پتھروں کی پلکوں پر

نازیہ کنول نازی

A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com

پتھروں کی پلکوں پر

نازیہ کنول نازی

القریش پبلی کیشنز
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546 , 042-37668958
www.alqurash.com E.mail:info@alqurash.com

خوب سے خوب تر کتابوں کی اشاعت
جدت اور معیار کے ساتھ

باہتمام.....محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراوّل.......................2013ء

مطبع.......................نیئر اسد پریس لاہور

کمپوزنگ.......................کلائمکس گرافکس

قیمت.......................-/700 روپے

وقار اعظم پاکستان ڈائجسٹ ڈاٹ کام

انتساب

ان بے گناہ معصوم قیدیوں کے نام......
جو وطن عزیز میں اندھے، بہرے قانون
کی بھینٹ چڑھ کر نظام کی تبدیلی کی خواہش
لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

وقار عظیم

پیش لفظ

"پتھروں کی پلکوں پر" میں نے جب یہ ناول تخلیق کیا تو ذہن میں ایک ہی سوچ تھی، مجھے قلم کے ذریعے بیدار کرنا ہے۔ وہ حقائق جن پر ظلم و اختیارات کی گرد جمی ہے، انہیں منظر عام پر لانا ہے۔ مجھے ان گھناؤنے چہروں کا پردہ چاک کرنا ہے جنہیں قلم بند کرنے کا حوصلہ ہر لکھاری میں نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ ناول کے تبصرات میں میرے سینئرز نے مجھے "محبت کی دیوی"، "امن کی دیوی"، شاعرات کے قبیلے کی سرخیل شاعرہ اور جانے کیسے کیسے القابات سے نوازا ہے۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ میں عام سی لکھاری صرف اور صرف ایک باغی محبت وطن ہوں۔ میرا دل اس ملک کے اندر جنگل کے قانون اور بدترین نظام پر انتہائی دُکھی ہے۔ وطن عزیز کے گوشے گوشے میں اُبھرتی داستانیں مجھے ہر لمحہ بے چین کرتی ہیں۔ پسماندہ دیہاتوں میں سسک سسک کر دم توڑتی انسانیت ہو یا جدید شہروں میں رشتوں کی بے حسی، ہسپتالوں میں مسیحاؤں کے ہاتھوں بجھتے زندگی کے چراغوں یا جیل کی اونچی چار دیواریوں میں ناچتی وحشت، میرا قلم ہر معاشرتی المیے کو لفظوں کا پیرہن دینے کے لئے بے چین رہتا ہے۔

قارئین! میرا قلمی سفر زیادہ طویل نہیں ہے۔ محض چند سالوں میں میرے پاک پروردگار نے مجھے کامیابی و عروج کی وہ منزل دکھائی ہے جہاں پہنچنے کی خواہش لئے بہت سے قلم کار دل گرفتہ سو گئے۔ مگر مجھے لگتا ہے، جیسے میں صدیوں سے لکھ رہی ہوں اور یونہی لکھتے لکھتے ایک دن وقت کی تاریکیوں میں کھو جاؤں گی۔ تاہم آخری سانس تک وقت کے ہر ظلم اور انسانی بربریت کے خلاف میری قلمی جنگ جاری رہے گی۔

آخر میں وطن عزیز کے ہر گوشے سے "پتھروں کی پلکوں پر" کے لئے بہنوں کی بے انتہا محبت کی اور تعریف میرا قیمتی سرمایہ رہے گی۔

میں بھائی محمد علی قریشی کی بے حد مشکور ہوں کہ جنہوں نے یہ ناول بہت محنت اور خوبصورتی کے ساتھ آپ تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔

دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

یار زندہ، صحبت باقی

naziakanwalnazi634@gmail.com

اے مالک کون و مکاں
اے خالق ہر دو سرا!!
تھالی کی ہزاروں ادھ کھلی کلیوں سے بھر دے
کاسہ دست دعا
اے مالک کون و مکاں!

Pakistanipoint Waqar Azeem

موسم خاصا ابر آلود ہو رہا تھا۔
طویل سفر طے کرنے کے باعث اس کی کمر درد سے اکڑ گئی تھی۔
گاؤں کے کچے پکے راستوں پر چلتا تانگہ ہچکولے لیتا بڑی سست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔
ہلہ انزلہ بڑی حسرت سے اردگرد کے بدلے ہوئے مناظر پر نگاہیں جمائے ان میں پندرہ سال پہلے کا عکس تلاشنے کی کوشش کر رہی تھی۔

آج سے ٹھیک پندرہ سال پہلے جب اس نے ٹھیک سے شعور کی سیڑھی پر قدم بھی نہیں رکھا تھا تب زندگی کتنی خوبصورت تھی۔

صبح صبح ناشتے سے پہلے داداجی اس کی ننھی سی انگلی تھام کر اسے اپنے ساتھ سرسبز کھیتوں کی سیر کروایا کرتے تھے۔

اس وقت صبح صبح داداجی کے ساتھ ہرے بھرے کھیتوں کی سیر کرتے ہوئے صبح کی ٹھنڈی ہوا کو اپنے چہرے پر محسوس کرنا اور کچی سبزیاں توڑ کر بغیر دھوئے کتر کتر کھانا اسے کتنا مزہ دیا کرتا تھا۔

اردگرد دکھائی دیتے سرسبز کھیتوں اور شیشم کے بلند درختوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے بے ساختہ نگاہوں میں وہ سہانی شامیں دھندلائی یاد کا لبادہ اوڑھ کر در آئی تھیں کہ جب وہ گاؤں کے دوسرے بچوں کے ساتھ مونگ پھلی، چلغوزے اور ریوڑیاں کھاتے ہوئے بی اماں کے گھر ٹی وی دیکھنے جایا کرتی تھی۔ بی اماں کتنا پیار کرتی تھیں اس سے۔

بے اولاد ہونے کے باعث گاؤں کے تمام بچوں سے ان کا پیار مثالی تھا۔

اسے کبھی کبھی یاد آتا تھا...... جب اماں بی دوپٹے کے پلو سے اس کے لئے کوئی اسپیشل چیز نکال کر اس کے حوالے کرتی تھیں تو اکثر ان کا بھتیجا سنی اچانک کہیں سے ٹپک پڑتا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ انزلہ کے ہاتھ سے اماں بی کی دی ہوئی چیز چھین کر کھا جاتا تھا اور وہ منہ بسور کر اسے دیکھتی

رہ جاتی۔

اکثر اس کی مما اسے نہلا دھلا کر نئے صاف ستھرے کپڑے پہناتیں تو حویلی سے باہر نکلنے پر سختی سے پابندی عائد کر دیتیں مگر وہ کسی نہ کسی طرح انہیں چکر دے کر باہر نکل جاتی اور جھٹ اماں بی کے پاس پہنچ جاتی۔

انزلہ ان سے اپنے گھر کی کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔

اس کے دادا جی گاؤں کے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے' ان کی اچھی عادات اور نیک طبیعت کی وجہ سے ہی گاؤں کے تمام لوگ ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ پورے گاؤں میں لوگ ان کی سادگی' محبت اور مساوات کی مثالیں دیتے نہیں تھکتے تھے۔ جس وقت اس نے شعور سنبھالا اس وقت حویلی بہت آباد تھی۔

اس کے بابا کا شمار گاؤں کے حسین ترین مردوں میں کیا جاتا تھا۔ وہ پڑھنے لکھنے کے بے حد مشتاق تھے' خود اس کے دادا جی بھی اپنے اکلوتے بیٹے کو اس کی خواہش کے عین مطابق اعلیٰ تعلیم دلوانے کے حق میں تھے' لہٰذا جب ساتھ والے گاؤں سے میٹرک شاندار نمبروں کے ساتھ کلیئر کرنے کے بعد وہ شہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے گئے تو گاؤں کے چوہدری کا منہ بن گیا۔

روائتی چوہدریوں کی مانند' ان کے گاؤں کے حکمران بھی اپنے علاقے کے لوگوں کی جاہلیت کے قائل تھے۔ پڑھ لکھ کر کوئی ان کے سامنے سر اٹھائے یا اپنے حق کے لئے آواز بلند کرے یہ انہیں کسی طور گوارہ نہیں تھا۔ لہٰذا معمولی معمولی باتوں کے بہانے چوہدری اور اس کے بیٹے اس کے دادا جی کے ساتھ جھگڑا کرنے لگے۔ اس کے بابا دانیال احمد کی تعلیم مکمل ہونے تک وہ صبر و برداشت کا بے مثال نمونہ بنے' چوہدری اور اس کے بیٹوں کی زیادتی برداشت کرتے رہے' مگر جونہی اس کے بابا دانیال احمد اپنا ایم اے انگلش مکمل کر کے گاؤں واپس لوٹے' وہ چوہدری اور اس کے بیٹوں کے بے جا مظالم کو چپ چاپ برداشت نہ کر سکے اور کئی بار ان سے جھگڑ بیٹھے۔

بعد ازاں دادا جی نے ان کا ذہن بٹانے اور ان کی توجہ چوہدریوں کی طرف سے ہٹانے کے لئے ان کی شادی انہی کی پسند پر شہر میں کنیز بیگم سے کر دی جو یونیورسٹی میں ان کی کلاس فیلو رہ چکی تھیں۔

کنیز بیگم ایک اچھی بہو ثابت نہیں ہو سکی تھیں کیونکہ وہ ہر صورت شہر میں رہنے کی خواہش مند تھیں' مگر دانیال صاحب نے انہیں گاؤں میں بسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپنے ساس' سسر کے ساتھ ان کا رویہ خاصا افسوس ناک ہوتا تھا' تاہم دادی ماں اور دادا جی دونوں ہی اپنی بردباری سے کام لے کر ان کی بدتمیزی کو نظر انداز کر جایا کرتے تھے۔

انزلہ ابھی چھ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کے پیارے بابا' پانی کے معمولی سے جھگڑے پر چوہدریوں کے ہاتھوں بالآخر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس کی مما غم سے پچھاڑیں کھا رہی تھیں' دادی کو ہوش ہی نہیں آ رہا تھا۔ جبکہ دادا جی یوں گم صم ہو کر رہ گئے تھے گویا ان کے وجود میں جان ہی نہ رہی ہو۔

حویلی کا واحد چراغ بجھ چکا تھا۔

پورا گاؤں دادا جی کے دکھ میں ان کے ساتھ برابر کا شریک تھا۔ مگر اس کے باوجود کسی میں [illegible] کے خلاف بولنے کی ہمت نہیں تھی۔

[illegible] کنواری بن کر رہ گئی تھی۔

[illegible] کبھی اپنی روتی بلکتی ماں کو دیکھتی تو کبھی دادا جی اور دادی ماں کو، [illegible] لوٹ پڑی تھی۔

[illegible] کے بعد دادا جی نے ریٹائرمنٹ لے لی' جبکہ اس کی شہری ماں ان کے پہلے سے [illegible] اپنی مدت پوری کرتے ہی اسے ساتھ لے کر شہر چلی آئی۔

[illegible] اپنی ماں کے ساتھ گاؤں سے شہر آرہی تھی اس روز اس نے پھر اپنے دادا جی اور دادی ماں کو روتے دیکھا تھا۔ اپنے بابا کی رحلت کے بعد وہ یوں بھی گم صم ہوگئی تھی۔ اسے اپنی ماں کے ساتھ شہر آنا بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا مگر وہ مجبور تھی۔

دادا جی شہر میں ہفتے دو ہفتے کے بعد اس سے ملنے کو آتے تو گاؤں سے اس کے لئے ڈھیروں چیزیں لاتے' وہ انہیں سامنے دیکھتے ہی بے طرح خوش ہوجاتی تھی۔ پہلے پہل شہر میں بالکل اس کا دل نہیں لگا تھا' تاہم بعد میں جب وہ اسکول میں داخل ہوگئی اور اس کی نئی سہیلیاں بن گئیں تو اس نے گاؤں سے دور ہونے کے غم میں ملول رہنا چھوڑ دیا۔

کچھ عرصے کے بعد اس کی مما کی دوسری شادی ہوگئی تو وہ نانا نانی کی ضرورت بن کر رہ گئی' اکثر چھٹیوں میں وہ گاؤں آکر اپنی دادی ماں اور دادا جی سے بھی مل جایا کرتی تھی۔

جن دنوں اس نے یونیورسٹی جوائن کی تھی انہی دنوں اس کے دادا جی اپنی بیماری سے ہار مان کر اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ یوں ایک مرتبہ پھر اس کے اندر اداسی کا بسیرا ہوا تھا۔

دادا جی کی رحلت کے بعد وہ گاؤں جا کر مستقل اپنی دادی ماں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی مگر پھر اس کی مجبوریاں آڑے آگئیں اور وہ چاہنے کے باوجود گاؤں نہ آسکی۔

انہی دنوں یونیورسٹی میں سانول شاہ نامی شخص سے اس کا ٹکراؤ ہوا تھا۔ بظاہر خاموش مگر ہر لحظہ کچھ کہتی نگاہوں کا مالک وہ شخص نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی سوچ میں در آیا تھا۔

یونیورسٹی میں ان کا گروپ صرف تین افراد پر مشتمل تھا۔ وہ' زوبی اور میران شاہ' جو اس کے دادا جی کا لائق فائق اسٹوڈنٹ تھا۔ تینوں مل کر پڑھائی بھی کرتے تھے اور ہنسی مذاق بھی۔ زوبی' میران شاہ پر مرتی تھی' مگر وہ اس میں دلچسپی لیتا تھا۔

انزلہ اکثر اسے سانول شاہ کا جڑواں بھائی کہہ کر چھیڑا کرتی تھی۔ کیونکہ دونوں کے ناموں میں گہری مشابہت تھی۔

تاہم سانول شاہ' میران شاہ سے دلی عناد رکھتا تھا اور اس کی وجہ انزلہ کو بخوبی معلوم تھی۔ یونیورسٹی سے ابھی وہ فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اچانک سانول شاہ منظر سے غائب ہوگیا۔

پھر کچھ ہی عرصے کے بعد وہ اور میران بھی جدا ہوگئے کیونکہ تعلیم سے فراغت پاتے ہی اسے ایمرجنسی میں اپنی مما کنیز بیگم کے پاس پیرس جانا پڑ گیا تھا۔ کچھ عرصہ وہاں قیام کے بعد وہ اپنے نانا کی وفات پر ان کے ساتھ واپس پاکستان آئی تھی تو دوبارہ پیرس ان کے ساتھ جانے سے انکار کردیا

کیونکہ وہاں کے اداس نظاروں میں اسے اپنے لئے کہیں سکون محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کنیز بیگم اس کی ضد پر اسے وہیں چھوڑ کر خود اپنے بیٹے اور شوہر کے ساتھ پیرس واپس چلی گئیں' جبکہ وہ دو تین دن بمشکل اپنے ننھیال میں سوگواری کی نذر کرنے کے بعد آج چوتھے دن گاؤں کے لئے روانہ ہوگئی تھی۔
کتنا بہت سا وقت چپ چاپ بیت گیا تھا۔

❁❁❁

''سنو...... تمہیں اعتراف ہے ناں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔''
وہ جائے نماز سمیٹ کر ابھی ارسلان حیدر کے کمرے میں داخل ہی ہوئی تھی جب اس نے پوچھا۔
جواب میں وہ دوپٹہ کھول کر اچھی طرح سر پر جماتے ہوئے بولی۔
''ہاں...... میں نے کبھی اپنے اس اعتراف سے انکار نہیں کیا۔''
''اچھا...... کیا کر سکتی ہو تم میرے لئے؟''
اگلے ہی لمحے وہ کھڑکی سے ہٹ کر اس کے مقابل آیا تھا۔
''جو تم کہو' چاہے تو جان لے لو' اف بھی نہیں کروں گی۔''
امامہ حسن کے لبوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ تھی' تاہم ارسلان حیدر نے اس کی طرف سے رخ پھیرا تھا۔
''مجھے تمہاری جان نہیں چاہئے۔''
''ٹھیک ہے' تمہیں جو چاہئے وہی بتا دو۔''
اس کے بستر کی چادر درست کرتے ہوئے وہ پھر مسکرائی تھی۔ جب کہ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ بیڈ پر بٹھاتے ہوئے بولا۔
''میں جانتا ہوں تم بہت اچھی ہو' یقیناً جتنا پیار تم مجھ سے کرتی ہو' دنیا میں کوئی اور لڑکی کسی اور لڑکے سے کبھی نہیں کر سکتی' مگر پھر بھی میں تمہیں بہت بڑی آزمائش میں ڈال رہا ہوں۔ بولو...... اس آزمائش میں میرا ساتھ دو گی؟''
امامہ کا نازک سا ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ میں تھا اور وہ الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
''آزمائش...... کیسی آزمائش......؟''
''ہے ایک آزمائش...... جس میں مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔''
پچھلے ایک ہفتے سے وہ اسے از حد متفکر دکھائی دے رہا تھا' دو ایک بار اس نے وجہ بھی پوچھی تھی' مگر وہ ٹال گیا تھا۔
امامہ حسن کو اس کا یہ الجھا ہوا انداز پریشان کر رہا تھا' تبھی وہ اس سے پوچھ بیٹھی تھی۔
''پلیز ارسلان! صاف صاف بتاؤ ناں' تمہیں کیا مسئلہ درپیش ہے۔''
ارسلان حیدر اس کے سوال پر قدرے مضطرب ہوتے ہوئے پھر سے کھڑکی میں جا کھڑا ہوا تھا۔
''ایک ایس پی ہے شجاع حسن' اسے اپنی بیٹی کی بہتر پرورش کے لئے ایک پڑھی لکھی گورنس کی

"... ہے"

"... ؟"

"تو ... تم وہاں اس لئے کہ چار پانچ عرصے کے لئے یہ جاب کرو گی۔"

"وہاں تمہارا ... کام تو ... ہے۔"

"... اکمل ... تو ... تھی' جب کہ وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے

...

"... ابھی تم نے ... اقرار کیا ہے کہ تم میرے لئے کچھ بھی کر سکتی ہو' پلیز امامہ......

... زندگی ... ہے تو پلیز تم یہ جاب کر لو' پلیز۔"

"... اس جاب کا تمہاری زندگی سے کیا تعلق؟"

... ابھی ... کے حصار سے باہر نہیں نکلی تھی۔

"تعلق ہے امامہ ... اس ایس پی کے پاس ایک ایسی فائل ہے' جو تمہارے ارسلان کی جان پر ... میں تمہیں سب کچھ صاف صاف بتاتا ہوں۔"

ایک مرتبہ پھر اس کے مقابل آتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔

"یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ابھی یونیورسٹی سے فارغ ہی ہوا تھا' یونیورسٹی میں ہمارے ساتھ ایک لڑکی پڑھتی تھی عائزہ' جتنی خوبصورت تھی' اتنی ہی نک چڑھی' مغرور بھی تھی۔ میرے دوست ... نے اسے اپنی ضد بنا لیا تھا' مگر وہ لڑکی کسی بھی طرح سے اس کے چکر میں نہیں آئی۔ نتیجتاً باسم ... یونیورسٹی سے فری ہونے کے بعد ایک روز اسے اچانک کڈنیپ کروا لیا۔ میری بدقسمتی کہ دوستی ... میں اپنے دیگر فرینڈز کے ساتھ ساتھ' میں نے بھی اس شرمناک اقدام میں باسم کا ساتھ دیا ... لڑکی ... قید کر دیا۔ باسم نے پتہ نہیں اس بیچاری کے ساتھ کیا کیا' کہ اس کی ڈیتھ ہو گئی۔ یہ غالباً دو سال پہلے کی بات ہے' اس وقت کوئی پرچہ وغیرہ ہوا تھا ہم لوگوں کے خلاف' مگر باسم ... باپ نے کیس دبا دیا اور ہم لوگ آزاد ہو گئے' اب جبکہ اس کے ڈیڈ' حکومت سے الگ ہو گئے ہیں تو ایس پی شجاع حسن نے اس کیس کو دوبارہ کھول لیا ہے۔ سنا ہے اس لڑکی کا بھائی' شجاع کا کوئی ... دوست ہے' بہرحال ایس پی شجاع ہم چاروں دوستوں کے خلاف کیس مضبوط کرنے کی ... میں مصروف ہے۔ تم تو جانتی ہو امامہ' اس وقت ریپ کی سزا سیدھی سزائے موت ہے' اب ... یہ ہے کہ اس کیس میں ایس پی شجاع نے باسم وغیرہ کے ساتھ میرا نام بھی ہٹ لسٹ پر درج کر ... ہے۔ جو ثبوت اس نے ہمارے خلاف اکٹھے کئے ہیں' وہ فائل ہم دو مرتبہ اس کے آفس سے ... کی کوشش کر چکے ہیں' مگر وہ بہت ہوشیار ہے' دو مرتبہ ہمیں ناکامی سے ہمکنار کرنے کے بعد ... وہ فائل اس نے گھر میں لے جا کر رکھ دی ہے۔ اس کیس پر آج کل وہ گھر میں رہ کر ہی کام کر رہا ہے امامہ...... میں جانتا ہوں تم اصول پرست لڑکی ہو تم کبھی کسی ظالم کا ساتھ نہیں دے سکتیں' مگر...... میں تو بے قصور ہوں ناں' میں تو صرف تمہارا ہوں امامہ! فضول میں سزا کی بھینٹ چڑھ رہا ہوں' سو پلیز صرف میرے لئے' تم کسی بھی طرح سے وہ فائل اس ایس پی کے گھر سے اڑا کر لے آؤ' پھر میں تم سے پرامس کرتا ہوں جان! جو اصل گنہگار ہیں انہیں میں خود ان کے کئے کی سزا دلواؤں گا' پلیز

امامہ...... مما کو اس بات کا پتہ نہ چلے، پلیز۔"

اس کے ہاتھ تھام کر کسی بچے کی مانند منت کرتا وہ کتنا معصوم لگ رہا تھا۔

امامہ اس کی زبانی، عجب و عجیب داستان سن کر، بالکل ساکت کھڑی تھی۔

کیا عجیب شخص تھا وہ جو اسے مشکل میں ڈال کر اپنی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

"اچھی طرح سوچ لو ڈیئر! مگر اتنا ضرور یاد رکھنا کہ اگر وہ ایس پی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا تو پھر ذلت کی موت قبول کرنے کی بجائے میں خود اپنے ہاتھوں سے مرجانا زیادہ پسند کروں گا۔" اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ کمرے میں ٹھہرا نہیں تھا، جبکہ امامہ کا دل جیسے کسی خشک پتے کی مانند کانپ کر رہ گیا۔

کتنی بڑی بات کہہ گیا تھا وہ شخص کہ جس کے کانٹا بھی چبھنا وہ گوارہ نہیں کر سکتی تھی۔

"نہیں...... جب تک امامہ حسن کے جسم کا روح سے تعلق برقرار ہے، وہ تمہاری طرف ہوا کے گرم جھونکے کو بھی نہیں آنے دے گی ارسلان، یہ وعدہ ہے میرا خود اپنے آپ سے، خواہ اس کے لئے مجھے اپنی ہی جان مشکل میں کیوں نہ ڈالنی پڑے، میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔"

صرف ایک لمحے میں فیصلہ کے بعد، اس نے چپ چاپ پلکیں موند کر، سر بیڈ کی پٹی سے ٹکا دیا تھا۔

❀❀❀

کہیں بے کنار سے رتجگے کہیں زرنگار سے خواب دے
تیرا کیا اصول ہے زندگی، مجھے کون اس کا جواب دے
جو بچھا سکوں تیرے واسطے جو سجا سکیں تیرے راستے
میری دسترس میں ستارے رکھ، میری مٹھیوں میں گلاب دے

ارسلان حیدر کی ہدایت کے عین مطابق، اگلے ہی روز امامہ سادہ سے حلئے میں ملبوس ایس پی شجاع حسن کے خوبصورت بنگلے میں موجود تھی۔

چوکیدار نے اسے روک کر کہا تھا کہ صاحب نوجوان لڑکیوں کو جاب نہیں دیتے، لہٰذا وہ واپس چلی جائے مگر اپنی محبت کے آگے سرخرو ہونے کے لئے وہ چوکیدار کی منت کر کے، کسی نہ کسی طرح بنگلے میں گھس آئی تھی۔

چوکیدار نے اس کی جھوٹی مظلومیت کی کہانی سے متاثر ہو کر ایس پی شجاع کو اس کی آمد سے مطلع کر دیا تھا۔

اور اب وہ دل ہی دل میں قدرے کنفیوز ہوتی، وسیع ڈیکوریٹڈ ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہی تھی۔

اگلے کچھ ہی لمحوں میں ملازمہ چائے کی ٹرے لئے چلی آئی تھی۔

امامہ ابھی چائے پی کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ ایس پی شجاع ڈرائنگ روم میں چلا آیا۔

ارسلان کی زبانی، شجاع حسن کے بارے میں سن کر، وہ اپنے ذہن میں اس کا خاکہ خاصا خوفناک بنا چکی تھی۔ مگر اس وقت جو شخص نہایت سلیقے سے اس کے مقابل آ کر بیٹھا تھا، بے شک وہ اپنے حسن اور وجاہت میں بے مثال تھا۔

''السلام علیکم''

اپنے مقابل پا کر وہ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
سامنے والی شخصیت کا رعب ہی اس قدر تھا کہ لمحوں میں اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئی تھیں۔

''وعلیکم السلام''

ایک نگاہ اس کے سادہ سراپا پر ڈالتے ہوئے وہ اطمینان سے اس کے مقابل ہی ٹک گیا تھا۔

''وہ میں جاب کے سلسلے میں حاضر ہوئی تھی سر!''

ضرورت سے زیادہ اعتماد رکھنے والی امامہ حسن' ایس پی شجاع کے سامنے اعتماد سے بات نہیں کر پائی تھی۔

''کس جاب کے سلسلے میں؟''

اس کے چہرے پر چھائی حد درجہ سنجیدگی' امامہ کو مزید پزل کر رہی تھی۔

''وہ آپ نے پیپر میں اپنی بچی کے لئے ایک گورنس کی ضرورت کا جو ایڈ دیا تھا' اسی جاب کے سلسلے میں۔''

بمشکل ہی سہی' مگر وہ کسی حد تک اپنے خوف پر قابو پا چکی تھی۔

''اچھا' لیکن اس جاب کے لئے میں نے اپنے ایڈ میں نوٹ لکھا تھا کہ یہ ملازمت صرف عمر رسیدہ خواتین کے لئے ہے' جو چھوٹے بچے کو سنبھالنے کا بہترین تجربہ رکھتی ہوں۔''

امامہ حسن کے علم میں یہ بات نہیں تھی' تاہم پھر بھی وہ فوراً لب کشائی کرتے ہوئے بولی تھی۔

''میں جانتی ہوں سر! مگر یہ جاب میرے لئے بہت ضروری ہے' بھری دنیا میں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے میرا' آپ صرف ایک موقع دیں' میں پوری کوشش کروں گی کہ آپ کو مجھ سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ہو۔''

اس وقت اس کے چہرے پر دنیا بھر کی مظلومیت چھلکتی صاف دکھائی دے رہی تھی۔
ایس پی شجاع حسن نے پھر سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

''کیا نام ہے آپ کا......؟''

چند لمحوں تک کچھ سوچنے کے بعد اس نے باقاعدہ انٹرویو کا آغاز کر دیا تھا۔

''امامہ حسن۔''

''کوالیفیکیشن؟''

''گریجویشن کیا ہے سر' یہ دیکھئے میں اسناد ساتھ لائی ہوں۔''

اپنا شاندار تعلیمی ریکارڈ' بڑے آرام سے اس کے حوالے کرتے ہوئے وہ پھر بولی تھی۔
شجاع حسن نے سرسری سے اس کے کاغذات چیک کئے پھر پوچھا۔

''یہ جاب کیوں کرنا چاہتی ہیں آپ؟''

وہ جانتی تھی یہ سوال ضرور ہو گا۔ تبھی پہلے سے ذہن میں گھڑی ہوئی فرضی کہانی' قدرے دکھی انداز میں سناتے ہوئے بولی۔

''کیونکہ یہ جاب میری زندگی ہے سر' میرے والدین حیات نہیں ہیں' اور رشتہ دار خود پر بوجھ

سمجھتے ہیں' سب کی چاکری کرنے کے باوجود' صرف کوسنے اور درد ہی ملتے ہیں مجھے' اس لئے جب آپ کا ایڈ پڑھا' تو محسوس ہوا جیسے قدرت نے میرے تمام دکھوں کی تلافی کا انتظام کردیا ہے' مجھے ایسی ہی جاب کی ضرورت تھی سر! جہاں عزت' حفاظت' اور چھت یکساں میسر ہو' پھر بچوں سے دلی طور پر بہت انسیت ہے مجھے' آپ دیکھئے گا' میں آپ کی بچی کو......"

"اوکے......آپ کل سے تشریف لے آیئے گا۔"

اس کی لمبی چوڑی روداد سے بیزار ہو کر وہ اس کی بات کو درمیان میں کاٹتے ہوئے بولا' تو باوجود انسلٹ کے' امامہ حسن کی باچھیں کھل گئیں۔

اتنے گھاگ بندے کو شیشے میں اتارنا' بھلا اتنا آسان کہاں تھا۔

شجاع حسن کا ممنونیت سے شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ گھر واپس آئی تو ارسلان بے تابی سے لان میں ٹہلتے ہوئے اس کا انتظار کررہا تھا۔

اسے گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا تو فوراً لپک کر اس کی طرف بڑھا۔

"کیا بنا مون؟"

امامہ کا دل چاہا کہ اسے تھوڑا ستائے' مگر اس کی پریشان صورت دیکھتے ہوئے اپنا ارادہ کینسل کردیا۔

"کچھ نہیں بنا' بہت غلط جگہ پھنسا کر رکھ دیا ہے' خدا خدا کرکے اس گھاگ انسان کو رضامند کرکے آئی ہوں میں۔"

"او مون' یو آر رئیلی ویری گریٹ گرل' میں جانتا تھا میری مون کبھی ناکام پلٹ ہی نہیں سکتی۔ انشاء اللہ اب جلد وہ فائل بھی تمہارے ہاتھ میں ہوگی' چلو آج اسی خوشی میں تمہاری پسندیدہ آئس کریم کھلا کرلاؤں تمہیں۔"

وہ ازحد پرجوش ہوا تھا۔ اور اس کی اسی ادا پر تو امامہ حسن کو اپنے دل کا سرور چھلکتا دکھائی دیتا تھا۔

"نہیں شکریہ' اس وقت تھکن بہت محسوس ہورہی ہے' کل سہی۔"

مقناطیسی نگاہوں سے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے دھیرے سے نفی میں سرہلایا تو ارسلان نے بھی فوراً کندھے اچکادیئے۔

"اوکے ایز یو وش' ابھی مما کو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے ان سے تمہارے معاملے میں میں خود ہی طریقے سے بات کرلوں گا' اوکے۔"

"ٹھیک ہے۔"

وہ بھلا اس کی کسی بھی بات سے اختلاف کرنے کی جرأت کہاں رکھتی تھی' سو فوراً اثبات میں سرہلادیا تو ارسلان محبت سے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اگلے ہی لمحے تیز تیز قدم اٹھاتا' گھر کی دہلیز سے باہر نکل گیا۔

❋❋❋

"کیا میں اندر آسکتی ہوں؟"

[illegible] ہوئی تھی
[illegible] قدرے نرم انداز میں اجازت چاہی تو اندر کلاس میں لیکچر
[illegible] نظر اس کے سادہ سے چہرے پر ڈالی' پھر حسب توقع اثبات
[illegible]
[illegible]"
[illegible]"

[illegible] سے ان کا شکریہ ادا کرتی' وہ اپنی کلاس میٹ صباء احمد کے پہلو میں
[illegible] اس بے انسانی پر غصے سے تلملایا تھا۔

[illegible] جانتا تھا کہ پرکشش شخصیت کے مالک سرزمان اپنے اصول و قواعد کے معاملے میں
[illegible] کلاس کے کسی بھی طالب علم کی جرأت نہیں تھی کہ وہ ان کے پریڈ کو بنک کر دیتا'
[illegible] ہی لیٹ ہو جاتا۔ وقت کی پابندی کے معاملے میں شاہ روز نے ان سے زیادہ سخت
[illegible] دیکھا تھا۔

[illegible] لیٹ یا غیر حاضر ہوتے تھے نہ اپنی کلاس کے کسی اسٹوڈنٹ کو ہونے دیتے تھے۔ خواہ وہ
[illegible] کیوں نہ ہوتا۔

پوری کلاس میں انوشہ رحمٰن واحد لڑکی تھی' جس کے معاملے میں وہ بے حد نرمی کا مظاہرہ
[illegible] تاہم ان کے سخت مزاج کے باعث کسی طالب علم میں' اس بات پر احتجاج کرنے کی
[illegible] تھی

[illegible] اصولوں کے سخت تھے' اتنے ہی طلبہ و طالبات کے محبوب بھی تھے۔

[illegible] ابھی کچھ ہی ماہ قبل' مائیگریشن کروا کر اس یونیورسٹی میں آئی تھی اور آتے ہی چھا گئی تھی۔

اس [illegible] پہلے شاہ روز پوری کلاس کا ہیرو تھا۔ سبھی اساتذہ بھی اس کی ذہانت کے معترف تھے۔ مگر......

[illegible] کے آنے کے بعد اس کی حیثیت پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔

اس [illegible] سی نازک دوشیزہ نے' ذہانت' عمدہ اخلاق' خوش طبعی' فرماں برداری' غرض کہ ہر
[illegible] ان میں اسے بری طرح پیچھے دھکیل کر رکھ دیا تھا۔

[illegible] سے وہ اس کے مقابل آئی تھی' شاہ روز ایک لمحے کے لئے بھی سکون کا سانس لینے کو ترس
[illegible] تھا۔ اس کی ضد اور حسد میں' اب اس کی توجہ بھی تعلیم پر پہلے جیسی نہیں رہی تھی' لہٰذا اساتذہ کی
[illegible] میں اب اس کا مقام بھی وہ پہلے جیسا نہیں رہا تھا اور اسی بات کا اسے دکھ تھا۔

شاہ روز کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اس کانچ کے پیکر کو اٹھا کر یونیورسٹی سے باہر پھینک دیتا۔

سرزمان کا پریڈ ختم ہوا تو وہ انوشہ رحمٰن کے پاس رک گئے۔

"مس انوشہ! آج پھر آپ نے بہت سے اہم پوائنٹ مس کر دیئے' میرا آخری پریڈ فری ہوگا
[illegible] اس میں یہ پوائنٹ مجھ سے دوبارہ سمجھ سکتی ہیں۔"

انوشہ نے ان کی اس شاندار آفر پر پھر ممنونیت سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اثبات میں
سر ہلایا تھا جبکہ اس کی پچھلی رو میں بیٹھا شاہ روز اس کھلم کھلا نوازش پر ایک مرتبہ پھر خون کے گھونٹ پی

کر رہ گیا۔
''ہونہہ بڑا با اصول بنا پھرتا ہے' پھنسالیا کہ نہیں اس لڑکی نے اپنے چکر میں۔''
سخت غصے کے عالم میں اس نے اپنے دوست سے کہا تھا' مگر آواز انوشہ کی سماعتوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔
سر زمان کے بعد اگلا پریڈ فری تھا' لہٰذا سبھی اسٹوڈنٹس اپنی اپنی سیٹ چھوڑ کر کلاس سے باہر نکل گئے تھے۔ مگر انوشہ اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کو چھلکنے سے روکتی وہیں بیٹھی رہی
شاہ روز اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر نوٹس بنانے لگا تھا۔
''نوشی' آج پھر تم لیٹ ہوگئیں' کیا بات ہے؟ گھر میں سب ٹھیک تو ہے ناں؟''
اسے اپنی سیٹ پر جے دیکھ کر صباء وقاص اس کے برابر میں آ بیٹھی تھی۔
پوری کلاس میں صباء وقاص ہی واحد لڑکی تھی جسے انوشہ نے سب سے پہلے اپنی دوست بنایا تھا۔ اور اسی کے ساتھ وہ اپنی پرسنل باتیں اور راز بھی بلا جھجک شیئر کر لیتی تھی۔
اس وقت بھی اس کے سوال پر انوشہ کی آنکھیں چپکے سے بھیگ گئی تھیں' تاہم وہ لبوں پر اداس سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی تھی۔
''تم تو بس ایک ہی دکھ پوچھتے ہو۔''

❋❋❋

''یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہے انوشہ۔''
اس کی اداس نظم کے جواب میں' صبا نے پرشکوہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا' جبکہ شاہ روز اسے گھور رہا تھا۔
'اب ایسا کیا پوچھ لیا صبا نے جو محترمہ آنکھوں میں آنسو بھر لائیں۔'
بظاہر اپنے کام میں مگن اس نے پھر کڑھتے ہوئے سوچا تھا' جب کہ انوشہ اپنی شفاف ہتھیلیوں پر نگاہ جماتے ہوئے اس سے قطعی بے خبر' دھیمے لہجے میں بولی۔
''آنٹی مجھے مما کے پاس بھیجنا چاہ رہی ہیں صباء' بقول ان کے اب وہ مزید میرا بوجھ نہیں اٹھاسکتیں' زندگی ایک مرتبہ پھر بار ثابت ہو رہی ہے میرے لئے۔''
لمحے میں آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔ صبا نے اپنائیت سے اس کے ہاتھ تھام کر آنسو پونچھے تھے۔
''اس میں رونے کی کیا بات ہے نوش' اور پھر تمہارے بھیا اور پاپا بھی تو ہوں گے وہاں۔''
''نہیں...... پاپا میرے لئے نہیں ہیں' وہاں صرف مما کی حکمرانی ہوگی' اور ان کے لئے تو میں آنٹی سے بڑھ کر بوجھ ہوں۔''
نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں نمی گھل گئی تھی۔
شاہ روز خاصا چڑ کر رہ گیا تھا۔
''بی بریو جان! تم صدف آنٹی کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں آخر وہ تو تمہاری سگی مما ہیں۔''
صبا کے سادہ انداز پر ایک زخمی مسکراہٹ انوشہ کے لبوں پر بکھر کر رہ گئی تھی۔
''نہیں ڈیئر! میں وہ کھلونا ہوں جس سے ممی پاپا وقتاً فوقتاً باری باری کھیلتے ضرور ہیں مگر دونوں

[illegible] کی ضرورت نہیں ہے۔"

"[illegible] وہاں جانے کی' تم انکار کردو' بس۔"

"[illegible] فون کرکے مجھے بلایا ہے۔ پاپا کے چہیتے بیٹے کی شادی ہے' اور مجھے [illegible] ہیں جو عام قصے کہانیوں میں کوئی بھی لاوارث لڑکی سرانجام [illegible] نے فائدہ اٹھا کر مما کے دل میں اپنی جگہ بنانی چاہیئے۔"

"[illegible] کا دل نہ ہوا' کوئی پلاٹ ہو گیا' سچ نوشی' سوتیلی ماں واقعی بڑی [illegible] ان سے اتنے ڈرتے کیوں ہیں؟"

[illegible] اس کے حالات کی روداد سن کر غصہ آیا تھا۔

[illegible] اب خود کو قدرے سنبھال چکی تھی' تبھی آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"[illegible] مریض ہیں صباء! وہ گھر میں فضول کے جھگڑے افورڈ نہیں کرسکتے' اسی لئے [illegible] زندگی بسر کررہے ہیں۔"

"اچھا' چلو چھوڑو' اس جھگڑے کو' یہ بتاؤ کب جارہی ہو اسلام آباد؟" صبا نے اس کی آزردگی [illegible] فوراً ہی موضوع بدل دیا تو وہ اسے بتانے لگی۔

"[illegible] اگلے ہفتے چلی جاؤں' تب تک پڑھائی کا زور بھی نہیں رہے گا' چھٹی آرام سے مل [illegible]۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

[illegible] فوراً اس کی تائید میں سر ہلایا تھا۔

[illegible] مکمل ہو چکا تھا' لہٰذا وہ اپنے دوست کے ساتھ چپ چاپ اٹھ کر کلاس سے باہر [illegible]

"[illegible] یہ صاحب بھی کلاس میں تھے؟"

[illegible] نے اسے دروازے سے باہر نکلتے دیکھا تو اپنے گال پیٹ کر رہ گئی' جواب میں صبا کھل کر [illegible]

"پتہ نہیں ہوتا یار! مجھے تو خود جناب کی موجودگی کا علم نہیں تھا' ورنہ کلاس سے باہر کہیں بیٹھ کر [illegible] رو لیتے۔"

صبا کے جواب پر وہ بھی دھیمے سے مسکرا دی تھی۔

"پتہ نہیں کیوں صبا! یہ شخص مجھ سے حد درجہ بدگمان لگتا ہے' اس کے دوست مجھ پر فضول فقرے [illegible] ہیں' جہاں بھی ملتا ہے یوں دیکھتا ہے جیسے کھا جائے گا' میری سمجھ میں اس کا یہ ایٹی ٹیوڈ نہیں [illegible]"

"چھوڑ یار! یہ جلتا ہے تیری شہرت سے اور کوئی بات نہیں' چل کینٹین کا چکر لگا کر آتے ہیں۔"

صبا اس کا ہاتھ تھام کر اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی تو مجبوراً انوشہ کو بھی اس کی تقلید کرنی پڑی۔

اگلے روز شاہ روز یونیورسٹی آیا تو اتفاق سے اس کا کلوز فرینڈ عباد کلاس سے غیر حاضر تھا۔

سر زمان کے پریڈ کا ٹائم ہو چکا تھا اور آج انوشہ اتفاق سے ٹائم سے پہلے کلاس میں حاضر تھی۔

سر زمان کلاس میں انٹر ہو کر اپنا لیکچر شروع کر چکے تھے۔
شاہ روز عباد کے بارے میں سوچ رہا تھا کیونکہ وہ اسے اطلاع کیے بغیر کبھی چھٹی نہیں کرتا تھا اور نہ ہی آج تک کبھی سر زمان کی کلاس بنک کی تھی۔
ابھی وہ اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے دروازے سے عباد کلاس کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیا۔
"مے آئی کم ان سر؟"
کلاس کی دہلیز پر پہنچ کر اس نے نہایت ادب سے اجازت چاہی تھی مگر سر زمان کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔
"یہ کلاس میں آنے کا کون سا ٹائم ہے عباد! آپ کو شاید معلوم نہیں' میں وقت کی پابندی نہ کرنے والے اسٹوڈنٹس کو قطعی پسند نہیں کرتا۔"
وہ عباد پر گرجے تھے۔ تب شاہ روز فوراً اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"ایکسکیوزمی سر! شاید آپ بھول رہے ہیں کہ آپ کا یہ اصول مس انوشہ رحمٰن پر لاگو نہیں ہوتا۔"
"شٹ اپ' یہ آپ کا معاملہ نہیں ہے' اور نہ ہی میں اپنے اسٹوڈنٹس کو ایسی بدتمیزی کی اجازت دے سکتا ہوں۔ مس انوشہ کا معاملہ سب سے الگ ہے۔"
شاہ روز کے الفاظ نے ان کے غصے کو مزید ہوا دی تھی۔
مگر وہ کہاں کسی کے رعب میں آنے والا تھا' تبھی گستاخانہ انداز میں بولا۔
"می نو ویل سر' آپ نہ بھی بتائیں تب بھی پوری کلاس جانتی ہے کہ ان کا معاملہ ہم سب سے الگ ہے' ایسی نازک اندام لڑکیوں پر آپ تو کیا کوئی بھی پروفیسر اپنے اصولوں سے منہ موڑ سکتا ہے۔"
"شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ فرام ہیئر۔"
ہمیشہ مہربان رہنے والے سر زمان کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا تھا۔
پوری کلاس دم سادھے بیٹھی تھی۔
شاہ روز نے اپنے ڈیسک کو زور سے ٹھوکر ماری اور اگلے ہی لمحے تن فن کرتا کلاس سے باہر نکل گیا۔
"آئی ایم سوری سر۔"
لاسٹ پریڈ میں وہ سر زمان کے شاندار روم میں سر جھکائے ان کے مقابل صوفے پر بیٹھی ان سے ایکسکیوز کر رہی تھی' جب انہوں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"سوری' فار وھاٹ مس انوشہ۔"
ان کا انداز ہمیشہ کی طرح مشفق اور اپنائیت بھرا تھا۔
انوشہ کا سر مزید جھک گیا۔
"سر! آج پھر میری وجہ سے پوری کلاس کے سامنے آپ کو شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا' مجھے بہت شرمندگی محسوس ہو رہی ہے' اللہ نے چاہا تو کل سے میں ہر ممکن کوشش کروں گی کہ وقت پر کلاس اٹینڈ کر سکوں۔"

اس کے ہاتھوں میں بڑی واضح لرزش تھی۔
سرزمان نے اب پھر دھیمے سے مسکرا اٹھے۔
"نہیں آپ کو اس سلسلے میں معمولی سی ٹینشن لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے' شاہ روز اچھا لڑکا ہے' ذاتی طور پر آپ سے کوئی دلی پرخاش بھی نہیں ہے' بس فضول میں خود کو آپ سے کمپیئر کر بیٹھا ہے۔ الٹا ... اگر کوئی اس کے مقابل آئے' یا اسے نظر انداز کرے' بہرحال پچھلے کچھ دنوں سے آپ پریشان دکھائی دے رہی ہیں' کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟"
سرزمان اس کے مشفق استاد ہی نہیں بلکہ انتہائی مہربان دوست بننے کی کوشش بھی کررہے تھے۔
انوشہ کو ان سے اپنے مسائل ڈسکس کرنا اچھا لگتا تھا۔
"میرا خیال ہے آج پھر کوئی آپ کو لینے نہیں آیا ہوگا' میں گھر جارہا ہوں' آپ بھی ساتھ ہی آجائیں' ماں کی طبیعت آج کل کچھ ٹھیک نہیں رہتی' ان سے دعا سلام کرلیجئے گا' راستے میں باتیں بھی ہوجائیں گی اور پھر میں آپ کو آپ کے گھر ڈراپ بھی کردوں گا۔"
اس سے پہلے کہ وہ ان کے پوچھے گئے سوال کے جواب میں کچھ کہتی' وہ خود ہی پھر سے بول اٹھے' ہمیشہ کی طرح وہ معذرت کرنے کی سوچ رکھنے کے باوجود ان کی آفر پر سر جھکا گئی۔
اس وقت وہ اپنی کتابیں سینے سے لگائے' سرزمان کے ساتھ ان کے روم سے باہر نکل رہی تھی اس وقت شاہ زور نے اپنے دوستوں کے درمیان کھڑے ہوئے اسے خاصی ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا تھا اس کی نگاہوں کے تعاقب میں اس کے دوستوں نے بھی اسے سرزمان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر بڑے شریر انداز میں سیٹی بجائی تھی۔
"شٹ ... مجھے ایسی بدکار' مفاد پرست اور گھنی لڑکیاں سخت زہر لگتی ہیں۔"
قریبی درخت پر مکا رسید کرتے ہوئے اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اس کا دوست بلال کھلکھلا کر ہنس پڑا۔
"بس کر یار' کیوں جل جل کر اپنی انرجی ضائع کررہا ہے۔"
"جاتی ہے میری جوتی' میں ایسی گھٹیا اور چال باز لڑکیوں پر لعنت بھی نہیں بھیجتا۔"
اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہوگیا تھا۔
ارمان نے بمشکل اس کا کندھا تھپک کر اسے ٹھنڈا کیا۔
"چھوڑ یار' کوئی کچھ بھی کرے تو کیوں فضول میں ٹینشن لیتا ہے۔"
"نہیں' میں اس معاملے میں ٹینشن فری نہیں رہ سکتا' تم دیکھنا اس انوشہ رحمٰن کو میں نے زمین نہ چٹائی تو میرا نام بھی شاہ زور آفندی نہیں' دیکھتا ہوں میں' کب تک سرزمان اس کی مٹھی میں رہتے ہیں۔"
وہ چونکہ سرزمان سے بے حد اٹیچ تھا' لہٰذا اسے زیادہ تکلیف ان ہی کی انوشہ پر مہربان ہونے کی تھی' ورنہ اس جیسی سادہ سی لڑکیوں کو وہ اپنی اک توجہ بھری نگاہ کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔
سرزمان ڈرائیونگ خاصی سلو کرتے تھے۔
انوشہ پہلے بھی دو تین بار ان کے ساتھ ان کے گھر آئی تھی' سرزمان کی طرح ان کی اپاہج مما بھی

سراپا محبت تھیں' اپنے مستقبل کے لئے وہ جب بھی چپکے سے پلکیں موند کر کسی گھر کا خواب دیکھتی تھی' سرزمان کا گھر بڑی بے ساختگی سے اس کے تصور کے پردے پر جھلملا کر رہ جاتا تھا۔

ہمیشہ سرزمان کے مقابل آ کر بھرپور اعتماد رکھنے کے باوجود وہ کنفیوز ہو کر رہ جاتی تھی۔

اس وقت بھی اس کا دل ان کی قربت میں دھڑ دھڑ کر رہا تھا' جب کہ گاڑی مین روڈ پر لاتے ہوئے انہوں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

آپ نے بتایا نہیں مس انوشہ! آج کل آپ پریشان کیوں رہنے لگی ہیں؟''

وہ ذمہ دار اور بھرپور حساس مرد تھے اس بات کا اندازہ انوشہ کو بخوبی ہو چکا تھا' اسے خوشی بھی ہو رہی تھی کہ وہ اس پر اتنی گہری توجہ رکھتے ہیں' شاید تبھی سر جھکا کر اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں انہیں بتایا تھا۔

''بظاہر تو کوئی پرابلم نہیں ہے سر! مگر پھر بھی میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی ہلکورے لے رہی ہے۔ اصل میں میرے پاپا نے دو شادیاں کی ہیں' پہلی اپنے گھر والوں کی رضا پر میری مما سے کی تھی اور دوسری اپنی پسند سے اپنی ایک کلاس فیلو کے ساتھ کی ہے۔ میری پیدائش کے تقریباً چھ ماہ بعد مما نے پاپا سے ڈائیورس لے لی تھی' کیونکہ وہ ان کی زندگی میں کسی اور کی مداخلت برداشت نہ کر سکیں۔ پاپا سے علیحدگی کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ ہی لے آئی تھیں' بعد ازاں ان کی شادی ہو گئی تو انہوں نے مجھے اپنے گھر والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور خود ملک سے باہر چلی گئیں۔ مما کے بعد دو تین سال نانی ماں نے مجھ پر اپنا پیار لٹایا' پھر ان کی رحلت ہو گئی تو میں چھوٹی آنٹی کی تحویل میں آ گئی' کچھ عرصے بعد ان کی شادی ہو گئی تو ان کی توجہ بھی بٹ گئی' بچے ہو جانے کے بعد تو میں ان کے لئے جیسے ناقابل برداشت بوجھ بن کر رہ گئی' حالانکہ بہت چھوٹی عمر میں' میں نے نہ صرف ان کے ساتھ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹایا ہے' بلکہ ان کے بچے بھی کھلائے ہیں' پھر بھی وہ مجھ سے عاجز ہیں' اب انہیں شب و روز یہ فکر کھائے جاتی ہے کہ کہیں میں ان کے شوہر کا ایمان نہ خراب کر دوں' اسی لئے وہ مجھے پاپا کے پاس مستقل بھجوانا چاہتی ہیں' جہاں زندگی یہاں سے بڑھ کر عذاب ہو گی میرے لئے۔''

اس کے لہجے میں تھکن تھی۔

سرزمان روٹ بدل کر پھر اس سے پوچھ بیٹھے۔

''کیوں' وہاں کیا پرابلم ہے؟''

''بہت ساری پرابلمز ہیں سر! اصل میں میری مما اور میری بڑی آنٹی کی ایک ہی گھر میں اکٹھی شادی ہوئی تھی۔ مما کا گھر اجڑنے کے بعد میری بڑی آنٹی کا پاپا سے اختلاف ہو گیا' مجھ سے بڑا میرا ایک بھائی ہے زوار علی حسن' وہ آنٹی کے پاس ہی رہتے ہیں کیونکہ آنٹی اولاد نرینہ سے محروم ہیں۔ میں نے آج تک اپنے بھائی کو نہیں دیکھا' نہ ہی آنٹی سے ملنے کی اجازت ہے' کیونکہ چھوٹی آنٹی جن کے پاس میں رہتی ہوں' وہ بڑی آنٹی سے شدید ناراضی کے باعث ان کا ذکر تک نہیں کرتیں میرے سامنے۔ ادھر پاپا کی دوسری بیوی ان پر بری طرح قابض ہے' پچھلے بیس بائیس سالوں میں انہوں نے ایک بار بھی پاپا کو اتنی اجازت نہیں دی کہ وہ کچھ روز کے لئے مجھے اپنے پاس رکھ سکیں' مزاجاً بھی بہت تیز ہیں۔ یہ سب انکل کی معرفت میرے علم میں آیا ہے' اب مسئلہ یہ ہے کہ آنٹی نے

۔۔ رابطہ کرنے میرے متعلق ان سے بات کی ہے' آنٹی کے کہنے پر وہ مجھے اپنے پاس بلانے
۔۔ تیار ہو گئے ہیں' مگر میں جانتی ہوں وہاں جا کر پاپا کی سیکنڈ وائف کے ساتھ امن وامان سے
۔۔ ممکن نہیں ہوگا' اسی لئے ٹینشن لگی ہوئی ہے۔"

۔۔ ان سے اپنا مسئلہ شیئر کر رہی تھی۔

۔۔ ان کے اس اعتماد سے خاصا حوصلہ ملا تھا۔

۔۔ اپنی مما سے اس سلسلے میں بات کیوں نہیں کرتیں؟"

۔۔ جاننے کے بعد انہوں نے پوچھا تھا' جب وہ بولی۔

"۔۔ کے بعد مما کے لئے مستقل مجھ سے رابطہ رکھنا ممکن نہیں ہے' انہوں نے اپنے سسرال
۔۔ ابھی میرے متعلق نہیں بتایا' اسی لئے ہر ماہ تھوڑے بہت پیسے میرے نام پر بھجوا کر وہ اپنی ذمہ
۔۔ سے بری الذمہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کاش میں پیدا ہی نہ ہوتی۔"

"نہیں' سمجھدار لوگ ایسی احمقانہ سوچ نہیں رکھتے۔"

فوراً اسے ٹوکتے ہوئے انہوں نے گاڑی اپنے گھر کے سرخ گیٹ کے عین سامنے روک دی تھی۔

"آیئے مس انوشہ' ایک ایک کپ چائے پی کر پھر آپ کے گھر چلتے ہیں۔"

اپنی سیٹ چھوڑ کر وہ اب اس کی سائیڈ کا دروازہ کھولے اس سے کہہ رہے تھے۔ جواباً وہ دوپٹہ
سنبھالتے ہوئے ان کی ہمراہی میں فوراً ہی گاڑی سے باہر نکل آئی۔

اگلے بیس پچیس منٹ تک وہ ان کی ماں جی کے پاس بیٹھی ان کا حال احوال دریافت کرتے
ہوئے ان سے سرزمان کی شخصیت اور ان کی فرمانبرداری کے قصے سنتی رہی تھی۔ ملازمہ چھٹی پر تھی' لہٰذا
۔۔ اس کے لئے چائے بھی وہ خود ہی بنا کر لائے تھے۔ انوشہ کا بڑا ہی چاہتا تھا کہ وہ ان کے
تمام کام خود اپنے ہاتھوں سے سرانجام دے' ان کا کمرہ صاف کرے' ان کے لئے اپنے ہاتھوں سے
کھانا بنائے' ان کی مما کی خوب خدمت کر کے ان کے دل میں اپنا مقام مزید بلند کرے' مگر...... کچھ
خواب صرف آنکھوں میں بسانے کے لئے ہوتے ہیں' تعبیر پانے کے لئے نہیں۔

سرزمان کی ذات سے وابستہ اس کا ہر خواب بھی تاعمر بے تعبیر ہی رہا تھا۔

❋❋❋

سست روی سے چلتا تانگہ بالآخر پرانی حویلی کے سامنے آرکا تھا۔

ازلہ نے دیکھا اردگرد کے تمام مناظر بدل چکے تھے۔

وہ کچے گھر' کشادہ گلیاں' ہرے بھرے پیڑ' اب کچھ بھی تو دکھائی نہیں دے رہا تھا وہاں پر۔ تانگے
کے پچھلے حصے سے اپنا بیگ گھسیٹ کر کندھے پر لٹکاتے ہوئے اس نے پرس سے کوچوان کا مطلوبہ
کرایہ نکالا اور اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

آسمان پر بادل گھر گھر کر آرہے تھے۔

دور کہیں پن چکی کے چلنے کی مدھم آواز اسے سرور بخش رہی تھی۔ پل کے پل میں اردگرد کے
گھروں سے کئی ننگ دھڑنگ بچے نکل کر اس کے قریب جمع ہو چکے تھے۔

حقیقی شعور اور زندگی کی آسائشات سے قطعی بے خبر وہ بچے اتنے ہی پیارے تھے کہ وہ باہوں میں بھر کر ان پر اپنا پیار لٹاتی' مگر اس وقت وہ ان سے مانوس نہیں تھی' لہٰذا ایک مسکراتی نظر ان سب پر ڈالنے کے بعد وہ ابھی حویلی کے گیٹ کی طرف قدم بڑھا ہی رہی تھی کہ ایک تیز رفتار جیپ دھول اڑاتے ہوئے مین اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

انزلہ نے بے حد حیرانی کے ساتھ جیپ میں بیٹھے شخص پر تفصیلی نگاہ ڈالی تھی۔

❁❁❁

سرزمان سے بدتمیزی کے بعد پورے ایک ہفتے تک اس نے یونیورسٹی کا منہ نہیں دیکھا تھا۔

انوشہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی' اسے اپنی وجہ سے کسی کو بھی اذیت میں مبتلا رکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا مگر...... پورے ایک ہفتے تک وہ نہیں آیا تھا۔

ادھر سرزمان کی نوازشات اس پر بڑھتی جا رہی تھیں۔

اس روز یونیورسٹی میں اس کا آخری دن تھا۔ فائنل ایئر کے تمام طالب علم فارغ کیے جا رہے تھے۔ الوداعی پارٹی میں سرزمان نے اپنے تمام طلبہ سے لازمی شرکت کی درخواست کی تھی۔ انوشہ کو یقین تھا کہ شاہ زر آج ضرور آئے گا۔

بلیک کریپ کے نفیس سوٹ میں ہلکے پھلکے میک اپ کے باوجود وہ سیدھی دل میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ صباء اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ اکثر طلبہ اس موقع پر ایک دوسرے سے بچھڑنے کے دکھ سے رنجیدہ بھی تھے۔

اسے چونکہ اسلام آباد کے لے روانہ ہونا تھا لہٰذا بڑی مشکل سے وہ یہ تقریب اٹینڈ کر پائی تھی۔

سرزمان بھی بلیک شلوار سوٹ میں ملبوس نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ان سے آٹوگراف لینے آئی تو انہوں نے اسے اپنے پاس ہی روک لیا۔

''مس انوشہ اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ پوری کلاس میں میری سب سے زیادہ فیورٹ طالبہ ہیں اور اسی بناء پر میں ہمیشہ کے لئے آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں تو کیا آپ میری حوصلہ افزائی کریں گی؟''

بناء کسی تمہید کے نہایت مناسب الفاظ میں انہوں نے اپنا مدعا بیان کر دیا تھا۔ جواب میں وہ دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ ازحد چونک کر حیرانی سے ان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

ان کے خوبصورت کلین شیو چہرے پر بکھرا اطمینان اور آنکھوں میں رقص کرتی روشنی اسے ان کے دل کے بہت سے چھپے رازوں کا پتہ دے رہی تھی۔

شاید تبھی وہ کنفیوز ہوئی تھی۔

''سر...... مم...... میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی۔ آپ کے اور میرے بیچ اسٹیٹس کا فرق بہت بڑا ہے۔''

''میں ایسی فضول چیزوں کی پروا نہیں کرتا۔ مجھے صرف ایسی ہمسفر مطلوب ہے جس کا ساتھ میرے لئے فخر اور سکون کا باعث ہو' جو مجھے خالص پیار دے سکے اور ایسی ہمسفر صرف ویل آف فیملیز سے ہی مل سکتی ہے یہ ضروری نہیں۔''

رشتوں سے متعلق ان کا اپنا ہی الگ تجزیہ تھا۔

انوشہ کا سر آپ ہی آپ احترام سے جھک گیا۔

''آپ کی خاموشی مجھے خوش فہم ہونے کا موقع دے رہی ہے انوشہ!'' وہ پھر بولے تھے۔

جواب میں وہ آہستہ سے سر اٹھاتے ہوئے بولی۔

''اور آپ کی خواہش مجھے میرے خوش بخت ہونے کی نوید دے رہی ہے۔''

اس کے الفاظ پر وہ خوب دل کھول کر ہنسے تھے۔

''رئیلی......؟ تھینکس سوئٹ لٹل گرل' خدا نے چاہا تو آپ میری رفاقت میں صرف خوشیوں اور راحتوں سے ہی واسطہ رکھیں گی' آپ امتحانات سے فارغ ہو جائیں' پھر میں امی کو آپ کی آنٹی صاحبہ کے پاس بھیجتا ہوں۔ انشاء اللہ باقی کے معاملات بھی جلد ہی نمٹ جائیں گے۔ پھر آپ کی رہائش کا بھی کوئی مسئلہ نہیں رہے گا اور ایک عدد ٹیوٹر بھی دن رات کے لئے مفت میں میسر آ جائے گا۔''

اب وہ اسے چھیڑ رہے تھے۔

انوشہ نے پل کے پل نظریں اٹھا کر شکایتی انداز میں ان کی طرف دیکھا' پھر ان کے سیل پر کال آ جانے کے باعث موقع سے فائدہ اٹھاتی ہوئی وہاں سے کھسک آئی۔

وہ ابھی پلٹ کر آگے بڑھ ہی رہی تھی کہ پیچھے کھڑے شاہ زر سے بری طرح ٹکرا گئی۔ جانے وہ اب آیا تھا اور کب سے وہاں کھڑا ان کی نہایت پرائیویٹ باتیں سن رہا تھا۔

''سوری......''

وہ تو پہلے ہی کنفیوز تھی' اس نئے اتفاق پر مزید گھبرا گئی۔ تاہم اس کے ایکسکیوز پر وہ خاصی درشتگی سے بولا تھا۔

''شٹ اپ' تم جیسی لوز کریکٹر لڑکیوں کی ہر ادا بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں میں۔''

''واٹ۔''

اسے شاہ زر کی سوچ پر اچھا خاصا دھچکا لگا تھا۔

وہ جو پوری یونیورسٹی میں' اپنی قابلیت اور خوش مزاجی کے باعث ہر دل عزیز تھی' اسی لڑکی کے لئے کتنے غلط الفاظ استعمال کئے تھے اس نے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اس سے، اس کے الفاظ کی وضاحت اور وجہ دریافت کرتی' وہ اسے خاصے کروفر بھرے انداز میں اپنے راستے سے ہٹاتے ہوئے دھپ دھپ کرتا اپنے دوستوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اس روز وہ پوری الوداعی تقریب میں بے حد اپ سیٹ رہا تھا۔

انوشہ رحمٰن کے ساتھ ساتھ آج کل گھر میں اس کی مما نائلہ بیگم اور چھوٹی بہن شافیہ آفندی کے درمیان چلنے والی سرد جنگ بھی اسے بے حد ڈسٹرب کئے ہوئے تھی۔

بچپن سے ہی وہ اپنی مما کے ساتھ بے حد اٹیچ رہا تھا۔ اسے یاد تھا' جب وہ صرف سات سال کا تھا تو اس کے ڈیڈی کی وفات ہو گئی تھی۔ شافیہ اس وقت محض تین سال کی تھی' تب اس کی مما نے ان دونوں کی بہتر پرورش کے لئے بہت سی مصیبتیں اٹھائی تھیں' وہ پڑھی لکھی تھیں' مگر اس کے باوجود انہیں کسی باوقار ادارے میں بہترین ملازمت نہیں مل سکی تھی۔

بہت تگ ودو کے بعد انہیں کسی فیکٹری میں معمولی تنخواہ پر ملازمہ رکھا گیا تھا۔ صبح سات بجے سے لے کر رات 9 بجے تک وہ سلائی کرتی تھیں۔ اپنے بچوں کو خود پالنے اور اپنی خودداری کا بھرم قائم رکھنے کے لئے انہوں نے اس معمولی ملازمت کو بھی صبر وشکر کے ساتھ قبول کیا تھا۔

روزانہ صبح فجر کی اذان کے ساتھ بیدار ہونا انہوں نے اپنا معمول بنالیا تھا۔

صبح نماز کی ادائیگی اور قرآن پاک کی تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد وہ شاہ زر اور شافیہ کے لئے ناشتہ تیار کرتیں' پھر ان دونوں کو اپنے ہاتھوں سے ناشتہ کروانے کے بعد وہ انہیں اسکول وین میں بٹھا کر خود اکثر ناشتہ کئے بغیر ہی فیکٹری چلی جاتی تھیں۔ جہاں دن بھر سلائی کرنے کے بعد ان کی واپسی شام ڈھلنے کے بعد ہوتی تھی۔ شاہ زر اور شافیہ اس وقت تک اسکول میں ہی ٹیوشن لیتے تھے۔

نائلہ بیگم کی گھر واپسی کے بعد ان کا رکشہ آ جاتا تھا' تب تک تھکن سے بے حال ہونے کے باوجود وہ ان کے لئے کچھ نہ کچھ تیار کر چکی ہوتی تھیں۔

گھر چونکہ ان کا اپنا تھا' لہٰذا وہ دربدر بھٹکنے سے بچ گئی تھیں۔ بہن بھائی حسب توفیق ان کی مدد کرتے رہتے تھے مگر وہ زیادہ سے زیادہ اپنے بل بوتے پر ہی اپنے بچوں کو بہترین زندگی دینے کی خواہاں تھیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ قدرت ان پر مہربان ہوتی گئی اور ایک اچھے ادارے میں کسی کے توسط سے انہیں بہترین ملازمت مل گئی۔ یوں وقت اور حالات بہتر ہوتے گئے اور اچھی تنخواہ وکفایت شعاری کے ساتھ وہ بہت سے پیسے پس انداز بھی کرتی رہیں۔ یوں کچھ ہی سالوں کی ان تھک محنت کے بعد وہ اس قابل ہو گئیں کہ اپنا ایک چھوٹا سا پرائیویٹ اسکول کھول سکیں۔

شاہ زر اس وقت میٹرک کلیئر کر چکا تھا۔ جبکہ شافیہ مڈل کے پیپرز کی تیاری کر رہی تھی۔ نائلہ بیگم اور شافیہ دونوں سے ہی اس کی محبت مثالی تھی۔ اسے کسی صورت اپنی ماں اور بہن کی آنکھ میں آنسو آنا گوارہ نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شعور سنبھالنے کے بعد اس نے اپنی زندگی کا مقصد ہی ماں اور بہن کی خوشنودی بنالیا تھا۔

وہ نائلہ بیگم کا کوئی بھی حکم نہیں ٹالتا تھا۔ حقیقی معنوں میں وہ اپنی ماں کو اپنا آئیڈیل تسلیم کرتا تھا۔ شاید یہ نائلہ بیگم سے اس کی بے انتہا محبت اور ان کی بہترین تربیت کا ہی اثر تھا کہ وہ دوسرے عام لڑکوں کی طرح آوارہ اور بدتمیز نہیں تھا۔

زندگی اب بے حد خوبصورت تھی۔

اس کی مما نے اپنی ان تھک محنت سے نہ صرف اپنے چھوٹے سے پرائیویٹ اسکول کو ہائی سیکنڈری درجہ دلا دیا تھا' بلکہ اب اسلام آباد میں انہوں نے اپنا ایک چھوٹا سا بوتیک بھی کھول لیا تھا جو ان کی ذہانت اور محنت کی وجہ سے بہت جلد کامیاب ہو گیا تھا' گھر میں پیسے کی بھی فراوانی تھی مگر...... اس کے باوجود الجھنیں بڑھ گئی تھیں۔

قدرے حساس ہونے کی وجہ سے وہ ہر معاملے کو بہت گہرائی سے لیتا تھا۔

شافیہ جو اس سے تین سال چھوٹی تھی' شروع سے ہی زیادہ تر سائلہ بیگم کے ساتھ اٹیچ رہی تھی جو ان کی چھوٹی خالہ تھی...... وہ لوگ چونکہ پنڈی میں رہائش پذیر تھے' لہٰذا ہر ویک اینڈ پر ہی وہ اپنی مما

ہ ماموں یزدانی پیلس چلا جاتا تھا تو کبھی سائلہ بیگم اپنے بچوں کے ساتھ ان کے گھر چلی آتی تھیں۔
وہ نائلہ بیگم کے پاس زیادہ رہتی تھی۔
دونوں بہنوں میں مثالی پیار تھا۔ شاہ زر اپنی مما کے ساتھ اپنی اکلوتی آنٹی سے بھی بہت اٹیچ
تھا اپنی مما نائلہ بیگم کی معرفت اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی آنٹی سائلہ بیگم نے دو شادیاں کی تھیں'
ایک والدین کی عزت رکھنے کے لئے ان کی پسند سے اور دوسری اپنی پسند سے۔ پہلے شوہر سے ان کی
ایک بیٹی تھی جبکہ دوسرے شوہر سید کمال یزدانی صاحب سے ان کے تین بچے تھے۔ دو بیٹے
اور ایک بیٹی۔ بیٹے دونوں بڑے تھے۔ جبکہ بیٹی شافیہ کی ہم عمر تھی۔ بچپن میں ہی نائلہ بیگم کی خواہش پر
دونوں نے اپنے بچوں کے رشتے آپس میں طے کر لئے تھے۔
ان کا بڑا بیٹا ساحل یزدانی ایم بی اے کرنے کے بعد کاروبار میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔
اور چھوٹا اشان یزدانی ابھی زیر تعلیم تھا اور تعلیم کے سلسلے میں زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہتا تھا۔ شافیہ
کی بات ان کے بڑے بیٹے ساحل کے ساتھ طے تھی' جو کسی اور کو پسند کرنے کے باوجود شافیہ کو
اپنانے کے لئے تیار تھا کیونکہ شاہ زر کی طرح اس میں بھی اپنی ماں کے حکم اور ان کی خواہش کے
خلاف جانے کی ہمت نہیں تھی۔
نائلہ بیگم کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی بریرہ کا رشتہ شاہ زر سے طے تھا اور وہ اس حوالے
سے اکثر بریرہ کو کچھ نہ کچھ کہہ کر تنگ کرتا رہتا تھا۔
نائلہ بیگم کی معرفت ہی ابھی پچھلے دنوں جو بات اس کے علم میں آئی تھی' وہ اس سے بے حد اپ
سیٹ ہو کر رہ گیا تھا۔
اس کی چھوٹی بہن شافیہ جسے وہ اپنی جان سے بڑھ کر پیار کرتا تھا' انگیج ہونے کے باوجود سید
کمال صاحب کے پہلے بیٹے زاور علی حسن کے عشق میں گرفتار ہو چکی تھی۔ سائلہ بیگم کی زبانی وہ اکثر
ان کے سوتیلے دو بچوں کا تذکرہ سنتا رہتا تھا' مگر ان سے ملنے یا انہیں دیکھنے کا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا۔
ایک دوبار اس نے اپنی مما سے ان کے بارے میں پوچھا تھا تو انہوں نے بتایا تھا کہ زاور
سائلہ بیگم کا سوتیلا بیٹا تھا وہ کراچی میں اپنی خالہ کے پاس رہتا ہے' کبھی کبھار کمال صاحب کے
ساتھ یزدانی پیلس بھی چکر لگا لیتا تھا۔ جبکہ ان کی بیٹی اپنی تیسرے نمبر کی خالہ کے پاس رہتی تھی
اور اس کا پچھلے دس بارہ سالوں سے یزدانی پیلس والوں کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ اب مسئلہ یہ
تھا کہ اس کی بہن نے صاف صاف الفاظ میں کسی بھی صورت سائلہ بیگم کے بیٹے ساحل کے ساتھ
شادی کرنے سے قطعی انکار کر دیا تھا' جس کی وجہ سے نائلہ بیگم بہت زیادہ پریشان ہو کر رہ گئی تھیں۔
شاہ زر نے اپنے طور پر ہر ممکن طریقے سے شافیہ کو سمجھا کر دیکھ لیا تھا مگر اس کی ایک ہی ضد تھی۔
''شادی کروں گی تو صرف زاور سے' ورنہ کسی سے نہیں۔''
اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کی یہ ضد' نائلہ بیگم کے لئے کتنے مسئلے کھڑے کر سکتی تھی' لہٰذا اس
سے پہلے کہ بات سائلہ بیگم کی سماعتوں تک پہنچتی انہوں نے اچانک اپنی بیٹی کی فوری شادی کا فیصلہ
کر لیا۔ ادھر سائلہ بیگم خود بھی یہی چاہتی تھیں' لہٰذا چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والی مثال پر صادق آتے
ہوئے انہوں نے ساحل اور شافیہ کی شادی کے دن رکھ دیئے' جبکہ شاہ زر اور بریرہ کے نکاح کا فیصلہ

بھی کر لیا۔

شافیہ کو اپنی ماں اور بھائی کے ان ارادوں کا پتہ چلا تو اس نے خود کو کمرے میں محصور کر کے بھوک ہڑتال کر دی‘ مگر نائلہ بیگم نے پروا نہیں کی۔ صرف بیٹی کے دل کی خوشی کے لئے وہ اپنی زندگی اور رشتوں کو الٹ پلٹ کر رکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ لہٰذا ہمیشہ اپنے بچوں پر جان نچھاور کرنے والی ماں اب جیسے پتھر کی ہو کر رہ گئی۔

گھر کی موجودہ صورتِ حال کی وجہ سے شاہ زر کا ڈپریشن بڑھ کر رہ گیا تھا۔

ادھر انوشہ اپنا سامان سمیٹ کر لاکھ نہ چاہتے ہوئے بھی گزشتہ شب یزدانی پیلس پہنچ گئی تھی۔ سید کمال صاحب کی آنکھوں میں اسے لمبے عرصے کے بعد اپنے سامنے دیکھ کر آنسو بھر آئے تھے۔ لہٰذا وہ بہت دیر تک اسے اپنے پاس بٹھا کر پیار کرتے رہے تھے۔ انوشہ خود بھی ان کے گلے لگ کر بہت روئی تھی۔

ماں باپ دونوں کے ہوتے ہوئے وہ بے سہاروں سی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی۔ سائلہ بیگم کو انوشہ رحمٰن سے کمال صاحب کا پیار ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ انوشہ شکل وصورت میں ہو بہو اپنی ماں پر گئی تھی۔ لہٰذا جب بھی ان کی نگاہ اس کے چہرے کی طرف اٹھتی تھی ان کے اندر کا جلاپا تن بدن میں عجیب سی آگ لگا کر رکھ دیتا تھا۔

انہیں وہ دن یاد آنے لگتے تھے جب وہ سید کمال صاحب کی رفاقت نصیب نہ ہونے پر گھنٹوں اپنے کمرے میں بند پڑی آنسو بہاتی رہتی تھیں۔

سید کمال صاحب کا مایوں‘ مہندی اور ولیمے کا فنکشن ان کا سارا خون نچوڑ گیا تھا۔

کمال صاحب‘ زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور اعلیٰ تعلیم کی غرض سے گاؤں سے شہر آئے تھے۔ یہیں کالج میں ان کی سائلہ بیگم اور ان کے بھائی سے آشنائی ہوئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے‘ بعد ازاں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب کمال صاحب گاؤں واپس گئے تو وہاں ان کے گھر والوں نے جمال الرحمٰن صاحب کے ساتھ ساتھ ان کی شادی کے دن بھی رکھ دیئے تھے۔ اپنے طور پر انہوں نے کافی احتجاج بھی کیا تھا اور اپنی ماں کو جذباتی بلیک میل کرنے کی کوشش بھی کی تھی‘ مگر وہ اپنی ہر کوشش میں ناکام رہے اور یوں صدف بیگم ان کی ہمسفر بن کر اپنی بڑی بہن نزہت خانم کے ساتھ ان کے گھر چلی آئیں۔ سائلہ بیگم کے لئے وہ دن کسی عذاب سے کم ہرگز نہیں تھے۔ تصویروں میں ہی اپنے محبوب کے پہلو میں کسی اور عورت کو بیٹھے دیکھ کر ان کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ گو کمال صاحب کے بعد وہ خود بھی زیادہ عرصہ کنواری نہ رہ سکی تھیں‘ تاہم شادی شدہ ہو کر بھی وہ صدف بیگم کی زندگی میں زہر گھولنے سے باز نہیں آئی تھیں۔

اپنے دل کے جلتے الاؤ کو کسی طور سرد کرنے کے لئے وہ اپنے شوہر سے قطعی بے نیاز ہر روز ان کے گھر چلی آتی تھیں اور پھر صدف بیگم کو اپنی اور کمال صاحب کی محبت کے قصے خوب تفصیل سے سنایا کرتیں۔ صدف بیگم سمجھدار عورت تھیں۔

ابتداء میں کئی ماہ تک وہ سائلہ بیگم کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتی رہی تھیں‘ تاہم انوشہ کی پیدائش کے بعد بھی انہوں نے کمال صاحب کی توجہ سائلہ بیگم کی طرف مبذول

ابھی تو آہستہ آہستہ ان کے ضبط کی طنابیں ٹوٹنا شروع ہو گئیں اور انہوں نے ہر لمحہ کڑھنا شروع کر دیا۔

انوشہ کی پیدائش پر سائلہ بیگم کا غم وغصہ دیکھنے کے لائق تھا۔

وہ کمال صاحب سے الجھی تھیں۔

''یہ سب کیا ہے کامی؟ جب تمہیں اس عورت سے کوئی سروکار نہیں' تمہارے جسم اور روح پر صرف میرا حق ہے تو پھر بیٹے کے بعد یہ بیٹی کیوں آئی دنیا میں......؟''

بلند آواز میں چنگھاڑتے ہوئے کمال صاحب کے گھر میں انہوں نے یہ الفاظ کہے تھے جس پر کمال صاحب سٹپٹائے تھے جبکہ صدف بیگم انگشت بدنداں رہ گئی تھیں۔

وہ اندر اپنے کمرے میں بیٹے کو سلانے کے بعد بیٹی کو فیڈ کروا رہی تھیں جبکہ کمال صاحب اور سائلہ بیگم باہر لاؤنج میں بیٹھے تھے۔

کمال صاحب نے سائلہ بیگم کا غصہ کم کرنے کے لئے قدرے منمناتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''خدا کا واسطہ ہے سائلہ' آہستہ بولو' صدف سن لے گی۔''

''سنتی ہے تو سن لے' میں کسی کا لے کر نہیں کھاتی جو کسی کا ڈر ہو مجھے۔ ہاں اتنا ضرور پتہ چل گیا کہ تم ایک جھوٹے فریبی شخص ہو' مجھ سے تمہاری محبت سوائے بکواس کے اور کچھ بھی نہیں' خبردار جو آج کے بعد مجھ سے بھی بات کرنے کی کوشش کی تو۔''

غصے سے تن فن کرتیں وہ کمال صاحب کے لاکھ روکنے کے باوجود وہاں نہیں ٹھہری تھیں اور پھر یوں ہوا کہ جہاں سائلہ بیگم کی کمال صاحب سے ناراضگی ہوئی، وہیں صدف بیگم اور انوشہ رحمٰن بھی ان کی توجہ سے یکسر محروم ہو کر رہ گئیں۔

کمال صاحب اپنی محبت کو راضی کرنے کے لئے ان دونوں کی ذمہ داری سے یکسر غافل ہو گئے تھے۔

❁❁❁

باتوں باتوں میں بچھڑنے کا اشارہ کر کے
خود بھی رویا وہ بہت ہم سے کنارہ کر کے
جگمگا دی ہیں تیرے شہر کی گلیاں ہم نے
اپنے ہر اشک کو پلکوں پہ ستارہ کر کے
دیکھ لیتے ہیں چلو حوصلہ اپنے دل کا
اور کچھ روز بناء تیرے گزارہ کر کے

ایس پی شجاع حسن کے شاندار بنگلے میں اس کی جاب کا وہ پہلا دن تھا۔

سنڈے کی چھٹی کے باعث وہ خود بھی گھر پر تھے۔

امامہ نہایت پراعتماد لڑکی تھی' مگر اس کے باوجود شجاع حسن کے سامنے آتے ہی اس کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔

اسے ارسلان کی ضد اور اپنے دل کی بے بسی پر غصہ بھی آتا تھا' مگر اس کے باوجود وہ اس

معاملے میں خود کو قطعی مجبور تصور کر رہی تھی۔

ابھی تک اس نے شجاع حسن کی بیٹی کا دیدار بھی نہیں کیا تھا۔

دل کے اندر یہ خوف بھی برابر سر اٹھا رہا تھا کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی تو کیا ہوگا؟

اگر شجاع حسن نے عین موقع واردات پر اسے پکڑ لیا' تو کیا ہوگا؟

کیا واقعی وہ اس کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو سکے گی؟ اسے تو چھوٹے بچوں کو سنبھالنے کا ایک فیصد بھی تجربہ نہیں تھا' کیا وہ اس کی بیٹی کو بہتر طریقے سے سنبھالنے کے فرائض سرانجام دے کر اسے مطمئن کر پائے گی؟

ایسے کتنے ہی سوال پچھلے کئی گھنٹوں سے اس کے ذہن میں ہلچل مچا رہے تھے' مگر وہ سب کچھ اللہ رب العزت پر چھوڑے خود کو مضبوط کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔

لائٹ براؤن کلر کے سادہ سے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس' وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی خود کو تسلی دے رہی تھی' جب ایس پی شجاع اس کی آمد سے باخبر ہو کر' اپنی چھوٹی سی چار سالہ بیٹی کو بازوؤں میں اٹھائے' وہیں لاؤنج میں اس کے مقابل آ بیٹھے۔

''السلام علیکم۔''

انہیں دیکھتے ہی امامہ نے پھر سے سلام جھاڑا تھا' جس کا جواب انہوں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دیا تھا۔

''یہ میری بیٹی ہے' عیشاء' تھوڑا چڑچڑا مزاج رکھتی ہے' پہلے پہل تنگ کرے گی' مگر آہستہ آہستہ آپ پیار اور توجہ دیں گی تو مانوس ہوتی جائے گی۔ آپ صرف اسی کا خیال رکھیں گی' بدلے میں تینوں وقت کا کھانا' رہائش اور معقول تنخواہ آپ کو ملے گی۔ یاد رہے یہاں اس گھر میں' میرے ابو جی بھی میرے ساتھ رہتے ہیں' وہ تنہائی پسند انسان ہیں' شور شرابہ پسند نہیں کرتے' لہٰذا خیال رکھئے گا کہ پانچ منٹ کے لئے بھی گڑیا کو رونے کا موقع نہ دیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوا تو ابو جی آپ کو خوب ڈانٹنے سے ہرگز پرہیز نہیں کریں گے۔''

ایک تو اس بندے کی شکل ضرورت سے زیادہ سنجیدہ تھی اوپر سے لہجہ اتنا سرد تھا جیسے برف۔

امامہ کو تو اپنی جان سخت مشکل کے عالم میں پھنسی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

اور وہ کہہ رہا تھا۔

''میں اصول پسند ایمان دار آدمی ہوں' جھوٹ اور بے ایمانی برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ پر ملازمت کے سلسلے میں کوئی جبر نہیں ہوگا' جب تک دل چاہے کیجئے گا' اکتا جائیں تو چھوڑ کر چلی جایئے گا۔ یہاں بھی آپ کو پوری آزادی حاصل ہوگی' اپنے اور گڑیا کے لئے جو چیز چاہیں ملازم سے کہہ کر منگوا سکتی ہیں' صفائی کے لئے ایک ملازمہ بھی آتی ہے' کھانا پکانے کے لئے باورچی بھی ہے' باہر کے کاموں کے لئے چوکیدار کے علاوہ ایک نوعمر لڑکا رکھا ہوا ہے' وہ آج کل چھٹی پر ہے' دو چار روز تک آ جائے گا۔ آئی ہوپ آپ کو یہاں کسی قسم کی کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔''

پہلی بار وہ اسے مسلسل بولتے ہوئے سن رہی تھی۔

امامہ کو اعتراف کرنا پڑا تھا۔ وہ سحر انگیز شخصیت کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خوبصورت لہجہ بھی رکھتا تھا۔

مگر پھر بھی اس کے ہاتھ سرد پڑ رہے تھے۔

''آئی تھنک آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے' ابھی مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں باہر جانا ہے' آپ گڑیا کو سنبھالیں۔''

امامہ اس کے سامنے نظر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔

دل ہی دل میں وہ ارسلان حیدر کو گالیوں سے بھی نواز رہی تھی۔

ایس پی شجاع حسن اپنی بیٹی کو اس کی تحویل میں دینے کے بعد اپنے بیڈروم میں گیا اور کچھ ہی دیر بعد تیار ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔

جاتے ہوئے اس نے چوکیدار سے کچھ دیر بات بھی کی تھی۔

اس کے گھر سے نکلتے ہی امامہ نے سکون کی سانس بھرتے ہوئے فوراً اپنا پرسنل سیل نکالا اور ارسلان حیدر کا موبائل نمبر پریس کر ڈالا۔

''ہاں بولو مون' کیا بات ہے؟''

وہ شاید کہیں روڈ پر تھا' گاڑیوں کے بہت زیادہ شور کی آواز آ رہی تھی۔ امامہ کا غصہ ایکدم سے ابل پڑا۔

''ارسلان! میں یہ جاب نہیں کر سکتی' وہ ایس پی بہت ٹیڑھا بندہ ہے۔ اوپر سے اس کی بیٹی مجھ سے سنبھل نہیں پا رہی ہے پھر بوڑھے باپ کا رعب بھی ڈال گیا ہے مجھ پر۔ آئی ایم سوری' میں یہاں نہیں رہ سکتی۔''

وہ سخت پریشان بھی تھی' اس شاندار گھر میں اپنی قید کا احساس اس کا دل جکڑ رہا تھا مگر ارسلان اس کی حالت سے یکسر بے خبر' اپنی ہی غرض رکھتے ہوئے تیز لہجے میں بولا تھا۔

''پاگل مت بنو مون! کچھ نہیں ہوتا تمہیں وہاں' میں مما سے بات کر کے' تمہارے گاؤں جانے کا کہہ چکا ہوں۔ چند دن وہاں رہ کر تھوڑی کوشش کر لو' تو کچھ بگڑ نہیں جائے گا تمہارا اور پھر میں ہوں نا' تم جس وقت چاہو مجھ سے بات کر سکتی ہو۔''

''مگر ارسلان میں......''

اس کے غصے اور خفگی سے خائف ہو کر اس نے کچھ کہنا چاہا تھا' مگر وہ درمیان میں ہی اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''یہاں شور بہت زیادہ ہے' مجھے تمہاری آواز صاف سنائی نہیں دے رہی' کہیں رک کر بات کرتا ہوں تم سے۔''

کہنے کے ساتھ ہی اس نے کال کاٹ دی تو امامہ بے چارگی سے اپنے موبائل کو دیکھ کر رہ گئی۔

شجاع حسن کی بچی' اپنے باپ کو قریب نہ پا کر اس کی اجنبی گود میں رونا شروع کر چکی تھی' لہٰذا موبائل پھر سے اپنے پرس میں ڈال کر وہ ہر ممکن کوشش سے بچی کو چپ کرانے میں مصروف ہو گئی۔

❋❋❋

انزلہ شاہ حویلی کے گیٹ کے قریب کھڑی جیپ میں بیٹھے شخص سے ابھی کچھ پوچھ بھی نہ پائی تھی کہ وہ زن سے آگے بڑھ گیا۔ تب وہ بھی بے پروائی سے سر جھٹکتی آگے بڑھ آئی۔

اندر حویلی کے وسیع برآمدے میں دادی اماں اپنے تخت پر بیٹھی' رنگ برنگ کبوتروں کو دانہ ڈال رہی تھیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی' حویلی کا بھاری گیٹ پار کرتی ہوئی اندر چلی آئی۔ کبوتروں کو دانہ ڈالتی دادی ماں کی نگاہ جونہی اس کی طرف اٹھی ان کا ہاتھ رک گیا۔

''دادی ماں......''

بیگ وہیں کشادہ صحن میں پھینک کر وہ بھاگتی ہوئی ان کی طرف لپکی تھی اور ان سے لپٹ کر بچوں کی طرح رو پڑی تھی۔

دادی ماں کے لئے ایک لمبے عرصے کے بعد اس کی یوں آمد کسی اچنبھے سے کم نہیں تھی' تبھی وہ اسے خود میں سموتے ہوئے قدرے بے یقینی سے بولیں۔

''دادی یاد آ گئی تجھے......؟''

''آپ بھولی ہی کب تھیں دادی ماں! پچھلے چند سال آپ سے دور رہ کر جیسے میں نے بسر کئے ہیں صرف میں ہی جانتی ہوں۔''

وہ اب بھی رو رہی تھی' جواب میں دادی ماں کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''اچھا چپ کر اور یہ بتا کس کے ساتھ آئی ہے؟''

اپنے دانیال کی واحد نشانی کو پھر سے قریب پا کر ان کے لئے بھی خود کو سنبھالنا آسان نہیں رہا تھا۔

ان کے ہاتھ بھی کپکپا رہے تھے' انزلہ تخت پر اپنی بانہیں ان کے گلے میں ڈال کر بیٹھ گئی۔

''اکیلی آئی ہوں دادی ماں! ساتھ کون آتا' کسی کے پاس اتنا ٹائم ہی نہیں ہے' اور پھر میں کون سا کسی سے ڈرتی ہوں۔''

''تیرا باپ بھی نہیں ڈرتا تھا کسی سے' مگر وہ مرد تھا بیٹے اور تو عورت ہے' مردوں کے اس معاشرے میں عورت چاہے کتنی ہی مضبوط اور حوصلہ مند کیوں نہ ہو' وہ اکیلی کچھ نہیں کر سکتی۔''

ان کی نرم انگلیاں انزلہ کا سر سہلا رہی تھیں' تبھی وہ ٹھٹکی تھی۔

''میں عورت نہیں ہوں دادی ماں! لڑکی ہوں لڑکی اور آپ دیکھنا جیسے میرے بابا نے شیر بن کر زندگی بسر کی تھی میں بھی ویسے ہی زندہ رہوں گی' آپ میری فکر نہ کریں۔ بس مجھے یہ بتائیں کہ آپ شہر کیوں نہیں آئیں' داداجی کے بعد یہاں تنہا کیسے رہ رہی ہیں۔''

''تنہا کہاں ہوں بچی! پورا گاؤں میرے ساتھ ہے' ایک بچی سپارہ پڑھنے آتی ہے' اور گھر کا سارا کام نپٹا جاتی ہے' ایک بچہ تیرے داداجی کی زمین پر ہل چلاتا ہے اور فصل کا آدھا ایمانداری سے میرے سپرد کر جاتا ہے۔ میں اکیلی جان کہاں یہ سب لے کر جاؤں گی؟ بس دن رات یہاں بیٹھی تیرا ہی انتظار کرتی رہتی تھی' کب تو بڑی ہو اور کب اپنی دادی ماں سے ملنے آئے۔''

وہ جیسے ابھی تک اس کی آمد پر بے یقین تھیں۔

انزلہ نے اس لمحے ان کے ہاتھ تھام کر چومے تھے۔

''میری سونی دادی ماں' اب میں ہمیشہ کے لئے یہاں رہنے آ گئی ہوں' آپ دیکھئے گا اب لی یہ بیٹی کیسے بیٹا بن کر آپ کی خدمت کرتی ہے۔''

اس سے دل کی خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی' اگلے کچھ ہی لمحوں میں تقریباً سارے گاؤں سے دادی ماں کی ملنے والی خواتین اسے دیکھنے حویلی آ رہی تھیں اور دادی ماں بڑے فخریہ انداز میں فرداً ... کو بتا رہی تھیں۔

''میری پوتی ہے انزلہ' لندن سے آئی ہے ڈگریاں لے کر' اب یہیں رہے گی' اس گاؤں میں۔''

... دیکھا ان کے چہرے پر اس لمحے اتنے خوبصورت رنگ بکھر رہے تھے کہ وہ زیادہ دیر نگاہ جما ... کے چہرے کی طرف دیکھ بھی نہ پائی تھی۔

اگلے چار پانچ روز تک یہی سلسلہ جاری رہا تھا۔ گاؤں کی سیدھی سادھی خواتین یوں آ کر روز ملتی تھیں جیسے وہ کوہ قاف سے آئی ہو۔ اس روز اچانک اسے یاد آیا تھا کہ اس کے یونیورسٹی ... ان شاہ کا تعلق بھی اسی گاؤں سے تھا۔ لہٰذا وہ دادی ماں سے اس کے متعلق پوچھ بیٹھی۔

''دادی ماں' یہاں کسی عبداللہ صاحب کا گھر ہے' جن کا بیٹا میران اعلیٰ تعلیم کے لئے شہر گیا تھا۔''

''ہاں۔''

قطعی غیر متوقع طور پر دادی ماں نے فوراً مثبت جواب دیا تھا۔ تبھی وہ پر جوش ہوئی تھی۔

''کہاں ہے......؟''

''یہیں قریب ہے' تو کیوں پوچھ رہی ہے......؟''

''بس ویسے ہی' مجھے وہاں جانا ہے' چلی جاؤں؟''

''ہاں چلی جا' لیکن جلدی واپس آ جانا۔''

دادی ماں جانے کس رو میں بیٹھی تھیں' اسے فوراً اجازت دے ڈالی۔

پچھلے سات آٹھ دنوں میں آج پہلی بار وہ حویلی سے باہر نکل کر آئی تھی' دادی ماں نے اسے ... ان شاہ کے گھر کے متعلق بتا دیا تھا' تبھی وہ خاصے پر اعتماد انداز میں قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی ... اچانک سامنے کا منظر دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

... اس سے کچھ ہی فاصلے پر پنگھٹ کے قریب کھڑی ایک خوبصورت دوشیزہ کا بازو اس وقت اسی ... شخص کی گرفت میں تھا' جسے اپنی گاؤں آمد پر حویلی کے گیٹ کے قریب اس نے جیپ میں ... دیکھا تھا۔

... بڑی بڑی خونخوار مونچھوں اور گھنی داڑھی کے ساتھ اس شخص کا حلیہ بھی اتنا ارف تھا کہ وہ اسے ... پہلے کے باوجود بھی پہچان نہیں پائی تھی۔

اس کی نگاہ کے سامنے کھڑی لڑکی بری طرح گھبراتے ہوئے اپنا ہاتھ اس غنڈے ٹائپ شخص ... سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی' تب وہ برداشت کا مادہ نہ رکھتے ہوئے چلا اٹھی۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں......؟''

اس کی بلند پکار پر جہاں لڑکی نے ہراساں ہو کر اس کی طرف دیکھا تھا وہیں سنی دادا نے بھی ... میران ہو کر گردن موڑی تھی۔

"اس لڑکی کا ہاتھ چھوڑو۔"

وہ ازحد جذباتی ہو رہی تھی' جب کہ سنی دادا کنویں سے پانی بھرنے والی لڑکی کا ہاتھ چھوڑ کر اس کی طرف بڑھ آیا۔

"لو چھوڑ دیا' اب......؟"

"اب جاؤ جہنم میں۔"

اپنے مقابل کھڑے شخص کی موٹی موٹی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بے خوفی سے بولی تھی' جب کہ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"اتنا غصہ کس لئے انزلہ شاہ......؟"

"تم میرا نام کیسے جانتے ہو......؟"

اب کے اس کی آنکھیں حیرانی سے پھیلی تھیں......تب وہ بولا تھا۔

"کل بتاؤں گا' ویسے سنی دادا کے گاؤں میں تشریف آوری پر شکریہ۔"

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ جیپ میں بیٹھ کر پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا جبکہ انزلہ ہکابکا سی وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

❋❋❋

کمال صاحب اور صدف بیگم کے ہاں انوشہ رحمٰن کی پیدائش کے بعد' شاید کمال صاحب سے اپنی جلن کا حساب بے باک کرنے کے لئے انہوں نے بھی ایک عدد بیٹی کو جنم دے دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود کمال صاحب نے قطعی برا نہ مانتے ہوئے انہیں راضی کرنے کی کوششیں جاری رکھی تھیں۔

صدف بیگم کے لئے یہ سب برداشت کرنا ممکن نہیں تھا' لہٰذا جب ان کی برداشت حد سے تجاوز کر گئی تو انہوں نے کمال صاحب سے ڈائیورس لے لی۔ کمال صاحب اپنی محبت اور دل کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتے تو شاید کسی صورت اپنی اتنی اچھی بیوی کو دکھ نہ پہنچاتے۔

اب بھی وہ انہیں اپنی زندگی سے بے دخل نہیں کرنا چاہتے تھے' تاہم صدف بیگم کی ضد پر قطعی مجبور ہوتے ہوئے انہیں یہ ناپسندیدہ قدم اٹھانا پڑا تھا اور یوں صدف بیگم سے ان کا تعلق ختم ہو گیا۔

سائلہ بیگم کے لئے یہ خبر نوید زیست سے کسی طور کم نہیں تھی' لہٰذا جیسے ہی صدف بیگم، کمال صاحب کی زندگی سے رخصت ہوئیں انہوں نے سیدھے سادے شریف شوہر کا ناک میں دم کر کے ان سے طلاق لے لی اور عدت پوری کرتے ہی کمال صاحب سے بیاہ رچا لیا۔

دونوں کے عزیز و اقارب ہی دونوں کی محبت کے سامنے قطعی بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔

سائلہ بیگم جہاں کمال صاحب کو پا کر بے حد مسرور تھیں' وہیں اپنی چھوٹی سی بیٹی کو کھو دینے کا ملال بھی انہیں رات میں سکون سے سونے نہیں دیتا تھا۔ اکثر تنہائی میں وہ اپنی چھوٹی سی گڑیا کو یاد کر کے رو پڑتی تھیں۔

کمال صاحب انہیں خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے مگر وہ چاہنے کے باوجود شادی کے ابتدائی ایک دو سالوں میں خود کو سنبھال نہیں سکی تھیں۔

بعدازاں قدرت نے انہیں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی صورت میں اولاد کی دولت سے مالا مال

ماما ان کا ملال کم پڑ گیا اور وہ مکمل طور پر اپنی نئی جنت میں مگن ہو گئیں۔ کمال صاحب چونکہ ان سے ... پیار بھی کرتے تھے اور پھر انکے ملول رہنے کی وجہ سے انہیں کچھ بھی کہنے سے گریز بھی کرتے ... شادی کے ابتدائی دنوں سے ہی وہ ان کے سر چڑھتی گئی تھیں۔

... بیٹوں کو جنم دینے کے بعد تو ان کا مزاج ویسے ہی آسمان سے جا لگا تھا' ابھی دو سال قبل وہ حج ... سے سبکدوش ہوئی تھیں اور اب صرف سوتیلے بیٹے کی ضد میں وہ جلد از جلد اپنے سگے بیٹے ... کرنا چاہ رہی تھیں' اسی مقصد کے لئے انہوں نے شاہ زر کو بھی دو چار روز کے لئے اسلام ... تھا' تاکہ زاور علی حسن کے خلاف اس کے کان بھر کر وہ اس شادی میں پڑنے والی کسی بھی ... کا خاتمہ کر سکیں۔

اس وقت بھی وہ اسی کے ساتھ باتوں میں مشغول تھیں' جب انوشہ نے اپنے باپ کے حکم پر ... تھا۔

''مما! آپ کو پاپا بلا رہے ہیں' پلیز ابھی آ کر بات سن لیں۔''

... جب سے آئی تھی اس نے بنا کہے ہی پورا گھر سنبھال لیا تھا' تاہم اس کی پکار پر سائلہ بیگم کے ... ان کے مقابل کھڑے شاہ زر نے جونہی پلٹ کر اس کی طرف دیکھا وہ اپنی جگہ حیران کھڑا رہ گیا۔

انوشہ کی نگاہ بھی اس پر پڑ چکی تھی۔

اس کی آنکھوں میں بھی ویسی ہی حیرانگی لپکی تھی' جیسی شاہ زر کی آنکھوں میں تھی' تاہم اس کے ... سے نظر انداز کر کے واپس پلٹ گئی تھی۔

شاہ زر کو سائلہ بیگم کی معرفت جیسے ہی یہ پتہ چلا کہ انوشہ رحمٰن ہی ان کی سوتیلی بیٹی ہے' اس کے ... سی سرخوشی نے انگڑائی لی تھی۔ سر زمان کے ہاتھوں ہونے والی اپنی انسلٹ وہ ابھی تک ... نہیں کر پایا تھا۔

''ہاہ ... اب آئے گا اصل مزہ۔''

... لڑے کھڑے بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔

اگلے دس بارہ گھنٹوں میں اسے نہ صرف یزدانی پیلس میں انوشہ کی حیثیت کا اندازہ ہو گیا بلکہ وہ ... بیگم کی اس سے بے تحاشا نفرت سے بھی آگاہ ہو گیا تھا۔ تبھی اس سے اپنی جلن کا حساب بے ... کے لئے بے مقصد اسے پریشان کرنے لگا۔

اس وقت بھی انوشہ کچن میں گھسی' اپنے قیمتی کپڑوں کی پروا کئے بغیر سائلہ بیگم کے اسپیشل ... کے لئے چائے بنا رہی تھی' جب وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر وہیں کچن میں گھس آیا۔

''ایک کپ چائے میرے لئے بھی بنا دینا' سر بہت درد کر رہا ہے۔''

... مانہ انداز میں کہہ کر وہ پلٹنے لگا تو انوشہ نے صاف جواب دے دیا۔

''میں چائے بنا چکی ہوں' اسی میں سے آپ بھی پی لیجئے گا' الگ سے بنانے کی ہمت نہیں ہے ...''

''... آپ' میں نے بکواس کرنے کے لئے نہیں کہا' اس گھر میں تمہاری جو اہمیت اور مقام ہے ... سمجھیں؟' میں یہ چائے اندر دے کر آتا ہوں' تب تک میرے لئے ایک کپ چائے الگ

سے تیار کرو، کم میٹھے اور تیز پتی کے ساتھ۔"

زبردستی چائے کی ٹرے اس کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے وہ بارعب لہجے میں بولا تو انوشہ کا دماغ بھی سلگ اٹھا۔

"کیوں، میں تمہاری نوکر ہوں کیا......؟ اور یہ رعب کس خوشی میں جما رہے ہو مجھ پر......؟"

شاہ زر کو اس کا دوبدو انداز خاصا برا لگا تھا، تبھی وہ چائے کی ٹرے رکھ کر اس کا بازو دبوچتے ہوئے بولا۔

"ہاں، خود کو اس گھر کی ملازمہ ہی سمجھو تم۔ مت بھولو کہ میری آنٹی تمہاری اسٹیپ مدر ہیں اور تم سے بے حد نفرت کرتی ہیں۔ اگر میں نے ان سے تمہاری شکایت کردی تو خود ہی سوچ لو، اس گھر میں تمہارا ایک گھنٹے کے لئے بھی ٹھہرنا محال ہوجائے گا۔"

وہ اس کے ویک پوائنٹ سے آگاہ تھا۔

انوشہ دکھ اور اہانت کے احساس سے کٹ کر رہ گئی۔ بہت کچھ کہنے کی خواہش کے باوجود اس نے اپنے لبوں پر خاموشی کا قفل ڈال لیا تھا۔ کیونکہ سامنے کھڑا وہ شخص جو کچھ بھی اس سے کہہ رہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ چائے کی ٹرے لے کر کچن سے باہر نکل گیا تو انوشہ آنسو پیتے ہوئے اس کے لئے پھر سے چائے کا پانی رکھنے لگی۔

❋❋❋

ہماری روح پہ جب بھی عذاب اُتریں گے
تمہاری یاد کو اس دل کی ڈھال ہونا ہے

امامہ حسن کو شجاع حسن کی بیٹی کی گورنس کے فرائض سرانجام دیتے پورا ایک ہفتہ ہوگیا تھا، مگر اس ایک ہفتے میں نہ تو وہ اس کی بیٹی کو خود سے مانوس کرپائی تھی، نہ ہی اپنی مطلوبہ فائل تک اس کی رسائی ممکن ہوسکی تھی۔

پورے بنگلے میں، نچلے پورشن میں کل چھ کمرے، ایک کچن، ایک ڈرائنگ روم اور کشادہ لاؤنج تھا۔ تین کمرے شجاع حسن نے اپنی تحویل میں لے رکھے تھے۔ ایک بیڈروم، دوسرا اسٹڈی روم اور تیسرا کمرہ ہمیشہ لاک ہی رہتا تھا، صبح آفس جانے سے کچھ دیر قبل وہ اس کمرے میں گھس کر چند منٹ صرف کیا کرتا تھا۔

امامہ تھوڑی لیٹ اٹھتی تھی، کیونکہ رات میں شجاع کی بیٹی اسے خوب تنگ کرتی تھی۔ رونے میں وہ ماسٹر تھی۔ ادھر مرضی کے خلاف کوئی کام ہوا نہیں اور ادھر ننھی پری نے رو رو کر گھر سر پر اٹھایا نہیں۔ پچھلے ایک ہفتے میں وہ اچھی طرح بے بس ہوگئی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس ننھی سی کو ہمیشہ کے لئے چپ کروا دیتی۔ کبھی وہ زیادہ غصے میں آتی تو کمرہ بند کرکے اس کی خوب پٹائی کردیا کرتی تھی۔ بچی رو رو کر ہلکان ہوجاتی، مگر وہ قطعی سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ا روم کے واش روم میں بند کرکے مزے سے میگزین پڑھتی یا ارسلان کو کال کرلیتی۔ بچی ایک آ گھنٹے میں رو رو کر تھک جاتی، تو خود ہی چپ ہوجاتی۔

اکثر روتے روتے سو بھی جاتی تھی' اور تب وہ بڑے آرام سے اسے اٹھا کر بیڈ پر لٹا دیتی اور خود مزے کرتی۔

اس گھر میں واقعی اسے ہر قسم کا عیش تھا۔ جو دل چاہتا کھاتی' جیسے دل چاہتا کرتی' کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ پھر بھی ارسلان حیدر سے دوری' اس کی جان پر بنا رہی تھی۔ پچھلے پورے ایک ہفتے میں وہ صرف دو بار اس سے ملنے' اس کے آفس آئی تھی' گھر آنے پر بھی پابندی لگادی تھی اس نے اور اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی' حالانکہ وہ دن میں متعدد بار خود کال کر کے اس سے بات کرتی تھی' رات میں سونے سے قبل ارسلان خود اس سے بات کرتا اور گھنٹوں بات ہوتی رہتی' مگر اس کے باوجود وہ اس کے لئے بے قرار تھی۔

اس روز بھی ارسلان سے اس کا جھگڑا ہوا تھا' لہٰذا سارا غصہ معصوم بچی پر نکال کر بھی اس کا دماغ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ شجاع اس روز ناشتہ کئے بغیر ہی آفس چلا گیا تھا۔ جبکہ اس کے والد صاحب سے ابھی اب تک اس کی شناسائی نہیں ہوئی تھی۔ سو بڑے مزے سے وہ بچی کو تنہا کمرے میں بھوکا چھوڑ کر' ٹی وی سے دل بہلاتی رہی۔

دوپہر کے قریب کہیں جا کر خوف خدا آیا تو بچی کو سنبھالا' جو رو رو کر نیچے زمین پر ہی سوگئی تھی' امامہ کو اس پر بھی غصہ آیا تھا' لہٰذا اسے زبردستی کچی نیند سے اٹھا کر نہلایا اور کپڑے بدلوانے کے بعد اسے بیڈ پر چھوڑ کر' اس کا فیڈر بنانے کچن میں چلی آئی۔ فیڈر بنانے کے دوران بھی اس کے ذہن میں صرف ارسلان کی باتیں ہی گردش کر رہی تھیں۔

ان کے خیالوں اور یادوں میں ڈوبی وہ دودھ میں چینی ملا رہی تھی جب شجاع حسن اپنی بیٹی کو بانہوں میں لئے کچن کے دروازے پر آ کر دہاڑا۔

''مس امامہ......''

''جی......جی سر۔''

ایک لمحے میں سارے خیال چھن سے ٹوٹے تھے اور وہ گھبرا کر اس کی دہاڑ پر فوراً پیچھے پلٹی تھی۔

''آپ کو یہ جاب کرنی ہے کہ نہیں۔''

ماتھے پر پڑی تیوریاں اور آنکھوں سے نکلتے غصے کے شعلے اس کا نازک دل سہانے کو کافی تھے۔ ابھی اس نے ہمت کا دامن پکڑتے ہوئے قدرے کمزور لہجے میں پوچھا تھا۔

''ہوا کیا ہے سر......؟''

بچی پھر بلک بلک کر رو رہی تھی اور اس کے یوں رونے پر امامہ کے غصے کا گراف دل ہی دل میں مزید بڑھ گیا تھا۔

''غفلت کی بھی حد ہوتی ہے' بچی بیڈ سے گر کر زمین پر پڑی کب سے رو رہی ہے اور آپ کو خیال نہیں' ہو بھی کیسے سکتی ہے جب سگی ماں کو خیال نہیں تو کسی اور کو کیوں ہو......؟''

امامہ نے پہلی بار اسے شدید غصے میں دیکھا تھا۔

پہلے ایک ہفتے میں اپنی بیٹی سے محبت اور اس کی پروا کا یہ پہلا ثبوت دیا تھا اس نے۔ امامہ اس وقت مصلحت کی نزاکت کے تحت سر جھکا کر صرف سوری کہہ سکی تھی۔ جبکہ وہ اس کی سوری کو کسی

خاطر میں نہ لاتے ہوئے غصے سے سر جھٹک کر فوراً اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

❀❀❀

''آنٹی مجھے یہ سوٹ پریس کروانا تھا' مگر کوئی بھی محترمہ فارغ دکھائی نہیں دے رہی سوائے آپ کی معصوم بیٹی مس انوشہ صاحبہ کے' پلیز ان سے کہہ کر یہ سوٹ پریس کروادیں' تب تک میں اوپر اپنے کمرے میں شاور لے لیتا ہوں۔''

سائرہ بیگم کچن میں کھڑی باورچی کو کچھ ہدایات دے رہی تھیں' جب وہ اپنا سفید کرتا شلوار ہینگر سمیت اٹھا کر ان کے قریب چلا آیا۔

سائرہ بیگم نے ان کی صدا پر فوراً کان دھرے تھے۔

''ٹھیک ہے بیٹا! تم شاور لے لو' میں پریس کروادیتی ہوں۔''

اسے جواب دینے کے ساتھ ہی انہوں نے انوشہ کو آواز دے ڈالی تو شاہ زر مزے سے مسکراتا اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔

کمال صاحب دل کے ساتھ ساتھ شوگر کے بھی مریض ہوگئے تھے لہٰذا ان کا زیادہ وقت بستر پر اپنے کمرے میں ہی گزرتا تھا۔ اسی لئے گھر کا سارا کنٹرول سائرہ بیگم کے ہاتھ میں آ گیا تھا' وہ مکمل طور پر سیاہ وسفید کی مختار ہوگئی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ انوشہ پر ستم کرنے کے لئے بھی انہیں فری ہینڈل گیا تھا۔

اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہ شاہ زر کا سوٹ پریس کئے اس کے کمرے میں اس کے مقابل کھڑی تھی۔

''دیکھا...... یہ ہے تمہاری اصل اوقات اور وہاں یونیورسٹی میں وہ کھسکے ہوئے دماغ کا شخص فضول میں پاگل ہورہا ہے تمہارے لئے۔''

سوٹ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس نے تمسخر بھری نگاہوں سے انوشہ کا سپاٹ چہرہ دیکھا تھا' جسے سرزمان کی شان میں گستاخی برداشت نہیں ہوئی تھی۔

''بکواس بند کرو' سرزمان غلط انسان نہیں ہیں۔ یہ تمہارا ذہن ہے جو گندا ہے اور تمہیں گھٹیا سوچ رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔''

''زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے' میں نے پہلے بھی کہا تھا' میں تم جیسی ذلیل' دو ٹکے کی لڑکی کے منہ لگنا پسند نہیں کرتا۔''

وہ غرایا تھا۔

انوشہ اپنی اس درجہ اہانت پر سلگ کر رہ گئی۔ وہ بولی تو اس کے لفظوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

''ذلیل ہوگے تم خود' اسی لئے تمہیں ہر دوسرا انسان غلیظ دکھائی دیتا ہے۔ میرا خیال تھا تمہیں انسانیت سے سمجھا کر غلط سوچنے سے روکا جاسکتا ہے' مگر...... تم کچھ بھی اچھا سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہو۔''

''بہت زیادہ زبان چلتی ہے تمہاری' کاٹ کر رکھ دوں گا۔''

وہ اس کے الفاظ پر غصے سے بل کھا کر رہ گیا۔

''ہاہ... اس خوش فہمی کو بھی دل سے نکال ہی دو تو بہتر ہے' کیونکہ ابھی میرا باپ اور بھائی زندہ ہیں' تمہارے ہاتھ توڑ کر رکھ دیں گے دونوں۔''

وہ کیوں بلاوجہ اس کا رعب برداشت کرتی۔

شاہ زر کسی ناگ کی طرح پھنکار کر اس کی طرف لپکا تھا۔

''بہت زعم ہے اپنے باپ اور بھائی پر' چلو کہو انہیں میرے ہاتھ توڑیں۔''

سنگدلی سے اس کا بازو مروڑتے ہوئے وہ غرایا تھا۔

انوشہ اس کی اس درجہ درندگی پر کراہ کر رہ گئی۔

''ٹکڑے ٹکڑے دو کوڑی کا کر دوں' تب بھی تمہارا باپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ سمجھی تم؟''

صد درجہ حقارت سے اسے پرے دھکیلتے ہوئے وہ روم سے باہر نکل گیا تو انوشہ آنسو پیتی اپنا بازو سہلاتے ہوئے خود بھی فوراً اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

یہاں واقعی کوئی اپنا نہیں تھا جو اس کا دکھ سمجھتا۔

گھر میں مایوں کا فنکشن تھا اور سب لڑکیاں خوب تیار ہوئے مہندی کے فنکشن کی مانند اس فنکشن کو انجوائے کر رہی تھیں' جب کہ وہ سب سے الگ تھلگ کچن میں گھسی اپنے پاپا کے لئے سادہ سا کھانا بنا رہی تھی۔

اسے رونے سے شدید چڑ تھی' ورنہ اب تک نجانے کتنی بار دل کا غبار ہلکا کر چکی ہوتی۔

''نوشی۔''

اپنے خیالوں میں گم سر جھکائے وہ پیاز کاٹ رہی تھی جب نامانوس پکار نے اسے چونکا دیا۔

''جی...''

فوراً گردن گھما کر اس نے کچن کے دروازے میں کھڑی اس قد آور شخصیت کو دیکھا تھا جس سے اس کا خون کا رشتہ تھا۔

''زاور بھیا......''

وہ اسے صد فیصد پہچان نہیں پائی تھی' صرف ہوا میں تیر چھوڑا تھا جو ٹھیک نشانے پر جا لگا تھا۔

''ہاں... کیسی ہو تم......؟''

وہ لپک کر جیسے ہی اس کے قریب آئی' زاور علی حسن نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے سر پر دھر دیا۔

''ٹھیک ہوں' بھیا' آپ کیسے ہیں اور یہاں کب آئے مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔''

اس کا دل اس لمحے بے حد خوش ہو رہا تھا۔

زاور علی حسن نے اس کی سرشاری محسوس کر لی تھی' تبھی وہ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے بولا تھا۔

''تم اپنی دنیا سے باہر نکلو گی تو کسی کی آمد کا پتہ چلے گا ناں۔ ویسے میں کراچی میں ہوتا ہوں بڑی آنٹی کے پاس' ابھی کل ہی اسلام آباد آیا تھا پاپا کے بلاوے پر...... وہ بھی آنٹی سے چوری' پاپا اور آنٹی کی ناراضگی چل رہی ہے ناں' ڈیڈی بھی مشکل سے ہی آئیں گے' میرا بڑا دل چاہتا تھا تم سے ملنے کو' مما سے مستقل رابطہ رہتا ہے میرا' وہ ہر کال پر مجھے تمہارا خیال رکھنے کی تلقین

ہیں مگر آنٹی کی وجہ سے میں تم سے مل بھی نہیں سکتا۔اب تو تم مستقل یہاں آ گئی ہو ناں......؟''

اس کے اندر پچھلے کئی سالوں کا غبار جمع تھا جو اپنی سگی بہن کو دیکھتے ہی بکھرنے لگا تھا۔انوشہ نے اس کا بھاری ہاتھ تھام کر اپنے گال سے لگا لیا۔

''ہاں بھیا' لیکن یہاں کوئی بھی میرا اپنا نہیں ہے' میرا دل نہیں لگ رہا یہاں پر۔''

اپنے اونچے لمبے جوان بھائی کو مقابل پاتے ہی اس کا حوصلہ بکھرنے لگا تھا۔عین اسی لمحے سائلہ بیگم کی کڑک آواز زاور حسن کی پشت پر ابھری تھی۔

''ہاں بھئی تمہیں یہاں کیوں کوئی اپنا لگے گا' سب کے سب سوتیلے رشتے جو ہیں۔مہارانی جہاں سے آئی ہیں' وہاں تو جیسے پوجا ہوتی تھی تمہاری' وہاں دل لگ گیا' میرے بچوں کو کیوں اپنا سمجھنے لگیں تم' آخر ہو تو اس گھمنڈی صدف آراء کی بیٹی۔''

ان کے الفاظ نے انوشہ کے ساتھ ساتھ اس کے مقابل کھڑے زاور حسن کے دل پر بھی ہاتھ ڈالا تھا۔شاید تب ہی وہ چپ نہیں رہ سکا تھا۔

''آپ بلاوجہ تلخ ہو رہی ہیں مما' انوشہ نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا ہے جس سے اس گھر کی یا آپ کی عزت پر کوئی حرف آتا ہو۔''

''تم چپ کرو' میرے گھر کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔اتنا ہی بہن سے پیار ہے تو لے جاؤ اسے اپنے ساتھ' میں بھر پائی ایسی بھلائیوں سے۔''

وہ بلاوجہ تماشہ لگانے پر تل گئی تھیں' زاور نے بات بڑھانا مناسب نہیں سمجھی۔

''تم ٹینس مت ہونا گڑیا' میرے ایک دو کام رہتے ہیں یہاں' انہیں نپٹاتے ہی پاپا سے بات کر کے تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا' صرف دو چار روز صبر کر لو' او کے۔''

''او کے۔''

انوشہ کی پلکیں اپنے بھائی کی تذلیل پر بھیگی تھیں۔

جبکہ وہ ضبط کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے یزدانی پیلس سے باہر نکل گیا تھا۔

❀❀❀

ہمیں کناروں سے نہیں ہے مطلب
تمہیں ضروری ہے پار جانا
مگر آج دریا کی موجوں کی سرخ آنکھیں بتلا رہی ہیں
خراج مانگے گا پھر سے دریا
تو پھر آج ایسا کر لو کہ مجھ کو
اپنا شریک سفر بنا لو
خراج مانگے جو تم سے دریا تو مجھے بھنور میں اتار جانا
تمہیں ضروری ہے پار جانا

''ارسلان! میں کل گھر واپس آ رہی ہوں۔اب مجھ سے مزید اس ڈربے نما گھر میں قید نہیں رہا جاتا۔''

اس شام ارسلان حیدر کی کال آنے پر اس نے پھر کہا تھا۔ جواب میں وہ اچھا خاصا چڑ کر رہ گیا۔
''کیوں......اب کون سی نئی افتاد ٹوٹ پڑی ہے وہاں؟''
''بات افتاد کی نہیں میرے دل کی ہے۔ میں تم سے دور نہیں رہ سکتی۔'' اس نے وجہ بیان کی تھی۔
دوسری طرف ارسلان حیدر چند لمحوں تک کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا۔
''یہ کیسی کیسی محبت ہے تمہاری جو ایک غیر مرد کے گھر مجھے تنہا چھوڑ کر وہاں سکون سے بیٹھے ہو یہاں مجھ پر ایک ایک لمحہ عذاب بن کر گزر رہا ہے۔ ہر پل یہی فکر رہی ہے کہ تم نے ٹائم پر کھانا کھایا ہو گا کہ نہیں...... تمہیں اپنے کسی بھی کام کے سلسلے میں کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی ہو گی۔ مجھے خود سے دوری کا عذاب مت دو ارسلان پلیز۔''
وہ روہانسی ہو گئی تھی جب ارسلان گہری سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے بولا۔
''تم کیا سمجھتی ہو مون! محبت صرف تم کرتی ہو مجھ سے' کیا میں تم سے محبت نہیں کرتا...... کیا مجھے تمہاری کوئی فکر نہیں ہوتی' کوئی اور جانے نہ جانے مگر تم تو اچھی طرح جانتی ہو مون کہ میری زندگی تمہارے بغیر بالکل بے کار ہے۔ تمہیں کیا پتہ' تمہارے بغیر میں یہاں کس مشکل سے گزارہ کر رہا ہوں ہر پل ذہن تمہاری طرف ہی لگا رہتا ہے مگر...... میں بہت بے بس ہو گیا ہوں جان! وہ خواب جو میں نے تمہاری رفاقت کے دیکھے ہیں۔ میں ان خوابوں کو ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں؟''
اس کے لہجے میں تھکن نمایاں تھی۔
امامہ کو ملال نے گھیر لیا تھا۔
''سوری ارسلان! میرا مقصد تمہیں دکھی کرنا نہیں تھا۔''
''اٹس او کے۔ فائل کے بارے میں کچھ پتہ چلا کہ نہیں؟''
''نہیں۔ وہ اپنے کمرے کو ہمیشہ لاک رکھتا ہے۔ آئی تھنک اس کی تمام فائلز اور کاغذات اسی کمرے میں رکھے ہوں گے۔ مجھے فائل کی تمام نشانیاں یاد ہیں۔ تم فکر نہ کرو' جس دن موقع ملا میں اس میں کوئی کوتاہی نہیں برتوں گی۔''
''تھینکس۔ مجھے معلوم ہے۔ میری مون کبھی کسی کام میں ناکام ہو ہی نہیں سکتی۔''
''بالکل۔''
وہ بالکل ریلیکس انداز میں مسکرائی جب وہ بولا۔
''اچھا سنو۔ تمہیں وہاں کسی پرابلم کا سامنا تو نہیں ہے ناں؟''
''نہیں۔ الحمدللہ مکمل آزادی حاصل ہے۔ بس ایک بڑی پرابلم ہے اور وہ ہے شجاع حسن کی بیٹی۔ توبہ ارسلان روتی ہے تو چپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ عجیب پراسراری بچی ہے۔ منہ سے بولتی ہی نہیں حالاں کہ بچے دو سال کی عمر میں پٹر پٹر بولنے لگتے ہیں۔''
''ہاں۔ اکثر بچوں کے ساتھ کچھ پرابلمز ہوتی ہیں۔ بہرحال تم اپنا خیال تو رکھ رہی ہو ناں؟''
''بالکل رکھ رہی ہوں کیا نہیں رکھنا چاہیے۔''
''رکھنا چاہیے کیوں نہیں رکھنا چاہیے۔''

وہ دھیمے سے مسکرایا تھا۔ جواب میں امامہ نے دل سے مطمئن ہوتے ہوئے تھوڑی دیر ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد لائن ڈس کنکٹ کر دی۔

❋❋❋

یزدانی پیلس میں مہندی کی تقریب کا آغاز ہو گیا تھا۔

سائلہ بیگم کی بیٹی بُریرہ کے نازنخرے دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ انوشہ کو تو وہ کسی قابل ہی نہیں سمجھتی تھی جب کہ کمال صاحب کے ساتھ بھی وہ حساب سے ہی بات کرتی تھی۔

ساحل اور اشان اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ انوشہ محسوس کر سکتی تھی کہ سائلہ بیگم کے تینوں بچے پورے پورے ان کے کہنے میں تھے اور شاید انہوں نے ہی ان کے دل میں انوشہ کے لیے نفرت ڈالی تھی۔

کمال صاحب ہر معاملے میں قطعی بے بس دکھائی دیتے تھے۔

اس روز بھی تمام ضروری کاموں سے فارغ ہو کر وہ ہال میں بیٹھی کمال صاحب سے باتیں کر رہی تھی جب اچانک شاہ زر پنڈی سے وہاں پہنچا تھا۔ آج کل اس کا ایک پیر پنڈی میں تو دوسرا اسلام آباد میں ہوتا تھا۔

انوشہ کمال صاحب سے باتیں کرتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ اس کے مقابل ہی قدرے فاصلے پر بیٹھا وہ خاصا گھور گھور کر اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ سائلہ بیگم ملازمین کو آج کے فنکشن کے لیے ہدایات دے رہی تھیں۔ اس سے زیادہ دیر برداشت نہ ہوا تو اٹھ کر ان کے پاس چلا آیا۔

"آنٹی! میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ پلیز کسی سے کہہ کر ایک کپ چائے بنوا دیں۔ میں اوپر کمرے میں ہوں۔"

بریرہ اپنی کزنز اور دوستوں کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہوئی تھی لہٰذا وہ وہاں سے اٹھ کر سیدھا اپنے کمرے میں ہی چلا آیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں اسے پھر پنڈی واپس جانا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ سائلہ بیگم انوشہ کو ہی کام کے لیے کہیں گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔ تقریباً دس پندرہ منٹ کے بعد وہ چائے اور درد کی گولی کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ چہرے پر حد درجہ غصے کا رنگ واضح دیکھا جا سکتا تھا۔

چائے کی ٹرے ٹیبل پر رکھ کر وہ واپسی کے لیے پلٹی تھی جب اس نے پکار لیا۔

"بات سنو محترمہ! میں نے ابھی جانے کے لیے نہیں کہا۔"

"تو کیا کروں میں تمہاری باندی ہوں کیا۔"

وہ تپی ہوئی تھی جب وہ مزے سے مسکرا دیا۔

"یہی سمجھ لو۔"

"شٹ اپ۔"

وہ پلٹی تھی جواب میں شاہ زر نے لپکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"سر دباؤ میرا بہت درد ہو رہا ہے۔"

''پھر میں کیا کروں؟ تمہاری منگیتر کو آجانے دو۔ وہ دبا دے گی۔''

''فضول بکواس کرنے کے لیے نہیں کہا۔ چلو سر دباؤ میرا۔''

اب میں اس کے غصے کا گراف بڑھ گیا تھا۔

انوشہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں اپنی کئی چوڑیاں تڑوا بیٹھی تھی۔

''تمہاری ملازمہ نہیں ہوں میں' جس دن خرید لو گے اسی دن آکر رعب جمانا۔''

''وہ بھی لوں گا۔ ابھی فضول چڑ چڑ کیے بغیر سر دباؤ میرا۔''

''مجھے نہیں پتہ۔ میں تم پر لعنت بھی نہیں بھیجتی۔''

''نہ بھیجو لعنت مگر پھر بھی کان کھول کر سن لو۔ تمہارے نصیب میرے ساتھ ہی پھوٹنے والے ہیں۔''

انوشہ کی بے بسی اسے لطف دے رہی تھی تب ہی وہ پھر چلائی تھی۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تمہاری زندگی کا حصہ بننے سے بہتر ہے میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لوں۔''

''کیوں...... میں اتنا برا ہوں؟''

اب کے اس کے گداز لبوں پر پرلطف مسکراہٹ بکھری تھی جس سے انوشہ کا خون جل رہا تھا تب وہ پھر چیخ کر بولی تھی۔

''تم اس سے بھی زیادہ برے ہو۔ میرا بس چلے تو لمحے میں جان سے مار دوں تمہیں۔''

''اچھا...... چلو مار دو جان سے۔ کم آن۔''

اٹھ کر اس کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے وہ ضد میں آیا تھا جواب میں انوشہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

''مرو تم کہیں جا کر۔ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔''

اسے پرے دھکیل کر وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

اگلے روز شافیہ کی رخصتی تھی اور شاہ زر کا نکاح بریرہ کے ساتھ طے پا گیا تھا۔

انوشہ کو قطعی نا چاہتے ہوئے بھی برات کے ساتھ اسلام آباد سے پنڈی شاہ زر کے گھر آنا پڑا تھا۔ یہاں بھی سب اجنبی چہرے تھے۔ کوئی ملنے' پہچاننے والا نہیں تھا۔ لہٰذا وہ سب سے الگ تھلگ ہو کر ایک کونے میں ٹک گئی۔

بریرہ نے آج اسپیشل شاہ زر کی توجہ حاصل کرنے کے لیے بڑی خاص قسم کی تیاری کی تھی۔ بلیک نیٹ کے سوٹ میں اس کے بدن کا گورا پن صاف چھلک رہا تھا۔ صرف اس کے دل پر بجلیاں گرانے کے لیے وہ کیسی کیسی حرکتیں نہیں کر رہی تھی۔

شاہ زر ہال میں آتے جاتے جہاں بریرہ سے باتیں کر رہا تھا' وہیں ایک نظر انوشہ رحمٰن پر بھی ضرور ڈال دیتا تھا جو الگ تھلگ بیٹھی بے حد معصوم دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی خالہ نے اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں بھی اپنے سوتیلے بیٹے اور بیٹی کے لیے نفرت کا زہر بھی پھونکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زاور علی حسن کے ساتھ ساتھ اس کی انوشہ رحمٰن کے لیے بھی نفرت بڑھ گئی تھی۔ بریرہ

وغیرہ کی مانند اسے بھی اپنی خالہ ہی مظلوم اور حق پر دکھائی دیتی تھیں۔
ابھی نکاح کی رسم شروع نہیں ہوئی تھی۔ شافیہ اور بریرہ دونوں کو ہی تیار کرنے کے لیے بیوٹی پارلر بھیج دیا گیا تھا۔ شاہ زر اپنی مما اور آنٹی کے ساتھ کھڑا ہنس رہا تھا جب اچانک اس کے سیل پر بریرہ کی کال آئی اور اس نے بے حد گھبرائے ہوئے لہجے میں اسے بتایا۔

''شاہ......شافیہ بیوٹی پارلر سے بھاگ گئی ہے۔''

''وہاٹ......؟'' اسے صرف شاک ہی نہیں لگا تھا بلکہ زور کا چکر بھی آگیا تھا۔

آنکھوں کے سامنے جیسے یکلخت اندھیرا چھا گیا تھا۔

اپنے گھر سے بیوٹی پارلر تک کا فاصلہ اس نے انتہائی ریش ڈرائیونگ کے ساتھ طے کیا تھا۔ آگے بریرہ انتہائی متوحش حالت میں بیوٹی پارلر کے باہر کھڑی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

''بریرہ! شافیہ کہاں ہے؟''

گھر میں کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر وہ سیدھا وہاں چلا آیا تھا۔

''پتہ نہیں شاہ! ہم دونوں اکٹھی بیٹھی تھیں تب ہی اس کی کسی دوست کا فون آیا اور وہ علیحدہ کمرے میں چلی گئی۔ پارلر میں رش تھا اور پھر میری چند سہلیاں بھی اچانک وہاں مل گئی تھیں۔ لہٰذا میں ان میں مگن ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے شافیہ کا پتہ کیا تو وہ یہاں نہیں تھی۔ میں نے پورا پارلر دیکھ لیا ہے۔ وہ کہیں نہیں ہے' باتھ روم میں بھی نہیں۔''

وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

شاہ زر کے دماغ میں جیسے آندھیاں سی چلنے لگیں۔

تھوڑی دیر تک بریرہ کی بے وقوفی اور واویلے سے یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی۔ سائلہ بیگم نے تو خبر سنتے ہی زاور حسن کو کوسنے دینے شروع کر دیے تھے جب کہ نائلہ بیگم بھرے گھر میں اس درجہ رسوائی پر لمحوں میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہو کر ہاسپٹل پہنچ چکی تھیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہنستا بستا گھر تماشہ گاہ بن کر رہ گیا تھا۔ ہر جگہ شافیہ کا پتہ کر لینے کے بعد ناکام ہو کر شاہ زر نے وہ قدم اٹھایا تھا جس کے بارے میں چند گھنٹے پہلے تک اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

❊❊❊

امامہ ٹی وی دیکھ رہی تھی اور شجاع حسن کی بیٹی نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔ اُسے وہ معصوم سی پری کسی بلا سے کم نہیں لگتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اس کے رونے کی پروا کیے بغیر ٹی وی کی آواز فل کیے پاکستانی فلم دیکھ رہی تھی' جب اچانک شجاع حسن کے والد قدرت اللہ صاحب کے روم کا دروازہ دھاڑ سے کھلا اور وہ کچھ ہی لمحوں میں اپنی وہیل چیئر گھسیٹتے وہاں ٹی وی لاؤنج میں چلے آئے۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں......؟ اس گھر میں کہیں سکون ہے کہ نہیں......؟''

وہ چلائے تھے۔ امامہ بوکھلا کر صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''دسس......سوری۔''

''سوری کی بچی۔ جا کر گڑیا کو سنبھالو وہ کب سے رو رہی ہے۔''

ہو بہو شجاع حسن سے ملتی جلتی شخصیت کے مالک۔ وہ اس وقت شدید غصے میں تھے۔ امامہ کو شجاع حسن کی پیشن گوئی بالکل درست لگ رہی تھی۔ سیب جیسے سرخ وسفید چہرے پر غصے کی جھلک نے ان کے چہرے کی رنگت اور زیادہ گہری کر دی تھی۔

وہ بھاگ کر بچی کی طرف لپکی اور اسے اپنی بانہوں میں لے کر لوری دینے لگی۔ قدرت اللہ صاحب کی دھاڑ سے دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔

شام میں بچی کو دودھ پلانے کے بعد وہ وہیں لاؤنج میں صوفے پر سو گئی تھی۔ شجاع ڈیوٹی سے فارغ ہو کر موبائل پر کسی سے بات کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوا تو نظر سیدھی اس پر پڑی تھی جو اس کی بیٹی کو ساتھ لگائے' نیند سے بے حال وہیں ٹی وی لاؤنج میں' سمٹ کر صوفے پر بیٹھی سو رہی تھی۔

سردی اگر زیادہ نہیں تھی تو کم بھی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نیند میں بھی سردی کو محسوس کرتے ہوئے سمٹ رہی تھی' تب وہ اس کے قریب آیا تھا۔ اس کی بیٹی امامہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر یوں مطمئن سے سو رہی تھی جیسے وہی اس کی ماں ہو۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے اپنی بیٹی کو الگ کرے مگر...... وہ خود سکون میں نہیں تھی۔ اس لیے مجبوراً اسے اپنی بیٹی کو اس کی بانہوں کے حصار سے نکالنا پڑا تھا۔

امامہ کی آنکھ فوراً کھلی تھی۔

شجاع حسن کو آنکھ کھلتے ہی اپنے اس قدر قریب دیکھ کر' قدرے گھبراتے ہوئے وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی جب وہ بولا۔

''مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ عورت کی عزت کو' میں اپنی جان سے بڑھ کر اہمیت دیتا ہوں۔ یہاں سردی بڑھ رہی ہے۔ آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کر سکتی ہیں۔''

کہنے کے ساتھ ہی وہ اپنی بچی کو لے کر اپنے روم کی طرف بڑھ گیا' تو امامہ دل ہی دل میں اس کے کردار کی مضبوطی کو سراہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔ اسے اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ آج وہ بچی کے بغیر اپنی مرضی سے سکون کی نیند سو سکتی تھی۔

مگر اب آنکھوں میں نیند رہی کہاں تھی۔ خیال کے پرندے فوراً بھٹک کر ارسلان حیدر کی سمت پرواز کر گئے تھے۔

وہ اس لمحے کیا کر رہا ہوگا؟

اسے میرے بغیر نیند بھی آتی ہوگی کہ نہیں؟

وہ ٹھیک سے وقت پر کھانا کھا لیتا ہوگا کہ نہیں؟

کہیں وہ کمزور تو نہیں ہو گیا ہوگا؟ میں اسے اتنا مس کرتی ہوں' اس کا میرے بغیر کیا حال ہوگا؟

اس سوچ کے ذہن میں آتے ہی اس نے اپنا موبائل آن کیا تھا مگر ارسلان حیدر کا موبائل مسلسل آف مل رہا تھا۔ وہ جھنجلائی تھی مگر پھر فوراً ہی ذہن میں اس کا دوسرا نمبر آ گیا تو اسے پریس کر دیا۔ یہ نمبر ارسلان نے اس سے خفیہ رکھا تھا مگر وہ اتفاقیہ طور پر اس کا سیل ہاتھ لگ جانے کے باعث اس نمبر کے بارے میں جان گئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ارسلان نے اس کی کال پک کرنے میں ٹائم

لیا تھا۔
''ہاں بولو مون کیا بات ہے؟''
قدرے جھنجلائے انداز میں اس کی کال پک کرتے ہی اس نے پوچھا تھا' جب وہ ہرٹ ہوتے ہوئے بولی۔
''تم...... کسی اور سے بات کر رہے تھے ناں؟''
''ہاں......'' اس نے اعتراف میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ امامہ کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔
''وہاٹ؟''
''پلیز! ڈونٹ بھی سلی مون۔ کسی دوست سے بات کر رہا تھا۔ تم بتاؤ کیا بات ہے؟''
اس نے نمبر کے بارے میں اس سے نہیں پوچھا تھا کہ اس کا وہ پرسنل نمبر اسے کیسے ملا...... امامہ کا دل اس کے لہجے کی بیزاری محسوس کر کے دکھ رہا تھا مگر...... دل کے ہاتھوں مجبور وہ اس لمحے اس سے رابطہ منقطع نہیں کر سکی تھی۔
''بہت اسپیشل فرینڈ ہے تمہارا' مجھ سے بھی زیادہ عزیز ہے تمہیں......''
اب کے اس کے لہجے میں نمی چھلکی تھی جس پر وہ جھنجلایا تھا۔
''پلیز فار گاڈ سیک مون! ایک منٹ میں بچی بن جاتی ہو تم' تم سے زیادہ بھلا کون عزیز ہو سکتا ہے مجھے؟''
''او کے۔'' وہ چپ ہو گئی تھی جواباً وہ نرم لہجے میں بولا۔
''پلیز! بتاؤ ناں اس وقت فون کیسے کیا؟ کوئی پرابلم ہے کیا؟''
''نہیں۔''
''تو پھر......؟''
''پتہ نہیں۔ بس تمہاری یاد آ رہی تھی۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں ارسلان فوری۔''
''پاگل ہو گئی ہو کیا۔ اس وقت یہ کیسے ممکن ہے۔ اس ایس پی کو شک ہو جائے گا۔''
وہ گھبرایا تھا جب وہ تپتے ہوئے بولی۔
''ایس پی گیا بھاڑ میں۔ تم سے ملنے کے لیے مجھے کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پلیز ارسلان مجھے اپنے پاس بلا لو۔ میرا دل تمہارے بغیر یہاں نہیں لگ رہا۔''
''او کے' او کے۔ ڈونٹ بی ایموشنل۔ کل کوئی مناسب موقع دیکھ کر ایس پی کی غیر موجودگی میں گھر چلی آنا۔ مما کو اپنے طور پر تمہارے معاملے میں مکمل مطمئن کر چکا ہوں میں۔ یہ کہہ کر کہ تم لاہور پنجاب یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے چکی ہو اور اپنی نہایت مخلص دوست کے ساتھ ہوسٹل میں رہتی ہو۔ تم بھی یہی کہنا۔ وہ خود تم سے ملنے آنا چاہتی تھیں مگر آج کل جوڑوں کی تکلیف کی وجہ سے اپنے کمرے سے باہر بھی نہیں نکلتیں۔ تم آ جاؤ گی تو انہیں بھی تھوڑا سکون ہو جائے گا۔''
''ہاں...... میں خود بھی انہیں بے حد مس کرتی ہوں۔''
امامہ کا لہجہ اس بار خود بخود دھیما ہو گیا تھا۔
''چلو ٹھیک ہے اب سو جاؤ۔ کل تم آؤ گی تو تفصیلاً روبرو بیٹھ کر بات کریں گے۔''

وہ خاصی عجلت میں تھا۔

امامہ ابھی اسے ٹھیک سے خداحافظ بھی نہیں کہہ پائی تھی کہ اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ عین اسی لمحے اس کے کمرے کے دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی تھی جس سے اس کا دل ایک مرتبہ زور سے دھڑکا تھا۔

"یا اللہ خیر۔ اب کیا مصیبت درپیش آ گئی کسی کو......؟"

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ہی شجاع حسن اپنی بیٹی کو اٹھائے کھڑا تھا۔

"جی سر!"

"ڈسٹربنس کے لیے معذرت۔ اصل میں مجھے گڑیا کا فیڈر نہیں مل رہا تھا۔ اسے بھوک لگی ہے۔ ڈھونڈ دیں پلیز......"

اس کی خوب صورت آنکھوں میں بھی نیند اور تھکن کے سرخ ڈورے واضح دکھائی دے رہے تھے مگر وہ اس کی تھکن کا خیال کر رہا تھا۔ اس کی شخصیت کی یہ ایک اور اچھائی اس کے سامنے آئی تھی۔

وہ اس کی بیٹی کا فیڈر ڈھونڈنے کچن میں آئی تو شجاع بھی دودھ بوائل کرنے کی غرض سے اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔

"آج اباجی نے آپ کی شکایت کی ہے مس امامہ۔"

وہ فیڈر ڈھونڈتے ڈھونڈتے چونکی تھی۔

"اس جاب کے لیے آپ پر کوئی پریشر تو نہیں ہے ناں؟"

"نن نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ اصل میں آپ کی بیٹی بات بے بات بہت روتی ہے۔ اسی لیے کبھی میں تھک جاتی ہوں۔"

وہ اچھی خاصی گھبرا گئی تھی۔ شجاع حسن نے سرسری سی اک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی پھر دودھ پتیلے کی طرف آ گیا۔ تب ہی امامہ نے اسے روکا تھا۔

"آپ کمرے میں جائیے سر! میں بے بی کا فیڈر تیار کر کے لاتی ہوں۔"

اس کے ہاتھوں میں معمولی سی لرزش تھی۔ شجاع حسن جیسے زیرک پولیس افسر سے کچھ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ اس کی اصلیت کے بارے میں جان جاتا۔ شجاع اس کی آفر پر دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تھینکس کہتا اپنے کمرے میں واپس چلا گیا تو اس نے شکر کا کلمہ پڑھتے ہوئے گہرا سانس خارج کیا۔

"اف۔ پتہ نہیں یہ محبت مجھے کیا کیا رنگ دکھائے گی......"

فیڈر ڈھونڈتے ہوئے وہ زیرلب بڑبڑائی' پھر دودھ بوائل کر کے اگلے کچھ ہی منٹوں میں شجاع کے کمرے میں چلی آئی جو اس وقت بیڈ پر لیٹا اپنی بیٹی سے کھیلتے ہوئے اسے پیار کر رہا تھا۔ اس نے فیڈر اسے تھمانے کے بعد وہاں سے رخصت ہونے میں ایک منٹ بھی نہیں لگایا تھا۔

❋❋❋

اک چاند تنہا کھڑا رہا' میرے آسماں سے ذرا پرے
میرے ساتھ ساتھ سفر میں تھا' میری منزلوں سے ذرا پرے
تیری جستجو کے حصار سے' تیرے خواب تیرے خیال سے
میں وہ شخص تھا جو کھڑا رہا' تیری چاہتوں سے ذرا پرے
کبھی دل کی بات کہی نہ تھی' جو کہی تو وہ بھی دبی دبی
میرے لفظ پورے تو تھے مگر' تیری ساعتوں سے ذرا پرے

''دادی ماں! یہ سنی دادا کون ہے؟''

شام ڈھل رہی تھی اور دادی ماں صرف اس کے لیے آج بڑے عرصے کے بعد خود چولہا جلائے آلو کے پراٹھے بنا رہی تھیں۔ جب اس نے چمٹے سے چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کو ادھر ادھر کرتے ہوئے پوچھا۔

کام والی لڑکی کو بخار تھا لہٰذا وہ پچھلے دو روز سے پڑھنے بھی نہیں آ رہی تھی۔

انزلہ کوکوشش کے باوجود میران شاہ کا گھر نہیں ملا تھا' لہٰذا وہ اس سے ملے بغیر ہی راستے سے واپس پلٹ آئی تھی۔

دادی اماں نے اس کے سوال پر قدرے متفکر ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تو کیوں پوچھ رہی ہے؟''

''وہ......ملا تھا مجھے راستے میں......اس لیے۔''

اس نے کچھ بھی چھپانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ دادی اماں کی فکر مزید بڑھی تھی۔

''انجو! آج کے بعد تو اکیلی گھر سے باہر نہ نکلنا۔''

''کیوں دادی ماں؟''

وہ بے حد حیران ہوئی تھی تب ہی انہوں نے بتایا تھا۔

''تجھے نہیں پتہ۔ اس گاؤں میں سنی دادا کا وجود کسی عذاب سے کم نہیں۔ غنڈا ہے پورا۔ سارا گاؤں اس کی دہشت سے پناہ مانگتا ہے۔ کب وہ کیا کر ڈالے کچھ خبر نہیں۔''

وہ چونکہ اس کی عملی غنڈہ گردی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی لہٰذا ان کی تنبیہ پر بے پروائی سے کندھے جھٹکتے ہوئے بولی۔

''دادی ماں! آپ بھی بڑی بھولی ہیں۔ میں کوئی گاؤں کی سیدھی سادی اجڈ سی لڑکی تھوڑی ہوں جو میرے ساتھ وہ کچھ بھی کر لے اور میں خاموش رہوں۔ نہیں دادی ماں میں یہاں کسی سے بھی ڈرنے والی نہیں ہوں۔ میرے بابا یہاں علم کی روشنی پھیلانا چاہتے تھے۔ میں بھی ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس گاؤں کی بھلائی کے لیے کام کروں گی اور آپ دیکھئے گا وہ غنڈا موالی جو کوئی بھی ہو میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔''

''نہیں انجو! دانی کے بعد میں تجھے کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا دادی ماں! آپ بالکل بے فکر رہیے۔''

دادی ماں کی فکر پر اس نے اطمینان سے ان کے ہاتھ تھامے تو وہ بے بسی سے اس کی طرف

بلبلا کر رہ گئیں۔

✻✻✻

ہر بار یہی سوچا' ہر بار قسم کھائی
اس بار نہ روئیں گے' دامن نہ بھگوئیں گے
اے معنیٔ گل' جب موسم گل آیا
معصوم شگوفوں کی معصوم اداؤں نے
مجبور بنا ڈالا' ہر بار رلا ڈالا

رات بھر گہری نیند میں مدہوش رہنے کے بعد صبح جب چڑیوں کی چہچہاہٹ سے اس کی آنکھ کھلی تو سر بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے سوجے ہوئے پپوٹوں اور معطل حواس نے اس کی حالت خاصی قابلِ رحم بنا رکھی تھی۔

پہلی فرصت میں تو اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیوں ہے؟ تاہم کچھ ہی لمحوں کے بعد جب اس کے منتشر حواس بحال ہوئے تو اسے یاد آیا کہ کل شاہ زر کے گھر میں اسی کے ہاتھوں وہ کڈنیپ ہوئی تھی۔

کتنی چالاکی سے اس نے اسے گھر سے باہر بلا کر اپنے سوچے سمجھے منصوبے کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی نہایت ریش ڈرائیونگ کے بعد یہاں سنسان علاقے میں وہ رات کسی وقت لا کر قید کر دی گئی تھی۔ جس وقت اسے یہاں لایا گیا تھا اس وقت وہاں لائٹ نہیں تھی۔ لہٰذا جیسے ہی شاہ زر نے اسے غصے سے کمرے میں دھکیلا' وہ لڑکھڑا کر کمرے میں پڑی چارپائی کے پائے سے ٹکرا گئی۔ اس وقت اسے اتنی زور کا چکر آیا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اپنے حواس قائم نہیں رکھ سکی تھی۔

وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ شاہ زر نے اس کے ساتھ اتنا بڑا ظلم کیوں کیا ہے؟

وہ برا تھا' انوشہ اس سے نفرت کرنے لگی تھی مگر اپنی عداوت اور ضد میں وہ اس درجہ گھٹیا حرکت بھی کر سکتا ہے یہ گمان اسے نہیں تھا۔

اس کی آنکھیں اپنی بے بسی پر آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

نہ جانے وہ اس کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا؟

''یا اللہ......اب کیا ہوگا؟''

بری طرح چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر پل دو پل کے لیے اس نے سوچا۔

''پتہ نہیں۔ وہاں سب لوگوں نے میری غیر موجودگی پر کیا سوچا ہوگا۔ مما تو پہلے ہی مجھے پسند نہیں کرتیں۔ اب تو انہیں اور بھی موقع مل گیا ہوگا میرے خلاف بولنے کا۔ یا اللہ میں کیسے سب کو اپنی بے گناہی کا یقین دلاؤں گی۔ میرا تو یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اتنی ذلت و رسوائی کے بعد میں کہاں جاؤں گی؟''

سوچوں کی یلغار نے اس پر اپنا گھیرا تنگ کر رکھا تھا۔ ازحد لاچار ہو کر وہ رو پڑی تھی۔

صبح کے ملگجے دھندلکے اب چھٹنے لگے تھے۔ باہر سر سبز درختوں اور ننھی چڑیوں کی چہچہاہٹ نے اسے باور کرا دیا تھا کہ وہ کسی جنگل یا فارم ہاؤس کے قریب لا کر مقید کی گئی ہے۔ اس کا ذہن قدرے بے

دار ہوا تو وہ بمشکل اپنے پر تھکن وجود کو گھسیٹتی کمرے میں لگی اس واحد کھڑکی کی طرف چلی آئی جہاں سے باہر دور دور تک پھیلا ہوا سبزہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ قطار در قطار لگے درختوں کا ذخیرہ اور افق پر چہچہاتے پرندوں کی چہکاریں ماحول میں فرحت کا احساس پیدا کر رہی تھیں۔ قرب وجوار میں کسی اور بلڈنگ کا نام ونشان نہیں تھا۔ بلاشبہ وہ کسی فارم ہاؤس کا ہی ایک حصہ تھا۔

وقت کی گرفت سے جیسے جیسے لمحے چھوٹتے جا رہے تھے اسے گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ دماغ کی شریانیں جیسے پھٹنے کو تیار ہو رہی تھیں۔ تب ہی دھاڑ سے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور شاہ زر خاصے خطرناک تیوروں کے ساتھ سرخ آنکھیں لیے اس کی سمت بڑھ آیا۔

''شاہ زر! تم انتہائی گھٹیا اور ذلیل انسان ہو۔''

اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ چلا اٹھی تھی۔ جواب میں شاہ زر کا بھاری ہاتھ خوب جم کر اس کے بائیں رخسار پر آ پڑا۔

''بکواس بند کرو۔ میرے گھر میں اس وقت بھونچال آیا ہوا ہے۔ صرف تمہارے کمینے بھائی کی وجہ سے۔ اس وقت میری مما آئی سی یو میں پڑی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہیں۔ یاد رکھنا انوشہ رحمٰن اگر میری مما کو خدانخواستہ کچھ ہوا تو میں تمہارا اور تمہارے بھائی کا وہ حشر کروں گا کہ ساری دنیا تم بہن بھائیوں کے انجام سے پناہ مانگے گی۔''

''وہاٹ......کیا کیا ہے میں نے اور میرے بھائی نے؟''

اس وقت وہ اپنے زخم کو بھلا کر حیران ہوئی تھی تب ہی وہ غراتے ہوئے بولا تھا۔

''اتنی بے خبر نہیں ہو تم۔ میری بہن تمہارے بھائی کے ساتھ بھاگی ہے۔''

''تو خود بھاگی ہو گی ناں۔ میرا بھائی تمہارے گھر سے تو اٹھا کر نہیں لے گیا اسے اور پھر اس معاملے میں میرا کیا قصور ہے؟''

وہ اس سے الجھی تھی۔ جواباً شاہ زر نے اس کے ریشمی بال اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

''بہت بک بک کرنی آتی ہے تمہیں۔ اب دیکھنا ہمیشہ کے لیے گونگا بہرا کر کے رکھ دوں گا۔ جو گھٹیا قدم تمہارے بھائی نے اٹھا کر مجھے اور میری مما کو تکلیف پہنچائی ہے اب میں بھی وہی قدم اٹھا کر اسے اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا۔ اس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے میں بھی اس کی عزت کو اٹھا کر لے آیا۔''

اس کے عزائم خطرناک تھے۔ انوشہ کے اندر تک کوئی سرد لہر اتر گئی۔

''خدا سے ڈرو شاہ زر آفندی! ایسا نہ ہو کہ کسی کی آہ تمہارے لیے زندگی کا ہر لمحہ عذاب بنا کر رکھ دے۔''

''شٹ اپ۔ فی الحال میری مما کی جلد سے جلد صحت یابی کی دعا مانگو ورنہ......تمہارا واسطہ ایک انسان سے نہیں کسی حیوان سے پڑے گا اور تب میں تمہیں اور تمہارے بھائی کو بتاؤں گا کہ کسی کی عزت سے کھیلنے کا انجام کیا ہوتا ہے......''

لفظ لفظ سے آگ برساتا وہ اس وقت اتنا ڈیریس دکھائی دے رہا تھا کہ انوشہ چاہنے کے باوجود خود کو اس کی طرف دیکھنے سے نہیں روک پائی۔ خون چھلکاتی غلافی نگاہیں اور تنے ہوئے اعصاب

اس کے اندر کا حال بخوبی عیاں کر رہے تھے۔ وہ خود چکرا کر رہ گئی تھی۔

عین اسی لمحے اس کے سیل پر بیپ ہوئی اور وہ اسے تنفر سے پرے دھکیلتا' پھر کمرے سے باہر نکل گیا جب کہ انوشہ کے لیے ایک اور رات عذاب بن کر گلے ملنے چلی آئی تھی۔

❋❋❋

صبح کی ٹھنڈی پرنم ہوائیں' بے نیازی سے سبک رو چلتی' قطار در قطار لگے درختوں کی لمبی شاخوں سے اٹھکھیلیاں کرتی اسے عجیب سی فرحت کا احساس دلا رہی تھیں۔ بلیک شال کو اچھی طرح دونوں کندھوں کے گرد لپیٹے وہ دنیا جہاں سے بے خبر اپنے داداجی کی قبر پر بیٹھی ان کے لیے دعائے مغفرت کر رہی تھی جب ان کے قریب کی دو چار قبریں چھوڑ کر ایک لمبی چوڑی قبر کے قریب کوئی آہستہ سے آ کر بیٹھ گیا۔

انزلہ نے دعا سے فارغ ہو کر ذرا سی گردن موڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ایک بزرگ خاتون تھیں۔ پھٹے پرانے بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس' سر پر دوپٹے اور پاؤں میں جوتے سے بے نیاز وہ قبر کے قریب بیٹھتے ہی اس سے لپٹ کر رو پڑی تھیں۔

''مانی پتر! دیکھ دن چڑھ آیا ہے۔ تیری بہن نے ناشتہ بنا لیا ہے۔ ماں صدقے جائے پتر ایک بار اٹھ کر چہرہ تو دکھا دے اپنا۔''

خاتون کے لہجے میں اتنا درد تھا کہ انزلہ کا دل اس کے الفاظ پر سکڑ کر رہ گیا۔ حیران نگاہوں سے اپنے قریب بیٹھی خاتون کو دیکھتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئی تھی جواب اسی لہجے میں قبر سے لپٹی کہہ رہی تھیں۔

''بہت نیند آتی ہے تجھے آج کل۔ اپنی ماں کا حال دیکھ میراں۔ اسے تیرے بغیر نیند نہیں آتی۔''

کسی برساتی نالے کی مانند بہتی آنکھوں میں کتنا درد بکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ انزلہ چاہنے کے باوجود اس خاتون سے کچھ نہیں پوچھ سکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر جانے منہ ہی منہ میں کیا بڑبڑاتے ہوئے قبرستان سے باہر نکل گئی تو وہ بھی اٹھ کر قبرستان کے مین داخلی دروازے کی جانب چلی آئی جہاں ایک مرتبہ پھر سنی دادا اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔

گرے شلوار سوٹ میں ملبوس' گرم سندھی شال دونوں کندھوں پر ڈالے' ایک ہاتھ گیٹ سے ملحقہ دیوار سے ٹکائے وہ اس کی راہ روکے کھڑے تھا' جواب عین اس کے مقابل پہنچ کر خاصی الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''راستہ چھوڑو میرا۔ گاؤں میں نظر آنے والی ہر لڑکی کو تم نے اپنی جاگیر سمجھ لیا ہے کیا......''

دادی ماں سے اس کی شخصیت کے متعلق سن کر وہ اس سے حد درجہ بدگمان ہو گئی تھی۔ تاہم اس کے الفاظ پر سنی دادا کی گھنی مونچھوں تلے دبے لبوں پر گہری مسکراہٹ بکھر کر رہ گئی تھی۔

''بہت بدل گئی ہو تم انزلہ شاہ! پہلے جیسی کوئی بات نہیں رہی تم میں۔''

وہ ذرا تھا جواب میں انزلہ نے تنفر سے منہ پھیر لیا۔

''ہٹو میرے راستے سے' میں تم جیسے غنڈے موالیوں کے منہ نہیں لگتی۔''

اسے زبردستی دھکا دے کر اپنے راستے سے ہٹاتی وہ آگے بڑھی تھی کہ اچانک کراہ کر رہ گئی۔

''آہ۔''

پاؤں میں کوئی بہت تیز نوکیلی چیز ایک دم سے لگی تھی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ سسکاری نکل گئی۔

سنی دادا اس کی تکلیف دیکھ کر پھر ہنسا تھا۔

''دیکھا انزلہ شاہ! تمہیں میرے گاؤں کے کچے راستوں پر پیدل چلنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔''

ایڑیوں کے بل اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے ذرا سا جھک کر اس کے گلابی پاؤں سے کانٹا کھینچ کر باہر نکالا اور دور پھینک دیا۔ نازک تلے والا فلیٹ جوتا اسے کانٹے کی تکلیف سے بچانے میں ناکام ثابت ہوا تھا۔

''پھر کب ملوگی......؟''

کانٹا نکالتے ہی وہ سیدھا کھڑا ہو کر اب براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''کبھی نہیں۔''

قطعی سرد مہری سے کہہ کر وہ پھر رخ پھیر گئی تو وہ پھر دھیمے سے مسکرا دیا۔

''یہ تو ناممکن ہے۔ قدرت تمہیں پھر سے سنی دادا کے مقابل لے آئی ہے۔ لہٰذا اب تو یہاں سے تمہارا فرار ممکن نہیں ہے۔''

اب کے وہ پھر چونکی تھی۔

''پہلے کب مقابل آئی ہوں میں تمہارے......؟''

''آ جائے گا یاد اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ ویسے میران شاہ کی ماں سے کیا بات کر رہی تھیں تم؟''

اب وہ آہستہ آہستہ اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

انزلہ شاہ کو اس کے سوال نے پھر سے ٹھٹک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''کیا...... وہ...... وہ میران شاہ کی ماں تھی...... وہی میران جو شہر میں پڑھتا تھا......؟''

''ہاں۔ اسی کی ماں تھی جس کی نیت تم پر خراب تھی۔''

''تم...... تم کیسے جانتے ہو یہ سب......؟''

''میں کیا نہیں جانتا۔ تم میرے بارے میں جانو گی تو سب سوالوں کے جواب ایک ساتھ مل جائیں گے۔''

''جانتی ہوں میں تمہارے بارے میں سب کچھ...... ایک نمبر بدمعاش ہو تو......''

وہ جذباتی ہوئی تھی جواب میں سنی دادا کے چہرے پر لمحوں میں کرختگی چھا گئی۔

''گالی نہیں انزلہ شاہ! اس گاؤں کے پرندوں کو بھی سنی دادا کے سامنے اونچی آواز میں بولنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''بھاڑ میں گیا سنی دادا۔ میں کسی سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔ میں یہاں وہی کام کروں گی جس میں سب کا بھلا ہوگا۔ دیکھتی ہوں کون کیا بگاڑتا ہے میرا......''

اس کا جملہ جیسے ہی مکمل ہوا سنی دادا کے زوردار تھپڑ نے اسے اگلے ہی لمحے زمین چاٹنے پر مجبور

''یہ تھپڑ پہلی اور آخر وارننگ ہے تمہارے لیے۔ آئندہ تمہیں بھی سب گاؤں والوں کی طرح
...ں رہنا ہوگا جیسے میں چاہوں گا۔ بصورتِ دیگر میران شاہ کی مانند تم بھی مٹی میں مل جاؤ گی۔''
قہر آلود لہجے میں کیسا دل خراش انکشاف کیا تھا اس نے کہ انزلہ اپنی جگہ سے ہل تک نہ سکی تھی۔
...لیوسنی دادا کے زوردار تھپڑ کی شدت سے اس کا گال دہک رہا تھا مگر ابھی ابھی جو نشتر ساعتوں
...ا ریعے دل میں اترا تھا اس کی تکلیف اس طمانچے کی تکلیف سے کہیں بڑھ کر تھی۔

❀❀❀

تیری قربتیں بھی سراب تھیں، یہ بھلا ہوا کہ ملی نہیں
تیری دوریاں بھی عذاب ہیں، میری جان لے کے ٹلی نہیں
مجھے زندگی وہ دیا لگے کہ کبھی بجھے جو ہوا لگے
کبھی کیا لگے، کبھی کیا لگے، کسی زاویے پہ یقیں نہیں
پسِ چشمِ نم وہ ضرور ہے، میرا دل جفاؤں سے دور ہے
میری منزلوں کا قصور ہے، تیرے راستوں سے ملی نہیں

اس کے کچے بوسیدہ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی، مگر وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی اپنی شریانوں میں
...ا نے والے درد کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
پورے دو دن ہو گئے تھے۔ اسے قطعی اجنبی جگہ پر قید ہوئے، پچھلے دو روز میں شاہ زر آفندی نے
...ا ...ت کی تمام اخلاقی قدروں کا گلا گھونٹتے ہوئے اس سے مکمل بے پروائی برتی تھی۔ اپنی دو روز پہلے
...ا ...ری وارننگ کے بعد اس نے پلٹ کر اس کے زندہ یا مردہ ہونے کی خبر لینا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔
الو شہ کا دل کسی سوکھے پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔
بار بار اپنے بابا سید کمال الرحمٰن یزدانی اور بھائی زاور علی حسن کے چہرے یاد کر کے اس کے اندر
...لی چیز کٹ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یزدانی پیلس میں اس کی یوں اچانک گمشدگی کو اس کی
...لی ماں نے کس رنگ میں پیش کیا ہوگا۔ کیسا کیسا کیچڑ نہیں اچھالا گیا ہوگا اس کے کردار پر۔
وہاں موجود دوسرے لوگوں کو تو کانوں کان خبر نہیں ہوئی ہوگی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟
اس کے بابا جو پہلے ہی دل کے مریض تھے ان کا کیا حال ہوا ہوگا؟
کیا کیا وسوسے اور خدشے نہیں آئے ہوں گے ان کے ذہن میں......؟
وہ جتنا سوچ رہی تھی اتنے اس کے اعصاب شل ہو رہے تھے۔
پیاس کی شدت سے اس کا گلا سوکھ گیا تھا۔ پچھلے دو روز سے پانی کا ایک گھونٹ بھی اس کے حلق
...ں ...ں گیا تھا۔ سنسان ویران جگہ پر اپنی تنہائی کا خوف اسے مزید سہما گیا تھی۔ اس وقت شاہ زر
...ا ...ں سے بے تحاشا نفرت کے باوجود وہ اس کی مما نائلہ بیگم کی زندگی اور جلد صحت یابی کے لیے
...ا ...رہی تھی۔
...گھٹن کچے کمرے میں اس وقت اسے وہاں روزمرہ زندگی کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی

جسے کھا کر وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھا لیتی۔

بے بسی کے شدید احساس سے مغلوب ہو کر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

ابھی نہ جانے اور کب تک اسے اسی قید خانے میں مقید رہنا تھا۔

صبح سے پھر رات ہونے کو آئی تھی۔ اسے اب بے حد نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ عین اسی لمـ
کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا تھا۔ انوشہ سمٹ کر مزید خود میں سمٹ گئی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتـ
ہی اس نے لائٹ آن کی تھی۔

بے حد بکھرے ہوئے سراپا کے ساتھ اس وقت وہ خود بھی بکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ شدتـ
گریہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

اس وقت اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت ناک سنجیدگی چھلکتی' اس کے اندر کے خراب طوفا
موسموں کا پتہ دے رہی تھی۔ گداز لبوں پر جمی خاموشی یوں لگ رہی تھی جیسے طوفان گزرنے کے بـ
اجڑی ہوئی بستیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

سرخ سرخ جلتی نگاہوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اس کی طرف دیکھ نہیں پائی تھی۔ تبھ
وہ جینز کی پاکٹس میں دونوں ہاتھ گھسائے' مضطرب سا دائیں طرف بنی ہوئی کھڑکی کی طرف چلا آ
تھا۔ بہت سے پل خاموشی کی نذر ہوئے تھے۔

اس دوران نہ تو انوشہ نے اپنے ہونٹوں کو جنبش دینے کی جسارت کی نہ ہی اس نے زبان سـ
حرف نکالا۔

خاصی دیر کے بعد وہ ہمت کر کے اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

''شاہ زر! خدا کے واسطے مجھ پر رحم کرو' میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں' پلیز مجھے جانے دو۔''

اسے اس کی مسلسل خاموشی سے خوف آ رہا تھا۔ تبھی گڑگڑائی تو وہ بھڑک کر رہ گیا۔

''بکواس بند کرو......''

وہ چلایا تھا۔ انوشہ سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''مت یہ ٹسوے بہا کر دکھاؤ مجھے' اب کوئی اثر نہیں ہونے والا مجھ پر۔ مر گیا ہے میرے اندر ا
شریف انسان۔ اب جو شخص تمہارے سامنے کھڑا ہے' وہ صرف پتھر ہے' گونگا بہرا پتھر۔ اب اس پتھر
سے جتنا سر ٹکراؤ گی اتنا ہی تمہارا نقصان ہوگا۔''

شدتِ گریہ سے سرخ آنکھیں اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ رویا تھا۔ انوشہ کے اندر بہت سـ
وسوسے سر اٹھانے لگے۔

''مگر...... میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔ مجھے کس چیز کی سزا دے رہے ہو تم......''

پھر سے دہائی دیتے ہوئے اس کی آواز بھیگی تھی۔ جواب میں وہ پھر سلگ اٹھا۔

''میری ماں نے بھی تمہارے بھائی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ اس کے باوجود وہ اسپتال میں چو
گھنٹوں کے اندر اندر زندگی اور موت کی جنگ لڑتی بالآخر موت کی بانہوں میں جھول گئیں۔ دوسر
کے گھروں میں خوشیوں کے چراغ بجھا کر تم لوگ اپنے گھر میں اجالا کیسے کر سکتے ہو......''

اس کا اندر جل رہا تھا۔ انوشہ چاہنے کے باوجود اسے کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔

''قصور پوچھتی ہوناں تم اپنا' تو سنو۔ تمہارا قصور یہ ہے کہ تم زاور کی بہن ہو' اس زاور علی حسن کی
ہ بہ ل بہن کو عین اس کے نکاح کے روز بیوٹی پارلر سے بھگا کر لے گیا۔ اسی کتے کی وجہ سے میری
ا ل جان چلی گئی۔''
قطعی خونخوار انداز میں اس کے بال نوچتے ہوئے وہ آخر میں جیسے ٹوٹ گیا تھا۔
''اب تم دیکھنا انوشہ رحمٰن' میں تمہارے اس ذلیل بھائی کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ میرے ساتھ
ہوا سو ہوا' اب اس کی عزت کے ساتھ میں جو کروں گا' اس کا تماشا پورا شہر دیکھے گا۔''
اس کی صرف آنکھوں میں ہی نہیں لہجے میں بھی شعلے لپک رہے تھے۔ تبھی وہ گڑگڑائی تھی۔
''خدا کا واسطہ ہے شاہ زر آفندی۔ میرا گلا گھونٹ دو اور جا کر میرے بھائی سے کہہ دو کہ تم نے
ا اپنا انتقام لے لیا ہے مگر پلیز میرے دامن پر کوئی داغ مت لگانا' پلیز......''
اس کے تیور دیکھ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے تھے۔ مگر اس پر اس کی
کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔
مکمل قہر کی علامت بنا وہ اس سے کہہ رہا تھا۔
''اتنی سستی موت نہیں دوں گا تمہیں۔ ابھی تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا ہے۔ اس آگ کو بجھانا ہے
تمہارے بھائی نے میرے اندر بھڑکائی ہے۔''
اس کے سلکی بال بے دردی سے اپنی مٹھی میں جکڑتے ہوئے اس نے زوردار جھٹکا دیا تو انوشہ کی
چیخ نکل گئی۔
''چلو شاباش' فی الحال یہ قلم پکڑو اور اپنے باپ کے نام خط لکھو۔''
اس وقت غصے کی آگ میں جلتا وہ انسانیت سے بے بہرہ ہو رہا تھا۔
انوشہ خود کو اس کی قید میں قطعی بے بس محسوس کر رہی تھی۔

❁❁❁

یزدانی پیلس میں نائلہ بیگم کی رحلت کے بعد گویا بھونچال آ گیا تھا۔
سائرہ بیگم کے کوسنے اور بددعائیں ہمہ وقت زاور اور انوشہ کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھتی تھیں۔
ا رخصت انوشہ سے ملتے ہوئے جو الفاظ اس نے سائرہ بیگم سے نفرت اور بیزاری کے اظہار کے
ادا کیے تھے وہ انہی الفاظ کو اس کی دھمکی مان کر اسے شافیہ کا کڈنیپر قرار دے رہی تھیں۔
اس سے قبل وہ شافیہ میں اس کی دلچسپی سے بھی قطعی بے خبر نہیں تھیں لہٰذا نائلہ بیگم کی رحلت کے
بعد انہوں نے مسلسل سب کی نگاہ سے زاور اور انوشہ کو گرانے کا کام جاری رکھا تھا۔
شافیہ کے ساتھ ہی انوشہ کی اچانک گمشدگی نے ان کے بیان کو خاصی تقویت دی تھی۔ سائرہ
بیگم کا یقین تھا کہ زاور ہی شافیہ اور انوشہ کو لے کر اچانک کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ کمال صاحب تو پہلے
ہی بستر سے لگے تھے اب تو ان کی حالت مزید خراب ہو گئی تھی۔ انہیں وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ ان
کے بچے ان کے ساتھ یوں بڑھاپے میں رسوائی کا کھیل کھیلیں گے۔
ساحل' اشنان اور بریرہ بھی زاور اور انوشہ سے مزید بدگمان ہو گئے تھے۔ زاور علی حسن کے

بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس کا سیل فون بھی مسلسل آف مل رہا تھا جس کی وجہ سے اس پر لگا الزام مزید پکا ہو گیا تھا۔ ساحل یزدانی کے لیے یہ تمام صورتحال بے حد پریشان کن تھی لہٰذا آج کل زیادہ وقت گھر پر ہی گزار رہا تھا۔

نزہت آرا بیگم ذاتی رنجش کے باوجود دو تین بار یزدانی پیلس آ کر سائلہ بیگم سے ان کی بہن کی وفات پر اظہارِ افسوس کر چکی تھیں مگر سائلہ بیگم نے ان سے سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ زاور حسن کے بارے میں باقی سب لوگوں کی مانند وہ خود بھی لاعلم تھیں۔

اس وقت یزدانی پیلس میں پھر نائلہ بیگم کے لیے قرآن خوانی ہو رہی تھی۔ کمال صاحب کی طبیعت بڑی مشکل سے سنبھلی تھی۔ اس وقت وہ بھی سب کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھے سید جمال صاحب کے ساتھ گفت وشنید کر رہے تھے جب اچانک ڈور بیل بج اٹھی تھی۔

ساحل' اشنان اور شاہ زر تینوں ہی گھر پر تھے۔ اس وقت کسی اور کے اٹھنے سے پہلے ہی شاہ زر نے خود اٹھ کر گیٹ کھولا اور اگلے دو تین منٹ کے بعد ایک خاکی رنگ کا لفافہ ہاتھ میں لیے سائلہ بیگم کے پاس چلا آیا۔

''آنٹی...... یہ خط کوئی انکل کے نام دے کر گیا ہے......''

سائلہ بیگم جو نم آنکھوں کے ساتھ سپارہ پڑھنے میں مصروف تھیں' اچانک چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ پھر خط اس کے ہاتھ سے لے کر بریرہ کو تھما دیا۔

''دیکھو بریرہ...... کیا لکھا ہے اس میں......''

ایک نظر کچھ ہی فاصلے پر بیٹھے سید کمال یزدانی صاحب پر ڈالنے کے بعد انہوں نے اپنی بیٹی سے کہا تو اس نے بلند آواز میں خط چاک کر کے سب کو سنانا شروع کر دیا۔ لکھا تھا۔

''پیارے بابا! مجھے معاف کر دیجئے گا کہ میں آپ کی اجازت کے بغیر گھر سے بھاگ رہا ہوں۔ زاور بھائی کو بھی معاف کر دیجئے گا کہ انہوں نے بھی آپ کی اجازت کے بغیر زبردستی شانیہ کو کڈنیپ کر لیا ہے۔ آئندہ ہمارا آپ سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ خدا حافظ۔''

یہ لکھائی وہ لاکھوں میں پہچان سکتے تھے۔ اس وقت سائلہ بیگم کے سامنے ان کی ہستی پھر زمیں بوس ہوئی تھی۔

❋❋❋

مجھے وہ لاکھ ستائے مگر اس شخص کی خاطر
میرے دل کے اندھیروں میں دعائیں رقص کرتی ہیں
اسے کہنا کہ لوٹ آئے سلگتی شام سے پہلے
کسی کی خشک آنکھوں میں صدائیں رقص کرتی ہیں
خدا جانے کشش کیسی ہے اس کی یاد میں یارو
میں اس کا ذکر چھیڑوں تو ہوائیں رقص کرتی ہیں

ایس پی شجاع حسن سے چوری وہ ارسلان سے ملنے اپنے گھر سے قریبی پارک میں آئی تھی۔ دل کا حال اس وقت عجیب تھا۔ کتنے دن ہو گئے تھے اس نے وہ چہرہ نہیں دیکھا تھا جسے ایک لحہ دیکھ

بالیر بھی اسے چین نہیں آتا تھا۔
وہ تقریباً آدھا گھنٹہ پارک میں بیٹھی اس کی راہ دیکھتی رہی تھی۔ جب وہ شانِ بے نیازی سے بائیک ڈرائیو کرتا وہاں پہنچا تھا۔ امامہ نے دیکھا کہ اس کے چہرے یا جسم پر اس کے ہجر کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ اس وقت وہ پہلے سے زیادہ فریش دکھائی دے رہا تھا۔
مکمل بلیک جینز شرٹ میں اس کی وجاہت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ امامہ کا دل اسے دیکھ کر مچل اٹھا تھا۔
''ہیلو مون' کیسی ہو......؟''
سن گلاسز اپنے ریشمی گھنے بالوں میں پھنساتے ہوئے وہ اس کے مقابل آ بیٹھا تھا۔ جب وہ بولی۔
''تمہیں کیسی دکھائی دیتی ہوں......؟''
''بہت خوبصورت' کہو کیوں ملنا چاہتی تھیں مجھ سے؟''
وہ ہوا کے رتھ پر سوار تھا۔ امامہ کی اداس آنکھوں میں بے ساختہ شکوہ امڈ آیا۔
''کیا اب تم سے ملنے کے لیے مجھے وجہ تلاشنی پڑے گی؟''
''نہیں' میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔''
''تم بہت بدل گئے ہو ارسلان۔''
''او کم آن مون' یہ بچوں کی طرح فضول سوچنا چھوڑ دو اب......''
وہ جھنجلایا تھا۔ امامہ خاموش رہ گئی۔
''بس' یہی بتانے کے لیے آئی تھیں تم یہاں......؟''
کچھ دیر بعد قدرے برہم انداز میں اس نے پوچھا تو وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔
''نہیں' مجھے تمہاری بہت یاد آ رہی تھی' ارسلان...... میں وہاں زیادہ دن نہیں رہ سکتی۔ پلیز مجھے اس آزمائش سے بری کر دو' میرے لیے تم سے دور رہ کر جینا بہت مشکل ہے۔''
''مجھے معلوم ہے۔ مگر یہ کام بھی تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا اور پھر کیا مجھے تمہارے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا......''
اس بار اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔ امامہ بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔
''اچھا یہ بتاؤ فائل کے بارے میں کچھ پتہ چلا کہ نہیں......؟''
اگلے ہی پل اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا تھا۔ جب وہ بولی۔
''ابھی تک تو کچھ پتہ نہیں چلا ہے۔ وہ ایس پی انتہائی چالاک اور گھاگ قسم کا انسان ہے۔ اس کا اعتماد جیتے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے۔''
''تو اعتماد جیتو ناں یار' کب اعتماد جیتو گی اس کا۔ جب وہ مجھے تختۂ دار تک پہنچا دے گا' تب'' اسے پھر غصہ آیا تھا۔ امامہ اس کے پل پل بدلتے روپ کو دیکھتی رہی تھی۔
''مجھے لگ رہا ہے تم سے کچھ نہیں ہوگا۔ نہ تم فضول سوچوں سے نکلو گی نہ کچھ کر سکو گی۔ یاد رکھو امامہ' اگر تم جلد از جلد وہ فائل حاصل نہ کر سکیں تو میں مما کے ساتھ ہمیشہ کے لیے یہ ملک چھوڑ کر چلا

جاؤں گا۔ پھر تمہارا جو دل چاہے وہ کرنا' میں کچھ نہیں کہوں گا۔ اب میں تم سے اسی وقت ملنے آؤں گا جب تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گی' خدا حافظ۔"

قطعی اجنبی انداز میں اپنا مدعا بیان کرنے کے بعد وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا جبکہ امامہ پھٹی پھٹی حیران نگاہوں سے اس کا یہ انداز بھی دیکھتی رہ گئی تھی۔

وہ بے درد تھا۔ اسے صرف اپنے مطلب سے غرض تھی۔ اس کے باوجود اس کا دل اس کے لیے کیوں تڑپتا مچلتا رہتا تھا اسے کبھی سمجھ نہیں آ سکی تھی۔

اس روز وہ پارک سے گھر واپس آئی تو اس کا دماغ بے حد بوجھل تھا۔

صد شکر کہ ایس پی کی بیٹی سکون سے سو رہی تھی ورنہ اس کی شامت لازمی بات تھی۔

شام ڈھل رہی تھی۔

ایس پی شجاع حسن اپنے چند دوستوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھا بلند آواز سے جانے کس مسئلے پر ڈسکس کر رہا تھا۔ وہ سست روی سے چلتی اپنے روم میں گھس آئی تھی۔

تھوڑی دیر میں ڈرائنگ روم سے آتی آوازوں کا شور تھما تو شجاع حسن ہلکے سے اس کے کمرے کا دروازہ ناک کرتے ہوئے اندر چلا آیا۔

"مس امامہ......"

"جی...... جی سر......"

لمحے میں بیڈ پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے سر پر دوپٹہ جمایا تھا۔ جب وہ بولا۔

"آپ پچھلے دو گھنٹوں سے گھر سے باہر تھیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے اطلاع کیے بغیر آپ کہاں گئی تھیں......"

اس کے تیور کڑے نہیں ہوتے تھے مگر اس کے باوجود وہ اس سے ڈرتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے غیر متوقع سوال پر اس کا دل بہت بری طرح سے دھڑکا تھا۔

"مارکیٹ تک گئی تھی سر...... سبزی اور گڑیا کا دودھ لانے' اچانک جانا پڑ گیا تھا اس لیے آپ کو انفارم نہیں کر سکی' سوری......"

فوری طور پر یہی بہانہ اس کے ذہن میں آیا تھا۔ شجاع گہری نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"اوکے' لیکن آئندہ ایسی صورت حال پیش آ جائے تو آپ مجھے اطلاع کر دیجئے گا۔ گھر کا سودا سلف لانا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔"

اس کا صرف دل ہی نہیں دھڑک رہا تھا' ہاتھ پاؤں بھی سرد پڑ گئے تھے۔

"جی...... بہت بہتر سر......"

کتنا مشکل تھا محبت میں سرخرو ہونا۔ شجاع حسن واپس پلٹ گیا تھا مگر وہ کافی دیر تک خود کو نارمل نہ کر سکی تھی۔

❋❋❋

اگلی صبح انوشہ کی آنکھ کھلی تو اس کا پورا وجود تیز بخار میں جل رہا تھا۔

رات روتے روتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ ابھی ہوش کی دنیا میں واپس آئی تو

بے حد بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ رات اپنے پورے ہوش و حواس میں جو تحریر اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ کے نام لکھی تھی اس تحریر کے الفاظ اسے جیتے جی مار دینے کو کافی تھے۔
زندگی پہلے ہی کب مہربان تھی اس پر کہ اس بے حس شخص نے اس سے عزت سے سر اٹھا کر جینے کا مان بھی چھین لیا تھا۔
اسے نہ صرف اپنی رسوائی پر رونا آ رہا تھا بلکہ وہ اپنے معصوم بھائی کے دامن پر خود کیچڑ اچھال چکی تھی۔ کتنا بے بس کر دیا تھا اس شخص نے اسے کہ وہ چاہ کر بھی فرار کا کوئی راستہ نہیں نکال پائی تھی۔
وہ رو رہی تھی جب کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔
اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا تو شاہ زر کو دروازے کے عین وسط میں کھڑے پایا۔ دونوں بازو باندھے وہ بڑی سنجیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔
''بس کرو محترمہ' ابھی اور بھی بہت سے ایسے مقام آئیں گے جب آپ کو ان آنسوؤں کی ضرورت پڑے گی۔ فی الحال تو اٹھ کر شاور لو' پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک روا رکھا جاتا ہے' شاباش......''
اس کے چہرے پر کل رات جیسی وحشت تھی نہ رنجیدگی۔ انوشہ رحمٰن کا رواں رواں اس وقت اس کے لیے بددعا بن گیا تھا۔
''میں گھر سے بھاگی ہوئی نہیں ہوں۔''
گھٹی گھٹی آواز میں وہ چلائی تھی۔ جب وہ خشک لبوں پر زہرخند مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا۔
''تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس احاطے سے باہر نکل کر دیکھو گی تو ہر آنکھ میں اپنے لیے ملامت پاؤ گی۔ سب کے نزدیک تم گھر سے بھاگی ہوئی بدکار لڑکی ہو۔ کل رات تم نے خود بھی اپنے ہاتھوں اس کا اقرار کیا ہے اور آج جب یہ خط تمہارے گھر والوں تک پہنچے گا تو تمہارے بارے میں تمہارے باپ کا رہا سہا یقین بھی بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ پھر میں دیکھوں گا تم اور تمہارا وہ کمینہ بھائی کیا کرتے ہو......؟''
انوشہ اس کے کرخت الفاظ پر بے بسی سے مسکرا کر رہ گئی تھی۔
''تمہیں یہ سب کر کے کیا مل جائے گا شاہ زر آفندی۔ کیا میری بربادی سے تمہاری مما زندہ ہو جائیں گی؟''
''نہیں...... مگر میرے اندر لگی یہ آگ ضرور کچھ سرد پڑ جائے گی۔''
''تم انسان نہیں' حیوان ہو۔''
اس کے الفاظ پر فوراً بلک کر اس نے دہائی دی تھی۔ جواباً وہ تنفر سے مسکرا دیا۔
''ابھی حیوانیت دیکھی کہاں ہے تم نے میری۔ بہرحال ابھی فوراً مجھے یزدانی پیلس پہنچنا ہے۔ آج کی رات پھر تم اسی کمرے میں قید رہو گی۔ صبح میں آؤں تو تم وہ تمام فرائض انجام دے چکی ہو گی جو یہاں مزارعوں کے ذمے تھے۔ صرف تمہارے لیے میں نے اپنے دوست سے کہہ کر یہ فارم ہاؤس لیا ہے۔ وہ بھی اس شرط پر کہ یہاں کا کوئی بھی کام رکے گا نہیں۔ یاد رکھنا کل صبح آ کر خبر لوں

گا تمہاری۔"
قطعی تضحیک آمیز انداز میں کہتا وہ کمرے سے باہر نکل گیا تو انوشہ وہیں کچے فرش پر سر گھٹنوں پر رکھ کر پھر رو پڑی۔
رات بھر وہ تیز بخار میں جلتی رہی تھی۔
شدید بھوک کی وجہ سے ہونے والی نقاہت نے اسے بے ہوش کر رکھا تھا۔ سخت سردی میں بدن کے ساتھ وہ نیچے کچے فرش پر بے یارومددگار پڑی تھی۔ خوبصورت سلکی بال بکھر کر گردن لپٹ چکے تھے۔ اس وقت اس کا حال اس قدر ابتر ہو رہا تھا کہ اگر وہ ہوش میں ہوتی تو شاید خود بے بسی پر پھوٹ کر رو پڑتی۔
کسی کو خبر ہی نہیں تھی کہ اس پر کیا گزر رہی تھی۔
سورج خاصا چڑھ آیا تھا جب اس کی آنکھ کھلی تھی۔
سر بے حد چکرا رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ شاید تبھی وہ پکاری تھی۔
"پ......پانی......"
کمرے میں داخل ہوتے شاہ زر آفندی نے اس کی صدا سن لی تھی تبھی الٹے پاؤں پلٹ کر کا گلاس بھر کر وہ دوبارہ کمرے میں چلا آیا تھا۔
"صبح بخیر محترمہ انوشہ رحمٰن صاحبہ' لیجئے ٹھنڈا ٹھنڈا پانی نوش فرمائیں۔"
نائلہ بیگم کی اچانک رحلت نے اس کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔
یوں تو انوشہ کے ساتھ اس کا سلوک پہلے بھی بہتر نہیں تھا مگر اس درجہ سنگدلی کا مظاہرہ وہ مرتبہ دیکھ رہی تھی۔ اس وقت بھی اس کے الفاظ پر اس نے اپنی نیند بھری متورم آنکھیں بمشکل کھول اس کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھنڈے پانی کا گلاس تھام لیا تھا۔
شدید بخار کی وجہ سے اس کا پورا وجود تنور کی مانند جل رہا تھا مگر اس کے باوجود شاہ زر آفندی نے اس پر رحم نہیں کیا۔
"چلو شاباش' جلدی سے یہ پانی پیو اور اصطبل میں کام کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"
سرخ ستے ہوئے چہرے سے نگاہ ہٹا کر وہ کرخت لہجے میں بولا تو انوشہ نے چند گھونٹ پانی کے بعد گلاس واپس زمین پر رکھ دیا۔
"مجھ میں اٹھنے کی ہمت نہیں ہے......"
"اچھا......تمہارے بھائی میں بہت کچھ کر گزرنے کی ہمت ہے......"
اس کے بے بسی سے کہنے پر وہ ہنسا تھا۔
"شکر کرو کہ ابھی تک وہ میرے ہاتھ نہیں لگا۔ جس دن میرے ہاتھ لگ گیا ایسی عبرت ناک موت دے کر ماروں گا کہ چیل کوے بھی اس کا مردہ گوشت نوچنے سے دور بھاگیں گے۔"
زبردستی اس کا بازو تھام کر کھڑے کرتے ہوئے اس نے اپنی نفرت کا اظہار کیا تو انوشہ ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔
"نہیں......تم ایسا نہیں کرو گے۔ خدا کا واسطہ ہے شاہ زر آفندی' مجھ پر اور میرے بھائی پر

لماؤ۔اس نے اگر کوئی غلط قدم اٹھایا بھی ہے تو اسے معاف کر دو' پلیز......"

"کیوں......میرا تم سے معاشقہ چل رہا ہے جو تمہارے کہنے پر میں اسے معاف کر دوں......"

اس کی حالت کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ چیخ اٹھی۔

"خدا کے قہر سے ڈرو شاہ زر آفندی۔ مت بھولو کہ تم اس پیارے نبی کی امت سے ہو جن کا یہ وہ ساری زندگی عفو و درگزر رہا۔ جن کے ہاتھوں کبھی دشمن کو بھی معمولی سی تکلیف نہیں پہنچی اور خدا' جس نے یہ ساری کائنات بنائی ہے وہ بھی جب چاہتا ہے اپنے گناہ گار بندے کو معاف کر دیتا ہے۔ پھر تم تو اس کے معمولی سے بندے ہو۔ تمہیں اتنا غرور کس چیز کا ہے......؟"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رو پڑی تھی۔

"ہاں ٹھیک کہتی ہو تم۔ خدا جب چاہتا ہے اپنے گناہ گار بندے کو معاف کر دیتا ہے مگر میں خدا نہیں ہوں' سمجھی تم......"

"خدا سے ڈرو شاہ زر آفندی۔ اس کی لاٹھی بے نیاز ہے۔"

"معلوم ہے مجھے۔ تم اپنا کام کرو......"

"کم آن بے بی۔ یوں چھوٹی چھوٹی تکلیفوں پر چلانا چھوڑ دو۔ یاد رکھنا جتنی تم بہن بھائیوں کو تکلیف ہو گی اتنا ہی میں سکون محسوس کروں گا۔"

وہ واقعی بے حس پتھر ہو چکا تھا۔ انوشہ آنسو پیتی رہ گئی۔

"چلو شاباش! سب سے پہلے اٹھ کر گھوڑوں کو چارہ ڈالو پھر اس کے بعد یہ کچرا سمیٹو تب تک میں یزدانی پیلس میں تمہاری بدبختیوں کے قصے سن لوں۔"

اسے کمرے سے نکال کر کچے احاطے کی طرف دھکیلتے ہوئے وہ مطمئن سا قریب پڑی کھجور کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پھر شرٹ کی جیب سے اپنا قیمتی موبائل نکال کر یزدانی پیلس کے نمبر پریس کرنے کے بعد دوسری طرف سے کال پک ہوتے ہی بولا۔

"السلام علیکم آنٹی' انکل کی طبیعت کیسی ہے......؟"

انوشہ جو گھوڑوں کے لیے رکھے چارے پر اوندھے منہ گری تھی' پھر سے سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔

"اوہ گاڈ......ڈاکٹر کیا کہتے ہیں......؟"

ایک نظر انوشہ کے پریشان چہرے پر ڈالتے ہوئے وہ قدرے بلند لہجے میں بولا تو انوشہ تڑپ کر اس کے قریب چلی آئی۔

"ٹھیک ہے۔ دوپہر میں چکر لگاؤں گا آپ کی طرف۔ خدا حافظ۔"

انوشہ کو یقین تھا کہ وہ سائلہ بیگم سے ہی بات کر رہا تھا۔ لہٰذا اس نے جیسے ہی کال ڈس کنکٹ کی وہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا ہے میرے بابا کو......؟"

"ہارٹ اٹیک! اور وہ بھی شدید قسم کا۔ پتہ نہیں بچ کیسے گئے......"

انوشہ کے دل پر پھر گھاؤ لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آئے تھے مگر شاہ زر نے پروا نہیں کی۔

"خدا کا واسطہ ہے شاہ زر آفندی۔ مجھے بے موت مت مارو۔ میری بربادی سے تمہاری مما زندہ

تو نہیں ہو جائیں گی......؟"

"بکواس بند کرو' تمہاری فضول بک بک سننے کے لیے نہیں آیا ہوں میں۔ جیسا کہا ہے ویسا کرو۔ نہیں تو تمہارے بدن کی کھال ادھیڑنے میں' میں کسی لچک کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔"

اسے بے حسی سے پرے دھکیلتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر اچانک کچھ یاد آنے پر پلٹتے ہوئے بولا۔

"یہ جگہ تمہارے لیے غیر محفوظ نہیں ہے۔ قرب و جوار میں کچھ گھر ہیں لیکن یہاں کوئی بھی تمہاری موجودگی سے آگاہ نہیں ہے لہٰذا فضول میں شور شرابہ کر کے اگر تم کسی کو اپنی یہاں موجودگی سے باخبر کرو گی تو اس کے نتائج کی ذمہ داری بھی تم پر ہو گی' سمجھیں......"

انوشہ اس سے نظر ملا کر جھکا بھی نہ سکی تھی کہ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے احاطے سے باہر نکل کر لکڑی کے بڑے گیٹ کو پھر سے لاک کر گیا۔ انوشہ پلٹ کر چارپائی پر بیٹھنے لگی تو وہاں کچھ پھل پڑے دیکھ کر رو پڑی۔

زندگی کبھی ایسے دوراہے پر لے آئے گی' اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

❋❋❋

سانول شاہ' اسے میران شاہ کی موت کی خبر دے کر پلٹا تھا مگر انزلہ اس کے سامنے آ گئی۔

"کیا کہا تم نے' میران شاہ کی ڈیتھ ہو گئی ہے......؟"

اس کی بڑی بڑی روشن نگاہوں میں حد درجہ بے یقینی تھی۔ سانول شاہ چاہنے کے باوجود اپنی نظریں اس کے چہرے سے نہیں ہٹا سکا۔

"ہاں' پچھلے سال انہی دنوں میں قتل ہو گیا تھا وہ......"

"کیا......؟"

اسے دھچکا لگا تھا۔ بہت بڑا دھچکا۔

"تمہیں یقین نہیں آ رہا۔ آ بھی کیسے سکتا ہے۔ اس کی محبوبہ جو ٹھہریں......"

اس کے حال سے بے نیاز وہ اس پر تیر برسا رہا تھا اور انزلہ کی سماعتیں جیسے سن ہوتی جا رہی تھیں۔

"کس نے قتل کیا اسے......؟"

بہت دیر کے بعد وہ چلا کر بولی تھی۔ جواب میں سانول کی آنکھیں پھر سے سرخ ہو گئیں۔

"میں نے......"

کتنے آرام سے اس نے اعتراف کر لیا تھا۔ وہ چیخی تھی۔

"کیوں...... تمہارا کیا بگاڑا تھا اس نے......؟"

"یہ ابھی تم نہیں سمجھو گی' جاؤ گھر جا کر آرام کرو......"

اسے بازو سے پکڑ کر سائیڈ پر کرتے ہوئے وہ بظاہر آرام سے بولا تھا مگر انزلہ شاہ سلگ کر رہ گئی۔

"چھوڑو مجھے' تم انسان نہیں حیوان ہو' سنی دادا۔ تم دیکھنا میں تمہارا وہ حال کروں گی کہ تم دوسروں کے لیے عبرت بن کر رہ جاؤ گے۔ سارا گاؤں تھو تھو کرے گا تم پر۔"

وہ جذباتی ہوگئی تھی۔

سنی دادا اپنی اس درجہ توہین پر اس پر ہاتھ اٹھائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''بہت بولتی ہو تم۔ لگتا ہے تمہارے لیے بھی کچھ سوچنا پڑے گا۔''

اسے اپنے طاقتور تھپڑوں سے زمین پر گرا کر اس نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ پھر اس نے پہلے کہ انزلہ کچھ کہتی' وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے قبرستان سے دور ہوتا چلا گیا۔

❊❊❊

تجھ کو پانے کی تمنا تھی جو پوری نہ ہوئی
کوئی حسرت ہی نہیں' حسرتِ ناکام کے بعد
مجھ کو جس شام تو آ کے ملا تھا سنگدل
شام ویسی نہیں آئی' پھر اس شام کے بعد

رات کے تقریباً دو بج رہے تھے اور وہ اکیلا سرد ہواؤں کے سنگ سرسبز لان میں کین کی چیئر پر بیٹھا تھا۔ زمین کے کسی بھی گوشے میں سکون نامی کوئی چیز نہیں تھی۔

ایسا تو نہیں تھا وہ۔ آج تک اس کے ہاتھوں کسی بھی عورت کی تذلیل نہیں ہوئی تھی۔

وہ تو خواتین کی بے حد عزت کرنے والا تھا۔ خود اس کی اپنی بہن شافیہ سے محبت مثالی تھی۔ وہ ایک پل کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل ہوتی تو اس کی جان پر بن آتی تھی۔ اسے ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رکھنے کے لیے ہی اس نے ساحل یزدانی کے ساتھ اس کی نسبت طے ہونے پر آمادگی کا اظہار کیا تھا ورنہ وہ اس کی خوشی کے خلاف کیسے جا سکتا تھا۔

مگر ہوا کیا تھا......؟

وہ اس کی اور اس کی پیاری مما کی بے لوث محبتوں کو ٹھوکر مار کر چلی گئی تھی۔ وہ جب بھی یہ سوچتا تھا کہ اس کی مما نے ان دونوں کے لیے کتنی مشقت جھیلی' کس مشکل سے انہیں پروان چڑھا کر پڑھایا لکھایا' پھر ان دونوں کی شادی کے حوالے سے کیا کیا خواب نہیں دیکھے مگر انہیں صلہ کیا ملا؟ جس اولاد کے لیے وہ زندگی بھر تکلیفیں جھیل کے جیتی رہیں' اسی اولاد کے دکھ نے انہیں قبر کے اندھیروں کے سپرد کر دیا۔

اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ کہیں سے شافیہ کو ڈھونڈ کر اپنے ریوالور کی ساری گولیاں اس کے وجود میں اتار دے۔

نائلہ بیگم کی یاد اسے ہر لمحہ جیسے پاگل کیے رکھتی تھی۔

جس روز شام میں انہوں نے آئی سی یو میں بے ہوشی کے دوران دم توڑا تھا اس روز اگر اس کا بس چلتا تو وہ ساری دنیا کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا۔ نائلہ بیگم کے سوئم تک وہ کس عذاب کی کیفیت سے گزرا تھا یہ صرف اس کا دل جانتا تھا۔

اس وقت پھر انوشہ رحمٰن کا سراپا اس کی نگاہ میں لہرایا تھا۔ یہ سوچ بھی دل کے کسی کونے میں ابھری تھی کہ وہ اس معصوم سی بے قصور لڑکی کو کیوں اپنے انتقام کی بھینٹ چڑھا رہا ہے۔ اگر اس کی بہن اپنے نکاح کے دن بھاگ گئی تھی تو اس میں اس سادہ سی لڑکی کا کیا قصور تھا؟ گناہ اگر بھائی نے

کیا تھا تو سزا بہن کو کیوں مل رہی تھی۔ وہ اپنے عمل پر نظر ثانی کرنا چاہتا تھا مگر پھر اچانک اسے وہ گھڑیاں یاد آ گئیں جب ان کے گھر میں کھچا کھچ بھرے مہمانوں کے بیچ یہ بات اڑی تھی۔

''دلہن بھاگ گئی' ارے نائلہ کی بیٹی پارلر سے فرار ہوگئی......''

یہ آگ اس کے گھر تک کیسے پہنچی' وہ نہیں جانتا تھا مگر مختلف عورتوں کے تبصروں اور سائلہ بیگم کے زاور علی حسن کے خلاف واویلے نے اس کے اندر وحشت بھر دی تھی۔

جلتے الاؤ پر تیل چھڑکنے کا کام اس کی پیاری مما کے ہارٹ اٹیک نے کیا تھا۔

آئی سی یو میں زندگی اور موت کی جنگ لڑتے ہوئے صرف ایک بار ہوش میں آنے پر بھی شافیہ کو پکارتی رہی تھیں۔ وہ بے درد نہیں تھا نہ ہی انوشہ رحمٰن کو انتقاماً کڈنیپ کر کے اس پر تشدد کرنے کا کوئی ارادہ تھا اس کا' مگر...... اپنے گھر میں اٹھتے طوفان اور اپنی مما کی حالت کے پیش نظر اسے بغیر سوچے سمجھے یہ قدم اٹھانا پڑا تھا۔

اپنی محبوب مما کی ناگہانی وفات اور رشتہ داروں کی زہر میں بجھی اشتعال انگیز باتوں نے اسے انسان سے حیوان بنا دیا تھا۔ اوپر سے زاور حسن کی اچانک گمشدگی نے اس کے شک کو مزید پکا کر دیا اور چونکہ وہ اس تک نہیں پہنچ پایا تھا لہٰذا اس کی بہن انوشہ رحمٰن کو اس کے ظلم اور تشدد کا شکار ہونا پڑا تھا۔

انوشہ رحمٰن کا خیال آتے ہی وہ پھر سے مضطرب ہو گیا تھا۔

آنسوؤں سے لبالب بھری نگاہیں' تیز بخار میں تپ کر کپکپاتا وجود اور بھوک سے کملایا چہرہ اسے پریشان کر رہا تھا مگر اس نے خود کو نرم پڑنے نہیں دیا۔

''نہیں...... مجھے انوشہ رحمٰن کے معاملے میں بزدلی نہیں دکھانی۔ جس طرح اس ذلیل انسان نے مجھے میری بہن کے ذریعے تکلیف پہنچائی ہے میں بھی اسی طرح اسے اس کی بہن کے ذریعے تکلیف پہنچاؤں گا......''

اسی وقت لان سے اٹھتے ہوئے اس نے سوچا تھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر سے باہر نکل آیا تھا۔

کیسی ویرانیاں اتر آئی تھیں اس کے گھر میں......؟

اس کا دل بہت بری طرح سے جل رہا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔ سرد سرسراتی ہوائیں جسم میں عجیب سی کپکپی دوڑاتی اسے مزید بے کل کر رہی تھیں۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ ڈرائیونگ کے دوران بھی کپکپا رہے تھے۔

اس کا ارادہ ہوا خوری کا تھا مگر جانے کیا سوچ کر وہ فارم ہاؤس کی طرف چلا آیا تھا۔

سخت ٹھٹھرتی رات کے ساڑھے تین بجے جب وہ لاکڈ لکڑی کا گیٹ کھول کر احاطے کے اندر داخل ہوا تو وہاں موجود گھوڑے اسے دیکھ کر ہنہنائے تھے۔ وہ گرد و پیش پر سرسری سی اک نگاہ ڈالنے کے بعد اس کمرے کی طرف چلا آیا تھا جہاں اس نے انوشہ کو مقید رکھا تھا۔

اندر کمرے میں سخت سردی کے باعث کپکپاتے ہوئے وہ ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے دبکی بیٹھی تھی۔ جب اس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔

❁❁❁

سامنے کوئی راستہ بھی نہیں
میرا خود ہی سے رابطہ بھی نہیں
یاد رکھنا بھی اک عذاب ہوا
بھول جانے کا حوصلہ بھی نہیں
ایک دن وہ مجھے بلائے گا
کیا یقیں ہے کہ ٹوٹتا بھی نہیں
وسوسے دل کو کیوں ستاتے ہیں
وہ ابھی تک تو بے وفا بھی نہیں
لمحہ لمحہ تمہارے نام ...... کیا
اور کچھ میرے پاس تھا بھی نہیں

دنیا میں محبت سے بڑھ کر کوئی چیز قیمتی نہیں ہوتی
اس کے لیے بھی ارسلان حیدر کی محبت سے بڑھ کر کچھ نہیں تھا۔

اس وقت وہ میٹرک کلیئر بھی نہیں کر پائی تھی جب اچانک اس کے والد وفات پا گئے تھے۔ گو وہ زیادہ مالدار نہیں تھے مگر پھر بھی ان کے ہوتے ہوئے امامہ نے کبھی زندگی کے تلخ ترین، بھیانک روپ نہیں دیکھے تھے۔ ماں تو پہلے ہی بیمار رہتی تھی اب اس سانحے کے بعد تو ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔

ان دنوں وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنی زندگی کے انتہائی بدترین دن گزار رہی تھی انہی دنوں ارسلان حیدر کی مما نے انہیں سہارا دیا تھا۔

اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ اپنے آوارہ بیٹے کے ساتھ انتہائی شاندار بنگلے میں اکیلی رہتی تھیں۔ پسند کی شادی کا جرم کرنے کے باعث ان کا اپنے سسرال یا میکے سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ماں کے بے جا لاڈ پیار اور باپ سے محرومی کے باعث ارسلان بہت زیادہ بگڑ چکا تھا۔

امامہ کے والد رفیق حسن صاحب کی ان سے دور پرے کی رشتہ داری تھی لہٰذا ان کی رحلت کے بعد ان کی بیوی اور بیٹی پر ترس کھاتے ہوئے اور کچھ اپنا مفاد سوچتے ہوئے وہ ان دونوں ماں بیٹی کو اپنے ساتھ گھر لے آئی تھیں۔

گھر میں روپے پیسے کی فراوانی تھی لہٰذا امامہ اور اس کی والدہ زینت بیگم کے آنے کے بعد ان کی ملازموں والی پریشانی بھی دور ہو گئی تھی اور خود پر لاحق ذمہ داریوں سے بھی جان چھوٹ گئی تھی۔

امامہ نے یہاں آتے ہی گھر کا سارا انتظام خود سنبھال لیا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنی تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ ان دنوں ارسلان میٹرک کا امتحان دے رہا تھا۔ جبکہ وہ فرسٹ ایئر کلیئر کر رہی تھی۔ ارسلان اس سے ایک سال چھوٹا تھا مگر پھر بھی وہ اس کا بے حد احترام کرتی تھی۔ جن دنوں زینت بیگم کا انتقال ہوا اس وقت تک ارسلان کے ساتھ اس کی اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔

ارسلان ہی تھا جس نے اس کی والدہ کی رحلت کے بعد اسے بکھرنے سے بچا کر پھر سے جینے پر مائل کیا تھا۔

وہ اس کے ساتھ بہترین دوستوں کی طرح پیش آتا تھا۔ کبھی بلاوجہ تنگ کرتا' کبھی رعب جما
کبھی ڈراتا' کبھی چڑاتا اور اگر کبھی وہ روٹھ جاتی تو نہایت پیار و اپنائیت سے مناتا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کی
محبت کے سحر میں جکڑتی چلی گئی تھی۔

ارسلان کی مما حفصہ بیگم' گردے اور گھٹنوں کے درد کے باعث بستر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔
اب امامہ کی ذمہ داریاں مزید بڑھ گئی تھیں۔

اگر کوئی اس سے پوچھتا کہ پوری کائنات میں اسے کون سی چیز سب سے زیادہ محبوب
بلا جھجک کہہ دیتی۔

''ارسلان حیدر کی محبت......''

کوئی اس کی محبت کی گہرائی کو نہیں جان پایا تھا۔ وہ کس حد تک اس کی دیوانی تھی شاید
ارسلان حیدر کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اب تو اکثر وہ خود بھی اپنی شدتوں سے گھبرا جاتی تھی اور ارسلان
چیز سے فائدہ اٹھا کر اس سے محبت کی قیمت وصول کر رہا تھا۔

جانے اس نے اس کے بارے میں کیا کہہ کر حفصہ بیگم کو مطمئن کیا تھا۔

اسی کی یادوں اور سوچوں میں کھوئی وہ پلکیں موندے بیٹھی تھی۔ جب شجاع حسن کی بیٹی
ہو گئی۔ بیدار ہوتے ہی اپنی عادت کے عین مطابق اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔

امامہ کو اس وقت اس کا بین بجانا انتہائی ناگوار گزرا تھا لہٰذا ایک کرارا سا تھپڑ اس کے معصوم
گال پر دے مارا جس کی وجہ سے اس کے رونے میں اور شدت آ گئی۔ تب جھنجلاتے ہوئے
غصے میں آ کر امامہ نے اپنا ہاتھ مضبوطی سے بچی کے منہ پر جما دیا۔ اس وقت اس کا دل چاہ رہا
وہ بچی کی اتنی پٹائی کرے کہ وہ ساری عمر کے لیے رونا بھول جائے۔ اکثر وہ اس پر اپنا غصہ اتا
کے لیے اس کے زور سے چٹکی کاٹ لیتی۔ کبھی زیادہ غصہ آتا تو زمین پر پٹخ دیتی۔ مگر آج تو اس
غصہ کنٹرول کرنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔

اس کا بس نہ چلتا تھا کہ بچی کو جان سے مار ڈالتی۔

باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ خوش بختی سے آج قدرت اللہ صاحب بھی گھر پر نہیں تھے لہٰذا
کے منہ سے ہاتھ ہٹا کر اسے زور زور سے ہلکورے دیتی باہر لان میں لے آئی جہاں تیز ہوا اور
کی موٹی موٹی بوندوں نے سبز گھاس کو جل تھل کر دیا تھا۔

اس وقت اپنے غصے کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے اس نے بچی کو لان میں کرسی پر بٹھایا ا
مزے سے لاؤنج میں چلی آئی۔ بچی کے بلند آواز میں رونے کی آواز اسے وہاں بھی واضح
دے رہی تھی۔ خانساماں اس وقت آتا نہیں تھا۔ صفائی والی فارغ ہو کر جا چکی تھی اور چوکیدار آ
ہی نہیں تھا۔ سو دل کی حسرت پوری کرنے اور بچی کو سبق سکھانے کا نادر موقع اسے پھر کبھی میسر
آنا تھا۔

بچی جتنی بے بسی سے حلق پھاڑ کر رو رہی تھی اسے اتنا ہی مزہ آ رہا تھا۔

شجاع حسن کی اسٹڈی کا دروازہ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی لاک تھا جس پر مزید تپتے
وہ اپنے لیے ایک کپ چائے بنا کر وہیں لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ کے بعد بچی رو رو کر نڈھال ہوگئی تو خود ہی چپ بھی ہوگئی۔

تب وہ چائے کا خالی کپ واپس کچن میں رکھنے کے بعد مسکراتے ہوئے لان کی طرف آئی تو بچی کو نیچے زمین پر گملے کے پاس گرا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

چھوٹی سی پیشانی سے بہتا خون اسے پریشان کر گیا تھا۔ لہٰذا لپک کر بچی کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا۔ پھر اندر اپنے کمرے میں بیڈ پر لٹا کر وہ جلدی سے فرسٹ ایڈ بلس نکال لائی۔ لمحوں میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

بچی کی پیشانی سے خون صاف کرتے ہوئے اس کے ہاتھ واضح کپکپا رہے تھے۔

یقیناً اس واقعے کے بعد شجاع حسن اسے ایک لمحے میں ملازمت سے فارغ کر سکتا تھا اور اگر ایسا ہو جاتا تو وہ ارسلان کے سامنے کیا منہ لے کر جاتی۔ اسے کیسے قانون کی گرفت سے بچاتی؟

اس نے تو سوچا تھا کہ بچی بارش میں بھیگنے کے بعد سردی کا شکار ہو جائے گی۔ پھر اسے تیز بخار ہوگا اور ہو سکتا ہے اسی بخار میں وہ مر جائے اور اس کی جان چھوٹ جائے مگر معاملہ بگڑ گیا تھا۔ وہ چپ چاپ مرنے کی بجائے پیشانی پر چوٹ کھا کر اس کے لیے مزید ٹینشن پیدا کر چکی تھی۔

شام میں شجاع گھر واپس آیا تو بچی گہری نیند کے زیر اثر سو رہی تھی۔

اس کی پیشانی پر بندھی سفید پٹی تا حال خون سے سرخ تھی۔ امامہ بچی کے قریب بیٹھی شاید اسی کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ اپنے روزانہ معمول کی مانند وہ بچی کو پیار کرنے اور امامہ کے کمرے میں آیا تو اس کی پیشانی پر سفید پٹی بندھی دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"یہ...... کیا ہوا ہے بے بی کو؟"

بے تابی سے ہاتھ میں پکڑی کیپ قریبی کرسی پر پھینکتے ہوئے وہ بچی کے قریب آیا تو امامہ جو خود کو اس پیشی کے لیے پہلے ہی ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی۔ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

"وہ...... میں بے بی کے لیے دلیہ بنا رہی تھی اور بے بی لاؤنج میں صوفے پر لیٹی تھی۔ پتہ نہیں کیسے اور کب یہ صوفے سے گر پڑی۔ میں بھاگ کر گئی تو اس کی پیشانی پھٹ چکی تھی۔"

"او شٹ۔ پچھلے ایک ماہ میں یہ تیسرا واقعہ ہے جس میں آپ کے موجود ہوتے ہوئے بچی کو چوٹ لگ گئی۔ پتہ نہیں سارا دن کیا کرتی رہتی ہیں آپ......؟"

اس کی توقع کے عین مطابق وہ پل میں تپ گیا تھا۔

امامہ قدرے کنفیوز ہو کر کھڑی ہوتے ہوئے اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔

"حد ہوتی ہے بے پروائی کی۔ لگتا ہے آپ کو اس جاب کی ضرورت ہی نہیں ہے......"

سخت کٹیلے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے پہلے بچی کے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھا پھر اس کی حرارت چیک کرتے ہوئے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر اس کے کمرے سے باہر لے گیا۔

وہ اس کے پیچھے ہی فوراً کمرے سے باہر نکلی تھی مگر تب تک وہ بچی کو کندھے سے لگائے، بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے گھر سے باہر نکل چکا تھا۔

جانے واپس آ کر وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا۔

❋❋❋

سردی کی شدت کے باعث انوشہ رحمٰن کے ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔
کمرے میں بستر' کمبل یا چارپائی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کرسی یا میز تک دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ سو وہ ٹھنڈی زمین پر سکڑ کر بیٹھی' گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھی۔ ایک پل کے لیے اس کا دل پسیجا تھا مگر اگلے ہی پل پھر دماغ دل پر غالب آ گیا تھا۔
انوشہ نے چونک کر اس کی آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا پھر اس پر نگاہ پڑتے ہی بے بسی سے رو پڑی۔
''کیوں رو رہی ہو......؟''
اس کے یوں رونے پر دل کو کچھ ہوا تھا تبھی وہ دہاڑ کر بولا تو انوشہ نے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔
''مجھے یہاں بہت ڈر لگ رہا ہے۔ خدا کا واسطہ ہے شاہ زر' مجھے چھوڑ دو' پلیز......''
کتنی معصوم لگ رہی تھی وہ اس سے التجا کرتی ہوئی۔
آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اور رونے سے سرخ ہوتی خوبصورت متورم آنکھیں۔
شاہ زر آفندی نے ایک لمحے سے قبل اپنا رخ بدلا تھا۔
''ٹھیک ہے' چھوڑ دوں گا مگر......تمہارے وجود اور روح کو داغدار کرنے کے بعد تاکہ تمہارے اس کمینے بھائی کو معلوم ہو جائے کہ کسی کی عزت سے کھیلنے کا انجام کیا ہوتا ہے......''
''نہیں......تم ایسا نہیں کرو گے۔ تت......تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔''
وہ اس کا ارادہ بھانپ گئی تھی۔ تبھی عاجزی سے گڑگڑائی تو وہ پھنکار اٹھا۔
''کیوں نہیں کر سکتا' میں کیا مرد نہیں یا میں نے کوئی دیوتا ہونے کا سرٹیفکیٹ لیا ہوا ہے؟''
یزدانی پیلس میں اب انوشہ اور زاور دونوں کے لیے ہی نفرت کے سوا اور کچھ نہیں رہا تھا۔
سائلہ بیگم تو اب اپنے گھر میں ان دونوں بہن بھائیوں کا ذکر سننا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ کمال صاحب کی حالت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی اور وہ اس کے لیے بھی ان دونوں بہن بھائیوں کو قصوروار قرار دیتے ہوئے دن رات انہیں بددعائیں دیتی نہیں تھکتی تھیں۔
انوشہ' شاہ زر کے دہاڑنے پر پھر سہم گئی تھی۔ تبھی وہ اس کا بازو دبوچتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔
''تم یہاں سے صاف ستھری چلی گئیں تو ضرور کسی نہ کسی کی زندگی کا حصہ بن کر یہ زخم بھول جاؤ گی۔ تمہارا گھر آباد ہو جائے گا مگر......میری بہن' اس کا رشتہ کون لے گا۔ میں اس تک پہنچ بھی گیا تو اس کا گھر آسانی سے آباد نہیں کر سکوں گا۔ جب وہ کہیں آباد نہیں ہو سکتی تو زاور حسن کی بہن کہیں کیوں آباد ہو۔ جب میری بہن کا نصیب زاور حسن ہے تو میں تمہارا نصیب کیوں نہیں......؟''
جانے کیسا غبار جمع تھا اس کے اندر کہ نکل ہی نہیں رہا تھا۔
اس وقت بھی انوشہ اپنا بازو دبوچے جانے پر درد سے کراہ اٹھی تھی۔ پھر جانے کیسے ہمت جمع کرتے ہوئے وہ اس کے سامنے بولی تھی۔
''تمہاری بہن خود اپنی مرضی سے بھاگی ہے' کسی نے زبردستی نہیں بھگایا اسے۔ جبکہ میرا دامن

ال ہے' وہ بدکردار تھی تبھی چکر دے کر بھاگ گئی مگر میں......"

"تڑاخ......"

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتی' شاہ زر آفندی کا بھاری ہاتھ اس کے گال پر اپنی انگلیوں نشان چھوڑ گیا۔

"آج کے بعد یہ گھمنڈ نہیں رہے گا تمہیں۔"

قطعی وحشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اس کا نازک سا بازو جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"نہیں۔ تم ایسا نہیں کرو گے۔ خدا کا واسطہ ہے شاہ زر آفندی۔ مجھے جیتے جی پل پل مرنے کی مت دو۔ مجھے داغدار مت کرو' پلیز...... مجھے پاکیزہ رہنے دو' پلیز......"

دونوں ہاتھ جوڑ کر بری طرح لرزتے ہوئے اس نے شاہ زر آفندی کی منت کی تھی مگر وہ اس اپنے حواس میں ہی کہاں تھا جو اس کے واسطوں کی لاج رکھتا' اس کے آنسوؤں میں چھپے کی گہرائی کو سمجھتا' اس کے شدید بخار میں جلتے' زخموں سے چور بدن کا لحاظ کرتا۔

انوشہ رحمٰن کا سر اس وقت بہت تیزی سے گھوم رہا تھا۔

خوف سے زرد چہرہ ایک دم سے سفید پڑ گیا تھا۔

شاہ زر آفندی کی جارحیت پر خود کو محفوظ رکھنے کی ہر ناکام کوشش کے بعد وہ یوں ساکت ہو گئی تھی اس کے وجود میں جان ہی نہ رہی ہو۔

شاہ نے دیکھا' وہ ہلکے ہلکے لرزتے ہوئے بڑی مشکل سے سانس لے رہی تھی۔ اس رات وہ اسی حالت میں چھوڑ کر فارم ہاؤس سے باہر نکل آیا تھا۔ ابھی جو حرکت اس سے سرزد ہوئی تھی وہ زاور حسن سے انتقام نہیں تھا' کہیں کچھ اور تھا جس نے اسے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔

مگر کیا......؟

یہ خدشہ کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور کی نہ ہو جائے؟

کیوں...... اسے کب اس بات سے فرق پڑنے لگا تھا کہ وہ کسی اور کی نہ ہو۔

فارم ہاؤس سے گھر واپس آتے ہوئے اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر لرز رہے تھے۔ ذہن پہلے سے الجھ کر رہ گیا تھا۔ اسے یکلخت خود سے گھن آنے لگی تھی۔ کردار کے معاملے میں اتنا کمزور تو وہ کبھی نہیں رہا تھا۔

اسے انوشہ کی مزاحمت یاد آ رہی تھی۔ اس کے واسطے ذہن میں ہتھوڑے کی مانند ضربیں لگا رہے رات اپنا پچھلا سفر ختم کیا ہی چاہتی تھی۔ گھر پہنچ کر گرم گرم پانی سے شاور لینے کے باوجود نیند کی مہربان پری اس کے قریب نہیں آئی تھی۔ بستر پر کروٹیں بدلتے بدلتے وہ بیزار ہونے لگا تھا جب اس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ کال اٹینڈ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا مگر اسکرین پر جگمگاتے نئے نمبر نے اسے کال پک کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ہیلو......"

بھاری آواز میں کال ریسیو کرتے ہی اس نے کہا تو دوسری طرف کوئی زور و شور سے رو پڑا۔

"ہیلو......"

اب کے اس کی آواز میں بے قراری تھی۔ تبھی دوسری طرف سے آواز ابھری تھی۔
''ہیلو بھیا...... مم...... میں شافیہ بول رہی ہوں۔ بھیا میں بہت تکلیف میں ہوں......'' وہ ا
کی آواز سنتے ہی کال ڈس کنکٹ کرنا چاہتا تھا مگر جانے کیوں نہ کر سکا۔
''بھیا...... آپ سن رہے ہیں ناں......''
اپنی عزیز از جان بہن کی آنسوؤں میں ڈوبی آواز اس کے اندر چھپے طوفانوں کو ہوا دے
تھی۔ تبھی وہ سرد مہری سے بولا تھا۔
''ہاں' سن رہا ہوں۔ ابھی صرف مما کی جان گئی ہے۔ میں تو بے شرم بنا جی رہا ہوں......''
''نہیں بھیا' پلیز مجھے معاف کر دیں۔ مجھے مما کا پتہ چلا ہے۔ مجھ سے صبر نہیں ہو رہا بھیا۔
کسی کے ساتھ نہیں بھاگی۔ مجھ پر لگا ہر الزام غلط ہے۔ میں صرف ساحل کے ساتھ نکاح سے
کے لیے خود اپنی دوست کے ساتھ کوئٹہ آئی ہوں۔ میرا دامن شفاف ہے' بھیا۔ خدا کی قسم میں کسی
ساتھ نہیں بھاگی۔ مجھے تو پتہ بھی نہیں کہ زاور علی حسن کہاں ہے......''
بھیگے لہجے میں جلدی جلدی بولتے ہوئے وہ اسے سرتاپا شاکڈ کر گئی تھی۔
''کیا بکواس کر رہی ہو تم......؟''
اس کے اعصاب چیخ رہے تھے۔ تبھی اس نے شافیہ کو کہتے ہوئے سنا تھا۔
''میں سچ کہہ رہی ہوں بھیا' قطعی بے بس ہو کر میں نے جو قدم بھی اٹھایا ہے اکیلے اٹھایا
میری دوست نے مجھے یزدانی پیلس کے حالات بتائے ہیں۔ آج ہی تمام تلخ سچائیوں سے پردہ ا
ہے۔ پچھلا پورا ہفتہ میں اسپتال میں رہی ہوں۔ بھیا پلیز مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کو سب
بتا دوں گی......''
وہ سسکیاں بھر رہی تھی اور ادھر شاہ زر آفندی کو محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا وجود ٹکڑے ٹکڑ
ہو کر ہوا میں تحلیل ہو رہا ہو۔
ساری حسیں' سماعتیں' بصارتیں جیسے ایک دم سے مفلوج ہو کر رہ گئی ہوں۔
شافیہ آفندی کی کال ڈس کنکٹ ہو چکی تھی مگر اس کے باوجود وہ سیل ہاتھ میں لیے جانے کتنی
تک گم صم بیٹھا خود پر اپنے ہی اعمال کی گرد اڑتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ بہت دیر کے بعد اس
اعصاب قدرے نارمل ہوئے تو اس نے اپنے گھر سے گاڑی فارم ہاؤس کے راستے پر ڈالنے
مزید ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔
مگر شاید نہیں' یقیناً اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔

❋❋❋

''سنو پتھر نہیں ہونا
ہوا کی جو بھی مرضی ہو
مقدر جو بھی کچھ چاہے
کوئی تارا نہ جگنو ہو
اندھیرے ہی اندھیرے ہوں

سبھی سپنے بکھر جائیں۔ سبھی لہجے بدل جائیں
میری یادوں سے اک پل بھی بے خبر نہیں ہونا
سنو پتھر نہیں ہونا''

شجاع حسن کی گاڑی گھر واپس آ چکی تھی۔

وہ شام آٹھ بجے کا گیا رات گیارہ بجے کے قریب گھر واپس لوٹا تھا۔ تب تک امامہ لاؤنج میں صوفے پر سمٹ کر بیٹھی اس کی واپسی کا انتظار کرتی رہی تھی۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کرنے کے بعد وہ اپنی سوئی ہوئی بیٹی کو کندھے سے لگائے اس کی لاؤنج میں موجودگی کو یکسر نظر انداز کرتا' اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

وہ پریشان ہوئی تھی۔

جانے اب وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا؟

اندر سے بے حد ڈرنے کے باوجود وہ ہمت کرتی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پیچھے ہی کمرے میں چلی آئی تھی۔

شجاع اپنی بیٹی کو احتیاط سے بیڈ پر سلانے کے بعد اب پلٹ رہا تھا۔

''سر! اب بے بی کی طبیعت کیسی ہے؟''

قدرے ڈرتے ڈرتے اس نے پوچھا تھا۔ شجاع حسن اسے کوئی بھی جواب دیئے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ جواباً وہ بھی کمرے سے نکل آئی۔

اسے اپنے کسی بھی عمل پر تا حال کوئی پشیمانی نہیں تھی۔ نہ ہی اسے بچی کے جینے مرنے سے کوئی سروکار تھا۔ اس وقت اگر کوئی بات اس کے لئے پریشانی کا باعث رہی تھی تو وہ صرف یہی تھی کہ اس کا قلم کھل گیا تھا اور اب کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ ایس پی اسے فوراً نوکری سے برخاست کر دیتا۔

اگر ایسا ہو جاتا تو وہ ارسلان حیدر کی مدد کیسے کرتی؟

اگر اس کی مدد نہ کر پاتی تو عین ممکن تھا کہ وہ اس سے خفا ہو کر سارے تعلق توڑ دیتا اور ملک سے باہر چلا جاتا یا پھر کوئی ایسا قدم اٹھا لیتا۔ جس کے بعد سوائے پچھتاؤں کے اور کچھ باقی نہ بچتا۔

ارسلان حیدر سے کسی بھی صورت جدائی اس کے لئے موت سے کم نہیں تھی۔ اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور اس کے لئے محال تھا۔ لہٰذا اسے ہر صورت اپنے مقصد میں کامیابی تک اس جاب کو برقرار رکھنا تھا۔ خواہ اس کے لئے اپنے مقام اور حیثیت سے کتنا ہی نیچے کیوں نہ گرنا پڑتا۔

شجاع حسن اپنے کمرے سے نکل کر باہر لاؤنج میں صوفے پر ٹک گیا تھا' جب وہ بظاہر بہت زیادہ پریشان نظر آتی' اس کے قریب ہی کھڑی ہو گئی۔

''بیٹھیے مس امامہ......''

سرد لہجے میں اگلے ہی پل اس نے حکم صادر کیا تھا۔

امامہ کا دل دہل کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے جیسے خون جھلک رہا تھا۔ پہلی سرسری نگاہ کے بعد وہ خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کرتی اس کے مقابل صوفے پر ٹک گئی تھی۔

''مس امامہ!...... کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میری بیٹی کے ساتھ آپ کی کیا دشمنی ہے......؟''

کیسا غیر متوقع سوال کیا تھا اس نے۔ امامہ کی ہتھیلیاں لمحوں میں پسینے سے بھیگ گئی تھیں۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لئے لب کھولتے ہوئے اس کا لہجہ واقعی کپکپایا تھا۔

''کیوں......سر......میں نے کیا کیا ہے؟''

ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کر اس کرخت چہرے پر ڈالتے ہوئے وہ ممنائی تھی جب وہ دہا ہوئے بولا۔

''آپ نے کیا کیا ہے؟ میری بچی کو جان سے مارنے کی کوشش کی ہے آپ نے؟ ڈاکٹر کے مطابق وہ کئی گھنٹے پانی میں بھیگتی رہی ہے۔ اس کی پیشانی کا زخم بھی کافی گہر انتہائی حد تک سہم گئی ہے وہ' کیوں......؟ ایسا کیا کیا ہے آپ نے اس کے ساتھ کہ پچھلے دو گھ سے وہ رو بھی نہیں رہی' یاد رکھیئے گا مس امامہ' اگر......میری بچی کو کچھ ہوا تو میں آپ کو ہرگز م نہیں کروں گا۔''

وہ اسے تنبیہ کر رہا تھا۔

امامہ نے دیکھا اس کی سرخ آنکھوں میں ہلکی سی نمی جھلک رہی تھی۔ وہ شخص اپنی بیٹی ـ اٹیچ تھا۔ امامہ اندازہ کر سکتی تھی۔

''اور ہاں' اب اپنے آپ کو اس جاب سے بھی فارغ سمجھیے' اپنی بچی کے لئے آپ جیسی آ ضرورت نہیں ہے مجھے......''

وہی ہو گیا تھا جس سے وہ ڈر رہی تھی۔

اس کی ذرا سی بے پروائی اتنے بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ کہاں سوچا تھا نے؟ شجاع اب کچن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تبھی وہ لپک کر اس کے پیچھے چلی آئی۔

''سر......! پلیز میری بات سنیں! میری بے بی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں اس معصوم کو سے مارنے کی کوشش کیوں کروں گی بھلا......؟ پلیز میرا یقین کیجئے' میں بالکل بے قصور ہوں......

اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ مگر شجاع نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ اب اپنے لئے چین چائے بنا رہا تھا۔

''سر......سر پلیز مجھے معاف کر دیں۔ میرا یقین کریں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میری صرف اتنی ہے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور میں سو گئی تھی اس دوران گڑیا کی آنکھ کھلی اور جا کیسے وہ کمرے سے نکل کر لان میں چلی گئی۔ میرے سوا کوئی ملازم بھی ڈیوٹی پر موجود نہیں تھا۔ لہذا کو پتہ نہیں چل سکا کہ گڑیا کیا کر رہی ہے۔ پلیز میرا یقین کریں' میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں' پلیز

اس بار اس نے آنکھوں میں آنسو بھر لیے تھے۔

شجاع نے خاموشی سے چائے کپ میں انڈیلنے کے بعد چولہا بند کر دیا۔

''اٹس او کے' فی الحال میرا موڈ بہت خراب ہے' بہتر ہو گا اگر اس وقت آپ مجھے اکیلا چھو یہاں سے چلی جائیں......''

اس کے لہجے میں اب بھی پہلی سی کرختگی تھی۔

امامہ چپ چاپ منہ لٹکا کر واپس اپنے کمرے میں پلٹ آئی۔

''سڑیل' بدد ماغ' کمینہ' خود کو نجانے کیا سمجھتا ہے۔ مری چھپکلی جیسی بیٹی ہے اور ایموشنل یوں ہو رہا ہے جیسے پتہ نہیں کیا چیز ہو؟''

اپنے کمرے میں آنے کے بعد زور سے دروازہ بند کر کے اس نے اپنے غصے کا اظہار کیا تھا۔

عین اسی لمحے اس کے سیل پر ارسلان حیدر کی کال آئی تھی۔ جسے پہلی بار اس نے چوتھی پانچویں بیل پر پک کیا تھا۔

''ہیلو......مون......کیسی ہو......؟''

''پتہ نہیں......''

اس کے خوشگوار سوال کے جواب میں وہ خاصی بے دلی سے بولی تھی۔

''کیا مطلب' کوئی پریشانی ہے کیا......''

دوسری طرف وہ فکر مند ہوا تھا۔

امامہ کو سر میں اچانک شدید درد کا احساس ہوا۔

''ہاں......''

''کیوں......کیا پریشانی ہے......؟''

اس کا تفکر بڑھ گیا تھا۔ امامہ نے الف سے لے کر تمام اسٹوری اس کے گوش گزار کر دی۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ارسلان! یہ ایس پی بہت ٹیڑھا بندا ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ جب کہ وہ خفگی سے اسے ڈپٹتے ہوئے بولا۔

''تم ضرور کوئی گل کھلا کر رہو گی وہاں' میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم نے اس کی بچی کے ساتھ اتنا ظلم کیوں کیا۔ ایک عورت ہو کر اتنی کٹھور کیسے ہو گئیں تم......؟ کتنے واسطے دے چکا ہوں میں تمہیں؟ کتنی منت کی ہے تمہاری کہ کسی بھی طرح اس ایس پی کا اعتبار جیتو۔ مگر نہیں' تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ تمہاری ''میں'' کبھی نہیں ٹوٹ سکتی......''

اسے امامہ پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔

جس کی آنکھیں لمحوں میں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

''میں یہاں جو کچھ بھی کر رہی ہوں صرف تمہارے لیے کر رہی ہوں' ارسلان! اور پھر بھی تم کہہ رہے ہو کہ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔

''کیا کیا ہے تم نے اب تک میرے لئے۔ بولو...... ایک ماہ ہونے کو آ گیا' مگر تم صرف ایک فائل کا پتہ نہیں چلا سکیں۔ ادھر ایس پی کی گرفت ہم پر سخت ہوتی جا رہی ہے۔ اگلے کچھ روز میں وہ ثبوت اکٹھے کر کے ہمارے گلے میں پھانسی کے پھندے فٹ کروا دے گا۔ تم کرتی رہنا اپنی کو شش......''

اس سے غصہ کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔

امامہ چپ چاپ رو پڑی۔

کان کھول کر سن لو مون! جب تک تم وہ فائل حاصل نہیں کر لو گی تب تک نہ میں تم سے ملوں گا' نہ بات کروں گا۔ اگر اس دوران میں اپنے طور پر وہ فائل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ٹھیک' ورنہ

تم مجھے بھول جانا' خدا حافظ......"

وہ لائن ڈس کنکٹ کرنے کے بعد اپنا سیل آف کر چکا تھا۔ امامہ کئی بار اس کا نمبر Retry کرنے کے بعد بالآخر گھٹنوں میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

کتنا خودغرض اور بے حس تھا وہ شخص' جس سے امامہ علی حسن کو شدید محبت کا دعویٰ تھا۔ اسے صرف اپنی فکر تھی۔ وہ کس عذاب سے گزر رہی ہے اسے قطعی پروا نہیں تھی۔ اس رات بہت دیر تک اس کا اجنبی لہجہ اور آخری وارننگ اسے شدت سے رُلاتی رہی تھی۔

❁❁❁

گاڑی سست روی سے کشادہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

کتنا بڑا گناہ' کتنی بڑی خطا' سرزد ہوگئی تھی اس سے کہ اس کا ضمیر کسی طور اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھا۔

جانے وہ کس حال میں تھی؟ جس کا حال وہ ابتر کر آیا تھا۔

گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ احاطے کے سامنے رکی تھی اور وہ اپنی سیٹ چھوڑ کر تیزی سے باہر نکلا تھا۔

کمرے میں اس وقت بھی اندھیرا تھا۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے انوشہ تک پہنچا تھا۔ مگر شاید اسے بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس وقت مکمل طور پر ہوش وحواس سے بیگانہ ہوئی وہ ٹھنڈے فرش پر بے جان پڑی تھی۔ پورا وجود جیسے سن ہو رہا تھا۔ آنکھیں اوپر چڑھی تھیں اور ہونٹ جیسے نیلے ہو رہے تھے۔

وہ اس پر جھکا تھا اور اپنے ہاتھوں سے اس کے چہرے کے گرد بکھرے بالوں کو سمیٹ کر گردن کے پیچھے کیا تھا۔

"انوشہ!"

زندگی میں پہلی بار اس لڑکی کو اس نے اپنائیت سے پکارا بھی تو وہ اس کی پکار سن نہ سکی تھی۔

"انوشہ......انوشہ آنکھیں کھولو پلیز!" میں تم سے شرمندہ ہوں۔ بہت زیادہ......"

اس وقت اس کی جو حالت تھی وہ خود اس کی بھی سمجھ سے باہر تھی۔

گلاب سا خوبصورت چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں جیسے اکڑ گئے تھے۔ اس کے دل کو بھی اسی وقت جیسے کچھ ہوا تھا۔ شاید تبھی اس نے اس کے نڈھال سے بظاہر بے جان وجود کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"آنکھیں کھولو انوشہ! تم آنکھیں کیوں نہیں کھولتیں......؟"

اس بار شاید بے بسی کے شدید احساس سے مغلوب ہو کر وہ چلا اٹھا تھا۔ مگر انوشہ رحمٰن پر اس کی اس حرکت کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کی نبض بہت آہستہ چل رہی تھی۔

شاہ زر کو اپنا ایک ایک ظلم' ایک ایک غلط حرکت یاد آنے لگی۔ پچھلے پورے ایک ہفتے میں اس نے کس کس طرح سے اسے ٹارچر نہیں کیا تھا۔ ابھی کل ہی اس کے تیز بخار اور نقاہت کی پروا کیے بغیر کیسے معمولی سی بات پر جانوروں کی طرح پیٹ کر رکھ دیا تھا۔ پچھلے دو روز میں سوائے ٹھنڈے پانی کے

اور کوئی چیز اسے کھانے پینے کو نہیں دی تھی۔ اس پر اس سے پورا اصطبل بھی صاف کروایا تھا۔

کیا کیا نہیں کیا تھا اس نے؟

کیا قدرت اس وحشت اس درندگی کے لئے اسے معاف کرتی؟

خدا کی پاک ذات نے مرد کو عورت پر برتر کیا ہے۔ زیادہ طاقت بھی دی ہے اور عقل بھی مگر طاقت اس کی حفاظت کے لئے دی ہے اسے مسمار کرنے کے لیے نہیں' اسی طرح عقل بھی اسی لیے ادا دی تا کہ وہ اس کی خطائیں معاف کردے اور الجھے معاملات میں دانشمندی سے کام لے کر بگڑی ہوئی بات کو سلجھادے۔ مگر ہوتا کیا ہے......

مرد زندگی کے بہت سے معاملات میں' عورت سے زیادہ کم عقل ثابت ہو کر دکھا دیتا ہے۔

اس نے کم عقلی کا ہی ثبوت دیا تھا۔ اور اب وہ اپنے اٹھے ہوئے قدم پر پچھتا رہا تھا۔

انوشہ رحمٰن کے دھان پان سے وجود کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر جس وقت وہ کچے احاطے سے باہر نکل کر گاڑی تک آیا۔ اس کا رواں رواں ان دیکھی آگ میں جل رہا تھا۔

اس کی زندگی میں وہ تیسری عورت تھی۔ جس کے لئے اس کے لبوں نے لمبی عمر اور دائمی خوشیوں کی دعا کی تھی۔

❋❋❋

وہ بے ہوش زخمی حالت میں سڑک پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ جب قریبی کھیتوں میں ہل چلاتے ادریس کی نگاہ اس پر پڑی اور وہ ٹریکٹر سے اتر کر قریب چلا آیا۔ کوئی ڈکیتی کا کیس لگتا تھا۔ نوجوان کی جو حالت تھی اسے دیکھتے ہوئے واضح پتہ چل رہا تھا کہ اس نے اپنے بچاؤ کے لئے کتنی جدوجہد کی ہو گی۔

وہ ابھی زندہ تھا۔ لہذا ادریس شاہ اسے بے ہوشی کی حالت میں گدھا گاڑی پر ڈال کر گھر لے آیا تھا۔ گلی میں بچے گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے خوب شور مچا رہے تھے۔ گوری ابھی ڈھور ڈنگروں کو چارہ ڈال کر فارغ ہوئی تھی کہ کنڈی کھڑک گئی۔

''ہائے وے ربا' اب کون آ گیا؟''

اپنے کام میں خلل اسے قطعی پسند نہیں تھا۔ لہذا دستک پر اس کی پیشانی سلوٹوں سے پر ہو گئی۔ وہ لے بچھڑے کو رسی ڈالنے کے بعد اس نے دروازہ کھولا تو ادریس کے ساتھ اونچے لمبے شہری نوجوان کو زخمی حالت میں دیکھ کر ڈر گئی۔

''ہاہ...... یہ کون ہے ادریس......؟''

دل پر ہاتھ رکھ کر زخمی نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا' جب وہ اسے بانہوں کا سہارا دیئے اندر لاتے ہوئے بولا۔

''پتہ نہیں' ابھی تو بے ہوش ہے' ہوش میں آئے گا تو پتہ چلے گا......''

وہ اسے کشادہ صحن میں ایک طرف پڑی چارپائی پر لٹا چکا تھا۔ گوری اپنے گداز دل کے باعث اس کے قریب ہی آ کھڑی ہوئی۔

''میں ڈاکٹر صاحب کو لاتا ہوں' تم ذرا دھیان رکھنا......''

وہ قدرے متفکر دکھائی دے رہا تھا۔ گوری نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔
''کون ہے گوری......؟''
ادریس دروازہ پار کر گیا تو رسوئی سے بی اماں نے سر نکال کر پوچھا۔ تب وہ بولی۔
''کوئی شہری لڑکا ہے بوا۔ بہت زخمی ہے' ادریس لایا ہے اپنے ساتھ......''
''خدا خیر کرے' جانے کس ماں کا لال ہوگا......''
وہ بھی پریشان ہوئی تھیں۔ گوری نے گہری نظروں سے نوجوان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ گندمی رنگت' تیکھے نقوش' ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتے ہوئے بھی وہ اتنا خوبصورت دے رہا تھا کہ اس کی نظریں اس کے سراپا سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔
''کتنا خوبصورت ہے ناں بوا۔ ہمارے تو پورے گاؤں میں کوئی ایسا مرد نہیں ہے۔''
اس کی ستائش زیادہ بلند آواز میں نہیں تھی۔ لہٰذا بی اماں کے پلے نہیں پڑی۔ ادریس تھوڑ میں ڈاکٹر کو لے آیا تھا۔ جس سے زخمی نوجوان کی مرہم پٹی بھی ہوگئی اور ان کی تسلی بھی۔
شام کے قریب کہیں جا کر اسے ہوش آیا تھا۔ گوری اس وقت شام کی روٹیاں ڈال رہی تھ ادریس اور بی اماں اس کے پاس ہی بیٹھے تھے۔
''آپ لوگ کون ہیں......؟''
ہوش میں آکر آنکھیں کھولنے کے بعد جو پہلا سوال اس کے لبوں پر آیا تھا وہ یہی تھا۔
ادریس قریبی چارپائی سے اٹھ کر اس کے پاس اسی کی چارپائی پر آبیٹھا۔
''شکر سوہنے رب کا۔ تمہیں ہوش تو آیا' ہمیں تو بڑی پریشانی ہو رہی تھی' ویسے میرا نام اد ہے' میں ہی تمہیں زخمی حالت میں سڑک سے اٹھا کر گھر لایا تھا۔''
اس کے لہجے میں دبا دبا جوش اور خوشی تھی۔ نوجوان کو سر کی پچھلی سائیڈ پر شدید تکلی احساس ہوا۔
''ابھی لیٹ جاؤ یار۔ ڈاکٹر کے مطابق گھاؤ کافی گہرے ہیں۔ کچھ دن لگیں گے ٹھیک ہ میں' فی الحال تو اپنا کوئی نام پتہ بتا دو' تا کہ تمہارے گھر والوں کو خبر دی جا سکے۔''
وہ پرخلوص انسان تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ نوجوان نے آہستہ سے سر تکیے پر ٹکا کر موندلیں۔ اسے فی الحال سکون کی ضرورت تھی۔ لہٰذا ادریس نے بھی اس سے مزید کوئی سوال کر کا ارادہ ملتوی کر دیا۔
اگلی صبح وہ دوبارہ بیدار ہوا تو قدرے بہتر حالت میں تھا۔
ادریس صرف اسی کی وجہ سے کھیت نہیں گیا تھا۔ گوری اپنے روزانہ کے معمول کے عین م سارے گھر کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی۔ اسے بیدار ہوتے دیکھ کر وہ اچٹتی سی نظر اس پر ڈا کے بعد رسوئی میں گھس گئی تا کہ اسے کچھ کھلانے پلانے کا انتظام کر سکے۔
ادریس کے دوبارہ پوچھ گچھ کرنے پر اس نے بتایا تھا۔
''میرا نام زاور ہے' ابھی دو روز قبل بابا کی ایمرجنسی کال پر U-K سے پاکستان آیا تھا۔ گہری ہونے کے باعث اپنے دوست کے گھر آرام کیا اور اگلے روز دوپہر کے قریب اکیلا ہی

لے کر گھر روانہ ہوگیا۔ میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور ڈکیتوں کے ساتھ ملا ہوا ہے' اس نے گاڑی جان بوجھ کر کھیتوں کی طرف موڑی اور راستے میں اس کے ساتھیوں نے ہمیں گھیر لیا تقریباً ستراسی لاکھ روپیہ تھا میرے پاس' گولڈ کی چین بھی تھی۔ اس کے علاوہ قیمتی ریسٹ واچ اور ...ر کے لیے گولڈ کی چند چوڑیاں بھی لایا تھا۔ سب پر پانی پھیر گئے۔ میں نے مزاحمت کی کوشش کی تو بری طرح پیٹ بھی گئے۔ پتہ نہیں ماں اور بابا کس حال میں ہوں گے۔ انوشہ نے تو رو رو کر انھیں سوجالی ہوں گی۔"

آخری جملہ جیسے اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا تھا۔ قریب بیٹھی اماں بی جو تسبیح کر رہی تھیں اس کے ساتھ ہونے والی واردات پر توبہ استغفار کرتی رہیں۔

"خدا غارت کرے ایسے کمینوں کو' کسی کی محنت سے کمائی دولت لوٹتے ہوئے ذرا خوف خدا نہیں آتا انہیں۔"

انہیں واقعی دل سے افسوس ہو رہا تھا۔ تبھی زاور حسین نے ادریس سے پوچھا تھا۔

"یہاں قریب میں کوئی پی سی او نہیں ہے کیا......؟ میرا موبائل بھی وہ ذلیل اپنے ساتھ ہی لے گئے ہیں......"

اسے اب غصہ آ رہا تھا۔

ادریس جو اس کی روداد پر خود بھی دکھی ہو رہا تھا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"پی سی او تو ہے' لیکن کافی دور ہے' تم چل کر نہیں جاسکو گے' مجھے نمبر بتادو میں تمہارے گھر والوں کو اطلاع کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے' سب کچھ تفصیل سے مت بتانا۔ مما پریشان ہو جائیں گی۔ بس اتنا بتا دینا کہ ابھی میں ...ر نہیں کرسکتا اور میرا موبائل بھی چوری ہوگیا ہے......"

اسے اپنا کارڈ دینے کے ساتھ ہی وہ نصیحت کرنا نہیں بھولا تھا۔ یہ بھی غنیمت ہی تھا کہ جیکٹ کی اندرونی پاکٹ میں اس کا والٹ محفوظ رہ گیا تھا۔ ورنہ جو چند ہزار بچ گئے تھے ان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا۔

ادریس نے پی سی او پر جا کر کارڈ پر درج گھر کے نمبر پر کال کر دی جسے سائلہ بیگم نے ہی پک کیا ...کارڈ پر درج پہلا نمبر "یزدانی ہاؤس" کا ہی تھا۔ ادھر سائلہ بیگم جو اسے تا حال کوسنے دے رہی تھیں۔ کسی اجنبی شخص سے اس کی روداد سن کر چپ کی چپ رہ گئیں۔ زاور' کہاں اور کس حال میں ہے انہوں نے کسی کو بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ جبکہ نزہت آراء بیگم نے اس کیلئے رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں۔

بھلے وہ اس کا سگا بیٹا نہیں تھا' مگر انہوں نے اسے ماں بن کر پالا تھا۔ انوشہ ان کی دسترس سے دور تھی۔ اس لیے آج تک وہ اس کے لیے کچھ نہ کر سکی تھیں' مگر زاور تو ان کے پاس تھا' وہ اس کی ...ول سے معمولی خوشی اور چھوٹے سے چھوٹے غم سے آشنا تھیں۔ لہٰذا پاکستان واپسی پر اس کی اچانک گمشدگی ان کے لیے ہرگز کسی سانحے سے کم نہیں تھی۔ جمال صاحب بھی بہت پریشان تھے وہ ...نزہت بیگم کا بھانجا تھا تو ان کا بھتیجا' مگر نزہت بیگم کی طرح انہوں نے بھی اسے اپنا سگا بیٹا ہی سمجھا

تھا۔لہذا اسے بازیاب کروانے کے لیے وہ اپنی سی ہر کوشش کر رہے تھے۔

دوسری طرف ادریس نے گھر پہنچ کر اسے یہ بتاتے ہوئے کہ وہ اس کے گھر اطلاع دے چکا ہے اسے مطمئن کر دیا تھا۔اس وقت زاور کے بھی ذہن میں کسی طور یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ اس سے پوچھ لے کہ اس نے کال کس نمبر پر کی ہے۔

رات کے کھانے کے بعد سونے سے پہلے اس سے باتیں کرتے ہوئے بی اماں نے اسے بتایا تھا۔

''ہم شروع سے اسی گاؤں میں رہ رہے ہیں' میرے ابا جی نے کشمیر سے ہجرت کر کے یہاں پاکستان میں گھر بنایا تھا' تب سے یہی گاؤں ہمارا مسکن ہے۔میں اور ادریس کے ابو' بس دو ہی بہن بھائی تھے' دونوں نے ایک ساتھ پانچ جماعتیں پاس کیں اور شادی بھی ایک ہی گھر میں ہوئی۔گوری چھوٹی سی تھی جب بھابھی کی موت ہوگئی۔دو سال پہلے ابا اور بھائی بھی آگے پیچھے چلے گئے۔میرے شوہر نے طلاق دے دی۔اس لیے یہاں آ گئی۔ان دونوں بچوں کو میں نے ہی ماں بن کر پالا ہے' دونوں کی شادی بھی ایک ہی گھر میں وٹے سٹے سے کی ہے۔گوری کا میاں اچھا نہیں' ایک نمبر کا جواری ہے اس لیے اسے گھر بٹھالیا ہے' شاہدی (ادریس کی بیوی) کو اس گھر میں پورا سکھ ہے' پھر بھی اس بچے کو بہت تنگ کرتی ہے' اب بھی فضول کی آڑ لے کر دو مہینے سے روٹھی بیٹھی ہے۔بہت پریشان ہے میرا بچہ۔''

ادریس کو علم نہیں تھا کہ وہ زاور کو اس درجہ اپنا سمجھتے ہوئے اس پر اپنے سارے دکھ کھول کر رکھ دیں گی۔تبھی وہ قدرے جز بز ہوا تھا۔

زاور نے سرسری سی نظر اٹھا کر گوری کی طرف دیکھا۔وہ واقعی اس قابل تھی کہ اس کی بے حد تعریف کی جاتی۔ادریس کسی کام کا بہانہ بنا کر وہاں سے اٹھ گیا' جب بی اماں نے اسے مزید بتایا۔

''آج کل گوری کا میاں بہت پریشان کر رہا ہے' بچی کسی صورت اس کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔مار مار کر ظالم نے سارا بدن ادھیڑ رکھا ہے۔زیور' کپڑا' لتا سب اجاڑ دیا' اوپر سے گھر والوں نے خوب شہ دے رکھی ہے۔ادریس کہتا ہے فیصلہ لینا ہے مگر وہ کمینہ کسی طرح جان نہیں چھوڑ رہا' اب دھمکیاں دے رہا ہے کہ جب موقع ملے اٹھا کر لے جائے گا۔میرا بچہ اسی خوف سے پوری رات نہیں سوتا۔چھوری کی الگ جان مصیبت میں پھنسی ہے۔میں کہتی ہوں جب تک معاملہ نمٹ نہیں جاتا شہر چل کر رہتے ہیں' مگر ادریس نہیں مانتا' کہتا ہے میں کسی سے ڈرتا نہیں جو میدان چھوڑ کر بھاگ جاؤں' تم ہی بتاؤ بیٹا' اگر اس بدبخت نے دشمنی میں آ کر اسے یا گوری کو کوئی نقصان پہنچا دیا تو میں کیا کروں گی؟ میرے تو جینے کا کوئی اور سہارا ہی نہیں ہے.....''

زاور چپ چاپ بی اماں کی روداد سن رہا تھا۔اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ دنیا میں اس کی زندگی سے ہٹ کر بھی بہت سے دکھ اور الجھنیں بکھری ہوئی ہیں۔

بی اماں اس سے اور بھی بہت کچھ شیئر کر رہی تھیں' اور اسے ان کا یہ اپنائیت بھرا انداز اچھا لگ رہا تھا۔اسی اثناء میں گوری چائے بنا کر لے آئی تو اس کی توجہ بھی بی اماں کی باتوں سے ہٹ گئی۔

''آپ ٹینشن نہ لیں آنٹی میں ادریس سے بات کروں گا۔انشاء اللہ بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس کی نگاہیں گوری کی خوب صورت کلائیوں میں پڑی رنگ برنگ چوڑیوں پر ٹھہری تھیں۔
اب اچانک دروازے پر ہونے والی دستک نے اس کے ساتھ ساتھ بی اماں اور گوری کو بھی چونکا دیا۔

❁❁❁

دشت ہجراں میں نہ سایہ' نہ صدا تیرے بعد
کتنے تنہا ہیں تیرے آبلہ پا تیرے بعد
تجھ سے بچھڑا ہوں تو گھبرا کے ہوا برد ہوا
کون دیتا مجھے جینے کی دعا تیرے بعد

باہر موسم بے حد خراب تھا اور طوفانی ہوا جیسے پورے گاؤں کو تباہ و برباد کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی۔ دادی ماں اس وقت عموماً عشاء کی نماز کی ادائیگی کے بعد تسبیح کیا کرتی تھیں' مگر آج وہ اس نفل نماز کی ادائیگی میں مشغول تھیں۔

انزلہ کو بے حد ڈر لگ رہا تھا۔

خود بھی کسی خشک پتے کی مانند کپکپاتی' وہ اپنے کمرے میں بستر پر بیٹھی' گھٹنوں میں سر چھپائے روئے چلی جا رہی تھی۔

میران شاہ مختلف روپ لے کر اس کے تصور میں آ جا رہا تھا اور اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ سنی دادا کے وجود کے پرخچے اڑا دے۔ اس نے آج تک کبھی زندگی میں کسی سے نفرت نہیں کی تھی۔ مگر اس وقت اس کا رواں رواں سنی دادا سے نفرت کے احساس سے کپکپا رہا تھا۔

میران شاہ کی یاد میں اس رات کا ایک ایک پہر اس کی سسکیوں کی نذر ہو رہا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ ان دنوں وہ ابھی یونیورسٹی میں داخل ہوئی تھی۔ ذرا ریزرو طبیعت کی مالک ہونے کی وجہ سے اس نے زیادہ لوگوں کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا۔ اور میران شاہ کے زندگی میں آنے کے بعد کسی اور کی ضرورت بھی کہاں رہی تھی۔ دونوں ہی اپنی کلاس میں ہر دل عزیز ہونے کا اعزاز رکھتے تھے۔ وہ لڑکوں سے دوستی کی قائل نہیں تھی۔ مگر میران شاہ نے اپنی شوخ حرکتوں دلچسپ' باتوں اور بے پناہ چاہت سے بہت جلد اس کا دل جیت لیا تھا۔

اس نے انزلہ کو بتایا تھا کہ وہ اسی کے گاؤں کا مکین ہے' کچھ اس لیے بھی وہ اس کے قریب ہو گئی تھی۔ پوری یونیورسٹی میں ان دونوں کی ایک دوسرے کے لیے محبت مثالی تھی۔ میران کو ذرا سا کچھ ہو جاتا وہ مرنے کو تیار ہو جاتی اور اگر وہ اس سے خفا ہو جاتی تو اس کا حال دیکھنے والا ہوتا تھا۔

اسے چاہ کر بھی وہ بارشیں نہیں بھول رہی تھیں جب وہ دونوں اپنی اپنی کلاس چھوڑ کر یونیورسٹی سے نکل آتے اور گھنٹوں بائیک پر سڑکیں ناپتے برستی ہوئی بارش کا لطف لیتے' وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا' آسمان پر گھرے سیاہ بادل دیکھ کر میران نے زبردستی اسے کلاس چھوڑ کر اپنے ساتھ یونیورسٹی سے نکلنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ وہ دونوں ہلکی ہلکی سرد بوندوں کو انجوائے کرتے اپنی مستی میں چلے جا رہے تھے کہ اچانک ایک دوسری موٹر بائیک سے ان کا معمولی سا ٹکراؤ ہو گیا۔ غلطی میران کی تھی۔ وہ پیچھے مڑ مڑ کر انزلہ کو دیکھتے ہوئے شرارت کر رہا تھا' کہ سامنے سے آتی بائیک سے ٹکرا گیا۔ تاہم اس نے فوراً اپنی غلطی پر ایکسکیوز کر لیا تھا۔

سانول شاہ سے یہ اس کا پہلا ٹکراؤ تھا۔

اگلی بار اس نے اسے اپنی یونیورسٹی میں دیکھا تھا۔ تاہم اس بار وہ اس کی ایک ہلکی سی جھلک ہی دیکھ سکی تھی۔ وہ لائبریری سے نکل رہی تھی۔ اور سانول شاہ لائبریری میں انٹر ہو رہا تھا۔ جب اس نے فقط چند سیکنڈز کے لیے سر اٹھا کر اس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی' اور پھر تو جیسے یہ اتفاقات معمول ہوتے چلے گئے تھے' اس نے کبھی اسپیشلی نوٹس نہیں لیا تھا' مگر اکثر اسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ جان بوجھ کر اس کے آس پاس رہتا ہے۔

انہی دنوں میران شاہ اپنے والد کی وفات کے باعث یونیورسٹی چھوڑ کر چلا گیا تو جیسے انزلہ کے لیے بھی تعلیم میں کوئی چارم نہیں رہا۔ یونیورسٹی چھوڑنے سے قبل ایک روز وہ میران کے ساتھ بیٹھی باتوں میں مشغول تھی' پڑھائی کا زور نہ ہونے کے باعث اور کچھ امتحانوں کے نزدیک ہونے کی وجہ سے زیادہ تر اسٹوڈنٹس یونیورسٹی سے غیر حاضر رہتے تھے' وہ بھی صرف ایک دوسرے سے ملنے کی وجہ سے ہی یونیورسٹی آتے تھے ورنہ آج کل ایگزیم کی تیاری کے دن تھے اس روز بھی آسمان گدلے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میران اوپر والی سیڑھی پر بیٹھا تھا اور وہ اس سے دو سیڑھی نیچے بیٹھی تھی باتوں باتوں میں اس نے اپنا سر اس کے گھٹنوں پر رکھ دیا تھا۔ اسے گمان تک نہیں تھا کہ وہ سانول شاہ کی نظروں کے حصار میں ہے۔

میران ایمرجنسی کال کے باعث گھر چلا گیا تو وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تاہم اس سے پہلے کہ وہ تمام سیڑھیاں کراس کرتی۔ سانول شاہ جانے کہاں سے نکل کر ٹھیک سیڑھیوں کے قریب اس جگہ آ کھڑا ہوا تھا جہاں سے اسے گزرنا تھا' اس وقت اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ کھڑے کھڑے اس کی روح کھینچ لے گا۔ وہ اس پر سرسری سی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ جانا چاہتی تھی' جب اس نے سرعت سے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو اپنی گرفت میں لے لیا۔

انزلہ اس کی اس جرأت پر حیرت سے گنگ رہ گئی تھی۔

''کیا بدتمیزی ہے یہ......؟''

وہ بھرپور شدت سے چلانا چاہتی تھی' مگر آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

سانول شاہ نے اس کے سوال پر اس کے نازک سے بازو کو خاصا زور کا جھٹکا دیا تھا' جس سے وہ کراہ کر رہ گئی تھی!

''یہ درس گاہ ہے اور یہاں لوگ تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں آئندہ میں تمہیں اس لڑکے کے ساتھ عیاشی کرتے نہ دیکھوں......''

وہ صرف اس کے الفاظ پر ہی نہیں انداز پر بھی حیران ہوئی تھی' انداز ایسا تھا گویا وہ اس کی منکوحہ ہو۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر اسے کوئی منہ توڑ جواب دیتی وہ جیسے تیزی سے اچانک آیا تھا ویسے ہی دھپ دھپ کرتا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس حیران کن سانحے کے فقط تین روز بعد' جب وہ ضروری کتاب لینے مجبوراً یونیورسٹی آئی تھی تب پھر وہ اس سے ٹکرا گیا۔

''انزلہ......''

مطلوبہ کتاب نکلوا کر وہ ٹیکسی کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہی تھی' جب اس نے پکارا اس بار شدید ملال ایک لہر اس کے اندر سے اٹھی تھی۔ وہ پلٹی تھی نہ مڑ کر اس کو دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس کی تھی وہ تیز تیز قدم اٹھاتے خود اس کے قریب آ گیا تھا۔

❁❁❁

وہ لان سے ملحقہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی گھٹنوں پر سر ٹکائے چپ چاپ رو رہی تھی۔ جب سامنے سے آتا شجاع اسے اس حال میں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

مکمل بلیک سوٹ میں ملبوس' گھنے لمبے بالوں کو پشت پر بکھرائے' وہ اتنی اداس لگ رہی تھی کہ جاتے ہوئے بھی اپنے قدم آگے نہیں بڑھا سکا تھا۔ وہ سیدھی سادھی سی لڑکی حالات کی ستائی ہرگز نہیں لگ رہی تھی۔

امامہ کو اس کی اپنے قریب موجودگی کا احساس قدرے تاخیر سے ہوا تھا۔ تاہم اپنی سوچوں کے سر جھٹک کر اس نے جیسے ہی اپنے سامنے کھڑے شجاع حسن کو دیکھا' فوراً گھبرا کر کھڑی ہوئی۔ رات سخت خفگی کے موڈ میں ''کمرہ بند'' ہو جانے کے بعد' صبح وہ اس کے بیدار ہونے سے قبل گھر سے نکل گیا وہ جان ہی نہیں سکی تھی۔ اب وہ دوبارہ گھر واپس آیا تھا۔ تبھی وہ پھر الرٹ ہوئی۔

''مزیا کہاں ہے......؟''

ہوش کی دنیا میں واپس آتے دیکھ کر اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ جلدی سے بولی۔

''امی سو رہی ہے۔ صبح جلدی اٹھ گئی تھی۔ میں نے دودھ پلا کر سلا دیا۔''

''اوکے۔''

مطمئن انداز میں سر ہلاتا وہ آگے بڑھا تو امامہ نے اسے پکار لیا۔

''

''جی فرمایئے؟''

وہ اسی سے پیچھے پلٹا تھا۔ تبھی وہ نگاہیں جھکاتے ہوئے بولی۔

''آپ نے مجھے معاف کر دیا ناں؟''

''ہاں' اور کچھ......؟''

وہ شاید بہت جلدی میں تھا۔ امامہ نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا کر پھر نظریں جھکا لیں۔

دوبارہ اپنے کمرے میں کھٹ پٹ کرنے کے بعد وہ پھر گھر سے نکل گیا تو امامہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسے رات سے ارسلان حیدر کی باتیں' اس کا اجنبی لہجہ رہ رہ کر رلا رہا تھا۔ وہ ابھی سے سوچ رہی تھی کہ اچانک لاؤنج سے قدرت اللہ صاحب کی گونجتی ہوئی گرجدار آواز نے اسے

''عقل کے اندھو' مفت خورو' کوئی ڈھنگ کا کام کرنا آتا ہے تمہیں کہ نہیں' سارے پودے مرجھا گئے' دو دن بیمار کیا پڑ گیا۔ تم لوگوں نے مرا سمجھ لیا مجھے' کہاں ہے وہ شجاع کا بچہ......؟''

ان کی دہاڑ ایسی تھی کہ سوئی ہوئی ننھی گڑیا کی آنکھ کھل گئی۔
جاگتے ہی پہلا کام اس نے رونے کا کیا تھا۔ جواب میں امامہ نے چڑتے ہوئے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ جمادیا۔ سارے فساد کی جڑ ہی اس کی نظر میں یہ بچی تھی۔ جس نے اس کا ناک میں دم کرر کھا تھا۔ نہ وہ اسے تنگ کرتی' نہ امامہ غصے ہو کر اسے سزا دیتی۔ نہ اس کی نوکری خطرے میں پڑتی اور نہ ارسلان اس سے ناراض ہوتا۔
اس کا بس نہ چلتا تھا کہ بچی کا گلا گھونٹ کر اسے ہمیشہ کے لیے چپ کروادیتی۔ اس وقت کسی صورت وہ قدرت اللہ صاحب کے قہر کا شکار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ لہذا جب تک وہ باہر ملازمین پر گرجتے برستے رہے' وہ بچی کا منہ سختی سے دبائے اسے آنکھیں دکھاتی رہی۔ بچی اب اس کی طرف دیکھتے ہوئے سہم گئی تھی۔ لہذا اس نے اپنا ہاتھ اس کے منہ سے ہٹالیا۔
''کمینی۔ ایسے حلق پھاڑ پھاڑ کر روتی ہے جیسے دنیا میں سب سے زیادہ دکھی ہو' دو سال کی ہوگئی ابھی منا پن نہیں گیا اس کا......''
ایک دھموکا اس کی پیٹھ پر جڑتے ہوئے اس نے اپنے اندر کا غبار نکالا تھا۔ جواب میں اس نے پھر رونا اسٹارٹ کر دیا۔
''یا میرے مولا' اس بلا سے کیسے چھٹکارا پاؤں' پتہ نہیں ایس۔ پی کے کن گناہوں کی سزا ہے یہ۔''
اب اسے گود میں اٹھا کر ٹہلتے ہوئے وہ اس کی کمر میں زور زور سے جھانپڑ بھی رسید کرتی جارہی تھی اور روہانسی بھی ہورہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں دور ایسی دنیا میں چلی جائے جہاں اس کی نہ کوئی مجبوری ہو نہ کسی سے کوئی تعلق ہو۔
اس روز اس نے ارسلان کو کال بھی نہیں کی تھی۔ دل بے حد بوجھل ہورہا تھا۔
رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تھی۔ گڑیا اس کے پہلو میں نہیں تھی' اس کا مطلب تھا رات میں شجاع اسے اس کے پہلو سے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے جاچکا تھا۔
وہ بستر سے اٹھی تھی۔
ایک عجیب سی بے چینی نے سارے وجود کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اس نے سوچ لیا آج' آر یا پار کا فیصلہ کر کے ہی دم لے گی۔ اس قید خانے میں اب زیادہ دن رہنا اس کی برداشت سے باہر ہوتا جارہا تھا۔ لہذا اسی وقت گرم گرم بستر سے نکل کر اپنا ڈوپٹہ سنبھالتے ہوئے وہ دبے پاؤں شجاع حسن کے کمرے کی طرف بڑھ گئی جو وہ سوتے وقت بھی لاک نہیں کرتا تھا۔

❋❋❋

دروازے پر دستک پھر ہوئی تھی۔ اس بار گوری نے مڑ کر بلند آواز میں پوچھا۔
''کون ہے......؟''
کھول دروازہ۔'' کرخت آواز میں کہا گیا۔
باہر سے جو جواب آیا اس نے گوری کے چہرے پر گھبراہٹ پیدا کردی تھی۔ ادریس اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ لہذا وہ گھبرا کر بی اماں کے پاس چلی آئی تھی۔
''وہ پھر آگیا ہے بوا' اس بار اس نے کوئی کمینگی کی' تو سوہنے رب کی قسم' میں کچھ نہ کر

رہی تھی۔"
وہ صرف گھبراہٹ کا شکار ہی نہیں تھی' بلکہ اپنے مجازی خدا سے بے حد اکتائی ہوئی بھی لگ رہی تھی
اور خود اسے اس درجہ متفکر دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا تھا۔
"خدا غارت کرے اس مردود کو' یہ ایسے باز نہیں آئے گا۔ میں دیکھتی ہوں اسے......" بی اماں کے لہجے میں بھی ترشی آ گئی تھی۔
اور بے بسی سے بستر پر پڑا انہیں دیکھتا رہا۔
"بول......اب پھر کیا تکلیف اٹھ گئی ہے تجھے' کیوں ہماری زندگی عذاب کرنا چاہتا ہے......"
عرض سے دروازہ کھول کر بی اماں' باہر کھڑے شخص پر چلائی تھیں۔ جب کہ وہ اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے' دل جلانے والی مسکراہٹ لبوں پر بکھیر کر بولا۔
"میری جورو ہے تمہارے پاس' اسے شرافت سے میرے حوالے کر دو' نہیں تو کسی روز دماغ خراب ہو جائے گا میرا......"
"تم مرو کہیں جا کر' میری بیٹی نہ آج تمہارے ساتھ جائے گی نہ کل۔ اب دفع ہو جا یہاں سے۔"
"ایسے کیسے دفع ہو جاؤں' غیر اجنبی مردوں کو گھر میں گھساتی ہو' اور جو اصل مالک ہے اسے دفع کرتی ہو' ہٹو راستے سے' کوئی بے غیرت نہیں ہوں میں کہ اپنی جورو کو یہاں بکنے کے لیے چھوڑ دوں۔"
بی اماں کو بے رحمی سے دھکا دیتے ہوئے وہ گھر کے اندر گھس آیا تھا۔ جب کہ گوری غصے سے چلاتے ہوئے بولی۔
"میرے قریب مت آنا' ورنہ دے ماروں گی کوئی چیز تمہارے تھوبڑے پر۔"
اور اس کے شوہر کے لیے گوری کی نفرت کی انتہا دیکھ سکتا تھا۔
تاہم اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' ادریس کھلے دروازے سے گھر کے اندر چلا آیا۔
"کیا ہو رہا ہے یہاں......؟" یہ ادریس کی آواز تھی۔
وہ باہر سے ہی گوری کو چنگھاڑتے ہوئے سن چکا تھا۔ تبھی بلند آواز میں گرج کر بولا تو گوری کا شوہر شاہد حسین کمینگی سے مسکراتے ہوئے اس کی طرف مڑ گیا۔
"اپنی زوجہ کو گھر چلنے کے لیے منا رہا ہوں' تمہیں تو اپنی جورو کا خیال نہیں' میرا تو گھر سونا سونا ہو رہا ہے۔"
"بکواس بند کرو اپنی اور کان کھول کر سن لو اچھی طرح' گوری اب تمہارے گھر کبھی نہیں جائے گی۔ اگر تم نے شرافت سے اس کا پیچھا نہ چھوڑا تو میں پنچائیت اکٹھی کر لوں گا۔"
اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ بی اماں نے اپنی قسم نہ دی ہوتی تو وہ اسے اچھی طرح مزا چکھا کر ہی دم لیتا۔ جس میں شرافت نام کو نہیں تھی۔
اس وقت بھی وہ خباثت سے مسکرایا تھا۔
"بڑا خون گرم رہنے لگا ہے تیرا۔ شرافت کی بات سمجھ میں ہی نہیں آتی تیرے' خیر کوئی بات نہیں' تو پنچائیت اکٹھی کر' اس سے پہلے مجھ سے جو ہو سکتا ہے وہ میں کر لوں گا۔"

اس قسم کی دھمکیاں اب اس کا روز کا معمول بن گئی تھیں۔

ادریس نے غصے سے بے حال ہو کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

''اپنا گندا منہ لے کر یہاں سے دفع ہو جا' نہیں تو وہ حشر کروں گا تیرا' کہ آنے والی سات نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔''

''نسلیں کہاں سے آئیں گی۔ میری جورو تو تیرے قبضے میں ہے۔''

ایک جھٹکے سے اپنا گریبان گرفت سے چھڑاتے ہوئے شاہد حسین نے پھر اس کے طیش کو ہوا دی تھی۔ جواب میں ادریس کے لیے خود پر قابو رکھنا ممکن نہ رہا۔

''یہ میرا دم تھا جو تیری بہن کے قصے سننے کے باوجود اسے قبول کیا تھا۔ آج یہاں اپنے منحوس قدم دھرے ہیں' آئندہ ادھر کا رخ کیا تو زندہ واپس نہیں جانے دوں گا۔

زاور کے سامنے آپس کی زیادہ باتیں اچھالنا' اس کی غیرت کو گوارہ نہیں تھا۔ لہٰذا اسے زور سے دھکا دیتے ہوئے وہ غصے سے چنگھاڑا تو شاہد حسین بھی تپ گیا۔

''اس کا جواب میں بہت جلد واپس لوٹاؤں گا تجھے۔''

کسی اجنبی شخص کے سامنے اپنی بے عزتی کی پروا کیئے بغیر' وہ کپڑے جھاڑ کر ادریس کو تنبیہ کرتے ہوئے گھر سے نکل گیا تھا۔

''دیکھا...... میں کہتی تھی ناں' یہ بدمعاش ضرور کچھ نہ کچھ غلط کرے گا۔ اب بھی وقت ہے ادریس' گوری کو کہیں بھیج دے' ورنہ یہ شخص پھر منہ مارنے آئے گا یہاں۔''

اس کے گھر سے نکلتے ہی اماں بی نے دہائی دی تھی۔

ادریس نے ایک سرسری سی نگاہ ان پر ڈال کر رخ پھیر لیا۔

''آپ خوامخواہ پریشانی نہ پھیلائیں بوا۔ میرے ہوتے ہوئے یہ کچھ بھی نہیں کر سکتا' کل صبح ہی بندوبست کرواتا ہوں اس کا......''

خاصے مضبوط لہجے میں کہتا وہ اندر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ جبکہ زاور اس ساری کارروائی کا اپنی آنکھوں کے سامنے نظارہ دیکھنے کے بعد کچھ سوچتے ہوئے سکون سے پلکیں موند کر لیٹ گیا۔

❋❋❋

''میں تمہیں پرپوز کرنا چاہتا ہوں انزلہ۔''

وہ ابھی ٹھیک سے اپنے سے چند قدم دور کھڑے سانول شاہ کو دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ اس نے سوال جڑ دیا۔ ایک مرتبہ وہ پھر اس کی جرأت پر حیران ہوئی تھی۔

''وھاٹ۔''؟

''ہاں انزلہ...... میں شادی کرنا چاہتا ہوں تم سے' بولو' کب بھیجوں اپنے گھر والوں کو......''؟

گہری سرمئی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑے وہ پوچھ رہا تھا۔

انزلہ کی پیشانی پر غصے سے سلوٹیں پڑ گئیں۔

''اپنی شکل دیکھی ہے کبھی آئینے میں' آئے بڑے پرپوز کرنے والے۔ لڑکیاں جیسے سڑک

کھلونے ہیں تمہارے لیے۔"
وہ بھی کسی سے اس لہجے میں بات نہیں کرتی تھی۔ مگر سانول شاہ کی فضول حرکتوں نے اسے نا
چاہتے ہوئے بھی تپ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔
"تمہیں کھلونا نہیں سمجھتا میں، کھلونا سمجھتا تو اٹھا کر لے جاتا۔ پرپوز کیوں کرتا۔"
اسے برا لگا تھا۔ تبھی وہ چیخا تھا، مگر انزلہ نے پروا نہیں کی۔
"میری طرف سے جہنم میں جاؤ، میرا تم میں انٹرسٹ نہیں ہے۔"
وہ کہہ کر مڑی تھی، جب سانول شاہ نے پھر اس کا راستہ روک لیا۔
"مگر میرا تم میں انٹرسٹ ہے۔"
"تو میں کیا کروں، میں نے راہ چلتوں کو منہ لگانے کا ٹھیکہ نہیں لیا ہوا۔"
تنفر سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ تاہم اگلے روز اس نے میران کو سانول شاہ کے متعلق مختصراً
بتایا تھا کہ وہ اسے تنگ کرتا ہے اور اس کی توقع کے عین مطابق، وہ اس کی بات سنتے ہی فوراً اٹھ کھڑا
ہوا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے کھلکھلاتے چہرے پر یکلخت سرخی بکھرتے دیکھی تھی اس نے۔
"کہاں جا رہے ہو؟"
میران کو اچانک اپنے قریب سے اٹھتے دیکھ کر اس نے فوراً پوچھا تھا، جب وہ بولا۔
"کہیں نہیں، کسی کی خبر لے کر آتا ہوں۔"
"کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ تو غنڈا ہے، خوامخواہ ساری یونیورسٹی میں بات پھیل جائے گی۔"
"نہیں پھیلتی...... مگر میں اسے چھوڑنے والا نہیں ہوں۔"
اس کے سر پر جیسے جنون سوار ہو گیا تھا۔
انزلہ شاہ کے لیے معاملے کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔
"نہیں میران، یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کسی مسئلے کو سلجھانے کا، ہم آرام سے بات کریں گے اس
سے۔"
گھبرا کر فوراً اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ بولی تھی۔ مگر میران شاہ نے اس کی بات نہیں سنی۔
"او کے...... اگر اسے آرام سے میری بات سمجھ نہیں آئی تو پھر کچھ اور سوچوں گا۔"
وہ اس کی فطرت اور مزاج سے اچھی طرح آگاہ ہونے کے باوجود اسے خطرے میں ڈال چکی
تھی، اور پھر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔

❋❋❋

شام ڈھل رہی تھی اور وہ آئی۔ سی یو کے اس پار کھڑا اخلوص دل سے انوشہ رحمٰن کی زندگی کے
لیے دعا کر رہا تھا۔ جب چار گھنٹے کی طویل جدوجہد کے بعد ایمرجنسی وارڈ کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر
عاطف قدرے تھکے تھکے سے چہرے کے ساتھ وارڈ سے باہر چلے آئے۔
شاہ زر انہیں دیکھتے ہی تیزی سے ان کی طرف لپکا تھا۔
"عاطف...... وہ...... وہ لڑکی ٹھیک تو ہے ناں......؟"

ڈاکٹر عاطف سے بہت قریبی تعلقات اور گہری دوستی کے باعث اس کے مراسم خاصے بے تکلفانہ تھے۔اس وقت بھی وہ فارملیٹی نبھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''سوری شاہ' وہ کوما میں ہے۔کوئی بہت زیادہ ذہنی دباؤ ہے۔''

ڈاکٹر عاطف کا لہجہ خاصا مایوس کن تھا۔وہ اپنی جگہ پر جیسے برف ہو کر رہ گیا۔

''وھاٹ......اس کا مطلب ہے وہ اب کبھی آنکھیں نہیں کھولے گی۔''

اس لمحے اسے خود اپنی آواز' گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

ڈاکٹر عاطف اسے ساتھ لے کر اپنے روم میں چلے آئے۔

زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے' اللہ نے چاہا تو ضرور وہ آنکھیں بھی کھول لے گی اور زندگی کی طرف واپس پلٹ بھی آئے گی۔ابھی تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اس لڑکی سے تمہارا کیا تعلق ہے' اور اس کے جسم پر' چہرے اور پیشانی پر جو زخموں کے نشانات ہیں' ان کی کیا کہانی ہے؟''

کتنا مشکل سوال پوچھ لیا تھا اس نے۔

شاہ زر غیر محسوس طریقے سے لب کاٹتے ہوئے آہستہ سے نگاہ پھیر گیا۔

''سب بتاؤں گا یار لیکن اس وقت میرے ذہن پر بہت بوجھ ہے' وہ لڑکی بظاہر میری کچھ نہیں لگتی' نہ ہی اس سے عشق محبت کا کوئی دعویٰ ہے مجھے لیکن پھر بھی عاطف' اگر وہ اسی حال میں ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گئی تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔''

اس وقت اس کے لہجے میں بسا اضطراب' ڈاکٹر عاطف جیسے سمجھ دار بندے کو بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔تبھی وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا تھا۔

''او کے۔میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔تم بس دعا کرو اس کے لیے۔''

وہ ابھی اسے کوئی تسلی دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

شاہ زر کچھ دیر سوچتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد چپ چاپ اٹھ کر اس کے روم سے باہر نکل آیا۔

❋❋❋

شجاع حسن کے کمرے میں نائٹ بلب کی مدھم پھیلی ہوئی روشنی' اس کی خاصی مدد کر سکتی تھی۔ دروازے کو ہلکا سا دبانے کے بعد وہ بناء آہٹ پیدا کیے بڑی آسانی کے ساتھ کمرے کے اندر چلی آئی تھی۔ جہاں جہازی بیڈ پر' وہ رعب دار ایس۔ پی اپنی بیٹی کو بانہوں میں چھپائے' بڑے سکون سے گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔

امامہ کا دھڑ دھڑ کرتا دل اسے کسی بھی ممکنہ خطرے کی وارننگ دے رہا تھا۔مگر وہ اپنے محبوب کی نگاہوں میں سرخرو ہونے کے لیے' اس وقت آگ کے دریا سے بھی گزر سکتی تھی' وہ شخص دن میں اپنا اسٹڈی روم لاک کرنا کبھی نہیں بھولتا تھا۔لہٰذا اس کے جاگتے ہوئے امامہ حسن کا اپنے مقصد میں کامیاب ہونا کسی طور ممکن نہیں تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے گہری نیند میں سونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اب اس کے روم سے اسٹڈی کی چابی تلاش کر رہی تھی' تاکہ رات میں ہی فائل اڑا کر وہ وہاں سے فرار ہو جائے مگر خدا جانے وہ اپنی ساری چابیاں کہاں رکھ کر سویا تھا کہ اسے مل ہی نہیں رہی تھیں۔

موسم گرم نہیں تھا۔ مگر اس کی پیشانی بار بار پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ جسے ڈوپٹے کے پلو سے صاف کرتی وہ اس کی تمام ڈرازیں اچھی طرح چیک کرنے کے بعد اب اس کے بیڈ کی طرف چلی آئی تھی۔

شجاع نے کوٹ اور شرٹ اتار رکھی تھی مگر ان میں بھی کوئی چابی نہیں تھی۔ اب اس کے تکیے چیک کرنے کے سوا' امامہ حسن کے پاس اور کوئی آپشن باقی نہیں بچا تھا۔

وہ آہستہ سے جھکی تھی اور کمال ہوشیاری سے معمولی آہٹ بھی پیدا کیے بغیر اس تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال دیا تھا جو اس سے لپٹ کر سوئی گڑیا کے سر کے نیچے تھا' اور اس وقت اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ جب اس کے ہاتھ نے مطلوبہ چابیوں کے گچھے کو چھو لیا۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ چابیاں مٹھی میں لے کر سیدھی ہوتی' شجاع کی آنکھ پٹ سے کھل گئی۔

رات کے اس پہر' وہ اس کے کمرے میں موجود' مکمل اس پر جھکی' اسے اچھا خاصا حیران کر گئی تھی۔

❁❁❁

جانے کون سے دیس کی چڑیا
شام منڈیر پہ آ بیٹھی ہے
چونچ میں اک نازک سی ڈالی
اُس پر ایک سنہری پھول
جیسے عشق سفر کی دھول

"آپ......اور اس وقت یہاں......؟"

وہ جیسے ہی گھبرا کر سیدھی ہوئی' شجاع حسن قدرے الجھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

امامہ حسن کی اس لمحے حقیقی معنوں میں بولتی بند ہو گئی تھی۔

"جی......وہ......وہ میں گڑیا کو دیکھنے آئی تھی۔ بخار تھا شام میں اسے......"

صبیح پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک اٹھے تھے۔

شجاع کچھ دیر جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے چہرے پر غیر معمولی گھبراہٹ دیکھ کر جانے کیا سوچتے ہوئے اپنے بستر سے اٹھا اور قدرے نرمی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے روم سے باہر نکل آیا۔

امامہ اس قطعی غیر متوقع صورتِ حال پر اچھی خاصی گھبرا گئی تھی۔ وہ اسے ساتھ کھینچتے ہوئے ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھا۔

"یہاں بیٹھیں۔"

خود مخملی صوفے میں دھنس کر اسے اپنے سامنے ہی بٹھاتے ہوئے وہ خاصی درشتگی سے بولا تھا۔

امامہ دل ہی دل میں ارسلان حیدر کو ایک سو ایک گالیاں دیتے ہوئے خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

اب جانے وہ اس سے کون سی تفتیش کرنے والا تھا۔

"مس امامہ!"

چند لمحے پھر خاموشی سے اس کا جائزہ لینے کے بعد بالآخر اس نے اپنے لب کھولے تھے۔

امامہ اپنا جھکا سر اٹھا کر سرسری سی ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالنے کے بعد پھر فوراً نگاہ جھکا گئی

"مجھے ایسا کیوں لگتا ہے مس امامہ کہ میں نے آپ کو اپنے گھر میں جاب دے کر غلطی کی ہے۔"

اس کے ابرو تنے ہوئے تھے۔

امامہ کی حقیقی معنوں میں بولتی بند ہوگئی۔

"آپ شروع سے مشکوک حرکتیں کر رہی ہیں۔ میری بیٹی کے ساتھ بھی آپ کا سلوک کچھ اچھا نہیں ہے۔ فطرتاً بزدل بھی نہیں آپ کہ محض عزت کی حفاظت کے لیے یہاں پناہ لینے پر مجبور ہوں جہاں تک میرا خیال ہے آپ کو روپے پیسے کی بھوک بھی نہیں ہے کیونکہ اتنے دنوں میں ایک بھی میں نے آپ کو کم از کم بے ایمان نہیں پایا۔ میرے گھر اور کمرے کی ہر چیز جوں کی توں ہے اس کے باوجود میں آپ کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے احساس دلا رہی ہے کہ یہاں جاب کی آڑ میں آپ ضرور کوئی خاص مقصد لے کر آئی ہیں۔ اب وہ خاص مقصد کیا ہے...... یہ میں نہیں جانتا لیکن میں آپ سے ریکوسٹ کرتا ہوں۔ آپ کو جو بھی مسئلہ ہے آپ مجھ پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے پلیز مجھ سے ڈسکس کر لیں۔ آئی تھنک اس طرح نہ صرف آپ خود کو مصیبت میں ڈالنے سے بچا سکتی ہیں بلکہ میری ڈسٹربنس بھی ختم ہو جائے گی۔"

"دھڑام۔"

امامہ حسن کو لگا اس کے دل کا چور پکڑا گیا ہو۔

اس وقت اسے وہ محاورہ یاد آ رہا تھا کہ "بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی؟"

وہ شخص اس کی سوچ سے زیادہ ہوشیار اور چوکنا تھا۔

امامہ خود کو اس کی گرفت سے بچانے کے لیے فوراً آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

"سوری سر! اگر میری وجہ سے آپ کو لگتا ہے کہ آپ ڈسٹرب ہو رہے ہیں یا مجھے یہ جاب دے کر غلطی کی ہے تو میں ابھی اسی وقت یہ جاب چھوڑ کر چلی جاتی ہوں۔"

اپنی اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے وہ فوراً آنکھوں میں آنسو بھرنے کے ساتھ ساتھ لہجے کو بھی گلوگیر بنا بیٹھی تھی۔

"آپ کہتے ہیں میں کوئی خاص مقصد لے کر یہاں آئی ہوں۔ کیا خاص مقصد ہو سکتا ہے میرا......؟ ایک بااختیار ایس۔ پی کے گھر میں میرے جیسی بے آسرا کمزور لڑکی کیا واردات کر سکتی ہے۔ اتنے دن ہو گئے مجھے یہاں آئے کیا آپ کا ایک چمچ کا بھی نقصان ہوا......؟"

سُوں کر کے ناک سکوڑتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے گالوں پر آئے آنسو خشک کیے تھے۔

"میں تخریب کار نہیں ہوں نہ ہی روپے پیسے کی بھوکی اتنا تو جان ہی گئے ہیں آپ مجھے۔ تنگ بے بی کی بات ہے تو...... مجھے اتنے چھوٹے بچوں کو سنبھالنے کا پہلے کوئی تجربہ نہیں ہے مصیبت گلے نہ پڑتی تو شاید اب بھی میں یہ جاب کبھی نہ کرتی۔"

''کیسی مصیبت؟''

وہ روانی میں کہہ گئی تھی۔ شجاع حسن کے ابرو پھر تن گئے تھے۔

''کچھ نہیں آپ نہیں سمجھ سکیں گے جس کا بھری دنیا میں کوئی آسرا نہ ہو اور اس کے اپنے ہی اس کی عزت کے در پے ہوں' انہیں ایسے امتحانوں کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناں میرے والدین نہیں ہیں۔ صرف ایک چچی ہے جو میری بے بسی سے فائدہ اٹھا کر اپنے آوارہ اور ملے بھائی کا رشتہ میرے ساتھ طے کرنا چاہتی ہیں۔ وہ شخص وحشی درندہ نہ ہوتا تو شاید میں کبھی گھر سے نہ بھاگتی مگر میں جانتی تھی' اگر اس سے میری شادی ہو گئی تو زندگی موت سے بدتر ہو جائے گی۔ اسی لیے بڑی مشکل سے جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلی۔ اب اسے قدرت کی طرف سے غیبی مدد سمجھئے یا اتفاق کہ روڈ پر پڑے ایک میگزین کے صفحے پر مجھے آپ کا دیا ہوا ایڈ نظر آ گیا اور میں یہاں چلی آئی۔ اس وقت مجھے صرف ایک چھت مطلوب تھی۔ میں بہت پریشان تھی۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ بچوں کو کیسے سنبھالتے ہیں مگر پھر بھی میں نے اس جاب کو زندگی موت کا مسئلہ بنا لیا کیونکہ عورت کے لیے عزت اور محبت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔''

اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں مگر پھر بھی وہ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ سکتا تھا۔

''میرا یہاں آنے کا کوئی خاص مقصد نہیں' سوائے اپنی عزت کی حفاظت کے لیکن اگر اس کے لیے مجھے کسی کی نگاہوں میں مشکوک ہو کر رہنا پڑے گا تو میں چلی جاتی ہوں۔''

اسکول ڈراموں میں ایکٹنگ کر کر کے وہ خاصی ماہر ہو چکی تھی۔ اب بھی اپنی شاندار ایکٹنگ پر وہ خود کو سراہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

شجاع حسن کے ماتھے کی تیوریاں اب کم پڑ گئی تھیں۔

''اٹس او کے۔ بے بی اکیلی ہو گی۔ آپ کمرے میں جائیں۔''

فوراً حکم دے کر وہ قمیص کی جیب سے اپنا سیل نکالتے ہوئے وہاں سے اٹھ کر لاؤنج سے باہر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

امامہ نے دل ہی دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہوئے گہری سانس بھری۔

''تھینک گاڈ! آج تو بچا لیا اللہ نے ورنہ یہ ایس پی کا بچہ تو میری ہڈیوں کا سرمہ بنا دیتا۔''

اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے آنکھیں صاف کیں۔

''تم بہت برے ہو ارسلان...... تم بہت برے ہو......''

قدم شجاع حسن کے کمرے کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے پھر دل ہی دل میں ارسلان حیدر سے گلہ کیا تھا۔

❁❁❁

''بھائی...... بھائی پلیز مجھے معاف کر دیں۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ میرے یوں گھر سے چلے آنے کے بعد مما اپنی جان گنوا بیٹھیں گی۔ بھیا میں بہت شرمندہ ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔''

وہ گم صم سا پلکیں موندے اپنے گھر کے لان میں بیٹھا تھا جب شافیہ کی کال نے ایک مرتبہ پھر اسے اچھا خاصا ڈسٹرب کر ڈالا۔

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور ادھر شاہ زر آفندی جیسے کچھ بھی سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محر
ہو بیٹھا تھا۔

"بھیا! مجھے مما کی یاد آ رہی ہے۔ آئی ایم ویری ڈیپریس بھیا پلیز میرا یقین کریں۔ میں ایسا
بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے معاف کر دیں بھیا پلیز۔"

اس نے کال پک تو کر لی تھی مگر اب وہ چاہتے ہوئے بھی لائن ڈس کنکٹ نہیں کر پا رہا تھ
دوسری طرف شافیہ آفندی اس کی مسلسل خاموشی پر مزید بے چین ہو گئی۔

"بھیا! بھیا آپ بول کیوں نہیں رہے، کچھ تو کہیں بھیا پلیز......"

اس کے آنسو شاہ زر کے دل پر گر رہے تھے لہٰذا اس نے موبائل کان سے ہٹا کر سامنے پڑ
ٹیبل پر دھر دیا۔

تب ہی وہ پھر بلکتے ہوئے بولی تھی۔

"بھائی میں جانتی ہوں آپ مجھ سے بہت ناراض ہیں مگر میں آپ کے بغیر نہیں جی سکتی بھا
میرا یقین کیوں نہیں کرتے آپ؟"

"گھر سے نکلتے ہوئے یہ بات کیوں نہیں سوچی تم نے......؟"

ٹھہرے ہوئے لہجے میں خاصی بھاری آواز کے ساتھ بالآخر وہ پوچھ بیٹھا تھا جب دوسری طر
وہ مچلتے ہوئے بولی۔

"سوچی تھی بھائی! مما اور آپ کے بغیر جینے کا تو تصور بھی نہیں تھا میرے پاس مگر سائلہ
نے مجھے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ بھیا وہ جانتی تھیں کہ میں زاور سے پیار کرتی ہوں اس کے
جینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس کے باوجود انہوں نے زبردستی مجھے مما سے بات کر کے اپنے
کے ساتھ منسوب کرنا چاہا۔ زاور اور اس کی بہن کے متعلق جانے کیسی کیسی جھوٹی کہانیاں گھڑ کر
رہیں انہیں۔ بھیا میں آپ سے آپ کی خوشیاں چھیننا نہیں چاہتی تھی مگر وہ شخص جو اس ملک میں
نہیں تھا اسے بے خبری میں زندگی بھر کے لیے تنہا کر دینے کا حوصلہ نہیں کر سکی میں۔ بس یہی میرا
ہے بھیا صرف یہی میرا قصور ہے کہ میں اس شخص سے بے وفائی نہیں کر سکی جو میرا آئیڈیل ہے۔"

جس بہن کے ساتھ اس کے دوستوں سے مراسم تھے کتنے افسوس کی بات تھی کہ وہ اسی کے
کے راز سے آگاہ نہیں ہو سکا تھا۔ اندر کہیں پھر درد کی اک ٹیس اٹھی تھی اور اس نے مزید کچھ بھی
سنے بغیر اس بار لائن ڈس کنکٹ کرنے میں ایک لحہ نہیں لگایا تھا۔

❋❋❋

رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔

ادریس شاہ آج گھر نہیں آیا تھا۔ اس کی آج کھیتوں پر پانی لگانے کی باری تھی۔ شام میں
زیادہ خراب ہو گیا تو وہ قطعی ارادہ نہ ہونے کے باوجود وہیں ڈیرے پر رک گیا۔

گوری کی آنکھ کھلی تھی، کشادہ صحن میں بنا کسی لحاف کے چت لیٹی وہ مسلسل شاہد حسین کی
گردی اور دھمکیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی برابر والی چارپائی پر بُوا کے خراٹے گونج رہ
جب کہ ان کے ساتھ زاور کی چارپائی تھی جو اسی کی طرح بے چین گاہے بگاہے کروٹیں بدل رہا

گوری نے ذراسی گردن گھما کر اس کی طرف نگاہ ڈالی' کروٹ کے بل لیٹا وہ اس کی طرف رخ کیے ہوئے تھا لہٰذا اس نے فوراً نگاہ پھیر لی۔

چاند کی چاندنی آج قدرے مدہم تھی۔ وہ آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی اثنا میں کوئی اپنے مضبوط ہاتھ' کچی دیوار پر جماتے ہوئے بہت احتیاط سے اندر کودا تھا۔ گوری نے فوراً آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا مگر دیوار کے قریب اندھیرے کے باعث اسے کچھ نظر نہ آیا۔ ذہنی طور پر پریشان ہونے کے باعث اس نے کروٹ بدلی اور پھر آنکھوں پر بازو دھر لیا۔ تب ہی کوئی دبے پاؤں نہایت ہوشیاری سے چلتے ہوئے اس کی چارپائی کے قریب آیا اور اگلے ہی پل اپنا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر جما دیا۔

گوری لمحے میں بے بس ہوئی تھی۔

❁❁❁

شام گہری ہو رہی تھی اور وہ سوچوں میں الجھا بیٹھا تھا۔

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ انوشہ کے باپ اور بھائی کا سامنا کیسے کرے گا۔ اگر انوشہ اسے معاف کیے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو گئی تو وہ اپنے پیدا کرنے والے خدا کا سامنا کیسے کرے گا؟ کیا کہے گا سب سے......؟ اپنی اس درندگی کا کیا جواز پیش کرے گا ان کے سامنے...... کیسے کہے گا کہ اس نے محض غلط فہمی کی بنا پر انوشہ کو اغوا کر کے اس کا یہ حال کر دیا؟

کیا وہ زندہ رہ گئی تو دوبارہ کسی کے سامنے سر اٹھا کر گھر سے نکل سکے گی؟

وحشت کا شکار ہو کر اس رات انسانیت کی جو حد وہ پار کر چکا تھا' کیا اس کے لیے اسے اپنے خدا اور ضمیر سے معافی مل سکتی تھی؟ کب گمان تھا اسے کہ اس کا جنون اس کی زندگی میں اتنی بڑی تباہی لے آئے گا کہ اس کی پرسکون نیند بھی حرام ہو جائے گی۔

لمحے گھنٹوں اور گھنٹے دنوں میں ڈھل گئے تھے مگر انوشہ رحمٰن کی حالت میں ذرا سی بہتری بھی نہیں آئی تھی۔ وہ حادثے کے بعد سے گھر اور اسپتال کے سوا کہیں گیا ہی نہیں تھا لہٰذا اسے نہیں پتہ تھا کہ انوشہ کے گھر میں اس کی غیر موجودگی کے بعد کیا ہوا؟

اس کی پلکیں بدستور بند تھیں۔ زندگی کا سارا حسن اور چارم جیسے ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ہنسنا' بولنا' کھانا' پینا سب بھول چکا تھا۔ بھرے گھر میں سناٹوں کے سوا اور رہ بھی کیا گیا تھا۔ صبح نو دس بجے بیدار ہو کر بنا ناشتہ کیے اسپتال کے چکر لگانا اور دوپہر کے قریب اٹھ کر ایک چکر آفس کا لگانا پھر اسپتال چلے آنا اور رات دیر تک وہیں انوشہ کے بیڈ کے قریب بیٹھے اسے تکتے رہنا اور رات میں بہت دیر سے اٹھ کر گھر واپس آنا۔ بریرہ کی ذات میں بھی اب اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ کال کرتی رہتی مگر شاہ زر موبائل پر نمبر دیکھ کر بے نیاز بنا رہتا۔ بھری دنیا میں اس کا کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

اس روز بھی وہ لان میں سست سا بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا جب سائرہ بیگم کی کال نے اسے چونکا ڈالا۔ بہت دنوں بعد کال آئی تھی ان کی' لہٰذا اس نے فوراً پک کر لی۔

''ہیلو۔''

''ہیلو شاہ زر کہاں ہو......؟''
وہ بے حد پریشان لگ رہی تھیں۔
شاہ زر الجھن کا شکار ہو گیا۔
''فی الحال تو گھر پر ہوں کیوں خیریت......؟''
''نہیں بیٹے' تمہارے انکل کی حالت بہت سیریس ہے۔ زبردست ہارٹ اٹیک کا شکار ہوئے
جب سے ہوش میں آئے ہیں انوشہ کو پکار رہے ہیں۔ کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے
سید کمال سے بے پناہ محبت کے باعث فی الحال وہ خاصی پریشان لگ رہی تھیں۔
شاہ زر اپنی نگاہوں میں پھر چور بن گیا۔
''نہیں آنٹی! میرا کسی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔''
کتنی مشکل سے یہ الفاظ ادا کیے تھے اس نے' صرف وہی جانتا تھا۔ سائلہ بیگم نے اسے
فرصت میں یزدانی پیلس پہنچنے کی تنبیہ کرتے ہوئے رابطہ ختم کر دیا۔
اس کا ذہن سائلہ بیگم سے بات کرنے کے بعد مزید الجھ گیا تھا' انوشہ کی حالت ایسی نہیں تھی
وہ انہیں اس کے بارے میں سچ بتاتا' جانے کیا کیا تھا اس لڑکی نے اس رات اپنے ساتھ کہ حا
یہاں تک پہنچ گئی تھی۔
اگلی صبح خاصے الجھے دماغ کے ساتھ وہ یزدانی پیلس پہنچا تو سب سے پہلے بریرہ سے ہی
پڑا۔ سائلہ بیگم' اطہر اور ارحم سب ہی کمال صاحب کے ساتھ اسپتال میں تھے جب کہ وہ تنہا گھر
شاہ زر اس سے بے ساختہ نگاہیں چرا گیا۔
''آج تو لگتا ہے موصوف راستہ بھول کر ادھر آ گئے ہیں......''
اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ خاصی پرشکوہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی تھی۔ جب
تھکے تھکے سے انداز میں خود کو اس کے قریب ہی صوفے پر گراتے ہوئے بولا۔
''سوری بریرہ! پتہ نہیں حالات کو کیا ہو گیا ہے۔ سب کچھ بدل گیا ہے سب کچھ......''
''کیا تمہارا دل بھی......''
وہ جانے کیا جاننا چاہ رہی تھی۔ شاہ زر چہرے کا رخ پھیر گیا۔
''پتہ نہیں یار انکل اور آنٹی کہاں ہیں؟''
''اسپتال......''
''ٹھیک ہے میں چلتا ہوں پھر......تم اپنا خیال رکھنا......''
جلدی سے کہہ کر وہ اٹھا تھا جب بریرہ نے پکار لیا۔
''شاہ زر بات سنو۔''
وہ رک گیا مگر پلٹا نہیں۔
''ہاں کہو......''
''شافیہ یا انوشہ کا کچھ پتہ چلا......؟''
پھر وہی سوال جس سے بچنے کے لیے اس نے خود کو گھر میں مقید کر لیا تھا۔ اسے پھر اندا

تھی تب ہی مختصر لہجے میں بولا۔

''نہیں......''

بریرہ ابھی اگلا سوال کرنا ہی چاہتی تھی کہ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ٹی وی لاؤنج سے نکل گیا۔

❋❋❋

اس کی طبیعت بے کل ہو رہی تھی' لہٰذا دادی ماں کو بتا کر وہ گھر سے نکل آئی۔ ارادہ قریب ہی پیر شاہ کے مزار تک جانے کا تھا۔ اس نے ابھی پورا گاؤں نہیں دیکھا تھا۔ تاہم جھورے ماچھی کی چھوٹی لڑکی چھمو نے اسے گاؤں کے خاص خاص گھروں اور لوگوں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے کچھ خاص مقامات کے بارے میں خاصی جاندار معلومات فراہم کر دی تھی۔

سورج ابھی پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا۔ اوپر سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں میں جھولتے سر سبز درخت اور نیلے آسمان پر اڑتے ہلکے ہلکے سفید بادلوں نے ماحول کی خوب صورتی کو مزید چار چاند لگا دیے تھے۔

وہ چادر کا پلو سنبھالتی آگے بڑھتی گئی۔

دور کہیں چلتی پن چکی کی آواز' ایک خوشگوار تاثر اعصاب پر چھوڑ رہی تھی۔

قبرستان کے قریب آباد گھروں میں' خالص دیہاتی ذمہ دار خواتین اپنے اپنے مویشیوں کا گوبر ایک جگہ پر اکٹھا کر کے اس کے اُپلے بناتے ہوئے اسے خاصی دلچسپ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

قرب و جوار میں کسی گھر سے اٹھتی حلوے کی خوشبو نے اس کی بھوک کے احساس کو جگا دیا تھا۔

نظر سے کچھ ہی فاصلے پر چند ننگ دھڑنگ بچوں کو بارش کے ٹھہرے ہوئے گدلے پانی میں کھیلتے ہوئے دیکھ کر اس نے وہاں اسکول بنانے کا ارادہ کیا تھا۔

پیر شاہ کے مزار پر حاضری دے کر وہ ابھی مزار کی سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ ایک مرتبہ پھر سانول شاہ سے اس کا ٹکراؤ ہو گیا۔

تازہ شیو کے ساتھ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس وہ شخص اسے بہت کچھ یاد کروا گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس کی جرأت پر غصے ہوتی' سر اٹھائے اسے نفرت سے دیکھ رہی تھی جب وہ گداز لبوں پر دھیمی سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا۔

''بڑے مزاروں کے چکر لگ رہے ہیں کبھی ٹک کر گھر بھی بیٹھ جایا کرو۔''

اس کے حلیے کی مانند آج اس کا لہجہ بھی نرم اور خوشگوار تھا۔

انزلہ نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔

''میں تمہیں اچھی طرح جان گئی ہوں سنی دادا کہ اس ملک کا قانون کسی بھی گناہ کے باوجود تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ صرف اتنا یاد رکھو کہ اس دنیا سے اوپر ایک عدالت اللہ کی ہے جہاں پر انسان کو اس کے کیے گئے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور وہیں تمہیں بھی اپنے ہر گناہ کا حساب دینا ہوگا۔ کتنا جی لو گے تم یہاں بولو......؟ صرف ایک لمحہ لگے گا آنکھیں بند ہونے میں...... اور پھر...... یہ سارے اختیار تم سے چھن جائیں گے جن پر ابھی تم بڑا اترا رہے ہو۔''

''بس......''

وہ ابھی کچھ اور بھی کہتی کہ اس کے سامنے کھڑے سانول شاہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بو
سے روک دیا۔

''ہر وقت لیکچر جھاڑنے کے موڈ میں مت رہا کرو۔ یہ تمہاری یونیورسٹی نہیں میرا گاؤں ہے
یہاں وہی بات کہی سنی جاتی ہے جو میرے منہ سے نکلتی ہے۔''

''شٹ اپ۔''

تنفر سے کہہ کر اس نے رخ پھیر لیا تھا۔

سانول کچھ دیر گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد خود بھی آہستہ سے رخ پھیر گیا۔

''یہاں سے چلی جاؤ انزلہ پلیز۔''

اس کا لہجہ یکسر بدل گیا تھا مگر انزلہ شاہ نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

''کیوں چلی جاؤں تمہارے باپ کی جاگیر نہیں ہے یہ گاؤں۔ اب میں یہیں رہوں گی۔
یاد رکھو! میں نے تمہیں ایک روز جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہ پہنچایا تو میرا نام بھی انزلہ شاہ نہیں.....''

اس کا اندر جل رہا تھا۔

سانول کے لبوں پر پھر دھیمی سی مسحور کن مسکراہٹ بکھر گئی۔

''بے موت مر جاؤ گی۔ مت ایسی خواہشیں پالو اندر جو کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔''

''خوش فہمی ہے تمہاری۔ یاد رکھنا سانول شاہ تمہاری موت ہو گی تو انزلہ شاہ کے ہاتھوں
کے ہاتھوں نہیں۔''

نفرت بھرے دھمکی آمیز لہجے میں کہتی وہ آگے بڑھ گئی تھی جب کہ سانول پیر شاہ کے مزا
باہر کھڑا اسے دیر تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

❀❀❀

وہ چپ بھی بیٹھا ہے تو مجھ کو سنائی دیتا ہے
ہر ایک چہرے میں وہ ہی دکھائی دیتا ہے
مجھے بھی رونقِ دنیا پسند ہے لیکن
تیرا خیال کب مجھ کو رہائی دیتا ہے

وہ ارسلان حیدر کے خیالوں میں گم بیٹھی اسے کال کرنے کا سوچ رہی تھی جب شجاع ا
گود میں اٹھائے اس کے کمرے کی دہلیز پر آ کر رک گیا۔

''مس امامہ.....''

ہاتھ میں پکڑی چابی سے اس نے پہلے آہستہ سے اس کے روم کا دروازہ ناک کیا پھر اسے ا

امامہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''جی..... جی سر.....''

''یہ بے بی کو سنبھالیں۔ میں دو روز کے لیے نیویارک جا رہا ہوں۔ ابھی بیس منٹ لا
ہے میری۔ دھیان رکھئے گا پلیز.....''

"جی...... جی ضرور......"

وہ ذہنی طور پر حاضر نہیں تھی مگر پھر بھی خوشی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے گڑیا کو تھام لیا تھا۔

مہمان کے گھر سے رخصت ہونے کے بعد اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اب یقیناً وہ پوری آزادی کے ساتھ اس کے کمرے کا لاک توڑ کر بھی اپنی مطلوبہ فائل تک پہنچ سکتی تھی۔

مہمان رخصت ہو چکا تھا اور اب وہ خوشی سے کپکپاتی انگلیوں کے ساتھ ارسلان حیدر کا نمبر ڈائل کر رہی تھی تاکہ اسے بھی خوش کر کے منا سکے۔

❀❀❀

وہ ابھی اسپتال پہنچا ہی تھا جب سید کمال صاحب کی زندگی کے چراغ گل ہونے کی خبر ملی اور اس کے قدم جیسے ان کے وارڈ کی دہلیز پر ہی ٹھٹک گئے۔

اندر سائرہ بیگم پچھاڑیں کھا رہی تھیں اور ان کے بچے دائیں بائیں کھڑے نم آنکھوں سے اپنے سامنے پڑے اپنے بے جان باپ کو دیکھ رہے تھے۔ شاید ابھی ابھی ڈاکٹرز نے ان کے چیک اپ کے بعد ان کی روح کے دارِ فانی کوچ کر جانے کی تصدیق کی تھی۔

اس کے دل اور اعصاب کا بوجھ ایک دم سے بڑھا تھا۔

پے در پے طوفانوں نے اس کے دل کا راستہ جیسے دیکھ لیا تھا۔ بے حد سادہ اور مشفق اس شخص کی موت کا ذمہ دار بھی وہی تھا۔ نہ وہ انوشہ کو اغوا کرتا' نہ یہ سب ہوتا۔ اس کے اندر پھر پچھتاوؤں کا غبار اٹھا تھا۔ انوشہ اگر ہوش میں آجاتی تو کیا اتنے بڑے نقصان کے لیے اس کو معاف کر پاتی۔

اعصابی دباؤ ایک دم سے اتنا بڑھا تھا کہ وہ وہیں کمال صاحب کے روم کی دہلیز سے واپس پلٹ آیا تھا۔ ہوسپٹل سے سیدھے گھر پہنچ کر اس نے خواب آور گولیاں پھانکیں اور پانی کا پورا گلاس ایک ہی گھونٹ میں خالی کر کے وہیں اپنے بیڈ پر گر گیا۔

اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کا موبائل مسلسل چیخ رہا تھا۔ کمال صاحب کو غسل دیا جا چکا تھا اور اب ان کی تدفین کے لیے تیاری کی جا رہی تھی۔ شاہ زر میں اٹھنے کی سکت نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مار کر گھر سے نکل آیا تھا۔

زہرہ اور سائرہ بیگم کا حال دیکھنے لائق نہ تھا۔

وہ چور سا ایک سائیڈ پر کھڑا ارحم لوگوں سے تعزیت کرتا' انہیں تسلی دیتا رہا۔ اطہر کی زبانی اسے پتا چلا تھا کہ کمال صاحب کی طبیعت کل شام کے بعد ہی زیادہ بگڑی تھی۔ اس سے پہلے وہ نیم بے ہوشی میں صرف انوشہ اور زاور کو ہی پکارتے رہے تھے اور کتنے افسوس کی بات تھی کہ وہ دونوں بچے ہی ان کا آخری دیدار تک نہیں کر سکتے تھے۔

شاہ زر کے اندر احساسِ جرم مزید بڑھ گیا۔

"ہمدانی پیلس" میں اس نے نزہت بیگم اور سید جمال صاحب کو بھی نڈھال دیکھا تھا۔ وہ انوشہ اور زاور کو لے کر بھی بہت پریشان تھے۔ شاہ زر کی الجھنیں مزید بڑھ گئیں۔

زاور کی ایک دم سے گمشدگی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ جہاں بھی تھا جس حال میں تھا۔ اگر

خیریت سے تھا تو اپنے گھر والوں کو کم از کم اپنے متعلق اطلاع تو دے سکتا تھا۔

کمال صاحب کی تدفین ہو چکی تھی جس کے فوراً بعد وہ وہاں سے نکل کر پنڈی آیا تھا اور اس روز اس نے صرف دن ہی نہیں رات بھی انوشہ کے پاس ہی گزاری تھی۔ بہت دیر تک اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیے وہ روتا رہا تھا۔

''انوشہ! خدا کے لیے آنکھیں تو کھولو۔ میری آنکھوں میں مچلتے پشیمانی کے آنسو تو دیکھ لو پھر چاہے تم مجھے میری زندگی سے دور کر دینا مگر پلیز صرف ایک بار کہہ تو دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا پلیز......''

بچوں کی طرح روتے ہوئے وہ جانے اس سے کیا کیا کہتا رہا تھا۔

پچھلے تین ماہ میں اس نے پانی کی طرح پیسہ بہا دیا تھا۔ ہزاروں' لاکھوں کا حساب نہیں تھا۔ انوشہ کا علاج مہنگا ترین ہو رہا تھا مگر اسے اپنے پیسوں کی پروا کہاں تھی۔ اسے ہر قیمت پر انوشہ رحمٰن کی زندگی مطلوب تھی۔ اس کی سوچوں' اس کی یادوں اور اس کے تصورات میں ہمہ وقت انوشہ رحمٰن کا گزر تھا۔

زندگی کے رنگ ایک دم سے کتنے پھیکے پڑ گئے تھے۔

✻✻✻

شام ڈھل رہی تھی جب تھکے تھکے سے سید جمال صاحب سست قدموں سے چلتے گھر کے کشادہ صحن میں آ بیٹھے تھے۔ نزہت بیگم کی آنکھوں میں ابھی تک نمی جھلک رہی تھی۔

''جمال! زاور کا کچھ پتہ چلا؟ میرا دل ہول رہا ہے۔ بدنصیب کو باپ کا آخری دیدار بھی نصیب نہیں ہو سکا۔ صدف کا بھی کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ کہاں ہے؟ اور انوشہ اسے تو جیسے یہ زمین نگل گئی ہے۔ میرا دل پھٹ جائے گا جمال پلیز آپ کچھ کریں۔''

سید کمال صاحب کی رحلت کو دوسرا ماہ شروع ہو گیا تھا مگر ابھی تک نہ انہیں انوشہ کی کوئی خبر ملی تھی اور نہ زاور کی۔ وہ ماں نہیں مگر ''ماں جیسی'' تو تھیں۔ جمال صاحب ان کا دکھ اور پریشانی سمجھ سکتے تھے مگر ابھی تو وہ خود نڈھال تھے۔ اکلوتے بھائی کی اچانک موت نے انہیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ لہٰذا ان کے سسکتے لہجے کے جواب میں فقط سر جھکا کر رہ گئے۔

''صبر کرو نزہت اور اللہ سے بہتری کی دعا کرو۔ بے شک وہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔''

''مجھے صبر نہیں آ رہا۔ پتہ نہیں میرے بچے کس حال میں ہوں گے اوپر سے سائلہ کے الزام.... میرا دل نہیں مانتا۔''

''دل تو میرا بھی نہیں مانتا۔ خیر تم دعا کرو۔ میں پھر تھانے جا کر پتہ کرتا ہوں۔''

تھکن سے چور ہونے کے باوجود وہ دوبارہ پاؤں میں جوتے اڑستے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے تھے جب کہ نزہت بیگم پلکیں موند کر ذکر اللہ میں مصروف ہو گئی تھیں۔

✻✻✻

چلو یہ فرض کرتے ہیں
کہ تم مشرق میں مغرب ہوں

مان لیتے ہیں بڑا لمبا سفر ہے یہ
یہ بھی حقیقت ہے
تمہاری ذات کا سورج
سارا رستہ چل کر میری ہستی میں ڈوبے گا
شام کے دھندلکے گہرے ہو رہے تھے۔
وہ ملول سا گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے بیٹھا رو رہا تھا جب کسی نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر دھر دیا۔
"شاہ زر......"
لہجے میں بے حد اپنائیت تھی۔ تاہم اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔
"کم آن یار کتنے دن ہو گئے تمہیں گھٹ گھٹ کر جیتے ہوئے۔ ایسا کب تک چلے گا؟ تمہارے اس طرح بہانے سے وہ لڑکی ہوش میں تو نہیں آ جائے گی۔"
اس کا عزیز از جان دوست عباد اس سے کہہ رہا تھا مگر وہ سن سا بیٹھا رہا۔
"چلو اٹھو۔ اٹھ کر شاور لو شیو بناؤ۔ سردی بڑھ رہی ہے مگر تمہیں کوئی احساس نہیں ہے۔"
اس بار اس نے شاہ زر کو زبردستی اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔
"شاہ زر اٹھو یار پلیز......"
اسے غصہ آیا تھا تب ہی وہ آنسو پیتے ہوئے بولا۔
"عباد اگر اسے ہوش نہ آیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔"
"اللہ کریم ہے۔ کیا تم اللہ کی رحمت سے مایوس ہو سکتے ہو؟"
"نہیں۔ میں اپنے اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں مگر......"
"مگر کیا...... حوصلہ رکھو یار انشاء اللہ سب بہتر ہوگا۔"
"حوصلہ نہیں ہے اب مجھ میں۔ میرا ضمیر مجھے معاف نہیں کر پا رہا عباد۔ میں نے ظلم کے ساتھ گناہ بھی کیا ہے۔ وہ گناہ جس کی معافی نہیں ہے۔ حوصلہ کیسے کروں میں......؟"
کہنے کے ساتھ ہی وہ پھر بے بسی سے رو پڑا تو عباد نے اس کے مضبوط کندھوں کے گرد ہاتھ رکھ کے اسے خود سے لگا لیا۔
"تمہیں اپنے گناہ اور ظلم کا احساس ہو گیا یہی تمہارے نیک ہونے کی دلیل ہے ورنہ کیا نہیں ہوتا اس دنیا میں۔ صبح و شام ضمیر بکتے ہیں کون توبہ کرتا ہے۔ چلو ہوسپٹل چلتے ہیں۔ بے شک اللہ کی رحمت کا دائرہ تمہارے گناہ سے زیادہ وسیع ہے اور تم جانتے ہو ناں اس کی رحمت سے مایوس ہونا کتنا بڑا گناہ ہے۔"
وہ اس کی زبانی تمام احوال مختصراً سن چکا تھا۔ تب ہی حوصلہ دیتے ہوئے بولا تو شاہ زر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ لیے۔
"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو بے شک وہ مہربان ہے۔ مجھے رونے کی بجائے اس سے دعا کرنی چاہیے۔"
عباد کی کوشش بے کار نہیں گئی تھی۔ وہ گاڑی کے بونٹ سے اٹھ کر اندر گاڑی میں فرنٹ سیٹ

پر آ بیٹھا۔

''گڈ...... یہ ہوئی ناں مردوں والی بات۔ ویسے ایک سوال پوچھوں سچ سچ جواب دو گے؟''

ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے عباد نے اچانک سوال کیا۔ جواب میں شاہ زر نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھے بغیر دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم...... میرا مطلب ہے کہیں تمہیں اس انوشہ سے پیار تو نہیں ہو گیا......؟''

''نہیں......''

''تو پھر...... اگر اسے کبھی ہوش نہ آیا تو کیا تم ساری زندگی یوں ہی گھلتے رہو گے؟''

وہ اس کا ہمدرد تھا تب ہی فکر کر رہا تھا۔

شاہ زر نے اپنا رخ آہستہ سے کھڑکی کی جانب پھیر لیا۔

''میں...... میں اس کی طلب کے سہارے زندگی کو نہیں گھسیٹ رہا عباد۔ نہ ہی میرے دل میں اس کی محبت کا کوئی دیپ روشن ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ناں اسے میں نے کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہی نہیں۔''

''تو پھر...... تمہاری آنکھوں میں اسے کھو دینے کا درد کیوں مچل رہا ہے؟ کیوں اس کے لیے اتنے ڈسٹرب رہتے ہو تم؟''

''پتہ نہیں یار۔ شاید یہ میرا احساسِ جرم ہے جو مجھے کسی پل چین لینے نہیں دے رہا مگر تم دیکھنا عباد جس روز اسے ہوش آ گیا اور وہ مجھے معاف کر کے نارمل لوگوں کی طرح زندگی کو جینا شروع ہو گی اس روز میں درد کے اس حصار سے باہر نکل آؤں گا جواب ہمہ وقت تمہیں میری آنکھوں میں مچلتا دکھائی دیتا ہے۔''

کہنے کے ساتھ ہی اس نے پلکیں موند کر سر کرسی کی پشت گاہ سے ٹکا دیا تو عباد نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر اپنی مکمل توجہ پھر سے ڈرائیونگ پر مرکوز کر دی۔

✻✻✻

''ہیلو ارسلان...... میں امامہ بول رہی ہوں۔ ایس پی شجاع حسن کے گھر کا نمبر ہے یہ...... میرے سیل میں کوئی پرابلم ہو گئی ہے۔ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا......''

بار بار کال ملانے کے بعد جیسے ہی دوسری طرف سے ارسلان نے کال پک کر کے ہیلو کہا وہ پرجوش انداز میں شروع ہو گئی۔ دوسری طرف نیند سے بیدار ہونے کے باعث اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

''تو......؟''

''تو یہ کہ میں اپنی محبت کے امتحان میں کامیاب ہونے والی ہوں۔ آج وہ ایس پی کا بچہ ملک سے باہر گیا ہے۔ پرسوں کہیں واپس آئے گا۔ گھر کی ساری چابیاں یہیں ہیں۔ کل میں تم تک وہ فائل پہنچا دوں گی جس کی وجہ سے تم نے اتنے دنوں سے مجھے جدائی کا عذاب دیا ہوا ہے۔''

''واقعی......؟''

ارسلان کی نیند بھک سے اڑ گئی تھی۔

''ہاں......اب تو مانتے ہو ناں کہ میں تم سے کتنا پیار کرتی ہوں؟''
وہ اترائی تھی۔
''ہاں جانی مان گیا ہوں۔ مجھے خود کہاں کچھ اچھا لگ رہا ہے تمہارے بغیر' سارا گھر سونا سونا لگ رہا ہے۔ امی کتنی بار تمہارا پوچھ چکی ہیں۔ آج آجاؤ ناں ملنے......'' صرف ایک لمحے میں وہ پھر پہلے جیسا ہو گیا تھا۔
امامہ کا دل خوشی سے بھر گیا۔
''شکریہ......میں آج ہی گھر آ رہی ہوں......''
خوشی اس سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ ارسلان نے فوراً الوداعیہ کلمات پیار سے کہہ کر لائن کاٹ دی۔ آج کل وہ زیادہ دیر اپنا نمبر مصروف نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ اس کی نئی محبوبہ اسے بار بار کال کرتی رہتی تھی اور پھر اسے قسم اٹھا کر اپنی صفائی پیش کرنی پڑتی تھی۔ پہلے ہی بہت گناہ سر ہو گئے تھے لہٰذا وہ احتیاط کر رہا تھا۔
ریسیور کریڈل پر ڈال کر وہ پلٹی ہی تھی کہ شجاع کی صدا نے چونکا ڈالا۔
''مس امامہ......''
وہ اپنے کمرے کی دہلیز پر کھڑا تھا۔
امامہ کو لگا بس اس کی زندگی میں عافیت کی گھڑیاں یہیں تک تھیں۔

❁❁❁

''کس سے بات ہو رہی تھی؟''
چہرے پر مکمل سنجیدگی طاری کیے شجاع اس سے پوچھ رہا تھا اور وہ نگاہیں جھکائے کھڑی اندر سے ہول رہی تھی۔
''کزن سے......''
''او کے۔ میں ایک ضروری فائل بھول گیا تھا وہی لینے آیا تھا۔ اباجی ابھی سو رہے ہیں۔ اٹھ جائیں تو بتا دیجیے گا کہ میں ایک دو روز کے لیے ملک سے باہر جا رہا ہوں۔''
''واٹ......؟''
وہ صرف چونکی نہیں تھی بلکہ بے حد حیران بھی رہ گئی تھی۔
شجاع نے پلٹتے پلٹتے رک کر اسے دیکھا تھا۔
''واٹ کیا......؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟''
''جی......مم......میں ٹھیک ہوں۔ وہ اصل میں ڈر گئی تھی کہ کہیں آپ کا نمبر استعمال کرنے پر مجھے ڈانٹ نہ دیں۔ آپ نے کچھ کہا ہی نہیں۔''
لمحوں میں خود کو سنبھالا تھا اس نے۔
شجاع اس کی پیشانی پر چمکتے پسینے کے قطرے دیکھ کر مبہم سا مسکرا دیا۔
''میں اتنا جلاد نہیں ہوں جتنا آپ نے سمجھ لیا ہے۔ ویسے میں ابھی لاؤنج میں انٹر ہوا تھا۔ اگر آپ نے اپنے کزن سے دل کی کوئی بات کہہ بھی لی ہے تو بے فکر رہیے۔ میں نے کچھ نہیں سنا۔'' وہ

بہت کم مسکراتا تھا مگر جب مسکراتا تھا تو سامنے والے کو اپنے حصار میں جکڑ لیتا تھا۔ امامہ ہونقوں کی طرح سر اٹھائے اسے دیکھتی رہ گئی تھی جب کہ وہ خوشگوار موڈ کے ساتھ دہلیز سے ہی پھر پلٹ گیا تھا۔

''شکر...... جان بچی سو لاکھوں پائے۔ خدا نے ایک مرتبہ پھر مجھے بچالیا بال بال۔ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے پاک اللہ۔''

اس کے جاتے ہی گہری سانس بھر کر وہ صوفے پر ڈھیر ہو گئی تھی۔

❁❁❁

گوری نے اپنے منہ پر بھاری ہاتھ جمنے کے بعد کافی احتجاج کیا تھا۔ اس کی کلائی میں پڑی چوڑیوں کی کھنک اور گھٹی گھٹی آواز پہ زاور نے کروٹ بدلی اور پھر جو منظر دیکھا اس نے اسے ٹھٹکا دیا۔ اس کے زخم ابھی مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوئے تھے مگر اس کے باوجود وہ کسی باز کی طرح لپک کر گوری کی مدد کے لیے اس کی طرف بڑھا تھا۔

شاہد حسین طاقت میں اس سے دوگنا تھا مگر اس نے اپنے زخموں کی پروا کیے بغیر اسے قابو کر لیا۔ بی اماں کی آنکھ بھی کھٹکے سے کھل گئی تھی۔ تاہم اس سے پہلے کہ سارا گاؤں جاگ کر وہاں جمع ہو جاتا۔ شاہد حسین نے ہوشیاری دکھائی اور زاور کی گرفت سے خود کو چھڑاتے ہوئے فوراً دیوار پھلانگ کر فرار ہو گیا۔

اس کا مقصد فیل ہو گیا تھا۔ گوری کی سانس سے سانس نہیں مل رہی تھی۔

خود زاور بھی دس پندرہ منٹ کی جنگ میں خاصا ہانپ گیا تھا۔

''گوری...... کیا ہوا پتر؟''

بات ابھی تک اماں بی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی تب ہی گوری حقارت سے ایک سائیڈ پر تھوکتے ہوئے بولی۔

''وہ کتا آیا تھا مجھے اٹھانے۔ اس روز دھمکی دے کر گیا تھا ناں......''

''کیا......؟'' بی اماں کا دل دھک سے رہ گیا تب ہی زاور بولا۔

''آپ پریشان نہ ہوں اماں میں کل اپنے شہر واپس جا رہا ہوں۔ آپ اور گوری میرے ساتھ شہر چلیں گی پھر وہیں میں اپنے دوست سے بات کر کے اس ذلیل انسان کا بندوبست کرواؤں گا۔ وہ ایسے نہیں سمجھے گا۔ اس لیے ہو سکتا ہے دوبارہ پھر نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔ ہمیں اس کی طرف سے مزید غفلت نہیں برتنی چاہیے۔''

زاور کے کہنے پر گوری نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

وہ شخص اس کے خوابوں کا شہزادہ نہیں تھا مگر مسیحا بن کر اس کی زندگی میں داخل ضرور ہو گیا تھا۔

❁❁❁

یونیورسٹی میں ان دنوں اسٹرائیک چل رہی تھی۔

لہٰذا وہ اور میران دونوں ہی یونیورسٹی نہیں جا رہے تھے۔ اس روز موسم بہت اچھا تھا۔ میران اسے اپنے ساتھ لانگ ڈرائیو پر لے جانے کے لیے خود اس کے گھر آیا۔ وہ کچن میں مصروف تھی مگر میران کی خواہش پر سارے کام چھوڑ کر کنیز بیگم سے اجازت لیتے ہوئے وہ اس کے ساتھ گھر سے

اوڑھ لی تھی۔
اس روز گرے کرتا شلوار میں وہ بہت پیارا لگ رہا تھا۔
تقریباً آدھ پون گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد میران نے گاڑی لاک کر دی اور دونوں ہلکی ہلکی پھوار میں گیلی سڑکیں ناپنے لگے۔
''انزلہ! مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔''
اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے میران شاہ نے اچانک کہا تھا جب وہ مسکراتے ہوئے بولی
''تو کہو بھئی یہاں چپ رہنے کا آرڈر کس نے دیا ہے؟''
''میں گاؤں جا رہا ہوں انجو۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ امتحانات سے قبل آ جاؤں گا۔ واپسی میں امی کو بھی لاؤں گا۔''
''کیوں...... امی کو کیوں لاؤ گے؟''
اس کا دل دھڑکا تھا جب وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
''کسی سے ملوانا ہے۔''
''کس سے......؟''
''ہے ایک لڑکی نٹ کھٹ سی۔ اب اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا ضروری ہو گیا ہے۔''
اس کی روشن آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔
انزلہ نے گھبرا کر پلکیں جھکا لیں۔ دل کی تیز رفتاری مزید بڑھی تھی۔
وہ دن دونوں نے خوشی خوشی ایک دوسرے کی ہمراہی میں ہی بسر کیا تھا۔ رات میں میران کو ٹرین کے ذریعے گاؤں روانہ ہو جانا تھا لہٰذا وہ دیر تک جاگتی رہی۔ جانے کیوں اس کے جانے پر اس کا دل پہلی بار مختلف وہموں کا شکار ہو رہا تھا۔
اس کی مما کی بیماری کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید وہ اسے جانے ہی نہ دیتی مگر...... اس کے ہزار وسوسوں کے باوجود وہ رخصت ہو گیا تھا اور بس...... یہی میران شاہ سے اس کی آخری ملاقات تھی۔ وہ وعدے کے مطابق دوبارہ شہر لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ نہ ہی وہ خود یونیورسٹی گئی تھی۔
اس وقت اس کے ذہن میں یہی تھا کہ میران نے ضرور اس سے بے وفائی کی ہے۔ اس کی بیمار ماں نے اپنی خواہش پر زبردستی اس کا نکاح کسی دیہاتی لڑکی سے کروا دیا ہوگا اور وہ فرماں برداری کی اعلیٰ ترین مثال قائم کرتا شادی کروا کے اب اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہا ہوگا۔ یہی کچھ سوچ سوچ کر اس نے خود کو تباہ کر لیا تھا جب کنیز بیگم نے زبردستی اسے ہائیر اسٹڈی کے لیے بھائی کے پاس انگلینڈ بھجوا دیا اور اب جب کہ سر تا پا بدل کر وہ واپس آئی تھی تو زندگی نے ایک مرتبہ پھر اسے آگ کے دریا میں دھکیل دیا تھا۔
وہ بری طرح سے رو رہی تھی۔
''تمہیں مرنا ہوگا سانول شاہ۔ کتے کی موت مرنا ہوگا تمہیں۔''
غصے کی آگ ایک مرتبہ پھر شدید ہوئی تھی۔ اس وقت اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ سانول شاہ کی

بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیتی۔
بی اماں اپنے بھتیجے اور بھتیجی کے ساتھ گاؤں سے جا رہی تھیں۔
اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہٰذا دادی ماں نے اسے نہیں بتایا۔ وہ آج کل خود بھی سنجیدگی سے شہر جانے کا سوچ رہی تھیں۔

❊❊❊

دل کی حالت کسی طرح سنبھلتی ہی نہیں
خواب در خواب ہے' تعبیر نکلتی ہی نہیں
زیست ہے شمع کی مانند' ہوا کی زد پر
بس سلگتی ہے کسی حال میں جلتی ہی نہیں
کشتیاں ڈوب رہی ہیں تو یہ اس کی مرضی
یہ ہوا ہے کہ میری راہ پر چلتی ہی نہیں
زیست بکھری ہوئی رہتی ہے میرے جذبوں میں
جانے کیا بات ہے احساس میں ڈھلتی ہی نہیں
ہم گزرتے ہوئے لمحات میں گم رہتے ہیں
زندگی ہے کہ کبھی راہ بدلتی ہی نہیں

وہ تھکا ماندہ سا گھر واپس لوٹا تھا جب اپنے سامنے بریرہ کو بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔
''تم یہاں......؟''
''آف کورس۔ کیا میں یہاں نہیں آ سکتی......؟''
''کیوں نہیں آ سکتی تمہارا اپنا گھر ہے۔''
وہ شرمندہ ہوا تھا۔ بریرہ مسحور کن انداز میں مسکرا دی۔
''انوشہ سے مل کر آ رہے ہو ناں......کیسی ہے وہ؟''
وہ ابھی سکون سے بیٹھا بھی نہیں تھا کہ اس کے سوال نے پھر حیرت زدہ کر ڈالا تھا۔
''تمہیں کیسے پتہ انوشہ کا؟''
''سب پتہ ہے مجھے زاور کا بھی پتہ ہے کہ وہ کہاں ہے؟''
''کہاں ہے......؟'' وہ پھر چونکا تھا جب وہ بولی۔
''پہلے تم بتاؤ۔ تم نے انوشہ کی کہانی مجھ سے کیوں چھپائی؟ گھر میں اتنا فساد کھڑا ہوا۔ ابو کی جان بھی چلی گئی اس دکھ میں، پھر بھی تم نے کسی کو کانوں کان بھنک تک پڑنے نہیں دی۔ کیوں؟''
اس کے سوال میں اصرار تھا۔ شاہ زر نے اپنا سر بے حد تھکے انداز میں صوفے کی پشت گاہ سے ٹکا دیا۔
''یہ بہت لمبی کہانی ہے بریرہ۔ اگر کسی کو سنا دیتا تو شاید سب مجھ سے منہ پھیر لیتے۔ بہت ظلم کیے ہیں میں نے اس لڑکی پر۔ بہت برا کیا ہے اس کے ساتھ میں نے۔''
وہ شروع ہوا تو پھر بریرہ کو ساری کہانی سنا کر ہی دم لیا۔ اب وہ سب کچھ جان کر سن بیٹھی تھی۔

''شاہ زر......اگر وہ جان سے چلی گئی تو......کیا تم خود کو معاف کر سکو گے......؟''

''نہیں......بس اسی بات کا ملال ہے مجھے۔''

اس کے لہجے میں پھر شکستگی اتر آئی تھی۔ ابھی بھی اپنی حیوانیت کی بات تو وہ چھپا ہی گیا تھا۔

بُریرہ اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

''تم ٹینشن مت لو۔ اللہ سب بہتر کرے گا۔ شافیہ بہت شرمندہ ہے تم سے۔ پلیز اسے معاف کر دو شاہ زر۔''

''اس کا نام مت لو میرے سامنے پلیز۔''

وہ چڑا تھا۔ بُریرہ چپ رہ گئی۔

''یہاں کس کے ساتھ آئی ہو تم؟''

''اشنان کے ساتھ۔ اسے یہاں کوئی ضروری کام تھا۔ میں نے ضد کی تو مجھے بھی لے آیا۔ ایک دو دن میں امی بھی آ رہی ہیں۔''

''کیوں......؟''

''پتہ نہیں۔ تمہاری فکر ستا رہی تھی۔ شاید اسی لیے آنا چاہ رہی ہوں گی۔''

''او کے میں بہت تھک گیا ہوں۔ تھوڑا ریسٹ کروں گا۔ تم ٹی وی دیکھ لو۔''

کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تو بُریرہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ اسے جاننے سے بھی دلچسپی نہیں تھی کہ اسے انوشہ کے بارے میں کیسے پتہ چلا......؟ نہ ہی وہ اسے بتا سکی کہ اسے عباد کے توسط سے تمام کہانی کا پتہ چلا تھا۔ شاید واقعی اس وقت وہ بہت ڈسٹرب تھا۔ اس کی انگلیاں اب شافیہ کا موبائل نمبر پریس کر رہی تھیں تاکہ اسے شاہ زر کے ردعمل کے متعلق آگاہ کر سکے۔

❋❋❋

ادریس شاہ کو جیسے ہی شاہد حسین کی حرکت کا پتہ چلا تھا وہ بے حد مشتعل ہو گیا تھا۔ زاور نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ سمجھ نہیں رہا تھا۔

''گوری کہیں نہیں جائے گی۔ ابھی بھائی مرا نہیں ہے اس کا۔ تم دیکھنا زاور میں اس کمینے کو مار کر گاؤں میں نہ پھینک دوں تو ادریس نام نہیں میرا۔''

وہ خالص دیہاتی تھا۔ زاور نے اسے سمجھانے کی کوشش ترک کر دی۔ ویسے بھی اسے ان لوگوں کے آپس کے مسائل میں پڑنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو صرف انسانیت کے ناتے ان کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

اب اس کے زخم بھی کافی مندمل ہو گئے تھے۔ لہٰذا بی اماں سے معذرت کر کے وہ ان سب کے خلوص کا شکریہ ادا کرتا اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ راستے میں ادریس اسے گاؤں کے لوگوں اور وہاں کے واقعات کے متعلق بہت کچھ بتاتا رہا تھا۔ اس نے اور گوری نے اسے گھر والوں کے لیے بہت سی خالص دیہاتی چیزیں بھی تحفے میں دی تھیں جو ادریس نے ہی اٹھائی ہوئی تھیں۔ بی اماں نے

وقتِ رخصت بہت سی دعاؤں کا تحفہ دیا تھا اسے۔

زاور نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اب جب بھی فرصت ملے گی وہ ایک چکر گاؤں کا ضرور کرے گا۔ بے شک وہاں کے لوگوں میں محبت کا رنگ بہت خالص تھا۔ بس میں بیٹھنے سے قبل نے ادریس کو اپنا فون نمبر اور گھر کا ایڈریس بھی دے دیا تھا تا کہ کسی بھی معاملے میں جب بھی اس ضرورت پیش آئے وہ اسے مدد کے لیے بلا لے۔

ادریس نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد ہی شہر کا چکر ضرور لگائے گا۔

زاور کے گاڑی میں بیٹھنے اور روانہ ہونے تک وہ چہرے سے پسینہ پونچھتا کچی سڑک پر کا اسے نگاہوں سے اوجھل ہوتے دیکھتا رہا تھا۔

❋❋❋

ہزار رنج گوارہ تیری خوشی کے لیے
ہزار غم تیری خاطر بھلا دیے ہم نے
جلا کے تیری تمنا کا دل میں ایک چراغ
سبھی چراغ تمنا بجھا دیے ہم نے

وہ مؤدب سا سائلہ بیگم کے سامنے سر نیوڑائے بیٹھا تھا اور وہ اس سے کہہ رہی تھیں۔

''شاہ زر بیٹا! دیکھو میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ نائلہ کی اچانک ناگہانی موت نے تمہیں بہت بڑے دکھ اور نقصان سے دوچار کیا ہے مگر بیٹا زندگی بڑی ظالم ہے۔ مجھے دیکھو جان سے پیاری بہن کے بعد اپنا محبوب شوہر بھی گنوا دیا میں نے۔ میرے پاس کیا بچا ہے جینے کے لیے مگر بچوں کے لیے جینا پڑے گا۔ تمہارے پاس بھی ابھی بہت سے رشتے ہیں جینے کے لیے ان کی قدر کرو بیٹا۔''

شاہ زر نہیں جانتا تھا کہ اتنے دنوں کے بعد وہ یہ سب اس سے کیوں کہہ رہی ہیں تب ہی چپ بیٹھا رہا۔ بُریرہ ان کے پاس سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔

''دیکھو بیٹا! آزمائشیں اور مصیبتیں تو سب پر آتی ہیں۔ اللہ اپنے پیارے بندوں سے ہی امتحان لیتا ہے۔ اس لیے بندوں کو چاہیے کہ وہ اس کی طرف سے آئی آزمائش میں ثابت قدم رہیں اور ہر حال میں اس کا شکریہ ادا کرتے رہیں۔ اب میری طرف ہی دیکھ لو۔ کیا میں نے صبر نہیں کیا۔ نائلہ کی موت یوں ہی لکھی تھی پھر کیسے ٹل جاتی۔''

''آنٹی پلیز! اگر ان سب باتوں کا مقصد شافیہ کی وکالت ہے تو مجھے مزید کچھ نہیں سننا۔'' وہ چ گیا تھا تب ہی وہ بولیں۔

''میں کسی کی وکالت نہیں کر رہی۔ جیسے تم عزیز ہو ویسے ہی شافیہ بھی مجھے عزیز ہے۔ اس نے غلطی ضرور کی ہے مگر اتنی بڑی نہیں کی کہ کبھی معافی ہی نہ مل سکے۔ تم نہ رکھو اسے اپنے گھر، میرے پاس رہ لے گی وہ۔ ویسے بھی وہاں زیادہ بہتر ہے۔ میں اس کی نہیں، تمہاری بات کرنا چاہتی ہوں تم سے۔''

''میری کیا بات کرنا چاہتی ہیں میں تو جی رہا ہوں۔''

''صرف جینے سے بات نہیں بنتی۔ ساحل ماشاء اللہ خوشگوار زندگی بیتا رہا ہے۔ اس شافی کی بچی نے حماقت نہ کی ہوتی تو آج اس کے ساتھ تم بھی خوشگوار زندگی جی رہے ہوتے۔ نائلہ کی بڑی خواہش تھی بُریرہ کو اپنی بہو بنانے کی مگر میری بہن اپنا آخری ارمان دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو گئی۔ مجھ سے تمہاری تنہائی دیکھی نہیں جاتی بیٹا۔ زندگی کا کیا بھروسہ میرے بعد کون بزرگ رہے گا تمہارے سر پر اس لیے میں چاہتی ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکتا ہے تمہاری اور بُریرہ کی شادی کر دوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے ناں؟''

''نہیں۔'' گہری سانس بھر کر اس نے اپنا سر صوفے کی پشت گاہ سے ٹکا دیا تھا۔

''بُریرہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چوائس نہیں مگر فی الحال میں ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

''ہو جاؤ گے۔ میں اب مزید تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ کیسا پیارا گھر تھا میری بہن کے ہوتے ہوئے۔ اب تو یہاں بیٹھتے ہوئے بھی وحشت ہوتی ہے۔ بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اسی ماہ کی آخری تاریخ کو میں تمہاری شادی طے کر رہی ہوں۔ تمہیں جو تیاری کرنی ہے کر لو۔ میں اب مزید چھوٹ نہیں دے سکتی تمہیں۔''

وہ اسی مقصد کے لیے آئی تھیں اور ان کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

''آنٹی میں......''

شاہ زر نے اتنی جلدی سب طے کرنے پر احتجاج کرنا چاہا تھا مگر سائلہ بیگم نے اس کی بات کاٹ دی۔

''بس...... اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی۔ بہت کر لی تم نے اپنی مرضی۔ اب اور نہیں۔'' اسے کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

شاہ زر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ بُریرہ کو اس کی بہت سی اچھی عادات کے باعث پسند کرتا تھا مگر اب جانے کیوں اسے کسی بھی تعلق کی کوئی خوشی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ہر چیز سے فرار چاہتا تھا مگر جانے یہ کیسی بے بسی تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی دل کی مرضی نہیں کر پا رہا تھا۔ ذہن میں صرف اور صرف اندھیرا تھا اور اس اندھیرے میں اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

❁❁❁

امامہ سارا گھر ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو گئی تھی مگر اسے وہ فائل نہیں ملی تھی جو ارسلان کو مطلوب تھی جس میں اس کے خلاف شجاع حسن نے ڈھیر سارے ثبوت اکٹھے کیے ہوئے تھے۔ صبح سے شام تک اس کی غیر موجودگی میں اس نے گھر اور اس کے اسٹڈی روم کا کونا کونا چھان مارا تھا مگر وہ مطلوبہ فائل کو تلاش نہ کر سکی تھی۔

ارسلان فون پر پل پل اس سے رابطے میں تھا۔

گزرتے ہر پل کے ساتھ بے بسی کے شدید احساس میں جکڑی وہ اب روہانسی ہو رہی تھی جب اچانک اسے یاد آیا کہ شجاع جب دوبارہ رخصت ہو رہا تھا تو اس کے ہاتھ میں وہ بریف کیس تھا جس

میں کسی فائل کا تذکرہ کیا تھا اس نے اور تب سے ہی اسے شجاع حسن پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔
گڑیا کو بھوک لگی تھی اور وہ رو رہی تھی مگر امامہ نے تھپڑ مار کر اسے چپ کرا دیا تھا۔
''منحوس ماری سوائے رونے کے دوسرا کوئی کام ہی نہیں اسے۔ ماں بھی چھوڑ گئی بلا کو باپ کی چھاتی پر اور باپ کو دیکھو ایک نمبر کا شیطانی دماغ ہے' ذرا جو کچھ بھول جائے۔''
ارسلان غصے ہو کر موبائل آف کر چکا تھا اور وہ اب اپنا غصہ اس چھوٹی سی معصوم بچی پر اتار رہی تھی جسے اس کی نفرت کی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔

❋❋❋

زاور کمال نے جس وقت گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھے اندھیرا اچھل رہا تھا۔
وہ تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کے اندر داخل ہوا تو جائے نماز پر بیٹھی نزہت آراء بیگم نے سلام پھیرتے ہی اس کی طرف نگاہ کی اور پھر نگاہوں میں اس کا چہرہ آتے ہی ان کے چہرے پر جیسے نور سا بکھر گیا۔ وہ جلدی سے اٹھیں اور لپک کر زاور کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔
''زاور...... میرے بچے...... کہاں چلے گئے تھے تم...... نہ کوئی فون نہ اطلاع......''
وہ ابھی بھی رو رہی تھیں۔ زاور نے اس کے ہاتھ تھام کر چومتے ہوئے ان کے آنسو بھی پونچھ دیئے۔
''سب بتاتا ہوں امی۔ ابو کہاں ہیں؟''
''تھانے گئے ہیں تیرا پتہ کرنے۔ کہاں چلا گیا تھا تو......؟''
اس کی صحت چونکہ اب اچھی تھی پھر کوئی زخم بھی نظر نہیں آ رہا تھا لہٰذا فکر مند ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اب الجھ بھی رہی تھیں تب ہی وہ بولا۔
''میرے ساتھ حادثہ ہو گیا تھا امی۔ پاکستان ایئر پورٹ سے جب میں گھر آ رہا تھا تو راستے میں ٹیکسی ڈرائیور کی بے ایمانی نے' مجھے ڈاکوؤں کے حوالے کر دیا۔ وہ لوگ میرا سب سامان بھی لوٹ کر لے گئے اور شدید زخمی بھی کر ڈالا۔ پتہ نہیں کتنی دیر میں ایک کچی سڑک پر پڑا کراہتا رہا۔ جب گاؤں کے ایک لڑکے نے میری مدد کی اور مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ وہاں تین چار روز کے بعد مجھے ہوش آیا۔ اس کے بعد زخموں کی تکلیف نے ادھر سے ادھر ہلنے ہی نہ دیا۔ میرا موبائل بھی چھن چکا تھا۔ اس لیے فوری آپ کو فون کر کے اطلاع نہ دے سکا لیکن میں جانتا تھا کہ میری وجہ سے آپ لوگ پریشان ہوں گے اس لیے میں نے ادریس کو کارڈ دیا کہ وہ گھر فون کر کے آپ کو اطلاع دے دے۔ اس کی بات ہوئی بھی تھی۔ کیا آپ نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔''
''نہیں بیٹے اپنا فون ٹھیک سے کام ہی نہیں کر رہا۔ اگر کسی کا فون آیا ہوتا تو یہ حال نہ ہوتا ہمارا۔ تمہیں کیا پتہ میرا اور تمہارے ابو کا کیا حال تھا تمہارے پیچھے۔ سو طرح کے وسوسے اور وہم آ رہے تھے دل میں۔ اوپر سے ایسی ایسی قیامتیں گزر گئیں کہ......''
آگے وہ کچھ بول ہی نہ سکیں اور بلک کر رو پڑیں۔
عین اسی لمحے جمال صاحب وہاں آئے تھے۔
''زاور!''

نزہت بیگم کے پاس زاور کو دیکھ کر وہ بھی خوشی سے لپکے تھے جب وہ خود آگے بڑھ کر ان کے گلے لگ گیا۔

''کہاں چلا گیا تھا تو؟ ہم تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو گئے؟''

ان کے لہجے میں بھی فکر تھی۔ زاور ان دونوں کو لے کر صوفے پر آ بیٹھا اور پھر جمال صاحب کو ساری کہانی الف سے یے تک سنا دی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ نزہت بیگم کو سنا چکا تھا۔

''ابو! اگر ادریس اور اس کے گھر والے میرا خیال نہ کرتے تو شاید میں آج بھی آپ کو زندہ نہ ملتا۔ ان لوگوں کے احسانات ہیں مجھ پر۔ یہاں سب خیریت تو ہے ناں۔''

نزہت بیگم کی آنکھ سے مسلسل گرتے آنسوؤں نے اسے پریشان کیا تھا۔

''ہاں سب ٹھیک ہے تم لمبے سفر سے آئے ہو تھوڑا آرام کر لو پھر باتیں کریں گے۔''

اس سے پہلے کہ نزہت آرا بیگم کچھ کہتیں۔ جمال صاحب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں اشارہ کر کے بات بدل دی۔

''ممی تھکاوٹ تو مجھے بھی بہت محسوس ہو رہی ہے خیر جب یہاں سے ناروے جانے سے قبل میں کمال انکل پاپا سے ملنے گیا تھا تو اس روز وہاں سے واپسی پر میں نے ماما کو انوشہ کے ساتھ بہت برا سلوک کرتے دیکھا تھا۔ میں نے اس سے پرامس کیا تھا کہ اپنے چند ضروری کام نمٹاتے ہی میں اسے اپنے ساتھ اس گھر میں لے آؤں گا۔ پاپا سے اس سلسلے میں پہلے ہی بات کر چکا ہوں میں۔ وہ بے چاری میرا انتظار کر رہی ہوگی۔''

''دیکھا آپ نے میرا بچہ وہاں مشکل میں تھا۔ ادھر انوشہ کو سولی پر ٹانک رکھا تھا اس کمینی عورت نے اور یہاں...... کیسے کیسے الزامات لگا دیے ان دونوں پر۔''

اس کی بات مکمل ہونے پر نزہت بیگم نے فوراً جمال صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے دہائی دی تو وہ بھی چونک اٹھا۔

''کون عورت اور الزام؟''

''کچھ نہیں بیٹا! تمہاری ماں کو تو یوں ہی بولنے کی عادت ہے۔ ابھی تو تم لوٹے ہو۔ پانی بھی نہیں پیا۔''

''پانی کو چھوڑیں پاپا پلیز! بتائیں کہ میرے پیچھے کیا ہوا ہے۔ ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں آپ۔''

جمال صاحب کی بات درمیان میں ہی کاٹ کر وہ بے تابی سے بولا تھا جب جمال صاحب کوئی چارہ نہ پائے تو بولے۔

''کیا بتائیں بیٹا کیسے بتائیں؟ تمہارے بعد بہت کچھ ہو گیا......''

''کیا ہو گیا......؟ پلیز بتائیں ناں ابو۔ میری الجھن بڑھ رہی ہے۔'' وہ مچلا تھا جب نزہت بیگم بولیں۔

''کمال بھائی کی وفات ہو گئی ہے زاور اور پچھلے دو ماہ سے انوشہ کا کچھ نہیں پتہ کہ کہاں ہے۔''

''واٹ......؟''

اسے بہت گہرا شاک لگا تھا۔
''ہاں بیٹے سائلہ کے بیٹے کی شادی کے وقت اس کی بھانجی گھر سے بھاگ گئی تھی جس کا الزا
اس نے تجھ پر لگا دیا۔ اب بیٹا تو دوسری جگہ بیاہ دیا ہے اس نے مگر انوشہ کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ ن
نہیں اس منحوس عورت نے کیا کیا ہوگا اس کے ساتھ......''
نزہت بیگم رو بھی رہی تھیں اور اسے بتاتی بھی جا رہی تھیں۔
زاور کو لگا جیسے اس کا دماغ لمحوں میں برف ہو گیا ہو۔

❁❁❁

زاور کو شہر جانے والی بس پر بٹھا کر تیز دھوپ میں جھلسے ہوئے کندھے پر پڑے صافے سے
بار پسینہ پونچھتا وہ اپنے کھیت کے قریب گھنے درخت کے نیچے آکر بیٹھ گیا تھا۔ کل پوری رات اب
نیند نہیں آئی تھی۔
اسے یاد آ رہا تھا جب وہ بہت چھوٹا سا تھا تو اس کے ماں باپ دونوں کی وفات ہو گئی تھی۔
پھوپی نے تب اسے اور گوری کو' جس نے ابھی پاؤں پاؤں چلنا بھی نہیں سیکھا تھا اپنے سینے سے لگا
پالا تھا۔ وہی تھیں جن کے دم سے اس کے بچپن کا زمانہ بہت سنہری گزرا۔ گاؤں کی کشادہ گلیوں
کبھی گلی ڈنڈا' کبھی وانجو تو کبھی برف پانی کھیلتے ہوئے اسے ہمیشہ بہت مزہ آتا تھا۔ اکثر شرار
موڈ ہوتا تو وہ اور میران لوگوں کی گھر سے باہر بندھی بھینسوں کی رسی کھول دیتے یا ان بھینسوں
چارے سے بھری ''گھر لی'' الٹ کر بھاگ جاتے۔ کبھی کسی کے اُپلے چرا کر اپنے گھر لے آ
کبھی کماد کے کھیت میں گھس کر چوری کے ''گنے'' گھنٹوں چوستے رہتے۔ سارا گاؤں ان دونوں
شرارتوں سے عاجز تھا۔
بچپن میں نمبردار کی بیٹی انزلہ شاہ بھی اس کے ہاتھوں کبھی سکھی نہیں رہی تھی۔ وہ اکثر اس
ہاتھ سے بی اماں کی دی ہوئی چیز چھین کر کھا جاتا تھا۔ بچپن کے وہ دن بہت سہانے لگتے تھے پھر ا
کو اس کی ماں شہر لے گئی۔ میران کو بھی اس کے گھر والوں نے تعلیم کے لیے شہر بھیج دیا۔ تاہم دو
جماعت تک وہ گاؤں میں ساتھ ساتھ رہے تھے۔
اسی دوران بی اماں نے اس کی اور گوری کی شادی کر دی تو وہ نئی زندگی کی مصروفیات میں
چلا گیا۔ شادی کے ابتدائی چند ماہ تک تو اس کی بیوی نے کوئی پریشانی نہیں دی لیکن پھر اچانک
کے دماغ کو جانے کیا ہوا کہ اسے دن میں ایک دو بار کسی سے جھگڑا کیے بغیر چین ہی نہیں آتا
ادھر گوری کو اس کے بھائی نے گویا سولی پر ٹانگ کر رکھ دیا تھا۔ اس کی برداشت زیادہ دن تک ا
ساتھ نہ دے سکی تھی۔ لہٰذا پانچویں بار جب شاہد حسین نے اسے بری طرح زدوکوب کیا تو وہ
اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔
اس کی بیوی نے اسی بات پر فساد کر کے خوامخواہ اپنا گھر خراب کیا اور بدلے میں روٹھ کر
بھائی کے گھر جا بیٹھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہمیشہ شرافت کا مظاہرہ کرنے والا نرم مزاج ادریس ا
کے بعد ہی اس کی جدائی میں بے حال بھاگا اس کے پیچھے آئے گا اور گوری کو چھوڑ کر اسے م
کے اپنے ساتھ لے جائے گا جیسا کہ اب تک ہوتا آیا تھا مگر ادریس شاہ نے اس بار جیسے اپنے ا

پتھر رکھ لیا تھا جس پر اس کی بیوی اور اس کے بھائی دونوں کے سینوں میں ہی آگ لگی ہوئی تھی۔
میران شہر سے کبھی کبھار چکر لگاتا تو پھر جتنے دن وہاں رہتا سارا وقت اسی کے ساتھ جڑا رہتا۔ الٹا وہ اسے اپنی اور انزلہ کی باتیں بھی بتاتا جنہیں سن کر اسے بے حد خوشی ملتی اور وہ شام میں سونے سے پہلے وہی باتیں بی اماں کو بتا دیتا۔ تاہم میران شاہ کی ناگہانی موت کے بعد اس کے لیے جیسے سارا گاؤں ہی اجڑ گیا تھا۔ اب نہ کھیتوں میں اس کا دل لگتا نہ پنگھٹ پہ' گھر میں تو ویسے ہی ٹینشن چل رہی تھی۔ اللہ نے اسے کچھ ہی روز میں بیٹے جیسی انمول دولت سے نواز دیا تھا۔
بیٹے کی پیدائش کی اطلاع پر وہ دل کے سارے زخم بھلا کر اپنی سسرال چلا گیا تھا مگر وہاں اس کی اچھی خاصی ''عزت افزائی'' ہوئی۔ وہ چونکہ غیور تھا لہٰذا دوبارہ اس چوکھٹ کا رخ نہ کیا اور اب یہی بات اس کے سسرال والوں سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔
وہ اسے کمزور سمجھ کر پھر اپنے اور اپنی بہن کے سامنے جھکانا چاہتے تھے مگر اس نے طے کر لیا تھا وہ اب اس مسئلے کا کوئی حل نکال کر ہی رہے گا کیونکہ گوری اب کسی صورت اپنے گھر جانا نہیں چاہتی تھی۔
تیز دھوپ میں گھنے درخت کی چھاؤں تلے بیٹھا' وہ جانے کب تک سوچوں کے گرداب میں الجھتا رہتا کہ اچانک اس کی نگاہ' دور ماجھے نائی کے گھر سے نکلتی انزلہ شاہ پر پڑ گئی۔
کتنے دن ہو گئے تھے اسے گاؤں آئے ہوئے مگر وہ اب تک اس سے یا بی اماں سے ملنے اس کے گھر نہیں آئی تھی اور اسی بات کا اسے گہرا ملال تھا جس کے سبب وہ خود سے بھی اسے ملنے نہیں گیا تھا۔
وہ اب نگاہوں سے اوجھل ہو رہی تھی لہٰذا ادریس عجب کھوئے کھوئے سے انداز میں سر جھٹکتا ہوا خود بھی اٹھ کر گھر کی طرف بڑھ گیا تھا کہ اب اسے بھوک ستانے لگی تھی۔

❁❁❁

بہت بے چین رہتی ہے طبیعت ایک مدت سے
دل وجاں کو نہیں مل پائی راحت ایک مدت سے
بہت مجبور ہوں ورنہ' بہت محسوس کرتا ہوں
میری جاں تم سے ملنے کی ضرورت ایک مدت سے

پچھلے دو گھنٹے سے وہ اپنی نگاہیں انوشہ رحمٰن کے خوب صورت چہرے پر ٹکائے بیٹھا جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ یونیورسٹی میں کسی کو بھی نہیں پتہ تھا کہ اس نے انوشہ رحمٰن کے ساتھ کیا کیا۔ اس سادہ سی سہمی ہوئی ہرنی جیسی لڑکی کی زندگی کے ساتھ کیسا بھیانک کھیل کھیلا۔ سوائے عباد کے جس سے چاہتے ہوئے بھی وہ کوئی بات چھپا نہیں سکا تھا اور عباد نے اسے سہارا دینے کے لیے بُریرہ کو سب بتا دیا تھا تاکہ شاہ زر اس حادثے کی ٹینشن لے کر اپنے ساتھ کچھ الٹا سیدھا نہ کر بیٹھے۔
اس کی شادی بُریرہ سے طے ہو چکی تھی۔
کل اس کی مایوں کی رسم ادا ہوئی تھی اور آج مہندی تھی مگر اس نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ سادگی سے صرف نکاح کر کے بُریرہ کو اپنے گھر لے آئے گا۔ اس سلسلے میں اگر وہ شان و شوکت سے کام لیں گے تو وہ شادی نہیں کرے گا۔ لہٰذا اس کی منشاء پر اب یہی ہو رہا تھا۔ کسی بھی رشتے دار کو اس

کی شادی کی تقریب کے لیے ''یزدانی پیلس'' انوائیٹ نہیں کیا گیا تھا۔

آج اس کا نکاح تھا اور جانے کیوں اس کی آنکھیں بات بات پر بھر آرہی تھیں۔

اس کی مما کو اس کی شادی کا کتنا ارمان تھا۔ شافیہ اکثر ناشتے اور رات کے کھانے کے دوران اس کی شادی کا تذکرہ کر کے اسے خوب چھیڑا کرتی تھی تب سب کچھ کتنا اچھا لگتا تھا مگر اب وہی سب کچھ ہو رہا تھا جو پہلے سے طے تھا مگر اب دل میں کوئی امنگ تھی نہ خوشی......

اگر اپنی ماں کے آخری ارمان اور گھر کی تنہائیوں سے محسوس ہوتی وحشت کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ کبھی شادی کے لیے ہامی نہ بھرتا۔

شام میں جب خوب سارے آنسو بہا کر وہ گھر واپس لوٹا تو عباد دیگر دوستوں کے ساتھ مل کر اس کی سیج سجا رہا تھا۔ گو اس نے اسے بھی منع کیا تھا مگر عباد نے اسے ڈپٹ کر رکھ دیا۔

''چپ کر تو تیرے اندر سب کچھ مر گیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تو اس معصوم لڑکی کے جذبات کی پروا بھی نہ کرے جو جانے کب سے تیری رفاقت کے خواب پلکوں میں سجا کر بیٹھی ہے۔ کچھ عقل کر اور جا' جا کے شاور لے لے۔ ابھی تک موالیوں والے حلیے میں پھر رہا ہے۔''

عباد کا خاصا رعب چلتا تھا اس پر۔ شاہ زر اسے اس کے کام میں مصروف چھوڑ کر سست روی سے چلتا کمرے سے نکل گیا۔

رات کے ڈھائی بج رہے تھے جب وہ بُریرہ سے نکاح کے بعد اسے یزدانی پیلس سے رخصت کروا کر گھر لے جانے کی بجائے اپنے ہی شہر کے خوب صورت ہوٹل سے رخصت کرا کر گھر لے آیا۔

شافیہ پوری تقریب میں رو رو کر اس کے قریب ہونے کے بہانے تلاشتی رہی مگر وہ پتھر بنا رہا۔ اس کی زندگی میں جو بھونچال آیا تھا اس کی وجہ شافیہ تھی جسے معاف کر کے پہلے کی طرح گلے لگانے کی وہ ہمت ہی نہیں کر پا رہا تھا۔

شادی بخیر و عافیت ہو گئی تھی۔

تقریباً سوا تین بجے جس وقت وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس کا سارا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ دروازے کے بالکل سامنے' بیڈ پر بُریرہ سمٹ کر بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈال کر عجیب سی کوفت کا شکار ہوتا بیڈ پر اس کے قریب بیٹھنے کی بجائے قدرے ریلیکس انداز میں بیڈ کے قریب ہی سیٹ کیے صوفے پر جا بیٹھا۔

دلہن بنی بُریرہ کا سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔ شاہ زر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ آج کی رات بُریرہ سے کیا کہے......مگر کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔

''بُریرہ! میں جانتا ہوں آج کی رات کے حوالے سے لڑکیوں کے بہت سے خواب وابستہ ہوتے ہیں۔ کچھ ماہ پہلے اس رات کے حوالے سے میں نے بھی بہت کچھ سوچ رکھا تھا مگر......اب......سب کچھ بدل گیا ہے۔ اب نہ وقت ہے اور نہ دل کی تمنائیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم بہت اچھی لڑکی ہو شاید اسی لیے میں خود کو تمہارے قابل نہیں پا رہا۔ عجیب سی الجھن نے پاگل کر رکھا ہے مجھے۔''

اس کا لہجہ اس کی الجھن کو ثابت بھی کر رہا تھا۔

بریرہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ کیا کہنے کے لیے تمہید باندھ رہا ہے تب ہی چپ بیٹھی رہی۔

"بُریرہ! میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تم سے کیا کسی بھی لڑکی سے نہیں کیونکہ...... کیونکہ میں اس قابل ہوں ہی نہیں کہ مجھے کوئی اچھی شریف لڑکی ملے۔ میں آنٹی سے معذرت کرنا چاہتا تھا۔ انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہتا تھا مگر جانے کیا بات تھی کہ میری زبان پر لگا قفل ان کے سامنے کھل ہی نہ سکا۔"

اس بار بُریرہ نے اس کے الفاظ پر چونک کر سر اٹھایا تھا۔

"کیسا سچ......؟"

شاہ زر نے دیکھا اس کی کاجل سے سجی آنکھوں میں گہرا اضطراب تھا۔ تب ہی وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آئی ایم سوری میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں دینا چاہتا لیکن جو بات میرے اندر بھونچال اٹھائے ہوئے ہے۔ اگر وہ بات آج بھی میں تم سے شیئر نہ کر پایا تو پھر شاید ساری زندگی تم کبھی مجھے معاف نہ کر پاؤ۔"

کتنی عجیب پہیلیاں بجھوا رہا تھا وہ...... بُریرہ کی پریشانی مزید بڑھ گئی۔

"آپ کو جو کہنا ہے پلیز صاف صاف کہہ ڈالیں۔ مجھے پہیلیاں بوجھنے کی عادت نہیں ہے۔"

شاہ زر نے اس کے روہانسے لہجے پر سرسری سے انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے اس کی طرف سے رخ پھیرتے ہوئے بولا۔

"پتہ نہیں تم یہ سچائی جاننے کے بعد مجھے معاف بھی کر پاؤ گی کہ نہیں......؟ مگر یہ سچ آج کی رات میں تم سے نہیں چھپاؤں گا کہ میں نے...... میں نے انوشہ کو اغوا کیا تھا۔"

"وہاٹ......؟"

بُریرہ کو لگا جیسے اس کا وجود صرف ایک لمحے میں بلاسٹ ہو گیا ہو تب ہی وہ پھر بولا تھا۔

"یہ سچ ہے بُریرہ! اپنے غصے اور انتقام کی آگ میں اس معصوم کی روح کو گھائل کر دیا تھا۔"

اب اس کا لہجہ رندھ رہا تھا' تاہم اس سے پہلے کہ وہ بُریرہ سے اسی ایشو پر مزید بات کرتا اس کے موبائل پر بجتی تیز بپ نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی اور وہ ساکت بیٹھی بُریرہ سے ایکسکیوز کر کے اپنے سیل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کال ہاسپٹل سے آ رہی تھی لہٰذا اس نے فوراً دھڑکتے دل سے پک کر لی۔ دوسری جانب ڈاکٹر عاطف اس سے مخاطب تھا۔

❋❋❋

مجھے اداس بھی کرنا تھا خود بھی رونا تھا
یہ حادثہ بھی میری جاں کبھی تو ہونا تھا
وہ مجھ کو توڑ کے پھر جوڑتا رہا اکثر
میں اس کے واسطے جیسے کوئی کھلونا تھا

"بُریرہ...... تم کپڑے چینج کر کے سکون سے سو جاؤ' مجھے اک ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔"

ڈاکٹر عاطف سے دومنٹ کی مختصر بات کرنے کے بعد اس نے موبائل شرٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے ساکت بیٹھی بُریرہ رحمٰن کی طرف توجہ کی تھی۔ جواب میں بُریرہ کی آنکھ سے آنسو کا ایک شفاف قطرہ ٹوٹ کر گر پڑا۔

''آئی ایم سوری بُریرہ...... آئی ایم رئیلی ویری سوری۔''

وہ پشیمان تھا یا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا' بُریرہ ہرگز نہیں جانتی تھی' مگر اس لمحے اسے اپنی جان سولی پر لٹکی ہوئی ضرور محسوس ہو رہی تھی۔

وہ کمرے سے نکل گیا تھا مگر بُریرہ اس کے کمرے سے نکل جانے کے ایک گھنٹے بعد تک بھی یونہی ساکت بیٹھی بے آواز رو رہی تھی۔

پورے ایک گھنٹے کے بعد اس نے بیڈ سے اتر کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اپنا دوپٹہ نوچ کر اتارا اور دور پھینک دیا۔ زیور کے ساتھ بھی اس نے یہی سلوک کیا تھا اور چوڑیوں کے ساتھ بھی' جس کی وجہ سے اس کی دونوں کلائیاں زخمی ہوگئی تھیں۔

''دھوکا کیا ہے تم نے میرے ساتھ شاہ زر' بہت بڑا دھوکا کیا ہے تم نے میرے ساتھ۔''

کرب انگیز لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے پرفیوم کی بوتل اٹھائی اور کھینچ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر دے ماری۔ چھناکے کی ایک زوردار آواز کے ساتھ اس کا عکس کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

تیری ابتداء کوئی اور ہے تیری انتہا کوئی اور ہے
تیری بات ہم سے ہوئی تو کیا' تیرا مدعا کوئی اور ہے
ہمیں شوق تھا بڑی دیر سے' کہ تیرے شریک سفر بنیں
تیرے ساتھ چل کے خبر ہوئی' تیرا راستہ کوئی اور ہے
تجھے فکر ہے کہ بدل دیا مجھے گردشِ شب وروز نے
کبھی خود سے بھی تو سوال کر' تو وہی ہے یا کوئی اور ہے

کبھی ایک کے بعد ایک آنسو ٹوٹ کر پلکوں سے گرتا جا رہا تھا اور وہ وہیں اپنے خالی سراپا کے ساتھ بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگا کر نیچے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی تھی۔

شاہ زر نے تیز قدموں سے چلتے ہوئے جس وقت انوشہ کے روم میں قدم رکھا اس کی پلکیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔ اسے لگا گویا ایک مدت کے بعد اس پتھر کے بے جان مجسمے میں جان پڑ گئی ہو۔ مارے خوشی اور تشکر کے اس کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔

بے شک اللہ کی پاک ذات نے اس کی دعائیں رد نہیں کی تھیں۔

ڈاکٹر عاطف کمرے میں انوشہ کے بستر کے پاس ہی کھڑے اس کی حالت کا جائزہ لے رہے تھے جب وہ آگے بڑھا۔

''عاطف!''

اس کی پکار پر تیزی سے پلٹتے ہوئے ڈاکٹر عاطف نے اس کی جانب نگاہ کی تھی۔

''شاہ...... مریضہ کو ہوش آ گیا ہے' بہت بہت مبارک ہو' ابھی یہ آنکھیں کھولنے میں کچھ تکلیف محسوس کر رہی ہیں' میں دیکھتا ہوں' ابھی تم اچانک سامنے مت آنا۔''

وہ اللہ اس کی کہانی سے کچھ نہ کچھ واقف تھے تبھی ملائمت سے تنبیہ کرتے ہوئے بولے تو شاہ [illegible] نے اثبات میں سر ہلا کر سائیڈ پر ہو گیا۔
انوشہ کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے پلکیں کھولنے میں شدید دشواری پیش آ رہی ہو۔ شاہ زر کا دل اس وقت بہت تیز دھڑک رہا تھا۔ اسے بھول گیا تھا کہ وہ آج اس کی شب عروسی تھی۔ وہ پلٹا تھا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا قریبی مسجد کی طرف بڑھ گیا تھا کہ اسے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہوئے انوشہ کے لیے ڈھیر ساری دعائیں کرنا بہت ضروری لگا تھا۔

❋❋❋

میرے بس میں اگر ہوتا
اٹھا کر چاند تاروں کو
میں نیلے آسماں پہ بس تیری آنکھیں بنا دیتی
مگر ہوتا تو لکھ کر تمہارا نام پتوں پر
تمہارے شہر کی جانب ہواؤں میں اڑا دیتی

اس کا دل ارسلان حیدر سے ملنے کو مچل رہا تھا۔ اوپر سے اپنے پروگرام میں ناکامی اور اس کی اداسی نے مزید بے قرار کر دیا۔ وہ گڑیا کو ساتھ لے کر ابھی گھر سے نکلنے کا ارادہ کر رہی تھی جب اوپر لاؤنج میں پڑا فون بج اٹھا۔
شدید کوفت کا شکار ہوتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف شجاع حسن کو پا کر مودب ہو گئی۔
''السلام علیکم سر۔''
''وعلیکم السلام۔ گھر میں سب ٹھیک ہے ناں......؟'' وہ شاید بہت مصروف تھا۔ جب وہ بولی۔
''جی الحمدللہ......سب ٹھیک ہے۔''
''ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' اگر کمرے سے باہر نہ نکلیں تو پلیز ہمارے فیملی ڈاکٹر عاطف رضا صاحب کو کال کر کے بلوا لیجئے گا' وہ چیک اپ کر لیں گے۔''
وہ جلدی میں ہدایت کر رہا تھا' امامہ نے جی سر کہہ کر اس کے مزید احکامات سننے سے قبل ہی ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔
''ہونہہ...... کیسا وقت تاک کے کال کی ہے' پتہ نہیں ارسلان نے کیوں مجھے اس جہنم میں دھکیل دیا۔''
اسے شدید کوفت محسوس ہو رہی تھی۔
گڑیا کو اپنے کمرے میں بیڈ پر گرا کر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے بڑے میاں کے کمرے میں جھانکا' وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اپنے کمرے میں لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں بیٹھے اداس نگاہوں سے اپنے باغیچے کا حال دیکھ رہے تھے۔ کتنے ہی پودے عدم توجہی کے باعث ختم

ہو چکے تھے۔ امامہ نے دیکھا قدرت اللہ صاحب کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی چھلک رہی تھی اور گالوں پر ٹھہرے آنسوؤں نے اسے سرپرائز کر ڈالا تھا۔

''ارے...... بھلا یہ صاحب بھی رو سکتے ہیں......؟ حیرت......''

اسے قدرت اللہ صاحب کا رونا عجیب لگا تھا۔ بھلا ان جیسے صاحب حیثیت' رعب داب والے شخص کو کیا مسئلہ لاحق ہو سکتا تھا؟

ایک دومنٹ تک وہ چھپ کر انہیں دیکھتی رہی' پھر اپنے کمرے میں آئی تو گڑیا کو بھی سوتے ہوئے دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔

''چلو شکر ہے' یہ بلا بھی سو گئی' اب میں اس ارسلان سے سکون سے بات کر سکوں گی۔''

اپنے کمرے کا دروازہ آہستہ سے بند کر کے وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر آئی اور اگلے ہی لمحوں میں ٹیکسی لے کر ارسلان کے گھر چلی آئی۔ اس کا دل اس لمحے بہت تیز دھڑک رہا تھا۔ جانے ارسلان اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا۔

تیز تیز قدموں سے چلتی وہ حفصہ بیگم کے کمرے کے اندر داخل ہونا ہی چاہتی تھی کہ مترنم نسوانی ہنسی کی چھنکار نے اس کے قدم ٹھٹکا دیئے۔

''ویری فنی آنٹی...... بچی ارسلان پہلے جب آپ کے بارے میں بتاتا تھا تو مجھے یقین نہیں آتا تھا' مگر آپ سے ملنے کے بعد پتہ چل گیا' وہ سچ ہی کہتا تھا' مجھے تو لگتا ہی نہیں کہ آپ نے اسے اڈاپٹ کیا تھا۔''

ہنسنے کے ساتھ ساتھ بولنے والی کی آواز بھی دل فریب تھی۔

وہ حیران کمرے کی دہلیز پر ہی گویا چپک گئی۔ اب حفصہ بیگم کہہ رہی تھیں۔

''ہاں' میں نے خود کبھی اسے احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ میرا بیٹا نہیں ہے' نہ ہی یہاں کوئی حقیقت جانتا ہے' تم سے بھی دل کا رشتہ جڑا ہے تو بتا دیا' ورنہ تو شاید تم بھی یہ راز کبھی نہ جان سکتیں۔''

''وھاٹ...... دل کا رشتہ......؟ تو پھر میرے ساتھ کون سا رشتہ جڑا تھا۔''

اس کے اعصاب کو حفصہ بیگم کی بات سن کر شدید دھچکا لگا تھا۔ جانے اندر بیٹھی وہ لڑکی کون تھی؟

''السلام وعلیکم۔''

مزید کچھ بھی سننے کا حوصلہ کئے بغیر اس نے کمرے میں انٹری دی تھی۔ جس پر سب سے پہلے ارسلان نے چونک کر سر اٹھایا تھا جو حفصہ بیگم سے کچھ فاصلے پر دل فریب آواز والی لڑکی کے ساتھ چپک کر بیٹھا تھا۔ اس کا خون جیسے لمحے میں منوں کے حساب سے جلا تھا۔

''وعلیکم السلام...... تم یہاں......؟''

اسے دیکھ کر کرنٹ کھاتے ہوئے وہ فوراً اٹھا تھا۔ جب وہ تلخی سے بھرپور لہجے میں بولی۔

''کیوں......؟ میرے یہاں آنے پر پابندی لگی ہے؟''

''ارے پابندی کیوں لگے......؟ میں تو پوچھ پوچھ کے تھک گئی اس سے' آ...... ادھر میرے پاس بیٹھ......'' حفصہ بیگم اتنے دنوں کے بعد اسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔ وہ جلتی بھنتی انہی کے پہلو میں جا بیٹھی۔

''کیسی ہے تو...... گاؤں میں سب خیریت تو ہے ناں؟''

''جی......''

نگاہیں اس کی اب بھی اسی لڑکی پر جمی تھیں جو اچھی خاصی ماڈل بنی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

''یہ کون ہے آنٹی......؟''

اسے اپنی طرف گھورتے پاکر اس لڑکی نے حفصہ بیگم سے پوچھا۔ جب وہ بول اٹھی۔

''بیٹی ہوں ان کی' اور اللہ نے چاہا تو بہت جلدی......''

''چاند فتح کرلو گی' چلو رُحاب تمہیں دیر ہو رہی ہے' پھر مجھے باسم کی طرف نکلنا ہے......''

اس کی بات کاٹ کر فوری کھڑے ہوتے ہوئے اس نے اس اجنبی لڑکی کا بازو تھام لیا تو امامہ کے اندر تک جیسے سب کچھ جل کر بھسم ہو گیا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ دل کی بھڑاس نکالتی' ارسلان اس لڑکی کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ حفصہ بیگم سے پوچھ پائی تھی۔

''یہ ماڈرن بی بی کون تھی پھوپھو؟''

''ارسلان کی دوست ہے' یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتی رہی ہے' تمہاری غیر موجودگی میں یہی میری دیکھ بھال کرتی ہے' بہت اچھی بچی ہے۔''

دھڑ دھڑ دھڑ...... امامہ کو لگا اس کے سر پر ایک ایک کر کے گویا ساتوں آسمان گر پڑے ہوں۔ ابھی تو اس نے شکست تسلیم بھی نہیں کی تھی اور وہ شخص راہ بدل گیا تھا؟

اس کا دل چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے مگر جانے کیا سوچ کر چپ بیٹھی رہی۔

''تم سناؤ' اور کب تک گاؤں میں رہنے کا ارادہ ہے تمہارا......؟''

اس کی دلی کیفیت سے بے نیاز اب وہ پھر اس سے پوچھ رہی تھیں۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ اس پل انہیں ساری حقیقت بتا دے' مگر جانے وہ کون سا جذبہ وہ کون سی سوچ تھی جس نے اب بھی اسے ارسلان حیدر کا بھرم توڑنے نہیں دیا تھا۔

قطعی غائب دماغی کے ساتھ دو تین گھنٹے ان سے ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں کر کے وہ پھر ابھی گھر سے نکل ہی رہی تھی جب گیٹ سے باہر بائیک روکتے ارسلان حیدر نے اسے پکار لیا۔

''مون بات سنو۔''

''نہیں...... کوئی بات نہیں سننی مجھے تمہاری' ایک نمبر کے دھوکے باز' آوارہ شخص ہو تم۔ مجھے وہاں عذاب میں پھنسا کر خود یہاں عیش کر رہے ہو' شرم آنی چاہیے تمہیں۔''

وہ پھٹ پڑی تھی۔ جب وہ ڈپٹ کر بولا۔

''چپ رہو...... سوائے فضول بولنے کے اور کچھ نہیں آتا تمہیں۔''

''تمہیں بہت کچھ آتا ہے ناں' تو ٹھیک ہے کرو' مجھے کچھ نہیں کرنا تمہارے لیے۔''

اس کے غصے کا گراف کسی طور نیچے نہیں آ رہا تھا۔ جب وہ برہمی سے بولا۔

''یہ بات تو میں پہلے سے جانتا ہوں' اسی لیے رُحاب کا سہارا لیا ہے' اور تم دیکھ لینا صرف ایک ہفتے کے اندر اندر وہ میرا کیس ختم کروا دے گی۔''

کتنا یقین تھا اس شخص کے لہجے میں۔ وہ ہکا بکا سی اس کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

"وہاٹ' اگر اس نے تمہارا کیس ختم کروا دیا تو کیا' کیا تم اسی سے شادی کرلو گے؟"

"آف کورس...... جو مجھے زندگی دلائے گی میں اسی کے نام اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کردوں گا۔"

شانے اچکاتے ہوئے اس کی شکل اتنی مکروہ لگ رہی تھی کہ امامہ کی کنپٹیاں غصے سے سلگ اٹھیں۔ کتنا خود غرض تھا وہ شخص محبت کے معاملے میں' اور کتنی پاگل تھی وہ اس کے لیے۔

اسے اس لمحے پھر شدت سے رونا آیا مگر وہ ضبط کرگئی۔

"او کے...... اگر یہی بات ہے تو پھر وہ لڑکی مجھ سے جیت نہیں سکتی' ٹھیک ایک ہفتے بعد وہ فائل میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارے سپرد کروں گی۔"

"ہاہ...... یہ تو پہلے بھی بیسیوں بار کہہ چکی ہو تم' رحاب کے ابو منسٹر بن گئے ہیں وہ کچھ بھی کرسکتی ہے' تمہارے پاس کیا ہے؟"

اس نے پھر امامہ کی محبت کا مذاق اڑایا تھا' جب کہ وہ ضبط کی آخری حد سے گزرتے ہوئے بولی۔

"بہت کچھ...... فکر مت کرو...... بہت جلد تم بھی دیکھ لوگے۔"

اس کی آنکھوں سے گویا آگ نکل رہی تھی۔

ارسلان حیدر نے زیر لب مسکراتے ہوئے' دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی پاکٹس میں پھنسا کر آہستہ سے رخ پھیر لیا۔

"ایک بات یاد رکھنا ارسلان' میں تمہاری خاطر اگر کسی کی غلامی کرسکتی ہوں تو تمہیں صرف اپنا بنائے رکھنے کے لیے کسی کی جان بھی لے سکتی ہوں' ابھی میرے پیار کی شدت دیکھی نہیں ہے تم نے۔"

"شٹ اپ' فضول دھمکیوں سے کہیں بہتر ہوگا کہ تم کچھ عملی طور پر کرکے دکھاؤ' تمہاری جگہ وہاں رُحاب کو بھیجا ہوتا تو اب تک اس ایس پی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر آچکی ہوتی۔"

اس کی کشادہ پیشانی پر سلوٹیں پڑ چکی تھیں۔

امامہ اس روز اس کی طرف سے ڈھیر سارا دکھ اور پریشانی لے کر واپس گھر پلٹی تھی۔

❀❀❀

دھوپ میں آج شدت پچھلے دنوں سے بڑھ کر تھی۔

وہ صبح جب اٹھا تھا تب سے ہی اس کی طبیعت کچھ بوجھل سی تھی۔ کل پوری رات وہ ایک منٹ بھی سو نہیں سکا تھا۔ دل پر عجیب سا بوجھ تھا۔ گوری نے صبح ہی صبح لسی کا بڑا سا گلاس اس کے ہاتھ میں لا تھمایا تھا۔

"بھا! کل انزلہ آئی تھی' ہیڈ ماسٹر جی کی بیٹی' بوا سے بڑی دیر تک تیری باتیں کرتی رہی تھی۔ کہہ رہی تھی گاؤں میں سکول بنوائے گی۔ اسی مقصد کے لیے گاؤں والوں سے بات کررہی ہے۔ ایک ڈاکٹر بھی بلوایا ہے اس نے یہاں' سنا ہے پرسوں ڈاکٹرنی سے بڑا جھگڑا کیا ہے اس نے' بوا نے شاہ حسین کے متعلق بھی بتایا ہے اسے' کہہ رہی تھی اس کا بھی جلد کوئی بندوبست کردے گی' پر میرا دل کل رات سے بہت گھبرا رہا ہے یوں لگتا ہے جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہے۔"

اس کی آنکھیں واقعی سرخ ہورہی تھیں۔

اور اس نے لسی کا گلاس دو گھونٹ بھر کر گوری کو واپس تھما دیا۔

''میرے ہوتے ہوئے تجھے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں' پنچائیت کے فیصلے کا انتظار کر رہا ہوں ہمارے حق میں نہ ہوئی تو دیکھ لینا گوری' اسے اس کے گھر جا کر گولی سے اڑا آؤں گا۔''

''نہیں بھا' ایسا مت کرنا' وہ تو ہے ہی آوارہ کتا' تو اس کے لیے کیوں اپنی جان کو جوکھم میں ڈالے'' گوری گھبرائی تھی۔ جب وہ بولا۔

''میری پروا نہ کر تو...... عزت سے بڑھ کر جان پیاری نہیں ہے مجھے۔''

''لیکن میرے لیے آپ کی جان ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر رو دی تھی۔

ادریس ہولے سے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے مسکرا دیا۔

''جھلی ہے تو تو' اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تو پریشان نہ ہوا کر۔''

اپنے بوجھل پن سے نگاہیں چراتا وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اماں کو پچھلی دو راتوں سے بخار آ رہا تھا' اس وقت وہ ابھی جاگی نہیں تھیں لہٰذا وہ انہیں بتائے بغیر ضروری سامان اٹھا کر گھر سے نکل گیا۔ گوری نے روز کے معمول کے عین مطابق اس پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی تھی۔

دن اب اچھا خاصا چڑھ آیا تھا' مگر اس میں ٹریکٹر چلانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ آج ظہر کی نماز کے بعد پنچائیت نے اپنا فیصلہ سنانا تھا اور بس اسے جیسے اسی فیصلے کا انتظار تھا۔ وہ اپنا گھر اجاڑنا نہیں چاہتا تھا' مگر گوری پر ظلم اسے کسی صورت گوارہ نہیں تھا اور اس نے پنچائیت میں مسئلہ بھی اسی کا اٹھایا ہوا تھا۔

ماتھے سے بار بار پسینہ پونچھتا وہ ظہر کی نماز کا انتظار کر رہا تھا' جب اچانک دو تین نقاب پوشوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ حملہ چونکہ اچانک پیچھے سے ہوا تھا لہٰذا وہ سنبھلنے یا خود کو بچانے کی کوئی تدبیر نہیں کر سکا تھا۔ اس کے سر پر بہت وزنی چیز لگی تھی' جس کی وجہ سے فوری طور پر اس کا دماغ اندھیرے میں ڈوبنا شروع ہو گیا تھا۔

''میران...... کسی نے میرے میران کو دیکھا ہے' صبح سے گھر نہیں آیا۔''

جس وقت ادریس اپنے سر پر دونوں ہاتھ جما کر زمین پر گر رہا تھا' تب ایک ادھیڑ عمر کی خستہ حال عورت' پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس' ہوش و حواس سے قطعی بیگانہ ہوئی جانے کہاں سے چلتی ان تین نقاب پوشوں کے پاس ٹھہری تھی' جو اسے قطعی نظر انداز کر کے اب بے ہوش پڑے ادریس شاہ کو اٹھا کر جانے کہاں لے جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

''میران...... میرے میران کو دیکھا ہے کسی نے...... صبح سے گھر نہیں آیا......''

آسمان آگ برسا رہا تھا اور نیچے زمین تپ رہی تھی' مگر وہ اپنے ہی حال میں مگن پاگل پن کی انتہا کو پہنچی ہوئی' جانے کس کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔

❋❋❋

کمال صاحب کے لیے بہت زیادہ رونے کے بعد اب اس کی شریانیں انوشہ کے لیے پھٹ

رہی تھیں۔

''میں اس ذلیل عورت کو چھوڑوں گا نہیں امی...... اگر انوشہ کو کچھ ہوا تو میں اس کے گھر کا سکون برباد کر کے رکھ دوں گا۔''

مغرب کی نماز کے بعد نزہت بیگم نے چائے کے بڑے سے مگ کے ساتھ جیسے ہی زاور کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے کندھے پر اپنائیت سے ہاتھ رکھا وہ شروع ہو گیا۔

''بہت ظلم کر لئے اس نے ہم پر اور ہماری ماں پر اب اور نہیں......''

شدید اضطراب کا شکار ہو کر وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا جب وہ نرمی سے بولیں۔

''صبر سے کام لو۔ اللہ نے چاہا تو انوشہ کو کچھ نہیں ہوگا' اصل میں وہ انوشہ کو تمہاری وجہ سے دکھ دے رہی ہے' اس کا خیال ہے کہ تم نے اس کی بھانجی شافیہ کو اغواء کیا ہے۔''

''میں لعنت بھیجتا ہوں اس پر' وہ خود پیچھے پڑی ہوئی ہے میرے۔''

بھاری تیز لہجے میں ان کی بات کاٹ کر اس نے پھر اپنے غصے کا اظہار کیا تھا۔

''اچھا...... ابھی تو وہ پنڈی گئی ہوئی ہے' بھانجے کی شادی میں' ابھی میاں کو مرے چند ماہ بھی نہیں ہوئے اور اسے بیٹی کے بیاہ کی فکر پڑ گئی' کسے کہنے کو محبت کرتی تھی اس سے۔''

''ہونہہ...... سب پتہ ہے مجھے جیسی محبت کرتی تھی' زندگی بھر سکون کا سانس لینے نہیں دیا اس عورت نے انہیں۔''

وہ تپا ہوا تھا۔ نزہت بیگم خاموشی سے سر جھا گئیں۔

عین اسی لمحے اس کے کمرے میں پڑا فون سیٹ چیخ اٹھا تھا۔

''ہیلو......'' فوراً الجھے دماغ کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر اس نے ریسیور اٹھا لیا تھا' جب دوسری جانب سے کسی نے تھوڑی دیر خاموشی کے بعد دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''زاور......؟''

''ہاں! بول رہا ہوں' فرمایئے۔''

''میں شاہ زر بول رہا ہوں' پنڈی سے' تم سے کچھ ضروری بات کرنی تھی۔''

''کیسی ضروری بات......؟''

شاہ زر سے اسے کوئی پرخاش نہیں تھی' مگر اس وقت دماغ انوشہ کی گمشدگی اور سائلہ بیگم کے شہر سے فرار کے ساتھ ساتھ اس کسک سے بھی الجھا ہوا تھا کہ وہ اپنے محبوب باپ کا آخری دیدار تک نہ کر سکا۔ تبھی خشک لہجے میں بول رہا تھا۔

''تم پنڈی آ جاؤ' پھر کرتے ہیں بات......'' شاہ زر کا لہجہ نرم ہی تھا جب وہ بولا۔

''پنڈی تو آل ریڈی آ رہا ہوں۔ لیکن یاد رکھنا شاہ زر' اگر تم لوگوں نے میری معصوم بہن کے ساتھ کوئی ظلم کیا' تو میں ایک ایک کو گولی سے اڑا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے' اڑا دینا' ابھی میں تمہارا ویٹ کر رہا ہوں۔''

پھر ملائمت سے کہہ کر اس نے کال ڈس کنکٹ کر دی' تو زاور ریسیور کریڈل پر پٹختے ہوئے بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں پنڈی جارہا ہوں امی' انوشہ کو لینے' میرا خیال ہے وہ وہیں ہوگی' آپ فکر مت کیجئے گا۔''
''لیکن تم ابھی تو خود آئے ہو' حالت بھی ٹھیک نہیں ہے۔''
''میں ٹھیک ہوں' آپ میری فکر مت کریں۔''
وہ جلدی میں تھا لہذا سرعت سے کہہ کر باہر نکل گیا۔ اس کے حصے کی چائے میز پر دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ جمال صاحب باتھ روم میں تھے۔ اس نے ان کے فارغ ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا اور گھر کی دہلیز پار کر گیا۔ تصور ہی تصور میں سارے سفر کے دوران وہ بھری مجلس میں سائلہ بیگم کی بے عزتی کرتا رہا تھا جن کی محبت اس کی نظر میں اس کے محبوب باپ کی زندگی کو نگل گئی تھی۔

❋❋❋

وہ اداس بیٹھی ارسلان حیدر کی قطعی غیر متوقع بے وفائی کے بارے میں سوچ رہی تھی' جب اس نے مین گیٹ سے کسی ماڈرن سی عورت کو گھر کے اندر داخل ہوتے اور پھر گڑیا کو والہانہ انداز میں بانہوں میں بھرتے دیکھا۔
وہ فوراً اپنی سوچوں سے چونکی تھی۔ عورت کے ساتھ شجاع حسن بھی تھا۔ وہ اپنی جگہ سے فوراً اٹھ کھڑی ہوگئی۔
''یہ امامہ ہے آپا' گڑیا کی گورنس۔''
شجاع کا موڈ خاصا فریش تھا۔ امامہ نے اپنا ڈوپٹہ اچھی طرح سر پر جمالیا۔
''السلام علیکم۔''
''وعلیکم السلام' گورنس تو بہت پیاری رکھی ہے تم نے۔''
اس کے سلام کے جواب میں خاصی تفصیلی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے آنے والی خاتون نے کہا تھا۔ امامہ ممنون انداز میں مسکرا کر بے مقصد ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
''امامہ! یہ فائزہ آپی ہیں میری اکلوتی بڑی بہن' آپ انہیں فائزہ آپی کہہ کر ہی مخاطب کر سکتی ہیں۔''
''جی......'' شجاع حسن کے کہنے پر اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر پھر رخ بدل لیا۔
''چلیں آپا' ابا جی سے مل لیں۔''
شجاع کے اگلے ہی پل کہنے پر وہ دونوں اندر بڑھ گئے' جبکہ امامہ کافی دیر تک وہیں کھڑی فائزہ آپا کے بارے میں غور کرتی رہی جسے اس نے پہلی بار اس گھر میں دیکھا تھا۔

❋❋❋

انزلہ گھر سے اسکول کی عمارت کا جائزہ لینے نکلی تھی۔
کل رات بھی دادی ماں بہت دیر تک اس سے شہر واپسی کے لیے منت کرتی رہی تھیں مگر اس نے انہیں مایوس کر دیا' یہ کہہ کر کہ وہ کسی طور اپنے بابا کے خوابوں کو ادھورا نہیں چھوڑے گی۔ اپنی طرف سے اس نے انہیں یہ اطمینان دلانے کی کوشش بھی کی تھی کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا لہذا وہ اس کی فکر نہ کیا کریں۔
صبح ناشتے کے بعد وہ تھوڑی دیر ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد' اپنی بلیک شال لے کر گھر سے نکل پڑی تھی تاکہ دوپہر چڑھنے سے پہلے اسکول کی اس خستہ حال عمارت کا جائزہ لے سکے

جو کسی اچھے مقصد سے تعمیر ضرور ہوئی تھی' مگر سالوں بعد بھی وہاں کوئی ایک بچہ علم حاصل نہیں کر سکا تھا
ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں کے بیچ چھوٹی سی کچی پگڈنڈی پر بھرپور اعتماد سے قدم جما کر
وہ ابھی پرانے کنوئیں کے پاس پہنچی تھی جب اس نے اس پاگل بڑھیا کو دیکھا تھا' جو بھری دوپہر میں ننگے پاؤں' پھٹے پرانے کپڑوں میں اپنے حال سے بیگانہ ہوئی اسی کی طرف آ رہی تھی۔

"میرے میران کو دیکھا ہے تم نے......؟ صبح سے گھر نہیں آیا' میں نے اس کی پسند کے چاول بنائے ہیں' تم نے دیکھا ہے میرے میران کو......؟"

انزلہ کو ایک لمحہ لگا تھا انہیں پہچاننے میں۔ وہ میران شاہ کی ماں تھی۔ اس میران شاہ کی ماں
اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

انزلہ کے قدم جیسے وہیں جکڑ گئے تھے۔ ادھیڑ عمر خاتون اب پھر وہی الفاظ دہراتی آگے بڑھ گئی تھی۔ مگر انزلہ کی دکھ بھری حیران نگاہیں انہیں تب تک دیکھتی رہی تھیں جب تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئی تھیں۔

"خدا کرے تم مر جاؤ سانول شاہ' تمہیں وہ موت ملے کہ تم اس پورے گاؤں کے لیے عبرت بن کر رہ جاؤ۔"

کٹتے دل سے پھر سانول شاہ کو بددعا دیتے ہوئے وہ واپس پلٹ آئی تھی۔ سانول شاہ سے اس کے انتقام کا ارادہ مزید مضبوط ہو گیا تھا' وہ واپس لوٹی تھی اور عین اسی لمحے کوئی بے ہوش ادریس شاہ کو جیپ کی پچھلی سیٹ پر ڈالے اس کے قریب سے گزر گیا تھا۔

❊❊❊

شامِ فرقت ڈھلے ہم نہیں چاہتے
غم سے فرصت ملے ہم نہیں چاہتے
ہم تیرے بعد اجڑے ہوئے ٹھیک ہیں
اب کہیں دل لگے ہم نہیں چاہتے

وہ ہوٹل کے باہر اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا جب زاور ٹیکسی سے نکل کر اس کی طرف بڑھ آیا۔

"السلام علیکم۔"

زاور کے قریب پہنچتے ہی شاہ زر نے خود آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا تھا جسے اس نے بھی بادلِ نخواستہ تھامتے ہوئے جوابی کلمات ادا کر دیئے۔

"وعلیکم السلام' اب بولو یہاں کیوں بلوایا ہے مجھے؟"

"انوشہ کے لیے۔"

اس سے مصافحہ کرنے کے بعد اس نے اپنے دونوں ہاتھ پینٹ کی پاکٹ میں ڈال کر ذرا سا رخ پھیر لیا تھا۔

"وھاٹ"

زاور کا گمان جیسے یقین میں بدل گیا۔ تبھی وہ بولا۔

''ہاں زاور...... انوشہ یہیں اسی اسپتال میں ایڈمٹ ہے' میں تمہاری کیفیت اور غصے کو سمجھ رہا ہوں مگر تم پہلے پوری بات سن لو' پھر جو چاہو سوال کر لینا پلیز۔''

وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ زاور نے گہری نگاہوں سے کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد سر جھٹک دیا۔

''تم سمجھ رہے ہو گے کہ شاید سائلہ آنٹی یا ہم میں سے کسی نے تمہاری بہن کے ساتھ ظلم کیا ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔''

جھوٹ بولتے ہوئے اس نے اپنے لہجے کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

میں نہیں جانتا تمہیں انوشہ' انکل یا یزدانی پیلس کے بارے میں کتنا علم ہے تاہم جو میں جانتا ہوں وہ انوشہ کا بھائی ہونے کی وجہ سے تمہیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں' یہ بات تو تم جانتے ہو کہ یزدانی پیلس میں میری بہن اور سائلہ آنٹی کے بیٹے ساحل کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ کسی وجہ سے یہ شادی نہیں ہو سکی' کسی کیا تمہاری بہن کی وجہ سے ہی نہیں ہو سکی کیونکہ جس روز نکاح کی رسم تھی اسی روز تمہاری بہن' گھر یا پارلر سے غائب ہو گئی بعدازاں اس نے خود اپنے ہاتھوں سے خط لکھ کر یزدانی پیلس پہنچایا اور اس بات کا اقرار کیا کہ وہ گھر سے خود اپنی مرضی سے فرار ہوئی ہے اور یہ بھی کہ اس کے بھائی نے' یعنی تم نے میری بہن شافیہ کو بھی اغواء کر لیا ہے اسی صدمے نے میری ممی اور تمہاری پاپا کی جان بھی لے لی۔ نزہت آنٹی جانتی ہیں اس خط کے بارے میں' وہ خط پڑھنے کے بعد میں نے تمہیں ڈھونڈنا چاہا تو پتہ چلا تم شادی سے کئی روز پہلے ہی ملک سے باہر چلے گئے تھے پھر شافیہ بھی اپنی دوست کے گھر تھی اس نے بھی صاف صاف بتا دیا کہ وہ ساحل سے شادی نہ کرنے کے لیے پارلر سے غائب ہو گئی تھی تاہم انوشہ گھر پر ہی تھی۔ وہ گھر سے کہاں اور کیوں فرار ہوئی میں نہیں جانتا' تاہم یہ خط ضرور سنبھال کر رکھا ہوا ہے میں نے...... پڑھ لو۔''

اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس نے کوٹ کی جیب سے انوشہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط اس کے حوالے کیا تو زاور کے ہاتھوں میں کاغذ کا وہ بند پرزا تھامتے ہوئے اس نے واضح لرزش دیکھی۔ بہنوں کی عزت کے تمام معاملات ہی شاید ایسے ہوتے ہیں۔

''بکواس ہے یہ سب' میں اپنی بہن کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں' وہ ایسی گری ہوئی حرکت کر ہی نہیں سکتی۔''

خط کو چاک کر کے' مٹھی میں مروڑتے ہوئے اس نے غصے سے کہا تھا جب وہ بولا۔

''ہر بھائی کے اپنی بہن کے متعلق ایسے ہی جذبات ہوتے ہیں' میں بھی تمہاری بہن کو قطعی غلط نہیں سمجھتا' وہ بہت اچھی لڑکی ہے' مگر یہ خط...... اس نے کیوں لکھا' یہ بات سمجھ میں نہیں آتی' ہم چاہیں بھی تو اس سچائی سے نظریں نہیں چرا سکتے کہ یہ خط اس نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا بہرحال مجھے پرسوں شام ہی معجزاتی طور پر اسی شہر میں بے ہوش ملی تھی یہ' اسی لیے اس اسپتال میں لے آیا' تم چاہو تو ابھی مل سکتے ہو اس سے۔''

اس کا لہجہ اتنا سنجیدہ تھا کہ زاور کو نا چاہتے ہوئے بھی اس کی سنائی گئی جھوٹی من گھڑت کہانی پر یقین کرنا پڑا۔

''کہاں ہے انوشہ۔''

''اندر اپنے وارڈ میں...... آؤ دکھاتا ہوں تمہیں۔''

خود اپنے آپ سے نگاہیں چراتا وہ زاور کو ساتھ لے کر اسپتال کے داخلی برآمدے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

❋❋❋

وہ باہر لان سے اٹھ کر اندر لاؤنج میں آئی تو سامنے کا عجیب وغریب منظر دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس کی نظر کے سامنے بڑے صوفے پر شجاع حسن بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ سنگل صوفے پر فائزہ آپا بیٹھی چیکوں پیکوں رو رہی تھیں۔ جبکہ شجاع حسن انہیں چپ کروانے کی کوشش کر رہے تھے امامہ کو دیکھتے ہی فائزہ آپا نے فوراً اپنے آنسو صاف کیے تھے۔

''میں اب چلتی ہوں شجاع' تم گڑیا کا خیال رکھنا اور اپنا بھی' ابھی سفر سے آئے ہو' تھوڑا آرام کر لو' ہم کل شام میں باہر ہی مل لیں گے۔''

امامہ کی سمجھ میں فائزہ آپا کا رونا آیا تھا نہ ان کی بات۔ تاہم پھر بھی وہ قدرے الجھ گئی تھیں۔ شجاع حسن کی وقت سے پہلے گھر واپسی بھی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

''اور ہاں' وہ عائزہ کے اغواء کے کیس کا کچھ ہوا کہ نہیں' اسی کے سلسلے میں ملک سے باہر گئے تھے نا تم......؟''

''جی...... کیس مضبوط ہے' دو ملزم پکڑے بھی گئے ہیں' ابھی دو کی تلاش جاری ہے' وہ بھی جلد گرفت میں آجائیں گے' پھر چاروں پر اکٹھا مقدمہ چلاؤں گا سارے ثبوت تو مل ہی گئے ہیں۔''

امامہ جانتی تھی کہ فائزہ آپا نے صرف اس کی موجودگی کی وجہ سے گفتگو کا رخ بدل دیا تھا' تاہم شجاع حسن کے انکشاف نے اس کے پاؤں تلے سے زمین جیسے کھینچ لی تھی۔ ارسلان حیدر کی بے وفائی کے باوجود اس کے دل پر جیسے کسی نے ہاتھ ڈالا تھا۔

❋❋❋

زاور نے جس وقت شاہ زر کی ہمراہی میں انوشہ کے کمرے کی دہلیز پر قدم رکھے' اس کی پلکیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔ باپ کی ناگہانی موت اور بہن کی بے وفائی کے باوجود وہ لپک کر اس کی طرف بڑھا تھا۔

''انوشہ......''

شاہ زر کی نگاہیں بھی اس کی لرزتی لانبی پلکوں پر جمی تھیں۔

''انوشہ...... میں زاور...... تمہارا بھائی' آنکھیں کھولو' شاباش......''

اس پر قدرے جھک کر نرمی سے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا جب لرزتی پلکوں کے ساتھ انوشہ کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات ظاہر ہوئے اور چند بے ربط سے جملے اس کے لبوں سے ادا ہوئے۔

''نہیں...... مجھے گھر جانے دو' خدا کا واسطہ ہے تمہیں' پلیز...... مجھے چھوڑ دو......''

وہ ہوش میں نہیں تھی' مگر زاور کے چہرے کا سارا خون جیسے اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ شاہ زر نے بے ساختہ رخ پھیرا تھا۔ وہ ابھی تک اپنے ساتھ پیش آنے والے بھیانک حادثے کی

ا ملی۔

"بس کسی نے میری بہن کے ساتھ ظلم کیا ہے' میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا' ٹکڑے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو نہ کھلائے تو میرا نام بھی زاور حسین یزدانی نہیں۔"

لموں میں پلٹ کر شاہ زر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ جواب میں شاہ زر نے اپنا ہاتھ اس کے مضبوط کندھے پر دھر دیا۔

"تم ٹینشن مت لو اور' میں معاملے کی اپنے طور پر تحقیق کر رہا ہوں' جیسے ہی کوئی بات سامنے آئی میں بتا دوں گا۔ تم فی الحال انوشہ کا خیال رکھو' میں اب چلتا ہوں۔"

اس کے سر میں اچانک شدید تکلیف شروع ہو گئی تھی۔

زاور نے اپنی توجہ اس سے ہٹالی۔

"او کے' یو کین گو۔"

اللہ چند دنوں میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

شاہ زر قطعی ڈسٹرب موڈ میں اسپتال سے گھر واپس آیا تو سائرہ بیگم' بُریرہ کے قریب بیٹھی اس سے کہہ رہی تھیں اور وہ سر جھکائے ان کے سامنے آنسو بہا رہی تھی۔ وہ سرسری نگاہوں سے اسے دیکھنے کے بعد سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ اعصاب ایک مرتبہ پھر اسے شدید تکلیف سے دوچار کر رہے تھے لہٰذا اس نے پھر ہتھیلی پر دو نیند کی گولیاں نکالیں' اور فوراً پھانک کر قریب ہی دھرا پانی کا جگ منہ سے لگالیا۔

بُریرہ جس وقت سائرہ بیگم سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی' وہ گہری پرسکون نیند میں ڈوب چکا تھا۔

❊❊❊

اسے خبر بھی نہیں تھی اور اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا' ایک بار جب اسے بخار چڑھا تھا اور وہ اپنے بستر سے اٹھ نہیں پا رہی تھی تو ارسلان حیدر کا کیا حال ہوا تھا۔ سارے دن وہ گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ گو حفصہ بیگم اس کی تیمارداری کر رہی تھیں مگر ارسلان نے وہ سارا دن بے حد تفکر کے عالم میں اس کے بستر کے پاس اِدھر اُدھر کی ہلکی پھلکی باتیں کر کے اس کا من بہلاتے ہوئے بیتایا تھا۔ شام میں جب وہ کچن میں گھسی رات کے کھانے کی تیاری کر رہی ہوتی تھی تو وہ بے حد ہلکے پھلکے موڈ میں اپنی کئی گرل فرینڈز کے فرضی قصے سنا سنا کر اسے خوب تنگ کرتا۔ اکثر وہ لمحات یاد آ رہی ہوتی جو اس کی ذات سے جڑی تھیں۔ کتنے خوبصورت لمحات تھے جو اس کے ساتھ بیتے اس سے منسوب تھے۔

وہ جتنا اس کے بارے میں سوچتی جا رہی تھی اس کے آنسو اتنی ہی روانی سے بہہ رہے تھے۔

ارسلان کا غصہ' اس کی بے وفائی' اب اسے بالکل جائز لگ رہی تھی۔

"نہیں تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا ارسلان' جب تک امامہ حسین کے جسم میں روح ہے' وہ تمہاری طرف گرم ہوا کے جھونکے کو بھی نہیں آنے دے گی' تم دیکھنا میں اس ایس پی کے بچے کو ایسا بے بس کروں گی کہ چاہتے ہوئے بھی پر نہیں مار سکے گا۔"

اپنی اشتعال انگیز سوچوں کو ہوا دیتے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر اپنے آنسو

صاف کیئے اور لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے پلٹ آئی۔

❁❁❁

اس کی جیسے ہی آنکھ کھلی اس نے بُریرہ کو مضطرب انداز میں اپنے پہلو میں بیٹھے انگلیاں مسلتے ہوئے دیکھا۔ چونکہ اس وقت اس کے اعصاب قدرے بوجھل تھے لہٰذا وہ اس کی کیفیت سمجھے بنا دوبارہ پلکیں موند گیا۔

''شاہ زر...... میں مما کے ساتھ یزدانی پیلس جا رہی ہوں۔''

''کیوں......؟''

مندی مندی آنکھیں کھول کر اگلے ہی پل اس نے اپنے اعصاب کو بیدار کیا تھا۔

''رسم ہے' ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہی۔'' اب کے تھوڑا سا رخ پھیرتے ہوئے اس نے اپنا رد کیا تھا۔ شاہ زر ٹینشن کے باوجود مسکرا دیا۔

''او کے......''

بے حسی کی انتہا تھی۔ وہ مزید کڑھ کر رہ گئی۔

''آپ اٹھ کر شاور لے لیں' امی اور بھائی لوگ باہر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ بھی کوئی شکوہ کیئے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جب اس نے پکار لیا۔

''بُریرہ بات سنو۔''

''جی......'' وہ وہیں کھڑی ذرا سی پلٹ کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''ایم سوری یار...... کل رات جو کچھ ہوا ہے اس کے لیے میں تم سے شرمندہ ہوں۔''

''کوئی بات نہیں' جن سے پیار کیا جاتا ہے ان کے لیے انسان اتنا بے اختیار ہو ہی جاتا ہے۔''

''میں اس سے پیار نہیں کرتا۔''

فوراً اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے وضاحت دی تھی۔ بُریرہ کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''پیار چھپائے بھی چھپتا نہیں ہے' حقیقی معنوں میں اس وقت مجھے تم سے شادی کے فیصلے پر پچھتاوا ہو رہا ہے' کیونکہ ایک بٹا ہوا انسان کبھی بھی میری چوائس نہیں ہو سکتا تھا کاش مجھے شادی سے پہلے اس افسوس ناک حقیقت کا پتہ چل جاتا۔''

''فضول سوچنے اور بولنے کی ضرورت نہیں ہے بُریرہ میں پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں۔'' وہ میں تپا تھا۔ بُریرہ اپنا کرب اور آنسو چھپانے کو رخ پھیر گئی۔

''بہر حال، میں شاور لینے جا رہا ہو تب تک تم تیاری کر لو' میں ساتھ تو نہیں جا سکوں گا' مگر......''

''تمہیں سی آف کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے تم لگاؤ اسپتال کے چکر' ہم خود ہی جائیں گے۔''

شاہ زر کی بات درمیان سے کاٹ کر وہ پھر غضب ناک ہوئی تھی' جواب میں وہ کچھ کہنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے چپ چاپ اٹھ کر واش روم میں گھس گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ شاور لے کر' ٹاول سے سر رگڑ کر بال خشک کرتے ہوئے واپس کمرے میں آیا تو بُریرہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھی' ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھی۔ شاہ زر نے تفصیلی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے

اپنا رخ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف موڑ لیا۔ اگلے پانچ منٹ میں بال سیٹ کیے بغیر وہ اس کے قریب ہی بیڈ پر آ بیٹھا اور پھر اپنائیت سے اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تھامتے ہوئے نرمی سے بولا۔

''پلیز بُریرہ' یوں عام سی جاہل عورتوں کی طرح ری ایکٹ کر کے میری الجھنوں میں مزید اضافہ مت کرو' تم نہیں جانتیں' میں نے اس لڑکی سے ہمیشہ نفرت کی ہے' قدم قدم پر ہرٹ کرتا رہا ہوں اسے' یہ میرے اندر کی وحشت اور نفرت ہی تھی جو میں نے اس سے یوں حیوانوں جیسا سلوک کیا۔ تم تو سمجھدار ہو' پڑھی لکھی روشن دماغ لڑکی ہو' محبت اور ہمدردی میں فرق کو سمجھ سکتی ہو' بچپن سے تمہارا اور میرا جو تعلق ہے' جو محبت اور دوستی ہے' کیا وہ کچھ بھی نہیں......؟ ہاں میں مانتا ہوں میں نے غلط کیا ہے' بہت غلط کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ تمہارے ساتھ بھی بہت زیادتی کی ہے میں نے' مگر پلیز بُریرہ' تم تو مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس وقت میں جتنا اپ سیٹ ہوں مجھے ایک اچھے دوست کے سہارے کی اشد ضرورت ہے جو مجھے اس اضطراب سے باہر نکال سکے' کیا تم میرے لیے وہ اچھی دوست ثابت نہیں ہو سکتیں......؟''

اس کی آنکھوں میں امید تھی۔

بُریرہ نے کچھ دیر نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد دھیرے سے اپنے آنسو پونچھ لئے۔

''زاور یہاں آیا ہوا ہے میں نے ہی بلایا ہے اسے' انوشہ پورے چار ماہ اور پچیس دن کومے میں رہنے کے بعد کل ہی ہوش میں آئی ہے' اس کی زندگی اور حالت ایسی نہیں ہے بُریرہ کہ اس سے نفرت کی جا سکے۔ یا تم اس سے کوئی حسد محسوس کرو' اسے صرف ہمدردی کی ضرورت ہے' صرف اور صرف ہمدردی کی' اسی لیے معاملہ نپٹائے بغیر میں فی الحال یہاں سے کہیں نہیں جا سکتا' تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات۔''

وہ پوچھ رہا تھا جواب میں آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر اس کے قریب سے اٹھ گئی اور اگلے ہی پل کمرے سے بُریرہ باہر نکل گئی۔ شاہ زر نے اس کے جانے پر پھر گہری سانس بھری تھی۔

❋❋❋

گرمی کی شدت اپنے زور پر تھی۔

کچی سڑک پر اٹھتی دھول کے سوا اب کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ کھیت سے بھاگ کر کچی سڑک پر چڑھ آئی۔

''یہ سانول شاہ کے آدمی' اسی کی جیپ میں کس کو لے جا رہے ہیں' اور کہاں......؟ کمینہ پھر سے کسی شیطانی کام میں ملوث نہ ہو۔''

حیران حیران سی دور تک دیکھتی وہ ابھی پلٹی تھی کہ چھنو کسی قریب کے گھر سے نکل کر اس کی طرف بھاگ آئی۔

''انزلہ باجی......آپ......اور اس وقت یہاں......؟''

''ہاں......وہ......وہ ابھی میں نے سانول شاہ کی جیپ یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھی تھی اس کی پچھلی سیٹ پر کوئی زخمی اوندھے منہ پڑا تھا' مگر اس کے سر سے خون نکل رہا تھا۔ کچھ گڑبڑ ہے چھنو۔''

اس کا لہجہ پریشان کن تھا۔ چھنو نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"باجی...... یہ کھیل تماشے تو روز کے ہیں یہاں' آپ نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے؟ چوہدریوں کا بال ہے سانول شاہ' کوئی اکھا جی کر کے بات نہیں کرسکتا اس سے' لیکن ابھی تو وہ گاؤں میں نہیں ہے' شہر میں کسی بندے کے ساتھ جھگڑا چل رہا ہے اس کا' پندریں دنی پیشی پر جاتا ہے' گاؤں والے تو دعا کرتے ہیں اللہ کرے پھانسی ہو جائے اسے......"

چھنو عادت کے عین مطابق شروع ہو چکی تھی۔

انزلہ نے بیزار ہو کر اسے ٹوک دیا۔

"محض بددعاؤں سے کچھ نہیں ہوگا' اس بندے کا بندوبست کسی اور طریقے سے کرنا پڑے گا' ابھی تو تم پتہ لگاؤ اس کے بندے کس کو اٹھا کر لے گئے ہیں' اور کہاں......؟"

"ٹھیک ہے' آپ فکر ہی نہ کریں' میں آدھے گھنٹے میں رپورٹ دیتی ہوں آپ کو' آپ اب گھر ہی چل رہی ہیں ناں......؟"

"ہاں۔"

پژمردہ لہجے میں کہتی وہ گھر کی طرف پلٹ گئی تھی۔ چھنو اس کی نظروں میں اپنی اہمیت پر مسرور تھی' خوش خوش فیقے لوہار کے گھر کی طرف چل پڑی کہ آج کل فیقہ بھی سانول شاہ کا خاص چمچہ بنا ہوا تھا اور چھنو جان دیتی تھی اس پر۔

❋❋❋

ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور شجاع پلکیں موندے اداس سالان میں بیٹھا تھا جب وہ خود کو اندر سے مضبوط کرتی اس کے قریب چلی آئی۔

"سر...... بارش تیز ہوگئی ہے' اندر آجائیں۔"

اس کی پکار پر چونک کر آنکھیں کھولتے ہوئے وہ یقیناً حیران ہوا تھا۔

"نہیں' میں ٹھیک ہوں......"

فوری طور پر یہی کہہ سکا کیونکہ بارش میں بھیگنا اسے ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا تھا' اور بارش کی دیوانی تو امامہ بھی تھی' مگر...... یہاں اس کی مجبوریاں اس کے ساتھ تھیں۔

"ابھی ٹھیک ہیں' تھوڑی دیر میں سردی لگے گی تو بخار چڑھ آئے گا۔"

وہ مایوس ہو کر پلٹتی نہیں تھی۔ شجاع اس کی جرات اور اپنائیت پر پھر جی بھر کر حیران ہوا تھا۔ بھلا اسے اس کی اتنی پروا کب سے ہوگئی تھی۔

"میں امامہ...... آر یو او کے......؟"

اب کے وہ تھوڑا گھبرائی تھی۔

"جی...... جی الحمدللہ...... آپ پلیز اندر چلے آئیں' اتنی دیر تیز بارش میں بیٹھنا اچھا نہیں ہوتا۔"

پلکیں جھکائے کہتی وہ اسے اچھی خاصی الجھن میں ڈال گئی تھی۔

"او کے' لیکن یہ اچانک مجھ سے ہمدردی کا بخار کیوں چڑھ گیا آپ کو؟"

اب وہ تیکھے چتونوں سے اسے گھور رہا تھا۔ امامہ کا جھکا سر مزید جھک گیا۔

''یہ ہمدردی نہیں' خیال ہے' پروا ہے۔''

''مگر مجھے کسی کے خیال اور پروا کی ضرورت نہیں ہے' آپ اس گھر میں میری بیٹی کی گورنس بن کر آئی ہیں' اسی حیثیت سے رہیں تو اچھا ہے۔''

وہ پٹ جانے کی بجائے برہم ہوگیا تھا۔ اور اسی برہمی میں تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے چلا بھی گیا' مگر امامہ مایوس نہیں ہوئی' اس کے لبوں پر اب بھی بڑی اداس سی مسکراہٹ بکھری تھی۔

''یہ تو آغاز ہے ایس پی' آگے آگے دیکھنا کیسے تمہیں اپنی محبت کے جال میں جکڑ کر بے بس کرتی ہوں' کتنا بھاگو گے مجھ سے' کتنا دامن بچاؤ گے؟ اپنے ارسلان کے لیے' اس کی جان بچانے کے لیے تو میں تمہاری جان لینے سے بھی گریز نہ کروں' یہ محبت' محبت ڈاٹ کام کا کھیل کیا معنی رکھتا ہے؟''

لبوں پر اداس مگر زہریلی مسکراہٹ سجائے وہ دل میں سوچ رہی تھی اور اندر شجاع اپنی بیٹی کے ساتھ ٹہلتے ہوئے اس کی آج کی حیران کن حرکت کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

❋❋❋

چلتا تھا کبھی ہاتھ میرا تھام کے جس پر
کرتا ہے بہت یاد وہ رستہ اسے کہنا
امید نہ رکھے وہ کسی اور سے ہرگز
ہر شخص محبت نہیں کرتا اسے کہنا

وہ لان کی جانب کھلنے والی کھڑکی میں کھڑی ارسلان حیدر کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔ شجاع حسن سے آنکھ بچا کر کئی بار اس نے اس کا موبائل نمبر بھی پریس کیا تھا مگر ہر بار وہ آف مل رہا تھا۔ جانے وہ کس حال میں تھا؟

پچھلے تین روز سے وہ جیسے انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ دل کا جو حال تھا خدا کے سوا اور کون جان سکتا تھا۔ پہلے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ شجاع حسن کے کھانے میں یا چائے میں زہر ملا کر اس کا قصہ ہی ختم کر دے تاکہ نہ وہ ہو اور نہ ہی ارسلان کو کوئی نقصان پہنچا سکے' تاہم پھر یہ سوچ کر کہ وہ ارسلان والے کیس والی فائل اوپر پہنچا چکا ہے اور ارسلان فی الوقت اسی کی تحویل میں ہے۔ وہ اپنا ارادہ ملتوی کر گئی تھی۔ اس وقت شجاع حسن کا اعتبار جیتنے کے ساتھ ساتھ اسے حفصہ بیگم کی بھی بے حد فکر تھی۔ جانے وہ کس حال میں تھیں اور کس کے پاس تھیں؟ ارسلان کی جیل کا سن کر جانے ان پر کیا بیتی ہوگی؟

وہ ان سے ملنے اور انہیں دیکھنے کے لئے بے حد بے قرار تھی۔ مگر شجاع حسن گھر سے ہلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کل دیر تک تیز بارش میں بھیگنے کے باعث وہ واقعی بخار کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور بخار بھی خوب ٹکا کر چڑھا تھا۔ وہ ہر صورت حفصہ بیگم کا حال جاننا چاہتی تھی' اسی مقصد کے لئے جلدی جلدی گڑیا کا فیڈر بنا کر اسے سلانے کے بعد وہ شجاع حسن کے کمرے میں آئی تو اسے کسی سے موبائل پر بات کرتے ہوئے پایا۔

''نہیں یار' تم ٹینشن مت لو۔ منسٹر ہو یا منسٹر کا باپ' اس بار یہ کیس میری گرفت سے نکلنے والا نہیں۔ بس ذرا حکومتی معاملات معمول پر آ جائیں' اس کیس میں ملوث ایک ایک لڑکے کو کڑی سے کڑی سزا دلوا کر رہوں گا۔''

اس کا لہجہ خاصا تیز تھا۔ امامہ کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر ہی جم گیا۔ جبکہ وہ اب کہہ رہا تھا۔

''نہیں یار' یوڈونٹ وری' عائزہ صرف تمہاری نہیں' میری بھی بہن تھی۔ جب تک میں اس کے مجرموں کو کیفر کردار تک نہیں پہنچا دیتا سکون سے نہیں بیٹھوں گا۔'' ارسلان نے صحیح کہا تھا' اس کیس میں اس کی توجہ اور دلچسپی ذاتی نوعیت کی تھی۔ وہ کچھ سوچ کر سر جھٹکتی بالآخر اس کے روم میں گھس آئی۔

''سر......''

اس کے مخاطب کرنے پر شجاع نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے' الوداعی کلمات کے ساتھ لائن ڈس کنکٹ کر دی۔

''جی......''

''وہ...... میں مارکیٹ جانا چاہ رہی تھی۔''

اس کی طرف دیکھے بغیر سر جھکا کر اس نے اپنا مدعا بیان کر دیا تھا۔

''اس وقت...... کیوں......؟''

بھوئیں اچکا کر توجہ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تو وہ آہستہ سے رخ پھیر گئی۔

''وہ...... گڑیا کے لئے کچھ چیزیں لانا تھیں' ابھی فارغ ہوئی تھی تو سوچا لے آؤں' آپ تو بستر سے اٹھ نہیں سکتے۔''

''نہیں میں شام میں لے آؤں گا' آپ ریسٹ کر لیں۔''

جونہی اس نے کہا امامہ دل میں اسے ہزار گالیوں سے نواز کر رہ گئی۔

''سر پلیز...... مجھے کچھ گھٹن سی محسوس ہو رہی ہے' تھوڑی دیر کسی پارک میں بیٹھ کر آؤں گی تو طبیعت فریش ہو جائے گی' گڑیا کو سلا دیا ہے' آپ کے لئے سوپ بھی بنا کر رکھ آئی ہوں۔'' کچھ بے بسی اور ناگواری سے کہتی وہ اسے پہلی بار بہت عجیب لگی تھی۔

''میرے لئے سوپ......؟ کیوں......؟ کیا باورچی آج چھٹی پر ہے......؟''

وہ واقعی حیران ہوا تھا۔ امامہ کو وضاحت دینا مشکل ہو گئی۔

''نہیں...... وہ اصل میں' میں گڑیا کے لئے دلیہ بنا رہی تھی تو ساتھ میں آپ کے لئے سوپ بھی بنا لیا' آپ کو اچھا لگے گا۔''

''بات اچھا لگنے کی نہیں' زحمت کی ہے۔ کھانا پکانا باورچی کی ذمہ داری ہے آپ کی نہیں' بہر حال بہت شکریہ آپ نے اتنی زحمت کی میرے لئے۔''

وہ قابو میں آنے والا بندہ تھا ہی نہیں۔ امامہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھتی' فوراً پلٹ کر اس کے کمرے سے باہر نکل آئی' اس وقت اس کا دل ساری دنیا سے کنارہ کشی کرنے کو چاہ رہا تھا۔

❋❋❋

شام ڈھل رہی تھی جب شاہد حسین نے بے ہوش ادریس شاہ کو جیپ سے اتار کر گھر میں اپنی

…ے سامنے لا پٹخا۔ جو اس کی بہن ہونے کے ساتھ ساتھ ادریس شاہ کی بیوی بھی تھی۔

"ہائے او ربا...... یہ...... یہ ادریس کو کیا ہوا......؟"

…ل کر چار پائی سے اٹھتے ہوئے اس نے سینے پر ہاتھ رکھا تھا' جب کہ شاہد حسین کرو فر سے …دھے پر پڑا صافہ جھاڑ کر دوبارہ کندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔

"…لے اسے تیرے قدموں میں لے آیا ہوں' بڑا اکڑا پھرتا ہے آج کل گاؤں میں' بول کیا کرنا …ہے؟"

سانول شاہ کا خاص چمچہ ہونے کی وجہ سے اس کی ہمت بہت بڑھی ہوئی تھی۔

زلیخا کا دل پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔

"نہیں بھا' یہ ٹھیک نہیں ہے' ہاں میں اس سے ناراض ہوں' مگر...... مگر یہ بھی تو سوچ یہ میرے …اپ ہے۔"

"ارے بھاڑ میں گیا تیرے بچے کا باپ۔"

گرج کر بولتے ہوئے اس نے زلیخا کو سہا دیا تھا۔ "بھائی کی پروا نہیں ہے' بچے کے باپ کی …ہے۔"

…دانت پیس کر کہتے ہوئے وہ قریبی چار پائی پر ٹک گیا۔ عین اسی لمحے ادریس کو ہوش آیا تھا۔ سر …لگے زخم سے نہ صرف خون رس رہا تھا بلکہ شدید درد کی ٹیسیں بھی اٹھ رہی تھی۔ تب دونوں …سر کے پیچھے جما کر اس نے ذرا سا سر اٹھایا تو سامنے ہی اپنی بیوی کو کھڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"تم......"

"آ گیا ہوش میں......"

اس کے آنکھ کھولتے ہی شاہد حسین نے بڑبڑا کر کہا اور اگلے ہی پل چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"لے چل اس کو کمرے میں' اگر اب بھی یہ اپنی بات پر اڑا رہا تو صبر کر لینا تم اس کی طرف سے۔"

اس کے عزائم خطرناک تھے۔

زلیخا کے اندر تک خوف پھیل گیا۔

ادریس اب اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا تھا' مگر اس سے پہلے کہ وہ کھڑا ہوتا' شاہد حسین …نے سے پھر اس پر پروار کر دیا۔

"جاتا کہاں ہے بے غیرت' تجھ سے تو دو دو ہاتھ کرنے ہیں مجھے۔"

نفرت بھرے لہجے میں کہہ کر اس نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھایا اور پیچھے بڑے کمرے کی …رف لے آیا۔

شام اب رات میں ڈھل چکی تھی۔

زلیخا کے منانے اٹھ کر رونا شروع کر دیا تھا' مگر وہ ہراساں سی کھڑی اپنے بھائی کے طیش کو دیکھ …ری تھی' جانے وہ اس کے سہاگ کے ساتھ کیا کرنے والا تھا؟

"بول۔ بھیجتا ہے اپنی بہن کو میرے گھر کہ نہیں۔"

ادریس کو کندھوں سے اتار کر بڑے کمرے کے کچے فرش پر پٹختے ہوئے اس نے پوچھا' جب کہ

وہ درد ضبط کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے غصے سے بولا۔
''ہرگز نہیں، تجھ جیسے گھٹیا جانور کو تو دیکھنے نہ دوں میں اپنی بہن' آج پنچائیت تیرا فیصلہ کرے گی۔''
''ہا......ہا......ہا......کون سی پنچائیت؟''
خباثت سے مسکراتے ہوئے اس نے ادریس کی لاعلمی کا مذاق اڑایا تھا۔
''پنچائیت کا ٹائم گزر چکا پیارے' اب میری پنچائیت کا ٹائم ہے۔ آخری بار پوچھ رہا ہوں گوری کو بھیجتا ہے میرے گھر کے نہیں......؟''
ادریس کی آنکھیں درد کی شدت سے بند ہورہی تھیں۔ اس نے اپنے دونوں جبڑے مضبوطی سے بھینچ رکھے تھے' وہ بہت کوشش کے باوجود اس کی پوری بات سمجھ نہیں سکا تھا۔
''نہیں......کبھی نہیں......''
''چلو' نہیں تو نہ سہی۔''
اس کے مسلسل انکار نے گویا تپا دیا تھا اسے' تبھی اس نے پاٹ دار آواز میں زلیخا کو صدا لگائی۔
''زلیخا۔''
''جی بھا......'' وہ بدحواس سی بھاگی آئی تھی۔ ہاتھ پاؤں برف کی مانند ٹھنڈے ہو رہے تھے۔
''سوا کہاں ہے برف والا؟''
''ک......کہاں......؟'' اس کا رنگ فق ہوا تھا۔
''سوال پر سوال نہ پوچھا کر' جو پوچھا ہے اس کا جواب دے۔''
وہ غصے میں کنٹرول سے باہر لگ رہا تھا۔
زلیخا پھپھک کر رو پڑی۔
''اس کی جان نہیں لینی بھیا' میرا سہاگ ہے ادریس۔''
''چپ کر تو' تیرا سہاگ میری جان اور سکون کا دشمن ہے۔''
ڈپٹ کر غصے سے کہتا وہ خود ہی رسوئی میں گھس گیا تھا۔ زلیخا کے مُنے نے اور بھی بلک کر رونا شروع کردیا۔
''چل میرے ساتھ۔''
برف والا سوا رسوئی سے ڈھونڈ کر' ایک ہاتھ سے زلیخا کا بازو پکڑ کر اسے اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے وہ بڑے کمرے میں لے آیا تھا۔
''ہاتھ پکڑ اس کے۔''
اس پر جیسے خون سوار تھا۔
''نہیں' خدا کا واسطہ ہے آپ کو' اسے چھوڑ دو بھا' اسے چھوڑ دو۔''
زلیخا بلک اٹھی تھی۔ شاہد حسین کا پارا مزید ہائی ہوگیا۔
''پکڑتی ہے ہاتھ کہ ساتھ مرنا ہے اس کے۔''
وہ جانتا تھا اس کے قرب و جوار میں کوئی گھر نہیں ہے' لہٰذا وہ جتنا بھی دہاڑ لے وہاں اسے اس کے ارادوں سے باز رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

زلیخا سرتاپیر کانپ اٹھی۔

"نہیں......آپ ایسا ظلم نہیں کر سکتے۔"

"ظلم نہیں ہے یہ بچاؤ ہے اپنا۔ اگر میں اسے نہیں ماروں گا تو یہ مجھے مار دے گا سمجھی تم......؟"

بلند آواز میں کہنے کے ساتھ' اس نے سوا' درد سے آہ بھرتے ادریس شاہ کی گردن میں گھونپ ڈالا۔ خون کی ایک دھار فوارے کی صورت پھوٹ کر اس کے اور زلیخا کے چہرے پر گری تھی۔ وہ چلایا تھا اور ادھر زلیخا کی چیخ نے کمرے کی دیواریں ہلادی تھیں۔

ادریس شاہ کو اپنا دفاع کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ سانول شاہ کا دوسرا چمچہ گاڑی چھوڑ کر شاہ حسین کے حکم پر واپس ڈیرے پر چلا گیا۔ لہٰذا وہاں نہ کوئی کسی کی چیخوں کو سننے والا تھا' نہ کسی کو ظلم سے روکنے والا۔

شاہ حسین اب جیسے جنون کی حالت میں نہایت بے رحمی سے ادریس کی گردن پر سُوے کے وار کر رہا تھا' زلیخا کی آنکھیں دہشت سے ابل پڑیں۔ اپنے ڈوپٹے کا گولہ بنا کر بمشکل اس نے اپنی چیخوں کا گلہ گھونٹا تھا۔

❁❁❁

انوشہ کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔

زاور اس سے بدظن ضرور ہو گیا تھا' مگر پھر بھی وہ اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ پنڈی سے اسلام آباد کے تمام سفر میں وہ یوں چپ تھی گویا بولنا ہی نہ جانتی ہو' نزہت بیگم' جمال صاحب' سب اس کی کال پر پہلے ہی پنڈی آ گئے تھے اور پورے ایک ہفتے وہی انوشہ کی دیکھ بھال کرتے رہے تھے۔

اب بھی نزہت بیگم اس کی کمر کے گرد بازو ڈالے' اسے اپنے ساتھ لگائے گاڑی میں بیٹھی تھی۔

یزدانی پیلس میں سائلہ بیگم نے ایک طوفان اٹھادیا تھا۔

"دیکھا میں ناں کہتی تھی یہ لڑکی چنڈال ہے' ماں پر گئی ہے' کھا لیئے ناں گل موقع سے فائدہ اٹھا کر باپ کی جان بھی لے لی منحوس ماری نے۔"

وہ اسپتال سے ان کے پاس نہیں آئی تھی مگر پھر بھی اس کے بارے میں خبر ملتے ہی انہوں نے اہر لعلانی شروع کر دی تھی۔ بُریرہ اور شافیہ کی نگاہیں ان کے الزامات پر جھکی ہوئی تھیں۔

"توبہ توبہ' ابھی نجانے اور کیا کیا سامنے آئے گا' دو بچے جنے منحوس ماری نے' دونوں ہی آوارہ بدکردار۔"

ان کا پسندیدہ مشغلہ ہی صدف بیگم اور ان کے بچوں کو گالیاں دینا تھا۔ شافیہ مزید برداشت نہ کر سکی تو چپکے سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی آئی' آج کتنے دن ہو گئے تھے اس نے زاور کو نہیں دیکھا تھا۔ جانے وہ کیسا تھا اور کس حال میں تھا۔ بہت سوچ کر اس روز اس نے کپکپاتی انگلیوں سے پھر اس کا سیل نمبر ٹرائی کیا تھا اور اس بار اس کی کال پک کر لی گئی تھی۔

❁❁❁

شجاع حسن سے الجھ کر تقریباً زبردستی وہ حفصہ بیگم سے ملنے آئی تھی۔ مگر گیٹ پر بڑا سا تالا لگا دیکھ کر اسے سخت مایوسی ہوئی کیونکہ اس وقت وہ خود بہت پریشان تھی۔ پڑوس والوں کا دروازہ بجانے

کے بعد جب سعیدہ باجی سے اس کی دعا سلام ہوئی تو اسے انہی کی معرفت حفصہ بیگم کے بارے میں یہ پتہ چلا کہ وہ کسی رحاب نامی لڑکی کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی ہیں۔ تب قدرے جلن کے ساتھ ساتھ اسے اطمینان بھی ہوا کہ وہ جہاں بھی تھیں محفوظ اور بخیریت تھیں تاہم اپنی اور دل کی بے بسی پر اسے بہت رونا آ رہا تھا۔

تقریباً پون گھنٹے تک قریبی پارک میں تنہا بیٹھ کر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد وہ گھر واپس آئی تو شجاع گڑیا کو گلے سے لگائے چپ کروانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے شاید اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

''السلام علیکم!''

وہ تھکن سے نڈھال اور غمزدہ تھی۔ تاہم پھر بھی اسے لان میں دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ کیونکہ اسے بہت تیز بخار تھا۔

''وعلیکم السلام۔''

اس کے خالی ہاتھوں کو بڑی توجہ سے دیکھتے ہوئے وہ گویا حیران ہوا تھا۔

امامہ اس کی نگاہوں کے سوال پر بے ساختہ نظریں چرا گئی۔

''وہ...... مم...... میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی' اس لئے مارکیٹ نہیں جا سکی۔''

''اٹس او کے' یہ گڑیا کو سنبھال لیں' مجھے ضروری کام سے آؤٹ آف سٹی جانا ہے۔''

''لیکن...... آپ کی طبیعت بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔''

اس نے ہمدردی میں نہیں کہا تھا مگر شجاع کو پھر عجیب لگا۔

''یو ڈونٹ وری' اپنا خیال رکھنا جانتا ہوں میں۔ آپ میری فکر مت کیا کریں۔''

سپاٹ لہجے میں کہتا وہ گڑیا کو اس کے سپرد کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

❋❋❋

رات گہری ہو رہی تھی اور دور کہیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ماحول میں عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

پرانی کھوئی اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی' مگر چاندنی رات میں کوئی بھی اگر کھیتوں میں پانی لگاتے ہوئے اسے دیکھ لیتا تو وہ مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ اسی لئے احتیاط کی ضرورت تھی اور وہ احتیاط کر رہا تھا۔

صبح ہونے سے پہلے پہلے اسے ادریس شاہ کی لاش کو ٹھکانے لگانا تھا اور اس طریقے سے ٹھکانے لگانا تھا کہ کسی کو اس کا سراغ تک نہ ملتا۔ اس کے لئے پرانی کھوئی کا انتخاب اس نے خوب سوچ کر کیا تھا۔ کیونکہ برسوں سے پانی نہ نکلنے کے سبب یہ کھوئی ویران ہو گئی تھی اور لوگوں سے زیادہ گاؤں کے بچوں نے اسے اینٹ' پتھروں سے بھر دیا تھا۔ یوں جو تھوڑا بہت پانی تھا وہ بھی دب گیا تھا' پھر یہ کھوئی آبادی اور کھیتوں سے تھوڑی ہٹ کر تھی اور سائے وغیرہ کے شک میں گاؤں کے لوگ شام کے بعد ادھر کا رخ ذرا کم ہی کرتے تھے۔

ہوا کا زور ایک دم سے بڑھا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہلکی ہلکی بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا

...پر وہ مزید جھنجلا گیا۔ اگلے ایک گھنٹے میں بڑی مشکل سے وہ ادریس شاہ کو گھسیٹ کر کھیتوں سے ...لا پایا تھا۔

"کون ہے وہاں......؟"

شاہد حسین کا ڈر پورا ہو گیا تھا۔ وہ لمبے لمبے سانس لیتا لاش کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"کون ہے......؟"

...ارچ کی روشنی میں اگلے ہی پل کوئی اس کے قریب چلا آیا تھا۔

"شاہد حسین۔"

"ہاں میں، طبیعت خراب ہو رہی تھی، اسی لئے گھر سے نکل آیا۔ تم اس وقت کیا کر رہے ہو ...یہاں؟"

...جھورے ماچھی کو اپنے مقابل دیکھ کر اس نے اپنا لہجہ بارعب بنایا تھا۔ جب کہ وہ وضاحت ...تے ہوئے بولا۔

"چھنو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اچانک پیٹ میں زور کا درد اٹھا ہے، اسی کے لئے ڈاکٹرنی کو ...لے جا رہا ہوں، اچھا فیر رب راکھا۔"

سانول شاہ کا خاص چمچہ ہونے کے باعث گاؤں کا کوئی بھی فرد اس کے زیادہ منہ لگنا پسند نہیں ...کرتا تھا، یہی وجہ تھی کہ جھورا ماچھی بھی جلد اپنی راہ پکڑ گیا تھا۔ شاہد حسین نے یہ بلا ٹل جانے پر لمبی ...سانس کھینچی تھی۔

❋❋❋

بُریرہ شاہ زر کی طرف سے مکمل اطمینان کے بعد سائرہ بیگم کے ساتھ "یزدانی پیلس" چلی گئی تھی ...اور اب وہ ایک مرتبہ پھر اپنے محل سے گھر میں تنہا تھا۔ دوبارہ انوشہ کے ہوش میں آنے کے بعد ...ہسپتال کا چکر لگانے کی اس میں ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔ جانے اب وہ کس حال میں تھی۔ عجیب بے ...بسی تھی کہ وہ کسی کو سچ بتا کر بہت سی نگاہوں سے گرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور خود اپنی نگاہوں میں ضمیر کی ...بوجھل کے ساتھ زندہ رہ کر سرخروئی بھی نصیب نہیں ہو رہی تھی اسے۔ وقت جیسے نہایت سست روی ...سے رینگ رہا تھا۔

راتوں کی نینداور دن کا قرار دونوں کھو چکا تھا وہ، پچھلے کئی دنوں سے اس نے تازہ شیو بھی نہیں کی ...تھی۔ مسلسل بے آرام رہنے کے باعث اس کی آنکھوں کے گرد حلقے بھی بن رہے تھے، صحت چند ہی ...دنوں میں اچھی خاصی متاثر ہو کر رہ گئی۔ مگر اسے اب بھی اپنی پروا نہیں تھی۔ بُریرہ کا دل صاف کرنے ...کے لئے جو جھوٹ اس نے بولا تھا، اب وہ جھوٹ اس کا دل مسل رہا تھا۔

بُریرہ سے اپنے تعلق پر بھی اب وہ پچھتا رہا تھا، کیونکہ انوشہ کے کومے سے باہر آ جانے کے بعد ...دل کی نگری کے تقاضے بدل گئے تھے۔

شافیہ یزدانی پیلس میں سائرہ بیگم کے پاس ہی تھی، مگر اس نے اب تک اس کا سامنا ...نہیں کیا تھا۔ جس کے ہمیشہ ناز اٹھائے، اسی بہن کو اب وہ اپنی زندگی میں آنے والے ہر طوفان کا ذمہ ...دار سمجھ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے ذکر پر پل میں غصے میں آ جاتا تھا۔

اس روز پورے ایک ہفتہ کے بعد وہ پھر پنڈی سے اسلام آباد آیا تھا۔ گو اسے بُریرہ کو واپس اپنے ساتھ پنڈی لانا تھا۔ مگر وہ یزدانی پیلس جانے سے پہلے' نزہت بیگم کے گھر کی طرف چلا آیا تھا۔ زاور اور جمال صاحب دونوں ہی اس وقت گھر پر نہیں تھے اور وہ یہ بات جانتا بھی تھا کہ اس وقت چونکہ آفس ٹائم تھا۔ لہٰذا ان دونوں کا گھر پر ہونا مشکل ہی تھا۔

اس کی دستک پر دروازہ خود نزہت بیگم نے ہی کھولا تھا۔ وہ شاید چاشت کی نماز سے فارغ ہوئی تھیں' کیونکہ ڈوپٹہ نماز کے اسٹائل میں ہی اچھی طرح لپیٹ کر اوڑھا گیا تھا۔

''اسلام علیکم!''

دھیمے سے مسکرا کر اس نے مہذب انداز میں سلام کیا تھا۔ جبکہ وہ اسے دیکھ کر تھوڑی حیران ہوئی تھیں۔

''وعلیکم السلام......آؤ۔''

اسے ساتھ لے کر وہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھی تھی۔

شاہ زر کو ان سے اپنا مدعا بیان کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

''وہ...... میں یزدانی پیلس آیا تھا۔ بُریرہ کو لینے' سوچا انوشہ کی خیریت معلوم کرتا جاؤں' اب کیسی طبیعت ہے ان کی......؟''

''بظاہر تو ٹھیک ہے مگر...... اس کا منہ دیکھتی ہوں تو کلیجے پر ہاتھ پڑتا ہے۔ نہ آنکھیں کھولتی ہے نہ کسی سے بات کرتی ہے' چپ ہی لگ گئی ہے' کئی کئی گھنٹے ایک ہی جگہ کو گھورتی نجانے کیا سوچتی رہتی ہے۔''

وہ اس سے زیادہ فری نہیں تھیں مگر جب سے زاور نے بتایا تھا کہ اسی نے انوشہ کو اسپتال میں داخل کروا کر اس کی دیکھ بھال کی تھی' تب سے ان کے دل میں جو میل سائلہ بیگم کے بھانجے بھانجی کے لئے تھا وہ تقریباً دھل گیا تھا۔ الٹا اب وہ اس کی احسان مند تھیں کہ اس نے ان کی بھانجی کی اتنی مدد کی۔

شاہ زر کے دل میں ان کے تفصیلی جواب پر جیسے پھر کوئی خنجر گڑھ گیا تھا۔ کچھ لمحوں تک وہ خود کچھ بھی بولنے کے لئے تیار نہیں کر سکا تھا۔

''میرے خیال میں ان کے دماغ پر کسی واقعے کا بہت گہرا اثر پڑا ہے' آپ کوشش کیجئے وہ کمرے سے نکل کر ذرا لوگوں سے ملیں جلیں' اندر باہر آئیں جائیں گی تو ذہن بٹے گا اور اس کی طبیعت پر اچھا اثر پڑے گا۔''

''ہاں بیٹے! میرا بھی یہی خیال ہے مگر وہ کچھ سنے تب ناں۔ اس نے تو ایک طرح سے خود کو مردہ تصور کر لیا ہے۔''

نزہت بیگم کے لہجے سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ اس کے لئے پریشان تھیں۔

شاہ زر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انہیں تسلی کیسے دے۔

''آپ حوصلہ مت ہاریئے آنٹی۔ اللہ نے چاہا تو جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا' میرے لائق اگر کوئی حکم ہو تو بلا جھجک آواز دیجئے گا' مجھے خوشی ہوگی۔''

"کیوں نہیں' بس دعا کرو وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے۔ جب تک وہ خود اپنی کہانی نہیں سنائے گی ہم کیسے اس کے ساتھ ظلم کرنے والے کا گریبان پکڑ سکتے ہیں۔ اللہ اس کا ظلم اس کے آگے لائے۔ میری تو یہی دعا ہے اپنے مولا سے۔"

آنچل پھیلا کر جونہی انہوں نے کہا' شاہ زر کے اندر بے چینی بکھر گئی۔

"جی ضرور' میں اب چلتا ہوں انشاء اللہ جیسے ہی دوبارہ اسلام آباد کا چکر لگا۔ میں آپ سے ملنے آؤں گا۔" کہتے ہی وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تو نزھت بیگم بول اٹھیں۔

"ارے ابھی بیٹھو' میں چائے لاتی ہوں' انوشہ کی وجہ سے ایسا دماغ خراب ہوا ہے کہ کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔"

"نہیں کوئی بات نہیں آنٹی' ابھی تو لیٹ ہو رہا ہوں پھر آجاؤں گا۔"

نزھت بیگم دروازے تک اسے چھوڑنے آئی تھیں اور جب تک وہ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے نہیں گیا تھا وہ دروازے پر ہی کھڑی رہی تھیں۔

❁❁❁

"ہیلو زاور۔"

"جی بول رہا ہوں' فرمایئے۔"

دوسری یا تیسری بیل پر کال ریسو کر کے بھاری لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔

شافیہ قدرے گھبرا گئی۔

"وہ......مم...... میں شافیہ بول رہی ہوں۔ سائلہ آنٹی کی بھانجی۔"

"جی آواز پہچانتا ہوں آپ کی فرمایئے۔"

اس کا انداز اجنبی ہی تھا۔ شافیہ کا دل دکھ کر رہ گیا۔

"زاور...... آپ مجھ سے اس لہجے میں بات کیوں کر رہے ہیں؟ دیکھیے۔ میں مانتی ہوں آپ کے ساتھ بہت برا ہوا ہے مگر...... اس میں میرا کیا قصور ہے؟ کمال انکل کو میں نے نہیں مارا' انوشہ کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ کیا اس کی ذمہ دار بھی میں ہوں۔"

وہ رو پڑی تھی۔

زاور نے تھکے تھکے سے انداز میں گہرا سانس بھر کر سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

"اتنا دکھی ہونے کی ضرورت نہیں ہے مس شافیہ! میرے پیچھے کیا ہوا' رب جانتا ہے مگر اتنا تو آپ بھی جانتی ہوں گی کہ آپ کے حوالے سے آپ کے اپنوں نے میرے گھر والوں کو کیسی کیسی گھٹیا باتیں نہیں سنائیں۔ آپ کو اغواء کر کے کہیں لے جانے تک کا گھٹیا الزام لگ گیا مجھ پر' میری بہن لاسٹ ٹائم آپ کے ساتھ پارلر سے نکلی تھی۔ اس کے بعد اس کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ کہاں گئی' کون لے گیا اسے' ابھی تک نہیں جان پایا میں۔"

وہ جانے کب سے بھرا بیٹھا تھا۔

شافیہ کے دکھ کی شدت میں اور اضافہ ہو گیا۔

"زاور خدا کی قسم یہ جھوٹ ہے۔ پارلر سے میں اکیلی فرار ہوئی تھی' وہ بھی صرف اس لئے کہ میں

آپ کے سوا اور کسی کے نام سے منسوب ہونا نہیں چاہتی تھی۔ سائلہ آنٹی نے میری مما سے خود ہی بات کر کے میرا اپنے بیٹے سے نکاح کا خفیہ پروگرام بنالیا تھا۔ مجھے علم ہوا تو میں عین ٹائم پر کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر وہاں سے بھاگ گئی۔ انوشہ تو اس وقت گھر پر تھی اسے تو آنٹی ساتھ لائی ہی نہیں تھیں ہوٹل میں۔"

بُریرہ کی زبانی ساری حقیقت جاننے کے باوجود وہ خود کو ہر بات سے لاعلم ظاہر کر رہی تھی۔

زاور پھر گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"دیکھو زاور! اگر تمہارے پاپا تم سے ہمیشہ کے لئے دور ہوئے ہیں تو میں نے بھی اپنی مما کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا ہے' اگر تمہارا دل تمہاری بہن کی وجہ سے دکھا تو میں نے بھی اپنے بھائی کی نفرت اور ناراضی کا درد سہا ہے پھر مجھ سے یہ بے رخی' یہ دوری کیوں......؟"

آنسو پونچھتے ہوئے اس نے پھر دہائی دی تھی۔

تبھی وہ پژمردہ لہجے میں بولا تھا۔

"تمہارا قصور تھا' اسی لئے تمہیں سزا ملی' مگر میں تو بے قصور تھا' پھر بھی اپنے دونوں سگے رشتوں کا دکھ اندر سے مار گیا مجھے۔"

"سوری زاور' اگر میری وجہ سے یہ سب ہوا تو واقعی میں تم سے بہت شرمندہ ہوں مگر میرا یقین کرو میں نے جو بھی کیا۔ صرف تمہارے لئے کیا کیونکہ میں...... میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔"

اجنبیت کی دیوار ڈھادی تھی' اس نے۔ زاور اس کے الفاظ پر تلخی سے مسکرا کر رہ گیا۔

"تمہاری معافی سے نہ تو میرے پاپا زندہ ہو کر واپس دنیا میں آجائیں گے نہ میری بہن اپنے ساتھ ہوئے حادثے کو بھلا سکتی ہے۔ لہٰذا تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ اب تم مجھے بھول جاؤ اور وہی کرو جو تمہاری سائلہ آنٹی کہتی ہیں۔ تمہارے بھائی کا احسان ہے مجھ پر کہ اس نے میری بہن کی زندگی بچائی اور اس کی دیکھ بھال کی۔ اس کا یہ احسان یاد رکھوں گا میں' مگر......"

"بس کرو زاور! خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔ بس کرو......"

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ رو پڑی تو زاور نے خاموشی سے لب بھینچ لیئے۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ زاور نے آج ہی اپنی بلاک سم دوبارہ قابل عمل کروائی تھی۔ وہ بہت تھکے تھکے سے انداز میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر آفس سے باہر آیا تھا۔

❁❁❁

امامہ کا دل ارسلان حیدر سے ملنے کو تڑپ رہا تھا مگر وہ بے بس تھی' اگر ہر رکاوٹ توڑ کر اس سے ملنے چلی جاتی تو اس کا سارا منصوبہ شجاع حسن کے سامنے آجاتا اور یوں اسے بچالینے کی رہی سہی امید بھی دم توڑ جاتی۔ آج کل وہ اتنی پریشان تھی کہ ساری دنیا کو تہ و بالا کر دینے کو دل چاہ رہا تھا' کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

شجاع اس روز گھر پر نہیں تھا اس کے والد قدرت اللہ صاحب بھی پچھلے دس پندرہ روز سے ملک

ادھر اپنے دوسرے بیٹے کے پاس علاج کی غرض سے چلے گئے تھے' میدان بالکل صاف تھا۔ امامہ نے شجاع کے گھر سے نکلتے ہی ننھی گڑیا کو بیڈ پر پٹخا اور خود اس کے اسٹڈی روم کی طرف بڑھ گئی۔ اسے یقین تو نہیں تھا کہ شجاع نے ارسلان حیدر کے کیس والی فائل اب بھی وہاں رکھی ہوگی مگر وہ ایک اور کوشش ضرور کرنا چاہتی تھی۔

ارسلان نے ٹھیک ہی کہا تھا وہ اس کے لئے۔ اتنے دنوں سے یہاں آ کر کچھ بھی نہیں کرسکی تھی۔ اب دل اس کے لئے دکھ رہا تھا اور آنکھیں اشک بار ہو رہی تھیں۔

''ایک بار وہ فائل میرے ہاتھ لگ جائے' پھر دیکھنا ارسلان اس ایس۔ پی کے بچے کی اینٹ سے اینٹ نہ بجائی میں نے تو دیکھنا۔''

بلند آواز میں بڑبڑاتے ہوئے اس نے اتفاق سے کھلے ہوئے اسٹڈی روم کا دروازہ دھکیلا اور شجاع کی ترتیب سے رکھی ہوئی ساری فائلز کو ہاتھ مار مار کر زمین بوس کر دیا۔ اس کا دماغ اس وقت بہت زیادہ گرم ہو رہا تھا۔

''تم میری زندگی ہو ارسلان! میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہاری گرد کو بھی نہیں چھو سکتا۔ تمہیں ہر تکلیف سے بچانے کے لئے امامہ اپنی جان سے گزر جائے گی۔ کیوں خود سے دور کر دیا ارسلان! کیوں اس گھٹیا آزمائش میں ڈال دیا تم نے مجھے۔''

روتے ہوئے وہ سامنے آئی ہر فائل گراتی جاتی تھی اور بڑبڑاتی جاتی تھی۔

شجاع حسن کی بیٹی شاید بیڈ سے گر پڑی تھی' تبھی بلک بلک کر رو رہی تھی' مگر اس نے مطلق پروانہ کی۔

''مر جاؤ منحوس لڑکی' ہر وقت ریں ریں سے بہتر ہے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ میری جان بھی چھوٹے تم جیسی بلا سے۔''

گڑیا کے رونے سے اس کا غصہ مزید بڑھ گیا تھا۔ تبھی صفائی والی ماسی نے اسٹڈی روم میں قدم رکھے۔

''امامہ بی بی! گڑیا بیڈ سے نیچے گر کے زخمی ہو گئی ہے' منہ سے خون بہہ رہا ہے۔''

''تو میں کیا کروں......؟''

اس کی بات پوری سنے بغیر وہ دہاڑی تھی۔

''روز کا معمول ہے اس کا' کبھی بیڈ' کبھی کرسی' کبھی صوفے سے گر کر زخمی ہو جانا۔ میں گورنس ہوں ماں نہیں ہوں اس کی کہ ہر وقت پیچھے پیچھے پھرتی رہوں۔ میری اپنی بھی مصروفیات ہیں اب جاؤ تم یہاں سے۔''

غصے میں سرخ ٹماٹر بنی وہ صفائی والی ماسی کو حیرانی سے گنگ کر گئی تھی۔

''ہونہہ' جسے دیکھو اس گھر میں ہدایتیں دیتا نظر آتا ہے میں جیسے یہاں آ کے سب کی غلام ہو گئی ہوں۔''

جتنی چڑچڑی اور غصیلی وہ یہاں آ کر ہو گئی تھی اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ نماز کی بھی پابندی جاتی رہی تھی۔

ملازمہ اپنا سامنہ لے کر کمرے سے نکل گئی۔

''پتہ نہیں اب کہاں ملے گی وہ فائل مجھے۔ارسلان تو بہت پریشان ہوگا' پتہ نہیں وہاں ڈھنگ کا کھانا اور آرام ملتا ہوگا اسے کہ نہیں۔''

ملازمہ کے کمرے سے نکلنے کے بعد اس کے اعصاب پر پھر ارسلان کی فکر سوار ہوگئی۔اس وقت اسے اپنے سوا اور کسی کا ہوش تھا بھی نہیں۔اگلے دو گھنٹے فائل کی تلاش میں حال سے بے حال ہوتے گزر گئے تھے وہ تھک کر کمرے سے نکلنا ہی چاہتی تھی کہ شجاع کی اچانک وہاں آمد نے اسے پھر بوکھلا دیا۔

''کیا ڈھونڈ رہی ہیں آپ یہاں......؟''

پہلا سوال ہی اس نے ایسا کیا تھا کہ امامہ کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔

شجاع حسن کی گہری نگاہیں اس کے تھکے ہوئے پسینہ پسینہ چہرے سے ہوتیں اب کمرے کے بکھرے ہوئے سامان اور فائلز پر تھیں۔

وہ چپ کی چپ کھڑی رہ گئی۔

''میں کیا پوچھ رہا ہوں جواب دو۔پچھلے تین گھنٹوں سے حال سے بے حال ہو کر کیا ڈھونڈا جا رہا ہے یہاں؟''

اس بار اس نے دو قدم آگے آ کر اس کا بازو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ لیا تھا۔

امامہ اتنی سخت گرفت پر ہلکی سی سسکاری بھر کر رہ گئی۔

''میرا بازو چھوڑیں۔''

''پہلے میرے سوال کا جواب دو' میرے اسٹڈی روم میں آنے کی اجازت کس نے دی تمہیں' وہاں میری بیٹی تکلیف سے تڑپ رہی تھی اور یہاں تم میرا کمرا ادھیڑنے میں لگی ہوئی تھیں کیوں......؟ کیا کھو گیا تمہارا یہاں ایسا جو تم نے یہ حال کر دیا ہے میرے روم کا۔''

امامہ اس لمحے ارسلان حیدر تو کیا خود اپنے آپ کو بھی بھول گئی۔کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ شخص ذرا سے شک کی بنیاد پر اسے بھی اسلان حیدر کے جرم میں شریک جان کر حراست میں لے لیتا۔فوری طور پر جان بچانے کا کوئی بہانہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔تبھی ایک ہاتھ سے چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''میں پاگل ہوگئی ہوں سر' کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔پلیز مجھے معاف کر دیں پلیز......''

''بند کرو یہ رونا دھونا؟ میں عورتوں کی اس فضول گیم میں کبھی نہیں آتا۔جب تک تم اپنی اس حرکت کی وضاحت نہیں دو گی' میری گرفت سے نہیں نکل سکتیں۔''

اس کے لہجے میں چٹانوں سی سختی تھی۔

امامہ کو اس بار اپنا بچنا بہت مشکل لگ رہا تھا وہ اپنی انگلیاں اسی طرح اس کے نرم بازو میں گاڑے اسے اسٹڈی روم سے کھینچ کر اپنے روم میں لے آیا تھا۔

''اب بولو......سب کچھ صاف صاف بتاؤ گی یا کروں اپنے پیشے والی تفتیش شروع۔''

شکل سے ہی اس کے عزائم خطرناک لگ رہے تھے۔

امامہ اندر تک کانپ کر رہ گئی۔

"مم...... میں یہ جاب چھوڑنا چاہتی ہوں اسی لئے یہ سب کیا تاکہ آپ مجھ پر برہم ہوں اور میں آ کر یہاں سے نکال دیں......؟"

"کیوں......؟"

اس کی بھوئیں تن گئی تھیں۔ جب کہ آنکھوں میں اب بھی غصہ تھا۔

امامہ نے لمحے میں بہانہ تیار کرتے ہوئے خاموشی سے نگاہیں جھکا لیں۔

"آئی ڈونٹ نو' میں نہیں جانتی کہ اچانک مجھے کیا ہو گیا ہے' مگر...... میں اب مزید یہاں رہنا نہیں چاہتی۔"

مرد جتنا بھی شاطر اور عقل مند کیوں نہ ہو' عورت کی چالوں سے کبھی جیت نہیں سکتا۔ وہ بھی اس کے الفاظ پر حیران رہ گیا تھا۔

"وھاٹ......؟"

"میں نے آپ کا کوئی نقصان نہیں کیا یہ دیکھئے' میرے ہاتھ خالی ہیں میں نے آپ کے گھر سے کچھ بھی نہیں چرایا۔"

"لہجے کو گلوگیر بنا کر اس بار اس نے نظریں اٹھائی تھیں وہ جانچتی نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"اس اچانک فیصلے کی وجہ بتانا پسند فرمائیں گی آپ......؟"

وہ جیسے ابھی تک اس کے "ڈرامے" پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

امامہ نے اپنی نگاہیں پھر جھکا لیں۔

"کوئی وجہ نہیں سر......بس اب میں خود کو اور آپ کو مزید اذیت دینا نہیں چاہتی۔"

"کیا مطلب...... آپ صاف صاف بات کیوں نہیں کرتیں؟"

وہ الجھا تھا۔ امامہ کو اس لمحے بے حد لطف آیا۔

"کیا کہوں صاف صاف......؟ اور کیسے کہوں کہ...... کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے' پاگل ہو گئی ہوں میں آپ کے لئے' گزرتے ہر دن کے ساتھ میری بڑھتی ہوئی خواہشات نے جینا دوبھر کر دیا ہے میرا۔" بھرائی آواز کے ساتھ وہ جیسے جذبات میں کہہ گئی تھی۔

شجاع حسن کے اعصاب کو اس کے الفاظ پر اچھا خاصا دھچکا لگا۔

"آئی ایم سوری سر...... میں جانتی ہوں میری اوقات کیا ہے' مجھے آپ کی ذات سے متعلق ایسی بات کبھی تو کیا سوچنی بھی نہیں چاہئے' مم...... مگر...... دل پر کسی کا پہرا تو نہیں لگتا ناں' مجھے آپ کے سوا کہیں کچھ نظر نہیں آتا' اسی لئے میں نے یہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے' پلیز مجھے میری جسارت کے لئے معاف کر دیجئے گا۔"

محبت وہ واحد ترپ کا پتا ہے جو کسی بھی کھیل میں آپ کو جیت سے ہمکنار کر سکتا ہے۔ محبت کا لالی پاپ دے کر کسی بھی سمجھ دار سے سمجھ دار انسان کو لوٹنا بعض اوقات دشوار نہیں رہتا۔ شجاع حسن بھی اس کے الفاظ پر اچھا خاصا ڈسٹرب ہو کر اٹھا تھا۔

''یہ کیا بکواس ہے' آپ صرف میری بیٹی کی گورنس ہیں اور بس۔''
اس کے چہرے پر ہی نہیں لہجے میں بھی اضطراب واضح تھا۔
امامہ دل ہی دل میں کھل کر ہنس دی۔
''ہاں...... میں نے کب اس سے انکار کیا ہے' مگر یہ دل۔''
''دل کو قابو میں رکھنا سیکھیے۔ میں راہ چلتی محبت کا قائل نہیں ہوں اور ویسے بھی لڑکیاں محبت کے معاملے میں ہمیشہ عقل سے کام لینے کی بجائے بے وقوفی کرتی ہیں۔ میں کم از کم آپ سے اس حماقت کی توقع نہیں کرتا۔''
اس کے ہاتھوں کی خوبصورت موٹی موٹی انگلیوں میں واضح لرزش تھی۔
امامہ بظاہر دھیمے سے مسکرا دی۔
''حماقت تو ہوگئی سر! اب تو سوائے کوچ کے دوسرا کوئی راستہ نہیں سامنے۔''
''اٹس او کے' میں دوسری گورنس کے لئے ایڈ دیتا ہوں' تب تک یہ جاب چھوڑ کر آپ کہیں نہیں جاسکتیں۔''
تیز لہجے میں کہنے کے ساتھ وہ اپنے ہی بیڈروم سے نکل کر لان کی طرف بڑھ گیا تھا پیچھے امامہ نے سر اٹھا کر کمرے کی چھت پر نگاہیں جماتے ہوئے کھل کر سانس لیا۔
''اب تم دیکھنا شجاع حسن' امامہ کیا کرتی ہے تمہارے ساتھ۔''
اس کے ذہن میں بہت سے خیال اور لبوں پر بڑی شریر مسکراہٹ تھی۔ باہر شجاع جیسے شدید ڈسٹرب ہو کر رہ گیا تھا۔

❋❋❋

دل کی خاموشی سے سانسوں کے ٹھہر جانے تک
یاد آئے گا مجھے شخص وہ مرجانے تک
اس نے الفت کے بھی پیمانے بنا رکھے تھے
میں نے چاہا تھا جسے حد سے گزر جانے تک

''انوشہ...... کچھ تو بتاؤ بیٹے! آخر کہاں گئی تھیں تم' کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟''
شام ڈھل رہی تھی اور نزہت بیگم مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر' حسب معمول انوشہ کے کمرے میں اس کے پاس چلی آئی تھیں۔ جو اس وقت بھی دنیا جہان سے بے نیاز' سر کو تکیے پر ٹکائے جانے خلاؤں میں کیا ڈھونڈ رہی تھی۔
پانچ ماہ ہو گئے تھے اس لڑکی کو زندگی سے روٹھے۔ اب جو ملی تھی تو جیسے زندہ نہیں تھی۔
''انوشہ......''
اسے گم صم پا کر انہوں نے پھر پکارا تھا' مگر جواب پھر ندارد۔
''اچھا یہ سوپ پی لو' انرجی کی بہت کمی ہو گئی ہے تمہارے اندر' دیکھو آنکھوں کے نیچے کیسے حلقے پڑ گئے ہیں' اپنا نہیں تو میرا ہی خیال کر لو بیٹی......''
نزہت بیگم کے لہجے میں آزردگی تھی۔

الوشہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی منہ کھول دیا مگر ابھی اس نے دو تین چمچ ہی لئے ہوں گے کہ ابکائی آئی اور اگلے ہی پل اس نے سب کچھ اپنے بستر کی سائیڈ میں اگل دیا۔

"یا اللہ خیر' پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے میری بچی کو' جو کھاتی ہے اگل دیتی ہے۔"

نزہت بیگم کی پریشانی پھر بڑھ گئی تھی۔

الوشہ کا چہرہ روز بروز زرد ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے کھائے پیئے بغیر چپ چاپ پڑی رہتی تھی۔ اب کچھ دنوں سے جو بھی کھاتی تھی اگل دیتی تھی' جس کی وجہ سے کمزوری بڑھ رہی تھی۔

زاور آفس سے آیا تو نزہت بیگم نے اسے بتا دیا۔

"زاور' الوشہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جو کھاتی ہے اگل دیتی ہے' کمزوری دیکھو' روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جو ہوا سو ہوا' مگر بچی کی دیکھ بھال تو ضروری ہے بیٹے۔ اگر فارغ ہو تو چلو ہم ابھی ڈاکٹر کو دکھا لاتے ہیں اسے' اب یوں مرنے کے لئے تو نہیں چھوڑ سکتے ناں۔"

"یہ کہاں مر رہی ہے امی۔ ابو کو مار دیا ہے اس نے اور مجھے بھی۔"

صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے اس کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔

نزہت بیگم سر جھکا کر رہ گئیں۔

"ایسا نہیں کہتے بیٹا! جس کی جیسے لکھی ہوتی ہے ویسے ہی آتی ہے' میں یا تم کون ہوتے ہیں کسی کو مارنے والے' سب مالک کے کھیل ہیں' اور پھر...... اس عمر میں اکثر بچوں سے بھول ہو ہی جاتی ہے' تم اس بیچاری کا حال تو دیکھو۔"

"سب اس کا اپنا کیا دھرا ہے امی' کسی دیہات میں ہوتی تو اب تک کاری کر دیا جاتا اسے' یہاں زندہ تو ہے۔"

"کیسے بھائی ہو زاور' دشمنوں کی باتوں میں آ کر اپنی سگی بہن کے لئے......"

"مر گئی ہے میری سگی بہن' خود اس کے ہاتھوں کا لکھا خط اپنی آنکھوں سے پڑھا ہے میں نے' کوئی ایسا دشمن نہیں ہے ہمارا' جو ہم سے انتقام کے لئے اسے کڈنیپ کرے گا۔ سب اس کا اپنا کیا دھرا ہے۔"

زاور کے لہجے میں غیر معمولی تلخی تھی۔ آج تو شافیہ نے یہ بات بھی عیاں کر دی تھی کہ وہ پارلر نہیں گھر سے فرار ہوئی تھی کیونکہ گھر میں وہ تنہا تھی۔ اس کے پاس موقع تھا' یقیناً جان بوجھ کر پیچھے رہ گئی ہو گی وہ' جتنا وہ اس معاملے پر سوچتا تھا اتنا اس کی شریانوں میں درد کی لہریں بھونچال اٹھاتی تھیں۔

نزہت بیگم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"چلو ٹھیک ہے' میں خود ہی لے جاتی ہوں اسے' میری تو بہن کی بیٹی ہے' میں تو یوں آنکھوں کے سامنے مرتے نہیں دیکھ سکتی اسے۔ تو بیٹھ گھر' میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔"

دکھ بھرے لہجے میں کہتیں وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ جب اس نے بے بسی سے اپنے بال نوچ لئے۔

"آپ چلیئے اسے لے کر...... میں ابھی آتا ہوں۔"

الوشہ کے منہ پر کپڑا تھا' مگر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

تقریباً آدھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ اسے اپنی جاننے والی ڈاکٹر رخسانہ کے کلینک پر لے آیا تھا۔ کیونکہ اسپتال میں خوار ہونے کا اس وقت اُس کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ ڈاکٹر رخسانہ نے نزہت بیگم سے مختصراس کا حال سننے کے بعد چیک اپ کیا تو سامنے نتیجہ پر گویا خود بھی گُنگ رہ گئیں۔

''زاور' مسٹر کی کہیں شادی کی ہے کہ نہیں؟''

''نہیں......''

وہ ان کے سوال پر نہ صرف حیران ہوا تھا بلکہ چونک بھی گیا تھا۔

کیا......؟ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

وہ الجھی تھیں' جب نزہت بیگم نے پوچھا۔

''کیا نہیں ہوسکتا؟''

ڈاکٹر رخسانہ نے ان کے استفسار پر ایک نظر زاور کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر نگاہ چراتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولیں۔

''پریگننٹ ہے۔''

''وھاٹ......''

زاور کو لگا جیسے کسی نے اس کے سر پر کوئی وزنی شے دے ماری ہو۔

❋❋❋

تھکا گیا ہے مسلسل سفر اداسی کا
اور اب بھی ہے میرے شانے پر سر اداسی کا
وہ کون کیمیا گر تھا کہ جو بکھیر گیا
میرے گلاب سے چہرے پہ زر اداسی کا
میں تجھ سے کیسے کہوں یار مہرباں میرے
کہ تو علاج نہیں میری ہر اداسی کا
یہ اب جو آگ کا دریا میرے وجود میں ہے
یہی تو پہلے پہل تھا شہر اداسی کا

شام ڈھل کر رات کی گہری تاریکی میں تبدیل ہورہی تھی۔ پورے گھر میں یوں سناٹا چھایا تھا جیسے کسی کی موت ہوگئی ہو۔ زاور ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر گم صم بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا جب نزہت بیگم پتھر کی مورت کی مانند' ساکت ہوئی انوشہ کو اس کے کمرے میں چھوڑنے کے بعد اس کے پاس آبیٹھیں جس کی آنکھوں سے اس لمحے جیسے لہو ٹپک رہا ہو۔

''زاور پتر! میں انوشہ کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ ایسی لڑکی......''

''امی پلیز......''

اس سے پہلے کہ نزہت بیگم انوشہ کے حق میں اس سے کوئی بات کرتیں' وہ بھنا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''بہت شرم محسوس ہورہی ہے مجھے یہ سوچ کر کہ یہ لڑکی میری بہن ہے۔ کیا کیا نہیں کہتی رہی وہ سائلہ نامی عورت اس بارے میں' لیکن میں نے ہمیشہ اسے غلط کہا۔ اس سے نفرت کرتا رہا۔ شاہ زر

لے اپنے ہاتھوں سے لکھا اس کا خط مجھے دکھایا مگر میں نے یقین نہیں کیا۔ ساری دنیا اس پر انگلیاں اٹھا رہی مگر میں اکیلا اس کی پارسائی کا دعویٰ کرتا رہا۔ یہ صلہ دیا اس نے میرے یقین کا' میرے بڑا بھائی ہونے کی اتنی بڑی سزا دی کہ گھر سے نکلوں تو سر بھی نہ اٹھا سکوں۔ کسی سے نظر بھی نہ ملا سکوں۔"

اس کے لہجے میں تلخی ہی نہیں' دکھ بھی تھا۔ نزہت بیگم نظر جھکا کر رہ گئیں۔

"بس کرو زاور! اور کتنا ذلیل کرو گے اسے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب یوں خون جلانے سے اس کی نیک نامی واپس تو نہیں آجائے گی۔"

"نہ آئے واپس۔ آپ جلد سے جلد کوئی لڑکا دیکھ کر اس کا فرض ادا کریں۔ میں مزید اپنے گھر میں اس کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔"

تلخی بیزار کن لہجے میں کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا جب کہ اندر اپنے کمرے میں یہ سب سنتی انوشہ پر گویا آسمان آ گرا۔

وہ بھائی جس کی بہن ہونے پر اسے فخر تھا۔ یہ کیسی ستم ظریفی تھی کہ اسی بھائی نے آج اسے سوکھے پتے سے بھی زیادہ حقیر کر دیا تھا۔ بستر سے کچھ ہی فاصلے پر جو ٹیبل سیٹ تھا' اس پر پھلوں کی ٹوکری کے ساتھ خاصی تیز دھار والی چھری دھری تھی۔ انوشہ نے ہاتھ بڑھا کر وہ چھری اٹھائی اور تلخی سے زیرلب مسکراتے ہوئے اپنی شفاف ہتھیلی پر چلا دی۔ جیسے ہی پہلا کٹ لگا اس نے ہلکی سی' سی کی آواز کے ساتھ اپنا نچلا لب کاٹ لیا مگر اس درد میں ایسی تسکین تھی کہ پھر ایک کے بعد ایک وہ اپنی ہتھیلی پر کئی کٹ لگاتی چلی گئی تھی اور عجیب سی تسکین کا ایک زہریلا احساس اس کے اندر تک سرایت کرتا چلا گیا تھا۔

❋❋❋

کل روز ہونے والی تیز بارش کی وجہ سے گاؤں کے کئی کچے مکان گر گئے تھے۔

انزلہ کی ابھی آنکھ کھلی تھی۔ باتھ سے فارغ ہو کر وہ ابھی ناشتے کی تیاری کر رہی تھی کہ چھنو اس سے ملنے آ گئی۔

"السلام علیکم' باجی!"

"وعلیکم السلام' کیسی ہو چھنو؟ تین چار روز ہو گئے تم لفٹ ہی نہیں دے رہیں۔"

دادی ماں گھر پر نہیں تھیں لہٰذا ابھی تک وہ بستر میں ہی تھی۔ چھنو اس کے شکوے پر کھل کر مسکرا دی۔

"کیا کروں باجی! موئے کام ہی جان نہیں چھوڑتے۔ ابھی کل رات پیٹ میں اتنا شدید درد اٹھا کہ آسمان کی کڑیوں کو ہاتھ لگ گئے۔ آپ اسکول کے ساتھ ساتھ اسپتال کیوں نہیں بنوا لیتیں یہاں؟"

اپنے موتیوں والے پراندے سے کھیلتے ہوئے اس نے بڑی معصومیت سے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ انزلہ کے لب دھیرے سے مسکرا اٹھے۔

"سوچوں گی اس بارے میں بھی۔ تم بس دعا کیا کرو۔"

''وہ تو میں کرتی ہوں' باجی!''

''چلو اچھی بات ہے۔ ادریس کا کچھ پتہ چلا کہ کہاں ہے؟''

''نہیں باجی! فیتے کو بخار ہے۔ وہ سنی دادا کے ڈیرے پر جا ہی نہیں رہا۔ میری تو ملاقات بھی نہیں ہوئی اس سے۔''

''ہوں...... میں ناشتہ کرلوں پھر بی اماں کی طرف چکر لگاتی ہوں۔''

چائے کا پانی چولہے پر چڑھاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ چھنو فوراً اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ دونوں گوری کے گھر کی طرف رواں دواں تھیں۔

''چھنو! تم سے ایک سوال پوچھوں؟''

گھر سے نکل کر کچھ فاصلے پر اچانک انزلہ نے چھنو سے کہا تھا' جب وہ بولی۔

''پوچھیں باجی! بھلا اجازت کی کیا ضرورت ہے؟''

''چھنو...... میران شاہ کو جانتی ہو؟''

''آہو جی' مائی میراں کا بیٹا ناں......؟''

اس کے لہجے کی اداسی کو محسوس کیے بغیر وہ جوش وخروش سے بولی تھی۔

''ہاں......''

''اس کے بارے میں کیا پوچھنا ہے؟''

''اس کی موت کیسے ہوئی تھی' چھنو......؟''

بڑی روانی میں اس نے پوچھا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

''لوجی' یہ تو گاؤں کے بچے بچے کو پتہ ہے کہ اس کی موت کیسے ہوئی تھی؟''

''مگر مجھے نہیں پتہ۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ چھنو چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''آپ رو رہی ہو' باجی......؟''

''نہیں...... مگر وہ میرا بہت اچھا دوست تھا......''

''آپ کا تو دوست تھا مگر اس کے لیے تو سارا گاؤں روتا ہے' باجی! ہیرو تھا اس گاؤں کا وہ اور یہ جو سنی دادا ہے نا' اس کا ہاتھ ہے اس کی موت میں۔''

''ہاتھ نہیں ہے اس کا۔ خود اپنے ہاتھوں سے مارا ہے اس نے اسے۔''

وہ درشتگی سے چھنو کی بات کاٹ کر بولی تھی۔

''بہر حال' کیسے مارا تھا اس کمینے نے اسے......؟'' اگلے ہی پل خود کو سنبھال کر وہ بولی تھی' جب چھنو نے بتایا۔

''کاروکاری میں پھنسایا گیا تھا اسے مگر وہ ان ظالموں کے ہاتھ نہیں آیا اور شہر چلا گیا۔ وہاں سنا ہے اس پر کوئی جھوٹا مقدمہ بنا کر اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا تھا جنہوں نے پولیس مقابلے میں مار ڈالا اسے اور سنی دادا سے کئی مربع زمین ہتھیانے کے ساتھ ساتھ حکومت سے بھی وردی پر ایک دو پھول لگوا لیئے۔''

...کے لہجے میں بھی تلخی تھی۔
انزلہ سر جھکا کر اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔
"...ہے انزلہ باجی! چوہدریوں نے ایک اور ظلم کیا کیا؟"
اچانک یاد آنے پر چھنو بولی تو انزلہ بھیگی پلکوں سے اسے دیکھنے لگی۔
"کیا......؟"
"میران کے ساتھ جس لڑکی کو کاری کیا تھا وہ خود ان کی اپنی بیٹی تھی۔ سنی دادا کی سوتیلی بہن۔"
"واٹ......؟"
"ہاں باجی! یہاں اس گاؤں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ زمین جائیداد کا جھگڑا ہو یا کوئی آپسی دشمنی یہاں کے بااثر مرد ایسا ہی کرتے ہیں۔ گھر بیٹھی اپنی شریف' پاک باز' بہن' بیٹی' ماں' بھابی' کسی کو بھی بے قصور گناہ گار ٹھہرا کر گولی مار دیتے ہیں اور بعد میں غیرت کا مسئلہ بنا کر قانون کی گرفت سے بھی بچ جاتے ہیں۔ کوئی پوچھنے والا ہوتا ہے نہ حساب لینے والا۔"
وہ گاؤں کی ان پڑھ لڑکی ضرور تھی مگر گہری فکر رکھتی تھی۔
انزلہ افسوس سے گہری سانس بھر کر رہ گئی۔
"یہ اس گاؤں کا ہی نہیں' پاکستان کے بہت سے ایسے علاقوں کا المیہ ہے چھنو' جہاں تعلیم کی کمی ہے۔ گھر کے بیٹے آپس کی دشمنی میں اپنے کسی نہ کسی حریف کو قتل کر کے خود سزا سے بچنے کے لیے گھر کی عورت کو قتل کر کے کاروکاری کا کیس بنا دیتے ہیں۔ کوئی حل نہیں ہے اس مسئلے کا۔"
"حل تو ہے ناں' باجی! آپ جو اسکول بنا رہی ہیں اس میں جب گاؤں کے بچے پڑھیں گے۔ اچھی باتیں سیکھیں گے تو ان کی سوچ بھی اچھی ہو جائے گی۔ پھر وہ جاہلوں والے کام نہیں کریں گے۔"
چھنو کی بات صد فیصد سچ تھی۔
انزلہ نے کچھ سوچتے ہوئے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

❋❋❋

"مما......"
وہ گڑیا کا فیڈر بنا رہی تھی جب اچانک اس کے لبوں سے نکلے اس لفظ پر چونک کر پیچھے پلٹی۔
لاؤنج میں ٹی وی چل رہا تھا اور گڑیا اس کے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ وہ سر جھٹک کر اپنے کام میں پھر سے مگن ہو گئی۔ مگر اچانک ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا اور اس نے پھر سے پیچھے پلٹ کر ٹی وی کی جانب دیکھتی گڑیا کی طرف نگاہ کی۔
"مما......"
وہ بار بار ٹی وی اسکرین کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے پکار رہی تھی۔ امامہ فیڈر میں شوگر مکس کرتے ہوئے اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ ٹی وی پر کوئی میوزیکل شو چل رہا تھا اور اس میں دو تین اچھی شکل وصورت والی لڑکیاں اپنی اپنی پرفارمنس کا مظاہرہ کرتی تھرک رہی تھیں۔ وہ ٹی وی اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر بچی کو دیکھنے لگی۔
'لو...... میں تو بھول ہی گئی تھی کہ شجاع حسن کی جان اس ننھی بچی میں ہے۔ اسے مہرہ بنا کر تو

میں اس سے ہر کام نکلوا سکتی ہوں۔"
ہوشیاری سے سوچتے ہوئے اس نے بچی کو اٹھا کر چوم لیا تھا۔
اسی پل اس کے سیل پر بپ ہوئی تو وہ اسکرین پر ارسلان حیدر کا نام دیکھ کر چونک گئی۔ اس کا سیل صوفے پر پڑا چمک رہا تھا۔ تبھی گڑیا کو پھر سے صوفے پر پٹختے ہوئے اس نے فوراً سیل اٹھا کر کال پک کر لی۔
"ہیلو......!"
"ہاں کیسی ہو مون......؟"
تھکے تھکے سے لہجے میں بنا سلام دعا کیے وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔
"ٹھیک ہوں تم کیسے ہو؟ کیا جیل سے بات کر رہے ہو؟"
"تم تو یہی چاہتی ہو کہ مجھے جیل ہو جائے اور میں پھانسی لگ جاؤں۔"
"کیا مطلب...... اگر میں ایسا چاہتی تو یہاں مصیبت میں نہ پھنسی ہوتی۔"
"مجھے تمہارے مصیبت میں پھنسنے سے کوئی سروکار نہیں۔ میں نے صرف یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا کہ میں رحاب کے پاپا کی مدد سے یہاں یورپ آ گیا ہوں۔ فی الحال وہ ایس پی کا بچہ میری دھول کو بھی نہیں پا سکتا۔ ابھی کل مما اور رحاب بھی یہیں پہنچ گئی ہیں۔"
"کیا......؟"
"ہاں...... مما کے اصرار پر تمہیں فون کر رہا ہوں وگرنہ تم نے میرے ساتھ جو کیا ہے اسے میں کبھی بھول نہیں سکتا۔"
کتنی اجنبیت اور بیگانگی تھی اس کے لہجے میں۔ امامہ کے دل میں جیسے سن سے کوئی تیر پیوست ہو گیا۔ اس کی کال ڈراپ ہو چکی تھی مگر وہ عجیب ساکت سے انداز میں صوفے پر ٹک گئی۔
یہ صلہ تھا اس شخص کے نزدیک اس کی بے لوث محبت کا وفا کا......؟
کتنی بے دردی سے وہ اس کے پرخلوص جذبوں پر طمانچہ مار کر اپنی الگ دنیا بسا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نہ چاہنے کے باوجود پانیوں سے بھر گئیں اور اگلے ہی پل وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔
گڑیا اب اسے حیرانی سے روتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔
تبھی لاؤنج میں کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری تھی۔
"مس امامہ......"
وہ جس سے دل کا درد برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا اس پکار پر فوراً سر اٹھایا۔ شجاع نے دیکھا اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔
"خیریت...... ایسے کیوں رو رہی ہیں......؟"
وہ جانے کب آیا تھا اور کب لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔
امامہ نے فوراً اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔
"بس یونہی...... آ...... آپ کب آئے؟"

"ابھی آیا ہوں۔ کوئی مسئلہ ہے تو آپ بلا جھجک مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔"

"نن...... نہیں تو...... میں چائے لاتی ہوں آپ کے لیے۔"

اچانک بوکھلاہٹ میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ بچی کی آیا ہے' اس کی ملازمہ نہیں۔ شجاع اس کی حالت پر دل ہی دل میں قیاس لگاتا' اپنی بچی کو گود میں لے کر اسی صوفے پر بیٹھ گیا جہاں ابھی لمحے قبل امامہ بیٹھی رو رہی تھی۔

اگلے پانچ منٹ میں وہ اس کے لیے گرما گرم چائے کا کپ ٹرے میں رکھ کر لے آئی تھی۔ شجاع نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے شکریہ کے ساتھ کپ ٹرے سے اٹھالیا۔ جیسے ہی اس نے کپ اٹھایا' امامہ نے گڑیا کو اس کی گود سے لے لیا۔

"سر...... وہ...... مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔"

وہ کھڑی تھی اور اس کی بھیگی پلکیں لرز رہی تھیں۔

شجاع نے چائے کا ایک ہی گھونٹ بھر کر نگاہ اس کے چہرے پر جما دی۔

"جی کہیے۔"

"وہ...... وہ...... مجھے آپ سے یہ کہنا تھا کہ میں...... میں یہ جاب چھوڑ رہی ہوں۔"

"کیوں......؟"

اسے اچھی خاصی حیرانی ہوئی تھی۔

امامہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اسے جاب چھوڑنے کی کیا وجہ بتائے۔ اصل بات تو وہ کسی صورت اسے نہیں بتا سکتی تھی۔ تبھی سر مزید جھکاتے ہوئے بولی۔

"مم...... میرا خیال ہے آپ کی بچی کے معاملے میں' میں اپنی ذمہ داری اچھے طریقے سے نہیں نبھا سکتی۔"

"یہ تو ہے۔ مگر فی الحال میں اتنا مصروف ہوں کہ نئی آیا کو اپائنٹ کرنے کے جھنجٹ میں نہیں پڑ سکتا۔ آپ محض کچھ روز مزید یہاں ٹھہر جائیں۔ جیسے ہی کسی اچھی لیڈی کا انتظام ہو گیا آپ بخوشی یہاں سے رخصت ہو جائیے گا۔"

بے مروتی کی انتہا کو چھوتے ہوئے اس نے جھوٹے منہ بھی اس کی ہمدردی کرنا گوارا نہیں کیا تھا۔ امامہ محض تلخی سے مسکرا کر ایک نگاہ اس پر ڈالتی چپ چاپ اثبات میں سر ہلا گئی۔

❊❊❊

میرے اشکوں کو پلکوں پر مچلنا بھی نہیں آتا
حصار ضبط سے مجھ کو نکلنا بھی نہیں آتا
گئے ہو ایسی راہوں پر اکیلا چھوڑ کر مجھ کو
کہ جن پر ٹھیک سے مجھ کو تو چلنا بھی نہیں آتا
مجھے لگتا ہے جیسے میں کوئی وہ غم کا سورج ہوں
کہ جس کو شام ہو جانے پر ڈھلنا بھی نہیں آتا
ہماری بے رخی اک دن انہیں بے چین کر دے گی

جنہیں نظروں سے گر کے پھر سنبھلنا بھی نہیں آتا
نہ رہتے منتظر تیرے تو پھر ہم اور کیا کرتے
ہمیں تیری طرح رستہ بدلنا بھی نہیں آتا

''توبہ' توبہ۔ ایسی بے حیا لڑکی میں نے تو کہیں دیکھی نہ سنی۔ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر گھر سے فرار ہوگئی اور اب واپس ملی تو اس حال میں کہ......! اللہ معاف کرے۔ میں اسی لیے کہتی تھی کہ چنڈال لڑکی ہے۔ مجھے اپنے گھر میں نہیں رکھنی۔ اب آ گیا ناں سب کے سامنے اصلی چہرہ......تب سب مجھ پر چڑھ رہے تھے کہ سوتیلی ماں ہوں' بے چاری بچی پر ظلم کر رہی ہوں۔ دیکھ لیے کرتوت بے چاری بچی کے......!''

سائلہ بیگم کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو موت کو بھلائے' دوسروں کے دل میں آگ لگا کر خود تسکین حاصل کرتے ہیں۔ اس وقت بھی انوشہ کے موضوع پر یزدانی پیلس میں گول میز کانفرنس ہو رہی تھی اور سائلہ بیگم اس کی صدارت کر رہی تھیں۔

اس روز بھائی بڑا اکڑ رہا تھا۔ اب کیا منہ لے کر گھر سے نکلے گا۔ چنڈال میرے میاں کی زندگی کو بھی نگل گئی۔ جیسی منحوس ماں' ویسی منحوس بیٹی۔''

دل کا غبار نکالنے کا بہت اچھا موقع میسر آ گیا تھا انہیں۔ وہاں موجود باقی سب افراد کے سر جھکے ہوئے تھے۔ بریرہ جو ابھی کل رات ہی شاہ زر کے ساتھ دوبارہ یہاں پہنچی تھی۔ کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جواب میں شاہ زر' مزید برداشت نہ کرتے ہوئے اس سے نظریں چرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں ذرا مارکیٹ سے ہو کر آتا ہوں۔ تم تیاری رکھنا' شام میں واپس چلیں گے۔''

شافیہ اس کے قریب بیٹھی تھی مگر اس نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس وقت اسے اپنے سینے میں بہت زیادہ گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ کیسی بے بسی تھی کہ وہ جس تکلیف کے حصار سے باہر نکلنا چاہ رہا تھا۔ وہی تکلیف اس کی روح کے گرد اپنا دائرہ روز بروز تنگ کرتی جا رہی تھی۔

دو چار گھنٹے یونہی بے مقصد سڑکیں ناپنے کے بعد اس سے رہا نہ گیا تو بے اختیار گاڑی نزہت بیگم کے گھر کی جانب موڑ لی۔ وہ دوپہر کے کھانے کے برتن دھو رہی تھیں۔ شاہ زر کی دستک کے جواب میں دروازہ کھولا تو سامنے اسے دیکھ کر شرمندہ سی ہو گئیں۔

''السلام علیکم' آنٹی۔'' شاہ زر نے ان کا چہرہ دیکھ کر بشاشت سے سلام کیا تھا۔ جواب میں ان کا سر جھک گیا۔

''وعلیکم السلام' آؤ......''

''زاور ہے گھر پر کہ نہیں......؟''

دہلیز پار کرتے ہوئے اس نے یونہی پوچھ لیا تھا۔ جب وہ بولیں۔

''ابھی چائے پی کر کہیں نکلا ہے۔ تم سناؤ' کیسے آنا ہوا؟''

''بس یونہی۔ آپ سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا تو چلا آیا۔ انوشہ کیسی ہے اب؟''

نزہت بیگم اس کے سوال پر کچھ لمحوں کے لیے چپ سی ہو گئی تھیں۔

"اس کرموں جلی کو کیسا ہونا ہے بیٹے' جب سے پیدا ہوئی ہے تب سے ایک کے بعد ایک مصیبت کے پیچھے پڑھ رہی ہے۔ اب تو مانو زندہ ہی نہیں ہے۔ سارے سارے دن نیند کی گولیاں کھا کر بے ہوش پڑی رہتی ہے۔ میں پاس جاتی ہوں تو پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگتی ہے۔ کبھی بال اٹھا اٹھا کر پٹختی ہے تو کبھی زور زور سے چلا کر بچوں کی طرح رونا شروع کر دیتی ہے۔ جگہ جگہ سے اپنا آپ زخمی بھی کر رکھا ہے اس نے۔ سچ مانو' اس کا حال دیکھ کر میرا تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔"

نزہت بیگم کے لیے وہ بہت اچھا غم خوار تھا لہٰذا اس کے سامنے دل ہلکا کرنے بیٹھ جاتیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی بھانجی کے ساتھ ظلم کرنے والا گناہ گار شخص وہی ہے۔

"اللہ سب بہتر کرنے والا ہے' آنٹی۔ آپ ٹینشن مت لیا کریں۔ کیا میں انوشہ سے مل سکتا ہوں؟" ڈرتے ڈرتے دل کی بات زبان پر لے ہی آیا تھا۔

نزہت بیگم گہری سانس بھر کر رہ گئیں۔

"کیا کرو گے مل کر۔ وہ تو اب کسی کو پہچاننے سے ہی انکاری ہے۔ زاور نے بہت برا بھلا کہا ہے۔ اسی بات کو دل سے لگا کر بیٹھ گئی ہے۔"

"میں...... میں مل کر آتا ہوں اس سے۔"

از حد مضطرب ہو کر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

نزہت بیگم بھی مجبوراً اٹھ کر اس کے پیچھے ہی چلی آئیں۔

وہ کمرے کا دروازہ بند کیے اپنے بیڈ پر گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔ جونہی دروازہ وا ہوا اس نے فوراً سر اٹھا کر دیکھا اور پھر شاہ زر کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ گویا پھر سے برف میں لگ گئی۔ کتنی دیر وہ بنا پلک جھپکائے اسے دیکھتی رہی۔ پھر بیڈ سے اتر کر چیل کی طرح جھپٹتے ہوئے اس پر حملہ آور ہوئی۔

"ذلیل' گھٹیا انسان' تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہاں آنے کی۔ تماشا دیکھنے آئے ہو میرا' مذاق اڑانے آئے ہو میری بے بسی کا۔ بولو...... کیا لینے آئے ہو تم یہاں۔"

پاگل لہجے میں چلاتے ہوئے اس نے شاہ زر کی شرٹ کے سارے بٹن توڑ ڈالے تھے۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ شرٹ اگر کسی سوتی کپڑے کی بنی ہوتی تو وہ اس کا بھی حشر نشر کر کے رکھ دیتی۔ نزہت بیگم اس کا جنون دیکھ کر آگے بڑھی تھیں۔ مگر شاہ زر نے انہیں نرمی سے پیچھے ہٹا دیا۔

"میں بات کرتا ہوں' آنٹی' آپ فکر نہ کریں۔ مجھے کچھ نہیں ہوتا۔"

ایک لمحے کے لیے نزہت بیگم کے سامنے انوشہ کے الفاظ پر اس کے چہرے کا رنگ اڑا تھا مگر اگلے ہی پل اس نے خود کو سنبھال لیا۔ نزہت بیگم کچھ نہ سمجھتے ہوئے بڑے بڑے متفکر انداز میں پیچھے ہٹی تھیں۔

"میں تھوکتی ہوں تم پر' دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

اب وہ اس کا چہرہ نوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بے خبری میں کچھ خراشیں پڑ بھی گئی تھیں اس کے چہرے پر تاہم فوراً ہی اس نے انوشہ کے دونوں بازو اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیے۔

"ہوش میں آؤ انوشہ۔ کیوں اپنی وجہ سے سب کو پریشان کر رہی ہو تم۔"

نزہت بیگم اگر پاس نہ ہوتیں تو وہ کھل کر اس سے اپنے کیے کی معافی مانگتا۔ اسے اپنے اندر کا حال بتاتا مگران کے سامنے یہ ممکن نہیں تھا۔ سب کی نظروں میں خود کو پارسا رکھنے کے لیے اسے چپ کا روزہ رکھنا تھا۔ چمکتی دھوپ میں مجبوراً انوشہ کو اکیلے جلتے ہوئے دیکھنا تھا۔

وہ اس کے بازو پکڑنے پر پھر مچلی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔ جان سے ماردوں گی میں تمہیں۔ تمہاری بوٹیاں نوچ کر چیل کوؤں کو کھلادوں گی میں۔"

نفرت میں وہ آپے سے باہر ہورہی تھی۔ جب شاہ زر نے خاموش کروانے کے لیے پوری طاقت سے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے بیڈ پر گری تھی۔

"یہ پاگل ہوگئی ہے' آنٹی۔ پتہ نہیں مجھ سے کس بات کی دشمنی نکال رہی ہے۔ بہرحال میں چلتا ہوں اب۔ زاور گھر آئے تو میرا اسلام کہیئے گا۔"

تیزی سے کہنے کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل کر بیرونی دروازہ بھی پار کر گیا تو نزہت بیگم ملامتی نگاہوں سے بیڈ پر اوندھے منہ پڑی انوشہ رحمٰن کی طرف دیکھتے ہوئے خود بھی کمرے سے نکل گئیں۔ باہر اپنی گاڑی میں بیٹھے شاہ زر کے ہاتھ بری طرح کپکپارہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں جیسے ریت بھر آئی تھی۔

"آئی ایم سوری انوشہ...... آئی ایم رئیلی ویری سوری......"

نم آنکھوں کو آہستگی سے موندتے ہوئے اس نے اپنا سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا کر جیسے خود سے معافی مانگی تھی۔

❁❁❁

شب دھیرے دھیرے آگے سرک رہی تھی اور وہ فضا میں اچھی خاصی ٹھنڈ کے باوجود گرم شال سے بے نیاز لان سے ملحقہ سیڑھیوں پر بیٹھی ارسلان حیدر کو سوچ رہی تھی۔

پچھلے تین روز سے جیسے اس کے اندر کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔

کیا کیا پلان نہیں بنائے تھے اس نے محبت کے امتحان میں سرخرو ہونے کے لیے۔ مگر کیا ہوا تھا؟ اپنے تمام ارادوں' تمام کوششوں کے باوجود وہ منہ کے بل آ گری تھی۔ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے تھے۔

پچھلی رات سے گڑیا کی طبیعت خراب تھی۔ اسے شاید امامہ کی بے پروائی کے باعث ہی ٹھنڈ لگ گئی تھی اور اب شجاع کا حال دیکھنے والا تھا۔ پچھلی پوری رات اس نے ایک پاؤں پر کاٹی تھی۔ امامہ اس کی پریشانی کے خیال سے ہی لان سے اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف چلی آئی تھی۔ جہاں وہ اپنے موبائل پر اپنی بڑی بہن سے گفتگو میں مصروف تھا۔

"جی آپا...... اب قدرے بہتر ہے۔ میں خود خیال رکھ رہا ہوں گڑیا کا۔"

"جی بہتر...... اللہ حافظ......"

امامہ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے فوراً گفتگو سمیٹی اور ناگواری سے ماتھے پر بل ڈال دیئے۔

"سر! اب بے بی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے الحمدللہ زندہ ہے۔ آپ نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی اسے مارنے کی۔"
لفظ کیا تھے گویا آگ میں دہکتے انگارے تھے۔
وہ محض اذیت سے لب کاٹ کر رہ گئی۔
بخار کی شدت کے باعث پھول سی بچی کا چہرہ خوب سرخ ہو رہا تھا۔
امامہ اپنی صفائی میں ایک بھی لفظ کہے بغیر نادم سی چپ چاپ واپس چلی آئی۔ ایک عجیب سی بےقراری نے جیسے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر رکھا تھا۔ شجاع کے کمرے کی لائٹ پوری رات جلتی رہی تھی اور ادھر امامہ نے بھی اس رات کا ایک ایک پل آنکھوں میں ہی کاٹا تھا۔ صبح کی اذان ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے اس کی آنکھ لگی تھی اور اس نے خواب میں دیکھا تھا جیسے گڑیا زور و شور سے رو رہی ہے۔ ماں ماں کہتے ہوئے اس کا حلق خشک ہو رہا ہے۔ ایسے میں وہ انتہائی سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اٹھا کر کسی اندھے کنویں میں پھینک دیتی ہے مگر اس کے باوجود اس کے رونے کی آواز اسے چین لینے نہیں دیتی۔
وہ ہڑبڑا کر اٹھی تو پسینے سے شرابور تھی۔
دل کی دھڑکن کی رفتار معمول سے کہیں بڑھ کر تیز تھی۔ جب کہ باہر اچھا خاصا دن نکل آیا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ بیڈ پر بیٹھی اپنے حواس نارمل کرتی رہی تھی۔ گڑیا کی طبیعت کی خرابی کے باعث شجاع آج بھی گھر پر ہی تھا۔ وہ بمشکل اپنے قدموں کی لغزش پر قابو پاتی اس کے کمرے میں داخل ہوئی تو شجاع کو کمرے سے غائب پایا۔
نظر سے کچھ ہی فاصلے پر گڑیا نرم کمبل میں لپٹی بےخبر سو رہی تھی۔ وہ مرے مرے سے بے جان قدم اٹھاتی اسی کی طرف بڑھ گئی۔
"آئی ایم سوری گڑیا' آئی ایم رئیلی ویری سوری......"
"ابھی کچھ دیر پہلے دیکھے گئے خواب کا منظر یاد کر کے اس کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔
کتنی گر گئی تھی وہ انسانیت کے درجے سے۔ محض اپنی ذاتی غرض کے لیے۔ ایک ایسے شخص کی محبت کے لیے جسے اس کا ہونا ہی نہیں تھا۔
کیسے کیسے گناہ سرزد نہیں ہوئے تھے اس سے' ان گزرے چند دنوں میں۔ محض ایک انسان کی محبت میں اس نے اپنے پیدا کرنے والے خدا کی محبت کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔
شجاع واش روم سے نکلا تو وہ بچی پر جھکی اسے پیار کر رہی تھی۔
وہ اپنی جگہ جیسے ٹھٹک کر رک گیا۔
نظر کے سامنے دکھائی دینے والا منظر کس قدر ناقابل یقین تھا۔ چند منٹ بہت خاموشی سے آگے سرک گئے تھے۔ جب وہ قدرے برہمی سے بولا تھا۔
"آج کے لیے اتنا ڈرامہ کافی ہے' مس امامہ...... میں نے تسلیم کر لیا ہے کہ آپ بہت بڑی ایکٹر ہیں۔ اب مزید کیا چاہتی ہیں آپ؟"
وہ اس کے الفاظ پر چونکی تھی اور چونک کر پلٹی تھی۔

''سوری......''

''شٹ اپ......''

اس کی سوری پر بھی اس نے نخوت سے شٹ اپ کہہ کر اس کے پہلے سے زخمی دل کو مزید دکھ کر دیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر چپ چاپ سر جھکا کر اس کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

❋❋❋

ادریس شاہ کی لاش ٹھکانے لگانے کے بعد وہ گھر واپس لوٹا تو اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔ اندر کمرے میں زلیخا فرش پر بیٹھی جیسے خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ وہ ایک پل کو اس سے نظر چراتا دوبارہ صحن میں آ کر بیٹھ گیا۔

''زلیخا! پانی دے اٹھ کر۔ ایسا کوئی نہیں مرا تیرا جو یوں سودائی ہو کر بیٹھ گئی ہے۔''

جب کسی انسان کے سر میں شیطان سا جاتا ہے تو پھر اسے اپنا کوئی بھی بد عمل غلط نہیں لگتا۔ وہ خود کو درست سمجھ رہا تھا۔

اندر زلیخا نے جیسے اس کا حکم سنا ہی نہیں۔

''اس کا بھی کچھ سوچنا پڑے گا اب...... صبح ہی سنی دادا سے بات کرتا ہوں۔''

آہستہ سے بڑبڑا کر وہ پھر اپنی چار پائی سے اٹھا اور بیرونی دروازہ کھول کر ادریس کے گھر جانے والی کچی سڑک پر گامزن ہو گیا۔ پو پھٹنے میں بس ابھی کچھ ہی دیر تھی۔ گوری رات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکی تھی۔ جان سے پیارے بھائی کی اچانک گمشدگی پر اس کے اندر جیسے ہول اٹھ رہے تھے۔ وہ کل سے رو رہی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھوں کے پپوٹے خوب سوج گئے تھے۔ اس وقت بھی وہ بستر چھوڑ کر ڈھور ڈنگروں کے ساتھ مصروف ہو گئی تھی۔ احاطے میں خوب گند مچا تھا۔ اس نے بجھے دل کے ساتھ پہلے اچھی طرح صفائی کی۔ پھر کل کے رکھے چارے کا کچھ حصہ دودھ دینے والی دونوں بھینسوں کے آگے ڈال کر رسوئی سے بڑی بالٹی اٹھا لائی۔ بی اماں کا بخار ابھی تک نہیں ٹوٹا تھا اور وہ ہنوز اپنے بستر میں بے خبر پڑی سو رہی تھیں۔

گوری ابھی دودھ دھو رہی تھی جب شاہد حسین بیرونی دیوار پھلانگ کر احاطے میں گھس آیا۔ اسے گمان ہی نہیں پورا یقین تھا کہ گوری اس وقت احاطے میں ہی ہو گی لہٰذا اب اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر ایک عجیب سی تسکین کی لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔

گوری کی نظر جونہی اس پر پڑی وہ دودھ چھوڑ کر ہراساں سی کھڑی ہو گئی۔

''چل گوری...... لینے آیا ہوں تجھے۔''

اس کی قمیض پر کالر کے پاس تازہ خون کے چھینٹے ہلکے ہلکے دھندلکے میں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ گوری کا دل دھک سے رہ گیا۔

''دفع ہو جا یہاں سے، مجھے تیری صورت سے بھی نفرت ہے۔''

''ارے پاس تو آ...... اس بار یہ نفرت محبت میں نہ بدل دوں تو شاہد نام نہیں میرا۔''

آگے بڑھ کر گوری کے دونوں بازو اپنے ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے وہ کمینگی سے مسکرایا تو گوری شدید حقارت کے باوجود بے بسی سے پھڑک کر رہ گئی۔

''ہاتھ چھوڑ میرے' نہیں تو ابھی سارے گاؤں کو اکٹھا کرلوں گی۔''
غرا کر دھمکی آمیز لہجے میں جونہی اس نے کہا' شاہد حسین جلال میں آ گیا۔
''اس قابل چھوڑوں گا تو ہی سارے گاؤں کو اکٹھا کرے گی ناں تو' اب دیکھ کیا کرتا ہوں میرے ساتھ۔''
کہنے کے ساتھ ہی اس نے گوری کی پشت پر پڑی اس کی صحت مند بالوں کی لمبی چوٹی کو ہاتھ میں لے کر پہلے اس کا منہ باندھا' پھر اسے کسی بھی مزاحمت کا موقع دیئے بغیر اپنے کندھے پر پڑے صافے سے اس کے دونوں بازو باندھ کر بڑے آرام سے اسے کندھے پر اٹھایا اور بیرونی دروازہ کھول کر واپس اپنے گھر والی سڑک پر گامزن ہو گیا۔

❊❊❊

گاؤں میں طلوع ہونے والی اگلی صبح بڑی اداس تھی۔
گاؤں سے اچانک ادریس شاہ اور اس کی بہن گوری کی گمشدگی نے گاؤں کے ہر باسی کو اچھا خاصا حیران کر ڈالا تھا۔ اس پر زلیخا کا سکتہ......
شاہد حسین اپنے ملنے والے ہر شخص کو ایک ہی کہانی سنا رہا تھا کہ پنچائیت کے متوقع فیصلے کے خوف سے ادریس اپنی بہن کے ساتھ کہیں روپوش ہو گیا ہے مگر انزلہ اس کی فرضی کہانی پر کسی طور یقین نہیں کر سکتی تھی کیونکہ ابھی کل وہ چھنو کے ساتھ گوری سے مل کر گئی تھی جو اپنے بھائی کی گمشدگی پر بے حد پریشان تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ادریس میدانِ جنگ سے فرار ہونے والوں میں سے نہیں ہے لہذا کچھ سوچ کر وہ سانول شاہ کی حویلی کی طرف چلی آئی تھی۔
''انزلہ باجی......''
وہ ابھی راستے میں تھی کہ پیچھے سے آنے والی صدا پر بے ساختہ اسے رک جانا پڑا۔ چھنو پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اس کے قریب آ کر رکی تھی۔
''ہاں بولو چھنو......''
''انزلہ باجی' آپ کو پتا ہے' گوری اور ادریس دونوں گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔''
گاؤں کے تمام لوگوں کی طرح اس کی بھی یہی رائے تھی۔
انزلہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔
''وہ بھاگے نہیں ہیں' چھنو۔ ضرور سانول کے چمچے نے ان کے ساتھ کوئی ظلم ہی کیا ہوگا۔''
''ہاں...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا' آپ کہاں جا رہی ہیں......؟''
''سانول شاہ کی حویلی۔''
''لیکن وہ تو حویلی میں نہیں ہے۔''
''تمہیں کیسے پتا......''
''توفیقا بتا رہا تھا۔''
چھنو کی مصدقہ اطلاع پر کچھ سوچتے ہوئے وہ شاہد حسین کے گھر کی طرف ہی بڑھ آئی تھی۔

❊❊❊

اک روگ لگا ہے دل کو جو
بے چین بہت ہی رکھتا ہے
اک شخص ہے اجلا اجلا سا
اب ساتھ وہ ہر پل رہتا ہے
کب اس سے جدا ہم ہوتے ہیں
وہ سانس میں اپنی بستا ہے
وہ شخص جو اپنا ہو جائے
پھر چاہے دنیا کھو جائے
وہ شخص جو جان سے پیارا ہے
کوئی کہہ دے ”صرف ہمارا ہے“

ہلکی ہلکی بوندا باندی میں قطعی بے پروائی سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس کا مکمل دھیان انوشہ کی سوچوں میں لگا تھا۔ جب تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد اس نے گاڑی اپنے ہی گھر کے گیٹ کے سامنے روک دی۔

بریرہ بڑے سلیقے سے بک سک سی تیار ہوئی بظاہر ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی مگر دل سے انتظار اس کا کر رہی تھی۔ تبھی شاہ زر تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا وہیں لاؤنج میں اس کے پاس صوفے پر آ بیٹھا۔

”اتنی دیر کر دی شاہ زر؟ میں نے کہا بھی تھا کہ اپنی دوست کی طرف جانا ہے۔“

قطعی نہ چاہنے کے باوجود وہ اس سے گلہ کر بیٹھی تھی۔

شاہ زر نے آہستہ سے پلکیں موند کر سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔

”سوری یار...... میں بھول گیا تھا۔ کل چلی جانا۔“

”کون سی کل؟ میری تو ہر بات ہی بھول جاتے ہو تم۔ تمہیں تو شاید یہ بھی یاد نہیں ہے کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔“

وہ اس کے جواب پر تپی تھی جب وہ مسکرا کر آنکھیں کھولتے ہوئے بولا۔

”نہیں یار! ایسا مت کہو۔ اتنی بڑی بھیانک حقیقت بھلا کیسے بھول سکتا ہوں میں......؟“

وہ سیریس نہیں تھا' مذاق کے موڈ میں تھا مگر بریرہ کو برا لگ گیا۔

”ہاں...... اچھی طرح معلوم ہے کہ میں بھیانک حقیقت ہوں۔ مگر کوئی بہت اچھی یادیں تو تمہاری اس ”سہانی حقیقت“ کے ساتھ بھی وابستہ نہیں ہیں۔“

”اس کا یہاں کیا ذکر......؟“

فوراً لب بھینچتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا تھا جب وہ بولی۔

”اسی کے ذکر اور یادوں سے تو ہر لمحہ جڑا ہے تمہارا۔ وہ ذہن سے نکلے تو کچھ اور یاد رہے ناں تمہیں...... اس پر بھی کہتے ہو کہ تم اس سے محبت نہیں کرتے۔“

”ہاں نہیں کرتا میں اس سے محبت۔ میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے اس کے ساتھ۔ میں صرف تم

ے محبت کرتا ہوں بریرہ...... صرف تم سے۔"
لہجے میں اس کا لہجہ پست ہوا تھا۔
بریرہ تلخی سے مسکرادی۔
"اچھا فریب ہے۔ تمہارا خیال ہے شاہ زر' تمہارے یہ کھوکھلے لفظ کتنا دفاع کر سکتے ہیں تمہارے جھوٹ کا؟"
"جھوٹ نہیں ہے یہ...... سچ ہے...... بڑا سچ...... کیوں نہیں مانتی ہو تم...... میں اس سے پیار نہیں کرتا۔"
بے بسی سے خود اپنے ہی بال مٹھیوں میں جکڑے ہوئے اس نے بریرہ سے زیادہ جیسے خود کو یقین دلانا چاہا تھا۔ پھر اگلے ہی پل وہ اس کی طرف پلٹ آیا۔
"تم سمجھو بریرہ' ہماری ابھی شادی ہوئی ہے اور آج...... آج کی رات ہماری شادی کی پہلی رات ہے۔"
جانے کس خیال کے تحت اس کی آنکھوں کا رنگ بدلا تھا۔
بریرہ حیرانی سے یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔
"میں صرف تم سے پیار کرتا ہوں بریرہ...... صرف تم سے......"
از حد تھکن کے باوجود وہ اس کے چہرے پر جھک آیا تھا۔ بریرہ اس لمحے اچھی خاصی کنفیوز ہو کر رہ گئی تھی۔ شاہ زر کے گرم ہاتھوں کا لمس اس کے حواس معطل کر رہا تھا۔ مگر یہ پل اس کی اب تک کی زندگی کے سب سے قیمتی پل تھے کیونکہ بے خودی کے ان لمحوں نے یک بارگی اس کی ذات کو بہت معتبر کر دیا تھا۔

❁❁❁

زاور افسردہ سا اپنے آفس میں بیٹھا انوشہ کے متعلق ہی سوچ رہا تھا جب اس کا دوست ساحر جو اس کے آفس میں بزنس منیجر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا' ہلکے سے دروازہ ناک کرتے ہوئے اس کے کمرے میں چلا آیا۔
"باہر اتنا پیارا موسم ہو رہا ہے اور تم یہاں بیٹھے فائلیں چاٹ رہے ہو۔"
اپنے مخصوص انداز میں کہتا وہ اس کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔
زاور اپنی سوچوں سے نکلتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔
"جن کے اندر کا موسم اچھا نہیں ہوتا ان پر باہر کے موسم اثر نہیں کرتے ساحر!"
"رائٹ...... چلو آج تمہیں وڈیرا صاحب سے ملواتا ہوں!"
"کون وڈیرا؟"
"بہت اچھا بزنس مین ہے یار۔ ابھی دو سال قبل اپنی بیوی کو ڈائیورس دے چکا ہے۔ اخلاقاً اچھا آدمی ہے۔ تم دیکھ لو تو انوشہ کے لیے بات کرلوں گا میں اس سے۔"
کوئی اور موقع یا وقت ہوتا تو شاید وہ اس کے گلے پڑ جاتا کہ اس نے ایک بیوی بھگتائے ہوئے شخص کے لیے اس کی بہن کا نام بھی کیسے لیا مگر اب صورت حال مختلف تھی۔ اگر وہ اس کام میں

مزید چند دنوں کی تاخیر بھی کرتا تو شاید اپنی بہن کو کہیں ٹھکانے نہ لگا سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ ساحر کے ساتھ مسٹر وڈیرا سے ملنے کے بعد' اس سے خاص مطمئن نہ ہونے کے باوجود اس نے اسے او کے کر دیا تھا۔
نزہت بیگم کو اس بات کا پتا چلا تو انہوں نے اچھا خاصا واویلا مچایا۔ جمال صاحب نے بھی حتی المقدور اس رشتے کی مخالفت کی تھی' مگر اپنی رسوائی کے خوف سے اس نے کسی کی ایک نہ سنی اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق انوشہ کی نسبت اس سے دوگنی عمر کے وڈیرا صاحب سے طے کر دی۔
شاہ زر کو اس نسبت کی خبر ہوئی تو وہ فوراً نزہت بیگم کے پاس دوڑا چلا آیا۔ زاور بھی اتفاق سے اس وقت گھر پر ہی تھا۔
''السلام علیکم......''
دروازہ کھلتے ہی اپنی دستک کے جواب میں اس کا پہلا ٹاکرا ہی زاور سے ہوا تھا۔
''وعلیکم السلام' آؤ۔''
ہلکی سی رنجش کے باوجود وہ اسے دوستانہ انداز میں ہی ملتا تھا کیونکہ شاہ زر سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔
''السلام علیکم آنٹی۔''
صحن عبور کر کے وہ کمرے میں آیا تو نزہت بیگم کے سامنے آنے پر بھی سلام جڑ دیا۔ جواب میں وہ شرمندہ شرمندہ سی اس کے سلام کا جواب دے کر وہیں بیٹھ گئیں۔
''کیسے ہو...... اس بار بہت دنوں کے بعد چکر لگایا۔''
''بس...... کچھ مصروف تھا آنٹی' آپ سنائیں...... آپ کیسی ہیں؟''
''اب اس بڑھاپے میں کیسا ہونا چاہئے۔ مولا کا کرم ہے بس اچھے برے دن بسر ہو رہے ہیں۔ تم کہو کیسے آنا ہوا؟''
''بس یونہی' آپ کی یاد آ رہی تھی تو سوچا مل آؤں۔ انوشہ کیسی ہے؟''
زاور کی موجودگی میں انوشہ کا پوچھتے ہوئے وہ ہلکا سا جھجکا تھا مگر اس نے پروا نہیں کی۔
''اسے کیا ہونا ہے' شادی طے کر دی ہے اس کی۔ اگلے ماہ کی ستائیس تاریخ ہے۔ تم ضرور آنا۔''
جواب نزہت بیگم کے بجائے زاور نے ہی دیا تھا۔
اس کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔
''اتنی جلدی......؟''
''کیسی جلدی یار! لڑکیاں وقت پر اپنے گھر بار کی ہو جائیں' تو ہی اچھا رہتا ہے۔''
''مگر...... اس کی ابھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' زاور۔ کم از کم اسے سنبھلنے کا موقع تو دو۔''
''اس کے سنبھلنے تک ہم سب منہ کے بل گر جائیں گے۔ میرا خیال ہے اس مسئلے پر تمہیں مجھ سے بحث نہیں کرنی چاہئے۔''
قطعی دوٹوک لہجہ تھا اس کا۔
شاہ زر نے اس لمحے خود کو بے حد بے بس محسوس کیا۔
''ہاں' لیکن زاور جس شخص کے ساتھ تم اس کی شادی کرنے جا رہے ہو۔ وہ قطعی اچھا آدمی

نہیں ہے۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بھی تو اچھی نہیں رہی۔"

اس بار اس کا لہجہ تلخی سے پر تھا۔

شاہ زر نے مدد طلب نگاہوں سے نزہت بیگم کی طرف دیکھا تو وہ بے بسی سے سر جھکا گئیں۔

"میرا خیال ہے، مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔ تم امی کے پاس بیٹھو، چائے پیو، انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔"

شاہ زر کی جرح نے اس کے سر میں پھر سے درد شروع کر دیا تھا لہٰذا وہ فوراً خود چائے پیے بغیر اٹھ گیا۔ تو شاہ زر نے بھی اسے روکنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ اس کی غیر موجودگی میں ہی وہ کھل کر نزہت بیگم سے کوئی بات کر سکتا تھا۔

"آنٹی...... زاور جو کر رہا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔"

زاور کے گھر سے نکلتے ہی وہ بے تابی سے نزہت بیگم کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جواب میں وہ سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔

"جانتی ہوں بیٹے...... مگر میرا کوئی اختیار کہاں رہا ہے۔"

"کیوں نہیں اختیار رہا آپ کا۔ وہ ظلم کر رہا ہے، اسے روکیں آنٹی۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں اس شخص کو۔ پہلی بیوی پر بھی ظلم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے اس نے۔ انوشہ اس کے ساتھ ایک پل نہیں رہ سکے گی۔ پلیز آنٹی، آپ ہی اسے سمجھائیں۔"

"بہت سمجھایا ہے بیٹے، کسی کی نہیں سن رہا وہ۔"

"یہ غلط ہے، آپ کو اسے روکنا ہوگا۔ کم از کم میں اپنی آنکھوں کے سامنے انوشہ پر یہ ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

اس کے لہجے میں شکستگی کے ساتھ ساتھ دکھ بھی تھا۔ تاہم اس سے پہلے کہ نزہت بیگم اس سے کچھ کہتیں، انوشہ کے کمرے کا دروازہ ٹھک سے کھلا اور وہ نیند میں ڈوبی خمار آلود نگاہوں کے ساتھ اس کے سامنے چلی آئی۔

شاہ زر اسے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران حیران سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"انوشہ......"

"مر گئی انوشہ...... تم ہوتے کون ہو میری زندگی کے انتہائی پرسنل معاملے میں ٹانگ اڑانے والے؟ میرا ذاتی مسئلہ ہے یہ کہ میری شادی کس سے ہوتی ہے۔ تمہیں اتنا حق کس نے دیا ہے کہ تم میرے مسئلوں کے بارے میں سوچو...... بولو......؟"

ایک عجیب سی چنگھاڑ تھی اس کے لہجے میں۔ شاہ زر اسے دیکھے گیا۔

"خون کیا ہے میں نے اپنے بھائی کی امنگوں کا۔ دھبہ بن کر رہ گئی ہوں میں ان کی زندگی پر۔ ایسی لڑکی کے لیے تم کیا سمجھتے ہو آسمان سے کوئی شہزادہ اتر کر آئے گا؟ رکھو اپنی ہمدردیاں اپنے پاس، میری شادی ہوگی تو اسی شخص سے، وگرنہ کسی سے نہیں۔"

قطعی جارحانہ انداز میں کہتی وہ اسے باغی دوشیزہ لگ رہی تھی۔

شاہ زر تھکے تھکے سے انداز میں دوبارہ صوفے پر ڈھے گیا۔
"مت اپنے ساتھ یہ ظلم کرو انوشہ' پلیز۔"
"تمہیں کوئی حق نہیں ہے ایسی بکواس کرنے کا۔ اب جاؤ یہاں سے اور دوبارہ کبھی ادھر کا رخ مت کرنا۔"
وہ اس کی التجا پر پھر بپھری تھی۔ شاہ زر اس درجہ اہانت پر لب بھینچ کر رہ گیا۔

❁❁❁

زخم تنہائی میں خوشبوئے حنا کس کی تھی
سایہ دیوار پہ میرا تھا' صدا کس کی تھی
اس کی رفتار سے لپٹی رہیں آنکھیں میری
اس نے مڑ کے بھی نہ دیکھا کہ وفا کس کی تھی
میرے اشکوں نے ہی بھر ڈالا میرے دامن کو
ہاتھ تو میں نے اٹھائے تھے دعا کس کی تھی
میری آنکھوں کی زباں کوئی سمجھتا' کیسے
زندگی اتنی دکھی میرے سوا کس کی تھی
آگ سے دوستی اس کی تھی جلا گھر میرا
دے گئے کس کو سزا اور خطا کس کی تھی

پتھر کی مورت بنی وہ قل سنگھار کے ساتھ محفل کی رونق کو چار چاند لگا رہی تھی جب کہ اس کے پہلو میں بیٹھا وہ شخص' جسے ابھی ابھی اس کا مجازی خدا ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا' یوں اکڑ کر بیٹھا تھا جیسے اڈھیر عمر میں بھی انوشہ جیسی خوب صورت' نوجوان لڑکی سے شادی کر کے گویا کوئی جنگ کا میدان فتح کر لیا ہو۔
زاور اور نزہت بیگم دونوں نے ہی شاہ زر کو شادی کی اس تقریب کے لیے اسپیشل انوائیٹ کیا تھا مگر وہ نہیں آیا تھا۔
بریرہ اس کے لیے بے حد پریشان تھی کیونکہ بارہ تیرہ گھنٹوں سے اس کا کہیں کوئی پتا نہیں تھا نہ ہی اس کا سیل آن مل رہا تھا۔
ادھر انوشہ کو خبر ہی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ لہو رنگ آنکھیں لیے' کسی پتھر کی مورت کی مانند وہ یوں ساکت بیٹھی تھی۔ گویا ذرا سی بھی اپنی جگہ سے ہلی تو تختہ دار پر لٹکا دی جائے گی۔
نزہت بیگم رو رہی تھیں۔ صدف بیگم سے بھی ان کا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا کہ وہ کہاں ہیں تاہم زاور نے اس کی طرف سے جیسے اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ صرف ایک بار کے علاوہ وہ انوشہ کے پاس ہی نہیں آیا تھا۔ شافیہ البتہ ضرور انوشہ کے پاس ہی بیٹھی بار بار اپنی بھیگی پلکیں صاف کرتی رہی تھی۔
اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس پر دلہن بننے کے بعد ٹوٹ کر روپ آیا تھا مگر اس کے باوجود اس کے ہونے والے مجازی خدا کے ماتھے پر پڑنے والے بلوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ رات کے

تقریباً تین بج گئے تھے جب اس کی رخصتی عمل میں آئی تھی۔

انوشہ کو قطعی احساس نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔اسے بس اتنا پتا تھا کہ ہر طرف شور ہے اور اسے اس شور میں اپنی قربانی پیش کرنی ہے۔ قطعی بے قصور ہوتے ہوئے بھی سب کے سامنے ہنس کر سولی پر چڑھنا ہے کیونکہ اس کے لیے یہ سزا کسی اور کی نہیں خود اس کے اپنوں کی تجویز کی ہوئی ہے۔

خاصے لمبے سفر کے بعد جس وقت وہ اپنے سسرال پہنچی' اس کا پورا بدن تھکن سے چور تھا۔مگر اس کا مجازی خدا اور ان کے ساتھ شریک دیگر لوگوں نے اس کی تھکن کی رتی بھر پروا کیے بغیر اپنے خاندان کی تمام رسومات پوری کی تھیں۔تقریباً صبح فجر کی اذان کے وقت اسے فرصت میسر آئی تھی اور تب تمام تر اخلاقیات کو سائیڈ پر رکھتے ہوئے وہ ایسی بے خبر ہو کر سوئی کہ پھر اگلے دن دوپہر میں ہی اس کی آنکھ کھلی۔

''چاچی......''

آنکھ کھلتے ہی جو پہلی صدا اس کے کانوں میں پڑی تھی وہ یہی تھی۔

انوشہ کو اس وقت اپنا سر بے حد بھاری محسوس ہو رہا تھا لہٰذا بمشکل آنکھیں کھول کر اپنے حواس کنٹرول کرتی وہ اٹھ بیٹھی۔

''چاچی! آپ کے گھر والے آئے ہیں۔امی کہتی ہیں جلدی سے تیار ہو کر نیچے آجائیں۔''

وہی بچی جو جانے کب سے اس کے جاگنے کی منتظر تھی' اب اس کے اٹھ کر بیٹھتے ہی فوراً معصومیت سے اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے بولی تو انوشہ غائب دماغی سے محض اثبات میں سر ہی ہلا سکی۔بچی اس کا جواب پاتے ہی فوراً مسکراتے ہوئے اپنی چھوٹی چھوٹی پونیوں کو ہلاتی کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

انوشہ بیڈ سے اتر کر آئینے کے سامنے آئی تو یاد آیا کہ کل اور آج کے بیچ اس کی زندگی کتنی بڑی تبدیلی سے دوچار ہو گئی تھی۔وہ خالی خالی سی نگاہوں سے کتنی ہی دیر اپنے سراپا کو دیکھتی رہی اور پھر ہنس دی۔ہنستے ہنستے جب تک وہ تھک نہیں گئی اور اس کی لبورنگ آنکھیں آنسوؤں سے بھر نہیں گئیں' تب تک اس کی ہنسی کو بریک نہیں لگا۔

اس وقت اگر کمرے میں کوئی بھی موجود ہوتا تو یقیناً اس کی دماغی حالت پر شک کرتا۔وہ شاور لیے بغیر محض منہ ہاتھ دھو کر' کپڑے بدل کر نیچے آئی تو نزہت بیگم' جمال صاحب اور زلوار تینوں ہی ڈائننگ ہال میں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔اس کا خاوند عبدالصمد وڈیرا رات بھر اپنے دوستوں سے ہنسی مذاق کرتا رہا جب کہ وہ اکیلی اس کے خاندان میں گھری تمام رسوم نبھاتی رہی تھی۔اس وقت بھی وہ کسی بھیانک سچ کی عملی تصویر بنا سو رہا تھا۔لہٰذا اسے اکیلے ہی اپنے گھر والوں کو ڈیل کرنا پڑا۔

ناشتے کے بعد رسم کے مطابق نزہت بیگم اسے کچھ روز کے لیے اپنے ساتھ ہی لے آئی تھیں جس پر مسٹر وڈیرا کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔اس بار بھی اگر وہ بے حد مجبور نہ ہوتی تو شاید کبھی نزہت بیگم کے ساتھ واپس لوٹ کر اس گھر میں نہ آتی جو اس کے لیے اچانک بہت تنگ پڑ گیا تھا۔

تقریباً تین روز میکے میں رہ کر چوتھے روز وہ اپنے سسرال واپس آئی تو پھر بے حد اپ سیٹ

تھی۔ اس وقت بھی وہ صحن میں بیٹھی اپنے سسرالیوں سے تعارف کی رسم نبھا رہی تھی جب اس کی چھوٹی دیورانی کی منجھلی بیٹی نے باہر سے بھاگ کر آتے ہوئے اسے بتایا۔

''آنٹی...... آپ سے ملنے کوئی انکل آئے ہیں...... اندر بلالوں......؟''

سب کے بیچ بچی کے الفاظ نے اسے چونکا ڈالا تھا۔

''انکل......''

پھنسی پھنسی سی آواز میں دہراتے ہوئے اس کا دھیان شاہ زر کی طرف گیا تھا۔

❀❀❀

کیا اندھیروں کے دُکھ' کیا اُجالوں کے دُکھ
جب ہرا دیں مقدر کی' چالوں کے دُکھ
جن کی آنکھیں نہیں وہ نہ روئیں...... کبھی
جان جائیں اگر آنکھ والوں کے دُکھ
میری منزل کہاں' ہم سفر ہے کدھر
مار ڈالیں گے اب اِن سوالوں کے دُکھ
دو گھڑی کے لیے پاس بیٹھو اگر
بھول جائیں گے ہم کتنے سالوں کے دُکھ
میری سوچوں کے جلتے ہوئے دشت سے
چھین لے آکے اپنے خیالوں کے دُکھ

جانے اُس شخص کو ابھی اُس کی اور کتنی رسوائی مقصود تھی۔

اُس کی دیورانی خاصی مشکوک نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی' وہ بے ساختہ نگاہوں کا رُخ پھیر گئی۔

''میرا کسی انکل سے کوئی واسطہ نہیں ہے' باہر جو بھی ہیں اُنھیں کہہ دو' مجھے کسی سے نہیں ملنا۔'' کہنے کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تو اُس کی دیورانی اُس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

''انوشہ۔''

اس کے سر میں اچانک شدید درد شروع ہوا تھا مگر پھر بھی وہ پلٹی تھی۔

''جی۔''

''مجھے کچھ بات کرنی ہے تم سے صمد بھائی کی موجودگی میں شاید وہ بات نہ کرسکوں۔''

''کہیئے۔'' دیورانی کی اُلجھن پر وہ پوری توجہ سے اُس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

''دیکھو انوشہ! آج ہم سب اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے ہیں' پھر نہ جانے کب آنا ہو' اِس لیے جانے سے پہلے میں کچھ باتیں تمہارے علم میں لانا ضروری سمجھتی ہوں' میں نہیں جانتی کہ تم جیسی خوبصورت پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی نے' شادی کے لیے اپنے سے دوگنی عمر کے شخص کا انتخاب کیوں کیا' لیکن میں تمہیں اتنا ضرور بتانا چاہوں گی کہ صمد بھائی شادی کے قابل نہیں تھے۔''

''کیا؟'' وہ چونکی تھی اور اُس نے بڑی سرعت سے سر اٹھا کر اپنی دیورانی کے چہرے کی طرف

''ہاں انوشہ! ہوسکتا ہے یہ حقیقت تمہیں اگلے چند روز کے بعد پتہ چلتی تو تمہیں زیادہ دُکھ ہوتا۔ بات صمد بھائی کی پہلی بیوی سے پتا چلی تھی اور اُن دونوں کے بیچ علیحدگی کی وجہ بھی یہی بات بہر حال تمہیں اس حقیقت سے آگاہ کرنے کا میرا مقصد' صمد بھائی سے بدگمان کرنا نہیں' بلکہ سے بچانا ہے۔ اگر تم نے یہ شادی' کسی مجبوری کی بناء پر کی ہے' تو ٹھیک ہے لیکن اگر اپنی رضا ہے یا اس سلسلے میں تمہارے ساتھ کوئی زبردستی ہوئی ہے تو...... تم اپنے بارے میں کوئی بہتر کر سکتی ہو۔''

اس کی دیورانی بول رہی تھی مگر اسے صرف اُس کے ہلتے ہونٹ نظر آرہے تھے' بعض اوقات کے ساتھ ساتھ دُنیا کو دھوکہ دینا کتنا دشوار ہوتا ہے' اُس کے بھائی نے بدنامی کے جس خوف قربان کر دیا تھا وہ خوف ابھی بھی اُس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ تقدیر کے اس عجیب مذاق ہنسی تھی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی تھی۔

''انوشہ! تم ٹھیک تو ہو؟'' اُس کی دیورانی اُس کی اس عجیب ہنسی پر پریشان ہو اٹھی تھی جب بڑی سے اُس نے خود کو سنبھالا۔

''جی۔ آپ میرے بارے میں زیادہ فکر نہ کریں' مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

اس کی دیورانی کے لیے یہ پہلے سے زیادہ حیران کن بات تھی۔ وہ کچھ دیر اُلجھی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''بہت عجیب لڑکی ہو تم' کم از کم میری سمجھ سے یکسر باہر ہو' بہر حال انگلینڈ کا کرو تو میری طرف قیام کرنا' میری بچیوں کو بہت پسند آئی ہو تم۔''

''جی ضرور۔''

''اور ہاں۔ یہ تو تم جان ہی گئی ہو کہ سوائے میرے میاں کے' صمد بھائی کے دونوں بڑے بھائی ہیں' اس لیے اُن سے بھلائی کی اُمید ذرا کم ہی رکھنا' اور میرا نیک مشورہ تمہیں یہی ہے کہ تم جلد سے جلد ملک سے باہر سیٹل ہونے کی کوشش کرنا ورنہ...... صمد بھائی کا چال چلن کوئی ایسا خاص نہیں ہے۔''

انوشہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا' کہ وہ اُسے یہ سب باتیں بتا کر اُس کے شوہر کے خلاف بدگمان کیوں چاہ رہی تھیں۔ مگر پھر بھی اُس نے انکساری سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''شاباش۔ میں اب ذرا اپنی پیکنگ دیکھ لوں' شام سات بجے کی فلائیٹ ہے اور دیکھو دن تو جا رہا ہے۔''

چرب زبانی میں ماہر وہ عورت بنا اُس کے احساسات کی پروا کیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ انوشہ نے موند لیں۔

''دیکھو...... پھر کہہ رہی ہوں' میرے ساتھ پل پل فون پر رابطہ رکھنا اور ایک ایک لمحے کی رپورٹ دیتی رہنا' سمجھیں؟'' کمرے سے نکلتے نکلتے بھی وہ اُسے نصیحت کرنا نہیں بھولی تھی۔

''جی۔'' انوشہ کے پاس ایک مرتبہ پھر اثبات میں سر ہلانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

❊❊❊

گوری کی آنکھ جونہی کھلی اسے اپنے سر کی پچھلی طرف شدید تکلیف کا احساس ہوا۔
"سی۔" کی ہلکی آواز کے ساتھ اُس نے اپنے دونوں ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔ کمرہ گھُپ اندھیرے میں ڈوبا تھا جس کی وجہ سے اُس کی آنکھیں چندھیا گئی تھی۔ حواس مکمل طور پر بیدار ہوتے ہی اُسے یاد آیا تھا کہ آج صبح جب وہ احاطے میں دودھ دوھ رہی تھی۔ تب شاہد حسین آیا تھا اور اُس نے اُس کی چوٹی اُس کے منہ کے گرد لپیٹ کر اُسی کے ڈوپٹے سے اُس کے دونوں ہاتھ باندھ کر اسے کتنا بے بس کر دیا تھا اور جس وقت وہ اسے اپنے مضبوط شانوں پر ڈال کر یہاں سانول شاہ کے ڈیرے پر لایا تھا تب تک ٹانگیں چلاتے ہوئے اُس نے اپنے دفاع کے لیے بھرپور کوشش کی تھی' مگر تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ اپنے چچوں کے ساتھ اُسے گاڑی میں ڈال کر گاؤں سے باہر جانے والی سڑک پر روانہ ہو گیا تھا۔ راستے میں سفر کے دوران ہی اُس کے سر پر کوئی چیز لگی تھی یا جان بوجھ کر ماری گئی تھی۔ بہر حال اُسے کوئی ہوش نہیں رہا تھا' کہ وہ کہاں لائی گئی تھی اور اب مزید اُس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟"

اُس کے ہاتھ اب بھی بندھے تھے' منہ البتہ کھول دیا گیا تھا' اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش میں وہ پھر گر پڑی تھی' جانے بی اماں کا کیا حال تھا؟ تھوڑی دیر کمرے کی تاریکی کا جائزہ لینے کے بعد وہ ابھی پھر اٹھنے کی کوشش کرنا ہی چاہ رہی تھی' کہ اسی پل شاہد حسین' دروازے کا لاک کھول کر اندر گھُس آیا۔ اندر آتے ہی اُس نے ساری لائیٹس آن کر ڈالی تھیں۔ اچانک روشنی کی یلغار پر اُس نے بے ساختہ چہرے کا رُخ پھیرا تھا۔

"ہوں......آ گئیں ہوش میں......؟" مونچھوں کو بل دیتا وہ پنجوں کے بل اُس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ گوری کا رواں رواں نفرت کے شدید احساس سے سُلگ اٹھا۔

"ایک جیسے ہو دونوں بہن بھائی' جتنا رب نے حسن دیا ہے اتنا ہی دماغ خراب کر دیا ہے۔" اُس کے نفرت سے منہ پھیرنے پر ہاتھ بڑھاتے ہوئے اُس نے کہا تھا اور پھر ہلکا سا قہقہہ لگا دیا تھا۔ تبھی وہ پھنکاری تھی۔

"بکواس بند کرو' اور بتاؤ' میرا بھائی کہاں ہے' کیا کیا ہے تم نے اُس کے ساتھ؟"

"بڑی فکر ہے بھائی کی؟ آہ بیچارہ تمہارا مرحوم بھائی' نہ تم اکڑ کر اُس کے گھر بیٹھتیں' نہ وہ میرے ہی گھر میں میرے ہاتھوں قتل ہوتا۔"

"کیا......یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم......؟" گوری کی ساعتوں کو زبردست دھچکا لگا تھا اور اُس کی آنکھیں حیرت کی شدت سے جیسے اُبل آئی تھیں۔

"سچ ہے جانو' بڑا کڑوا سچ ہے۔ یقین نہیں آتا تو چل میرے ساتھ' پرانے کنویں میں اُس کی لاش دیکھ لے۔ شاہد حسین سے ٹکر لینے والے کا انجام یہی ہوتا ہے۔" اُس کے لبوں پر فخریہ شیطانی مسکراہٹ تھی' گوری کو لگا جیسے اُس کا سارا جسم مفلوج ہو گیا ہو۔

"اب بول کہاں جائے گی' بڑی اکڑتی تھی بھائی پر' کر ڈالا اُس کا پتا صاف' اب بتا کیا راستہ ہے تیرے پاس مجھ سے فرار پانے کا؟"

وہ بول رہا تھا مگر گوری کی ساعتوں میں تو دھماکے ہو رہے تھے۔ اُس کے اندر تو عجیب سا

رہا تھا۔ لہٰذا وہ اُسے کوئی جواب نہ دے سکی۔

''چل...... دو گھڑی منا لے سوگ' لے...... ہاتھ اور ٹانگیں کھول دیتا ہوں تیری' چل پھر کر اچھی طرح سوچ لینا۔''

اُس کی حالت سے قطعی بے نیاز وہ پھر خباثت سے دانت نکالتے ہوئے بولا اور اُسے اُس کے حال پر گم صم چھوڑ کر پھر سے دروازہ باہر سے لاک کر گیا۔

گوری کو حیرانی ہو رہی تھی' کہ جان سے پیارے بھائی کے بارے اتنی بڑی خبر سن کر بھی اُس کا دل دھڑک کیسے رہا تھا؟ اُس کی سانس کیسے چل رہی تھی۔ دونوں بازوؤں میں منہ چھپا کر اچانک وہ رو دی تھی اور پھر اگلے کئی گھنٹوں تک بچوں کی طرح بلک بلک کر روتی ہی رہی تھی۔

❋❋❋

گاؤں کی کچی دُھول اُڑاتی سڑک پر گامزن وہ شاہد حسین کے گھر کی جانب رواں تھی۔ جب غیر متوقع طور پر سانول شاہ اپنی جیپ میں بیٹھا' اُس کے قریب سے گزرتے ہوئے ہمیشہ کی طرح تھوڑی دُور جا کر رُک گیا۔

انزلہ نے ایک سرد نگاہ اُس پر ڈالی اور پھر اپنے ساتھ آتی چھنو کو گھور کر دیکھا' جیسے پُوچھ رہی ہو کہ تم نے تو کہا تھا' یہ گاؤں میں نہیں ہے۔ چھنو اُس کی گھوری پر گھبراتے ہوئے جلدی سے بولی۔

''مم...... میں چلتی ہوں انزلہ باجی' ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اُسے کھچڑی پکا کر دینی ہے۔''

اس لیے اُسے چھنو پر بے انتہا غصہ آیا تھا مگر وہ ضبط کر گئی تھی۔

سانول شاہ اُسے پُرشوق نگاہوں سے دیکھتا' گھنی مونچھوں کے تلے گداز لبوں پر ایک میٹھی سی مسکان سجائے' بالآخر جیپ سے اُتر آیا تھا۔

''کیا بات ہے ربّ سوہنے کی' گاؤں آتے وقت میں نے ایک ہی دُعا کی تھی کہ سب سے پہلے تمہارا چہرہ دیکھوں اور دیکھو کیسی سنی مالک نے' بھئی مان گیا' سچے دل سے نکلی دعاؤں میں واقعی بڑا اثر ہے۔'' عین اُس کے مقابل کھڑے ہو کر اُس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے تھے۔ ''کہاں جا رہی ہو......؟''

انزلہ کا چہرہ تپا دیکھ کر اُس کے کچھ کہنے سے قبل ہی اُس نے پوچھ لیا تھا۔ جب وہ بولی۔

''تمہاری غیر موجودگی میں بھی یہ گاؤں شیطانوں سے خالی نہیں ہے۔ یوں سمجھ لو تمہارے خاص ایک ظالم شیطان سے ملنے ہی جا رہی ہوں۔''

''ہا۔ہا۔ہا۔ اچھا جواب ہے' ویسے بھی سوائے اِدھر اُدھر پھرنے کے تمہیں اس گاؤں میں اور کام ہی کیا ہے۔''

''تم کہہ سکتے ہو۔ مگر میرا رب جانتا ہے' میں یہاں اس گاؤں کے سیدھے سادے باسیوں کے لیے کیا پلان لے کر آئی ہوں' اور جب تک میرے وہ سب خواب پُورے نہیں ہو جاتے' میں یہاں سے جانے والی نہیں۔''

''چلو اچھی بات ہے' لیکن سارے خواب سارے پلان' گاؤں کے سیدھے سادے غریب لوگوں کے لیے ہی کیوں...... کچھ خواب میرے حوالے سے بھی دیکھ لو۔'' اُس کی مقناطیسی پُرکشش

آنکھوں میں عجیب سی چمک لپکی تھی۔

انزلہ نے سر جھٹکتے ہوئے نخوت سے منہ پھیر لیا۔

''ہوں تمہیں تو سرِ عام صبح و شام سو کوڑے ماروں تب بھی کم ہے۔''

''اتنا غصہ انزلہ...... کیا اتنا بُرا ہوں میں؟'' اُس کی نفرت پر سنجیدہ ہوتے ہوئے وہ ایک قدم مزید آگے بڑھا تھا جب وہ بولی۔

''تم اس سے بھی زیادہ بُرے ہو سانول شاہ' مگر کاش تمہیں اس کا احساس ہوتا۔''

''اچھا...... تمہارے ساتھ کیا بُرا کیا ہے میں نے؟''

''کیا بُرا کیا ہے؟ یہ مجھ سے پوچھ رہے ہو تم؟ تمہارے باپ اور دادا نے میرے پیارے پاپا کی جان لی تھی اور تم نے...... تم نے میرے سب سے اچھے دوست میران شاہ کو مجھ سے چھین لیا' کیا اس سے زیادہ بُرا کر سکتا ہے کوئی کسی کے ساتھ؟''

''بہت چاہتی تھیں تم میران کو؟'' انزلہ کے چلّانے پر بہت جلدی اُس کی آنکھوں کا رُخ بدلا تھا۔ اُس کا لہجہ بھی تبدیل ہوا تھا۔

انزلہ سسک کر رہ گئی۔

''جواب دو انزلہ بہت چاہتی تھیں تم میران کو؟''

''ہاں۔'' صرف غصے میں آ کر اُس نے کہا تھا ورنہ حقیقت میں میران اُس کا صرف بہت اچھا دوست تھا اور وہ خود اُس سے شادی کا خواہشمند تھا۔

سانول شاہ نے اُس کے جواب پر پوری شدت سے لب بھینچے تھے۔

''پھر تو مرنا ہی تھا اُسے انزلہ تم تو جانتی ہو' جو چیز مجھے اچھی لگتی ہے' وہ میں کسی کو نہیں دیتا۔''

''مگر میں کوئی چیز نہیں تھی' نہ ہی تم سے کوئی تعلق واسطہ تھا میرا۔''

''تو کیا ہوا۔ میرا تعلق واسطہ تو تھا ناں تم سے اِدھر میری طرف دیکھو انزلہ اور بتاؤ مجھے، کیا کمی ہے مجھ میں؟ اگر میرے باپ یا دادا کے ہاتھوں تمہارے باپ کا قتل ہوا تو اس میں میرا کیا قصور ہے میں تو تمہارے لیے ہر لحہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہوں' تم کبھی نگاہ تو کرو میری طرف۔'' تھم لہجے میں کہتا وہ واقعی نثار ہونے کو تیار تھا۔ انزلہ نے سائیڈ پر ہو کر اُسے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔

''بات سنو انزلہ'' ایک مرتبہ پھر نظر انداز کیے جانے پر وہ اندر سے ٹوٹا تھا مگر ظاہر کیے بغیر اُس نے خود کو سنبھال لیا۔

انزلہ رُکی تھی مگر اُس نے پلٹ کر پیچھے اُس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''میرے کس خاص شیطان سے ملنے جا رہی ہو۔'' وہ خود ہی چلتے ہوئے اُس کے برابر آیا جب وہ بولی۔

''شاہد حسین سے۔''

''شاہد حسین سے...... کیوں خیریت......؟''

''خیریت نہیں ہے' اُس سٹوپڈ انسان نے ادریس شاہ اور اُس کی بہن گوری کو اغوا کیا ہے۔''

"کیا......تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میں نے خود دیکھا تھا اُسے تمہاری جیپ میں بے ہوش ادریس شاہ کو ڈالتے' اسی سڑک سے ...ہارے ڈیرے کی طرف جاتے ہوئے۔"

"کتنے روز پہلے کی بات ہے؟"

"اسی ہفتے کی۔"

"چلو ٹھیک ہے' اس وقت تو شہر میں ہے وہ' میں کال کر کے بلواتا ہوں اُسے' پھر تمہارے سامنے ...اور اُس کی بہن کا پوچھوں گا' اس وقت تو شام ڈھل رہی ہے۔ خوبصورت لڑکیوں کا اس وقت ...باہر پھرنا ٹھیک نہیں' تم گھر جاؤ' شاہد جیسے ہی یہاں پہنچتا ہے میں خود اُس سے اس معاملے ...پہ کچھ کرتا ہوں۔" انتہائی نرم لہجے میں کہا اس بار وہ اُس پر مکمل مہربان دکھائی دے رہا تھا۔

انزلہ اُس کی یقین دہانی پر کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتی' پیچھے اپنے گھر کی طرف ...ال۔

❊❊❊

...ٹھٹھراتی سردی میں شام ڈھلنے کے بعد جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا بریرہ اُس سے اُلجھ ...ال۔

"کہاں سے آ رہے ہو' اس وقت؟"

شاہ زر کی آنکھیں خمار سے سُرخ ہو رہی تھی۔ وہ اُس کے سوال کے ساتھ ساتھ اُسے بھی نظر ...انداز کرتا آگے بڑھ آیا تو وہ مزید سلگ اٹھی۔

"میں نے کچھ پُوچھا ہے شاہ زر' جواب دو' پچھلے پُورے اٹھارہ گھنٹوں سے کہاں تھے تُم؟"

"چیخو مت بُریرہ' میرے سر میں پہلے ہی بہت درد ہو رہا ہے۔" اُس کا لہجہ بہت عجیب سا ...ہوا شکستہ۔

بُریرہ کی پلکیں ضبط کی ہزار کوششوں کے باوجود بھیگ گئیں۔

"بہت تکلیف ہوئی ہے تمہیں انوشہ کی شادی کی۔" تھکے تھکے سے انداز میں' کارپٹ پر بیٹھتے ...اس نے شاہ زر کے گھٹنوں پر ہاتھ دھرے تھے۔

"ہاں۔" اس بار اُس کا جواب بُریرہ کی توقع کے قطعی خلاف تھا۔

"پھر بھی تُم کہتے ہو کہ تُم اُس سے محبت نہیں کرتے۔" وہ درد کی کڑی منزل سے پھر گزری تھی۔ ...ر مضطرب سا اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں......نہیں محبت کرتا میں اُس سے' یہ صرف انسانی ہمدردی ہے اور کچھ نہیں۔"

"اچھا' اور جو تمہاری آنکھوں میں اُجڑی ہوئی بستیوں کے' بجھے ہوئے چراغ دکھائی دے رہے ...ہا"

"وہم ہے تمہارا' کیوں ہر وقت کھوجنے میں لگی رہتی ہو مجھے' فار گاڈ سیک بُریرہ۔ مت کیا کرو ...وہ سوال جو ہم دونوں کو اذیت دیتے ہیں۔"

اس کی آنکھوں کے گوشوں میں پھر نمی چھلکی تھی۔ بُریرہ نے اپنے بہتے آنسو پی لیے۔

''اوکے نہیں کرتی ایسے سوال لیکن کیا تمہیں احساس ہے کہ تمہارا یوں ہر وقت اُس کے غم میں کھوئے رہنا مجھے کتنی اذیت دیتا ہے۔ اپنی صحت کی طرف دیکھو پچھلے چند ماہ میں وقت نے کیا سے کیا بنا دیا ہے تمہیں......؟ اور تمہارا بزنس...... کیا تمہیں پتا ہے شاہ زر کہ صرف تمہاری بے پروائی کی وجہ سے پچھلے تین ماہ میں تمہاری کمپنی کو ساڑھے سات کروڑ کا نقصان ہوا ہے اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو بہت جلد یہ گھر بھی نیلام ہو جائے گا اور ہم...... ہم دونوں سڑکوں پر آ جائیں گے۔''

''تو تمہیں سڑکوں پر آنے کا خوف ستا رہا ہے؟''

''نہیں تمہارے ساتھ فٹ پاتھ پر زندگی گزارنے کا حوصلہ ہے مجھ میں مگر کتنے افسوس کی بات ہے شاہ زر کہ جس لڑکی کی ذات سے تم محبت کے دعوے دار بھی نہیں ہو اُسی لڑکی کے سائے نے تمہاری ساری زندگی کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ اُس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

شاہ زر اپنا کوٹ وہیں صوفے پر چھوڑ کر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ آیا۔

''بُریرہ۔''

وہ اُس کے پیچھے ہی آئی تھی جب اُس نے بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے ہولے سے اُسے پکارا۔

''ہوں۔''

''یہاں بیٹھو میرے پاس۔'' اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے بیڈ پر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے اُس نے پھر اپنی زیادتی کی تلافی کرنا چاہی تھی۔ بُریرہ اُس کی اس ادا پر پھر تلخی سے مسکراتے ہوئے اُس کے پہلو میں ٹک گئی۔

''ہاں کہو۔''

''بُریرہ! تم اتنی اچھی ہو اتنی پیاری ہو کہ اگر میں خود کو مار کر دس بار تم پر قربان کر دوں تو شاید تمہاری عظمت کا اعتراف نہ ہو سکے پھر...... پھر تمہیں کیوں لگتا ہے کہ اتنی پیاری ہم سفر کے ہوتے ہوئے میں کسی اور کو چاہوں گا۔''

''ہوں...... یہ تم خود سے پوچھو شاہ زر۔'' اُس کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے وہ پھیکے انداز میں مسکرائی تھی۔

''خود سے نہیں پوچھ سکتا بُریرہ کاش تم جان سکتیں کہ میں کتنی اذیت میں ہوں۔''

''یہی تو دکھ ہے شاہ زر کاش تم بھی یہ جان سکتے کہ کل رات ہزاروں وسوسوں کے ساتھ میں نے اس محل جیسے بڑے گھر میں تنہا تمہاری فکر کرتے ہوئے ہر لمحہ کتنی اذیت میں بسر کیا ہے۔''

''آئی ایم سوری بُریرہ میں تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتا تھا مگر......''

''اٹس اوکے...... کیا تم محض یہ بتانا پسند کرو گے شاہ زر کہ تم نے کل کی رات کہاں بسر کی؟''

''عباد کے ساتھ تھا اسی کے گھر۔''

''اوکے...... بھوک لگی ہو تو کھانا لاؤں؟''

''نہیں میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم بس میرے پاس بیٹھی رہو میں کچھ دیر میٹھی پر سکون نیند سونا چاہتا ہوں۔'' اُس کی آنکھیں بوجھل پن کے ساتھ بار بار بند ہو رہی تھیں۔ بُریرہ نے اپنے اندر اُٹھتی ہر ٹیس کو دباتے ہوئے اُس پر کمبل ڈال دیا اور خود اپنی گداز انگلیوں سے نرمی کے ساتھ اُس کے

سنبھالنے لگی۔

کتابِ عمر میں ہر ایک جا اُداسی ہے
متن سفید مگر حاشیہ اُداسی ہے
اُترتی جاتی ہے جو تہہ در تہہ اندھیروں سی
کچھ ایسی مرحلہ در مرحلہ اُداسی ہے
ملا نہ ہاتھ تجھے بھی اُداس کردیں گے
ہمارے ہاتھ پہ لکھا ہوا اُداسی ہے

❁❁❁

غروب ہوتے سورج کی اداس زرد کرنوں کی تپش آہستہ آہستہ مدہم پڑتی جارہی تھی۔

آج بڑے دنوں کے بعد اُسے نے بنا کسی غلط ارادے کے ایس پی شجاع کی بیٹی کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی پوری توجہ کے ساتھ سرانجام دیے تھے۔ قفل لگے لبوں اور بجھی ہوئی اُداس آنکھوں کے ساتھ اُس کی جیسے پوری شخصیت ہی بدل گئی تھی۔

ایس پی کی بیٹی نے اب اُس کی محبت کا اعتماد حاصل ہوتے ہی اُسی کی کوششوں سے تھوڑا تھوڑا چلنا اور زمین پر بنا کسی سہارے کے چلنا شروع کردیا تھا' جس پر شجاع کو خاصی خوشی ہوئی تھی۔ آج کل وہ خاصی تاخیر سے گھر واپس آرہا تھا۔ کچھ مصروفیات بڑھ گئی تھیں اور کچھ نئے کیسز نے اُسے اچھا خاصا الجھا رکھا تھا۔

اُس روز لان کی صفائی کے دوران چوکیدار نے اُسے بتایا تھا کہ شجاع کی شخصیت اپنی فیلڈ میں کافی بارعب اور قابلِ قدر تھی۔ اُس کا شاندار آفس سخت سیکیورٹی سے آراستہ تھا۔ چھوٹے موٹے کئی تھانوں کے مختلف افسران کو خاصا کھینچ رکھا تھا اُس نے' ایک بار امامہ نے گھر پر بھی اُس کی ''اتھارٹی'' کا مظاہرہ دیکھا تھا۔ جب علاقے کا ڈی ایس پی' کسی خصوصی مسئلے کے ساتھ اُس سے ملنے گھر آیا تھا اور شجاع نے کسی بات پر برہم ہوتے ہوئے خاصی خفگی کے ساتھ' اُسے کھری کھری سُنا کر رکھ دی تھیں۔

اُس روز کے بعد وہ اُس سے مزید ڈرنے لگی تھی اور اب چوکیدار بتا رہا تھا کہ اُس کی مزید پروموشن ہوگئی ہے جس کی وجہ سے اُس نے اپنے گھر پر ہی اپنے عزیز دوستوں کے لیے چھوٹی سی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔

امامہ نے اُس سے جاب چھوڑنے کا کہہ تو دیا تھا' مگر اب وہ یہ سوچ کر پریشان تھی کہ اگر شجاع نے کسی اور لڑکی یا خاتون کو اُس کی جگہ اپائنٹ کرلیا تو وہ کہاں جائے گی؟ کیا کرے گی؟ ارسلان حیدر کے گھر کے سوا اُس کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ یہی سوچ آج کل بار بار اُس کی پلکیں بھگو دیتی تھی۔ جس شخص کو رو رو کر اُس نے دعاؤں میں مانگا تھا' جس کے لیے وہ خود مٹ گئی تھی' اُسی شخص نے کیسے ٹھوکر مار کر محض چند لمحوں میں اُسے دو کوڑی کا کر دیا تھا۔ محبت کی اس ہار اور بے قدری پر اب تو آنسو بہاتے بہاتے بھی وہ ختم ہونے لگی تھی۔

چوکیدار بتا رہا تھا کہ شجاع کی پروموشن کے بعد اُس کا ٹرانسفر یقینی تھا' اور اب اُسے یہی سوچ

پریشان کر رہی تھی کہ اگر اُس کا کسی دور دراز کے شہر میں ٹرانسفر ہوگیا تو اُس کی جاب لازمی ختم ہوجائے گی اور یہ صورت حال اُس کے لیے نہایت پریشان کُن تھی۔ گڑیا اُس کی محبت کے باعث اب اُس سے بہت اٹیچ ہوگئی تھی اور یہ اُس کے لیے کسی قدر حوصلے کی بات تھی۔ اپنی اُلجھنوں میں گھری جانے کن سوچوں کی شکار‘ وہ اپنے لیے چائے بنارہی تھی‘ جب بھاپ اُڑاتی گرم چائے کو کپ میں انڈلتے ہوئے اُس کا ہاتھ ہل گیا اور چائے کپ کے بجائے اُس کے ہاتھ پر آگری۔

’’اف۔‘‘ تکلیف کی شدت پر وہ لب بھینچ کر رہ گئی تھیں۔

’’مس امامہ۔‘‘

’’ج... جی سر......‘‘ اچانک شجاع کی پکار پر رہی سہی چائے بھی بوکھلا کر وہ پاؤں پر گرا بیٹھی تھی۔

’’آپ ٹھیک تو ہیں؟‘‘

’’جی سر۔‘‘

’’لیکن کچن کا حال دیکھ کر تو نہیں لگتا کہ آپ ٹھیک ہیں اور یہ ہاتھ پر کیا ہوا ہے؟‘‘ وہ متوحش سا آگے بڑھ آیا تھا۔ امامہ نے بمشکل آنکھ میں اُمڈتے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا۔

’’ک... کچھ نہیں...... وہ...... میں اپنے لیے چائے بنارہی تھی تو پتہ نہیں کیسے ہاتھ پر گرگئی۔‘‘

شجاع پچھلے کئی دنوں سے اُس کی ذہنی ڈسٹربنس محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا اُس کے قریب چلا آیا۔

’’میرا خیال ہے آپ آج کل کچھ زیادہ ہی پریشان رہنے لگی ہیں۔‘‘

’’ن... نہیں...... تو......‘‘

’’آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے‘ مس امامہ......؟ میری زندگی میں کبھی کوئی کیس ایسا نہیں آیا جسے میں حل نہ کرسکوں‘ لیکن میرے لیے یہ حیران کُن بات ہے کہ میں کوشش کے باوجود آپ کا کیس حل کرنے سے قاصر ہوں۔‘‘

دونوں ہاتھ پینٹ کی پاکٹس میں گھسائے وہ خاصی سنجیدگی کے ساتھ اُس سے پوچھ رہا تھا۔ امامہ کا لہجہ کچھ کہنے کی کوشش میں بھرا گیا۔

’’او کے...... آپ اپنے زخم کو بینڈیج کرلیں‘ اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔‘‘ اگلے ہی پل سرد لہجے میں کہہ کر وہ واپس پلٹ گیا تھا۔

امامہ ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ‘ وہیں بیٹھ کر اپنے جلے ہاتھ کے زخم کا مشاہدہ کرنے لگی۔

❋❋❋

گاؤں سے سانول شاہ کی کال آئی تھی اور اُس نے فوری اُسے گاؤں واپس بلایا تھا۔ گوری بھی پھر اُسے سامنے دیکھ کر چیل کوؤں کی طرح اُس پر جھپٹ پڑی تھی۔ اب اُس کے دھکا دینے پر زور سے گری۔

’’تو بھی لگتا ہے اپنے بھائی کی طرح بے موت مرے گی میرے ہاتھوں۔‘‘ بجتے سیل کو جیب سے نکالتے ہوئے وہ غصے سے بولا اور کمرے سے باہر نکل گیا‘ تبھی گوری نے دیکھا تھا‘ وہ کسی بنائے گھر کا کمرہ تھا‘ مگر شاہد حسین کی موجودگی میں وہاں سے فرار کا سوچنا بھی محال تھا۔ اُس

کمرے میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی' وہاں ایک بستر کے ساتھ ساتھ سیمنٹ' ریت' بجری اور اینٹیں وغیرہ پڑی تھیں۔ وہ کمرہ جیسے ابھی حال ہی میں تعمیر ہوا تھا۔ گوری تھکے تھکے سے انداز میں بستر پر بیٹھ کر اپنا نفس بحال کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

شاھد حسین اُس کی توقع کے قطعی خلاف' بنا وہاں رُکے' کال سُن کر دروازہ باہر سے لاک کرتے ہوئے رخصت ہوگیا تھا۔ گوری کے لیے وہ کال کسی خُدائی مدد سے کم نہیں تھی۔ کمرے میں دو بلب لگے تھے ایک مدھم روشنی کے لیے اور دوسرا تیز روشنی کے لیے۔ اُس نے دونوں بلب جلائے رکھے اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ کمرے کے کمزور حصے کا مشاھدہ کرنے لگی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ تقدیر آگے اُس کے ساتھ کیا کرنے والی تھی مگر یہ طے تھا کہ اُسے اپنے جان سے پیارے بھائی کی ناگہانی موت کا بدلہ ضرور لینا تھا۔ اب اُسے یاد آرہا تھا کہ اُس روز جب ادریس ہمیشہ کے لیے گھر سے رخصت ہو رہا تھا' تو اُس کا دل کتنا پریشان تھا۔ کیسے کیسے وسوسے اُٹھ رہے تھے اُس کے اندر سے' وہ روتی جاتی تھی اور اُس کے اندر جلتی آگ مزید بھڑکتی جاتی تھی۔

کمرے میں دو الماریاں ایک اینٹ کے حساب سے بنی ہوئی تھیں' اُس نے وہیں پر ضرب لگانا طے کرلیا' دودھ مکھنوں سے پلی اُس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ لہٰذا جان جوکھوں والے کام اُس کے لیے خاص معنی نہیں رکھتے تھے اپنا ڈوپٹہ چارپائی پر پھینک کر اُس نے کونے میں پڑی بھاری اینٹ اُٹھائی اور الماری کو نشانہ بنانا شروع کردیا' ہر پڑتی ضرب کے ساتھ اُس کا جوش مزید بڑھتا جاتا تھا۔ ایک نازک اندام شہری لڑکی جو سوچ بھی نہیں سکتی تھی وہ اُس نے کر دکھایا تھا' اور اب دیوار میں اتنی جگہ بن گئی تھی کہ وہ مشکل سے مگر باہر نکل سکتی تھی۔

قرب و جوار میں اِکا دُکا گھر آباد تھے' وہ بنا اِدھر اُدھر دیکھے' ڈوپٹہ اچھی طرح اپنے وجود کے گرد لپیٹ کر تیز بھاگنا شروع ہوگئی۔ دُور مختلف گھروں اور سڑکوں پر جلتی روشنیاں اُس کے لیے امید کی ایک کرن تھیں' مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کا تعلق جس معاشرے سے ہے' وہاں مرد کی کھال پہن کر انسانی روپ لیے مختلف بھیڑیئے' آس پاس پھرتے ہیں۔ سردی سے ٹھٹھرتی' وہ سڑک پر تیز تیز چلتی' کسی جائے پناہ کی تلاش میں تھی' جب دو آوارہ لڑکے اُس کے پیچھے لگ گئے!

''اتنی رات کو اکیلی جارہی ہے' چل حسیب چھوڑ آتے ہیں گھر۔'' وہ بہادر تھی' مگر موجودہ صورت حال ایک جوان لڑکی ہونے کی حیثیت سے اُس کے لیے پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ اس کے قدموں میں مزید تیزی آگئی۔

''آئے ہائے۔ چال تو دیکھو مس ورلڈ کی' لگتا ہے ریس کے مقابلے سے بھاگ کر آرہی ہے۔'' اس کے پیچھے اُن لڑکوں کے قدموں کی چال میں بھی تیزی آگئی تھی۔ وہ تھک کر رُک گئی۔

''تم لوگوں کو کوئی مصیبت ہے کیا؟''

''نہیں' ہم تو اپنی راہ جارہے ہیں۔''

''تو بکواس کیوں کر رہے ہو' چُپ کرکے نہیں چلا جاتا؟''

''کیوں چلیں چُپ کرکے' تجھے بل آتا ہے ہمارے بولنے کا۔''

دونوں ایک نمبر کے خبیث تھے۔ گوری کی سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا تو وہیں ایک گھر کی سیڑھیوں

پر بیٹھ گئی۔
''مرو......اور جاؤ جہاں جانا ہے' شرم وحیا تو تم لوگوں میں ہے نہیں۔''
''ہم کیوں مریں' تم مرو جو اتنی رات کو گھر والوں کو دھوکہ دے کر گھر سے فرار ہو رہی ہو۔'' وہ بھی بکواس کرتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئے تھے۔
گوری نے اشتعال میں پاس پڑا ایک چھوٹا سا پتھر اُٹھایا اور رکھ کر چپڑ چپڑ کرتے لڑکے کے سر پر دے مارا۔
''اب بول بے غیرت' کیسے کسی مجبور و بے بس لڑکی کو تنگ کرتا ہے۔'' مارے اشتعال کے اُس نے زمین پر تھوکا تھا' جواب میں لڑکے کے ساتھی نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔
''کیا تو خود کو کسی پہلوان کی اولاد سمجھتی ہے؟''
''ہاتھ چھوڑ میرا' نہیں تو تیرا بھی تھوبڑا توڑ کر رکھ دوں گی۔'' گوری چلاّئی تھی جب کہ وہ بولا۔
''توڑ......ایسی تمیں مار خان ہے تُو۔'' اُس کے بازو کو موڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے وہ اپنے غلیظ اسٹائل میں بولا تھا' گوری تھکن اور تکلیف کا شکار ہونے کے باوجود غُرانا نہ بھولی۔
''ہاتھ چھوڑ میرا' پھر دکھاتی ہوں تجھے کہ میں کیا چیز ہوں۔''
اُس کے سر میں ابھی بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ اُسی پل کوئی ہاتھ روزمرہ اشیاء کے کچھ شاپرز تھامے اُس کے قریب آ رکا۔
''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' آنے والے کے لہجے میں گرج تھی' لڑکے نے فوری اُس کا ہاتھ چھوڑا دیا۔
''سمعان بھائی......یہ لڑکی بہت تنگ کر رہی ہے۔''
''بکواس بند کر' لڑکی تجھے تنگ کر رہی یا تُو لڑکی کو تنگ کر رہا ہے؟''
گوری نے سر اٹھا کر دیکھا' اونچا لمبا تیکھے نقوش کا حامل وہ شخص اُس کے قریب کھڑے لڑکے پر خوامخواہ رُعب جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔
''یہی تنگ کر رہی تھی سمعان بھائی! قسم لے لیں' یہ دیکھیں رشید کا سر بھی پھاڑ ڈالا ہے اس ہٹلر نے۔'' سمعان نے اُس کے کہنے پر ایک نظر رشید کے پھٹے ہوئے سر کی طرف دیکھا۔ پھر گوری سے پوچھنے لگا۔
''کون ہو تم؟''
''مصیبت کی ماری ہوں' یہ دونوں کمینے پچھلے آدھے گھنٹے سے میرا پیچھا کرتے ہوئے گھٹیا بکواس کر رہے تھے' اسی لیے سبق سکھانا پڑا۔'' گوری کے تُرنت جواب پر وہ بے ساختہ اُمڈنے والی اپنی مسکراہٹ کو چھپا نہ سکا۔
''بڑی جی دار لڑکی ہو......کیا تمہیں نہیں پتا اس ٹائم اکیلے گھر سے نکلنا' ایک اچھی شریف لڑکی کے لیے کسی طور مناسب نہیں۔''
''پتا ہے' لیکن قسمت کے لکھے کے آگے کسی کا زور نہیں چلتا' میں نہ گھر سے بھاگی ہوں نہ کسی سے ملنے کے لیے نکلی ہوں' بس اپنی جان اور عزت کی حفاظت کے لیے کسی ظالم صیاد کی قید سے رہائی

ال ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کا لہجہ بھاری ہو گیا تھا۔
سمعان نے کچھ دیر جانچتی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا' پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
"اگر ایسی بات ہے تو میرے گھر چلو' اسی روڈ کی دوسری گلی میں گھر ہے میرا' ماں ہے گھر میں اور دو بہنیں ہیں' چاہو تو اعتبار کر سکتی ہو۔"
گوری کے پاس اُس کی آفر قبول نہ کرنے کی صورت میں دوسرا کوئی آپشن نہیں تھا' لہٰذا خُدائی دا اٹھتے ہوئے وہ اُس کے پیچھے چل پڑی۔
کوڑا کرکٹ اور گندے پانی سے بھری اُس چھوٹی سی تنگ گلی میں خاصا خستہ حال مکان تھا اس کا' گوری نے اپنا ڈوپٹہ ناک پر رکھ لیا۔ اُس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تقدیر ایک دن بھی ایسا دن بھی دکھائے گی اُسے۔ پُرانی لکڑی کے گُھن لگے دروازے میں جونہی اُس نے پہلا قدم رکھا' ایک پاٹ دار نسوانی آواز حلق پھاڑتے ہوئے اُس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔
"جا دفع ہو جا کہیں جا کر کمینے' ایسی کمر توڑ مہنگائی میں اپنا وجود کاٹ کر کھلاؤں تمہیں' ایک وقت کی روکھی سُوکھی روٹی مل جاتی ہے یہی بہت ہے۔"
وہ آگے بڑھنے سے جھجکی تھی مگر اُس سے دو قدم آگے چلتے سمعان نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔
"آ جاؤ۔ یہاں یہ راگ معمول کا حصہ ہیں۔"
وہ اُس کے کہنے پر صحن میں آئی تھی جہاں چار پانچ چارپائیاں بچھی تھیں' جن کی وجہ سے چھوٹا سا صحن سارا چھپ گیا تھا۔ دروازے کے ایک طرف باتھ بنا تھا اور اس سے کچھ ہی فاصلے پر ہینڈ پمپ نصب تھا' جس کے بے دریغ استعمال نے وہاں صحن میں بھی اچھا خاصا کیچڑ پھیلا رکھا تھا۔ ہینڈ پمپ سے کچھ ہی فاصلے پر اُن لوگوں نے اپنا مٹی کا چولہا رکھ رکھا تھا جس کے گرد زمین پر رنگ رنگ کے بہت سے برتن پھیلا رکھے تھے' اور وہ سب جُھوٹھے تھے۔ گوری کو اتنا گند بکھرا دیکھ کر ابکائی سی آ گئی۔
"ارے' یہ کون ہے؟" اپنے بچوں کے ساتھ جھگڑتی عورت کی نگاہ بالآخر اُس پر جا پڑی تھی' اور اب وہ خاصے کڑے تیور کے ساتھ اُسے گھور رہی تھی۔ گوری خود میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ سمعان اُس کی مدد کو ماں کے قریب بڑھا تھا۔
"مشکوک نظروں سے نہ دیکھ ماں' مصیبت کی ماری ہے۔"
"ارے تو ہم کم مصیبت کے مارے ہیں۔ پہلے ہی دو وقت کی روٹی پُوری نہیں ہوتی اور تُو ایک اور وجود کو کھینچ لایا' دماغ ٹھیک ہے تیرا' یہ گھر ہے' کوئی ایدھی سینٹر نہیں جو ہر مصیبت کا مارا منہ اُٹھائے یہاں چلا آئے۔" اُس کی بات پُوری سُنے بغیر اُس کی ماں نے اپنا غصہ نکالا تھا۔ وہ جُز بز سا اُٹھ کھڑا ہوا۔
"خود نہیں آئی ہے وہ' میں لایا ہوں۔ بہنوں جیسی محترم ہے میرے لیے وہ۔ کچھ دن دو روٹی کھا بھی لے گی تو کوئی پہاڑ نہیں ٹوٹ گرے گا یہاں' اُس کی روداد تو سُن لو کم از کم۔"
"چُپ کر تُو ...... مجھے اچھی طرح پتہ ہے' یہ خوبصورت لڑکیاں یونہی مسکین بن کر' تم بدھوؤں کو بیوقوف بنا کر گھروں میں گھستی ہیں اور پھر سب کچھ سمیٹ کر رفو چکر ہو جاتی ہیں۔ میں نہیں ایسا خطرہ مول لینے کی۔"

گوری کو لگا اُس عورت نے کھڑے کھڑے جیسے اُس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا ہو۔
سمعان ایک اجنبی لڑکی کے سامنے اپنی ماں کی اس درجہ ''عزت افزائی پر'' پاؤں پٹخ کر رہ گیا۔
''خدا کا واسطہ ہے ماں' عقل سے کام لے' ہمارے اس ''محل'' میں کون سے قیمتی ہیرے جواہرات پڑے ہیں جو یہ چُرا کر لے جائے گی۔ ایک عورت ہونے کے ساتھ ساتھ تُو ایک ماں بھی ہے۔ کچھ تو سوچ۔'' کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اچھی خاصی بدتمیزی کر جاتا مگر یہ وقت تڑی دکھانے کا نہیں تھا۔ اُس کی ماں نے اس بار اُس کے سخت لہجے پر ناگوار نگاہوں سے گوری کی طرف دیکھا تھا۔
''کون ہے تُو......اور نام کیا ہے تیرا؟'' سمعان کی سخت مزاج والی ماں کے پہلے براہ راست سوال کے جواب میں اُس نے خاصے بجھے بجھے سے انداز میں کہا تھا۔
''گوری......گوری نام ہے میرا' یہاں پاس ہی ایک گاؤں ''شاہ والا'' سے تعلق ہے میرا۔''
''گھر سے کیوں بھاگی۔'' اگلا کڑا سوال سن کر اُس کا سر آپ ہی آپ جھک گیا۔
''گھر سے نہیں بھاگی میں بلکہ میرے شوہر نے مجھے میرے بھائی کے گھر سے اغوا کیا تھا۔''
''شوہر نے؟'' اُس عورت کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں جبکہ سمعان بھی چونک کر اُسے دیکھنے لگا تھا۔
''ہاں۔''
''کیوں......شوہر نے کیوں اغوا کیا؟'' اگلا سوال ہوا تھا۔ سمعان چڑ گیا۔
''اُسے آرام سے بیٹھنے تو دے ماں۔ کھڑے کھڑے ساری کہانی سُن لے گی کیا؟''
''اچھا' اچھا رُعب نہ ڈال' چل بیٹھ جا لڑکی۔'' اُس کا انداز اب بھی کرخت تھا۔ گوری ممنون نگاہوں سے سمعان کی طرف دیکھتی قریبی چارپائی پر سکڑ کر بیٹھ گئی۔
''چل اب بتا شوہر نے کیوں اغوا کیا تجھے؟''
''ظلم کرتا تھا مجھ پر' میری اور میرے اکلوتے بھائی کی ایک ہی گھر میں وٹے سٹے کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد نہ میری بھابھی کا سلوک میرے بھائی کے ساتھ اچھا رہا' نہ میرے شوہر کا مجھ سے۔ روزانہ جانوروں کی طرح مجھے پیٹتا' گندی گالیاں دیتا اور پھر غصہ اُترتے ہی معافی مانگ لیتا۔ میرے بھائی نے اُسے کئی بار خبردار کیا' مگر وہ نہیں سمجھا' تنگ آ کر بھائی مجھے اپنے گھر لے آئے اور بھابی کو اُس کے بھائی کے گھر بھجوا دیا۔ اس پر بھی اُسے کوئی سبق نہیں ملا اور وہ روز میرے بھائی کے گھر آ کر مجھے مختلف قسم کی دھمکیاں دیتا' بھائی کے گھر بیٹھا ہوا' اور وہ اُس سے ملنے گیا تو وہاں پر بھی اُس نے میرے بھائی کی بہت بے عزتی کی' اُس کے بعد بھائی نے میری طلاق کے لیے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا' مگر اُس کی ہٹ دھرمی پر مجبوراً اُسے یہ معاملہ گاؤں کی پنچائیت کے سامنے رکھنا پڑا۔ میرے شوہر کو اسی بات کا رنج تھا' اسی لیے اُس نے دھوکے سے میرے بھائی کو قتل کر کے' مجھے اغوا کر لیا تاکہ اپنی ضد پوری کر سکے۔''
''اللہ......تو پھر تُو اُس کے چنگل سے نکلی کیسے؟''
''رب سوہنے کی مدد سے۔''
''سمعان مجھے تو ڈر لگ رہا ہے' اگر وہ لڑکا اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں آ گیا تو ہم سب کو مار ڈالے گا۔''

گوری کی کہانی سُن کر سمعان کی ماں خاصی خوف زدہ ہوئی تھی جب کہ وہ بولا۔
''اب ایسا بھی اندھیر نہیں مچا ماں' تھوڑے حوصلے سے کام لے' اُس کو خواب نہیں آجائے گا کہ ہمارے گھر ہے۔''
''دیکھ لے ساری تیری ذمہ داری ہے۔ پہلے ہی ایک بیٹا جیل میں ہے میرا۔''
''اللہ کرم کرے گا۔ تُو چائے بنا' پتہ نہیں بے چاری نے کچھ کھایا پیا بھی ہوگا کہ نہیں۔''
سمعان کے آگے اُس کی ماں کی کم ہی چلتی تھی۔
گوری نے پھر دوپٹہ اپنی گردن کے قریب اچھی طرح لپیٹ لیا۔
''صائمہ اور صائقہ نظر نہیں آرہیں' کہیں گئی ہیں کیا؟''
ارے جانا کہاں ہے۔ اوپر چھت پر روٹیاں بنارہی ہیں' لگ گئی ہوں گی ساتھ والی کے ساتھ ٹھٹھے لگانے۔ ان لڑکیوں کو کون سا دوسرا کام ہے۔'' ان کا نزلہ اپنی بیٹیوں پر گرنے لگا تھا۔
سمعان اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر گوری کے سامنے والی چارپائی پر آبیٹھا۔
''مائینڈ نہ کرنا سسٹر' میری ماں جتنی بُری نظر آرہی ہے' اتنی بُری ہے نہیں۔ دل کی بہت اچھی ہے۔ بس کیا کریں' حالات نے انہیں ایسا کڑوا بنا دیا ہے۔ تیرہ چودہ سال کی تھی جب ماں باپ نے بیاہ دیا' اچھی طرح باشعور ہونے تک ہم چار بہن بھائی ان کی گود میں آچکے تھے۔ میں سب سے بڑا ہوں' مجھ سے چھوٹا ایان ہے' وہ بڑا خراب دماغ والا ہے' ابھی پچھلے دنوں مار پیٹ کے سلسلے میں کوئی چوتھی بار جیل گیا ہے۔ اُس سے چھوٹی صائمہ اور صائقہ ہیں' وہ دونوں جڑواں ہیں۔ دِکھنے میں بھی ایک جیسی لگتی ہیں۔ مگر مزاج دونوں کا ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہے۔ ابھی روٹیاں پکا کر نیچے آئیں گی تو دیکھ لینا۔ اس کے علاوہ یہ جو چھوٹے چھوٹے بچے نظر آرہے ہیں' یہ اماں کے دوسرے شوہر کی نشانیاں ہیں' میرے ابا کی رحلت کے بعد میری ماں نے بھری جوانی میں بیوہ ہو کر میرے چھوٹے چچا سے نکاح کر لیا تھا۔ اُسی سے یہ تین چھوٹے چھوٹے بلونگڑے پیدا ہوئے ہیں۔ ابھی چھ ماہ قبل انتقال ہوا ہے چچا کا۔ اُن کے انتقال کے بعد میں نے تعلیم چھوڑی ہے اور اب مجبوراً ٹھیلا لگاتا ہوں۔ پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے درخواست دے رکھی ہے' دیکھوں کیا بنتا ہے۔ اپنے پاس تو نہ رشوت ہے نہ سفارش' اور ان دو چیزوں کے بغیر یہاں پاکستان میں کسی کی بات بنتی نہیں۔ ایان البتہ اماں کو ستانے کے سوا اور کچھ نہیں کرتا۔ یہاں محلے کے سارے لڑکے اُس کی غنڈا گردی سے ڈرتے ہیں اس لیے میرا بھی احترام کرتے ہیں۔ وہ شہزادہ ہے اس بستی کا مگر بڑا ضدی اور ہٹ دھرم ہے ایک نمبر کا آوارہ......''
اپنے گھر کا تفصیلی تعارف کروا کر وہ اب اپنے بھائی کی شان میں ''قصیدے'' پڑھ رہا تھا۔ گوری غائب دماغی سے اُس کی باتیں سنتی' بہت غور سے چولہے کی طرف دیکھ رہی تھی جس پر پڑی چائے کے اندر اب اُبال اُٹھ رہے تھے۔ اُس وقت اُسے وہ چائے اپنے اندر اُٹھتے ابالوں کا بہترین عکس دکھائی دے رہی تھی۔

❊❊❊

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔''

شجاع فُل توجہ سے کسی کیس کے مطالعے میں مصروف تھا جب وہ اُس کے اسٹڈی روم کا دروازہ ہلکے سے ناک کرتے ہوئے روم میں چلی آئی۔

''جی کہیئے۔'' اُس کا انداز وہی تھا۔ بے حد اجنبی اور سرد وہ اُسے محض ایک نظر دیکھ کر سر جھکا گئی۔

''آپ......آپ کی پرموشن ہوگئی ہے۔ بہت بہت مبارک ہو' وہ چوکیدار بتا رہا تھا کہ آج کل میں آپ کا ٹرانسفر بھی ہو جائے گا اور آپ یہاں سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں گے۔''

''تو۔''

''تو......تو......وہ......میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ میں...... میں یہ جاب چھوڑنا نہیں چاہتی' آپ کی بیٹی مجھ سے خاصی اٹیچ ہوگئی ہے' بڑی اچھی اچھی باتیں سیکھ رہی ہے۔ آج کل' اگر سچ کہوں تو اب میرے لیے بھی اُس کے بغیر رہنا مشکل ہوگا۔ اس لیے' اس لیے پلیز آپ جہاں بھی جائیں' میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔''

''ٹھیک ہے......اور کچھ......'' وہ شاید زیادہ ہی مصروف تھا۔

امامہ دھیرے سے نفی میں سر ہلا کر پھر اُسے دیکھنے لگی۔

''کیا اسی بات کے لیے اتنی پریشان تھیں آپ؟'' وہ اب توجہ سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

امامہ نے بنا کچھ کہے محض اثبات میں سر ہلا دیا۔ جس پر وہ کچھ لمحے مزید اسے خاموش نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

''آپ ٹینشن نہ لیں' فی الحال میں کہیں نہیں جا رہا' ٹرانسفر ہو بھی گیا تو گھر شفٹ نہیں کروں گا' آج کل کچھ کیسیز کی وجہ سے بہت مصروف ہوں' اس لیے گھر آنے میں تاخیر بھی ہو جاتی ہے لیکن آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں' کیونکہ گورنمنٹ کی طرف سے یہاں چار گارڈ ہیں جن کی صبح و شام کی ڈیوٹی ہے۔ اُن کے علاوہ میں جتنے چاہوں اُتنے سپاہی یہاں متعین کر سکتا ہوں۔ آپ یہاں مکمل محفوظ ہیں' اس لیے کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں' نہ ہی پریشان ہونے کی۔ سمجھ گئیں آپ؟''

''جی۔''

''اب کام کر لوں؟''

اُس کے ''جی'' پر پھر بظاہر سخت مگر اپنائیت بھرے انداز میں اُس نے پوچھا تو وہ ایک مرتبہ پھر جلدی سے اثبات میں سر ہلا کر واپس پلٹ گئی۔ اُس رات بہت دنوں کے بعد وہ' عشاء کی نماز پڑھ کر' گڑیا کو سُلاتے ہوئے جلدی سو گئی تھی۔

شجاع اپنے کام سے فارغ ہو کر گڑیا کے کمرے کی طرف آیا تو وہاں عجیب ہی نظارہ دیکھنے کو ملا۔ اُس کی بیٹی امامہ کی بانہوں میں یُوں چھپ کر سو رہی تھی جیسے ماں کی آغوش ہو۔ جبکہ امامہ کا اپنا چہرہ اتنا نورانی ہو رہا تھا کہ وہ ارادہ نہ ہونے کے باوجود اُسے بے خبری میں سوئے ہوئے دیکھتا رہا۔

ایک لمحہ لگا تھا اُسے ماضی پر نگاہ دوڑانے میں اور اس ایک لمحے میں وہ جیسے پھر سے اُدھڑ کر رہ گیا تھا۔

زخم زخم یادوں کے ڈھیر تھے اور درمیان میں اس کا سلگتا وجود۔

وہ گڑیا کے کمرے سے نکلا اور معمول کے مطابق باہر لان میں آ بیٹھا۔

''صاحب...... چائے لاؤں؟'' اُسے لان میں بیٹھے دیکھ کر باورچی فوراً اُس کے قریب دوڑا چلا آیا تھا۔ جواب میں اُس نے گہری سانس بھرتے ہوئے سر کرسی کی پُشت سے ٹکا دیا۔

''ہاں دو کپ لانا۔''

''جی صاحب...... ابھی لایا......''

وہ سخت مزاج کا حامل نہیں تھا مگر اس کے باوجود گھر کے سبھی ملازمین اُس کے سامنے آتے ہوئے کپکپاتے تھے۔ آج بہت سالوں کے بعد پہلا دن تھا جب وہ اپنی زندگی سے ہٹ کر کسی اور کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

❃❃❃

وہ گم صم سی اپنے بیڈ پر بیٹھی' اپنی کلائی میں پڑی کانچ کی چوڑیوں کو بے دردی سے توڑتے ہوئے اپنی کلائی زخمی کر رہی تھی' جب عبدالصمد کمرے میں داخل ہوا۔ اُسے ابھی ابھی اپنے دوستوں سے فرصت ملی تھی تو وہ لوٹ کر گھر آیا تھا۔

انوشہ نے کمرے میں اُس کی موجودگی محسوس کرتے ہی فوراً اپنے ڈوپٹے سے زخمی کلائی پونچھ لی۔ عبدالصمد صوفے پر اُس کے مقابل بیٹھ گیا۔

''سوری مجھے گھر واپسی میں دیر ہوگئی۔ آپ کو ڈر تو نہیں لگا۔''

شادی کے بعد دوسری بار وہ اُس سے براہ راست مخاطب ہو رہا تھا۔ انوشہ نے اُسے یوں سر اٹھا کر دیکھا جیسے اُس سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

''نہیں...... مجھے تنہائی سے ڈر نہیں لگتا۔''

''چلو اچھی بات ہے' مجھے ایسی ہی بیوی کی خواہش تھی۔ جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر موڈ نہ بگاڑے' اور ذرا سی بات کو لے کر جھگڑا نہ کرے' بے وجہ ناز نہ اُٹھوائے اور کبھی گھر واپسی میں تاخیر ہو جائے تو بچوں کی طرح ڈرتی نہ پھرے۔''

''اور کچھ؟'' اور کچھ جیسے وہ دل میں بولی تھی۔ جبکہ وہ کہہ رہا تھا۔

''میرے ساتھ رہو گی تو آہستہ آہستہ ساری باتوں کا پتا چل جائے گا۔ یہاں اس گھر میں تمہیں کبھی کسی چیز کا احساس نہیں ہوگا۔ میں یہ کوشش بھی کروں گا کہ تمہیں میری ذات سے کوئی شکایت نہ ہو' بس اتنا خیال رکھنا کہ میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی مت کرنا کیونکہ مجھے اپنے ذاتی معاملات میں دخل اندازی بالکل برداشت نہیں۔''

اُسے شاید گمان نہیں تھا کہ وہ پتھر کے مجسمے سے مخاطب ہے۔

انوشہ نے اُس کی نصیحت پر پھر محض سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ کیونکہ اُس کے ذاتی معاملات سے اُسے کسی قسم کی کوئی غرض بھی نہیں تھی۔

اگلے روز ابھی اُس کا شوہر گھر پر ہی تھا کہ اُس کے گھر کی ڈور بیل بج اُٹھی' وہ کچن میں تھی لہٰذا دروازہ عبدالصمد نے ہی کھولا تھا۔ وہ آنے والی شخصیت کو نہیں دیکھ سکی مگر ہاں کمرے سے آتی آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ آنے والا اُس کے شوہر کا کوئی قریبی تھا۔ تبھی اُس کے شوہر نے اُسے آواز لگائی تھی۔

''انوشہ...... ناشتہ لگادو' میں آفس سے لیٹ ہورہا ہوں۔'' ساتھ ہی کسی سے باتیں کرتے ہوئے اُس نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ انوشہ جلدی جلدی آملیٹ بنا کر چائے اور پراٹھے کے ساتھ جونہی کچن سے باہر آئی' عبدالصمد کے ساتھ بیٹھی شخصیت کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

''سر......آپ......اور یہاں......؟''

ذہنی حالت نہایت ابتر ہونے کے باوجود اُس نے اپنے سامنے بیٹھے سرزمان کو فوراً پہچان لیا تھا۔ جس پر وہ دھیمے سے مسکرائے تھے۔

''جی' السلام علیکم۔'' اپنے مخصوص انداز میں نرمی سے مسکراتے ہوئے وہ کھڑے ہوگئے تھے' انوشہ کی پلکیں اپنے اُس محبوب استاد کو سامنے پا کر بھیگ گئیں۔

''وعلیکم السلام......آپ یہاں کیسے......؟''

''میں......یہیں رہتا ہوں۔ اسی روڈ پر' شادی کے موقع پر دیکھا تھا آپ کو' اُس کے بعد سنڈے کو ملنے بھی آیا تھا' مگر یہاں آکر پتہ چلا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لیے چائے پی کر چلا گیا۔ اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

''اب تو ٹھیک ہوں سر' الحمدللہ' مجھے بہت خوشی ہورہی ہے آپ کو یہاں دیکھ کر۔''

''ہاں وہ تو ہوگی۔ آخر اتنی قابل اسٹوڈنٹ تھیں' مگر ایگزیم سے پہلے آپ کی یونیورسٹی چھوڑنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی مجھے' سچ پوچھیں تو مجھے بہت دکھ ہوا تھا کیونکہ مجھے یقین تھا آپ ضرور ٹاپ کریں گی۔''

''میں نے ٹاپ ہی تو کیا ہے سر!'' سامان ٹیبل پر رکھ کر سر جھکاتے ہوئے بہت مدھم لہجے میں اُس نے کہا تھا' جب کہ وہ پھیکے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔

''ہاں شادی کرنا بھی کسی ٹاپ سے کم تھوڑی ہے' بہر حال یہ صمد بہت اچھا دوست ہے میرا' جب چاہو اس کی شکایت کرسکتی ہو۔''

انوشہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ پہلے سے بہت کمزور ہوگئے تھے۔ وہ اپنے آنسو اندر گراتی اُن سے اُن کی زندگی کے بارے میں اِدھر اُدھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہی۔

❋❋❋

''نفرت ہے مجھے عدالتوں سے' سناتم نے' شدید نفرت کرتا ہوں میں انصاف کے کٹہروں میں بیٹھے ان بے ضمیر ناخداؤں سے......''

وہ بے خبر سورہا تھا کہ اچانک اس تیز چنگھاڑ پر آنکھوں سے بازو ہٹاتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ اُس کی بیرک میں شاید وہ نیا پنچھی تھا۔ ایان خوب توجہ سے اُسے دیکھنے لگا۔ جس کا چہرہ جذبات کی شدت سے سُرخ ہورہا تھا۔

''عدالتوں کی کہانیاں سُنو گے......؟ جاننا چاہو گے کہ کیا ہوتا ہے عدالتوں میں......؟ پولیس والوں سے ڈرتے ہو تم' میں بتاتا ہوں تمہیں کہ چھوٹے شہروں کی عدالتوں میں انصاف کی کُرسی پر بیٹھے نااہل جج کیسے محض قلم کی ایک جنبش کے ساتھ' انسانی زندگیوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔''

اُس کے ساتھ ساتھ اب بیرک کے دوسرے لوگ بھی اُس نئے آنے والے پنچھی کی طرف

ہو گئے تھے۔ اُسے شاید اُسی بیرک کا کوئی لڑکا' انصاف کے حصول کے لیے' عدالت کا نام لے کر بیٹھا تھا۔

❊❊❊

محبت اس طرح جیسے گلابی تتلیوں کے پر
محبت زندگی کی جبینِ ناز کا جھومر
محبت آرزو کے سیپ کا انمول سا گوہر
محبت آرزو کی دھوپ میں امید کی چادر
محبت ہی میرے گیسو' میری پلکیں' میری آنکھیں
محبت تیری خاموشی' محبت ہی تیری باتیں
محبت ہی تمہارے ہجر کی اور وصل کی راتیں
محبت ہی تیری دھڑکن' محبت ہی میری سانسیں
محبت تیری خاموشی' تمہاری بات جیسی ہے
محبت کو اگر سمجھو' تمہاری ذات جیسی ہے!

"کاش..... میں تمہیں بتا سکتا کہ مجھے زندگی سے کتنی نفرت ہے۔"

اس کا جوش کم پڑا تھا اور وہ بیرک کی سلاخ سے ہاتھ چھڑاتا نیچے زمین پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔

ایان کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ بکھر کر رہ گئی۔

"یہ جو جیل ہوتی ہے ناں..... یہ مجرم پیدا کرتی ہے اور یہ جو سرکاری وردی پہن کر قانون کے رکھوالے بنے پھرتے ہیں' یہ بناتے ہیں ہمیں مجرم..... کس انصاف کی بات کرتے ہو تم' جیل کی چار دیواری سے لے کر' عدالت کی اونچی کرسیوں تک ایک ہی کہانی چلتی ہے' ضمیر اور ایمان کی فروخت کی کہانی۔"

وہ جو کوئی بھی تھا یہ طے تھا کہ اس کے اندر بہت حبس بھرا تھا۔

ایان ابھی اٹھ کر اس کے قریب جانا ہی چاہتا تھا کہ باہر کا دروازہ کھول کر ایک تنومند سپاہی اندر گھس آیا۔

"چپ کر اوئے..... بہت پٹر پٹر زبان چلتی ہے تیری۔" اندر آتے ہی اس نے نووارد کو لات ماری تھی جس پر بیرک کے دیگر قیدی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے تھے' جبکہ نووارد نوجوان منہ کے بل زمین پر گرا تھا۔

"بہت کہانیاں آتی ہے تجھے جیلوں اور عدالتوں کی' اب ذرا چار دن اس جیل میں رہے گا تو ساری کہانیاں دماغ سے نکل جائیں گی۔"

پنجوں کے بل بیٹھ کر نوجوان کے بال مٹھی میں جکڑتے ہوئے اس سپاہی نے اپنی "طاقت" اور "اختیار" کا "جائز" استعمال کیا تھا۔ جس پر نوجوان چلّا اٹھا۔

"چھوڑو مجھے......"

"بہت شور کرنا آتا ہے تجھے' چل باہر نکل' آج تیری خدمت کرتے ہیں۔" اپنے مخصوص پیشہ

ورانہ انداز میں نوجوان کو وارن کرتے ہوئے وہ سپاہی بیرک سے نکلا اور اپنے افسر کی خدمت میں پیش ہو گیا۔

''سر...... سیف نامی جو نیا لڑکا بیرک میں آیا ہے' بہت تنگ کر رہا ہے سر۔''

''اچھا...... کیا کر رہا ہے؟''

جیل کا افسر جو سیل فون پر کسی سے باتوں میں مشغول تھا اس کی شکایت پر فوراً متوجہ ہوا۔

''جیل کا ڈسپلن خراب کر رہا ہے سر' فضول چلا چلا کر دوسرے قیدیوں کا دماغ خراب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''اچھا...... تو لے آؤ باہر' کر دیتے ہیں دماغ ٹھنڈا۔''

سیل فون بند کر کے اس نے شکایت کرنے والے سپاہی کو حکم دے کر مزید دو تین سپاہیوں کو طلب کر لیا۔

''جی سر۔'' سپاہی جو گپوں میں مصروف تھے اپنے جیل انچارج کے بلاوے پر فوراً حاضر ہوئے۔

''اوئے اسے دیکھو' بڑی گرمی چڑھی ہے اس کے دماغ کو' ٹھنڈا کرواسے۔''

بنا اپنے طور سے معاملے کی تحقیق کیے' جیل کے قوانین کو سائیڈ پر رکھ کر' اس نے اپنے ''جائز'' حق و اختیار کا استعمال کیا تھا۔ بیرک کے دیگر قیدی اس ظلم پر سراپا احتجاج بن گئے' مگر وہاں جیل کی اونچی دیواروں کے اندر ان کے احتجاج کو خاطر میں لانے والا کوئی نہیں تھا۔

اگلے دو گھنٹے' شدید سردی میں بیرک کے قیدی نو وارد کی دل دہلا دینے والی چیخیں سنتے' بے قراری سے پہلو بدلتے رہے تھے۔ ایان اس سے پہلے بھی اس اذیت سے کئی بار گزر چکا تھا۔ لہٰذا وہ کسی قسم کی پریشانی لیے بغیر دوبارہ آنکھوں پر بازو رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

❊❊❊

اگلے روز ایک اجنبی گھر میں طلوع ہونے والی نئی صبح گوری کے لیے خاصی تکلیف دہ تھی۔

اس کی آنکھ تیز جھنکار والے بے ہودہ گانے کے شور سے کھلی تھی' تاہم آنکھ کھلتے ہی بی اماں اور اپنے جان سے پیارے بھائی ادریس کے خیال نے اسے پھر سے دکھی کر دیا۔ صحن میں جھاڑو دی جا چکی تھی اور اب اس کی چارپائی سے کچھ فاصلے پر چولہے کے گرد بیٹھی سمعان کی سخت جان ماں' لہو نچوڑتی مہنگائی کی شکار' اپنے چھوٹے بچوں کے گرد گھری ان کا روٹی کے لیے ہونے والا جھگڑا نپٹا رہی تھی۔

سمعان جو ہینڈ پمپ کے قریب کھڑا برش کر رہا تھا۔ اسے بیدار ہوتے دیکھ کر منہ صاف کرتے ہوئے اس کے قریب چلا آیا۔

''السلام علیکم' صبح بخیر۔''

''وعلیکم السلام۔''

سمعان کے قریب آنے پر اس نے اپنا دوپٹہ اچھی طرح گردن کے گرد لپیٹ لیا تھا۔

''محسوس مت کیجیے گا یہاں صبح کا آغاز یونہی شور شرابے' اور بھوک سے جنگ کرتے بچوں کے دل فریب مناظر سے ہوتا ہے' آپ ناشتہ ابھی کریں گی یا ٹھہر کر......؟''

''نہیں......ناشتے میں صرف چائے پیوں گی' آپ کہیں جا رہے ہیں؟''

''ہاں......ایان سے ملنے جا رہا تھا۔ پھر ایک جگہ انٹرویو دینے جانا ہے' دعا کیجیے گا بات بن جائے' اس بار بڑی تگڑی سفارش کروائی ہے میں نے۔'' گوری کی قریبی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس نے فخریہ بتایا تھا۔

گوری کے اندر لگی آگ ایک دم سے بھڑک اٹھی۔

''انشاء اللہ......اللہ کے فضل و کرم سے آپ کو بہت اچھی ملازمت ملے گی' وہ مجھے بھی ایک کام تھا آپ سے۔''

''جی فرمائیں۔'' گوری کے ہچکچائے انداز پر وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جب وہ بولی۔

''وہ......آپ اپنے بھائی سے ملنے تھانے آتے جاتے ہیں تو وہاں کے افسران سے تھوڑی بہت ہیلو ہائے تو ہو گی آپ کی......؟''

''جی ہاں' خاصی اچھی ہیلو ہائے ہو گئی ہے اب تو' ویسے ایان تو اب تھانے میں کم ہی ٹکتا ہے۔ اب تو گرفتار کرتے ہی تھانے والے اس کا چالان کر کے اسے سیدھا جیل بھجوا دیتے ہیں۔''

''ایان کوئی کام وام نہیں کرتا؟'' پھر سے ایان کے ذکر پر وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی جب وہ بولا۔

''ہاں بس یہی سمجھ لیں' جیل کی لت لگ گئی ہے اسے' روز کوئی نہ کوئی فساد کھڑا کیے ہی رکھتا ہے۔ دو چار ماہ کسی اخبار میں کام کیا کر لیا' عقل بالکل ہی سٹھیا گئی۔ سچ لکھنے بولنے کا علمبردار بن کر جینا چاہتا ہے۔ یہاں سنتا ہے کوئی سچ؟ اماں بیچاری اس کی فکر میں ساری ساری رات نہیں سوتیں۔''

وہ اندر سے کافی دکھی تھا۔ گوری گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

''کتنی سزا ہوئی ہے اسے؟''

''دو سال کی ہوئی تھی؟ اب تو بس آنے ہی والا ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے' وہ آ جائے گا تو آپ کا بوجھ تھوڑا کم ہو جائے گا۔''

''نہیں' غریب کا بوجھ کبھی کم نہیں ہوتا' ایک مصیبت سے جان چھوٹتی نہیں' دوسری گلے پڑ جاتی ہے' خیر آپ نے آگے کیا سوچا ہے؟''

اسے جلد اس کی پریشانی کا خیال آ گیا تھا۔ تبھی اٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ بولی۔

''سوچنا کیا ہے' میری تو زندگی ہی ختم ہو گئی ہے' اب تو بس ایک کام ہی کرنا ہے۔''

''کیا......؟''

''اپنے نامراد شوہر سے طلاق اور اپنے پیارے بھائی کے قتل کا انتقام۔''

''کیسے......میرا مطلب ہے آپ اکیلی تو کچھ نہیں کر سکیں گی۔''

''کیوں......کیوں نہیں کر سکوں گی......؟''

''بس نہیں کر سکیں گی ناں' خیر کوئی عزیز رشتے دار تو ہو گا ناں آپ کا......؟''

''نہیں......کوئی نہیں ہے۔'' اس کی آنکھیں یک لخت آنسوؤں سے بھری تھیں۔

سمعان نے رخ پھیر لیا۔

"اچھا آپ پریشان نہ ہوں' مجھ سے جہاں تک ہوگا میں آپ کی مدد کروں گا۔"
"شکریہ..... کیا ابھی میں آپ کے ساتھ پولیس اسٹیشن چل سکتی ہوں؟"
سمعان نے اسے مدد کی آفر کی تھی اور وہ اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتی تھی کیوں کہ اپنے پیچھے تمام کشتیاں وہ پہلے ہی جلا آئی تھی۔
"کیا کریں گی وہاں جا کر......؟" گہری سانس بھر کر سمعان کھڑا ہوا تھا جب وہ بولی۔
"اپنے بھائی کے اندوہناک قتل کی رپورٹ درج کرواؤں گی۔"
"ٹھیک ہے' رپورٹ تو شاید درج ہو ہی جائے گی' آپ چائے پی لیں' پھر چلتے ہیں۔"
رات بھر جو سوچ اس کے اعصاب تھکاتی رہی تھی' وہ صبح اٹھتے ہی یوں عمل کے سانچے میں ڈھل جائے گی اسے گمان نہیں تھا۔ سمعان کے پرسوچ انداز میں اقرار کرتے ہی اس کے سلگتے اعصاب کو تھوڑا سا سکون نصیب ہوا تھا اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ اسے آگے کیا کرنا ہے؟

❋❋❋

بارش زور و شور سے ہو رہی تھی' مگر وہ جو اس موسم کی دیوانی تھی' اپنے بند کمرے میں ہر ایک بوند سے بے نیاز بیٹھی تھی۔
پچھلے دو ہفتوں میں ہی اس پر یہ راز کھل گیا تھا کہ اس کا نصیب جس شخص کے ساتھ جُڑا ہے وہ ایک نمبر کا عیاش اور بے حس انسان ہے' نکاح کے دو بولوں کے عوض وہ اس کی دسترس میں ضرور آگئی تھی' مگر اس کی زندگی میں اس کا کوئی مقام نہیں تھا۔
صبح نوابوں کی طرح ناشتہ کر کے گھر سے نکلنا اور پھر رات میں اس کے سو جانے کے بعد دیر سے گھر واپس پلٹنا۔ اس کی روٹین بن چکی تھی جس میں ذرا بھر تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی۔
انوشہ کے لیے یہ بہتر ہی تھا۔ وہ اس پوزیشن میں تھی بھی نہیں کہ کسی کے حقوق زوجیت پورے کر سکتی۔ لہٰذا اس شادی نے اس کی زندگی پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا' ہاں...... ایک چیز تھی جو اس کے اندر بڑھتی جا رہی تھی اور وہ تھی بے حسی۔
گزرتے ہر لمحے کے ساتھ اسے لگتا تھا جیسے وہ گوشت پوست کے وجود سے پتھر کے بے جان مجسمے میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔
اسے اپنے شوہر سے یہ جان کر کہ سرزمان' جن کی ذات اور رفاقت کے حوالے سے اس نے کبھی بہت خوب صورت خواب دیکھے تھے' اس کے محلے میں' اسی کے گھر کے بالکل سامنے رہائش پذیر ہیں بے حد دکھ ہوا تھا۔ وہ خود میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتی تھی۔ ان کے شکایت بھرے سوالوں کا جواب دینے کی سکت ہی نہیں تھی اس میں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب یہاں سے بھی بھاگ جانا چاہتی تھی۔
اس وقت بھی وہ کھڑکی میں آئی تھی اور باہر ایک مرتبہ پھر سرزمان کو روڈ پر تنہا بارش میں بھیگتے دیکھ کر اس کی آنکھیں ایک دم سے جلنے لگی تھیں۔ وہ کھڑکی سے پلٹنا چاہتی تھی مگر جانے کیا ہوا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے وجود کو کوئی حرکت نہیں دے سکی تھی۔
عین اسی لمحے سرزمان کی نگاہ بھی اس پر پڑی تھی اور پھر جیسے آسمان سے برسنے والا بارش کا ہر

واس کا آنسو بن گیا تھا۔
وہ ان سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی' انہیں خود پر گزرنے والی قیامت کے ہر منظر کا احوال بتانا
چاہتی تھی مگر وہ کچھ بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔
اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے کے باوجود اس نے ہنس کر معمول کے مطابق ملنے والے
'امان صدیقی' کی آنکھیں چیخ چیخ کر کہتی تھیں۔
''نہیں مس انوشہ' زندگی کا جو باب تمہارے اور میرے خوابوں سے جڑا ہے اب اس کا حوالہ کبھی
مت دینا' کیونکہ زندگی کے اس باب سے میری کچھ اچھی یادیں وابستہ ہیں اور میں تمہارے بعد اب
ان یادوں کو بھی کھونا نہیں چاہتا۔''
وہ پلٹی تھی اور بیڈ پر گر کر ہانپنا شروع ہو گئی تھی۔
کاش وہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے وجود میں پلنے والے ننھے بچے کی جان لینے پر قادر ہوتی۔ کتنی
ہی بار جان لینے کی کوشش کی اس نے' مگر ہر بار اس کی کوشش ناکام ہو گئی تھی اور اب جبکہ اس کی
زندگی کے ساتھ ساتھ سوال ایک اور ننھی جان کا اٹھنے لگا تھا۔ وہ کمزور پڑ گئی تھی' اسے عزت کی زندگی
تو نصیب نہیں ہوا تھا مگر وہ عزت کی موت مرنا ضرور چاہتی تھی' کیوں کہ اب اس کے شکم میں
محبت کے جائز نظام سے پلنے والا وجود زیادہ دن تک پوشیدہ رہنے والا نہیں تھا اور اس بار وہ خود میں
اپنی کھو کھو برداشت کرنے کا حوصلہ بہت کم پا رہی تھی اور یہی وجہ تھی جس نے اسے ایک نئی اذیت
میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اسے اپنی روح ایسی سولی پر اٹکی محسوس ہو رہی تھی جہاں نہ جان نکل رہی تھی نہ
نجات کا کوئی سرا ہاتھ آ رہا تھا۔
زندگی میں آپ کے پاس جب زندہ رہنے کا کوئی مقصد باقی نہیں رہتا' تب روح کا بھرم رکھتی
یہ سانس وجود پر بوجھ کی مانند محسوس ہوتی ہے۔ اس کا ارادہ بھی اس بار اس بوجھ سے چھٹکارا پا کر تمام
اذیت سے بری ہونے کا تھا اور اس کے لیے لازمی طور پر اسے اس شخص سے رابطہ قائم کرنا تھا جس
ابھی اس کے بہت سے قرض باقی تھے۔

❁❁❁

''ہیلو۔''
رات بھر کی میٹھی پرسکون نیند کے بعد وہ ابھی شاور لے کر واش روم سے نکلا تھا کہ اس کا سیل بجنا
شروع ہو گیا۔ نمبر اجنبی تھا لہٰذا اس نے کال پک نہیں کی' تاہم تھوڑی دیر کے وقفے کے بعد سیل پھر بجنا
شروع ہو گیا تو مجبوراً اسے کال پک کرنا پڑی۔
''ہیلو۔''
دوسری طرف خاموشی تھی گہری جامد خاموشی' تبھی وہ الجھا تھا مگر اس نے کال کٹ نہیں کی۔
''شاہ زر آفندی۔''
اس کی الجھن کا تھوڑی دیر تماشا دیکھنے کے بعد کسی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔ شاہ
زر کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔
''ہوں۔''

''انوشہ بول رہی ہوں۔'' وہی ٹھہرا ہوا سرد لہجہ شاہ زر کو اپنی سماعتوں پر شبہ ہوا۔
''انوشہ......'' دل دھڑکنے کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھوں میں بھی لرزش پیدا ہوئی تھی۔ دوسری طرف وہ تلخی سے ہنسی تھی۔
''ہاں......اتنی جلدی بھول گئے اس نام کو......؟''
''نہیں......'' تھکی تھکی سی بوجھل سانس خنک فضا کے سپرد کرتے ہوئے وہ بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ٹانگوں میں زیادہ دیر کھڑے رہنے کی سکت نہیں تھی۔ تبھی وہ بولی تھی۔
''بھول بھی کیسے سکتے ہو' جس کی زندگی خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کی ہو اسے اتنی جلدی کوئی بھول بھی کیسے سکتا ہے؟''
''کیا یہی بتانے کے لیے رابطہ کیا ہے؟'' وہ اندر سے پھر ٹوٹا تھا مگر انوشہ اس کا درد محسوس نہیں کرسکتی تھی تبھی بولی۔
''نہیں' صرف اتنی سی بات کے لیے تم جیسے فضول انسان کو کال نہیں کرسکتی میں۔'' اس کے لہجے میں ازحد تلخی تھی۔
شاہ زر کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔ عین اسی لمحے بریرہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔
''شاہ زر! میں ناشتہ لگا رہی ہوں تم تیار ہوگئے ہو تو جلدی۔'' اپنی رو میں بولتے ہوئے جونہی اس نے شاہ زر کے حال پر غور کیا اس کی زبان کو بریک لگ گئی۔
''شاہ زر......کیا ہوا......؟''
فکر مندی سے اس پر جھکتے ہوئے اس نے پوچھا تھا مگر شاہ زر نے اس کی طرف نگاہ نہیں کی وہ جیسے اپنے آپ میں تھا ہی نہیں اس کا دل صرف انوشہ کی آواز پر دھڑک رہا تھا جو اس سے تلخ لہجے میں کہہ رہی تھی۔
''ملنا چاہتی ہوں میں تم سے' جلد از جلد......بتاؤ کہاں ملو گے؟''
''کیوں ملنا چاہتی ہو؟''
جب ملو گے تو وجہ بھی بتا دوں گی۔''
''اوکے تم جہاں کہو گی میں تم سے ملوں گا۔''
اس کا جسم سرد پڑ رہا تھا اور مساموں سے پسینے کی چھوٹی چھوٹی بوندیں پھوٹ رہی تھی۔ بریرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی اس کے پہلو میں ٹک گئی۔
''شاہ زر۔''
نرم لہجے میں اسے پکارتے ہوئے اس نے شاہ زر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے کمرے میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا مگر اسے احساس نہیں ہوا' انوشہ کال بند کرچکی تھی تاہم وہ پھر بھی سیل فون کو ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔
''کس کی کال تھی؟''
اپنے کٹتے دل کی اذیت سے بے نیاز وہ پوچھ رہی تھی جواب میں شاہ زر نے یوں چونک کر اس کی طرف دیکھا جیسے وہاں ہوتے ہوئے بھی وہ اعصابی طور پر حاضر نہ ہو۔

"ہوں......وہ......وہ دوست تھا میرا......تم کب آئیں......؟"

"تو اب تم مجھ سے جھوٹ بھی بولنے لگے ہو......؟"

اس کے صاف جھوٹ پر بڑی مشکل سے لب بھینچتے ہوئے اس نے اپنے آنسو پینے کی کوشش کی تھی۔ جب وہ اپنا بھرم بچاتے ہوئے تپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے تم سے جھوٹ بولنے کی؟ خدا کا واسطہ ہے بریرہ' ہر وقت میری جاسوس مت بنی رہا کرو پلیز۔"

انوشہ کے مقابلے میں اپنی اس درجہ تذلیل پر وہ بلبلا کر اٹھی تھی مگر اس نے اپنے آنسو پی لیے۔

"کاش مجھے تم سے محبت نہ ہوئی ہوتی شاہ زر۔"

کتنے رنگ بکھرے تھے اس کی آنکھوں میں' مگر شاہ زر نے اس کی طرف نگاہ نہیں کی وہ بال جھٹکے بغیر کمرے سے نکل گیا تھا۔

❋❋❋

غروب ہوتے سورج کی زرد کرنیں کھیتوں پر عجب سا فسوں بکھیر رہی تھیں' جب سانول شاہ کے بلاوے پر وہ اس کے حضور پیش ہوا تھا کل رات شہر سے گاؤں واپسی پر روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر وہ اپنی ایک ٹانگ اور ایک بازو پر اچھی خاصی چوٹ لگوا بیٹھا تھا۔ جس کے باعث اس کے حکم کی تعمیل میں فوری اس کے حضور حاضر ہونا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

سانول شاہ جو اپنے ڈیرے پر بیٹھا مزارعوں سے اپنی فصل کا حساب کتاب لے رہا تھا اسے آتے دیکھ کر چپ ہو گیا۔

"سلام سائیں' آپ نے یاد کیا تھا۔"

"ہاں یاد تو کیا تھا مگر تم آئے ہی نہیں۔"

کن اکھیوں سے اس کے زخموں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے مزارعوں کو فارغ کر دیا تھا۔

"آیا تو سر کے بل تھا سائیں مگر راستے میں ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا آج دوپہر کو چھٹی ملی تھی اسپتال سے سب ٹھیک تو ہے ناں سائیں......؟"

"ہاں ٹھیک ہے سب' تُو بیٹھ کچھ بات کرنی ہے۔"

اس کے چہرے کے اڑے رنگ سے نگاہ چراتے ہوئے اس نے قریبی چارپائی پر اسے بیٹھنے کا حکم دیا تھا جب وہ کندھے پر پڑی شال سمیٹ کر گود میں رکھتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"حکم سائیں۔"

ادریس شاہ کے ساتھ کیا کیا ہے تو نے......؟"

کسی ہیر پھیر کے بغیر اس نے سیدھا سوال کیا تھا۔

شاہد حسین شاہ کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔

"ک......کچھ نہیں سائیں۔"

"جھوٹ مت بولو شاہد...... جو بات سیدھی اور سچ ہے وہ بتاؤ۔"

وہ دہاڑ اٹھا تھا۔ شاہد حسین کو مجبوراً سچ بولنا پڑا۔

''وہ..... تین روز پہلے سائیں اس کا قتل ہوگیا تھا میرے ہاتھوں' اگر میں اسے نہ مارتا تو وہ مجھے مار دیتا۔''

''لاش کہاں ہے اس کی؟''

''پرانی کھوئی میں۔''

''اور اس کی بہن گوری؟ کیا اسے بھی مار دیا تم نے.....؟''

''نہیں وہ شہر میں ہے میرے پاس۔''

''فوراً گاؤں واپس لاؤ اسے خود ہی سارے معاملے نپٹاتے پھرتے ہو' میں مر تو نہیں گیا تھا مجھ سے پوچھے بغیر اسے مار کر قصہ ہی ختم کر ڈالا' اب کیا جواب دوں گا میں انزلہ کو؟''

وہ برہم ہوا تھا۔ شاہد حسین گھبرا کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''معافی دے دیں سرکار' غلطی ہوگئی۔''

''غلطی کا بچہ' اب جاؤ یہاں سے اور لاؤ اس کی بہن کو گاؤں واپس۔'' اسے غصہ بہت کم آتا مگر جب آتا تھا تو اس کے پالتو کتے بھی اس سے سہم جاتے تھے۔

انزلہ دو چار روز کے لیے شہر گئی تھی کیوں کہ اس کے کسی عزیز کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی وہاں لہٰذا اسے ایمرجنسی میں جانا پڑا۔ سانول شاہ کے لیے یہ خاصے سکون کی بات تھی کیونکہ اس کی واپسی تک وہ ''اصل بات'' کو دبا کر اس پر پردہ ڈال سکتا تھا۔ بصورت دیگر اس کے لیے انزلہ کو دیکھنا کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔

اسی روز سورج ڈھلنے کے بعد اس نے اپنے خاص کارندوں کو کہہ کر ادریس شاہ کی متعفن لاش کھوئی سے نکلوا کر چپ چاپ دبا دی یوں کہ گاؤں میں کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو سکی' جبکہ شاہد حسین کی بہن زلیخا کو اس نے اپنی حویلی کے اندر بنے چھوٹے سے تہہ خانے میں چھپا دیا تھا۔ اس سارے قصے سے اس کا مقصد ایک تو انزلہ سے سچائی کو چھپانا تھا دوسرا الیکشن سر پر تھے اور وہ کسی صورت الیکشن سے پہلے کوئی نیا شور اٹھنے کے حق میں نہیں تھا۔

❁❁❁

امامہ کی محض چند روز کی محنت خاصا رنگ لائی تھی اور شجاع کی بیٹی بڑی حد تک نارمل زندگی کی طرف لوٹ آئی تھی۔ اس نے ہمہ وقت رونا چھوڑ دیا تھا اور اب دودھ کے ساتھ ساتھ وہ دوسری کئی اور چیزیں بھی بناء تنگ کیے کھانے لگی تھی۔ پورے گھر میں دوڑے پھرنا اور میٹھی میٹھی باتیں کرنا اسے آ گیا تھا شجاع اس کی اس کارکردگی سے بہت خوش تھا مگر امامہ کے ساتھ اس کے سلوک میں تبدیلی نہیں آئی تھی۔

اس روز امامہ کچن میں گڑیا کے لیے دلیہ بنا رہی تھی جب کہ وہ اوپر اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھا کچھ کیسوں کی فائل دیکھ رہا تھا اور گڑیا اس کے پاس کھیل رہی تھی کہ اچانک کرسی پر چڑھتے ہوئے اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ دھڑام سے زمین پر گرتے ہی اپنے سابقہ معمول کی مانند بلک بلک کر رونا شروع ہوگئی۔ امامہ تک جیسے ہی اس کے رونے کی آواز پہنچی وہ کچن سے بھاگتی ہوئے آئی اور اس سے پہلے کہ شجاع بچی کو اٹھا کر اس کے سر پر لگنے والی چوٹ کا مشاہدہ کرتا اس نے لپک کر گڑیا کو اس کی

ہاتھوں سے لے لیا۔

''کیا ہوا ہے اسے......؟''

پریشانی سے شجاع کی طرف دیکھتے ہوئے جس لہجے میں اس نے پوچھا تھا اس لہجے میں بناوٹ نہیں تھی وہ اپنی بیٹی کے لیے اس کا یہ تفکر بھرا انداز دیکھتا رہ گیا۔

''کچھ نہیں' کرسی سے گرنے کی وجہ سے شاید چوٹ لگی ہے۔''

''آپ کو خیال رکھنا چاہیے تھا دیکھیے خون نکل رہا ہے اس کی پیشانی سے۔''

لہجے کی بے کلی کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں بھی نم ہوئی تھیں۔ شجاع گنگ سا اس کی صورت دیکھتا رہا۔ بچی امامہ کی بانہوں میں آ کر رونے کی تیزی قدرے کم کر چکی تھی جبکہ امامہ اس کے لیے فرسٹ ایڈ بکس ڈھونڈنے کے ساتھ ساتھ بار بار اس کا منہ چومتی اسے بے حد حیران کر رہی تھی۔

وہ اپنی فائلز سمیٹ کر اس کے قریب آ گیا۔

''ٹیک اٹ ایزی مس امامہ' میری بیٹی ایسی چوٹیں کھانے کی عادی ہے۔''

''تو کیا یہ ضروری ہے سر کہ آگے بھی یہ چوٹیں کھاتی رہے؟''

وہ پہلے والی امامہ رہی ہی نہیں تھی' شجاع پینٹ کی پاکٹس میں دونوں ہاتھ گھسائے اسے سنجیدگی سے دیکھتا رہا۔

''میری بیٹی سے اس درجہ محبت کی وجہ بتانا چاہیں گی؟''

''کوئی وجہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ گڑیا کے معاملے میں اللہ نے میرا دل اپنی قدرت سے نرم کر دیا ہے۔''

''اچھی بات ہے' میں ایک دو روز میں اسے اسکول میں ایڈمیشن دلانے کا سوچ رہا ہوں۔''

''آپ کی بیٹی ہے' آپ جو چاہیں بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں' مگر میری ادنیٰ سی رائے یہ ہے کہ ابھی بچی کو گھر پر ٹیوشن کی ضرورت ہے مجھے تھوڑا سا مزید وقت درکار ہے اس کے بعد آپ گڑیا کو اسکول داخل کروا سکتے ہیں۔''

''او کے۔''

اس کی رائے سے اتفاق کرتا وہ پلٹا تھا جب امامہ نے اسے پیچھے سے آواز دی۔

''سر۔''

''جی؟''

''سوری مجھے پوچھنے کا حق تو نہیں ہے مگر گڑیا کے لیے پوچھ رہی ہوں کیا گڑیا کی مما زندہ ہے یا......؟''

اس کے پلٹنے پر سر جھکاتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

شجاع کو توقع نہیں تھی کہ وہ اس سے ایسا کوئی سوال پوچھے گی تبھی رخ پھیرتے ہوئے خشک لہجے میں بولا۔

''زندہ ہے مگر گڑیا کے لیے نہیں۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''آپ سمجھ بھی نہیں سکتیں۔''
یکدم اس کے چہرے پر کرختگی بکھر گئی تھی۔ امامہ کو اس سے مزید کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہو سکی۔

❋❋❋

سمعان کی ہمراہی میں جھجکتے' ڈرتے وہ پولیس اسٹیشن آئی تھی اور اب اس ماحول کا کھلی آنکھوں سے خود جائزہ لے رہی تھی جس کا اب تک اس نے محض ذکر ہی سنا تھا۔
تھانے کی عمارت خاصی شکستہ تھی' وہ کھلا میدان اور وسیع برآمدہ عبور کرنے کے بعد جس کمرے میں آ کر بیٹھی تھی' سمعان کے بقول وہ اے ایس آئی کا کمرہ تھا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے مگر ایس ایچ او کو ابھی تک ڈیوٹی پر آنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔ اے ایس آئی بھی خاصا مصروف دکھائی دے رہا تھا جبکہ اس کا محرر اور دیگر سپاہی جن نظروں سے گوری کو دیکھتے ہوئے باتیں کر رہے تھے اس کا بس نہ چلتا تھا کہ سب کی طبیعت صاف کر کے رکھ دیتی۔
سمعان اے ایس آئی کے منشی سے بات کر رہا تھا۔ گوری کی کمر وہاں بیٹھے بیٹھے تختہ ہونے لگی تھی۔ جب اے ایس آئی نے انہیں اپنے کمرے میں طلب کیا۔
''السلام علیکم۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی سمعان نے اے ایس آئی سے مصافحہ کیا تھا جبکہ گوری کڑی نگاہوں سے اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔
''وعلیکم السلام...... ہاں بھئی کیا بنا تمہارے بھائی کا...... رہائی ہوئی کہ نہیں اس کی؟''
چہرے پر پیشہ ورانہ مخصوص مسکراہٹ سجا کر' گوری پر سرسری سی نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے پوچھا تھا جب وہ بولا۔
''ہونے والی ہے۔''
''ایک سال تو ہو گیا اسے اندر ہوئے کہ نہیں؟''
''جی ہو گیا ہے۔''
''پھر؟ سزا کروالی بھائی کو مگر پچیس ہزار نہ دے سکے' کیسے بھائی ہو یار تم؟ اتفاق دیکھو' ایک سال بعد پھر مجھ سے ہی ٹاکرہ ہو گیا تمہارا' خیر اس بار کیسے آئے ہو؟'' اس کی باتوں کا پس منظر سمعان جانتا تھا مگر گوری نہیں جانتی تھی تبھی وہ کچھ سمجھ نہ سکی۔
سمعان اب اے ایس آئی کو بتا رہا تھا۔
''میرے پاس اس وقت پچیس ہزار ہوتے تو میں اپنے بھائی کو کبھی سزا نہ ہونے دیتا۔ جہاں تک آپ سے دوبارہ ملاقات کا سوال ہے تو کیا فرق پڑتا ہے تھانے میں تو سپاہی سے لے کر ایس ایچ او تک ہر بات پیسے سے شروع ہو کر پیسے پر ختم ہوتی ہے آپ کی جگہ کوئی دوسرا افسر ہوتا تو شاید وہ اس سے بھی زیادہ مانگتا۔ بہرحال یہ عزیزہ ہیں میری' ابھی کچھ روز پہلے ان کے بھائی کا مرڈر ہو گیا ہے اسی کے سلسلے میں رپورٹ لکھوانے آئی ہیں۔''
''کہاں ہوا ہے مرڈر؟''
سمعان کا یہ اسے خاصا ناگوار گزرا تھا۔ تبھی چہرے پر مسکراہٹ کی جگہ کرختگی پھیل گئی تھی۔
''گاؤں شاہ والا میں۔'' سمعان نے ہی اس کے سوال کا جواب دیا تھا۔

''شاہ والا میں؟''

''جی۔''

''یہ وہی شاہ والا ہے ناں جس میں کسی پیر صاحب کا مزار ہے اور گاؤں میں بسنے والے اسی نسبت سے شاہ کہلاتے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' اس پر گوری کو لب کھولنے پڑے تھے کیوں کہ سمعان یہ بات نہیں جانتا تھا۔

''اچھا اسے تو اسی تھانے کی حدود لگتی ہیں۔ آگے آؤ بی بی اور کھل کر بتاؤ اصل معاملہ کیا ہے۔''

سمعان کو یکسر نظر انداز کر کے اس نے اپنا روئے سخن گوری کی جانب ہی پھیر لیا تھا۔ جواب میں گوری نے وہی کہانی جو اس سے قبل وہ سمعان کی ماں کو سنا چکی تھی اس کے گوش گزار کر دی۔

''اچھا تو یہ بات ہے' معاملہ خاصا گمبھیر ہے' قتل کے کیس کی رپورٹ یوں آسانی سے درج نہیں کی جاتی' بڑی تحقیق ہوتی ہے' محنت کرنی پڑتی ہے' پھر وہ جو بندہ ہے کیا نام بتایا تھا اس کا' ہاں شاہد حسین۔ ابھی اس کا بھی نہیں پتا' وہ کیسا بندہ ہے' عام ہے یا کوئی اثر و رسوخ والا بندہ ہے۔ اگر اثر رسوخ والا ہوا تو اس پر ہاتھ ڈالنا ذرا مشکل ہو جائے گا۔''

''کیوں مشکل ہو جائے گا' آپ تو پولیس والے ہیں۔ لوگوں کی داد رسی کرنا' انہیں انصاف فراہم کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔''

''اوئے پتا ہے مجھے' ہماری ذمہ داری ہے' اب آپ مجھے بتائیں گی کہ ہماری کیا ذمہ داری ہے؟ آپ نے تو کہہ دیا آ کر کہ قتل ہوا ہے مگر ہم تو آنکھیں بند کر کے آپ کے پیچھے نہیں چل سکتے ناں۔ پولیس کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں کسی بھی معاملے کی جانچ پرکھ کے۔ ہفتہ دو ہفتے لگیں گے معاملے کی تحقیق میں' پھر عملی کارروائی ہو گی دو ہفتے بعد آنا۔''

اس بار اے ایس آئی اس سے جس لہجے میں مخاطب ہوا تھا وہ انتہائی تحقیر آمیز تھا' گوری کو اس کا انداز اور لب و لہجہ بے حد برا لگا۔

''دو ہفتے بعد کیوں' آپ میرے ساتھ چلیں میں آپ کو اپنے بھائی کی لاش دکھا دیتی ہوں۔ اس کے علاوہ سارا گاؤں میرے شوہر کے خلاف میرے اور میرے بھائی کے حق میں گواہی دینے کو تیار ہے اور کس قسم کا ثبوت چاہیے آپ کو؟''

''اوئے چپ کروا اسے۔''

اس بار ماتھے پر تیوری ڈالتے ہوئے اس نے سمعان کو ڈپٹا تھا۔

''میرے ساتھ چلیں..... تمہارے ملازم نہیں ہیں کہ ادھر تم نے حکم کیا اور اِدھر ہم چل پڑے ہیں۔ اور بھی بڑے کام ہیں ہمیں۔ صرف ایک کیس نہیں ہوتا یہاں کہ ذرا کوئی شکایت ہوئی اور ہم سارا کام چھوڑ کر فوراً اس کے پیچھے چل پڑیں۔ ایک بار کہہ دیا ناں' دو ہفتے بعد آنا۔ اب جاؤ یہاں سے۔ آ جاتے ہیں اٹھ کر دماغ کھانے' ابھی تو یہ بھی نہیں پتا کہ تمہارے شوہر نے تمہارے بھائی کو قتل کس وجہ پر کیا۔ یہ دیہاتوں' گاؤں میں تم جیسی لڑکیوں کے چال چلن کی کہانیاں بھی بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔''

اس کی نقل اتارتے ہوئے اس نے خاصے تحقیر آمیز انداز میں گوری کے کردار پر کیچڑ اچھالنے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ گوری کچھ کہتی سمعان فوراً اٹھ کھڑا ہوا

"چلو گوری! ہم دو ہفتے بعد آجائیں گے۔"

وہ تھانے کے ماحول کو بھی جانتا تھا اور افسران کے مزاج کو بھی۔ مگر گوری کے لیے یہ "گا انتہائی غم و غصے کا باعث بنا تھا۔ تھانے کی حدود سے باہر آکر وہ چپ نہیں رہ سکی تھی۔

"کتنا بد دماغ اور بے غیرت شخص تھا۔ یہ کیا کرتا ہو گا کوئی انصاف۔ الٹا لوگ بھاگ جا ہوں گے یہاں سے۔"

"ہاں بہن یہی قانون ہے یہاں' جس کی جیب میں پیسہ ہے یا جس کے پاس کوئی اونچی سفارش ہے' اس کی یہاں تھوڑی بہت شنوائی ہو جاتی ہے۔ ہمارے جیسے مفلسوں کی یہاں کوئی شنوا نہیں' ایان جب پکڑا گیا تھا تب بھی یہی افسر تھا یہاں۔ 324 کی دفعہ لگی تھی اس پر۔ ان کی اپنی میں بھی بے گناہ ثابت ہو گیا تھا وہ' مگر اس نے پچیس ہزار روپے کی رشوت نہ ملنے پر اس کی جھو فائل بنا کر عدالت بھجوا دی۔ اسی لیے دو سال قید کی سزا ہو گئی اسے' ورنہ سارے ثبوت اس کے ح میں تھے۔ جس روز لڑائی ہوئی تھی اس روز وہ شہر میں تھا ہی نہیں مگر ان کو کوئی کیا کہے؟"

سرد آہ بھر کر اس نے جو قانون کی کہانی گوری کو سنائی تھی وہ اس کے لیے خاصی افسوس ناک تھی۔ تبھی اس نے پریشانی سے سمعان کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"پھر...... میں کیا کروں؟ کیا میرے بھائی کا قاتل یونہی دندناتا پھرتا رہے گا؟"

"نہیں...... ایان باہر آجائے پھر کرتے ہیں کچھ نہ کچھ۔"

ٹوٹے لہجے میں اسے تسلی دیتے ہوئے وہ خود بھی سر جھٹک کر ابھی تھوڑی دیر قبل ہوئی تل بھلانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ جب وہ بولی۔

"میرے اندر آگ لگی ہے۔ میں ایان کی رہائی کا انتظار نہیں کر سکتی' پتا نہیں بوا کا کیا حال ہو بھائی تم نے میری اتنی مدد کی ہے ایک آخری کام کرو گے؟"

"ہوں...... بولو۔"

اس کی التجا بھری نگاہوں کا مان رکھتے ہوئے اسے ہامی بھرنا پڑی تھی۔ جب وہ بولی۔

"بھائی میرے گاؤں میں ایک لڑکی ہے انزلہ شاہ' وہ مجھے انصاف دلا سکتی ہے کیا آپ اس تک میرا پیغام پہنچا سکتے ہیں؟"

"کوشش کروں گا اب بہن کہا ہے تو بھائی کے سارے فرائض بھی پورے کروں گا۔"

وہ مسکرایا تھا گوری کی آنکھیں لفظ "بھائی" پر پھر سے جلنے لگی تھیں۔

❋❋❋

آج کتنے دنوں کے بعد وہ اس کے مقابل بیٹھا تھا اور انوشہ رو رہی تھی۔

کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ابھی چند روز قبل اس کی شادی ہوئی تھی۔ اسی کے سسرال میں اس کے مقابل بیٹھا وہ بھرپور اشتیاق سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی۔

"تم سوچ رہے ہو گے کہ میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے' ہے ناں؟"

"ہوں۔"

"کچھ قرض باقی تھا ابھی تمہارا مجھ پر' وہی چکانے کے لیے بلایا ہے۔" اس کی آنکھیں نم

شدت سے لہورنگ ہورہی تھیں۔

''کیسا قرض؟'' وہ چونکا تھا' انوشہ نے اپنی بھیگی پلکیں رگڑ لیں۔

''اتنی جلدی' کتنا کچھ بھول گئے تم...... کیا اب میں تمہیں یاد دلاؤں شاہ زر کہ تم انوشہ رحمان سے نفرت کرتے ہو' شدید نفرت...... اسی نفرت کی وجہ سے تم نے مجھے ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں پٹخ دیا' میرا غرور میرا وقار' سب چھین لیا تم نے مجھ سے۔ اپنے جس گناہ کی مجھے خبر بھی نہیں تھی اسی گناہ کو کالی بنا کر تم نے میری روح کو کانٹوں پر گھسیٹ لیا۔ تم کامیاب ہوگئے شاہ زر آفندی' بہت بہت مبارک ہو' تمہارا منصوبہ بیکار نہیں گیا' میرے بھائی نے اپنی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے مجھے قربان کردیا' مگر پھر بھی اس کی گردن جھک گئی ہے' وہ کسی سے نظر ملا کر بات نہیں کرسکتا' یہی چاہتے تھے نا تم' لو ہوگیا تمہارا مقصد پورا...... اب تو خوش ہو ناں تم......؟''

سلگتی آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں بھی ٹوٹ پھوٹ تھی۔

شاہ زر کے اندر کہیں ایک مرتبہ پھر ٹوٹ پھوٹ شروع ہوگئی تھی۔

''تم اس باعزت معاشرے کے مرد ہو ناں شاہ زر' لہٰذا ایک مرتبہ پھر ایک عورت تم سے ہار گئی۔ ہر طرح سے قصوروار ہوتے ہوئے بھی تمہاری عزت اور وقار پر کوئی حرف نہیں آیا اور میں' میں ہر طرح سے بے قصور ہوتے ہوئے بھی سب کی نگاہوں سے گرگئی۔ ماں باپ کے ساتھ ساتھ میرے اکثر سارے رشتے بھی چھن گئے مجھ سے۔ تم اپنے انتقام میں جیت گئے شاہ زر اور میں اپنی بدنصیبی میں تمہاری مردانگی سے ہار گئی۔'' اس کا لہجہ ایک مرتبہ پھر بھرا گیا تھا۔

شاہ زر بے قراری کی انتہا پر پہنچتے ہوئے پینٹ کی پاکٹس میں ہاتھ گھسا کر اٹھ کر کھڑا ہوا۔

''بہرحال...... تم نے جو کیا' میرا ایمان ہے اللہ اس کے لیے ضرور تم سے بہتر حساب لینے والا ہے۔ میں نے اپنا معاملہ اسی پاک ذات کے سپرد کردیا ہے جس سے بڑھ کر کوئی انصاف کرنے والا نہیں۔ کوئی جانے نہ جانے وہ جانتا ہے کہ میں گنہگار ہوں یا تم ظالم ہو......''

''بس کرو انوشہ پلیز۔'' ابھی وہ اپنی بات مکمل بھی نہ کرسکی تھی کہ وہ چلا اٹھا۔

''بس کرو...... خدا کا واسطہ ہے تمہیں ایک مرے ہوئے انسان کو مزید مت مارو۔ ادھر دیکھو میری طرف' کیا ان آنکھوں میں تمہیں زندگی کی کوئی رمق نظر آتی ہے؟ کون سی رات ایسی رہی ہے اس عرصے میں' جب بنا ٹیبلٹ لیے نیند آجائے۔ اگر تم بے سکون ہو تو میں بھی سکون کی زندگی نہیں جی رہا انوشہ' ایک ایک سانس بوجھ بن گئی ہے روح پر' خدا کا واسطہ ہے تمہیں میری جان لے لو مگر مجھے معاف کردو انوشہ...... پلیز......'' اس کی پلکیں بھی بھیگی تھیں۔

انوشہ رحمان کے سوکھے لبوں پر زہرخند مسکراہٹ بکھر کر رہ گئی۔

''نہیں...... تمہاری موت سے مجھے عزت کی زندگی نہیں مل سکتی تم نے جو کیا ہے اس کے لیے موت بہت سستا سودا ہے' جو مجھے منظور نہیں۔ ہاں ایک شرط پر میں تمہارا قصور معاف کرسکتی ہوں۔'' پلکیں موند کر صوفے کی پشت گاہ سے ٹکاتے ہوئے وہ اصل مقصد کی طرف آگئی تھی۔

شاہ زر نے چونک کر کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔

''کیسی شرط؟''

''پہلے وعدہ کرو' جو میں کہوں گی وہ اپنے گناہ کے کفارے کے لیے تم کرو گے۔''

''پہیلیاں مت بجھاؤ انوشہ' صاف صاف کہو' کیا کروانا چاہتی ہو مجھ سے۔'' وہ اس کے پاگل پن سے خوف زدہ ہوا تھا تبھی چلایا تو انوشہ ہنس پڑی۔

''تم بھول گئے ہو شاہ زر کہ تمہارا انتقام پورا ہو چکا ہے اب انتقام کی باری میری ہے۔''

''کیسا انتقام؟''

وہ خائف ہوا تھا جواب میں انوشہ نے قریبی میز سے قلم اور کاغذ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''یہ لو شاہ زر' میں بدنصیب عزت کی زندگی تو نہیں جی سکتی مگر عزت کی موت تو مر سکتی ہوں۔ میرا قصور اتنا بڑا تو نہیں کہ مجھے عزت کی موت بھی نہ ملے۔ یہ ننھا وجود جو میری کوکھ میں قدرت کے جائز نظام کے ساتھ پل رہا ہے۔ مجھ میں اس کی جان لینے کا حوصلہ نہیں ہے کہ مرنے کے بعد بھی لوگ میرے نام پر تھو تھو کریں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی' تم نے کہا تھا ناں شاہ زر تم مجھے کسی اور کے نام کی مہندی لگانے نہیں دو گے۔ تمہارا کہا سچ ہو گیا' سہاگن ہو کر بھی میں ایک طلاق یافتہ، ایک بیوہ کی سی زندگی بسر کر رہی ہوں۔ تمہاری زبان سے نکلا ہر لفظ سچا ہو گیا ہے۔ اسی لیے میں یہ چاہتی ہوں کہ اب عزت کی موت مر جاؤں۔ اپنے گناہ کا کفارا ادا کرنا چاہتے ہو ناں تم' تو لو اپنے ہاتھوں مجھ سے میری گناہ آلود زندگی چھین کر ایک آخری احسان کر دو مجھ پر اور جس طرح میری بے بسی سے فائدہ اٹھا کر تم نے مجھ سے وہ تحریر لکھوائی تھی جس نے میرے بابا کی جان لے لی' مجھے سب کی نگاہوں میں نامعتبر کر دیا' اسی طرح آج اپنا ہر ظلم اس کاغذ پر لکھ کر مجھے پھر ویسے ہی سب کی نگاہوں میں معتبر کر دو' تاکہ میرے مرنے کے بعد سب یہ جان لیں کہ میرا کردار کمزور نہیں تھا پلیز۔''

وہ کہہ رہی تھی اور شاہ زر کے اندر جیسے سناٹے بکھر گئے تھے۔

''لکھو شاہ زر کہ تم نے اپنے انتقام کے لیے مجھے اغوا کیا تھا۔ لکھو کہ قصوروار تم تھے میں نہیں لکھو......'' وہ جنون کی انتہا کو چھو رہی تھی۔

شاہ زر کو لگا اس کا سانس جیسے سینے میں گھٹنے لگا ہو۔

''دیر مت کرو شاہ زر اس سے پہلے کہ کوئی رکاوٹ آئے جو کہا ہے وہ کرو۔'' رونے کے ساتھ ساتھ وہ اب چلا بھی رہی تھی۔

شاہ زر نے دھندلائی آنکھوں کے ساتھ جانے کیا کیا شفاف کاغذ پر رقم کر دیا۔

انوشہ نے ایک نظر اس کے تیزی سے چلتے' لرزتے ہاتھوں پر ڈالی اور دوسری آخری نظر اپنے گھر پر۔

''یہی تمہارا مجھ پر آخری احسان ہے اور یہی میرا تم سے آخری انتقام ہے شاہ زر! میری جان لے کر تم مجھ پر احسان کرو گے جو تمہارے ظلم کا کفارہ ہے اور یہ تحریر میرے اپنوں تک پہنچا کر تم میرے انتقام کو پہنچانو گے' تمہیں ہمیشہ یاد رہے گا کہ تم نے جو کیا اس سے تمہیں کیا ملا۔''

وہ اب پرسکون تھی مگر شاہ زر کو محسوس ہو رہا تھا جیسے لحہ لحہ اس کا وجود برف میں تبدیل ہو رہا ہو۔ اس کی سماعتیں کام کرنا چھوڑ رہی تھیں۔ وہ صرف دیکھ رہا تھا کہ انوشہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے مقابل آئی تھی اور اس نے اپنے سرد ہاتھوں سے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنی گردن پر رکھے تھے۔

❁❁❁

"امامہ......"

وہ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر گڑیا کے ساتھ لان میں کھیل رہی تھی۔ جب اپنے نام کی پکار پر پلٹتے ہوئے فوراً آنکھوں سے پٹی اتار دی۔

"جی۔"

پلٹ کر دیکھتے ہوئے اس کی نگاہ فائزہ آپی پر پڑی تھی جو شجاع حسن کی بڑی بہن تھیں۔

"کیسی ہو تم؟"

بہت دنوں کے بعد آج وہ راستہ بھولی تھیں۔ امامہ گڑیا کو گود میں اٹھا کر ان کے قریب چلی آئی۔

"ٹھیک ہوں' آپ کیسی ہیں؟"

"تمہارے سامنے ہوں' خود ہی دیکھ لو۔" ہنس کر کہتے ہوئے وہ اسے بہت اپنی اپنی سی لگی تھیں۔

"اللہ سوہنے کی ذات کا بہت کرم ہے۔ میرا کئی دنوں سے اِدھر چکر لگانے کو دل چاہ رہا تھا مگر گھر کی مصروفیات آڑے آتی رہیں۔ شجاع سے رات میں روزانہ بات ہو جاتی ہے۔ بتا رہا تھا کہ گڑیا تم سے خاصی مانوس ہو چکی ہے۔"

"جی۔"

"چلو......یہ تو اچھی بات ہے۔ بیٹھو آج تم سے بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔" وہ اچھے موڈ میں تھیں۔

امامہ ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ان کے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔

"پتا نہیں کیوں امامہ! میں جب بھی تمہاری صورت کی طرف دیکھتی ہوں تو تم مجھے بہت اپنی اپنی سی لگتی ہو۔ شاید تم نے کبھی غور نہ کیا ہو' مگر تمہارا چہرہ ایک کھلی کتاب کی مانند ہے سادا اور شفاف۔ کیا تم مجھے سچ سچ بتاؤ گی کہ تم کون ہو؟" وہ اسے کریدنے آئی تھیں۔

امامہ نے بے ساختہ گھبرا کر ان کی طرف نگاہ کی تھی۔

"میں نے اب تک اپنے بارے میں جو بتایا ہے وہ سچ ہی تو ہے۔"

"مگر میں اس سچ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی' اصل میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔" گڑیا کو امامہ کی گود سے لیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ وہ الجھ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"پتا ہے امامہ! میں اباجی کی موجودگی میں اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔"

"کیا۔"

"ہاں۔" ان کی آنکھوں میں دکھ کی ہلکی سی پرچھائیں امامہ کو بے چین کر گئی تھی۔

"کیوں؟"

"بڑی لمبی کہانی ہے کیا کرو گی جان کر؟" ٹھنڈی سانس بھر کر ذرا سا رخ پھیرتے ہوئے انہوں نے اپنا دکھ چھپانے کی کوشش کی تھی۔ جب وہ بولی۔

"آپ نے اپنا کہا ہے تو دکھ شیئر کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"ہاں صحیح کہہ رہی ہو' دل کو بہت اپنی تو لگتی ہو تم۔ تبھی تو وہ سب بتانا چاہتی ہوں جو مجھے ہر لمحہ

پریشان کیے رکھتا ہے۔'' ان کا لہجہ کسی الجھن کا شکار تھا۔

امامہ جی جان سے ان کی طرف متوجہ ہوگئی۔ تبھی وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

''ہمارا خاندان سالوں سے جاگیرداری سنبھالتا آرہا ہے۔ میرے دادا تک یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا دادا کے بعد میرے بابا اور تایا جی میں ایک عجیب سی جنگ چھڑ گئی زمین کے جھگڑے نے خون کے رشتوں کی کشش پر گرد ڈال دی۔ جواب میں تین تایا جی کے اور دو میرے بھائی ایک دوسرے کے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے میں چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ شجاع سے بڑے ضیاء کے ساتھ بہت دل تھا میرا۔ تایا کے سب سے چھوٹے بیٹے کے ہاتھوں اس کی موت نے ایک طرح سے مجھے نیم پاگل بنا چھوڑا تھا۔ بچپن میں تایا اور بابا کے درمیان میری نسبت اس سے طے تھی' مگر ضیاء کی رحلت کے بعد تایا کے گھرانے کے کسی فرد کا ذکر بھی میری طبیعت خراب کر دیتا تھا۔ شجاع ان دنوں پڑھائی کے سلسلے میں ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اس نے وہ دکھ نہیں دیکھا جو میں نے دیکھا ہے۔ اسی لیے کئی برس دشمنی کی نذر کرنے کے بعد جب تایا کے چھوٹے بیٹے نے جیل سے رہا ہو کر' صلح کے لیے بابا کی منت کی تو ان کا دل پسیج گیا اور یوں دونوں گھرانوں میں سالوں بعد پھر سے آنا جانا شروع ہو گیا۔ شجاع اور اعتقاد بھائی بابا کے حامی تھے کیوں کہ میری طرح ان کی نسبت بھی تایا کے گھر طے تھی اور دونوں ہی اپنی اپنی منگیتروں پر دل و جان سے فدا تھے۔ اس کے علاوہ' ان کے دلوں میں اپنے بھائیوں کی موت کا جو دکھ اور رنجش تھی وہ بھی تایا کے تین بیٹوں کے یکے بعد دیگرے اسپتال میں موت سے جاتی رہی پھر ان کے چوتھے بیٹے کو بھی دس سال قید کی سزا ہوئی تھی۔ جس کے بعد بابا اور دونوں بھائی ان کے لیے زیادہ نرم پڑ گئے تھے۔ بابا نے اس غلطی کی تلافی کے لیے جو انہوں نے بڑے بھائی سے جھگڑ کر کی تھی۔ اپنے حصے کی بہت سی زمین بھی رضاکارانہ طور پر تایا کے سپرد کر دی۔ ساتھ ہی وہ مجھے بھی فوراً ان کے سپرد کرنے کا فیصلہ کر بیٹھے۔ وہ شخص جس کے ذکر سے مجھے وحشت ہوتی تھی' بابا اسی سے میری جلد از جلد شادی کا انتظام کر رہے تھے جو مجھے کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ اسی لیے میں نے انکار کر دیا۔ بہت دباؤ ڈالا گیا مجھ پر کیسے کیسے منانے کی کوشش نہیں کی بابا نے مگر میں نہ مانی' میرے لیے اس وقت مر جانا آسان تھا مگر اپنے بھائی کے قاتل سے زندگی بھر کا رشتہ جوڑنا بہت مشکل...... پتا نہیں میں صحیح تھی یا غلط' مگر میرے اس فیصلے نے دونوں خاندانوں کو ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے سے دور کر دیا میرا رشتہ ختم ہونے پر تایا جی نے میرے دونوں بھائیوں کو بھی اپنی بیٹیاں نہیں دیں' جس سے ان کی زندگیاں بھی بکھر کر رہ گئیں۔ شجاع کی جو منگیتر تھی اس نے تو کسی اور سے اپنا رشتہ طے ہونے پر شادی سے فقط چند روز قبل ہی گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی۔ جس کی ذمہ داری بھی بابا نے مجھ پر ڈال دی۔ شجاع بھی کئی دن زندگی اور موت کی جنگ لڑنے کے بعد زندگی کی طرف واپس لوٹا تھا۔ جس دن اس کی منگیتر نے خودکشی کی تھی' اسی دن سے بابا نے مجھے اپنی اولاد سمجھنا چھوڑ دیا۔ اعتقاد بھائی بھی بہت پہلے دیار غیر میں جا کر بس گئے۔ ایک شجاع ہے جس نے ہزاروں غم اٹھا کر بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں بہت اذیت میں ہوں امامہ...... اپنے بھائی کی اجڑی زندگی مجھے سکون سے سونے نہیں دیتی۔ نیند کی گولیاں استعمال کر کر کے اعصابی طور پر کھوکھلی ہو گئی ہوں۔'' فائزہ آپی کے لہجے میں دکھ کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھیں بھی بھیگی تھیں۔

امامہ کا دل عورت کی محبت کے اس نرالے دکھ پر سکڑ کر رہ گیا۔
"کاش وقت واپس پلٹے تو میں اپنی ہر غلطی کا ازالہ کرلوں مگر وقت واپس ہی تو نہیں پلٹتا۔"
وہ اب باقاعدہ رونا شروع ہو گئی تھیں۔ مگر اس سے پہلے کہ امامہ انہیں کچھ کہتی شجاع گھر چلا آیا۔
آپی نے اسے دیکھتے ہی جلدی سے اپنی بھیگی پلکیں رگڑ ڈالی تھیں۔
"السلام علیکم۔"
"وعلیکم السلام، آج کیسے اِدھر کا راستہ بھول گئیں آپ۔"
گڑیا کو ان کی گود سے لیتے ہوئے وہ مسکرایا تھا جب وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولیں۔
"راستہ تو نہیں بھولی مگر آج تو امامہ کی یاد اس طرف کھینچ لائی۔"
"اچھا چلیں کسی بہانے سہی، آپ کو اِدھر کی یاد تو آئی۔"
ایک نظر امامہ کی طرف دیکھتے ہوئے وہ پھر مسکرایا تو امامہ اپنی نگاہیں جھکا نہ سکی وہ شخص جو ہمہ اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کیے رکھتا تھا اس وقت اس کے چہرے پر کھلی کھلی سی مسکراہٹ کتنی لگ رہی تھی۔
لائزہ آپی نے اس کی اس حیرانی کو اور ہی معنوں میں لیا تھا۔
"ٹریٹ کب دے رہے ہو اپنی پروموشن کی۔"
"جب آپ کہیں۔"
"تو ٹھیک ہے، پھر اگلے اتوار کو تیار رہنا اپنی جیب ہلکی کرنے کے لیے۔"
وہ شخص جس کی گھر سے باہر اتھارٹی کئی شیروں پر بھاری تھی، اپنے گھر میں کبھی اسے اتنا "با اثر" لگا۔
"او کے۔ چائے تو یقیناً پئیں گی آپ۔ چلیں آج میں آپ کو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلاتا ہوں۔"
اپنی بہن کی طرح آج وہ بھی موڈ میں لگ رہا تھا۔
امامہ اس کے بشاش چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئی اور وہ ایک بازو میں اپنی بیٹی کو سنبھال کر دوسرا اپنی بہن کے گرد حمائل کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔
امامہ کو اس لمحے ایک مرتبہ پھر بھری دنیا میں اپنی تنہائی کا احساس شدت سے ہوا تھا۔

❋❋❋

"زلیخا......"
ازلہ کی غیر موجودگی میں اس کی ہدایت پر چھنو صبح ہی صبح شاہد حسین کے گھر کی طرف نکل آئی تھی۔ جہاں کھلے صحن کے اس پار وہ سودائیوں سے حلیے میں بیٹھی کسی گہرے صدمے کی شکار دکھائی دے رہی تھی۔
شاہد حسین اس وقت ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر اسپتال میں بے ہوش پڑا تھا جبکہ گاؤں کے دیگر لوگوں کو ابھی کسی تازہ قیامت کی خبر تک نہ ہوئی تھی وجہ صرف اور صرف شاہد حسین کا گھر گاؤں سے دور فاصلے پر الگ تھلگ ہونا تھا۔

"زلیخا۔"

اس بار زمین پر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے چھنو نے اسے جھنجوڑا تھا مگر اس کا سکتہ نہیں ٹوٹا۔
رات کے جانے کس پہر اس کا بیٹا بھی روتے روتے یونہی سو گیا تھا۔

"زلیخا! کچھ بتا تو سہی کیا ہوا ہے؟"

اس کی حالت چھنو کو پریشانی میں مبتلا کر رہی تھی۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے
عین اسی لمحے فیقا وہاں سے گزرتے ہوئے اس کی آواز سن کر اندر آیا تھا۔

"چھنو۔"

وہ اس کی آواز سنتے ہوئے پلٹی تھی اور فیقے کو دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف لپکی تھی۔

"فیقے......دیکھ تو سہی زلیخا کو کیا ہو گیا ہے' پکار کا جواب ہی نہیں دے رہی۔"

فیقا ساری کہانی سے نا صرف باخبر تھا بلکہ کسی حد تک شاہد حسین کے جرم میں اس کا معاون بھی
تھا۔ تبھی زلیخا پر سرسری سی ایک نگاہ ڈالتے ہوئے اطمینان سے بولا۔

"اس کے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے' اسپتال میں پڑا ہے اسی صدمے کی وجہ سے باؤلی ہو گئی
ہے' شوہر بھی سنا ہے طلاق دے گیا' تو نہ پڑ اس معاملے میں یہ اب شاہد حسین اور گوری کا معاملہ ہے۔"

"اچھا لیکن انزلہ تو کہہ رہی تھی......"

"ارے چھوڑ انزلہ کو' وہ شہری میم کیا جانے اندر کی باتوں کو' تو بتا کل ملنے کیوں نہیں آئی مجھ سے۔"

"بابا تھے گھر پر۔"

فیقے نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس کا دھیان اپنی طرف لگانے کی کوشش کی تھی اور وہ اپنی
اس کوشش میں کامیاب رہا تھا۔

اسی روز چھنو شام میں دوبارہ وہاں آئی تو زلیخا وہاں موجود نہیں تھی۔
گھر میں شاہد حسین تھا جس کی وجہ سے وہ وہاں ٹھہر بھی نہ سکی بس زلیخا کا پوچھ کر جلدی سے نکل
آئی مگر اس معاملے نے اسے اچھا خاصا بے کل ضرور کر دیا تھا۔ وہ ابھی شاہد حسین کے گھر سے نکل کر
کچھ قدم آگے آئی تھی کہ اچانک کسی نے اس کی راہ روک لی۔

ہر طرف گھرے ہوتے اندھیرے میں ایک اجنبی شخص کو اپنی راہ میں کھڑے دیکھ کر وہ ذرا سی
گھبرائی تھی۔

"کون ہو تم۔" گھبرانے کے باوجود اس نے ڈپٹ کر پوچھا تھا جب وہ بولا۔

"اللہ کا بے ضرر بندہ۔"

"میری راہ کیوں روکی ہے؟"

"میں نے تو نہیں روکی' میں تو اپنی راہ چل رہا تھا آپ خود ہی سامنے آگئیں۔"

"ہٹو فضول میں پریشان کر کے رکھ دیا۔"

سر جھٹکتے ہوئے وہ آگے بڑھی تھی کہ اس نے آواز دے ڈالی۔

"بات سنیں خاتون۔"

"کیا ہے؟" پھر سے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ذرا سی گردن موڑی تھی۔

سمعان کو کسی طور وہ گوری سے مختلف نہ لگی۔

''وہ...... مجھے انزلہ صاحبہ سے ملنا تھا۔ کسی کا پیغام دینا تھا ان کو۔''

''وہ شہر گئی ہوئی ہیں۔ پتا نہیں کب واپس آئیں' آئیں بھی کہ نہیں' کس کا پیغام دینا ہے؟'' وہ اس کی سوچ سے زیادہ تیز تھی۔

سمعان نے کچھ سوچ کر اسی کی مدد لینے کا فیصلہ کرلیا۔

''ایک لڑکی ہے' اسی گاؤں کی اپنے شوہر کے ظلم کا شکار ہے اسی کا پیغام دینا تھا۔''

''کیا نام ہے اس کا؟''

چھنو کا دھیان فوری طور پر گوری کی طرف نہیں جا سکا تھا۔

اسی اثناء میں اس کے عقب سے شاہد حسین نے سمعان کو پکار لیا۔

''اوئے اِدھر آ...... مجھے بتا کس کا پیغام دینا ہے چل چھنو تو گھر چل۔''

اسے پکارنے کے ساتھ ہی اس نے چھنو کو بھی وہاں سے کھسک جانے کا حکم دے دیا تھا۔

وہ بادل نخواستہ' وہاں سے قدم آگے بڑھانے پر مجبور ہوئی تھی۔

سمعان نئی الجھن میں گرفتار ہو کر رہ گیا۔

''گوری نام ہے لڑکی کا' دو روز پہلے اس کے شوہر نے اسے اس کے بھائی کے گھر سے اغواء کر کے کہیں قید کر دیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے وہاں سے بھاگ کر مجھ تک پہنچی ہے۔ سگی بہنوں کی طرح عزیز سمجھتا ہوں اسے۔ بہت مشکل میں ہے۔ اس نے کہا ہے کوئی انزلہ نامی شہری لڑکی اس کی مدد کر سکتی ہے اسی سے ملنے آیا ہوں میں۔ آپ کون ہیں؟''

ساری بات ایک سانس میں بتا کر اسے اس سوال کا خیال آیا تھا۔

شاہد حسین کو لگا اسے کھویا خزانہ واپس مل گیا ہو' ابھی ابھی وہ شہر سے واپس آ کر بیٹھا تھا اور گوری کے ہاتھ سے نکل جانے پر بے حد ملول تھا۔ اس اجنبی نوجوان نے گویا اسے زندگی کی نوید سنائی تھی۔ تبھی وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''خیر خواہ ہوں اس کا کچھ رشتہ داری بھی ہے' گھر کہاں ہے تمہارا؟''

''یہیں پاس میں ہے۔''

''تو چلو پھر...... دیر کس بات کی...... اس کا شوہر ڈھونڈتا پھر رہا ہے اسے۔''

دل ہی دل میں نیا منصوبہ طے کرتے ہوئے اس نے جس انداز میں سمعان کی طرف دیکھا تھا وہ انداز سمعان کو ایک نئی الجھن میں مبتلا کر گیا تھا۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ شاید اس نے انزلہ شاہ کے علاوہ گوری کے سلسلے میں کسی اور پر اعتبار کر کے غلطی کی ہے' مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس لانا ممکن نہ تھا۔

گوری جو ایک ایک پل کو انگلیوں پر گن رہی تھی' شام ڈھلے دروازے پر دستک کی آواز سن کر چونک گئی۔ جانے کیوں اس لمحے اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک کر اسے پھر سے کسی مشکل کا احساس دلا رہا تھا۔

❋❋❋

''شاہد حسین۔''

اَدھ کھلے دروازے سے نظر آتے شاہد حسین کے چہرے کو دیکھ کر گوری کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ جب کہ سمعان جو سارے راستے عجیب سی کشمکش کا شکار' شاہد حسین اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ساتھ لا کر پچھتاتا آیا تھا' اب گوری کے چہرے کا زرد رنگ دیکھ کر مزید پشیمانی میں مبتلا ہو گیا۔

شاہد حسین کی نگاہ بھی اس پر پڑ چکی تھی۔ تبھی دروازے کو زور سے ٹھوکر مارتے ہوئے وہ گھر کے اندر گھس آیا تھا۔

''چل......تو کیا سمجھتی ہے' جیتے جی کہیں بھی کھو جانے دوں گا تجھے؟''

گوری کا بازو پوری قوت سے اپنی گرفت میں لیتے ہوئے اس نے ہلکا سا جھٹکا دیا تھا۔ جس پر سمعان چیل کوؤں کی طرح اس پر جھپٹا۔

''بازو چھوڑ میری بہن کا' اگر مجھے تیری اصلیت کا پتا ہوتا تو کبھی اتنی بڑی خطا سرزد نہ ہوتی مجھ سے۔''

''ارے جا' بڑا آیا بہن والا۔ اس کا صرف ایک ہی بھائی تھا۔ وہ بھی زندہ نہیں۔ ہے اب تو راتوں رات کہاں سے پیدا ہو گیا؟'' سمعان کو زور سے دھکا دیتے ہوئے اس نے اپنا آپ چھڑایا تھا۔ سمعان کی ماں اور بہنیں قدرے فاصلے پر سمٹ کر خاصی پریشان نگاہوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ جب کہ شاہد حسین کے خاص بندے گھر سے باہر کھڑے تھے۔

''چل گوری......ابھی تیرا دماغ ٹھکانے پر لگانا باقی ہے۔ صحیح کہتے ہیں کہنے والے' عورت کو اس کی اوقات سے بڑھ کر اہمیت دو تو سر پر چڑھ جاتی ہے۔ بہت نرمی برت لی تیرے ساتھ۔ اب دیکھ کیا حشر کرتا ہوں تیرا' جتنا ان تین دنوں میں تو نے مجھے خوار کیا ہے۔''

وہ شکل سے ہی خطرناک دکھائی دے رہا تھا۔

سمعان کو کچھ سجھائی نہ دیا تو قریبی چارپائی سے قدرے فاصلے پر بنے چولہے سے جلتی لکڑی اٹھا لی۔

''گوری کا ہاتھ چھوڑتا ہے کہ نہیں......؟''

شاہد حسین نے اس کی للکار پر خاصی بدمزہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا' پھر گرتے کی جیب سے اپنا ذاتی پستول نکال لیا۔

''بڑی جلدی بہن سے گوری پر آ گیا۔ چل راستہ چھوڑ' تیرے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے میری۔''

گوری کا بازو اب بھی اس کی مضبوط گرفت میں تھا۔

سمعان کی ماں اور بہنوں نے چیخ پکار شروع کر دی۔

''راستہ چھوڑ دے سمعان' میں نے کہا تھا ناں پرائی مصیبت نہ مول لے۔ میں ایک کے بعد دوسرے بیٹے کو مصیبت میں نہیں ڈال سکتی' دفع ہونے دے اس بلا کو گھر سے ہٹ جا۔''

''نہیں ماں' یہ لڑکی صائمہ اور صاعقہ سے کم نہیں ہے میرے لیے' بہن کہہ کر یوں اپنے ہاتھوں اسے ذلت بھری موت کے سپرد نہیں کر سکتا میں۔''

وہ غیرت مند تھا۔
شاہد حسین نے تمسخرانہ نگاہوں سے اس کے ہاتھ میں موجود لکڑی کے سلگتے ہوئے ڈنڈے کو اٹھایا اور اگلے ہی پل اس کی بائیں ٹانگ پر فائر کر دیا۔ ''ٹھاہ'' کی زوردار آواز کے ساتھ جہاں ریحان کی ٹانگ لہولہان ہوئی تھی وہیں اس کے گھر میں خواتین کی چیخوں نے گویا کہرام بپا کر دیا تھا۔ شاہد حسین کے چچے بھی فائر سن کر جلدی سے گھر کے اندر گھس آئے تھے۔ جب کہ قرب و جوار کے لوگ دار بجائے مدد کے لیے اندر آنے کے اپنے اپنے گھر کی چھتوں پر چڑھ کر دلچسپی سے یہ ''تماشہ'' دیکھ رہے تھے۔
شاہد حسین اپنے چچوں کو دیکھ کر مزید شیر ہوا تھا۔
''اوئے! اسے دیکھو بڑی گرمی ہے اس کے خون میں۔ اس سے پہلے کہ مزید کوئی تماشا کرے ٹھنڈا کروا دو اس کو۔''
''مگر یہ تو زخمی ہے۔'' اس کی دہاڑ کے جواب میں اس کے ایک ساتھی نے زبان کھولنے کی جسارت کی تھی جس پر وہ مزید دہاڑتے ہوئے بولا۔
''تو کیا ہوا...... تم میں سے نہیں ہو سکتا کوئی زخمی؟''
اس کا ساتھی اس کا مطلب سمجھ گیا تھا تبھی اثبات میں سر ہلانے لگا تو وہ مشتعل انداز میں گوری کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر لے آیا۔
''بہت پر لگ گئے ہیں تجھے' کب تک بھاگتی رہے گی' اب کے ایسے پر باندھوں گا کہ ساری عمر آزاد ہوا کو ترستی رہے گی۔''
خاصے تند لہجے میں وہ کہہ رہا تھا۔ جب کہ گوری ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں گم اسے خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔

❁❁❁

سخت سرد ہوا چل رہی تھی۔
امامہ ایسے میں معمول کے عین مطابق گڑیا کو میٹھی نیند سُلانے کے بعد کمرے سے باہر نکل کر اسی برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔
کل فائزہ آپی نے اپنی کتنی ذاتی باتیں اس کے گوش گزار کی تھیں۔ بالکل گھر کے کسی فرد کی طرح' ایس پی شجاع کے مزاج کے قطعی برعکس وہ اس پر بے حد مہربان تھیں۔ قطعی احساس نہیں ہونے دیتی تھیں کہ وہ ان کی بھتیجی کی ''آیا'' ہے۔
اس وقت بھی وہ انہی کی باتوں کو سوچ رہی تھی۔ ایس پی شجاع کی بارعب اور بے نیاز شخصیت کو دیکھ کر کہاں یقین آتا تھا کہ اسے بھی کبھی کسی سے محبت جیسا کوئی مرض لاحق ہوا ہوگا۔ وہ شخص اندر سے جتنا بھی بکھرا ہوا سہی' مگر اوپر سے اس نے اپنی شخصیت پر بہت سخت خول چڑھا رکھا تھا۔ امامہ کو بے ساختہ اپنی کچھ روز قبل والی پلاننگ پر ہنسی آگئی۔
کتنی پاگل تھی وہ صرف اپنی محبت کا دل آباد رکھنے کے لیے وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ محبت الٹ کام کا کھیل رچانے چلی تھی۔ جو پہلے ہی اس میدان میں اپنا سب کچھ ہار بیٹھا تھا۔ کیا کیا کرنے

پر مجبور نہیں کر دیتی یہ محبت انسان کو؟

اسے اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ رانجھے نے ہیر کے لیے اپنی پُرآسائش زندگی کو ٹھوکر مار کر اس کے باپ کا نوکر بننا کیوں گوارا کیا تھا؟

کس جذبے کے زیر اثر مجنوں ہنس کر لوگوں کے پتھر کھا لیا کرتا تھا۔

وہ کون سا جذبہ تھا جس نے فرہاد سے دودھ کی نہر نکلوا دی تھیں۔ اب سمجھ میں آ رہا تھا اسے اس نے بھی تو یہی کیا تھا۔ اپنی محبت کے امتحان میں سرخرو ہونے کے لیے خود اپنے مقام سے گر کر رہ گئی تھی۔

رات اس کی سوچوں کے ساتھ سرد ہوا کا ہاتھ تھام کر آہستگی سے اپنا سفر طے کرتی جا رہی تھی۔ وہ تھک کر دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹتے ہوئے وہیں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔

کتنے دن ہو گئے تھے اسے وہ آواز سنے جو اس کے اندر زندگی کا احساس جگاتی تھی۔ ایس پی شجاع حسن کے مقابلے میں تو وہ شخص کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی ہر سانس اس کے تصور سے آباد کر چھوڑی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اس نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ دل سے ہنسی نہیں تھی۔ پچھلے کتنے دنوں سے اس کی آنکھوں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا اس کے اندر جینے کی کوئی امنگ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پچھلے گزرے کتنے ہی دنوں سے نیند نے اپنا تعلق اس سے توڑ لیا تھا۔ اندر کہیں جینے کی امنگ جیسے ایک دم سے ختم ہو گئی تھی۔

دھیرے دھیرے سرکتے پچھلی شب کے پرسکون لمحوں نے اچانک اسے شدید سردی کا احساس دلایا تو وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ تہجد کا وقت ختم ہونے میں ابھی کافی ٹائم تھا۔ وہ اٹھی اور وضو کر کے سیدھی جائے نماز پر آ کھڑی ہوئی۔ پچھلے کئی روز کے معمول کے مطابق اس وقت بھی آٹھ نفل ادا کر کے وہ اللہ رب العزت کے حضور ہاتھ پھیلاتے ہوئے سسک اٹھی تھی۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں عجیب سا درد مچل رہا تھا ایک دوسرے میں پیوست لب خاموش تھے اور وہ رو رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک چھوٹا سا بچہ کسی درد کسی تکلیف سے بے حال اپنی ماں کے سامنے روتا ہے۔

ایس پی شجاع اپنے کمرے کے گلاس ونڈو سے اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا مگر وہ اس کی آواز نہ سن سکتا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی۔

"اے اللہ! مانا کہ میں بہت گناہ گار ہوں' اس قابل بھی نہیں ہوں کہ خود پر تیری نعمتوں اور رحمتوں کا شکر ادا کر سکوں۔ میں اس قابل بھی نہیں کہ میری دعا تیرے دربار میں قبولیت کا درجہ پا سکے لیکن...... تیری رحمت کا میرے گناہوں سے کیا واسطہ...... تُو تو ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرنے والا ہے۔ تیری رحمت کا بادل صرف نیکوکاروں پر ہی تو نہیں برستا۔ میں نے مانا کہ وہ غلط ہے۔ لیکن تُو اسے اچھا کر کے میرا بنا دے۔ تو جسے چاہے اچھا بنا دے' جس پر چاہے کرم کی انتہا کر دے' اس پر بھی کرم کر دے مولا! اسے اچھا کر کے میرا بنا دے میرے مالک مجھ پر اپنا رحم فرما۔" روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

شجاع نے بیزاری سے پردا برابر کیا اور پھر سے بیڈ پر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

❀❀❀

شاہ زر کے ہاتھ انوشہ رحمٰن کی گردن پر لرز رہے تھے اور وہ پلکیں موندے کہہ رہی تھی۔

''کم آن شاہ زر...... گردن دباؤ میری۔''

مگر وہ جیسے اس کا حکم سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ چلائی تھی۔

''گردن دباؤ شاہ زر' مت ادھورا چھوڑو اپنا انتقام۔''

''نہیں...... مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں یہ نہیں کر سکتا انوشہ!'' بے بسی سے لب بھینچتے ہوئے وہ ہوا تھا اور رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا تھا۔

انوشہ جیسے گنگ سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

''کیوں...... کیوں نہیں ہوگا؟ ختم ہی تو کرنا چاہتے تھے تم مجھے' پھر اب' جب میں اپنی رضا سے اپنی جان لینے کی اجازت دے رہی ہوں اب یہ ہچکچاہٹ کیوں؟ شاہ زر! مجھ پر ترس کھاؤ۔ لوٹ چکی ہوں میں' اب اور نہیں پلیز۔'' اس بار وہ پھر رو پڑی تھی۔

شاہ زر کا دل کرب کی شدت سے ایک مرتبہ پھر جیسے کٹ کر رہ گیا۔

''تم...... تم اذیت میں ہو......؟ اپنا وار چلا کر' من چاہا مقصد حاصل کر کے بھی تم اذیت میں تمہیں پتا ہے اذیت کیا ہوتی ہے۔ پتا ہے تمہیں......؟''

اس کے لفظوں پر وہ کرب سے چلائی تھی۔

''تم ایک عورت ہوتے' کسی باپ کی عزت دار بیٹی ہوتے' کسی بھائی کی شریف بہن ہوتے' کوئی یوں تمہاری زندگی کے ساتھ کھیلتا جیسا تم نے میری زندگی کے ساتھ کھیل کھیلا' پھر پتا چلتا تمہیں کہ اذیت کیا ہوتی ہے۔''

اس کی آنکھوں سے ٹپکتا ایک ایک آنسو شاہ زر کو اپنے دل پر گرتا محسوس ہو رہا تھا۔

''تم نے وعدہ کیا ہے مجھ سے' تم عزت کی موت دو گے مجھے' کم آن وعدہ پورا کرو اپنا۔'' جنونی کیفیت میں ایک مرتبہ پھر آگے بڑھ کر اس نے شاہ زر کے ہاتھ تھامے تھے۔ جب اس نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ اس سے چھڑا لیے۔

''ہوش میں آؤ انوشہ۔'' وہ دہاڑا تھا مگر انوشہ پر اس کی دہاڑ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

''نہیں' پانچ ماہ قبل اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی میں۔ اب سانسوں کی باری ہے وعدہ پورا کرو اپنا۔''

وہ جیسے کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ شاہ زر کو مجبوراً اس بار اسے ہوش دلانے کے لیے بیڈ پر بٹھانا پڑا تھا۔

''پاگل ہو گئی ہو تم...... پہلے ہی ایک پل کا سکون میسر نہیں ہے' تم مزید کرب میں مبتلا کرنا چاہ رہی ہو' عزت کی زندگی اور موت چاہیے ناں تمہیں......؟ اوکے میں دوں گا تمہیں عزت کی زندگی اور ابھی' ابھی آج ہی بریرہ کو فارغ کر دیتا ہوں تم بھی اپنے شوہر سے طلاق لے کر میرے ساتھ چلو' وعدہ کرتا ہوں انوشہ' آئندہ زندگی میں کبھی تمہاری آنکھ میں کوئی آنسو نہیں آنے دوں گا۔'' وہ بھی

جذباتی ہوا تھا۔
انوشہ کے آنسو حیرت اور غصے کی شدت سے اس کی پلکوں پر ہی اٹک گئے۔
"ہاں انوشہ' میں اب بھی تمہیں اپنانے کے لیے تیار ہوں۔"
اس کا جنون تھا دیکھ کر وہ پھر سنجیدگی سے گویا تھا جب وہ پھٹ پڑی۔
"مگر میں تمہیں اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوں' سنا تم نے......؟ شدید نفرت ہے مجھے تمہارے تصور سے۔ جاؤ چلے جاؤ یہاں سے جاؤ۔"
انوشہ کا جواب اس کی توقع کے خلاف تھا۔ تبھی گہری سانس بھر کر وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے گھر سے باہر نکل آیا۔
اندر کہیں الاؤ دہک اٹھا تھا۔ وہ گاڑی میں آ کر بیٹھا اور پھر اسے کچھ خبر نہ رہی کہ وہ کس راہ کی جانب گامزن ہے۔

❋❋❋

"مر یہاں......"
گاڑی رکتے ہی اس نے گوری کو سر کے بالوں سے پکڑ کر نیچے زمین پر دھکا دیا تھا جس پر وہ اذیت سے بلبلا کر رہ گئی۔
"مجھے ہاتھ دکھاتی ہے' نخرے کرتی ہے' اب دیکھ کیسا بندوبست کرتا ہوں تیرا۔" وہ اوندھے منہ زمین پر پڑی تھی۔
سانول شاہ ابھی ڈیرے پر نہیں پہنچا تھا' اس لیے اسے غصہ ٹھنڈا کرنے کا مزید وقت میسر آ گیا۔
"مت بھول کہ ابھی صرف بھائی مرا ہے تیرا' پھوپھی زندہ ہے۔ اگر تو چاہتی ہے کہ وہ زندہ رہے تو زبان بند رکھ اپنی اور وہی کر جو میں کہتا ہوں' نہیں تو جو اپنی سگی بہن کو مار سکتا ہے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"
اس لمحے شاہد حسین کا مقصد صرف گوری کو ڈرانا تھا اور وہ ڈر گئی تھی۔
سانول کچھ ہی دیر میں ڈیرے پر پہنچا تو شاہد حسین نے گوری کو اس کے حضور پیش کر دیا۔
"لے آئے اسے؟" اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے سانول نے بڑی گہری نگاہوں سے گوری کو دیکھا تھا۔
"آہو سرکار...... بھلا آپ کا حکم ٹال سکتا تھا میں؟"
"پھر......اب آگے کیا سوچا ہے اس کا؟"
"سوچنا کیا ہے سرکار' آپ کے ہوتے مجھے بھلا کس بات کی فکر' میں تو چاہتا ہوں' اسے اب آپ اپنی حویلی میں ہی ملازم رکھ لیں۔"
"چلو ٹھیک ہے حویلی سے زیادہ یہ کہیں اور محفوظ ہو بھی نہیں سکتی۔" اب اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔
گوری کو لگا اپنے بھائی کی موت کے ساتھ ہی جیسے اس کی روح کا بھی خون ہو گیا ہو۔

❁❁❁

شاہ زر وہاں سے رخصت ہو چکا تھا اور اب وہ لٹے پٹے سے انداز میں بیٹھی' دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

عبدالصمد نے رات جس وقت اپنے بیڈ روم میں قدم رکھا۔ اس کے پورے جسم پر تھکن سوار تھی، مگر جیسے ہی اس کی نگاہ انوشہ پر پڑی' وہ کوئی دل چسپی نہ ہونے کے باوجود اس کی طرف لپکا تھا۔ جو بخار میں جلتی کراہ رہی تھی۔

کچھ دیر بیڈ کے قریب کھڑے ہو کر اس کے حال کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس کے پاس بیٹھا تھا اور ہاتھ بڑھا کر اس کا بخار چیک کیا تھا۔ یقیناً اس وقت وہ تسلی بخش حالت میں قطعی نہیں تھی۔ اس نے کلائی پر بندھی رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا' رات کا ایک بج رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے دوبارہ گاڑی نکالی اور اس کے بے ہوش وجود کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر اسپتال لے آیا۔ جہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر انیلہ نے انوشہ کا اچھی طرح تفصیلی چیک اپ کرنے کے بعد اسے بتایا۔

''مسٹر طلحہ احمد! آپ کی وائف میں کمزوری بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ حمل کے دوران اتنی کمزوری ان کے لیے ٹھیک نہیں' دوسرے آپ انہیں کسی بھی قسم کی ٹینشن سے دور رکھنے کی کوشش کریں' اس وقت بھی یہ کس بڑی ٹینشن کے حصار میں ہیں۔''

''وہاٹ؟''

کچھ روز پہلے جو جھٹکا زوار کو لگا تھا۔ اس وقت وہی جھٹکا عبدالصمد کو لگا' مگر ڈاکٹر اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ اپنے پیڈ پر ضروری دوائیاں تحریر کر رہی تھی۔ اگلے پون گھنٹے میں جس وقت وہ انوشہ کو لے کر گھر واپس آ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں جیسے جھکڑ چل رہے تھے۔

اگلی صبح ناشتا کیے بغیر ہی وہ گھر سے نکل گیا۔ دوپہر کے قریب' جب انوشہ کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ وہ غیر متوقع طور پر گھر چلا آیا۔ انوشہ کے لیے اس وقت اس کی آمد حیرانی سے خالی نہیں تھی۔ وہ سیدھا بیڈ روم میں آیا تھا اور کچھ دیر واش روم میں گھسے رہنے کے بعد ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر تولیے سے چہرہ خشک کرتے ہوئے خاصے خشک لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟''

انوشہ کے لیے اس کی توجہ کے ساتھ ساتھ اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ تبھی دھیمے مختصر لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہوں۔''

اس پر وہ پلٹا تھا اور سست قدم اٹھاتے ہوئے بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا تھا۔

''میں نے تمہیں بتایا ہے اپنے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کے ساتھ ساتھ مجھے جھوٹ سے بھی شدید نفرت ہے۔ اس لیے سچ سچ بتاؤ میری زوجیت میں آنے سے پہلے کس کے ہاتھوں اپنا سب کچھ گنوا چکی ہو؟'' اس کا لہجہ برف کی طرح سرد اور ٹھوس تھا۔

انوشہ کی آنکھیں اتنی جلدی اس بھیانک سچ کے انکشاف پر حیرانی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے انوشہ.....''

اس کی جامد خاموشی پر ایک مرتبہ پھر اس نے اپنا سوال دہرایا تھا۔ جواب میں وہ مضطرب سی ہو کر ہونٹوں سے اتر گئی۔

"پتا نہیں۔"

"چٹاخ۔"

لپک کر اس کے گال کو اپنے تھپڑ کا نشانہ بناتے ہوئے اس نے ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ انوشہ اس کے تھپڑ کی شدت سے تیورا کر اوندھے منہ زمین پر گر پڑی۔

"جھوٹ سے نفرت ہے مجھے' بولو...... کس کی نشانی لے کر آئی ہو اپنے ساتھ؟"

دہاڑ کر بولتے ہوئے اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا تھا۔ انوشہ کو ایک مرتبہ پھر اپنے وجود سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

احتساب کے جس محشر سے اسے ڈر لگا تھا اس کی پہلی گھڑی آ پہنچی تھی۔

اس کا نچلا ہونٹ اچانک زخمی ہوا تھا اور پیٹ میں بھی تکلیف کے آثار بڑھے تھے۔ عبدالصمد نے اس بار اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے اپنے مقابل کھڑا کر لیا۔

وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ جب کہ چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ تبھی اس نے زبان کھولی تھی۔

"مم...... میں بتاتی ہوں۔"

اس وقت وہ کسی قسم کے تشدد کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ تبھی فوراً ہتھیار ڈال دیے۔

"بولو۔"

"یہ...... مم...... میرے ناکردہ گناہوں کی سزا ہے۔ یونیورسٹی پیریڈ میں میری ایک دوست کے کزن نے اس کی غلط فہمی میں' مجھے اپنی بھوک کا شکار بنا لیا تھا۔ کوئی نہیں تھا وہاں میری سننے والا' اسی آسانی سے لٹ گئی میں۔ پورے چار ماہ بے ہوش رہنے کے بعد جب میں کومے سے باہر آئی تو پتا چلا کہ قدرت کو ابھی میرا مزید امتحان لینا مقصود ہے۔ اسی لیے ابارشن نہ ہو سکا اور...... اور میرا نصیب آپ سے جڑ گیا۔ آپ مجھے مزید ذلیل و خوار مت کیجیے گا' پہلے ہی ایک ایک سانس سزا کی طرح جھیل رہی ہوں میں' زندگی کو مجھ پر مزید بوجھ مت بنائیے گا۔ پلیز......"

اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ جب کہ عبدالصمد نے ہونٹ بھینچتے ہوئے آہستہ سے رخ پھیر لیا۔

"تمہارا قصور نہیں ہے یہ۔ میری قسمت ہی ایسی ہے مجھے صاف ستھری ہم سفر مل ہی نہیں سکتی۔"

دھیمے آزردہ لہجے میں کہتا' اگلے ہی پل وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

انوشہ کی وہ پوری رات ایک مرتبہ پھر سولی کی نذر ہو گئی تھی۔ کل عبدالصمد کے معمولی تشدد نے اپنا اثر دکھایا تھا اور اب رات کے اس پہر وہ درد کی اذیت سے جیسے دوہری ہو رہی تھی۔ عبدالصمد زیادہ دیر تک اس کی چیخوں سے بے نیاز نہیں رہ سکا تھا۔ مگر اس کے لیے فی الحال اس شہر میں قیام کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ تبھی کچھ سوچتے ہوئے اس نے اپنا مختصر سا سامان پیک کیا اور درد سے بلبلاتی انوشہ رحمٰن کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں چلا آیا' جہاں صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اس کے اندر اٹھتے

ے کو اس سوچ سے تسکین ملی تھی کہ اب انوشہ رحمٰن کے متعلق کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے وہ بالکل ارا تھا۔

❋❋❋

اس کے موبائل پر شافیہ کی وہ کوئی پچیسویں کال تھی۔ جو بج رہی تھی مگر وہ ہوش میں ہوتا تو کال ہی کرتا۔ اسے نہ ڈھلتی شام کی پرواتھی نہ گہری ہوتی رات کی فکر' انوشہ رحمٰن سے ملنے کے بعد جب کیں ناپتے ناپتے وہ تھک گیا تو اپنے آفس چلا آیا جو اس وقت تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ گارڈ نے اس اس کی آمد کو خاصی حیرانی سے دیکھا تھا کیوں کہ اس سے پہلے وہ اتنا لیٹ کبھی آفس کی طرف یں گیا تھا۔

اپنے روم میں پہنچنے کے بعد موبائل کو زور سے میز پر پھینک کر وہ صوفے پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ رے میں لائٹ جلانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی اس نے۔ مکمل اندھیرے میں آنکھوں پر ازو رکھنے کے باوجود اس کی آنکھیں جیسے ایک انجانی سی ان دیکھی آگ میں جل رہی تھیں۔

تبھی شاید بہت مجبور ہو کر اس نے سلیپنگ پلز کا سہارا لیا تھا اور لمحوں میں اس اذیت سے بے ر ہو گیا تھا۔ جو پچھلے کئی گھنٹوں سے اس کا وجود چاٹ رہی تھی۔ اگلے روز چونکہ اتوار تھا۔ لہٰذا دیر تک کسی نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔ حواس قدرے ٹھکانے پر آئے تو اسے گھر کی یاد آئی۔ بُریرہ کے ساتھ جو سلوک اس نے اپنایا تھا وہ بھی یاد کیا۔ اس کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

گھر میں داخل ہوا تو غیر معمولی خاموشی نے اسے چونکا دیا۔ اس پر بُریرہ کے بجائے وہاں شافیہ کی موجودی پر اسے مزید حیرانی سے دوچار ہونا پڑا۔

وہ اسے نظر انداز کرنا چاہتا تھا۔ مگر بُریرہ کی عدم موجودگی کے باعث نہ کر سکا۔

''بُریرہ کہاں ہے؟''

سرخ آنکھوں میں چھپی اپنے لیے نفرت سے وہ لاتعلق نہ رہ سکی تھی۔ تبھی جذباتی لہجے میں بولی تھی۔

''جہاں ہونا چاہیے تھا اسے۔''

''کہاں ہونا چاہیے؟'' چونک کر پلٹتے ہوئے وہ حیران ہوا تھا۔

''اسپتال۔''

''وہاٹ......لیکن کیوں؟''

''کیوں......؟ یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔ اپنے آپ سے پوچھیں کہ کیوں پہنچا دیا آپ نے اسے وہاں جہاں وہ پوری رات زندگی اور موت کی جنگ لڑتی رہی ہے۔ میں مجرم تھی ناں آپ کی؟ مجھ سے قصور سرزد ہوا تھا آپ کی عزت کے ساتھ کھیلنے کا' میں سزاوار ہوں آپ سے سزا پانے کی' پھر اسے کیوں کانٹوں پر گھسیٹ رہے ہیں آپ؟ کس گناہ کی سزا دے رہے ہیں اسے، وہ تو قصوروار نہیں ہے آپ کی۔ اس نے تو محبت کی ہے آپ سے' مگر آپ نے کیا کیا اس کے ساتھ؟ اسے ہمیشہ کے لیے......'' جذبات کی شدت میں بہہ کر جانے وہ اسے کیا بتانے چلی تھی کہ اچانک لب بھینچ گئی۔

''کیا ہمیشہ کے لیے؟''

اچانک کسی انہونی کے احساس نے اس کا دل دھڑکایا تھا۔

"مار دیا ہے اسے ہمیشہ کے لیے آپ نے۔"

اچانک دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر روتے ہوئے اس نے کہا اور تیزی سے بھاگتی ہوا سیڑھیاں چڑھ گئی۔ جب کہ وہ وہیں ہال کمرے میں کھڑا سُن اعصاب کے ساتھ لفظوں کی باز گشت میں گھومتا رہا تھا۔ ابھی کیا کہہ گئی تھی وہ......؟"

کل تک تو وہ بالکل ٹھیک تھی' بھلا اس نے کہاں کچھ برا بھلا کہا تھا اسے؟"

اعصاب تو پہلے ہی بوجھل تھے اب پاؤں بھی جیسے من من کے بھاری ہو گئے تھے۔ ساحل کو کال کرنے کے لیے اس نے سیل فون پاکٹ سے نکالنا چاہا تو پتا چلا کہ اپنا سیل فون تو آفس سے آتے ہوئے وہ ساتھ لایا ہی نہیں۔ جھنجلاہٹ کے شدید احساس نے اس لمحے اسے پاگل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اگلے کتنے ہی لمحے تو سودائیوں کے سے حال میں اپنے ہاتھوں پر سر تھامے نائلہ بیگم کو یاد کر کے روتا رہا تھا۔ واقعی ان کی رحلت کے بعد وہ مصیبتوں میں گھر کر رہ گیا تھا۔

❁❁❁

جانے یہ طبیعت کی ناسازی تھی یا رات دیر تک جاگنے کا باعث کہ صبح اس کی آنکھ معمول سے خاصی تاخیر سے کھلی تھی۔ آج اسے بہت سے کام نپٹانے تھے۔ کچھ وزٹ کرنے تھے تو کچھ بہت اہم میٹنگز رکھی تھیں اس نے' اسی لیے آفس فون کر کے سکون سے تیار ہونے کے بعد جس وقت وہ اپنے کمرے سے باہر آیا امامہ کو کچن میں موجود پا کر اسی کی طرف بڑھ آیا۔

"السّلام علیکم!"

وہ جو اپنے ہی کاموں میں مشغول تھی اس کے بھاری بھرکم سلام پر بوکھلا کر پلٹی۔

"جی وعلیکم السّلام!"

"گڑیا کہاں ہے؟"

"کمرے میں کھیل رہی ہے۔ مم...... میں لاتی ہوں۔"

"نہیں رہنے دو...... میں خود ہی مل لیتا ہوں۔"

اسے سہولت سے منع کر کے وہ خود ہی اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جو اس کی بیٹی کے ساتھ ساتھ' آج کل امامہ کے زیر استعمال بھی تھا۔ اندر کمرے میں اس کی بیٹی سکون سے ڈھیر سارے کھلونوں کے ساتھ بیٹھی کھیل رہی تھی۔ جو کہ بالکل نئے تھے۔ دروازے پر اس کی آہٹ محسوس کر کے وہ اس کی طرف لپکی تھی۔

"پاپا۔"

اور شجاع نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اگلے ہی پل وہ کمرے سے باہر تھا۔

"مس امامہ۔"

"جی...... جی سر......"

اس کی آواز پر کچن سے بوتل کے جن کی مانند نمودار ہوتی وہ پل میں اس کے مقابل آ کھڑی

رہی تھی۔

"گڑیا کے لیے اتنے سارے کھلونے آپ نے خریدے ہیں؟"

"جی سر۔"

"کیوں؟" وہ پولیس افسر تھا اور امامہ جانتی تھی کہ اب وہ آسانی سے اسے جانے نہیں دے گا
بھی سر جھکا کر انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولی۔

"میرے پاس کافی پیسے جمع ہو گئے تھے۔ یونہی پڑے تھے اس لیے سوچا کچھ خرید لوں تو بس گڑیا
کے لیے کھلونے خرید لیے۔"

"کتنے روپوں کے خریدے کھلونے؟"

اس بار اس کے سوال پر چونک کر سر اٹھاتے ہوئے وہ اسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"پتا نہیں میں نے کاؤنٹ نہیں کیے تھے۔"

صاف جھوٹ بولتے ہوئے اس نے ٹالنا چاہا تھا جب وہ سرد لہجے میں بولا۔

"دس بیس ہزار تو خرچ ہو ہی گئے ہوں گے۔ فی الحال بیس ہزار کا چیک دے دیتا ہوں کم ہوں
تو مجھے بتا دیجیے گا۔ کوئی مجھ پر یا میری بیٹی پر احسان کرے مجھے گوارا نہیں اور ہاں آئندہ ایسی
خواہشات کم ہی رکھیے گا۔ آپ کو گڑیا کے لیے کسی معمولی سی چیز کی ضرورت بھی پیش آئے تو آپ
مجھے بتا دیجیے گا۔ اس کے باپ کی تنخواہ آپ کی سوچ سے بھی زیادہ ہے سمجھیں آپ۔"

کتنی اجنبیت اور گہری کاٹ تھی اس کے لہجے میں کہ وہ کھڑی کھڑی جیسے پانی ہو گئی تھی۔

وہ شخص کسی بھی لمحے اسے اس کی اوقات یاد دلانا نہیں بھولتا تھا امامہ بھول گئی تھی کہ وہ کس شعبے
سے منسلک ہے۔ اس نے کسی سے سنا تھا کہ پولیس والوں کے سینے میں دل نہیں ہوتے۔ اس وقت
شجاع کو دیکھتے ہوئے اسے کسی کی یہ بات صد فیصد درست لگ رہی تھی۔

آنسو تھے کہ بے اختیار آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ کیا عزت کا سرٹیفکیٹ صرف دولت سے
مشروط ہو کر رہ گیا تھا۔ اگر وہ غریب اور لاچار تھی تو کیا اس کی کوئی عزت نہیں تھی۔ اتنی سی حیثیت بھی
نہیں کہ وہ اپنی خوشی سے اپنے پیسوں سے ایک اعلیٰ عہدے دار کی بیٹی کے لیے کچھ کھلونے ہی خرید
سکی۔

شجاع اپنے کمرے کا چکر لگا کر آیا تو اس کے ہاتھ میں بیس ہزار کا چیک تھا۔ جسے اس نے امامہ
کی طرف بڑھانے میں ایک پل نہیں لگایا تھا۔

"یہ لیجیے۔"

"یہ...... ان کھلونوں کی قیمت ہے یا گڑیا سے میری بے لوث محبت کی؟"

ہاتھ بڑھانے کے بجائے اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھا کر شجاع حسن کی آنکھوں
میں دیکھا تھا جو اس کے سوال پر کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے صحیح کہا میری اتنی اوقات ہی نہیں کہ میں ایک ایس پی کی تنخواہ کا اندازہ کر سکوں لیکن
کتنے دکھ کی بات ہے کہ میری سوچ سے بھی زیادہ تنخواہ پانے والے افسر کا ذہن اور دل اتنا چھوٹا ہے
کہ وہ بے لوث محبت کی قدر بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ دکھی ہوئی تھی اور بے حد دکھی ہوئی تھی۔
شجاع کا ہاتھ بڑھا رہ گیا۔ مگر وہ چیک تھامے بغیر پلٹ کر کچن میں واپس چلی گئی۔
نہ اس کے یوں رونے کی وجہ اس کی سمجھ میں آسکی تھی۔ نہ اتنا دکھی ہونے کی۔
معمول کے عین مطابق اس روز بھی وہ بہت دیر سے گھر واپس لوٹا تھا۔ گڑیا کے رونے کی آواز سن کر سیدھا امامہ کے کمرے کی طرف چلا آیا۔ اس کے خیال کے مطابق تو اب تک اسے سو جانا چاہیئے تھا کیوں کہ اس وقت تک عموماً وہ سو چکی ہوتی تھی۔ مگر وہ نہ صرف جاگ رہی تھی بلکہ بہت دنوں کے بعد رو بھی رہی تھی۔
شجاع کمرے میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر وہ چپ کر گئی۔
"پاپا...... آنی۔"
امامہ کو وہ آنی ہی کہتی تھی۔ اسی لیے دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے اس نے اپنے رونے کی وجہ بھی بیان کر دی۔ امامہ اپنے بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی تھی اور اس کی نبض بہت رک رک کر چل رہی تھی۔ جانے اس کے پیچھے کون سی قیامت برپا ہو گئی تھی؟
قریب رکھی میز سے پانی کا گلاس اٹھا کر اس نے دو تین بار امامہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو مجبوراً اسے ڈاکٹر کو بلوانا پڑا۔ جس کے بعد وہ ہوش میں آئی۔
ڈاکٹر کے جانے کے بعد بھی وہ اس کے کمرے میں بیٹھا رہا تھا۔
"اب کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ؟"
سوال کیا تھا کوئی زہر میں بجھا ہوا نشتر تھا۔ جس نے ایک مرتبہ پھر اس کی پلکیں بھگو ڈالی تھیں۔
"ٹھیک ہوں۔"
زبان سے کہنے کے بجائے اس نے صرف آہستہ سے سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا جب وہ بولی۔
"لیکن ٹھیک لگ نہیں رہیں۔ ڈاکٹر کے مطابق کسی ٹینشن کے باعث آپ بے ہوش ہو گئی تھیں۔"
"نن...... نہیں تو۔"
"اس کا مطلب ہے ڈاکٹر جھوٹ بول رہا ہے۔"
امامہ ہمیشہ اس سے جھوٹ بولتے ہوئے یہ بھول جاتی تھی کہ وہ پولیس والا ہے۔
"نہیں۔"
اِٹس انف مس امامہ۔"
اس کی طبیعت کی پروا کیے بغیر وہ جھلایا تھا۔
"بہت ہو گیا یہ لُکا چھپی کا کھیل۔ میں صاف سیدھا بندہ ہوں ایسی الجھی ہوئی کہانیوں کو پسند نہیں کرتا۔ آپ کے ساتھ واقعی کوئی مسئلہ ہے تو کھل کر شیئر کریں' نہیں تو پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنے کام پر توجہ دیں۔ میرے پاس اتنی فرصت نہیں کہ چھوٹے چھوٹے مسائل پر الجھتا پھروں۔"
تنک کر کھڑے ہوتے ہوئے اس نے اپنا نکتہ نظر واضح کیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ اس پر کون سا عذاب گزرا ہے۔ تبھی پلکیں موند کر اپنے بھل بھل بہنے والے آنسوؤں کا گلا گھونٹ دیا۔
"سوری...... آئندہ آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" اس کا لہجہ بھرایا ہوا تھا۔

وہ سرسری سی نگاہ اس کے زرد چہرے پر ڈالتا' گڑیا کو اپنے ساتھ لے کر اس کے کمرے سے نکل گیا۔

امامہ کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کب بے ہوش ہو گئی تھی۔

اسے محض اتنی خبر تھی کہ ایک مدت کے بعد صبح شجاع کے گھر سے چلے جانے کے بعد وہ اپنے سیل فون سے ارسلان کو کال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب اس نے اس کی کال کٹ کر کے کچھ لمحے بعد خود اسے کال کر دی۔ امامہ کا دل اس لمحے خوشی سے دھڑک اٹھا تھا۔

''ہیلو......'' پہلی بیل پر ہی کال ریسیو کر کے وہ بے تابی سے بولی تھی جب وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہاں بولو' کیوں تنگ کر رہی ہو؟''

''تنگ......اتنے دنوں بعد یاد کر کے بھی تنگ کر رہی ہوں تمہیں؟''

دل آزردہ ہو تو چھوٹی سے چھوٹی بات رُلا دیتی ہے اس کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔

''ہاں یار......اس وقت بہت بزی ہوں میں' بعد میں کال کروں گا۔'' وہ جان چھڑا رہا تھا۔ اب وہ بولی۔

''ایک وقت تھا ارسلان' جب تم میری آواز سننے کے لیے ترستے تھے۔''

''ان لمحوں میں جینا چھوڑ دو اب۔ بہت پرانی بات ہے وہ۔''

''لیکن میں تو پرانی نہیں ہوئی ارسلان، میں تو ویسی ہی ہوں جیسی تمہیں پسند تھی' پھر مجھے کس بات کی سزا مل رہی ہے؟''

''فار گاڈ سیک امامہ! میں اس وقت تمہارے شکوے' گلے سننے کے لیے فارغ نہیں ہوں۔''

''پتا ہے مجھے، میں لگتی ہی کیا ہوں تمہاری جو تم میرے شکوے' گلے سنو گے میں نے تمہیں صرف بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ مجھے آج تمہاری بہت یاد آ رہی تھی۔''

''او کے میں ٹھہر کر فون کرتا ہوں تمہیں۔''

وہ جیسے اس کی کوئی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ امامہ جی بھر کر دکھی ہوئی۔

''کیوں ابھی کیا کر رہے ہو؟''

''شاپنگ کر رہا ہوں، اپنی اور رُباب کی شادی کے لیے، آج نکاح ہے ہمارا۔''

''کیا؟''

''ہاں فارغ ہو کر دوبارہ کال کروں گا۔ خدا حافظ۔''

اسے بڑے طوفان کے سپرد کر کے وہ جلدی سے کال ڈراپ کر گیا تھا۔ جب کہ امامہ اپنے کانوں میں گونجنے والی سائیں سائیں کی آواز میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ بھلا اس سے بڑھ کر قیامت کیا ہوتی اس پر کہ جس شخص کے تصور سے اس کی سانس چلتی تھی۔ وہ شخص بدلا ہی نہیں تھا بلکہ ہمیشہ کے لیے اس سے چھن بھی گیا تھا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی، مگر اس کے کمزور اعصاب نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور وہ اپنے حواس کھو کر بے ہوش ہو گئی۔

گڑیا اس وقت اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی کارٹون دیکھ رہی تھی۔ وہاں سے اٹھی تو کھیل میں لگ گئی۔ امامہ کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا۔ شجاع کے آنے سے کچھ پہلے ہی وہ کمرے میں آئی تھی اور اسے اٹھانے کی کوشش میں ناکام ہو کر رونا شروع ہوگئی تھی۔ اتفاق کی بات تھی کہ اس وقت کوئی بھی ملازم کوٹھی کے اندر موجود نہیں تھا ورنہ گڑیا کے رونے کی آواز سن کر ضرور بھاگا آتا۔

❀❀❀

انزلہ شہر میں ڈھیر سارے کام نمٹا کر کل شام ہی گاؤں پہنچی تھی اور اس کے پہنچتے ہی چھنو فوراً اس سے ملنے کے لیے دوڑی آئی تھی۔ سلام دعا کے بعد قدرے سائیڈ پر ہو کر اس نے انزلہ کو بتایا تھا۔

''پتا ہے انزلہ باجی! آپ کے شہر جانے کے بعد یہاں گاؤں میں کیا کیا ہوگیا؟''

''کیا ہوگیا؟''

وہ اس کے مشکوک انداز پر چونکی تھی۔ جب وہ بولی۔

''ادریس اور گوری کہیں فرار نہیں ہوئے جی' بلکہ سانول کے خاص چمچے شاہد حسین نے ان دونوں کے ساتھ کچھ کیا ہے۔ میں گئی تھی اس کی بہن زلیخا سے ملنے بڑا عجیب وغریب حال تھا جی اس کا' دو بار ملنے گئی تو وہ ملی ہی نہیں' میرا دل کہتا ہے کہ انزلہ باجی اندر ہی اندر ضرور کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔''

''ہوں بی اماں کا کیا حال ہے اب؟''

''پہلے سے خراب ہے ساتھ والی ہمسائی سنبھال رہی ہے انہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے پہلی فرصت میں انہیں میرے گھر لاؤ' میں تھوڑی دیر میں سانول شاہ سے بات کرتی ہوں۔ گاؤں میں ہی ہے ناں وہ۔''

''آہو جی۔''

''چلو ٹھیک ہے پھر میں کرتی ہوں سانول شاہ سے بات۔''

پر سوچ انداز میں کہتی وہ دادی ماں سے بات کرنے پلٹ گئی تھی' مگر انہوں نے فوری اس کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی کیوں کہ ابھی اس پر تھکن سوار تھی۔ تاہم اگلی صبح ناشتے کے فوراً بعد سانول شاہ سے ملنے کو نکل کھڑی ہوئی تھی۔

سرسبز کھیتوں میں لگے سرسوں کے ساگ کی خوشبو فضا میں اپنی عجیب سی مہک پھیلا رہی تھی۔ ان کھیتوں کے درمیان سے ہوتی قبرستان کے قریب پہنچی تو وہاں ایک مرتبہ پھر میران شاہ کی بے حال ماں کو اس کی لمبی چوڑی قبر کے قریب بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

کیسی اجڑی ہوئی بے بس ماں تھی وہ کہ لاڈلے بیٹے کی جدائی نے اسے سچ مچ پاگل کر چھوڑا تھا۔ اس وقت بھی سارے عالم سے بے نیاز' وہ اپنے ہی حال میں کھوئی میران شاہ کی قبر پر بازو پھیلائے' کیسے دکھ بھرے انداز میں اس سے کہہ رہی تھی۔

''تجھے مجھ پر ترس کیوں نہیں آیا میران' ماں صدقے جائے کس بات پر ناراض ہوگیا ہے اپنی ماں سے' تجھے تو اکیلے سونے سے وحشت ہوتی تھی پتر' یہاں اکیلا آکر کیوں لیٹ گیا ہے۔ دیکھ تو سہی کتنی ٹھنڈ ہے یہاں، تجھے ٹھنڈ نہیں لگتی؟'' پتا نہیں وہ کب سے یونہی باتیں کر رہی تھیں۔

لالہ کا دل جیسے ایک مرتبہ پھر کٹ کر رہ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلتی، سے نگاہ ہٹا کر آگے بڑھی تھی۔

سانول شاہ کچھ ہی فاصلے پر جیپ روکے موبائل فون پر کسی سے باتیں کرتا اسے دکھائی دے انزلہ شاہ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے اگلے کچھ ہی لمحوں میں کال ختم کر دی تھی۔

"گاؤں پہنچتے ہی صبح صبح میری یاد آ گئی۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہنسا تھا۔

انزلہ اندر ہی اندر کلس کر رہ گئی۔

"اپنے بارے میں اتنی خوش فہمیوں میں جینا چھوڑ دو شاہ، میں گوری اور ادریس کو پوچھنے آئی ہوں۔ وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"پتا نہیں...... شاہد حسین کو بلا کر پوچھا تھا میں نے، وہ تو دونوں کی گاؤں میں غیر موجودگی سے لاعلم ہے۔"

"اتنا سیدھا نہیں ہے وہ، یہ سارے چکر ہیں اس کمینے کے، تم گاؤں کے چوہدری ہو، تمہارا فرض ہے ہر بات کی خبر رکھنا۔"

وہ تپی تھی جواب میں سانول شاہ لطافت سے مسکراتے ہوئے رخ پھیر گیا۔

"خبر تو رکھتا ہوں۔ اب کوئی راتوں رات چھپ کر فرار ہو جائے تو کیا کروں؟"

"وہ چھپ کر فرار ہونے والوں میں سے نہیں ہیں۔"

"آہستہ بولو انزلہ شاہ...... سو بار کہا ہے، یہاں کسی کو اتنی اونچی آواز میں سانول کے سامنے بولنے کی اجازت نہیں ہے۔" اس کے تیز لہجے میں چلانے پر وہ تنبیہی انداز میں بولا تھا۔ مگر انزلہ نے پروا نہیں کی۔

"میں کسی نہیں ہوں۔ اگر تم صاف صاف مجھے کچھ نہیں بتاؤ گے تو مجبوراً تمہارے خلاف جانا پڑے گا مجھے اور یہ تو تم جانتے ہو سانول شاہ کہ میں تمہارے گاؤں کی کوئی سیدھی سادھی ان پڑھ ڈرپوک لڑکی نہیں ہوں۔"

"پتا ہے مجھے۔"

اس کی دیدہ دلیری پر وہ قدرے خائف ہوا تھا پھر تیز لہجے میں بولا۔

"تم بھول رہی ہو انزلہ شاہ کہ تم ایک لڑکی ہو، جب کہ یہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے، تم چلاتی رہ جاؤ گی مگر کوئی تمہاری صدا نہیں سنے گا۔ پھر بھی تمہیں اونچا اڑنے کا شوق ہے تو اڑ کر دیکھو، تھک کر منہ کے بل زمین پر گرو گی تو ساری اکڑ نکل جائے گی۔ یہ جو ہمہ وقت لوگوں سے ہمدردی کا بخار چڑھا رہتا ہے تمہیں یہ بھی اُتر جائے گا۔" اس کا انداز صاف مذاق اڑانے والا تھا۔

وہ کلس کر رہ گئی۔

"یہ تو وقت بتائے گا سانول شاہ کہ کون منہ کے بل گرتا ہے۔ فرعون کو بھی بڑا گھمنڈ تھا اپنی دولت اور طاقت پر، کیا ہوا اُس کا......؟ آج پوری دنیا میں عبرت کا نشان بنا ہوا ہے۔ تم بھی کسی دن ایسی عبرت کا نشان بنو گے۔"

"بس......" اس سے زیادہ برداشت کی تاب اس میں نہیں تھی۔ "بہت بول لیا تم نے انزلہ شاہ،"

مزید ایک لفظ نہیں......" لہجے کی کرختگی کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر سُرخی بھی پھیلی تھی۔
"اگر میں تمہیں رعایت دیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تمہارے معاملے میں' میں کمزور ہوں۔ بہتر ہوگا کہ اپنی حدود میں رہو! حدود سے باہر آؤ گی تو اسی' گاؤں کے قبرستان میں میران شاہ کے ساتھ دوسری قبر تمہاری ہوگی۔"

وہ پہلی بار اسے اس درجہ غصے میں دیکھ رہی تھی۔

انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتا وہ خود کو بگڑا ہوا رئیس زادہ ثابت کر رہا تھا۔

انزلہ کے اندر عجیب سی آگ بھڑک اٹھی۔

"اپنی بکواس سنا کر کسی اور کو ہراساں کرنا سانول شاہ' میں اپنے جوتے کی نوک پر رکھتی ہوں تمہاری دولت کو اور جہاں تک میران شاہ کی بات ہے تو مت سمجھنا کہ اس کا خون رائیگاں جائے گا۔ میرے اندر آگ لگی ہے۔ اس آگ کو تمہارے خون کے چھینٹے ہی سرد کریں گے۔ صرف تم ہی اس گاؤں کے قانون پر حکمران نہیں ہو' میں بھی الف ب جانتی ہوں' اس قانون کی سمجھے تم۔"

وہ مٹھی میں آنے والی ریت نہیں تھی۔

سانول غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا اور وہ پلٹ کر چند لمحوں میں اس سے دور ہو گئی تھی۔

❋❋❋

سمعان کی ٹانگ زخمی تھی' شاہد حسین کے ایک ساتھی نے اسے قریبی اسپتال لے جا کر اس کی ٹانگ سے گولی نکلوا دی جب کہ دوسرا اپنا سر پھاڑ کر فوراً پولیس اسٹیشن چلا آیا۔ اس وقت ڈیوٹی پر موجود اے ایس آئی کسی ملزم کو لے کر عدالت گیا ہوا تھا لہٰذا وہ سیدھا ایس ایچ او کے کمرے میں گھس آیا۔ جو اس وقت فون پر اپنے کسی اعلیٰ افسر سے بات کرنے میں مصروف تھا۔

ابتداء میں ایس ایچ او نے اس کی فرضی کہانی سن کر اسے اے ایس آئی سے رابطہ کرنے کا کہا تھا مگر جب اس نے سانول شاہ اور شاہد حسین کا حوالہ دیا تو وہ فوراً نرم پڑ گیا اور اگلے دس منٹ میں ہی دوسرے اے ایس آئی کو' فوراً سمعان کے خلاف پرچہ کاٹنے کا حکم جاری کر دیا۔ جس کے جواب میں شاہد حسین کے ساتھی نے شکریہ کے طور پر "تحفتاً" اس کے ضمیر کی قیمت بیس ہزار روپے ادا کر دی۔ کیوں کہ ایف آئی آر درج کروانے کے علاوہ بھی ابھی ایس ایچ او سے اس کو بڑے کام لینے تھے۔

❋❋❋

رات کافی گہری ہو رہی تھی۔ جب سمعان اپنے گھر کا ضروری سامان سمیٹ کر' اپنی تکلیف کی پروا کیے بغیر' راتوں رات اپنے گھر والوں کو لے کر وہ شہر' وہ گھر چھوڑ گیا۔ ایان پہلے ہی جیل میں تھا اگر وہ بھی گرفتار ہو جاتا تو پیچھے اس کی ماں اور بہنوں کا کیا بنتا؟ ابھی تو اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اسے جانا کہاں ہے مگر جس طرح سے اس نے شاہد حسین کی کارروائی دیکھی تھی۔ اس سے اتنا ضرور جان گیا تھا کہ اس کے خلاف وہ کچھ نہ کچھ کیے بغیر سکون سے نہیں بیٹھے گا۔

اسے اپنے اور اپنے گھر والوں کے مشکل میں پڑنے کی زیادہ فکر بھی نہیں تھی۔ اسے تو صرف

گوری کا خیال ستا رہا تھا۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا کیا ہوگا اس غنڈے انسان نے؟ یہی سوچ اسے اندر سے کاٹ رہی تھی۔ کتنی بڑی غلطی سرزرد ہوگئی تھی اس سے کہ اس نے ایک فریبی انسان پر اعتبار کرکے اس لڑکی کو خود مصیبت میں دھکیل دیا تھا۔ جسے وہ خود ہی مصیبت سے بچا کر اپنے گھر لایا تھا۔
اجنبی شہر میں اجنبی لوگوں کے درمیان رہنا' بعد کا مسئلہ تھا۔ پہلا مسئلہ فی الحال اپنے گھر والوں کو پناہ گاہ فراہم کرنا تھا' اسی لیے اپنے گھر سے نکل کر سیدھا وہ ایان کے ایک قریبی دوست کے پاس آگیا تھا۔ جہاں چند روز قیام کے بعد اپنے گھر والوں کو لے کر وہ کراچی چلا گیا۔

❊❊❊

ایان جیل سے رہا ہو کر گھر آیا تو محلے والوں کی زبانی' ایک نئی کہانی سن کر حیران رہ گیا۔
''کون تھی وہ لڑکی......؟''
گوری سے الجھنے والے رشید خان سے خاصے تند لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ بولا۔
''لڑکی' شکل سے ہی ڈکیت لگ رہی تھی۔ دیکھ لیں کام دکھا گئی ناں' نہ سمعان بھائی اس کی باتوں میں آتے نہ یوں آپ کے گھر والوں کو مشکل وقت دیکھنا پڑتا......''
وہ اور بھی جانے اسے کیا کیا بتلانے کا ارادہ رکھتا تھا جب ایان نے اسے درمیان سے ٹوک دیا۔
''میرے گھر والوں کا کچھ پتا ہے کہاں گئے ہیں؟''
''نہیں بھائی کچھ بتا کر نہیں گئے۔ راتوں رات ہی نکل گئے۔ ہمیں تو صبح خبر ہوئی ہے۔''
وہاں موجود سبھی لوگوں کی زبان پر ایک ہی جواب تھا۔
ایان اپنے گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اس لڑکی تک پہنچنے کا طریقہ سوچنے لگا جس نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر والوں کو اتنی بڑی مصیبت سے دوچار کیا تھا۔

❊❊❊

''سر! آپ سے کوئی انزلہ بی بی ملنا چاہتی ہیں' گاؤں شاہ والا سے۔''
وہ ابھی آفس آیا تھا کہ اس کے اردلی نے پہلی اطلاع دی۔ شجاع نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے کہہ دیا کہ وہ ابھی کچھ دیر میں اسے اندر بھیج دے۔ آج اس نے تمام متعلقہ تھانوں کے ایس ایچ او صاحبان اور نچلے عملے کو لائین حاضر کیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کا آج کا دن بے حد مصروف گزرے گا۔
انزلہ کچھ ہی دیر میں اس کے شاندار آفس میں داخل ہوئی تو وہ فون پر کسی کو ہدایت دے رہا تھا۔
''السلام علیکم!''
اس کی شاندار شخصیت سے نگاہ چراتی وہ آگے آئی تھی۔ جواب میں شجاع نے سر کے اشارے سے اسے سلام کا جواب دے کر اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔
انزلہ چپ چاپ سیٹ سنبھال کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی!
''جی مس انزلہ' فرمایئے کیسے آنا ہوا؟''

فون کا ریسیور رکھ کر اگلے پانچ منٹ میں وہ اس سے مخاطب ہوا تھا جب وہ بولی۔
''کچھ ضروری کام تھا آپ سے اسی لیے زحمت دینا پڑی۔''
''جی فرمایئے' میں سن رہا ہوں۔''
وہ کنیز بیگم کے جاننے والوں میں سے تھا اسی لیے انزلہ سے شناسائی تھی۔
''وہ..... آج کل میں شاہ والا میں رہ رہی ہوں' وہاں ایک لڑکا ہے سانول شاہ' چوہدریوں کا خون ہے۔ اسی لیے اس نے گاؤں کے لوگوں کا جینا دوبھر کیا ہوا ہے۔ جو دل میں آتا ہے کرتا ہے۔ چند سال قبل اس نے میران شاہ نامی ایک لڑکے کو قطعی بے قصور ایک جھوٹے کیس میں ملوث کر کے نہ صرف اسے جیل کروا دی بلکہ مروا بھی دیا' اب دو اور لوگوں کا کوئی پتا نہیں چل رہا ہے میں نے بات کی تو فضول قسم کی دھمکیوں پر اتر آیا۔ اسی لیے مجبوراً یہاں تک آنا پڑا مجھے۔''
''ہوں..... کرتا کیا ہے یہ سانول شاہ نامی لڑکا؟''
اس کی بات مکمل توجہ سے سننے کے بعد شجاع نے پوچھا تھا تب وہ بولی۔
''کچھ نہیں' پچھلے چار پانچ ماہ میں سوائے آوارہ گردی کے میں نے اسے اور کچھ کرتے نہیں دیکھا۔''
''اور آپ کیا کرتی ہیں گاؤں شاہ والا میں؟''
''فی الحال تو کچھ خاص نہیں کر رہی۔ میرے بابا کے نام کچھ زمین گاؤں میں بیکار پڑی تھی۔ اس پر ایک چھوٹا سا اسکول بنانے کی کوشش کر رہی ہوں' ابھی پچھلے ہفتے رجسٹریشن کروائی ہے۔ کچھ اور مسائل ہیں گاؤں والوں کے' میری خواہش ہے وہ بھی جلد ہی حل ہو جائیں۔''
''گڈ..... اس کا مطلب ہے سماجی بہبود کے کاموں سے کافی دل چسپی ہے آپ کو۔''
''محض دل چسپی نہیں' میرے جینے کا مقصد ہی دکھی انسانیت کی خدمت ہے۔''
''اچھی بات ہے بہت کم لوگوں کے جذبات ایسے ہوتے ہیں۔ بہر حال آپ بے فکر ہو جایئے۔ میں متعلقہ پولیس اسٹیشن کے ڈی ایس پی کو ابھی اس سلسلے میں آپ کی شکایت نوٹ کروا دیتا ہوں۔''
''بہت شکریہ۔''
''نہیں شکریے کی کیا بات ہے۔ دکھی انسانیت کی خدمت تو پولیس والوں کا شیوہ ہے۔''
وہ مسکرایا تھا' انزلہ کو جواباً زبردستی مسکرانا پڑا۔ کیوں کہ دکھی انسانیت کے ساتھ' پولیس والوں کی ''خدمت'' کے معاملات کو وہ بہت اچھی طرح سے جان گئی تھی۔

❁❁❁

وہ ابھی اپنے گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھا' اپنے گھر والوں کے متعلق ہی سوچ رہا تھا کہ ایک مرتبہ پھر پولیس کی گاڑی ہارن بجاتی اس کے گھر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔
''چلو بادشاہو' سرکار نے یاد کیا ہے آپ کو۔''
کانسٹیبل گاڑی سے نکل کر مسکراتے ہوئے اس کے قریب آیا تھا۔
ایان کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی۔
''کیوں..... اب کیا کر دیا میں نے؟''

''یہ تو وہاں چل کر ہی پتا چلے گا۔ ایس ایچ او صاحب راہ دیکھ رہے ہیں آپ کی۔''
کانسٹیبل کے لبوں کی مسکراہٹ اسے طیش دلا رہی تھی۔ اسی طیش کے عالم میں اٹھ کر وہ کانسٹیبل کے ساتھ چل دیا۔
''لو سرکار' آ گئے سرکاری مہمان۔''
اسے ہمراہ لے کر کانسٹیبل اے ایس آئی کی خدمت میں سیلوٹ مار کر حاضر ہوا تو اس نے تفصیلی نگاہ ایان پر ڈالتے ہوئے اسے دوبارہ گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔
''ڈال دو حوالات میں' میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟''
''حوالات میں' لیکن میرا قصور کیا ہے؟''
''قصور بھی بتا دیتے ہیں' اندر چلو۔''
کانسٹیبل نے کالر سے پکڑ کر اسے ہلکا سا دھکیلا تھا۔ جب اس نے ایک جھٹکے سے اپنا کالر چھڑا لیا۔
''کیوں چلوں' قصور بتاؤ میرا نہیں تو ابھی اپنے اسٹاف کو بلا کر تم لوگوں کا اصل چہرہ سب کے سامنے لے آؤں گا۔''
''اوئے...... بکواس بند کر اپنی۔ بڑا آیا اسٹاف کو بلانے والا' شاہوں کے بندے پر فائر کیا ہے میرے بھائی نے' وہ ہاتھ نہیں آیا تو تجھے پکڑا ہے ہم نے' چل اندر۔''
اے ایس آئی اس کی بات پر بھنا کر اپنی سیٹ سے اٹھا تھا۔
ایان حیرانی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔
''کون سے شاہوں کے بندے؟ کون سا بھائی؟''
''سب بتاتے ہیں تجھے' اوئے اِدھر لاؤ اسے ایف آئی آر رپورٹ پڑھا دیتے ہیں۔''
ایان کو اس اے ایس آئی سے انتہائی درجے کی نفرت تھی۔ وہ اس کی میز قریب آیا تو اے ایس آئی نے ایک پرچہ اسے تھما دیا۔ ایان کی نگاہیں تیزی سے تحریر پر پھسلتی چلی گئیں۔
نیچے ایک فرضی کہانی تحریر تھی۔ جس کے مطابق درخواست گزر ساجد شاہ نے لکھا تھا کہ وہ کسی ضروری کام کے تحت سیدوالا موجود تھا کہ اچانک سمعان اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ وہاں آ گیا اور چھوٹی سی بات کو وجہ بنا کر اس سے جھگڑ پڑا۔ لڑائی کے دوران عالم طیش میں اس نے ایک بھاری ڈنڈے سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ جس سے وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے ساتھی اسے لے کر فوری اسپتال آ گئے۔ جس سے سمعان احمد کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ لہٰذا اس کے خلاف قانونی کارروئی کر کے اسے انصاف مہیا کیا جائے۔''
وہ جیسے جیسے پڑھتا جا رہا تھا اس کا خون کھول رہا تھا۔ دو سال قبل اس کے ساتھ بھی یہی کھیل رچایا گیا تھا اور اب...... اس کے بعد اس کے امن پسند بھائی کے ساتھ بھی وہی کھیل رچایا جا رہا تھا۔ قانون اندھا ہوتا ہے۔ وہ بہت پہلے سے جانتا تھا' مگر قانون اتنا ظالم ہوتا ہے یہ اسے صحیح معنوں میں کچھ سال قبل ہی پتا چلا تھا۔ کسی بھی ایکس وائی زیڈ بندے کو کسی بھی متعلقہ مقدمے میں پھنسا کر پھانسی کے تختے تک پہنچانا' قانون کے رکھوالوں کا صبح و شام کا کھیل تھا' بڑی کرسیوں پر بیٹھے قانون کے ''بڑے افسران'' کو پتا ہی نہ چلتا تھا کہ ان کے نیچے کے عملے میں کیا ''کھیر'' پک رہی ہے۔

ایس پی' ڈی ایس پی' صرف ایک آدھ گھنٹے کے لیے چکر لگاتے اور سب ٹھیک ہے کا سگنل پا کر واپس چلے جاتے۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے قید' کتنے ہی بے گناہ قیدیوں کی ان کہی کہانیاں دم توڑتی ان کے اندر ہی دفن ہو کر رہ جاتیں۔

ایان بھی جان گیا تھا کہ وہ فی الحال جتنا بھی احتجاج کر لے اپنے حق میں کچھ بھی بہتر نہیں کر سکتا۔ لہٰذا کھا جانے والی نگاہوں سے متعلقہ اے ایس آئی اور کانسٹیبل کو گھورتے ہوئے وہ خود ہی حوالات میں آبیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے سزا نہیں ہو سکتی' مگر جو پیسے ایس ایچ او نے مخالف پارٹی سے کھائے تھے۔ انہیں ''حلال'' کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

وہ خاموشی سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا تھا اور اس کے دماغ میں صرف ایک ہی نام بار بار رقص کر رہا تھا۔ ''سید شاہ والا۔''

وہ اس نام سے انجان نہیں تھا' بچپن میں کئی بار ماں اسے شاہ صاحب سے دم کروانے اِس گاؤں لے جاتی رہی تھی۔ وہ خود بھی مختلف کاموں کے سلسلے میں کئی بار شاہ والا جا چکا تھا' مگر اس گاؤں کے باسیوں کے حوالے سے پیدا ہونے والی نئی کہانی نے اس کے اندر مشکل سے سرد ہوتی آگ کو دوبارہ بھڑکا دیا تھا۔

اگلے دو روز میں ایس ایچ او نے اس کی توقع کے عین مطابق اسے اس کی عدم موجودگی میں ہوئے' جھوٹے کیس میں ملوث کر کے اس کا چالان کر دیا اور یوں ایک مرتبہ پھر جیل کی چار دیواری اور سلاخیں جیسے اس کے نصیب میں لکھ دی گئیں۔

''ارے..... اتنی جلدی پھر آ گئے؟'' جونہی وہ اپنی بیرک میں داخل ہوا' اس کا ایک ساتھی قیدی حیرانی سے اٹھتے ہوئے کہے بغیر نہ رہ سکا۔ ایان نے جلتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیوں؟ کس جرم میں؟''

اس کے ساتھی کی حیرانی میں اضافہ ہوا تھا جب وہ تلخی سے بولا۔

''کچھ لوگوں کو سزا پانے کے لیے کوئی جرم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی رضوان' ہماری بے قصور سزائیں ہی ان افسروں کے سینوں پر لگے پھولوں میں اضافہ کرتی ہیں۔''

''لیکن..... یہ تو زیادتی ہے' تُو نے جب کچھ کیا ہی نہیں تو سزا کیوں.....؟''

''دو سال پہلے بھی تو کچھ نہیں کیا تھا' وہ دن بھی گزارے ہیں ناں یہاں' یہ بھی گزر جائیں گے۔''

''لیکن..... ایان.....''

''بس رضون خدا کے واسطے کچھ نہ کہہ۔''

اس کے لہجے میں تلخی ہی نہیں گہری مایوسی بھی تھی۔

رضوان چپ ہو کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''پتا نہیں اس بار کیا ہوا ہے' ہم تو سوچ رہے تھے ہمارا یار ان سلاخوں کی تاریکی سے نکل کر باہر سورج کی تازہ روشنی اور ہوا میں سانس لے گا تو ہمیں یاد کرے گا۔ اسے گھر کی پکی صاف ستھری روٹی کھانے کو ملے گی تو اس کا دھیان' ہمیں ملنے والی اُبلی دال اور کچی روٹیوں کی طرف ضرور جائے گا'

رات میں جب گرم بستر میں لیٹے گا تو اسے بے ساختہ ہمارے ساتھ ٹھٹھرتی سردی میں بنا کسی کمبل یا لحاف کے ٹھنڈی زمین پر بسر ہونے والی کپکپاتی راتیں یاد آئیں گی...... سچ کہتا ہوں یار! اس بار میں نے دل سے دعا کی تھی کہ تو کبھی یہاں نہ آئے۔“

رضوان کی آنکھوں میں اپنی بات کے اختتام پر آنسو بھر آئے تھے۔

ایان نے ہاتھ بڑھا کر اسے خود سے لگالیا۔

”باہر کی دنیا بڑی ظالم ہے رضوان! رنگ و نور کی مستیوں میں گم‘ اندھا دھند پیسے کے پیچھے بھاگتی یہ باہر کی آزاد دنیا‘ اچھا کھانا کھاتے ہوئے تیرے میرے جیسوں کے بارے میں نہیں سوچتی‘ سخت سردی میں ہم برف سے ٹھنڈے پانی سے نہا کر‘ پھر کسی بھی لحاف کے بغیر سوتے ہیں تو یہ ہمارا مسئلہ ہے‘ بنا کوئی جرم کیے۔ اگر ان بے ضمیر افسروں کی بے ایمانیوں کی وجہ سے ہم تختہ دار پر چڑھ جاتے ہیں تو یہ ہمارا مسئلہ ہے‘ ہمیں یہاں زندہ رہ کر بھی زندگی کی ہر چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے‘ تو یہ بھی ہمارا مسئلہ ہے میرے یار! جو یہاں نہیں آتا‘ یہ اذیت خود نہیں سہتا‘ اسے اس بات سے کوئی مطلب بھی نہیں کہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے زندگی بسر کرنے والوں کا حال کیسا ہوتا ہے‘ انہیں کھانے سونے‘ پہننے کے لیے کیا ملتا ہے‘ جو قیدی ہوتا ہے ناں رضوان‘ وہ بس پھر ہر بات کے لیے قیدی ہی ہو کر رہ جاتا ہے‘ جس افسر کا دل چاہے اسے بنا قصور اُدھیڑ کر رکھ دے۔ جس کا دل چاہے اس کی عزت نفس مجروح کر کے رکھ دے۔ باہر والوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ہماری کہانیاں سنیں یا جانیں۔“ اس کے لہجے میں گہرا ملال تھا‘ رضوان کا دل بھر آیا۔

”صحیح کہتے ہو یار! قید کی اذیت وہی جانتا ہے جو قیدی ہوتا ہے۔ سچ پوچھو تو یہاں آنے کے بعد میں نے اپنے لیے اللہ سے موت کے سوا اور کچھ نہیں مانگا‘ انسانیت کی اس درجہ تذلیل اور اس قدر بے بسی...... مجھے تو اپنا ہر سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے یہاں۔“

وہ آزردہ تھا۔ ایان نے پلکیں موند کر سر دیوار سے ٹکا دیا۔

❋❋❋

سنا ہے یاد کرتے ہو
کہ جب بھی شام ڈھلتی ہے ہجر میں جان جلتی ہے
تم اپنی رات کا اکثر سکوں برباد کرتے ہو
سنا ہے یاد کرتے ہو
کہ جب پنچھی ٹھکانوں پر پلٹ آتے ہیں
غموں کے گیت گاتے ہیں
سنو تم لوٹ آؤں گا ناں‘ یہی فریاد کرتے ہو
سنا ہے یاد کرتے ہو
کہ شب کو جب ستارے آسماں پہ جگمگاتے ہیں
وہ بیتے پل ہمیں اکثر بہت زیادہ رلاتے ہیں

تم اس دَم اپنی آنکھوں میں ہمیں آباد کرتے ہو
سنا ہے یاد کرتے ہو
سارے صحن میں ڈھول اڑ رہی تھی۔
اور وہ کسی تھکے ہوئے بے بس پرندے کی مانند حویلی کی اونچی دیوار میں قید سر جھکائے رہ رہی تھی۔

کل شام ہی حویلی کی ایک ملازمہ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ اس کی ''بوا'' جسے گاؤں والے بی اماں کے نام سے بلاتے تھے۔ ادریس اور گوری کا نام لیتے لیتے بالآخر ابدی نیند سو گئی تھیں۔ پورے گاؤں میں صف ماتم بچھی تھی مگر وہ جو بی اماں کی واحد وارث تھی۔ اسے اتنی سی اجازت بھی نہ تھی کہ وہ ان کا آخری دیدار کر سکتی۔

ادریس زندہ ہوتا تو کیا وہ اتنی کمزور اور بے بس ہو سکتی تھی......؟

پورا گاؤں جانتا تھا کہ وہ بہت بہادر اور جی دار لڑکی تھی گاؤں میں کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھ بھی لے۔ اس کے اچھے اور مضبوط کردار کی وجہ سے ہی سارا گاؤں اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ دوسرا بی اماں اور ادریس کی شخصیات بھی گاؤں والوں کے لیے پسندیدہ شخصیات تھیں۔ ادریس نے خود بھی گاؤں کی کسی لڑکی کو نگاہ اٹھا کر بری نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر آج جب اس کا ''سائبان'' وہی بھائی نہیں تھا تو وہ کیسے کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔

شاہد حسین اسے حویلی کی اونچی دیواروں کے سپرد کر کے جیسے قطعی بے فکر ہو گیا تھا۔ وہ سارا دن کیا کرتی ہے، کھاتی پیتی بھی ہے کہ نہیں اسے کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ ہاں روز شام ڈھلے کسی بھی معمولی بات کو بہانہ بنا کر اسے جانوروں کی طرح پیٹنا اس نے جیسے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ کل رات بھی اس نے بات نہ ماننے پر بہت تشدد کیا تھا اس پر جس کی وجہ سے اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا مگر اب بھلا کسی ''دکھن'' کی کوئی اہمیت ہی کہاں رہی تھی؟

شام ڈھلے شاہد حسین اپنے کمرے میں آیا تو اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ گوری کچھ ہی دیر پہلے حویلی کے ڈھیر سارے جانوروں کا چارا کاٹ کر فارغ ہوئی تھی جب کہ اس کا دل بی اماں کی رحلت کی وجہ سے خون کے آنسو رو رہا تھا۔ مگر شاہد حسین کو اس بات کی پروا نہیں تھی۔

وہ اس سے گزرے دنوں کا حساب لینا چاہتا تھا۔ اسی لیے دہاڑ کر اسے آواز دی تو وہ ڈر گئی۔ وقت کیسے بدل گیا تھا۔ سارے گاؤں کو جُوتی کی نوک پر رکھنے والی گوری اکیلی کیا پڑی کہ اسے بلند آوازوں سے بھی خوف محسوس ہونے لگا۔

ادریس کے ہوتے اسے کبھی شاہد حسین کی مار کی اتنی تکلیف محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اب ہو رہی تھی۔ اس کی دہاڑ پر دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتی وہ کمرے میں آئی تھی۔

''کیا ہے...... کیوں چلا رہے ہو جانوروں کی طرح؟''

''جانور کی بچی اتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں کانوں میں روئی ٹھونس کر بیٹھی ہے کیا؟''

اس کا بازو دبوچ کر جھٹکا دیتے ہوئے وہ پھر چلایا تھا۔ گوری اس حرکت پر پھر تڑپ اٹھی۔

''بازو چھوڑ کر بات کر۔''

''چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا چل بیٹھ یہاں اور ٹانگیں دبا میری۔''
اسے چارپائی کی طرف دھکیل کر اپنے کندھے پر پڑی شال جھٹکتے ہوئے وہ خود اکڑ کر چارپائی پہ بیٹھ گیا تھا۔
''اچھی طرح پتا ہونا چاہیے کہ کیوں لایا ہوں تجھے اس حویلی میں۔ بہت اکڑ دکھالی تو نے اور بہت خوار ہو گیا میں' اب اور نہیں۔ آخری رشتہ بھی مر گیا تیرا' اب کس کے پاس جائے گی بول۔'' اس کے غصے کا گراف نیچے نہیں آ رہا تھا۔
گوری کے گلے میں غم کا پھندا اڑ گیا۔
''خدا اس ظلم کے لیے تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ شاہد حسین بہت برا انجام ہوگا تیرا۔''
''اوئے چپ کر...... بڑی آئی کسی پیر کی پوتی۔ تیرے جیسے کمزور اور بے بس لوگ ایسی بددعائیں ہی دے سکتے ہیں' چل بہت ٹر ٹر نہ کر ٹانگیں دبا۔''
اسے ڈپٹ کر چپ کرواتا وہ چارپائی پر لیٹ گیا تھا۔ گوری ہر طرح سے خود کو بے بس تصور کرتی۔ اس کے حکم کی تعمیل میں جُت گئی۔
''شاباش! میرا کہا مانتی رہے گی تو فائدے میں رہے گی۔ وگرنہ تو جانتی ہے میں غصے میں یہ بھی نہیں دیکھتا کہ ہاتھ میں کون سی چیز ہے۔''
وہ مجبور اور بے بس تھی اور وہ اس کی مجبوری و بے بسی کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔
اس وقت شاہد حسین کے زبردستی ہاتھ پکڑنے پر اس نے چاہا تھا کہ چلا کر شور مچائے مگر...... اب شور کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ اینٹ سیمنٹ سے بنی ان پختہ بے جان دیواروں کے پاس اس کے کسی دُکھ کا کوئی مداوا نہیں تھا۔

❋❋❋

سمعان کی ماں کی طبیعت انتہائی خراب تھی اور اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ اپنی ماں کے لیے ایک وقت کی دوا لے لیتا۔ ہنگامی طور پر گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنے کی وجہ سے وہ بہت سی ضروری چیزیں بھی ساتھ نہیں لا سکا تھا۔ جیب میں جو تھوڑے بہت پیسے تھے وہ بھی ختم ہو گئے تھے۔ تقدیر پہلے ہی کہاں مہربان تھی کہ اب نئی مصیبتوں نے گھر کا راستہ دیکھ لیا۔
صائمہ کا رشتہ انہوں نے بچپن سے ہی اپنے دور پرے کے رشتے داروں میں طے کر رکھا تھا۔ اب ایسے حالات میں یہ رشتہ بھی اسے پایہ تکمیل تک پہنچتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پریشانی ہی پریشانی تھی اور وہ ماں کی چارپائی کے قریب بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ آخر کرے تو کیا کرے......؟
چھوٹے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ اوپر سے صائمہ اور صاعقہ جو چار پیسے روزانہ سلائی کڑھائی سے بنا لیتی تھیں' وہ آمدنی بھی نہ رہی۔ یہی وجہ تھی کہ نوبت فاقوں تک آ گئی تھی۔ تب ہی صائمہ نے اپنے جہیز میں رکھے سونے کے چھوٹے ٹاپس بکسے سے نکال کر اسے لا تھمائے۔
''یہ...... یہ کیا ہے؟'' وہ حیران ہوا تھا جب وہ بولی۔
''سونے کے ٹاپس ہیں بھائی۔ میرے جہیز کے لیے ماں نے کب سے سنبھال کر رکھے ہوئے

ہیں مگر...... مجھے یہ ماں کی زندگی سے زیادہ عزیز نہیں ہیں۔ اس لیے انہیں بیچ کر ماں کے لیے دوا، بچوں کے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے آئیں۔"

وہ حساس بھی تھی اور سمجھ دار بھی۔

سمعان کا دل بہن کی اس قربانی پر بھر آیا۔

"میں نے کہا تھا ناں سمعان پرائی مصیبت مول نہ لے مگر تو نے میری ایک نہیں سنی۔ اب دیکھ لے، کتنی مصیبت دیکھنا پڑ رہی ہے تجھے......"

اس کی ماں بھی قریب ہی لیٹی تھی۔

سمعان پر ان کی پچاس مرتبہ کی کہی بات پھر سن کر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ٹانگ کا زخم تھا کہ کسی طور ٹھیک ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ خودکشی کر لے مگر...... خودکشی ہی ہر مسئلے کا حل کہاں ہوتی ہے؟

صائمہ کے جہیز کا سامان آہستہ آہستہ ٹھکانے لگ رہا تھا اور گھر کے حالات تھے کہ بگڑتے جا رہے تھے۔

ایسے حالات میں صاعقہ جو سارے بہن بھائیوں میں زیادہ ہوشیار اور پڑھی لکھی تھی۔ بے حد مجبور ہو کر کسی ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ کٹھن حالات میں اپنے پیاروں کو مزید اذیت میں مبتلا دیکھنا اس کی برداشت سے باہر تھا۔

❋❋❋

جب سے اس کا رینک بڑھا تھا۔ پیشہ ورانہ ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔

محبت کے میدان میں اوندھے منہ گرنے کے بعد امامہ کے لیے چار دیواری کی اہمیت مزید بڑھ گئی تھی۔ ایسے میں ہزار برے رویے کے باوجود شجاع حسن کو وہ اپنا مسیحا مانتی تھی کیونکہ اس شخص نے اپنی جان سے پیاری بیٹی کو اس کے ہاتھوں پہنچنے والی تکلیف میں دیکھنے کے باوجود اس سے چھت نہیں چھینی تھی۔

اس روز بھی وہ خاصی تاخیر سے گھر آیا تھا اور بے حد تھکن کا شکار تھا۔ امامہ کو کبھی کبھی اس شخص پر ترس آتا تھا۔ کیا زندگی تھی اس کی...... کولہو کے بیل کی مانند سارے دن کام میں مصروف رہ کر جب تھک جاتا تھا تو خود کو اپنے شاندار کمرے کی تنہائیوں کے سپرد کر دیتا تھا۔ نہ کوئی اس کا غمگسار تھا نہ تنہائی بانٹنے والا۔

اسے خود میں اور ایس پی شجاع حسن کی زندگی میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا تھا۔

آج کل وہ اسے خصوصی توجہ کے ساتھ ٹیلی کر رہی تھی۔ گھر آنے کے بعد بھی وہ شخص اپنے کیس میں مصروف رہتا تھا اور جب تھک جاتا تھا تو سو جاتا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی مگر...... ایک کوشش ضرور کر سکتی تھی اس کا اعتماد جیتنے کی اور اسی سوچ کے زیر اثر اس وقت وہ اس کے کمرے میں آئی تھی۔

شجاع اس کی آمد سے قطعی بے خبر دروازے کی جانب پشت کیے بیڈ پر بیٹھا کسی تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر اضطراب کے تاثرات واضح پڑھے جا سکتے تھے مگر وہ چونکہ اس کا

وہ نہیں دیکھ پا رہی تھی تب ہی جھجکتے ہوئے کچھ دیر ہمت کرنے کے بعد اس نے اسے پکار لیا تھا۔

"سر......"

اور وہ جو اپنے ہی خیالوں میں کھویا تھا اس کی آواز پر چونک کر فوراً سر گھمایا۔

"ہوں......"

امامہ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں سرخی کی ہلکی سی لکیر کے ساتھ نمی بھی تھی۔ تب ہی فوری طور پر وہ کچھ بول نہ سکی تو شجاع نے خود کو سنبھال لیا۔

"جی مس امامہ۔"

"چائے لاؤں آپ کے لیے؟"

"نہیں۔"

"کیوں......؟ روز تو اس ٹائم ایک کپ چائے پیتے ہیں۔"

"ہوں......لیکن یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے آپ صرف......"

"جی......معلوم ہے مجھے۔ میں آپ کی بیٹی کی صرف آیا ہوں اور کچھ نہیں' آپ بار بار یاد نہ بھی دلائیں تب بھی یاد رہتا ہے مجھے لیکن یہ کہاں لکھا ہے کہ ایک گورنس صرف بچے کی دیکھ بھال ہی کر سکتی ہے' چائے تک نہیں بنا سکتی۔"

آج اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

شجاع چاہنے کے باوجود اسے نظر انداز نہ کر سکا۔

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میں اصل میں آپ پر کوئی اضافی بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا کیونکہ اس گھر میں ہر کام کے لیے ملازم موجود ہے۔"

"جی مجھے معلوم ہے لیکن میں ہر کام میں ٹانگ نہیں اڑا رہی۔ میں صرف چائے کی اجازت لے رہی ہوں۔"

شجاع کے نرم لہجے نے اس کا اعتماد بڑھایا تھا۔

"او کے لے آئیں۔"

وہ اس وقت اس سے بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔ امامہ مطمئن سی واپس پلٹ گئی۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی تو شجاع لباس تبدیل کر چکا تھا۔

"گڑیا تو سو گئی ہو گی؟"

اس کے ہاتھ سے گرم چائے کا کپ تھامتے ہوئے وہ بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

"جی ہاں۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر ٹی وی دیکھتی ہے پھر میری گود میں ہی سو جاتی ہے۔"

"آپ سے بہت مانوس ہو گئی ہے۔ اصل میں وہ اندر سے بہت سہمی ہوئی ہے۔ اسی لیے اس کی طبیعت میں چڑچڑا پن آ گیا ہے۔ آپ سے قبل وہ کسی آیا سے اتنی مانوس نہیں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اُدھیڑ عمر تھیں جب کہ اس کی ماں اُدھیڑ عمر نہیں ہے۔ وہ آپ کے وجود میں شاید اپنی ماں کو تلاشنے کی کوشش کرتی ہے۔ میں نے اسی پوائنٹ کو ذہن میں رکھ کر آپ کو اپائنٹ کیا تھا۔"

''اور آپ اپنے اس تجربے میں کامیاب رہے۔''

وہ بے مقصد مسکرائی تھی جواب میں شجاع کو بھی مسکرانا پڑا۔

''جی اب کسی حد تک کہہ سکتی ہیں آپ......''

کپ خالی کر کے اس نے سائیڈ پر رکھ دیا تھا تب ہی امامہ نے اس سے وہ سوال کیا جو وہ پچھلے کئی دنوں سے سوچ رہی تھی۔

''سر! اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں آپ سے ایک سوال پوچھوں۔''

کتنا حیران کر رہی تھی وہ آج اسے...... شجاع کا سر آپ ہی آپ اثبات میں ہل گیا۔

''ہوں پوچھیں......''

''سر! آپ کے نزدیک میں کیسی لڑکی ہوں؟''

''کیا مطلب؟ میں آپ کا سوال سمجھا نہیں۔'' وہ الجھا تھا اس بے تکے سوال پر۔

امامہ نے اپنا سر جھکا لیا۔

''میرا کہنے کا مطلب ہے آپ مجھے کیسی لڑکی سمجھتے ہیں اچھی یا بری؟''

''نہ اچھی نہ بری...... لیکن آپ یہ سوال کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

وہ اب بھی سمجھ نہیں پایا تھا تب ہی وہ رخ پھیرتے ہوئے بولی تھی۔

''اس لیے کیونکہ آج تک سب مجھے برا ہی سمجھتے رہے ہیں۔ میں کسی کو اچھی نہیں لگی۔ جان سے پیاروں نے بھی بے کار بوجھ کی مانند کندھے سے اتار پھینکا۔''

''لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا مس امامہ! آپ تھوڑی سی مشکل لڑکی ضرور ہیں مگر میں جانتا ہوں جن رشتوں سے آپ پیار کرتی ہیں پھر ان کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ عقل کی کمی ہو سکتی ہے آپ میں مگر کردار کے لحاظ سے بہت مضبوط لڑکی ہیں آپ...... آج کے دور میں ہر عورت جو نفس کے بے لگام گھوڑے کے پیچھے بھاگ کر اپنا وقار گنوا رہی ہے۔ آپ جیسی سیدھی سادی بے ضرر لڑکیوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ عورت پردے کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔''

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن...... یہاں ہر مرد کی سوچ آپ جیسی نہیں ہے۔''

اس کے تصور میں پھر ارسلان کا سراپا در آیا تھا اور اندر لگے زخموں کو ہوا لگی تھی۔

''ہوں...... لیکن آپ نے دیکھا ہوگا ایسے مرد زندگی میں کامیاب بھی کم ہی ہوتے ہیں۔ عورت چاہے تو مرد کو تخت و تاج لٹا کر فقیر بننے پر مجبور کر دے اور عورت چاہے تو کسی مرد کو زمین سے اٹھا کر کامیابیوں کے زینے تک پہنچا دے۔ بڑا رول ہوتا ہے مرد کی زندگی میں عورت کا۔''

وہ اپنا ہی فلسفہ بگھار رہا تھا۔ امامہ اس کے خیالات سے اتفاق کرتی' کچھ ہی دیر میں اس کے کمرے سے نکل آئی تو شجاع نے گہری سانس بھری۔

''تمہیں کیا پتا امامہ تم کتنی پیاری لڑکی ہو......''

سر اٹھا کر کمرے کی چھت پر نگاہ ٹکاتے ہوئے اس نے جیسے امامہ کے تصور کو روبرو کیا تھا مگر باہر چلنے والی سرد ہوا کے تھپیڑوں نے جی بھر کر اس کے اس تصور کا مذاق اڑایا۔

❋❋❋

"زاور! میری بات سنو پلیز۔"
وہ آفس سے نکل کر ابھی گاڑی میں بیٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شافیہ آفندی کی پکار پر رک گیا۔ کاٹن کے سادہ سے سوٹ میں ملبوس' وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔
زاور نے لب بھینچ کر بمشکل اپنی کوفت کا گلا گھونٹا۔
"کہو......اب کیا مصیبت آپڑی ہے تم پر......؟"
"مصیبتیں تو بہت ہیں مگر غمگسار کوئی نہیں خیر کہاں جا رہے ہو؟"
"تم سے مطلب؟"
"کوئی مطلب نہیں۔ ویسے ہی پوچھ رہی ہوں۔ بتا دو گے تو عزت کم نہیں ہو جائے گی تمہاری۔"
وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔
زاور حسین نے رخ پھیر کر اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔
"گاؤں جا رہا ہوں۔ اپنے ایک محسن دوست سے ملنے۔"
"تو مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ کچھ ضروری بات کرنی ہے تم سے۔"
"ہرگز نہیں۔ پہلے کم بے عزت نہیں ہوا تمہاری وجہ سے کہ مزید مصیبت اپنے گلے ڈال لوں۔"
"پلیز زاور! بے عزت تو میں ہوئی ہوں۔ تمہاری عزت پر تو کسی نے میرے حوالے سے کوئی کیچڑ نہیں اچھالا......" وہ روہانسی ہوئی تھی۔ زاور کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے جان کیسے چھڑائے۔
"گھر جاؤ شافیہ' میں پہلے ہی دماغی طور پر نارمل نہیں ہوں۔"
"پتا ہے مجھے۔ اسی لیے بہت سی ضروری باتیں تم سے شیئر کرنا چاہتی ہوں پلیز زاور اتنے کٹھور مت بنو۔"
ضبط کرتے کرتے بھی وہ اپنی پلکوں کو بھیگنے سے باز نہیں رکھ سکی تھی۔
زاور نے پل دو پل کے لیے کچھ سوچتے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"اوکے۔ بیٹھو گاڑی میں۔"
شافیہ کو لگا جیسے تاحدِ نگاہ پھیلے صحرا میں بارش کا پہلا قطرہ ٹپک پڑا ہو۔
وہ جلدی سے گھوم کر گاڑی کی دوسری سائیڈ کی طرف آگئی۔
"تھینکس......"
زاور کے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی وہ ممنون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تو وہ کہہ اٹھا۔
"اب کہو۔ کون سی بہت ضروری باتیں شیئر کرنا تھیں تمہیں؟"
"سانس تو لینے دو۔ ویسے تم شادی کیوں نہیں کر رہے؟"
"میرا ذاتی معاملہ ہے یہ اور میرے خیال سے تمہیں اس میں دخل انداز کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"
"کیوں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے لیے میں نے اپنی پوری زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔

سب کچھ گنوا دیا اپنا اور تم کہہ رہے ہو مجھے ضرورت نہیں ہے۔"
"میں نے نہیں کہا تھا تم سے کچھ بھی کرنے کے لیے۔"
اس کے ہرٹ ہونے پر لب بھینچتے ہوئے فوری اس نے کہا تھا۔ جواب میں شافیہ نے تلخی
مسکراتے ہوئے اپنا رخ پھیر لیا۔
"ہاں تم نے نہیں کہا تھا۔ تمہیں ضرورت بھی نہیں تھی کچھ کہنے کی۔ محبت تمہارا درد سر تھوڑی ہے۔"
"میں ایسی محبت کو نہیں مانتا جو رسوائی کے کمبل میں لپٹی ہو۔"
"تو پھر کیا کرتی میں...... ؟ بولو تم تو سات سمندر پار جا کر بیٹھ گئے تھے۔ تمہاری طرف سے
بھاڑ میں جاتی تمہیں کیا......"
وہ جذباتی ہوئی تھی پھر فوراً خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔
"تمہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میری زندگی کے ساتھ کیا ہوتا ہے مگر...... مجھے
بات سے فرق پڑتا ہے کہ میری زندگی کس کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ صرف تمہارے لیے...... تمہیں
پانے کے لیے میں نے اپنی جان سے پیاری ماں کو کھو دیا زاور۔ میرا بھائی جو اپنی جان چھڑکتا تھا
پر اب میری طرف دیکھتا ہے تو اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی ہوتی ہیں۔ وہ
ڈسٹرب ہو کر رہ گیا ہے کہ اپنی محبوب بیوی کو معمولی سی خوشی بھی نہیں دے سکتا۔ ابھی ایک روز پہلے
ڈسٹربنس نے میری بھابی کو ہمیشہ کے لیے بانجھ کر دیا ہے زاور" اپنی بات مکمل کرتے
دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تو زاور نے گاڑی کی رفتار قدرے کم کر دی
"زندگی میں بعض اوقات چھوٹی چھوٹی غلطیاں یوں ہی بڑے بڑے طوفانوں کا پتا دیتی ہیں۔
کوئی ہے اور بھرتا کوئی ہے۔ اگر تم اپنی ماں اور بھائی کے پیار سے محروم ہوئی ہو تو محبتوں کے خزا
میری جھولی میں بھی نہیں ہیں۔ میں نے بھی بہت کچھ کھو دیا ہے۔ اپنے پیارے بابا' اپنی بہن
خوشیاں اور سب سے بڑھ کر نیک نامی۔"
وہ بھی مضطرب تھا۔ شافیہ نے آہستہ سے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔
"میں سمجھتی ہوں زاور! اپنی غلطی کا پورا احساس بھی ہے مجھے۔ ہر روز خدا سے اپنی موت کی
مانگ کر سوتی ہوں مگر میں نے اپنی مما کا دل دکھا کر ان کی جان لی ہے ناں اس لیے میری دعا
بھی اب قبولیت کا حق کھو چکی ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جاؤں؟"
وہ اب بے حد آزردہ تھی۔ زاور حسین کا دل ایک لمحے میں موم ہوا تھا اور اس نے ہاتھ بڑھا
اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اسے اگلے ہی پل اپنے مضبوط حصار میں لے لیا۔

❁❁❁

"ہریرہ ہاسپٹل سے گھر واپس آنے کی بجائے سائلہ بیگم کے ساتھ یزدانی پیلس چلی گئی تھی
پر شاہ زر مزید الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس نے سائلہ بیگم کے نمبر پر فون کیا تھا۔ جواب میں اچھی خاصی
پڑ گئی تھی۔ ابھی ہریرہ نے انہیں اندر کی کہانی تو سنائی ہی نہیں تھی۔ وہ تو محض اس کی کل رات کی
موجودگی پر ہی برہم ہو رہی تھیں۔ وہ شرمسار سا رابطہ منقطع کر گیا تھا۔

زندگی اتنی الجھ کر رہ گئی تھی کہ وہ خود اپنے آپ سے بیزار ہو کر رہ گیا تھا۔
بُریرہ کے مِس کیرج کا اسے بھی شدید دکھ تھا مگر اس سے بھی بڑا دکھ اس کے ہمیشہ کے لیے ماں نہ بن پانے کا تھا۔ جرم اس نے کیا تھا اور سزا وہ کاٹ رہی تھی جس کا اس سارے قصے میں کہیں کوئی قصور نہیں تھا۔
اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر بُریرہ کے سیل کا نمبر ٹرائی کیا مگر اس نے دو چار بیل کے بعد ہی اس کی کال کاٹ دی۔ اس نے پھر کیا اور جواب میں بُریرہ نے پھر اس کی کال کاٹ دی۔ وہ اس سے ناراض تھی اور شاید اس بار یہ ناراضگی شدید نوعیت کی تھی۔
فون کا ریسیور رکھ کر گہرا سانس بھرتے ہوئے وہ اٹھا اور سیدھا نائلہ بیگم کی قبر پر چلا آیا۔ ان کی وفات کے بعد جب بھی وہ بہت مضطرب یا دکھی ہوتا تھا۔ ان کی قبر پر چلا آتا تھا۔ وہ زندہ نہیں تھیں مگر اسے لگتا تھا کہ وہ اس کی ہر بات سنتی ہیں اور اس کے لیے دعا کرتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اگلے دو چار گھنٹے وہاں بیٹھ کر قدرے سکون سمیٹنے کے بعد جب وہ وہاں سے اٹھا تو اپنے لیے ایک بہتر فیصلہ کر چکا تھا۔

❊❊❊

ایان کی رہائی ہو گئی تھی۔
شاہد حسین کے آدمیوں نے اس کے کہنے پر اپنا پرچہ جو سمعان اور ایان دونوں کے خلاف کٹ گیا تھا واپس اٹھا لیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ کیسے ہوا۔ اسے اس بات کی خبر بھی نہیں تھی کہ اگر گوری کی وجہ سے اس کے گھر پر مصیبت آئی تھی تو گوری کی وجہ سے ہی اسے رہائی بھی مل گئی۔
کل رات اس نے شاہد حسین کے حکم کے سامنے اس کی خواہش پر سر جھکا لیا تھا اور جواب میں اس سے یہ التجا کی تھی کہ وہ سمعان اور اس کے گھر والوں کو اپنی دشمنی کی لسٹ سے نکال دے۔ وہ بھی ترنگ میں تھا لہٰذا اس نے متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او کو کہہ کر اپنا پرچہ واپس لے لیا۔ عدالت میں تو ابھی بات شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔
پولیس اہلکار نے جس وقت اسے رہائی کی نوید سنائی وہ حیران سا اپنے ساتھی رضوان کا چہرہ دیکھتا رہا تھا جو اس کی دوسری غیر متوقع رہائی پر بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔
"مبارک ہو ایان! رب سوہنے نے تیری سن لی ہے۔ باہر جا کر ہمیں بھول تو نہیں جائے گا ناں؟" خوشی کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں عجیب سی کسک تھی۔
ایان نے ہاتھ بڑھا کر اسے خود سے لپٹا لیا۔
"تو سوچ سکتا ہے ایسا مگر میں مر کر بھی ان سلاخوں کی کہانی بھلا نہیں سکتا رضوان! جتنے دن بھی ہم نے یہاں گزارے ہیں سب دل پر رقم ہیں۔
"باہر جا کر ہمارے لیے بھی دعا کرنا۔"
رضوان کے ساتھ آصف نے بھی اسے تاکید کی تھی۔ وہ اس سے بھی گلے مل کر اثبات میں سر ہلاتا نم آنکھوں کے ساتھ بیرک سے باہر آتے آتے رک گیا۔ بیرک کے داخلی دروازے کے ساتھ وہ لڑکا کھڑا تھا جسے ابھی جیل میں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور جس پر چند روز پہلے ہی پولیس

والوں نے خاصا تشدد کیا تھا۔
ایان کچھ سوچتے ہوئے اس کے قریب رک گیا۔
''رضوان! میرے بعد اس کا خیال رکھنا۔ میں نہیں چاہتا یہاں کے ماحول میں ایک اور اچھا انسان اپنی انسانیت گنوا بیٹھے۔'' اس کے لہجے میں خلوص تھا۔ رضوان نے اس کے کہنے پر فوراً آگے بڑھتے ہوئے اس نئے پنچھی کے چوڑے شانوں کے گرد اپنا بازو حمائل کر دیا۔
''تو فکر نہ کر۔ یہ بھی یار ہے اپنا۔''
''اچھا پھر...... اللہ حافظ۔''
بوجھل قدموں کو اٹھاتا۔ وہ پژمردہ سے لہجے میں اپنے ساتھیوں کو خدا حافظ کہتا اگلے کچھ ہی لمحوں میں لاک اپ سے باہر نکل آیا۔ اس بار اس کے قدم سیدھے گاؤں ''سید شاہ والا'' کی طرف جانے راستے پر گامزن تھے۔ اسے یہ جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اسے جھوٹے کیس میں پھنسانے والوں نے پھر اپنا کیس واپس کیوں لے لیا مگر اسے یہ بات جاننے میں ضرور دل چسپی تھی کہ آخر وہ لڑکی کون تھی جس نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر والوں کو انتہائی تکلیف سے دوچار کیا تھا اور یہی کھوج اس روز اسے سید شاہ والا کی طرف لے آئی تھی۔

❋❋❋

بی اماں کی اچانک رحلت نے انزلہ کو شدید صدمے سے دوچار کیا تھا۔ پہلے ہی ادریس اور گوری کی اچانک گمشدگی اسے پریشان کیے ہوئے تھی کہ اس پر ان دونوں کے غم میں تڑپتی بی اماں بھی ہمیشہ کی ابدی نیند جا سوئیں۔ ان کا چالیسواں ہو چکا تھا مگر وہ تا حال ادریس اور گوری کا کوئی پتا نہیں چلا سکی تھی۔ چند روز پہلے علاقے کے ڈی ایس پی نے اسے طلب کیا تھا اور سانول شاہ کے خلاف اس کی شکایت سنی تھی مگر کوئی عمل دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔
اس کی پہنچ واقعی اوپر تک تھی پھر وہ کوئی ثبوت بھی پیش نہیں کر سکی تھی اس کے خلاف۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آزاد پھر رہا تھا۔ اس روز وہ ابھی قبرستان میں بی اماں کی قبر پر جانے کا قصد کر رہی تھی کہ اچانک سانول شاہ کا کوئی چمچہ دھول اڑاتی گاڑی میں سوار اس کے راستے میں آ کر رک گیا۔
''چلو انزلہ بی بی! ہم چھوڑ آتے ہیں۔''
انزلہ کی آنکھیں حیرانی سے اوپر اٹھی تھیں۔ اسے گمان ہی نہیں تھا کہ سانول کا کوئی چمچہ سرِ راہ کبھی اسے بھی چھیڑ سکتا ہے۔
''اپنی اوقات میں رہو۔''
تنفر سے کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگی جب وہ بے ڈھنگا سا شخص گاڑی سے اتر کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
''اپنی اوقات میں رہ کر ہی کہہ رہا ہوں۔ یہ تم ہو جو آج کل اپنی اوقات بھولتی جا رہی ہو اور استاد پر وار کر رہی ہو۔ بھلا گیدڑوں کی بھبکیوں سے بھی کبھی شیر ڈرے ہیں؟''
سنسان راستے میں اس کی راہ روکے کھڑا وہ مسکرا رہا تھا۔

انزلہ کو پہلی بار اپنے عورت ہونے کا احساس ہوا۔

"بکواس بند کرواپنی اور راستہ چھوڑو میرا۔"

اس کے مزاج کی طرح موسم کے تیور بھی بگڑتے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی پل بادل برسیں گے اور گاؤں کے کچے راستے بارش کے پانی سے جل تھل ہو جائیں گے۔

سانول شاہ کے چمچے نے اس کی دہاڑ پر اپنے قدم مزید آگے بڑھائے تھے۔

"راستہ نہ چھوڑوں تو کیا کرلو گی تم میرا؟"

مرد کے شیطان بنتے کبھی دیر نہیں لگتی۔

انزلہ نے بے ساختہ اپنے قدم پیچھے ہٹائے تھے اور ٹھٹک گئی تھی کیونکہ اس کے پیچھے ہی کچھ فاصلے پر سانول شاہ کھڑا تھا جس کی آنکھیں اس لمحے جیسے جل رہی تھیں۔

"استاد......"

اس کے کارندے کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کہیں آس پاس ہی ہوگا تب ہی اچانک اسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ خوف زدہ ہوا تھا۔ جواب میں سانول نے پے در پے تھپڑوں سے اس کا چہرہ سرخ کر ڈالا۔ اس کی آنکھیں جیسے قہر برسا رہی تھیں۔

"جرأت کیسے ہوئی تمہیں انزلہ کی راہ روکنے کی...... کیسے غلط نگاہ ڈالی تم نے اس پر بولو......؟"

وہ اسے بے دردی سے پیٹ رہا تھا اور ادھر بارش شروع ہوگئی تھی۔

"منع کیا تھا ناں میں نے کوئی میلی نگاہ سے نہیں دیکھے گا اسے...... پھر کیسے ہمت کی تم نے......؟"

وہ نہ صرف اپنے خاص کارندے کو پیٹ رہا تھا بلکہ غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے دہاڑ بھی رہا تھا۔

انزلہ اپنے لیے اس کے یہ جذبات دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔

لمحہ لمحہ تیز ہوتی بارش نے اس کے ساتھ ساتھ سانول شاہ اور اس کے کارندے کو بھی بھگو ڈالا تھا مگر اسے اس بات کا احساس نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر خون سوار ہوگیا ہو۔ وہ اپنے کارندے کو اس وقت تک پیٹتا رہا جب تک کہ انزلہ نے چلا کر اسے اس اقدام سے روک نہیں دیا۔

اپنے چمچے کے الٹے پاؤں بھاگ جانے کے بعد وہ اس کی طرف پلٹا تھا۔

"تمہیں گاؤں میں لور لور پھرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔"

اس کی دہاڑ میں شیر جیسی گرج تھی۔ وہ دو قدم مزید پیچھے ہٹ گئی۔

"کیوں عذاب بن گئی ہو میرے لیے یہاں آکر بولو؟"

اس بار اس کے دونوں کندھوں کو جھنجوڑتے ہوئے اس نے اچھا خاصا جھٹکا دیا تھا۔

انزلہ چاہنے کے باوجود اپنی نگاہوں کو اس کے چہرے سے ہٹا نہ سکی۔

"جو آنکھ میلی ہو کر تمہاری طرف اٹھے گی وہ آنکھ نکال لوں گا میں...... جو ہاتھ تمہیں چھوئے گا وہ ہاتھ کاٹ ڈالوں گا میں...... کیوں بھول جاتی ہو تم کہ تم صرف میری ہو صرف میری......"

جذبات کی شدت نے اس کی آواز کو بوجھل کر دیا تھا۔ انزلہ حیران نگاہوں سے اس کا یہ جنونی

انداز دیکھتی رہ گئی۔

کتنے بہت سارے لمحے یوں ہی بیت گئے تھے جب وہ اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے بولا تھا۔

''تم نفرت کرتی ہوناں مجھ سے تو کرو۔ جھولیاں بھر بھر کر بددعائیں دو جو کرنا ہے کرو مگر خدا کا واسطہ ہے تمہیں شہر واپس چلی جاؤ انزلہ پلیز......''

بارش پہلے سے اور تیز ہو گئی تھی۔

انزلہ نے اس کے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹا کر جھٹک دیے۔

''تمہیں موت کے سپرد کیے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتی میں۔''

ایک لمحہ لگا تھا اسے ٹرانس کی کیفیت سے نکلنے میں اور اس ایک لمحے میں اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ سانول شاہ کے لبوں پر اس کے الفاظ نے پھر کسیلی مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

''بہت کڑی شرط ہے انزلہ میری بات کیوں نہیں مانتی ہو تم......؟''

''نہیں مانتی مجھے تمہاری کوئی بات۔ اگر پولیس والوں پر تمہاری دولت کا جادو چلتا ہے تو کوئی بات نہیں۔ میرے پاس اور بھی راستے ہیں تمہیں تمہارے کیے کی سزا دلوانے کے۔''

''مثلاً......؟''

''چل جائے گا پتا جلد ہی......''

''ٹھیک ہے کرلو جو کر سکتی ہو مگر پلیز یوں صبح شام ادھر اُدھر پھر کر خون مت جلایا کرو میرا......اتنا تو کہا مان سکتی ہو؟''

وہ اب نارمل ہو چکا تھا۔ انزلہ سرسری نگاہ سے اسے دیکھتی رخ پھیر گئی۔

''اگر واقعی تمہیں میری عزت کا اتنا خیال ہے تو سچ سچ بتا کیوں نہیں دیتے کہ ادریس اور گوری کہاں ہیں؟''

''اگر بتا دوں گا تو تم یہ سارے فضول کام چھوڑ دو گی؟''

''پتا نہیں۔''

''پھر تو یہ بے ایمانی ہے انزلہ۔''

جانے ان لمحوں کا اثر تھا یا موسم کا کہ وہ نثار ہو رہا تھا۔ ادھر انزلہ کے لیے مشکل بڑھتی جا رہی تھی۔

''مجھے ادریس اور گوری کا پتہ چاہیے۔''

''ادریس مر چکا ہے۔ شاہد حسین کے ساتھ لڑائی میں اس کی موت ہو گئی تھی اور گوری......وہ شاہد حسین کے خوف سے گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہے۔ میرے علم میں تو یہی بات ہے۔''

وہ اس سے کچھ چھپا کر مطمئن بھی نہ رہ سکتا تھا اور صاف ساری بات بتا کر اسے دکھی بھی نہیں کر سکتا تھا تب ہی آدھے سچ اور آدھے جھوٹ سے کام لیا مگر انزلہ کی سماعتیں جیسے ادریس کی موت کا سن کر فریز ہو گئی تھیں۔ کتنی ہی دیر وہ بے یقینی سے سانول شاہ کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتی رہی تھی۔ میران شاہ کے بعد وہ دوسرا شخص تھا جس کی موت کی خبر نے اسے شدید شاک پہنچایا تھا۔

❀❀❀

''بُریرہ......''

وہ نیند کی گولیاں لے کر ابھی سونا ہی چاہتی تھی کہ شاہ زر کی پکار نے اسے چونکا دیا۔ پورے پندرہ دن کے بعد تھکے تھکے سے حلیے میں بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ وہ اس کے سامنے تھا۔ سائرہ بیگم اور شافیہ کے ساتھ ساتھ ساحل کی بیوی بھی اس وقت گھر پر نہیں تھی تب ہی جز بز ہوتی وہ اس سے ہمکلام ہوئی تھی۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! کیسی ہو تم؟''

''پتا نہیں......''

اس کے صوفے پر بیٹھنے کے بعد نگاہوں کا رخ پھیرتے ہوئے اس نے بمشکل اپنے آنسوؤں کو چھلکنے سے روکا تھا۔

''ابھی تک ناراض ہو بُریرہ؟''

وہ ہرٹ ہوا تھا جب وہ بولی

''ناراضگی کس بات کی......؟''

''میں تمہیں لینے آیا ہوں۔''

''لیکن مجھے تمہارے ساتھ کہیں نہیں جانا۔''

''کیوں نہیں جانا؟ مجھے تمہارے دکھ، تمہاری اذیت کا احساس ہے بُریرہ لیکن......''

''لیکن...... آپ مجبور ہیں۔ انوشہ رحمٰن کی محبت آپ کو کسی اور کے درد کا احساس کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہی کہنا چاہتے ہیں ناں آپ؟'' وہ تلخ ہوئی تھی۔

شاہ زر لب بھینچ کر ضبط کی کوشش کرتا اپنے چہرے کا رخ پھیر گیا۔

''نہیں کرتا میں اس سے محبت...... کتنی بار وضاحت دوں تمہیں......؟ اس سے محبت کرتا تو آج میری وجہ سے وہ موت کے دوراہے پر نہ کھڑی ہوتی۔ تم نہیں جانتیں بُریرہ کہ صرف میری وجہ سے وہ کتنی اذیت میں ہے۔ بہت برا کیا ہے میں نے اس کے ساتھ بہت برا......''

''اور میرے ساتھ...... کیا میرے ساتھ بہت اچھا کیا ہے تم نے......؟''

''شاید نہیں...... لیکن تم تو میری اپنی ہو بُریرہ۔ میرے ہر سکھ دکھ کی ساتھی۔ اگر ان حالات میں تم بھی مجھے بے آسرا چھوڑ دو گی تو بتاؤ میں کہاں جاؤں گا......''

وہ اس کے تلخ سوال پر بہت شکستگی سے بولا تھا۔

بُریرہ کے آنسو اس بار اس کی پلکوں کی باڑ توڑ کر گالوں پر بہہ نکلے۔

''قصور تمہارا نہیں ہے شاہ زر! قصور میرے دل کا ہے۔ تم کتنا بھی برا کر لو میرے ساتھ مگر یہ دل تم سے محبت کرنے سے باز نہیں آ سکتا۔ پتا نہیں کیوں شدید دکھی ہو کر بھی میں تمہیں کسی اذیت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی۔ تمہارے معاملے میں' میں اپنے دل سے نہیں جیت سکتی شاہ زر پتا نہیں کیوں؟''

وہ رو رہی تھی اور شاہ زر کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔

''بہت شرمندہ ہوں میں تم سے بُریرہ پلیز! مجھے معاف کر دو پلیز......''

ہاتھ بڑھا کر اسے گلے سے لگاتے ہوئے اس بار اس کی آواز بھرائی تھی۔ جواب میں بُریرہ اس

سے لپٹ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔
''اس بار تم نے میرا بڑا نقصان کیا ہے شاہ زر! صرف تمہاری وجہ سے ڈیپریس ہو کر بے دھیانی میں، میں سیڑھیوں سے گری اور قدرت نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے ماں بننے کا حسین اعزاز چھین لیا۔''

وہ اب گلہ کر رہی تھی مگر شاہ زر کے پاس اپنے دفاع میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ بس اس سے معافی مانگ رہا تھا۔

''میں نے سوچ لیا ہے بُریرہ! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ یہاں سے کہیں دور چلے جائیں گے جہاں کوئی دکھ ہمارا تعاقب کرنے والا نہ ہو تم چلو گی ناں میرے ساتھ......؟''

''ہاں......''

وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں تھی ہی نہیں۔ زندگی میں بعض اوقات انسان کا اپنا دل اس سے جنگ کے لیے مقابل آجاتا ہے اور دل سے جنگ کرنے کا حوصلہ ان ہی لوگوں کا ہوتا ہے جو بے حس ہو جاتے ہیں مگر بُریرہ کمال ابھی بے حس نہیں ہوئی تھی۔ اس کا دل اب بھی شاہ زر کی مٹھی میں دھڑکتا تھا یہی وجہ تھی کہ تہی دامن ہو کر بھی وہ اس کے ساتھ سائلہ بیگم کی مخالفت کے باوجود سڈنی چلی آئی تھی۔

❁❁❁

ایان پچھلے ڈیڑھ ماہ سے سید شاہ والا میں گوری نامی لڑکی کی تلاش کے لیے خوار ہو رہا تھا جب اس روز اس کی ملاقات انزلہ سے ہو گئی۔

وہ زیر تعمیر اسکول کی عمارت کا جائزہ لے رہی تھی تب ہی وہ چہرے سے پسینہ پونچھتا اس کے قریب چلا آیا۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔''

ایک قطعی اجنبی نوجوان کو خود سے ہمکلام ہوتے دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھی جب وہ بولا۔

''میرا نام ایان ہے۔ یہاں گاؤں سے کچھ ہی فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے وہیں رہتا ہوں۔ آپ سے کچھ مدد چاہیے تھی۔''

''کیسی مدد؟''

''اسی گاؤں کی ایک لڑکی گوری کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''گوری کے بارے میں مگر وہ تو...... خیر کیا جاننا چاہتے ہیں؟''

چھنو اس وقت اس کے ساتھ ہی تھی اور اس نے سمعان والی بات حرف بہ حرف اس کے گوش گزار کر رکھی تھی اسی لیے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ چھنو کی نگاہوں میں بھی اس کے لیے تجسس تھا۔ تب ہی وہ بولا تھا۔

''ہم کہیں چھاؤں میں بیٹھ کر بات نہیں کر سکتے......؟''

''کیوں نہیں...... یہ سامنے ہی گھنے درخت ہیں۔ وہ کرسیاں رکھی ہیں میں نے آیئے۔''

ادریس کی وفات کا سن کر وہ پچھلے کئی دنوں سے بہت مضطرب تھی۔ اسی لیے ایان کو نظر انداز نہ کر سکی۔ ایان گھنے درختوں کے نیچے کرسی پر بیٹھا تو اس کے حواس ٹھکانے پر آئے اور اس نے اپنی تمام روداد انزلہ کے گوش گزار کی۔

''بس اس لڑکی کی وجہ سے میرے گھر والوں کے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔ اسی لیے میں اس تک پہنچنا چاہتا ہوں۔''

اپنی روداد کے اختتام پر گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے انزلہ سے کہا تھا جب وہ اس سے افسوس کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔

''آپ کا دکھ اور غصہ اپنی جگہ بجا ہے مگر وہ لڑکی شاید آپ کو مزید خواری کے بعد بھی یہاں نہ ملے کیونکہ یہاں کے چوہدری نے اس بے چاری کا سارا گھرانہ اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ پچھلے دو ماہ سے اس کا کوئی اتا پتا نہیں ہے کہ وہ کہاں گئی اور یہ بھی نہیں پتا کہ آپ کے بھائی پر فائر کرنے والے وہ کون لوگ تھے کیونکہ جہاں تک مجھے بتایا گیا ہے اس کے مطابق تو اس کا شوہر بھی اس کی تلاش میں ہے۔''

''ہوں تو پھر میں چلتا ہوں۔ اگر کبھی وہ لڑکی یہاں آئے تو آپ پلیز مجھے اس سے مطلع ضرور کر دیجیے گا۔ وہی بتا سکتی ہے کہ میرے گھر والے کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔''

اگلے ہی پل کھڑے ہوتے ہوئے وہ بولا تھا جب سانول شاہ کا منشی اس کی جیپ میں ان کے قریب سے گزر گیا۔

''یہ...... سانول شاہ کا منشی تھا ناں؟''

ایان کی سرسری سی نگاہ اس پر پڑی تھی اور اس نے رُک کر پلٹتے ہوئے انزلہ سے پوچھ لیا تھا۔

''ہاں...... لیکن آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟''

''کئی بار اس کے ساتھ عدالت میں دیکھا ہے اسے' میران شاہ کے کیس میں۔''

''میران شاہ کے کیس میں؟'' وہ حیران ہوئی تھی جب وہ بولا۔

''ہاں میران شاہ کے کیس میں۔ وہ بھی تو اسی گاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے میرے ساتھ ہی ہوتا تھا وہ۔ اب تو سزا ہو گئی ہے اسے۔ اسی لیے کسی دوسری جیل میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔''

اس کے حال سے بے خبر وہ بتا رہا تھا اور انزلہ شاہ کو لگ رہا تھا جیسے اس کا دماغ کام کرنا چھوڑ گیا ہو۔ میران شاہ تو مر چکا تھا پھر وہ اسی گاؤں کے کس میران شاہ کی کہانی سنا رہا تھا اسے؟ چھنو کا حال بھی اس سے مختلف نہ تھا۔ ایان قدم آگے بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ انزلہ نے خود کو سنبھال لیا۔

''ایک منٹ رکیں پلیز......''

اس کا دل اس لمحے بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا جب کہ ایان کو اس کے چہرے کی رنگت حیرانی میں ڈال گئی تھی۔

❋❋❋

''یار مجھ سے لکھوا لے بنا کسی تگڑی سفارش یا بھاری رشوت کے تجھے کوئی بھی جاب نہیں ملنے

والی۔'' ناشتے میں صبح چائے پی کر اپنے ڈاکومینٹس اٹھائے وہ اپنی نئی ہمسائی لڑکی کے ساتھ پچھلے چار گھنٹے سے خوار ہو رہی تھی جب ایک جگہ درخت کے نیچے اس کے ذرا دیر ستانے پر اس کی ہمسائی لڑکی آمنہ نے پیشن گوئی کی۔ جواب میں صاعقہ نے چہرے پر آیا پسینہ پونچھ کر اپنے گریبان میں پھونک ماری۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ کہانیوں میں یوں ہی لڑکیاں پیدل چل رہی ہوتی ہیں اور یوں ہی کوئی نہ کوئی عقل کا مارا ہیرو اِدھر اُدھر سے نکل کر اس کی مدد کو پہنچ جاتا ہے۔ یہاں ہیرو تو دور' طبیعت فریش کرنے کو کوئی بندر بھی نظر نہیں آ رہا۔''

وہ خود تھکن سے بے حال تھی۔ آمنہ اس کے گلے پر ہنس پڑی۔

''بندر کا کیا کرنا ہے یار۔ اصل میں آج کل لوگ ہمارے جیسے غریب غربا' مجبوریوں کی بیڑیوں میں جکڑے بے بس لوگوں سے دور بھاگتے ہیں۔ اب وہ ترس کھانے اور ہمدردی جتانے کے زمانے گئے۔ اب جاب بھی ان ہی لڑکے لڑکیوں کو ملتی ہے جو اپنے مالکوں کو ترسی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے کی بجائے یہ سگنل دیتے نظر آتے ہیں کہ بھئی نوکری دینی ہے تو دو ورنہ ہمیں بھی کوئی ایسی مصیبت نہیں پڑی کہ فضول میں ٹائم ضائع کریں اپنا۔''

آمنہ کا تجربہ اس سے زیادہ تھا۔ صاعقہ تائیدی انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔

''چل آخری کوشش کر لیتے ہیں۔ سنا ہے سلائی سینٹر والوں کو کچھ ایسے ورکرز کی ضرورت ہے جو ان کے آرڈر پر ان کی ہدایات کے مطابق فوری مال تیار کر کے دیں۔ تنخواہ تو تھوڑی ہے مگر فارغ پھرنے سے تو بہتر ہی ہے ناں۔''

اپنے گھریلو حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے کہا تھا اور اس روز بالآخر وہ کامیاب گھر لوٹی تھی کیونکہ سلائی والے کارخانے میں اسے اور آمنہ دونوں کو تین تین ہزار روپے پر جاب مل گئی تھی۔ صبح سات سے رات نو بجے تک پندرہ گھنٹے کی سخت ترین ڈیوٹی بھی اسے قبول تھی کہ اس وقت ایک ایک روپیہ اس کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔

صائمہ کے جہیز کی اب مزید ایسی کوئی چیز ان کے پاس نہیں رہی تھی کہ جسے فروخت کر کے اس کے گھر والے گھر کا نظام چلا سکتے۔ اوپر سے سمعان کی ٹانگ کا زخم بھی مناسب علاج اور دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے بگڑتا جا رہا تھا۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد سکون کے ایک لمحے کو ترس کر رہ جاتی تھی وہ۔ بھائی کی بیروزگاری اور معذوری' ماں کی بیماری' چھوٹے بہن بھائیوں کی بھوک سے ہوتی جنگ اور بہن کی آنکھوں کے دم توڑتے خواب...... اسے تھکن سے چور ہونے کے باوجود رات میں دیر تک سونے نہیں دیتے تھے۔

صائمہ نے ان کٹھن حالات میں اس کا ساتھ دینے کے لیے اپنے جہیز کی سلائی مشین سنبھال لی تھی اور اب چار پانچ ماہ کے بعد ان کے حالات قدرے معمول پر آ گئے تھے۔ زخم زیادہ بگڑ جانے کے سبب سمعان کو اپنی ٹانگ مجبوراً کٹوانی پڑی تھی اور اسی غم نے پھر اس کی ماں کو بستر سے اٹھنے ہی نہ دیا۔ صاعقہ کے اندر گزرتے ہر لمحے کے ساتھ جیسے زندگی کا احساس دم توڑتا جا رہا تھا۔ جاب کی مشکلات کی وجہ سے اسے پہلی فرصت میں موبائل فون لینا پڑا تھا تاکہ کبھی کبھار کام زیادہ ہونے یا کسی

مشکل کا شکار ہونے کے سبب گھر والوں کو اطلاع دے سکے۔
مگر اسے یہ خبر کہاں تھی کہ زندگی اس موڑ پر اس کے لیے ایک نئی دل چسپ کہانی لیے منتظر کھڑی ہے۔

❁❁❁

تُو کسی در پہ گیا ہو تو خبر ہو تجھ کو
کس قدر کارِ اذیت ہے سوالی ہونا

چار ماہ کے چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھائے' پسینے سے بے حال ہوتی' سڑک کے کنارے وہ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ جب شاہ زر کے پاؤں فوراً بریک پر جا پڑے۔
پچھلے چار ماہ جو وہ بُریرہ کے ساتھ دیارِ غیر میں گزار کر آیا تھا جیسے اس ایک پل میں غارت ہو گئے تھے۔ وہ جو یہ طے کر بیٹھا تھا کہ اب کبھی انوشہ کو بُریرہ کے مقابل لا کر اسے دکھی نہیں کرے گا۔ اس ایک لمحے میں اپنے اس ارادے سے بے خبر ہو بیٹھا۔
انوشہ کے بازوؤں میں چھوٹا سا بچہ دیکھ کر اس کا دل بہت تیزی سے دھڑکا تھا۔ جب کہ بُریرہ اور شافیہ اس کے یوں اچانک بریک لگانے پر حیران ہوئی تھیں۔
''کیا ہوا شاہ زر۔'' بُریرہ جو اس کے پہلو میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی' اس کی نگاہ ابھی انوشہ پر نہیں پڑی تھی۔
شاہ زر نے اس کے سوال پر چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔
تاہم شافیہ کی نگاہ انوشہ پر پڑ چکی تھی' تبھی اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر وہ گاڑی سے باہر نکل آئی۔
''انوشہ...... آپ یہاں......؟''
چند قدم کا فاصلہ طے کر کے وہ انوشہ تک پہنچی تھی۔
بُریرہ کا دل ایک مرتبہ پھر سکڑ کر رہ گیا۔
انوشہ نے شافیہ کی پکار پر فوراً رُخ اس کی طرف پھیرا تھا اور پھر قدرے تامل کرتی ہوئی بولی تھی۔
''ہاں...... وہ...... وہ میں اپنے بے بی کو ڈاکٹر کے پاس لائی تھی' کل رات سے بہت تیز بخار تھا اسے۔''
''ارے...... آپ مما بھی بن گئیں اور ہمیں خبر تک نہیں ہوئی' ذرا دکھائیں تو' ہمارا بے بی کیسا ہے؟'' وہ ساری حقیقت سے باخبر تھی۔ تبھی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے بچے کو انوشہ کے بازوؤں سے اُچک لیا۔
''بہت پیارا ہے' اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ یہاں دھوپ میں کیوں کھڑی ہیں؟''
بچہ ہو بہو شاہ زر کی کاپی تھا۔ مگر وہ اس کی تعریف میں شاہ زر کا حوالہ استعمال نہیں کر سکتی تھی۔
تبھی ملکے سے بچے کے گال چھو کر اس نے انوشہ سے پوچھا تو وہ بولی۔
''ٹیکسی کا انتظار کر رہی تھی' عبدالصمد ملک سے باہر ہیں' اسی لیے اکیلے آنا پڑا۔''
''چلیے میں ڈراپ کر دیتی ہوں آپ کو' بھائی مجھے اور بھابی کو آئس کریم کھلانے لائے تھے۔

آپ بھی شریک ہو جایئے۔"

"نہیں' میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی' یہاں پاس ہی تو جانا ہے مجھے' آپ انجوائے کریں۔"

شاہ زر کی توقع کے عین مطابق اس نے سہولت سے انکار کر دیا تھا' جس پر وہ ضبط سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ جان پہلے ہی سکون میں نہیں تھی کہ اس نئی اتفاقی مڈبھیڑ نے اور بے چین کر کے رکھ دیا۔

شام کو عباد اس سے ملنے آیا تو وہ اس کے سامنے رو پڑا۔

"شاہ...... کیا ہوا میرے یار......؟"

"پتا نہیں عباد' مجھے لگتا ہے میں لحہ لحہ ختم ہو رہا ہوں' کوئی چیز ہے جو مجھے اندر سے کاٹ رہی ہے' نہیں برداشت ہوتی یہ اذیت مجھ سے' کیا کروں میں؟"

"اب کیا ہوا؟"

"کیا کچھ نہیں ہو رہا...... اس کی گود میں میرا خون تھا عباد اور میں...... میں ایک نظر اسے دیکھ بھی نہیں سکا' میری آنکھوں کے سامنے وہ اذیت سہہ رہی ہے اور میں...... میں کتنا بے بس ہوں کہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔"

"انوشہ رحمان کی بات کر رہے ہو ناں؟"

"ہوں......"

"سرزمان والی سائیڈ پر ہی سسرال ہے اس کا۔ میری خالہ زاد کزن اس کے برابر میں ہی رہتی ہے' ابھی پچھلے اتوار میں اُدھر گیا تو کافی کچھ بتا رہی تھی وہ اس کے بارے میں' پچھلے چار پانچ ماہ تو اس کا پتا ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں رہی ہے' کزن بتا رہی تھی کہ اس کا شوہر پرائی عورتوں کے چکر میں پڑ کر بہت ظلم کرتا ہے اس پر۔"

عباد بتا رہا تھا اور اس کا دل کٹ کر گر رہا تھا۔

"اسے اس کے حال پر چھوڑ دو شاہ زر' یہی بہتر ہوگا تمہارے لیے بھی اور اس کے لیے بھی۔ ویسے بھی تم اس سے محبت تو کرتے نہیں' صرف ہمدردی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ یہ ہمدردی تمہیں مہنگی پڑے۔" اسے تسلی دیتے ہوئے وہ سمجھا رہا تھا۔

شاہ زر نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے آہستہ سے رُخ پھیر لیا۔

❀❀❀

سائلہ بیگم اپنے بیٹوں اور بہو کے ساتھ دیارِ غیر شفٹ ہونے کو پر تول رہی تھیں' کیونکہ صدف بیگم نے جمال صاحب اور نزہت بیگم کو اپنے پاس بلا لیا تھا' لہٰذا وہ پیچھے کیوں رہتیں۔ صدف بیگم کو انوشہ کی زندگی کے بارے میں جان کر شدید دکھ پہنچا تھا' مگر وہ کسی صورت ان سے رابطے کی خواہاں نہیں تھی' اسی لیے ان کے بے حد اصرار پر بھی اس نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔

بُریرہ نے شاہ زر کا رجحان اس کی طرف پا کر' اپنی اماں کے ساتھ ہی یورپ شفٹ ہونے کے لیے شاہ زر پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا' مگر وہ اس کے دباؤ میں نہیں آیا۔ انوشہ کے ساتھ ساتھ اس کے لیے اس گھر سے الگ رہنا بھی آسان نہیں تھا۔ جس کے در و دیوار سے اسے اپنی اماں کی خوش بو

آتی تھی‘ اسی لیے آج کل دونوں کے بیچ جھگڑا چل رہا تھا‘ نزہت بیگم یورپ شفٹ ہونے سے قبل زاور کی خواہش پر اس کی شادی کر کے سُرخرو ہونا چاہتی تھیں۔ اسی سلسلے میں انہوں نے سائلہ بیگم سے بات کرنے کی بجائے ڈائریکٹ شاہ زر کو گھر بلا کر اس سے شافیہ کا ہاتھ مانگ لیا تو وہ انکار نہ کر سکا۔ گو اب وہ شافیہ سے ناراض نہیں تھا مگر وہ پہلی سی محبت بھی نہیں رہی تھی۔ پھر اپنی جس ضد کی وجہ سے اس نے اتنی ساری زندگیوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا‘ اب وہ ضد پوری ہو ہی جاتی تو اچھا تھا۔

سائلہ بیگم کو اس رشتے کی بابت پتا چلا تو انہوں نے کافی شور مچایا‘ انوشہ اور زاور کے کرداروں پر کیچڑ اُچھالنے کے ساتھ ساتھ‘ اپنی مرحومہ بہن نائلہ بیگم کے حوالے سے اسے جذباتی بلیک میل کرنے کی کوشش بھی کی‘ مگر اس پر جیسے ان کی کسی بات کا اثر نہ ہوا اور یوں زاور اور شافیہ کی نسبت طے ہوگئی۔

عبدالصمد آج کل زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہتا تھا لہٰذا نزہت بیگم زبردستی انوشہ کو اپنے گھر لے آئیں۔ ان کے لیے اکیلے شادی کی تیاری کرنا ممکن نہیں تھا‘ جب کہ زاور بھی اپنی خوشیوں میں اس کی شمولیت کا خواہش مند تھا۔ لاکھ وہ اس سے بدگمان سہی مگر وہ اس کی بہن تو تھی۔

اگر شاہ زر اپنی بہن کا قصور معاف کر کے اس کی خوشی کا خیال رکھ سکتا تھا تو وہ کیسے اپنی زندگی کے اتنے اہم موقع پر اپنی بہن کے وجود کو نظرانداز کر دیتا۔ یہ سب چونکہ ایمرجنسی میں ہو رہا تھا لہٰذا اسے ادریس کے گاؤں جا کر اسے انوائیٹ کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ مصروفیات اتنی تھیں کہ حد نہیں‘ اس روز مہندی کا فنکشن تھا۔

شاہ زر نے اگلی پچھلی ساری کسر نکالتے ہوئے اپنے گھر کو دلہن کی طرح سجا دیا تھا۔ صدف بیگم پل پل فون پر نزہت بیگم اور زاور سے رابطہ رکھے ہوئے تھیں‘ ادھر سائلہ بیگم نے اس شادی کا مکمل بائیکاٹ کرتے ہوئے اپنے کسی بھی بچے کو شادی میں شمولیت کی اجازت نہیں دی‘ صرف بُریرہ شاہ زر کے ساتھ تھی اور وہ بھی مجبوری میں کہ شاہ زر کی ناراضی اسے کسی طور گوارہ نہیں تھی۔

بلیک ڈنر سوٹ میں نفاست سے تیار ہوئے‘ وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت دکھائی دے رہا تھا جب کہ بُریرہ نے بھی اسی کی مناسبت سے بلیک شیفون کپڑے پر نازک سی کڑھائی والے سوٹ کا انتخاب کر کے اس کی ذات سے اپنی محبت کی انتہاء ثابت کر دی تھی۔

عباد تو باقاعدہ ان دونوں کی بلائیں لیتے ہوئے ان کا ریکارڈ لگا رہا تھا۔

شافیہ اس موقع پر اتنی خوش تھی کہ بار بار اپنے پاک پروردگار کا شکر ادا کرتے ہوئے رو پڑتی تھی۔ اس کی سہیلیوں نے زاور کے حوالے سے اسے چھیڑ چھیڑ کر خوب تنگ کیا ہوا تھا۔

شاہ زر انتظامات میں مصروف تھا تو بُریرہ مہمانوں کو ڈیل کرنے میں‘ اپنے گھر والوں کے بائیکاٹ کے سبب اس کا اپنا دل بھی اس تقریب میں نہیں لگ رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ مجبوراً سب کو ہنس ہنس کر خوش آمدید کہہ رہی تھی۔

لڑکے والوں کی طرف سے مہندی آچکی تھی۔

شاہ زر جو اپنے کاموں میں الجھا ہوا تھا مہندی کی آمد کا سن کر بے قرار ہو گیا‘ اس کی نگاہیں بے صبری سے آنے والے مہمانوں میں انوشہ رحمٰن کو ڈھونڈ رہی تھیں اور بالآخر وہ اسے نظر آگئی تھی۔

ڈارک بلو کلر کے سادہ سے سوٹ میں ملبوس' مہمانوں کے بیچ خاموشی سے کھڑی' وہ اسے حقیقی معنوں میں مسرور کر گئی تھی۔ ہر طرف خوشیاں تھیں' قہقہے تھے' مگر اس کے اداس چہرے پر کسی مسکراہٹ کا کوئی گزر نہیں تھا۔ اگلے کتنے ہی لمحوں تک اردگرد کی پروا کیے بغیر وہ یک ٹک اسے دیکھتا رہا تھا' جب ایک لمحے کو انوشہ رحمٰن کی نگاہیں اٹھی تھیں اور اسے محویت سے اپنی طرف دیکھتے پا کر' اس نے فوراً اپنا رُخ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ شاہ زر کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکان بکھر کر رہ گئی۔

اس کا بچہ نزہت بیگم کے پاس تھا اور وہ گھر پر ہی رک گئی تھیں۔

بُریرہ اب آنے والے مہمانوں کو کولڈ ڈرنک سرو کر رہی تھی' جب عباد نے شرارت سے شاہ زر کا دھیان بٹانے کے لیے ایک لڑکی کی پلیٹ سے تھوڑی سی مہندی اٹھا کر شاہ زر کے گال پر مسل دی۔ جواب میں وہ جو اپنے ہی خیالوں میں گم کھڑا تھا' اس کی اس شرارت پر چونکتے ہوئے مسکرایا اور پھر بدلا لینے کی غرض سے خود بھی تھوڑی سی مہندی اٹھا کر اس کے پیچھے لپک گیا' مگر وہ کہاں ہاتھ آنے والا تھا؟

شاہ زر کو چڑاتا وہ پہلے بُریرہ کو پکڑ کر اس کے سامنے کرتا رہا' پھر دل میں جانے کیا سمائی کہ بُریرہ کو چھوڑ کر انوشہ کے گرد ہو گیا۔ شاہ زر اس ٹکراؤ کے لیے تیار نہیں تھا' لہٰذا کسی بھی صورت اسے قابو کرنے کے لیے' اس نے جونہی اس کے گال کو مہندی کا نشانہ بنانا چاہا' اس نے انوشہ کو پکڑ کر' اس کے سامنے کر دیا اور یوں وہ مہندی جو اس کے ہاتھ میں تھی انوشہ کے چہرے کو نشانہ بنا گئی۔

لوگ اس بھاگ دوڑ کو انجوائے کرتے ہوئے ہنس رہے تھے' مگر وہ جیسے پتھر کا مجسمہ بنا اس لڑکی کے سامنے کھڑا تھا جس کے چہرے پر اس وقت بھی اس کے لیے سوائے نفرت کے اور کچھ نہیں تھا۔

❁❁❁

''صاعقہ...... یار میں سوچ رہی تھی تو پڑھ لکھ کر کوئی ڈھنگ کا شعبہ کیوں نہیں جوائن کر لیتی۔''

آمنہ اس روز سنڈے کی چھٹی کا فائدہ اٹھا کر اس کے گھر آ دھمکی تھی۔

صائمہ سلائی مشین سے چمٹی بیٹھی تھی' جب کہ وہ کپڑے دھو رہی تھی۔ بچوں کو اس نے باہر گلی میں کھیلنے کے لیے نکال دیا تھا۔

''کہہ تو تُو یوں رہی ہے جیسے سارے ڈھنگ کے شعبے میری ڈگریوں کے انتظار میں پڑے سڑ رہے ہیں یا میرا کوئی ہوتا سوتا ہیڈ لگا ہے ان پر' جو جاتے ہی شاندار سی جاب میرے ہاتھ میں تھما دے گا' کوئی نہیں ہے غریبوں کا ایسا خیر خواہ' بڑے جتنے بھی لوگ ہیں سب خون چوستے ہیں ہمارا اور بس۔''

کٹھن حالات نے اس کی سوچوں میں تلخی بھر دی تھی۔

آمنہ اس کے الفاظ پر کھل کر ہنس دی۔

''بات تو صحیح کہہ رہی ہے تو' اب اپنی طرف ہی دیکھ لے' محض دو چار ماہ میں اتنی سی شکل نکل آئی ہے پھر بھی اخراجات پورے نہیں ہوتے۔''

''ہنس لے' تو بھی ہنس لے' ہم غریبوں کے حال پر۔''

کپڑے نچوڑتے ہوئے اس نے دل جلے لہجے میں کہا تو آمنہ مزید ہنس دی۔

''آئے ہائے' خدا خیر کرے۔ ایک ہی رات میں کون سے فاقے اتر آئے آسمان سے؟'' وہ
[illegible]اری تھی۔ صاعقہ نے اسے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

''اچھا سن' تیرے دونوں بھائیوں کے ساتھ مسئلہ چل رہا ہے' تو وکالت کیوں نہیں کر لیتی؟''
[illegible]پ بیٹھنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

صاعقہ نے کپڑے نچوڑ کر تار پر پھیلانے شروع کر دیے۔

''کی تھی کوشش' پر میری اماں نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔''

''کیوں......؟''

''گھریلو حالات کی وجہ سے یار' اماں مجھے کتابیں لے کر دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی' ورنہ [illegible]ری تو بڑی خواہش تھی وکیل بننے کی۔''

''چلو اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہی ہوتی ہے۔ وکیل بن کر بھی کون سے تیر مار لینے تھے' جس کا [illegible]ی کیس پکڑتیں' مروا دیتیں بے چارے کو۔''

اس کے سرد آہ بھرنے پر آمنہ اب ہنس رہی تھی' تبھی وہ بولی۔

''واہ...... تمہیں میری ذہانت کا اندازہ نہیں ہے' چھکے چھڑا دیتی میں اپنے مخالف وکیلوں کے۔''

''اچھا...... وہ کیسے......؟''

آمنہ کی آنکھوں میں اب بھی شرارت تھی۔

''وہ ایسے کہ جس دن فائنل بحث ہوتی اس دن میں ذرا ٹھیک ٹھاک میک اپ کر کے جاتی' بے [illegible]ارے جج کو میرے چہرے کے سوا اور کوئی چیز دکھائی ہی نہ دیتی' یوں فیصلہ میرے حق میں ہو جاتا' [illegible]ب اپنے موکلوں سے فیس الگ لیتی اور میک اپ کے پیسے الگ۔''

وہ اپنے نادر خیالات کا اظہار کر رہی تھی اور ادھر آمنہ کا ہنس ہنس کر برا حال ہو رہا تھا۔

''واقعی یار' کتنی جینئس ہے تو۔ میں یونہی شک کرتی ہوں تمہاری عقل پر۔ تجھے تو قانون کے وہ [illegible]ر پتا ہیں جو سینئر سے سینئر وکیل کو بھی نہیں پتا ہوں گے' ویسے اس وقت اگر کوئی جج تمہارے خیالات [illegible]ن لے ناں تو قسم سے پتا لگ جائے تمہیں۔''

''چھوڑ یار' میں تو ذکر بھی پسند نہیں کرتی ان وکلاء' ججز کا۔''

ایک لمحے میں وہ بیزار ہوئی تھی۔

آمنہ نے بھی فوراً موضوع بدل دیا۔

''اچھا' پھر انٹرویو کے لیے تیار رہنا' کل اکٹھے چلیں گے۔''

''ٹھیک ہے' آج سالن کیا پکایا ہے تم لوگوں نے؟''

کپڑے پھیلا کر وہ فارغ ہو گئی تھی اور اب اسے روٹی بنانی تھی۔

''آلو گوشت۔'' آمنہ نے اٹھتے اٹھتے اسے جواب دیا تھا۔

''گڈ' میرے لیے بھجوا دینا یاد سے' تجھے تو پتا ہے آلو گوشت میں میری جان اٹکی رہتی ہے۔''

''ہاں پتا ہے ندیدی' گھر جا کر بھجواتی ہوں۔''

''شکریہ' جاتے جاتے دروازہ بند کر جانا اچھی طرح سے' ورنہ اماں ابھی بولنا شروع ہو جائیں گی۔''

آمنہ دروازہ پار کر رہی تھی جب اس نے ہانک لگائی' جواب میں وہ اچھی طرح ان کے ٹوٹے پھوٹے دروازے کو بھیڑتی دہلیز پار کر گئی۔

❁❁❁

وہ گڑیا کے ساتھ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی جب اچانک اس کا موبائل بج اٹھا۔ یہ تو طے تھا کہ اس نمبر پر سوائے ارسلان کے اور کوئی کال نہیں کر سکتا تھا' لہٰذا اس کا دل اچانک شدت سے دھڑک اٹھا۔

''کس کا فون ہے آنی......؟''

گڑیا کی توجہ بھی اس کے سیل فون کی بزر کی جانب مبذول ہوئی تھی۔

امامہ نے گھبرا کر اسکرین پر اُبھرتا نمبر دیکھا پھر گڑیا کو جواب دیتے ہوئے بولی۔

''میرے کزن کا۔''

''کزن......کزن کیا ہوتا ہے آنی......؟''

''بتاتی ہوں' ویٹ کرو۔''

اتنے دنوں کے بعد ارسلان کی کال نے نہ صرف اسے حیران کر دیا تھا بلکہ اس کے ہاتھ پاؤں بھی پھلا دیئے تھے۔

''ہیلو......'' گڑیا کے قریب سے اٹھ کر اس نے فوراً کال پک کی تھی۔ جب وہ بولا۔

''کب سے بیل جا رہی ہے اٹھا کیوں نہیں رہیں' بہت مصروف ہو کیا؟''

''نن......نہیں تو......''

''پھر......خوب عیش کر رہی ہو گی؟''

وہ تلخ ہوا تھا' امامہ تڑپ کر رہ گئی۔

''کیا تم سے الگ رہ کر عیش کر سکتی ہوں؟''

''مجھے کیا پتا' تم لڑکیوں کے قول و فعل کا کوئی بھروسہ تھوڑی ہے؟''

''کیا یہی سنانے کے لیے فون کیا ہے۔''

وہ رو دینے کو ہو گئی تھی۔ جب وہ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد بولا۔

''نہیں......یونہی اکیلا بیٹھا تھا تو سوچا تمہیں فون کر لوں' کیا کر رہی تھیں؟''

''ٹی وی دیکھ رہی تھی۔''

''ایس پی کے گھر میں کوئی ٹینشن تو نہیں ہے ناں؟''

''ہو بھی تو تم کیا کر لو گے؟ اپنے پاس تو بلا نہیں سکتے۔''

''کیسے بلاؤں' میں تو خود کسی اور کے کندھوں پر سوار ہو کر آیا ہوں۔''

اس کے محبت بھرے شکوے پر فوراً وہ تپتے ہوئے بولا تھا۔ تبھی وہ دکھ سے مسکرا دی۔

''میری محبت کے معاملے میں کتنے مجبور ہو تم؟''

''اچھا یار! اب شروع نہ ہو جانا' پہلے ہی وہ اسٹوپڈ رُحاب ناراض ہوئی بیٹھی ہے مجھ سے۔''

''وہ ناراض ہوئی ہے تو تمہیں میں یاد آئی ہوں؟''

''ہاں......''

بنا کسی ہچکچاہٹ کے اس نے فوری اعتراف کرلیا تھا۔ امامہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔
''پھر تو خدا کرے وہ ہر روز تم سے ناراض ہی رہے۔''
''ہاں' تم تو بد دعائیں ہی دو گی' میرا سکون کہاں برداشت ہوتا ہے تم سے۔''
وہ جلا تھا' امامہ روتے ہوئے مسکرا دی۔
''اچھا سنو' وہ فائل کا کچھ پتا چلا کہ نہیں؟''
اصل مقصد کی طرف آنے میں اس نے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔
''پتا نہیں' تمہاری بے وفائی کے بعد میں نے کبھی کسی فائل کی تلاش نہیں کی۔''
امامہ نے صاف جواب دے دیا۔
''کیوں نہیں کی' کیا تم نہیں چاہتیں کہ میں پاکستان آکر تم سے ملوں؟ امامہ...... یہ ٹھیک ہے میں نے رُحاب سے شادی کرلی ہے مگر میں اس سے محبت نہیں کرتا' یہ تو صرف مجبوری تھی۔ محبت کا جو رشتہ ہے وہ صرف تم سے جڑا ہے میرا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے شادی کے باوجود میں خوش نہیں ہوں' میں تمہیں بہت مس کررہا ہوں امامہ۔''
ایک پل میں اس کا لہجہ بدلا تھا۔
امامہ کے دل کی حالت عجیب ہوگئی۔ اس کا شدت سے دل چاہا کہ ارسلان کہیں سے اُڑ کر فوراً اس کے سامنے آجائے اور وہ اس کے گلے لگ کر خوب روئے۔
''تم بھی مجھے مس کرتی ہو ناں امامہ!''
ہر شاطر مرد کی طرح وہ بھی اپنے لیے اس کی سچی محبت سے واقف تھا تبھی لہجے کو گلوگیر بنا کر سوال کیا تو وہ سیل فون پر ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔
''امامہ......! امامہ تم رو رہی ہو' امامہ پلیز چپ ہوجاؤ۔ میرے دل کو کچھ ہورہا ہے۔''
وہ جیسے تڑپا تھا۔
امامہ کو صرف ایک لمحہ لگا تھا اس کی طرف سے دل صاف کرنے اور اس کی تمام خطائیں بھلانے میں۔
شام کو شجاع گھر آیا تو گڑیا نے اس کے سامنے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔
''پاپا...... آنی آج پھر روئی تھیں۔''
اس کی بات پر شجاع نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا' وہیں امامہ بھی گڑیا کی اس قطعی غیر متوقع شکایت پر سٹ پٹا کر رہ گئی تھی۔
''کیوں......؟''
''پتا نہیں' ان کے کزن کا فون آیا تھا' اس نے آنی کو رُلا دیا۔''
وہ اتنی (شارپ مائنڈ) ہوگی، امامہ کو قطعی اندازہ نہیں تھا۔
''ہوں' آپ نے چپ نہیں کروایا؟''
''نہیں۔''
اس کی گود میں بیٹھی وہ سچائی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ امامہ خود پر شجاع کی

نظروں کی تپش برداشت نہ کرتے ہوئے فوراً وہاں سے کھسک گئی۔

❋❋❋

میں تمہیں چاہتا نہیں لیکن......
پھر بھی جب پاس تم نہیں ہوتیں
خود کو کتنا اداس پاتا ہوں' گم سے اپنے حواس پاتا ہوں
جانے کیا دھن سمائی رہتی ہے' خاموشی روح پہ چھائی رہتی ہے
دل سے بھی گفتگو نہیں ہوتی
میں تمہیں چاہتا نہیں لیکن......
پھر بھی جب تم اداس ہوتی ہو' دل میرا ڈوب ڈوب جاتا ہے
میرے خوابوں میں اور خیالوں میں' عکس تیرا ہی جھلملاتا ہے
میں تمہیں چاہتا نہیں لیکن......
میری سوچوں میں' سب خیالوں میں
ساری باتوں میں' سب حوالوں میں
ذکر تیرا ہی جاری رہتا ہے' اک نشہ روح پہ طاری رہتا ہے
میں تمہیں چاہتا نہیں لیکن......

انوشہ اپنا چہرہ دھونے کے لیے واش بیسن کی طرف آئی تو وہ بھی سب سے نگاہ بچا کر' چپکے سے اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔ انوشہ اپنے پیچھے اس کی آمد سے بے خبر تھی' لہٰذا ڈوپٹہ ہٹا کر' دونوں بازو فولڈ کرتے ہوئے وہ چہرے کو مسل کر دھونے لگی۔

شاہ زر جو اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تھا' اس کی گوری کلائیوں پر تازہ زخموں کے نشان دیکھ کر تڑپ اٹھا۔

''انوشہ......'' اس کی پکار میں بھی تڑپ تھی' جب کہ وہ از حد حیرانی سے پیچھے پلٹی تھی۔

''انوشہ...... یہ زخم' یہ کیسے لگے تمہاری کلائیوں پر۔''

وہ لپک کر اس کا بازو تھام چکا تھا۔ تبھی وہ درشتگی سے اپنا بازو اس سے چھڑاتے ہوئے بولی تھی۔

''تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے کہ یہ زخم کیوں لگے' کیونکہ میرے ساتھ جو بھی ہو رہا ہے اس کی وجہ صرف تم ہو۔''

''جانتا ہوں میں...... لیکن اپنے ہر گناہ کی تلافی کرنا بھی چاہتا تھا' تم مجھے یہ بھی نہیں کرنے دینا چاہتیں۔''

''مجھے تمہاری کسی تلافی کی کوئی ضرورت نہیں' خدا کا واسطہ ہے شاہ زر' مت آیا کرو میرے سامنے' تمہیں دیکھ کر میرا ایک ایک زخم رسنے لگتا ہے۔ پاگل ہو جاتی ہوں میں' پلیز......''

اس کی آواز پھر بھرائی تھی جب شاہ زر ایک ہاتھ دیوار پر ٹکا کر اس کی راہ روکتے ہوئے بولا۔

''تم سمجھتی ہو مجھے تمہاری کسی تکلیف کا کوئی احساس نہیں' کاش میں تمہیں اپنا دل چیر کے دکھا

الوشہ! کاش میں تمہیں بتا سکتا کہ تمہاری آنکھوں کو آنسوؤں کے سپرد کرنے کی' پاداش میں' میں اپنی نیندیں گنوا چکا ہوں' کیوں ترس نہیں آتا تمہیں مجھ پر' کیوں......؟''

''تمہارے پچھتاوے اب میرے کسی کام کے نہیں ہیں۔''

اس کی بے بسی پر آہستہ سے رُخ پھیرتے ہوئے اس نے سرد مہری سے کام لیا تھا۔ جواب میں شاہ زر نے زور سے دیوار پر مکا رسید کر کے اپنا غصہ نکالا۔

الوشہ نے سرسری سی اک نگاہ اس پر ڈالی پھر اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ گئی' جب کہ وہ وہیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر سسک اٹھا۔

❊❊❊

''کیا میں میران شاہ سے مل سکتی ہوں......؟''

ایان کے مڑ کر دیکھنے پر اس نے بے تابی سے کہا تھا جب وہ بولا۔

''ہاں' لیکن میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا' کیونکہ میں بالکل نہیں جانتا کہ اس وقت اسے کس جیل میں رکھا گیا ہے۔''

''میں آپ کے جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے خود بات کر لوں گی' آپ مجھے صرف جیل کا بتا دیں' پلیز......''

اس کی بے تابی عروج کو چھو رہی تھی۔

ایان نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی جیل کا مکمل ایڈریس سمجھا دیا۔

وہ متعلقہ جیل کے انچارج سے ملی تو وہاں اس کے اسٹیٹس اور تعلیم کی وجہ سے اسے خاصا اچھا پروٹوکول ملا۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ ویسے بھی لڑکیوں کا شیدائی تھا' لہٰذا اسے میران شاہ کے بارے میں جاننے اور اس تک پہنچنے کے لیے کسی قسم کی خواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد جس وقت وہ ملتان کی بڑی جیل میں' میران شاہ کی بیرک تک پہنچی اس کا دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو گیا۔

''میران......''

میران شاہ دیوار سے ٹیک لگائے' سلاخوں سے منہ پھیرے بیٹھا تھا' جب عرصے بعد مانوس پکار پر جیسے کرنٹ کھا گیا۔

کیا کچھ نہیں تھا انزلہ کی نگاہوں میں

وہ حیران ہوا تھا اور جی بھر کر حیران ہوا تھا۔

''انزلہ تم یہاں۔''

ہاں پچھلے کئی ماہ سے تمہیں مردہ سمجھ کر تمہاری روح کو ایصال ثواب پہنچا رہی ہوں۔''

بے قرار نگاہوں سے اسے دیکھتی وہ جیسے اسے اپنے سامنے پا کر بھی اس کے زندہ ہونے کا یقین نہ کر پا رہی تھی۔

''تمہیں پتا ہے میران وہاں گاؤں میں تمہاری ایک قبر ہے۔ جس پر روز تمہاری ماں بیٹھ کر تم

سے ڈھیروں باتیں کرتی ہے اور گاؤں والے اس کے حال پر ترس کھاتے ہوئے قریب سے گزر جاتے ہیں۔ وہاں سب کی نگاہیں تمہیں یاد کر کے پُر نم رہتی ہیں کیونکہ سب یہی جانتے ہیں کہ سانول شاہ نے تمہیں پولیس مقابلے میں مروا دیا ہے۔"

جیل کی سلاخوں کو تھامتے ہوئے اس بار وہ جذباتی ہوئی تھی۔

میران حیرانی بھری خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"کیوں کیا تم نے ایسا میران؟ مجھ سے رابطہ رکھنا بھی گوارا نہیں کیا تم نے' آخر کیوں؟"

اب اس کی بیرک کے دوسرے لڑکے بھی انزلہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ شپٹائی نگاہوں سے اسے دیکھتا دھیمے لہجے میں بولا۔

"سب بتاؤں گا انزلہ مگر فی الحال تم یہاں سے جاؤ۔"

"کیوں جاؤں اتنی مشکل سے یہاں تک پہنچی ہوں اور تم کہہ رہے جاؤ۔"

"ہاں جاؤ! دیکھو میرے سب دوست تمہیں دیکھ رہے ہیں میں نہیں چاہتا کہ تم کوئی تماشا بنو میں تم سے علیحدہ کمرے میں مل لوں گا ابھی جاؤ پلیز۔"

وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔

انزلہ اس کے اصرار پر مجبوراً کچھ دیر خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی بالآخر واپس پلٹ آئی۔ گاؤں واپس پہنچ کر جو سب سے پہلا کام اس نے کیا وہ میران شاہ کی بوڑھی ماں کی تلاش کا تھا۔ اس کی تلاش میں وہ قبرستان کی طرف آئی تھی۔ جب راستے میں چھنو سے ٹکراؤ ہو گیا۔

"انزلہ باجی...... کہاں تھیں آپ؟ میں کب سے آپ کو ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔"

"کیوں خیریت؟"

"آہو جی ویسے تو خیریت ہی ہے وہ گوری تھی ناں ادریس شاہ کی بہن اس کا پتا چل گیا ہے جی۔"

چھنو کا سانس پھول رہا تھا۔ انزلہ وہیں رک گئی۔

"کیا پتا چل گیا ہے؟"

"یہی کہ وہ حویلی میں ہے۔"

"حویلی میں؟"

"آہو جی! میں نے آج صبح خود اپنے کنی سنا ہے۔ شاہد حسین، فیقے سے بات کر رہا تھا اور اسے کہہ رہا تھا کہ گوری کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ حکیم کو لے کر حویلی پہنچ جائے۔"

"لیکن سانول شاہ تو کہہ رہا تھا کہ وہ شاہد حسین کے ڈر سے کہیں بھاگ گئی ہے۔"

"بکواس کرتا ہے جی۔ ایک نمبر کا فراڈ آدمی ہے یہ سانول شاہ۔ پتا نہیں گوری بے چاری کس حال میں ہو گی۔"

وہ گوری کے لیے فکر مند تھی۔

انزلہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ شاید چھنو صحیح کہہ رہی تھی اسے کسی بھی معاملے میں سانول شاہ جیسے شخص کی بات کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

❋❋❋

شادی کے پورے پیریڈ میں انوشہ، شاہ زر کے سائے بھی سے دور بھاگتی رہی تھی جب کہ وہ بہانے بہانے سے اس کے قریب ہونے کے مواقع تلاش کر رہا تھا۔

اس روز شافیہ کی رخصتی تھی۔ شاہ زر کا پورا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ بُریرہ ہر ممکن کوشش کر رہی تھی کہ ہر مہمان کو اچھا پروٹوکول ملے اور اس کوشش نے اسے اچھا خاصا الجھا رکھا تھا۔ برات آ گئی تھی۔ جس سے وہاں کی رونقوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

انوشہ جو اوپر شافیہ کے کمرے میں اس کے پاس بیٹھی تھی۔ نزہت بیگم کے بلاوے پر اس کے پاس سے اٹھ کر تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آ رہی تھی۔ جب اچانک شاہ زر اس کے سامنے آ گیا۔ اتفاق سے وہ بھی کسی کام کے لیے کسی کے بلاوے پر ہی اوپر جا رہا تھا۔

انوشہ اسے اپنے سامنے پا کر ٹھٹکی تھی۔ جب کہ شاہ زر یوں جم گیا تھا جیسے انوشہ کو سامنے پا کر اس کے جسم نے حرکت کرنا ہی چھوڑ دی ہو۔

"راستا چھوڑو۔"

اگلے ہی لمحے اس کی پیشانی پر بل پڑے تھے۔ مگر اس نے پروا نہیں کی۔

"مجھے بے بی کو دیکھنا ہے انوشہ پلیز۔"

"کوئی تعلق نہیں ہے اس بے بی سے تمہارا سمجھے تم۔" وہ پھنکاری تھی۔ جب وہ بولا۔

"کیوں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی کی وجہ سے اتنی نفرت کرتی ہو تم مجھ سے۔"

وہ اڑ گیا تھا۔

انوشہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی تبھی چباتے ہوئے بولی۔

"شاہ زر آفندی اگر تم چاہتے ہو کہ میں سب کے سامنے تمہارا تماشا نہ بناؤں تو خدا کا واسطہ ہے تمہیں میری جان چھوڑ دو ورنہ تم نے بھی سنا ہو گا چوٹ کھائی ہوئی عورت زخمی ناگن سے زیادہ بری ہوتی ہے۔"

شاہ زر اس کی دھمکی پر دھیمے سے مسکرایا تھا اسی پل بریرہ نے شاہ زر کو پکار لیا۔

"تمہاری جان نہیں چھوڑ سکتا میں انوشہ یہ یاد رکھنا تم۔"

پلٹ کر ایک نظر سیڑھیوں سے نیچے کھڑی بریرہ کو دیکھتے ہوئے اس نے انوشہ سے کہا اور پھر اوپر جانے کے بجائے دھپ دھپ کرتا اتر آیا۔ جہاں بریرہ اپنا دکھ چھپائے اسے کھانے کے سلسلے میں ضروری ہدایات دینا چاہ رہی تھی۔

شادی کا یہ مرحلہ بخیر و عافیت اپنے انجام کو پہنچا تو انوشہ کے ساتھ ساتھ بریرہ نے بھی سکون کا سانس لیا۔ زاور کا ارادہ شادی کے فوراً بعد باہر شفٹ ہونے کا تھا۔ لہٰذا شادی کے ہنگامے سرد پڑتے ہی وہ شافیہ اور جمال صاحب و نزہت بیگم کے ساتھ پیرس شفٹ ہو گیا۔

انوشہ کے لیے یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا کیوں کہ اسے اتنی تکلیف زخم جھیلنے کی نہیں تھی۔ جتنی زخم جھیلنے کے بعد اپنوں کے سامنے مسکرا مسکرا کر اپنا بھرم رکھنے کی۔ زاور نے جانے سے پہلے شاہ زر کو انوشہ کا خیال رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ جس پر تلخی سے مسکراتے ہوئے وہ کتنی ہی دیر اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

❁❁❁

"یہ کزن وزن کا کیا معاملہ ہے مس امامہ۔"

ٹی وی لاؤنج کے سامنے بیٹھا وہ بظاہر نیوز دیکھ رہا تھا مگر جونہی امامہ وہاں گڑیا کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے آئی وہ اس سے پوچھ بیٹھا۔

امامہ کا دل اس کے سوال پر زور سے دھڑکا تھا۔

"ک......کون سے کزن کا؟"

"وہی......جس سے فون پر بات کرتے ہوئے کبھی آپ بری طرح گھبرا جاتی ہیں تو کبھی رو پڑتی ہیں۔"

شجاع کی نگاہیں ٹی وی اسکرین پر ہی تھیں۔

امامہ بے ساختہ گھبراہٹ کا شکار ہوگئی۔

"کوئی معاملہ نہیں۔"

"کوئی معاملہ نہیں تو اس کا بار بار فون کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔اور پھر آپ تو کہہ رہی تھیں کہ آپ کا بھری دنیا میں کوئی بھی عزیز نہیں۔"

اس بار نگاہیں ٹی وی اسکرین سے ہٹا کر اس نے امامہ کا چہرہ دیکھا تھا۔

"جی......وہ اصل میں میرے دور پرے کا رشتے دار ہے کبھی کبھی خیریت پوچھنے کو فون کر لیتا ہے۔اس روز میں آپ سے ڈر گئی تھی اس لیے گھبرا گئی اور کل اس نے مجھے میری ماں یاد دلادی تھی اس لیے رونا آ گیا۔"

شجاع کو چکر دینا اس کے لیے اب بہت آسان ہو گیا تھا۔

شجاع نے چینل تبدیل کرتے ہوئے توجہ اس سے ہٹالی۔

"گڑیا کیا کر رہی ہے۔"

فوراً موضوع بدلا تھا اس نے۔جب وہ بولی۔

"تھوڑی دیر پہلے کھیل رہی تھی،اب میں نے اسے کاپی پنسل دے کر پڑھنے بیٹھا دیا ہے۔"

"ویل۔فائزہ آپی بہت یاد کر رہی تھیں آپ کو اگر آپ معترض نہ ہوں تو گڑیا کو لے آئیں' میں اس وقت ان سے ملنے کو نکل رہا تھا۔"

ٹی وی آف کرتے ہوئے پہلی بار اس نے امامہ کو اپنی بچی کی آیا سے الگ کوئی حیثیت دی تھی۔

وہ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھتی اثبات میں سر ہلا کر فوراً اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

گڑیا کو اٹھا کر جس وقت وہ گھر سے باہر آئی شجاع خود ڈرائیونگ سیٹ سنجالے بیٹھا تھا جب کہ عام طور پر اس کا ڈرائیور ہی گاڑی ڈرائیو کرتا تھا سارے راستے گڑیا ان دونوں سے باتیں کرتی رہی۔ جس سے سفر کا پتا ہی نہ چلا اور فائزہ آپی کا گھر آ گیا۔

شجاع جس وقت اس کے ساتھ فائزہ آپی کے شاندار گھر میں داخل ہوا وہ لوگ لان میں ہی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔شجاع کے پہلو میں امامہ کو دیکھ کر فائزہ آپی کو ایک عجیب سی خوشی ہوئی تھی اور وہ لپک کر ان دونوں کی طرف بڑھ آئی تھیں۔

''امامہ آج تم کیسے اِدھر کا راستا بھول پڑیں؟''
ان کی آنکھوں میں خوشی اور محبت کا جو عکس تھا وہ جھوٹا نہیں تھا۔
وہ سر جھکا کر ان کی اپنائیت پر مسکرا دی جب کہ شجاع اپنے بہنوئی اور بھانجے بھانجیوں کی طرف بڑھ گیا۔
''کتنے دنوں سے سوچ رہی تھی تمہاری طرف چکر لگانے کا مگر فرصت ہی نہ مل سکی۔ شجاع بتا رہا تھا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔''
وہ اسے یوں اہمیت دے رہی تھیں گویا وہ شجاع کی ملازمہ نہیں بلکہ اس کی بیوی ہو۔
امامہ کے دل میں ان کا مقام ایک دم سے بڑھا تھا۔
''ٹھیک ہوں آپ سنائیں کیسی ہیں؟''
''ارے مجھے کیا ہونا ہے میں تو ایک دم سے بھلی چنگی ہوں۔ خود سارے گھر کا کام کرتی ہوں۔ شوہر اور بچوں کو سنبھالتی ہوں حالانکہ میرے میاں بالکل اس حق میں نہیں ہیں کہ میں اتنا کام کروں مگر میں سوچتی ہوں جب اللہ کی ذات نے ہر طرح سے ہاتھ' پاؤں ہلانے کی توفیق دے رکھی ہے تو کیوں ملازموں کا جھنجٹ پالوں۔''
عادت کے عین مطابق وہ شروع ہو چکی تھیں۔
امامہ اثبات میں سر ہلا کر ان کی تائید کرتی رہی۔
''آؤ اپنے شوہر اور بچوں سے ملاؤں تمہیں۔''
اگلے ہی پل گڑیا کو اس کی گود سے لے کر وہ اسے ساتھ لیے اپنے شوہر اور بچوں کی طرف بڑھ آئیں۔
''یہ علی ہے میرا سب سے بڑا بیٹا اور یہ مریم' عائشہ ہیں میری دونوں چھوٹی بیٹیاں اب تو خیر بڑی ہو چکی ہیں مگر لاڈ پیار میں کوئی کمی نہیں آئی۔''
وہ بتا رہی تھیں اور امامہ، شجاع کے سامنے اپنی اس درجہ اہمیت پر اترا رہی تھی۔
فائزہ آپی کی طرح ان کے بچے بھی گھمنڈ جیسی بیماری سے پاک تھے ان کے شوہر نے امامہ کے سلام کرنے پر مسکرا کر جواب دیتے ہوئے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔
''بہت پیاری بچی ہے بھئی شجاع۔ اس بار واقعی تم نے بچی کے لیے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔''
وہ عمر میں شجاع اور فائزہ آپی سے خاصے بڑے تھے تبھی بے تکلفی سے اسے سراہتے ہوئے بولے تو شجاع ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے تکلفاً مسکرا دیا۔
''اور سناؤ' جاب کیسی جا رہی ہے تمہاری اور وہ عائزہ نامی لڑکی کے کیس کا کیا بنا؟''
تھوڑی دیر بعد جب فائزہ آپی کی دونوں بیٹیاں اٹھ کر کچن کو سدھار گئیں اور بیٹا پڑھائی کے بہانے اپنے کمرے میں گھس گیا تو ان کے شوہر نے یونہی باتوں باتوں میں شجاع سے پوچھ لیا۔ امامہ بظاہر فائزہ آپی کے ساتھ باتوں میں لگی تھی مگر اس سوال پر اس کے کان کھڑے ہو گئے جب کہ دل بے ساختہ دھڑک اٹھا۔
شجاع اپنے بہنوئی کو بتا رہا تھا۔

''جاب تو اے ون جا رہی ہے۔ عائزہ کا کیس البتہ ابھی پینڈنگ میں ہے' دو تین لڑکے تو لاک اپ میں ہیں ایک باہر فرار ہو گیا۔ اسے پاکستان بلا کر گرفتار کرنے کی تدبیر کر رہا ہوں۔ اب دیکھیں کیا ہوتا ہے اصل میں اس کیس میں جو لوگ ملوث ہیں ان کی پہنچ بہت اوپر تک ہے اپنے آئی جی سے بات کی تھی میں نے۔ ان کا کہنا ہے کہ جہاں ہزاروں لڑکیوں کا روزانہ اغواء ہو جاتا ہے اور ان کا کچھ نہیں بنتا وہاں ایک یہ بھی سہی آپ سوچ نہیں سکتے اپنی فیلڈ کے بڑے افسر کی یہ بات سن کر میں کتنا شرمسار ہوا۔''

اسے اندازہ نہیں تھا کہ ان کی اس نہایت پرسنل گفتگو کو امامہ توجہ سے سن رہی ہے۔ تبھی وہ کھل کر بول رہا تھا۔

فائزہ آپی کے شوہر نے شجاع کی بات پر افسوس سے سر ہلایا تھا۔

''بس یار یہ فیلڈ ہی ایسی ہے۔ اچھے اور حساس لوگ کم ہیں اس فیلڈ میں اور برے بے حس لوگ زیادہ۔ تم ثانیہ کا سناؤ اب تو تنگ نہیں کرتی تمہیں؟''

وہ نئے نئے انکشافات کر رہے تھے۔ امامہ کے کان پھر کھڑے ہو گئے۔ جب کہ فائزہ آپی اسے اپنی روزمرہ مصروفیت کا حال سنا رہی تھیں۔ مگر اس کا دھیان ان کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔

شجاع نئے سوال پر ایک نظر امامہ کی طرف دیکھتا قدرے تامل سے بولا تھا۔

''تنگ تو کرتی ہے مگر میں اب اس کی کال پک نہیں کرتا۔ سنا ہے تیسری شادی بھی کر لی ہے اس نے۔ آج کل پاکستان سے باہر گئی ہوئی ہے۔''

''بچی کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتی؟''

اگلا سوال ہوا تھا جس سے امامہ کو پتا چلا تھا کہ وہ شجاع کی سابقہ مسز کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اس کی دلچسپی اور توجہ مزید بڑھ گئی۔

''نہیں جب میں کال ہی پک نہیں کرتا تو وہ کیا بات کرے گی۔''

''پھر آگے کیا سوچا ہے تم نے اپنے لیے؟ فائزہ تو بڑی بے صبری سے تمہاری دوسری شادی کے لیے کوششیں کر رہی ہے۔ دو چار لڑکیاں بھی شاید دیکھ رکھی ہیں اس نے۔''

وہ مسکرائے تھے جواب میں شجاع کے لبوں پر بھی ہلکا سا تبسم بکھر کر رہ گیا۔

''فی الحال میری ایسی کوئی سوچ نہیں ہے۔ نہ ہی اتنی جلدی میں دوبارہ اس جھنجٹ میں پڑنا چاہتا ہوں۔''

''ارے یہ کیا بات ہوئی بھلا یہاں میری راتوں کی نیند اڑی ہوئی ہے تمہاری تنہائی کا سوچ کر اور تم کہہ رہے ہو اس جھنجٹ میں نہیں پڑنا۔''

فائزہ آپی کے کان میں اس کی بات پڑ گئی تھی۔ تبھی وہ فوراً چمکتے ہوئے بولیں تو ان کے شوہر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ امامہ کے اپنے لبوں پر نمائشی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''آپی آپ بھی ناں بس۔''

شجاع، امامہ کے سامنے اس قدر پرسنل گفتگو پر خاصا جزبز ہوا تھا۔ کھانا تیار ہو گیا تو فائزہ آپی نے انہیں زبردستی کھانے پر روک لیا۔ امامہ کے لیے فائزہ آپی کے گھر پر بسر ہونے والا یہ وقت بے

والا گزار رہا تھا۔

❃❃❃

عباد زاور کی شادی کے فنکشن سے فارغ ہو کر دوسرے دن شام کو ہی کراچی پہنچا تھا جب اس کے والد کی کال آ گئی۔ وہ پاکستان آ رہے تھے اور ایک خصوصی میٹنگ کے سلسلے میں عباد کو آسٹریلیا بلایا تھا۔ آج کل ان کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی۔ تبھی عباد نے یونیورسٹی چھوڑنے کے فوراً بعد ان کا کاروبار سنبھال لیا تھا۔

ابھی تک اسے اپنے والد کی تمام جائیداد کا کوئی خاص اندازہ نہیں تھا۔ ان کا جہاں جہاں جو کچھ تھا سب اس کا تھا کیوں کہ وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ اس سے چھوٹی صرف ایک بہن تھی ہانیہ اب وہ بھی تعلیم سے فارغ ہو چکی تھی۔ ہانیہ کے ساتھ اس کا رشتا بھی اس کی چچا زاد کے ساتھ اس کے بچپن میں طے ہو گیا تھا اور اب اس کی مما آسیہ بیگم کی خواہش تھی کہ وہ اپنے بچوں کے فرض سے سبکدوش ہو کر ان کی خوشیاں دیکھیں۔ ادھر بیٹی کو گھر سے رخصت کریں تو ادھر بہو کو گھر لے آئیں عباد کو اس سارے معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

وہ اپنی منگیتر کو پسند ضرور کرتا تھا مگر فوری شادی کی کوئی شدید خواہش نہیں تھی اسے۔ یہی وجہ تھی کہ بے فکر آزاد پنچھی کی طرح ایک ہفتہ کراچی میں رہتا تو دوسرا ہفتہ اسلام آباد میں کیوں کہ شاہ زر کے بغیر زیادہ دن رہنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ زندگی اپنے دامن میں اس کے لیے آگے کیا سیٹ کرلا رہی تھی۔

❃❃❃

آمنہ کی کالج کی ایک دوست منزہ نے اسے کسی نئی فیکٹری میں نسبتاً بہتر سیلری والی جاب کا بتایا تھا اور اس نے یہ بات صاعقہ کو بتا دی تھی۔ کیوں کہ اس کے گھریلو حالات تو پھر بھی بہتر تھے۔ اصل پریشانی تو اسے صاعقہ کی طرف سے رہتی تھی۔ جو اشد ضرورت میں بھی اس قدر کفایت شعار تھی کہ کال کرنے کے بجائے صرف میسج سے کام چلا لیتی تھی۔

روزانہ مسلسل پندرہ گھنٹے کی مشقت نے اسے تھکا دیا تھا۔ آمنہ اس روز اس کے ساتھ فیکٹری نہیں گئی تھی کیوں کہ اسے گھر پر ضروری کام تھا البتہ اس نے صاعقہ کو کہہ دیا تھا کہ وہ دوپہر میں ہاف ٹائم کے وقت اسے ساتھ لے جانے کے لیے فیکٹری پہنچ جائے گی اور پھر دونوں اکٹھے انٹرویو دے آئیں گی۔

صاعقہ نے اس سے اتفاق کرلیا اور اب ہاف ٹائم کے بعد وہ بھی بہانہ کر کے فیکٹری سے نکل آئی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں سے گرمی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لہٰذا کڑی دھوپ میں ڈوپٹے سے پسینہ پونچھتی وہ فیکٹری سے کافی دور نکل آئی تھی مگر آمنہ کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا تبھی اس نے ایک جگہ رک کر اپنا موبائل نکالا اور اسے میسج لکھ بھیجا۔ میسج لکھ کر جلدی جلدی اس نے آمنہ کا نمبر اپنے طور سے پریس کیا اور میسج سینڈ کر دیا۔ یہ دیکھے بنا کہ آخری فگر میں بے پروائی کے باعث اس سے خاصی بڑی غلطی سرزد ہو گئی تھی۔

❃❃❃

وہ سڈنی سے کل رات ہی واپس آیا تھا۔
پورا ایک ہفتہ شدید مصروف رہنے کی وجہ سے لمبی نیند اس کی پہلی خواہش بن گئی تھی لہٰذا دن چڑھے تک خوب سو کر کوئی دوپہر میں ایک دو بجے تک وہ بے دار ہوا تو دماغ خاصا فریش محسوس ہو رہا تھا اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے شاور لینے کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکل کر نیچے آیا تو بیگم آسیہ کو اپنا ہی منتظر پایا۔
''السلام علیکم امی!''
''وعلیکم السلام' آؤ بیٹھو میں تمہارے ہی بے دار ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔''
کچھ جیولری باکس اپنے سامنے رکھے انہوں نے توجہ عباد کی جانب مبذول کی تھی جواب میں وہ سرسری سی نگاہ ان کے سامنے پڑے Boxes پر ڈالتے ہوئے ان کے پہلو میں ٹک گیا۔
''حکم کیجیے' آج تو بالکل فری ہوں میں۔''
''چلو یہ تو اچھی بات ہے۔ اصل میں مجھے مارکیٹ جانا تھا۔ یہ کچھ زیوارات میں نے اپنے لیے پچھلے سال خریدے تھے۔ اب سارے ڈیزائن پرانے ہو چکے ہیں پھر مجھ سے اب اتنا بھاری زیور پہنا بھی نہیں جاتا۔ اسی لیے سوچ رہی تھی کہ چل کر اسے تبدیل کروا لیتے ہیں اور ہانیہ کے لیے ایک دو سیٹ اور لے لیتے ہیں اس کی پسند کے۔ فاخر کل پاکستان آرہا ہے۔ تمہارے ابو کہہ رہے تھے بس اگلے ماہ کی کوئی بھی تاریخ رکھ دیں گے فنکشن کے لیے۔ تم کیا کہتے ہو؟''
''ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں ایک دو میلز چیک کرلوں پھر چلتے ہیں۔'' رسان سے کہتے ہوئے وہ اٹھ کر پھر سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔
''او شٹ۔''
ابھی اس نے کمپیوٹر آن کیا ہی تھا کہ لائیٹ چلی گئی۔ گو ups نے فوراً اپنا کام شروع کیا تھا مگر صرف ایک لمحے میں اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ لہٰذا تکیے کے نیچے سے اپنا سیل نکال کر اس نے دو چار ضروری کالز کیں اور دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔
''امی چلیں میں گاڑی نکالتا ہوں۔''
''ہاں چلو۔''
اس کی آواز پر سر ہلاتی آسیہ بیگم اپنا پرس اٹھانے فوراً اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ وہ گاڑی نکال کر باہر روڈ پر آیا تو اچانک اس کے سیل کی میسج ٹون بج اٹھی۔ عموماً وہ فوری میسج نہیں پڑھتا تھا مگر اس وقت مسز آسیہ نقوی کا انتظار کرتے ہوئے اس نے یونہی میسج کھولا تو پہلا لفظ پڑھتے ہی ٹھٹک گیا۔
''اسٹوپڈ میں کب سے تیرا انتظار کر رہی ہوں۔ جلدی مرو نہیں تو میں اکیلی ہی چلی جا رہی ہوں' ہاں۔''
میسج یقیناً اس کی طرف غلطی سے آگیا تھا۔
اس نے سیل پھر سے ڈیش بورڈ پر ڈال دیا۔ تبھی میسج ٹون پھر بجی تھی اور اس بار پھر وہی نمبر تھا۔
''انٹرویو دینے جانا ہے کہ نہیں؟ اگر تُو دس منٹ میں نہ آئی تو میرے ہاتھوں خیر نہیں۔ اس وقت

پہلے میں ہوں میں۔ آج اگر میرا انٹرویو نہ ہوا تو میں نے ضرور کسی کا سر پھاڑ کے آجانا ہے۔

یہ لمبا تم۔"

اس بار وہ بے ساختہ ہنسا تھا اور میسج کرنے والی موصوفہ کا نمبر بھی سرسری نگاہ سے دیکھنے کی زحمت کر گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں آسیہ بیگم کے آجانے سے اس نے سیل پھر ڈیش بورڈ پر رکھ دیا اور بڑی سکون سے ڈرائیو کرتے ہوئے ان سے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گیا۔

❊❊❊

گزشتہ دنوں زاور کی شادی کی مصروفیات نے انوشہ کو تھکا ڈالا تھا۔ اس پر سب اپنوں کی دوری اور جدائی کا غم وہ جیسے نڈھال ہو کر رہ گئی تھی۔

عبدالصمد اس روز خاصی لیٹ گھر آیا تھا آج کل اس کے معمولات انوشہ کو گہری تشویش میں مبتلا کر رہے تھے۔ سرزمان بھی انگلینڈ شفٹ ہو چکے تھے لہٰذا کوئی ایسا اپنا نہیں رہا تھا کہ جس سے وہ اپنا دکھ شیئر کر سکتی۔ صباء کی شادی ہو گئی تھی اور یوں وہ اپنے شوہر کی ہو کر رہ گئی۔

طبیعت کی ناسازی کے باعث اس روز وہ ایک لمحے کے لیے بھی کچن میں کھڑی ہو کر کچھ بھی نہ بنا سکی تھی۔ عبدالصمد تو ویسے بھی زیادہ تر باہر سے کھانا کھا کر آتا تھا۔ ابھی اسے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔

کمرے میں داخل ہو کر جونہی اس نے لائٹ آن کی انوشہ نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

وہ آج پھر نشے میں دھت تھا۔ ابھی کچھ لمحے گزرے تھے کہ "چھن" کی تیز آواز پر اسے بے ساختہ اپنے بازو آنکھوں سے ہٹانے پڑے۔

عبدالصمد ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا تھا اور نشے کی حالت میں اس نے قیمتی پرفیوم کی بوتل زمین بوس کر دی۔

تھکن اور حرارت کی وجہ سے نہ صرف وہ نڈھال تھی بلکہ اس کا سر بھی بری طرح چکرا رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ اٹھی تھی۔

"کپڑے کہاں ہیں میرے؟"

اسے اٹھتے دیکھ کر وہ دہاڑا تھا اور اس دہاڑ کے جواب میں اس کا بچہ جو گہری نیند سو رہا تھا جاگ گیا۔

"باتھ روم میں رکھے ہیں میں نے۔"

ایک نظر بچے پر ڈال کر اس نے فوری جواب دیا۔ جب وہ بڑبڑاتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ہی کپڑے تبدیل کر کے وہ کمرے میں واپس آیا تو انوشہ ٹوٹے ہوئے کانچ کی کرچیاں سمیٹ رہی تھی۔ جب کہ اپنے بیٹے کو اس نے تھپک کر سلا دیا تھا۔

"پکایا کیا ہے آج؟"

"کچھ نہیں۔" اس کے سوال پر بنا سر اٹھائے اس نے جواب دیا تو وہ تپ گیا۔

"کیوں میری دعوت تھی کہیں یا تمہیں میں صرف دوسروں کے بچے پیدا کرنے کے لیے بیاہ کر لایا ہوں۔"

اس بار وہ زیادہ شدت سے دہاڑا تھا۔

انوشہ سہم کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی میری۔"

"وہ تو کبھی نہیں ہوتی۔ اس گھر میں رہنا ہے تمہیں کہ نہیں؟"

کہنے کے ساتھ اس نے انوشہ کا سر پکڑ کر دیوار میں دے مارا تو وہ اپنی چیخ ضبط کر کے رہ گئی۔

"لاتی ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے' کھلا دینا اس کو بے وقوف سمجھا ہوا ہے مجھے جو ہر بات پر صبر کرتا رہوں گا۔"

وہ اپنے ہوش میں نہیں تھا اور انوشہ یہ بات سمجھتی تھی تبھی چلاتے ہوئے وہ لڑکھڑایا تو اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

"چھوڑو مجھے۔"

وہ اس سے نفرت کا اظہار کر رہا تھا مگر انوشہ نے اسے نہیں چھوڑا۔ چھوڑ دیتی تو کہاں جاتی؟ کوئی ٹھکانہ ہی باقی نہیں بچا تھا۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہو گئے تھے۔ لہٰذر روز کے ان کھیل تماشوں کو اپنے نصیب کا حصہ سمجھ کر اب اس نے صبر کرنا سیکھ لیا تھا۔

عبدالصمد نے اس سے نفرت کے چکر میں نشے کی شدت کے ساتھ ساتھ عورتوں سے پرانے مراسم' دوبارہ بڑھا لیے تھے یہی وجہ تھی کہ اس کا کاروبار مسلسل خسارے میں جا رہا تھا اور یہ الگ الجھن تھی جس نے اسے اس حد تک بد دماغ اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔

بات یہیں تک رہتی تو شاید آہستہ آہستہ وہ جینا سیکھ لیتی مگر کاتب تقدیر کو ابھی اس سے صبر اور ضبط کے اور بہت سے امتحان مطلوب تھے۔

❁❁❁

حویلی کی اونچی منڈیروں پر سورج کی ننھی کرنوں نے اپنی روشنی نچھاور کر دی تھی۔ صبح کے آغاز کے ساتھ ہی حویلی میں چہل پہل کا آغاز ہو گیا۔ گوری ابھی تک سانول شاہ یا اس کے گھر کے کسی فرد کے سامنے نہیں آئی تھی۔ ادریس کی رحلت کے بعد وہ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگی تھی۔ اس روز صفائی کے دوران وہ حویلی کے پچھلے حصے کی طرف آئی تو وہاں بالائی منزل پر ایک چھوٹا سا مقفل دروازہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

شاید اس کمرے کو استعمال کرنے والا اس روز اسے قفل لگانا بھول گیا تھا۔ فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے جلدی جلدی دروازے کی کنڈی کھولی اور اندر جھانکا جہاں اس وقت بھی گھپ اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ شاید نہیں۔ یقیناً وہی تہہ خانہ تھا حویلی کا جس کی طرف جانے سے شاہد حسین نے اسے سختی سے منع کیا تھا۔

وہ اندر آئی اور اس نے اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد تہہ خانے کا مردہ سا پیلا بلب جلا لیا۔

بلب کے جلتے ہی جونہی اس نے گردن موڑی دنگ رہ گئی۔

وہاں دیوار کے ساتھ کوئی بیٹھا تھا۔ گوری دھک دھک کرتے دل کے ساتھ قریب آئی تو اس کی

اچھل گئی۔

”زلیخا......“

❋❋❋

”زلیخا......“

اس کی آنکھیں دہشت سے اُبلی ہوئی تھیں جب کہ سامنے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی زلیخا کے مردہ جسم کو فرش پر قطار در قطار چلتی چیونٹیوں نے جیسے مرغن غذا بنا لیا تھا۔ گوری کو لگا اس کے کانپتے‘ سرد وجود سے جان نکل گئی ہو۔

”زلیخا......“

مدہم سی مری مری آواز نکالتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر زلیخا کے مردہ وجود کو چھوا تھا۔

کتنا بڑا شاک تھا یہ اس کے لیے......؟

شاہد حسین کے بقول وہ زلیخا کو مار چکا تھا۔ گوری آج سے پہلے ادریس کے ساتھ ساتھ اس کے لیے بھی صبر کر چکی تھی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ شاہد حسین جیسے جاہل انسان نے اس کے بھائی کے ساتھ ساتھ اپنی بہن کو بھی مار کر پرانی کھوئی میں پھینک دیا ہوگا مگر......

”زلیخا......“

اب اسے پکارتے ہوئے اس کا دل درد سے پھٹتا تھا۔

پرانی بوسیدہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی اس عورت کی جان جانے کس لمحے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ وہ اس کے مردہ چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لے کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رو پڑی۔

یہ وہ عورت تھی جس سے اس کا بھائی اپنی جان سے بڑھ کر پیار کرتا تھا۔

حویلی میں اچانک شور اٹھا تھا جیسے کوئی بڑا سانحہ رونما ہو گیا ہو۔

وہ کافی دیر رو کر دل ہلکا کرنے کے بعد تہہ خانے سے باہر آئی تو حویلی کے بڑے صحن میں جمع ہوئے ملازموں کا جمگھٹا دیکھ کر‘ مزید پریشان ہو گئی۔

”ہائے نمانی جوانی میں بیوہ ہو گئی۔“

اسے دیکھتے ہی حویلی کی ایک ملازمہ نے کہا تھا۔

گوری کو لگا جیسے وہ کسی بھیانک خواب کی زد میں ہو۔

کھوئے کھوئے سے معطل حواس کے ساتھ دو قدم آگے بڑھ کر اس نے حویلی کے کشادہ صحن میں‘ نگاہوں کے سامنے پڑی چارپائی پر‘ شاہد حسین کا خون سے لت پت سراپا دیکھا تھا اور اس کا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔

اس نے غور ہی نہ کیا کہ اس وقت وہاں ملازموں کی فوج کے ساتھ ساتھ سانول شاہ اور رفیقا بھی کھڑا تھا جو اسے قریب آتے دیکھ کر کہے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

”حوصلہ کرنا گوری۔ شاہد حسین اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔“

”کیا......؟“

اعصاب تو پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑے بیٹھے تھے اب یہ نیا شاک......

"ہاں...... ساتھ والے گاؤں کے چوہدریوں سے لڑائی میں مارا گیا ہے۔ دو بندے تو ان کے بھی مرے ہیں۔ حوصلہ کر اور اس کی مغفرت کے لیے دعا کر۔"

وہ کہہ رہا تھا۔ گوری خالی خالی سی نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے پلکیں بند کیے لیٹے شاہد حسین کے زخمی چہرے کو دیکھتی رہی۔ کیسا عجیب اتفاق تھا کہ ابھی کچھ دیر قبل وہ تہہ خانے میں اس کی بہن کی اندوہ ناک موت پر آنسو بہا کر آئی تھی اور ابھی...... اس کا بھی حساب ہو گیا تھا۔

یہ تھی وہ زندگی...... اور اس کی مختصر سی حقیقت...... جس پر اکڑ کر جانے کیسے کیسے گناہ کر ڈالے تھے اس نے۔ گوری کا دل چاہا وہ دونوں مٹھیوں میں ریت بھرے اور شاہد حسین کے مردہ چہرے پر انڈیل دے۔

سیمنٹ پتھروں سے بنی اس شان دار حویلی میں وہ اس کا آخری دن تھا۔ اس سے پہلے کہ انزلہ وہاں آ کر اس سے ملتی اس نے ہمیشہ کے لیے "شاہ وِلا" کو خدا حافظ کہہ دیا تھا۔

❁❁❁

"ماں جی......"

ہلکی ٹھنڈی ہوا میں دھیمے قدموں سے چلتی وہ شیشم کے اس پیڑ کے قریب آئی تھی جس کی ٹھنڈی چھاؤں تلے میران شاہ کی ماں بیٹھی خود اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ ممتا کی محبت اور تڑپ کا یہ روپ اس کے لیے بے حد دکھ کا باعث تھا۔

"ماں جی......"

ان کے متوجہ نہ ہونے پر وہ پھر سے انہیں پکارتی پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ تب ہی اس بزرگ خاتون نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

خالی خالی سی نگاہوں میں یہاں وہاں صرف دھول اڑ رہی تھی۔

"ماں جی! آپ کا بیٹا زندہ ہے۔ میران شاہ زندہ ہے ماں جی......"

انہیں زندگی کی نوید دیتے ہوئے وہ پر جوش ہوئی تھی مگر...... وہ اس کی بات سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھیں تب ہی اس کے لبوں سے میران کا نام سن کر اداسی سے بولیں۔

"میرے میران کو دیکھا ہے تم نے......؟ صبح سے یہاں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ اللہ جانے کدھر چلا گیا ہے؟"

"میران واپس آ گیا ہے ماں جی! کہیں نہیں گیا وہ آپ کو چھوڑ کر......"

اس کی پلکیں ان کے حال پر بھیگی تھیں۔

تب ہی کسی کے قدموں کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔

"سانول شاہ......"

پلٹ کر جوں ہی اس نے پیچھے دیکھا نگاہ سانول شاہ کے سپاٹ چہرے سے ٹکرا گئی۔

اس کے تیور انزلہ کو اس لمحے خاصے خطرناک لگ رہے تھے۔ وہ میران شاہ کی ماں کو چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سانول چلتے ہوئے آیا اور اس سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔

''کل کہاں گئی تھیں تم......؟''
قطعی سرد لہجے میں کڑی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔
انزلہ نے نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے رخ پھیرلیا۔
''وہیں۔ جہاں مجھے بہت پہلے چلے جانا چاہے تھا۔''
''کیوں......؟''
پوری قوت سے وہ چلّایا تھا جب وہ سلگتے ہوئے بولی۔
''آہستہ بولو سانول شاہ! تمہاری منکوحہ نہیں ہوں جو یوں چلّا رہے ہو۔''
''شٹ اپ۔ منع کیا تھا میں نے کہ اپنی حدود مت پار کرنا مگر تم نے عمل نہیں کیا۔ کیوں بے موت مرنا چاہتی ہو میرے ہاتھوں' کیوں......؟''
اس کی چنگھاڑ پر میران شاہ کی ماں سہمتے ہوئے بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔
انزلہ نے کن اکھیوں سے انہیں بھاگتے ہوئے دیکھا پھر نگاہیں سامنے کھڑے سانول شاہ کے چہرے پر ٹکادیں جو اس وقت سخت تناؤ کا شکار تھا۔
''میرے ذاتی معاملات میں دخل اندازی مت کرو سانول شاہ! کیونکہ تم جیسے گھٹیا' جھوٹے اور بے ایمان شخص کی میری زندگی میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یونیورسٹی پریڈ میں جب میں نے تمہیں اپنے لیے بے قرار دیکھا تھا تو ہیرو لگے تھے تم مجھے' مگر اب...... جب کہ تمہارے سارے جھوٹ میرے سامنے آگئے ہیں۔ مجھے تم سے کراہیت محسوس ہو رہی ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے تمہارا بدنما پتلا بناؤں اور سارے گاؤں والے تمہارے منہ پر تھوتھو کریں۔''
''چٹاخ......''
اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی سانول شاہ کے جاندار طمانچے نے اسے خاموش کرادیا تھا۔
''بہت گھمنڈ ہے ناں تمہیں اپنی قابلیت کا' آج کے بعد نہیں رہے گا۔''
اس کا لہجہ جیسے انگارے چبا رہا تھا۔
انزلہ چہرے پر ہاتھ رکھے اس کے طیش کو دیکھتی رہ گئی اور وہ جیسے خاموشی سے آیا تھا واپس پلٹ گیا۔ اس روز اس نے جانا تھا کہ اس کی ایک ایک حرکت پر سانول شاہ کی نگاہیں کتنی گہری تھیں۔

❁❁❁

گڑیا کی طبیعت رات لیٹ گھر واپس آنے کی وجہ سے ناساز ہوگئی تھی۔
ایک تو ٹھنڈ' اوپر سے فائزہ آپی کے گھر سے واپسی پر شجاع نے اسے آئس کریم دلا دی۔ نتیجتاً پہلے اس کا گلا خراب ہوا پھر وہ بخار کا شکار ہوگئی۔
آج تیسرا دن تھا اور اس کی طبیعت ہنوز خراب تھی۔ شجاع کے ساتھ ساتھ امامہ نے بھی خود پر نیند کو حرام کیا ہوا تھا۔
اس وقت بھی وہ گڑیا کے بیڈ پر اسے اپنی گود میں سلائے بیٹھی تھی جب شجاع نے اس سے کہا تھا۔
''آپ تھک گئی ہوں گی امامہ...... تھوڑا آرام کرلیں۔''

''نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔''

بنا سر اٹھائے اس نے جواب دیا تھا۔

شجاع اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''اب بخار قدرے کم ہے۔ آپ کچھ کھالیں جا کر۔ پچھلے تین روز سے میں دیکھ رہا ہوں آپ صرف گڑیا کے لیے پریشان ہیں اور اس پریشانی میں اپنا خیال بھی نہیں رکھ رہیں۔''

وہ اس کی کیئر کر رہا تھا۔

امامہ جھکا سر اٹھا کے خود کو اس کی طرف دیکھنے سے، باز نہ رکھ سکی۔

''پچھلے تین روز سے آپ بھی تو صرف چائے، پی رہے ہیں' کیا آپ کو بھوک کا احساس نہیں ہے؟''

''میری بات اور ہے......''

''کیوں اور ہے......؟ کیا اس لیے کہ آپ گڑیا کے باپ ہیں اور میں...... میں صرف اس کی گورنس......؟ چند ہزار لے کر اس کی دیکھ بھال کرنے والی ملازمہ......؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔ آپ غلط سوچ رہی ہیں۔''

دل ہی دل میں اس کے درست قیاس اور حاضر جوابی پر وہ اسے سراہے بغیر نہ رہ سکا تھا مگر بظاہر اس نے وضاحت پیش کی تھی۔

''یہ صحیح ہے کہ میں گڑیا کی صرف گورنس ہوں مگر...... میں پیسے صرف اس کی دیکھ بھال کے لیتی ہوں' محبت کے نہیں......''

اس لڑکی کے بارے میں پہلے دن سے اس کا جو شک تھا' اب گزرتے ہر دن کے ساتھ اس پر یقین کی مہر لگ رہی تھی۔

''ہوں! جانتا ہوں تب ہی تو آپ کو اس کی گورنس نہیں سمجھتا اب......''

''کیا مطلب......؟''

وہ اس کے لفظوں کی گہرائی پر چونکے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

شجاع نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔

''کوئی مطلب نہیں۔''

کہنے کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل گیا اور اگلے کچھ ہی لمحوں میں اس کے ہاتھوں میں چائے کے دو کپ تھے۔

''یہ چائے پی لیں۔ مسلسل شب بیداری سے تھکن تو ہو گئی ہو گی ناں؟''

وہ کہیں سے بھی سخت گیر آفیسر نہیں لگ رہا تھا۔

امامہ نے ممنونیت سے کپ تھام لیا۔

''ایک بات پوچھوں امامہ؟''

گڑیا کے بیڈ پر ہی وہ قدرے فاصلے پر ٹک گیا جب وہ بولی۔

''جی پوچھیے اجازت کی کیا بات ہے......''

"تمہیں میں کیسا انسان لگتا ہوں......؟"

اجازت ملتے ہی فوری اس نے وہی سوال کر دیا تھا جو امامہ کچھ روز قبل اپنے لیے اس سے کر چکی تھی۔ اسے یاد آیا تھا تب ہی وہ مسکرائی تھی۔

"میں سمجھی نہیں آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"آپ مجھے کیسا انسان سمجھتی ہیں اچھا یا برا؟"

تکلفات کی دیوار گرائے وہ اب اس سے اپنائیت جتا رہا تھا۔

امامہ کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا کہہ دے نہ اچھا نہ برا...... جیسے اس نے بیگانگی سے کہا تھا مگر دوسرے لمحے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

"اچھا...... بہت اچھا......"

"کیوں......؟"

"کیوں کی کوئی وجہ نہیں آپ اپنی جاب' اپنے پروفیشن سے مخلص ہیں۔ بہت اچھے بیٹے' بہت اچھے بھائی اور بہت اچھے باپ ہیں۔ ملازمین کے ساتھ بھی آپ کا رویہ اچھا ہے۔ یوں ہر لحاظ سے دیکھا جائے تو اچھے ہی ثابت ہوئے ہیں آپ۔"

وہ کسی کی شخصیت یا عہدے سے مرعوب ہو کر دبنے والوں میں سے نہیں تھی۔

شجاع کے اندر کی بے چینی مزید پھیل گئی۔

"امامہ......" کچھ دیر سوچ میں ڈوبنے کے بعد اس نے اسے پکارا تھا۔

"جی سر!"

"امامہ...... جو بچی کی گورنس ہوتی ہے' کیا وہ ڈپریشن میں' شدید ڈپریشن میں بچی کے فادر کا سر نہیں دبا سکتی؟"

مضبوط اعصاب اور مضبوط کردار والا وہ شخص...... اس لمحے بہت ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا۔ امامہ نے دیکھا اس کی آنکھوں کے کناروں میں پھیلی سرخی اس کے اندر اضطراب کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

"کیا آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے؟"

"ہوں۔"

آج اس کے سامنے وہ کوئی بے بس سا بچہ بنا ہوا تھا۔

امامہ گڑیا کو بیڈ پر سلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ٹیبلٹ لاتی ہوں۔"

"نہیں...... میں ٹیبلٹ لے چکا ہوں۔"

دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے اس نے امامہ کو منع کیا تھا۔ وہ الجھتی نگاہوں سے اسے دیکھتی خاموش کھڑی ہو گئی۔

"سر دبا سکتی ہیں آپ میرا؟"

اسے خاموش کھڑی دیکھ کر اس نے پھر کہا تھا۔ امامہ فوری انکار کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ کوئی عذر پیش کرتی وہ پھر بول اٹھا۔

''پلیز امامہ......''

اتنا بے بس اور بے اختیار وہ پہلی بار اسے دیکھ رہی تھی۔

تھکن سے سرخ آنکھوں کا اضطراب تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ امامہ نے اس کی درخواست قبول کر لی۔

وہ شخص دل یا کردار کے معاملے میں کمزور نہیں تھا یہی وجہ تھی کہ وہ نرم ہاتھوں سے سائیڈ پر بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی تھی۔ وہ رو رہا تھا جیسے جیسے امامہ کے ہاتھوں کی حرارت اسے تسکین پہنچا رہی تھی ویسے ویسے اس کا دل درد سے پھٹتا جا رہا تھا۔ امامہ اس وقت اس کی بچی کی گورنس نہیں بلکہ اس کی کوئی مخلص دوست بنی ہوئی تھی۔

❁❁❁

جانے یہ عشق کا جنون تھا یا محبوب کی قربت کا بہانہ کہ شاہ زر نے عبدالصمد کی گرتی ہوئی کمپنی کو سہارا دینے کے لیے اس سے دوستی کا ہاتھ بڑھا لیا تھا۔

وہ جس کا شمار شہر کے کامیاب ترین بزنس ٹائیکون میں ہوتا تھا۔ اسی شاہ زر آفندی نے اپنے ننھے سے باغی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عبدالصمد کی ڈوبتی ہوئی کمپنی کے دس فیصد شیئر خرید لیے تھے جس پر وہ خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔

شاہ زر کی مصروفیات میں اب پہلے کی نسبت کمی آ گئی تھی کیونکہ بریرہ نے اپنی تنہائی اور شاہ زر کی بے پرائی کا غم بھلانے کے لیے اس کی جگہ خود کالج جانا شروع کر دیا تھا جس کی داغ بیل اس کی مرحومہ ساس نائلہ بیگم نے ڈالی تھی۔

اپنی بے قدری اور احساسِ کمتری کے دکھ کو غلط کرنے کا بہترین طریقہ بھی مصروفیت ہی تھا۔ لٰہذا اس نے خود کو مصروف کر لیا تھا۔

انوشہ کو جب سے پتا چلا تھا کہ شاہ زر' عبدالصمد کے ساتھ نئے معاہدے کر رہا ہے۔ اس کے اندر ایک عجیب سا انتشار پھیل گیا تھا مگر وہ بے بس تھی۔ تقدیر نے جو داغ اس کی پیشانی پر لگا چھوڑا تھا اس داغ نے اس سے سر اٹھا کر جینے کا ہر اختیار ہی چھین لیا تھا۔

اس روز عبدالصمد کی شاہ زر سے پہلی میٹنگ تھی لٰہذا اس خوشی کے اعزاز میں اس نے اپنے گھر ایک چھوٹی سی پارٹی رکھی تھی جس میں چند قریبی دوستوں کو انوائیٹ کیا تھا۔

بُریرہ اس میٹنگ کے لیے کسی طور انوشہ کے گھر جانا نہیں چاہتی تھی مگر...... وہ بھی انوشہ کی مانند بے بس تھی کیونکہ شاہ زر نے اس کے کسی بہانے کو قبول نہیں کیا تھا۔

عبدالصمد سے شاہ زر کی جان پہچان تو پہلے سے تھی کیونکہ مختلف میٹنگز میں وہ لوگ اپنی اپنی کمپنی کے چیف کی حیثیت سے شرکت کرتے رہے تھے۔ تاہم براہِ راست یہ ان کی پہلی میٹنگ تھی۔ جس وقت وہ بُریرہ کے ہمراہ انوشہ کے گھر پہنچا۔ تقریباً تمام مہمان پہنچ چکے تھے۔ سادہ سے کپڑوں میں ملبوس انوشہ رحمٰن عجب نڈھال سی کیفیت میں' خود تمام مہمانوں کی خاطر مدارت میں لگی انہیں کولڈ ڈرنک سرو کر رہی تھی۔

شاہ زر کا دل اس پر پہلی نگاہ پڑتے ہی بہت زور سے دھڑکا تھا۔

عبدالصمد کے ساتھ ساتھ وہاں موجود دیگر مہمانوں نے نے اس کی آمد پر خاصی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے والہانہ انداز میں اس کا استقبال کیا تھا مگر......انوشہ رحمٰن کے چہرے پر کوئی خوشی نہیں تھی۔ تھکی تھکی سی آنکھوں کے دیپ جیسے بجھ گئے تھے۔ شاید نہیں یقیناً وہ بیمار تھی اور اس وقت بھی اسے بخار تھا مگر......شاہ زر کے سوا وہاں اس کا احساس کرنے والا دوسرا کوئی نہیں تھا۔

شاہ زر اور بُریرہ کی خدمت کے لیے عبدالصمد نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے خصوصی ہدایات دی تھیں لہٰذا وہ انہیں مشروب پیش کرنے کے بعد کچھ اور اہتمام کا انتظام کرنے والی تھی' شاہ زر نے جس وقت اس کے کپکپاتے ہاتھوں سے گلاس پکڑا۔ اس کے دل کی کیفیت سمجھ سے باہر ہو رہی تھی۔

نرم و نازک دودھیا ہاتھوں پر لگے کٹ کے نشان اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ خود کو سزا دے رہی ہے مگر جتنی سزا وہ خود کو دے رہی تھی اتنی ہی اذیت اس کا اپنا دل محسوس کر رہا تھا۔

بُریرہ کو گلاس تھماتے ہوئے اس کی نگاہیں جھکی تھیں۔ اسی اثنا میں بریرہ کی کلائی میں پڑے کنگن کے لگنے سے انوشہ کی کلائی پر لگے زخم کو تکلیف پہنچی تھی۔ جس سے گلاس پر اس کی گرفت مضبوط نہ رہ سکی تھی اور یوں مشروب چھلک کر بُریرہ کے نفیس کپڑوں پر گر پڑا۔

''سوری......''

سہم کر عبدالصمد کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے کپکپاتے ہونٹوں نے سوری کہا تھا۔ جب وہ اٹھ کر قریب چلا آیا۔

''کیا ہوا......؟ اوہ...... یہ جاہل عورت ہر محفل میں یوں ہی ناک کٹواتی ہے میری۔''

بے دردی سے انوشہ کا بازو پکڑ کر اسے سائیڈ پر دھکیلتے ہوئے عبدالصمد نے اپنے غصے کا اظہار کیا تھا جب شاہ زر نے تڑپ کر لپکتے ہوئے اسے گرنے سے تھام لیا۔

''یہ کیا جاہلانہ پن ہے مسٹر عبدالصمد...... آپ بھول رہے ہیں کہ یہ آپ کی وائف ہیں......''

اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ عبدالصمد کا گریبان تھام لیتا مگر وہ اس کے غصے کی نوعیت نہ سمجھ سکا تب ہی اسے خوش کرنے کے لیے بُریرہ سے معذرت میں لگ گیا۔

''سوری بھابی! اس جاہل عورت کی طرف سے میں معافی چاہتا ہوں۔ رئیلی ویری سوری۔''

''اٹس او کے۔''

بُریرہ خود اس صورتِ حال پر پریشان ہو گئی تھی۔

انوشہ نے درشتگی سے اپنا آپ شاہ زر سے چھڑایا۔ آنسوؤں سے لبالب بھری نگاہوں میں اس کے لیے اتنی حقارت تھی کہ شاہ زر کا دل کٹ کر رہ گیا۔ ضبط کی شدت سے دل کا سارا خون جیسے آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔

''جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

عبدالصمد نے اس کی حالت کی پروا کیے بغیر انوشہ کو پھر سائیڈ پر دھکیلا تھا جس پر وہ خاموش نہ رہ سکا۔

''مسٹر عبدالصمد! کنٹرول یور سیلف۔ آپ شاید جانتے نہیں ہیں کہ یہ میری عزیزہ ہیں۔ میں

بھری محفل میں ان کی اس قدر تذلیل برداشت نہیں کروں گا۔"

حلق کے بل چلایا تھا وہ جس پر وہاں موجود دیگر مہمانوں کی توجہ بھی ان لوگوں کی جانب مبذول ہو گئی۔

"کیا ہوا شاہ زر......؟"

اس کا ایک دوست فوری اٹھ کر اس کے قریب آیا تھا۔

انوشہ نے جو خود کو محفل میں تماشہ بنتے دیکھا تو فوری پلٹ کر وہاں سے بھاگ گئی۔

عبدالصمد اب شرمندہ سا کھڑا تھا جب کہ اس نے خاصی ناراض نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں گھر جا رہا ہوں۔"

"مگر ڈیل......؟"

"وہ ہوتی رہے گی بعد میں۔ کہیں بھاگ نہیں رہا میں......"

خاصے تلخ لہجے میں کہہ کر بنا عبدالصمد کو کوئی موقع دیئے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے گھر سے نکل آیا تھا۔ بُریرہ جسے تھوڑی دیر پہلے انوشہ کی تذلیل پر ذرا سی تسکین کا احساس ہوا تھا۔ اب شاہ زر کے رویئے پر خاصی دکھی ہوتی اس کے پیچھے آئی تھی۔

"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا شاہ زر بھری محفل میں......"

"چپ ہو جاؤ بُریرہ پلیز۔"

وہ جو گاڑی میں بیٹھتے ہی شروع ہوئی تھی۔ شاہ زر کے رنجیدگی سے کہنے پر لب بھینچ کر رہ گئی۔ اگلے بیس منٹ کا فاصلہ شاہ زر نے صرف دس منٹ میں طے کیا اور اسے گھر ڈراپ کر کے خود سڑکوں پر نکل آیا۔

آنسو تھے کہ آنکھوں سے بہتے جا رہے تھے۔

اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ انوشہ کو عبدالصمد کی دسترس سے نکال کر اپنی تحویل میں لے لیتا اور اتنا پیار کرتا کہ اس کے سارے دکھوں کا ازالہ ہو جاتا۔

"انوشہ! مت دو خود کو ایسی سزا......نہیں برداشت ہوتا اب مجھ سے......" بالآخر گاڑی روک کر اسٹیئرنگ پر سر رکھتے ہوئے وہ رو پڑا تھا۔

"کیسے معافی مانگوں میں تم سے' کیسے ازالہ کروں اپنے گناہ کا' میرا درد کیوں نہیں سمجھتی تم......؟ میں مر جاؤں گا انوشہ......مر جاؤں گا میں......"

کوئی اس گھڑی اسے دیکھتا وہ کیسے ٹوٹ کر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

"کیسے بانٹوں تمہارے دکھ' کیسے تمہارے ایک ایک آنسو کو چن کر تمہارے سارے درد اپنے سینے میں اتار لوں' کیسے انوشہ کیسے......؟"

اسٹیئرنگ پر مکے برساتے ہوئے وہ جیسے خود اپنا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

❁❁❁

رات میں وہ خاصا لیٹ فارغ ہوا تھا۔

دوست کی برتھ ڈے پارٹی سے فارغ ہو کر جس وقت وہ گھر آیا۔ رات کے تقریباً ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ آسیہ بیگم نیند کی گولیاں لے کر سو چکی تھیں جب کہ چھوٹی ہانیہ کے کمرے کی لائٹ بھی بند تھی۔ وہ گاڑی گیراج میں کھڑی کرنے کے بعد' سیدھا کچن میں آیا اور فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگالی۔

تھکن کے باعث اس وقت اس کا ٹی وی کے سامنے بیٹھنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ لہٰذا پانی پی کر وہ اپنے بیڈروم میں چلا آیا۔ بیڈ پر لیٹ کر اس نے شاہ زر کا نمبر پریس کیا مگر اس کا سیل آف مل رہا تھا۔ دو تین بار ٹرائی کرنے کے بعد اس نے سیل رکھ دیا۔ تب ہی اس کے ذہن میں' دوپہر والے نمبر کا خیال آیا اور اس نے کچھ سوچتے ہوئے وہ نمبر پریس کر دیا۔

بار بار بیل جاتی رہی' تب کسی نے اس کی کال پک کرنے کی زحمت گوارا کی تھی۔

''ہیلو۔''

نیند کے خمار میں ڈوبی آواز' اتنی مخمور تھی کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''ہیلو......''

اس کی خاموشی پر پھر وہی آواز ابھری تھی اور عباد نے پھر اسے انجوائے کیا تھا مگر ایک مرتبہ پھر اس کی خاموشی پر دوسری طرف سے اس کی کال ڈس کنکٹ کر دی گئی۔

وہ بیڈ پر چت لیٹا ابھی کچھ دیر قبل سنی جانے والی آواز کے سحر کو محسوس کرتا رہا پھر مسکرا کر کچھ سوچتے ہوئے اس نے دوبارہ نمبر پریس کر دیا۔

صاعقہ جو صحن میں اپنی ماں اور سمعان کی چارپائی کے درمیان والی چارپائی پر سو رہی تھی اب ایک مرتبہ پھر اسی نمبر سے کال آنے پر' کوفت میں مبتلا ہوتی چارپائی سے اٹھ کر کمرے میں چلی آئی۔

''ہیلو۔''

اس بار اس کی ہیلو سے پہلے ہی عباد بول اٹھا تھا جس پر وہ چونک اٹھی۔

''کون؟''

''اللہ کا بندہ۔''

گمبھیر آواز میں کہتے ہوئے وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔

''میرا نمبر کیوں ڈائل کیا ہے؟''

اس کے سیل پر وہ پہلی رانگ کال تھی اور وہ جانتی تھی کہ اس نے خود صبح غلطی سے رانگ نمبر پر میسج بھیج کر اس رانگ کالر کو تنگ کرنے کا موقع دیا ہے۔ وہ چونکہ زندگی سے بیزار تھی لہٰذا یہ رانگ کال ایک طرح سے اس کے لیے خود کو بہلانے کا بہترین اتفاق تھا۔

عباد اس کے معصوم لہجے پر پھر مسکرایا تھا۔

''بس یوں ہی نیند نہیں آ رہی تھی تو سوچا فون کر کے معلوم کرلوں جاب شاب مل گئی آپ کو کہ نہیں......؟''

''جاب......کیسی جاب......او......آپ وہ صبح والے میسج پڑھ کر کہہ رہے ہیں۔ وہ میسج میں نے نہیں کیا تھا' میری ایک دوست نے کیا تھا۔ بہت غریب ہے بیچاری اپنا سیل بھی افورڈ نہیں کر سکتی۔''

''اچھا...... ویری سیڈ مگر آپ کتنی اچھی ہیں دوستوں کو اپنا سیل استعمال کے لیے دے دیتی ہیں۔ آج کل کہاں ملتے ہیں ایسے نیک دل لوگ؟''

عباد کو اس کی گفتگو میں مزہ آ رہا تھا۔

صاعقہ اپنی دانست میں اس کے بے وقوف بن جانے پر دل ہی دل میں ہنس دی۔

''بس غرور نہیں کیا کبھی۔ سیل کا کیا ہے ہر ہفتے تبدیل کرتی ہوں میں تو۔ اب بھی بلیک بیری استعمال کر رہی ہوں۔''

''واہ اس کا مطلب ہے خاصی امیر کبیر لڑکی ہیں آپ؟''

''بس کیا بتاؤں شو مارنے کی عادت نہیں ہے اپنی ورنہ پیسہ تو اتنا ہے کہ صبح سے شام تک گنتی رہوں تو حساب نہ ہو۔ معمولی لڑکی سمجھ کر کال کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ بہت برا انجام ہوگا......''

''اچھا جی میری کیا مجال کہ آپ جیسی صاحب حیثیت لڑکی کو کال کروں۔ میں تو جی بہت ہی معمولی سا بندہ ہوں۔ یہ سیل بھی سمجھیں دوست سے مارا ہے آپ کو کال کرنے کا اصل مقصد یہی تھا کہ آپ سے مدد کی درخواست کروں پلیز میری بھی کہیں جاب لگوا دیں۔''

زندگی میں پہلی بار کسی ان دیکھی انجان لڑکی سے بات کرتے ہوئے اسے لطف آ رہا تھا۔

صاعقہ کی نیند جیسے بھک سے اڑ گئی۔ ذرا سی گردن موڑ کر اس نے اپنی سوئی ہوئی بیمار ماما سمعان اور صائمہ کی طرف دیکھا پھر دوپٹے سے چہرے پر آیا پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔

''ہوں...... کیوں نہیں لیکن ابھی تو میں کچھ دنوں کے لیے ابروڈ جا رہی ہوں۔ واپس آ کر بات کروں گی آپ کے لیے۔''

''بڑی مہربانی جی۔ اللہ آپ کو خوش اور سلامت رکھے۔ ابروڈ کب جا رہی ہیں آپ؟''

''بس یہی کوئی دو چار روز میں۔''

''اور...... واپس کب آئیں گی؟''

''جلد انشاء اللہ۔''

صاعقہ اب جان چھڑانے پر تھی۔ تب ہی جلدی سے کہہ کر اس نے لائن ڈس کنکٹ کر دی تو عباد سیل کی آف اسکرین کو دیکھتے ہوئے دھیمے سے مسکرایا۔

''تم جو کوئی بھی ہو بہت معصوم اور دل چسپ لڑکی ہو۔''

سیل چارج پر رکھنے سے پہلے اس نے جیسے اس لڑکی کے تصور سے ہمکلام ہو کر کہا تھا۔

اگلے روز فیکٹری جاتے ہوئے صاعقہ ہنس ہنس کر آمنہ کو یہ رات والی روداد سنا رہی تھی۔

''اف یار کمال بندہ تھا۔ کوئی پچیس منٹ کی کال کی تھی اس نے اور ان پچیس منٹ میں میں نے اس پر وہ رعب ڈالا اپنا کہ جی جی کرتے اس بندے کی زبان نہ تھکتی تھی۔''

وہ چلتے چلتے ہنس رہی تھی۔

اسی اثناء میں عباد قطعی اتفاق سے وہاں فیکٹری کے راستے میں اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا سر زمان سے بات کر رہا تھا اور انہیں انوشہ کی خیریت کے بارے میں بتا رہا تھا' جیسے چونک اٹھا۔ کاٹن کے معمولی سے مکمل بلیک سوٹ میں ملبوس وہ لڑکی ہوا کے کسی معطر جھونکے کی مانند اس کے

لب سے ہنستے ہوئے گزر گئی تھی۔
اپنی ہی باتوں' اپنے ہی حال میں مگن......
اسے شاید اپنے اردگرد نگاہ دوڑانے کی فرصت ہی میسر نہیں تھی۔
اس روز عباد نے آفس پہنچتے ہی جو سب سے پہلا کام کیا وہ اسی لڑکی اور اس کے نمبر کی انویسٹی گیشن کا تھا۔ صرف چند گھنٹوں میں اس کے ایک قابل اعتماد دوست نے اس لڑکی کے بارے میں تمام معلومات اس کی ٹیبل پر پہنچا دی تھیں۔
وہ کون تھی' کہاں رہتی تھی......؟ کہاں کام کرتی تھی کتنے بہن بھائی تھے......؟ کیا گھریلو حالات تھے کیسے کردار کی مالک تھی؟ کتنی تعلیم یافتہ وغیرہ وغیرہ...... کچھ بھی چھپا نہ رہ سکا تھا اس سے۔
''ہوں تو یہ بات ہے......''
صاعقہ کے بارے میں تمام حالات جان کر اس نے خود کو اپنی سیٹ پر ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔
وہ محبت کے وجود سے انکاری تھا۔ اس کے نزدیک محبت صرف بے کار اور احمق لوگوں کا مشغلہ تھا۔ جان بوجھ کر خود کو درد کے سپرد کرنے والے پاگلوں کا کام تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یونیورسٹی میں بھی سوائے شاہ زر کے' اس کی اور کسی کے ساتھ کوئی خاص فرینڈ شپ نہیں تھی۔
الوشہ کی دوست صبا میں تھوڑی دلچسپی ضرور محسوس کی تھی اس نے مگر اس کی فوری شادی کے بعد یہ دلچسپی بھی دل سے مفقود ہوگئی۔ وہ چاہتا تو اپنی فیانسی کے ساتھ راہ ورسم بڑھا کر اچھا ٹائم پاس کرسکتا تھا مگر......اسے یہ گوارہ ہی نہیں تھا۔
لڑکیوں کے چکر میں پڑنا...... ان کے بارے میں سوچنا پھر بات بات پر کڑھنا اسے شدید بے کار محسوس ہوتی تھی ایسی باتوں سے مگر...... وہ نہیں جانتا تھا جب بنجر دل پر محبت کا موسم دستک دیتا ہے تو انسان کا اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں رہتا۔ محبت یوں باندھ باندھ کر مارتی ہے کہ پھر...... کچھ بھلا سوچنے کے لیے اعصاب بھی سلامت نہیں رہتے اور اسے محسوس ہو رہا تھا شاید اب وہ بھی کسی ایسے سفر کی تیاری کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔

❁❁❁

اسے بہت تیز بخار ہو رہا تھا مگر اس کے باوجود وہ ٹھنڈے پانی سے شاور لے کر کمرے سے نکل آیا تھا۔ نُدیرہ کچن میں تھی اور پچھلے دو روز سے اس کے لبوں پر جیسے خاموشی کا قفل لگا ہوا تھا۔ وہ کچن میں آیا تو وہ بولے بغیر نہ رہ سکی۔
''میں کچھ روز کے لیے امی کے پاس جانا چاہتی ہوں شاہ زر......''
''کیوں......؟''
''دل چاہ رہا ہے۔''
''او کے لیکن ابھی تو دو ماہ ہی ہوئے ہیں انہیں یہاں سے گئے۔ کچھ دن ٹھہر جاؤ پھر دونوں اکٹھے ہی چلیں گے۔''
''نہیں۔ میں اکیلی جاؤں گی اور کچھ روز رہ کر آؤں گی۔''
''ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔''

کندھے اچکاتے ہوئے بنا بحث کے اس نے بُریرہ کا مطالبہ مان لیا تھا جس پر وہ پھر کٹ کر رہ گئی تھی۔ اس شخص کو اب جیسے اس کی کسی بھی بات سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا انوشہ رحمٰن کے زندگی میں آنے سے پہلے وہ کیسا دیوانہ تھا اس کا...... کبھی کبھی تو وہ سانس بھی اس کی مرضی سے لیتی تھی۔ اکثر اس کا مارکیٹ جانے یا کسی فرینڈ کی سالگرہ شادی وغیرہ کی تقریب میں شرکت کرنے کو دل چاہتا تھا مگر وہ یوں ہی اسے تنگ کرنے کو ضد میں آ کر منع کر دیتا اور یوں وہ روتے بسورتے رک جاتی۔ اسے شاہ زر کا خود پر رعب جمانا اور حق جتانا بے حد اچھا لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اسے زندگی میں اتنی اہمیت دیتی تھی مگر...... وہ نہیں جانتی تھی کہ محبت صرف عورت کا مسئلہ...... صرف عورت کی زندگی ہے۔ مرد کے زندہ رہنے کے لیے کسی ایک خالص محبت کا پانا ضروری نہیں ہے۔ وہ دریافت کا پرندہ ہے۔ نئے جہانوں کی سیر میں جو منڈیرا اچھی لگی وہیں بیٹھ گیا۔ اسے تو یاد بھی نہیں رہتا کہ نئے سفر سے قبل جو علاقہ وہ چھوڑ کر آیا ہے اس علاقے کی نرم مٹی میں اس کے کچھ خواب...... کچھ عہد...... کچھ یادیں دفن ہیں۔ وہ علاقہ بھی اس کی واپسی کا منتظر ہے۔ اس کے قدموں کی آہٹ کا عادی ہو گیا ہے۔

دن بھر وہ اسے سوچتی رہتی تھی اور اندر ہی اندر مسمار ہوتی رہتی تھی۔

شاہ زر بنا اس کے احساسات کی پروا کیے ناشتے کے بغیر ہی گھر سے نکل گیا تھا۔

عبدالصمد کل رات ہی دبئی گیا تھا لہٰذا کچھ سوچتے ہوئے اس نے گاڑی انوشہ رحمٰن کے گھر کی طرف جاتے راستے پر ڈال دی۔

❀❀❀

"آپ رو رہے ہیں......؟"

امامہ کو جوں ہی شجاع کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کا احساس ہوا وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

شجاع کو لگا جیسے اس وقت وہ خود پر بندھے مضبوط بندھوں کا بھرم نہیں رکھ سکے گا۔

"ہوں......"

"کیوں سر......؟"

وہ اب حقیقتاً اس کے لیے پریشان ہوئی تھی۔

شجاع صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"پتہ نہیں امامہ! کبھی کبھی لگتا ہے جیسے میں انسان ہی نہیں ہوں۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں سوچتے......"

شجاع کا دل جیتنے کا اس سے اچھا موقع اسے میسر نہیں آ سکتا تھا تب ہی دل جوئی سے بولی تو وہ اس کی طرف پلٹ آیا۔

"تم سمجھتی ہو ناں میں اچھا انسان ہوں بہت اچھا......"

"ہوں......"

وہ گھبرا گئی تھی۔ شجاع آج اسے اپنے حواس میں نہیں لگ رہا تھا۔

"تم بے آسرا ہو ناں امامہ...... میرے سوا بھری دنیا میں کہیں کوئی جائے پناہ نہیں ہے تمہاری

"ہاں؟"

وہ دوقدم پیچھے ہٹی تھی اور شجاع دوقدم مزید اس کے قریب آیا تھا۔

"ہوں......"

"ہمیشہ میرے ساتھ رہنا چاہوگی......؟"

وہ دیوار سے لگی تھی اور شجاع نے اپنا ہاتھ دیوار سے ٹکا دیا تھا۔

اس کی شدتیں جیسے ایک دم سے عود کر آئی تھیں۔ اپنی ذمہ داریاں' اپنا عہدہ' نام ومقام جیسے وہ بھول چکا تھا اس لمحے۔

امامہ کو اپنی جان ہوا ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟"

"پاگل ہو گیا ہوں میں۔ بتاؤ امامہ! چلو گی زندگی کے سفر میں میرے ساتھ......؟"

اس کا چہرہ جیسے طوفانوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔

امامہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لمحے وہ اس طوفان کا سامنا کیسے کرے۔

"سر پلیز! کنٹرول یور سیلف پلیز......"

وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

شجاع نے بے بسی سے دیوار پر مکا رسید کر دیا۔

"جاؤ۔"

اس کی آنکھیں اس لمحے جیسے شعلے اگل رہی تھیں۔

امامہ کا پورا وجود خشک پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھل بھی گیا تھا مگر پھر بھی سرخرو نہ ہو سکا۔

"جاؤ چلی جاؤ......"

اسے اپنی جگہ جماد یکھ کر وہ پھر دہاڑا تھا۔

امامہ کپکپاتے وجود کے ساتھ اپنا آنچل سنبھالتی کمرے سے بھاگ گئی۔

شجاع کو لگا اس کا سر جیسے درد کی شدت سے پھٹ جائے گا۔ گڑیا بے خبر سو رہی تھی اس نے ہتھیلی پر اٹھی چار نیند کی گولیاں نکالیں اور گلاس میں پانی انڈیل کر ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر گیا۔

اندر اپنے کمرے میں امامہ سر گھٹنوں میں دیئے زاروقطار روئے جا رہی تھی۔

❁❁❁

بار بار بجتی بیل کے بعد بڑی مشکل سے اس کی کال پک کی گئی تھی۔

امامہ کے آنسو تھے کہ بے دردی سے بہتے چلے جا رہے تھے۔ پہلی بار اسے شجاع حسن کے گھر میں اپنے تنہا ہونے کا احساس ہوا تھا اور یہ احساس کل رات سے اس کے ہزاروں آنسو بہا کر آنکھوں سے نکال چکا تھا۔

"ارسلان......"

کال پک ہوتے ہی اس نے نم لہجے میں کہا تھا جب وہ کرخت لہجے میں بولا۔

''کہو کیا مصیبت ہے......؟''

''ارسلان میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں مجھے اپنے پاس بلالو۔ میں نوکرانی بن کرتمہاری خدمت کرلوں گی مگراب میں یہاں نہیں رہوں گی......''

اس کے کرخت لہجے کی پروا کیے بغیر وہ بلک اٹھی تھی۔

دوسری طرف وہ جیسے انگاروں پر بیٹھا تھا۔

''نہیں رہ سکتی وہاں تو کسی ایدھی سینٹر میں پناہ لے لو یا پھر تھوڑا سا زہر پھانک کر ہمیشہ کے لیے سورہو۔ میری بلا سے جہنم میں جاؤ مجھے کوئی پروا نہیں۔''

''ارسلان......''

حیرانی کی شدت سے اس کے آنسو جیسے پلکوں پر اٹکے تھے جب وہ بولا۔

''مرگیا ارسلان۔ خبردار جو آج کے بعد مجھے تنگ کرنے کی کوشش کی تو...... پہلے ہی زندگی کم عذاب میں نہیں آئی ہوئی کہ تم بھی جان کو چمٹ گئی ہو۔''

''ارسلان......'' وہ پھر ٹوٹی تھی۔

''شٹ اپ۔''

اس بار ہر احساس سے عاری ہو کر اس نے لائن ہی ڈس کنکٹ کردی۔

امامہ کتنی ہی دیر تک پاگلوں کی طرح گم صم سی بیٹھی رہی۔

شجاع اس روز طبیعت کی سخت خرابی کے باوجود بغیر ناشتہ کیے اپنے آفس چلا گیا تھا۔

آج اس کی خصوصی میٹنگ تھی۔

شام ڈھلنے کے بعد موسم نے اچانک اپنے تیور بدلے تھے اور وہ گھبرا اٹھی تھی۔ پورا جسم جیسے بے جان ہو رہا تھا۔ شدت سے مرجانے کو دل چاہ رہا تھا مگر موت کہاں دسترس میں تھی اس کے......؟ آسمان پر شدت سے کڑکتی بجلی اور بادلوں کی گھن گرج کے ساتھ اب بارش میں بھی شدت آگئی تھی۔

اس نے کھانا کھلا کر گڑیا کو سلایا اور خود اتنے خطرناک موسم کی پروا کیے بغیر لان میں چلی آئی۔

اسے تیز بارش کے ساتھ ساتھ کڑکتی بجلی سے بھی بے پناہ خوف آتا تھا۔ ایمرجنسی صورتِ حال میں بھی ایسے موسم میں وہ کھلے آسمان کے نیچے نہیں آتی تھی مگر......اس وقت اس کے اندر جیسے کوئی آگ دہک رہی تھی۔

ارسلان حیدر کا نفرت اور بیزاری سے بدلا لہجہ' اسے بے موت مرجانے پر اکسا رہا تھا لہٰذا ہر قسم کے خوف سے بے نیاز وہ لان میں کھلے آسمان کے نیچے چلی آئی۔

شجاع جس وقت گاڑی پارک کر کے لان سے گزر رہا تھا اس کی نگاہ اس پر پڑی تھی اور وہ وہیں ٹھٹک گیا تھا۔

کین کی چیئر پر پلکیں موندے سکون سے بیٹھی وہ بری طرح بارش میں بھیگی ہوئی تھی۔ گھر کے اس گوشے میں لائٹ لگی تھی۔ اسے جیسے احساس ہی نہیں تھا۔ وہ اگر اس موسم میں اس کے خوف سے باخبر نہ ہوتا تو شاید نظرانداز کر کے آگے بڑھ جاتا مگر کچھ اس کا خوف اور کچھ کل رات والی اپنی بات

کر کے وہ مجبوراً اس کی طرف بڑھا تھا۔
"امامہ......"
جب سے دل کے تقاضے بدلے تھے وہ امامہ ہی کہتا تھا مگر......وہ خاموش رہی۔
"امامہ......"
اس بار زیادہ شدت سے پکارا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔
"امامہ! اندر چلو موسم ٹھیک نہیں ہے۔"
مجبوراً اس بار اسے امامہ کو جھنجوڑنا پڑا تھا مگر یہ بھی بے اثر رہا۔
"کیا ہوا ہے سر آپ جائیں......"
"پاگل ہوگئی ہو۔ اتنی تیز بارش اور سرد ہَوا میں مرنے کا ارادہ ہے کیا؟"
وہ خود بھی یونیفارم میں بھیگ رہا تھا۔
"ہاں......"
اس کے تیز لہجے کے سوال کا جواب' کتنے سکون سے دیا تھا اس نے کہ لحظہ بھر کو وہ جیسے کچھ بول ہی نہ سکا۔
"کیوں......کیا میری کل رات والی بات کی وجہ سے......؟"
"نہیں......"
"پھر......؟" وہ اب الجھ رہا تھا۔
"پھر کچھ نہیں۔ آپ جائیں ناں پلیز۔"
دوبارہ روہانسی ہوئی تھی وہ۔ شجاع کے دماغ کا میٹر جیسے پھر گھوم گیا۔
"پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے۔ پولیس والا ہوں' قسائی نہیں جو آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھتا رہوں۔ چلو اندر......"
اس بار دھونس جماتے ہوئے اس کا بازو تھاما تھا اس نے جسے امامہ نے فوراً چھڑا لیا۔
"نہیں جانا مجھے یہاں سے کہیں پلیز آپ جائیں......"
وہ ضد کر رہی تھی اور اس کی ضد نے شجاع کو بھی جیسے ضد دلا دی۔
"او کے مت جاؤ......میں بھی دیکھتا ہوں کیا لطف ملتا ہے اس بارش میں بھیگنے کا۔" دوسری کرسی گھسیٹ کر بنا یونیفارم کی پروا کیے وہ اس کے مقابل بیٹھ گیا۔
اچانک بجلی شدت سے کہیں قریب ہی زمین پر گری اور امامہ کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔
نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حلق سے چیخ نکل گئی تھی اور پورا جسم جیسے خشک پتے کی مانند کانپ اٹھا تھا۔
"امامہ......"
شجاع نے اسے تسلی دینا چاہی تھی مگر وہ قطعی غیر متوقع طور پر کسی ننھے سے بچے کی مانند اس کی گود میں سر چھپا کر رو پڑی۔
شجاع کو لگا جیسے اس لمحے اس کی ہستی فنا ہو جائے گی۔
"امامہ......"

اسے پکارتے ہوئے اس کے اپنے لہجے میں واضح لرزش پیدا ہوئی تھی۔اسی پل امامہ نے خود کو سنبھالا اور اس کی گود سے سر اٹھاتے ہوئے لڑکھڑاتے قدم اٹھاتی لان سے بھاگ گئی۔
پیچھے شجاع بہت دیر تک خود کو سنبھالنے سے قاصر رہا تھا۔

❋❋❋

وہ ابھی کپڑے دھو کر فارغ ہوئی تھی کہ دروازے پر ہونے والی بیل نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔
اس کا بیٹا ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا کھیل رہا تھا۔
وہ گیلے ہاتھ دوپٹے سے خشک کرتی دروازے تک آئی تھی۔
''کون......؟''
''میں شاہ زر......''
باہر سے جواب اس کی توقع کے قطعی خلاف آیا تھا۔
''آپ کو جس سے ملنا ہے وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں......''
خود بخود اس کے لہجے میں تلخی در آئی تھی جب کہ وہ سرد لہجے میں بولا۔
''مجھے اس وقت صرف تم سے ملنا ہے انوشہ۔دروازہ کھولو اس سے پہلے کہ کوئی تماشہ بن جائے۔''
اس کا لہجہ غیر معمولی ہو رہا تھا۔انوشہ کو مجبوراً دروازہ کھولنا پڑا۔
''کہو اب کیا مصیبت آپڑی ہے تم پر......''
دونوں پٹ تھامے وہ تنفر سے شاہ زر کی طرف دیکھ رہی تھی۔جواباً اس نے بغیر کچھ کہے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔
''یہ کیا بدتمیزی ہے......؟''
''چپ رہو تم......''
اس کی غراہٹ کا کوئی نوٹس لیے بغیر وہ اندر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
''میرا بیٹا کہاں ہے؟''
انوشہ کے بیڈروم میں جھانکنے کے بعد وہ اب ٹی وی لاؤنج میں دیکھ رہا تھا پھر اس سے پہلے کہ انوشہ کچھ کہتی وہ لپک کر اپنے بیٹے کی طرف بڑھا اور اسے بانہوں میں لے کر دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔
''چھوڑو اسے......''
انوشہ نے سختی سے اس کا بازو تھاما تو اس نے اسے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔
''نہیں چھوڑ سکتا نہ اسے اور نہ تمہیں......''
''شٹ اپ۔مت بھولو کہ میرا شوہر ابھی زندہ ہے۔''
''تو کیا ہوا تم کیا سمجھتی ہو۔نکاح کے تین بولوں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور کر دیا......؟نہیں انوشہ تم صرف میری ہو،صرف میری......''

عجیب سے جنون کی زد میں آیا وہ اسے حیران کر رہا تھا۔
انوشہ کو لگا جیسے اس کا سانس حلق میں اٹک جائے گا۔
''تم اپنی حد کراس کر رہے ہو شاہ زر۔ مت بھولو کہ مجھے تم سے شدید نفرت ہے۔''
حلق کے بل چلائی تھی وہ مگر اس نے پروا نہیں کی۔
''کرتی رہو تمہاری نفرت سے میری محبت پر کوئی اثر نہیں پڑتا......''
کتنا فائدہ اٹھا رہا تھا وہ اس کے کمزور ہونے کا......
''بہت ہو گیا انوشہ! بہت سزا دے لی تم نے مجھے اور بہت برداشت کر لیا میں نے اب اور نہیں۔''
اسے بازو میں جکڑے وہ یونیورسٹی کے دنوں کی یاد تازہ کر رہا تھا۔
''بہت کمزور سمجھتی ہو تم شاہ زر کو نہیں......شاہ زر ابھی کمزور نہیں ہے سمجھی تم......''
وہ جیسے اپنے حواس میں تھا ہی نہیں......
انوشہ کو لگا جیسے اس کی سانس رک جائے گی۔
''جاننا چاہتی ہو اپنے اور میرے تعلق کو......او کے ابھی دکھاتا ہوں میں کہ کیا تعلق ہے میرا تم سے......''
عجیب سے جنون کی زد میں آیا وہ اسے چھوڑ کر منے کو اسے تھماتے ہوئے کچن میں گھس گیا پھر تیز دھار چھری ہاتھ میں لے کر واپس پلٹ آیا۔
''میں نے زندگی برباد کی ہے ناں تمہاری۔ یہ گھاؤ جو تم خود کو لگاتی ہو میں ہوں ان کا ذمے دار......تو سزا بھی مجھے ہی ملنی چاہیے۔ انوشہ کیوں سولی چڑھے......شاہ زر کو صلیب ملے شاہ زر کو......''
کہنے کے ساتھ ہی اس نے انوشہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔
''یہاں کٹ لگایا ہے ناں تم نے خود کو......چلو میں بھی اپنے ہاتھ پر یہیں کٹ لگا کر دیکھتا ہوں کیسی تکلیف ہوتی ہے......''
کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ پر کٹ لگا لیا تھا۔
انوشہ کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔
''اور یہاں......بازو پر......یہاں اس جنگلی نے مارا ہے ناں......یہ لو......یہ کٹ یہاں پر......''
''بس کرو......''
اچانک چلا کر اسے روکتے ہوئے اس نے اپنی چپ کا گلا گھونٹا تھا۔ زیادہ دیر تک خاموش تماشائی نہیں بنی رہ سکتی تھی وہ......
شاہ زر کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کا بایاں بازو پورا لہولہان ہو رہا تھا۔
''نہیں دیکھ سکتی ناں تم یہ خون......میں بھی نہیں دیکھ سکتا یہ......دل کی دھڑکن سنو میری دیکھو کیا آواز آتی ہے یہاں سے......''

❊❊❊

شام ڈھل رہی تھی جب وہ تھکے تھکے سے وجود کے ساتھ اس چھوٹے سے ہوٹل کے باہر لکڑی کے بینچ پر آ بیٹھا تھا۔ اسے اپنے گھر والے بہت یاد آ رہے تھے۔

صائمہ، صاعقہ، سمعان، چھوٹے دونوں بھائی۔ اپنی ماں سب کو یاد کرتے ہوئے اس کے اندر کی بے چینی اسے کسی پل قرار لینے نہیں دے رہی تھی۔ جاتا تو کہاں جاتا۔ اسے تو ان کے ٹھکانے کا بھی نہیں پتا تھا۔ وہ یوں ہی ملول سا بیٹھا سوچوں میں گم تھا جب کسی نے اس کے مضبوط کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے چونکا ڈالا۔

"کیسے ہو شہزادے......؟"

ایان نے ذرا سی گردن گھما کر دیکھا۔ وہ اس کا جیل کے دنوں کا ایک عزیز دوست تھا۔ ایان اٹھ کر فوراً اس کے گلے لگ گیا۔

"ٹھیک ہوں یار تُو سنا کب آیا باہر......؟"

"بس...... دو چار روز ہی ہوئے ہیں تُو یہاں کیسے؟"

دوست کے سوال پر ایان نے مختصر لفظوں میں اپنی روداد اسے کہہ سنائی۔

"یہ تو بہت برا ہوا یار...... پھر آگے کیا سوچا ہے تُو نے......؟"

اس کی روداد سننے کے بعد اس کے دوست نے اس سے پوچھا تھا جب وہ بولا۔

"کیا سوچنا ہے یار! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ عزیز رشتہ دار سب کنارا کشی کر گئے ہیں۔ آج تنہا اور مفلس ہوں تو کسی کو حال پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں......"

وہ اندر سے دکھی تھا۔

اس کے دوست نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

"غم نہ کر اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس اتنا ہے کہ اللہ کبھی کبھی اپنے کسی نیک بندے کو آزمائش میں ڈال کر اس پر زندگی کی حقیقت ضرور آشکارا کر دیتا ہے۔ دیکھ ناں ایان، انسان انسان کی محبت میں خاک ہو جاتا ہے پھر بھی اسے کچھ نہیں ملتا سوائے دربدری اور خواری کے...... محبوب سے محبوب رشتہ نگاہ بدلنے میں منٹ لگاتا ہے۔ ذرا سی آزمائش میں ساتھ چھوڑ جاتا ہے مگر...... وہ خالق...... جس کی محبت سے انسان دم آخر تک بے نیاز رہتا ہے۔ وہ نہیں چھوڑتا اپنے بندوں کو۔ ان کی بے وفائی، نافرمانی کے باوجود وہ انہیں نہیں چھوڑتا...... اس فانی دنیا کی محبت میں غرق...... یہ ہم جیسے گنہگار بندے جب بھی ٹھوکر کھا کر اسے پکارتے ہیں وہ سو بار ہماری پکار کا جواب دیتا ہے۔ گناہوں سے لتھڑے ہمارے وجود کو اپنے دامنِ رحمت میں پناہ دیتا ہے تو پھر کیوں نہ ہم صرف اسی کے ہو کر جئیں...... اس کے لیے جب یہ دنیا بکری کے مردہ بچے سے زیادہ حقیر ہے کہ جس نے خود اسے تخلیق کیا ہے تو پھر...... ہمارے لیے یہ اتنی اہم کیوں ہم تو مسافر ہیں یار...... ہمارا تو کچھ بھی نہیں اس دنیا میں......"

اس کا دوست جیل سے رہائی کے بعد دنیا سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔

ایان نے تھکی تھکی سی سانس خارج کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں کل سعودیہ جا رہا ہوں۔ دعا کرنا اچھا روزگار مل جائے اور عمرے کی سعادت بھی حاصل کر لوں۔ اگر تُو چاہے تو تیرے لیے یہاں بہتر ٹھکانے کا انتظام کر سکتا ہوں۔"

"کیسے......؟"

''کیسے کو چھوڑو۔ وہ میرا درد سر ہے تُو بول کام چاہیے تجھے......؟''

''ہاں......''

''تو چل پھر میرے ساتھ۔ میرے گاؤں کے نمبردار کو ایک محنتی' شریف' ایمان دار مزارعے کی ضرورت ہے۔ کام صرف ڈیرے کی رکھوالی کا ہی ہوگا۔ پہلے میں یہ کام کر رہا تھا۔ اب میرے بعد تُو کر لینا۔ پکی پکائی روٹی' خرچہ پانی' تنخواہ سب ملے گا۔''

اس کا دوست اسے بتا رہا تھا۔

ایان کچھ سوچتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑا۔

''شاہ والا'' کے ساتھ وہ گاؤں ''سیدوالا'' تھا۔ ایان کو اپنے مالک پسند آئے تھے۔ بارعب سنجیدہ مگر کسی بھی قسم کے گھمنڈ سے بے نیاز...... وہ بھی اپنے مالکوں کو پسند آ گیا تھا۔ کام پر رکھنے سے پہلے جو سب سے اہم نصیحت اسے کی گئی وہ یہ تھی کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے اور اپنے مالکوں کے اعتبار کو کسی بھی طرح ٹھیس نہ پہنچائے۔ ایان نے اپنی طرف سے انہیں مکمل بے فکر رہنے کی یقین دہانی کروا دی تھی۔

اسے کام سنبھالے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ وہ حویلی بھی جانے لگا۔

حویلی کے چھوٹے موٹے کام اس کے ذمے لگ گئے تھے۔ جیسے دانے پسوا کر لانا' کھیتوں سے بوقت ضرورت کوئی چیز گھر پہنچانا' دودھ وغیرہ دے کر آنا اسی ڈیوٹی میں جانے کب وہ نمبردار کی سب سے چھوٹی بیٹی علیزہ کی نگاہ میں بچ گیا۔ وہ نہ صرف چھوٹی تھی بلکہ باپ اور بھائیوں کی لاڈلی بھی بہت تھی۔ ایان کو خبر بھی نہ ہو سکی اور وہ اس کے دل میں بس گیا۔

❋❋❋

اس روز ڈیرے پر وہ اکیلا تھا۔

کام کی تھکن کے باعث پورا جسم جیسے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ پچھلے دو روز سے وہ کھیتوں پر فصل کی کٹائی اور رات میں نئی فصل کے لیے پانی لگانے کی ذمہ داری سنبھالے مسلسل جاگ رہا تھا۔ اس کے مالک اس سے بے حد خوش تھے اور وہ ان کی خوشی میں سرشار تھا۔ محنت سے نہ کبھی پہلے اس نے جی چرایا تھا اور نہ اب چرا رہا تھا۔ تاہم اس روز ذرا سی فرصت میسر آنے پر' ٹھنڈی ہوا میں' وہ درختوں کے نیچے چارپائی ڈال کر لیٹ گیا۔ بھری دوپہر میں دور دور تک کسی ذی روح کا نام ونشان تک نہیں تھا۔

سر تکیے پر رکھ کر اس نے آنکھوں پر بازو رکھا اور تھوڑی ہی دیر میں اسے نیند آ گئی۔ ابھی اسے سوئے بمشکل پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک اسے اپنے سینے پر ہلکے سے دباؤ کا احساس ہوا اور فوراً آنکھ کھل گئی۔

❋❋❋

بارش خوب برس رہی تھی۔

گھڑی کی سوئیوں کی ٹِک ٹِک کے ساتھ جیسے بُریرہ کا دل چل رہا تھا۔ آج رات اس کی یورپ کے لیے فلائٹ تھی' مگر شاہ زر ابھی تک گھر نہیں پہنچا تھا۔

اس کا دل تھا کہ جیسے کٹ کٹ کر ختم ہوتا جا رہا تھا۔ کتنا مشکل ہوتا ہے' اس شخص کو زندگی میں شیئر کرنا جس سے آپ کی سانسیں جڑی ہوں۔ اندر آنسوؤں کا اتنا غبار جمع ہو گیا تھا کہ بُریرہ کو اب اپنی ہر سانس گھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

اپنی عظمت' خاموشی' کمپرومائز پر اب اسے شدید غصہ آ رہا تھا۔ وہ جان ہی نہیں سکی تھی کہ عورت جب عظمت کا تمغہ گلے میں پہنتی ہے تو وہ درد کے کس مقام پر کھڑی ہوتی ہے۔ یہ عظمت و اچھائی اسے اپنا آپ جلا کر اپنے ہاتھوں خود اپنے آپ کو دفن کرنے کے بعد ملتی ہے۔

ایک ایسا شخص جس نے آپ کو بھی بہت چاہت' بہت اہمیت دی ہو' زندگی سے متعارف کرایا ہو۔ وہی شخص کسی اور کے لیے جب آپ سے قربانی مانگ لیتا ہے۔ تو زندگی کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟

وہ بھی آج کل یہی سوچ رہی تھی۔ وہ انوشہ اور شاہ زر کے بیچ کیوں ہے؟

شاید اسی لیے اس نے فرار کا یہ راستا اپنایا تھا' مگر سکون اب بھی نہیں تھا۔

سانسوں سے قیمتی اس شخص سے وہ دور جا رہی تھی۔ انوشہ رحمٰن نہیں...... اس کے لیے تو اُلٹا وہ میدان خالی کر رہی تھی۔ یہی احساس' یہی سوچ تھی جس نے اس کی روح کو سُولی پر لٹکا چھوڑا تھا۔

ایک بار پھر اس کی نظریں وال کلاک کی طرف اُٹھی تھیں۔ گیارہ بج کر اڑتیس منٹ ہو رہے تھے۔ وہ خاموشی سے آنسو پیتی اٹھی تھی اور اپنے پیک شدہ سامان کا دوبارہ جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ تب ہی شاہ زر کے قدم گھر کی دہلیز پر پڑے تھے۔ اس کا بایاں بازو پورا زخمی تھا۔ بُریرہ نے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈال کر اپنی تیاری شروع کر دی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی وہ بال سنوار رہی تھی۔ جب شاہ زر تھکے تھکے سے قدم اٹھاتا اس کے عین پیچھے آ کھڑا ہوا اور پھر اپنے ہاتھ نرمی سے اس کے دونوں کندھوں پر رکھ دیے۔

''آئی ایم سوری بُریرہ۔'' بہت مشکل سے جیسے وہ بول پایا تھا۔ بُریرہ نے آہستگی سے اس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیے۔

''اٹس او کے۔''

اس کے لہجے میں نمی اور خفگی تھی۔ شاہ زر اپنے بال جکڑ کر رہ گیا۔

''میں اچھا شوہر نہیں ہوں بُریرہ! اسی لیے...... اسی لیے اس شادی سے بچ رہا تھا' مگر سائلہ آنٹی نے میری ایک نہیں سُنی اور ہم دونوں کو سُولی پر چڑھا دیا۔''

اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''اٹس او کے اپنی ماں کے غلط فیصلے کی سزا بنا کوئی آہ کیے چپ چاپ بھگت رہی ہوں میں' پھر بھی میری ذات سے اگر آپ کو کوئی شکایت ہوئی ہو تو میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔''

''نہیں جان! ایسے مت کہو' میں' تمہارے قابل نہیں ہوں۔ صرف ایک ہی حادثے نے مجھے میری ہی نگاہوں میں اتنا حقیر کر دیا ہے بُریرہ' کہ آئینہ دیکھتے ہوئے خود سے بھی نگاہ چُراتا ہوں' مگر تم تو آئینہ نہیں ہو بُریرہ! ایک بیوی سے پہلے تم میری بہت اچھی دوست ہو قدم قدم پر تم نے مجھے......''

''مجھے دیر ہو رہی ہے شاہ زر! چلیں۔''

اس کی بات درمیان میں کاٹ کر اس نے سرد مہری سے کہا تھا۔ شاہ زر کئی لمحے چپ چاپ اسے

دیکھنے کے بعد آہستہ سے اثبات میں سر ہلا گیا۔
بُریرہ اس رات چلی گئی تھی، مگر وہ رات بھر نہ سو سکا۔

❀❀❀

شدید بخار اور ذہنی تھکن کے باوجود اگلے روز وہ آفس چلا آیا تھا ابھی آکر چند کام ہی نپٹائے تھے کہ انٹرکام بج اُٹھا۔

''ہیلو۔''

''سر! عباد صاحب آئے ہیں، آپ سے ملنے۔''

''او کے، فوراً بھیج دو۔''

ناسازیٔ طبیعت کے باعث اس نے سیکرٹری کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ کسی کو اس کے روم میں نہ آنے دیا جائے۔ تبھی پہلی بار شاید عباد کو اجازت کی ضرورت پڑی تھی، وگرنہ وہ تو دندناتا ہوا، سیدھا اس کے روم میں گھس آتا تھا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ اسے روک لیتا۔

''السلام علیکم!''

اس وقت بھی دروازہ ہلکے سے ناک کر کے وہ خاصے فریش موڈ میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ شاہ زر اسے دیکھ کر فوراً اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''وعلیکم السلام!''

''میرے دوست قصہ یہ کیا ہو گیا ہے؟ سنا ہے کہ تو بے وفا ہو گیا ہے؟''

شاہ زر کے گلے لگتے ہی اس کی چوڑی پشت پر دھموکا رسید کرتے ہوئے وہ گنگنایا تھا۔ جواب میں ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر رینگ گئی۔

''خیر تو ہے؟ آج یاروں پر بین لگ گیا تیرے آفس میں؟''

اب اس کے سامنے کی سیٹ سنبھالتے ہوئے وہ گلہ کر رہا تھا۔ شاہ زر کا تپتا چہرہ اس کی توجہ میں ہی نہیں آیا۔

''نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں بس طبیعت تھوڑی ناساز تھی تو......''

''تھوڑی ناساز......؟ آنکھیں دیکھ اپنی کیسی سرخ ہو رہی ہیں۔ سنا ہے تو نے کل رات بھابھی کو بھی میکے بھگا دیا ہے، سسرالیوں کو تو پہلے ہی بھگا دیا تھا۔ ہوا کیا ہے آخر......؟''

''پتا نہیں......''

عباد اس کی کیفیت سمجھ نہیں پا رہا تھا تبھی شاید اس نے رخ پھیرا تھا۔

''شاہ......''

وہ متفکر ہوا تھا۔ جواب میں شاہ زر کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

''مر گیا ہے تیرا شاہ یار...... بھری دنیا میں سوکھے پتے سے زیادہ ہلکا ہو کر رہ گیا ہے وہ......'' لہجے میں اس کی آواز بھرائی تھی۔ عباد اُٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

''اوئے...... ہوا کیا ہے، سب ٹھیک تو ہے ناں......؟''

''پتا نہیں......''

''کیا پتا نہیں' پتا نہیں کی رَٹ لگا رکھی ہے۔ سیدھی طرح بتا کیا ہوا ہے' نہیں تو میں کر رہا ہوں بھابی کو کل میسج بھی آیا تھا ان کا ابروڈ جانے کا' بتا کیا بات ہے......؟'' وہ اس کا جگری یار تھا' مگر اس کی الجھن سے تا حال بے خبر تھا۔

شاہ زر شدید اضطراب کی کیفیت میں سیٹ سے اٹھ کر گلاس ونڈو کی طرف چلا آیا۔

''میرا زندگی میں دل نہیں لگ رہا عباد! ایک آگ جو میرے اندر لگی ہے' مجھے راکھ کیے جا رہی ہے۔ ایک کسک ہے جو مجھے کھُل کر سانس لینے نہیں دے رہی۔ میں سو کر اٹھتا ہوں تو میرے بیڈ روم کی ہر چیز مجھ پر ہنستی ہے۔ مینٹلی پاگل ہو کر رہ گیا ہوں اور میرے اسی پاگل پن سے ہرٹ ہو کر بُریرہ بھی مجھ سے دور ہو گئی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' عباد اس کے قریب آ کر اس کے پہلو میں کھڑے ہوتے ہوئے اُلجھا تھا۔

شاہ زر نے کچھ پل گمبھیر خاموشی کی نذر کر دیے۔

''سمجھ بھی کیسے سکتے ہو تم...... محبت تمہاری سمجھ سے باہر کی چیز ہے۔''

''کیا مطلب......؟ تمہارا کہنے کا مطلب ہے تمہیں کسی سے محبت ہو گئی ہے۔''

''ہاں...... آج سے نہیں سات سال پہلے سے' جب وہ مائیگریشن کروا کر ہماری کلاس میں آئی تھی۔''

''آئی تھی...... کون...... کون آئی تھی......؟'' عباد کو جیسے جھٹکے لگ رہے تھے۔ کتنا گھنا تھا شاہ زر' وہ اس کے سامنے آیا تھا۔

''انوشہ رحمٰن......'' سکون سے کہہ کر اس نے اپنی نظر باہر کے نظاروں پر جمائی تھی۔

عباد اپنی جگہ سے اُچھل ہی تو پڑا۔

''واٹ...... وہ...... وہ انوشہ رحمٰن......''

''ہوں......''

بالآخر اپنی شکست کا اعتراف کرتا وہ اسے غصہ دلا گیا تھا۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا......؟ وہ...... وہی ملی تھی ساری دنیا میں تمہیں دل لگانے کے لیے......؟''

''ہوں......''

''یہ ٹھیک نہیں ہے شاہ زر' وہ میرڈ ہے' پھر جو کچھ تم نے اس کے ساتھ کیا ہے اس کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ تمہاری زندگی میں اس کی کوئی گنجائش نکلتی ہوگی' یا پھر اس کی زندگی میں تمہاری کوئی گنجائش نکلتی ہوگی۔''

''یہاں زندگی کی بات کر کون رہا ہے عباد! محبت کی حد اگر زندگی تک ہی محدود ہوتی تو دودھ کی نہریں کون نکالتا' صحراؤں کی خاک کون چھانتا......؟ مگر تم نہیں سمجھو گے تم نے وہ چوٹ کھائی ہی نہیں جو سانسیں الجھا دیتی ہے' آنکھوں کا تعلق نیندوں سے توڑ دیتی ہے۔''

''خیر اب ایسا بھی نہیں ہے' تازہ تازہ بد دعا لگی ہے تمہاری مجھے' پچھلے چند دنوں سے قسم لے لو جو سکون کی نیند نصیب ہوئی ہو مجھے۔''

شاہ زر کا موڈ فریش کرنے کے لیے اس نے بات کا رُخ اپنی کہانی کی طرف موڑ دیا تھا اور وہ

اعصاب رہا تھا۔

"کیا مطلب......؟"

"مطلب تو بڑا سیدھا سادا ہے یار! یہ لڑکیاں یونہی اپنی مظلومیت کا رونا روتی ہیں۔ حقیقت میں ان سے بڑا لٹیرا کوئی نہیں۔ ایک پل میں ہم چاق و چوبند' ذہین چھ فٹ مردوں کا دل چرا کر اپنے قبضے میں کر لیتی ہیں اور پھر مرضی سے سانس بھی نہیں لینے دیتیں۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے شاہ زر اپنا دکھ بھول گیا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ......"

"ہوں...... دال کالی ہوگئی ہے بھائی' تیرے یار کا دل بھی چرا لیا ہے کسی نے......"

"یہ معجزہ کیسے ہوگیا اور تو نے بتایا کیوں نہیں......؟"

"بتا تو رہا ہوں بلکہ بتانے کے لیے ہی کراچی سے دھکے کھاتا یہاں آیا تھا' مگر تُو نے آگے سے اپنی ہی الف لیلیٰ شروع کر دی۔" اس کے انداز میں شگفتگی تھی۔

شاہ زر اسے لے کر صوفے پر آبیٹھا۔

"کون حور پری ہے' یقیناً آسمان سے اُتری ہوگی یا پھر زمین سے اُگی ہوگی......؟"

"نہیں یار! زمین سے ہی برآمد ہوئی ہے' بس میری زندگی میں آتے آتے دیر کر دی۔"

"ہے کون......؟"

"لوئر کلاس طبقے کی شہزادی ہے' میرے آفس میں ہی جاب اسٹارٹ کرے گی' ایک بڑا معذور بھائی ہے' اس کے بارے میں سنا ہے کہ کچھ عرصہ قبل اس کی ٹانگ کٹ گئی تھی۔ ماں بیمار رہتی ہے یقیناً گھر کے نامساعد حالات کی وجہ سے' ایک اور بہن ہے وہ گھر میں سلائی کرتی ہے باقی بہن بھائی چھوٹے ہیں۔"

اس کا بات مکمل کرنا تھا اور شاہ زر کا کھلکھلا کر ہنسنا تھا۔

"واہ...... تجھے بھی یہ ملی تھی دل لگانے کے لیے۔ اپنا مقام دیکھ اور اس کی حیثیت دیکھ' بے وقوف گدھے' تیری دولت دیکھ کر مرمٹی ہوگی تجھ پر......"

"اوئے نہیں یار! اس شہزادی کو تو پتا بھی نہیں ہے کہ میں کون ہوں' کیا ہوں' اس سے تو انتہائی غریب بن کر ملا ہوں میں۔ سچ شاہ زر! تو سچ ہی کہتا ہے' زندگی میں محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"

شاہ زر کو اس کی خوشی اور فریش موڈ کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔ تبھی وہ مسکرا دیا تھا۔

"بہر حال اب میں چلتا ہوں۔ آج رات اکٹھے ساتھ میں گزاریں گے' ابھی میں ذرا جلدی میں ہوں چائے ادھار رہی تجھ پر......"

شاہ زر اس کے لیے کچھ منگوا ہی رہا تھا کہ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"لیکن......!"

"لیکن' ویکن کو مارو گولی...... ابھی ساری ٹینشن ذہن سے جھٹک کر شرافت سے ڈاکٹر کے پاس جا' رات میں تیرے مسئلے پر بھی غور کریں گے اوکے بائے بائے۔" وہ ایسا ہی تھا ہوا کے جھونکے کی مانند آتا اور چلا جاتا۔

شاہ زرا سے رو کتا رہ گیا مگر وہ ہاتھ ہلاتا چلا گیا۔
اس کے جانے کے بعد اس کے سیل پر عبدالصمد کی کال آئی تھی جسے اس نے نہ چاہتے ہوئے پک کرلیا تھا۔ جواب میں دوسری طرف سے اس نے جو کچھ سنا اس نے اسے مزید پریشان کر کے رکھ دیا۔
'او کے فی الحال آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے' میرے گھر کا اوپر والا پورشن تقریباً خالی پڑا ہے' وہاں شفٹ ہو جائیں بعد میں دیکھتے ہیں اس مسئلے کا کیا حل نکلتا ہے۔"
اُلجھے ہوئے اعصاب کے ساتھ فوری طور پر اسے جو مناسب لگا' اس نے وہ کہہ کر لائن ڈس کنکٹ کردی۔ اب مزید وہاں بیٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ اُٹھ کر پہلے کمرے سے اور پھر اپنے آفس سے باہر نکل آیا۔

❋❋❋

ایان کی آنکھ گہری نیند سے کھلی تھی اور وہ جیسے کرنٹ کھا گیا تھا۔
اس کی چارپائی پر نہایت حسین و جمیل لڑکی بیٹھی تھی۔ جسے پہلی نظر میں تو اس نے کوئی باہر کی مخلوق ہی سمجھا تھا۔ تاہم دوسری نگاہ میں اسے یاد آ گیا کہ وہ چہرہ اس سے قبل وہ ملکوں کی حویلی میں دیکھ چکا تھا۔ تبھی فوراً وہ اُٹھ کر بیٹھا تھا۔
"کون ہو تم......؟"
"علیزہ......"
"کون علیزہ......؟"
"ملکوں کی بیٹی' بدھو...... صبح و شام حویلی میں آتے جاتے ہو' کیا دیکھا نہیں کبھی۔" وہ خفا ہوئی تھی۔ ایان چارپائی سے نیچے اُتر گیا۔
"میں حویلی میں کام کرنے جاتا ہوں لڑکیاں تاڑنے نہیں۔"
"صدقے جاؤں' پتا ہے مجھے۔ تمہاری شرافت نے ہی تو دل موہ لیا ہے میرا۔" دیہاتن ہولے کے باوجود وہ انتہائی بے باک تھی۔
ایان اچھا خاصا گھبرا گیا۔
"یہ کیا مذاق ہے......؟"
"مذاق نہیں ہے' میں سچ کہہ رہی ہوں قسم سے۔"
"میں نہیں مانتا ان باتوں کو آپ گھر جائیں پلیز۔"
وہ بدکا تھا تبھی علیزہ اس کے قریب آ گئی۔
"گھر جانے کے لیے نہیں آئی۔ اس وقت اپنے ملازم سے باتیں کرنے آئی ہوں۔"
کہنے کے ساتھ ہی اس نے ایان کا بازو تھاما تھا۔ جس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک اٹھے تھے۔
"دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا' میں اپنے مالکوں کی عزت سے کھیلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"
"میں تو باتیں کرنے آئی ہوں۔"

وہ نفس کی غلام تھی۔ باپ بھائیوں کے لاڈ پیار اور دولت کی فراوانی نے اسے راہِ راست سے ہٹا دیا تھا' یہی وجہ تھی کہ اس وقت وہ بھٹکی ہوئی روح کا کردار ادا کر رہی تھی۔

ایان گہری نگاہ سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''میں ایسے پیار پر لعنت بھیجتا ہوں جو مجھے دونوں جہاں میں برباد اور رسوا کر کے رکھ دے۔''

''ہا......ہا......ہا سر پھرے ہو' سر پھرے...... میں بھی دیکھتی ہوں عورت کے چلتر سے کیسے بچتے ہو تم۔ چند ہی دنوں میں آہیں نہ بھرو میرے لیے تو کہنا۔'' ہنس کر چیلنجنگ انداز میں کہتی وہ واپس پلٹ گئی۔

ایان اس روز پورا دن بے حد پریشان رہا تھا۔

❊❊❊

کل دیر تلک بارش میں بھیگنے کے بعد اگلے روز وہ ہلکی حرارت کا شکار ہو گیا تھا۔

امامہ باہر لاؤنج میں بیٹھی عیشا کو کاؤنٹنگ سکھا رہی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر امامہ کو آواز دے ڈالی۔

''جی سر!'' بوتل کے جن کی طرح وہ فوراً حاضر ہوئی تھی' مگر نگاہیں جھکائے ہوئے۔ شجاع اسے گہری نگاہوں سے دیکھ کر رہ گیا۔

''ایم سوری امامہ......!''

''لیکن کیوں سر؟'' اس کی سوری پر فوراً سر اٹھایا تھا اس نے' جیسے حیران ہوئی ہو۔

شجاع مسکرانے کی کوشش میں رخ پھیر گیا۔

''کل رات محض جذبات میں آ کر جو کچھ میں نے کیا' یا کہا میں اس کے لیے انتہائی شرمندہ ہوں' مجھے نہ تو دوبارہ گھر بسانے کی ایسی شدید خواہش ہے نہ میرا کردار اتنا کمزور ہے کہ اپنے گھر میں اپنی دسترس میں رہنے والی ایک معصوم سی بے بس لڑکی کو شکار بناؤں۔ تم سوچ نہیں سکتیں امامہ! اس وقت مجھے خود سے کتنی کراہت محسوس ہو رہی ہے۔ پتا نہیں کیا سوچا ہو گا تم نے میرے بارے میں کہ میں کیسا شخص ہوں' اچھی طرح جان لو امامہ! تمہاری ذات میرے لیے قابلِ احترام ہے۔ آج کے بعد میں خود کو شوٹ تو کر سکتا ہوں' مگر آپ کو بے اعتبار کرنے کی کوشش کبھی نہیں کروں گا۔ بہت اچھی زندگی گزر رہی ہے میری' کہیں کوئی کمی نہیں ہے' آپ پورے سکون اور تحفظ کے احساس کے ساتھ یہاں رہ سکتی ہیں۔ او کے۔''

ایک ہی سانس میں بھرپور اپنائیت اور شرمساری سے اپنی غلطی کا اعتراف کرتا وہ کتنا معتبر لگ رہا تھا۔

امامہ کا سر آپ ہی آپ اثبات میں ہل گیا۔

''تھینکس......''

اس کے اعتبار پر وہ ممنون ہوا تھا۔ امامہ خاموشی سے اس کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

''کاش...... کاش مجھے تم سے محبت نہ ہوئی ہوتی ارسلان...... کاش میرے سینے میں بھی تمہارے

دل جیسا دل ہوتا' کاش...... تمہیں بھلا کر' اپنی زندگی سے نکال کر مجھے بھی کوئی فرق نہ پڑتا' کاش...... کاش میں اس شخص کو چاہنے میں با اختیار ہوتی۔''

اس کا دل دُہائی دے رہا تھا۔

وہ سر جھٹک کر اپنے اندر سے اٹھتی آوازوں کے شور کو دباتے ہوئے دوبارہ گڑیا کو پڑھانے بیٹھ گئی۔

❋❋❋

سارے گھر میں پوچا لگا کر ابھی وہ فارغ ہوئی تھی کہ عبدالصمد گھر چلا آیا۔

انوشہ وقت سے پہلے اس کی گھر آمد پر حیران ہوتی اس کے پیچھے کمرے میں آئی تھی۔

''خیریت...... آج آپ جلدی گھر آ گئے......؟''

''ہوں...... اصل میں ہم ابھی فوراً یہاں سے شفٹ ہو رہے ہیں۔ شاہ زر صاحب کے گھر......!''

''کیا...... لیکن کیوں......''

انوشہ کو لگا جیسے کسی نے اس کی سماعتوں میں بم پھوڑ دیا ہو۔

عبدالصمد نے اس کی طرف رُخ پھیرا تھا۔

''نیلامی ہو رہی ہے اس گھر کی کل صبح اور اس وقت سارے شہر کی پولیس جعلی چیکس کے کیس میں مجھے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ جن کمپنیز کے آرڈرز پورے نہیں کیے ان کی رقم تو واپس کرنی پڑے گی۔ اب تمہاری نحوست کا شکار ہو کر میں جیل تو نہیں جا سکتا ناں۔''

بات کے اختتام پر وہ ذرا سا تلخ ہوا تھا۔

انوشہ کا دل دکھ کر رہ گیا۔

''کسی پر بوجھ بننا ضروری ہے؟ ہم گاؤں بھی تو جا سکتے ہیں۔ وہاں بھی تو گھر اور زمینیں ہیں آپ کی۔''

''مجھ اکیلے کی نہیں ہیں۔ اس میں باقی بہن بھائی بھی حصہ دار ہیں۔ پہلے چار ماہ جیسے میں گزار کر آیا ہوں وہاں' میں ہی جانتا ہوں کیا کچھ نہیں ملا سننے کو۔''

وہ بہت گہرا اور اُلجھا ہوا شخص تھا۔

انوشہ چاہنے کے باوجود اسے نہ کہہ سکی کہ مجھے مرنا قبول ہے' مگر اس شخص کی چھت تلے جا کر رہنا قبول نہیں' جس کے تصور سے بھی میرا خون رگوں میں اُبلنے لگتا ہے۔

کہہ دیتی تو کہاں جاتی؟ جینے کے لیے اس کے سوا اور کوئی رشتا ہی باقی نہیں بچا تھا۔ زندہ ہوتے ہوئے بھی سب مر گئے تھے اس کے لیے۔

شاہ زر کی آفر پر' صرف اور صرف اپنے دیوالیہ پن سے ہراساں' بناء انوشہ کے احساسات کی پروا کیے وہ اسے اس شیر کی کچھار میں لے آیا تھا۔ جس نے کبھی اس کی ذات کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ خود کو ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں محسوس کرتی' وہ جیسے اپنی لاش گھسیٹ کر لائی تھی۔ شاہ زر آفندی کی دہلیز پر' جو اس وقت اپنے شاندار گھر کے ہال کمرے میں تنہا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

الصمد کے ساتھ‘ انوشہ اور اپنے بیٹے کو دیکھ کر فوراً وہ کھڑا ہوا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ انوشہ الصمد کے ساتھ لازمی آئے گی۔ کیونکہ وہ اس کے سائے سے بھی ڈرتی تھی۔

❁❁❁

”السلام علیکم!“

وہ ابھی نہا کر نکلی تھی کہ بجتے سیل نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔ کال پک کرتے اس کی سماعتوں میں عباد کی گمبھیر آواز اتری تھی۔

صاعقہ کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”وعلیکم السلام!“

”کیسی ہیں آپ......؟“

وہ ابھی ابھی بے دار ہوا تھا۔ اس لیے آواز بھاری ہو رہی تھی۔ کمرے سے باہر دوپہر ڈھل رہی تھی۔ صاعقہ صحن سے اندر کمرے میں چلی آئی کیونکہ باہر گلی میں بچوں کے شور کی آوازیں اسے شرمندہ کرواسکتی تھیں۔

”ٹھیک ہوں فرمایئے کیسے یاد کیا......؟“

”بس یونہی سلام کرنے کو دل چاہ رہا تھا آپ کی دوست کو جاب مل گئی......؟“

”نہیں۔“

عباد کے بشاشت سے پوچھنے پر قطعی بے ساختگی میں اس کے منہ سے نکل گیا تھا اور اس نے زبان دانتوں تلے دبالی۔

”کیوں......؟“

تکیے کا سہارا لے کر کہنیوں کے بل بیڈ پر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

صاعقہ سے بات سنبھالنا مشکل ہوگئی۔

”بس...... میں ذرا مصروف تھی اور وہ بے چاری بے حد غریب ہے کون سنتا ہے اس کی؟ اس ملک میں بھلا غریبوں کو پوچھتا ہے کوئی......؟“

”صحیح۔ ویسے آپ سفارش کردیں تو کام بن سکتا ہے اس بے چاری کا۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں میری تو ایک کال پر بڑے بڑے افسر سیٹ سے کھڑے ہوجاتے ہیں۔“

”اچھا......“

اچھا کو حیرانی سے لمبا کرتے ہوئے اس نے بمشکل اپنے قہقہے کا گلا گھونٹا تھا جب وہ بولی۔

”اور نہیں تو کیا...... چھوٹے موٹے کاموں کے لیے سفارش نہیں کرتی۔ میں۔“

”ویری گڈ خیر میرے لیے تو سفارش کریں گی ناں آپ‘ وعدہ کیا تھا آپ نے۔“

”ہوں دیکھوں گی‘ ٹائم نکل سکا تو۔ کہاں جاب کرنی ہے آپ کو......؟“

”جہاں آپ دلوادیں گی جی......“

وہ اس کی سادگی کو انجوائے کررہا تھا۔ صاعقہ شو مار کر پچھتائی۔

”ٹھیک ہے سوچتی ہوں آپ کا کچھ نہ کچھ‘ ویسے بھی ابروڈ کی سیٹ کینسل کروادی ہے میں نے۔“

''بڑی مہربانی جی' تو پھر میں کل ٹ لوں آپ سے......؟''
''کس خوشی میں۔'' فوراً اگلی فرمائش پر اس کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ وہ ہنس دیا۔
''خوشی میں نہیں جی جاب کے لیے۔''
''اچھا ٹھیک ہے دیکھوں گی۔ ویسے میں بہت سادا رہتی ہوں۔''
''ویری گڈ اس لیے تو کہتا ہوں آپ بہت گریٹ لڑکی ہیں۔''
وہ نثار ہو رہا تھا۔ صاعقہ اس کے پاگل پن پر ہنستی فوراً لائن ڈس کنکٹ کر گئی۔
''کیا ہوا کس کی کال تھی......؟''
صائمہ اسے اکیلے میں ہنستے دیکھ کر پوچھے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ جب وہ بولی۔
''ہے ایک پاگل...... اب یہ نہیں پتا کون ہے' کیسا ہے' لیکن میں نے اسے الّو خوب بنالیا ہے۔ شو مار کر۔''
''شرم تو نہیں آتی' بہت اچھا کام کر رہی ہو کسی کو دھوکا دے کر۔''
کپڑے سمیٹ کر رکھتی صائمہ نے اسے لتاڑا تھا۔ جواب میں وہ اور کھل کر ہنس دی۔
''دھوکا کیسا مائی ڈیئر...... میرا کون سا افیئر چل رہا ہے اس کے ساتھ' کبھی کبھی دل چاہتا ہے ناں کوئی ہماری بھی عزت کرے' ہم بھوک و افلاس سے مارے غریب لوگوں کا بھی احترام کرے ہماری بھی کوئی اہمیت ہو۔''
اس کا اپنا ہی فلسفہ اور خواب تھے۔
صائمہ سر جھٹک کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔
اگلے روز صبح ہی صبح آمنہ آدھمکی تھی۔
''شہزادی صاحبہ...... آٹھ بج رہے ہیں آج فیکٹری نہیں جانا کیا؟''
''نہیں۔''
روٹی بیل کر توے پر ڈالتے ہوئے اس نے فوری جواب دیا تھا۔
''کیوں؟''
''اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے یار! ابھی ناشتے سے فارغ ہو کر انہیں اسپتال لے کر جانا ہے۔''
''ہوں' پھر بی پی شوٹ کر گیا ہوگا؟''
''وہ تو شوٹ ہی رہتا ہے یار! کبھی سمعان بھائی کو دیکھ کر کڑھتی ہیں تو کبھی ایان بھائی کو سوچ کر روتی رہتی ہیں۔''
''ظاہر ہے ماں ہیں ناں' اپنے بچوں کے لیے فکر مند تو ہوں گی۔ اللہ کی ذات بڑی مہربان ہے۔ میں تجھے یہ بتانے آئی تھی کہ ابھی چند روز پہلے جس کمپنی میں ہم انٹرویو دینے گئے تھے۔ وہاں کچھ نئے ورکرز کی جگہ نکل آئی ہے۔ میرا کزن کام کر رہا ہے وہاں۔ کہہ رہا تھا اس بار انٹرویو دے آؤ' سفارش کر دوں گا۔ مالک بہت اچھے ہیں' اگر کام بن گیا تو سمجھ مزے ہو جائیں گے۔''
آمنہ بہت خوشی سے اسے بتا رہی تھی۔
صاعقہ توے پر پڑی روٹی سینکتے ہوئے بے دھیانی میں اپنا ہاتھ جلا بیٹھی۔

''چھوڑ یار! امیروں کے روز کے کھیل تماشے ہیں یہ...... جب چاہا ڈگڈگی بجا کر غریبوں کی بے بسی کا تماشہ دیکھنے کے لیے انہیں بلایا' پھر جب بے زار ہوئے ٹھوکر مار کر بھگا دیا۔ میرا دل تو بہت کھٹا ہوا ہے۔''

وہ جن حالات اور مسائل کا شکار تھی انہیں کے مطابق بول رہی تھی؟

آمنہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بس یار! صرف تیرا مسئلہ نہیں ہے۔ اس ملک کے سترہ کروڑ عوام کا رونا ہے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے کہیں کا نہیں چھوڑا ہمیں۔ تو یوں کڑھ کڑھ کر خون نہ جلا اپنا۔ خالہ کو اچھی طرح چیک کروانا۔ ان شاء اللہ ظہر کی نماز سے پہلے چلیں گے وہاں' دیکھیں کیا بنتا ہے۔''

وہ پُرامید تھی۔

صاعقہ کے ہاتھ مزید تیزی سے دوسری روٹی بیلنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

❀❀❀

دوپہر میں سورج کی گرمی جسم کو چبھ رہی تھی۔

وہ بار بار چہرے پر آیا پسینہ دوپٹے سے خشک کرتی۔ آمنہ کے ساتھ ایک مرتبہ پھر تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے اسی کمپنی کے ویٹنگ ہال میں آ بیٹھی تھی۔ جہاں سے پچھلی بار خاصی تپ کر مایوس ہو کر واپس گئی تھی۔ آمنہ کا کزن آ کر انہیں تسلی دے گیا تھا' لہٰذا اندر آفس کے اے سی لگے سرد ماحول میں سکون کا سانس لیتی وہ کامیابی کے لیے دعاؤں کا ورد کرنے لگی۔

آج انٹرویو پینل کی سربراہی عباد کو کرنی تھی' مگر قطعی نادانستگی میں' اس کی نگاہ صاعقہ پر پڑی تھی اور اس نے آہستہ سے معذرت کر لی۔ یہ کہہ کر کہ اسے نہایت ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔ ساتھ ہی اپنے مینیجر سے اس نے صاعقہ کے لیے خصوصی خیال رکھنے کی ہدایت بھی کی تھی۔

واپسی پر وہ ابھی آفس کی عمارت سے نکلی ہی تھیں' جب اس کے سیل پر عباد کی کال آ گئی۔

''السلام علیکم!''

جونہی اس نے کال پک کی عباد کا خوب صورت آواز میں سلام سن کر مسکرا اُٹھی۔

''وعلیکم السلام!''

اپنی دانست میں وہ شکر ادا کر رہی تھی کہ انٹرویو کے وقت کوئی کال نہیں آئی تھی۔ آمنہ اب توجہ سے اسے دیکھ رہی تھی اور اشارے سے پوچھ بھی رہی تھی' مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے صبر کرنے کا سگنل دے دیا۔

''میم...... پریشان کرنے کے لیے معافی چاہتا ہوں' وہ اصل میں آج آپ نے مجھے جلب دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔''

اس کے بشاشت سے وعلیکم السلام کہنے پر عباد کا حوصلہ بڑھا تھا۔

''ہوں وعدہ تو کیا تھا' مگر وہ کیا ہے کہ آج تو میں بہت مصروف ہوں' اپنی ایک فرینڈ کی پارٹی میں جانا ہے' آپ کل مل لیجیے گا۔''

آمنہ کی طرف دیکھ کر بائیں آنکھ دباتے ہوئے اس نے اپنی ہنسی روکی تھی۔
''نہیں میم...... پلیز آج ہی مل لیں۔ مجھے بہت شوق ہے آپ جیسی عظیم لڑکی کو دیکھنے کا۔''
اس کی ''شو'' پر مسکرانے کے باوجود عباد نے اپنے لہجے کو ملتجانہ رکھا تھا۔
صاعقہ کی گردن اس کی تعریف پر کچھ اور تن گئی۔
''او کے' پھر یوں کرو' ابھی ''عباد انڈسٹریز'' کے قریب آجاؤ میں نکل ہی رہی ہوں یہاں سے' میری پی اے بھی ساتھ ہی ہے۔''
''اوتھینک یوسوچ' آپ واقعی میں بہت اچھی ہیں' میں بس ابھی آیا۔''
اس کی آفر پر اپنی خوشی کا اظہار کرتا وہ فوراً آف لائن ہو گیا تھا' صاعقہ کا ایک مرتبہ پھر ہنس ہنس کر بُرا حال ہو گیا۔
''کون تھا جس کو اتنی ''شو'' مار کر دکھا رہی تھیں؟''
لائن کٹ ہوتے ہی اسے ہنستے دیکھ کر آمنہ نے اس کے بازو پر دھموکا جڑا تھا۔ جب وہ ہنستے ہوئے بولی۔
''ہے ایک پاگل' الو کہیں کا' ابھی تھوڑی دیر میں آئے گا تو دیکھ لینا۔''
عباد سے متعلق ساری کہانی بھی ہنس ہنس کر وہ آمنہ کو سنا چکی تھی۔ تبھی وہ بھی ہنسی تھی۔
''بڑی شے ہے تو بھی' اگر اسے تیرے جھوٹ کا پتا لگ گیا تو......؟''
''تو کیا...... وہ بھی میرے جیسا ہی غریب ہے' میرا کیا بگاڑ لے گا۔''
صاعقہ کے انداز میں بے نیازی تھی آمنہ گھور کر رہ گئی۔
''شکل دیکھو میم کی اور مجھے اپنا پی اے بنالیا' شرم تو نہیں آتی دوست کہہ دیتیں۔''
''نہیں یار! تو دوست لگتی نہیں ہے' پی اے ہی لگتی ہے۔''
وہ متواتر ہنس رہی تھی۔ آمنہ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اسی اثناء میں اس کے کزن نے اسے کال کر کے دوبارہ آفس بلوالیا۔ تو وہ صاعقہ سے ایکسکیوز کرتی ابھی آئی کہہ کر دوبارہ عباد انڈسٹریز کی طرف بڑھ گئی۔ صاعقہ کی بیک پر ایک شاندار مرسڈیز کھڑی تھی۔ وہ اسی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ آج اس نے شاندار سوٹ اور جوتے پہنے ہوئے تھے۔ شکل تو اس کی پہلے ہی کشمیریوں جیسی تھی' لہٰذا اسے کسی قسم کی کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔
عباد البتہ کسی عام سے سوٹ کے لیے ضرور خوار ہو رہا تھا اور بالآخر اسے اپنے گھریلو ملازم کی مدد لینا پڑی۔ اس سے اس کا استعمال شدہ ایک دُھلا ہوا سوٹ اور جوتے پہن کر اسے از حد حیران کرتا وہ دوبارہ اپنے آفس کے قریب پہنچ گیا تھا۔
''السلام علیکم!''
صاعقہ گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب اس نے قریب پہنچ کر فوراً سلام جڑ دیا۔ جواب میں اس نے ہڑبڑا کر اس کی طرف نگاہ کی تھی۔ جو کپڑوں اور جوتے کے علاوہ اور کہیں سے ایک غریب انسان نہیں لگتا تھا۔
''وعلیکم السلام...... آپ؟''

اسے حیرانی ہوئی تھی اسے دیکھ کر جب وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''جی میں...... میرا نام زین ہے' فون پر جاب کے لیے بات ہوئی تھی ناں آپ سے۔''

''ہوں لیکن تم نے مجھے پہچانا کیسے؟''

وہ اندر سے مشکوک ہو رہی تھی جب وہ ہوشیاری سے بولا۔

''لو جی...... اس میں کیا مشکل تھی ''عباد انڈسٹریز'' کے قریب یوں سرِ راہ مجھ جیسے دو ٹکے کے انسان کی مدد کے لیے آپ جیسی کوئی عظیم لڑکی ہی انتظار کر سکتی ہے ناں' ویسے آپ گاڑی میں بیٹھ کر بھی انتظار کر سکتی تھیں۔''

''ہاں...... لیکن...... میں نے سوچا گاڑی میں تو ہر وقت بیٹھے ہی رہتے ہیں۔ تھوڑی تازہ ہوا میں سانس لے لیں۔ خیر دیکھنے میں تو آپ خاصے نفیس اور ہینڈسم دکھائی دے رہے ہیں۔ کہیں سے غریب لگتے تو نہیں۔''

''تھینک یو جی' بظاہر دیکھنے میں تو آپ بھی رئیس کبیر نہیں لگتیں نظر کا کیا ہے۔ ظاہری حلیے سے اندر کا انسان تھوڑی پہچانا جاتا ہے۔''

اس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ صاعقہ ستائشی انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔

''خیر ''عباد انڈسٹریز'' تو بڑا نام ہے جی اور سنا ہے' عباد صاحب بڑی ریز رو نیچر کے مالک نوجوان ہیں' آپ کیسے جانتی ہیں انہیں......؟''

صاعقہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ عباد انڈسٹریز آئی تھی کسی کام سے' تبھی وہ پوچھ بیٹھا تھا۔ جواب میں اسے متاثر کرنے کے لیے وہ مزید پھیلتے ہوئے بولی۔

'او بابا' میرا فیانسی ہے وہ' بچپن سے اکٹھے پلے بڑھے ہیں ہم' مجھ پر تو جان دیتا ہے جہاں جاتا ہے ساتھ لے کر جاتا ہے۔ اس سے کہہ کر آج اپنی فرینڈ کو جاب دلوائی ہے میں نے......''

''ویری گڈ پلیز ان سے کہہ کر میرا بھی کہیں بندوبست کروا دیں ناں۔''

وہ مچلا تھا' صاعقہ اس کے عاجزانہ انداز پر احساس تفاخر سے مسکرا اٹھی۔

''نہیں' آپ کی بات نہیں کر سکتی ان سے۔ وہ مائنڈ کر جائیں گے کہ تم اس لڑکے کو کیسے جانتی ہو۔ آپ کا بندوبست کسی اور جگہ کروں گی۔''

اپنا بھرم رکھنے کے لیے اس نے بات بنائی تھی۔

عباد گہری نگاہ سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''آپ کی پی اے نظر نہیں آ رہی؟''

تھوڑی دیر بعد اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ قدرے سنبھل کر بولی۔

''ہاں وہ اسے کسی کام سے بھیجا ہے میں نے' ابھی آتی ہو گی۔''

''اچھا جی' اب اگر آپ محسوس نہ کریں تو پلیز اپنا نام بتا دیں مجھے اچھا لگے گا۔''

''ارے میرا نام تو اتنا فینسی ہے' میرے حلقے میں' خیر مجھے ذرنیل کہتے ہیں۔ ذرنیل عباد' آپ ذرنیل صاحبہ کہہ سکتے ہیں۔''

اسے دیکھنے کے بعد اس نے اس کے لیے 'تم' کی جگہ 'آپ' استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔

عباد دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا۔
تبھی اسے دور سے آمنہ آتی دکھائی دی تو کہہ اٹھا۔
''اچھا ذرنیل جی! میں ابھی چلتا ہوں' آپ سے شام کو ان شاء اللہ فون پر بات ہوگی۔''
''ہوں' گاڈ بلیس یو۔''
صاعقہ کی گردن ہنوز تنی ہوئی تھی۔ عباد آمنہ کے قریب آنے سے پہلے ہی واپس مڑ گیا۔
''آ گئیں تم......؟ اسٹوپڈ وہ چلا بھی گیا۔''
''کون۔''
آمنہ نے عباد کو نہیں دیکھا تھا تبھی اس کے دھموکے پر حیرانی سے پوچھا تو صاعقہ نے سر پیٹ لیا۔
''کوئی نہیں اب گھر چلیں؟''
''ہوں' چلو۔''
وہ اپنی ترنگ میں تھی' صاعقہ بنا موڈ خراب کیے اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی گھر آ گئی۔

❋❋❋

دور نیلے آسمان پر اس وقت ایک خوب صورت کبوتر اڑتا دکھائی دے رہا تھا اور انزلہ کی نگاہیں اسی کبوتر پر تھیں پچھلے دس گھنٹوں سے مسلسل اڑ رہا تھا۔ اس کے اسکول کی عمارت مکمل ہو گئی تھی۔ اسٹاف کے لیے بھی اس نے شہر کی ایک دو جاننے والی لڑکیوں کا بندوبست کر لیا تھا۔ آج کل بچوں کے ایڈمیشن کا کام تیزی سے مکمل ہو رہا تھا اور وہ اسی میں بے حد مصروف و مسرور تھی۔ شہر میں اس نے اپنی ذاتی کوششوں سے میران شاہ کے کیس کی ری انویسٹی گیشن کے آرڈرز حاصل کر لیے تھے اور یہ بات ابھی سانول شاہ کے علم میں نہیں آئی تھی' کیونکہ وہ اپنے کسی ضروری کام سے کچھ روز کے لیے گاؤں سے باہر گیا ہوا تھا۔
اس وقت اسکول کی عمارت کے کشادہ گراؤنڈ میں بیٹھی۔ وہ صرف اور صرف کبوتر کے لیے سوچ رہی تھی جسے صبح سات بجے سانول شاہ کے آدمیوں نے ''بازی'' اڑایا تھا اور اب شام کے پانچ بجنے والے تھے' کبوتر تھک کر یا پیاس سے نڈھال ہر کر جونہی نیچے آتا وہ اسے کنکر مار کر یا ڈرا کر واپس اڑا دیتے۔ صبح دیے گئے نشے کا اثر اب ٹوٹنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کبوتر کو پیاس ستا رہی تھی' مگر اپنے مالکوں کی جیت کا پرچم لہرانے یا جان گنوانے تک اسے اڑتے رہنا تھا نیچے نہیں آنا تھا۔ اور پھر وہی ہوا جس کا انزلہ کو ڈر تھا۔
دور اونچی فضا میں مسلسل دس گھنٹے پرواز کرتا کبوتر اب تیزی سے نیچے آ رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔
ساتھ والے گاؤں کے مخالف پارٹی کے آدمی جیت کی خوشی میں شور مچا رہے تھے۔
انزلہ نے ازحد کرب کے احساس کے ساتھ آنکھیں میچ کر سر کرسی سے ٹکا دیا۔
معصوم پرندوں اور جانوروں کی زندگیوں سے کھیلنے کا یہ ''شغل'' وہاں نیا نہیں تھا۔ اسکول کی عمارت سے قدرے فاصلے پہ بلند ہوتا وہ شور صرف جیت کا شور تھا۔ وہاں سانول شاہ کے آدمیوں

یہاں پر پھیلی شکستگی اور رنج صرف ہار کا تھا۔ اپنی اپنی ناک اور بھاری رقم کی ہار جیت کے اس عمل میں معصوم اور مقدس پرندے کی قیمتی جان کے زیاں پر افسوس کرنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔

انزلہ دکھ کے اسی احساس میں گھری ابھی گھر جانے کا سوچ رہی تھی کہ چھنو وہاں آ گئی۔

''اللہ! باجی آپ ابھی تک یہاں بیٹھی ہیں؟''

وہ شاید اسے ڈھونڈتی ہوئی آئی تھی۔ انزلہ نے اثبات میں سر ہلا کر نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔

''ہوں کیوں خیریت؟''

''آہو جی! خیریت ہی ہے' میں گھر گئی تھی آپ کے' دادی اماں آپ کے لیے فکر مند ہو رہی تھیں۔''

''ماں ہیں ناں اسی لیے فکر مند رہتی ہیں۔''

''آہو جی' آپ پیاری بھی تو بہت ہو آخر کو ان کے اکلوتے بیٹے کی اکلوتی بیٹی ہو۔ اماں بتاتی ہیں' بڑا پیار تھا دادی کو آپ کے پاپا جی سے' ایک منٹ نظر سے اوجھل ہو جاتے تو سارے گاؤں میں ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ بڑی منتوں مرادوں کے بعد جو پیدا ہوئے تھے۔ آپ کو پتا ہے انزلہ باجی! چوہدری کے جس بیٹے کے ہاتھوں آپ کے پاپا جی کا قتل ہوا تھا۔ وہ ابھی پرسوں ہی جیل سے رہا ہو کر پھر سے گاؤں آ گیا ہے۔''

چھنو ہمیشہ اسے تازہ ترین معلومات فراہم کرتی تھی۔ انزلہ چونک اٹھی۔

''کیا!''

''آہو جی! کل شام ہی فیقے نے بتایا تھا اس کے بارے میں۔ تین سال پہلے ساتھ والے گاؤں کے چوہدری کا بیٹا مار دیا تھا جی اس نے' اسی لیے سزا ہوگئی اگر یہ چوہدری ہیں تو وہ کون سا کمی کمین ہیں۔ بڑا پیسا لگایا تھا جی دونوں چوہدریوں نے بالآخر تین سال کی سزا ہو سکی' اسی کی پیشی پر تو جاتا تھا یہ سانول شاہ۔''

اسے معلومات فراہم کرتے ہوئے چھنو ہمیشہ پر جوش ہو جاتی تھی۔

انزلہ کو لگا جیسے کوئی بہت نوکیلی چیز اس کے دل کو چیرتی ہوئی گزر گئی ہو۔

''کتنے بیٹے ہیں چوہدری کے؟''

''چار تھے جی ایک کی موت ہو گئی تھی کچھ سال پہلے' ایک ملک سے باہر ہے اور ایک یہ اب آیا ہے جیل سے رہا ہو کر۔ سانول شاہ سب سے چھوٹا ہے' بڑا پیار تھا چوہدری کو اس سے' اس کی خواہش پر تو پڑھ رہا تھا یہ شہر میں۔ وہاں سنا ہے کسی شہرن پر عاشق ہو گیا تھا۔ چوہدری سے اس لڑکی کے لیے بات بھی کر لی تھی مگر چوہدری کی اچانک موت نے حویلی کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیے۔ اس سانول شاہ نے تو ایسا صدمہ لیا کہ پھر پلٹ کر شہر گیا ہی نہیں۔''

''ماں زندہ ہے ان کی؟''

''نہیں جی وہ بہشتن تے ان کے بچپن میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ بڑی نیک عورت تھی اور چوہدری کو پیار بھی بڑا تھا اس سے۔ اسی لیے تو اس کے بعد دوسری شادی کروائی نہیں۔ پتا ہے انزلہ

باجی! چوہدری کی دو بڑی بیٹیاں بھی ہیں ایک کا وٹے سٹے میں نکاح دیا ہوا تھا ایک ابھی بھی کنواری ہے۔ دونوں بیٹیاں باپ کی دہلیز پر بیٹھی بیٹھی ہی بوڑھی ہوگئی ہیں۔ چھوٹی والی کا خاندان میں مناسب جوڑ نہیں ملا اور بڑی والی کسی معمولی جھگڑے کی نذر ہو کر آج تک باپ کی دہلیز سے رخصت نہیں ہوئی۔ صرف جائیداد بچانے کے لیے یہ چوہدری اور وڈیرے برسوں سے اپنی بیٹیوں کو سُولی پہ چڑھاتے آرہے ہیں۔ سچی انزلہ باجی! آپ بھی ملیں ناں چوہدری کی دونوں بیٹیوں کو تو رو پڑیں۔ پیدا ہونے سے لے کر اب تک انہوں نے حویلی سے باہر کی دنیا نہیں دیکھی سیکڑوں مربع زمین کی مالک ہیں، مگر ان کی مجال نہیں کہ اپنی خواہش پر اپنے نام لگی زمین سے ایک گاجر یا مولی ہی منگوا کر کھالیں۔ جس زمین نے جس جائیداد نے ان کے خواب نوچ لیے ان کی زندگی سُونی کردی وہ زمین وہ جائیداد ان کے کس کام کی انزلہ باجی......؟"

چھنو کے دل میں چوہدری کی بیٹیوں کے لیے درد تھا۔

انزلہ کی نگاہ میں اس کا مقام اور بڑھ گیا۔

"صحیح کہتی ہو چھنو' کون کہتا ہے عورت کو حقوق مل گئے ہیں وہ آزاد ہوگئی ہے۔ یہاں ہمارے دیہات میں' جہاں وڈیرا سسٹم نے فضول رسم ورواج کو اپنے فائدے کے لیے پروان چڑھا کر عورت کے حقوق غصب کر لیے ہیں یہاں عورت کبھی اپنے حق کے لیے سر اونچا نہیں کر سکتی۔ بہت مشکل ہے اس کے لیے رسم و رواج کی ان زنجیروں کو توڑنا' جاہلیت کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کسی روشنی کی امید رکھنا بے کار ہے۔ ان اونچی حویلیوں کی شہزادیوں کے خوب صورت خوابوں میں رنگ بھرنے یہاں کوئی شہزادہ نہیں آسکتا چھنو! آبھی جائے تو یہ زمینوں کے پجاری اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔ یہی قسمت ہے ان اونچے گھرانوں کے چھوٹے دماغوں والے چوہدریوں کے گھروں میں پیدا ہونے والی بدبخت بیٹیوں اور بہنوں کی ساری عمر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر گھٹ گھٹ کر مرسکتی ہیں وہ، ان شان دار اونچی دیواروں میں مگر اپنی زندگی کے لیے کبھی معمولی سی آہ بلند نہیں کر سکتیں۔"

انزلہ کا لہجہ رنجیدہ اور انداز کھویا کھویا تھا۔

چھنو افسوس سے سر ہلا کر رہ گئی۔

"اس کا مطلب ہے یہاں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئے گی؟ یہ وڈیرے، یہ چوہدری یونہی ناخدا بنے' جس کا چاہیں گے خون چُوستے رہیں گے۔"

"نہیں چھنو دیپ سے دیپ جلے گا تو روشنی ضرور ہوگی یہ لوگ مرتے دم تک نہیں چاہیں گے کہ ان کی خدائی کا سورج ڈوبے۔ اسی لیے تو یہ اپنے ماتحت علاقوں میں علم کی روشنی کو پھیلنے نہیں دیتے کیونکہ یہ جانتے ہیں علم وہ واحد تلوار ہے جو ان کی مٹھی میں پڑی حکمرانی کا سر کاٹ سکتی ہے' مگر میں علم پھیلاؤں گی مجھے اپنے خون سے بھی علم کی روشنی کے چراغ جلانے پڑے تو میں جلاؤں گی۔ تم دیکھنا چھنو یہ انزلہ شاہ ان طاقت کے نشے میں چُور مست ہاتھیوں کو ضرور شکست سے دوچار کرے گی۔ تم دیکھنا۔"

کھوئی کھوئی شہد آگیں آنکھوں میں عجیب سا ولولہ اور خواب تھے۔

چھنو کے رگ و پے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو اللہ آپ کو کامیاب کرے باجی! میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔''
''تھینکس چھنو۔''
''لو جی اصل بات آپ کو بتانا تو میں بھول ہی گئی۔ وہ جی کیا ہے کہ ابے نے فیقے کے ساتھ میری شادی کے دن رکھ دیے ہیں۔ یہ پیر چھوڑ کر اگلے پیر کو تیل لگے گا۔ میری خواہش ہے جی آپ میری شادی کو بہت اچھے طریقے سے انجوائے کرو جی۔''
شرم کی سرخی چہرے پر پھیلائے اپنے مخصوص لب و لہجے کے ساتھ وہ اسے نئی اطلاع دے رہی تھی۔
انزلہ کے لبوں پر دھیمی سی مسحور کن مسکراہٹ پھیل گئی۔
''ٹھیک ہے چھنو' جیسے تمہاری خوشی۔''
''شکریہ جی! آپ بہت اچھی ہو باجی! قسم سے۔''
وہ مسرور ہوئی تھی۔ انزلہ کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔
''تم بھی بہت اچھی ہو چھنو! بہت پیارے اور سادہ دل کی مالک۔ میری دعا ہے سوہنا رب تمہاری زندگی کے ہر پل کو سچی خوشیوں سے مالا مال کردے۔ آمین۔'' چھنو کا سر اس کی پُر خلوص دعا پر جھک گیا۔
''میری بھی آپ کے لیے یہی دعا ہے باجی! ویسے آپ برا نہ مانیں تو ایک سوال پوچھوں؟''
''ہوں۔''
''آپ کو...... کبھی پیار نہیں ہوا کسی لڑکے سے......؟''
انزلہ کو اس سے اتنے پرسنل سوال کی توقع نہیں تھی۔ تبھی ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ہنسی تھی۔
''نہیں چھنو اپنے لیے کوئی شہزادہ زمین پر اترا ہی نہیں۔''
اب وہ اسے کیا بتاتی کہ یونیورسٹی کے ابتدائی دنوں میں جن دو مقناطیسی نگاہوں نے اسے اپنے حصار میں باندھا تھا۔ ان نگاہوں کے مالک شخص کو اس کے اصل روپ میں دیکھ کر اس کے سارے خواب ٹوٹ کر چکنا چور ہو گئے تھے۔
''خیر مجھے ابھی تھوڑی دیر میں میران شاہ کے گھر جانا ہے۔ پھر شہر جاؤں گی تھوڑی دیر کے لیے تم دادی ماں کو بتا دینا میری فکر نہ کریں جلد واپس آجاؤں گی۔''
گہری سانس بھر کر اگلے ہی پل اس نے چھنو کو مطلع کیا تھا۔ مبادہ وہ کوئی اور پرسنل سوال نہ پوچھے۔ جسم اس وقت شدید تھکاوٹ کا شکار ہو رہا تھا' مگر اسے تھکنا نہیں تھا۔

❁❁❁

شجاع کے والد کی طبیعت ناساز تھی۔
اسے ایمرجنسی ایبروڈ جانا پڑ گیا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے امامہ کو اپنی بیٹی کا خیال رکھنے کی ہدایت کی تھی۔
اسی روز شام میں جب وہ گڑیا کے ساتھ کھیل رہی تھی فائزہ آپا اس سے ملنے چلی آئیں۔
''کیسی ہو امامہ......؟''
اس کے چہرے پر اداسی رقم تھی وہ نارمل انداز میں مسکرادی۔

"ٹھیک ہوں آپی' آپ سنائیں کیسی ہیں؟"

"ارے مجھے کیا ہونا ہے۔ سدا بہار ہوں۔"

مسکرانے کی کوشش میں سر جھکاتے ہوئے انہوں نے خود کو چھپانا چاہا تھا۔ پھر بولیں۔

"اباجی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اور مجھے دیکھو کیسی بدنصیب ہوں ان سے مل بھی نہیں سکتی۔"

امامہ دیکھ سکتی تھی باپ کی خود ساختہ خفگی نے انہیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

"تم نے اپنے بارے میں نہیں بتایا امامہ! کون ہو' کس خاندان سے' کس شہر سے ہو' یہ ملازمت کیوں اختیار کی؟"

اپنے آپ کو بہلانے کے لیے فوراً ہی امامہ کے کچھ کہنے سے پہلے انہوں نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔ امامہ کا دل اس پیاری مہربان شخصیت سے جھوٹ بولنے کو قطعاً نہیں چاہ رہا تھا' مگر وہ مجبور تھی۔ لہٰذا جو فرضی کہانی اس سے پہلے اس نے شجاع کو سنائی تھی وہی فائزہ آپا کو سنا دی۔

"بہت افسوس ہوا سن کر اس پھٹکار مارے دور میں اکیلی عورت کی کوئی زندگی نہیں تم نے کیا سوچا ہے اپنی آئندہ زندگی کے لیے؟"

وہ پُرخلوص تھیں امامہ نے آہستہ سے چہرہ پھیر لیا۔

"کچھ نہیں آپا میں نے کیا سوچنا ہے جو اللہ کی مرضی وہی میری مرضی۔"

"پھر بھی یہ پہاڑ سی زندگی یونہی تو بسر نہیں ہوگی ناں۔ میرا دل چاہتا ہے میں تمہاری شادی خود اپنے ہاتھوں سے اس شخص کے ساتھ کروں جو ساری زندگی تمہیں پلکوں پر بٹھا کر رکھے۔"

"چھوڑیں آپا۔ کچھ لوگوں کی قسمت میں شاید ٹھوکریں ہی ہوتی ہیں۔"

"نہیں امامہ! مایوسی کفر ہے' اگر تم محسوس نہ کرو میں اپنے دل کی بات کہوں۔"

اپنے بھائی کی خوشی کے لیے اس کے دل کا بھید پاکر' وہ شاید آج کچھ ٹھان کر آئی تھیں۔

امامہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"جی آپا! آپ کی بات محسوس کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی میں۔"

فائزہ آپا نے اس کی کھلی آفر پر ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر بولیں۔

"خدا جانتا ہے تم مجھے بہت عزیز ہو۔ کیوں؟ یہ میں نہیں جانتی مجھے غلط مت سمجھنا' شاید میری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو کبھی تم سے وہ سب نہ کہتی جو میں کہنے جا رہی ہوں۔"

وہ تمہید باندھ رہی تھیں اور اس بار امامہ کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔

"شجاع بہت اچھا مرد ہے امامہ! کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا ہے' یہ تو ثانیہ تھی جس نے اس جیسے ہیرے کی قدر نہیں کی۔ وگرنہ جتنا وہ عورت کی محبت کو ترسا ہوا ہے کوئی قدر دان لڑکی ہوتی تو پاؤں دھو دھو کر پیتی' اس کے علاوہ اپنی بیٹی سے بہت محبت کرتا ہے امامہ! اسے تمہارے ساتھ خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اس کی آنکھوں میں محبت کے جگنو چمکتے ہوئے دیکھے ہیں میں نے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں امامہ' ثانیہ سے اس کی علیحدگی کے بعد میں کتنی اذیت میں ہوں۔ مجھے ہر پل یہ احساس کچوکے لگاتا رہتا ہے کہ شاید مجھ سے کچھ غلط ہو گیا ہے۔"

اس بار فائزہ آپا کے لہجے میں نمی چھلکی تھی۔

امامہ نے بے چین ہو کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"تم بھری دنیا میں تنہا ہوناں امامہ! میرا بھائی بھی تنہا ہے۔ اپنی فیلڈ میں وہ جتنا بہادر ہے اپنی اتنی زندگی میں اتنا ہی ٹوٹا ہوا ہے۔ اندر سے اسے کبھی عورت کا پیار نہیں ملا۔ امامہ...... پلیز اسے سمیٹ لو...... اسے سنبھال لو...... نہیں تو میں مر جاؤں گی۔"

انہوں نے اپنے دل کی بات بچوں کی طرح روتے ہوئے کہہ ڈالی تھی۔ امامہ پریشان ہوگئی؟

"آپا...... مم...... میں کیسے......؟"

"تم سنبھال سکتی ہو امامہ! تم ہی اسے وہ پیار دے سکتی ہو جس کا وہ ترسا ہوا ہے۔ تم بھری دنیا میں تنہا ہو۔ رشتوں اور محبتوں کی ترسی ہوئی ہو۔ تم نے اپنوں سے دل پر چوٹ کھائی ہے اور جس نے کسی نہ کسی حادثے سے چوٹ کھائی ہو۔ وہ اتنا حساس ضرور ہو جاتا ہے کہ پھر اپنی وجہ سے کسی دوسرے کو دکھ نہیں دیتا۔ پلیز امامہ! ایک بہن کی آرزوؤں کا مان رکھ لو پلیز......"

اس بار فائزہ آپا نے اس کے ہاتھ تھامے تھے۔

امامہ کو لگا جیسے وہ کچھ بھی بولنے کی صلاحیت کھو چکی ہو۔

"تم بہت خوش رہو گی امامہ! اگر نہ رہو تو میں وعدہ کرتی ہوں تم سے تم جب چاہو گی ہم سے اپنا دامن چھڑا کر اپنی مرضی کی دنیا میں واپس جا سکتی ہو۔"

اس کی خاموشی پر انہوں نے مزید آپشن دیا تھا اور یہی بات دل کو لگی تھی امامہ کے۔ اسے عزت سے سر اٹھا کر جینے کے لیے ایک نام کی ضرورت بہرحال تھی۔ مگر اس کی جو حیثیت تھی اس حیثیت میں وہ شجاع جیسے قابل اور شان دار بندے کی رفاقت کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اس کے تصور، سوچ اور اوقات سے بہت بڑھ کر تھا۔

اس کا سر جھکا تھا اور فائزہ آپا نے اسے "ہاں" کا سگنل سمجھ کر خوشی سے اس کی پیشانی چوم لی۔ امامہ ان سے سوچنے کے لیے ٹائم لینا چاہتی تھی' مگر انہوں نے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ دیا اور اپنے ہاتھ کے درمیانی انگلی سے ایک خوب صورت رنگ نکال کر اس کی انگلی میں پہنا دی یوں جیسے کہ وہ سب کچھ پہلے ہی پلان کیے بیٹھی ہوں۔

شجاع واپس آیا تو قدرت اللہ صاحب اس کے ہمراہ تھے۔

دیارِ غیر میں مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے اور کچھ رشتوں کی بے اعتنائی نے انہیں مزید توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یوں کہ اب ان کی طبیعت کی چڑچڑاہٹ بھی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ بھرا بھرا جسم بھی کمزور ہو کر رہ گیا تھا۔

شجاع انہیں اپنے مضبوط بازوؤں کے سہارے' ان کے بیڈ روم تک لایا تھا۔ تبھی گڑیا نے دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے خود کو لپٹا لیا۔ امامہ دیکھ سکتی تھی کہ اس کا موڈ قدرے فریش تھا۔ شاید تبھی گڑیا کو پیار کر کے بانہوں میں بھرنے کے بعد اس نے فوری فائزہ آپا کو کال کر کے اپنی گھر موجودگی کی اطلاع دی تھی۔

فائزہ آپا آئیں تو ان کے شوہر اور بچے بھی ان کے ہمراہ تھے۔

اس بار شجاع کے گھر میں ان کی آمد پر قدرت اللہ صاحب نے کسی خفگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ بلکہ

انہیں دیکھتے ہی وہ بے بسی سے رو پڑے تھے جس پر فائزہ آپا بھی بھیگی پلکوں کے ساتھ لپک کر ان کی طرف بڑھیں اور باپ کی آغوش میں منہ چھپا کر دیر تک روتی رہیں۔

برسوں بعد دلوں پر چھائی کدورتوں کے بادل چھٹے تھے۔ سب اتنے خوش تھے کہ حد نہیں۔ امامہ اس خوب صورت مکمل منظر سے نگاہ چراتی باہر لان کی طرف چلی آئی۔ خوش نما پھول پودوں کے سوا اس کا درد محسوس کرنے والا وہاں اور تھا ہی کون......؟ لہٰذا جب بھی دل پر آنسوؤں کا بوجھ بڑھتا وہ پھول پودوں کے بیچ چلی آتی اور ان سے باتیں کر کے خود کو ہلکا کرتی۔ اس لمحے اس کا دل ٹوٹ کر رونے کی خواہش کر رہا تھا۔ لہٰذا گھٹنوں پر سر ٹکا کر خوش نما پھولوں کو دیکھتے ہوئے اس نے چپ چاپ ڈھیروں آنسو بہا ڈالے۔

رونے کا یہ سلسلہ جانے کب تک جاری رہتا کہ اچانک اپنے پیچھے تیز قدموں کی آہٹ سن کر اس نے جلدی سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

❋❋❋

''السلام علیکم شاہ زر صاحب۔''

شاہ زر کو ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے دیکھ کر عبدالصمد تیزی سے اس کی طرف بڑھا تھا' مگر اس کی نگاہیں اس پر نہیں تھیں۔ وہ اس کے پیچھے سر جھکائے کھڑی انوشہ کو دیکھ رہا تھا جو غالباً نہیں یقیناً رو رہی تھی۔

''وعلیکم السلام! سامان پیک ہو گیا......؟''

''جی ہاں کچھ ہی دیر میں پہنچ رہا ہے یہاں۔''

عبدالصمد کے لہجے میں وہ عاجزی اور تشکر تھا۔ جو ہڈی ملنے کے بعد کتے کے انداز میں قسائی کے لیے ہوتا ہے۔ شاہ زر اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

''ٹھیک ہے اوپر کا پورشن خالی کروا دیا ہے میں نے' میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے آپ کو یہاں کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''

عبدالصمد سے زیادہ شاید وہ انوشہ کی تسلی کروا رہا تھا۔

عبدالصمد خوشامدی انداز میں مسکرا دیا۔

''آپ کے ہوتے کوئی مسئلہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں۔''

''نہیں شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اپنی فیملی کا خیال رکھیں آپ۔ آیئے کمرہ دکھا دوں آپ کو۔'' قطعی نارمل انداز میں کہہ کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

عبدالصمد نے فوراً اس کی تقلید کی تھی' مگر انوشہ پتھر بنی وہیں کھڑی رہی۔ اس کا بیٹا ابھی تک سو رہا تھا۔ شاہ زر' عبدالصمد کو کمرا دکھا کر واپس آیا تو اسے وہیں کھڑا دیکھ کر بے ساختہ اس کی طرف بڑھ آیا۔

''اپنے کمرے میں جاؤ انوشہ۔''

انوشہ نے سر اٹھا کر یوں نفرت سے اس کی طرف دیکھا جیسے اسے جلا کر بھسم ہی کر ڈالے گی۔

''کاش...... مجھے اپنی کسی ایک دعا کی قبولیت کا یقین ہوتا تو میں ایک دعا تمہاری موت کے

مانگی۔"

"مانگ لینا' ابھی بغیر کسی ٹینشن کے کمرے میں جاؤ اور آرام کرو پلیز۔"

اسے جیسے اس کی نفرت سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

انوشہ آنسو پیتی عبدالصمد کے نیچے آنے سے قبل ہی آگے بڑھ گئی۔

اگلے تین چار روز میں اس نے خود کو یوں اپنے کمرے کی دیواروں تک محدود کر لیا تھا کہ شاہ زر کی خواہش کے باوجود اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکا۔

اس روز اس کی طبیعت قدرے ناساز تھی' لہٰذا وہ آفس سے جلد اٹھ آیا تھا۔ انوشہ کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس جیسا مصروف بندہ اپنے معمول کے ٹائم سے ہٹ کر یوں وقت سے پہلے اچانک گھر آ سکتا ہے۔

عبدالصمد کی روٹین میں وہاں آ کر بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اب بھی آدھی رات یا اکثر رات بھر گھر سے باہر رہنا اس کا روز کا معمول تھا۔ انوشہ کا دم کمرے کی چار دیواری میں مسلسل تین چار دن رہنے سے گھٹ رہا تھا لہٰذا اپنے بیٹے کو سلا کر وہ کمرے سے باہر نیچے ہال کمرے کو جاتی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ اندر اتنی گھٹن تھی کہ ہزار ضبط کے باوجود وہ اپنی سسکیوں کا گلا نہ گھونٹ سکی تھی۔

شاہ زر گاڑی گیراج میں کھڑی کرنے کے بعد سست قدم اٹھاتا ہال کمرے میں داخل ہوا تو اسے سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

شام کے پھیلتے دھندلکوں میں' بکھری بکھری سی وہ لڑکی شام کا حصہ ہی لگ رہی تھی۔ اس کے قدم نادانستگی میں اس کی طرف اٹھے تھے' مگر وہ اپنے دکھ میں کچھ یوں بے حال و مگن تھی کہ قالین پر اٹھتے اس کے قدموں کی آہٹ کو محسوس ہی نہ کر سکی۔

شاہ زر نے عین اس کے سر پر پہنچ کر اپنا ہاتھ بہت جذب سے اس کے کندھے پر رکھا تھا۔

"انوشہ......"

❋❋❋

آؤ جانچ لیتے ہیں
درد کے ترازو پر
کس کا غم کہاں تک ہے؟
شدتیں کہاں تک ہیں
کچھ عزیز لوگوں سے' پوچھنا تو پڑتا ہے
آج کل محبت کی قیمتیں کہاں تک ہیں؟
ایک شام آ جاؤ' کھل کے حالِ دل کہہ لیں
کون جانے سانسوں کی مہلتیں کہاں تک ہیں؟

انوشہ......اس کی آواز میں تڑپ تھی مگر انوشہ نے اس کے ہاتھ کے لمس سے چونک کر سر گھٹنوں سے اُٹھایا تھا۔

"کیوں رو رہی ہو انوشہ......؟"

اس کے لہجے میں عجیب سی تھکن اور کسک تھی۔
انوشہ تنفر سے اس کا ہاتھ پرے جھٹکتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔
''انوشہ.....'' وہ چلّایا تھا اور چلّا کر اس کا آنچل اپنی گرفت میں لیا تھا۔
''ایسا مت کرو یوں میرے ساتھ' مت مارو بے بسی کی موت مجھے' پلیز۔'' انوشہ کی طرح اس کے دل کا غبار بھی حد سے بڑھ گیا تھا۔
تبھی وہ پلٹی تھی۔
''میرا آنچل چھوڑو شاہ زر.....''
''نہیں.....اپنے آنسوؤں کی وضاحت کرو پہلے۔''
''کیوں.....؟ جس گھٹیا انسان کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی' اسے کیوں اپنے ہنسنے رونے کی وضاحت دوں.....تمہاری چھت تلے آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں غلام ہوگئی ہوں تمہاری' تم جو چاہو گے سلوک کرو گے میرے ساتھ.....''
اس کی نفرت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔
شاہ زر کے اندر کا اضطراب مزید بڑھ کر رہ گیا۔
''بہت سیاہ بخت ہوں میں.....جس شخص کے تصور سے بھی نفرت ہے مجھے' میری تقدیر نے اسی شخص کی چوکھٹ پر حقیر کر کے لا پھینکا ہے مجھے۔''
اگلے ہی پل اپنا آنچل اس کی گرفت سے نکالتے ہوئے اس نے آنسو پیئے تھے' جب شاہ زر نے اپنے ہاتھ زبردستی اس کے کندھوں پر جما دیئے۔
''اپنے درد کا اتنا ڈھنڈورا پیٹتی ہو' میرا اضطراب کیوں نظر نہیں آتا تمہیں.....؟ منع کیا تھا میں نے' مت شادی کرو اس شخص کے ساتھ۔ وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔ مگر تم نے میری نہیں سنی' صرف مجھے اذیت دینے کے لیے زبردستی شادی رچالی تم نے اس کے ساتھ۔ پھر اب گلہ کیوں کر رہی ہو' میں نے جا کر پاؤں نہیں پکڑے تھے اس کے کہ وہ تمہیں یہاں لائے' میری آنکھوں کے سامنے.....اور میں پل پل' صبح و شام اذیت کی سولی پر لٹکوں' خود اپنے ضبط کا امتحان لیتا پھروں.....''
اس کے ہاتھوں اور لہجے میں سختی آئی تھی۔ جب کہ آنکھیں جیسے تندور کی مانند جل رہی تھیں۔
''ایک غلطی.....صرف ایک غلطی.....صرف ایک کبیرہ گناہ سرزد ہوا مجھ سے' اور تم نے' تم نے مجھے انسانیت کے درجے سے گرا دیا۔ کبھی میرے نقصان پر بھی نگاہ ڈالو انوشہ! کیا کچھ نہیں کھویا میں نے' اپنی جان سے پیاری ماں' اپنی لاڈلی بہن' اپنا پیار.....اپنا بچہ.....اور اب' اب شاید بیوی بھی..... کیا رہا ہے میرے پاس۔ ایک لمحے کے سکون سے بھی ترسا دیا ہے تم نے مجھے۔''
اس کا لہجہ اب ٹوٹ رہا تھا۔ انوشہ خاموش کھڑی رہی۔
''تمہاری نفرت کا ملال نہیں ہے مجھے' کیونکہ میں جانتا ہوں ہم مردوں کا یہ معاشرہ' اپنے لیے ایک وقت بیس عورتوں سے افیئر چلا کر بھی معتبر رہتا ہے' سر آنکھوں پر رہتا ہے۔ مگر کسی لڑکی' کسی عورت کے دامن پر لگا ایک معمولی سا داغ بھی برداشت نہیں کر سکتے ہم۔ تمہاری کسک' تمہاری اذیت میں جانتا ہوں انوشہ! میں نے تم سے تمہاری خوشیاں چھینی ہیں' عزت اور اعتماد سے سر اُٹھا کر

کا اختیار چھینا ہے۔ میں مانتا ہوں' میری وجہ سے بہت دُکھ اُٹھائے ہیں تم نے' کیا کیا نہیں سنا' کیا کیا نہیں سہا' دنیا کی تُھو تُھو' میری نگاہ یا احساس سے اوجھل نہیں مگر میں تم سے دنیا کی بات نہیں کرنا چاہتا انوشہ! اپنی بات کرنا چاہتا ہوں' تم' تم مجھ سے میری بات سنو پلیز......"

وہ جذباتی ہو رہا تھا' انوشہ کی خاموشی کا قفل نہیں ٹوٹا۔

"یہاں آؤ انوشہ...... آج میں تمہیں وہ سب بتاتا ہوں' جو شاید کبھی اپنے آپ سے بھی نہ کہہ سکا ہوں......"

اس کا ہاتھ تھام کر تقریباً کھینچتے ہوئے وہ اسے ہال کمرے میں رکھے صوفے تک لے آیا تھا' اس کے کندھوں پر دباؤ بڑھا کر زبردستی اسے صوفے پر بٹھانے کے بعد خود اس کے سامنے قالین پر بیٹھ گیا۔

"تمہیں شاید یہ جان کر شاک لگے انوشہ کہ میں نے تمہیں اپنے انتقام کے لیے صرف اغواء کیا تھا اس سے آگے جو کچھ ہوا' وہ میرے انتقام کا حصہ نہیں تھا۔"

نظریں چُرائے اس نے واقعی انکشاف کیا تھا اس پر۔

انوشہ کی آنکھوں میں حیرانی سمٹ آئی تاہم اس نے لب نہیں کھولے تھے۔

شاہ زراب براہِ راست اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"پتا ہے انوشہ! یونیورسٹی لائف میں جب تم مائیگریشن کروا کر ہماری کلاس میں آئی تھیں اور میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تو میرے دل نے ایک بیٹ مِس کی تھی۔ حالانکہ اس وقت بُریرہ کی محبت میری زندگی میں شامل تھی' مگر اس سے ملتے ہوئے کبھی میرا دل ویسے نہیں دھڑکا' جیسے تمہیں مقابل پا کر دھڑکتا تھا' بظاہر میں نفرت کرتا تھا تم سے۔ مگر حقیقتاً جب سرزمان تمہیں خاص نظروں سے دیکھتے تو میرا بس نہیں چلتا تھا کہ انہیں شوٹ کر ڈالتا یا تمہیں اُٹھا کر ان کی پہنچ سے کہیں دور پھینک دیتا۔ میرا خون مسلسل جلنے لگا تھا' بھوک' پیاس رات کی نیند سب اُڑ گئی تھی۔ عجیب بے بسی تھی اندر ہی اندر لڑ رہا تھا میں اور پھر...... پھر شاید قدرت کو ترس آ گیا مجھ پر...... اور تم سائلہ آنٹی کی سوتیلی بیٹی کی حیثیت سے میرے سامنے آ گئیں۔ تمہارے بارے میں سائلہ آنٹی نے میری نگاہوں میں تمہارا جو امیج بنایا تھا وہ بہت غلط اور گھٹیا تھا مگر مجھے جیسے کسی بات کی کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ میں تو اپنی آگ میں جل رہا تھا اور تمہیں بھی جلانے کی خواہش رکھتا تھا' پر ہمیشہ ویسا نہیں ہوتا انوشہ! جیسا ہم انسان چاہتے ہیں۔ ابھی خواب پوری طرح دسترس میں آئے ہی نہیں تھے کہ عین نکاح والے روز بہن کی رسوائی اور پھر ماں کی المناک موت کا درد سہنا پڑ گیا مجھے۔ خدا کی قسم مما کی موت کی اطلاع سُن کر میرا بس نہ چلتا تھا کہ ایک ٹھوکر میں ساری دنیا ہلا کر رکھ دوں' یا خود کو شوٹ کر لوں۔ ایک طرح سے پاگل ہو کر رہ گیا تھا میں اور اسی پاگل پن میں تمہیں بھی اپنے غصے کی بھینٹ چڑھا بیٹھا' میرا ارادہ صرف تمہیں رسوا کرنا تھا مگر پتا نہیں کب یہ خواہش میرے نفس پر حاوی ہو گئی کہ تمہیں صرف اپنا بنا کے رکھنا ہے اور اس کے لیے جو کچھ قطعی نادانستگی میں مجھ سے ہوا' اس سے ہٹ کر دوسرا کوئی راستہ ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر وہ نفرت تھی تو اس میں یہ خوف کیسا تھا کہ تم کسی اور کی زندگی کا حصہ نہ بن جاؤ' کہیں کوئی اور تمہیں مجھ سے چھین نہ لے' مجھے کچھ نہیں پتا انوشہ کہ یہ سب کیوں ہوا۔

مگر اس ایک غلط قدم نے میری ساری زندگی کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔"

قالین پر اس کے قدموں میں بیٹھا وہ بتا رہا تھا مگر انوشہ جیسے کچھ سُن ہی نہیں رہی تھی' بس آنسو تھے جو تیزی سے گالوں پر بہتے جا رہے تھے۔

"مجھے معاف کر دو انوشہ...... بہت درد سہہ لیا ہے میں نے' بہت بوجھ ڈال لیا اپنے ضمیر پر' اب پلیز رہائی دے دو۔ یہ شخص' یہ تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکتا' دیوالیہ ہو گیا ہے اس کی کمپنی کا۔ پرائی عورتوں کے چکروں اور اپنی کم عقلی کے باعث غلط فیصلوں نے کہیں کا نہیں چھوڑا ہے اسے۔ ابھی بھی بارہ کروڑ کا قرض واجب ہے اس پر۔ اسی لیے اپنا گھر اور دیگر پراپرٹی مجبوراً نیلام کر رہا ہے' کیونکہ لوگوں کے پاس اس کے بوگس چیک ہیں۔ جو اسے ساری عمر جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلے رکھ سکتے ہیں' یہ شخص تمہارے لائق نہیں ہے' سو پلیز چھوڑ دو اِسے۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہارا پورا خیال رکھوں گا' جیسے تم کہو گی ویسے ہی کروں گا' پلیز انوشہ...... پلیز......"

اب وہ اس کی مِنّت کر رہا تھا۔ انوشہ کی آنکھیں جیسے غصے سے دہک اُٹھیں۔ بہت نفرت سے اس نے شاہ زر کو پرے دھکیلا تھا۔

"شٹ اپ...... کھلونا سمجھتے ہو تم مجھے؟ جب چاہو چھوڑ کر بکھیر دیا اور جب چاہو ہاتھ بڑھا کر سمیٹ لیا۔ یاد رکھو مسٹر شاہ زر' عورت اپنی تذلیل کرنے والے مرد کو کبھی معاف نہیں کر سکتی' جس شخص نے اس وقت مجھے اپنایا جب میرے اپنوں نے بھی مجھے دھتکار دیا تھا اس شخص کو چھوڑ دوں؟ نیور' وہ میری جان بھی لے لے' چاہے کانٹوں کے بستر پر ہی کیوں نہ رکھے' میری نسوانیت اس سے بے وفائی کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ مرتے دم تک میری ہر سانس اس کی وفادار رہے گی' سنا تم نے......"

وہی خفگی' وہی غصہ' وہی نفرت' شاہ زر گم صم سا دیکھتا رہ گیا اور وہ ٹِک ٹِک کرتی سیڑھیاں چڑھ کر دوبارہ اپنے کمرے میں قید ہو گئی!

"میری اُلفت سے بھی سچی رہی نفرت اس کی"

❋❋❋

قدموں کی آہٹ پر امامہ نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا جہاں ملازم مؤدب انداز میں کھڑا جیسے اس کے متوجہ ہونے کا ہی منتظر تھا۔

"بٹیا! آپ کو صاحب اندر بلا رہے ہیں۔"

پیغام آیا تھا۔

وہ سراثبات میں ہلا کر چہرہ اچھی طرح رگڑ کر صاف کرتی اندر ہال کمرے میں چلی آئی جہاں اس وقت وہ سب لوگ بیٹھے تھے۔

"لیجیے بابا' آ گئیں محترمہ' جنہوں نے آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے بعد آپ کی طرح ہی آپ کے پھول پودوں کا خیال رکھا ہے۔"

شجاع اسے دیکھتے ہی بولا تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے آگے بڑھ آئی۔

"بابا تم سے ملنا چاہ رہے تھے امامہ! آگے بڑھ کر پیار لے لو۔"

اگلے ہی پل فائزہ آپی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا' وہ حیران سی مزید آگے آئی تو اب قدرت اللہ صاحب نے اپنا پُر شفقت ہاتھ اس کے سر پر جما دیا۔

''جیتی رہو......''

بہت مدھم لہجے میں دعا دی تھی۔ شجاع کے لبوں پر مسرور کن مسکراہٹ بکھر گئی۔

اسی وقت فائزہ آپی شجاع سے مخاطب ہوئی تھیں۔

''شجاع...... ذرا دو منٹ کے لیے کچن میں آنا' مجھے کچھ بات کرنی ہے تم سے۔''

ان کے میاں اور بچے امامہ سے باتوں میں لگ گئے تھے لہٰذا موقع دیکھ کر انہوں نے آہستہ سے شجاع کے کان میں کہہ ڈالا' جواباً وہ حیران نگاہوں سے انہیں دیکھتا چُپ چاپ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''جی آپا' حکم......؟''

کچن میں آ کر لب کھولے تھے اس نے' جب وہ بولیں۔

''تمہیں پتا ہے آج شام کیا ہونے والا ہے؟''

''نہیں......''

وہ حیران ہوا تھا اور فائزہ آپی ہنسی تھی۔

''بدھو ہو تم اور کچھ نہیں...... ارے نکاح ہو رہا ہے تمہارا اور وہ بھی سب کی مشترکہ من پسند لڑکی سے۔''

''کیا......'' وہ اُچھل ہی تو پڑا تھا۔

''جی جناب...... جسے انوائیٹ کرنا ہے کرلو' جو ارینج منٹ کرنی ہے جلدی کرلو' صرف چند گھنٹے ہیں تمہارے پاس' باقی تیاری میں نے کرلی ہے۔''

وہ بے حد خوش تھیں۔ شجاع پریشان ہو کر رہ گیا۔

''مگر آپا......''

''ارے اگر مگر کو مارو گولی...... لڑکی تمہاری دیکھی بھالی ہے۔ پھر بھی پسند نہ آئے تو عین نکاح کے وقت بھی انکار کرسکتے ہو' اسے بہرحال اس کی اپنی رضامندی کے ساتھ راضی کرلیا ہے میں نے اب چلو شاباش...... تیاری کرو۔''

ان کی آنکھیں جیسے چمک رہی تھیں۔

شجاع قدرے حیرانی سے انہیں دیکھتا مسکرا دیا۔

''ریئلی......؟''

''ہوں......''

''او...... یو آر ریئلی ویری گریٹ آپا......''

انہیں کندھوں سے تھام کر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے وہ خوش ہوا تھا۔ جواب میں فائزہ آپا کے اندر تک جیسے سکون کی لہر اُتر گئی۔

❋❋❋

''ہیلو ارسلان......''

کپکپاتی انگلیوں سے شاید آخری بار ارسلان حیدر کو کال ملاتے ہوئے وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔
ابھی تھوڑی دیر پہلے بیوٹیشن آ کر اسے بہت اچھے طریقے سے تیار کر گئی تھی۔ آئینے میں اس کا اپنا سراپا اس سے پہچانا نہیں جا رہا تھا' مگر یہ سجاوٹ کیسی سجاوٹ تھی؟ اگر اسے سراہنے والا من کا میت ہی نہیں تھا تو!

لڑکیاں "محبت" کے معاملے میں محض جذباتی نہیں ہوتیں۔ "پاگل" ہوتی ہیں' وہ بھی ایک غلط انسان کی "اندھی محبت" میں پاگل تھی۔

قدرت کے "بڑھ کر" نوازنے پر اس کا دل اپنے رب کا شکر گزار نہیں تھا بلکہ کچھ کھو دینے کے غم و احساس سے پھٹ رہا تھا۔ وہ پاگل ہی تو تھی۔ جو "ہیرا" پا کر ایک "پتھر" کے کھو دینے کا ماتم کر رہی تھی۔

ارسلان حیدر نے سیل فون سے ابھرتی اس کی نم آواز پر کن انکھیوں سے کمرے میں موجود رُحاب کو دیکھا پھر واش روم میں گھس آیا۔

"ہوں بولو......"

"ارسلان......ارسلان میری شادی ہو رہی ہے۔"

"وھاٹ......"

لہجہ ممکنہ حد تک دھیما کیے وہ جیسے اس کی اطلاع پر اُچھلا تھا۔

"ہاں ارسلان! تمہاری محبت کے امتحان میں سرخرو ہوتے ہوتے' دیکھو آج روح کے ساتھ ساتھ اپنا جسم بھی رہن رکھ دیا ہے میں نے......"

میک اپ کی پروا کیے بغیر وہ بلک رہی تھی۔

دوسری طرف ارسلان تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

"کس سے ہو رہی ہے شادی؟"

"شجاع حسن سے......"

"وہاٹ؟"

دوسرا شدید جھٹکا لگا تھا اسے' امامہ کے درد میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"ہاں ارسلان......میرے جھوٹ نے کہیں کا نہیں چھوڑا مجھے......"

"اِٹس او کے۔ میں تمہارے جذبات سمجھتا ہوں' مگر اس میں اتنا رونے والی کون سی بات ہے' شادی ہی کر رہا ہے ناں تم سے' کوئی پھندا تو گلے میں فٹ نہیں کروا رہا۔ ہو سکتا ہے جو کام اب تک تم سے نہیں ہو سکا' وہ شادی کے بعد اس کا اعتماد جیت کر ہو جائے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

امامہ کو لگا جیسے ایک پل میں اس کی محبت کا تاج محل دھڑام سے اس پر آ گرا ہو۔ اس شخص کو ابھی بھی صرف اپنے مطلب سے غرض تھی' اس کے کھو جانے یا پرایا ہو جانے کا کوئی ملال نہیں تھا۔

کیسی محبت ہے اس کی' جس پر اپنا آپ وار بیٹھی تھی وہ۔ یہ کیسا روپ تھا "اندھی محبت" کا جس نے اسے فنا کر ڈالا تھا۔ امامہ کو لگا جیسے وہ اپنی محبت کی منہدم عمارت پر سُن بیٹھی رو رہی ہو۔

اِسی لمحے فائزہ آپی اندر آئی تھیں اور اسے روتے دیکھ کر پریشان ہو اُٹھیں۔

"ارے......تم رو رہی ہو امامہ......؟"

امامہ نے آنسوؤں بھری نگاہیں اٹھا کر غائب دماغی سے انہیں دیکھا اور جلدی سے سیل فون اٹھا کر تکیے کے نیچے چھپا دیا۔

"موقع ہی ایسا ہے چندا' ہر لڑکی کو اس موقع پر اپنی ماں' اپنے گھر والے ضرور یاد آتے ہیں' خیر امامت...... میں ہوں ناں تمہاری ماں' تمہاری بڑی بہن' تمہاری دوست' سب کچھ......"

اس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے جونہی انہوں نے کہا امامہ ان کے گلے لگ کر اتنی شدت سے روئی کہ دل کا ہر درد آنسوؤں میں بہہ گیا۔

"بس چپ کر جاؤ میری جان! شجاع کے اس میک اپ کے لیے دیئے گئے سارے پیسے تو سمجھو ضائع کر دیئے تم نے۔" مسکراتے ہوئے انہوں نے اسے بہلانا چاہا تھا۔ امامہ نے جلدی سے آنسو صاف کر لیے۔ جس پر وہ کھلکھلا اٹھیں۔

"دیکھا کتنا خیال ہے میاں کے پیسوں کا' جگ جگ جیو میری جان اور اب چلو باہر چلتے ہیں۔ مولوی صاحب آ گئے ہیں۔ شجاع کے سب گیسٹ بھی شدت سے تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔"

وہ شاید اسی مقصد کے لیے کمرے میں آئی تھیں۔

امامہ نے خود کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

باہر وسیع ہال کمرے میں مہمانوں کے ساتھ ساتھ خود شجاع کی نگاہیں بھی بے صبری سے اس کی منتظر تھیں۔ پولیس کی ایک بھاری نفری وردی میں ملبوس وہاں مختلف امور کی نگرانی کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ فائزہ آپا کے سہارے سست قدم اٹھاتے ہوئے صوفے پر شجاع کے پہلو میں آ بیٹھی۔ اس کی گود میں بیٹھی عیشاء خوب چہک رہی تھی۔

نکاح کا مرحلہ جیسے ہی طے پایا' مبارک بادوں کا شور بلند ہو گیا۔ شجاع ازحد مسرور انداز میں اٹھ کر اپنے دوستوں اور آفیسرز سے گلے مل رہا تھا۔ جب کہ امامہ سر جھکائے یوں سُن بیٹھی تھی جیسے ابھی ابھی اس نے نکاح نامے پر نہیں۔ اپنی موت کے پروانے پر دستخط کیے ہوں۔

گڑیا اب شجاع کی گود سے نکل کر اس کے پہلو میں جڑ کر آ بیٹھی تھی۔

سب کتنے خوش تھے۔ اس کی ایک چھوٹی سی قربانی نے کتنے چہروں کو مسرت بخش دی تھی' سب اسے سراہ رہے تھے' اس کے بے مثال حسن کی تعریف کر رہے تھے' اور شجاع یہ تعریفیں یوں وصول کر رہا تھا جیسے یہ اس کا حق ہو۔

رات اب بھاگ رہی تھی۔

وہ شدید تھکاوٹ محسوس کرتے ہوئے تھوڑا سا کھانا کھا کر' گڑیا کو ساتھ لیے فائزہ آپی سے التجا کر کے بیڈ روم میں آ گئی تھی جسے شجاع کے چند بہت قریبی دوستوں نے قدرتی پھولوں سے یوں سجا رکھا تھا کہ وہ مسحور سی دیکھتی رہی۔

گڑیا کا بس نہ چل رہا تھا کہ اسے چوم چوم کر مار ڈالتی۔ باہر فنکشن چل رہا تھا' خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور اندر وہ ننھی سی بچی کبھی اس کی چوڑیوں' کبھی آنچل' کبھی جھمکوں سے کھیلتے ہوئے اپنی مسرت کا اظہار کر رہی تھی۔

رات کے تقریباً تین بج رہے تھے جب شجاع مہمانوں کو رخصت کر کے فائزہ آپی کی فیملی اور

قدرت اللہ صاحب کے درمیان سے اُٹھ کرانہیں آرام کرنے کی تاکید کرتا اپنے کمرے میں آیا تھا۔

❁❁❁

"گڑنالوں عشق میٹھا...... ہائے ہائے' رباّ لگ نہ کسی نوں جاوے......

گڑنالوں عشق میٹھا......

بیس مرلے پر پھیلے کشادہ صحن میں گاؤں بھر سے عورتیں اور نوجوان لڑکیاں اکٹھی ہوئیں۔ چھنو کے مہندی کے فنکشن میں اپنی دیہاتی ریت کے مطابق رنگ بھر رہی تھیں۔ انزلہ قدرے فاصلے پر چھنو کے ساتھ بیٹھی' صحن میں رکھی پرات اور ڈھولک کے قریب ناچتی دونوں لڑکیوں کو دل چسپ نگاہوں سے دیکھے گئی۔

ہائے ہائے......

"میری پاویں جند کڈھ لے' میرے یارنوں مندانہ بولیں......"

"میری پاویں جند کڈھ لے......"

وہ جان ہی نہ سکی کہ سانول شاہ کی گہری نگاہیں کس بے خوفی سے اس کے چہرے کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ ٹیپ پر گیت فل والیم سے گونج رہا تھا اور نیچے دری پر بیٹھی چھنو کی سہیلیاں خوب ذوق وشوق سے ڈھولک پیٹ رہی تھیں' جب کہ دو خوب صورت لڑکیاں بہت اچھا ڈانس بھی کررہی تھیں۔ سانول چونکہ انتظامات کروارہا تھا لہٰذا اس پر گھر کے اندر آنے پر کوئی پابندی نہیں تھی' بظاہر وہ چھنو کی ماں سے باتیں کررہا تھا مگر اس کی نگاہیں انزلہ شاہ کے چہرے پر تھیں جو تالیاں پیٹتے ہوئے بہت مسرور کن انداز میں مسکرارہی تھی۔

گُونالوں عشق میٹھا...... گیت کا ایک ایک بول سانول کو اپنے دل کی آواز لگ رہا تھا۔

شرماتی لجاتی چھنو اب اپنی برادری کی شادی شدہ خواتین کے درمیان گھر گئی تھی' جو اس کے ہاتھ پر رکھے نوٹ پر ذرا ذرا سی مہندی رکھتے ہوئے باری باری اس کا منہ میٹھا کروارہی تھیں۔ انزلہ اس کے پہلو سے اُٹھ کر سائیڈ پر آ کھڑی ہوئی۔

سبھی اپنی مستی میں گم تھے' تبھی وہ کچھ سوچتا اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تھا۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو آج' قسم سے۔"

سرگوشیانہ انداز میں کہتے ہوئے اس نے انزلہ کا نازک سا ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں دبالیا تھا۔ انزلہ جیسے کرنٹ کھا کر رہ گئی۔

"تم......؟"

"ہوں...... تمہاری کشش کھینچ لائی' ورنہ میں یوں معمولی لوگوں کے فنکشنز میں شرکت نہیں کرتا۔" انزلہ کی طرح اس کا لہجہ بھی دھیما تھا۔ وہ غصے سے بل کھا کر رہ گئی۔

"ہاتھ چھوڑو میرا......"

"ہمت ہے تو چھڑالو' میں نے چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا۔"

کیسی بے خوفی اور بے نیازی تھی لہجے میں۔ انزلہ کا بس نہ چلتا تھا کہ تھپڑ دے مارتی اس کے

ے پر۔ ''تم حد سے بڑھ رہے ہو سانول شاہ۔''
''کہاں بڑھا ہوں میری انزؔ حد سے بڑھنے کہاں دیتی ہو تم مجھے۔'' موقع کی مناسبت سے اس کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔

انزلہ مچل کر رہ گئی۔

''ایک شرط پر ہاتھ چھوڑ سکتا ہوں۔''

اگلے ہی پل وہ اسے آفر کر رہا تھا۔ انزلہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''بولو......''

''اُف......ایک تو غصہ بہت آتا ہے تمہیں، خیر میں چھت پر جا رہا ہوں، ابھی میرے پیچھے آ کر مجھے ملو۔''

''ہرگز نہیں......''

''تو ٹھیک ہے پھر، یونہی سہی، میں تو انجوائے کر رہا ہوں۔''

وہ ضدی تھا انتہا درجے کا ضدی اور یہ بات انزلہ بہت اچھی طرح جانتی تھی، تبھی غصے سے اسے گہری نگاہ سے دیکھتے ہوئے اس کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔

❋❋❋

گڑیا امامہ سے باتیں کرتے کرتے، اسی کی گود میں سو چکی تھی۔ جب کہ وہ خود بھی شاید شدید تھکاوٹ کی شکار ہو کر، گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیڈ پر بیٹھی بیٹھی سو گئی تھی، یوں اس پوزیشن میں کہ اس کی لمبی گردن بیڈ کراؤن سے ٹیک کے باعث خوب نمایاں ہو رہی تھی۔ عجیب سے احساسات میں گھرا وہ اپنے بیڈ کے قریب آیا تھا جس کی اب وہ موصوفہ بھی بلاشرکت غیرے حصہ دار بن گئی تھیں۔

جانے یہ اس کی نگاہوں کا حُسن تھا یا وہ واقعی اس قدر حسین تھی کہ شجاع اسے دیکھتے ہوئے جیسے بے خود ہو رہا تھا۔

''امامہ......''

بنا اس کی پوزیشن کو خاطر میں لائے اس نے بہت قریب ہو کر اسے پکارا تھا، جواب میں امامہ یوں ہڑبڑا کر جاگی۔ جیسے کوئی طوفان آ گیا ہو۔

فوری طور پر اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کہاں ہے، کیوں ہے، تاہم اگلے ہی پل ذہن بیدار ہوا تو اس کا دل بہت شدت سے دھڑک اُٹھا۔ تھکی تھکی سی خوب صورت نگاہوں میں نیند کی سرخی نے شجاع جیسے مضبوط دل و دماغ کے بندے کے ہوش اُڑا دیئے تھے۔

''میرا انتظار کیے بغیر سو گئیں......؟''

اس کا لہجہ بہت مختلف تھا۔

امامہ کی پیشانی پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے چمک اُٹھے جب کہ ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔

اس میں نظریں اُٹھا کر شجاع کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہ رہی تھی۔

شجاع نے ایک نظر اس کی گود کی طرف دیکھا، پھر عیشاء گڑیا کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا۔

''آئی تھنک کم از کم آج کی رات تو یہ مقام اس کے باپ کو مل جانا چاہیے۔'' اس کی
میں شرارت تھی۔

امامہ کا جھکا سر مزید جھک گیا۔ تھوڑی دیر بعد گڑیا کو فائزہ آپی کے سپرد کر کے وہ کمرے میں
تو امامہ خود کو قدرے سنبھال چکی تھی۔

''ہوں...... اب ٹھیک ہے' میرا خیال ہے ابھی شاید ایک گھنٹہ تو مجھے یہ یقین کرنے میں
کہ تم واقعی میری ہو چکی ہو۔''

بہت اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ بولا تھا۔ امامہ شدید خواہش کے باوجود اپنا
اس کے ہاتھ کی گرفت سے نہ نکال سکی۔

''بہت رشک آرہا ہے اس وقت اپنی تقدیر پر مجھے' میں نے جو کھویا میرے ربّ نے اس
بڑھ کر مجھے عطا کر دیا۔''

دایاں ہاتھ اُٹھا کر اس نے امامہ کے کندھے پر رکھا تھا۔ وہ بے جان سی بیٹھی رہی۔

''کچھ کہو گی نہیں امامہ......؟''

اب اس کا چہرہ بالکل امامہ کے چہرے پر جھک آیا تھا۔ عین اسی وقت امامہ کی آنکھ سے ایک
آنسو پھسل کر شجاع کے بائیں ہاتھ کی پشت پر گرا تھا۔ اس کی آنکھیں بالآخر اُٹھی تھیں اور شجاع کو
بے قرار کر گئی تھیں۔

''آپ...... بہت اچھے ہیں' بہت زیادہ اچھے' میری سوچ' میری اوقات' میرے نصیب ہر
سے بڑھ کر۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ پاؤں سے اُٹھا کر مجھے اپنے دل کی زینت بنائیں۔
میری جگہ کوئی بھی لڑکی ہوتی تو آپ جیسے پیارے انسان کا ساتھ پا کر خوشی سے پھولی نہ سماتی' مگر میں
کوئی لڑکی نہیں ہوں سر! میں...... میں امامہ ہوں' کم ہمت' کم نصیب لڑکی' پلیز...... پلیز اس رشتے' اس
تعلق کو مکمل ذہنی آمادگی اور دل سے تسلیم کرنے کے لیے مجھے تھوڑا سا وقت دے دیں' پلیز......''

جس اندرونی توڑ پھوڑ اور کشمکش کا وہ شکار تھی' اس توڑ پھوڑ اور کشمکش کا یہ تقاضا بھی تھا کہ وہ
شجاع سے اپنے اور اس کے تعلق کے لیے تھوڑا سا وقت لیتی۔

شجاع نے اس کی اِس انوکھی فرمائش پر ذرا سا مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''مکھن لگا کر' میرے ضبط کا امتحان لینا چاہتی ہو۔''

''نہیں......'' وہ صرف سر ہلا سکی تھی۔

''ٹھیک ہے' اگر یہ میری آزمائش ہے تو ان شاء اللہ مجھے کبھی اس میں کمزور نہیں پاؤ گی تم۔ مگر
پلیز امامہ' اس شرط کے ساتھ یہ حدود بھی نافذ نہ کر دینا میں اس بیڈ پر آپ کے ساتھ نہیں سوؤں گی
نیچے زمین پر یا صوفے پر سوؤں گی۔ آپ مجھے ٹچ نہیں کرنا' وغیرہ وغیرہ۔''

اس کی التجاء کا مان رکھتے ہوئے اس نے اپنے خدشات کا فوری اظہار بھی ضروری سمجھا تھا۔
امامہ حیرانی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''تمہیں اعتبار ہے ناں مجھ پر......؟''

براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اسے کندھوں سے تھامے وہ پوچھ رہا تھا۔ امامہ

اثبات میں مل گیا۔
"تھینکس ڈیئر......بس یہ اعتبار قائم رکھنا......"
پل میں اپنی تمناؤں کا گلا گھونٹتے ہوئے اس نے اپنے شوریدہ جذبات کو قابو کیا تھا اور کسی بچے کی طرح' امامہ کے وجود کو اپنی مضبوط بانہوں میں سمولیا تھا۔ امامہ محبت کے اس انوکھے انداز پر اندر ہی اندر سسک کر رہ گئی تھی۔

❋❋❋

"اب پھوٹو...... کیوں بلایا ہے مجھے چوروں کی طرح یہاں۔"
سانول شاہ کی ضد پر' بہت مجبور ہو کر' وہ چھت پر آئی تھی جہاں رات کی تاریکی میں چاند کے اجلے اُجالے اور ٹھنڈی ٹھنڈی پُر مہک ہواؤں نے ایک جادوئی ماحول سا بنا رکھا تھا۔ مہمان سب سو چکے تھے۔ وہ انزلہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے نسبتاً کم روشنی والے گوشے میں لے آیا۔ آج اس کا دل عجیب جذبوں پر اُکسا رہا تھا اسے۔
"کبھی پیار سے بھی بات کر لیا کرو انزلہ! ہر وقت مرچیں چباتی رہتی ہو۔" اس وقت اس کے دونوں بازو اس کی گرفت میں تھے۔
وہ سر سے پاؤں تک سلگ اُٹھی۔
"تم بھول رہے ہو سانول شاہ کہ مجھے تمہاری ذات سے کتنی نفرت ہے۔"
"نہیں بھول رہا یار...... تم بھلا بھولنے دیتی ہو؟ بھوکی شیرنی کی طرح جب دیکھو پنجے مارتی رہتی ہو۔" اس کو لطف آ رہا تھا اسے ستا کر۔
انزلہ نے خود کو چھڑانے کی کوشش ترک کر دی۔
"کیوں بلایا ہے مجھے یہاں......؟"
اگلے پل اپنا چہرہ اس کی طرف سے پھیرے وہ پوچھ رہی تھی جب سانول شاہ نے زبردستی اس کا چہرہ' پھر اپنی طرف پھیر لیا۔
"بتا دوں گا' اتنی جلدی کس بات کی ہے......؟"
کتنا اچھا لگ رہا تھا اس کا گداز گداز سا لمس۔
انزلہ روہانسی ہو گئی۔
"تم میری کمزوری سے فائدہ اُٹھا رہے ہو سانول۔"
"اُٹھانا چاہتا ہوں یار! مگر تم اُٹھانے نہیں دیتیں' ہر بار کبھی ڈرا کر' کبھی تپا کر رکھ دیتی ہو۔ خیر مطلب کی بات کی طرف آتا ہوں۔ اگر کوئی اوپر آ گیا تو بات ادھوری رہ جائے گی۔" اس وقت اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اس "چڑیا" کو بے بس کر کے خود میں سمو لیتا۔
"دیکھو انزلہ...... حویلی میں آج کل ایک ہی موضوع چل رہا ہے۔ میری شادی کا موضوع' بہت چھوٹا سا تھا جب دادو نے' پھوپھو کی بیٹی کے ساتھ' جو بابا کی دور پرے کی کزن لگتی ہیں' میری نسبت طے کر دی تھی۔ بابا بھی دادو کے اس فیصلے پر راضی تھے۔ کیونکہ پھوپھو کی اور کوئی اولاد نہیں' ان کے میاں کی جتنی زمین' ڈھور ڈنگر' جائیداد وغیرہ ہے وہ سب اسی بیٹی کا ہے۔ بابا کو بڑی خواہش تھی

میری شادی کی۔ مگر تمہارے عشق کو اپنا جنون بنا کر میں ان کی خواہش سے نگاہیں چراتا رہا اور یوں بالآخر وہ یہ خواہش اپنے ساتھ' اپنے دل میں لیے اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کے بعد بہت مشکل سے سنبھالا ہے میں نے خود کو' اب جب کہ بابا کی رحلت کو اتنے سال بیت گئے ہیں' یہ موضوع پھر سے حویلی میں سر اُٹھانے لگا ہے۔ آج کل بڑے بھائی آئے ہوئے ہیں۔ ان کا دباؤ بڑھ رہا ہے مجھ پر' مگر میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں۔ وہ برہم تو ہوئے ہیں' مگر اس شرط پر مان بھی گئے ہیں کہ میں دونوں لڑکیوں سے شادی کروں گا' ان کی پسند کی ہوئی لڑکی سے بھی' اور اپنی پسند کی لڑکی سے بھی' کیا کریں' وڈیرے ہیں ناں۔ زبان سے پھرنا' ناک کٹنے کے مترادف لگتا ہے انہیں۔ بہرحال میں نے کہہ دیا ہے پہلے میں اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کروں گا' پھر چند دن بعد ان کی پسند کی ہوئی لڑکی سے۔ میری زندگی میں جائیداد وغیرہ کے حساب سے دونوں کا حصہ برابر ہوگا' لیکن دل کے حساب سے' سارا پیار' ساری محبتیں' سارے خواب' سارے ارمان صرف اسی سے وابستہ ہوں گے جو میری پسند ہوگی۔''

کس جذب کے عالم میں وہ اسے بتائے جا رہا تھا۔ جیسے سانس لینے کو بھی رُکا تو شاید انزلہ اس کی بات کاٹ دے گی' مگر وہ پھر بھی تھکی تھی۔

''بس...... مجھے کیوں بتا رہے ہو یہ سب......''

''تو اور کسے بتاؤں' میری پسند کی لڑکی تو تم ہی ہو......''

اب اسے چھوڑ کر وہ دونوں بازو سینے پر لپیٹ رہا تھا۔ انزلہ پھر تپ اُٹھی۔

''منہ دھو رکھو' تم جیسے اوباش مرد سے شادی کرنے کی بجائے میں کسی کنوئیں میں چھلانگ لگا کر مر جانا زیادہ پسند کروں گی۔''

''چلو یہ خواہش بھی کر لینا پوری' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ فی الحال تو صرف تمہیں باخبر کرنا تھا سو کر دیا۔ پرسوں بھائی اور بھابی آئیں گے مٹھائی لے کر۔ انکار نہیں ہونا چاہیے' اگر انکار ہوا تو قسم سے انزلہ...... تمہارے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دوں گا میں۔'' لہجہ سرد مگر انداز گرم تھا۔

انزلہ چلاّ کر کچھ کہنا چاہتی تھی' مگر وہ اس کا جواب سنے بغیر دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں اُتر گیا۔

''گو نالوں عشق مِٹھا...... ہائے ہائے' ربا لگ نہ کسی نوں جاوے...... گو نالوں عشق مِٹھا......''

وہی گیت زور و شور سے دوبارہ ریپیٹ ہو رہا تھا۔ انزلہ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے وہیں دیوار کے ساتھ گم صم سی بیٹھ گئی تھی۔

❁❁❁

عباد اس روز ایمرجنسی کے باعث باوجود وعدے کے رات شاہ زر کے ساتھ نہیں گزار سکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز ایک ہفتے کے بعد وہ پھر پنڈی آ دھمکا تھا۔

کئی روز سے مسلسل بارش نے شہر کو ٹھنڈ کا ایک عجیب سا حسن دیا تھا۔ شاہ زر کو اس کے آفس سے زبردستی اُٹھا کر اس وقت وہ لانگ ڈرائیو پر لے آیا تھا' تاہم ہلکی ہلکی رم جھم میں' اس وقت وہ اس کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے ہوئے موسم انجوائے کر رہا تھا۔

''یار شاہ زر! میری سمجھ میں نہیں آتا' یہ اونگی بونگی' نازک سی' بے وقوف لڑکیاں یار! آخر یہ ہم

...اپنی محبت کے شیشے میں اُتار کیسے لیتی ہیں؟"
صرف اور صرف اس کا موڈ فریش کرنے کے لیے اس نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ مگر شاہ زر گہری ... فضا کے سپرد کرکے، پل دو پل اوپر نیلے آسمان پر نگاہ ڈال کر پھر خاموشی سے چل پڑا۔
"پھر تو بول یار' کیا گونگے کا گڑ کھا بیٹھا ہے۔ اب تو سنا ہے محبوبہ کو اپنی دہلیز پر بُلا لیا ہے ... نے......"
"گھر کی دہلیز تک آئی ہے وہ مجبور ہوکر' دل کی دہلیز تک نہیں۔"
"کیا مطلب......؟"
وہ رُکا تھا۔ شاہ زر کے اندر دور تک اُداسی بکھر گئی۔
"بہت ضدی ہے وہ' بہت گہری ہے اپنی نفرت میں۔ میں مرجاؤں گا تب بھی معاف نہیں کرے گی وہ مجھے۔" اس کے لہجے میں تپش تھی۔ عباد نے اسے ڈانٹ دیا۔
"مرنے ورنے کی باتیں کرنا چھوڑ دو سمجھے' جہاں تک انوشہ کی بات ہے تو میں یہی کہوں گا اسے بھول جاؤ۔ بُریرہ بھابی بہت اچھی ہیں' اتنا پیار بھی کرتی ہیں تم سے...... پھر کیوں اُجالا چھوڑ کر فضول کے سائے کے پیچھے بھاگ رہے ہو تم......؟"
"میرے بس میں نہیں ہے یہ...... پاگل کردیا ہے اس محبت نے مجھے' نہ کوئی راستہ دکھائی دیتا ہے' نہ پیچھے پلٹنے دیتی ہے۔ کیا کروں عباد' کیا کروں میں......؟"
وہ سخت بے بسی کا شکار لگ رہا تھا۔ عباد خود سوچ میں ڈوب گیا۔
"اسے چھوڑو وہ کیا کررہی ہے' کیا نہیں کررہی۔ تم مجھے اپنی بات بتاؤ' تم کیا چاہتے ہو؟" تھوڑی دیر کے بعد اس نے پوچھا تھا جب وہ بولا۔
"یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا' بس میں چاہتا ہوں وہ خوش رہے۔ چاہے مجھے قبول نہ کرے' لیکن مجھے معاف کردے' میں اس کی نفرت برداشت نہیں کرسکتا عباد!"
"حیرت ہوتی ہے مجھے' کہاں یونیورسٹی کا شاہ زر اور کہاں یہ موجودہ پاگل...... میرا دوست۔ خیر چند دن نظر انداز کرکے دیکھ اسے' دل پر پتھر رکھ کر' ان شاء اللہ بہتر نتائج سامنے آجائیں گے۔ یہ میرا تجربہ ہے' اب چل تجھے اپنی لیلیٰ کی آواز سناتا ہوں۔"
جینز کی پاکٹ سے سیل نکال کر صائمہ کا نمبر پریس کرتے ہوئے اس کے دل میں مخصوص ہلچل مچی تھی۔ شاہ زر اسے گہری نگاہ سے دیکھ کر رہ گیا۔
صاعقہ ابھی آٹا گوندھ کے فارغ ہوئی تھی' چھوٹے دونوں بھائی سپارہ پڑھنے گئے ہوئے تھے۔ سمعان اپنے کمرے میں لیٹا ہاکی میچ دیکھ رہا تھا' جب کہ صائمہ ابھی سلائی سے اُٹھی تھی۔ وہ کمرے میں آئی تو موبائل زور و شور سے بج رہا تھا۔
"ہیلو......" چمکتی اسکرین پر عباد کا نام دیکھ کر اس کے لب خود بہ خود ہی مسکرا اُٹھے تھے۔
"لگتا ہے یہ پاگل گیا کام سے......" نچلا ہونٹ دبا کر شرارت سے ہنستے ہوئے اس نے گرین بٹن پریس کردیا تھا۔
"ہیلو...... السلام علیکم۔" عباد کی مخصوص گمبھیر آواز سماعتوں میں اُتری تھی۔ جب وہ اٹھلاتے

ہوئے بولی۔
''وعلیکم السّلام' فرمایئے۔''
''کیسی ہیں آپ......؟''
''بہت اچھی......''
''بالکل اس میں تو کوئی شک نہیں......لیکن میں حال چال پوچھ رہا تھا۔''
''وہ بھی بہت اچھا ہے' یو ڈونٹ وری۔''
''چلیں اچھی بات ہے' وہ جی مجھے اصل میں آپ کو ایک خوش خبری سنانی تھی۔''
شاہ زر اس کی ''جی، جی'' کو بے حد انجوائے کر رہا تھا۔
''ہوں' سنایئے......''
صاعقہ کی بے نیازی اپنے عروج پر تھی' عباد نے نچلا لب دانتوں تلے دبالیا۔
''وہ جی' آپ کی دعاؤں سے مجھے جاب مل گئی ہے۔''
''اچھا ویری گڈ' بہت بہت مبارک ہو۔''
''شکریہ جی۔ میری خوشی کے لیے' منہ میٹھا کریں گی۔''
اگلی فرمائش پر اس نے سر پیٹ لیا۔
''اس کی کیا ضرورت ہے؟''
''میرا دل چاہتا ہے جی کہ میں اپنی خوشی اور کامیابی آپ سے شیئر کروں۔''
''او کے......''
''پھر کہاں ملیں گی۔ میرا مطلب ہے منہ میٹھا کریں گی؟''
''ساحلِ سمندر پر...... میں اکثر شام میں ساحلِ سمندر پر واک کرتی ہوں۔''
''ویری گڈ جی' بہت شکریہ۔'' اسے حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔ صاعقہ نے مسکرا کر لائن کاٹ دی۔
''پاگل......''
''ہا...... ہا...... ہا...... بالکل صحیح جگہ پر دماغ خراب ہوا ہے تیرا۔'' کال ڈراپ ہونے کے بعد شاہ زر، عباد پر ہنس رہا تھا۔ مگر وہ شرمندہ ہونے کی بجائے مسکرا دیا۔
''کیسی لگی تجھے......؟''
''اچھی ہے......شارپ بنتی ہے۔ مگر ہے نہیں۔''
''بالکل۔'' عباد نے تائید میں فوراً سر ہلایا تھا وہ پھر ہنس دیا۔
''ہر بات میں جی جی...... کیا بات ہے۔ زن مرید شوہر کے لیے سُنا تھا' محبوبہ کے لیے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔''
اب وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ عباد مسکرا کر پلٹتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ آیا۔
''مجھے اس کی خوشی اچھی لگتی ہے شاہ زر...... کیا پتا میرے حسب نسب کا جان کر احساس کمتری کا شکار ہو کر' وہ قدم پیچھے ہٹالے' بس وہ یونہی اچھی لگتی ہے مجھے' رُعب ڈالتی ہوئی' شو مارتی ہوئی' مسکراتی ہوئی......''

''ہائے...... عشق نے غالب نکما کر دیا' ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے......''
شاہ زر پھر ہنسا تھا۔
عباد نے اس بار سر جھکا کر اپنی شرمیلی سی مسکراہٹ لبوں میں دبالی۔

❁❁❁

اگلے روز طلوع ہونے والی صبح بڑی حسین تھی۔ صبح سویرے بیدار ہو کر ایان نے فجر کی نماز پڑھی' گائے' بھینسوں کا دودھ دوہنے کے لیے بالٹی اُٹھا کر باڑے کی طرف چلا آیا۔
کل اسے ہلکی ہلکی حرارت تھی جس کی وجہ سے تھکاوٹ جسم سے لپٹ کر رہ گئی تھی' دودھ دوہنے کے بعد جس وقت حویلی پہنچ کر اس نے دودھ کی دونوں بڑی بالٹیاں حویلی کے وسیع کچن میں رکھیں' علیزہ چھم سے اس کے راستے میں آ گئی۔
''کیسے ہو ایان؟''
آنکھوں میں وہی بے باکی اور بھوک۔ ایان بیزار سا پلٹ گیا۔
''پتا نہیں......''
''ارے بات سنو......''
وہ اس کی طرف لپکی تھی مگر ایان اس سے پہلے ہی بازو چھڑاتا' لمبے لمبے ڈگ بھرتا حویلی کے کشادہ صحن سے نکلتا چلا گیا تھا۔ وہ ابھی حویلی سے ڈیرے کے راستے میں ہی تھا جب اس کی نگاہ' اس سادہ سے خوب صورت چہرے پر پڑی تھی۔
سیدھے سادے معمولی کپڑوں میں ملبوس' وہ اپنا لہولہان پاؤں پکڑ کر بیٹھی' درد ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایان خود بخود اس کی طرف کھنچا آیا تھا۔
''کیا ہوا......؟''
صرف دو پل میں وہ اس کے سر پر کھڑا پوچھ رہا تھا مگر لڑکی نے سر اُٹھانے کے باوجود کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس گاؤں کی لگتی بھی نہیں تھی۔
''کون ہو تم؟'' اس بار قدرے ہمدردی سے پوچھا تھا اس نے' جب وہ سادگی سے بولی۔
''گوری......''
''گوری...... نام تو سُنا سُنا سا ہے۔ یہاں کیا کر رہی ہو اور یہ پاؤں کو کیا ہوا ہے۔'' وہ اس کی فکر کر رہا تھا۔ گوری کی نظریں پھر زمین پر گڑ گئیں۔
''کچھ نہیں...... یہاں سے گزر رہی تھی تو بے دھیانی میں کانچ لگ گیا پاؤں میں۔''
''اوہ...... دیکھو کتنا خون بہہ گیا ہے' جانا کہاں ہے؟'' وہ ہمدردی میں پوچھ رہا تھا۔ گوری کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔
''پتا نہیں...... جہاں تقدیر لے جائے گی چلی جاؤں گی۔''
''کیا مطلب......؟'' اسے حیرانی ہوئی تھی۔ گوری نے آنکھیں دوپٹے کے پلو سے رگڑ لیں۔
''کوئی مطلب نہیں' بھری دنیا میں بالکل اکیلی ہوں' کوئی آسرا' کوئی ٹھکانہ نہیں' ایک شوہر کا

کھوکھلا سہارا تھا‘ وہ بھی نہیں رہا۔“

”کہاں سے آئی ہو؟“

”شاہ والا سے۔“

”اوہ......تم وہی گوری تو نہیں‘ جس نے میرے گھر والوں کو مشکل میں ڈال کر فرار کا راستہ اپنا لیا تھا۔“

اچانک جھماکا ہوا تھا اس کے ذہن میں‘ گوری نے اُلجھن بھری نگاہ سے اسے دیکھا۔

”میں سمجھی نہیں۔“

”زیادہ ڈرامہ مت کرو......وہ تم ہی ہو سکتی ہو جس نے میرے بھائی سمعان کو بے وقوف بنا کر پہلے ہمارے گھر میں پناہ لی‘ پھر اپنے آدمیوں سے اسی پر گولیاں چلوا کر وہاں سے فرار ہو گئیں۔ صرف تمہاری وجہ سے کہاں کہاں خوار نہیں ہوا میں۔ آج تک میرے گھر والوں کا بھی پتا نہیں چل سکا کہ کہاں ہیں‘ کس حال میں ہیں؟ اب پھر کوئی نیا ڈرامہ کرنے نکل کھڑی ہوئی ہو گی۔“

گوری کے متعلق انزلہ کی ساری باتیں اس کے ذہن سے نکل چکی تھیں۔

گوری اس الزام پر تڑپ کر رہ گئی۔

”تم......تم سمعان کے بھائی ایان ہو‘ جو اس وقت جیل میں تھا؟“

”جی ہاں......“ خاصا چبا کر جواب دیا تھا اس نے‘ وہ شرمندہ ہو گئی۔

”مجھے معاف کر دو ایان‘ سوہنے رب کی قسم میں ویسی نہیں ہوں۔ جیسی آپ سمجھ رہے ہو‘ میں نے تو خود بڑے دُکھ جھیلے ہیں۔ بڑی مصیبتیں برداشت کی ہیں‘ گھر بار‘ خون کے رشتے‘ اپنے لوگ‘ اپنا گاؤں‘ سب کھو دیا میں نے......کیا میرے چہرے کو دیکھ کر آپ کو لگتا ہے کہ میں کوئی واردات کرنے والی ہوں۔“

خشک لبوں پر زبان پھیر کر اس نے بڑی مشکل سے اپنی بات مکمل کی تھی۔

ایان نے بے ساختہ نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔ گورے رنگ اور خوب صورت نقوش کی مالک اس لڑکی کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ وہ فوراً نگاہ چرا گیا۔

”کچھ کھایا پیا ہے؟“

”نہیں......“

”کتنے دن سے......؟“

”دو دن سے۔“

”اس سے پہلے کہاں تھیں......؟“

”اپنے گاؤں کی حویلی میں......“

”چلی کیوں آئیں وہاں سے؟“

”بس......اس گاؤں سے خوف آتا ہے اب۔“

”اچھا چلو اُٹھو فی الحال مائی حاجن کے گھر لے چلتا ہوں‘ پھر حویلی میں جگہ کا پتا کروں گا‘ اگر کام نکل آیا تو کر لو گی؟“

"ہوں۔"

"چلو پھر ٹھیک ہے' اب اُٹھو شاباش۔"

نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر بڑی مشکل سے اسے سہارا دے کر وہ اسے مائی حاجن کے گھر تک لایا تھا جو اپنی بدزبان جھگڑالو بہو کے ہاتھوں بے حد تنگ تھیں۔

❀❀❀

شام کی تاریکی ہلکی ہلکی پھیل رہی تھی۔ عباد اپنی ضروری میٹنگ کینسل کر کے پچھلے دو گھنٹے سے وہاں ساحل سمندر کے کنارے آیا بیٹھا' اس کا انتظار کر رہا تھا مگر صاعقہ کا دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں تھا۔

وقت کے لمحے جیسے جیسے سرک رہے تھے اس کا دل مایوسی کے اندھیرے میں ڈوبتا جا رہا تھا' اگلے تیس منٹ مزید انتظار کے بعد وہ گہری سانس بھر کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ شاید اسے آنا ہی نہیں تھا۔ وہ تھکے قدموں سے واپس پلٹا تھا اور سست روی سے قدم اُٹھاتا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا تب اچانک اس کی نادانستہ نگاہ اس پر پڑی تھی۔

سڑک پر شاید کوئی حادثہ ہو گیا تھا' زیادہ لوگ نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بآسانی اسے دیکھ پایا تھا۔ اس وقت وہ شدید تکلیف سے دوچار تھی۔ عباد گاڑی چھوڑ کر' برق کی سی تیزی کے ساتھ فوراً اس کے قریب پہنچا تھا۔

"زرنیل جی......"

شدید پریشانی میں بھی اپنا بھرم کھلنے نہیں دیا تھا اس نے۔ تبھی صاعقہ نے چونک کر سر اوپر اٹھایا تھا۔

"آپ......؟"

"ہوں...... کیا ہوا؟ آپ ٹھیک تو ہیں......؟"

صاعقہ نے اطمینان سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہوں میں ٹھیک ہوں' یہ پاؤں میں شاید موچ آ گئی ہے۔"

لوگ عباد کو اس کے قریب دیکھ کر وہاں سے چھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ متفکر سا اس کے قریب بیٹھ گیا۔ بناء اپنی حیثیت کی پروا کیے۔ بناء اپنے مرتبے کا لحاظ کیے۔

"کیسے......؟ آئی مین کیا آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے......؟"

اس کی آنکھوں میں اس وقت جو تشویش تھی اس نے صاعقہ کو حیران کر دیا تھا' وہ گم صم سی اسے دیکھے گئی۔

کیا کر رہا تھا وہ شخص اس کے ساتھ؟

"زرنیل جی......"

اسے گم صم پا کر عباد نے پھر اسے پکارا' جواب میں وہ یوں چونکی جیسے نیند سے جاگی ہو۔

"ہوں......"

''کیا ہوا ہے آپ کو...... یہ پاؤں میں موچ کیوں آئی' یہاں کیا کر رہی تھیں آپ؟''
وہ بے چین ہو رہا تھا۔
صاعقہ اپنا سر اُٹھاتی عجیب سی اُدھیڑ بُن سے بے ساختہ نگاہیں چُرا گئی۔
''کچھ نہیں...... میں...... گزر رہی تھی یہاں سے کہ اچانک، اچانک یہاں پاس میں کرکٹ کھیلتے بچوں کی بال پکڑنے کے لیے ایک بالکل چھوٹا سا بچہ یہاں...... یہاں روڈ کے درمیان آ گیا۔ وہاں پیچھے سے ایک تیز رفتار وین آ رہی تھی' اسی لیے میں بچے کو پکڑنے کے لیے بھاگی تو......''
دانستہ بات اُدھوری چھوڑ کر وہ سر جھکا گئی تو عباد کی اس سے محبت مزید بڑھ گئی۔
''بچہ محفوظ ہے......؟''
''ہوں...... اس کا بڑا بھائی گود میں اُٹھا کر لے گیا اسے۔''
''آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟''
''نہیں...... بس یہ پاؤں رپٹ گیا ہے ذرا سا۔''
وہ درد ضبط کرنے کے معاملے میں بہادر بھی تھی۔
عباد گہری سانس بھر کر اُٹھ کھڑا ہوا۔
''چلیے...... بینڈیج کروا لیجیے۔''
''نہیں آپ جائیے' میں بلوا لیتی ہوں کسی ملازم کو۔''
''پلیز زرنیل جی! مجھ پر اعتبار کیجیے' آپ کا گھاؤ گہرا ہے۔ خون زیادہ بہہ گیا تو مسئلہ ہو سکتا ہے۔ ملازم پتا نہیں کب آئے' اس وقت پلیز مجھے اپنا ملازم ہی سمجھیے۔''
اس کے لہجے میں اتنی عاجزی اور اصرار تھا کہ صاعقہ باوجود خواہش کے اس کی آفر رد نہ کر سکی۔
''آئیے...... میں لے چلتا ہوں۔''
اسے اُٹھنے کی کوشش کرتے دیکھ کر عباد نے اپنا ہاتھ بڑھایا مگر اس نے سہولت سے انکار کر دیا۔
''نہیں شکریہ...... میں چل سکتی ہوں۔''
اپنی حدود و قیود کا احساس اسے بہت اچھی طرح سے تھا۔
عباد بناء محسوس کیے اسے اُٹھتے دیکھ کر آگے بڑھ گیا۔

❀❀❀

خوشبو' کلیاں' تارے' جگنو
بارش' مٹی' کچا آنگن
دھانی چوڑی' مہندی' گجرے
آتے جاتے سارے موسم
ہنستے کھیلتے اور مسکاتے
لیکن ساون کیوں روتا ہے؟

پو پھٹنے میں ابھی کچھ وقت تھا جب دور مسجد کے اسپیکر سے بلند ہوتی موذن کی جذب میں ڈوبی ہوئی سحر انگیز صدا اس کی سماعتوں سے ٹکرائی ''اللہ اکبر...... اللہ اکبر......'' گوری کی پلکوں نے ہلکی سی

رہی مگر وہ چاہنے کے باوجود آنکھیں کھول نہ سکی۔
اس کا پورا وجود پسینے سے تر تھا۔
کل جس وقت وہ مائی حاجن کے گھر لائی گئی تھی۔ اس وقت مائی حاجن گھر پر نہ تھیں اور گوری کا سارا وجود سردی سے کپکپا رہا تھا مگر اس نے ایان کو نہیں بتایا تھا۔ وہ اسے مائی حاجن کی بہو کے سپرد کر کے اس کا خیال رکھنے کی تاکید کرتا باہر نکل گیا تھا۔
گوری کو بھوک لگ رہی تھی مگر اسے پتا ہی نہ چلا کہ کب اس کی آنکھ لگ گئی...... مسلسل تھکن نے اسے بے حال کر چھوڑا تھا۔ مٹی میں اَٹے پاؤں بھی ایان نے ہی دھلائے تھے۔
اس کا ذہن اس وقت مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔
پتا نہیں وہ خواب تھا یا کچھ اور...... مگر اس کی جان ضرور خوف محسوس کر رہی تھی۔
وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے جسم سے روح کا تعلق ختم ہو گیا تھا۔ بہت سے لوگ اس کے مردہ وجود کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے اور وہ سب کے درمیان بے حس و حرکت پڑی تھی۔ یوں جیسے کہ اسے اپنی اچانک موت کا یقین نہ آتا ہو۔ اردگرد کھڑے کچھ لوگوں کے چہرے شناسا تھے کچھ اجنبی مگر اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ سب سے بے نیاز اس نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بے کار گئی۔ بہت زور کے باوجود وہ ہاتھ کی ایک انگلی بھی نہیں ہلا سکی تھی۔
پھر اس نے پاؤں کے انگوٹھے کو حرکت دینی چاہی مگر یہاں بھی ناکام رہی۔ لوگ اسے رو رہے تھے مگر وہ عجیب سا خوف محسوس کرتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک پڑی افتاد کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی تب ہی اس کا جنازہ اٹھا لیا گیا۔ لوگوں کے کندھوں پر سوار شہرِ خاموشاں کی طرف جاتے ہوئے کتنی شدت سے چلا کر اپنے شناسا لوگوں کو روکنے کی کوشش کی تھی اس نے مگر...... وہ تو زبان بندھ گئی تھی۔
ایک ایک سانس بندھ گئی تھی اس کی...... بے اختیار اسے خود پر رونا آ گیا۔
تو کیا واقعی وہ مر گئی تھی......؟
قبرستان پہنچ کر اس کا جنازہ ایک سائیڈ پر رکھ دیا گیا۔ وہ جانتی تھی کہ ابھی تھوڑی دیر بعد اسے ہمیشہ کے لیے تاریک قبر میں اتار دیا جائے گا۔ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ جانا چاہتی تھی مگر...... وہی بے بسی...... من ہی من میں وہ رو رہی تھی۔ خدا کو پکار رہی تھی مگر شاید اس کے پاس ''رعایت'' کی مہلت ختم ہو چکی تھی۔
اس کی قبر تیار کر دی گئی تھی۔ جنازے کے ساتھ آئے لوگوں میں...... اس کے دور پرے کے رشتے دار اسے چارپائی سے اٹھا کر قبر میں منتقل کر رہے تھے جو اس کے قد سے بھی گہری تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ تنگ و تاریک قبر میں وہ زمین پر چت لیٹی تھی مگر ابھی قبر کا منہ کھلا تھا۔ لہٰذا اندھیرا اپنے اصل روپ کے ساتھ اس پر واضح نہیں ہوا تھا۔ وہ درختوں پر چہکتے ہوئے پرندوں کا شور سن سکتی تھی۔ گویا دنیا سے رخصتی کا یہ آخری نظارہ تھا۔
بہت جلد اس کی قبر کو پیک کرنا شروع کر دیا گیا تھا۔ وہ مٹی کے ڈھیر تلے دب رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے مٹی کے ڈھیر کا حصہ بنا دیا گیا تھا۔ قبر کے پیک ہوتے ہی جیسے اس کی حسیات بیدار ہو

گئی تھیں۔ آنکھیں کھل گئی تھیں مگر جسم کے کسی عضو کو حرکت دینے میں وہ اب بھی ناکام تھی۔ اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ وہ کھڑی ہو کر اپنے اوپر ڈالی گئی مٹی کے ڈھیر کو دونوں ہاتھوں سے پرے دھکیل دے اور وہاں سے نکل جائے مگر عجب بے بسی سی بے بسی تھی......

اسے لگ رہا تھا جیسے ابھی چاروں اطراف سے مختلف خطرناک حشرات ارض نکلیں گے اور اس کے وجود سے چمٹ کر اسے کھانا شروع کر دیں گے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ فی الحال اس کی قبر میں پہلے سے موجود چیونٹیوں نے ہی اس کا استقبال کیا تھا۔

وہ ڈر سے پیلی پڑ رہی تھی۔ سینے پر اچانک کوئی بہت بھاری بوجھ لاد دیا گیا تھا۔ اس وقت اسے اپنی کوئی نیکی یاد نہ آ رہی تھی۔ صرف گناہ تھے...... ڈھیروں گناہ جو سامنے آتے جا رہے تھے۔ کاش اسے موت سی ظالم حقیقت کا ادراک چند دن پہلے ہو جاتا تو وہ فوراً ساری دنیا تج کر دن رات اللہ کے حضور اپنے لیے نیکیاں جمع کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔

مگر...... غفلت نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

اچانک اسے لگا جیسے اس کی قبر بائیں دیوار کی طرف سے پھٹی ہے اور یہیں وہ چیخی تھی۔

بھرپور زوردار چیخ کے ساتھ اس کی آنکھ کھلی تھی۔

پورا جسم یوں پسینے سے تر تھا جیسے بارش میں نہائی ہو۔ مائی حاجن اس کی چارپائی کے قریب بیٹھی تسبیح کر رہی تھیں۔ اسے خوف سے لمبے لمبے سانس لیتے دیکھا تو فوراً اٹھ کر اس کی چارپائی پر آ بیٹھیں۔

''ماں صدقے جائے۔ خواب سے ڈر گئی ہو؟''

گوری نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا جیسے زندگی کا یقین پانا چاہتی ہو۔

''ہوں۔''

اگلے پل وہ اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ مائی حاجن نے فوراً آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر تک گوری کے حواس بحال ہوئے تو اس نے پوچھا۔

''آپ کون ہیں؟''

''اپنی ماں ہی سمجھ پتر! سارے گاؤں والے مائی حاجن کہتے ہیں۔ تم جو چاہو کہہ سکتی ہو۔''

کتنا نور تھا اس عورت کے چہرے پر، کتنی عجیب سی خوشبو اٹھ رہی تھی ان کے وجود سے، وہ گم صم سی انہیں دیکھے گئی۔

''اماں! اماں کہہ لیا کروں......؟''

''ہوں...... کیوں نہیں۔''

ان کے لب مسکرا رہے تھے۔ گوری نے پھر پلکیں موند لیں۔ اس کا سر اس وقت جیسے درد سے پھٹ رہا تھا۔

❁❁❁

عباد گاڑی کا لاک کھول رہا تھا مگر وہ ابھی بمشکل دو قدم ہی اٹھا سکی تھی۔

لاک کھول کر پلٹتے ہوئے اس نے صاعقہ پر نگاہ ڈالی تھی جو شدید تکلیف برداشت کرتی نچلا لب دانتوں میں دبائے بنا کسی سہارے کے بہت مشکل سے قدم اٹھا رہی تھی۔ عباد دونوں ہاتھ سینے

اد ھے گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کا ٹخنا کافی سوج چکا تھا مگر اس کے باوجود اسے کسی نامحرم کے "عارضی سہارے" کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عباد کے دل میں اس کا مقام مزید بڑھ رہا تھا۔ یقیناً یہ چیز اسے اہل سوسائٹی کی لڑکیوں میں دیکھنے میں نہیں مل سکتی تھی۔ تب ہی وہ دلچسپی سے اس خوب صورت ے پر تکلیف کے آثار دیکھتا رہا اور صاعقہ آہستگی سے قدم اٹھاتی بالآخر اس تک پہنچ گئی۔

دکتی خوب صورت پیشانی پر پسینے کی کتنی ہی بوندیں چمک رہی تھیں۔

"یہ گاڑی کس کی ہے؟"

قریب پہنچ کر عادت سے مجبور دوپٹے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے اس نے حیرانی سے پوچھا تھا جب وہ گھبرا گیا۔ اس کے ذہن میں ہی نہیں تھا کہ وہ اس سے کیا بن کر مل رہا ہے......؟ اس نے تو یہی سوچا تھا کہ وہ ساحل سمندر پر اس سے ملے گا اور ساحل سمندر سے ہی پیدل رخصت ہو جائے گا۔ صاعقہ کو اس کی کنوینس کا پتا ہی نہیں چلے گا......

صاعقہ بڑی باریک بینی سے گاڑی کا جائزہ لے رہی تھی۔

عباد کو پھر جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔

"وہ...... دراصل یہ گاڑی صاحب کی ہے جی۔ میں نے بتایا تھا ناں آپ کو کہ مجھے جاب مل گئی ہے۔ تو صاحب نے اپنی گاڑی دے کر گھر بھیجا تھا کسی کام سے۔ میں ادھر آ گیا آپ سے ملنے......"

بروقت بہت اچھا خیال آ گیا تھا ذہن میں۔

صاعقہ جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی بالآخر بولی تھی۔

"کتنی بری بات ہے کسی کے اعتبار کو توڑنا نہیں چاہیے۔ آپ کے صاحب کو اگر آپ کی اس حرکت کا پتا چل گیا تو سوچیے کتنا غصہ آئے گا انہیں اور ہو سکتا ہے وہ آپ کو جاب سے بھی فارغ کر دیں۔ کیا یہ اچھی بات ہو گی......؟"

"نہیں جی۔"

"پھر کیوں کیا آپ نے ایسا؟"

"پتا نہیں۔ بس میں نے سوچا آپ اتنی امیر کبیر لڑکی ہیں تو میری بھی ذرا سی ٹور شور ہونی چاہیے۔"

"پاگل ہو آپ اور کچھ نہیں۔"

صاعقہ نے اس بار بے ساختہ نگاہیں چرائی تھیں۔

"اچھا پلیز بیٹھیں ناں۔ ابھی آپ کی بینڈیج ضروری ہے۔"

اگلے ہی پل اس کے لیے فرنٹ ڈور کھول کر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

وہ چاہتا تو اسے اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس لے جا سکتا تھا مگر...... یہ اس کے بھرم کی بھی مجبوری تھی کہ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی صاعقہ کو ایک معمولی سے کلینک پر لانا پڑا تھا۔

وہ گاڑی سے نکلنے لگی تو تکلیف کی شدت سے تیورا کر گر پڑی تھی۔ عباد بجلی کی سی تیزی سے لپک کر اس تک پہنچا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں ناں......؟"

''ہوں......؟''

عباد کواس کے انکار کے باوجود اسے سہارا دے کر کلینک کے اندر تک لانا پڑا جب کہ چند لمحوں کی اس ذرا سی قربت نے جہاں صاعقہ کے پسینے چھڑا دیے وہیں عباد کا دل بھی اس کے پہلو میں بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔

❋❋❋

وہ گہری نیند سو رہا تھا جب موبائل کی تیز بیل سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

''ہیلو......''

اسکرین پر بریرہ کا نام جگمگاتا دیکھ کر اسے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کال پک کرنی پڑی تھی جب کہ دوسری طرف کوئی ہنس رہا تھا اور ہنستا ہی جا رہا تھا۔

''بریرہ......'' اس کی آنکھیں پوری کھل گئی تھیں جب وہ ہنسی کو بریک کرتے ہوئے بولی۔

''بہت بہت مبارک ہو شاہ...... بالآخر محبت خود چل کر تمہاری دہلیز تک آ گئی۔''

''بس......صرف یہی پتھر مارنے کے لیے فون کیا ہے۔''

وہ ٹینس تھا بے حد ٹینس...... بریرہ نے دوسری طرف گہری سانس بھری۔

''اور کہنے کے لیے رہا ہی کیا ہے شاہ...... پچھلے کئی دنوں سے میں سوچ رہی ہوں۔ یہ محبت ہمیشہ رانگ پرسن سے ہی کیوں ہوتی ہے......؟ کیوں یہ احساس وہاں لے جا کر مارتا ہے انسان کو' جہاں اسے پانی بھی نہ ملے......؟''

''تمہاری طبیعت ٹھیک تو ہے؟''

''ہاں...... بہت ٹھنڈی ہَوا چل رہی ہے یہاں اور تم تو جانتے ہو شب کے اندھیرے میں سرد ہَوا کے جھونکے کیسے بے خود کرتے ہیں۔ ساری ساری رات جاگتے محبت کے متوالوں کو سونے ہی نہیں دیتے...... پلیز شاہ زر آج مجھ سے صرف انوشہ کی باتیں کرو اور ایک اچھی دوست سمجھ کر......''

اس کا لہجہ بہکا بہکا سا تھا۔

شاہ زر کے سر میں درد شروع ہو گیا۔

''اس وقت کہاں ہو تم......؟''

ایک نظر ہاتھ پر بندھی رسٹ واچ پر ڈالتے ہوئے اس نے پوچھا تھا جب وہ بولی۔

''پتا نہیں لیکن جہاں بھی ہوں محفوظ ہوں۔ میری فکر چھوڑو تم...... پلیز انوشہ کا بتاؤ نا' آج کل تو بہت خوش ہو گی وہ۔ ہے ناں......؟''

''نہیں...... اسے یہاں آنے کی کوئی خوشی نہیں ہے۔ صرف اس کی مجبوریاں دھکیل کر لائی ہیں اسے یہاں۔ بہت برا شوہر ہے اس کا۔ بہت تشدد کرتا ہے اس پر......''

''چچ...... چچ...... چچ...... تب تو تمہارا بہت دل دُکھتا ہو گا۔ مرہم تو رکھتے ہی ہو گے اس کے زخموں پر......؟''

وہ نجانے کیسے تسلی چاہتی تھی......

شاہ زر پھر گہری سانس بھر کر رہ گیا۔
"تمہیں کیا ہو گیا ہے بریرہ......؟ ایسی تو نہیں تھیں تم کبھی...... تمہیں تو چڑیا کے بچے پر ہوا ظلم رُلا
دیتا تھا اب...... وہ تو بہن ہے تمہاری...... بہن نہ مانو تب بھی ایک انسان تو ہے ناں......؟ اس کا
قصور ہے اگر میں اس کے لیے دل میں کوئی نرم گوشہ رکھتا ہوں...... کیا زندگی کے کسی رنگ پر اس
کا حق نہیں......؟"
اس کی آواز ہلکی سی نم ہوئی تھی۔ دوسری طرف بریرہ پھر ہنس پڑی۔ ٹوٹے کانچ جیسے ہنسی۔
"سفر آسان لگتا تھا
دل برباد تجھ کو یہ سفر آسان لگتا تھا
ادھر تو سوچتا تھا اور ادھر
آنکھوں سے کوئی خواب چہرہ آن لگتا تھا
مگر خوابوں میں رہنا......
خواب جیسی بے حقیقت خوشبو صحرا میں رہنا ہے
کناروں سے جو ہو محروم اس دریا میں رہنا ہے
دل برباد ہم نے تو کہا تھا
بظاہر یہ سفر آسان لگتا ہے مگر
آنکھیں بدن سے چھین لیتا ہے
ہنستے ہنستے بہت دل نشین لہجے میں وہ نظم سنا رہی تھی جواب میں شاہ زر تکیے کے سہارے اٹھ کر
بیٹھ گیا۔
"میں تمہیں بہت مس کر رہا ہوں بریرہ۔"
"اچھا؟" آواز میں حیرت جھلکاتے ہوئے اس نے صاف شاہ زر کا مذاق اڑایا تھا۔
تب ہی شاہ زر کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔
"صاحب...... وہ بی بی صاحب شاید اوپر سو رہی ہیں اور ان کا یہ بچہ سیڑھیوں سے گر پڑا ہے۔"
بچے کو بانہوں میں لیے ملازم اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ اس نے شاہ زر کی اجازت بھی ضروری نہیں سمجھی
تھی کمرے میں آنے کے لیے۔
شاہ زر نے لپک کر بچہ اپنی بانہوں میں لیا تھا۔
"او کے تم جاؤ۔"
اس کا دل تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا تھا۔ دوسری طرف بریرہ شاید اس پر بھی کچھ کہتی مگر اس
نے سرعت سے اس کی کال ڈراپ کر دی۔
کیسا موقع دیا تھا آج قدرت نے کہ اس کا جگر گوشہ اس کی بانہوں میں تھا۔ وہ اسے جی بھر کر
نہ صرف دیکھ سکتا تھا بلکہ پیار بھی کر سکتا تھا۔ اس کی ظالم جلاد ماں جانے اس وقت کیسے اس پھول سے
بے خبر ہو گئی تھی۔
شاہ زر کی بانہوں میں آتے ہی بچہ پر سکون سو گیا تھا۔

شافیہ نے میسج کیا تھا۔ وہ واقعی ہو بہو اسی کی کاپی تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بیڈ پر لٹایا اور اس کا سر سہلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ کھیل میں مشغول کرلیا۔ تیرہ ماہ کا وہ پیارا سا بچہ کیسی کشش رکھتا تھا اپنے اندر کہ وہ اس میں کھو کر جیسے خود کو بھی فراموش کر بیٹھا تھا۔

✻✻✻

اس روز چھنو کی رخصتی تھی مگر انزلہ نہیں گئی۔

اسے شہر جانا تھا جہاں میران شاہ کے کیس کے سلسلے میں ''ری انوسٹی گیشن کے لیے آج اس کی خصوصی میٹنگ تھی۔ تقریباً دو گھنٹے شجاع حسن کے ساتھ میٹنگ کے بعد اس کا دل بے ساختہ میران شاہ سے ملنے کو چاہا تھا تب ہی وہ سینٹرل جیل کی طرف بڑھی تھی۔

ابھی وہ ڈیوٹی پر موجود افسران سے مل کر ان کی ہمراہی میں میران شاہ کی بیرک کی طرف جا رہی تھی کہ کسی کی دل سوز چیخوں نے اس کا دل دہلا دیا۔ بے ساختہ مڑ کر اس نے اپنے ساتھ چلتے سپاہی کی طرف دیکھا تھا مگر وہ نگاہ چرا گیا۔

''چلو بی بی! یہاں یہ کھیل تماشے روز کا معمول ہیں۔''

تھوڑی دیر میں وہ میران شاہ کی بیرک تک پہنچی تو وہاں موجود قیدیوں کا حال دیکھ کر اسے ابکائی سی آ گئی۔ چھوٹی سی تنگ بیرک میں گنجائش سے تین گنا زائد قیدیوں کو یوں بند کیا ہوا تھا جیسے جانوروں کے باڑے میں ایمرجنسی کے وقت گائیں بھینسوں کو ٹھونس دیا جاتا ہے۔ سخت گرمی میں سگریٹ پان، چرس کی بدبو...... شریف قیدیوں کو عذاب میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ اس پر افتاد یہ کہ وہاں نہ پاؤں پسار کر سونے کی جگہ تھی نہ کھانے کو اچھا کھانا تھا اور نہ پینے کو صاف پانی۔ جو پیسہ حکومت کی طرف سے قیدیوں کے جمع خرچ کے لیے آتا تھا وہ پیسہ اعلیٰ افسران بالا ہی بالا چٹ کر جاتے تھے۔

اس وقت بھی کھانے کا وقفہ تھا۔ انزلہ نے میران کے سامنے رکھی پلیٹ میں جو سالن اور ہاتھ میں پکڑی روٹی کا جو حال دیکھا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

''تم......؟'' میران کی نگاہ جوں ہی اس پر پڑی تو وہ روٹی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ کیا کھا رہے ہو میران......؟ یہ کھانا تو جانوروں کے کھانے لائق بھی نہیں ہے......''

انزلہ کی نگاہیں اس پر نہیں اس کے کھانے پر تھیں۔

میران شرمندگی سے سر جھکا گیا۔

''تو تم کیا سمجھتی ہو...... یہاں قید یہ سب لوگ ان لوہے کی موٹی سلاخوں کے اندر انسان رہ گئے ہیں پگلی...... ہم نہ کھائیں گے تو کیا افسران کو مرغ مسلم مل سکے گا؟''

''لیکن...... یہ زیادتی ہے تم سب لوگوں کو اس پر احتجاج کرنا چاہیے۔''

اس نے پھر دہائی دی تھی۔ میران کے لبوں کو پھیکی سی مسکان چھو گئی۔

''احتجاج...... آزادی...... حقوق...... یہ سب باتیں...... جیل کی اس چار دیواری سے باہر اچھی لگتی ہیں انزلہ...... یہاں آ کر تو لوگوں کی اکثریت پاگل ہو جاتی ہے یا پکا مجرم بن جاتی ہے۔ یہاں انسان نہیں بولتے دیواریں بولتی ہیں...... وہ باہر...... جہاں سے گزر کر ابھی تم یہاں تک آئی ہو وہاں

میں بیٹھا وہ قانون کا رکھوالا...... ہم تک پہنچنے والی ہوا سے بھی ''معاوضہ طلب کرتا ہے...... یہ بہت بے درد ہیں انزلہ...... یہ چیخیں سنو...... نیا لڑکا ہے ساجد...... اس کو مار رہے ہیں یہ حالاں کہ اس نے تو کوئی احتجاج بھی نہیں کیا تھا۔ صرف طبیعت کی ناسازی کے باعث یہاں کے سپرنٹینڈنٹ کی پکار کا جواب نہیں دے سکا تھا اور دیکھ لو...... پچھلے آدھ گھنٹے سے الٹا لٹکا کر مار رہے ہیں اسے......''

میران پہلی بار کی نسبت اس بار بہت ملول اور بکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

انزلہ کی گرفت بیرک کی سلاخوں پر ڈھیلی پڑ گئی۔

''یہ کیسے ممکن ہے میران! جیل میں تو کسی بھی قیدی کو مارنے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ یہ لوگ اب عدالتی رحم و کرم پر ہیں۔ پولیس کیسے تشدد کر سکتی ہے ان پر...... کیا انہیں پتا نہیں کہ بات عدالت تک گئی تو ان کی اپنی ملازمت بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''

''کچھ خطرے میں نہیں پڑتا انزلہ! یہاں خطرے میں پڑتی ہے تو صرف قیدیوں کی جان یا مسلمین قیدیوں کی عزت...... ان افسران کے لیے تو یہ عمارت تفریح گاہ ہے۔''

''دکھ کا مقام ہے میران! بے حد دکھ کا مقام ہے...... ہمیں کشمیر اور یورپ میں غیر مسلموں کے ہاتھوں پہنچنے والی اذیتوں کا ملال ہے مگر یہاں...... جن کا مذہب ایک' زبان ایک' عقیدہ ایک' ملک ایک' کتاب ایک' اللہ اور اس کا رسولؐ ایک...... یہ لوگ تو ظلم و بربریت میں ان سے بھی بڑھ گئے ہیں میران! ان سے بھی بازی لے گئے۔ اب کہاں جائیں...... کس سے فریاد کریں' رب کی ذات کے سوا کوئی دیکھنے سننے اور درد محسوس کرنے والا ہی نہیں رہا۔''

وہ رو پڑی تھی۔

میران شاہ نے بے بسی سے رخ پھیر لیا۔

''اب جاؤ انزلہ! مجھے اچھا نہیں لگ رہا تمہارا سب کے سامنے کھڑا ہونا۔''

''او کے۔ میں چلتی ہوں۔ تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے آئی تھی کہ تمہارے کیس کی فائل دوبارہ کھل گئی ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد تم ان سلاخوں سے باہر ہو گے۔ باقی اماں جی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں انہیں ابھی تک نہیں بتا سکی کہ تم زندہ ہو...... اور ہاں...... یہ...... میں کچھ چیزیں لائی تھی تمہارے لیے...... رکھ لو......''

اچانک اسے ہاتھ میں پکڑے شاپروں کا خیال آیا تو اس نے پلٹ کر سپاہی کو دیکھا اور پھر لاک کھلوا لیا۔

''ایس پی شجاع حسن کے ساتھ اچھا تعلق ہے میرا۔ ان ہی کی وجہ سے یہ لوگ اتنا تعاون کر رہے ہیں ورنہ یہ سب چیزیں بھی ہتھیا لیتے اور تم تک آنے بھی نہ دیتے۔ اپنا خیال رکھنا میران۔ اب کے آئی تو ماں جی کو ساتھ لاؤں گی۔''

وہ نڈر اور بے باک تھی۔ میران نے کھانے کے شاپر اپنے دوستوں کو پکڑا کر پھر سے توجہ اس کی طرف مرکوز کر دی۔

''نہیں انجو پلیز! ایسا مت کرنا۔ میں برداشت نہیں کروں گا۔''

"اوکے لیکن اگر انہوں نے ضد کی تو میں لے آؤں گی۔ اب چلتی ہوں خدا حافظ۔"

محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتی وہ پلٹی تھی اور پھر دو تین بار چلتے چلتے پلٹ کر اسے دیکھ وہاں سے نکل آئی۔ ایک دم سے اسے یوں لگا جیسے تھکن اس کی رگ رگ میں سوار ہو۔ ادھر گھر میں دادی اماں نے سانول شاہ کے بھائی اور بھابی کو رشتے کے لیے صاف جواب دے کر گویا اپنے لیے خود مصیبت مول لے لی تھی۔

❋❋❋

صاعقہ کی ٹانگ کا زخم عباد کی سوچ سے زیادہ گہرا تھا۔

اس کی نہ صرف پوری ٹانگ چھل گئی تھی بلکہ ٹخنے کی ہڈی بھی اپنی جگہ سے سرک گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے ہوسپٹل میں ایڈمٹ کروانے کا کہہ دیا تھا مگر صاعقہ اس کے لیے کسی طور تیار نہیں تھی۔ ایک تو اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے دوسرا اسے اپنا پول کھلنے کا بھی خدشہ تھا۔ تب ہی عباد کو تقریباً ڈانٹتے ہوئے بولی۔

"بس ٹھیک ہے ناں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی۔ آپ جائیں اب۔ پہلے ہی میری وجہ سے بہت ٹائم ہو گیا۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھیں......"

"مجھے ملازمت آپ سے زیادہ عزیز نہیں ہے' سمجھیں آپ۔"

وہ سنجیدہ اور متفکر تھا۔ صاعقہ اس کے چہرے کو دیکھتی رہ گئی۔

"چلیں اٹھیں۔ ہم ابھی ہوسپٹل چلتے ہیں۔"

"مجھے نہیں جانا۔"

ڈاکٹر دیگر مریضوں میں مصروف ہو گیا تھا اور صاعقہ اس کا فائدہ اٹھا رہی تھی۔

"اوکے۔ مجبوراً مجھے اٹھا کر لے جانا پڑے گا کیونکہ میں آپ کو اتنی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔"

وہ ازحد سنجیدہ تھا۔ صاعقہ پریشان ہو گئی۔

"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں مسٹر زین......"

"ہوں......"

وہ ضدی اور اٹل تھا۔ صاعقہ کی اس کے سامنے ایک نہ چل سکی۔

اسے سب سے زیادہ فکر ہوسپٹل کے اخراجات کی تھی۔ گھر کی جو صورتِ حال تھی اس میں ایک روپیہ بھی اضافی خرچ کرنے کی گنجائش نہیں تھی اور یہ بات فی الحال وہ اسے بتا بھی نہیں سکتی تھی۔ عجیب بے بسی سی بے بسی تھی۔

جس وقت عباد نے فل اسپیڈ سے دوڑتی گاڑی' شہر کے مہنگے ترین ہوسپٹل کے قریب روکی صاعقہ کی پریشانی مزید بڑھ گئی۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر عباد نے اس کی ایک نہ سنی اور اسپیشل وارڈ میں مہنگا ترین روم لے لیا۔ اس وقت وہ کوئی معمولی عام عاشق نہیں بلکہ عباد انڈسٹری کا مالک تھا۔

صاعقہ کو سہارا دے کر گاڑی سے نکالتے ہوئے وہ کمرے میں لے آیا تھا اور اگلے ہی کچھ لمحوں میں نرسیں اس کے پاس تھیں جب کہ وہ خود جانے کہاں چلا گیا تھا۔ صاعقہ بے ہوش ہونے سے پہلے اپنے گھر والوں کو اطلاع کرنا چاہتی تھی مگر اس کا موبائل عباد کے پاس تھا۔ اس کا پرس اس کی گاڑی

سی رہ گیا تھا۔
تھوڑی دیر بعد وہ ڈاکٹر کے ہمراہ اس کے پاس آیا تو صاعقہ نے اس سے اپنا موبائل مانگ لیا جو اچھی کمپنی کا تھا پھر چیک اپ کے بعد ڈاکٹر کمرے سے باہر گیا تو اس نے عباد کے سامنے آمنہ کو کال کر دی۔
''ہیلو آمنہ!''
''ہوں......''
''یار! میری موم کو بتا دینا کہ میں اس وقت ایک دوست کے ساتھ ہاسپٹل میں ہوں۔ کچھ ایمرجنسی ہے شاید کچھ گھنٹے لگیں۔ وہ پریشان نہ ہوں۔''
بمشکل اپنا بھرم رکھنے میں وہ کامیاب ہوئی تھی۔
آمنہ اس سے پہلے کہ کوئی سوال کرتی' اس نے فوراً کال کاٹ دی۔
''بس ہو گئی تسلی۔ چلیں اب تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے تکلیف زیادہ ہو اس لیے ٹانگ کو سُن کیا جائے گا۔ پریشان نہیں ہونا پلیز۔''
وہ کتنا کیئرنگ تھا۔ صاعقہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔
''کتنی فکر ہے آپ کو میری......؟ کیا اپنے سب ہی رشتوں کے لیے اتنے ہی حساس ہیں آپ؟''
''ہوں......''
''بہت اچھی بات ہے۔ مردوں کی جو چیز موسٹ فیورٹ بناتی ہے۔ وہ یہی احساس ہے۔''
''اچھا......؟ بہت بہت شکریہ کہ آپ نے بتا دیا۔''
وہ مسکرا رہا تھا۔ صاعقہ رخ پھیر گئی۔
''زرنیل جی! اگر میں آپ سے کوئی خواہش کروں تو ناراض تو نہیں ہوں گی؟''
بیڈ پر اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا تھا جب اس نے رخ اس کی طرف پھیرا۔
''خواہش......کیسی خواہش......؟''

❋❋❋

دروازہ ایک زوردار ٹھوکر سے کھلا تھا اور دادی اماں دہل کر رہ گئی تھیں۔
''یا اللہ خیر......''
انزلہ کو ابھی شہر سے گھر واپس لوٹے تھوڑی ہی دیر گزری تھی۔ لہٰذا اس نے بھی چونک کر سر اٹھایا تھا۔ دروازے کی چوکھٹ تھامے سانول کھڑا کسی قہر سے کم نہیں لگ رہا تھا۔
انزلہ جو ہینڈ پمپ کے قریب کھڑی منہ دھو رہی تھی۔ چہرہ دوپٹے سے صاف کرتی ہوئی اس کی طرف بڑھ آئی۔
''کسی کے گھر میں داخل ہونے کا یہ کون سا مہذب طریقہ ہے سانول شاہ؟''
''میرے لیے گاؤں کے کسی بھی گھر میں داخل ہونے کا یہی طریقہ ہے مگر کان کھول کر سن لو

انزلہ شاہ...... تمہارے ہاتھوں پر اگر کسی اور کے نام کی مہندی لگی تو میں بھول جاؤں گا کہ میرا تم سے کیا واسطہ ہے...... سنا تم نے......"

اس کے لہجے کی غراہٹ تھی۔ انزلہ نے خاصی ناگواری سے اسے دیکھا۔

"بھول جاؤ...... مجھے تمہارے کسی واسطے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ میں ڈرتی ہوں تم سے سنا تم نے......؟ جو دل چاہتا ہے کرلو...... میں اپنی زندگی کے کسی فیصلے کے لیے تمہاری خوشی' ناخوشی کی پابند نہیں ہوں...... یہ میری زندگی ہے اور اس کا فیصلہ میں اپنی پسند سے کروں گی۔ تمہاری مرضی سے نہیں......"

"چٹاخ......"

انزلہ بھول گئی تھی کہ وہ اس وقت کس موڈ میں تھا۔

دادی اماں اس بربریت پر سینہ پیٹتی فوراً انزلہ کی طرف لپکی تھیں۔

"اس وحشی کے منہ مت لگو انجو...... یہ انسان نہیں ہے' جانور ہے جانور......"

"ہاں...... نہیں ہوں میں انسان...... مگر تمہارے ساتھ ابھی تک انسان بن کر ہی ملا ہوں بڑھیا......؟ یاد رکھنا' میرے رشتے کو ٹھوکر مار کر اچھا نہیں کیا تم نے...... شکر کرو کہ انزلہ شاہ کی دادی ہو...... ورنہ پورے گاؤں میں وہ تماشہ بناتا کہ یاد رکھتیں تم بھی...... اب دیکھتا ہوں کیسے سکون سے رہتی ہو اس گاؤں میں......"

اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔

انزلہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

"بہت مہنگی پڑے گی تمہیں یہ نفرت انزلہ...... بہت مہنگی......"

شہادت کی انگلی اٹھا کر تنبیہہ کرنے والے انداز میں کہتا وہ واپس پلٹ گیا تھا جب کہ انزلہ شاہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ دادی اماں کے چہرے پر ابھی تک ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"دادی اماں! آپ پریشان مت ہوں۔ سارا گاؤں اس سے ڈرتا ہے تو اس نے مجھے بھی تر نوالہ سمجھ لیا ہے مگر شاید وہ یہ جانتا نہیں کہ میں کس کی بیٹی ہوں...... جب تک میں اپنے سب ادھورے خواب مکمل نہیں کر لیتی یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ نماز پڑھیں تسلی سے پلیز......"

وہ بہادر تھی مگر دادی اماں اس رات ایک لمحے کے لئے بھی سکون سے نہیں سو سکی تھیں۔

اگلے روز گاؤں میں سب نے اس کی ناطقہ بندی کر دی۔ انزلہ جس سے بھی بات کرنے کی کوشش کرتی وہ منہ پھیر کر چل دیتا۔ کم از کم اس کے لیے یہ صورت حال ازحد پریشانی کا باعث تھی۔ لوگوں نے اگلے روز اپنے ایک بچے کو بھی اسکول نہیں بھیجا تھا۔

عجیب افسوس کا مقام تھا کہ جن کے لیے وہ تن تنہا جنگ لڑ رہی تھی وہی لوگ اس کا ساتھ دینے سے قاصر تھے۔ یہ غم کی شدت ہی تھی کہ اس نے ساتھ والے گاؤں کا وزٹ کیا تاکہ وہاں ان کے بچوں کو اور ان کے والدین کو تعلیم کی اہمیت سے روشناس کروا سکے...... اس طرف راغب کرا سکے مگر اسے کہاں خبر تھی کہ وہاں کس کی نگاہیں' اس کے تعاقب میں گھات لگائے بیٹھی ہیں......

❄❄❄

رات تیزی سے سرک رہی تھی جب صاعقہ اسپتال سے فارغ ہو کر عباد کے ہمراہ سڑک پر آئی۔ اس کے ٹخنے کی ہڈی اپنی اصل جگہ سے ذرا سی سرک گئی تھی جس کے لیے عباد کو اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اسے وہاں اپنے قابلِ اعتماد ڈاکٹر کے پاس لانا پڑا کیونکہ اس کے معاملے میں ذرا سی بے پروائی بھی اسے قابلِ قبول نہیں تھی۔

صاعقہ کا پاؤں اس وقت مکمل طور پر سن تھا لہٰذا اسے تکلیف کی شدت کا احساس نہ ہو رہا تھا تاہم چلنے میں اب بھی اسے شدید دشواری پیش آ رہی تھی۔

عباد نے اس کے لیے جلدی سے فرنٹ ڈور کھولا تھا اور وہ اب عجب بے بسی میں پھنسی بیٹھ گئی تھی کہ اب اس کے سوا دوسرا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

رات کے پرسکون لمحوں میں سبک روی سے چلتی ٹھنڈی پُرمہک ہوا نے اسے عجیب سے سکون کا احساس دلایا تھا مگر آگے کھلنے والے پول نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ تاہم اس کی نسبت عباد بہت خوشحال اور مسرور تھا۔ اپنا موبائل اس نے مسلسل آف کر رکھا تھا مبادا کوئی ضروری کال نہ آ جائے جو اٹینڈ کرنا لازمی ہو اور یوں صاعقہ پر اس کی حیثیت کھل جائے۔

''زرنیل جی! اب کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ؟'' گاڑی کو لاک کرتے ہی اس نے پوچھا تھا جواب میں صاعقہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اب بہتر ہے مگر آپ نے تمام پے منٹ کر کے مجھے شرمندہ کر دیا ہے۔ کاش گھر سے نکلنے سے پہلے میں کچھ پیسے پرس میں ڈال لیتی......''

''کوئی بات نہیں جن سے عقیدت ہوتی ہے ان کے کسی بھی کام آ کر بہت خوشی ملتی ہے اور پھر آپ تو میری خوشی کے لیے ہی وہاں آئی تھیں ناں تو پے منٹ مجھے ہی ادا کرنی چاہیے تھی۔ ویسے بھی آپ کی دعا سے مجھے جاب بہت اچھی ملی ہے۔ لہٰذا روپے پیسے کا کوئی پرابلم نہیں ہے۔''

اس کے سامنے وہ اتنا سادہ اور عاجز تھا کہ صاعقہ کا خوامخواہ ہی مغرور ہونے کو دل چاہتا۔ اسے اب تک عباد جیسے شاندار بندے کی اپنی ذات سے اس درجہ عقیدت کا اظہار سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

سبک رو سرد ہوا کا سلسلہ صاعقہ کی پشت پر پھیلے ریشمی بالوں سے اٹھکیلیاں کر رہا تھا اور عباد نگاہ بچا کر چوری چوری یہ کھیل دیکھ رہا تھا۔

''آپ نے کبھی بتایا نہیں کہ آپ کے گھر میں آپ کے علاوہ اور کون کون ہیں؟'' بالوں سے الجھنے کے دوران ہی صاعقہ نے اس سے پوچھا تھا جب وہ بولا۔

''آپ نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔ بہر حال میں اکلوتا بیٹا ہوں اپنے والدین کا' ایک چھوٹی بہن ہے اور وہ بہت ناٹی ہے۔ ایک پل سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی۔''

''ہوں...... شادی وادی کی آپ نے ابھی تک کہ نہیں......؟''

یہ سوال کرتے ہوئے اس کا دل دھڑکا تھا۔

عباد کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''ابھی کہاں...... کوئی لڑکی لفٹ ہی نہیں دیتی۔''

''کمال ہے...... اچھے خاصے شاندار بندے کو کوئی لڑکی لفٹ نہیں دیتی جب کہ میں نے تو یہ

دیکھا اور سنا ہے کہ آج کل لڑکیوں کو سوائے لفٹ دینے کے دوسرا کوئی کام ہی نہیں......"

"ہا...... ہا...... ہا...... آپ پہلی لڑکی ہیں جو اپنی صنف کے لیے اس قدر صاف گوئی سے کا لے رہی ہیں۔"

وہ اس کی بے ساختگی پر کھل کر ہنسا تھا۔

صاعقہ نے زبان دانتوں تلے دبا کر آہستہ سے رخ پھیر لیا۔

اگلے بہت سے پل خاموشی کی نذر ہو گئے تھے تب ہی صاعقہ نے اس سے اپنے روڈ پر گھر سے تقریباً دو گلی پیچھے ہی گاڑی رکوالی۔

"بس یہیں روک دیجیے...... میرا گھر آ گیا......"

علاقے کی معزز شخصیت ثناء اللہ ہاشمی کے گھر کے دروازے پر گاڑی رکواتے ہوئے اس نے پھر جھوٹ سے اپنا بھرم رکھا تھا۔ عباد دل ہی دل میں اس کی چالاکی پر مسکرا دیا۔

"او کے۔ گھر بہت خوب صورت ہے آپ کا...... ماشاء اللہ......"

گاڑی سے نکل کر صاعقہ کی سائیڈ کا ڈور کھولتے ہوئے اس نے سامنے سر اٹھائے کھڑی شاندار عمارت کی تعریف کی تھی جب وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

"شکریہ۔ پورے پانچ کروڑ کا ہے خوب صورت تو ہوگا ہی مگر مجھے تو یہ بھی پسند نہیں ہے۔ اصل میں میرا اسلام آباد والا گھر اس سے زیادہ خوب صورت ہے۔"

"واہ یہ اتنا خوب صورت ہے تو وہ گھر کیسا ہوگا؟" صرف اس کی خوشی کے لیے وہ متاثر ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔

صاعقہ اس "شو" پر دل ہی دل میں پھر سے اس کو بے وقوف بنانے پر ہنس دی۔

"وہ بہت خوب صورت ہے۔ خیر بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میری اتنی مدد کی۔ اس وقت میرا خیال ہے کہ گھر میں کوئی نہیں ہوگا۔ اس لیے معذرت کہ میں آپ کو چائے نہیں پلوا سکوں گی۔ میری پوزیشن کا تو آپ کو پتہ ہی ہے۔ آپ کی چائے قرض رہی مجھ پر......"

"نہیں...... نہیں ایسی کوئی بات نہیں...... چائے تو میں پیتا ہی نہیں ہوں۔ آیئے آپ کو گھر کے باہر تک چھوڑ آؤں۔"

وہ اس کی مجبوری سمجھتا تھا مگر پھر بھی ستا رہا تھا۔

صاعقہ دل ہی دل میں دانت پیستی بظاہر مسکرا کر بولی۔

"نہیں۔ اس زحمت کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ آپ اب جایئے پلیز۔"

اس کے زخم پر دوا کا اثر کم ہو رہا تھا جس کی وجہ سے اب کھڑے ہونے میں اسے تکلیف پیش رہی تھی اور عباد اس کے چہرے پر یہ تکلیف دیکھ چکا تھا تب ہی مزید تنگ کیے بغیر مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتا گاڑی میں آ بیٹھا۔

"او کے جی اللہ حافظ۔ پلیز اپنا خیال رکھیے گا۔"

"او کے اللہ حافظ۔" وہ جلد سے جلد اسے رخصت کرنا چاہتی تھی تب ہی عباد کے گاڑی اسٹارٹ کرنے پر شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ تاہم اسے "جل" دے کر وہ وہاں سے ہٹ تو گیا مگر صاعقہ کے گھ

میں داخل ہونے کا اطمینان کیے بغیر وہ واپس نہیں گیا۔

❊❊❊

دل اس سے مل گیا تو ستارے نہیں ملے
طوفاں سے بچ گئے تو کنارے نہیں ملے
اک دن گئے تھے ہم بھی ستاروں کو توڑنے
ایسے گرے کہ پر بھی ہمارے نہیں ملے
رونا تو یہ ہے ساتھ بھی رہنے کے باوجود
اس سے ہماری سوچ کے دھارے نہیں ملے
شاید رقیب لے اڑے قاصد کے ہاتھ سے
ہم کو کبھی خطوط تمہارے نہیں ملے

کچھ دیر بچے کے ساتھ کھیلنے اور اسے پیار کرنے کے بعد اچانک اس کا دھیان انوشہ کی طرف گیا تھا۔

جانے وہ کہاں تھی؟

اسے تو ایک منٹ کے لیے بھی اپنے بچے کا ادھر سے اُدھر ہونا گوارہ نہیں تھا۔ وہ قدرے متفکر سا بچے کو بازوؤں میں لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا۔ عبدالصمد کی کوئی روٹین نہیں تھی۔ موڈ ہوتا تو کئی کئی دن گھر پڑا رہتا اور اگر دل نہ چاہتا تو ہفتہ ہفتہ گھر کی راہ ہی نہ دیکھتا۔ پچھلے تین روز سے اس کا انوشہ سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے وہ متفکر ہوا تھا...... پھر جس وقت اس نے انوشہ کے کمرے کی دہلیز پر قدم دھرے' ٹھٹک گیا...... سامنے بیڈ پر کمبل کے بغیر وہ بے سدھ پڑی تھی۔

''انوشہ......'' لپک کر اس کے قریب آتے ہوئے اس نے پکارا تھا مگر انوشہ نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس کا چہرہ آگ کے شعلوں کی مانند دہک رہا تھا۔ شاہ زر نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی کو چھوا تو مزید متفکر ہو گیا۔ وہ بہت تیز بخار کا شکار تھی۔

تقریباً مدہوشی کی کیفیت میں سانس بھی مشکل سے آ رہی تھی تب ہی مجبوراً اس نے اسے دوبارہ پکارا تھا۔

''انوشہ......''

اس بار اپنے بازو پر اس کے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی۔

''انوشہ! تم ٹھیک ہو ناں......؟'' وہ ذرا سا جھکا تھا۔

انوشہ کے سر میں اس وقت اتنی تکلیف تھی کہ اسے شاہ زر کے صرف لب ہلتے دکھائی دے رہے تھے...... اس کا عکس بھی دھندلا دھندلا سا تھا مگر یہ اس کی نفرت کی انتہا تھی کہ اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے اس نے اپنا سر تکیے سے اٹھا لیا تھا۔

''تم...... کیوں آئے ہو تم یہاں......؟''

"تمہاری خبر گیری کرنے...... کب سے اس حال میں پڑی ہو اور مجھے خبر ہی نہیں......"

"کیوں خبر ہو تمہیں؟ میں چاہے مر بھی جاؤں تم کون ہوتے ہو میری خبر گیری کرنے والے؟"

"انوشہ......" وہ منمنایا تھا جب وہ دہاڑی۔

"مر گئی انوشہ...... اسی روز مر گئی تھی جس روز اس کی زندگی میں تم آئے تھے۔ خریدنا چاہتے تھے ناں تم مجھے...... دیکھو بک گئی میں...... اپنی ملازمہ بنانے کا شوق تھا ناں تمہیں...... بن گئی میں تمہاری ملازمہ...... اب اور کیا چاہتے ہو مجھ سے......؟ کیا جان لے کر پیچھا چھوڑو گے میرا......؟"

چکراتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے وہ چلا رہی تھی۔

شاہ زر کا چہرہ ضبط کی شدت سے سرخ ہو گیا۔

"مر جاؤ گی اتنی نفرت کے زہر میں انوشہ...... مجھ پر نہ سہی خود پر ہی رحم کر لو......"

"جاؤ...... چلے جاؤ یہاں سے پلیز......"

اس وقت وہ اپنے آپ میں لگ ہی نہیں رہی تھی۔ شاہ زر نے خاموشی سے بچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اوکے۔ یہ منے کو سنبھال لو۔ سیڑھیوں سے گر پڑا تھا۔"

"چٹاخ......" جوں ہی بچہ اس کے قریب ہوا اس نے بے دردی سے ایک تھپڑ اسے دے مارا۔

"نہیں مرتا یہ ایسے...... بڑی ڈھیٹ ہڈی ہے اس کی بھی......"

کتنی سفاک لگ رہی تھی وہ اس وقت......

شاہ زر کا چہرہ صدمے کی شدت سے برف ہو گیا تھا جب کہ بچہ اب رو رہا تھا۔

"انوشہ......"

بمشکل اس کے حلق سے آواز نکلی تھی مگر انوشہ نے تنفر سے رخ پھیر لیا۔

"اتنی نفرت انوشہ......؟ میں تو سمجھتا تھا کہ میں تمہارا قصور وار ہوں اس لیے تم مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہو مگر...... یہ بچہ...... یہ تو معصوم ہے انوشہ...... یہ بھی اتنا ہی مظلوم ہے جتنی کہ تم ہو...... پھر یہ تمہاری نفرت اور عتاب کا شکار کیوں......؟"

اب کے اس نے دہائی دی تھی مگر انوشہ پر اثر نہیں ہوا۔

"تمہارا خون ہے یہ...... تمہارا عکس ہے اس پر...... اور مجھے ہر اس چیز سے نفرت ہے جو کسی بھی طور سے تم سے جڑی ہو۔"

"اوکے۔ بہت تڑپ کر دیکھ لیا میں نے اور بہت جتا لی تم نے نفرت...... اب میرے بھی صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے انوشہ رحمٰن...... آج سے میں بھول رہا ہوں کہ تم کون ہو اور میرا کیا واسطہ ہے تم سے...... بس اتنا یاد رکھنا...... اس بچے کو اگر تمہاری طرف سے معمولی سی بھی تکلیف پہنچی تو میں برداشت نہیں کروں گا سمجھیں تم......؟"

"شٹ اپ۔"

وہ اپنے حواس میں تھی ہی نہیں۔ شاہ زر نے وہیں کھڑے کھڑے عبدالصمد کا نمبر پریس کر ڈالا۔ بچہ اب بھی اس کی طرف بڑھنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا رو رہا تھا۔

اگلے کچھ ہی منٹوں میں عبدالصمد گھر پر تھا جب کہ شاہ زر لاؤنج میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''جی سر! آپ نے یاد کیا خیریت......؟''

''اب تک کہاں تھے تم......؟''

اس کا مزاج برہم تھا۔ عبدالصمد گھبرا گیا۔

''ایک دوست کی طرف تھا۔ سب ٹھیک تو ہے ناں؟''

''کچھ ٹھیک نہیں ہے یہاں...... وہاں اوپر وہ لڑکی جسے تم اپنی بیوی بنا کر بیاہ کر لائے ہو۔ شدید بخار میں بے سدھ پڑی پھنک رہی ہے اور ادھر یہ معصوم بچہ...... جو تمہاری ذمہ داری ہے بھوک اور تکلیف سے بلک رہا ہے...... کیا سمجھتے ہو تم...... انہیں یہاں لا کر ساری ذمہ داریاں پوری ہو گئیں تمہاری......؟ میں نے چھت دی ہے تمہیں...... تمہاری ذمہ داریوں کو اپنے سر نہیں لیا۔ براہِ کرم انہیں یہاں سے لے جاؤ۔ میں اپنے گھر میں مفت کی پریشانی برداشت نہیں کر سکتا۔'' اس کا لہجہ تلخی سے پُر تھا۔

عبدالصمد کی جان پر بن آئی۔

''سوری سر! اگر ایسا ہے تو...... میں اصل میں ایک دوست کے ساتھ نیا بزنس اسٹارٹ کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا۔ اسی لیے گھر چکر نہیں لگا سکا پھر...... وہ انوشہ...... آپ کہہ رہے تھے آپ کی عزیزہ ہیں تو میں اس لیے بھی تھوڑا بے فکر ہو جاتا ہوں آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔''

شاہ زر نے اس بار لب بھینچ لیے تھے۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔

عبدالصمد اس کی خاموشی سے اپنی مرضی کا مطلب نکالتا اس سے ایکسکیوز کر کے اٹھا اور بنا بچے کی طرف کوئی دھیان دیے اوپر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا جو گُر اس کے علم میں تھے۔ شاہ زر ان سے بے خبر تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اب تک انوشہ کے معاملے میں بے بس رہا تھا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ آگے آنے والے دن اسے کیا دکھانے والے ہیں......؟

❁❁❁

شام ڈھل رہی تھی۔

ایان ڈھور ڈنگروں کے لیے چارا کاٹ کر ''باڑے'' میں ٹھکانے لگانے کے بعد پسینے میں شرابور باڑے کی صفائی کر رہا تھا۔ جب علیزہ خوب بنی ٹھنی موقع تاک کر وہاں چلی آئی۔

''چچ...... چچ...... ہر وقت کام...... ہر وقت کام...... کبھی ادھر بھی توجہ کر لیا کرو۔''

وہ ہوش ربا حسن کی مالک تھی مگر ایان کا اپنے نفس پر کنٹرول مضبوط تھا تب ہی نگاہ پھیر کر اس کی طرف دھیان کیے بغیر وہ بدستور اپنے کام میں جتا رہا۔

''ایان صاحب! میں آپ سے مخاطب ہوں۔''

اس کی بے نیازی پر اس نے پاؤں پٹخے تھے۔

مگر ایان نے اثر نہیں لیا۔

''تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو......؟''

اگلے ہی پل تپ کر وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''اس پورے گاؤں میں آج تک کسی نے مجھے نظر انداز کرنے کی ہمت نہیں کی۔ تم سمجھتے ہو تم کوئی آسمان سے اترے ہو۔ ایک میری نگاہ میں بچ گئے ہو تو مزاج ہی نہیں ملتے نواب کے......''

چھوٹی سی ناک کی پھنگیں پھلائے وہ اب غصے کا اظہار کر رہی تھی۔

ایان نے ''پھاوڑا'' روک دیا۔

''آپ جو بھی ہیں' جیسی بھی ہیں' مجھے اس سے کوئی دل چسپی نہیں۔ خدا کا واسطہ ہے آپ کو اپنے نفس کے گھوڑے پر قابو پانا سیکھیے کیونکہ شاید آپ کے علم میں نہیں ہے۔ نفس کی غلام عورتوں کا انجام مرنے کے بعد کتنا عبرت ناک ہے اور پھر میں یہاں کام کے پیسے لیتا ہوں۔ اپنے مالکوں کی عزت کی چادر میں چھید کرنے کے نہیں سمجھیں آپ......؟ اب اس سے پہلے کہ میں آپ کے باپ بھائیوں سے آپ کی شکایت کروں یا یہ کام چھوڑ کر چلا جاؤں' خدا کا واسطہ ہے آپ کو سدھر جائیں۔ نہیں تو مجھے مجبوراً وہ کرنا پڑے گا جو میں نہیں کرنا چاہتا۔''

اس کے چہرے پر خفگی اور لہجے میں مضبوطی تھی۔

علیزہ کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر دھیرے سے ہنس پڑی۔

''گڈ ویری گڈ......اور تھینکس مسٹر ایان کہ آپ آج کل کے عام نفس کے غلام مردوں جیسے نہیں ہیں...... میں اصل میں آپ کو آزما رہی تھی اور سچ کہتی ہوں اگر آپ اس آزمائش میں فیل ہو جاتے تو فوراً یہاں سے نکال دیے جاتے کیونکہ میں اپنے بابا کی بہت لاڈلی ہوں اور میری ذرا سی شکایت کسی بھی ملازم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔''

اب کے چونکنے کی باری ایان کی تھی۔ وہ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''بہرحال مجھے خوشی ہوئی کہ آپ اچھے لڑکے ہیں۔ میں بھی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ بارہ جماعتیں پڑھی ہیں۔ حویلی کا نظام وانتظام بھی میرے ہی ہاتھوں میں ہے۔ صرف آپ کی اچھائی اور کردار کی مضبوطی نے مجھے متاثر کیا ہے۔ کیا آپ میرے صرف اچھے دوست بن سکتے ہیں......؟''

اب کے تقاضا مختلف تھا۔

ایان الجھ کر رہ گیا۔

''سوری...... میں اسے پسند نہیں کرتا۔''

''کوئی بات نہیں......بس کبھی کبھی میں اپنا کوئی دکھ آپ سے شیئر کر سکتی ہوں کہ نہیں؟''

اب کے اس کی پلکیں بھیگی تھیں۔

ایان اسے دیکھتا رہ گیا۔

''اوکے۔'' کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا۔

علیزہ کے چہرے پر رنگ سے بکھر گئے۔

''تھینکس......تھینک یو ویری مچ......''

وہ خوش ہوئی تھی۔

ایان پھر سے کام میں جت گیا۔

اگلے دو تین روز وہ اسے نظر نہیں آئی تھی۔ تاہم چوتھے روز عام سے حلیے میں' اداس اداس سی وہ

بارے میں ہی نظر آ گئی۔
''السلام علیکم......''
وہ دودھ دوہ رہا تھا جب وہ پاس آ کھڑی ہوئی۔
''وعلیکم السلام!'' ایان نے اس بار فوری جواب دیا تھا۔
''کیسے ہو......؟''
''آپ کو کیسا نظر آ رہا ہوں؟''
''بہت اچھے......'' وہ مسکرائی تھی۔ ایان بالٹی اٹھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔
''ایان......''
''جی......''
''ایک مدد مانگوں تو کرو گے؟''
''کیسی مدد......؟''
اس کی رائے علیزہ کے بارے میں بدلی تھی تب ہی لہجہ نرم ہوا تھا۔
علیزہ کچھ دیر سوچتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی وہیں بیٹھ گئی۔
''مجھے غلط مت سمجھنا پلیز...... اصل میں ایک لڑکا ہے سعد...... شہر میں پڑھتا ہے۔ بچپن سے ہم ساتھ کھیلے ہیں۔ اب بڑے ہو کر بھی ہم دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے بہت جگہ ہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور میں...... میں بھی اس کے بغیر جینے کا تصور نہیں کر سکتی۔ مگر......''
''مگر کیا......؟'' وہ خاموش ہوئی تھی جب ایان نے پوچھا تھا۔
''مگر...... میرے بھائی ایسا نہیں چاہتے...... میرے حصے کی جائیداد بچانے کے لیے وہ میرا بیاہ قرآن پاک سے کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں بابا کو بھی انہوں نے اپنا ہم خیال بنا لیا ہے خیر...... میں صرف ایک بار سعد سے ملنا چاہتی ہوں...... اس سے پہلے کہ وہ خود کو کوئی نقصان پہنچائے میں اسے سمجھانا چاہتی ہوں مگر...... بابا لوگوں کو چونکہ اس بات کی خبر ہو چکی ہے اس لیے میرے حویلی سے باہر پابندی ہے......''
''تو......؟''
''تو یہ کہ پلیز ایک انسان ہونے کے ناتے میری مدد کرو...... مجھے صرف ایک بار سعد سے ملا دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں تمہارے ساتھ ہی واپس آ جاؤں گی......''
وہ رو پڑی تھی۔
ایان الجھن کا شکار ہو گیا۔
''مگر......''
''اگر مگر کو چھوڑو ایان...... کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا پلیز......''
اب اس کے آنسوؤں میں شدت آ گئی تھی۔
ایان کو ناچار ہتھیار ڈالنا پڑے۔
''ٹھیک ہے کب چلنا ہے......؟''

"آج..... آج رات ہی...... پرسوں تو نکاح ہو جائے گا میرا......"

"ٹھیک ہے اگر مالکوں کو پتہ لگ گیا تو......؟"

"نہیں لگے گا...... ابو اور بھائی آج شام کو کہیں جا رہے ہیں۔ شاید کل صبح واپس آئیں...... اماں اور بھابیوں کو دوست کا کہہ دوں گی۔"

"او کے...... لیکن جائیں گے کیسے......؟"

"رکشہ ٹیکسی جو مناسب سمجھو لے آنا تاکہ حویلی میں کسی کو پتہ نہ لگے۔ کرایہ میں دے دوں گی۔" وہ منتیں کر رہی تھی۔ ایان سر ہلا کر دودھ کی بالٹی اٹھائے باڑے سے نکل گیا۔

اسی روز رات میں سخت کشمکش کا شکار رہ کر اس نے بالآخر ٹیکسی کرائے پر حاصل کر لی تھی۔

حویلی کی اونچی دیواروں میں رات کے سناٹے نے پوری طرح اپنے پر پھیلا لیے تھے۔ اماں نے ملک اور اس کے بیٹوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے پُجارو میں رخصت کیا تھا تب ہی اسے قدرے اطمینان تھا۔ علیزہ مقررہ ٹائم پر جوتے ہاتھ میں لیے دوسرے ہاتھ سے اپنا آنچل سنبھالتی دبے پاؤں حویلی سے باہر نکل آئی تھی۔

اگلے پندرہ منٹ کے سفر کے بعد اس نے گاڑی رکوا کر بوتل منگوائی تھی۔ ایان قریبی دکان سے بوتل لے آیا کہ علیزہ کو گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ سفر دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔ ابھی پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ڈرائیور گاڑی کو ریورس کر کے دوسرے راستے پر لے آیا۔

ایان اپنی سوچ اور خیالوں میں مگن تھا۔ گاڑی اچانک پولیس اسٹیشن کے سامنے رکی تو وہ چونکا۔

"پولیس اسٹیشن......"

❁❁❁

اس دل کی اداس باتیں
سمجھنے والا کوئی تو ہوتا
کہ جس کی باتوں سے دل سنبھلتا
کہ جس کی سنگت میں دل بہلتا
کہ جس کی ہلکی سی اک جھلک بھی ہمارے دکھ کو سمیٹ لیتی
فلک سے خوشیاں انڈیل دیتی
یا اس کی نازک مسکراہٹ
ہمارے دن کی سبھی تھکاوٹ کو دور کرتی
یا پھر چمکتی وہ آنکھیں اس کی ہماری ہستی کا راز ہوتیں
ہمارے دل کی کتاب ہوتیں
جو ہم کو چاہتا، وہ ہم کو پڑھتا، گزرتے لمحوں کی سختیوں میں
کوئی تو نازک مزاج ہوتا......

جس وقت اس کی آنکھ دوبارہ کھلی کمرے میں اچھی خاصی روشنی پھیل چکی تھی۔

اس کی چارپائی کے قریب جائے نماز پر بیٹھی مائی حاجن' دعا میں ہاتھ اٹھائے زار و قطار رو رہی تھیں۔

"مالک! اسے ستر ماؤں سے بڑھ کر پیار کرنے والے۔ میں تیری محبت کے قابل نہیں ہوں۔ بدل دے۔ کہاں جاؤں گی اگر تو مجھ سے بے نیاز ہوگا۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے تیرے سوا۔ اے مالک! تجھے تیری پاک ذات کا واسطہ مجھے ان لوگوں میں شامل فرما دے جن سے تو راضی ہوا۔ میرے مالک! مجھ سے راضی ہوجا' مجھے بخش دے' میرے مولا! میں تیری پناہ مانگتی ہوں۔ شیطان مردود سے' شیطانی وسوسوں سے' بُرے دن' بُری رات' بُرے وقت بُری گھڑی سے۔ عافیتوں کے جانے اور نعمتوں کے چھن جانے سے۔ اے اللہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے صدقے تمام امت مسلمہ پر اپنا رحم فرما۔"

گلو گیر لہجے میں عاجزی وانکساری سے بولتے ہوئے وہ شدت سے رو رہی تھیں۔

گوری حیران نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ اس کے کپڑے پسینے سے شرابور تھے۔

تھوڑی دیر پہلے دیکھے گئے خواب کے زیرِ اثر اب بھی اس کا بدن خوف سے کپکپا رہا تھا۔ دماغ میں اب بھی جیسے آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

مائی حاجن دعا سے فارغ ہوکر اس کی چارپائی کے قریب آئیں تو وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"لماں......!"

"جی بچے!" پُرنُور نگاہوں میں نمی کے ساتھ ساتھ محبت بھی تھی۔

گوری یک ٹک ان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

"لماں! اللہ سے اتنی قریب ہونے کے باوجود' اس سے اتنی محبت کے باوجود' آپ دعا میں یوں رو رہی تھیں جیسے جانے کتنی گناہ گار ہوں۔ کیوں......؟"

مائی حاجن کے لب اس کے معصوم سوال پر زور سے مسکرائے تھے۔

"محبت، اللہ سے محبت آسان نہیں ہے بچے!"

"کیا مطلب؟ اللہ سے محبت ہی تو آسان ہے اماں۔ دنیا اور انسانوں سے محبت تو بہت خوار کرتی ہے۔" اس نے اپنی دانائی جھاڑی تھی۔

مائی حاجن کے چہرے پر عجیب سی اُداسی بکھر گئی۔

"بہت مشکل ہے۔ اللہ سے محبت کر کے اس تک پہنچنا' عمریں بیت جاتی ہیں بیٹی! مگر انسان رب سے محبت کا صحیح حق ادا نہیں کر سکتا۔ جو علم والے ہیں' عقل والے ہیں' وہی جانتے ہیں' حقیقی کیا ہے۔ عشقِ حقیقی کے امتحان کیا ہیں؟ محبوب کا خفا ہو جانا' دور ہو جانا' کیسی اذیت رکھتا ہے۔ یہ انسان جو بدبودار مٹی سے بنا ہے۔ اس کی محبت میں دوسرا انسان کیا سے کیا ہو کر رہ جاتا ہے۔ صرف اس کی نگاہ میں مقام پانے کے لیے اس کے دل میں جچنے کے لیے' کتنی قربانیاں دیتا ہے۔ دکھ اٹھاتا ہے۔ رسوائی مول لیتا ہے۔ کئی کئی سال سلگتے گزر جاتے ہیں۔ پھر بھی راحت نہیں ملتی' کہیں نہیں ملتی۔ اپنے جیسے انسان کی محبت میں سرخرو ہونے کے لیے۔ سر سے پاؤں تک بدل لیتے

ہیں ہم خود کو ہر وہ چیز اپنے لیے حرام کر لیتے ہیں جو ہمارے محبوب کو ناپسند ہو۔ دنیا تیاگ دیتے ہیں، مذہب بھول جاتے ہیں۔ کعبہ اور قبلہ میں محبوب کی صورت نظر آتی ہے' مگر پھر بھی کہیں معمولی سی ذرا سی لغزش پر اس بدبودار مٹی سے بنے انسان کی محبت ہمیں گرا دیتی ہے' عرش سے فرش پر پٹخ دیا ہے۔ تو پھر وہ' وہ تو خالق ہے محبت کی مکڑی سے کائنات کا جالا بننے والا۔ اس کی نگاہ میں مقام پانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا ہوگا' خود کو کتنا بدلنا اور سنوارنا پڑتا ہوگا؟''

مائی حاجن کی آنکھوں سے اب بھی آنسو گر رہے تھے۔

گوری مسمرائزسی انہیں دیکھے گئی۔

''انسان اور اللہ کی محبت کی داستان سنو گی بیٹی......؟''

کچھ دیر خاموشی کے بعد اچانک سر اٹھاتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔

انہماک سے ان کی طرف دیکھتی ہوئی گوری کا سر آپ ہی آپ اثبات میں ہل گیا۔

❁❁❁

''ایان! تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

ٹیکسی پولیس اسٹیشن کی عمارت کے سامنے کھڑی تھی' جب اچانک علیزہ نے اس سے پوچھا۔ جواب میں وہ قدرے بھینچے لبوں کے ساتھ' اپنی سائیڈ کا دروازہ دھکیل کر ٹیکسی سے باہر نکل آیا۔

''نہیں۔''

اس کی آنکھوں میں ایک دم سے جیسے جلن بڑھی تھی۔ علیزہ مسکرا کر رہ گئی۔

''کر بھی کیسے سکتے ہو' لوہے جیسا تو دل ہے تمہارا۔''

''ہوں' میرا خیال ہے ابھی گاؤں واپس چلتے ہیں۔ دیکھو بادل بہت زور کے چڑھے ہیں۔ مجھے اس وقت ڈھور ڈنگروں کے پاس ہونا ضروری ہے۔ تم اپنے دوست سے ملنے کے لیے کل آ جانا۔''

''نہیں' اتنی مشکل سے تو نکلے ہیں حویلی سے' پھر پتا نہیں یہ موقع ملے نہ ملے۔''

''مل جائے گا میں گارنٹی دیتا ہوں' ابھی چلو۔''

اسے خطرے کی بُو آ رہی تھی۔ علیزہ اس کے اٹل ارادے پر دانت پیس کر رہ گئی۔

اگلے روز ابھی وہ باڑے کی صفائی کر رہا تھا کہ حویلی میں اس کے ساتھ ہی کام کرنے والا نوعمر لڑکا عاطف' پشت پر جانوروں کے لیے چارے کی بھاری مقدار اٹھائے وہاں چلا آیا۔

''ایان۔''

وہ پھاوڑے سے گوبر سمیٹ رہا تھا۔ جب عاطف نے چارے کی بڑی سی گانٹھ کو کچی دیوار کے ساتھ لگا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہوں' بولو۔'' ایان اپنے کام میں ہی مگن تھا۔

عاطف نے کمر سے بندھا کپڑا کھول کر جھاڑ دیا۔

''کل علیزہ بی بی کو لے کر کہاں گئے تھے تم؟''

ایان کے قریب پہنچ کر قدرے مشکوک انداز میں اس نے پوچھا تھا۔

ایان کا پھاوڑے پر جما ہاتھ فوراً رک گیا۔
"کہیں نہیں' ان کا نکاح ہو رہا ہے تو شہر میں اپنی کسی دوست سے ملنا چاہ رہی تھیں مگر میں موسم میں خرابی کے باعث راستے سے ہی واپس آ گیا۔"
"نکاح؟ تجھے کس نے کہا کہ ان نکاح ہو رہا ہے۔"
ایان کے روکھے لہجے پر وہ حیران ہوا تھا۔تبھی اس نے بتایا۔
"پتا لگا تھا کہیں سے کہ ملک قرآن پاک سے ان کا نکاح کر رہے ہیں۔"
وہی اس کا مصروف اور بے نیازانہ انداز۔
عاطف حیران سا دیوار سے لگ گیا۔
"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"
"کیوں نہیں ہو سکتا' ان وڈیروں جاگیرداروں کی تو ریت ہے یہ......"
"دماغ تو نہیں چل گیا تیرا' ملک شاہ نواز کی بیٹی ہے علیزہ۔ اپنی جان سے بڑھ کر چاہتے ہیں وہ اسے۔ پھر بھلا قرآن سے کیوں نکاح کرنے لگے۔"
ایان کے لیے یہ انکشاف تھا۔اب وہ حیرانی سے منہ کھولے عاطف کو دیکھ رہا تھا۔
"یہ کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے تو علیزہ بی بی نے خود بتایا تھا کہ......"
"چھوڑ یار' ایک نمبر کی دل پھینک لڑکی ہے ملک شاہ نواز کی' تجھ سے پہلے اب تک جتنے بھی جوان حویلی میں کام کے لیے آئے سب بھاگ گئے۔ کسی کی سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے وہ۔ اس لیے میرے یار عقل سے کام لے اور جتنا ہو سکتا ہے اس سے دور رہ۔ ویسے بھی وہ اپنے ماموں زاد کی منگ ہے۔ دیکھ ذلیل نہ ہو جانا' ان عورتوں کے فریب سے اللہ بچائے۔"
"پتا ہے مجھے تو بے فکر رہ۔ مجھ پر اس کی کوئی ہوشیاری اثر انداز ہونے والی نہیں ہے۔" دل ہی دل میں علیزہ کے جھوٹ پر پیچ و تاب کھاتا وہ بظاہر سکون سے اسے کہہ رہا تھا۔
عاطف اس کا کندھا تھپتھپا کر باڑے سے نکل گیا۔
اس رات اسے فصلوں کو پانی دینا تھا۔لہٰذہ وہ ڈیرے پر ہی رُکا رہا۔رات تقریباً اڑھائی بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ضرورت کا دیگر سامان اٹھا کر کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ سرد ٹھنڈی رات کے اس پہر آسمان سے جیسے سکون کے خزانے اترے تھے۔ زمین پر دور کہیں اجنبی راہ گیر پر بھونکتے کتوں کی آواز اور قریبی فصلوں میں پھدکتے مینڈکوں کی ٹرٹر نے چاندنی رات کے فسوں میں جیسے خلل سا ڈال رکھا تھا۔
وہ ذہن میں مختلف سوچوں سے لڑتا' ابھی اپنے کھیتوں کے قریب پہنچنے ہی والا تھا کہ اچانک اس کے قدم رک گئے۔ بہت قریب سے ابھرتی' نسوانی آواز کے ہلکے سے قہقہے نے اسے آگے بڑھنے ہی نہیں دیا۔
"اب جاؤں۔تمہارا دل تو کبھی نہیں بھرے گا۔"
آواز مدھم مگر واضح تھی۔
ایان کے ہاتھوں کی گرفت اپنے اوزاروں پر ڈھیلی پڑ گئی۔ تبھی اسے مردانہ آواز سنائی دی تھی۔

جو جذبات کے نشے میں چور تھی۔
''تھوڑی دیر اور رک جاؤ' پھر چلا جاؤں گا۔''
''نہیں' بس اب چلو۔''
فصلوں میں سرسراہٹ بڑھی تھی اور اسی کے ساتھ ایان کی آنکھیں جیسے حیرانی سے پھٹ پڑیں اس کے سامنے اس وقت علیزہ اور عاطف کھڑے تھے۔ عجیب شرمناک حال میں۔ جھٹکا دونوں طرف برابر کا تھا مگر ایان کو لگا جیسے اس کے اردگرد کی ساری زمین گول گول چکر میں گھوم رہی ہے۔ اس وقت بڑی مشکل سے وہ قدم آگے بڑھانے کے لیے خود کو تیار کر سکا تھا۔

❁❁❁

عبدالصمد اچھی طرح انوشہ رحمٰن کی درگت بنانے کے بعد سرخ چہرہ لیے کمرہ سے نکل چکا تھا۔ جب کہ وہ پیشانی پر لگے خون سے بے نیاز' بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگائے بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر' بیڈ پر پڑا اس کا سیل بج رہا تھا اور اسکرین پر ''زاور بھیا'' کا نام بار بار چمک رہا تھا' مگر اس نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ دیکھ بھی لیتی تب بھی وہ شاید کال پک نہ کرتی کہ اس حال میں سمندر پار بیٹھے ''اپنوں'' کو دکھ دینے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔
شاہ زر گھر پر نہیں تھا اور اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر سیر و تفریح کی غرض سے نکل گیا تھا اور عبدالصمد نے اسی کا فائدہ اٹھایا تھا۔
رات جس وقت وہ گھر واپس لوٹا تاریکی اچھی خاصی پھیل گئی تھی۔
بچہ کھیلتے کھیلتے اس کے بازوؤں میں سو چکا تھا۔ وہ اسے انوشہ کے سپرد کرنے اوپر آیا تھا' مگر سامنے کے منظر نے اسے وہیں دہلیز پر ٹھٹک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

❁❁❁

رات اس کی آنکھ صاعقہ کے بارے میں سوچتے ہوئے خاصی دیر سے لگی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اگلے روز وہ کافی لیٹ بے دار ہوا تھا۔ شاور لے کر' ہلکی پھلکی تیاری کے بعد جس وقت وہ اپنے کمرے سے نکل کر نیچے ہال میں آیا اپنی مما اور پپا کو اپنا منتظر پایا۔
''آؤ برخوردار' آپ کا انتظار ہی ہو رہا تھا۔''
حسن صاحب کی نگاہ جیسے ہی اس پر پڑی انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اخبار لپیٹ کر سائیڈ پر رکھ دیا۔
''کیا مصروفیات ہیں آج کل' آفس میں ٹکتے ہی نہیں ہو؟''
وہ صوفے پر ان کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ جب وہ اپنا بازو محبت سے اس کے دونوں کندھوں کے گرد پھیلاتے ہوئے بولے۔ البتہ آسیہ بیگم محبت پاش نگاہوں سے اپنے لاڈلے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔
''کچھ نہیں پاپا' آفس میں نہ رہ کر بھی جان بزنس میں ہی اٹکی رہتی ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کم از کم کام کے معاملے میں' میں قطعی بے پروائی نہیں کرتا۔''
''ویری گڈ' اسی لیے فخر کرتا ہوں میں اپنے بیٹے پر۔ بہر حال ہانیہ کی شادی پر تمہارے چچا کی

ملک پاکستان آرہی ہے۔ موصوف بتا رہے تھے کہ ہادیہ نے اپنا ایم بی اے مکمل کرلیا ہے اور اب وہ یہاں کچھ عرصہ تمہارے ساتھ رہ کر اپنا بزنس ہوم ورک مکمل کرے گی۔ پھر اس کے بعد تمہاری اس سے شادی کا سوچتے ہیں۔"

"مگر پاپا......!"

وہ بے چین ہوا تھا۔ تبھی حسن صاحب مسکرا دیے۔

"بس اب کوئی آئیں' بائیں' شائیں مت کرنا۔ ہمارے بھی کچھ خواب ہیں' خواہشیں ہیں۔ کیا وہ قبر میں جا کر پوری ہوں گی؟"

"پاپا پلیز' ایسی بات نہیں ہے۔ اصل میں' میں ابھی زندگی کو انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ ذمہ داریوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"تمہاری عمر میں میری بھی یہی سوچ ہوتی تھی مگر تمہاری مما کے زندگی میں آنے کے بعد پتا چلا کہ زندگی حقیقت میں کتنی خوب صورت ہے۔"

اس کے دبے دبے احتجاج پر وہ مسکرائے تھے۔

عبادان کی شوخی پر خود بھی مسکرا اٹھا جب کہ آسیہ بیگم جھینپ کر حسن صاحب کو گھورنے لگیں۔

"او کے پاپا! مجھے ابھی تھوڑی دیر میں سڈنی کے لیے فلائی کرنا ہے۔ میں تیاری کرلوں۔" انہیں آپس میں مگن دیکھ کر اس نے فوراً فرار چاہا تھا جب وہ بولے۔

"ہاں' ہاں کیوں نہیں' مگر اس بار اپنے چچا سے ملنا مت بھولنا۔ پچھلی بار بھی' تمہارے چپ چاپ آنے پر شکایت کر رہے تھے۔"

"او کے پاپا۔"

الجھے الجھے سے دل و دماغ کے ساتھ وہ فوراً وہاں سے اٹھ گیا تھا۔

سڈنی روانگی سے قبل اس نے بار بار صاعقہ کے سیل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس کا سیل مسلسل آف جا رہا تھا۔ جس پر شدید پریشانی کی کیفیت میں مجبوراً اسے اس سے بات کیے بنا پاکستان سے روانہ ہونا پڑا۔

سڈنی میں کاروباری امور سے فارغ ہو کر' عرصہ دراز کے بعد جس وقت وہ اپنے چچا کے گھر آیا۔ وہاں اس کا استقبال خاصی گرم جوشی کے ساتھ ہوا تھا۔ چچا اور چچی تو اسے دیکھتے ہی گویا نہال ہو گئے تھے۔

رات کھانے کے بعد وہ ہادیہ کے کمرے میں آیا تھا اور وہ بھی اس کے زبردستی کھینچ لانے پر۔

"تم بہت اسٹوپڈ ہو عباد بچی۔"

ہلکا سا دھکا دے کر اسے اپنے بیڈ پر گراتے ہوئے وہ بولی تھی۔ جب وہ ہنس دیا۔

"کیوں' اب کیا کر دیا میں نے؟"

"کیا کر دیا؟ پورے ایک سال بعد اِدھر کا چکر لگایا ہے تم نے اور وہ بھی انکل سے شکایت کرنے پر' تمہیں تو شاید یاد بھی نہیں رہا کہ ہم کتنے اچھے دوست ہیں۔"

وہ صحیح گلہ کر رہی تھی عباد سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''یاد ہے مجھے' تم جیسی چڑیل کو بھلا بھول سکتا ہوں میں۔''
وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔ ہادیہ اس پر چڑھ دوڑی۔
''کیا' میں چڑیل ہوں؟ اور تم' تم خود کیا ہو' مرگھٹ کے بھوت۔'' ہلکے غصے میں وہ اس کے مضبوط شانے پر مکے برسا رہی تھی جب اس کی چچی وہاں آ گئیں۔
''یہ لو گرم گرم کافی۔''
''تھینکس آنٹی۔'' ہادیہ سے جان چھڑا کر اس نے فوراً کافی کا کپ تھام لیا تھا۔
''آسٹریلیا میں مزید کتنے دن قیام ہے تمہارا؟''
قریبی صوفے پر ٹکتے ہوئے انہوں نے عباد سے پوچھا تھا۔ جب وہ بولا۔
''بس آج کی رات ہے' کل صبح کی فلائٹ سے پاکستان روانگی ہے۔''
''اتنی جلدی' کچھ دن ٹھہر جاؤ ناں۔ پہلے تو ایک ایک ماہ رک جاتے تھے۔''
ہادیہ بولی تھی۔ وہ دامن بچا گیا۔
''پہلے کی بات اور تھی مائی ڈیئر۔ اب آفس کی تمام ذمہ داری میرے کندھوں پر ہے۔ خیر تم کب آ رہی ہو پاکستان؟''
''نیکسٹ ویک' کیوں؟''
''ذرا ہیلپ ہو جائے گی پاپا بتا رہے تھے کہ تم آفس جوائن کرنا چاہتی ہو۔''
''ہوں' سوچا تو یہی ہے۔''
''چلو پھر' میں ویٹ کروں گا۔''
مسکرا کر کہتے ہوئے وہ فوراً ہی تھکن کا بہانہ بنا کر آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔ مگر درحقیقت اس کا دل صاعقہ سے بات کرنے کو مچل رہا تھا جو پچھلے دو روز سے جانے کہاں تھی۔
صاعقہ کا سیل مسلسل بج رہا تھا مگر وہ چاہتے ہوئے بھی عباد کی کال پک کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ کیونکہ اس کی ماں اس وقت اسپتال میں تھی اور ڈاکٹرز کے مطابق ان کے کچھ ٹیسٹ ضروری تھے۔
پچھلے دو ماہ سے انہیں کھانسی کے ساتھ خون آ رہا تھا۔ مگر غربت کے پیش نظر انہوں نے گھر میں' کسی کو نہیں بتایا تھا۔ تاہم اب بات ان کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ سارا سارا دن مشین پر بنا آرام کیے لگاتار کپڑے سی سی کر صائمہ کی کمر میں بھی مسلسل درد رہنے لگا تھا جب کہ دواؤں کا سلسلہ رُک جانے پر سفان کی ٹانگ کا زخم بھی دوبارہ بگڑنا شروع ہو گیا تھا۔ پریشانی ہی پریشانی تھی۔
صاعقہ' جس کے دل نے ابھی نیا نیا کسی کی محبت کے احساس میں دھڑکنا سیکھا تھا۔ حالات کی اس ستم ظریفی پر بوکھلا کر رہ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس سے مدد مانگے۔ پہلے ایان سے بچھڑ جانے کا غم اور پریشانی کیا کم تھی کہ اب حالات اسے مزید توڑنے پر تل گئے تھے۔ گھر کے حالات اور معذوری نے سمعان کو بھی چڑچڑا بنا دیا تھا۔ وہ بھی سارا سارا دن بستر پر پڑا چھوٹے دونوں بھائیوں کو ڈانٹتا رہتا تھا۔
صاعقہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ حالات کی کس چکی میں پسنے جا رہی ہے۔

❁❁❁

ازلہ اس وقت گاؤں مراد شاہ کی دھول اڑاتی 'کشادہ کچی سڑک پر تنہا کھڑی پسینے سے شرابور ہو رہی تھی جب اچانک سامنے سے آتی جیپ زوردار جھٹکے کے ساتھ اس کے قریب آرکی۔

"ہیلو۔"

ازلہ نے چہرے پر آیا پسینہ ٹشو سے صاف کرتے ہوئے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ جہاں مکمل سفید لباس میں ملبوس ایک نکھرا نکھرا سا شخص خاصی فرصت سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"آپ کے گاؤں میں سلام کرنے کا رواج نہیں ہے کیا؟"

اسے نو وارد کا "ہیلو" کہنا بُرا لگا تھا۔ تبھی اظہار کیے بغیر نہ رہ سکی تو وہ بولا۔

"معذرت اگر آپ کو بُرا لگا تو السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام! اب فرمائیے کون ہیں آپ اور یوں میرا راستا کیوں روکا ہے آپ نے؟"

اس اجنبی مرد کو مقابل پا کر بھی وہ نہیں گھبرائی تھی۔ تبھی وہ مسکرایا تھا۔

"میں نے تو راستا نہیں روکا آپ کا' ہاں اتنی سخت دوپہر میں ایک اجنبی اکیلی لڑکی کو یوں سڑک کنارے کھڑی دیکھ کر اپنے حساس اور ہمدرد دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بریک لگا دی۔ وگرنہ تو پورا دن کھیتوں میں گھومنے کے باعث اتنی تھکن ہو رہی ہے کہ حد نہیں۔ خیر میرا نام مراد علی شیر ہے۔ پڑ دادا کے نام پر میرا نام رکھا گیا تھا اور یہ گاؤں جس میں اس وقت آپ موجود ہیں انہی کے نام سے منسوب ہیں۔"

"مطلب اب آپ اس گاؤں کے مالک ہیں۔"

"اب" پر زور دیتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ بولا۔

"مالک تو ہر شے کی صرف اللہ رب العزت کی ذات ہے بی بی! میں اور آپ تو صرف خادم ہیں۔ خیر فرمائیے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

مقابل کی سیاہ مقناطیسی نگاہوں میں کسی ہوس یا فریب کا شائبہ تک نہ تھا۔

ازلہ کڑی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتی۔ بالآخر رخ پھیر گئی۔

"مجھے حویلی والوں سے ملنا تھا۔ کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے تشریف رکھیے میں حویلی کی طرف ہی جا رہا تھا۔ ویسے یہ گاؤں اس وقت میرے بابا صاحب کی زیرِ نگرانی ہی ہے اور بھروسا رکھیے میرے لیے آپ بالکل سگی بہنوں جیسی محترم ہیں۔"

وہ شاید اس کی نگاہیں پڑھ چکا تھا۔ ازلہ کو اس پر بھروسا کرنا پڑا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد جیپ حویلی کے بڑے سے محرابی دروازے کے سامنے رُکی تھی۔

"تشریف لائیے۔ میں ماں جی اور بابا کو آپ کی آمد کی اطلاع کرتا ہوں۔"

چھلانگ لگا کر وہ جیپ سے اترا تھا۔ ازلہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"لیکن آپ میرا تعارف کیا کروائیں گے؟"

"یہی کہ آپ ازلہ شاہ ہیں جو شہر سے ڈھیر ساری ڈگریاں لے کر آئی ہیں اور جن کے بابا کو ہمارے گاؤں کے چوہدریوں نے ناگہانی موت مار دیا تھا۔"

مراد علی شاہ کے تفصیلی جواب نے اسے ہکا بکا ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔
''آپ کیسے جانتے ہیں میرے بارے میں؟''
''بس دیکھ لیں۔ بابا کہتے ہیں کہ وہ آپ کے بابا کے بہت اچھے دوست تھے۔ یوں سمجھ لیں کہ ایک جان دو قلب تھے۔ جن دنوں آپ کے بابا کی ڈیتھ ہوئی' میرے بابا ملک سے باہر تھے۔ تاہم جب آپ شہر سے گاؤں آئیں بابا کو فوراً پتا چل گیا مگر چوہدریوں سے دیرینہ دشمنی کے باعث انہوں نے آپ کو پیغام نہیں بھیجا۔ بہر حال میں اطلاع کرتا ہوں۔''
جلدی جلدی وضاحت دیتا وہ ابھی پلٹا تھا کہ کوئی تیز تیز قدم اٹھاتا ہاتھ میں رائفل لیے مراد علی شیر کے قریب آ کھڑا ہوا۔
''اتنی دیر لگا دی واپسی میں مراد۔ میں نے کہا بھی تھا کہ مجھے شہر جانا ہے۔''
آنے والی بارعب شخصیت کی آنکھوں میں قدرے غصہ تھا۔
مراد علی شیر اس کی خفگی پر کان کھجاتا مسکرا دیا۔
''سوری بھائی' اصل میں ہم بہت دور نکل گئے تھے۔ جلدی واپسی ممکن ہی نہ ہو سکی۔ خیر ان سے ملیں۔ یہ انزلہ شاہ ہیں۔ ہمارے چہیتے انکل کی اکلوتی بیٹی۔''
اس کی اطلاع پر انزلہ کے مقابل کھڑے' اس مغرور شخص نے ذرا سی نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر سر ہلا کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔
''امیزنگ' ماں اور بابا ہال کمرے میں ہی بیٹھے ہیں ملوا دو' میں ذرا دیر سے آؤں گا۔ بابا کو بتا دینا۔'' اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ وزن سے جیپ بھگا لے گیا۔
انزلہ کی نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔
''یہ بہزاد بھائی ہیں۔ بہزاد علی شیر۔ آپ کی طرح انہیں بھی خدمت خلق کا بہت شوق ہے۔'' انزلہ کی نگاہوں کے تعاقب میں دور جاتی جیپ کو دیکھتے ہوئے اس نے مزید معلومات فراہم کی تھیں۔ جواب میں وہ چونک کر اس کی طرف دیکھتی آہستہ اثبات میں سر ہلا کر آگے بڑھ آئی۔

❁❁❁

شام کی سرد ہوا چل رہی تھی۔
امامہ لان میں پھول پودوں کے قریب بیٹھی' خالی خالی سی نگاہوں سے ننھی گڑیا کو وہاں لان میں کھیلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ سارے دن اس ننھی سی گڑیا کا منہ اسے مما' مما کہتے نہیں سوکھتا تھا۔ سب کتنے خوش تھے مگر اس کا دل جیسے اُجڑ کر رہ گیا تھا۔
سوگوار سا سراپا یوں بکھرا تھا گویا سالوں آئینہ نہ دیکھا ہو۔
انسان جب اپنے ہی جیسے کسی انسان کی محبت میں ٹھوکر کھا کر' لٹے پٹے احساسات کے ساتھ' سکونِ قلب پانے کے لیے بارگاہِ الٰہی میں سر بہ سجود ہوتا ہے تو اسے اپنے ''نقصان'' صحیح معنوں میں یاد آتے ہیں۔ ''عشقِ مجازی'' میں ''عشقِ حقیقی'' کو پسِ پشت ڈال کر اس نے بھی ہزاروں عاقبت نا اندیش لڑکیوں کی طرح اپنا نقصان کیا تھا۔
وہ مسلمان تھی' پانچ وقت کی نمازی تھی' مگر ''عشقِ مجازی'' کی بے سکونی نے اسے پانچ وقت کا

نمازی نہیں رہنے دیا تھا۔ اس کا سکون قرآن کی تلاوت کے بجائے ایک "بت" کی آواز اور اس کے تصور میں مسحور ہو کر رہ گیا تھا۔

خدا سے اس کی محبت کا رشتہ خالص ہونا چاہیے تھا مگر وہ بھی "خود غرض" تھی۔ اپنی چند نمازوں کے عوض بہت کچھ لیا تھا اس نے اپنے خالقِ حقیقی سے۔ پانچوں وقت نماز میں اس "واحد ولاشریک" کے حضور سر جھکا کر اس کی وحدانیت کا صبح و شام اعتراف کرنے کے باوجود وہ "شرک" کی مرتکب ٹھہری تھی۔

نفس کے بے لگام گھوڑے کے ہاتھوں بے بس۔ اس نے بھی مٹی سے بنے ایک "بت" کی محبت کو اپنے پیدا کرنے والے حقیقی مالک کی محبت پر غالب کیا تھا۔

وہ بھول گئی تھی کہ وہ مسلمان ہے۔

اسے یاد رہا تو محض اتنا کہ وہ شیدائی ہے۔ ایک بت کی شیدا۔ اللہ کو ماننے کے باوجود اس نے اللہ کی نہیں مانی تھی۔ نتیجتاً ایک فانی انسان کی فانی محبت نے اسے منہ کے بل گرا دیا۔

سیکڑوں ہزاروں لڑکیوں کی طرح اس کی محبت بھی لاحاصل' بے مراد ٹھہری تھی۔ کیونکہ اس نے بھی ارسلان حیدر کو اللہ کی رضا کے لیے نہیں چاہا تھا۔ اپنے لیے چاہا تھا۔ اپنے نفس' اپنے دل کی خوش نودی کے لیے۔

وہ روئی تھی اور ایک مرتبہ پھر دل کھول کر روئی تھی۔

دریچے سے جھانکتی وہ لڑکی' عجیب دُکھ سے بھری ہوئی تھی کہ اس کے آنگن میں پھول پر اک نیلی تتلی مری ہوئی ہے

کبھی اذانوں میں کھوئی' کبھی نمازوں میں روئی

وہ ایسے دنیا کو دیکھتی ہے کہ جیسے اس سے ڈری ہوئی ہے

شجاع حسن جیسے شاندار بندے کا ساتھ پا کر بھی وہ جیسے زندگی کی زندہ دلی سے روٹھ گئی تھی۔

شجاع اس کی ذہنی حالت سے بے خبر نہیں تھا۔ تبھی ایک ضروری کورس کے لیے مختصر دورے پر ملک سے باہر چلا گیا۔ امامہ نے اس کے اس ایک اور احسان پر دل ہی دل میں اپنے ربّ کے ساتھ ساتھ اس کا بھی شکریہ ادا کیا تھا۔

وہ منافق نہیں تھی۔

دل میں کسی اور کو رکھ کر مسکراہٹوں کے تعلق کسی اور سے نہیں رکھ سکتی تھی۔

اپنے بکھرے خوابوں کے دکھ پر' اتنی جلدی خود کو سنبھال کر کسی اور کا ساتھ نبھانا بہت مشکل لگ رہا تھا اسے۔

لان کی سیڑھیوں پر یا سیت میں گھری بیٹھی وہ اسی کو سوچ رہی تھی جب اس کے موبائل پر شجاع کی کال آ گئی۔ وہ چونکی تھی اور دھڑکتے دل کے ساتھ فوراً اس کی کال پک کی تھی۔

"السّلام علیکم!"

"وعلیکم السّلام' کیسی ہو......؟"

"ٹھیک' آپ کیسے ہیں؟"

''میں تو ٹھیک نہیں ہوں' گھر کی بہت یاد آ رہی ہے۔''

وہ ابھی بھی خوش گوار موڈ میں تھا۔ امامہ چپ ہو گئی۔

''پھر چپ' یار ایک تو میں تمہاری اس چپ سے بڑا عاجز ہوں۔ کہاں تو کھلم کھلا مجھ سے محبت کے دعوے ہوتے تھے' رو رو کر التجاء کی جاتی تھی کہ میں جناب کو خود سے دور نہ کروں' گھر سے نہ نکالوں اور تو اور اس مقصد کے لیے میری بچی کو بھی پٹا لیا تھا تم نے۔ آپی کے دل میں بھی جگہ بنالی اور اب جب کہ مجھے تمہاری آنکھوں میں زندگی خوب صورت لگنے لگی ہے تو تم نے ہونٹوں پر خاموشی کا قفل لگا لیا۔ یہ تو زیادتی ہے امامہ!''

کون کہہ سکتا تھا کہ وہ شخص اپنی فیلڈ کا سخت گیر آفیسر تھا۔

امامہ کی پلکیں اس کے الفاظ پر پھر بھیگی تھیں۔

''میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔ تمہارا چہرہ ایک کھلی کتاب ہے امامہ! پھر بھی نہ جانے کیوں میں تمہیں پڑھ نہیں پاتا' مجھے اندازہ ہے کہ تم کسی الجھن کا شکار ہو' مگر میں کوشش کے باوجود تمہارا اعتبار جیت نہیں پا رہا امامہ! پتا نہیں کیوں؟'' بھرائے لہجے میں ابھی اپنی بات مکمل بھی نہ کر پائی تھی کہ وہ بول اٹھا۔

''اچھا چھوڑو یہ بتاؤ کہ ابا جی اور گڑیا کیسے ہیں؟''

''بالکل ٹھیک' ابا جی نیوز دیکھ رہے ہیں اور گڑیا یہاں لان میں میرے پاس کھیل رہی ہے۔''

''آہ' کتنی خوش قسمت ہے میری گڑیا۔''

وہ ہنسا تھا' امامہ مسکرا دی اور اسی پل رابطہ منقطع ہو گیا۔ موبائل فون ہاتھ میں تھامے وہ کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی شجاع حسن کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

❊❊❊

دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے ایان کے سامنے بیٹھی وہ زار و قطار رو رہی تھی اور وہ بے بس سا غصیلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا چارا کاٹ رہا تھا۔

تبھی وہ اس کے قریب آئی تھی۔

''ایان' اللہ کی قسم میں ویسی نہیں ہوں جیسی تم مجھے سمجھتے ہو۔ قرآن اٹھوا لو مجھ سے' جو میں اپنی مرضی سے اس کمینے عاطف کے بچے کے ساتھ وہاں کھیتوں میں گئی ہوں تو۔ وہ تو مجھے تمہارا نام لے کر ساتھ لے گیا تھا۔ سچی ایان تمہاری قسم صرف تمہیں جلانے کے لیے میں نے وہ شہر والا جھوٹ بولا تھا۔ میں تمہارے ساتھ گھومنا پھرنا چاہتی تھی۔''

''جسٹ شٹ اپ' زیادہ ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے تم کس قماش کی لڑکی ہو' بہت اچھی طرح جان گیا ہوں میں۔''

وہ دہاڑا تھا تبھی باڑے کے باہر جیپ رکنے کی آواز سن کر ایان کے ہاتھ چارا کاٹتی مشین کی ہتھی پر رک گئے۔

''باپ رے' لگتا ہے بابا بھائی آ گئے ہیں میں چھپتی ہوں۔''

بھاگ کر توڑی والے کمرے میں پناہ لیتی وہ اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی بچا گئی تھی کیونکہ اس کی پیشگوئی کے عین مطابق اگلے ہی منٹ میں چھوٹا ملک باڑے کے احاطے میں چلا آیا تھا۔

''السلام علیکم چھوٹے ملک۔''

''وعلیکم السلام' کیا ہو رہا ہے؟''

قریب پہنچ کر ایک ہاتھ ایان کے مضبوط شانے پر دھرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ بولا۔

''ابھی تو چارا کاٹ رہا تھا کوئی کام ہے؟''

''ہاں یار شکار پر جانا تھا چلو گے ساتھ۔''

''میں؟ مگر وہ عاطف جاتا ہے ناں ہر بار۔''

''ہاں وہی جاتا ہے مگر اس کی چھٹی ہوگئی ہے۔''

چھٹی؟ مگر کیوں کیوں چھوٹے ملک؟''

''بس یار حویلی کی عزت پر میلی نگاہ تھی اس کی۔ بڑی ٹھیک ٹھاک دھلائی کے بعد نکال باہر کیا اسے۔''

چھوٹا ملک اسے بتا رہا تھا اور وہ بے یقین سی نگاہوں سے اسے سنتا' بے ساختہ توڑی والے کمرے کی طرف نگاہ اٹھا گیا تھا۔ کوئی شک نہیں تھا کہ اسے بھی علیزہ کی شکایت پر ہی ملازمت سے فارغ کیا گیا تھا۔

''ٹھیک ہے' میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔''

''شاباش' بس میں ذرا باتھ لے لوں۔''

ایک مرتبہ پھر اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے وہ چلا گیا تھا۔ ایان کو لگا جیسے اس کا دماغ یک دم ماؤف ہو گیا ہو تبھی علیزہ کمرے سے نکل کر باہر آئی تھی۔

''شکر اللہ کا' بچت ہوگئی وگرنہ اس بار میری خیر نہیں تھی۔ دیکھ لو۔ تمہاری محبت کتنا خوار کر رہی ہے۔''

''شٹ اپ۔''

''کیوں شٹ اپ' پیار کرتی ہوں میں تم سے اور یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ قسم سے ایان' صرف ایک بار میری محبت کو قبول کر لو۔ میں سرتا پیر بدل جاؤں گی۔ آزما کر تو دیکھو۔ مر جاؤں گی مگر تمہارے نام پر حرف نہیں آنے دوں گی۔''

معاف کرو مجھے' میں باز آیا ایسی نیکی سے۔''

بے زاری سے پُر لہجے میں کہتا وہ چارے کو ٹھکانے لگانے لگا۔

''اور ہاں تم بھی اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ' وگرنہ اس بار شکایت میں کروں گا بڑے ملک صاحب سے اور وہ بھی تمہاری۔''

''صدقے جاؤں یہ شوق بھی پورا کر کے دیکھو' بابا اور دادی مجھ پر اندھا اعتبار کرتے ہیں تم قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر بھی کہو گے تب بھی وہ تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کریں گے۔ الٹا تمہاری شامت آجائے گی۔''

اب وہ مسکرا رہی تھی۔ ایان تنفر سے سر جھٹک کر رہ گیا۔

"صرف ایک بار اعتبار کر کے دیکھو ایان! صرف ایک بار پلیز۔"
وہ کھڑا تھا جب وہ کمال جرأت سے اس کے قریب آ کر اپنی باہیں اس کے گلے میں ڈال گئی۔
"ہرگز نہیں، پہلے ہی ایک عورت کا ڈسا ہوا ہوں، دوبارہ وہی غلطی نہیں دہراؤں گا۔"
"تو ٹھیک ہے، قسم اللہ پاک کی تم ابھی اور اسی وقت میری لاش پر سے گزر کر اس احاطے سے باہر جاؤ گے۔"
فوراً موڈ بدلتی، وہ پلٹی تھی اور دوپٹا گلے سے نکال کر واپس توڑی والے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
ایان جانتا تھا کہ وہ بے حد جذباتی ہے مگر اس وقت اس کی اٹھائی گئی قسم نے اسے گھبرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ شریف تھا مگر ظالم نہیں تھا۔
لپک کر جس وقت وہ کمرے کی طرف بڑھا۔ علیزہ توڑی والے کمرے کے گاڈر میں نصب کنڈی سے اپنے دوپٹے کا پھندا تیار کر چکی تھی۔ تبھی وہ بولا تھا۔
"یہ کیا حماقت ہے، دماغ خراب تو نہیں ہو گیا ہے تمہارا؟"
"دماغ خراب ہی تو ہو گیا ہے۔ دیکھو اب مزے سے میری موت کا تماشا۔"
"پاگل مت بنو، چلو کھولو اس دوپٹے کو۔"
اب کے وہ قریب آیا تھا۔ علیزہ نے اس قربت سے فائدہ اٹھا کر پھر سے باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔
"پھر، پیار کرتے ہو نا مجھ سے؟"
وہی اس کی ضد۔
ایان نے جان چھڑانے کے لیے گہری سانس بھری اور اثبات میں سر ہلا دیا۔
"شکریہ۔" وہ بے حد خوش ہوئی۔

❋❋❋

رات کی ہر طرف بکھرتی خاموشی چاندنی میں کھڑکی کھولے وہ آسمان پر جانے کیا تلاش کر رہا تھا۔ جب امامہ نے پیچھے سے آ کر گرم شال اس کے کندھوں پر ڈال دی۔
آج صبح ہی وہ وطن واپس آیا تھا اور جب سے واپس آیا تھا تب سے قدرے خاموش خاموش سا تھا۔ اس وقت امامہ کی نوازش پر فوراً گردن موڑتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔
"تھینکس امامہ!"
"نہیں، تھینکس کی کیا بات ہے آپ کی خدمت تو میرا فرض ہے۔"
امامہ کی نگاہیں جھکی تھیں۔ شجاع کی توجہ پھر سے آسمان پر مرکوز ہو گئی۔
"امامہ!" کچھ دیر بعد اس نے پکارا تھا۔
"جی۔" اس نے فوراً لبیک کہا۔ جب وہ بولا۔
"مجھ سے میرے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھو گی؟"
"نہیں۔"

"کیوں؟" اس کے فوراً "نہیں" کہنے پر وہ قدرے حیران ہوا تھا۔ اس بار امامہ نے بھی اپنی اہیں تاروں سے بھرے آسمان پر ٹکا دیں۔

"کیوں' کیونکہ میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی' ہاں اگر اپنی مرضی سے آپ کچھ شیئر کریں گے تو اری ہوگی۔"

اس کا لہجہ ویسا ہی تھا۔ سادہ اور یاسیت بھرا۔

شجاع گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"میرے پاس خود سے شیئر کرنے کے لیے زیادہ کچھ نہیں ہے امامہ! بس اتنا ہی ہے کہ جن دنوں بطور ایس ایس پی میں نے پولیس فورس جوائن کی' ان دنوں ثانیہ نام کی ایک لڑکی کا دل میری محبت میں اٹک گیا۔ پہلی بار اپنے کسی مقدمے کی وجہ سے وہ میرے پاس آئی تھی اور پھر جیسے یہ اس کا اصول بن گیا۔ وہ اتنی خوب صورت تھی امامہ کہ میں نادانستگی میں بھی اس کی طرف نگاہ اٹھانے سے ڈرتا تھا کہ کہیں صراطِ مستقیم سے بھٹک نہ جاؤں' مگر اس نے میری ہر کوشش کو بے کار کر دیا۔ میں جو ان سے الرجک تھا' بچپن کی محبت کا روگ دل سے لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے سب بھلا کر اپنی طرف توجہ دینے پر مجبور کر دیا۔ میں کسی طور دوبارہ کوئی روگ پالنے کو تیار نہ تھا مگر اس نے مجھے پانے کے لیے دوبار سوسائیڈ کرنے کی کوشش کر کے جیسے مجھے جکڑ لیا۔ وہ میرے لیے پاگل تھی امامہ! دیوانی تھی وہ میری' مگر بہت جلدی اس کی جذباتی محبت کی پالش اتر گئی۔ آزاد فضاؤں میں اڑتی محبت کی ا اپنے محبوب کی مٹھی کی ذرا سی قید بھی برداشت نہ کر سکی اور اڑ گئی۔"

"کیا مطلب؟"

وہ اپنی رو میں مگن تھا جب امامہ کو بے ساختہ مداخلت کرنی پڑی۔ شجاع اس کے سوال پر یوں چونکا جیسے خواب سے جاگا ہو۔

"مطلب...... پتا نہیں کیا مطلب امامہ! پتا نہیں جب کوئی چاہنے والا اپنے محبوب کو دغا دیتا ہے اس کا کیا ہوتا ہے۔ پتا نہیں جب آپ کا کوئی بہت پیارا آپ سے بچھڑ جاتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ تم بتاؤ بھلا کیا مطلب ہو سکتا ہے اس کا؟"

اب وہ اس کی طرف متوجہ تھا امامہ نے بے ساختہ نگاہیں چرا لیں۔ اس شخص سے کچھ بعید نہیں تھا کہ اندر تک اُتر کر سب جان لیتا۔

"بہت بڑی غلطی ہوئی تھی مجھ سے امامہ! میں نے غلط محبت کے احساس کے سپرد اپنے سب خواب کر دیے۔ نتیجتاً میرے ساتھ بھی وہی ہوا جو اس راہ میں ہر مخلص اور ایماندار محبت کرنے والے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسے بہت جلد احساس ہو گیا کہ اس کا دم میرے گھر کی چار دیواری میں گھٹتا ہے' ایڈونچرز' سیاحت اور آزاد سوچ کی حامل لڑکی' میرے شریفانہ اصولوں سے سمجھوتہ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ گھر جس میں میرے ابا جی کی شب و روز عبادت اور بزرگی کی وجہ سے نور ہی نور پھیلا ہے۔ وہ اسے اپنی پسند کے قالب میں ڈھالنا چاہتی تھی۔ آئے روز' اس کے گھر والوں' دوستوں' رشتہ داروں کی محفل بھی رہتی اور ابا جی خاموش تماشائی بنے سب دیکھتے رہتے۔ گڑیا کی پیدائش کے بعد میں نے ذرا سی سختی کی' تو اس کا خول ٹوٹ گیا امامہ! وہ ذرا سی محبت سے بھی بے نیاز ہو گئی۔ اپنی پسند کا

''سکون'' پانے کے لیے اب اس نے باہر کی راہ دیکھ لی اور میں' میں اس کے لیے اپنی بیٹی بہن باپ سمیت جیسے پسِ پشت کرتا چلا گیا۔ دو بار اسے نشے کی حالت میں انتہائی معترض دوستوں کی سے اٹھا کر گھر لایا۔ دو بار اس کے کئی بے ہودہ کزنز کو گرفتار کر کے ریپ کے الزام میں جیل سلاخوں کے پیچھے دھکیلا۔ مگر وہ میری فرض شناسی سے بھی ٹکرا گئی۔ اپنے رشتہ داروں کی رہائی ہونے کا غصہ اس نے یوں نکالا کہ اپنے لیے اس نے کسی اور شخص کا انتخاب کرلیا۔ صرف چھ ماہ کی سے اس کا سلوک ہرگز سوتیلی ماں سے کم نہیں تھا۔ اور میں' میں شاید پھر بھی سمجھوتے کی راہ نکال کہ جن سے لگاؤ ہوتا ہے ان کی ہزار خامیاں بھی دل قبول کرلیتا ہے' مگر اس روز جب اس نے میری غیر موجودگی میں میرے بابا پر ہاتھ اٹھایا اور انہیں اپنے اشتعال میں جان سے مارنے کی کوشش کی اس کی یہ جرأت و گستاخی میں برداشت نہیں کر سکا امامہ! للہٰذا مٹھی کھول کر آزاد کر دیا اسے۔''

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا تھا۔ امامہ کی پلکیں کسی احساس کے زیرِ اثر آہستہ سے بھیگ گئیں۔

''میری بیٹی نے ماں کا پیار نہیں دیکھا امامہ! اسے سگی سوتیلی کی پہچان بھی نہیں ہے اور میرا بابا...... ان کی خاموشی' کمرہ نشینی اور بیماری کی ایک بڑی وجہ یہی دکھ ہے کہ انہیں اپنے بچوں سے سکھ نہیں ملا۔ میں جو پچھلے چھ سالوں سے پتھر بنا جی رہا ہوں۔ پتا نہیں کیوں تمہیں پہلی بار گھبرایا گھبرایا دیکھ کر اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دے بیٹھا۔''

اب وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا امامہ چاہنے کے باوجود نگاہیں نہ اٹھا سکی۔

''ایک بات پوچھوں امامہ؟'' کچھ دیر بعد اس نے کہا تھا۔ امامہ چونک اٹھی۔

''جی۔''

''محبت کرتی ہو نا کسی سے تم؟''

''دھڑاک......'' امامہ کو لگا جیسے زمین اس کے پاؤں تلے سے کھینچ لی گئی ہو۔ وہ شخص اگر پولیس میں اعلیٰ آفیسر تھا تو بالکل صحیح تھا۔ اس کے آنسو اس وقت اور شدت سے بہنے لگے تھے۔

❋❋❋

کمرے کی کھڑکی کھلی تھی اور انوشہ کواڑوں پر دونوں ہاتھ جمائے نیچے کودنے کی کوشش میں تھی۔ اگر اسے گھر واپسی میں ذرا سی بھی تاخیر ہو جاتی تو کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ گھر سے بھاگ جاتی یا جان پر کھیل جاتی۔

چلتی سانسوں تک کسی بھی انسان کی زندگی سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہوتا، اس کے باوجود اگر زندگی کو داؤ پر لگانے کا سوچ لے تو سوچنے کی بات ہے کہ اس وقت اس انسان کا ذہن کسی نہج پر کر رہا ہوتا ہے۔

بجلی کی سرعت سے لپک کر اس نے بچے کو بیڈ پر لٹایا اور کھڑکی سے کودتی' انوشہ کا بازو تھام لیا۔ جواب میں اس نے یوں سرخ نگاہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا، جیسے کچا چبا ڈالے گی۔

''بازو چھوڑو میرا......'' وہ غرائی تھی مگر شاہ زر نے پروا نہیں کی۔

''یہ کھیل تماشے کرنا اب چھوڑ دو انوشہ...... جو ہو چکا اسے تم بدل نہیں سکتیں...... مگر جو مرے

سکتا ہے اسے ضرور روک سکتی ہو...... یہ گھر تمہارے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ہے، لیکن اگر تم یہاں نہیں رہنا چاہتیں تو ٹھیک ہے، جاؤ جہاں جانا چاہتی ہو...... بہت جلد اندازہ ہو جائے گا دنیا کی قباحت کا...... ابھی دیکھا ہی کیا ہے تم نے...... صرف دو دن بھاگ دوڑ کر کے دیکھ لو، لوگ عزت بھی چھین لیں گے اور جان بھی......"

اس کے شانوں کو سختی سے جھٹکا دیتے ہوئے اس نے خفگی سے اسے پیچھے دھکیلا تھا۔

"تھک گیا ہوں میں تم سے لڑتے لڑتے...... اب اور ہمت نہیں ہے مجھ میں...... تمہیں جو سمجھنا ہے سمجھو...... جتنی نفرت کرنی ہے کرو...... مگر میں باز نہیں آ سکتا' نہ تم سے محبت کے معاملے میں' نہ تمہاری کیئر کرنے کے معاملے میں...... سمجھیں تم......؟"

وہ غصے سے آگ بگولہ ہو رہا تھا۔

انوشہ سرخ چہرہ لیے' نفرت سے منہ پھیر گئی۔

تبھی وہ پھر بولا تھا۔

"زاور سے بات کی ہے میں نے' صدف آنٹی کی طبیعت خراب ہے' پچھلے پندرہ روز سے اسپتال میں ہیں' صرف تمہاری وجہ سے...... کس کس کو اذیت دو گی۔ کس کس کو مارو گی بے موت......؟ تمہارا پاسپورٹ بنوا رہا ہوں میں...... اپنے "اپنوں" کے پاس جانے کی تیاری کر لو......"

اس بار خاصے تلخ لہجے میں کہتا وہ فوراً کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

انوشہ الجھے دل و دماغ کے ساتھ' سنگھار میز کے سامنے کھڑی کچھ دیر آئینہ میں اپنا عکس دیکھتی رہی' پھر اچانک پرفیوم کی بوتل اٹھا کر زور سے آئینے پر دے ماری' اگلے ہی پل زوردار چھناکے کے ساتھ آئینہ ٹوٹ کر ہزار حصوں میں منقسم ہو چکا تھا۔

❁❁❁

مائی اماں کے چہرے پر اس وقت عجیب سا سکون پھیلا ہوا تھا۔ مگر ان کے لب مل رہے تھے۔

"بہت پرانی داستان ہے یہ محبت کی...... بہت پرانی......"

خود اپنے حال میں گم وہ جیسے کسی سے یہ راز شیئر کرنے کو بے تاب تھیں۔

یہ اس لڑکی کی داستان ہے بیٹی...... جو بتوں کی پجاری تھی...... جسے اپنے دھرم سے ٹوٹ کر لگاؤ تھا جس کی صبح رام نام سے ہوتی تھی اور جسے لکشمی دیوی کو ہر روز نت نئے پہناوے پہنا کر خوشی ہوتی تھی۔ اسے یہ جاننے سے سروکار ہی نہیں تھا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا......؟ یہ مذہب جس کا نام اسلام ہے' کیا ہے اور کیوں ہے......؟ اس کی اصل تعلیمات کیا ہیں؟ کیوں اس مذہب کے پیروکار ساری دنیا میں ہیں اور میرے مذہب کے پیروکار صرف ایک ملک تک محدود ہیں۔ پڑھی لکھی بھی نہ تھی کہ اخبارات میں بڑی بڑی ہستیوں کے اسلام لانے کے ایمان افروز واقعات پڑھ کر کچھ جان سکتی...... بس...... شعور سنبھالتے ہی ماں اور موسیوں نے جو کان میں ڈال دیا' وہی دل اور ذہن میں رہا' یہ آنسو جو اس وقت تم میری آنکھوں میں دیکھ رہی ہو' ان کا تعلق انہی دنوں سے جڑا ہے بیٹی...... یہ آنسو میرے لیے نہیں ہیں' بلکہ اس عورت کے لیے ہیں جو میری ماں تھی۔ جسے زندگی بھر سکھ کا کوئی ایک سانس لینا نصیب نہ ہو سکا' جو صرف اس لیے "ستی" ہونے سے رہ گئی کہ میں اس کی گود میں تھی'

وگرنہ موسی کی طرح اسے بھی درجنوں لوگوں کے سامنے بنا سنوار کر بابا کے ساتھ ہی ان کی موت پر زندہ جلا دیا جاتا جیسے میری موسی کو جلایا گیا تھا اور میری نانی اسی غم میں پاگل ہو کر رہ گئی...... دو اور بیٹیاں گھر سنبھالنے والی نہ ہوتیں تو جانے کیا بنتا ان کا......؟

مائی حاجن کی آنکھوں سے آنسو اب تواتر کے ساتھ گر رہے تھے۔

''بنا تو خیر ماں کا بھی کچھ نہیں...... کسی اچھوت کی طرح سب سے الگ تھلگ ان کا سارا دن آشرم میں بھگوان کی پوجا پاٹ کرنے میں گزرتا پھر میں ان کی زندگی میں تھوڑی سی مصروفیات لائی بہت لاڈ پیار سے پالا گیا مجھے...... دادی کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ ماں مجھے ہاتھ نہ لگائے...... ہمارے پڑوس میں چند مسلم گھرانے تھے اگر میں کبھی بھولے سے بھی کھیلنے کے لیے آنکھ بچا کر ان کے گھر چلی جاتی تو تایا جی اور دادی میری اماں کو اس ''بھول'' پر مار مار کر ان کا حشر بگاڑ دیتے تھے۔ بہت نفرت تھی انہیں اسلام اور مسلمانوں سے...... وہ ایسی ایسی باتیں کرتی تھیں مسلمانوں کے لیے کہ میں خوف زدہ ہو گئی اور خود بھی اسلام سے نفرت کرنے لگی۔ انہی دنوں جب میں بلوغت کو چھو رہی تھی میری زندگی میں ''رندھیر'' آ گیا۔ وہ بہت پیارا تھا بیٹی بہت اچھا تھا۔ بہت محبت کرتا تھا مجھ سے پورے گاؤں میں میری ٹکر کی دوسری حسین لڑکی نہیں تھی اسی لیے میرا نام بھی دادی نے ''سندر'' رکھا تھا۔ ''رندھیر'' مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر گھنٹوں میرا انتظار کرتا اور میں اس کی بے قراری بھانپ کر اسے اور تنگ کرتی عجیب مستی میں ڈوبی زندگی تھی کہ کسی گناہ کا کوئی احساس ہی نہ تھا۔ ہر روز وہ مندر کی سیڑھیوں پر میرا ہاتھ تھام کر میرے ساتھ دیوی ماں کے درشن کرتا تھا اور ہم دونوں اپنے ملن کی دعائیں مانگتے، ابھی میں نے عمر کی بارہویں سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ گھر میں میری شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ رندھیر نے اس موقع پر میرا بہت ساتھ دیا۔ میں اس کے لیے منت مان کر بیٹھی تھی اور وہ صبح و شام مندر کے چکر لگا رہا تھا۔ بالآخر تقدیر نے جب اسے میرا جیون ساتھی بنا دیا تو میں اسے ''دیوی کی کرپا'' جان کر اپنے مذہب کے لیے اور بھی حساس ہو گئی۔ وقت مٹھی سے ریت کی طرح پھسل رہا تھا اور ہم اپنی نسل بڑھاتے جا رہے تھے۔ انہی دنوں ایک بڑا سانحہ ہوا۔''

نم آنکھوں کے آنسو پونچھتی مائی حاجن ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکی تھیں جب گوری پوچھ بیٹھی۔

''کیسا سانحہ اماں......؟''

مائی حاجن اس کے سوال پر کچھ لمحے خاموش رہ کر پھر اسی انداز میں گویا ہوئیں۔

''میری ماں نے چوری سے اسلام قبول کر لیا تھا تین سال تک گھر میں کسی کو پتا نہ چل سکا مگر اس روز...... جب وہ رسوئی میں گھسی۔ کسی چھوٹی سی کتاب کو چوم کر کپڑے میں لپیٹ کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دھان کے دیگچے میں چھپانے لگیں تو چھوٹی موسی نے انہیں پکڑ لیا اور یوں یہ بات گھر میں سب پر کھل گئی۔ ماں پر بہت سختی کی گئی بہت مارا پیٹا گیا انہیں مگر وہ کسی طور اس نئے مذہب سے دستبردار ہونے کو تیار نہ ہوئیں تبھی...... اسی رات تایا اور چچا کے ساتھ گھر کے دیگر مردوں نے بہت بے دردی کے ساتھ انہیں مار کر ان کا وجود اسی گھر کے پچھواڑے میں دفن کر دیا۔ میری پرہیزگار ماں شہادت کی موت گلے لگا کر اسلامی طریقے سے ہی زمین کی گود میں گئی وہ لوگ چاہنے کے باوجود

اسے جلا نہیں سکے مگر گاؤں میں یہ ضرور مشہور کر دیا کہ کوئی لڑکا انہیں ورغلا کر بھگا لے گیا۔

جس پر نام نہاد فساد برپا کر کے میرے تایا اور چچا نے مسلمان گھرانوں کے مردوں اور عورتوں کو بہت نقصان پہنچایا' اتنا ذلیل کیا کہ وہ لوگ' وہ محلہ ہی چھوڑ کر کہیں اور جا بسے...... یہ انہی دنوں کی بات ہے جب میں نے پانچویں بچے کا چھلہ نہایا تھا اور تبھی وہ اس محلے میں آیا۔

''وہ...... وہ کون اماں......؟''

''شیر محمد...... صرف نام کا شیر نہیں تھا...... دیکھنے میں بھی شیر ہی لگتا تھا۔ مضبوط کسرتی جسم کا مالک...... بے انتہا خوب صورت...... قرآنِ پاک کا حافظ تھا...... دلی سے راجستھان آیا تھا' اپنے گھر۔ کئی لڑکیاں دل ہار بیٹھی تھیں اس پر...... کڑیل جوان ایسا کہ محلے کے سبھی اوباش لڑکے اس کے گھر کے سامنے سے نگاہ نیچی کر کے گزرتے تھے...... مجھے بہت غصہ آتا تھا' اپنی ہم جولیوں پر خوب ٹلتی جلاتی اور انہیں اپنے ساتھ ملا کر' مسلمانوں کا مذاق اُڑاتی پھر انہی دنوں عجیب تماشہ ہوا۔

میں صبح بھگوان شری کرشن کو سلام کرنے اور نہلانے دُھلانے کو اُٹھتی' تو وہ اپنے گھر کے صحن میں اونچا' بلند آواز سے قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہا ہوتا' میرا شوہر اور بچے سو رہے ہوتے تھے' صرف میں جاگ رہی ہوتی اور دیوار کے اُس پار سے آتی آواز جیسے میرے تن بدن میں چنگاریاں سی بھر دیتی' جس پر کئی بار میرے سسرالیوں نے اس سے جھگڑا بھی کیا اور مار پیٹ بھی کی' لیکن وہ باز نہ آیا۔ تنگ آ کر میں نے خود اس کا دماغ ٹھکانے لگانے کا سوچا' مگر پتا ہے بیٹی' جب میں اس کے سامنے گئی تو کیا ہوا......؟

''کیا ہوا اماں......؟''

''بہت عجیب ہوا...... وہ آنکھیں بند کیے تلاوت کر رہا تھا اور میں...... میرا وجود جیسے گوشت سے پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ نہ اس نے آنکھیں کھولیں نہ میں نے زبان۔ ایک لرزا تھا جو سارے بدن پر طاری ہو گیا تھا' اس کے چہرے پر پھیلے نور نے میری حالت غیر کر دی' میں جو گھر بھر کی لاڈلی تھی' اپنے مذہب میں جنونی تھی' مطمئن تھی۔ میرے اندر جیسے بے سکونی بکھر گئی۔ اُلٹے پاؤں واپس ہوئی تھی میں اور پھر جلے پیر کی بلی کی مانند اِدھر اُدھر چکراتی پھرتی' پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے......؟ میں تو شادی شدہ تھی' پانچ بچوں کی ماں تھی' مگر اس نے جیسے مجھے پاگل کر چھوڑا تھا۔ صرف دنوں میں جیسے کایا ہی پلٹ گئی تھی ساری۔ میں جو اس کی تلاوت پر چیختی تھی' کانوں میں اُنگلیاں ٹھونستی تھی۔ اب وہ دیوار کے اس پار تلاوت کر رہا ہوتا اور میں دیوار کے اس پار روتی رہتی' گھنٹوں گزر جاتے۔ انہی دنوں مجھ پر ماں کی موت کا بھید کھلا تھا۔ یہ سچائی جان کر تو میں اور بھی بے چین ہو گئی۔ نہ شوہر اچھا لگتا نہ بچے...... دادی کہتی تھی مجھ پر سایہ ہو گیا ہے گھر میں' میں تو جیسے بھول ہی گئی تھی کہ میں کون ہوں......؟ کیا ہوں......؟ یاد رہا تو صرف اتنا کہ مجھے اسے دیکھنا ہے' سننا ہے...... جو کسی سے نہیں ڈرتا سوائے اپنے ربّ کی ذات کے جو وہ کسی کی مانتا بھی نہیں ہے سوائے اپنے ربّ کے۔

بہت منتیں مانی میں نے' بہت چکر لگائے دیوی ماں کے مندر کے۔ بہت چڑھاوے بھی چڑھائے کہ میں اس کے سامنے کمزور نہ پڑوں' میرے دل میں اس کا خیال تک نہ آئے مگر میری آشا پوری نہیں ہوئی' مجھے سکون نہیں ملا۔ وہ روز نماز کے لیے گھر سے نکلتا اور میں' میں مندر کے لیے مگر

مندر جانا تو اب اِک بہانا تھا' اصل مقصد تو اس کا دیدار تھا۔ میرے محبوب کے رب نے مجھے اپنے بندے کی محبت میں جکڑ کر بے بس کر ڈالا تھا۔ میں پہروں جلتی...... سلگتی...... روتی رہتی تھی۔ کسی چیز کا ہوش نہیں تھا ان دنوں اور پھر' پھر جیسے میرے اندر کی دنیا بدلتی چلی گئی۔

میرے معمولات میں آہستہ آہستہ تبدیلیاں یوں آئیں کہ خود میرے گھر والے بھی چونکے بغیر نہ رہ سکے۔

وہ شام بہت سرد تھی' ایسی ٹھنڈ تھی فضاؤں میں کہ ہڈیوں میں گھستی تھی۔

بولتے بولتے مائی حاجن کا لہجہ عجیب ہو گیا تھا۔

گوری کا انہماک مزید بڑھ گیا۔

"کیا ہوا تھا اس شام اماں......؟"

وہ بے ساختہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

مائی حاجن نے خالی خالی سی نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

❁❁❁

سا گر یہ جان جاؤ تم' کوئی کیسے اُجڑتا ہے
کوئی کیسے بکھرتا ہے
تو میرے پاس آنا تم' میری بنجر ہوئی آنکھوں میں
جلتے خواب کو تکنا' تو ان کا مرثیہ سننا
اگر ایسا نہیں ممکن' تو میری زندگی کی ڈائری کو کھول کر پڑھنا
اس کے ہر ورق پر آنسوؤں کی مات لکھی ہے
جو تم سے کہہ نہیں پائے وہی ہر بات لکھی ہے
اگر یہ ڈائری پڑھ کر بھی تم انجان رہتے ہو
تو اس کا ہے یہی مطلب......
میری سب التجائیں بس ہواؤں میں معلق ہیں
ابھی کچھ وقت باقی ہے' بدل جاؤ پگھل جاؤ
کہیں ایسا نہ ہو یہ وقت ہاتھوں سے نکل جائے
ہماری آرزوئیں اپنا رستہ ہی بدل جائیں

"اس شام...... اس شام میں مندر جانے کے بجائے بے سدھ بیٹھی' دیوار سے کان لگا قرآن پاک کی تلاوت سن رہی تھی اور' اور میرے اندر سرور یوں اتر رہا تھا جیسے ساری بے سکونی' تمام تکلیفیں ختم ہو گئی ہوں۔"

بی اماں کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا تھا مگر ان کی آنکھیں خوب روشن تھیں۔

"مجھے پتا ہی نہ چلا کب میرا جیٹھ گھر آیا اور اس نے مجھے اس حال میں بیٹھے دیکھ کر تنہا چڑھائی۔ مجھے تو اس وقت ہوش آیا جب اس نے چٹیا پکڑ کر میرے بال کھینچے اور پھر اندھا دھند تھپڑوں' لاتوں' گھونسوں کی بارش کر دی۔ مسلسل تین چار گھنٹے وہ مجھے مارتا رہا اور گھر کی عورتیں بھی

ا رگت کا تماشہ دیکھتی رہیں۔ ان کا خیال تھا شاید گاؤں کی دیگر لڑکیوں کی طرح میں بھی شیر محمد کی جوانی پر ادل گئی ہوں مگر میں کسی کے حسن پر ڈولنے والی ہوتی تو رند میر کے پانچ بچے بھی جنم نہ دیتی۔ مجھے خود پتا نہیں تھا کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ وہ رب کہ جس کے وجود سے میں منکر تھی۔ جس کی بے مثال قدرت میں میں نے اپنی مرضی کے خداؤں کو شریک کر لیا تھا' اس وحدہ لاشریک نے مجھ جیسی گناہ گار کو جانے میری کس اچھائی کے عوض اپنے رحم اور کرم کی انتہا کرتے ہوئے' اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لیے چن لیا۔ میں جو مسلمانوں کا مذاق اڑاتی تھی' اس کی حقیقی روح سے بے خبر' کچھ کچھ مسلمانوں کی طرزِ زندگی کو دیکھ کر اسلام سے نفرت کرتی تھی۔ اس پاک بے نیاز نے اپنے ایک معمولی بندے کی محبت میں جکڑ کر ایسا بے بس کیا کہ سارے کس بل نکل گئے۔ اس نے دکھا دیا کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ زبردست پکڑ والا ہے، بے نیاز ہے۔ میرا جیٹھ دیور اور سسر تینوں مل کر مجھے اپنے تشدد کا نشانہ بنا رہے تھے اور میں یوں تھی جیسے وہ مار میرے جسم پر نہیں کسی اور کے جسم پر پڑ رہی ہو۔ میں ان کی وحشت برداشت کرتے ہوئے بھی پُرسکون تھی۔ دیوار کے اس پار سے جب تک قرآن پاک کی تلاوت کی آواز آتی رہی۔ میں چپ چاپ خاموشی سے ان کی مار کھاتی رہی پھر جیسے ہی اس سے آواز آنی بند ہوئی میں غش کھا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔

اگلی صبح میری آنکھ کھلی تو پتا چلا کہ رند میر جس نے ہر سکھ دکھ میں میرا ساتھ نبھانے کی ہزار قسمیں کھائی تھیں جانے کہاں میرے پانچوں بچوں کو لے کر چلا گیا تھا۔ شاید وہ ان پر میرا سایہ بھی پڑنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

شیر محمد کو بھی میرے حال کی خبر ہو گئی تھی۔ میرے سسر اور جیٹھ نے برادری کو ساتھ ملا کر اسے گاؤں سے دربدر کرنے کی کوششیں تیز کر دیں۔ جان سے مارنے کی دھمکیاں بھی دیں' مگر وہ کسی سے مار کھانے والا نہیں تھا۔ ایمان کی روشنی نے اسے بہت مضبوط بنا دیا تھا۔ جب کہ میں' میں تو جیسے ہوش ہی گنوا بیٹھی تھی۔ میرے ہاتھوں اور پیروں کو رسیوں سے جکڑ کر میرے سسرال والوں نے گھر میں قید کر دیا تھا۔ مسلسل تین تین چار چار دن بھوکا رکھ کر مجھے میری ''غلطی'' کا احساس دلانے کی کوشش کی جاتی۔ گھر کے افراد کے ساتھ ساتھ برادری کی دوسری عورتیں بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھتیں اور تھوک کر چلی جاتیں۔ جن کو اصل معاملے کی خبر نہیں تھی۔ وہ بھوت پریت کا اثر سمجھ کر ترس کھاتیں۔ بہت اذیت بھرے دن تھے وہ پھر' پھر ایک روز جب مردوں کے ساتھ ساتھ گھر کی عورتیں بھی کھیتوں کو سدھار گئیں تو مجھے گھر سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ کچھ خبر نہ تھی کہ میں کیسے خود کو رسیوں سے چھڑوا کر شیر محمد کے پاس پہنچی۔ بس اتنا پتا ہے کہ وہ جو اپنے کمرے کی صفائی ستھرائی میں معروف تھا اس نے پلٹ کر جیسے ہی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ میں بے خودی' اس کے قدموں میں گر پڑی۔ اس بے غرض کے قدموں میں کہ جس کے زبردست پکڑ والے خدا نے مجھے ایک معمولی سی محبت میں جکڑ کر بے بس کر ڈالا تھا۔

بہت روئی تھی اس وقت میں اس شخص کے قدموں میں گر کر جو صراطِ مستقیم کا راہی تھا۔ میری خدا وہ بھی جانتا تھا کہ میں کیوں رو رہی ہوں' مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اگر اس روز میں گھر واپس چلی جاتی تو میرے گھر والے مجھے زندہ چتا میں جلا دیتے۔ مجھے موت کا خوف نہیں تھا' مگر میں اس

حال میں مرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے میرا حال دیکھ کر شیر محمد کو مجھ پر ترس آ گیا۔ میری التجا و منت پر وہ مجھے اس علاقے سے نکال لایا۔ اسی نے مجھے کلمہ سکھایا' سچے دین سے متعارف کروایا۔ اسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا میں نے' یوں لگتا تھا جیسے میں نے دل کا سکون پالیا ہو۔ اس دوران مجھے یہ پتا چلا کہ میرے گھر والے کتوں کی طرح سونگھتے پھر رہے ہیں مجھے۔ صرف میرے فرار کے بدلے میں گاؤں کے ہندو نمبر دار نے کئی مسلمانوں کے کئی گھروں کو آگ لگوادی۔ کئی غریب بے کس مسلمانوں کو اس کے غنڈوں نے زبردستی پکڑ پکڑ کر ایسی ایسی سزائیں دیں کہ ذکر کرتے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ علاقے میں ایک عجیب سا خوف پھیل گیا تھا۔ زبردستی مسلمانوں کو ہندو مذہب اپنانے پر مجبور کیا جانے لگا۔ جو انکار کرتا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ شیر محمد اس علاقے میں واپس جا کر ان جابر ہندوؤں سے لڑنا چاہتا تھا' مگر میں ایک مرتبہ پھر اس کی راہ کی رکاوٹ بن گئی۔ میرا حال ایسا تھا کہ گھنٹوں بے ہوش پڑی رہتی۔ ایک میری وجہ سے کتنے بے قصور مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ یہی بات مجھے مارے دے رہی تھی۔ شیر محمد کو پہلی بار بہت بے بس دیکھا تھا میں نے' پھر انہی دنوں جب میں نئی نئی ہدایت کے راستے پر گامزن ہوئی تھی علیحدہ وطن کی باتیں ہندوستان کی سرزمین میں سر اٹھانے لگیں۔ ہندوؤں کے لیے مسلمانوں کی ذرا سی خوشی و راحت' برداشت کرنا محال تھا۔ وہ انہیں آزاد فضاؤں میں اپنی مرضی سے سانس لیتے کیسے دیکھ سکتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے مسلمانوں کا قتل عام کر دیا۔ جہاں نظر اٹھتی تھی لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں۔ اس سے پہلے مجھے بھی مسلمانوں پر ہندوانہ مظالم برے نہیں لگتے تھے' مگر اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کو قریب سے دیکھنے کے بعد میرا دل ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں پر پھٹ رہا تھا۔ مجھے اپنی درسی کتب کے وہ تمام اسباق یاد آنے لگے تھے جن میں ہر ننھے منے بچے کو مسلمانوں سے نفرت کا درس دیا جا رہا تھا۔ مگر میں کیا کر سکتی تھی سوائے رونے کے اور سچے رب سے دعا مانگنے کے۔ لاکھوں زندگیوں کے چراغ گل ہوئے ہزاروں دلوں کی بستیاں اجڑیں اور یوں سرکاری کاغذوں میں علیحدہ سرزمین کا فیصلہ ہو گیا۔ لٹے پٹے خالی ہاتھ لوگوں کے ساتھ۔ پاک سرزمین کی جانب ہجرت کرنے والوں میں' میں بھی شامل تھی۔''

ماضی کے دھندلکوں میں کھوئی اماں بی کی آواز مدھم ہو گئی تھی۔

گوری نے آہستہ سے اپنا ہاتھ مائی حاجن کے بائیں ہاتھ پر رکھ دیا۔

''پھر' پھر کیا ہوا اماں......؟''

''پھر...... پھر وہ قافلہ جس میں' میں اور شیر محمد شامل تھے۔ اچانک راستے میں روک دیا گیا یہ کہہ کر آگے ہماری یعنی مسلمانوں کی جانوں کو خطرہ ہے' وہ چند ہندو سپاہی تھے اور انہوں نے قافلے کے تمام لوگوں کو جو اپنا سب کچھ لٹا کر اپنے پیاروں کی لاشوں کے دریا پار کر کے نئے وطن کو جا رہے تھے اپنی حراست میں لے کر جیل میں بند کر دیا۔ سب پریشان تھے کہ جانے اب کیا ہو' جس ہندو افسر کے کہنے پر یہ سب ہو رہا تھا۔ وہ بھی جانے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ تین دن یونہی گزر گئے تھے۔ ہمیں کھانے پینے کے لیے کوئی مناسب چیز نہیں مل رہی تھی۔ چوتھے روز ہمیں روٹی دی گئی اور وہ بھی کانچ پیس کر وہ کم ظرف ہندو۔ کہیں بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے باز نہیں آ رہے تھے۔ اس وقت

وہاں جیل میں جتنے بھی لوگ تھے سب چلا رہے تھے ان کے چلانے پر وہ ہندو افسر وہاں آیا تھا جس نے ہمارے قافلے کو روکا تھا۔ اسے جب پتا چلا کہ ہمارے کھانے میں کانچ پیس کر شامل کیا گیا ہے۔ وہ بہت شرمندہ ہوا۔ بہت بُرا بھلا کہا اس نے اپنے عملے کو اور ہمیں آزاد کر دیا۔ آزاد ہونے کے بعد قافلے کے لوگ مزید دو ٹولیوں میں بٹ گئے۔ میں جس ٹولی میں تھی شیر محمد اس میں شامل نہیں تھے۔ اس لیے اس ٹولی کی کچھ عورتیں اوباش ہندو لڑکوں کے ہاتھ چڑھ گئیں۔"

مائی حاجن کے لہجے میں پھر ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

گوری کی دل چسپی ان کی داستان میں مزید بڑھ گئی۔

✻✻✻

"میں نے کچھ پوچھا ہے امامہ......؟"

امامہ کے گالوں پر بہتے آنسوؤں کو بغور دیکھتے ہوئے وہ بولا تھا۔ جب اس نے آہستہ سے رخ پھیر لیا۔

"نہیں، میں کسی سے محبت نہیں کرتی کسی سے بھی نہیں۔"

کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تو شجاع نے آہستہ سے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

"کس سے ڈر رہی ہو امامہ، ایک دوست سے؟"

وہ اسے گھیر رہا تھا۔ امامہ تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکل آئی۔

"میں نہیں ڈرتی کسی سے، آپ سے تو بالکل نہیں۔"

رگڑ کر آنسو صاف کرتے ہوئے وہ قدرے اعتماد سے بولی تھی۔

شجاع کے لبوں پر دھیمی سی مسکان بکھر گئی۔

"اچھا، چلو یہ تو اچھی بات ہے۔"

"اب سو جائیں۔ آج گڑیا کے کان میں درد تھا میں ذرا اسے دیکھ آؤں۔"

نظریں چرا کر کہتی وہ فوراً کمرے سے بھاگ گئی تھی۔

شجاع لب بھینچ کر کھڑکی بند کرتا بیڈ پر چلا آیا۔

رات کے کسی پہر اچانک اس کی آنکھ کھلی تھی اور اس نے امامہ کو اپنے پہلو میں قدرے سائیڈ پر سمٹ کر لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ نہ صرف رو رہی تھی بلکہ بہت دھیمی سی سسکیاں بھی اس کے حلق سے برآمد ہو رہی تھیں۔

"امامہ......!" ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے پاس کرتے ہوئے اس نے اپنائیت سے پکارا تھا۔

امامہ کو جانے کیا ہوا، وہ اس کے کشادہ سینے میں منہ چھپا کر بلک اٹھی۔

"امامہ، کیا ہوا۔" شجاع اچھا خاصا پریشان ہو گیا تھا۔

امامہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے اپنا درد کیسے کہے؟ سو چپ چاپ کسی ننھی سی بچی کی طرح اس کی پناہ میں بلک بلک کر روتی رہی اور شجاع اس کا سر سہلاتا اسے چپ کرانے کی کوشش کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے آنسوؤں کی شدت میں کمی ہوئی تو شجاع نے آہستگی سے اسے خود سے علیحدہ کیا۔

''چلو اب بتاؤ شاباش کیا بات ہے؟ گڑیا تو ٹھیک ہے ناں؟''

''ہوں۔''

''پھر کیا الجھن ہے؟''

اس بار وہ اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کر رہا تھا۔ امامہ نے اندر کی تھکن سے بے حال اپنا سر اس کے مضبوط بازو پر ٹکا دیا

''شجاع' م...... میں بہت اکیلی ہوں...... پوری دنیا میں اللہ رب العزت کے سوا کوئی میرا نہیں ہے۔ نہ میری خوشی میں خوش ہونے والا' نہ میرے دکھ میں دکھی ہونے والا۔ میرا وجود کسی کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا' میں جیوں یا مر جاؤں' کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھ سے کسی کو محبت نہیں ہے کسی کو بھی نہیں۔''

وہ جذباتی ہو رہی تھی۔

شجاع یک ٹک اسے دیکھتا' خاموشی سے سنتا رہا۔

''بس اتنی سی بات پر رو رہی ہو؟''

امامہ کے خاموش ہونے کے بعد' گہری سانس بھرتے ہوئے وہ بولا تھا۔

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔''

''اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے کیونکہ رشتوں کا نہ ہونا اتنا تکلیف کا باعث نہیں ہوتا۔ جتنا رشتوں کے ہوتے ہوئے احساس کا مر جانا تکلیف کا باعث ہوتا ہے اور پھر...... امامہ کے پاس تو شجاع ہے ناں' جو اس کی عزت کرتا ہے' اسے اپنی زندگی میں اہمیت دیتا ہے' بنا کسی غرض کے اس سے بے لوث محبت کرتا ہے' اس کا خیال رکھتا ہے' بتاؤ کیا ایسا نہیں ہے۔''

کروٹ کے بل لیٹے وہ اس کا احتساب کر رہا تھا۔

امامہ کی نگاہ جھک گئی۔

''کیا تمہیں میری ننھی گڑیا کی محبت پر بھی شک ہے امامہ؟''

''نہیں۔''

''بس پھر آج کے بعد کبھی خود کو اکیلی مت سمجھنا' میں ہوں نا تمہارا' ہر سکھ دکھ کے موسم میں ساتھ نبھانے والا۔ اور ان شاء اللہ تم کبھی مجھے میرے کسی بھی قول و فعل میں جھوٹا نہیں پاؤ گی' میں تمہارا دوست ہوں امامہ۔ کبھی مت سوچنا کہ تم میری بچی کی گورنس تھیں یا میں پولیس لائن سے وابستہ ہوں تو تم پر سختی کروں گا۔ عورت خواہ کسی بھی روپ میں ہو میرے لیے اس کی مثال اک پھول سی ہے۔ تمہاری طرح بدقسمتی سے میرا بھی کوئی دکھ بٹانے والا نہیں تھا۔ مگر اب تم ہو ناں۔ میری ہم سفر۔ ہر دکھ سکھ کے موسم میں میرا ساتھ نبھانے والی۔ کبھی اکیلا چھوڑ کر نہ جانے والی ہے ناں۔''

شہادت کی انگلی امامہ کی جانب اٹھا کر وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

امامہ کا سر اثبات میں ہل گیا۔ اس کی پلکیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔

''آج سے ہم دوست ہیں امامہ! اپنا ہر سکھ دکھ بلا جھجک ایک دوسرے سے شیئر کرنے والے ٹھیک ہے؟''

"ہوں۔"

شجاع کے اپنائیت بھرے لہجے پر اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا تھا۔ جواب میں اس نے پھر امامہ کو اپنے حصار میں لے لیا۔

"تھینکس امامہ۔"

❋❋❋

عباد کی آنکھ کھلی تو طبیعت کا بوجھل پن قدرے کم ہوا تھا۔

آنکھ کھلتے ہی اس نے سب سے پہلے ہاتھ مار کر تکیے کے نیچے سے اپنا سیل برآمد کیا اور ایک مرتبہ پھر جماہی لیتے ہوئے صاعقہ کا سیل نمبر پریس کر ڈالا۔

ابھی کل رات ہی اس کی پاکستان واپسی ہوئی تھی اور سب سے پہلی کال وہ صاعقہ کو ہی کر رہا تھا۔ پہلے جو بے چینی تھی وہ اب اچھی خاصی پریشانی میں بدل رہی تھی۔ ایک کے بعد کئی بار اس نے نمبر پریس کیا تب کہیں جا کر اس کی کال پک ہوئی۔

"ہیلو۔" کال پک ہوتے ہی بے قراری سے کہتا وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

دوسری طرف صاعقہ آنسو پونچھ کر اپنی ماں کے کمرے سے باہر نکل آئی۔

"جی؟" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔

"زرنیل جی آپ ٹھیک تو ہیں پچھلے کئی روز سے میں کال کر رہا ہوں، مگر آپ رسپانس نہیں دے رہیں۔"

"ہوں......وہ......میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"کیا ہوا؟"

"پتا نہیں، بس دنیا میں دل نہیں لگ رہا۔"

دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے وہ پھر رو پڑی تو عباد کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔

"مم......ملنا چاہتا ہوں آپ سے فوری۔"

"سوری......فی الحال میں آپ سے نہیں مل سکتی۔"

"کیوں؟" وہ مچلا تھا۔ صاعقہ لب کچل کر رہ گئی۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ کیوں؟

تھوڑی دیر خاموشی کے بعد وہ بولی تھی۔

"میں ان دنوں ملک سے باہر ہوں۔"

عباد اس کے اس جھوٹ سے جان گیا کہ وہ ضرور کسی بڑی الجھن میں ہے تبھی گہری سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"میں آپ کے لیے پریشان ہو رہا ہوں زرنیل جی! بہت زیادہ مس کر رہا ہوں آپ کو۔ پلیز وطن واپسی پر مجھ سے ضرور ملیے گا۔ میں شدت سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" مختصراً کہہ کر صاعقہ نے لائن کاٹ دی تو عباد کی اس کے لیے پریشانی مزید بڑھ گئی۔ جانے وہ کس الجھن کس پریشانی کا شکار تھی۔ بہت بے کل ہو کر وہ بستر سے نکلا تھا اور بد دلی سے کپڑے اٹھا کر واش روم میں بند ہو گیا۔

❁❁❁

عباد انڈسٹری میں اس کی اور آمنہ کی جاب پکی ہوگئی تھی۔ وہ بے تحاشہ خوش تھی مگر گھر کے حالات اور سب سے بڑھ کر ماں کی بیماری نے اسے خاصا غم زدہ کر رکھا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس سے مدد کی درخواست کرے۔ کس سے قرض مانگے؟ ڈاکٹر عارف جو اس کی ماں کا علاج کر رہے تھے اُدھیڑ عمر بزرگ تھے۔ صاعقہ کے حالات ان کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں تھے۔ اسی لیے اس روز جب وہ فیکٹری سے واپس آئی تو چیک اپ کے بعد انہوں نے اسے اپنے آفس میں بلالیا۔

"السلام علیکم ڈاکٹر صاحب۔" تھکی تھکی سی وہ بہت شکستہ لگ رہی تھی۔ وہ اسے بغور دیکھ کر رہ گئے۔

"وعلیکم السلام' آیئے بیٹھیے۔"

"آپ نے بلایا' خیریت؟" وہ جھجکتی آگے بڑھ آئی۔

"ہوں اصل میں' میں آپ کی والدہ صاحبہ کے بارے میں آپ سے تفصیلاً بات کرنا چاہ رہا تھا۔ جو وہاں روم میں ممکن نہیں تھی۔"

"کیسی بات؟" ابرو اچکاتی وہ ان کے مقابل کرسی پر ٹک گئی تبھی وہ بولے۔

"دیکھیے مِس صاعقہ چند روز قبل میں نے آپ کی والدہ کے جو چند ضروری ٹیسٹ کیے تھے ان کی رپورٹ آ گئی ہے۔ رپورٹس کے مطابق آپ کی والدہ مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ کینسر کی ابتدائی اسٹیج پر کھڑی ہیں۔ گلے کا کینسر ہے انہیں۔ تاہم فوری آپریشن سے اس پر سو فیصد قابو پایا جاسکتا ہے۔"

ڈاکٹر عارف کا لہجہ نارمل تھا مگر صاعقہ اندر سے ہل کر رہ گئی تھی۔

"آپریشن......!"

"جی ہاں آپریشن ہی اس کا واحد حل ہے۔ آپ کو فوری طور پر پانچ لاکھ روپے کا انتظام کرنا ہوگا کیونکہ اس آپریشن میں تاخیر کسی صورت مناسب نہیں۔"

ڈاکٹر عارف کی زبان فراٹے بھر رہی تھی۔ صاعقہ کے چہرے کا سارا خون جیسے نچڑ گیا۔

"پانچ لاکھ......؟"

خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے ڈاکٹر عارف کی طرف دیکھا تھا جب وہ بولے۔

"جی ہاں میں سمجھ سکتا ہوں آپ جیسی معمولی ملازمت کرنے والی لڑکی کے لیے یہ رقم بہت زیادہ ہے مگر اپنی والدہ کی زندگی چاہتی ہو تو فوراً اتنی رقم کا انتظام آپ کو کرنا ہی ہوگا۔ میں تو آپ کی مدد کے لیے اتنا ہی کرسکتا ہوں کہ اپنی فیس کے پیسے نہ لوں۔"

صاعقہ کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے۔

"ویسے آپ مناسب خیال کریں تو ایک اور آپشن بھی ہے۔"

اسے سن بیٹھی دیکھ کر انہوں نے پلان کے مطابق پہلا پتہ پھینکا۔

صاعقہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

"کیسا آپشن؟"

"میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں۔ آپریشن کے تمام اخراجات اٹھا سکتا ہوں۔ بدلے میں آپ بھی

میری مدد کریں۔"

"مم...... میں کیسے مدد کرسکتی ہوں آپ کی؟"

اس کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا۔

ڈاکٹر عارف چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔

"مس صاعقہ......! مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دھن دولت کے انبار لگے ہیں۔ اربوں کی پراپرٹی کا مالک ہوں۔ مگر ذہنی سکون نہیں ہے۔ بیوی تو ہے مگر اسے اپنے فرائض کا خیال نہیں۔ شکل وصورت بھی ایسی ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھنے کو دل نہ چاہے۔ ایک بیٹا ہے وہ سمندر پار پڑھ رہا ہے۔ اسے مہینوں کال کر کے خیریت دریافت کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ بیٹی ہے تو اس کی شادی بھی دیار غیر میں ہوئی ہے۔ کوئی حال پوچھنے والا ہے نہ خیال رکھنے والا۔ ایسے میں کل شب یونہی آپ کی والدہ کے چیک اپ کے لیے جب میں روم میں آیا۔ تو آپ کرسی پر بیٹھی بیٹھی سو رہی تھیں۔ میں نے اسی لمحے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ آپ کو اپنی زندگی میں شامل کرلوں۔"

بڑھاپے کی حدود کو چھوتے "انسانی مسیحا" کی ساری کہانی کا پس منظر صاعقہ کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس لمحے اسے اپنے سچے دین کی سچی تعلیمات میں عورت کے لیے پردے کے احکام کی اہمیت بھی شدت سے یاد آ گئی۔

یک لخت اس کی آنکھیں اپنی بے بسی پر آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں ڈاکٹر صاحب مگر معذرت کہ میں آل ریڈی انگیجڈ ہوں۔"

"تو کیا ہوا آپ پڑھی لکھی، سمجھ دار لڑکی ہیں۔ خود مختار ہیں انگیجمنٹ ایسا تعلق تو نہیں جو ٹوٹ نہ سکے۔"

صاعقہ کے ہاتھ پیر سرد پڑ گئے۔

"اچھی طرح سوچ لیجیے۔ کل اپنے جواب سے آگاہ کر دیجیے گا۔ میں انتظار کروں گا۔" فوراً ہی خود کو معروف ظاہر کرتے ہوئے اس نے صاعقہ کو جانے کی اجازت دی تھی۔

"اور ہاں اتنا یاد رکھیے گا مس صاعقہ آج جو وقت چل رہا ہے اس میں لڑکی کا حصول بے حد آسان اور سستا ہے مگر دولت کا حصول بے حد مشکل، ضروری نہیں میرے علاوہ بھی کوئی نوجوان لڑکا آپ کے حصول کا اتنا ہی ضرورت مند ہو۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناں میری بات۔"

اپنا شکستہ وجود سمیٹتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھ رہی تھی جب وہ اسے تنبیہ کرتے ہوئے بولے۔ صاعقہ کا سر ایک مرتبہ پھر اثبات میں ہلا اور اس کے ساتھ ہی اس کی پلکوں پر لرزتا آنسو پھسل کر اس کے گریبان میں جذب ہو گیا۔

زندگی کبھی کبھی ایسے کڑے امتحان بھی لیتی ہے اسے گمان نہیں تھا۔

❁❁❁

اسے خبر ہی نہیں تھی کہ پچھلے چار گھنٹے سے وہ کہاں تھا اور کیوں تھا؟

وقت کا گھوڑا تیزی سے آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ تبھی وہ گاڑی کے بونٹ سے اٹھا تھا اور

بے دلی سے دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھا۔

ابھی کل عبدالصمد نے اس کے سامنے اس کے بیٹے کو تھپڑ مارا تھا اور وہ اچھا خاصا الجھ کر رہ گیا تھا۔ کیسی بے بسی تھی یہ کہ وہ کھل کر دنیا کو اپنے گناہ کے بارے میں بتا بھی نہیں سکتا تھا۔

اندر کی گھٹن تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو اچانک لائٹ چلی گئی۔ یو۔ پی۔ ایس بھی شاید اپنا چارج کھو چکا تھا۔ اسے اپنے سیل کی لائٹ سے کام چلانا پڑا۔ تھکن اتنی تھی کہ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اس کا ارادہ پہلے کچن میں جا کر چائے بنانے کا تھا لہٰذا سیل کی روشنی میں وہ سیدھا اسی طرف چلا آیا۔ تبھی اس کی نگاہ وہاں پہلے سے موجود انوشہ پر پڑی اور اس کے قدم دہلیز پر ٹھٹک گئے۔

''تم......اور اس وقت یہاں؟''

رات گہری ہو رہی تھی تبھی وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

انوشہ نے خاموشی سے پلٹ کر ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر سے اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے انوشہ اتنی رات کو یہاں کیا کر رہی ہو تم؟''

وہ لپک کر قریب آیا تھا تبھی وہ تلخی سے بولی۔

''کچھ بھی کروں تم سے مطلب؟''

''مطلب ہے تبھی پوچھ رہا ہوں۔''

وہ تپا تھا اور انوشہ کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف گھمایا تھا۔

''بازو چھوڑو میرا۔''

''کیوں اتنی پتھر ہو گئی ہو تم؟ ایک صنف نازک کو اتنی سختی زیب نہیں دیتی۔''

ضد میں آ کر بنا اس کے احساسات کی پروا کیے اس نے اس کے بازو پر اپنی گرفت سخت کی تھی۔

تبھی وہ سلگ کر بولی۔

''تمہارے گھرانے کی لڑکیوں کو زیب نہیں دیتی ہو گی اس لیے وہ......''

''چٹاخ۔''

اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرتی۔ شاہ زر کے زوردار تھپڑ نے اس کی زبان کو بریک لگا دی۔

''بات بات میں میرے گھرانے کی عورتوں تک مت پہنچا کرو۔ بہت پاکباز ماں تھی میری صرف دو ننھے منے بچوں پر اپنی ساری جوانی وار کر رکھ دی تھی انہوں نے سنا تم نے۔'' اسے غصہ بہت کم آتا تھا مگر اب مسلسل ذہنی پریشانی نے اسے نیم پاگل سا کر چھوڑا تھا۔

انوشہ اب دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔

شاہ زر کو ترس آ گیا۔

''مت غصہ دلایا کرو مجھے انوشہ پلیز۔ کیوں چاہتی ہو تم کہ میں وقت سے پہلے مر جاؤں۔'' پشیمانی سے کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ انوشہ کے کندھوں پر دھرے تھے۔

''میں کل کراچی جا رہا ہوں' دو تین روز کے لیے۔ آتے ہی تمہاری ٹکٹ کنفرم کرانے کا کام کروں گا۔ اب تو خوش ہو جاؤ۔''

''میں کہیں نہیں جا رہی سنا تم نے' مر گئے ہیں میرے سب' ازل سے اکیلی تھی اکیلی ہی مروں گی' مت احسان کرو مجھ پر۔''

تڑخ کر کہتی وہ پلٹی تھی۔ جب شاہ زر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تمہیں رنج ہے ناں کہ میری وجہ سے تم معتوب ٹھہریں اور مجھ پر حرف بھی نہیں آیا۔ چلو آج اس کہانی کو بھی یہ موڑ دے ہی دیتے ہیں۔''

ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں کہہ کر سسپنس پھیلاتے ہوئے اس نے انوشہ کو حیران کر دیا تھا۔

''آؤ میرے ساتھ۔''

جانے اس کا کیا ارادہ تھا۔ انوشہ غائب دماغی سے اس کے ساتھ کھنچتی گئی۔

''بیٹھو یہاں۔''

لاؤنج میں پڑے صوفے پر اسے بٹھاتے ہوئے وہ خود بھی وہیں اس کے ساتھ جم کر بیٹھ گیا تھا۔ اگلے پل اس نے پاکٹ کی جیب سے سیل نکالا اور زاور حسن کا نمبر پریس کر ڈالا۔

''ہیلو۔''

زاور فیملی کے ساتھ گھر میں ہی بیٹھا تھا۔ شاہ زر کے فون سے خوش ہو گیا۔

''السلام علیکم' کیسے ہو شاہ' انوشہ کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے تم کیسے ہو؟'' اس کا چہرہ سپاٹ تھا انوشہ ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہی۔

''میں بھی ٹھیک ہوں اور شافیہ بھی۔ کل ہی مما کو اسپتال سے گھر واپس لائے ہیں۔ بابا اور امی (جمال صاحب اور نزہت بیگم) انوشہ کو بہت یاد کر رہے ہیں۔ کب آ رہی ہے وہ یہاں؟'' اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے انوشہ زاور کی ہر بات خود سن رہی تھی۔ اس کی آنکھیں یک لخت آنسوؤں سے بھر آئیں۔

''بہت جلد...... اور سناؤ گھر میں سب کیسے ہیں؟'' اس کا لہجہ بھاری ہو رہا تھا۔ انوشہ سُن سی اسے دیکھتی رہی۔

''سب ٹھیک ہیں، بلکہ اس وقت سب اکٹھے ہی بیٹھے ہیں۔''

''اچھی بات ہے...... لاؤڈ اسپیکر آن کر لو...... آج بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں سب سے۔'' ہنوز سپاٹ لہجے میں کہتا وہ اسے حیران کر رہا تھا۔

تو کیا واقعی وہ شخص سب کے سامنے، اپنے گناہ تسلیم کر کے خود کو سب کی نگاہوں سے گرانے جا رہا تھا؟

اپنا وقار، اپنی ساکھ داؤ پر لگانے جا رہا تھا؟

کس لیے......؟ صرف اس کی نفرت سے ہار مان کر؟

اس کے درد کا ازالہ کرنے کے لیے......؟

اسے یہ دکھانے کے لیے کہ وہ اس کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہے، کچھ بھی......

کیا واقعی اسے محض اس کی نظر میں سرخرو ہونے کے لیے اپنی رسوائی سے بھی کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

زاور حسن اس کے الفاظ پر ٹھٹکا تھا۔
''ضروری باتیں...... خیریت ہے ناں......؟''
''ہُوں...... انوشہ کے بارے کچھ اہم انکشافات کرنے ہیں...... سب یہی جانتے ہیں کہ وہ خطا کار ہے، اس نے کوئی غلط قدم اُٹھایا ہے، مگر...... ایسا نہیں ہے...... صرف تمہاری وجہ سے اسے کڈنیپ کیا گیا، اس پر بے جا تشدد کیا گیا...... اس کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کر کے اسے سب کی نظروں سے گرانے کی کوشش کی گئی، اور تو اور کمال انکل کی موت کا ذمہ دار بھی اسی کو سمجھ لیا گیا...... مگر...... اسے تمہاری بہن ہونے کی سزا ملی، صرف تمہیں سبق سکھانے کے لیے اسے اغواء کیا گیا...... وہ خط جو اس کی رائٹنگ میں تم نے پڑھا اور کسی حد تک جو کمال انکل کی موت کا سبب بنا...... وہ خط بھی اس سے جبراً لکھوایا گیا تھا...... تمہاری بہن ہونے کے جرم میں اپنی عصمت لُٹائی اس نے...... اور...... اور اب بھی صرف تمہاری بہن ہونے کی سزا میں وہ پل پل مر رہی ہے کیونکہ جس شخص کے ساتھ تم اسے منسوب کر کے گئے وہ شخص کسی عذاب سے کم نہیں ہے اس کے لیے۔''
جذبات کی رو میں بنا کسی انجام کی پروا کیے وہ بول رہا تھا۔
انوشہ کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی اس کا جذبات سے سرخ چہرہ دیکھ رہی تھیں۔
''جاننا چاہو گے...... یہ سب کس نے کیا اور کیوں کیا......؟''
زاور حسن کی سماعتیں سائیں سائیں کر رہی تھیں...... یہ وہ کیا سُن رہا تھا......؟ کیا بتانے جا رہا تھا شاہ زر اسے......؟
وہ بولا تو اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے برآمد ہوئی تھی۔
''کس نے کیا یہ سب اور کیوں......؟''
زاور کے سوال پر انوشہ کی آنکھ سے یُوں آنسو کا قطرہ ٹپکا جیسے کسی پتھر سے بارش کا قطرہ پھسلا ہو، تاہم اس سے پہلے کہ شاہ زر کے لب اس کے سوال کا جواب دیتے، اس کا سکتہ ٹوٹا اور اس نے سرعت سے لپک کر سیل فون اس سے چھین لیا۔

❁❁❁

عباد کے گھر میں اس کی لاڈلی اکلوتی بہن ہانیہ کی شادی کے سلسلے میں سبھی عزیز و اقارب پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ معروفیات اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ اس کا ایک پاؤں گھر پر ہوتا تو ایک گھر سے باہر، اکلوتا بیٹا اور بھائی ہونے کی تمام تر ذمہ داریاں وہ بخوبی نبھا رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کا دل سکون میں نہیں تھا۔ صاعقہ کا خیال بار بار اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔ سُنڈنی سے ہادیہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ پاکستان پہنچ چکی تھی، شاہ زر نے البتہ مہندی والے روز آنے کا وعدہ کیا تھا۔ سب کچھ اپنی جگہ ٹھیک تھا مگر وہ انجوائے نہیں کر پا رہا تھا۔
کئی بار صاعقہ کے سیل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار وہ آف ملتا۔ اس کا دھیان مختلف کاموں میں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھا۔ مگر کیسی عجیب بے بسی تھی کہ نہ اس کے لیے اپنی اُلجھن کسی سے شیئر کرنا ممکن تھا نہ صاعقہ کو اس تقریب میں خود جا کر انوائیٹ کرنا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا

رکھا رہے۔
ہادیہ کی شاپنگ ابھی رہتی تھی اسی لیے وہ اس کے سر پر سوار ہوئی تھی کہ اسے مارکیٹ لے کر جائے۔ خود اس کی مما بھی کئی بار اسے یہی حکم سُنا چکی تھیں مگر اس کا دل کہیں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ صاعقہ کا آف سیل اسے بے قرار کیے ہوئے تھا۔

صبح سے دوپہر کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر نیچے ہال میں آ گیا تو ہادیہ کا موڈ خاصا خراب ہو چکا تھا۔ مجبوراً اسے دل نہ چاہنے کے باوجود اس کے ساتھ مارکیٹ آنا پڑا۔ عین اس وقت جب وہ گاڑی کا لاک کھول رہا تھا اس کا سیل بجا تھا۔

وہ کال پک نہیں کرنا چاہتا تھا مگر جانے کیا سوچ کر اس نے سیل پاکٹ سے نکال لیا۔ ہادیہ اپنی سیٹ سنبھال چکی تھی۔ عباد کی نظر اپنے سیل کی اسکرین پر چمکتے نمبر پر جونہی پڑی اس کا دل بلیوں اُچھل پڑا۔ کال صاعقہ کی تھی...... اسے کتنی ہی دیر یقین نہ آیا۔

کال بج بج کر اس سے پہلے کہ بند ہو جاتی اس نے فوراً اسے ڈس کنکٹ کر کے خود کال کر لی۔

''ہیلو......'' صاعقہ کی آواز جونہی سماعتوں میں اُتری اس کا دل بے کل ہو گیا۔

ہادیہ اب منتظر نگاہوں سے روٹھی روٹھی سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''جی...... آ گیا میرا خیال......؟'' خوشی سے بے حال اس کا دل چاہا وہ رو پڑے۔ تبھی وہ بولی تھی۔

''سوری...... میں نے بتایا تھا ناں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی......''

''اب کیسی طبیعت ہے؟'' اپنی خوشی میں وہ ہادیہ کی موجودگی قطعی فراموش کر چکا تھا۔

''کچھ بہتر ہے...... آپ کیا کر رہے ہیں اس وقت......؟''

''کچھ نہیں۔ آپ حکم کریں۔''

''میں ملنا چاہتی ہوں آپ سے...... ابھی اور اسی وقت ساحل سمندر پر۔'' وہی اس کا نم نم سا بھیگا لہجہ، عباد اپنی خوش بختی اور دعاؤں کی اس قدر جلد قبولیت پر حیران رہ گیا۔

''ٹھیک ہے...... میں ابھی آ رہا ہوں...... سیل آف مت کیجئے گا پلیز......'' جلدی جلدی کہہ کر اس نے لائن ڈس کنکٹ کی، پھر دبے دبے جوش سے گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے بولا۔

''سوری ہادیہ...... مجھے اس وقت ایمرجنسی کہیں پہنچنا ہے، میں فی الوقت تمہارے ساتھ مارکیٹ نہیں جا سکتا۔'' ہادیہ کو اس کی معذرت اپنے منہ پر تماچے کی صورت لگی تھی۔ تبھی وہ بنا کچھ کہے منہ پُھلا کر گاڑی سے نکلی اور واپس پلٹ گئی۔

عباد اس کے موڈ کی پروا کیے بغیر زن سے گاڑی بھگا کر ساحل سمندر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پچھلی بار کی طرح اس بار بھی اسے صاعقہ کا انتظار کرنا پڑے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ ابھی گاڑی سے اُتر کر تھوڑی دور ہی آیا تھا کہ اسے وہ تنہا بیٹھی دکھائی دے گئی۔ سر پر اسکارف کے باوجود اس کے ریشمی بال پشت پر بکھرے اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ عباد کے قدموں میں مزید تیزی آ گئی۔

''زرنیل جی......'' پھولی سانس کے ساتھ اس کے قریب پہنچ کر اس نے پکارا تھا۔

صاعقہ جو اپنے ہی خیالوں میں گم تھی اس کی پکار پر فوراً چونک کر پلٹی۔
''آ گئے آپ...... کیسے ہیں......؟'' وہ بے طرح خوش ہوئی تھی۔ عباد دل سے مسکراتا اس کے پہلو میں ٹک گیا۔
''بہت سنگدل ہیں آپ...... اتنے دنوں سے میری جان سولی پر لٹکا رکھی ہے آپ نے...... اور آپ کو اس کا احساس بھی نہیں ہے۔'' وہ شکوہ کر رہا تھا اور صاعقہ کی نگاہیں اس کے شاندار سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔
''میں سمجھی نہیں......''
''سمجھ بھی کیسے سکتی ہیں...... دل والوں کی باتوں کو سمجھنے کے لیے دل والا ہونا ضروری ہے، مگر آپ کے پاس تو دل نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں......''
صاعقہ کا سر جھکا تھا اور اس کے لب پھیکی سی مسکان کے حصار میں اس کی آنکھوں کے گوشے نم کر گئے تھے۔
''صحیح کہہ رہے ہیں آپ......''
''بکواس کر رہا ہوں میں...... کچھ بھی صحیح نہیں کہہ رہا ہوں۔''
وہ تپا ہوا تھا، صاعقہ سر اُٹھا کر ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گئی۔
''پلیز بتائیے ناں...... کیا ہوا ہے...... پریشان کیوں ہیں آپ......؟''
''پتا نہیں......'' تھکی تھکی سی سانس خارج کی تھی اس نے۔ عباد کی بے کلی مزید بڑھ گئی۔
''اعتبار نہیں ہے ناں مجھ پر......؟'' وہ مضطرب ہو رہا تھا۔ صاعقہ کی پلکیں ضبط کی ہزار کوششوں کے باوجود بھیگ گئیں۔
''ایسی بات نہیں ہے......''
''پھر...... کیسی بات ہے......؟''
''میری موم کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے زین...... انہی کی وجہ سے پریشان ہوں...... بزنس نقصان میں جا رہا ہے اور......''
آگے کچھ کہنے کی اس میں ہمت ہی نہیں تھی۔ عباد کو لگا وہ پُرسکون ہو گیا ہو۔
''بس...... اتنی سی بات پر اتنی پریشان ہو گئیں آپ......؟''
''یہ اتنی سی بات نہیں ہے زین...... آپ نہیں جانتے میں کتنے مسائل کا شکار ہوں...... مم...... میں غلط نہیں ہوں۔ میرے دل میں آپ کا بہت احترام ہے...... مگر...... ہو سکتا ہے اب بھی میری آپ سے کوئی بات نہ ہو۔ آپ کا احسان ہے مجھ پر...... اسی لیے۔''
ابھی بول رہی تھی کہ اچانک اس کی نگاہ سامنے سے آتے ڈاکٹر عارف پر جا پڑی۔ وہ عباد کے سامنے اپنا پول کھلتا برداشت نہیں کر سکتی تھی تبھی بدحواس ہو کر جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔
''ایکسکیوزمی...... مم...... میں ابھی آتی ہوں......'' عباد نے پلٹ کر دیکھا اور اسے ڈاکٹر عارف کی طرف بڑھتے دیکھ کر حیرانی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جانے اس شخص سے کیا بات کر رہی تھی مگر...... وہ سلگ اُٹھا۔

دو منٹ...... تین منٹ...... پانچ منٹ اس نے انتظار کیا، پھر صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو غصے سے آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے سائیڈ پر کھینچ لایا۔

صاعقہ اس کی اس جرأت پر دنگ رہ گئی۔

''کون ہے یہ شخص...... اور آپ کیسے جانتی ہیں اسے......؟''

''ڈاکٹر ہے...... میری موم کا علاج انہی کے پاس ہو رہا ہے۔''

''اوکے......'' وہ یوں لب بھینچ رہا تھا گویا ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا ہو۔

''آپ ڈاکٹر تبدیل کریں...... روپیہ جتنا درکار ہو گا میں بندوبست کرلوں گا۔''

''کوئی ضرورت نہیں...... میں کسی کا احسان نہیں لینا چاہتی۔''

''میں احسان نہیں کر رہا...... جو فرض ہے وہ ادا کر رہا ہوں۔''

''کس رشتے سے......؟'' وہ ذرا سی تلخ ہوئی تھی۔

ڈاکٹر عارف کے سامنے جو حرکت اس نے کی تھی، اس سے اس کا دماغ کھول رہا تھا۔

عباد اس کے سوال پر مزید سلگ اُٹھا۔

''کل بتاؤں گا کس رشتے سے...... ابھی جا رہا ہوں مگر کل اسی وقت اسی جگہ پر آپ کا انتظار کروں گا...... اگر آپ نہ آئیں تو قسم کھا کر کہتا ہوں، زندگی بھر دوبارہ کبھی آپ میری شکل نہیں دیکھیں گی......''

وہ غصے میں تھا۔ صاعقہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی اور وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا اس کی نگاہ سے دور ہوتا گیا۔

❁❁❁

گاؤں مراد شاہ کی خوب صورت کشادہ حویلی میں بیٹھی، اس وقت وہ بہزاد علی مراد کے ماں باپ سے مل رہی تھی۔ جو مراد علی شیر کے تعارف پر اس سے مل کر بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے۔

پانچوں وقت نماز کی ادائیگی اور ایمان کی روشنی نے ان دونوں بزرگوں کے چہروں پر نور ہی نور پھیلا رکھا تھا۔ بابا دیر تک اس سے اس کے بابا کی باتیں کرتے رہے، ماضی کے ہزاروں قصے انہیں ازبر تھے، انزلہ کو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہو سکا۔

حویلی کے شفاف کشادہ صحن میں جو اینٹوں سے بنا تھا، کبوتروں کا غول، غٹرغوں، غٹرغوں کرتا پھر رہا تھا۔ ایک طرف کچے احاطے میں، گاؤں کی کچھ لڑکیاں کام کر رہی تھیں، کوئی گندم صاف کر رہی تھی کوئی لسی میں سے مکھن نکالنے کا فریضہ سرانجام دے رہی تھی تو کوئی ایک سائیڈ پر بیٹھی ساگ اور پالک صاف کر رہی تھی۔

انزلہ کی نگاہ براہ راست ان سب پر پڑ رہی تھی۔ بابا خادم علی مراد سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''بابا...... میں اصل میں ایک گزارش لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔''

''ہاں کہو بیٹا......''

خادم علی مراد کی نگاہ ہال کمرے میں داخل ہوتے بہزاد علی مراد پر تھی جو ابھی حویلی واپس آیا تھا۔ انزلہ نے پلٹ کر اسے نہیں دیکھا۔

''بابا......! میں اصل میں علم کی دولت عام کرنا چاہتی ہوں......اس مقصد کے لیے ''شاہ والا'' میں، میں نے ایک اسکول بھی تعمیر کروایا ہے مگر...... وہ لوگ میرے ساتھ تعاون نہیں کر رہے...... بہت مایوس ہو کر میں نے آپ کے گاؤں کا رُخ کیا...... کیا آپ لوگوں میں یہ دولت بانٹنے میں میری مدد کر سکتے ہیں......؟'' اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

بہزاد علی مراد بازو کے کف فولڈ کرتے ہوئے بے ساختہ سر اُٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔

خادم علی مراد اب انزلہ سے کہہ رہے تھے۔

''کیوں نہیں بیٹے......تمہاری طرح بہزاد بھی لوگوں کی فلاح اور بھلائی کے کاموں میں بہت جذباتی ہے، اس نے بھی یہاں ایک اسکول اور کالج کی تعمیر شروع کر رکھی ہے......تم دونوں مل کر جو چاہو کر سکتے ہو۔''

''شکریہ بابا......بہت بہت شکریہ۔''

وہ بہت خوش ہوئی تھی، تبھی ملازمہ نے رات کا کھانا چُن دیا تو وہ سب اکٹھے دسترخوان پر جا بیٹھے۔ انزلہ ایک عرصے کے بعد بہت خوشی محسوس کر رہی تھی۔ کھانا بہت خوش گوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ حویلی سے باہر شام کے سائے گہرے ہوئے تو وہ واپسی کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''اب میں چلوں گی بابا......بڑی ماں پریشان ہو رہی ہوں گی......''

''ٹھیک ہے......لیکن تم اکیلی نہیں جاؤ گی...... بہزاد یا مراد میں سے کوئی چھوڑ آئے گا۔'' بابا بھی اس کے ساتھ ہی اُٹھے تھے۔

بہزاد کی والدہ ماں جی نے کئی چیزیں اس کے لیے گاڑی میں رکھوا دیں۔ مراد کو حویلی میں کام تھا لہٰذا بہزاد اپنی جیپ میں اسے ''شاہ والا'' کے لیے چھوڑنے پر راضی ہو گیا۔ انزلہ بہت سارا پیار لے کر، جلد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے حویلی سے نکلی تھی۔

❁❁❁

''میراں یار! تیری کزن تو بڑی کام کی نکلی، پچھلے پانچ سال سے کیس لٹک رہا ہے تیرا......اب سُنا ہے ڈی آئی جی صاحب کے حکم پر دوبارہ تفتیش ہو رہی ہے۔''

وہ نماز کے بعد دیوار سے سر ٹکائے، خاموشی سے کلمہ طیبہ کا ورد کر رہا تھا جب اس کے ساتھی قیدی نے جوش سے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ جواب میں میران نے آہستہ سے آنکھیں کھول لیں۔

''وہ بہت بہادر ہے حفیظ......جبر کے سامنے سر جھکانا نہیں سیکھا اس نے......''

''کیا بہت پیار کرتی ہے تم سے......؟''

''نہیں...... ہاں میں پیار کرتا ہوں اس سے......اور یہ وہ جانتی ہے اسی لیے یونیورسٹی کے دنوں میں جب میں نے اسے پرپوز کیا تو وہ بہت خوش تھی......مگر......اب شاید یہ ممکن نہ ہو......'' میران کا لہجہ یاس میں ڈوبا ہوا تھا۔

''کیوں...... کیوں ممکن نہ ہو......؟''

''بس یار......اب میری ذات پر ایک دھبّا لگ گیا ہے...... میں نہیں چاہتا وہ میرے نام سے جانا جائے تو اس کا سر جھکا ہو......''

''دل کا کیا کرنا ہے یار......اسے تو جتنی ڈھیل دو اتنا ہی سر کو چڑھتا ہے۔''

وہ سخت اذیت کا شکار تھا۔ حفیظ اس کے بعد ایک لفظ بھی مزید کہنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔

❊❊❊

''مما جانی!'' وہ کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھی۔ جب گڑیا کی پکار پر چونک کر سر اُٹھایا۔

''جی بیٹے......''

''باہر لان میں کھیلیں......''

ہر وقت اسی سے سہمی رہنے والی بچی اب اس کے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہتی تھی۔ امامہ نے سامنے کھلی کتاب بند کر کے سائیڈ پر رکھ دی۔

''پاپا اُٹھ گئے......؟''

''نہیں......''

''او کے چلو......''

بچی کو بانہوں میں بھر کر وہ باہر لان کی طرف آئی تو وہاں قدرت اللہ صاحب کو پودوں کے پاس ٹہلتے دیکھ کر خوش ہو گئی۔

''بابا......آپ......؟''

''ہوں...... ایک عرصہ ہوا، ان پھول پودوں کا حال ہی نہیں جان سکا...... آج سوچا ایک نظر دیکھ لوں، بہت خوش ہیں یہ پھول پودے تم سے۔''

''مجھ سے......؟ وہ کیسے......؟'' مسرور انداز میں مسکراتے ہوئے وہ قدرت اللہ صاحب کے پہلو میں کرسی پر ٹِک گئی تھی۔ جب کہ گڑیا اس کی گود سے اُتر کر قدرت اللہ صاحب کی گود میں جا بیٹھی۔

''دیکھو تم نے ان کا کتنا خیال رکھا ہے...... یہ ملازم......ان کا ویسے خیال نہیں رکھ سکتے جیسے کوئی بے غرض محبت کرنے والا کر سکتا ہے۔''

امامہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ اس سے بے حد خوش تھے۔ اسے بے پناہ خوشی ہوئی۔

اسی پل شجاع فل یونیفارم میں تیار ہو کر اسی طرف چلا آیا۔

''السلام علیکم......''

''وعلیکم السلام......آؤ بیٹھو۔''

قدرت اللہ صاحب کا چہرہ سچی خوشی سے دمک رہا تھا۔ شجاع ایک نظر امامہ کے چہرے پر ڈالتا ان کے قریب بیٹھ گیا۔

''آج بہت خوش دکھائی دے رہے ہیں بابا...... خیر ہے......؟''

''ہوں...... میں واقعی بہت خوش ہوں بچے...... پہلی بار تم نے مجھے مطمئن کیا ہے......''

''کیسے......؟'' اس کی سیاہ آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔

''اس بچی کو اپنی زندگی میں شامل کر کے..... پچھلے چار سال سے مجھے یہی احساس دلایا جا رہا تھا جیسے میں کوئی پرانی، بے کار چیز ہوں..... جس کی کسی کو کوئی خاص ضرورت نہیں..... مگر..... اس بچی کی خدمت نے مجھے پھر سے زندہ کر دیا ہے..... یہ ہر بات کی، میرا خیال ایسے ہی رکھتی ہے جیسے میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں..... میری نماز..... وضو..... کھانا پینا..... دل بہلانا..... یہاں تک کہ ان پھول پودوں کی دیکھ بھال کا فرض بھی پوری جانفشانی سے سر انجام دیا ہے اس نے.....'' قدرت اللہ صاحب کی زبان، امامہ کی تعریف میں فرانٹے بھر رہی تھی۔

شجاع کے لبوں پر دھیمی سے مسحور کُن مسکراہٹ بکھر گئی۔

''چلیں..... یہ تو اچھی بات ہے..... مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ محترمہ اس گھر میں کیا کیا کام سر انجام دے رہی ہیں..... ویسے بچ کے رہیے گا۔ ایسا نہ ہو جناب آپ کو بھی اپنا عادی بنا کر پھر کہیں رفو چکر ہو جائیں اور ہمیں ڈھونڈے سے بھی ان کا نام ونشان نہ ملے۔'' وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ امامہ کے مسکراتے لب سمٹ گئے۔

شجاع کے الفاظ پر اس کی نگاہیں بہت دکھ کے ساتھ اس کی طرف اُٹھی تھیں۔ تو کیا وہ ابھی تک اس شخص کا اعتماد جیتنے میں ناکام رہی تھی؟

اس سے پہلے کہ شجاع اس کے چہرے سے اس کو ابھی ابھی پہنچنے والے دکھ کا اندازہ کرتا، وہ لان سے ملحقہ ہال کمرے میں رکھے فون کی تیزی سے بجتی بیل پر اُٹھ کر ہال کمرے کی طرف بڑھ گئی،

''ہیلو.....''

''ہیلو مُون..... کیسی ہو.....؟''

اس کے ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے آنے والی خوش گوار آواز ارسلان حیدر کی تھی۔

امامہ کا دل جیسے ایک لمحے کے لیے رُک گیا۔

فون کے ریسور پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تھی جب کہ زبان یوں گنگ ہو گئی جیسے کچھ بولنا ہی نہ جانتی ہو۔

''چپ کیوں ہو گئی ہو یار..... کیا ناراض ہو مجھ سے.....؟''

کیسا بدلا بدلا سا انداز تھا اس کا۔

بے حد خوش گوار..... پُر مسرت.....

تو کیا اسے اپنی زیادتی کا احساس ہو گیا تھا۔

''نہیں.....'' جانے کیسے وہ خود کو بولنے پر آمادہ کر پائی تھی۔

''تو پھر اتنے دنوں سے فون کیوں نہیں کیا..... تمہیں پتہ ہے میں تمہیں کتنا مس کر رہا تھا.....''

وہی بھرپور اپنائیت..... محبت میں ڈوبا لہجہ جس کے لیے وہ ترستی رہی تھی۔

اس کی آنکھیں ایک لمحے میں نم ہوئی تھیں۔ عین اسی پل شجاع اس کے پیچھے چلا آیا۔

''امامہ.....'' وہ چونکی تھی اور گھبرا کر جلدی سے ریسور کریڈل پر ڈالا تھا۔

''جی.....''

''کس کا فون تھا.....''

وہ اب اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ امامہ بھیگی پلکیں بھی صاف نہ کر سکی۔

❊❊❊

بچھڑنے کی اذیت کو......
اگر تم جاننا چاہو
تو کچھ پل کو ذرا یہ سانس اپنی روک کر دیکھو
تمہیں محسوس یہ ہوگا
بچھڑنا موت جیسا ہے......!'

"عباد......"

وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آفس سے آیا تھا اور اب پھر سیڑھیاں کراس کرتے ہوئے باہر جا رہا تھا جب آسیہ بیگم نے اسے پکار لیا۔

"جی مما......" تیزی سے اُٹھتے اس کے قدم ان کی پکار پر مجبوراً رُکے تھے۔

"کہاں جا رہے ہو......؟ کل بھی کہیں غائب ہو گئے تھے...... اچھا پروٹوکول دے رہے ہو گھر آئے مہمانوں کو......"

وہ اس پر خفا ہو رہی تھیں۔ عباد نے سرسری سی اِک نظر ان کے پہلو میں کھڑی ہادیہ پر ڈالی پھر بڑی شرمندگی سے بولا۔

"سوری مما...... مجھے ارجنٹ کل کہیں جانا پڑ گیا تھا......"

"او کے...... ابھی کہاں جا رہے ہو......؟"

"کچھ خاص نہیں...... بس ابھی تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔"

"نہیں...... ابھی ہادیہ کو ساتھ لے کر جاؤ...... پھر اس کے بعد جہاں جانا ہو چلے جانا......"

"لیکن مما...... میں......"

"کچھ لیکن ویکن نہیں...... کچھ اخلاقی تقاضے بھی ہوتے ہیں...... کیا تمہیں سڈنی میں ایسا پروٹوکول ملتا ہے......؟"

اس کی سنجیدگی اور پریشانی سے قطع نظر وہ اسے ڈانٹ رہی تھیں۔

عباد بے بسی سے ہادیہ کو دیکھ کر رہ گیا۔

شام گہری ہو رہی تھی وہ جانتا تھا کہ صاعقہ ساحل سمندر پر اس کا انتظار کر رہی ہوگی، وقت جیسے جیسے سرکتا جا رہا تھا اس کی جان پر بن رہی تھی۔

"او کے چلو......"

تھکی تھکی سی اک نظر کلائی پر بندھی رسٹ واچ پر ڈالتے ہوئے اس نے ہادیہ سے کہا اور تیزی سے گیٹ کے باہر کھڑی اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

اُدھر صاعقہ ساحل سمندر پر تنہا ملول سی بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کل رات اس کی ماں ایک پل بھی سکون سے نہیں سو سکی تھی۔ گھر میں روٹی کے لالے پڑ رہے تھے جس کے سبب چھوٹے دونوں

بھائیوں کو مجبوراً اسے کام پر لگانا پڑا تھا۔ ڈاکٹر عارف جیسے ہم سفر سے بہتر تھا وہ ساری عمر شادی ہی نہ کرتی، مگر۔

اس کا سیل آن تھا مگر...... عباد کی طرف سے کوئی کال نہ آئی!

وہ جس خدشے سے ڈر رہی تھی وہی پورا ہو گیا تھا۔

گہری ہوتی شام کے دھندلکے رات کی سیاہی میں بدلنے لگے تھے جب وہ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یوں جیسے اپنا سب کچھ ہار کر جا رہی ہو......

غریب لڑکیوں کی قسمت میں صرف ''خواب'' ہوتے ہیں، ان کی تعبیر پانا نہیں۔

پچھلے گزرے ہر لمحے میں اس کا دل دھڑکتا رہا تھا، کسی بھی پل عباد کی آمد کا خیال بے کل کیے دے رہا تھا مگر...... اس کا ہر گمان ٹوٹ گیا تھا۔ وہ بھی اپنا ''بھرم'' کھونے کے بعد ٹھکرا دی گئی تھی۔ اس کی خواہش اب ''خوش فہمی'' کا روپ لیے اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

شکستہ قدموں سے واپس پلٹتے ہوئے وہ سیدھی گھر جانے کی بجائے اسپتال چلی آئی تھی جہاں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر عارف جیسے اسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

''پھر...... کیا سوچا آپ نے مس صاعقہ......؟'' جونہی وہ وارڈ میں داخل ہوئی ڈاکٹر عارف کا ٹکراؤ اس سے ہو گیا۔

اس کی نگاہیں اُٹھی تھیں اور پھر بھیگنے سے قبل ہی جھک گئی تھیں۔

''مجھے آپ کی آفر قبول ہے ڈاکٹر عارف...... بس میری امی کا آپریشن کامیاب ہونا چاہیے۔'' کوئی اپنے آپ کو کیسے ہارتا ہے اس لمحے اس نے جانا تھا۔

❁❁❁

تمہیں بھی تو خبر ہو گی!
کہ دریا پاس بہتا ہو تو پانی اچھا لگتا ہے
کنارے سے جُڑی مٹی سے پوچھو روگ چاہت کا
کہ اس پانی کی چاہت میں
کنارے سے اُتر کر، اجنبی دیسوں کو جانا
کتنا مشکل ہے
کنارہ پھر نہیں ملتا......
تمہیں بس اتنا کہنا ہے، یہاں جو بھی بچھڑ جائے
''دوبارہ پھر نہیں ملتا''

جیل کی دنیا ایک گہرے سمندر سی عجیب دنیا کی مثال ہے۔ ہزاروں زندگیوں کی کہانیاں، محض چند روپوں کے عوض ''اندھے قانون'' کی بھینٹ چڑھ کر اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہیں مگر، جیل کی چار دیواری سے باہر نہ کہیں کوئی آندھی آتی ہے، نہ آسمان پھٹتا ہے مگر سکوں میں تلتے ایمان اور لوریاں دے کر سلائے گئے ضمیر کی بربریت صرف کسی ملزم یا مجرم کی پیشانی پر اس کی سزا درج کر کے ایک اسی کا فیصلہ نہیں کرتی بلکہ اس زندگی سے جڑے ان دیگر رشتوں کو بھی کھا جاتی ہے، جو پہلے ہی ''مجبوری''

"بے بسی" کی چکی میں پس رہے ہوتے ہیں۔ "اندھے قانون" کی نگری میں صرف ایک ہی اصول چلتا ہے، طاقت اور پیسے کا اصول۔ قلم کی ایک جنبش سے تخت کو تختہ بنا دینے والے اندھے قانون کے بعض بہرے منصفوں کے پاس صرف اختیار ہوتا ہے۔ سچ اور جھوٹ کی پڑتال کر کے روزِ محشر اس زبردست پکڑ والے ربّ کے حضور اپنے ہر غلط یا صحیح فیصلے کا جواب دینے کا خوف نہیں، رشتہ داری، شناسائی یا تگڑی رشوت کسی دُکھیاری ماں کے دل کا حال، دیکھنے کی فرصت دیتی ہے نہ کسی بہن کی عدالتوں میں خوار ہوتی عزت پر شرمندگی کا احساس۔

اس وقت بھی وہاں تھانے کی حدود کے اندر ڈی ایس پی کے کمرے میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے سانول شاہ، وہ رپورٹ پڑھ رہا تھا، جو میران شاہ پر دائر جھوٹے کیس کے سلسلے میں، حرف بہ حرف اس کے حکم اور خواہش کے مطابق تحریر کی گئی تھی اور جس کے لیے اس نے ڈی ایس پی سے لے کر اے ایس آئی تک سب کے منہ نوٹوں سے بھرے تھے۔ شجاع کے حکم پر کیس کی ری انویسٹی گیشن کا مرحلہ شروع ہونے سے قبل ہی سانول شاہ اب اس کیس کا فیصلہ "سزائے موت" کی صورت چاہتا تھا اور ڈی ایس پی صاحب نے اس سلسلے میں اسے اپنے مکمل تعاون کی یقین دہانی کروائی تھی۔ بے نام، غریب، بے بس سائلوں کو کرختگی سے جھڑک کر ان کی جائز درخواست سننے سے انکاری وہ بڑا افسر اس وقت جس عوامی خدمت میں مصروف تھا اس کی اہمیت صرف وہی جانتا تھا۔ چند سال قبل سانول شاہ کے بڑے بھائی کے حکم پر اس نے اپنی جیل کے چار قیدی غائب کروا دیئے تھے۔ جس کے بدلے میں اسے ایس ایچ او سے ڈی ایس پی کے عہدے پر ڈائریکٹ ترقی "نصیب" ہو گئی تھی۔ اب بھی وہ ایسی ہی کسی کوشش میں تھا۔ سانول پوری عزت و تکریم کے ساتھ اس سے رخصت ہو کر جونہی اس کے شان دار، ڈیکوریٹڈ کمرے سے باہر آیا، اسی تھانے کا ایس ایچ او زبردستی اسے اصرار کر کے اپنے کمرے میں لے آیا۔

"سرکار! کبھی اس غریب کو بھی خدمت کا موقع دے دیا کریں، وہ آپ کا کیس کیا نام تھا اس لڑکے کا ہاں میران شاہ جناب اس کیس کی رپورٹ میں نے ہی لکھی ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کسی بھی کیس کا فیصلہ پہلے "یہاں" ہوتا ہے۔ ایس ایچ او کی میز پر عدالت تو سمجھیں صرف ہمارے لکھے ہوئے فیصلے پر قلم چلاتی ہے، جھوٹی یا سچی تفتیش تو ہماری ہی ہوتی ہے سرکار۔" اپنی بات مکمل کرتے ہی اس نے قہقہہ لگانے کی کوشش کی تھی۔

سانول شاہ نے پُرسوچ تیز نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اگلے لمحے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار کے جتنے نوٹ گرفت میں آ سکے، نکال کر اس کے سامنے میز پر پھینک دیئے۔ "کوئی ردّو بدل نہیں ہونا چاہئے رپورٹ میں، کل کا سورج ہر صورت میران شاہ کی سزائے موت کی خبر لے کر طلوع ہو۔"

"ایسا ہی ہو گا جناب! بالکل ایسا ہی ہو گا۔" ہنس کر نوٹ اُٹھاتے ہوئے اس کی بے جا خوشامد کرتا "اندھے قانون" کا وہ فرض شناس سپاہی اسے خوش کرنے کی بھونڈی کوشش کر رہا تھا۔ سانول شاہ کندھے پر دھری چادر مزید سیٹ کرتے ہوئے ہنکارہ بھر کر تھانے کی حدود سے باہر نکل آیا، اگلے پانچ منٹ بعد وہ سینٹرل جیل میں میران شاہ کی بیرک کے باہر کھڑا تھا۔ میران جو اپنے دوست حفیظ

کے ساتھ لگ کر بیٹھا۔ اس سے سورۃ واقعہ کی تلاوت اور ترجمہ سُن رہا تھا اسے کئی ماہ کے بعد اپنے مقابل دیکھ کر بے ساختہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ہوں! سُنا ہے اُڑتی لگی ہوئی ہے آج کل یہاں جیل میں تمہیں، چچ...... چچ...... چچ ضرور کسی افسر کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہوگی۔ خیر میں یہاں تمہاری بے بسی پر ہنسنے نہیں آیا، بلکہ یہ بتانے آیا ہوں کہ کل تمہارے کیس کی پیشی، تمہاری زندگی کی آخری پیشی بنانے جا رہا ہوں میں، دیکھوں گا کیا بگاڑ لیتی ہے تمہاری انزلہ شاہ میرا، ساری خوش فہمی، ساری اُمیدیں، سارے خواب مٹی نہ کردوں تو سانول شاہ نام نہیں۔'' اس کی آنکھوں اور لہجے میں آگ کی لپٹیں تھیں۔ وہ چپ چاپ ناگواری سے اسے دیکھتا، سر جھکا گیا۔

❋❋❋

''چٹاخ......'' وہ ساکت کھڑا ابھی انوشہ کے سیل چھین لینے کا ردِ عمل سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے طمانچہ بھی دے مارا منہ پر۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں اور غصے کی شدت سے سرخ گالوں کے ساتھ وہ اسے عجیب اُلجھن میں ڈال گئی تھی۔

''کیا بدتمیزی ہے یہ؟'' اسے غصہ آیا تھا، تبھی چلایا تو انوشہ جیسے پھٹ پڑی۔

''تم اسی سلوک کے مستحق ہو شاہ زر آفندی، جانے کتنی زندگیوں کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہو تم؟ جس شخص کا ساتھ پانے کے لیے تمہاری بہن نے اتنی ساری زندگیوں کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا، اسی شخص کو سچ بتا کر پھر سے چھین لینا چاہتے ہو اس سے؟ وہ شخص جو ایک غیرت مند بھائی بھی ہے تم کیا سمجھتے ہو، وہ سچائی جاننے کے بعد تمہیں اور تمہاری بہن کو معاف کردے گا؟ مزید مت چنگاریاں بکھیرو اُن کی زندگی میں۔ کسی کو تو سکون سے جینے دو۔ ماں کو تو پہلے ہی کھو چکے ہو، بیوی جو کبھی تمہاری بہترین دوست تھی اسے بھی سولی پر لٹکا رکھا ہے تم نے۔ لے دے کے اب صرف بہن کا رشتہ باقی رہ گیا ہے، کیا اسے بھی کھو دینے، سولی پر لٹکانے یا نیم پاگل کردینے کی ہمت ہے تم میں؟'' وہ شروع ہوئی تو پھر خوب ہی دل کا غبار نکالا۔

شاہ زر حیرت زدہ، یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ واقعی اس نقطے پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ جو بات سارے فساد کی جڑ تھی۔ وہ اسی بات کو پھر سے ہَوا دینے جا رہا تھا؟ انوشہ اوپر اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی تھی مگر وہ شکستہ سا وہیں صوفے پر ٹک گیا۔ کیا رہا تھا اس کے ہاتھ میں، کچھ بھی تو نہیں۔

زندگی میں بعض اوقات ''نفس'' انسان سے ایسی غلطیاں بھی کرواتا ہے، جن کا کوئی مداوا نہیں ہوتا، جو ساری عمر کا پچھتاوا بن کر روح کے ساتھ چپک جاتی ہیں۔ اس کی بھی ایک ایسی ہی غلطی اس کے گلے پڑ گئی تھی جس سے چھٹکارا حاصل ہوتا کسی طور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ادھر زاور سمیت سب ہی گھر والے اس کی ادھوری بات پر ازحد بے قرار تھے۔ صدف بیگم کا حال بُرا تھا۔ وہ ہر صورت اپنی بیٹی سے ملنا چاہتی تھیں، مگر جو حال ان کا تھا اب وہی حال زاور کے ساتھ ساتھ، نزہت بیگم اور جمال صاحب کا بھی تھا، جو انوشہ سے بات کرنے کے لیے بے چین تھے، مگر کسی طور اس سے رابطہ ممکن نہ ہو رہا تھا۔ ایسے میں زاور نے پاکستان واپسی کی ٹھانی تھی اور شافیہ نے یہاں اسے اپنے تعاون کا پورا

یقین دلایا تھا۔

❁❁❁

''چلو بادشاہ! آج پیشی ہے آپ کی۔'' وہ حفیظ کے ساتھ کھڑا تھا۔ جب ڈیوٹی پر موجود سپاہی لے لوہے کی سلاخوں سے ڈنڈا بجاتے ہوئے اسے مطلع کیا۔ کل رات بیرک کی سلاخوں سے سردی چھن چھن کر آتی رہی تھی، مگر اس کے پاس نہ کوئی گرم کپڑے تھے نہ گرم بستر، پندرہ بیس قیدیوں کے لیے جو حکومتی کمبل بیرک میں موجود تھے، وہ مٹی سے یوں اَٹے تھے کہ ان کو اوڑھ کر سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ جانے دس سال پرانے تھے یا بیس سال، اوپر سے ان کمبلوں کی حالت اتنی خستہ ہو چکی تھی کہ جیل کی سلاخوں سے چھن کر آتی سردی روکنے میں قطعی ناکام تھے، شروع شروع میں اب وہ جیل کے اس ماحول سے قطعی ناآشنا تھا تو اس نے حفیظ سے پوچھا تھا۔

''یار! یہ کھانا جو ہمیں دیتے ہیں یہ تو کوئی اپنے جانوروں کو بھی نہیں ڈالتا ہوگا اور یہ کمبل ان کی جو حالت ہے، کیا یہی کمبل ان وزیروں، مشیروں کو بھی پیش کیے جاتے ہیں جو جیل کی ہوا کھاتے ہیں، جیلوں میں رہتے ہیں، یہاں کی زندگی کو قریب سے دیکھتے ہیں مگر پھر بھی اس کا نظام درست نہیں کرتے۔'' حفیظ اس کی بات پر ہنسا تھا اور دیر تک ہنستا رہا تھا۔

''او میرے بھولے بادشاہ! تو ابھی نیا نیا یہاں آیا ہے ناں اس لیے باہر کے جوشیلے، پڑھے لکھوں جیسی باتیں کر رہا ہے، کچھ عرصے یہاں رہے گا تو یہاں کے سارے قانون قاعدوں کا پتا لگ جائے گا، اُدھر دیکھو وہ لڑکا آصف ہے، سات بہنوں کا اکلوتا بھائی۔ ماں باپ کے بڑھاپے کا واحد سہارا، کل پھانسی کی سزا ہوئی ہے اسے اور جانتا ہے کس جُرم میں؟ شہر کے ایم این اے کے بیٹے اور اس کے دوستوں کے ساتھ جھگڑے کے جُرم میں، لڑائی کے دوران گولی چلی وہ بھی ایم این اے کے بیٹے کے پستول سے مگر اسے نہیں لگی اسی کے کسی دوست کو لگ گئی اور وہ مر گیا، اب مجرم ایک معزز شخص کا بیٹا ہے مگر ان صاحب کی عوامی خدمت دیکھو کہ اس بے قصور پر سارا جھوٹا کیس بنوا کر اسے تختہ دار پر چڑھا دیا ہے، تم نے اس کے ساتھ پولیس والوں کا سلوک نہیں دیکھا، چلو پولیس والوں کو چھوڑو، وکیل صاحب کا حال دیکھ لو، اس کے بوڑھے بزرگ باپ نے اپنی زمین بیچ کر وکیل کی فیس بھری، دن رات اس کے چیمبر کے چکر لگائے، دھکے کھائے، مگر اس کے باوجود اسی وکیل نے اپنی مخالف پارٹی یعنی شہر کے ''معزز شخص'' سے دُگنی فیس وصول کر کے خود اسے گناہ گار ثابت کر دیا اور اسے سزائے موت دلوا دی۔'' حفیظ کی آنکھیں ہلکی سی سرخ ہو رہی تھیں۔ میران گنگ سا اس خوبرو شخص کو دیکھتا رہ گیا جس کی نوخیز جوانی نے ابھی ابھی بہار کا منہ دیکھا تھا۔

''اس دنیا کے سارے اُلٹ پھیر عجب ہیں میرے یار! گورنمنٹ پورا پیسہ دیتی ہے کھانے کا، مگر یہ جو اعلیٰ افسران ہیں ناں، ان کی بھوک ہم سے کہیں بڑھ کر ہے، قیدیوں کے کھانے سے بھی تین چوتھائی رقم یہ اپنے لیے بچا لیتے ہیں اور باقی ایک چوتھائی رقم سے جیسا کھانا پک سکتا ہے وہ پکوا کر ہمیں کھلا دیتے ہیں، جو کمبل وغیرہ آتے ہیں وہ بھی اوپر کے اوپر ہی رہ جاتے ہیں، کیونکہ یہاں سے رہائی پانے کے بعد پھر کسی وزیر مشیر کو دوبارہ یہاں چکر لگانے کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔'' حفیظ کا دل بھی زخمی تھا۔ میران کے اندر کی وحشت مزید بڑھ گئی۔

''وہ اس طرف دیکھو، وہ جو لمبی قطار لگی ہے وہ سب باتھ روم جانے والوں کی ہے، پچھلے پون گھنٹے سے وہ لوگ لائن میں لگے ہیں اپنی باری کے انتظار میں اور ابھی مزید دو گھنٹے اور لائن میں لگے رہ کر انہیں اپنی باری کا انتظار کرنا ہے کیونکہ باتھ روم صرف چار ہیں یہاں، ان لوگوں میں کئی ایسے نوجوان بھی ہیں جو بہت پڑھے لکھے ہیں، قائد کے خوابوں کی تعبیر ہیں مگر اس ماحول نے انہیں ذہنی مریض بنا چھوڑا ہے۔ وہ یہاں سے نکلیں گے تو ملک کے معزز شہری نہیں ہوں گے، جیل کی سلاخوں کے داغ ہوں گے ان کی پیشانیوں پر اور تمہیں پتا ہے ہمارے اس معزز معاشرے کے معزز لوگ جن کی بدولت یہ نوجوان یہاں آتے ہیں۔ یہاں سے رہائی کے بعد انہیں کام نہیں دیں گے، ان کے گھروں کے بجھے چولہے یا تو بجھے ہی رہیں گے یا پھر اس کمائی سے جلیں گے۔ جو انہیں اور کئی گھروں کے چولہے بجھا دینے پر ملے گی۔'' حفیظ کے لہجے ہی نہیں آنکھوں میں بھی دُکھ تھا۔ میران دیوار کے سہارے نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔

''یہاں کوئی کچھ نہیں سوچتا یار! کچھ بھی ہوتا رہے، ایسی بھوک اُتری ہے اس ملک کے لوگوں پر آسمان سے کہ سمندر پی کر پہاڑ نگل کر بھی ان کے پیٹ بھرنے کے نہیں ہیں اور اسی چیز کا، اسی بھوک کا فائدہ وہ لوگ اُٹھا رہے ہیں جو اللہ اور اللہ کے نیک بندوں کے دشمن ہیں۔''

میران کے ذہن میں حفیظ کی چار سال پہلے کی کہی ہوئی وہ ساری باتیں تازہ ہو رہی تھیں۔ اس نے نظر اُٹھا کر اس بڑھی ہوئی توند والے، بدشکل سے سپاہی کو دیکھا پھر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جانے آج عدل کے ایوان میں ''اندھے قانون'' کی ترازو سامنے رکھنے والے قانون کے ایک اور رکھوالے، ایک اور بہرے منصف نے، اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا تھا۔

❀❀❀

عدالت لگی تھی، سانول شاہ اور اس کے دونوں باڈی گارڈ چاق چوبند کمرۂ عدالت میں موجود تھے، جب کہ وہ ایک طرف سر نہوڑائے کھڑا، کٹہرے کو مضبوطی سے تھامے، اپنے اوپر لگے وہ الزامات خاموشی سے سُن رہا تھا جو اس سے پہلے خود اس کے علم میں بھی نہیں تھے۔

پولیس کے مطابق اس نے اپنے گاؤں کے ''معزز چوہدری خاندان'' کی حویلی میں نہ صرف ڈکیتی جیسا سنگین جرم کیا تھا، بلکہ حویلی میں موجود چوہدری سانول شاہ کی بڑی بہن کو بے آبرو کر کے بے دردی سے موت کے گھاٹ بھی اُتار دیا، جس کے لیے گاؤں کے کئی اشخاص چشم دید گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کیے جا چکے تھے۔ ان گواہوں سے اگر سانول شاہ خود اقبال جرم کرنے کا کہہ دیتا تو وہ اس سے بھی ہرگز نہ چوکتے، کسی اور کے لیے جھوٹا قرآن اُٹھانا اور جھوٹی قسم کھا کر گواہی دے دینا، یہ تو خیر ان کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

میران شاہ کا جرم ثابت ہوا نہیں تھا، طاقت اور پیسے کے بل بوتے پر ثابت کر دیا گیا تھا۔ وہ کیس جس کا فیصلہ پہلے ہی پولیس کر چکی تھی۔ سانول شاہ کو دلائے گئے یقین کے عین مطابق ایک فارملیٹی پوری کرتے ہوئے بالآخر گواہوں اور ثبوتوں کے ساتھ پولیس کی اچھی طرح کی گئی تفتیش اور چھان بین کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسے دفعہ 392 اور دفعہ 302 کے تحت انصاف کے تمام تر تقاضے پورے کرتے ہوئے سزائے موت کا مجرم بنا دیا گیا۔ ایک سناٹا تھا جو اس کے وجود سے ہوتا ہوا پاؤں

سے نکل گیا تھا۔ کس قدر سرعت سے سر اُٹھا کر اس نے جج کی کرسی پر بیٹھے منصف کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں اس چہرے پر اس کے لیے سوائے کرختگی اور نفرت کے اور کچھ نہیں تھا۔ سانول شاہ اور اس کے ساتھی اب اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ میران کو لگا شاید وہ اب کبھی زندگی میں دوبارہ سانس نہیں لے سکے گا۔

❋❋❋

اس کی آنکھیں اس وقت ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ صاعقہ کا سیل مسلسل آف تھا اور اس کا سر جیسے درد کی شدت سے پھٹنے کو تیار تھا۔ وہ پریشان تھی، کسی اُلجھن کا شکار تھی، اسے پیسوں کی ضرورت تھی، ایسے میں ڈاکٹر عارف جیسے گھاگ شکاری کے ساتھ اس کی شناسائی، جانے کیا ہونے جا رہا تھا، رہ رہ کر اسے خود پر غصہ آ رہا تھا۔

کیوں وہ وقت پر نہیں پہنچ سکا تھا اس کے پاس؟ کیوں ہادیہ کے بیکار کی شاپنگ میں، بے بس سا اس کے ساتھ پھرتا رہا؟ کیوں نہیں ڈانٹ سکا اسے، کیوں کوئی بہانہ بنا کر جلدی جان نہیں چھڑا سکا اس سے؟ پروٹوکول اور اخلاقیات کے چکر میں پھنس کر، کیوں اپنے دل کے ساتھ دشمنی کر بیٹھا؟ پچھلے اٹھارہ گھنٹوں سے وہ گھر سے باہر تھا اور سوائے چند گھونٹ پانی کے اور کوئی چیز اس کے حلق سے نہیں اتری تھی۔ اس وقت اس کا شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ وہ سب کچھ تہس نہس کر دے، سارا آفس بینک بیلنس، ہر چیز۔ اس کے پاپا اور ہادیہ کی بار بار کال آ رہی تھی مگر وہ اٹینڈ نہیں کر رہا تھا، صاعقہ کی کال آ جانے کی امید نہ ہوتی تو شاید وہ سیل آف کر کے ہی رکھ دیتا۔

پتا نہیں کیا ہو رہا تھا اسے اور کیوں ہو رہا تھا، کیا یہ ”محبت“ تھی؟ کیا ایک معمولی سی غریب لڑکی سے کسی کو ایسی جنوں خیز قسم کی محبت بھی ہو سکتی تھی؟ کیسی محبت تھی یہ جو ہیروئن کے نشے کی طرح اس کا جوڑ جوڑ توڑ رہی تھی۔ اپنے ساتھ ساتھ اس وقت اسے ہادیہ پر بھی غصہ آ رہا تھا، جو خوامخواہ اس کی جان کو عذاب میں ڈالنا چاہ رہی تھی۔

کیسا معاملہ تھا یہ ”دل“ کا، جس نے ازل سے تخت و تاج داؤ پر لگا دیئے تھے۔ وہ اپ سیٹ ہونا نہیں چاہتا تھا مگر اس لمحے اس کی آنکھیں جیسے جلنے لگی تھیں۔ خنک فضا میں دور آسمان پر اُڑتے سارے پرندے اسے اپنی طرح اداس دکھائی دے رہے تھے۔

اس کا سیل ایک مرتبہ پھر بجنا شروع ہو گیا تھا اور ایک بار پھر ہادیہ لائن پر تھی، وہ جانتا تھا کہ وہ لمحے میں آؤٹ آف کنٹرول ہو جائے گا۔ لہٰذا اس نے اس بار اس کی کال کاٹ کر سیل ہی آف کر دیا، گھر والوں کا کیا حال ہو گا؟ وہ اس کے لیے کتنے پریشان ہوں گے؟ وہ سمجھ سکتا تھا مگر فی الحال وہ کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر سیل آف رکھنے کے بعد اس نے پھر اسے آن کر لیا، اور ایک بار پر صاعقہ کا موبائل نمبر پریس کر ڈالا اس بار بیل جا رہی تھی، وہ مچل کر سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”ہیلو......“ تھوڑی دیر بعد صاعقہ کی تھکی تھکی سی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

”ہیلو...... زرنیل......؟“ اِدھر وہ بے قراری کی انتہا پر تھا۔

”ہوں...... بولیں، اب کیوں فون کیا ہے؟“

”کیا مطلب اب؟“ وہ ٹھٹکا تھا۔

''آپ مجھ سے ناراض ہیں؟ آپ کو ناراض ہونا بھی چاہیے مگر میرا خدا جانتا ہے میں فرا[illegible]
ہوں۔''

''مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا، میری شادی ہو رہی ہے، اسی ڈاکٹر عارف کے ساتھ جن [illegible]
پرسوں آپ ساحل سمندر پر ملے تھے، لہٰذا آج کے بعد دوبارہ کبھی میرے نمبر پر رابطہ نہ کر[illegible]
سمجھے......؟'' وہ سخت رنج اور غصے کا شکار تھی۔

عباد کے دل پر گھونسا سا پڑا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ کیا جانتی ہیں آپ ڈاکٹر عارف کے
بارے میں؟ میرے مرنے کے بعد ہی آپ اس جیسے دو نمبر شخص سے کوئی تعلق قائم کر سکتی ہیں' میرے
جیتے جی نہیں۔'' اس بار صاعقہ کو چپ لگ گئی تھی۔

''میں ملنا چاہتا ہوں آپ سے، صرف چند منٹ کے لیے پلیز۔''

''اب یہ ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں ممکن نہیں ہے، اب کیا ہو گیا ہے؟'' وہ غصے سے بولا۔ وہ پھر خاموش ہو گئی۔

''میں ساحل سمندر پر اسی جگہ آپ کا انتظار کر رہا ہوں جہاں ہم پہلی بار ملے تھے، اگر تیس منٹ
کے اندر اندر آپ وہاں نہ آئیں تو یاد رکھیے گا، اسی سمندر کی لہریں پھر زندگی بھر آپ کو میرے نوحے
سنایا کرے گی۔'' اسی تیز لہجے میں کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی تھی۔ صاعقہ عجیب سی مشکل میں
گرفتار لب بھینچ کر رو پڑی۔

❁❁❁

شجاع اب بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جب وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''ک......کزن کا۔''

''تو پھر اتنی جلدی بند کیوں کر دیا، میری بات بھی کروا دیتیں۔''

''م...... میں نے نہیں کیا، اُدھر سے ہی لائن ڈراپ ہو گئی تھی۔'' وہ ٹھیک سے وضاحت بھی نہ
دے پائی۔

''اوکے...... باہر سے یوں ایک دم اُٹھ کیوں آئیں۔''

''بس یونہی......''

''بس یونہی کیا، صاف صاف کہو تم نے میری بات کو مائنڈ کیا۔'' اس بار وہ چپ رہی تو شجاع
مسکرا دیا۔

''ناراض ہوناں؟''

''نہیں...... بھلا میں کسی سے کیسے ناراض ہو سکتی ہوں؟''

''طنز کر رہی ہو؟''

''نہیں......''

''اوکے! آج شام تیار رہنا، آپا کی طرف جانا ہے۔'' جلد ہی بحث سمیٹتا، دوستانہ مسکراہٹ اس
کی طرف اُچھالتے ہوئے وہ بولا تو امامہ نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا ذہن اس وقت
اچھا خاصا اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ اسی روز شام میں ارسلان حیدر کی کال پھر آئی تھی۔ امامہ لاکھ خود کو سمجھانے

اور مضبوط کرنے کے باوجود اس سے بات کیے بغیر نہ رہ سکی۔

”تم مجھ سے بھاگ رہی ہو ناں امامہ؟“ اس کے ہیلو کہتے ہی اس نے شکوہ کیا تھا۔ وہ آنکھوں سے اُمڈتے آنسو پی کر رہ گئی۔

”کاش یہ ممکن ہوتا تو میں ایسا ہی کرتی۔“ کوشش کے باوجود وہ اپنی آواز کی لغزش پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

”اتنی نفرت ہوگئی ہے مجھ سے؟“ اس بار وہ سنجیدہ تھا۔ امامہ چند لمحوں کے لیے کچھ بھی نہ بول سکی۔

”لگا لیا ناں شجاع حسن سے دل، مر مٹی ناں اس کی شاندار شخصیت اور دولت پر؟“

”شٹ اپ!“ زہر میں بجھا کوئی تیر تھا جو اس وقت ارسلان حیدر نے اس کے سینے میں اُتارا تھا۔ اس کا چہرہ ضبط اور غصے کی شدت سے سرخ پڑ گیا جب کہ آنسو اور روانی سے بہنے لگے۔

”او کے...... ایم سوری...... میں نے جو بھی تمہارے ساتھ کیا میں اس کے لیے شرمندہ ہوں مون، پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے، ہو سکے تو پلیز معاف کر دینا، کیونکہ اب میں بالکل اکیلا ہوں، بالکل اکیلا......“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ امامہ کے آنسو جیسے اس کی پلکوں پر ہی اٹک گئے۔

❁❁❁

وہ جلتی آنکھوں سے ساحل سمندر پر رقص کرتی، شوریدہ سر موجوں کا خاموشی سے نظارہ کرتا، اپنے اندر کے اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا جب وہ ڈیڑھ گھنٹے کے جاں گسل انتظار کے بعد مرے مرے سے قدم اُٹھاتی، وہاں چلی آئی۔ ڈھلتی شام کے ساتھ، ساحلِ سمندر کے کنارے اُداس بیٹھا، وہ کسی مصور کی شاہکار تصویر کا کوئی کردار دکھائی دے رہا تھا۔ صاعقہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھنے کے بعد اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم......!“ وہ جو ساحل کی موجوں کے رقص میں گم تھا اس کی آواز پر بُری طرح چونکتے ہوئے پلٹا۔

”وعلیکم السلام......! کیسی ہیں آپ......؟“ ستارہ سی روشن آنکھوں میں یکدم جیسے دیپ جل اُٹھے تھے۔ صاعقہ سر اُٹھا کر اسے دیکھ بھی نہ سکی۔ ”کب سے انتظار کر رہا ہوں آپ کا، بہت مزہ آتا ہے ناں مجھے تنگ کر کے۔“ آج اس کی آنکھوں کے رنگ نرالے تھے، وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔

”کیوں بلایا ہے مجھے، یہ جاننے کے باوجود بھی کہ میں اس وقت زندگی کی کڑی مشکلات کا سامنا کر رہی ہوں۔ وہ حیثیت، وہ مقام، جس کی وجہ سے آپ مجھ سے متاثر ہوئے، اب وہ میرے پاس نہیں رہا ہے۔“ وہ ذرا سی تلخ ہوئی تھی۔ عباد زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔

”آپ سے کس نے کہا کہ میں آپ کی دولت کی وجہ سے آپ سے متاثر ہوا ہوں؟“ صاعقہ ٹھٹک گئی، تبھی وہ پھر بولا۔

”بہت بُری بات ہے اتنی جلدی کسی سے اتنا بدگمان ہو جانا، بہر حال فنا ہو جانے والی چیزوں پر مر مٹنے والا نہیں ہوں میں، یہ بات یاد رکھیے گا اور اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مجھے آپ کی مدد، کس رشتے سے کرنی ہے۔“ وہ بول رہا تھا اور اس بار چونک کر سر اُٹھانے کی باری صاعقہ کی تھی۔ عباد نے

اپنے ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور تھوڑی دیر بعد ایک نفیس سی رِنگ برآمد کرلی۔
"سونے کی سستی سی بے حیثیت رِنگ ہے اور ہرگز اس قابل نہیں کہ آپ جیسی امیر کبیر خوب صورت لڑکی کے ساتھ اس معمولی سی رِنگ سے کوئی تعلق جوڑا جائے لیکن غریب ہوں ناں اس لیے اپنے احساسات کے اظہار کے لیے کوئی نایاب چیز فی الحال افورڈ نہیں کرسکتا، ہاں یہ جو دل ہے ناں میرا، یہ بہت نایاب ہے اور اس کی کوئی قیمت لگا بھی نہیں سکتا۔ تو آج اس معمولی سی رِنگ کے ساتھ، میں یہ انمول نایاب دل بھی آپ کے سپرد کررہا ہوں صاعقہ جی، قبول کریں گی؟" کتنا احترام تھا اس کی آنکھوں میں، کتنی پاکیزگی تھی۔ وہ گنگ سی، کسی پتھر کی طرح ساکت، بنا پلک جھپکائے اسے دیکھتی رہی۔
عباد نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر خاموشی سے اسے دیکھتے ہوئے آہستہ سے اس کا بایاں ہاتھ تھاما اور رِنگ بڑے پیار کے ساتھ اس کی دوسری اُنگلی میں ڈال دیا۔
"یہ لیں...... ہوگئی ہماری انگیجمنٹ...... خوش؟" وہ اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ صاعقہ کے دل و دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔
"صاعقہ جی! چپ کیوں ہیں پلیز کچھ تو بولیں ناں، میں جانتا ہوں کہ آپ میری جرأت پر حیران ہورہی ہیں۔ کہاں میں ایک غریب سا آوارہ لڑکا اور کہاں آپ، اتنی بڑی معروف بزنس مین، عباد انڈسٹری کے مالک کی فیانسی' اسے دل سے چاہنے والی، لیکن میں کیا کروں میں آپ سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ نہ ہی آپ کو کسی اور کا ہوتے دیکھ سکتا ہوں، وہ شخص تو ویسے بھی بہت معروف بندہ ہے، میرے جیسی چاہ اور قدر کہاں دے سکے گا، لیکن میں، میں آپ کو اس جیسی دولت حیثیت اور مرتبہ حاصل کرکے دکھاؤں گا۔ بس تھوڑا سا وقت دے دیجئے مجھے پلیز!" اب وہ براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ صاعقہ کی آنکھوں کی سطح نم ہوگئی، وہ بولی تو اس کا لہجہ بے حد رُندھا ہوا تھا۔
"میری شادی عباد انڈسٹری کے مالک سے نہیں کسی اور سے ہورہی ہے مسٹر زین۔ عباد انڈسٹری کے مالک سے اب کوئی واسطہ نہیں رہا میرا۔" آخری بار اس سے بچھڑنے سے پہلے وہ اسے اپنی ذات کے بارے میں تھوڑا بہت سچ بتا دینا چاہتی تھی، مگر وہ جیسے کچھ سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔
"اچھی بات ہے، میرے سوا اور کسی سے آپ کا کوئی واسطہ ہونا بھی نہیں چاہئے اور کان کھول کر سُن لیں، آپ کی شادی ہوگی تو صرف مجھ سے، وگرنہ میں کسی سے بھی نہیں ہونے دوں گا۔" وہ آج اسے حیران کرنے کے درپے تھا۔ صاعقہ کا آنسو اس کی پلکوں پر ہی اٹک گیا۔
"کیا جانتے ہیں آپ میرے بارے میں؟ کچھ بھی تو نہیں؟" ایک پھیکی سی مسکان لبوں پر پھیلاتے ہوئے اس نے رُخ پھیرا تھا۔ جب عباد نے اس کا چہرہ پھر سے اپنی طرف موڑ کر، اس کی پلکوں پر اٹکا آنسو اپنی اُنگلی کی پور سے صاف کیا۔
"مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں جاننا کہ آپ بہت اچھی لڑکی ہیں اور سب سے بڑھ کر مالکِ دو جہاں نے آپ کا چہرہ میری نگاہ میں بسا دیا ہے۔ میں خود بھی یہ مسٹری سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر آپ کے پاس وہ کیا ایسا جادو ہے، جس نے مجھے جکڑ کر بے بس سا کردیا ہے، نہ میں آپ کو جاننا

ہوں، نہ آپ کی فیملی کا پتا ہے مجھے، نہ میں نے آپ کا گھر بار دیکھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اگر اچانک آپ مجھ سے روٹھ کر بچھڑ جائیں خدانخواستہ تو میں آپ کو تلاش کہاں کروں، کچھ بھی تو نہیں جانتا میں۔ پھر بھی میرے دل میں آپ کے لیے بے پناہ عزت ہے، محبت ہے، احترام ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ اضطراب، وہ اذیت ہے جو پچھلے اٹھارہ گھنٹوں میں میں نے جھیلی ہے، خدا کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں زرنیل جی، یہ محبت میرا دردِ سر نہیں تھا مگر آپ جیسی ساحرہ نے اسے جنون بنا دیا ہے میرا۔'' وہ روانی میں جو بھی کہہ رہا تھا اس کی آنکھیں اس کے سچ کی گواہی دے رہی تھیں۔ وہ یک ٹک خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

''کچھ بولیں گی نہیں اور نہیں تو یہی پوچھ لیں کہ میں پرسوں وعدے کے باوجود ٹائم پر یہاں آ کیوں نہیں سکا۔'' بہت آہستہ سے اس کا آنچل تھامتے ہوئے وہ اب شکایت کر رہا تھا۔ صاعقہ کے لبوں کا قفل اب بھی نہیں ٹوٹا۔

''آپ مشکل میں ہیں تو میں، کیا مجھے چین نصیب ہو سکتا ہے؟ میں اصل میں پیسوں کا بندوبست کر رہا تھا تاکہ آپ کی مشکل حل ہو جائے اور آپ اس مکروہ انسان سے محفوظ رہیں، جو کسی بھی طور سے آپ کے لائق نہیں مگر، آپ میرا انتظار بھی نہیں کر سکیں؟''

''میں نے انتظار کیا تھا......'' عباد کے الزام پر اچانک اس کے بندلبوں کا قفل ٹوٹا تھا جس پر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

''مہربانی، یہ لیں پانچ لاکھ روپے کا چیک اور چلیں پہلی فرصت میں آپ کی والدہ محترمہ کی عیادت کرتے ہیں۔'' صاعقہ کے آنچل کا کونا اب بھی اس کے شفاف ہاتھوں میں اُنگلیوں میں دبا تھا۔ وہ ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالتی پھر سر جھکا گئی۔

''ابھی اپنے پاس رکھیں، مجھے پہلے ڈاکٹر عارف سے بات کرنی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، مگر یاد رکھیے گا، اب آپ صرف اور صرف میری امانت ہیں۔ جب جس وقت جس کام کے لیے چاہیں کال کر کے بلا سکتی ہیں، فوراً حاضر ہوں گا۔ کم از کم اب کسی بھی بات کے لیے آپ مجھے رشتے کا طعنہ نہیں دے سکتیں۔'' وہ اسے تنگ کر رہا تھا، صاعقہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''پیسوں کا انتظام کہاں سے کیا ہے؟''

''جہاں سے بھی کروں یہ میرا دردِ سر ہے، آپ نے تو حال تک نہیں پوچھا، آپ کی بلا سے جیوں یا مروں، آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔ پیار تو مجھے ہوا ہے ناں آپ سے، آپ کو تھوڑی کوئی پروا ہے میری۔ اُدھر عباد کے گھران کی سسٹر کی شادی ہے۔ اتنے کام ہیں وہاں کہ مگر صرف آپ کی اس شادی والی بات کی اتنی ٹینشن لی میں نے کچھ پچھلے اٹھارہ گھنٹوں سے وہاں گیا ہی نہیں، اب سوچیں ذرا کتنی ڈانٹ پڑے گی مجھے؟'' بے تکان پٹر پٹر بولتا وہ بالآخر اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھینچ ہی لایا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں اب کسی اداسی کسی اضطراب کا دُور دُور تک نام و نشان نہیں تھا۔ عباد کو لگا جیسے وہ یکدم سے ہلکا پھلکا ہو گیا ہو۔

''اب چلیں......'' صاعقہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ اثبات میں سر ہلاتی اسے ٹھینگا دکھا گئی۔ عباد اس کی اس حرکت پر بے ساختہ مسکراتے ہوئے اس کے

قدموں سے قدم ملا کر چلتا بہت سرشار سا واپس پلٹ گیا۔

❀❀❀

رات کی گہری تاریکی میں گاؤں کی کچی پگڈنڈی تیزی سے عبور کرتے ہوئے جس وقت اس نے اپنے ہی گھر کی دیوار پھلانگی، اس کی چھوٹی بہن سہم کر اپنے بستر پر اُٹھ بیٹھی۔

''کون......؟'' سب سے پہلا خوف جو اسے لاحق ہوا وہ عزت پر حملے کا تھا۔ میران سنبھل کر کھڑے ہوتے ہوئے اس کی چارپائی کے قریب چلا آیا۔

''شش......'' ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اس نے اپنی خوف زدہ بہن کو خاموش رہنے کی ہدایت کی تھی، جس کی آنکھیں خوف اور حیرانی سے باہر اُبلنے کو ہو رہی تھی۔

''میران بھیا آپ؟''

''ہوں...... ماں کو مت جگانا، باہر گاڑی کھڑی ہے جتنی جلدی ہو سکے سارا ضروری سامان سمیٹ کر میرے ساتھ چلو، میں لینے آیا ہوں تمہیں۔''

''مم......مگر آپ تو......''

''ہاں میں مر گیا تھا، مگر حقیقت میں نہیں، ساری کہانی سناؤں گا تمہیں، ابھی وقت نہیں ہے، میں ماں کو لے کر نکلتا ہوں، تم جلدی سے ضروری سامان سمیٹ کر پیچھے آجاؤ'' وہ سرگوشی میں بول رہا تھا۔ چھوٹی کے دل کی دھڑکن قابو سے باہر ہو رہی تھی۔ کیسا خستہ حال ہو گیا تھا اس کے گھر کا؟ اور اس کی ماں.....وقت نے کتنی بے دردی سے اس باوقار، صابر شاکر عورت کو، حالات کے دوزخ میں دھکیلا تھا۔ یوں جیسے ایک ہی طوفان سے کوئی شاندار، سر بفلک عمارت، ویران کھنڈر میں تبدیل ہو جائے۔ پہلی بار اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور وہ اپنی بے بسی پر رو پڑا تھا۔ اس کی بہن، بدحواسی سے، اس کے حکم پر جلدی جلدی ضروری سامان سمیٹ رہی تھی جب کہ وہ حسرت زدہ نگاہوں سے اپنے گھر کے ایک ایک کونے کو دیکھتے ہوئے بکھر رہا تھا۔ وہ رات گاؤں ''شاہ والا'' میں اس کی آخری رات تھی۔

سانول شاہ کی ضد کے سامنے ہتھیار پھینکتے ہوئے بالآخر وہ انزلہ شاہ سے دستبردار ہو گیا تھا کہ سزائے موت اس کی نگاہ میں بڑی سزا نہیں تھی مگر، اکلوتی جوان بہن کی آبروریزی اور کوٹھے پر پہنچائے جانے کی دھمکی میں اتنا دم ضرور تھا کہ اسے بالآخر شکست تسلیم کرنی پڑی تھی اور یوں سانول شاہ نے اس سے صلح کا اعلان کر کے اپنا کیس ختم کروا دیا۔ اندھیری رات میں کتوں کے بھونکنے کی آواز اب آہستہ آہستہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی، نہ چاند نکلا، نہ کسی ستارے نے ہی اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی اور وہ میران شاہ ایک ایک منظر، ایک ایک عکس کو پیچھے چھوڑتا اس رات، شاہ والا ہی نہیں انزلہ شاہ کی زندگی سے بھی بہت دور نکل آیا تھا۔

❀❀❀

''بالکل اکیلا؟ میں سمجھی نہیں؟'' اسے واقعی حیرانی ہوئی تھی۔ جب ارسلان گہری سانس بھرتے ہوئے بولا۔

''تم سمجھ بھی کہاں سکتی ہو مجھے، بہرحال امی کی ڈیتھ ہو گئی ہے پچھلے ہفتے۔ اس سے پہلے رُباب اور میری ڈائیوورس بھی ہو گئی۔'' دو اہم خبریں وہ کتنے نارمل انداز میں روانی سے اسے سُنا گیا تھا۔

امامہ جیسے برف میں لگ گئی۔اس کے آنسوؤں کی شدت میں یکدم اضافہ ہوا تھا۔

''پچھلے ہفتے اور تم......تم مجھے اب اطلاع دے رہے ہو؟''

''بڑی تھا یار، بہت اپ سیٹ بھی۔ پرائے دیس میں سو مسائل ہوتے ہیں، اب یہ پاکستان تو ہے جہاں کسی بھی حال میں اللہ پر توکل کر کے جیتے رہو۔'' وہ رنجیدہ تھی تو یہ بے زار، امامہ کو اس کے بالکل اچھے نہیں لگے۔ وہ چند لمحے خاموش رہی تو وہ خود ہی بولا۔

''میں تمہیں مِس کر رہا ہوں مون! امی کے بعد اگر کسی ہستی سے مجھے سچا پیار ملا ہے تو وہ تم ہو، پاکستان واپس آنا چاہتا ہوں، مگر یہاں میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے، کھانے کا، رہائش کا، ہر طرح کا مسئلہ درپیش ہے، کچھ مدد کر سکو گی میری۔'' اپنے مطلب کی بات کی طرف آنے میں اس نے زیادہ وقت نہیں لیا تھا۔

امامہ کی حیرانی اور پریشانی میں مزید اضافہ ہوا۔

''مدد......کیسی مدد......؟'' وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

''مجھے کچھ روپے چاہئیں مون، فوری اور تمہارے سوا دنیا میں کوئی نہیں جو اس وقت میری مدد کر سکے، اسی لیے تم سے اپنی پریشانی شیئر کر رہا ہوں۔''

''مم......مگر میں......میں کیسے؟''

''تم کر سکتی ہو مون، جو شخص تمہارا شوہر ہے بڑا فیاض اور امیر ہے، جتنے چاہو اتنے پیسے مانگ سکتی ہو اس سے، تمہیں انکار نہیں کرے گا وہ، پلیز مون......میں بہت مشکل میں ہوں۔''

''میں نہیں کر سکتی ارسلان، تم رُحاب سے مدد کیوں نہیں لیتے؟''

''تھو کتا ہوں میں اس کے پیسے پر اور تم، تم وہی ہو ناں جو میری مدد کے لیے اس ایس پی کے گھر میں جا گھسیں پھر اب کیا ہو گیا ہے؟ کیا تھوڑے سے دنوں کی جدائی نے ارسلان حیدر کے دام گرا دیئے ہیں؟ بولو......؟'' وہ مشتعل ہو رہا تھا۔ امامہ کچھ دیر خاموشی سے اسے سنتی رہی، پھر آنسو پیتے ہوئے آہستہ سے لائن ڈراپ کر دی، وہ شخص جو آج بھی اس کے لیے زندہ رہنے کا واحد سبب تھا۔ ایک بار پھر اسے کانٹوں پر گھسیٹتے ہوئے، اس کی محبت اور ضبط کا امتحان لینے پر تُلا ہوا تھا۔

❊❊❊

آ کسی روز کسی دُکھ پہ اکٹھے روئیں
جس طرح مرگِ جواں پر کہیں دیہاتوں میں
بوڑھیاں روتے ہوئے بین کیا کرتی ہیں
جس طرح ایک سیاہ پوش پرندے کے کہیں گرنے سے
ڈار کے ڈار زمینوں پر اُتر آتے ہیں......
چیختے، شور مچاتے ہوئے......کراہتے ہوئے
اپنے محروم رویوں کی المناکی پر......
اپنی تنہائی کے ویرانوں میں چھپ کر رونا
اجنبیت کے گھٹا ٹوپ بیابانوں میں

شہر سے دور سیاہ غاروں میں چھپ کر رونا
اک نئے دکھ میں اضافے کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنی ہی ذات کے جنگل میں الجھ کر رونا
ان گمراہ مقاصد سے وفا ٹھیک نہیں
ہم پرندے ہیں نہ مقتول ہوائیں پھر بھی
آ کسی روز کسی دُکھ پہ اکٹھے روئیں......

وہ گم صم سی بیٹھی تھی! بیڈ پر تکیے کے قریب پڑا اس کا موبائل پھر بجنا شروع ہو گیا تھا۔ انوشہ نے زچ ہوتے ہوئے کال پک کی۔ دوسری طرف صدف بیگم تھیں۔

"ہیلو......" انوشہ ان کی آواز نہیں پہچانتی تھی تبھی اُلجھ کر رہ گئی۔

"کون......؟"

"ماں بول رہی ہوں تیری، کیسی ہے تُو؟" ان کا لہجہ نم تھا۔ انوشہ کو لگا جیسے وہ پتھر ہو گئی ہو۔

"ماں......؟"

"ہاں میری جان، تیری بدنصیب ماں......" وہ اب رو پڑی تھیں۔ انوشہ نے خود کو سنبھال لیا۔

"کیوں فون کیا ہے......؟"

"تیری یاد آ رہی تھی، دل تڑپ رہا ہے تجھے دیکھنے کے لیے، زاور کو بھیج رہی ہوں چند روز میں، اس کے ساتھ یہاں آ جا انوشہ! خدا کا واسطہ ہے تجھے۔" وہ تڑپ رہی تھیں، انوشہ نے اپنے آنسو پی لیے۔

"میرے لیے ممکن نہیں ہے آپ کے حکم کی تعمیل کرنا، جب مجھے آپ کی ضرورت تھی، اپنی ماں کی ضرورت تھی اس وقت، میں یہاں اکیلی تھی، یہاں حالات کے تپتے سورج کے تلے آبلہ پا، اکیلی اس وقت آپ کے پاس میرے لیے فرصت نہیں تھی، آج اس وقت مجھے آپ کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کا لہجہ سرد تھا۔ صدف بیگم کا دل مچل کر رہ گیا۔

"ایسا مت کہہ انوشہ! تیری ماں بہت مجبور ہے یہاں۔"

"تو رہیں خوش اپنی مجبوریوں کے ساتھ، میں نے کبھی آپ سے آپ کا وقت، آپ کی ممتا نہیں مانگی، بہت سے بچوں کی مائیں ان کے جنم کے ساتھ ہی مر جاتی ہیں، مجھے ہمیشہ یہی لگا ہے میری ماں بھی میری پیدائش پر ہی مر گئی تھی۔" وہ تلخ ہوئی تھی اور اسی تلخی کے بناء صدف بیگم کے احساسات و جذبات کی پروا کیے بغیر اس نے کال کاٹ کر موبائل دور پھینک دیا۔ بہت عرصے کے بعد وہ زندگی کی طرف واپس پلٹ رہی تھی۔ عبدالصمد کی کوششوں سے اسے ایک بہترین کمپنی میں جاب مل رہی تھی اور انوشہ کے لیے اپنی فرسٹریشن سے چھٹکارہ پانے کا اس سے بہتر کوئی دوسرا حل نہیں تھا۔ اسے تیار ہو کر عبدالصمد کے ساتھ ہی باہر جانا تھا مگر وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

انوشہ اچھی طرح تیار ہو کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ نیچے لان میں شاہ زر اُس کے بیٹے کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

وہ کافی دیر وہیں کھڑی انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مگن کھیلتے ہوئے دیکھتی رہی، پھر کھڑکی سے

آئی۔ عبدالصمد اسے کال کر کے گیٹ پر بُلا رہا تھا، وہ تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر شاہ زر اور اس کے ساتھ کھیلتے اپنے بیٹے کو یکسر نظر انداز کرتی، تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ شاہ زر جو اپنے بیٹے کی کسی بات پر ہنس رہا تھا، اسے دیکھ کر یک دم اپنی ہنسی کو بریک لگا گیا۔

انوشہ رحمٰن ایک عرصے کے بعد اسے اپنے پرانے رنگ و روپ میں نظر آئی تھی اور اس وقت اسے اتنا مطمئن دیکھ کر وہ واقعی حیران رہ گیا تھا۔

❁❁❁

''چوہدری صاحب..... آپ کو بڑے صاحب اپنے کمرے میں بُلا رہے ہیں۔'' وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھا کوئی فلم دیکھ رہا تھا جب حویلی کے ملازم نے ادب سے ہاتھ باندھے اسے اطلاع دی۔

سانول نے ایک لمحے کے لیے ٹی وی اسکرین سے نظریں ہٹا کر ملازم کو دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا کر اسے جانے کا اشارہ کر دیا۔

اگلے بیس منٹ میں وہ مردان خانے کے اس آخری حصے میں بیٹھا تھا جہاں بیٹھ کر عموماً پنچائیت کے فیصلے کیے جاتے تھے۔

''جی بڑے بھا، آپ نے یاد کیا؟''

''آہو..... آؤ بیٹھو.....'' بڑے بھا کا موڈ اس کی توقع سے زیادہ خراب تھا۔ وہ چپ چاپ ان کے مقابل بیٹھ گیا۔

''جی حکم.....''

''کوئی حکم نہیں، حکم کے قابل کب چھوڑا ہے تُو نے ہمیں۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''اتنا بھولا نہیں ہے تُو.....'' بڑا چوہدری اس کی ادائے معصومیت پر گرجا۔ ''خوب جانتا ہے کس بات کی طرف اشارہ ہے میرا، سالوں جس کیس پر پانی کی طرح پیسہ بہایا اسے پھر خود ہی ایک منٹ میں ختم بھی کر دیا۔ بڑے بھائی سے مشورہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تُو نے.....؟'' مارے اشتعال کے بڑے چوہدری کے منہ سے کف بہنے لگا تھا۔ سانول کے چہرے پر تناؤ آ گیا۔

''یہ کیس میرا ذاتی مسئلہ تھا بڑے بھا، اس سے آپ کا کوئی لینا دینا نہیں۔''

''ارے بھاڑ میں گئے تیرے سارے ذاتی مسئلے، حویلی کی عزت اور ناک کا مسئلہ تھا یہ، گاؤں میں اگر کسی کو کانوں کان خبر ہو گئی تو کیا حیثیت رہ جائے گی ہماری، چھوٹا سہی مگر یہ کیس بہت اہمیت رکھتا تھا ہمارے لیے۔''

''رکھتا ہو گا مگر میں نے جو صحیح سمجھا وہی کیا، فضول میں کسی کو پھندا لگوا کر ساری عمر کے لیے اس کی ماں، بہن کی بد دعائیں نہیں لے سکتا تھا میں۔''

''ہاہا..... ہاہاہا..... کہہ تو یوں رہا ہے جیسے پہلے کبھی ایسا کوئی کام کیا ہی نہیں، اس سے پہلے جو بیسیوں بندے پھڑکائے ہیں وہ جائز مارے تھے؟ چھتر مارنے والی بات پر بھی گولی مارتا ہے تُو، پھر اب گناہ ثواب کا خیال کیسے آ گیا تجھے؟'' بڑے چوہدری کو اس کی بات چبھی تھی، تبھی وہ ہنسا تھا۔

سانول کے چہرے پر ناگواری جھلک آئی۔

''جو ہو گیا سو ہو گیا، اب آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟''

''کیا چاہا ہے تجھ سے، پہلے کتنے چاہ پورے کیے ہیں تُو نے؟'' ان کا غصہ کسی طور اُترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

سانول اس بار خاموش بیٹھا رہا۔

''سسر آیا تھا تیرا کل شام' شادی کی تاریخ مانگ رہا ہے، کیا جواب دوں اسے؟'' اگلے ہی پل وہ نرم پڑے تھے۔

سانول نے بے چین ہو کر رُخ پھیر لیا۔

''مجھے کیا پتا کیا جواب دینا ہے؟ جو بہتر سمجھیں دے دیں، مجھے تو صرف اور صرف پہلے اپنی محبت سے شادی کرنی ہے، پھر کسی اور کے لیے سوچوں گا۔''

''تو کر لے اپنی محبت سے شادی، روک کون رہا ہے تجھے؟''

''کوئی نہیں، لیکن ابھی وہ مان نہیں رہی ہے، پہلے اسے رضامند کروں گا پھر شادی کروں گا۔''

''واہ...... کیا خوب شان بڑھا رہا ہے حویلی کی؟ گاؤں کا چوہدری ہو کر ایک معمولی سی لڑکی کو شادی کے لیے منا رہا ہے، منت کر رہا ہے اس کی؟ تف ہے تیری مردانگی پر۔'' بڑے چوہدری کی بات نے اسے جیسے آگ لگا دی تھی۔

''محبت کرتا ہوں اس سے میں، خریدا نہیں ہے اسے جو من مرضی کا سلوک کرتا پھروں، ویسے بھی محبت کے معاملے میں مردانگیاں نہیں چلتیں۔''

''نہیں چلتی مردانگی تو چوڑیاں پہن کر حویلی میں بیٹھ جا، ہونہہ محبت نہ ہو گئی، کوئی فریضہ ہو گیا۔'' اس کا بھائی اپنی شال کو جھٹکا دیتا غصے سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

سانول شاہ اس پر نگاہ ڈالے بغیر زمین کو گھورتا رہا۔

''کان کھول کر سُن لے سانول! ایک ہفتے کے اندر اندر اگر تُو نے شادی کے لیے رضامندی نہ دی، تو میں تیری رضا کے بغیر یہ شادی زبردستی کروانے پر مجبور ہو جاؤں گا، تیری فضول حرکتوں کی وجہ سے اپنے خاندان اور باپ کی مزید رسوائی نہیں کروا سکتا میں۔'' وسیع کمرے میں صرف ان کی آواز گونج رہی تھی۔

کسی شیر کی طرح دہاڑتی ہوئی' غراتی ہوئی آواز۔

سانول ان سے بنا کوئی بات کیے چپ چاپ اُٹھ کر وہاں سے چلا آیا۔

اس کا دل اس وقت عجیب سی بے کلی اور اضطراب کا شکار تھا۔

❋❋❋

جیپ اسٹارٹ ہو چکی تھی، گاؤں مراد شاہ سے شاہ والا کے درمیان سفر کے دوران بہزاد علی مراد تقریباً خاموش رہا تھا۔ انزلہ اس سے اس کی تعلیم، مشاغل اور دیگر مصروفیات کی بابت چھوٹے موٹے سوالات کرتی رہی تھی، جن کے وہ احتیاط سے جواب دیتا رہا۔

''مراد بتا رہا تھا آپ کو بھی شکار کا بہت شوق ہے۔''

''ہوں......''

مکمل توجہ گاؤں کے کچے راستے پر مرکوز رکھتے ہوئے اس نے محض ہنکارہ بھرا تھا۔
''کن کن جانوروں کا شکار شوق سے کرتے ہیں؟''
''جو بھی میسر آ جائے، ہرن، خرگوش، چیتا، جنگلی بٹیر، تیتر، یا دیگر پرند۔''
''کبھی کوئی نقصان بھی اُٹھانا پڑا شکار کے شوق کے دوران؟''
''ہوں...... دو دفعہ چیتے کی زد میں آ گیا تھا۔ ایک دفعہ سینہ اچھا خاصا زخمی ہوا اور دوسری بار دائیں ٹانگ پر شدید چوٹ آئی، ایک بار تن تنہا شکار کرتے ہوئے راستہ بھول کر جنگل میں کھو گیا، تین دن جنگل میں بھٹکنے کے بعد چوتھے دن میرے دوستوں نے پہنچ کر مجھے وہاں سے باہر نکلنے میں مدد دی۔''
ست روی سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ جیسے گزرے دنوں میں کھو گیا تھا۔
انزلہ دل چسپی سے اس کی باتیں سنتی مسکرا دی۔
''میرے پاپا کو بھی شکار کا بہت شوق تھا، ان کی بندوق اب بھی ہے، کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے جنگلوں کی سیر کو، مگر صرف جنگلوں کی سیر کو، میں پاپا اور آپ کی طرح کسی جانور یا پرندے کا بے دردی سے شکار نہیں کر سکتی۔'' اس بار زیرِ لب مسکرانے کی باری بہزاد کی تھی۔
''اس جمعہ کو میں اور مراد اکٹھے شکار پر جا رہے ہیں، آپ کا دل چاہے تو آپ بھی ہمارے ساتھ چل سکتی ہیں۔''
''بالکل ضرور، یہ تو میرے دل کی آواز ہے، بہت شکریہ آپ کی دعوت کا۔'' وہ خوش ہوئی تھی۔
بہزاد بنا اس کی طرف دیکھے لاتعلق سا بیٹھا رہا۔
گاؤں شاہ والا کی حدود شروع ہو گئی تھیں، باقی گھر تک کا سفر پھر خاموشی کی نذر ہو گیا۔
شہر سے گاؤں آنے کے بعد وہ پہلا دن تھا جب وہ بے حد مسرور تھی۔
بہزاد نے اس کے گھر کے قریب جیپ کو بریک لگا دی۔
''یہاں سے چلی جائیں گی یا میں ساتھ آؤں؟' جیپ کے اندر ہی بیٹھا، ہاتھ اسٹیئرنگ پر دھرے وہ پوچھ رہا تھا۔ انزلہ مسکرا دی۔
''آپ شرمندہ کر رہے ہیں، میں چلی جاؤں گی۔''
''چائے پانی کا نہیں پوچھیں گی؟'' اب اس کی سیاہ آنکھوں میں شرارت اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ انزلہ کے لب بھی مزید پھیل گئے۔
''نہیں۔'' سہولت سے کہتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا تھا، جواب میں بہزاد نے مسکراتے ہوئے جیپ اسٹارٹ کر لی۔
''اوکے پھر، فی امان اللہ۔'' وہ واپس پلٹا تھا۔ انزلہ وہیں کھڑی اسے حفاظت سے گاؤں کا آخری موڑ مڑتے دیکھتی رہی۔
چاند کی روشنی میں اِرد گرد کا ہر منظر اس پر خوب روشن تھا۔
وہ سرشاری سی واپس پلٹی اور ٹھٹک گئی۔
وہاں اس سے کچھ ہی فاصلے پر، اپنے رف سراپا کے ساتھ کھڑا سانول شاہ، حقیقی معنوں میں اس

کا دل دھڑکا گیا تھا۔

❀❀❀

خزاں کے زرد پتوں کو وہ منظر یاد کرتا ہے
اسے کہنا، بہت اس کو دسمبر یاد کرتا ہے
اسے کہنا کہ یخ بستہ ہوائیں زخم دیتی ہیں
اسے کہنا اسے اِک شخص اکثر یاد کرتا ہے
اسے کہنا کہ اس کے بِن اداسی میں ہیں سب رَستے
اسے کہنا اسے بچھڑا سمندر یاد کرتا ہے
اسے کہنا کہ اس کو بھول جانا بس سے باہر ہے
اسے کہنا اسے کوئی برابر یاد کرتا ہے

بُریرہ کی طرف سے سائلہ بیگم کا خط شاہ زر کو موصول ہوا تھا۔ جس میں سب سے اہم اور تکلیف دہ بات، بُریرہ کا شاہ زر سے طلاق کا مطالبہ تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ جیسے ساکت رہ گیا تھا......

وہ لڑکی جو اس سے بے پناہ محبت کی دعوے دار تھی، کیا وہ یوں آسانی سے اپنا راستہ اس سے علیحدہ کرنے کا سوچ سکتی تھی۔ اضطراب ایسا تھا کہ وہ فوراً آفس سے اُٹھ آیا......

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے بُریرہ کا نمبر پریس کیا تھا، دوسری طرف بیل جاتی رہی مگر کسی نے اس کی کال ریسیو نہیں کی۔ بُریرہ اس سے ناراض تھی، یہ وہ جانتا تھا مگر یہ ناراضگی، یہ خفگی کیا اس نہج تک جا پہنچی تھی کہ اب ان دونوں کا اکٹھے رہنا ممکن نہیں رہا تھا۔

وہ محض اس کی شریکِ حیات نہیں تھی، قریبی کزن اور سب سے بہترین دوست بھی تھی۔ پھر وہ اسے کس کے لیے گنوا رہا تھا؟

ایک سراب کے لیے......؟

ایک الوژن کے لیے......؟

مزید پریشان ہوتے ہوئے اس نے دوبارہ اس کا نمبر پریس کیا تھا مگر اس بار بھی بیل جاتی رہی، اس کی کال کسی نے پک نہیں کی۔ پریشانی سی پریشانی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ ابھی تھوڑی دور ہی آیا تھا کہ ایک مرتبہ پھر اس نے ڈیش بورڈ پر پڑا سیل اُٹھا کر بُریرہ سے رابطے کی کوشش کی اور اس بار دوسری طرف سے اس کی کال کو پک کر لیا گیا۔

''ہیلو......!''

''ہُوں بولو، کیوں بار بار کال کر رہے ہو؟'' دوسری طرف بُریرہ تھی مگر اس کی آواز میں نشہ تھا۔

شاہ زر ضبط کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

''میری کال کیوں ریسیو نہیں کر رہیں، کہاں ہو اس وقت؟''

''جہاں بھی ہوں، تمہیں بتانے یا تم سے اجازت لینے کی پابند نہیں ہوں۔'' نشے میں ہونے کے باوجود اس کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

''شٹ اپ بُریرہ! میں نے اگر تمہیں خود سے دور بھجوایا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنی

حدود وقیود کو کراس کر جاؤ۔“

”اچھا! تمہیں خود اپنی حدود و قیود کا پتا ہے؟ اپنی عیاشیوں پر توجہ کی ہے کبھی تم نے؟ بیوی کے ہوتے ہوئے، دوسری پرائی عورتوں پر فدا رہتے ہو، یہ حدود و قیود کی خلاف ورزی نہیں ہے؟ اتنا پیار تھا اس سے تو میری زندگی کیوں برباد کی؟ اسی سے کر لیتے شادی، کوئی روکنے والا نہیں تھا تمہیں؟“ وہ اب چلا رہی تھی۔

شاہ زر کو بے ساختہ اس پر ترس آ گیا۔ جھنجلاہٹ اور پریشانی کے باوجود اس نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر کے اپنے لہجے میں نرمی اور مٹھاس پیدا کی تھی۔

”نہیں...... اگر تم میرے سامنے نہ ہوتیں تو شاید میں ایسا کچھ کر لیتا...... مگر...... جب تم مل گئیں تو پھر کسی اور کی گنجائش کہاں رہ گئی تھی؟“

”جسٹ شٹ اپ شاہ زر! ساری عمر باتوں سے بہلاتے آئے ہو تم مجھے، مگر اب...... اب ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے تم سے ڈائیوورس چاہیے اور بس......“

”کیا کرو گی ڈائیوورس لے کر......؟“ اس کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔

”تمہارا دردِ سر نہیں ہے یہ کہ میں کیا کرتی ہوں۔ یہ میری زندگی ہے اور اسے میں اپنی مرضی سے گزارنے کا پورا پورا حق رکھتی ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو، تمہاری زندگی میں میری کوئی اہمیت نہیں تو میں ساری عمر اسی دُکھ میں گھلتی مر جاؤں گی؟ نہیں شاہ زر! کوئی کسی کے غم میں نہیں مرتا۔ ہاں جینے کا انداز بدل جاتا ہے۔ اب میں بھی تمہیں ایک نئے انداز میں جی کر دکھاؤں گی، سمجھے تم؟“ اس کا اشتعال مزید بڑھا تھا۔

”پاگل ہو تم بُریرہ اور کچھ بھی نہیں۔ اچھی طرح کان کھول کر سُن لو۔ میں کسی طور تمہیں طلاق نہیں دوں گا، سمجھیں؟ گڈ بائے......!“

بات مکمل کرتے ہی اس نے لائن کاٹ دی تھی۔ ٹھیک اسی وقت اس کا سیل دوبارہ بج اُٹھا تھا۔ شاہ زر کا خیال تھا کہ بُریرہ نے کال بیک کی ہوگی مگر وہاں اسکرین پر اس کے آفس کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

”ہیلو......“

”ہیلو سر! میں زید بول رہا ہوں آفس سے۔ آپ کو ایک افسوسناک خبر دینی تھی۔“

”افسوس ناک خبر؟“ اس کے دل کو کچھ ہوا تھا، جب اس نے سنا۔

”جی سر! وہ...... ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک زبردست روڈ ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ جس میں آپ کے نیو پارٹنر مسٹر عبد الصمد اور ان کی وائف انوشہ رحمٰن صاحبہ شدید زخمی ہو گئی ہیں۔ دونوں اس وقت اسپتال میں ہیں مگر دونوں کی حالت تشویشناک بتائی جا رہی ہیں۔“

اس کا ورکر روانی میں اسے تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔ شاہ زر کو لگا جیسے اس کی سماعتوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے، اس کا دماغ بھک سے اُڑ گیا تھا۔

وہ اندازہ نہیں کر پایا کہ ابھی تھوڑی دیر قبل بُریرہ سے علیحدگی کا تصور اس کے لیے زیادہ تکلیف دہ تھا یا ابھی ابھی ملنے والی انوشہ رحمٰن سے جدائی کی خبر، کہ جس نے اس کے جسم کا سارا خون ہی نچوڑ لیا تھا۔ اس وقت اسے صرف اتنا یاد تھا کہ اسے جلد از جلد انوشہ رحمٰن کے پاس پہنچنا ہے اور اس کے

لیے اس نے ایک بار پھر تیزی سے بجتے ہوئے سیل کی بھی کوئی پروا نہیں کی تھی۔
متعلقہ اسپتال پہنچنے کے بعد سب سے پہلی خبر اسے عبدالصمد کی وفات کی ملی اور وہ بے جان ہوتے وجود کے ساتھ جیسے وہیں کوریڈور میں لکڑی کی بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔
اندر آئی، سی، یو میں انوشہ رحمٰن ابھی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی۔

❀❀❀

وہ اسٹڈی روم میں بیٹھا کسی کیس کی اسٹڈی میں مصروف تھا جب وہ آہستہ سے دروازہ دھکیل کر کمرے میں چلی آئی۔
''سُنیے......!'' کچھ دیر اس کے متوجہ ہونے کا انتظار کرنے کے بعد، ہاتھوں کی اُنگلیاں آپس میں رگڑتے ہوئے بالآخر وہ بول اُٹھی تھی۔ شجاع نے خاصی حیرانی سے سر فائل سے اُٹھایا تھا۔
''ہُوں......''
''وہ...... مجھے کچھ کام تھا آپ سے۔'' ازحد کنفیوژ ہوتی وہ شجاع کو اُلجھن میں ڈال رہی تھی۔
نگاہیں تھیں کہ جیسے زمین پر بچھے نفیس قالین پر جم کر رہ گئی تھیں۔
''ہُوں کہو......'' وہ اس وقت مصروف بھی تھا اور قدرے ڈسٹرب بھی۔
امامہ نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور پھر سر جھکایا۔ اپنا مدعا اس سے بیان کرنا کتنا دشوار ہو رہا تھا۔
صبیح پیشانی پر پسینے کے چند قطرے اُمڈ آئے تھے۔ جب کہ ہاتھ کی اُنگلیوں میں واضح لرزش تھی۔
''وہ...... مجھے...... کچھ پیسے چاہئیں تھے......'' اٹک اٹک کر بولتی وہ اسے حیران کر گئی تھی۔
''تو اس میں اتنا گھبرانے والی کون سی بات ہے؟ میری چیک بک لے آؤ۔'' حکم صادر کر کے وہ پھر سے سامنے دھری فائل میں گم ہو گیا تھا۔
امامہ مرے مرے سے قدم اُٹھاتی اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے چیک بک اُٹھا لائی۔
''ہُوں...... کتنے پیسے چاہئیں......؟'' فائل میں گم اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ بولی۔
''پچاس ہزار......''
''پچاس ہزار......؟'' شجاع کی نظریں اُٹھی تھیں اور اس پر جم کر رہ گئی تھیں۔
امامہ کے لیے اس کی نگاہوں کا سامنا کرنا، موت کے مترادف ہو رہا تھا۔
کاش اس نے ارسلان حیدر سے محبت نہ کی ہوتی!
''جی......!'' بمشکل آنسو پیتے ہوئے اس نے سر کو جنبش دی تھی۔
شجاع نے سامنے دھری فائل بند کر دی۔
''پوچھ سکتا ہوں اچانک اتنے پیسوں کی ضرورت کیوں پیش آ گئی تمہیں؟''
''جی...... وہ...... میں...... مم...... مجھے شاپنگ کرنی تھی کچھ، اپنے لیے۔''
پہلے سے سوچا ہوا جملہ ادا کرتے ہوئے بھی اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔
شجاع نے کچھ دیر بغور اس کے چہرے کو دیکھا پھر تیزی سے چیک پر پچاس ہزار کی رقم

ارج کردی۔

''یہ لو مائی ڈیئر......! آئندہ اتنی سی رقم کے لیے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، سمجھیں۔''

اس کا جھوٹ جاننے کے باوجود وہ مسکرایا تھا۔

امامہ چاہنے کے باوجود اس کے سامنے سر نہ اُٹھا سکی۔

اس روز اس نے شجاع حسن سے پچاس ہزار شاپنگ کے نام پر ہتھیانے کے علاوہ، اپنی ایک گولڈ کی رنگ بھی فروخت کی تھی۔ وہ شخص جو اس کے دل کا اوّلین مکین تھا۔ پرائے دیس میں اس کی لاچاری کا خیال اب بھی اسے اداس کیے ہوئے تھا۔ یہ درست تھا کہ وہ اس کے ہاتھوں دُکھی ہوئی تھی مگر......اس وقت اسے اپنے کسی نقصان کا احساس رہا ہی نہیں تھا۔

ایک لاکھ روپے جس مشقت سے اکٹھے کر کے اس نے اسے ارسال کیے تھے، یہ صرف وہی جانتی تھی۔

شجاع اس کی الجھن سے بے خبر خاموشی سے اس کی سرگرمیاں دیکھتا رہا تھا۔

❁❁❁

بی اماں کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو...... ماضی کے بیتے ہوئے ہر لمحے کو ان کے تصور میں کھینچ لائے تھے۔ وہ گوری کو بتا رہی تھیں کہ کیسے ان کے قافلے کی خواتین، اوباش آوارہ ہندو لڑکوں کے ہاتھ لگ گئیں اور کیسے مسلمانوں سے ازلی دشمنی رکھنے والے ان سفاک انسانوں نے وہاں جنگل میں ان کی عزتوں سے کھیلتے ہوئے اِک قیامت بپا کی۔ وہ بے ہوش ہوگئی تھیں شاید اسی لیے ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رہیں یا پھر وہاں بروقت شیر محمد کی آمد کی صورت، ان کی دعاؤں کے صدقے، ان کے پروردگار نے ان کی عزت بچالی تھی۔ وہ کڑی مسافت کے بعد پاکستان آئیں تو ان کا بُرا حال تھا۔ مگر سچے دین کا خزانہ پالینے کی خوشی ان کے ہر غم کے سامنے ڈھال بن گئی تھی۔

شیر محمد صاحب نے پاکستان ہجرت کے بعد، فوج میں شمولیت اختیار کی اور عین جوانی میں، جب کہ بی اماں کے ساتھ ان کی شادی کو ابھی محض چند سال ہی ہوئے تھے کہ وطن کی سرحدوں کی حفاظت سرانجام دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ ان کی رحلت کے بعد اپنی جوانی کی حفاظت اور ننھے سے بیٹے کی تن تنہا پرورش، ایک الگ کہانی تھی۔

عصر کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ گوری کے سر پر ہاتھ پھرتی، بعد کے وقت کی یادیں ساتھ لیے، نماز کے لیے اُٹھ گئیں، جب کہ گوری وہیں بیٹھی اپنی سوچوں میں کھوئی رہی۔

❁❁❁

''ہیلو شاہ زر صاحب......!''

وہ نڈھال سا، اسپتال کے کوریڈور میں کھڑا تھا، جب مسلسل بجتے سیل نے اس کی توجہ اپنی جانب مرکوز کروالی۔ نمبر کراچی کا نہ ہوتا تو شاید وہ کبھی کال پک نہ کرتا، بلکہ سیل ہی آف کر کے رکھ دیتا کہ اس وقت اس کا کسی بھی فرد سے بات کرنے کو قطعی دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''جی......'' جانے کیسے آواز اس کے حلق سے نکل پائی تھی۔
''سر! آپ کے لیے ایک بُری خبر ہے۔'' دوسری جانب اجنبی آواز تھی۔
''ایک مرتبہ پھر...... بُری خبر۔''
شاہ زر کے اعصاب جیسے چٹخ سے گئے۔ اسے لگا وہ موبائل فون پر اپنی گرفت مضبوط نہ رکھ سکے گا۔
''کیا......؟''
پاتال کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتے دل کو بمشکل سنبھالے ایک مرتبہ پھر وہ لبوں کو جنبش دے گیا۔ تبھی اسے بتایا گیا۔
''سر! انگلینڈ سے پاکستان آنے والی آج صبح کی فلائٹ کو حادثہ پیش آ گیا ہے۔ ایک سو تیس مسافروں میں سے کوئی زندہ نہیں بچا۔ میں متعلقہ کمپنی کا نمائندہ ہوں، آپ کے تین عزیز انگلینڈ سے اسلام آباد کے لیے سفر میں تھے۔ ابتدائی تحقیق کے مطابق دو خواتین اور ایک مرد ہے اور ان سے محفوظ سامان ملا ہے، اس میں ایک ڈائری ہے جس پر آپ کا نمبر اور ایڈریس درج ہے۔'' کوئی پیشہ وارانہ انداز میں روانی سے اسے بتا رہا تھا۔
شاہ زر کو لگا اس کا سر جیسے کسی بھاری بھرکم چیز نے کچل دیا ہو۔
اگر یہ قدرت کی طرف سے امتحان تھا تو بہت مشکل امتحان تھا۔ اگر یہ اس کے ایمان کی آزمائش تھی تو وہ خود کو اس آزمائش میں بہت کمزور پا رہا تھا۔
پے در پے مصائب، پریشانیاں، حادثات!
کیا اسی کا نام زندگی ہے؟
سنبھلنے کا کوئی موقع ہی نہیں مل رہا تھا
متعلقہ کمپنی کا نمائندہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا مگر وہ سُن ہی کہاں رہا تھا۔
عباد کو جیسے ہی اس کے آفس کی طرف سے شاہ زر کا پیغام پہنچایا گیا، وہ پہلی فلائٹ سے اس کے پاس دوڑا چلا آیا، مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں اسے صرف ایک حادثے پر شاہ زر کو تسلی نہیں دینی، جب کہ اسے حقیقی معنوں میں ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے بھی دیکھنا ہے۔

❋❋❋

اس کی آنکھیں ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ انزلہ نے اس کی طرف دیکھا، پھر فوراً رُخ پھیر لیا۔
''کون تھا یہ......؟''
شاید اندھیرے کی وجہ سے وہ بہزاد علی مراد کو دیکھ نہیں پایا تھا۔
انزلہ کی پیشانی پر اس کے ایک دم سامنے آنے سے بل پڑ گئے۔
''تم سے مطلب......؟''
''مجھ سے ہی مطلب نکلتے ہیں سب تمہارے، سمجھیں تم......؟'' وہ دہاڑا تھا اور انزلہ کی ناگواری میں مزید اضافہ ہوا تھا۔

''چلاؤ مت۔ ہزار مرتبہ کہہ چکی ہوں تمہیں، میرے ذاتی معاملات میں ٹانگ اُڑانا چھوڑ دو، سوائے نفرت کے دوسرا کوئی تعلق نہیں ہے میرا تمہارے ساتھ۔ مت بھولو سانول شاہ! کہ تم ایک پڑھے لکھے جاہل اور جنگلی انسان ہو، تمہارا بھائی میرے پاپا کا قاتل ہے۔ تم جیسے وحشی انسان سے کوئی واسطہ رکھنے سے بہتر ہے، میں کسی کنوئیں میں چھلانگ لگا کر مر جاؤں۔ انزلہ شاہ تو کیا کوئی بھی لڑکی تم سے آوارہ، رئیس زادے کی رفاقت کا نہیں سوچ سکتی، سمجھے تم!''

وہ اتنی تلخ کیوں ہو گئی تھی، اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔

سانول شاہ حیرت سے گنگ اس کے سامنے پہاڑ بنا اسے چلاتے ہوئے سنتا رہا اور وہ یکسر نظر انداز کرتی آگے بڑھ گئی۔

❋❋❋

اسے یہ کون سمجھائے......
کہ وہ دشتِ خاموشی میں
انگلیوں میں سپیاں پہنے
کسی سوکھے سمندر کی
ادھوری پیاس کی باتیں
بہت چُپ چاپ سنتا ہے
بہت خاموش رہتا ہے
اسے یہ کون سمجھائے......
خوشی کے ایک آنسو سے
سمندر بھر بھی جاتے ہیں
بہت خاموش رہنے سے
تعلق مر بھی جاتے ہیں

زاور حسن کو انوشہ رحمٰن کے ایکسیڈنٹ کی خبر نہیں ملی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کس حال میں ہے۔ اسے اس بات کی خبر بھی نہیں تھی کہ اس کی سوتیلی ماں سائلہ بیگم اپنی بیٹی کا گھر بچانے کے لیے کئی بار نہ صرف انوشہ کو لے کر شاہ زر سے جھگڑا کر بیٹھی تھیں بلکہ انہوں نے بُریرہ کی پاکستان واپسی کی شرط ہی یہ رکھ دی۔ وہ پہلے انوشہ کو ان کے پاس انگلینڈ بھجوائے مگر۔ یہ نہ تو شاہ زر کو گوارہ تھا نہ انوشہ کسی طور یہ ماننے کو تیار تھی۔ اس نے اپنے آپ کو زندگی میں کبھی اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔

وہ شافیہ کے ساتھ پاکستان روانگی کی مکمل تیاری میں تھا، جب صدف بیگم نے بھی ان کے ساتھ جانے کا عندیہ دے دیا، انہیں اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ جا کر اپنی بیٹی کو منانا تھا، اس کا دل صاف کرنا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ اس کے نصیب میں نہیں ہے۔

اِدھر پاکستان میں انوشہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی اور اُدھر اس کے پیاروں نے موت کی دہلیز پر قدم دھر دیئے تھے۔ انگلینڈ سے پاکستان کے لیے روانہ ہونے والی اس فلائٹ کو پاکستان کی سرزمین پر پہنچنا نصیب نہیں ہوا تھا۔

دل کے سارے راز، دل میں لیے وہ تینوں نفوس فلائٹ کو اچانک پیش آنے والے حادثے کا شکار ہو کر لقمۂ اَجل بن گئے تھے، مگر پاکستان میں انوشہ اور شاہ زر دونوں کو ہی اس حادثے کی کانوں کان خبر نہیں ہو سکی تھی۔

بیٹی کا دل صاف کرنے کی صدف بیگم کی خواہش، خواہش ہی رہ گئی تھی۔ شافیہ جو اس سے معافی کی خواستگار تھی، زاور جو اسے سینے سے لگا کر ڈھیر سارا رونے کا خواہش مند تھا، سب خاک میں مل گیا۔ آئی سی یو میں زندگی اور موت کی جنگ لڑتی اس لڑکی کو خبر بھی نہ ہو سکی تھی اور اس کا سارا گلشن خزاں کی نذر ہو کر رہ گیا تھا۔

کسے خبر تھی کہ اگر وہ زندگی کی طرف واپس پلٹ بھی آئی تو اسے صرف اپنے نام نہاد شوہر کی ناگہانی موت کا ماتم نہیں منانا۔ بلکہ ان لوگوں کے لیے بھی رونا ہے، جن سے خفگی کے باوجود، وہ ان سے بے حد پیار کرتی تھی۔

وہ لوگ جو اس کا اثاثہ تھے
اس کا مان تھے
دُکھوں کی گرم دوپہر میں اس کا سائبان تھے
اسے رونا تھا......اور کاتبِ تقدیر کی اس آزمائش پر جانے کب تک رونا تھا

❁❁❁

وہ اپنے روزمرّہ کے کاموں میں مصروف تھا، جب علیزہ دودھ کی خالی بالٹی اُٹھائے باڑے میں چلی آئی۔

ایان نے سرسری سی اِک نظر اس پر ڈال کر رُخ پھیر لیا تھا۔

"السّلام علیکم!"

اس کی پلکیں بھیگی تھیں۔

"وعلیکم السّلام!" خود کو مصروف ظاہر کرتے ایان نے سر اُٹھا کر دوسری نگاہ اس پر نہیں ڈالی۔

"بہت مصروف رکھتے ہو ہر وقت خود کو......کبھی تھوڑا آرام بھی کر لیا کرو ایان!" آج اس کی ٹون بدلی ہوئی تھی۔

ایان دل ہی دل میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"مجھے مصروف رہنے کے ہی پیسے ملتے ہیں، آرام کرنے کے نہیں۔"

"بڑے ایمان دار ہو۔"

"اللہ ربّ العزت کا خاص کرم ہے مجھ پر، وگرنہ میری کیا اوقات۔"

"بہت پیار کرتے ہو اللہ سے، کبھی اس کی مخلوق کے لیے بھی کچھ سوچ لیا کرو۔" وہ سنجیدہ تھی۔

سبز پتوں میں بھوسا ملاتا ایان اپنے ہاتھ روک گیا۔

"میں کسی بھی قسم کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ بس صرف یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کا واسطہ ہے تمہیں، میری جان چھوڑ دو۔ میں تمہارے مطلب کا بندہ نہیں ہوں۔"

''تم سمجھتے ہو، میں تمہیں اپنے جال میں پھنسا رہی ہوں؟''

''ہاں!'' وہ دہاڑا تھا۔

علیزہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''کتنے بُرے ہو تم ایان! تمہارے پاس وہ آنکھ ہی نہیں جو کسی کی بے لوث محبت کو دیکھ سکے، محسوس کر سکے۔''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تمہاری بے لوث محبت کی، نہ ہی تمہارے پیار کا کوئی اچار ڈالنا ہے مجھے۔''

''پیار کا اچار ڈالا بھی نہیں جاتا...... خیر، مجھے شادی کرنی ہے تم سے۔''

بات کرتے کرتے ایک منٹ کے لیے رُک کر اس نے جیسے اچانک کوئی بم پھوڑا تھا۔

ایان کی پیشانی پر کئی بل ایک ساتھ پڑ گئے۔

''تم کیا چاہتی ہو کیا نہیں، مجھے اس کی پروا نہیں، مگر میں، میں یہ چاہتا ہوں کہ تم جیسی بدکردار لڑکی کی شکل بھی نہ دیکھوں اور اس کے لیے میں آج ہی بڑے ملک صاحب سے بات کر کے یہ کام چھوڑ رہا ہوں۔''

علیزہ کا سر اس کے جواب پر جھکا تھا اور اس کی آنکھیں یک لخت آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

''ہاں میں بدکردار ہوں، جو بھی کرتی ہوں مجھے اس کا احساس ہے، مگر میں بدل سکتی ہوں، سر تا پا بدل سکتی ہوں، تم اپنی محبت کا آسرا تو دو ایان! میں تمہارے لیے، ہنس کر موت کو گلے نہ لگالوں تو کہنا۔''

''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے ڈرامے کا اثر لے کر تمہاری باتوں میں آجاؤں گا تو تم بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو۔ میں تم سے نفرت کرتا ہوں علیزہ ملک! شدید نفرت کرتا ہوں تم سے۔ کیونکہ تم بھی نفس کی غلام، راہ سے بھٹکی ہوئی عورتوں میں سے ایک ہو، جنہیں نہ ماں باپ کی عزت کا پاس ہوتا ہے نہ پردے کی حرمت کا احساس، صرف تماشا ہو، نمائش ہو تم دنیا کے لیے، اور کچھ بھی نہیں۔''

وہ تلخ ہوا تھا اور علیزہ کا منہ اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

کتنی نفرت چھپائے ہوئے تھا وہ اس کے لیے اپنے دل میں...... اسے لگا اس کا دل جیسے ضبط کے طوفان کو دبانے سے پھٹ جائے گا، تبھی وہ بولی تھی۔

''ہاں میں تماشا ہوں، کھلونا ہوں دنیا کے لیے۔ مگر میں تم سے محبت کرتی ہوں ایان ملک...... اور اسی محبت کے صدقے، میں زندگی بھر تمہاری غلام بن کر رہ سکتی ہوں۔ کیا گارنٹی ہے تمہارے پاس کہ جس پارسا لڑکی کو تم اپنی زندگی کا حصہ بناؤ گے، اس کا کسی کے ساتھ کوئی چکر نہیں ہوگا، کوئی تعلق نہیں ہوگا؟ عورت کی نگرانی بھی رکھ سکا ہے کبھی کوئی۔ بہت یقین ہے تمہیں پردے کی پاکیزگی پر؟ مگر میں نے، علیزہ ملک نے بہت بار ایسی لڑکیاں دیکھی ہیں جو اپنے وجود کو مکمل طور پر عبا اور اسکارف میں لپیٹ کر گھر سے نکلتی ہیں، مگر جب وہ گھر واپس لوٹتی ہیں تو ان کے وجود گندگی سے لتھڑے ہوتے ہیں۔ چار گز کے کپڑے کو آہنی دیوار سمجھتے ہو تم؟ جسے کوئی ڈھا نہ سکے، مسمار نہ

کرسکے؟"

سرخ بھیگی ہوئی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑے وہ تلخی سے کہتی حساب برابر کررہی تھی۔ ایان کو لگا جیسے وہ اس سے کبھی جیت نہیں سکے گا۔

وہ عورت کے فریب کا شکار تھا، اس صنف سے نفرت کرتا تھا مگر...... اس لمحے اچانک اس کے اندر کہیں کچھ بدلا تھا۔

بھیگی ہوئی ہلکی ہلکی سرخ آنکھوں میں ہلکورے لیتا غصہ اسے گنگ کرگیا تھا۔

کتنی گہری تھی وہ اور کتنی کڑی نگاہ تھی اس کی اپنے اردگرد کے ماحول پر......

اسے اب اپنے الفاظ پر افسوس ہورہا تھا مگر اس نے علیزہ سے اس کا اظہار نہیں کیا۔

وہ روتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔ ایان اُلجھا اُلجھا سا کام چھوڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔

اگلے کئی روز تک وہ اس کے سامنے نہیں آئی اور وہ مزید بے چین سا ہوگیا۔

ٹھیک ہی تو کہا تھا اس نے، بھلا رب کی ذات کے سوا کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو ہدایت دے سکتا ہے؟

اس کے کردار کی نگرانی کرسکتا ہے؟

وہ غلط لڑکی تھی مگر اس نے بات بالکل سچ کہی تھی۔

کتنے ہی دن کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد بالآخر اس نے خود سے یہ اعتراف کرلیا تھا کہ علیزہ ملک اس کے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ بنا چکی تھی۔

اس روز بہت دنوں کے بعد اس نے اسے دیکھا تھا۔ خاموش خاموش سی اداس لڑکی...... پیلے سوٹ میں کتنی اچھی لگ رہی تھی۔

ابھی دو روز قبل اس نے حویلی میں کام کرنے والے لڑکے عاطف کی بے تکلفی پر اس کی اچھی خاصی بے عزتی کرکے اُسے وارن کردیا تھا۔ ایان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے بات کرے تو کیسے کرے؟ اور پھر اس دن جیسے اس کی تقدیر نے اسے یہ موقع مہیا کر ہی دیا۔

بڑے ملک کی طبیعت خراب تھی اور چھوٹا ملک اپنے بڑے بھائی کو ائر پورٹ سے لینے کے لیے کل ہی کراچی روانہ ہوا تھا۔ جو عرصہ دراز کے بعد اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یو کے سے پاکستان واپس آیا تھا۔ ایسے میں علیزہ کو اچانک شہر میں کوئی کام پڑ گیا تو بڑے ملک نے ایان کی شرافت دیکھتے ہوئے اپنی ذاتی گاڑی دے کر اسے علیزہ کو شہر لے جانے کا حکم دے دیا۔

محبت اور قانون دونوں اندھے ہوتے ہیں اور جو چیز ان دونوں کی لپیٹ میں آجاتی ہے وہ ہمیشہ کے لیے ایک دھبا بن کر رہ جاتی ہے، ایسا دھبا کہ جس کا نشان نہ آنسوؤں سے دُھل سکتا ہے نہ پچھتاوے کے احساس سے۔

وہاں دل میں پھوٹتی محبت کی نئی کونپل کے احساس سے سرشار، ایان ملک اندھے قانون کے بعد اب اندھی محبت کے فریب کا شکار ہونے جارہا تھا۔

❋❋❋

فراقِ یار کی بارش، ملال کا موسم
ہمارے شہر میں اُترا کمال کا موسم
وہ اک دعا جو میری نامراد لوٹ آئی
زباں سے روٹھ گیا پھر سوال کا موسم
بہت دنوں سے میرے ذہن کے دریچوں میں
ٹھہر گیا ہے تمہارے خیال کا موسم
جو بے یقیں ہوں بہاریں اُجڑ بھی سکتی ہیں
تُو آ کے دیکھ لے میرے زوال کا موسم
محبتیں بھی تیری دھوپ چھاؤں جیسی ہیں
کبھی یہ ہجر، کبھی یہ وصال کا موسم
کوئی ملا ہی نہیں، جس کو یہ سنا پاتے
ہم اپنے خواب کی خوش بُو، جمال کا موسم

''جی مس ساعقہ! پھر کیا سوچا آپ نے؟''

''کس سلسلے میں؟''

''بھئی اپنی اور میری شادی کی تیاری اور اپنی والدہ کے آپریشن کے سلسلے میں۔''

وہ اپنی ماں کے کمرے کے باہر کھڑی تھی، جب آپریشن کے بارے کسی سادہ سے دیہاتی بزرگ سے باتیں کرتا ڈاکٹر عارف اس کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔

وہ اس کی سوچ اور تصور سے زیادہ بے حس اور شاطر انسان تھا۔ ساعقہ کو بے ساختہ عباد کا غصہ اور اس شخص سے متعلق اس کے کمنٹس یاد آ گئے۔

''سوری! میں آپ سے شادی نہیں کرسکتی۔''

''کیوں؟ پہلے تو کر رہی تھیں؟'' اس کی تیوری چڑھی تھی۔

ساعقہ نے اپنے چہرے کا رُخ پھیر لیا۔

''پہلے کی بات اور تھی۔''

وہ ابھی بات مکمل بھی نہ کرسکی تھی کہ اس نے کاٹ دی۔ ''آپ میرے روم میں آئیں ذرا......''

اس شخص کو موڈ بدلنے میں چند لمحے لگے تھے۔

سادہ سا، دیہاتی بزرگ اپنے جوان خوبرو بیٹے کے فوری آپریشن کے لیے منمنا کر رہ گیا۔

ساعقہ کو اس لمحے اس بے بس بوڑھے باپ پر بے حد رحم آیا تھا۔

''جی فرمائیے......'' خاصی بیزار سی وہ اس کے پیچھے اس کے کمرے میں آئی تھی۔

''میں جاننا چاہتا ہوں مس ساعقہ! صرف دو روز میں آپ کا فیصلہ بدلنے کی وجہ کیا ہے؟'' سکون سے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے سوال کیا تھا۔

''کوئی وجہ نہیں......سوائے اس کے کہ اب میں مجبور نہیں ہوں۔''

''پہلے کیا مجبوری تھی؟''

انسانیت کے اس مسیحا کا لہجہ صرف ایک لمحے میں شیریں سے تلخ ہوا تھا۔

صاعقہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ اس کے اندر اس لمحے ناگواری کی شدید لہر اُٹھی تھی۔

''میری ماں کی زندگی کا سوال مجبوری بن کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور میں، میں بے آسرا تھی، مگر شکر ہے اس پاک ذات کا کہ اس نے زیادہ دیر مجھے بے آسرا نہیں رکھا۔''

''افسانوی باتیں مت کریں محترمہ! صاف اور سیدھا جواب دیں، میں تیاری کر چکا ہوں۔''

''وہ آپ کا مسئلہ ہے، میری ماں کا آپریشن ابھی نہیں ہوا۔ باقی جتنے بھی اخراجات ہیں، میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔''

''ٹھیک ہے، اگر آپ بیٹی ہو کر خود اپنی ماں کو مارنا چاہتی ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''مارنے اور بچانے والی ذات صرف اللہ ربّ العزت کی ہے ڈاکٹر صاحب! اس ذات نے محض شفاء رکھی ہے آپ کے ہاتھوں میں، زندگی اور موت نہیں۔ وگرنہ جانے اس روئے زمین پر آپ لوگ کسی لاچار انسان کو زندہ رہنے کا حق دیتے یا نہیں۔'' وہ تلخ ہوئی تھی۔ ''آپ اور آپ جیسے کئی اعلیٰ ڈگریوں کے حامل، تعلیم یافتہ مگر بے حس ڈاکٹر، بظاہر دُکھی انسانیت کے مسیحا بن کر بے بس و لاچار لوگوں میں زندگی بانٹتے نہیں بلکہ زندگی کا سودا کرتے ہیں۔ یہ سفید مسیحائی کوٹ پہن کر لوگوں کی ڈوبتی امیدیں باندھتے نہیں بلکہ بڑے کرّ و فر و بے حسی سے تماشا دیکھتے ہیں، ان کی مجبوری اور بے بسی کا۔ کیا سمجھتے ہیں آپ، یہ جو عالی شان عمارت تعمیر کروا رکھی ہے آپ نے؟ یہ آپ کے حق حلال سے کمائے گئے پیسوں سے بنی ہے؟ نہیں...... یہ دولت جو کاغذ کے ٹکڑوں کی صورت اپنے پاس جمع کر رکھی ہے آپ نے یہ کاغذ کے ٹکڑے نہیں ہیں، کسی بے بس ماں کے کلیجے سے ٹپکے ہوئے خون کے قطرے ہیں، کسی لاچار غریب باپ بھائی کی، بیٹے کی، آنکھوں سے پھسلتے مجبوری کے آنسو ہیں۔ بہت ناز ہے اپنی اعلیٰ ڈگریوں پر آپ کو؟ کیا فائدہ ان نام نہاد کاغذ کے قیمتی ٹکڑوں کا، جو آپ کو انسانیت کا احساس نہ دلا سکیں؟ آپ کے دل اور ضمیر کو پتھر سے موم نہ بنا سکیں؟ یہ سوچنے پر مجبور نہ کر سکیں کہ جانے کیسے، کوئی مجبور و لاچار، دھکّے کھا کر ہزار صعوبتیں اُٹھا کر، کتنی مشکل سے آپ تک پہنچا ہو گا۔ کیسی کیسی امید نہیں باندھی ہو گی اس نے آپ سے، آپ کے فوری حکم پر جانے کیسے، کبھی آپریشن، کبھی ٹریٹمنٹ، کبھی چیک اپ کے لیے، آپ کی منہ مانگی فیس کا انتظام کیا ہو گا اس نے۔ کبھی سوچا آپ نے، جو پیسے آپ صرف اپنی چند منٹ کی مسیحائی کے وصول کرتے ہیں۔ اتنے پیسے اس نے کبھی اپنی پوری زندگی میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔''

''خدا کا شکر ہے کہ میرے ربّ نے مجھے آپ کے فریب کا شکار ہونے سے بچا لیا، وگرنہ وہاں، جو ایک بے یار و مددگار ماں بیٹھی اپنی بیٹی کے لیے رو رہی ہے ناں! وہاں اس وقت میں بیٹھی ہوتی اور وہ، وہ دیکھیے، وہ باہر لکڑی کے اس ٹھنڈے بنچ پر اس ماں کی وہ چھوٹی سی بچی پڑی درد سے تڑپ رہی ہے ناں! وہاں اس جگہ پر میری ماں پڑی درد سے تڑپ رہی ہوتی۔''

جذباتی کیفیت میں وہ بلا تکان بولے جا رہی تھی۔ جب ڈاکٹر عارف کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''اسٹاپ اٹ محترمہ! اِٹس انف۔''

وہ آئینہ دکھارہی تھی اور انسان کے لیے اس وقت آئینہ دیکھنے سے بڑھ کر شرمناک فعل اور کوئی رہ ہی نہیں جاتا، جب اس میں اس کا مکروہ چہرہ صاف سامنے دکھائی دے رہا ہو۔

”کیا ہوا؟ برداشت جواب دے گئی؟ چچ...... چچ...... چچ...... تھوڑا سا سچ برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے آپ میں اور وہ لوگ جو آپ کی سفاکی کے سامنے مجبور لاچار، تقدیر اور حالات کے تھپیڑے سہتے پہنچتے ہیں، کبھی سوچا ہے آپ نے کہ وہ کیسے یہ درد برداشت کرتے ہوں گے، جو آپ ذراسی غفلت، ذراسی بے پروائی سے انہیں سونپ دیتے ہیں؟ اُکتا جاتے ہیں نا، ان جاہل، گنوار لوگوں کے آئے روز خون میں بھیگے جسم دیکھ دیکھ کر، واقعی آپ کا بھی قصور نہیں ہے مگر کتنی دلچسپ بات ہے، آپ روز پیسے سمیٹنے سے نہیں اُکتاتے، زندگیوں اور رشتوں کے سودوں میں، اُکتاہٹ صرف ہارتی سانسوں والوں سے ہوتی ہے۔ ہاتھ میں پیسے تھمانے والوں سے نہیں۔“

وہ اتنی تلخ کیوں ہو رہی تھی، اسے خود بھی پتا نہیں تھا۔

ڈاکٹر عارف کا چہرہ خفت اور احساس توہین سے سرخ پڑ چکا تھا۔

”بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

”دفع ہو جانے کے لیے ہی آئی ہوں۔ مگر جانے سے پہلے اتنا ضرور کہوں گی، آپ ان بدنصیب انسانوں میں سے ہیں جن کو اللہ ہدایت نہیں دیتا اور جس کو اللہ ہدایت نہ دے اس پر کسی انسان کی تبلیغ کا اثر کیسے ہو سکتا ہے؟“

اس کا اندر جل رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ اسے ڈاکٹر عارف سے مزید کوئی ناقابل برداشت جملہ سننے کو ملتا؟ وہ اس پر چار حرف بھیج کر اس وارڈ کی طرف چلی آئی، جس کے ایک وی آئی پی کمرے میں اس وقت اس کی ماں ایڈمٹ تھی۔

لڑکیوں کی فطرت میں یہ بات گندھی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ جسے چاہتی ہیں یا جس کسی سے چاہت کا ذرا سا احساس پاتی ہیں۔ پھر وہ شخص ایک دلچسپ اور روح کو مسرور کر دینے والے احساس کا عکس بن کر، ان کی زبان پر آ جاتا ہے۔

ایک سہیلی کے دل کی باتیں دوسری سہیلی، پھر دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی سہیلی تک با آسانی پہنچ جاتی ہیں۔ چاہے جانے کا مسرور کن احساس، کسی فخر، کسی اعزاز کے ساتھ محبت کی کہانی کے اختتام تک ان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

صاعقہ بھی مڈل بلکہ لوئر مڈل خاندان سے تعلق رکھنے والی ایسی ہی لڑکی تھی مگر، اس نے ابھی تک اپنے دل کا راز کسی کے سپرد نہیں کیا تھا۔ وہ اس شخص کو چھوڑ سکتی تھی مگر کھو نہیں سکتی تھی۔

اس روز اپنی ماں کو اسپتال سے گھر لاتے ہوئے اس نے سوچ لیا تھا کہ زین (عباد) سے کوئی بات نہیں چھپائے گی۔ اسے اپنی حیثیت اور اسٹینڈرڈ سے متعلق ساری سچائی صاف صاف بتا دے گی پھر اس کے بعد یہ اس پر ہوگا کہ وہ اس سے مزید واسطہ رکھنا چاہتا ہے یا نہیں۔

وہ جس طبیعت کی مالک لڑکی تھی اور جس کلاس سے اس کا تعلق تھا، وہاں کسی کو فریب دے کر سکون سے رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ سو اس سے پہلے کہ عباد کو اس کی نظر میں، اس کی حیثیت اور سچائی کا پتا چلتا وہ خود اسے سب کچھ صاف صاف بتا کر سرخرو ہو جانا چاہتی تھی۔

❊❊❊

ارسلان حیدر کو امامہ کی بھجوائی گئی رقم مل گئی تھی۔ وہ اس کا مشکور ہو رہا تھا اور اس نے اسے رات آٹھ بجے فون کرنے کا پیغام دیا تھا۔ امامہ کو عرصے کے بعد وہی اس کا پرانا انداز بہت اچھا لگ رہا تھا۔

محبت اگر سچی ہو تو صنف نازک کے لیے دل کی سرزمین پر قدم دھرنے والے اوّلین شخص کو اس کی تمام تر بے وفائی کے باوجود اپنے دل و دماغ سے نکال دینا موت کے مترادف ہوتا ہے، خواہ بدلے میں کتنی ہی آسائشیں، عزت اور پیار مل رہا ہو۔ محبت عورت کی زندگی میں اس کا سب سے بڑا امتحان ہے۔

امامہ حسن کے لیے بھی یہ کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔

اس کی زندگی میں دو شخص تھے۔

ایک وہ، جسے اس کے دل کی سرزمین پر قدم دھرنے والے اوّلین شخص ہونے کا فخر حاصل تھا اور دوسرا شخص وہ تھا جو اللہ نے اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ شخص جو اس نے خود اپنے لیے پسند کیا تھا، وہ اس کے لیے جان بھی دے سکتی تھی، اگرچہ وہ اس سے مخلص نہیں تھا۔ مگر وہ شخص جو اللہ ربّ العزت نے اس کے لیے منتخب کیا تھا، وہ اس کے لیے جان دے سکتا مگر وہ اس سے مخلص نہیں تھی۔

ہر عام سے انسان کی طرح، وہ بھی ایک عام سی انسان تھی، جذبات، خواہشات اور اپنی پسند کی چیزوں کے لیے ماری ہوئی پاگل لڑکی......

اس روز اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

نہ کسی کام میں ہاتھ ڈالنا، نہ گڑیا کے ساتھ وقت گزار کر اس کے پے در پے چھوٹے چھوٹے سوالوں کے جواب دینا، نہ قدرت اللہ صاحب کے پاس بیٹھ کر ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں شیئر کرنا۔

اُلجھی اُلجھی سی...... کھوئی کھوئی سی...... وہ سب کو پریشان کر رہی تھی۔

وقت تھا کہ جیسے کاٹے نہ کٹ رہا تھا۔ وہ لان میں بیٹھی تھی اور شدت سے آٹھ بج جانے کا انتظار کر رہی تھی جب قدرت اللہ صاحب نے ملازم کے ہاتھ اسے اپنے کمرے میں بلوالیا۔ وہ بے کل سی مجبوراً اُٹھ کر، مرے مرے سے قدموں کے ساتھ ان کے کمرے کی طرف چلی آئی۔

''السلام علیکم بابا!''

''وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو۔''

''خیریت بابا؟''

''ہاں، خیریت ہی ہے...... آج صبح سے تم آئی نہیں، میرا وقت نہیں کٹ رہا تھا۔''

''وہ...... میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی بابا!''

فوری طور پر سر اُٹھا کر ذرا سی نظر ان پر ڈالتے ہوئے وہ یہی بہانہ کر سکی تھی۔

''کیا ہوا طبیعت کو......؟ اپنا خیال بھی تو نہیں رکھتی ہو تم۔'' وہ پریشان ہوئے تھے، امامہ شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

''تھوڑا سا آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی بابا! آپ پریشان نہ ہوں۔''

''پریشان تو رہوں گا، مگر تم آرام کرلو، آج میں اپنا کچھ سُنے بنا سونے کی کوشش کرتا ہوں۔''

امامہ نادم سی، دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نا چاہتے ہوئے بھی خاموشی سے اُٹھ آئی۔
"ماما......!"

اپنے روم میں پہنچ کر ابھی اس نے سیل چیک ہی کیا تھا کہ گڑیا کی پکار پر بیزار سی واپس پلٹی۔
"جی گڑیا!"

"مجھے پاستا بنادیں پلیز!"

فرمائش نئی نہیں تھی مگر پہلی بار وہ کوفت کا شکار ہوئی۔
"کل بنادوں گی گڑیا! آج مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا ہوا مما کو؟"

اپنی فرمائش بھول کر متفکر سی وہ قریب چلی آئی تھی۔
"کچھ نہیں بیٹے! بس ہلکا سا سر میں درد ہے۔"

وہ اس سے جان چھڑانا چاہتی تھی کیونکہ ارسلان کی کال کسی بھی وقت آسکتی تھی۔
"میں سر دباؤں آپ کا؟"

"نہیں چندا! آپ ٹی وی دیکھ لو۔ پھر پاپا آئیں گے تو ان کے ساتھ کھیل لینا، ٹھیک ہے؟"
"جی ٹھیک ہے۔"

گڑیا بھی شاید اس کی کیفیت سمجھ رہی تھی، تبھی اس کی تجویز پر فوراً فرماں برداری سے سر ہلاتی، واپس پلٹ گئی۔

اسے اب ارسلان پر غصہ آ رہا تھا، آٹھ بج کر پچیس منٹ ہو چکے تھے۔ مگر اس کی کال نہیں آ رہی تھی۔

سیل اُٹھا کر اس نے اسے بیل دی تو دوسری طرف اس کا سیل ہی آف ملا۔ وہ شدید جھنجلاہٹ کا شکار ہو کر رہ گئی۔

'اسٹوپڈ...... ذرا جو اپنی کسی بات کا خیال رہ جائے اسے۔"

عین اسی پل شجاع کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی۔ آج وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ پولیس کے کچھ اور افسران بھی تھے۔ وہ اپنے روم کی کھڑکی سے ان سب کو بس ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے ہی دیکھ پائی تھی۔

اگلے تقریباً تیس منٹ تک ارسلان کا موبائل آف ہی ملا تھا۔ وہ بار بار چیک کرتی جیسے تھک سی گئی۔

ملازم مہمانوں کو چیزیں سرو کر رہے تھے۔

وہ جلے پیر کی بلی کی مانند اِدھر سے اُدھر چکر لگاتی رہی، تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد، مہمانوں کو رخصت کر کے شجاع، قدرت اللہ صاحب کے کمرے سے ہو کر اپنے روم میں آیا تو وہ اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

"السلام علیکم!"

آج تھکن اس کے چہرے سے ہی ظاہر ہو رہی تھی، وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"وعلیکم السلام! آج جلدی آ گئے خیریت؟"

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی تو واپس چلا جاتا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے قریب آیا تھا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اس نے نظر چراتے ہوئے کہا تھا مگر حقیقت میں اس کا یہی مطلب تھا۔

شجاع اب مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے اپنے پاؤں کو جوتوں کی قید سے آزاد کر رہا تھا۔

"آج طبیعت کچھ ناسازسی تھی؟ سوچا گھر چل کر اپنی پیاری بیگم کے نرم ہاتھوں سے سر دبواتا ہوں، دبا دو گی ناں؟"

"جی...... جی کیوں نہیں؟"

وہ دل ہی دل میں خوب بیزار ہوئی۔ اسے بھی آج ہی یہ ناز اُٹھوانے تھے۔

شجاع جوتے اُتار کر ایزی ہوا تو وہ ایک نظر وال کلاک پر ڈالتی، اس کے قریب آ بیٹھی۔

"کوئی ٹیبلٹ وغیرہ لی آپ نے؟"

"نہیں یار! سارا دن اتنا مصروف رہا کہ اپنے لیے وقت ہی نہیں مل سکا۔"

"دنیا کے پہلے پولیس والے ہیں آپ، جن کے پاس خود اپنے لیے ہی وقت نہیں ہے۔" شجاع کھل کر ہنسا تھا۔

"بہت بدظن ہو پولیس والوں سے...... پوچھ سکتا ہوں کیوں؟"

"نہیں...... گڑیا کہاں ہے؟"

"بابا کے پاس چھوڑ کر آیا ہوں، وہ سُلا لیں گے، تم سر دباؤ میرا...... شاباش۔"

خود اس کے ہاتھ تھام کر شجاع نے اپنی پیشانی پر دھر دیے تھے۔ امامہ کو فوراً محسوس ہو گیا تھا کہ سر درد کے ساتھ ساتھ اس وقت وہ بخار کی لپیٹ میں بھی تھا۔

"آپ کو تو بخار بھی ہے اور جانے کب سے ہے، انسان کو اتنا بے پروا بھی نہیں ہونا چاہیے، خود سے۔"

"اچھا یار! پلیز کلاس بعد میں لے لینا، ابھی زور زور سے سر دباؤ، شدید درد ہو رہا ہے۔"

"کیا کوئی ڈیپریشن ہے؟"

"نہیں......"

"پھر سر میں درد کیوں ہو رہا ہے؟ اور یہ آج آپ کے ساتھ کون لوگ تھے جو گھر آئے تھے۔"

کب سے ذہن میں کلبلاتا سوال بالآخر زبان پر آ ہی گیا تھا۔

"کولیگز تھے میرے۔ کسی کیس کے سلسلے میں اکٹھے ہوئے تھے۔"

امامہ ابھی اگلا سوال پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ اس کے سیل کی بزر بج اُٹھی۔ اسکرین پر چمکتے ارسلان حیدر کے نام کو دیکھتے ہی اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ شجاع کی پیشانی پر دھرے ہاتھ، لمحے میں جیسے بے جان ہوئے تھے۔

"کیا ہوا؟" شجاع سے اس کی کیفیت مخفی نہیں رہ سکی تھی۔

وہ فوراً نفی میں سر ہلا گئی۔

"ک...... کچھ نہیں...... ایک دوست کی کال ہے، سُن لوں؟"

’’گولی مارو یار! کچھ دیر ٹھہر کر خود اسے کال کر لینا۔‘‘

وہ تھکا ہوا تھا، سارا جسم جیسے بخار نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا، ایسے میں امامہ کے نرم ہاتھوں کی حرارت کیسا سکون بخش رہی تھی اسے۔ لہٰذا وہ اس کے ہاتھ تھام کر اسے اُٹھنے سے روک گیا۔

فون بج بج کر بند ہو گیا تھا۔ امامہ کا دل بے کل ہو کر رہ گیا۔ اس کی دھڑکنیں معمول پر آنا بھول چکی تھیں۔ بے دلی سے وہ پھر اس کا سر دبانے کی کوشش کرنے لگی تبھی بیل دوبارہ پھر بجی تھی۔

’’سوری...... مم...... میں...... ابھی آتی ہوں، بہت ارجنٹ کال ہے پلیز۔‘‘

اس بار وہ کسی اسپرنگ کی طرح فوراً اُٹھی تھی، اتنی تیزی سے کہ شجاع کو اسے روکنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔

’’امامہ! میرے سر میں بہت درد ہے یار!‘‘

اس نے عقب سے دہائی دی تھی۔ مگر وہ نظر انداز کر گئی۔

’’آتی ہوں ناں ابھی...... صرف پانچ منٹ۔‘‘

وہ سرعت سے کہتی کمرے سے باہر نکل آئی تھی، شجاع بے بس سا اسے دیکھ کر رہ گیا۔

’’السلام علیکم!‘‘

جونہی اس نے ہال کمرے سے نکل کر کال پک کی، ارسلان کی خوش گوار آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

’’وعلیکم السلام! مل گئی فرصت کال کرنے کی؟‘‘

’’سوری یار! کچھ بزی تھا یہاں، کیا کر رہی ہو؟‘‘

’’کچھ نہیں، کب سے فری ہی تھی، تمہاری کال کا انتظار کر رہی تھی۔‘‘

’’اس کا مطلب ہے مجھ سے واقعی کوتاہی ہو گئی؟ اگین سوری یار!‘‘

’’کوئی بات نہیں، کچھ پریشانی کم ہوئی تمہاری کہ نہیں؟‘‘

’’تمہارے ہوتے پریشان کیسے رہ سکتا ہوں میں؟ بہت بہت شکریہ مُون۔‘‘

’’بس...... کوئی ضرورت نہیں فارمیلٹی نبھانے کی...... یہ بتاؤ پاکستان کب آ رہے ہو؟‘‘

’’بہت جلد، اب تو خود میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا مُون!‘‘

’’جھوٹ......؟‘‘

’’نہیں یار! تمہاری قسم!‘‘

’’پھر...... چند روز پہلے کیا ہو گیا تھا؟‘‘

’’دماغ خراب ہو گیا تھا میرا...... اور کچھ نہیں۔‘‘

بات سے بات نکلی تھی اور دور تک پھیلتی گئی تھی، امامہ بھول ہی گئی تھی کہ شجاع کی طبیعت ٹھیک نہیں اور اس وقت اسے اس کی ضرورت تھی۔

❋❋❋

وصال شامیں گلاب لمحے، بھلا نہ دینا خیال رکھنا
یہ کاغذوں پہ بکھرتے جذبے، بھلا نہ دینا خیال رکھنا

خود اعتمادی کے جو ستارے چمک رہے ہیں میری جبیں پر
تم ان ستاروں کو بے رخی سے ہَوا نہ دینا خیال رکھنا
وفا کی مٹی سے میں نے ان کو کیا ہے تعمیر یاد رکھنا
محل بھروسے کا میرے ہمدم گرا نہ دینا خیال رکھنا

"تم بہت خوب صورت ہو، بہت شان دار ہو، مگر میرے دل کے مکین نہیں ہو۔ تم اپنی اس سحر انگیز شخصیت کے ساتھ کسی بھی اچھی سے اچھی لڑکی کا خواب اور تمنا ہو سکتے ہو، کوئی بھی لڑکی تمھیں پاکر سب کچھ بھلا سکتی ہے، مگر امامہ حسن نہیں کیونکہ تم اس کا خواب اور تمنا نہیں ہو، تمہاری اس سحر انگیز شخصیت کے ساتھ میرا تعلق، دل کا نہیں، مجبوری کا ہے۔ میں محبتوں کے معاملے میں ایمان دار لڑکی ہوں شجاع حسن اور میں اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔ تم جو بھی ہو، جیسے بھی ہو، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے شجاع حسن! محبت نہیں ہے۔ محبت مجھے صرف اسی شخص سے ہے جس کے پاس میرے لیے سوائے دُکھوں اور آزمائشوں کے اور کچھ بھی نہیں۔ میں چاہ کر بھی اس کی تمنا کو دل سے نہیں نکال سکتی، کیونکہ وہ شخص میری آنکھوں کا پہلا خواب ہے اور میرے جیسے محبت میں ایمان دار لوگوں کے لیے ہر نئے موڑ پر ایک نئے کردار کے ساتھ چلنا بہت مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کر رہی شجاع حسن، کیونکہ جس رشتے میں تم نے اور تمہارے گھر والوں نے آناً فاناً مجھے باندھ دیا ہے وہ کسی بھی طور سے میری خواہش نہیں تھا۔ میں تو بے بس ہوں، کبھی خدا کے سامنے اور کبھی تقدیر اور کبھی حالات کے سامنے۔ کوئی مجھے بدکردار کہتا ہے تو کہے۔ کوئی میری ذات، میری خودی پر سوال اٹھاتا ہے تو اٹھائے۔ مجھے کسی کی پروا نہیں، وہ شخص جو میرے دل کا مکین ہے، چاہے وہ تمہارے قدموں کی دُھول کے برابر نہ سہی، مگر کوئی میری نگاہ سے دیکھے تو مجھے تم اس کے پاؤں کی دُھول کے برابر نہیں لگتے۔ وہ جو ہے، جیسا ہے میری خواہش، میرا خواب ہے اور سچی محبت کرنے والے اپنے خوابوں کا سودا کبھی نہیں کرتے، یہاں تک کے ٹوٹ کہ بکھر جائیں۔" کمرے کی کھڑکی سے چھن چھن کر ہَوا اندر آ رہی تھی اور وہ ہر بات سے بے خوف وخطر ،دں پر خوش کن مسکراہٹ سجائے اپنی ڈائری کے کچھ اور صفحات کے سپرد اپنی سوچ کر رہی تھی۔

شجاع اس کی واپسی کا انتظار کرتے کرتے سُو چکا تھا۔ تاہم امامہ اتنی خوش تھی کہ اسے شجاع حسن کو پہنچنے والی دلی تکلیف کا ذرا سا احساس بھی نہ ہو سکا۔ ارسلان حیدر نے اسے خوش خبری سنائی تھی کہ وہ بہت جلد پاکستان واپس آ رہا ہے، صرف اور صرف اس کے لیے اور وہ جو اسے کھو دینے پر ملول تھی، اس خبر کے بعد جیسے پھر سے جی اُٹھی۔ شجاع حسن کا شان دار محل، بینک بیلنس، پُرکشش ملازمت اور اس کی شان دار شخصیت کچھ بھی تو اس کے لیے اہم نہیں تھا۔ صرف ایک پل میں وہ ہر چیز کو ٹھوکر مار سکتی تھی۔

اس روز دیر تک ارسلان حیدر سے بات کرنے کے بعد اس نے یہی سوچا تھا۔

❃❃❃

عباد کی معرفت بُریرہ کو انوشہ کے ساتھ پیش آنے والے حادثات کی خبر ملی تھی اور وہ جو شدید غم و غصے میں مبتلا، اس سے علیحدگی کا فیصلہ کیے ہوئے تھی، دل سے ساری رنجشیں بھلا کر، سائلہ بیگم کی

ناراضگی کی پروا کیے بغیر پہلی فلائٹ سے شاہ زر کے پاس پاکستان پہنچ گئی۔
آئی سی یو میں زندگی اور موت کی جنگ لڑتی انوشہ رحمٰن اپنے سارے رشتے گنوا کر بالآخر زندگی جیت گئی تھی۔ اِدھر اس کی حالت خطرے سے باہر ہوئی اور اُدھر شاہ زر نے اس کے پیاروں کی لاشوں کے ٹکڑے وصول کیے تھے۔ عباد اس کے ساتھ تھا اور ہر کام میں وہی اس کی مدد کر رہا تھا۔ شاہ زر کی تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟
رات گئے زاور حسین، صدف بیگم اور اپنی جان سے پیاری لاڈلی بہن شافیہ کا مُردہ وجود لے کر گھر پہنچا تو بُریرہ کو اپنا منتظر پایا۔ وہ پہلے سے بے حد کمزور دکھائی دے رہی تھی۔ شاہ زر کی آنکھوں کے گوشوں میں اسے دیکھ کر سرخی اُتر آئی۔ تاہم عباد نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور اسے شاہ زر کے بیڈروم میں لے آیا۔
''بھابی! ابھی شاہ سے کسی قسم کی بات مت کیجیے۔ وہ ذہنی طور پر بہت پریشان ہے۔ اس وقت کسی بھی قسم کا تناؤ اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ابھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں تو بہتر ہے۔''
''لیکن عباد میں......''
''میں آپ کی کیفیت سمجھتا ہوں مگر فی الحال آپ کو دانش مندی سے کام لینے کی ضرورت ہے پلیز۔'' تھکا تھکا سا وہ خود بھی بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ بُریرہ نے دونوں ہاتھوں میں سر چھپا کر خود کو بیڈ کی طرف دھکیل دیا۔
وہ ابھی کمرے سے نکلا تھا کہ اس کے موبائل پر صاعقہ کی کال آ گئی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل نے ایک دھڑکن مِس کی، تاہم وہ اس وقت اس سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا سیل آف کر کے دوبارہ جیب میں ڈالنے کے بعد، شاہ زر کے پاس چلا آیا۔
وہ رات بُریرہ کے ساتھ ان دونوں نے بھی آنکھوں میں ہی کاٹی تھی۔ اگلی صبح نزہت بیگم اور جمال صاحب کے ساتھ ساتھ صدف بیگم کے بچے اور شوہر بھی پاکستان پہنچ گئے تھے۔ ایک کہرام تھا جو شاہ ہاؤس کے در و دیوار کے اندر بپا تھا، کتنی بہت سی زندگیاں ان تین بے جان نفوس سے جڑی تھیں۔
بُریرہ کی اپنی آنکھیں مسلسل آنسو بہا رہی تھیں، جب کہ شاہ زر یوں پتھر بنا ساکت نظروں سے سب کو دیکھ رہا تھا، جیسے اس کے حواس کام کرنا ہی چھوڑ گئے ہوں۔
اتنی سخت آزمائش زندگی کی؟ ایسا کڑا امتحان؟
اسے لگا وہ اب زندگی میں کبھی مسکرا نہیں سکے گا۔ اس روز کا ڈھلتا سورج، صدف بیگم، زاور حسین اور شافیہ کے مُردہ جسموں کو مٹی کا پردہ دیتا، بے حد اداس ڈوبا تھا۔
عبدالصمد کی تدفین اس سے ایک روز پہلے ہی ہو گئی تھی۔ سب کا اپنا غم تھا، اپنے جذبات تھے۔ مگر وہ ننھا سا ایک وجود جس کا جنم انوشہ رحمٰن کے بطن سے ہوا تھا۔ اس کے لیے وہ تمام صورت حال سخت تکلیف کا باعث بنی تھی۔
کسی کو بھی اس ننھے سے وجود کا خیال نہیں رہا تھا، جو بھوک سے روتے روتے، جانے کب کس

لمحے آنکھ بچا کر بیرونی گیٹ پار کر گیا تھا۔

❀❀❀

''تم نے کسی انسان کو وحشی ہوتے دیکھا ہے؟''

اسے چھنو کی معرفت میران شاہ کے گھر والوں کی گاؤں شاہ والا سے عدم موجودگی کی خبر ملی تھی اور وہ اس پر بے حد مشتعل ہو کر سانول شاہ کی حویلی کی طرف آئی تھی۔ جب حویلی کے کشادہ صحن میں ہی اس کا سامنا سانول شاہ سے ہو گیا اور وہ اس سے الجھ پڑی۔

''تم وحشی درندے ہو سانول شاہ، انتہائی غلیظ انسان۔''

شاہ والا میں وہ پہلی لڑکی تھی جس نے حویلی کے اندر کھڑے ہو کر، سانول شاہ کے سامنے یہ بات کہی تھی اور اس نے بہت ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے رخ پھیر کر، اپنے ملازمین کے سامنے اس تذلیل کو برداشت کیا تھا۔

''افضل......'' اگلے ہی پل دہاڑ کر اس نے اپنے ڈرائیور کو آواز دی، مگر بدقسمتی سے وہ اس وقت بیت الخلاء میں تھا اور اس کے حکم کی فوری تعمیل میں آناً فاناً حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ پانچ جوان بیٹیوں کے اس ہارے ہوئے ادھیڑ عمر شخص کو اپنی غیر متوقع طلبی پر بیت الخلاء سے حویلی کے کشادہ سرخ اینٹوں کے شفاف صحن تک پہنچتے میں ناچاہتے ہوئے بھی پانچ سے دس منٹ لگ گئے اور یہ اس کا ایسا ناقابل معافی جرم تھا کہ جس کی فوری سزا جیسے حویلی کے چوہدری پر فرض ہو گئی تھی۔

''جی سرکار...... آپ نے یاد فرمایا......؟'' کندھے پر پڑے صافے سے گیلے ہاتھ خشک کرتا وہ بھاگ کر وہاں تک پہنچا تھا مگر شاید اسے تاخیر ہو چکی تھی۔ سانول شاہ نے اسے دیکھ کر منہ سے ایک بھی لفظ نکالے بغیر اپنا پسٹل نکالا اور یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیئے۔

ایک لمحے میں وہاں جیسے ہر چیز ساکت ہو گئی۔ انزلہ کی آنکھیں خوف سے اُبل آئیں۔ پانچ جوان بیٹیوں کا باپ، پچھلے سات سال سے بے دام غلام کی طرح حویلی والوں کی خدمت کرنے والا یہ ادھیڑ عمر شخص اپنی تمام تر جاں نثاری، وفاداری کا صلہ ان گولیوں کی صورت پا چکا تھا۔ سرخ اینٹوں کے فرش پر اس کی تڑپتی ہوئی لاش کو، سانول شاہ نے پاؤں رکھ کر دباتے ہوئے سرد کیا تھا۔

انزلہ کو لگا جیسے وہ مٹی کی دیوار کی مانند پل میں ڈھے جائے گی۔

افضل ڈرائیور کا بیٹا جو ان دنوں شہر سے چھٹیوں پر گاؤں آیا ہوا تھا۔ فوراً اطلاع پر حویلی پہنچا اور یہی وہ وقت تھا جب سانول شاہ نے بُت بنی انزلہ سے پوچھا۔ ''کیا تم نے کسی انسان کو وحشی ہوتے دیکھا ہے؟''

وہ دَم سادھے خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ جب وہ پھر سے رُخ پھیر کر افضل ڈرائیور کے جواں سال بیٹے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''لے جاؤ اپنے باپ کی لاش اٹھا کر اور کہہ دینا گھر والوں سے کسی نامعلوم شخص کی گولیوں کا شکار ہو گیا ہے یہ......''

کتنی کرختگی تھی اس کے لہجے میں۔ افضل ڈرائیور کا بیٹا چیخ اٹھا۔

''نامعلوم شخص کیوں، تمہارا نام لوں گا۔ تم نے مارا ہے میرے باپ کو۔''

"ٹھیک ہے میرا نام لے دینا۔ پھر اس کے بعد اپنی دونوں جوان بہنوں کو یہاں میرے پاس حویلی بھیج کر خود اپنے باپ کے قتل کے الزام میں ذرا حوالات کی سیر بھی کر آنا۔ تم گندی نالی کے کیڑے لوگ ترس کے قابل نہیں ہو۔"

وہ تناؤ کا شکار اب بھی غصے کی زد میں تھا۔ تبھی وہاں موجود ملازمین میں افضل ڈرائیور کا چھوٹا بھائی اور اس جواں سالہ لڑکے کا چاچا فضل نامی وہ شخص ہاتھ جوڑ کر سانول شاہ کے سامنے آ کھڑا ہوا، جو اسی حویلی میں چوکیداری کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔

"نہیں سرکار! یہ بچہ ہے اسے کیا پتا۔ معاف کر دیں اسے۔ مم...... میں خود بتا دوں گا سب کو کہ اسے باہر سے (دوسرے گاؤں سے) گولی لگی ہے۔" وہ رو رہا تھا۔ سانول کی آنکھوں کی سرخی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

"بچا کر رکھنا اسے مجھ سے۔ یہ نہ ہو باپ کی طرح یہ بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔" اس نے ایک تیکھی نظر افضل ڈرائیور کے نوعمر بیٹے پر ڈالی تھی اور پھر پلٹ گیا۔

حویلی کے شان دار در و دیوار اور اس کے بے زبان، بے بس ملازمین کے لیے وہ حادثہ وہ ناگہانی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ معمولی معمولی باتوں پر طاقت کے نشے میں چُور اس حویلی کے مکین آئے روز "ایسے" کھیل تماشے کرتے رہتے تھے مگر انزلہ شاہ کے لیے وہ سانحہ کسی شاک سے کم نہیں تھا۔ وہ حویلی والوں کی بربریت سے بے خبر نہیں تھی، وہ جانتی تھی کہ سانول شاہ اور اس کے بھائی کتنے ظالم ہیں مگر یوں بے قصور، بے جرم کوئی کسی کی جان کیسے لے سکتا تھا؟

وہ جو بازی میں اُڑنے والے کبوتروں کی بے بسی اور موت پر گھنٹوں ملول رہتی تھی۔ اسی کی آنکھوں کے سامنے کیسے محض چند لمحوں میں ایک چلتے پھرتے صحت مند انسان کو مار کر سُلا دیا گیا اور کیسی قیامت تھی کہ اس ظلم پر اس بدنصیب شخص کے گھر والوں کو رونے کی اجازت بھی نہ تھی۔

سرخ اینٹوں کے اس صاف ستھرے کشادہ فرش سے اب اس شخص کی لاش اٹھائی جا چکی تھی، جس کے پڑھے لکھے جواں سال بیٹے کو اس کا چاچا روتے ہوئے منت کر کے چپ چاپ واپس لے گیا تھا۔ انزلہ شاہ کی ساکت نگاہوں نے دور تلک ان کی برستی آنکھوں کو دیکھا اور پھر اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے چیخ اُٹھی۔

"اللہ......! تُو نے دیکھا تیرے فرشتوں سے برتر مٹی کے انسانوں کے ساتھ، یہاں اس دھرتی پر کیا ہو رہا ہے۔ تُو نے تو موت کے بعد جنت دوزخ کی جزا و سزا رکھی تھی، یہاں دیکھ تیری خدائی میں یہ بدبودار مٹی سے بنے بے ایمان، بے ضمیر، سرکش انسان کیسی کیسی دوزخ کھودے بیٹھے ہیں۔ یہاں ایک نظر اِدھر ڈال میرے مالک اور دیکھ یہ کیسے اپنے دونوں جہاں داؤ پر لگائے ہوئے ہیں، یومِ حساب سے پہلے ہی محشر تیار کر رکھا ہے انہوں نے۔ اب ان فرعونوں کو غرق کرنے کے لیے کون سا موسیٰ آئے گا؟ کون سبق سکھائے گا انہیں، تیری ذات کے سوا۔" پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے اس لمحے وہ خود کو قطعی بے بس محسوس کر رہی تھی۔

اگلے روز گاؤں مراد شاہ میں بہزاد علی مراد کے سامنے بیٹھی ہوئی وہ پھر رو پڑی۔

"حوصلہ رکھیں انزلہ! اللہ کی عدالت میں ظالم اور سرکش انسانوں کے لیے بڑا سخت عذاب اور

سزا ہے، تم کیا سمجھتی ہو، یہ وڈیرے، چوہدری، یہ اعلیٰ عہدوں پر جمے بیٹھے مست ہاتھی، یہ سب اس واحد و لاشریک کی گرفت سے بچ جائیں گے؟ نہیں۔ اپنے ہر عمل، ہر گناہ، ہر ظلم کے جواب دہ ہوں گے۔ یہ اس پاک و بے نیاز ذات کے سامنے کہ جس کے ہاں نہ کسی کی سفارش چلتی ہے، نہ پاور کام آتی ہے۔ یہ ظلم جو یہ دوسرے بے بس لوگوں پر ڈھاتے ہیں۔ حقیقت میں یہ انہی کی جانوں پر آ پڑے گا۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔

انزلہ کے دکھ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بہزاد ایک نظر اس کے زرد نم چہرے پر ڈالنے کے بعد اُٹھ کھڑا ہوا۔ قریبی درخت پر اس وقت چہکتے پرندوں کی چہکار اسے بے حد بھلی لگ رہی تھی۔

"بہت غم ہیں اس دنیا میں انزلہ۔ کس کس پر روئیں گی آپ؟ آپ تو ملک سے باہر تھیں، آپ کو کیا خبر کہ ابھی کچھ ماہ قبل یونہی طاقت کے نشے میں چُور ایک بے ضمیر، بے ایمان مست ہاتھی نے یہاں اس سرزمین پر کیسا قہر بپا کیا تھا۔" وہ رخ پھیرے کھڑا تھا۔ انزلہ جان ہی نہ سکی کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے۔

"قہر......؟"

"ہُوں...... معصوم، بے قصور جانوں پر قہر۔"

"کیسے......؟" وہ اب الجھی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"بالکل ویسے ہی، جیسے کل سانول شاہ نے برپا کیا۔"

"میں سمجھی نہیں؟"

"آپ سمجھ بھی نہیں سکیں گی انزلہ۔ بہت سے لوگ نہیں سمجھ سکے۔ ہر کسی کے لیے سب کچھ سمجھنا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے۔ خاص کر ان حالات میں، جب آپ کو روشن خیالی کی زہر آلود ہَوا چُھو رہی ہو۔"

"آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"اس قوم کی، اس قوم کے روشن خیال لوگوں کی۔ جن کے لیے وہ قہر ایک تماشا تھا۔ سیکڑوں جانوں کی وہ بے حرمتی و قربانی، جن کے لیے محض ایک سزا تھی، کوئی نہیں جانتا وہاں اس چار دیواری کے اندر کیسا قہر برپا ہوا۔ کیسے مقدس کتاب کے اوراق جو خوش بُو بن کر سینوں میں اُترنے کے لیے تھے، انہیں قدموں تلے روند دیا گیا۔ کیسے ساری قوم کو گمراہ کر کے اپنے ایمان اور ضمیر کی قیمت چُکاتے ہوئے صرف ایک مست ہاتھی نے اپنے اس قہر کو جائز منوالیا۔ یہاں اس ملک میں کتنے ہی روشن خیال ملیں گے تمہیں۔ جو اس قیامت، اس درد پر تمہارے دکھ کو تمہارا پاگل پن کہیں گے۔ یہ ایسے ہی لوگوں کا ملک ہے انزلہ۔ یہاں درد صرف اسی کی میراث ہے کہ جس کے سینے پر گھاؤ لگے، آپ کے اور میرے جیسے لوگوں کا گزارا نہیں ہے یہاں۔" رُخ پھیرے کھڑا وہ اب جیسے کچھ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انزلہ اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟ لال مسجد کی؟"

"ہُوں......"

"آپ کو پتا ہے وہاں کیا ہوا تھا؟ قرآن و دین کی آڑ میں وہ لوگ کیا کر رہے تھے؟" اس بار اس کی آواز بلند تھی۔ بہزاد شاہ نے گردن موڑ کر سرد آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ لوگ غلط تھے، دہشت گرد تھے، آپ نے سنا نہیں وہاں اس مسجد میں کتنا اسلحہ چھپا رکھا تھا انہوں نے۔'' یکسر بدلی ٹون کے ساتھ اس نے بہزاد علی مراد کی شہ رگ پر پاؤں رکھا تھا۔

''چپ کر جاؤ انزلہ۔ بالکل چپ۔ مت کرو وہ بات جس کا علم تمہارے پاس نہیں، مت آواز دو خدا کے قہر کو۔ کہا تھا ناں میں نے یہ ایسے ہی لوگوں کا ملک ہے۔ گونگے، اندھے، بہروں کا۔ اسی لیے تو یہ سب ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔ کیا جانتی ہو تم ان لوگوں کے بارے میں؟ صرف وہی، جو عاقبت نااندیش لوگوں نے تمہیں بتایا اور دکھایا، صرف وہی جو تمہاری ظاہری آنکھوں نے دیکھا۔ کانوں نے سنا؟'' وہ دہاڑ رہا تھا۔ انزلہ خاموشی سے اس کے سرخ چہرے پر نظریں جمائے کھڑی رہی۔

''بہت دعوے کرتی ہو تم انسانی حقوق کے، لوگوں سے بھلائی کے، اپنے دین سے لگاؤ کے، مگر بہت کھوکھلے دعوے ہیں یہ۔ بہت سے لوگ آج تک جناح کو غاصب کہتے ہیں، غلط کہتے ہیں، کیا وہ غلط تھے؟ کیا ان کے نظریات، ان کی سوچ، ان کے اندیشے غلط تھے؟ نہیں، انہیں جو نظر آ رہا تھا وہ بہت خوف زدہ کر دینے والا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے اس چھوٹی سی جنت کے مکینوں کو نظر آ رہا تھا۔ اندر کی کہانی کا تمہیں کیا پتا انزلہ۔ وہ گولیوں سے چھلنی، بارود میں رچی دیواریں ان احوال کو بیان نہیں کر سکتیں، جو اس چار دیواری کے مکینوں نے اپنی جانوں پر جھیلے ہیں۔ جاؤ کہہ دو جا کر اپنے اعلیٰ عہدے داروں سے، میں نہیں ڈرتا ان سے، ان کے ڈر سے سچ کہنے سے، کیونکہ میں نے بہت کچھ کھویا ہے وہاں۔'' صرف ایک لمحے کے لیے اس نے رک کر اپنا سانس ہموار کیا تھا۔ ''تم کہتی ہو وہ دہشت گرد تھے، وہ کیسے دہشت گرد تھے انزلہ، جو آخری لمحے تک امن کا پرچم بلند کرتے رہے، نفاذ اسلام کے لیے اپنی رگوں میں جوش مارتے قوتِ ایمانی کے سبب، سب کی بچت، سب کو اللہ کے عذاب سے بچانے کے لیے، ظلم اور بدکرداری کے خلاف ڈٹ گئے۔ کیسے دہشت گرد تھے وہ جو اپنے ہی اسلامی بھائیوں کی گولیوں سے خوف زدہ ٹوٹے کواڑوں والے دروازوں پر بیٹھ کر صرف اپنی عصمت اور ایمان کی حفاظت کے لیے رات رات بھر مصلے پر بیٹھ کر روتے رہے اور فتح کی دعائیں کرتے رہے، بھوکے، پیاسے، بارش کے پانی اور درختوں کے پتوں کو نگلتے رہے، کیا سمجھتی ہو تم فتح صرف مخالفین کو پچھاڑنے کا نام ہے۔ نہیں...... کبھی کبھی جانیں لٹا کر ظلم اور بے عدل حکمران کے سامنے کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے قربان ہو جانے کا نام بھی فتح ہے۔ کوئی کچھ بھی سمجھے، کچھ بھی کہے، جنہیں اپنے رب کے حضور سرخرو ہونا تھا وہ تو ہو گئے مگر وہ لوگ جنہوں نے وقت کے یزید کا ساتھ دیا۔ میں نے ان لوگوں میں سے ایک شخص کو ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر بہت عبرت ناک حال میں مرتے دیکھا ہے انزلہ۔ جاننا چاہو گی وہ شخص کون تھا؟'' انزلہ سانس روکے اسے سن رہی تھی جب اس نے اچانک پوچھ لیا۔

''ہوں......''

''دوست تھا میرا، بہت عزیز، بچپن کا، بہت مجبور تھا۔ بہت سے افسروں کی طرح ریزائن دے کر گھر نہیں آ سکتا تھا، کیونکہ باپ بستر پر پڑا تھا اس کا اور بہنیں ابھی بیاہی تھیں پھر کچھ روشن خیال بھی تھا وہ اسے بھی بہت سے شکوے تھے ان سیاہ برقعوں میں سرتاپا لپٹی جنتی شہزادیوں سے، کیونکہ جس مساج سینٹر کی چینی عورت کو وہ پردے دار لڑکیاں بے عزت کر کے لے کر گئی تھیں، اس سینٹر میں وہ بھی

باقاعدگی سے مالش کروانے جاتا تھا۔ منہ کو لگی شراب کوئی چھین لے تو غصہ آ ہی جاتا ہے۔ جیسے سجاد کو آ گیا تھا، میرے دوست کو۔" بہزاد علی مراد کی نگاہیں اب دور کچی پگڈنڈی پر جیسے کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ "اپنی موت سے پہلے بہت سے راز منکشف کیے تھے اس نے۔ وہاں اس چار دیواری کے اندر کیا ہوا، کیسے ہوا، سب جانتا تھا وہ۔ تم اسے دیکھتی ناں انزلہ تو ساری عمر اپنے انسان کہلائے جانے پر شرمسار رہتیں، جیسے میں رہتا ہوں۔" چند لمحوں کے لیے گہری سانس بھر کر وہ پھر خاموش ہوا تھا۔ جب اس نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے بھی اور اپنے رب سے بھی کہ مجھے اصل حقیقت کا پتا نہیں تھا۔ میں نے جو سُنا، جو پڑھا اسی کے مطابق بات کی۔ وگرنہ وہ واحد ولاشریک جانتا ہے انزلہ شاہ مر سکتی ہے مگر ظالم لوگوں کا ساتھ کبھی نہیں دے سکتی۔" بہزاد نے اس کی معذرت پر سرسری سی نظر اس کے جھکے سر پر ڈالی پھر نگاہ پھیر لی۔

"اماں جی انتظار کر رہی ہوں گی۔ میرا خیال ہے حویلی چلتے ہیں۔"

"جی!" اثبات میں سر ہلا کر وہ اس کے ساتھ زیرِ تعمیر اسکول کی عمارت سے نکل آئی۔

نیچے کچے فرش پر بیٹھے چھوٹے چھوٹے ننھے فرشتے گاہے بگاہے سر اٹھا کر اسے دیکھتے اور مسکراتے وہ ان سے نگاہ چُرا کر کچی پگڈنڈی پر چڑھ آئی جو سیدھی گاؤں مراد شاہ کی حویلی کو جاتی تھی۔

"بُرا نہ مانیں تو ایک سوال پوچھوں آپ سے؟" کچھ دیر سے خاموشی سے قدم اٹھانے کے بعد وہ بولی تو بہزاد نے اس کی طرف دیکھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ نے کہا، آپ نے وہاں اس چھوٹی سی خوب صورت دنیا میں بہت کچھ کھویا ہے، کیا کھویا ہے؟"

بہزاد کو گمان نہیں تھا کہ وہ اس سے یہ سوال پوچھے گی تبھی وہ رکا تھا۔

"بہت کچھ، صرف ایک زندگی بچ گئی، باقی سب کچھ کھو گیا، سب کچھ......" وہ تحمل و برداشت والا شخص تھا مگر اس لمحے اس کی آنکھوں میں ایسی ویرانی تھی کہ انزلہ چاہنے کے باوجود دوبارہ سر اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ سکی۔ کچھ دور کا سفر مزید خاموشی کی نذر ہو گیا تھا جب وہ بولا۔

"آپ چاہیں تو میں اس ڈرائیور کے قتل کی ایف آئی آر درج کروا دیتا ہوں۔"

"نہیں...... جب اس کا کوئی فائدہ ہی نہیں تو کیوں زحمت میں پڑیں آپ۔"

"فائدہ تو ہو سکتا ہے، اگر کوئی اس چوہدری کے خلاف گواہی دے دے تو۔"

"اور یہ گواہی دے گا کون؟"

"کوئی بھی دے سکتا ہے، چاہیں تو آپ بھی بننے سکتی ہیں۔"

"میری گواہی سے کیا ہوگا، کون سنے گا میری۔ آپ ہی کا تو کہنا ہے کہ یہ ملک اندھوں، گونگوں اور بہروں کا ہے۔ پھر صرف ایک میری گواہی سے کیا ہوگا۔" وہ افسردہ تھی بے حد افسردہ......

بہزاد شاہ نے اس کی مایوسی پر گہری سانس بھر کر اپنے قدموں کی رفتار مزید بڑھا دی کہ ابھی کھانا کھا کر اسے انزلہ شاہ کو واپس گاؤں شاہ والا بھی چھوڑنے جانا تھا۔

❁❁❁

کشادہ آنگن میں ڈھیر ساری چڑیاں چوں چوں کرتی، صحن کے کونے کھدروں سے اپنے حصے کا رزق تلاش کر رہی تھیں۔ جب اس کی آنکھ ایک عجیب سی چنگھاڑتی آواز کے شور سے کھلی۔

''میرے میاں کی کمائی درختوں سے نہیں لگی کہ توڑ توڑ کر آپ کو کھلاتی رہوں۔ سارے دن سوائے مصلے پر بیٹھ کر دانے گھمانے کے اور کوئی کام ہے آپ کو۔ جو آئے روز کبھی بازو تڑوا لیتی ہیں تو کبھی ٹانگ......''

وہ غور نہ بھی کرتی تب بھی جان لیتی کہ یہ آواز کس کی ہے، مگر اس وقت وہ کیوں چنگھاڑ رہی تھی، گوری کی سمجھ سے باہر تھا۔ تبھی بی اماں کی اکلوتی بہو پھر چلائی تھی۔

''اتنی مہنگائی میں، اتنا بھی مل جاتا ہے، بہت ہے۔ ان لوگوں کی طرف دیکھیں جن کے نہ گھر بار ہیں نہ ایک وقت کھا کر دوسرے وقت ملنے کی امید۔ آپ تو پھر بھی نوابوں کی طرح رہ رہی ہیں بیٹے کے گھر میں اور نہ صرف خود عیش سے رہ رہی ہیں بلکہ اِدھر اُدھر کے لوگوں کو بھی لا کر میرے سر پر مسلط کر رکھا ہے۔''

گوری کو اس گھر میں دوسرا ہفتہ تھا اور اتنے سے دنوں میں وہ ایک بار بھی نہ تو سکون سے سو پائی تھی نہ ٹھیک سے کھا پائی تھی، پھر بھی طعنے تھے کہ کم نہ ہوتے تھے۔ پچھلے دو روز سے وہ بخار کی لپیٹ میں تھی۔ سارا بدن درد سے چُور تھا، مگر وہاں سوائے بی اماں کے دوسرا کوئی ہمدرد نہیں تھا اس کا۔ جان لٹانے والے رشتے تو کب کے خاک اوڑھ کے سُو چکے تھے۔

تیز بخار سے جلتی آنکھیں تھوڑی ہی دیر میں تھک کر اس نے پھر بند کر لی تھیں مگر آنکھیں بند کر لینے سے دل کو چیرتی آواز نہیں رکی تھی۔

''میرا منہ کیا دیکھ رہی ہیں اب۔ کھانا ہے تو کھائیں نہیں تو بے شک چھوڑ کر اٹھ جائیں۔ دیکھتی ہوں میں پردیس میں بیٹھا بیٹا جب آ کر اپنے ہاتھوں سے کھلائے گا، ہونہہ......''

بند آنکھوں کے باوجود وہ اس لمحے بی اماں کی بھیگی آنکھوں کے کناروں کو دیکھ رہی تھی اس عورت کی بھیگی آنکھوں کے کناروں کو کہ جس نے اجنبی سرزمین پر ایک نئے سچے دین کی خوش بُو کو سینے میں چھپائے، اپنے چھوٹے سے اکلوتے بیٹے پر اپنی ساری جوانی نچھاور کر دی تھی اور اب جب اس شجر کے پھل دینے کا وقت آیا تھا تو انہیں کانٹے کھانے کو مل رہے تھے۔ اگلے دس منٹ بعد وہ کمرے میں آئی تھیں۔

''اماں......'' گوری نے ان کی آہٹ محسوس کرتے ہی آنکھیں کھول دیں۔

''جی بیٹے......'' وہ اس کے پاس ہی چارپائی پر آ بیٹھیں۔

''کتنا صبر کریں گی اور پچھلے دو ہفتے سے میں آپ کو رات رات بھر جائے نماز پر بیٹھی عاجزی سے روتے دعائیں مانگتے دیکھتی رہی ہوں۔ اس عمر میں بھی کتنا خیال رکھتی ہیں آپ پردے کا، نہ کسی کا بُرا سوچتی ہیں نہ کرتی ہیں، پھر بھی اللہ آپ سے راضی نہیں۔ پھر بھی اس نے آپ کو اتنی کڑی آزمائش میں ڈال رکھا ہے، کیوں اماں؟''

''کیسی آزمائش بیٹی؟ یہ تو کرم ہے مجھ پر میرے مالک کا کہ اس نے مجھے صبر کی دولت دی، اچھائی اور بُرائی میں تمیز کا شعور دیا، کیسے شکر ادا کروں اس کی رحمتوں کا کہ جس نے مجھ حقیر وفقیر کو

کسی بھی مشکل اور امتحان میں ڈولنے نہیں دیا۔ وہ اللہ ہے بیٹی، کائنات کی ہر چیز کا مالک، اس نے جنت کے بدلے مومن مردوں اور عورتوں کے نفس خرید لیے ہیں۔ اس کا حق ہے اپنے بندوں پر کہ وہ جسے چاہے اتنی بڑی قیمت کے عوض انہیں آزمائے، پرکھے۔ ان کی خود سے محبت اور صبر کا امتحان لے۔ کسی انسان کی کیا مجال کہ وہ اس رحیم و رحمٰن، قہار و جبار، زبردست پکڑ والے اپنے معبودِ حقیقی سے ذرا سا شکوہ کرنے کی گستاخی کر سکے۔ وہ پاک و بے نیاز ہے مگر اپنے بندے کی شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اسی کا کرم ہے بیٹی کہ میں نے ہزار صعوبتیں اٹھا کر بھی عزت کے ساتھ جوانی بسر کر لی۔ وگرنہ شیر محمد کے بعد تو لگتا تھا میں کھلے آسمان تلے بالکل برہنہ ہو گئی ہوں۔ اس وقت اگر میرا خدا میرا ہاتھ نہ تھامتا تو میں کہاں جاتی، کیا کرتی؟'' وہ اپنے رب کی شکر گزار تھیں۔ گوری نے بیزاری سے رخ پھیر لیا۔

''کیا ملا آپ کو اماں؟ کچھ بھی نہیں۔ اس سے تو بہتر تھا کہ آپ اپنے ملک......''

''توبہ استغفار! ایسی بات بھول کر بھی منہ سے نہ نکالنا بیٹی! تجھے کیا پتا میرے پاس کیسی دولت ہے؟ جنہیں وہ اپنا کر لیتا ہے وہ دنیا کی معمولی معمولی چیزوں کے لیے نہیں جیتے، تجھے کیا پتا یہ آگاہی کیا ہے؟ یہ سرور، یہ سکون کیا ہے؟ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے ''تماشا'' نہیں بنایا۔ وگرنہ یہ بے خبری کا عذاب جانے کہاں لے جا کر ڈبوتا مجھے۔'' بی اماں کی باتیں، ہر بار اس کے سر کے اوپر سے ہی گزر جاتی تھیں، اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

''تُو نہیں جانتی، یہ مختصر لباس، بناوٹ، یہ زیادہ سے زیادہ دلوں کو لبھانے کی خواہش، مردوں کی نگاہ میں جچنے کا جنون، یہ کیسا عذاب ہے عورت کے لیے۔ کتنا گرا دیا ہے اس جنون نے عورت کو۔ تُو نہیں جانتی بیٹی کہ اللہ نے عورت کا وقار پردے میں رکھا ہے، جو اس کا خیال نہیں رکھتی۔ وہ پھسل جاتی ہے، بہت سی نگاہوں کے لیے تماشا بن جاتی ہے، وقت گزر جاتا ہے مگر اس کی زندگی کے دامن پر لگا ذرا سی بھول اور غلطی کا داغ کبھی نہیں دھلتا، دُھل بھی جائے تو اس کا نشان ہمیشہ باقی رہتا ہے اور داغ لگی کوئی بھی چیز کبھی اچھے داموں نہیں بکتی۔'' اپنے ہی آپ میں مگن وہ اسے کتنی گہری بات کہہ گئی تھیں۔

''مم...... میں نے زندگی میں کبھی ایمان کا سودا نہیں کیا اماں۔'' اسے لگا وہ جیسے اسے سمجھا رہی تھیں۔ تبھی فوراً وضاحت دی تو بی اماں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

''اللہ ربّ العزت تجھے اپنی پناہ میں رکھے بیٹی، سدا خوش رہ۔'' دعائیں دیتی وہ اٹھ گئیں تو گوری کے ذہن میں ان کا ایک ہی جملہ اٹک گیا۔

''جنہیں وہ (اللہ) اپنا بنا لیتا ہے وہ دنیا کی معمولی معمولی چیزوں کے لیے نہیں جیتے۔''

'پھر وہ کس کے لیے جیتے ہیں؟ کیا وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو جاتے ہیں؟ کیا بے نیاز ہو کر جینا آسان ہوتا ہے؟ اللہ صبر کیسے دیتا ہے؟ کیا ہر نقصان پر صبر کرنا آسان ہوتا ہے؟ بی اماں نے کیوں کہا کہ وہ بہت سکون میں ہیں؟ کیا جنہیں اللہ اپنا لیتا ہے انہیں کوئی غم نہیں ملتا؟ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہیں آتا؟ کیسے لوگوں کو اپناتا ہے اللہ؟ وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو اس کی نگاہ میں جچتے ہیں؟ وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں، جن کے دل اور نفس وہ جنت کے بدلے خرید لیتا ہے؟ عورت تو فتنہ ہے، شر

ہے، وہ کیسے کیچڑ میں رہ کر اپنا دامن بے داغ رکھ سکتی ہے؟'' کتنے سوال تھے جو اس وقت اس کے اندر سے اٹھ رہے تھے۔ ابھی چند دن پہلے اس نے بی اماں کو کہتے سُنا تھا۔

''پاکیزگی صرف عمدہ لباس اور پاک جسم کا نام ہی نہیں ہے، بلکہ ہر انسان کی سوچ، اس کا ہر خیال زبان سے نکلی ہر بات کا پاکیزہ ہونا بھی لازم ہے، روزِ محشر ہر انسان اپنے اچھے بُرے اعمال کا حساب دیتے وقت اپنی ہر سوچ، خیال اور زبان سے نکلی ہر بات کا جواب دہ بھی ہوگا'' اور وہ تو جانے کیا کیا سوچتی رہ گئی۔

ایک لمحے کے لیے اس کا پورا جسم پسینے میں نہا گیا، زندگی کی شاہراہ پر سنبھل سنبھل کر چلنے کے لیے ایک اچھے رہ نما کا ہونا کتنا ضروری تھا اس روز اس نے جانا تھا۔

❁❁❁

''ہیلو......'' وہ بے حد اداس، باورچی خانے میں بیٹھی چائے بنا رہی تھی جب سامنے الماری میں رکھا اس کا سیل فون بج اٹھا۔

صاعقہ نے چائے چھوڑ کر لپک کر موبائل اٹھایا تو سامنے اسکرین پر ''زین'' کا خوب صورت نام چمک رہا تھا۔ اس نے فوراً سے پیشتر دھڑکتے دل کے ساتھ بٹن پریس کر دیا۔

''السلام علیکم!'' اس کی ہیلو کے جواب میں عباد نے سلام کیا تھا۔ جب وہ شرمندہ سی بولی۔

''وعلیکم السلام...... میں ابھی آپ کو ہی یاد کر رہی تھی۔''

''خیریت؟''

''ہوں، آپ کا فون دو دن سے بند تھا۔ مجھے پریشانی ہو رہی تھی۔''

''وہ تو ہونی تھی، اِدھر میں جو پریشان تھا۔''

''کیوں! اللہ خیر کرے، کیا ہوا؟''

''بہت کچھ، بہت عزیز دوست کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا۔ خیر کیا کر رہی تھیں آپ؟''

''کچھ نہیں، بس فارغ ہی بیٹھی تھی۔''

''آپ کی والدہ کے علاج کا کیا ہوا؟''

''اب تو بہتر ہیں، میرا خیال ہے ڈاکٹر عارف نے صرف مجھے حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔''

''آپ کو اب لگا ہے، مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ بہر حال جان بچی سو لاکھوں پائے۔''

''اس کا کریڈٹ تو اللہ کے بعد آپ کو جاتا ہے۔''

''وہ تو ہے۔''

''اب کہاں ہیں آپ اور آپ کے دوست کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہے، میں تو ابھی پنڈی میں ہی ہوں، کیوں خیریت؟''

''ہوں خیریت ہی ہے، بس کچھ بات کرنی تھی آپ سے۔''

''تو کرو ناں یار! میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''ایسے فون پر نہیں، آپ جب کراچی آئیں تو بتایئے گا۔''
''آپ کہیں تو ابھی آ جاؤں؟''
''جی نہیں! اتنے اچھے نہیں ہیں آپ۔'' وہ ہنسی۔
عباد جیسے بے اختیار سا ہو گیا۔
''آپ کہہ کر تو دیکھیں، دو گھنٹے کے اندر اندر کراچی نہ پہنچ جاؤں تو کہنا۔''
''چلو ٹھیک ہے پھر، میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔''
''او کے! میں آ رہا ہوں۔'' صرف ایک لمحے میں فیصلہ کیا اس نے۔
صاعقہ سرشاری سی موبائل بند کر گئی۔
وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا نیچے ہال میں آیا تھا جب شاہ زر نے اسے پکارا۔
''کہاں جا رہے ہو؟''
''کراچی واپس جانا ہے یار، بہت ارجنٹ کام آ پڑا ہے۔''
''ٹھیک ہے، مجھے اسپتال چھوڑتے جاؤ۔''
''لیکن شاہ......''
''بحث کرنے کے لیے نہیں کہا ہے عباد۔ چھوڑ سکتے ہو تو بتا دو۔ نہیں چھوڑ سکتے تو میں خود چلا جاؤں گا۔''
''او کے چلو۔''
ایک لمحے میں ہتھیار پھینکے تھے اس نے، اوپر سیڑھیوں کے دہانے پر کھڑی بُریرہ انہیں جاتے دیکھ کر محض لب کاٹ کر رہ گئی۔

❋❋❋

انوشہ کی آنکھیں کھلی تھیں اور بہت بے تاثر نگاہوں سے کمرے کی چھت کو گھور رہی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے دنیا سے کنارہ کیے، آنکھ کھلتے ہی جو پہلی چیز اسے یاد آئی، وہ اس کا بچہ تھا۔ وہ کہاں ہو گا؟ کتنا رویا ہو گا میرے لیے؟ میں تو بدنصیب ہوں مگر اسے کس بات کی سزا مل رہی ہے؟ جو کچھ بھی زندگی نے میرے ساتھ کیا اس میں اس بے شعور، معصوم بچے کا کیا قصور؟
شاہ زر جس وقت اس کے کمرے میں داخل ہوا وہ اپنے بچے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کا سر سفید پٹیوں میں جکڑا تھا۔ بایاں بازو اور پسلیاں بھی حادثے میں شدید متاثر ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔
''اب کیسی ہو انوشہ؟'' بہت سنجیدگی سے مگر اپنائیت بھرے لہجے میں اس نے پوچھا تو انوشہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔
''میرا بیٹا کہاں ہے؟'' ہوش میں آنے کے بعد پہلا جملہ یہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ شاہ زر اس کے سوال پر چونک اٹھا۔
''بیٹا......'' سن دماغ میں اچانک جیسے دھماکا ہوا تھا۔ پچھلے تین روز سے اس نے اپنے بچے کو

نہیں دیکھا تھا۔ وہ کہاں تھا؟

''میں! میں آتا ہوں ابھی۔'' فوراً واپس پلٹتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا۔

اسپتال سے گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ تین بار ایکسیڈنٹ سے بچا، گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے اسے خاصی حیرانی سے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔

''منی...... کہاں ہے؟'' پہلا سوال چوکیدار سے ہی ہوا تھا۔

''پتا نہیں صاب...... میں نے نہیں دیکھا۔''

''کیوں نہیں دیکھا، یہاں کھڑے ہو کر پیسے کس چیز کے لیتے ہو۔'' وہ دہاڑا تھا۔ چوکیدار سر جھکا کر رہ گیا۔

گیٹ سے ہال اور اوپر بیڈروم تک، کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی اس نے، بُریرہ چپ اور حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہو؟''

''میرا بیٹا کہاں ہے؟'' وہ اسے مخاطب کرنا نہیں چاہتا تھا مگر کر بیٹھا تھا۔

''مجھے کیا پتا۔'' اسے بُرا لگا تھا۔ شاہ زر نے پروا نہیں کی۔ اس کا دل جیسے کوئی مٹھی میں لے کر مسل رہا تھا۔

''میرا بیٹا چاہیے ابھی۔'' تین دن سے خود پر چڑھایا سختی کا خول اس لمحے وہ توڑ بیٹھا تھا۔ بُریرہ کو لگا جیسے وہ ابھی رو پڑے گا۔

''ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے۔''

''تمہارا نہیں ہے، میرا ہے۔'' چلا کر کہتے ہوئے وہ بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بُریرہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

وہ گھر اور اردگرد سے اچھی طرح پوچھ تاچھ کے بعد سیدھا پولیس اسٹیشن گیا تھا، بُریرہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ پاکستان واپسی پر اس کے ساتھ کچھ ایسا بھی ہوگا۔

❁❁❁

اسے کہنا قسم لے لو

تمہارے بعد جو ہم نے کسی کا خواب دیکھا ہو

کسی کو ہم نے چاہا ہو، کسی کو ہم نے سوچا ہو

کسی کی آرزو کی ہو، کسی کی جستجو کی ہو

کسی کی راہ دیکھی ہو، کسی کا قرب مانگا ہو

کسی سے آس رکھی ہو، کوئی امید باندھی ہو

کوئی دل میں اُتارا ہو، کوئی تم سے جو پیارا ہو

کوئی دل میں بسایا ہو، کوئی اپنا بنایا ہو

کوئی روٹھا ہو تو ہم نے اسے رو رو منایا ہو

دسمبر کی حسیں رُت میں کسی کا ہجر جھیلا ہو
کسی کی یاد کا موسم، میرے آنگن میں کھیلا ہو
کسی سے بات کرنے کو، کبھی یہ ہونٹ ترسے ہوں
کسی کی بے وفائی پر، کبھی یہ نین برسے ہوں
کبھی راتوں کو اٹھ اٹھ کر تیرے دکھ میں نہ روئے ہوں
اسے کہنا قسم لے لو!
تمہارے بعد جو اکثر کبھی اک پل بھی سوئے ہوں
اسے کہنا قسم لے لو
کبھی جگنو، کبھی تارا، کبھی ماہتاب دیکھا ہو
اسے کہنا قسم لے لو! تمہارے بعد جو ہم نے
''کسی کا خواب دیکھا ہو......''

''علیزہ......!'' گاڑی گاؤں کی حدود سے نکل کر شہر والی سڑک پر گامزن ہوئی تھی، جب خاموشی سے ڈرائیو کرتے ایان نے اسے پکار لیا۔ وہ رُخ موڑے مکمل بے نیازی سے کھڑکی کے پار دیکھ رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دو علیزہ! اس روز عورت ذات کے حوالے سے جو کچھ میں نے تم سے کہا، شاید مجھے وہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

وہ اب بھی چپ تھی، ایان نے گاڑی روک دی۔

''کیا تم اب بھی مجھے معاف نہیں کرو گی۔''

''کیا مجھے تمہیں معاف کرنا چاہیے؟''

''ہاں۔''

''تو ٹھیک ہے، جاؤ معاف کیا۔''

''شکریہ! تم بہت اچھی ہو علیزہ، بہت اچھی۔ میں اصل میں عورت ذات سے بہت متنفر ہوں۔ کیونکہ اس صنف نے کبھی میرے ساتھ ہی کیا، کسی کے ساتھ بھی اچھا نہیں کیا، اسی لیے میں خود کو تم سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ میری اماں کہتی ہیں عورت فتنہ ہے، شر ہے۔ اگر اس سے جائز تعلق نہ ہو تو وہ مرد کی زندگی تباہ کر دیتی ہے اور میں تو تباہ ہو چکا ہوں، اسی لیے غلطی دُہرانے سے ڈرتا ہوں، کیونکہ کہا جاتا ہے مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جاتا۔''

''پھر؟''

''پھر...... پھر کچھ نہیں۔ بس تم اچھی ہو، میرے دل کو اچھی لگی ہو، سو اب کچھ بھی ہو، میں تمہارا دل کبھی نہیں توڑوں گا۔''

''وعدہ!''

''جی ہاں، پکا وعدہ۔''

''شکریہ ایان! تم خود بھی بہت اچھے ہو، دنیا کے سارے لڑکوں سے مختلف ہو، سب سے الگ،

اسی لیے تو میری رال ٹپک پڑی تم پر۔'' وہ اب مسکرا رہی تھی۔
ایان کو لگا جیسے اس کا دل ایک دم سے ہلکا پھلکا ہو گیا ہو۔
اس روز اس نے علیزہ کو خوب گھمایا پھرایا، جیب میں جتنے پیسے تھے سب خرچ کر ڈالے۔ ایک مدت کے بعد وہ خوش تھا بے حد خوش۔
بالکل اسی طرح جیسے اندھی محبت کی تاریک نگری میں ٹھوکر کھا کر گرنے سے پہلے سب خوش ہوتے ہیں۔ دن ابھی ڈھلنے ہی والا تھا۔ جب ایان نے واپسی کا قصد کیا مگر علیزہ نے انکار کر دیا۔
''ابھی نہیں ایان، ابھی تو میں نے تمہیں اپنا شہر والا بنگلہ بھی نہیں دکھایا۔''
''گولی مارو شہر والے بنگلے کو۔ ملک صاحب پریشان ہو رہے ہوں گے۔''
''ہونے دو، ساری دنیا کی فکر سر پر سوار رہتی ہے تمہیں، ایک میرے سوا۔''
''اب بھی یہی گلہ ہے تمہیں؟'' وہ مسکرایا تھا۔ علیزہ نے ناک چڑھا کر مصنوعی خفگی سے منہ پھیر لیا۔
''ٹھیک ہے، دیکھ لیتے ہیں تمہارا شہر والا بنگلہ، پھر واپس چلتے ہیں، تمہیں تو ملک صاحب کچھ نہیں کہیں گے، مجھے گولی سے اُڑا دیں گے۔''
''نہیں اُڑنے دوں گی تمہیں گولی سے۔'' وہ مسکرائی اور ایان نے جیسے بے بسی سے گاڑی اسٹارٹ کر لی۔
شام کے دھندلکے اب اردگرد پھیلنے لگے تو علیزہ نے ایک سنسان سے علاقے میں شان دار گھر کے سامنے گاڑی رکوالی۔
''یہ دیکھو یہ ہمارا بنگلہ ہے، جب میں اپنی اماں کی بیماری کے دنوں میں ان کے ساتھ رہا کرتی تھی تو یہیں ہمارا قیام ہوتا تھا۔''
''ماشاءاللہ! شان دار گھر ہے۔''
''اندر سے اور زیادہ شان دار ہے۔ یہ گھر خالصتاً میری پسند سے بنایا گیا ہے۔ بابا کہتے ہیں شادی کے بعد وہ یہ گھر مجھے گفٹ کر دیں گے۔''
''چلو اچھی بات ہے۔ ابھی تو گیٹ پر تالا پڑا ہے۔ پھر کبھی آئیں گے تو اندر سے بھی دیکھیں گے۔''
''پھر کبھی کیوں، آج ہی دیکھیں گے۔ تالے کی چابی ہے میرے پاس۔''
سفر کے آغاز میں وہ جتنی اداس تھی، اب اتنی ہی چہک رہی تھی۔ ایان کا دل کسی انہونی کے خدشے کو محسوس کر رہا تھا مگر عجیب سی بے بسی تھی کہ وہ چاہنے کے باوجود خود کو علیزہ کی کسی بات سے انحراف کرنے کے لیے تیار نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ اب لاک کھول رہی تھی۔
''علیزہ! دیر ہو جائے گی۔''
''ہو جانے دو، میں نے بابا کو کہہ دیا تھا اگر دیر ہو گئی اور مجھے اپنی دوست کے گھر رکنا پڑا تو پھر صبح ہی آؤں گی۔''
''وہ اعتراض کریں گے۔''

''نہیں کریں گے، میں تو شہر آتی جاتی رہتی ہوں اور دو، دو دن ٹھہر بھی جاتی ہوں۔ اصل میں بابا کی خواہش پر، میں یہاں پرائیویٹ پڑھ رہی ہوں۔ بھائی اسکول کالج وغیرہ کے خلاف ہیں، اس لیے بابا نے گھر بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت دے دی، کبھی کبھی کچھ مشکل ہو یا سمجھ میں نہ آئے تو میں بابا کو بتا کر اپنی دوست کے پاس شہر چلی آتی ہوں۔ وہ یہاں کالج میں پڑھتی ہے، بہت اچھی دوست ہے میری اور بابا کو اس پر اعتبار بھی بہت ہے۔ اس لیے میرے یہاں رُکنے پر اعتراض نہیں کرتے، آج بھی میں انہیں یہی کہہ کر آئی ہوں۔'' اس کے تفکر پر کھل کر وضاحت دیتی وہ اسے بے حد اچھی لگی۔

لاک کھل چکا تھا۔ ایان اس کی ہمراہی میں اِدھر اُدھر احتیاط سے دیکھتا آگے بڑھ رہا تھا۔

''یہ دیکھو، یہ جو باغیچہ ہے ناں۔ یہاں اکثر پھول اور پودے میں نے اپنے ہاتھوں سے لگائے ہیں اور وہ، وہ ہال ہے۔ یہیں میری اماں جی کی موت ہوئی تھی۔ میری جو شہر والی دوست ہے ناں وہ اماں کی بیماری کے دنوں میں اسپتال میں میری دوست بنی تھی۔ اس کا وہاں اسپتال میں بھائی داخل تھا۔ یہ دیکھو یہ اِدھر شہری کچن اور وہ اوپر کی منزل کو جاتی سیڑھیاں، تم ذرا سکون سے بیٹھو، میں ابھی آتی ہوں۔''

پٹر پٹر بولتی اسے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر، اسے ہال میں رکھے صوفے پر دھکیلنے کے بعد وہ خود واپس پلٹ گئی۔ ایان دلچسپ نگاہوں سے ہال کی بیش قیمت چیزوں کا جائزہ لیتا رہا، جب کہ وہ گاڑی سے سارا سامان، ایان کی کروائی گئی شاپنگ کی تمام اشیاء ایک محفوظ کمرے میں منتقل کرنے کے بعد دوبارہ پھر اس کے پاس چلی آئی۔

''ایان! موبائل ہوگا تمہارے پاس۔''

''ہاں ہے، کیوں؟''

''مجھے چاہیے۔ اپنی فرینڈ کو کال کر کے بلوانا ہے، تم سے ملوانا ہے اور بابا کو بھی بتانا ہے کہ ہمیں تھوڑی دیر ہو جائے گی، وہ پریشان نہ ہوں۔''

''ٹھیک ہے، بابا کو کال کر لو، مگر فرینڈ کو یہاں بلوانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں ابھی نکلنا ہے یہاں سے۔ میں زیادہ دیر تمہارے ساتھ نہیں ٹھہر سکتا۔''

''پتا ہے مجھے، بہت شریف ہو۔ پوری دنیا میں ایک تمہیں ہی تو پتا ہے کردار کی حفاظت کا۔ باقی سب تو جیسے ہاتھ پر ایمان لیے پھرتے ہیں۔''

''نہ پھرتے ہوں، میرا کوئی واسطہ نہیں ہے کسی کے ساتھ۔ تمہیں نہیں پتا حالات کیسے جا رہے ہیں، دنیا کو تو موقع چاہیے کسی کی زندگی جہنم بنانے کا۔''

''اچھا بابا موبائل تو دو، ہر وقت مولانا بنے رہتے ہو۔'' وہ جھنجلائی۔ ایان نے خاموشی سے اسے اپنا موبائل نکال کر دے دیا۔

''شکریہ، میں چائے لاتی ہوں، تب تک تم ذرا گھوم پھر کر دیکھ لو، پھر واپس چلتے ہیں، ٹھیک۔''

''ہُوں!'' گہری سانس بھر کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ دوبارہ وہیں بیٹھ گیا۔

علیزہ اس کا موبائل لے کر وہاں سے ایک کمرے میں چلی آئی، جہاں اسے یقین تھا کہ اس کی آواز، کسی بھی طور سے ایان تک نہیں پہنچ سکے گی۔

مکمل اطمینان کے ساتھ اس نے اپنے بابا کا نمبر ملایا تھا اور دوسری جانب کال وصول ہوتے ہی وہ رو پڑی۔

''بابا......''

''علیزہ...... کہاں ہو تم؟ کیا ہوا؟''

بڑے ملک صاحب اس کی تاخیر پر پہلے ہی پریشان تھے کہ وہ صرف ایک گھنٹے کی بمشکل اجازت لے کر نکلی تھی کہ اب اسے روتے ہوئے بھی سُن رہے تھے۔ وہ ان کی پریشانی پر مزید چونکی۔

''بابا...... بابا وہ کمینہ ایان...... نمک حرام نکلا بابا۔ اس کی نیت خراب ہوگئی ہے مجھ پر، زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں بہت مشکل میں ہوں بابا۔ اس نے مجھے یہاں اس کمرے میں لا کر قید کر رکھا ہے۔ میں مر جاؤں گی بابا، مگر آپ کا اٹھا ہوا سر کبھی جھکنے نہیں دوں گی۔''

بڑے ملک صاحب کے لیے اس کے الفاظ کسی شاک سے کم ہرگز نہیں تھے۔ ایک طرف اگر عزیز از جان بیٹی تھی تو دوسری طرف وہ شخص تھا جسے ان کی زیرک نگاہ نے اندر تک جانچ لیا تھا۔ وہ پھسلنے، بہکنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس کے باوجود اگر اس نے ان کی عزت کو مٹی میں ملانے کا ارادہ کیا تھا تو بہت غلط کیا تھا۔ اس وقت ان کا خون جیسے سارے کا سارا ان کی شریانوں میں جمع ہوگیا تھا۔

''خود کہاں ہے وہ اس وقت؟'' وہ گرجے تھے۔ علیزہ کی مصنوعی سسکیوں میں شدت آگئی۔

''وہ مولی کو لینے گیا ہے بابا۔ کہتا ہے دیکھ لوں گا تمہارا باپ میرا کیا بگاڑ لیتا ہے۔ اسی کا موبائل ہے بابا، بے خبری میں گر گیا اس سے۔ شاید اللہ نے میری مدد کرنے کے لیے یہ ایک وسیلہ بنا دیا۔''

''اس وقت کہاں ہو، جگہ کا کچھ پتا ہے کہ نہیں؟''

''جو پتا ہے وہ بتاتی ہوں بابا، آپ فوراً پہنچ جائیں، فوراً۔'' مکمل پلان کے تحت اس نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے بڑے ملک کے قہر کو دعوت دے دی تھی۔ اپنے منصوبے پر سرشار وہ فون بند ہونے پر، مسرور سی، واپس پلٹی تو دہلیز کے اس پار ایان کو بُت بنے کھڑے دیکھ کر شاکڈ رہ گئی۔

اس کا یقین غلط تھا کہ ہال تک اس کی آواز نہیں پہنچ سکے گی۔

❋❋❋

اپنے نرم ہاتھوں سے
کوئی بات اچھی سی، کوئی خواب سچا سا
کوئی بولتی خوش بُو، کوئی سوچتا لمحہ
جب بھی لکھنا چاہو گے
سوچ کے دریچے سے، یاد کے حوالوں سے
میرا نام چھپ چھپ کر، تم کو یاد آئے گا
ہاتھ کانپ جائیں گے، شام ٹھہر جائے گی
''میری یاد آئے گی''

عباد کراچی پہنچ گیا تھا۔

صاعقہ جھاڑو لگاتے ہوئے اس کا میسج پڑھ کر مسکرا دی۔
''کہاں جارہی ہو؟''
پندرہ منٹ بعد وہ جھاڑو سے فارغ ہو کر قدرے ستھرے حلیے میں چادر لے کر گھر سے نکلنے لگی تو برتن دھوتی صائمہ نے پوچھ لیا۔
''اسپتال جارہی ہوں' اماں کی دوا لینے۔''
''جلدی آجانا' اماں بار بار پوچھتی ہے تیرا' ویسے بھی آج کل حالات اچھے نہیں ہیں۔''
''پتا ہے مجھے۔''
تیز لہجے میں کہہ کر وہ جلدی سے دروازہ پار کر گئی تھی۔
عباد ساحل سمندر پر اس کا منتظر تھا۔
''السلام علیکم!''
اسے مقابل پاتے ہی وہ خوش ہوئی تو عباد کو لگا اس کی ساری تھکن ہوا ہو گئی ہو۔
''وعلیکم السلام' دیکھ لیں آپ نے کہا اور میں پہنچ گیا یہاں۔''
''مہربانی' لگتا ہے ائرپورٹ سے سیدھے یہیں چلے آئے۔''
''کیوں؟''
''تھکے ہوئے لگ رہے ہیں' آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں۔''
''وہ تو ہوں گی' سویا جو نہیں تین روز سے۔''
''کیوں؟''
بس' پریشان تھا' آپ سے بات بھی تو نہیں ہو پائی تھی تین روز سے۔''
''یہ اتنی بڑی بات تو نہیں۔''
''آپ کے لیے نہیں ہوگی۔ میرے لیے ہے۔''
''اچھا! دوست کیسے ہیں اب آپ کے اور ہوا کیا ہے ان کے ساتھ؟'' ذرا سا رخ پھیر کر اس نے اپنا اضطراب عباد سے چھپایا تھا۔ جب وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا۔
''پلین کریش میں کچھ عزیزوں کی موت ہو گئی ہے اس کے اسی لیے پریشان تھا۔''
''بہت قریبی عزیز تھے؟''
''ہاں۔''
''پھر تو آپ کو بھی وہیں رہنا چاہیے تھا۔''
''ہوں آپ کی طرف سے فوری پہنچنے کا حکم نہ ہوتا تو وہیں رہتا۔''
صاعقہ کے پاس اس کے لفظوں کے جواب میں فوری طور پر کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا تھا۔
''زرنیل!'' کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پکارا۔
''جی!'' وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔
''کوئی پریشانی تو نہیں ہے ناں؟''
''نہیں۔''

''ڈاکٹر عارف سے دوبارہ ملاقات ہوئی؟''

''نہیں۔''

''پھر......!''

''کیا پھر......!''

'اتنی چپ چپ سی کیوں ہیں؟ کیا آپ کو مجھے یہاں اس طرح سے دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔''

پھر کیسی بات ہے؟''

وہ بے چین ہوگیا۔ صاعقہ نے کچھ سوچتے ہوئے اپنی انگلی سے اس کی گفٹ کی ہوئی انگوٹھی کھینچ لی۔

''مجھے کچھ واپس کرنا ہے آپ کو۔''

کہتے ہی اس نے اپنی مٹھی عباد کے سامنے کھول دی تھی۔ شفاف گلابی ہتھیلی پر اس کی دی ہوئی رنگ اوندھی پڑی تھی۔ اسے دھچکا لگا۔

''وجہ پوچھ سکتا ہوں اس کی؟''

صاعقہ نے سر جھکا لیا۔

''جی......! میں نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں؟ کیا ہیں؟ مگر میں آپ کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں کون ہوں' کیا ہوں۔''

اس کا لہجہ دھیما تھا۔ عباد کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔

''مطلب......؟''

''کوئی مطلب نہیں' سوائے اس کے کہ میں نے اپنے بارے میں جو کچھ بھی آپ کو بتایا وہ سب جھوٹ تھا' غلط تھا' میں کوئی لینڈ لارڈ لڑکی نہیں ہوں۔ نہ ہی عباد انڈسٹری کے مالک سے میرا کسی قسم کا کوئی تعلق رہا ہے۔ میں تو' میں تو لوئر مڈل کلاس کے ایک بہت ہی غریب گھرانے کی بیٹی ہوں۔ جس کے کندھوں پر گھر کی بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ جس کی ماں ایک بیٹے کی معذوری اور ایک جوان بیٹے کی گمشدگی سے نڈھال بیمار پڑی ہے۔ میں نے جھوٹ کہا تھا کہ مجھے کاروبار میں نقصان ہوا ہے۔ اصل میں......! اصل میں میں آپ سے سچ چھپانا چاہ رہی تھی۔ ہر عام سی کمزور لڑکی کی مانند مجھ میں بھی آپ کو کھو دینے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی' مگر جھوٹ کی لہروں پر خوابوں کے محل نہیں ٹکتے۔ میں نہیں چاہتی کہ کل جب آپ میری اصل حقیقت سے واقف ہوں تو مجھے برا بھلا کہیں۔ میری کلاس پر مزید کچھ نئے ریمارکس پاس کریں۔ میں دکھ اٹھا سکتی ہوں ذلت نہیں اٹھا سکتی۔''

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔

عباد کے لبوں پر ہلکی سی مسکان پھیل گئی۔

''بس!''

وہ دو قدم قریب آیا تھا۔ صاعقہ کا جھکا سر جھکا ہی رہا۔

''آپ سمجھتی ہیں مجھے آپ کے منہ سے اصل حقیقت سن کر آپ سے نفرت ہو جائے گی۔ میں آپ پر دو حرف بھیج کر چلا جاؤں گا۔''

وہ اب سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ صاعقہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''بس اتنا ہی جان سکیں مجھے؟''

وہ اب گلہ کر رہا تھا۔ وہ پھر سے سر جھکا گئی۔

''اپنے اور میرے تعلق کو اتنا ستا مت کریں۔ صاعقہ......! پلیز!''

قطعی نادانستگی میں اس کے لبوں سے اس کا اصل نام نکل گیا تھا۔ صاعقہ نے فوراً چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جو غلطی کرنے کے بعد مسکرا رہا تھا۔

''سوری زرنیل!''

''میرا اصل نام کیسے جانتے ہیں آپ؟''

اس کی مسکراہٹ کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ عباد مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے گیلی ریت پر بیٹھ گیا۔

''جیسے بھی جانتا ہوں' آپ کو کیوں بتاؤں؟''

وہ اب اسے تنگ کر رہا تھا۔

''کیا آپ مجھے پہلے سے جانتے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''تو بتایا کیوں نہیں؟''

''میری مرضی۔''

''آپ بے وقوف بنا رہے تھے مجھے؟''

''نہیں...... بے وقوف بن رہا تھا۔''

''کیوں؟''

''میری مرضی۔''

شانِ بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے وہ اسے چڑا رہا تھا۔

صاعقہ خفا ہو گئی۔

''ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔ خبردار جو آج کے بعد کوئی رابطہ رکھا مجھ سے تو......!''

پاؤں پٹختے ہوئے وہ واپس پلٹی تھی۔ عباد مسکراتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ''پاگل لڑکی ہو پاگل۔'' وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ جب وہ ساحل کی گیلی ریت پر دیر تک اس کا نام لکھنے کے بعد دھیرے سے بڑبڑایا اور خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ تھکن سے بے حال اعصاب اس وقت شدت سے نیند کی خواہش کر رہے تھے۔ جب کہ مہمانوں سے بھرا گھر اس کی تھکن کو مزید بڑھا رہا تھا۔

❋❋❋

''تم بدل گئے ہو عباد اور یہ بات میں بہت دنوں سے نوٹ کر رہی ہوں۔''

تھکن سے بے حال وہ اپنے کمرے میں آیا تھا۔ جب ہادیہ اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

''اچھا کیسے بدل گیا ہوں۔ پہلے سینگ تھے سر پر جو اب نہیں ہیں؟''

بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اور موزے اتارتے ہوئے وہ مسکرایا۔

ہادیہ جی جان سے جل گئی۔

''اتنے بھولے نہیں ہو تم جو میری بات کا مطلب نہ سمجھ سکو۔''

''پاگل ہو تم اور کچھ نہیں۔''

''میں سیریس ہوں عباد! پاپا مجھے تمہاری زندگی میں ایڈجسٹ کرنا چاہتے ہیں۔ اکٹھے دیکھنا چاہتے ہیں ہمیں۔ اسی لیے بہت جلد ہماری شادی طے کرنے کا پروگرام بھی بنا رہے ہیں۔ مگر مائینڈ اٹ اگر تم اپنا رویہ تبدیل نہیں کرو گے تو میں کسی صورت تم سے شادی نہیں کروں گی۔''

''اچھی بات ہے' ویسے بھی میری کہاں بنتی ہے تم سے۔''

وہ اب مسکرا رہا تھا۔ ہادیہ کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔

''میرا خیال ہے اب تم سے پاپا اور انکل آنٹی ہی بات کریں تو بہتر ہے۔''

اسے دھمکا کر وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔

عباد کچھ دیر کمپیوٹر کے ساتھ مصروف رہا۔ پھر نیچے کی سرگرمیوں سے قطعی بے نیاز شاہ زر کا نمبر ملایا۔

''کیسے ہو شاہ؟'' کال پک ہوتے ہی دعا سلام کے بعد اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ یاسیت سے بولا۔

''کیسا ہو سکتا ہوں؟'' عباد نے اس کے جواب پر گہری سانس بھری۔

''ہمت سے کام لو یار' نشیب و فراز تو زندگی کا حصہ ہیں۔ اللہ نے چاہا تو انوشہ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔''

''تم میرے لیے دعا کرو عباد' اللہ سکون دے دے مجھے' وہ مجھے معاف نہیں کر رہا۔ صرف ایک بھول' ایک گناہ پر اپنی گرفت میں لے لیا اس نے یہاں کتنے لوگ ہیں عباد' جن کی ساری عمر گناہوں میں گزر جاتی ہے۔ پھر وہ بھی بخشے جاتے ہیں۔ صرف ایک بار توبہ پر وہ معاف کر دیتا ہے انہیں۔ مجھے کیوں نہیں معاف کر رہا وہ۔ میں کیا اس کا بندہ نہیں ہوں؟''

شاہ زر کی آواز بھرا رہی تھی۔ عباد بے کل ہو گیا۔

''سب ٹھیک تو ہے ناں شاہ؟''

''کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے عباد۔ میری زندگی میں کہیں بھی' کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''اب کیا ہوا؟''

''پتا نہیں' میرا بیٹا کہاں کھو گیا ہے۔ اس کی حفاظت بھی نہیں کر سکا۔ میں نے سب رشتے چھین لیے انوشہ سے۔ سب رشتے عباد۔''

شاہ زر کے لہجے میں درد تھا۔ عباد کی سمجھ میں نہ آیا وہ اسے کیا کہے۔

''میں کل آ رہا ہوں تمہارے پاس تم ٹینشن مت لو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مل جائے گا تمہارا بیٹا۔ ان شاء اللہ۔''

شاہ زر نے اس کی دعا پر چپکے سے کال کاٹ دی تھی۔ وہ کچھ دیر چپ لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔ پھر کروٹ بدل کر صاعقہ کا نمبر پریس کر دیا۔ کافی دیر بیل جانے کے بعد اس نے کال پک کی تھی۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام کیسی ہو؟''

''بہت اچھی' بے حد پیاری۔''

صاعقہ کا جواب برجستہ تھا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

''جی ہاں! اس میں کوئی شک نہیں، کیا کر رہی تھیں؟''

''اماں کو دوا پلا رہی تھی۔ ابھی وہ سوئی ہیں تو سوچا کچھ پڑھ لوں۔''

''کسی دن وقت نکال کر مجھے بھی پڑھ لیں پلیز۔''

''اتنا فضول ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔''

وہ ہنسی تھی تو عباد آہ بھر کر رہ گیا۔

''اُف......! اتنے اچھے' خوبرو' کماؤ لڑکے کی ایسی ناقدری۔''

وہ ٹینس تھا اور صاعقہ ہمیشہ اس کی اعصابی تھکن کو دور بھگانے میں بہتر معاون ثابت ہوتی تھی۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

''رنگ دوبارہ پہن لی کہ نہیں؟''

''نہیں پہلے آپ کو بتانا ہوگا کہ آپ مجھے پہلے سے کیسے جانتے ہیں؟''

''اگر نہ بتاؤں تو؟''

''تو میں بات نہیں کروں گی آپ سے۔''

فوراً سے پیشتر اس نے کہا تھا عباد کو چپ لگ گئی۔

''میں صرف آپ کا نام جانتا ہوں۔ صاعقہ اور کچھ بھی نہیں۔ معلوم نہیں مجھے آپ کے بارے میں آپ کا نام بھی آپ کی دوست کی وجہ سے پتا چلا۔ جب انہوں نے کال کے دوران آپ کو پکارا۔'' وہ سنجیدہ ہو چکا تھا۔ صاعقہ مسکرا دی۔

''اتنی سی بات پر اتنا ستانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''اچھا لگتا ہے آپ کو تنگ کرنا۔ امی کیسی ہیں اب آپ کی؟''

''پہلے سے بہتر ہیں۔ کل پے ملے گی تو کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھاؤں گی۔''

''پے کو گولی ماریں کل ہر صورت ان کا چیک اپ کروائیں۔ پیسے میں دے دوں گا۔''

''کس خوشی میں؟''

''ہماری منگنی کی خوشی میں۔''

''لگتا ہے بہت پیسا ہے آپ کے پاس۔''

''کہاں یار! کھینچ تان کر بہ مشکل مہینہ نکلتا ہے۔ ویسے اگر میں بہت امیر ہوتا تو آپ کے کیا احساسات ہوتے میرے لیے؟''

کب سے ذہن میں کلبلاتا سوال بالآخر اس نے پوچھ لیا تھا۔

''پتا نہیں۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو شاید میں آپ سے اتنی فری کبھی نہ ہو پاتی۔ مجھے اپر کلاس لوگوں سے چڑ ہے پتا نہیں کیوں۔''

وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولی تو عباد کا دل جیسے دھک سے رہ گیا۔

''اس کا مطلب ہے اگر میں امیر ہوتا......؟''

''اگر آپ امیر ہوتے تو میرا آپ سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہ ہوتا۔ میں خوابوں کی دنیا میں جینے والی لڑکی نہیں ہوں زین۔ مجھے زندگی اپنے حقیقی رنگوں کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔ ہاں اگر میں بہت امیر ہوتی تب بھی آپ سے یونہی بات کرتی۔''

''یہ تو غلط بات ہوئی نا۔''

''غلط صحیح کا مجھے نہیں پتا۔ بس میں ایسا ہی کرتی۔''

''چلو پھر تو شکر ہے اللہ کا کہ اس نے مجھے امیر نہیں بنایا۔''

''جی ہاں ویسے آپ نے ابھی تک اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔''

''آپ نے پوچھا ہی نہیں۔''

''اب پوچھ رہی ہوں ناں۔'' وہ خوش تھی۔

عباد پھر سے بیڈ پر اٹھ بیٹھا۔

''کیا پوچھ رہی ہیں؟''

''یہی کہ آپ کا گھر کہاں ہے' فیملی میں کون کون ہے' جاب کے علاوہ کیا مصروفیات ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں' گھر میں امی ابو ہوتے ہیں ایک چھوٹی بہن ہے ہانیہ اور بس میں ہوں اپنے ماں باپ کا اکلوتا' لاڈلا بیٹا۔''

''اور گھر؟''

''گھر بھی ہے' مگر زیادہ شاندار نہیں۔ بس گزارہ ہو جاتا ہے۔''

''ابو کیا کرتے ہیں؟''

''انہیں کیا کرنا ہے۔ گھر پر ہی ہوتے ہیں جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے انہیں کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ کیا آپ مجھے اپنا گھر نہیں دکھائیں گے؟''

''کیا کریں گی دیکھ کر' یہاں تو ہوا بھی نہیں آتی۔ مچھروں نے کاٹ کاٹ کر بے حال کر رکھا ہے۔''

اس کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ صاعقہ بے ساختہ ہنس دی اور عباد کے لیے اس کی یہ ہنسی دنیا کی ہر شے سے زیادہ قیمتی تھی۔

''افسوس میرے بس میں ہوتا تو میں آپ کو پیارا سا شاندار گھر گفٹ کر دیتی۔''

''اچھا......؟'' وہ مسکرایا۔

''جی ہاں اور اب میں سونے لگی ہوں۔ صبح بات ہوگی۔ خدا حافظ۔''

صائمہ کمرے میں آ چکی تھی لہٰذا اس نے فوراً سے پیشتر کال ڈراپ کر دی۔

''تم باز نہیں آؤ گی ناں صاعقہ!'' وہ تھکی ہوئی تھی۔ صاعقہ نے نظر چرا لی۔

''کس بات سے......؟''

''اتنی انجان نہیں ہو تم جو یہ نہ جان سکو کہ میرا اشارہ کس بات کی طرف ہے۔'' وہ تپی تھی۔

ساعقہ نے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا۔

''مت چنو وہ راہیں جن پر چل کر پچھتانا پڑے۔ مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی ہو تم' لوئر مڈل کلاس گھرانے کی۔ جہاں صرف خواب دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی تعبیر پانے کی ضد نہیں کی جاتی' یہ معاشرہ' اس معاشرے کے لوگ تمہارا گلا گھونٹ دیں گے۔ نوچ لیں گے تمہاری آنکھوں سے یہ خوش نما خواب۔''

''اچھا بس ہر وقت نصیحتوں کے پٹارے کھول کر نہ بیٹھ جایا کرو۔ میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ہنسی مذاق میں کسی سے بات ہو جاتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم فوراً فتوے دینا شروع کر دو۔ پتا ہے مجھے، کس کلاس سے تعلق ہے میرا۔ تم بار بار یہ یاد نہ بھی دلاؤ تب بھی یاد رہتا ہے مجھے، لہٰذا میری طرف سے بے فکر رہو۔ میں کچھ ایسا نہیں کروں گی جس سے میرے گھر والوں کی عزت پر حرف آئے۔''

اسے غصہ آ گیا تو صائمہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

اگلے روز اس نے پھر سے ماں کی طبیعت خراب ہونے پر انہیں اسپتال میں داخل کروا دیا۔ عباد کے صرف ایک فون نے اس کی ساری مشکلات حل کر دی تھیں۔ وہ خوش تھی بے پناہ خوش۔ عباد کا مقام اس کے دل میں بڑھ رہا تھا۔ خود وہ بھی اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اسے یاد رکھتا تھا اور ایک لوئر مڈل کلاس' حساس سی صاف گو لڑکی کے لیے یہ چاہ' یہ اہمیت' یہ محبت' یہ توجہ۔ کتنی اہم اور قیمتی تھی کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

❁❁❁

سانول شاہ کے ڈرائیور افضل کا جوشیلا پڑھا لکھا بیٹا اپنے چچا کی ہزار منتوں اور نصیحتوں کے باوجود سانول شاہ کے خلاف ایف آئی آر کٹوانے پولیس اسٹیشن چلا گیا تھا۔ جہاں ڈیوٹی نبھاتے ''اندھے قانون کے فرض شناس'' سپاہی اس کی دادرسی کے لیے ایف آئی آر تو کیا کاٹتے الٹا سانول شاہ کا نام سن کر اسے ذلیل کرنے لگے۔

وہ صبح گھر سے نکلا۔ ایس ایچ او کے حکم پر پورے دو گھنٹے ایس ایچ او کے کمرے سے دور باہر دھوپ میں بیٹھا اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ جو اندر سانول شاہ کو فون کر کے اس سے گپیں لگا رہا تھا۔

وہ جب بھی پاس سے گزرتے کسی سپاہی کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتا اسے مخاطب کرتا وہ اسے کھانے کو پڑتے پورا دن پولیس اسٹیشن میں شدید خوار ہونے کے بعد جب بے حد دل برداشتگی کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوا تو سامنے سانول شاہ کو بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ جو اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

''بڑے وقت پر پہنچے ہو' میں نے منع کیا تھا ناں میرے مقابل مت آنا۔ مگر تم باز نہیں آئے۔ اب اس کا انجام دیکھنا۔''

اس کی نظروں میں عجیب سی تضحیک تھی اور وہ اس کی دوسرے نمبر والی بہن کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کی رگوں میں خون ابلنے لگا ہو۔ بے حد طیش کے عالم میں وہ آگے بڑھا۔

''منہ سنبھال کر بات کر چوہدری......تو اس گاؤں کا سردار ہے۔ ساری دنیا کا خدا نہیں ہے۔ نہیں ڈرتا میں تجھ سے نہ تیرے جیسے دوسرے فرعونوں سے۔ میں لڑوں گا تیرے خلاف چاہے ساری دنیا کی خاک کیوں نہ چھاننی پڑے مجھے۔''

''اب خاک ہی چھانو گے شہزادے' یہ یاد رکھنا۔''

چیلنج دیتی نگاہوں میں عجیب سی ضد تھی۔ افضل ڈرائیور کا بیٹا تیوری چڑھائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اگلے دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے اس نے اپنی دوسرے نمبر والی بہن کو گھر سے غائب پایا۔ ابھی چند روز کے بعد وہ اور اس سے بڑی دونوں بہنوں کی شادی ایک ہی گھر میں طے ہوئی تھی۔ مگر چھوٹی بہن کی گھر سے عدم موجودگی نے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

فیصل (افضل ڈرائیور کا بیٹا) کو لگا جیسے اس کی شریانیں غم و غصے سے پھٹ جائیں گی۔ وہ جانتا تھا یہ سانول شاہ کی شرارت ہے مگر اس کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ تیسرے دن کے ڈھلتے سورج کے ساتھ اسے اپنی شہزادیوں جیسی بہن کی لاش' قریبی کھیت سے ملی تھی۔ وہ کیسے گھر سے غائب ہوئی اس کے ساتھ کیا کیا ظلم ہوا۔ کسی کو پتا ہی نہ چل سکا۔ انزلہ کو لگا جیسے وہ مر جائے گی۔

اس کا بس نہ چلتا تھا کہ خود سانول کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیتی۔ اس نے جس طرح سے ایک ماں کو بلک بلک کر جوان بیٹی کی ناگہانی موت پر روتے دیکھا تھا اس کا بس چلتا تو وہ عدل کے ایوانوں کو ہلا کر رکھ دیتی۔ اس روز اسکول سے واپسی پر اس نے پھر بہزاد علی مراد کو ہر بات بتائی تھی۔

''آپ کیا سمجھتی ہیں۔ وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے؟''

''میں نہیں جانتی' مگر وہ مجھے اذیت دینا چاہتا ہے اور بس۔''

''کیوں اذیت دینا چاہتا ہے۔ کیا پرانی دشمنی کی وجہ سے؟''

''نہیں' اصل میں وہ یونیورسٹی میں میرا کلاس فیلو رہ چکا ہے۔ وہیں اسے مجھ سے خاموش محبت بھی ہوگئی تھی۔ اب وہ شادی کے لیے اصرار کر رہا ہے مگر میں ایسے درندہ صفت شخص کی رفاقت کا سوچ بھی نہیں سکتی۔''

وہ غم زدہ تھی۔ بہزاد کے قدموں کی رفتار میں سستی آ گئی۔

''آپ چاہیں تو اسے انسان بنا سکتی ہیں۔''

''کیسے؟''

''محبت کے ہتھیار کا استعمال کر کے' وہ طاقت ور ہے انزلہ! آپ طاقت سے اس کا مقابلہ کریں گی تو ہار جائیں گی۔ طاقت اور اقتدار دونوں مل جائیں تو اکثر رگوں میں دوڑتا خون آگ بن جاتا ہے۔ اچھے برے کی تمیز رہتی ہے نہ گناہ ثواب کا خیال۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کسی بھی طور سے کسی بھی برائی کو' برائی سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر برائی کو برائی سے ختم کرنا بھی چاہیں تو یہ مزید بڑھتی ہے۔ کم نہیں ہوتی۔ اسی لیے میرا آپ کو یہ مشورہ ہے انزلہ کہ آپ اپنی ذات اور احساسات کو ایک طرف رکھ کر دوسرے لوگوں کے لیے ان کی زندگی کے لیے سوچیں اور اس شخص کو ایسا سبق سکھائیں کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک یاد رکھے۔ مرد کو صرف اس کی کسی نہ کسی کمزوری سے زیر کیا جا سکتا ہے۔ آپ بھی اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھائیں اور اسے سیدھے راستے کی طرف لائیں۔ پھر اس

کے بعد آپ جو چاہیں اپنے لیے فیصلہ کر سکتی ہیں۔"

بہزاد علی مراد کی بات اور مشورے میں وزن تھا۔

انزلہ پُرسوچ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی جیسے کسی نتیجے پر پہنچ گئی تھی۔

"تو یہ طے ہوا سانول شاہ کہ انزلہ تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔ تمہاری کمزوری میرا حصول میری محبت ہے اور اب میں تمہاری اسی کمزوری کو ہتھیار بنا کر تمہیں اس انجام تک پہنچاؤں گی کہ تم جیسے سیکڑوں مست ہاتھی اس سے عبرت حاصل کریں گے۔"

اس سوچ کے ساتھ ہی اس کی رگوں میں خون جیسے ابلنا شروع ہو گیا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ قدرت کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں اور مٹی سے بنے انسانوں کو قدرت کے ہر فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔

❁❁❁

وہ تھکا ہوا گھر واپس آیا تھا۔

لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے بیٹھی بریرہ اسے دیکھتے ہی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شاہ زر......!"

وہ جو خاموشی سے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ رہا تھا اس کی پکار پر ٹھٹک گیا۔

"میں یہاں تمہارے لیے آئی ہوں شاہ زر' ان وحشت ٹپکاتے در و دیوار کے لیے نہیں۔" وہ قدم آگے بڑھ کر وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کوئی اتنا کیسے بدل جاتا ہے۔ کیسے بدل سکتا ہے کوئی اس قدر؟"

بھیگی پلکوں کے ساتھ مضطرب انداز میں اس کی طرف دیکھتی وہ کتنی بے چین دکھائی دے رہی تھی۔ شاہ زر نے خاموشی سے رخ پھیر لیا۔

"تمہیں کیسے یاد دلاؤں شاہ زر کہ میں بریرہ رحمٰن...... تمہاری بہترین دوست تھی، کبھی تمہیں مجھ سے پیار تھا۔ بے حد پیار' تم تو وہ تھے شاہ زر کہ حسین سے حسین تر لڑکی بھی تمہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی تھی۔ پھر...... پھر کیا ایسا ہوا کہ آج تمہیں میری طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں۔ میں جانتی ہوں میری ماں نے تمہاری انوشہ رحمٰن کی ماں سے ان کا شوہر چھینا تھا۔ مجھے علم ہے شاہ زر کہ انہوں نے بہت کچھ غلط کیا اور مجھے یہ بھی خبر ہے کہ صرف ان کے بہکاوے کی وجہ سے تم نے بھی بہت کچھ غلط کیا مگر مما اور تمہاری غلطیوں کی سزا میں کیوں بھگتوں۔ میں نے کیا گناہ کیا ہے شاہ زر کہ مجھے ایسی اذیتوں بھری دھتکاری ہوئی زندگی ملے۔ میرا کیا قصور ہے شاہ زر کہ تمہارے نام سے منسوب ہو کر بھی میں تمہارے لیے ترسوں؟"

وہ روپڑی تو شاہ زر پلٹ کر خاموشی سے صوفے پر جا بیٹھا۔

"میں تمہیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتی شاہ زر! انوشہ رحمٰن کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کیا مجھے اس کا کوئی دکھ اور ملال نہیں؟ کیا وہ میری کچھ نہیں لگتی؟ مما کی نفرت اور تربیت اپنی جگہ' مگر ایک انسان کی حیثیت سے مجھے اس کے ساتھ پیش آنے

والے ہر حادثے پر گہرا دکھ اور رنج ہے۔ مگر کیا میرا رنج میرا دکھ اس کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ کیا میرا یہ پچھتاوا؟"

"چپ کر جاؤ بریرہ خدا کے لیے چپ کر جاؤ۔"

وہ اس کے قدموں میں بیٹھی تھی جب وہ اس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی چلا اٹھا۔

"کوئی وضاحت کوئی صفائی نہیں چاہیے مجھے خدارا۔"

آزردہ لہجے میں کہتا اگلے ہی پل وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بریرہ از حد ہتک محسوس کرتی اسے دیکھتی رہ گئی۔

❋❋❋

ارسلان حیدر پاکستان آ رہا تھا اور امامہ حسن کے قدم جیسے زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ وہ خوش تھی بے پناہ خوش۔

شجاع، گڑیا کے ساتھ فائزہ آپا کی طرف گیا ہوا تھا جب کہ وہ خوشی سے بے حال قدرت اللہ صاحب کے ساتھ لان میں پھول پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھی۔

قدرت اللہ صاحب اس کی کمپنی میں بہت خوش رہتے تھے اور اسی چیز نے شجاع کو اس کا گرویدہ کر دیا تھا۔ وہ بیوی ہونے کا سکھ و راحت نہ پہنچا کر بھی اس کی نظر میں معتبر تھی۔ کیونکہ امامہ حسن نے اس کے باپ اور بیٹی کا دل جیت لیا تھا۔ فائزہ آپا اور ان کی فیملی باہر شفٹ ہو رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آج کل کبھی وہ ان کے گھر پر ہوتیں تو کبھی شجاع آفس سے سیدھا ان کی طرف چلا جاتا۔ اس وقت بھی جب وہ اپنی بیٹی کے ساتھ گھر واپس آیا تو امامہ بچوں کی طرح پاؤں موڑے زمین پر بیٹھی ایک نیا پودا مٹی میں دبائے اسے پانی دے رہی تھی۔ وہ گڑیا کو گود میں لیے ٹخنوں کے بل اس کے قریب جا بیٹھا۔

"لگ گیا پودا؟"

"جی۔" سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا اور مٹی میں لتھڑے دونوں ہاتھ بڑی اپنائیت سے اس کے دونوں گالوں پر پھیر دیے۔ گڑیا اس کی اس حرکت پر ہنسی تھی جب کہ قدرت اللہ صاحب مسکرا کر رخ پھیر گئے۔

"بدتمیز۔" وہ سٹپٹا کر کھڑا ہوا تھا جب وہ منہ بسور کر بولی۔

"بابا دیکھ لیں یہ مجھے بدتمیز کہہ رہے ہیں۔"

"تو اور کیا کہوں چڑیل؟"

"بابا۔" اب اس نے دہائی دیتے ہوئے پاؤں پٹخے تو شجاع کا کان قدرت اللہ صاحب کی گرفت میں آ گیا۔

"کیوں تنگ کر رہے ہو میری بیٹی کو؟"

"میں تنگ کر رہا ہوں۔؟ بابا دیکھیں اس نے سارا چہرہ خراب کر دیا ہے۔ گڑیا بھی ہنس رہی ہے اسے ڈانٹیں ناں پہلے۔"

''اس نے تو پیار سے کیا ہے۔''

''آہ...... یہ کس طرح کا پیار ہے؟''

معصوم سی شکل بنا کر اس نے امامہ کو گھورا تو وہ اسے منہ چڑا کر ہنس دی۔ اس کا منہ اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کیا۔

''یہ لیں ہوگئی صاف اب پانی سے منہ دھو لیجیے جا کر کوئی ملنے بھی آ سکتا ہے۔''

''دیکھ لوں گا تمہیں؟'' گڑیا کو گود سے اتار کر اسے وارننگ دیتا وہ سیل کال آ جانے کے باعث اندر کی طرف بڑھ گیا۔ جب کہ امامہ ہاتھ جھاڑتی یہ سوچ رہی تھی کہ اس سارے ڈرامے کے بعد اسے شجاع سے جو اصل بات کرنی ہے وہ ابھی کرے یا رات میں؟

شجاع اس وقت کسی ضروری کام کا کہہ کر گھر سے نکل گیا تھا۔ رات میں اس کی واپسی خاصی لیٹ ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں آیا تو امامہ گڑیا کے ساتھ بیڈ پر نیم دراز اسی کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔

''السّلام علیکم!''

''وعلیکم السّلام! یاد آ گیا آپ کو کہ گھر بھی جانا ہے؟''

''جی ہاں۔'' امامہ کے لہجے میں ہلکی سی خفگی محسوس کر کے وہ چونکا تھا۔ آج صبح سے وہ اسے حیران کر رہی تھی اور شجاع گھاگ ہونے کے باوجود یہ بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''خیریت......؟''

''جی ہاں خیریت ہی ہے موسم ٹھیک نہیں تھا مجھے ڈر لگ رہا تھا۔''

''بڑی حیران کن بات ہے یہ میرے لیے کہ آپ موسموں سے ڈرتی ہیں۔''

کن اکھیوں سے اس کا خفا خفا سا چہرہ دیکھ کر وہ سیدھا ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔ واپس آیا تو وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی تھی۔

''اپنے لیے ڈر نہیں لگ رہا تھا مجھے' آپ کی فکر ہو رہی تھی۔ کتنے خراب حالات ہیں آج کل ملک کے پولیس والوں کے لیے تو اور بھی مشکلات ہیں۔''

نظریں سامنے آئینے پر جمائے وہ بول رہی تھی۔ شجاع کو لگا وہ بے ہوش ہو جائے گا۔

''تم نے آج مجھے خوشی سے مارنے کی کہیں قسم تو نہیں کھالی؟''

بے حد سرشار وہ قریب آیا تھا امامہ مسکرا دی۔

''اللہ نہ کرے ایسا کوئی ارادہ ہو میرا' اصل میں آپ اتنے مشکل کیس پر کام کرتے ہیں کہ ہزار بے نیازی کے باوجود فکر رہتی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے آپا بتا رہی تھیں کسی لڑکی کے ریپ اور مرڈر کا بہت پیچیدہ کیس نمٹا رہے تھے آپ جس میں براہِ راست کوئی وزیر یا مشیر ملوث تھا۔''

''ہوں وہ تو اب دوسرے افسر کے پاس ہے' تم فکر مت کرو خطروں سے کھیلنا میری بچپن کی عادت ہے۔''

''مگر میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی شجاع۔ پلیز مجھے بتایئے اس کیس میں آپ کو کوئی خطرہ تو نہیں ہے ناں۔''

''خطرہ تو ہر کیس میں رہتا ہے پگلی' وہ کیس تو اب ویسے بھی پرانا ہو گیا ہے۔ تین ملزم لاک اپ

میں ہیں۔ دو فرار ہیں۔ جس روز سب پکڑے گئے کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا اس کا بھی۔''

''لیکن آپا بتا رہی تھیں آپ اس کیس کو ذاتی لے رہے تھے؟''

''ہوں ایک بہت عزیز دوست کی بہن تھی وہ جس کا مرڈر ہوا۔ بہت پیاری لڑکی تھی' مگر تم بے فکر رہو' میرا کوئی افیئر نہیں تھا اس کے ساتھ۔''

وہ مسکرا رہا تھا۔ امامہ بے چینی سے رخ پھیر گئی۔

''اپنی وائف کے ساتھ تو تھا ناں؟''

قطعی غیر دانستگی میں اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ شجاع کی مسکراہٹ فوراً معدوم ہو گئی۔

''مجھے بھوک لگی ہے امامہ۔''

وہ ڈسٹرب تھا۔

''ٹھیک ہے میں کھانا لاتی ہوں۔''

وہ خود بھی اب مزید گفتگو کے حق میں نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فوراً سر ہلا کر کمرے سے نکل گئی۔
جب کہ شجاع اس رات پھر اضطراب کی وادی میں اتر گیا تھا۔

❋❋❋

ہَوا تھمی تھی ضرور لیکن وہ شام جیسے سسک رہی تھی
کہ زرد پتوں کو آندھیوں نے عجیب قصہ سنا دیا تھا
کہ جس کو سن کر تمام پتے سسک رہے تھے
بلک رہے تھے
جانے کس سانحے کے غم میں شجر جڑوں سے اکھڑ چکے تھے
بہت تلاشا تھا ہم نے تم کو ہر ایک رستہ' ہر ایک گھاٹی
ہر ایک پربت' ہر ایک وادی
کہیں سے تیری خبر نہ آئی
تو یہ کہ ہم نے دل کو ٹالا
ہَوا تھمے گی تو دیکھ لیں گے ہم اس کے رستوں کو ڈھونڈ لیں گے
مگر ہماری یہ خوش خیالی جو ہم کو برباد کر گئی تھی
ہَوا تھمی تھی ضرور لیکن بڑی ہی مدت گزر چکی تھی
ہمارے بالوں کے جگنوؤں میں سفید چاندی اتر چکی تھی
فلک پر تارے نہیں رہے تھے
گلاب پیارے نہیں رہے تھے
وہ جن کے دم سے تھی دل کی بستی
وہ لوگ ہمارے نہیں رہے تھے
یہ المیہ سب سے بالاتر تھا

کہ ہم تمہارے نہیں رہے تھے
کہ تم ہمارے نہیں رہے تھے
ہوا تھمی تھی ضرور لیکن بڑی ہی مدت گزر چکی تھی!

❁❁❁

ساکت نگاہوں سے علیزہ کو دیکھتا وہ جیسے خود بھی پتھر ہو رہا تھا۔ علیزہ اس کی نگاہوں سے گھبرا کر فوراً رخ پھیر گئی تو وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بس یہی اصلیت تھی تمہاری میں سمجھا تھا تم دوسری لڑکیوں سے مختلف ہو' تم نے عورت کی بے حیائی اور پاکیزگی پر جو کہا تھا مجھے اس نے متاثر کیا تھا مگر تم نے بھی میرا اعتبار توڑ دیا۔ میری شرافت' میری سادگی کا کتنا غلط فائدہ اٹھایا تم نے۔ میں چاہوں تو کیا نہیں کر سکتا تمہارے ساتھ' جب تک تمہارا باپ اور بھائی یہاں پہنچیں گے میں تمہارے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے جہاں چاہوں پھینک سکتا ہوں' مگر میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ یہ انسانیت نہیں حیوانیت ہے۔ محض طاقت کے بل بوتے پر اپنے سے کمزور کو مٹا دینا۔ کتنا کبیرہ گناہ اور بربادی ہے۔ کاش میں تمہیں بتا سکتا تم نے پیٹھ سے وار کیا ہے علیزہ ملک! میرے مضبوط کردار کی دھجیاں بکھیری ہیں تم نے' لہٰذا تمہارا قصور میں معاف نہیں کروں گا۔ تمہیں اپنے فریب اور گھٹیا شیطانی منصوبے کی سزا بھگتنا پڑے گی۔"

شدید ضبط اور غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

علیزہ نے چہرے پر ناگواری کے ساتھ اسے دیکھا۔

"تم میرے باپ اور بھائیوں کی طاقت سے واقف نہیں ہو ایان احمد! زمین کی سات تہوں میں بھی چلے جاؤ تو یہ لوگ تمہیں ڈھونڈ کر کتے کی موت مار ڈالیں گے۔ ان سے بچ بھی گئے تو میرا منگیتر سانول شاہ نہیں چھوڑے گا تمہیں۔ کہاں جاؤ گے بھاگ کر اور کیا کر سکتے ہو تم میرے ساتھ؟ بے وقوف عاقبت نااندیش مرد' علیزہ ملک کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تم' کیونکہ میں عورت کا وہ روپ ہوں جو زخمی ہونے کے بعد ناگن سے زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے۔ تم میرا اصل جان گئے تھے۔ لہٰذا تمہیں سبق سکھانے کے لیے یہ سب کھیل ضروری تھا۔ کہو کیسی رہی؟"

وہ لڑکی تھی' کمزور صنف تھی' مگر اس وقت اس کی آنکھوں میں کوئی خوف نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ زندگی کے ہر بھیانک طوفان سے لڑ چکی ہو اور اب اسے کسی پتھر' کسی سنگ باری سے کوئی خوف محسوس نہ ہوتا ہو۔

ایان نے بے حد دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔

"عورت حیا اور ایمان کا دوسرا نام ہے' مگر تم میں نہ حیا رہی ہے نہ ایمان۔ تم اب کسی کی منزل کا خواب نہیں رہی ہو علیزہ ملک۔ گزرگاہ بن گئی ہو۔ ایسی راہ جس پر کوئی بھی آئے اور روند کر چلا جائے۔ یہ خدا کی طرف سے سزا ہے تمہارے لیے۔ مگر یاد رکھنا میرا قرض تم پر واجب رہے گا۔ جب بھی حالات و تقدیر نے ساتھ دیا۔ میں تمہیں تمہاری اس شرارت پر سبق سکھانے ضرور آؤں گا۔"

خوب صورت آنکھوں میں عجیب سی ضد لیے وہ الٹے قدموں واپس پلٹا اور پھر بغیر کسی رکاوٹ

کے لاکڈ بیرونی گیٹ کو مہارت سے پھلانگتا اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ علیزہ اپنے منصوبے کی اتنی بڑی ناکامی پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ وہ پہلا مرد تھا جو اس کے وار سے بچ نکلا تھا۔ ادھر گاؤں سید والا میں گویا اک بھونچال آ گیا تھا۔

ملکوں کی عزت پر حویلی کے ایک معمولی کی کمین کا ہاتھ ڈالنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ایسے میں بی اماں کا گھر بھی جیسے اک آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ بی اماں کی ہٹلر بہو جو جانے ان کا وجود کیسے برداشت کیے ہوئے تھی۔ گوری اور ایان کی اپنے گھر آمد و رفت پر شدید نکتہ چین بی اماں پر الٹ پڑی۔

وہ بی اماں کی کسی نیکی کے لیے اپنے گھر اور بچوں کو کسی بھی مشکل کا شکار ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی یہی وجہ تھی کہ گوری کے لیے وہ ٹھکانہ بھی چھن گیا۔ برستی آنکھوں سے بی اماں کو مل کر گھر سے نکلتے ہوئے وہ خود بھی یہ بات جانتی تھی کہ اگر ملکوں کو ذرا سی بھی اس بات کی بھنک پڑ گئی کہ ایان کا ان کے گھر آنا جانا ہے۔ وہ تو اس گھر کو آگ لگوا دیں گے۔ گوری کو چونکہ ایان ہی لایا تھا لہٰذا اس سے پہلے کہ وہ بھی ایسا کوئی قدم اٹھاتی۔ اس سے نجات حاصل کر لینا ہی بہو بیگم کو اپنی عافیت لگ رہا تھا۔ ہَوا ساکن تھی اور غروب ہوتے سورج کی نارنجی کرنوں نے پیڑوں پر پھدکتی چڑیوں میں عجیب سی ہلچل مچا دی تھی۔

گاؤں سے شہر جانے والے کچے رستے کی پگڈنڈی پر بیٹھی وہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کیسا نصیب پایا تھا اس نے کہ کوئی ٹھکانا راس نہ آ رہا تھا، نہ رشتہ۔ دربدری ہی دربدری جیسے اس کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ سورج مکمل غروب ہو جاتا اس نے کب سے پلو میں بندھا ایک مڑا تڑا سا کارڈ نکالا اور اس پر ایک تھکی تھکی سی نگاہ ڈالتی دوبارہ اسی راستے پر گامزن ہوگئی جہاں سے کچھ عرصہ پہلے ایان ملک اسے بی اماں کے گھر لایا تھا۔

❋❋❋

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''جی...... گوری......!''

''نام تو بہت خوب صورت ہے' خیر کہاں سے آئی ہو؟''

''جی گاؤں سید والا سے۔''

''پیدل آئی ہو؟''

''نہیں جی' دو بسیں بدل کر آئی ہوں۔''

''زاور حسین کو کیسے جانتی ہو؟''

''وہ جی وہ دوست تھے میرے بھائی کے۔ کچھ روز ہمارے گھر رہے تھے انہوں نے ہی بھائی کو اپنا پتا دے کر کہا تھا کہ کسی مدد کی ضرورت پڑے تو......!''

ایک دم اس کا لہجہ بھاری ہوا تھا۔ بریرہ نے اس کے سادہ سے خوب صورت سراپا سے نگاہ ہٹالی۔

''وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

گوری کو لگا بریرہ کے اس ایک مختصر سے جملے نے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔

"کیا؟ وہ......وہ تو اچھے بھلے تھے جوان تھے......پھر......!"

"موت صرف بوڑھوں کو نہیں آتی' کبھی کبھی کچھ ایسے لوگ بھی لقمہ بن جاتے ہیں اس کا جن کی ابھی زندگی کو بہت ضرورت ہوتی ہے۔"

"مم......مگر......میں تو یہاں بڑی آس و امید کے ساتھ آئی تھی۔"

چٹانوں سے مضبوط اس لڑکی کو حالات نے کتنا کمزور کر ڈالا تھا۔ بریرہ نے ایک تھکی تھکی سی نظر اس پر ڈالی پھر رخ پھیر لیا۔

"اگر تم پناہ کی تلاش میں ہو تو یہاں اس گھر میں رہ سکتی ہو۔ میں یہاں کبھی کبھار ہی آتی ہوں۔ میری مما اور باقی فیملی یہاں سے باہر شفٹ ہو گئے ہیں۔ تم اس گھر کی دیکھ بھال کر سکتی ہو۔ ملازمین پر نظر رکھ سکتی ہو۔ بہر حال جس شخص کا حوالہ لے کر تم یہاں آئی ہو۔ وہ میرا ابھی بھائی تھا۔ کچھ نہ کچھ تعلق تو دل کا تھا اس سے۔"

اس بار گوری کو لگا جیسے اسے زندگی کی نوید سنا دی گئی ہو۔ اس کا سر اپنے مالک کے حضور شکرانے کے لیے جھک گیا۔ اس کی دعائیں رائگاں نہیں گئی تھیں۔ کائنات کے خالق و مالک نے اس کے لیے پھر اپنی دنیا میں ٹھکانے کا بندوبست کر دیا تھا۔ لہٰذا وہ اس کے کرم کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔

❁❁❁

"مجھے شجاع حسن کہتے ہیں۔"

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے مصافحہ کیا تھا۔ عباد اس سے ہاتھ ملاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اور میں عباد ہوں' عباد انڈسٹری کا سپروائزر۔ یہ شاہ زر ہے میرا دوست' اسی کے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی تھی ہم نے' مگر تین دن گزرنے کے باوجود کوئی پیش رفت دکھائی نہیں دے رہی اسی لیے آپ کو زحمت دینی پڑی۔"

"مجھے افسوس ہے اگر ایسا ہے تو' ان شاء اللہ میں خود اپنی نگرانی میں یہ کیس کسی ذمہ دار افسر کے سپرد کرتا ہوں۔ امید ہے بہت جلد آپ کے بیٹے کا سراغ مل جائے گا۔"

مکمل یونیفارم میں تیار وہ بے حد شاندار دکھائی دے رہا تھا۔ عباد ایک نظر اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بہت شکریہ شجاع صاحب! اگر میرا بیٹا مجھے مل جاتا ہے تو میں آپ کا بے حد ممنون رہوں گا۔"

شاہ زر نے اس بار ممنونیت سے کہا تھا۔

شجاع بھی اس کے ساتھ ہی کھڑا ہوا۔

"ان شاء اللہ میں پوری کوشش کروں گا۔ آپ اللہ سے اچھی امید رکھیے۔"

وہ گھر ہی تھا۔ عباد، شاہ زر کے ساتھ مزید وقت ضائع کیے بغیر۔ شجاع کی چائے کی آفر سے معذرت کرتا اس کے گھر سے نکل آیا۔

"اب گھر چلو گے یا اسپتال۔"

"اسپتال لے چلو مجھے انوشہ کو گھر لانا ہے۔ وہ وہاں آرام محسوس نہیں کر رہی۔"

"مگر ابھی اس کی حالت......!"

"معلوم ہے مجھے اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ مگر میرے لیے اب اس کی کسی بھی خواہش کو رد کرنا ممکن نہیں۔"

شاہ زر کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ عباد لب بھینچتا گاڑی اسپتال کی طرف جاتے راستے کی طرف موڑ گیا۔

"بریرہ بھابی کو انوشہ کی آمد اچھی نہیں لگے گی شاہ' تم اپنے گناہ ثواب کے چکر میں ان کے ساتھ بہت زیادتی کر رہے ہو۔"

"معلوم ہے مجھے۔ انوشہ، بریرہ کے ساتھ نہیں رہے گی۔"

تو پھر......؟"

"پھر......! پھر کیا نزہت آنٹی اور جمال انکل اب یہیں رہیں گے۔ اس کے ساتھ' گھر میں نے دیکھ لیا ہے۔"

"نزہت آنٹی کا جو گھر تھا کیا وہ انہوں نے فروخت کر دیا؟"

"ہاں وہ سمجھتی تھیں' شاید وہ اب بھی پاکستان میں نہیں رہیں گی۔"

"اور انوشہ نے گھر آنے کے بعد پھر اپنے بچے کا تقاضا کیا تو......؟"

"وہ اب کوئی بھی تقاضا کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہی ہے عباد۔ نزہت آنٹی کے آنسوؤں نے سارے بھید کھول دیے ہیں اس پر۔ اب اسے دیکھو گے تو کسی ساکن جھیل کا گمان ہوگا۔"

شاہ زر کے لہجے میں ٹھہراؤ جب کہ آنکھوں میں اضطراب تھا۔ عباد نے پھر اس کے بعد کوئی سوال نہیں پوچھا جس وقت وہ دونوں انوشہ کے کمرے میں داخل ہوئے وہ اپنے زخموں سے بے نیاز بیڈ پر بیٹھی۔ عجیب سرد نگاہوں سے اپنی ہتھیلیوں کو گھور رہی تھی۔

"انوشہ!" شاہ زر کی پکار پر اس نے چونکتے ہوئے سر اٹھایا تھا اور پھر خاموشی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"گھر چلیں؟" وہ آگے بڑھا تھا۔ نزہت بیگم جو انوشہ کے قریب بیٹھی تھیں رو پڑیں۔ انوشہ نے اگلے ہی پل اپنا ہاتھ شاہ زر کی طرف بڑھا دیا تھا۔

وہ لڑکی جو نفرتوں سے گندھی تھی۔ اس وقت کسی پتھر کے مجسمے سے کم دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ عباد نے پہلی بار انوشہ رحمٰن کے لیے اپنے دل میں کوئی ہم دردی محسوس کی تھی۔

❀❀❀

زمینوں پر کام ہو رہا تھا اور وہ ملازمین کی نگرانی کر رہا تھا۔ جب اسے انزلہ شاہ کا پیغام ملا اور وہ حیران رہ گیا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ انزلہ شاہ اسے خود ملنے کے لیے بلاتی۔ وہ خوش ہوا تھا مگر پھر اگلے ہی پل اس کا دماغ گھوم گیا۔

"جا کر کہہ دو اسے میں فارغ نہیں ہوں۔"

پیغامبر اس کا جواب لے کر پلٹ گیا تھا مگر اگلے تیس منٹ میں وہ خود اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"کیوں آئی ہو یہاں؟"

وہ اسے دیکھ کر جہاں حیران تھا وہیں اسے غصہ بھی آیا تھا۔ اسے قطعی گمان نہیں تھا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے یوں وہاں کھیتوں میں بھی آسکتی ہے۔ تاہم انزلہ اس کی خفگی پر مسکرائی تھی۔

"مجھے تم سے ملنا تھا سانول شاہ! کچھ بات کرنی تھی تم سے۔"

"ایسی کیا افتاد آپڑی جو یہاں چلی آئیں۔"

اس سے غصہ ضبط نہیں ہو رہا تھا۔ انزلہ نے لب سمیٹ لیے۔

"افتاد کا ذکر ہی کرنے آئی ہوں۔ آپ فارغ ہوں گے تو ہی سنا سکوں گی ناں۔"

آج اس کا انداز جدا تھا۔ وہ مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھتا ڈیرے کی طرف چلا آیا۔ انزلہ نے بھی اس کی پیش قدمی کی تھی۔

"کہو کیا مسئلہ ہے؟"

"بہت سے مسئلے ہیں اور بہت سوچنے کے بعد مجھے یہ بات سمجھ آئی ہے سانول کہ میں کچھ بھی کرلوں مگر یہاں اس گاؤں میں تم سے جیت نہیں سکتی۔ اس لیے میں ہر اس بات کی معافی مانگنے آئی ہوں تم سے، جس نے تمہیں مشتعل کیا۔ تب مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ تمہاری طاقت اور اختیار مجھ سے بڑھ کر ہے۔"

"اس سارے ڈرامے کا مقصد؟" وہ ہوشیار تھا۔ انزلہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے کوئی تم سے ڈراما کرسکتا ہے؟"

"تم کرسکتی ہو کیونکہ تمہیں میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔"

"چلو ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو پھر میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔"

اسے ٹریپ کرنے کی آخری کوشش کے طور پر وہ کھڑی ہوئی تھی۔

سانول خاموشی سے اسے سمجھنے کی کوشش کرتا' دونوں بازو سینے پر باندھے اسے دیکھتا رہا۔

❋❋❋

درختِ جاں پر عذاب رُت تھی' نہ برگ جاگے نہ پھول آئے
بہار وادی سے جتنے پنچھی ادھر کو آئے ملول آئے
وہ ساری خوشیاں جو اس نے چاہیں' اٹھا کے جھولی میں اپنی رکھ لیں
ہمارے حصے میں عذر آئے' اصول آئے......!

دن خاصا ڈھل چکا تھا۔

اوپر نیلے آسمان پر اُڑتے پرندے اب جیسے تھک ہار کر اپنے ٹھکانوں کو واپس پلٹ رہے تھے۔ فضا میں حبس بڑھ گیا تھا۔ اونچے اونچے درختوں کے سرسبز پتوں نے حرکت کرنا بند کردی تھی۔ دور اُفق کے اس پار غروب ہوتا سورج اب اپنی نارنجی کرنیں خاصی تیزی کے ساتھ سمیٹ رہا تھا۔ قریب ہی کچے گھروں کے باہر موجود کچھ دیہاتی عورتیں دیواروں پر اُپلے لگا رہی تھیں۔

انزلہ شاہ نے تھکی تھکی سی نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں سامنے شہر کو جاتے کچے راستے پر اب دور دور

کہ کسی سانول شاہ کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔ یک لخت ہی اس کے اندر جیسے تھکن اتر آئی تھی۔ جانے یوں اس وقت اسے بے ساختہ یونیورسٹی کے وہ دن یاد آئے تھے جب سانول شاہ خواب بن کر اس کی آنکھوں میں اُترا تھا۔ عورت خواہ کتنی بھی سمجھ دار' سوشل' اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جائے محبت کے وار سے نہیں بچ سکتی۔ وہ بھی نہیں بچ سکی تھی۔

وہ اوائل سردیوں کے دن تھے۔

انزلہ اپنی دوستوں کے ساتھ' یونیورسٹی لان کے ایک گوشے میں بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ جب سانول شاہ اور اس کے شرارتی دوستوں کا ٹولہ ان سے کچھ ہی فاصلے پر آ کر بیٹھ گیا۔

''واہ' انزلہ! دیکھ بلیک سوٹ میں کتنا شاندار لگ رہا ہے تیرا شہزادہ' ہائے کتنی خوش نصیب ہے تو کہ سانول جیسا شاندار بندہ تجھ پر مرتا ہے۔ کاش مجھ پر مرجاتا کم بخت تو میں جان وار دیتی اس پر۔''

اس کی عزیز دوست نے ہنس کر اس کے کان میں سرگوشی کی تھی جب وہ غصہ ہوتے ہوئے بولی۔

''شرم وحیا کرلو کچھ' وہ اِدھر ہی دیکھ رہا ہے۔ تمہارا کچھ لگتا......!''

''تو میں کیا کروں وہ کہتے ہیں ناں ''جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم'' اور سانول شاہ کے تجھ پر مرمٹنے کا راز تو ساری یونیورسٹی جانتی ہے اب ایویں تو میران سے جھگڑا نہیں کیا تھا اس نے' دیکھ کتنے مزے سے مسکرا رہا ہے۔''

''تم نہیں سدھرنے والی کبھی بھی' چلو اٹھو یہاں سے نکمی نہ ہو تو۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ادھر سانول کی آنکھوں میں جیسے بے چینی بڑھ گئی۔

''ہائے صدقے جاؤں' یہاں لیلیٰ پَروں پر پانی پڑنے نہیں دے رہی اور وہاں قیس کو دیکھو! آنکھیں ہی سیراب نہیں ہو پا رہی ہیں جناب کی۔''

اس کی دوست زوبی ہنسی اور وہ اس لمحے اسے محض گھور کر رہ گئی تھی۔ جانے اسے اس شخص سے چڑ ایسی کیوں تھی۔ ادھر وہ سامنے سے آتا دکھائی دیتا اور ادھر وہ فوراً راستہ بدل لیتی۔ اس روز وہ لائبریری میں اس سے ٹکرا گیا تھا۔

''راستہ چھوڑیں میرا۔''

انزلہ جو لائبریری سے نکل رہی تھی اسے دہلیز پر براجمان پا کر خفا ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ جواب میں وہ آسانی سے اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

''لڑکیوں کو اتنا غصہ زیب نہیں دیتا انزلہ شاہ! محبت کی مٹی سے گندھا ہوتا ہے عورت کا وجود' سراپا محبت ہی ہونا چاہیے اسے۔''

''ایسی فضول نصیحتوں کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔'' تلخی سے بولی تو سانول مسکرا دیا۔

''آج نہ سہی مگر زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر یہ نصیحت بہت کام آئے گی آپ کو۔ خیر ایک گزارش کرنی تھی آپ سے۔'' وہ اب واپس پلٹ کر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''فرمائیے۔'' انزلہ کا لہجہ نا چاہنے کے باوجود ناخوش گوار ہو گیا۔

''فرمانا کیا ہے بس گزارش کرنی ہے کہ خود کو اس میران شاہ سے ذرا دور رکھا کریں۔ مجھے آپ کا اس سے بے تکلف ہونا پسند نہیں ہے۔''

''تو میں کیا کروں' وہ میرا بچپن کا دوست ہے۔''
''بچپن اور جوانی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اب بچی نہیں ہیں آپ کہ لڑکوں کے ساتھ کھیلیں۔''
''آپ مجھ پر منسٹر نہیں لگے کہ میں وہی کروں جو آپ کہیں۔ یہ خالص میرا ذاتی معاملہ ہے۔''
''تو ٹھیک ہے' میری اور اس کی زندگی میں اگر کچھ غلط ہوا تو اس کی ذمہ دار آپ ہوں گی۔''
ایک بار پھر وہ اسے تنبیہہ کر رہا تھا۔ انزلہ الجھ کر رہ گئی۔
چند ہی روز کے بعد وہ واقعہ پیش آ گیا تھا کہ جب اس کے دل میں سانول شاہ کے لیے موجود کدورت ختم ہو گئی تھی۔

❁❁❁

کہا جاتا ہے کسی کے مر جانے سے کوئی ان کے پیچھے مر نہیں جاتا' کائنات کا نظام رک نہیں جاتا مگر...... کہنے والوں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ کچھ پیارے رشتوں سے دائمی جدائی کے بعد زندگی کا مفہوم یکسر بدل لیتی ہے۔ اللہ رب العزت کی عطا کی ہوئی سانس مٹی کے وجود میں جاری ضرور رہتی ہے مگر پھر زندگی جی نہیں جاتی' محض ''گزاری'' جاتی ہے۔ اپنا بوجھ اپنے کندھوں پر لاد کر چلتی پھرتی زندہ لاشیں اپنا قبرستان' ویران اور اُجاڑ آنکھوں میں ساتھ لیے پھرتی ہیں۔ خاک اوڑھ کے سونا آسان ہے مگر اذیت ساتھ لے کر چلنا بہت جاں گسل ہوتا ہے۔
انوشہ رحمٰن کے لیے بھی حالات ایسے ہی ہو گئے تھے۔ اپنی چوبیس سالہ زندگی میں اس نے کبھی کوئی ایک لمحہ بھی ہنس کر نہیں گزارا تھا۔ بچپن میں ہی والدین کی علیحدگی کے بعد ان دونوں بہن بھائیوں کی تقسیم بھی ہو گئی تھی۔ زاور بڑی خالہ کے پاس تو وہ چھوٹی خالہ کے پاس ٹھہرا دی گئی تھی۔ کیسے کیسے دن نہیں دیکھے تھے اس نے وہاں' سمندر پار گھر بسا کر بیٹھی ماں سے تو اس کی خالہ اکثر فون پر بھی اس کی بات نہیں کرواتی تھیں۔ جیسے جیسے عمر بڑھی اسے خالہ کے ساتھ ساتھ خالو سے بھی خوف آنے لگا جو اچانک اس پر خاص توجہ دینے لگے تھے۔ ایسے میں اس کے لیے اپنا آپ بچا کر اس پنجرے میں رہنا کتنا مشکل ہو گیا تھا۔ جس میں اس کی ماں اسے ڈال کر بے فکر ہو گئی تھی۔
اسکول سے کالج اور وہاں سے یونیورسٹی تک' جن مشکلات اور رکاوٹوں کو عبور کرتی وہ پہنچی تھی یہ بھی محض اس کا دل ہی جانتا تھا۔ وگرنہ کتنی خواہش تھی اس کی کہ اس کا بھی اپنا گھر ہو۔ جس میں وہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ بے فکری کی زندگی بسر کرے۔ دوسری تمام لڑکیوں کی طرح وہ بھی خوب صورت خواب دیکھے۔ نت نئی فرمائشیں کرے۔ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر ان سے اپنی دوستوں اور یونیورسٹی کی ڈھیروں باتیں کرے۔ اپنے باپ کے کندھے سے سر ٹکا کر ان سے اپنی جائز ناجائز ضدیں پوری کروائے مگر......!
ہر خواب کی قسمت میں تعبیر نہیں ہوتی۔
ہر خواہش کے حصے میں تکمیل نہیں ہوتی۔
اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ایک عذاب سے نکل کر دوسرے عذاب میں جا پڑے گی۔ یونیورسٹی میں شاہ زر کا بیر اور حسد اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ ہر ممکن طور پر اس سے بچنے کی کوشش کرتی تھی۔ ان دنوں وہ یہی سوچتی تھی کہ وہ سر زمان کی زندگی کا حصہ بن کر ہر دکھ ہر مشکل سے

نجات پالے گی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔
سرزمان کی زندگی کا حصہ بننے کے بجائے وہ اپنی سوتیلی ماں کے بھانجے کی بھینٹ چڑھ کر ہر رشتے سے محروم ہوتی چلی گئی تھی۔ نہ عزت رہی تھی نہ خودداری' عارضی سہارا ثابت ہونے والے لوگ بھی نہیں رہے تھے۔ چن چن کر حالات نے اس کے سارے رشتوں کو نگل لیا تھا۔ پورا ایک ہفتہ اسپتال میں بستر پر چت پڑے رہ کر بار بار اسے صرف ایک ہی رشتے کا خیال آیا تھا اور وہ رشتہ اس بچے کا تھا جس نے قدرت کے جائز طریقے سے اس کے بطن سے جنم لیا تھا۔
اسے اپنے اور اپنے بچے کے نصیب میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بھی اپنے بیٹے کے ساتھ وہی کر رہی تھی جو اس کی ماں نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے کردار پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔
دروازہ آہستہ سے ناک ہوا تھا اس نے چونک کر سر اٹھایا تو شاہ زر آفندی' تھکا تھکا سا اندر چلا آیا۔ انوشہ نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا۔
''اب کیسی طبیعت ہے انوشہ؟''
وہ شاید ان نگاہوں کا مفہوم جان گیا تھا۔ تبھی نرمی سے پوچھا تو انوشہ نے سر جھکا لیا۔
''مجھے کیا ہونا ہے؟ میں تو زندگی کے سب سے بھیانک باب کی ہیروئن ہوں شاہ زر آفندی اور تم نے پڑھا ہوگا۔ کسی بھی کردار میں ہیروئن کبھی نہیں مرتی' چاہے اس کا ریپ ہو جائے' چاہے اس کی شادی ایک نفسیاتی مریض شخص کے ساتھ ہو جائے' چاہے وہ صبح و شام اس شخص کے ہاتھوں اُدھڑتی رہے' چاہے وہ شخص بھی مر جائے' چاہے ایک ایک کر کے اس کے سارے رشتے مر جائیں' چاہے دنیا اس پر اور اس کے کردار پر تھو تھو کرے...... وہ کبھی نہیں مرتی' اپنا قبرستان اپنے ساتھ لیے ڈھیٹ بنی زندہ لاش کی مانند جیتی ہی چلی جاتی ہے۔ زندگی' تقدیر اور موت کوئی بھی رحم نہیں کھاتا اس پر۔''
کتنا درد تھا اس کے لہجے میں۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔
''تم نے...... تم نے صرف ایک غلط فہمی کی آگ میں صرف ایک رشتے کے لیے میرے سارے رشتے مجھ سے چھین کر بھلا دیے۔ کنگلا کر ڈالا تم نے مجھے' کیا رہنے دیا تم نے میرے پاس' کچھ بھی تو نہیں۔''
وہ دل میں شگاف ڈال رہی تھی۔ شاہ زر کی آنکھیں ضبط کی کوشش میں جل اٹھیں۔
''میرے پاس بھی تو کچھ نہیں رہا انوشہ! میں نے بھی تو اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ سب کچھ......''
''کس کے لیے؟ کیا میرے لیے؟'' اچانک وہ جذباتی ہوئی۔
''میرے لیے کیا کیا تم نے' بہت بلند و بالا دعوے کرتے ہو محبت کے' ہمدردی کے' مگر کچھ کر نہیں سکتے۔ دنیا میں اتنے لوگ مر رہے ہیں۔ اتنے حادثات ہو رہے ہیں۔ تمہارے ساتھ کوئی حادثہ کیوں نہیں ہوتا۔ تم کیوں نہیں مر جاتے کسی کی جگہ...... تم سے تو عداوت نہیں ہے موت کو' پھر تمہیں موت کیوں نہیں آتی' خدا کا واسطہ ہے شاہ زر آفندی! مر جاؤ۔ جیسے بھی ممکن ہو مر جاؤ...... خدارا۔''
کتنی جذباتی ہوگئی تھی وہ' شاہ زر کو لگا وہ جیسے سانس بھی نہیں لے سکے گا۔
''اور کچھ نہیں' تم تو زندگی کے بھیانک باب کے ہیرو نہیں ہو' تم تو مر سکتے ہو' جب چاہو گلے لگا

سکتے ہو موت کو۔"

وہ اب رو رہی تھی۔ شاہ زر سکتے کی کیفیت میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ جو مطالبہ وہ اس سے کر رہی تھی کیا وہ اس کے اختیار میں تھا؟ اس سے پہلے کہ وہ مزید جذباتی ہو کر اسے کمرے سے باہر دھکیل دیتی وہ اسی حال میں پلٹ گیا۔ مگر یہ کیا......! وہاں انوشہ رحمٰن کے کمرے کی دہلیز پر اس وقت بریرہ کھڑی تھی۔ لب بھینچے بالکل خاموش' وہ آنسو چھپاتا جانے کسی تذلیل کے زیر اثر فوراً اس کی دوسری طرف سے نکل گیا۔ جب کہ وہ اعتماد سے چلتی عین انوشہ رحمٰن کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

"بس نکل گیا دل کا غبار' یا ابھی اور بھی کچھ کہنا باقی ہے؟"

وہ دونوں بازو سینے پر باندھے کھڑی تھی۔ انوشہ ناسمجھی کے انداز میں اسے دیکھے گئی۔

"تم خود کو سمجھتی کیا ہو انوشہ رحمٰن! یہی کہ تم دنیا کی سب سے زیادہ مظلوم لڑکی ہو۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا وہ کسی کے ساتھ نہیں ہوا؟ مجھے بتاؤ' یہاں اس ملک میں کتنی لڑکیاں انتقام کی بھینٹ نہیں چڑھتیں۔ بنا کسی معمولی سے قصور کے کیا کیا نہیں ہوتا ان کے ساتھ؟ ایک پل ایک لمحے میں موت کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے انہیں اور وہ آہ تک نہیں کر پاتیں۔ پھر تم کس ستم کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہو؟"

وہ اشتعال کا شکار تھی۔ انوشہ دم بخود سی اسے دیکھتی رہی۔

"ایک ریپ ہوا تمہارا اور تم نے سارا آسمان سر پر اٹھا لیا۔ یہاں ہزاروں لڑکیوں کے روز جسم بھی بکتے ہیں اور وہ ماری بھی جاتی ہیں مگر کسی کو ذرا سا احساس نہیں ہوتا ان کا' نہ کوئی توجہ دیتا ہے ان پر۔ پھر تم یہ سب ڈراما کیوں کر رہی ہو' کیا اس نے کچھ نہیں کھویا؟ کیا اس نے اذیت نہیں سمیٹی؟ کیا اس نے وہ جہاز گرایا؟ جس میں تمہاری ماں اور بھائی مرا' قدرت کا فیصلہ تھا ناں یہ۔ پھر اسے سولی پر کیوں لٹکا رکھا ہے تم نے؟ کب تک زندگی کو یونہی گھسیٹتی رہو گی تم؟ اسے مرنے کا مشورہ دیتی ہو' خود کہیں دفعان کیوں نہیں ہو جاتیں' کیوں میری زندگی اور خوشیوں پر اپنی نحوست بکھیر رکھی ہے تم نے؟ کیوں سکون سے جینے نہیں دیتی ہو تم مجھے...... کیوں؟"

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انوشہ رحمٰن کا چہرہ نوچ لے' جمال صاحب اور نزہت بیگم اس کی تیز چنگھاڑ پر گھبرا کر اندر آئے تھے جب وہ ان پر برس پڑی۔

"اور آپ لوگ...... آپ لوگوں کو تو شرم آنی چاہیے۔ ایسی گھٹیا' غلیظ لڑکی کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ میری مانیے' ایک کام کیجیے' اسے فلم انڈسٹری میں چھوڑ آئیے۔ خوش بھی رہے گی اور چار پیسے بھی کما لے گی۔ کم از کم میری جان تو چھوٹے گی اس منحوس سے۔" زہر ہی زہر تھا اس کے لہجے میں' انوشہ کو لگا وہ ایک بار پھر کنویں میں دھکیل دی گئی ہو۔

اس کا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر روئے' مگر آنکھیں جیسے خشک جھیلیں ہو گئی تھیں۔ بریرہ رحمٰن اسے چور چور کرنے کے بعد وہاں رُکی نہیں تھی۔ مگر انوشہ کی سانس ضرور اس کے سینے میں اٹکنے لگی تھی۔ نزہت بیگم نے لپک کر اسے سینے سے لگایا تھا۔ جب وہ سسکتے ہوئے بولی۔

"ہم یہاں نہیں رہیں گے خالہ! یہ شہر اب ہمیں راس نہیں ہے۔"

"ہاں بیٹی! ہم کل صبح ہی شہر چھوڑ دیں گے۔ بہت بڑی زمین ہے میرے مالک کی' کہیں نہ کہیں تو آسرا مل ہی جائے گا۔" جمال صاحب نے افسردگی سے کہتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

انوشہ دیر تک نزہت بیگم کے سینے میں منہ چھپائے روتی رہی۔

❀❀❀

اس روز کے بعد شجاع کے لبوں کو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ اپنے کام میں مشغول اس نے ہر وقت گھر سے باہر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہنا شروع کردیا تھا۔ رات میں بھی خاصی تاخیر سے آتا اور چپ چاپ بیڈ روم سے ملحقہ سائیڈ روم میں اپنی بیٹی کو لے کر سو جاتا۔ کھانا تو روز ہی باہر سے کھا کر آنا شروع کردیا تھا۔ امامہ پریشان ہوگئی۔

وہ شخص چاہے اس کے لیے ایک فیصد دل چسپی کا باعث بھی نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اسے ناراض کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ نا ہی اس نے دانستہ اسے زک پہنچانے کی کوئی کوشش کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اب اس کی خاموشی پر اسے الجھن ہو رہی تھی۔

اس روز بھی وہ لاؤنج میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی جب ارسلان کی کال آ گئی۔

''ہیلو سویٹ ہارٹ! کیسی ہو؟'' آج کئی دنوں کے بعد وہ اسے یاد آئی تھی۔ امامہ خوش ہوگئی۔

''ٹھیک ہوں' تم کیسے ہو اور اتنے دن رابطہ کیوں نہیں کیا؟''

''مصروف تھا یار! پاکستان آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اپنی سویٹ ہارٹ کے پاس۔''

''پھر کیا بنا؟''

''بننا کیا تھا' پہنچ گیا ہوں پاکستان' اپنی سویٹی کے پاس۔''

''سچ!'' وہ اس کی خوشی پر خود بھی خوشی سے چلائی۔ جب وہ بولا۔

''کیوں؟ یقین نہیں آ رہا' آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔''

''کہاں ہو تم اس وقت؟''

''ائیرپورٹ کے باہر تم آ رہی ہو؟''

''ہاں' میں آ رہی ہوں۔ پلیز وہیں رہنا' کہیں جانا مت پلیز۔'' خوشی سے اس کا حال برا ہو رہا تھا۔ ارسلان حیدر نے مسکرا کر کال کاٹ دی۔ اگلے بیس منٹ میں وہ اس کے مقابل تھی۔ آف وائٹ کلر کے سادہ مگر نفیس سوٹ میں ملبوس کتنی باوقار لگ رہی تھی وہ' ارسلان اسے دیکھتا رہ گیا۔

''واہ' تم تو بہت بدل گئی ہو مون! قسم سے پہچانی ہی نہیں جا رہیں۔''

''تم بھی تو کتنے بدل گئے ہو' پہلے اتنے اسمارٹ تھے اب کتنے موٹے ہو گئے ہو۔''

''اچھا......!'' وہ ہنسا۔

امامہ آنکھوں میں جگنو لیے اسے دیکھتی رہی۔

''یہاں سے کہاں جاؤ گے کسی دوست کے پاس؟''

''ہاں...... کسی دوست کے پاس ہی جاؤں گا۔ اپنی کون سی کوئی جاگیر ہے یہاں' کچھ پیسے ہوں گے تمہارے پاس۔''

''نہیں کیوں؟'' اچانک اس نے پوچھا تو وہ بوکھلا گئی۔

''ٹیکسی کرنی تھی یار' میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی نہیں ہے اور مزید پیدل چلنے کا تصور بھی محال ہے۔''

وہ مایوس ہوا تھا۔ امامہ شرمندہ ہوگئی۔

''مجھے کیا پتا تھا ایسا ہوگا۔ میں تو فرطِ مسرت میں اپنا موبائل بھی گھر ہی بھول آئی۔ ٹیکسی کے پیسے بھی وہیں ادا کیے تھے بابا نے۔ انہیں میں مارکیٹ کا کہہ کر گھر سے نکلی ہوں۔''

''اوہ...... تمہاری تو زندگی سنور گئی ہے' پیسوں میں کھیلتی رہو گی۔''

''کیا پیسوں سے زندگی سنور جاتی ہے؟'' اسے دکھ ہوا تھا۔ جب وہ بولا۔

''ہاں......! پیسہ ہی سب کچھ ہے۔ زندگی' موت' دین ایمان' دنیا آخرت' سب کچھ پیسہ ہی ہے۔''

''تمہارے لیے ہوگا' میرے لیے پیسے کی کوئی اہمیت نہیں زندگی میں' میرے لیے تو اگر کوئی چیز اہم ہے تو وہ محبت ہے' سچے جذبوں سے گندھی خالص محبت۔''

''تم بس پینڈو کی پینڈو رہو گی۔ بے وقوف۔''

وہ اس پر ہنسا تھا۔ امامہ دکھ سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''پیسے کا کوئی قبلہ نہیں ہوتا ارسلان! محبت کا ہوتا ہے۔ پیسہ بہت مل جاتا ہے زندگی میں' محبت نہیں ملتی۔''

''کون کہتا ہے نہیں ملتی' پیسہ جیب میں ہو تو کسی بھی شخص کی جان اور ایمان خریدا جا سکتا ہے۔ محبت کی تو اوقات ہی کیا ہے؟''

''اچھا اگر یہ بات ہے تو جاؤ' امامہ حسن کی خالص بے لوث محبت خرید کر دکھاؤ بازار سے۔''

''امامہ حسن کی محبت خریدنے کی کیا ضرورت ہے وہ تو مفت میں ملی ہے۔''

''اسی لیے تمہیں قدر نہیں۔'' اس نے فوراً طنز کیا اور وہ بے پروائی سے رخ پھیر گیا۔

''قدر ہے تو یہاں آیا ہوں یار! ورنہ میرا کیا پڑا ہے یہاں۔ اب بتاؤ بھلا دوست کے گھر تک کیسے جاؤں گا میں؟'' وہ پریشان ہوا تو امامہ بھی فکر مند ہوگئی۔

''پریشان کیوں ہوتے ہو' اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔ کسی دوست کو کال کرو۔''

''کیسے کال کرلوں' ایک روپے کا بیلنس نہیں ہے پتا نہیں کیا ہوگا۔''

متفکر لہجے میں کہتا وہ بار بار اس کی کلائی میں پڑے خوب صورت کنگن کو دیکھ رہا تھا۔ امامہ نے کچھ سوچتے ہوئے کنگن اتار کر اسے دیے۔

''یہ رکھ لو ارسلان! کچھ روز کے لیے تو پیسوں کا انتظام ہو ہی جائے گا۔''

''نہیں' تمہارا پہلے ہی بہت قرض ہے مجھ پر۔''

''اف بیگانوں جیسی باتیں مت کیا کرو' مشکل میں اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں اور یہ کنگن تو بہت معمولی ہیں ارسلان! تم تو مجھ سے میری جان بھی مانگ لو تو میں کبھی انکار نہ کروں۔''

اس کے لہجے میں کچھ تھا جو وہ چونک کر اسے دیکھنے پر مجبور ہوا تھا۔ وہاں اس سادہ سے چہرے پر کیسی سچائی' کیسا نور تھا۔ ارسلان کا دل چاہا وہ اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اس مادہ پرست دنیا سے کہیں دور چلا جائے۔ مگر اگلے ہی پل اس نے سر جھٹک دیا۔ وہ وقت جذبات کے بہاؤ کا نہیں تھا۔ ہوش سے کام لینے کا تھا۔ تبھی اس نے امامہ کے ہاتھ تھامے۔

''تم بہت عظیم لڑکی ہو امامہ! دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ہو تم۔ مجھے تم پر ہمیشہ فخر رہے گا۔''

''بس' زیادہ ممنون ہونے اور جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے آہستگی سے ہاتھ چھڑا کر اس کے کندھے پر ہلکا سا مُکا رسید کیا تو وہ سرشار ہو گیا۔ پندرہ بیس منٹ امامہ کو وہاں اپنے سامان کے پاس کھڑا رکھنے کے بعد وہ واپس آیا تو اس کے پاس کچھ نوٹ تھے۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ اتنی جلدی اسے کوئی جیولر کیسے اور کہاں سے مل گیا؟

''بہت شکریہ' لگتا ہے اللہ نے تمہیں میری مدد کے لیے ہی بھیجا ہے۔ اب گھر جاؤ گی یا میرے ساتھ چلو گی؟'' وہ خوش دکھائی دے رہا تھا۔

''نہیں میں گھر جاؤں گی' شجاع آنے والے ہوں گے' تم جاؤ اب' پھر ملتے ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ آؤ پہلے تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ اس فائل کا پتا تو نہیں چلا ہو گا تمہیں۔''

''نہیں۔'' وہ اس سوال پر ہمیشہ شرمندہ ہو جاتی تھی۔

''پتا تھا مجھے' اس ایس پی کا دل جیت لیا۔ اس کے اعتبار پر پوری اتر گئیں۔ دل میں اتر گئیں۔ یہاں تک کہ شادی بھی رچالی مگر وہ فائل نہ ڈھونڈ سکیں' کتنی مضحکہ خیز بات ہے یہ۔'' وہ ہنسا تھا امامہ نظریں چُرا گئی۔

''چلو تمہارا گھر بس گیا' میری خیر ہے۔''

اب وہ ٹیکسی روک رہا تھا۔ امامہ سر اٹھانے کے قابل نہیں رہی۔

''تم سمجھتے ہو یہ سب میری خوشی سے ہوا ہے؟ میری خوشی سے نہیں ہوا کچھ بھی۔ بہت مجبور تھی میں صرف تمہارے لیے، تمہاری محبت میں سرخرو ہونے کے لیے یہ سب کرنا پڑا مجھے' مگر اب میں مزید وہاں نہیں رہ سکتی' میں طلاق لے لوں گی اس ایس پی سے۔ اب مزید کسی امتحان میں پڑنا گوارا نہیں ہے مجھے۔''

''ٹھیک ہے اب چلو۔'' گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے ٹیکسی کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا اور امامہ سارے راستے' شجاع حسن سے علیحدگی کے بہانے سوچتی رہی۔ وہ گھر آئی تو شجاع مضطرب سا اوپر ٹیرس پر ٹہل رہا تھا۔ گھر کے چاروں طرف ڈیوٹی دیتے درجنوں سپاہیوں نے اسے ٹیکسی سے ارسلان کے ساتھ نکلتے دیکھا تھا۔

وہ ابھی اسے اپنا خیال رکھنے کی ہدایت کرنا ہی چاہتی تھی کہ وہ اس سے جان چھڑا کر جلدی سے دوبارہ ٹیکسی میں جا گھسا اور اگلے ہی پل وہاں سے یہ جا' وہ جا۔ وہ خجل سی اندر آئی تھی۔ جس وقت اس نے لاؤنج میں قدم رکھے شجاع سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ وہ اسے مقابل پا کر ٹھٹک گئی۔

''کہاں سے آ رہی ہو اس وقت اور کس کے ساتھ آئی ہو؟''

اس وقت وہ اس کے مشفق شوہر سے زیادہ پولیس آفیسر ہی لگ رہا تھا۔

امامہ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔

''وہ...... کزن تھا میرا...... باہر سے آیا ہے ائرپورٹ سے لینے گئی تھی اسے......!''

''چٹاخ!''

پوری وضاحت دینے سے قبل ہی جاندار طمانچہ پڑا تھا اسے۔ وہ منہ کے بل زمین پر جا گری۔

''نفرت ہے مجھے دھوکے باز عورت سے' سمجھیں تم۔''
اگلے ہی پل وہ دہاڑا تھا اور اسی غصے میں تیز چلتا وہاں سے نکل گیا۔ امامہ کے حواس اس کے جاندار تھپڑ اور غیر متوقع الفاظ پر دیر تک بحال نہ ہو سکے۔

❋❋❋

''تم نے ایان ملک کے ساتھ اچھا نہیں کیا علیزہ۔'' وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ ایک طوفان سے گزر کر بیٹھی تھی۔ جب اس کی دوست صاحبہ نے اس سے کہا۔
''وہ اچھا لڑکا تھا' تمہیں کم از کم اسے اپنے انتقام کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہیے تھا۔''
''کیوں نہیں چڑھانا چاہیے تھا؟ وہ بھی تو ایک مرد تھا۔''
''مردوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ وہ شہزاد جیسا نہیں تھا۔''
''شہزاد جیسا کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔'' وہ چلائی تو صاحبہ اسے دیکھتی رہ گئی۔
''ہاں' جس نے تیرے جیسی بے وقوف کو ذلیل کیا' بدنام کیا' دھتکارا' خاک چٹائی اس جیسا کوئی ہو بھی کیسے سکتا ہے۔''
''تم زخم اُدھیڑنے آئی ہو میرے؟'' صاحبہ کے طنز پر وہ پھر چلائی۔ کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ علیزہ کی آنکھوں میں اب آنسو جھلملا رہے تھے۔
''مرد کبھی بھی قصور وار کہاں ہوتا ہے' سارے قصور سارے ستم ساری جفائیں کر کے بھی' ہمدردیاں مرد کے حصے میں آتی ہیں اور پھٹکار عورت کے حصے میں۔ قصور تو ہم لڑکیوں کا ہوتا ہے صاحبہ' جو کبھی باپ کی عزت پر اپنا آپ قربان کر دیتی ہیں تو کبھی بھائیوں کی اونچی ناک پر اپنے حسین خوابوں کا گلہ گھونٹ دیتی ہیں۔ ساری عمر خوش رہنے کی کوشش میں اون کے گولوں کی مانند ادھڑتی ہی چلی جاتی ہیں۔ کبھی اپنے لیے نہیں سوچتیں۔ کبھی اپنے من کی خوشی کی پروا نہیں کرتیں۔ بس بکھرتی ہی چلی جاتی ہیں۔'' شدتِ کرب سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ صاحبہ نے اسے ساتھ لگا لیا۔
''لڑکی' لڑکی میں فرق ہوتا ہے یار! بہت اعتبار کھو دیا ہے ہم لڑکیوں نے بھی اپنا۔ ذرا سوچ سارے گاؤں میں جو تیرے حویلی سے بھاگ جانے کی افواہ اُڑی ہے کیا تیرے منگیتر تک بات نہیں پہنچی ہو گی۔ اس نے اگر شادی سے انکار کر دیا تو؟''
''مجھے نہیں پتا یار! بس تو دعا کر میرے لیے۔'' وہ شدید اضطراب کا شکار تھی۔
صاحبہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اس کے گال سہلاتی' وہاں سے اُٹھ گئی۔ اسے ابھی چارا کاٹنا تھا' گائیوں کو اندر باندھنا تھا' شام کی ہانڈی پکانی تھی۔ بہت سے کام اس کی جان کو پڑے تھے۔ وہ ابھی حویلی سے نکلی تھی کہ سانول شاہ کا فون آ گیا۔ وہ جو پہلے ہی بہ مشکل اس شادی کے لیے مان رہا تھا اب علیزہ کے حویلی سے فرار کی خبر کے بعد قطعی طور پر اس سے شادی سے انکاری ہو گیا۔ گو اس جسارت پر اسے حویلی سے بے دخل ہونا پڑا تھا مگر اس نے کسی صورت بڑے بھائی کی یہ بات نہیں مانی۔ جو سراسر اس کی توہین اور مردانگی پر چوٹ لگاتی تھی۔ ماں کی خواہش اور بچپن کی منگ ایک طرف..... مگر وہ تو داغ لگا سوٹ نہیں پہنتا تھا پھر ساری عمر کے لیے داغ لگی بیوی کیسے قبول کر لیتا۔

علیزہ کو لگا قدرت نے اسے منہ کے بَل گرا دیا ہو۔

❁❁❁

"آپ نے مجھے بلایا پاپا!"

ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ کراچی واپس پہنچا تھا جب آزر صاحب (عباد کے پاپا) کی طرف سے بلاوے کا پیغام آ گیا۔ کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کرتا اگلے پانچ منٹ میں وہ ان کے حضور پیش ہوا۔ ہادیہ شکایتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی' آزر صاحب سے جڑ کر بیٹھی تھی جب کہ نیچے ہال میں اس کی مما' مہندی کے فنکشن کی تیاری کے لیے ملازمین کو ہدایت دے رہی تھیں۔

"ہاں' آؤ' بیٹھو۔" وہ جان گیا کہ ضرور ہادیہ نے اس کی شکایت کی ہے۔ تبھی ایک کڑی نظر اس پر ڈالتا وہ آزر صاحب کے قریب بیٹھ گیا۔

"جی پاپا۔"

"پاپا کے بچے' آج کل ہوتے کہاں ہو تم؟ شادی والا گھر ہے۔ سو کام ہیں' مگر تمہارا کوئی اتا پتا نہیں' بزنس ہے تو وہ تمہاری توجہ کو ترس رہا ہے' ادھر یہ بچی ہے جو سمندر پار سے صرف تمہارے لیے تم سے کچھ سیکھنے کے لیے آئی ہے مگر اس کے لیے تمہارے پاس کوئی وقت نہیں' کر کیا رہے ہو تم آج کل؟" وہ برہم ہو رہے تھے اس پر۔ عباد، ہادیہ کو دیکھ کر رہ گیا۔

"سوری پاپا! وہ اصل میں شاہ کے ساتھ کچھ مسائل چل رہے ہیں۔ گزشتہ روز کچھ قریبی عزیزوں اور بہن کا انتقال بھی ہو گیا۔ اس کو اس وقت میری ضرورت ہے اس لیے اسی کے ساتھ ہوتا ہوں۔"

"وہ ٹھیک ہے مگر باقی رشتوں کے بھی کچھ حقوق ہیں تم پر' بہر حال تمہارے چچا' کل ہانیہ کے نکاح کے موقع پر تمہارا اور ہادیہ کے رشتے کا بھی اعلان کرنا چاہ رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ تم کیا کہتے ہو؟"

"میں نے کیا کہنا ہے پاپا! جیسی آپ کی مرضی۔"

"شاباش' اب شکایت نہیں ہونی چاہیے' چلو ہادیہ بیٹی کو کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ اسے مارکیٹ گھما لاؤ۔ جب سے یہاں آئی ہے ایک بار بھی کہیں نہیں گئی' تمہارے ساتھ۔" اگلے ہی پل نیا حکم جاری ہوا تو وہ کندھے اُچکاتا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ خود ہی نہیں جاتی پاپا! میں نے تو انکار نہیں کیا اسے کہیں لے جانے سے۔"

"بس رہنے دو' میرا منہ مت کھلواؤ انکل کے سامنے۔ وگرنہ بھاگنے کو جگہ نہیں ملے گی۔" فوراً سے پیشتر وہ بولی تھی۔ عباد مسکرا کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے شہزادی صاحبہ! آپ کو پاکستانی بازار دکھا لاؤں' کہیں اس سعادت سے محروم ہی نہ رہ جائیں آپ۔"

وہ پھر مسکرایا تو ہادیہ خفا خفا سی' منہ بناتی اُٹھ کر اس کے ساتھ چل دی۔

"بہت بے وقوف ہو تم ہادیہ' قسم سے۔"

گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ چپ نہیں رہ سکا تھا۔ جواباً وہ اسے گھورنے لگی۔

"تم اسی سلوک کے مستحق ہو' یہی طریقہ ہے تمہیں قابو کرنے کا۔"

''غلط' تمہارے پاس مجھے قابو کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔''
''مثلاً۔'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔
''مثلاً...... مثلاً ابھی بتاؤں گا تو تم پھر پاپا سے شکایت کروگی۔ شادی کے بعد بتاؤں گا۔''
''شادی کے بعد میں نے تمہیں لفٹ ہی نہیں کروانی۔'' وہ ہنسی۔
''ایسی کی تیسی تمہاری۔ دیکھوں گا کیسے لفٹ نہیں کرواتیں۔ بہت چیکو قسم کا شوہر ثابت ہوں گا میں تمہارے لیے۔ دعائیں مانگا کروگی تم کب آفس کا ٹائم ہو اور میں تمہاری جان چھوڑوں۔''
''تم ڈرا رہے ہو مجھے؟''
''نہیں' آگاہ کر رہا ہوں۔ ابھی سے تیار کرلو خود کو۔''
''مما کہتی ہیں ابھی دو سال تک ہماری شادی کا کوئی امکان نہیں۔''
''تمہاری مما کہتی ہے نا' میری مما کا تو بس نہیں چلتا' وہ شام سے پہلے تمہیں بہو بنا کر گھر لے آئیں۔''
''اور مما کا بیٹا؟'' اس بار اس نے ترچھی نگاہوں سے عباد کو دیکھا۔
''آہ' اس کا کیا پوچھتی ہو یار' اس کا تو بس نہیں چلتا۔ اسی تقریب میں تمہاری رخصتی کروا کر تمہیں ہمیشہ کے لیے یہیں رکھ لے واپس جانے ہی نہ دے۔''
ابھی وہ مزید کچھ کہتا کہ موبائل اسکرین پر صاعقہ کے نام پر محفوظ ''اجنبی'' جگمگا اٹھا۔ صرف ایک پل کے لیے اس نے گاڑی آہستہ کی اور فوراً کال کاٹ دی۔ مگر اگلے ہی پل پھر وہی نام جگمگانے لگا۔ تب مجبوراً اسے بات کرنی پڑی۔
''جی السّلام علیکم!''
''وعلیکم السّلام! زین آپ کہاں ہو؟ مجھے اس وقت آپ کی ضرورت ہے۔'' دوسری طرف وہ پریشان تھی۔ عباد کا دل دھڑک اُٹھا۔
''خیریت! کہاں ہو اس وقت؟''
''خیریت نہیں ہے اسپتال میں ہوں' امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''
''ٹھیک ہے میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔'' سرعت سے کہتے اس نے کال ختم کی تو ہادیہ نے پوچھا۔
''کس کی کال تھی؟''
''دوست تھا یار! کوئی کام پڑ گیا ہے اسے مجھ سے' بلا رہا تھا۔''
''بلا رہا تھا کہ بلا رہی تھی؟'' وہ مشکوک ہوئی تو وہ فوراً بولا۔
''خدا کا نام لو یار! تم ایسا سمجھتی ہو مجھے؟''
''مرد ذات کا کوئی اعتبار نہیں' لوٹے کے پیندے کی طرح ایمان پھرتا ہے عورت کے معاملے میں ان کا۔''
''پھرتا ہوگا میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں' میری زندگی میں ہر فرد کی علیحدہ جگہ ہے۔ اب کہو تو خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم اٹھا کر یقین دلاؤں؟''

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اتنا تو مجھے پتا ہے کہ بالکل شریف نہیں ہو تم' کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہو گا۔ وہ جو تین دن گھر سے باہر رہے تھے۔ فون بھی بند تھا۔ وہ یونہی تو نہیں تھا۔"

"شاہ زر کی وجہ سے پریشان تھا یار! بتایا تو تھا کتنے بڑے حادثے سے گزرا ہے وہ۔"

"ٹھیک ہے چلو پہلے کسی اچھے سے میڈیکل اسٹور پر چلتے ہیں۔ پاپا کے لیے دوا لینی ہے۔ پھر آپ چلیں گے۔"

"جو حکم۔" ہادیہ کے کہنے پر اس نے گاڑی موڑی اور اس سے دوا کا نسخہ لے کر قریبی اسٹور کے سامنے گاڑی روک دی۔ ہادیہ اس کے منع کرنے کے باوجود اس کے ساتھ ہی گاڑی سے نکل آئی۔ اس وقت وہ اسٹور میں داخل ہونے لگے اچانک باہر نکلتی صاعقہ سے عباد کا ٹکراؤ ہو گیا۔

"زین!" وہ اسے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی جبکہ عباد گھبرا گیا۔

"سوری...... میں آپ کو نہیں جانتا۔"

جلدی سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ جب کہ صاعقہ کو لگا جیسے وہ وہیں پتھر ہو گئی ہو۔ اسے سمجھ والی اس کی نظر نے دھوکا کھایا ہے۔ سماعتوں نے' یا پھر دل نے؟ وہ شخص کوئی عام سا تھرڈ کلاس لڑکا نہیں تھا۔ جو گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتا۔ مگر وہاں تو حلیے کے ساتھ ساتھ اس شخص کی آنکھوں کا رنگ ہی بدل گئے تھے۔ وہ ہاتھ میں پکڑے سستی ترین دوائیوں کے شاپر کو دیکھتی' جیسے بے یقینی کے انداز میں ایک بار پھر پلٹ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ ہادیہ پر اس نے دھیان ہی نہ دیا کہ وہ کون ہے جو اس کے ساتھ آئی ہے۔ وہ تو صرف اسے دیکھ رہی تھی جو کسی دیوی کی مانند' اس کی یوں پرستش کرتا تھا گویا وہ خود سچ مچ کا کوئی پجاری ہو۔ اس لمحے اچانک ذہن میں آئے خیال کے تحت اس نے فوراً اس کا نمبر ملایا تھا اور اسی وقت وہاں میڈیکل اسٹور میں اس کے موبائل پر لگی مخصوص گھنٹی گونجی تھی۔ کیا وہ ہار گیا تھا؟

عباد نے اس کی کال فوراً کاٹ دی۔ تب شکستہ قدموں کو گھسیٹتی وہ آگے بڑھی' محبت کے بھی اصول ہوتے ہیں۔ معیار ہوتا ہے اور اس کا تعلق جس کلاس سے تھا وہاں کسی کو محبت کے نام پر فول تو بنایا جا سکتا تھا۔ بہلایا تو جا سکتا تھا مگر خالص محبت دان نہیں کی جا سکتی تھی۔ عباد نے اس اسٹور سے نکلنے کے بعد صرف ایک بار پلٹ کر دیکھا تھا اور پھر سے سیلز مین کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ چل رہی تھی اور سامنے راستہ جیسے دھندلا رہا تھا۔ ابھی دو روز پہلے ہی تو کتنی آسانی سے کہا تھا اس نے کہ وہ دکھ اٹھا سکتی ہے' ذلت نہیں اٹھا سکتی' مگر اس وقت اس سے وہ "دکھ" نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے ٹھوکر لگی تھی اور لڑکھڑا گئی۔ اسے لگا اس کے منہ پر صائمہ نے طمانچہ مارا ہو اور کہہ رہی ہو۔

"کہا تھا ناں تجھ سے' مت چنو وہ راہیں جن پر چل کر پچھتانا پڑے۔ دکھ اٹھانا پڑے۔ کہا تھا نا' لوئر مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی ہو تم لوئر مڈل کلاس گھرانے کی۔ جہاں صرف خواب دیکھے جاتے ہیں ان کی تعبیر پانے کی ضد نہیں کی جاتی۔ ورنہ یہ معاشرہ' اس معاشرے کے لوگ گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ نوچ لیتے ہیں کنواری آنکھوں کے خوشنما خواب' کب سمجھو گی یہ حقیقت کب عقل آئے گی تمہیں؟"

اور وہ بے بس سی' چہرہ چادر میں چھپائے بس روتی رہی۔ میڈیکل اسٹور سے اسپتال تک کا لمبا فاصلہ کب طے ہوا۔ اسے اپنے خیالوں اور اذیت میں احساس ہی نہ ہو سکا۔ وہ تو اس وقت چونکی

جب کسی نے اس کا نام لے کر اسے آواز دی۔

''صاعقہ!'' وہ وہ جو گم صم سی چل رہی تھی اس نے فوراً سر اٹھا کر سامنے دیکھا تھا۔

''ایان بھائی! آپ؟'' آنسوؤں سے بھری آنکھیں حیرت کی شدت سے پھیلی تھیں۔ دوسری طرف ایان جو خود میں مگن جا رہا تھا' کا حال بھی اس سے مختلف نہ تھا۔

❁❁❁

سنو لوگو! میری آنکھیں خریدو گے؟
مجھے اک خواب کا تاوان بھرنا ہے
اک ایسا خواب تھا جو جاگتی آنکھوں نے دیکھا تھا
بہت ہی چاؤ سے اور کتنے ارمانوں سے دیکھا تھا
مگر دیکھے ہوئے اس خواب کی تعبیر اُلٹی تھی
نہیں شکوہ کسی سے' اپنی ہی تقدیر اُلٹی تھی
جواب تک ہو چکا ہے مجھ کو وہ نقصان بھرنا ہے
اب آنکھیں بیچ کر ہی خواب کا تاوان بھرنا ہے

کمرے میں اندھیرا کیے' تنہا بیٹھا۔ وہ شافیہ کی تصویر کو سینے سے لگائے بے آواز رو رہا تھا۔ بے
درد زندگی کے سفاک لمحوں نے بالآخر اس سے خون کے آخری رشتے کو بھی چھین لیا تھا۔ وہ بہن ج
اس کی جان تھی' جس کے لیے اس نے اپنا جیون الجھا لیا تھا' کیسے بھاگ کر خاک میں چھپ گئی تھی ک
رہ گیا تھا اس کے پاس' کچھ بھی تو نہیں......!

پچھلے ایک ماہ سے اسے اپنی خبر نہیں تھی۔ سارا دن گھر سے باہر گزارتا۔ رات میں دیر سے واپس
لوٹتا تو اکثر کمرا بند کر کے شافیہ کی تصویر کو سینے سے لگا کر اس سے معافی مانگتا' بچوں کی طرح پھوٹ
پھوٹ کر رو پڑتا پچھلے ایک ماہ میں اس کی صحت اچھی خاصی گر گئی تھی۔ اب تو جو بھی اسے دیکھتا تھا اس
پر ترس کھاتا تھا۔ بریرہ جلے پیر کی بلی کی مانند لاؤنج میں کئی چکر لگانے کے بعد بالآخر اس کے کمرے
میں چلی گئی جو کمرے کے وسط میں کرسی ڈالے بیٹھا سر کرسی کی پشت گاہ سے ٹکائے سسک رہا تھا۔ و
ٹھنڈی سانس بھرتی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''شاہ زر......!'' اور اس نے فوراً آنکھیں کھولیں۔

''تمہیں' سکون چاہیے نا؟''

''ہاں......!''

''آؤ میں سکون دیتی ہوں تمہیں۔'' وہ سراپا محبت بنی کھڑی تھی۔

شاہ زر نے پھر سے پلکیں موند لیں۔

''مجھے میرے حال پر چھوڑ دو بریرہ! خدا کے لیے۔''

''آؤ تو سہی۔'' وہ زبردستی اس کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ رہی تھی۔ وہ کھڑا ہوا۔

''چلو وضو کرو' شاباش۔'' ہاتھ پکڑ کر اسے واش روم میں لاتے ہوئے اس نے اگلا حکم جاری ک

تھا جب وہ ہچکچا گیا۔
"نہیں میں اس پاک ذات کے سامنے جانے کے قابل نہیں ہوں۔"
"تم وضو تو کرو' اللہ بہتر جانتا ہے کہ تم کس قابل ہو۔" وہ اس کی ہمت بندھا رہی تھی۔ شاہ زر نے روتے ہوئے وضو مکمل کر لیا۔
"شاباش! چلو اب میں جائے نماز بچھا رہی ہوں' آ جاؤ اور خوب رو کر بھڑاس نکال لو اس ذات کے سامنے جس سے بڑھ کر کوئی غم خوار اور مہربان نہیں۔"
وہ خود نماز کی پابند نہیں تھی۔ مگر اسے وہ راہ دکھا رہی تھی جس میں سکون تھا' نجات تھی۔ شاہ زر نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر جھجکتے ہوئے جائے نماز پر کھڑا ہو گیا۔ بریرہ اس کی نیت کے بعد کمرے سے نکل گئی۔ اس روز دیر تک اپنے خالق حقیقی کے سامنے سجدہ ریز رہنے کے بعد وہ دل بھر کر رویا۔ جتنا وہ روتا رہا اتنا ہی دل کو سرور و قرار نصیب ہوتا جاتا۔ بہت تاخیر سے ہی سہی مگر اس نے حقیقی نجات کا راستہ پا لیا تھا۔

❋❋❋

ٹرین سست روی سے پٹریاں روندتی' اپنی مستی میں آگے بڑھ رہی تھی اور وہ کسی مجسمے کی مانند خاموش کھڑکی کی طرف بیٹھی باہر کے مناظر کو دیکھ رہی تھی۔ ذہن میں اس وقت بھی بریرہ رحمٰن کے نوکیلے جملے گونج رہے تھے۔
"تم خود کو سمجھتی کیا ہو انوشہ رحمٰن! یہی کہ تم دنیا کی سب سے زیادہ مظلوم لڑکی ہو' جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا۔ کسی کے ساتھ نہیں ہوا۔ کس ستم کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہو تم؟ ایک ریپ ہوا تمہارا اور تم نے سارا آسمان سر پر اٹھا لیا۔ یہاں ہزاروں لڑکیوں کے روز جسم بکتے ہیں اور وہ ماری جاتی ہیں۔ پر کسی کو احساس تک نہیں ہوتا ان کا' پھر تم یہ سب ڈراما کیوں کر رہی ہو۔ کیا اس نے جہاز گرایا' جس میں تمہاری ماں اور بھائی مرا' قدرت کا فیصلہ تھا یہ۔ پھر اسے سولی پر کیوں لٹکا رکھا ہے تم نے؟"
کیسی تلخی' کیسی نفرت تھی اس کے لہجے میں۔ انوشہ نے سر کھڑکی پر زور سے دے مارا۔ کیوں پیچھا نہیں چھڑا پا رہی تھی وہ اس بازگشت سے۔
کتنی سفاکی سے اس نے کہہ دیا تھا۔
"شرم آنی چاہیے آپ لوگوں کو' ایسی گھٹیا' غلیظ لڑکی کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ میری مامیے ایک کام کیجیے اسے فلم انڈسٹری میں چھوڑ آیئے۔ خوش بھی رہے گی اور چار پیسے بھی کما لے گی۔"
"اللہ......!" درد کی شدت سے پھٹتے سر اور آنکھوں کی جلن سے بے تاب ہو کر اس نے سر اٹھایا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے رو پڑی۔
"کیا بات ہے انوشہ! ٹھیک تو ہے ناں۔" نزہت بیگم جو اونگھ رہی تھیں اس کی کراہ پر بے دار ہو کر پریشانی سے پوچھنے لگیں۔ جواب میں وہ سر سیٹ کی پشت گاہ سے زور زور سے ٹکرانے لگی۔
"میں مر کیوں نہیں جاتی خالہ! عزت کی زندگی نہ سہی عزت کی موت تو دے ہی سکتا ہے وہ مجھے' میں کیا اس کی بندی نہیں ہوں۔ کون ترس کھانے والا ہے مجھ پر سوائے اس کے۔" وہ پھر رو رہی تھی۔
نزہت بیگم کا دل بھر آیا۔

''وہ اپنے خاص بندوں کو آزماتا ہے بیٹی! بندہ صبر کرے تو اس کے درجات بڑھا دیتا ہے۔ گلہ شکوہ کرے' اس کی ذات سے مایوس ہو تو چھوڑ دیتا ہے اسے اس کے حال میں خوش۔ اس کا کرم سب پر ہے۔ چاہے کوئی اس سے مانگے نہ مانگے۔''

دکھی دل سے وہ اسے تسلی دے رہی تھیں اور انوشہ ان کے کندھے سے لگی بے آواز روتی رہی۔

گاڑی کی رفتار رات بھر کے سفر کے بعد اب دھیمی ہو رہی تھی۔ شاید وہ کسی اسٹیشن پر رکنے والی تھی۔ انوشہ نے آہستہ سے پلکیں موندلیں۔ خشک آنکھیں' خشک لب اسے لگا جیسے حلق میں کانٹے چبھ رہے ہوں۔

''انوشہ...... وہ دیکھ......!'' نزہت بیگم نے اچانک اس کا کندھا ہلایا تھا۔ وہ پٹ سے آنکھیں کھول گئی۔

''کیا ہے خالہ؟''

''تیرا منا لگتا ہے' اُدھر دیکھ۔'' جمال صاحب ٹرین سے اُتر چکے تھے۔

انوشہ نے مچلتے دل سے بے قرار ہو کر اس طرف دیکھا تھا جدھر نزہت بیگم اشارہ کر رہی تھیں اور اسے لگا جیسے اس کا دل پھٹ جائے گا۔ وہ اس کا بیٹا ہی تھا' محض ڈھائی سال کا۔ اسے تو ٹھیک سے باتیں کرنا بھی نہیں آتی تھیں پھر بھی وہ ایک نابینا لڑکے کی قمیص کا دامن پکڑے وہاں اسٹیشن پر بھیک مانگ رہا تھا۔ کتنی معصومیت اور مظلومیت تھی اس کے چہرے پر' جانے کن لوگوں کے ہاتھ لگ گیا تھا وہ۔

اس لمحے ایک پل سے پیشتر وہ اٹھی اور لپک کر ٹرین سے باہر نکل گئی۔ بچہ اب دوسری طرف جا رہا تھا۔ وہ لوگوں کو پیچھے دھکیلتی کسی کی پروا کیے بنا اپنے بیٹے تک جا پہنچی۔

''چاند......!'' اس کی صدا پر بچے نے پلٹ کر دیکھا تھا اور اس پر نظر پڑتے ہی رو پڑا تھا۔

''مما!'' وہ اسے بھولی نہیں تھی' اس کے ذہن میں اس کا چہرہ محفوظ تھا۔ انوشہ نے اسے چوم کر سینے سے لگا لیا۔

''مجھے معاف کر دو میری جان' میں نے تم سے منہ موڑا' کسی اور کے گناہ کی سزا تمہیں دی۔ جب کہ تم بھی اتنے ہی بے قصور ہو جتنی کہ میں خود۔''

وہ بڑبڑا رہی تھی مگر بچہ اس کی کوئی بھی بات سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ بس رو رہا تھا۔ اس کے ساتھ گیارہ بارہ سال کا جو نابینا لڑکا ڈھونگ رچائے پھر رہا تھا۔ خوف کے مارے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ لوگ اب دائرے کی صورت میں وہاں جمع تھے اور انوشہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے بلند آواز میں روتی رہی۔

❋❋❋

''میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔''

شجاع حسن کے جاندار تھپڑ کے بعد فوری اس نے فیصلہ کیا اور اپنا مختصر سا سامان پیک کر کے وہ بیڈروم میں اسے اطلاع دینے چلی آئی۔ شجاع جو کسی کیس میں الجھا ہوا تھا۔ نظر اٹھا کر اسے دیکھنے کا روادار بھی نہ ہوا۔

''ٹھیک ہے' مجھے کوئی پروا نہیں۔'' کیسا غیر متوقع جواب تھا اس کا۔ وہ حیران رہ گئی۔ کوئی اتنا بھی بدل سکتا ہے۔

پریشانِ پریشان سی وہ اس کے کمرے سے نکل کر گڑیا کے کمرے میں آئی اور اسے پیار کرتے ہوئے اس پر کمبل ڈالتی باہر نکل آئی۔ اب وہ ارسلان کو فون کر رہی تھی۔ جس نے دوسری ہی بیل پر کال ریسیو کر لی۔

''ہاں مون! ابھی میں تمہیں ہی یاد کر رہا تھا۔''

''مجھے تم سے ملنا ہے ارسلان! ابھی اور اسی وقت۔''

''خیریت......؟''

''ہاں خیریت ہی ہے' کہاں ملو گے؟''

''تم نکلو گھر سے' میں آتا ہوں۔'' وہ شاید جلدی میں تھا۔

امامہ شجاع حسن کے محل کو ایک ٹھوکر پر رکھتی' اپنا بیگ اٹھائے اس کے گھر سے نکل آئی۔ گیٹ پر موجود گارڈ کسی طور اسے روکنے کا پابند نہیں تھا کیونکہ شجاع نے امامہ کو پورے اختیارات دے رکھے تھے۔ وہ جب چاہے جہاں دل کرے جا سکتی تھی۔ کتنے عرصے بعد اسے لگا جیسے وہ آزاد ہو گئی ہو۔ اس کی تمنا' اس کا خواب صرف اور صرف اپنی محبت' ارسلان کو پانا تھا اور اب اسے لگ رہا تھا جیسے ان دونوں کے بیچ کوئی دیوار نہ رہی ہو۔

سنسان سڑک پر روشنیوں کی پروا نہ کرتی وہ آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔

❁❁❁

ہم جگنو تھے' ہم تتلی تھے' ہم رنگ برنگے پنچھی تھے
کچھ ماہ و سال کی جنت میں ماں ہم دونوں بھی ساتھی تھے
میں چھوٹا سا اک بچہ تھا' تیری اُنگلی تھام کے چلتا تھا
تُو دور نظر سے ہوتی تھی' میں آنسو آنسو روتا تھا
اک خواب کا روشن بستہ تُو' ہر روز مجھے پہناتی تھی
جب ڈرتا تھا میں راتوں کو' تُو اپنے ساتھ سلاتی تھی
ماں تُو نے کتنے برسوں تک اس پھول کو سینچا ہاتھوں سے
جیون کے گہرے بھیدوں کو' میں سمجھا تیری باتوں سے
میں تیرے ہاتھ کے تکیے پر ماں اب بھی رات کو سوتا ہوں
ماں! میں چھوٹا سا اک بچہ' تیری یاد میں اب بھی روتا ہوں

مسجد کے وسیع احاطے میں بیٹھا وہ رو رہا تھا اور ساتھ ساتھ تسبیح بھی کر رہا تھا۔ جانے آج کیوں اسے اپنی مما بے حد یاد آ رہی تھیں۔ وہ ان کی گود میں منہ چھپا کر رونا چاہتا تھا۔ دل کا سکون پانا چاہتا تھا۔

کئی گھنٹے مسجد میں گزار کر رونے کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر سیدھا قبرستان چلا آیا' جہاں اس کی جنت مٹی کے ڈھیر میں چھپی' شہرِ خاموشاں کا حصہ بنی ہوئی تھی' شافیہ کی قبر بھی ان کے پہلو میں ہی

بنی تھی، جب کہ زاور اور صدف بیگم کی قبریں ساتھ ساتھ تھیں۔

مٹی کے ان بڑے ڈھیروں کے نیچے' کیسے کیسے محبوب رشتے' کیسے کیسے پیارے چہرے چھپ گئے تھے۔ وہ فاتحہ پڑھتا رہا اور کسی ننھے سے بچے کی مانند بلک بلک کر روتا رہا۔ اگلے کئی گھنٹے رو کر دل ہلکا کرنے کے بعد وہ شکستہ سا اٹھا اور گاڑی میں بیٹھ کر انوشہ کے گھر کی طرف چلا آیا مگر وہاں دروازے پر تالا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

قدرے بوکھلاہٹ میں ساتھ والوں کا دروازہ کھٹکھٹایا تو ایک ادھیڑ عمر خاتون نے سر باہر نکالا۔

''السلام علیکم آنٹی! یہ ساتھ والے آپ کے پڑوسی......؟''

''وہ تو کل یہاں سے چلے گئے بیٹا! اپنا سارا سامان سمیٹ کر۔''

''چلے گئے...... کہاں چلے گئے......؟'' بہت زور کا دھچکا لگا تھا اسے، جب وہ خاتون بولی۔

''پتا نہیں...... کچھ بتا کر نہیں گئے' بس یہی کہا کہ اب اس شہر میں دل نہیں لگتا۔''

خاتون کا لہجہ سادا تھا۔ شاہ زر کو لگا وہ گر پڑے گا۔ پتا نہیں زندگی کو ابھی اس سے اور کتنے امتحان مطلوب تھے۔

انوشہ رحمٰن کے گھر سے اپنے گھر تک جیسے وہ پہنچا تھا وہی جانتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی بھی لمحے دل یا دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔ آنکھوں میں جیسے لہو اُمڈ آیا تھا۔ بُریرہ اس وقت کچن میں تھی جب وہ لاؤنج میں آ کر دھاڑا۔

''بُریرہ......!'' اور بُریرہ کے ہاتھ سے کرسٹل کی پلیٹ چھوٹ کر زمین پر جا پڑی۔

''اللہ خیر...... کیا ہو گیا؟'' گھبرا کر وہ فوراً کچن سے نکلی' جب وہ قہر برساتی نگاہوں سے اسے دیکھتا اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔

''کیا کہا تھا تم نے کل انوشہ سے' جو وہ لوگ راتوں رات شہر چھوڑ کر چلے گئے' بولو......؟''

اپنی انگلیوں کو اس کے گداز بازوؤں میں گاڑ کر زور کا جھٹکا دیا تھا اس نے' وہ سہم گئی۔ شاہ زر کا یہ روپ اس کے لیے بالکل نیا تھا۔

''کچھ نہیں......'' بہت مشکل سے وہ کہہ پائی' جواب میں شاہ زر نے اسے تھپڑ دے مارا۔

''بکواس نہیں سننی مجھے' جو سچ ہے وہ بتاؤ۔''

وہ جنونی ہو رہا تھا۔ عین اسی لمحے سائلہ بیگم کے قدم اس کی دہلیز پر پڑے تھے' وہ بیٹی کو سرپرائز دینے' بنا بتائے آئی تھیں مگر بیٹی نے آگے ان کے لیے سرپرائز تیار کر رکھا تھا' ان کی آنکھیں جیسے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اتنی ہمت بھی نہ رہی تھی کہ دھاڑ کر شاہ زر کو آواز ہی دے سکتیں۔

''ممی......'' بُریرہ کی نگاہ ہی ان پر پڑی تھی اور وہ خود کو شاہ زر کی گرفت سے نکالتی فوراً ان کی طرف لپکی۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں......؟'' اگلے پل ان کا سکتہ ٹوٹا۔

شاہ زر غیر متوقع طور پر انہیں وہاں دیکھ کر خود پر ضبط کر گیا جب کہ بُریرہ رو پڑی۔

''گھٹیا' ذلیل' کمینے انسان! میں تو سمجھی تھی بہن کی موت نے تمہیں توڑ کر رکھ دیا ہوگا' تم خود کو سنبھال نہیں پا رہے ہو گے' اس لیے میری بیٹی کا' جو بدقسمتی سے تمہاری بیوی ہے' تمہارے پاس ہونا

ضروری ہے مگر مجھے کیا پتا تھا کہ تم تو جانور ہو بلکہ جانور سے بھی بدتر...... بہت غلط کیا میں نے جو اپنی شہزادیوں جیسی بیٹی تم جیسے جنگلی کے سپرد کردی۔" وہ بُریرہ کو چھوڑ کر اس کے مقابل آئی تھیں۔ شاہ زر نے رُخ پھیر لیا۔

"یہ صلہ ہے میری محبتوں اور احسان کا؟ ساری عمر بیٹا سمجھ کر دل سے لگا کر رکھا، ہر خواہش پوری کی اور تم اس کا بدلہ یوں دے رہے ہو، میری بیٹی کو جہنم میں جھونک کر۔" حلق کے بل چلاتی وہ آپے سے باہر ہو رہی تھیں، جب وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا۔

"لے جائیں اپنی لاڈلی کو یہاں سے، مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

"لے جاؤں گی، لے جانے کے لیے ہی آئی ہوں مگر تم یاد رکھنا، میں تمہارے ساتھ وہ کروں گی اس وحشت کے بدلے میں کہ ساری زندگی یاد رکھو گے۔"

"ٹھیک ہے کر لیجیے گا، جہاں حالات نے اتنے تھپڑ لگائے ہیں اس چہرے پر، وہاں آپ بھی لگا لیجیے گا، کوئی فرق نہیں پڑتا اب مجھے اس سے۔" ٹھہرے لہجے میں کہتا وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

سائرہ بیگم بُریرہ پر چڑھ دوڑیں۔

"یہی سب دیکھنے اور دکھانے کے لیے آئی تھیں یہاں، دیکھ لو! جوتے کی نوک پر رکھ کر چلا گیا ہے تمہیں، اب بھی یہیں رُکو گی؟"

"وہ بہت پریشان ہے مما۔"

"تو، میں نے کیا ہے اسے پریشان یا تم نے۔ کیا قصور ہے تمہارا جو وہ یوں تھپڑ مار رہا تھا تمہارے منہ پر۔"

"محبت......" بہت دھیرے سے اس نے کہا تھا مگر سائرہ بیگم نے سن لیا۔

"لعنت بھیجو ایسی محبت پر، جس میں عزت اور احساس ہی نہ ہو، تمہیں اچھے رشتوں کی کمی نہیں ہے بُریرہ! چلو میرے ساتھ۔"

"نہیں مما! وہ اس وقت حقیقت میں پریشان ہے، میں سنبھال لوں گی اسے۔"

"کیا سنبھالو گی، محبت سنبھالنے سے ہوئی ہے کبھی۔ وہ بھٹک گیا ہے، سمجھنے سمجھانے کی حد سے نکل گیا ہے، اب کچھ نہیں کر پاؤ گی تم۔ عورت چاہے زندگی سے پیاری کیوں نہ ہو، دل سے اُتر جائے تو اس کی جوتی کے برابر بھی اہمیت نہیں رہتی اس کی، تم بھی دل سے اُتر گئی ہو اس کے۔ اب کیا کرو گی یہاں رہ کر، اس مقبرے میں رہ کر؟" وہ تلخ ہوئی تو بُریرہ کا دل کٹ گیا۔

وہ شکستہ سی بیڈ روم میں آئی تو شاہ زر بیڈ پر نیم دراز، آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا۔ بُریرہ نے روتے ہوئے وارڈ روب کے پٹ کھولے، وہاں رکھا ہی کیا تھا جو وہ ساتھ لے جاتی، بس یونہی بے مقصد کپڑے اِدھر اُدھر کرتی رہی، جب تھک گئی تو شاہ زر کے پاس چلی آئی۔

"کیا واقعی اب تمہاری زندگی میں میری کوئی گنجائش نہیں رہی شاہ؟" کتنی ملول تھی وہ، اس نے آنکھوں سے بازو ہٹا دیے۔

"گنجائش ہے مگر زندگی نہیں رہی ہے یہ......! نہیں انصاف کر پا رہا میں تمہارے ساتھ، مجھے لگتا ہے تم یہاں رہیں تو میں تمہیں بھی گنوا دوں گا۔" اس کا لہجہ نم تھا۔ وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

''تو تم چاہتے ہو میں تمہاری زندگی سے چلی جاؤں' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے؟''

''نہیں...... مجھے بس کچھ وقت چاہیے' میرے اندر ابھی بہت اضطراب ہے' طوفان ہے' ابھی پلیز تم آنٹی کے ساتھ چلی جاؤ' میں وعدہ کرتا ہوں' ٹھیک ہوتے ہی تمہیں خود لینے آؤں گا۔''

وہ اسے اپنے پنجرے سے رہائی دے رہا تھا۔ بُریرہ جھوٹی تسلی پر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آئی ایم سوری بُریرہ! ایم رئیلی ویری سوری!'' اس کے کھڑے ہونے پر اس نے بہت محبت سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

''کاش! ہم لڑکیوں کا دل بھی خدا تم مردوں جیسا بنا دیتا۔ ہمیں بھی فرق نہ پڑتا کسی کو کھودینے سے' ہر نئے موڑ پر' نئے چہرے سے محبت کا عہد کرتے ہوئے' ہمیں بھی پچھلی محبتیں یاد نہ رہتیں۔ کاش! یہ بے وفائی ہمارے لیے بھی اتنی آسان ہوتی شاہ زر...... کاش......!'' وہ دل برداشتہ ہوئی تو شاہ زر بیڈ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''تمہیں بھلانا اور کھونا آسان نہیں ہے میرے لیے......''

اس سے زیادہ شاید وہ خود کو یقین دلا رہا تھا۔ بُریرہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اس نے اپنے لب اس کی پیشانی پر دھر دیے۔

''میری جان ہو تم بُریرہ رحمٰن! مگر کاش میں اپنے اختیار میں ہوتا۔''

جانے کیا ہوا تھا اسے کہ بھیگے لہجے میں اپنی بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے اس نے بُریرہ کو کسی قیمتی متاع کی طرح اپنی پناہ میں جکڑ لیا یوں کہ اس سے سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔

''کاش! میں زبردست پکڑ والے کی گرفت میں نہ آیا ہوتا' کاش......!'' بُریرہ کے کندھے پر چہرہ ٹکائے' وہ اب ٹوٹ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اس کی دھڑکنیں سنتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد نیچے آ کر اس نے سائلہ بیگم سے معافی مانگی تھی اور بہت مشکل سے انہیں منایا تھا۔ اگلے ایک ہفتے کے لیے اس نے زبردستی انہیں اپنے پاس روک لیا۔ وہ اس کی ماں نہیں تھیں مگر ماں جیسی تو تھیں۔ ان کے وجود سے اَسے اپنی مما کی خوش بُو آتی تھی' لہٰذا روز آفس سے واپسی کے بعد وہ اپنا تمام وقت بُریرہ اور ان کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔

اس ایک ہفتے میں نماز اور بُریرہ کے ساتھ ساتھ سائلہ بیگم نے بھی اسے خاصا سنبھالا تھا۔ وہ ان کے ساتھ ہی انگلینڈ چلے جانا چاہتا تھا مگر جو دل اور روح پر بوجھ تھا وہ اسے کسی صورت قرار لینے نہیں دے رہا تھا۔ انوشہ اور بیٹے کی گمشدگی جیسے پھانس بن کر سینے میں چبھ گئی تھی۔ ایک ہفتہ اپنی بیوی اور ساس کے ساتھ خوب انجوائے کرنے کے بعد اس روز جب وہ انہیں ائرپورٹ چھوڑنے آیا تو بہت اداس تھا۔

تمام راستے بُریرہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہا تھا اور وہ ایک ہاتھ سے گاڑی سنبھالے رہا' دو تین بار بُریرہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکالنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ہر بار اس کی کوشش ناکام بنا کر گرفت مضبوط کر لی۔

ائرپورٹ کی عمارت کے باہر گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی تھی۔ انگلینڈ کے لیے روانہ ہونے والی فلائٹ میں ٹائم بہت کم رہ گیا تھا۔ شاہ زر آخری وقت تک بُریرہ کے ساتھ رہا۔ وقتِ رخصت اس

نے بُریرہ کی پیشانی چومی تھی جس پر وہ اس کا ہاتھ تھام کر رو پڑی۔

''لو یو سوچ شاہ...... آئی آل ویز مس یو اِن مائی لائف......''

''می ٹو......'' نرمی سے کہتے ہوئے اس نے بُریرہ کا ہاتھ تھپتھپایا۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی سائلہ بیگم کے پیچھے لپکتی پلٹ گئی۔ شاہ زر دیر تک ان دونوں کو رخصت ہوتا دیکھتا رہا۔

❀❀❀

گاڑی کی ہیڈ لائٹس اس کی آنکھوں میں پڑی تو وہ رُک گئی۔

سنسان روڈ پر جھٹکے کے ساتھ رُکی گاڑی سے ارسلان باہر نکلا تو امامہ کا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر اور شرٹ میں وہ کتنا پیارا لگ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی وہ آئے گا' ضرور آئے گا اور وہ آ گیا تھا۔ وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھی۔

''مون! تم ٹھیک ہو......؟'' وہ پریشان تھا جب وہ مسکرائی۔

''ہاں! الحمدللہ...... کیوں کیا ہوا؟''

''وہ! تم نے ایمرجنسی میں بلایا تو میں فکر مند ہو گیا کہ جانے کیا ہوا ہے؟''

''پاگل ہو تم اور کچھ نہیں' میں نے تو اس لیے بلایا تھا کہ میں نے شجاع کا گھر چھوڑ دیا ہے' بس آج سے ہم اکٹھے رہیں گے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' اس کے چہرے کا رنگ اُڑا تھا۔

''کیوں...... کیوں ممکن نہیں؟ اب کس کا پریشر ہے تم پر؟ ہم نکاح کر سکتے ہیں ارسلان......!''

''نہیں کر سکتے...... نہ میرے پاس کوئی جاب ہے نہ ٹھکانہ ہے' کہاں رکھوں گا تمہیں؟''

''جہاں تم رہو گے میں بھی وہیں رہ لوں گی' تم کہو گے تو سڑک کنارے جھونپڑی میں بھی رہ لوں گی' تمہارے ساتھ۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا مون اور کچھ نہیں' اچھی بھلی سکون سے رہ رہی ہو' کیوں چھوڑ کر آئی ہو وہ گھر؟''

''تمہاری وجہ سے کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں' اس ایس پی سے نہیں۔''

''تو کیا ہوا؟ محبت انسان کا پیٹ نہیں بھرتی' ابھی میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تمہاری ذمہ داری اٹھا سکوں' لہٰذا پلیز واپس چلی جاؤ مون! بلکہ آؤ میں خود تمہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔''

''ہرگز نہیں...... میں واپسی کے سارے راستے بند کر آئی ہوں' اب وہاں پلٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''تم حماقت کر رہی ہو مون! مگر میں تمہیں یہ حماقت نہیں کرنے دوں گا؟''

''کیوں...... کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتے؟''

''کرتا ہوں' مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہاری ہر حماقت پر سمجھوتا بھی کر لوں' ابھی میں جن لڑکوں کے ساتھ رہ رہا ہوں وہ اچھے لوگ نہیں ہیں' میں نہیں چاہتا کہ تم ان کی نظروں میں آؤ۔''

''مجھے کچھ نہیں پتا' بس مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے۔'' وہ اپنی ضد پر اڑی تھی۔ ارسلان کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

''ٹھیک ہے' ایک شرط پر تم میرے ساتھ رہ سکتی ہو۔''
''مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔'' وہ جذباتی ہوئی تھی جب وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
''تو ٹھیک ہے' جس گھر میں تم ایس پی شجاع حسن کے ساتھ رہ رہی ہو وہ اپنے نام کروالو' میں وعدہ کرتا ہوں فوری نکاح کرلوں گا تم سے۔''
''کیا......؟'' اسے حیرت سے جھٹکا لگا۔
''حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے' میں کوشش کر کے جاب ڈھونڈ سکتا ہوں' گھر بنا کر نہیں دے سکتا تمہیں۔ اس لیے جس گھر میں رہ رہی ہو وہ اپنے نام کروالو' تاکہ بعد میں کوئی پریشانی نہ ہو۔'' وہ اس کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہا تھا۔ امامہ پریشان ہوگئی۔
''وہ اپنا گھر میرے نام کیوں کرے گا' اب تو شاید وہ مجھے طلاق بھی دے دے۔''
''کیوں! اب کیا ہوگیا ہے؟''
''بہت کچھ...... اس نے مجھے تمہاری گاڑی سے نکلتے دیکھ لیا تھا' میں نے جھوٹ بولا تو اس نے تھپڑ مارا' جس پر میں اس سے جھگڑا کر کے چلی آئی۔''
''بہت غلط کیا تم نے' میں اس کی جگہ ہوتا تو جانے کیا کر بیٹھتا۔''
''ارسلان......!'' ارسلان نے رُخ پھیر لیا۔
''تم زندگی میں کچھ بھی نہیں کر سکتیں امامہ حسن! انتہائی بے کار فضول لڑکی ہو تم' تمہاری جگہ میں ہوتا تو اب تک جانے کتنا کچھ ہتھیا چکا ہوتا اس ایس پی سے۔''
''ایس پی نہیں رہا اب وہ' ڈی آئی جی بن چکا ہے اور مجھے چیزوں سے کبھی محبت نہیں رہی' سنا تم نے۔''
''جو بھی ہو' مگر مجھے ابھی سرمائے کی ضرورت ہے' تم نے اب تک میرے لیے کچھ نہیں کیا' اب کرنا ہوگا' جیسے بھی ہو وہ گھر اپنے نام کراؤ۔''
''میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔''
''تو ٹھیک ہے پھر آج کے بعد تمہارے اور میرے راستے جدا جدا ہیں۔'' ایک لمحے میں اس نے فیصلہ سنا دیا تو امامہ کی آنکھیں جیسے جل اُٹھیں۔
''ایک اور آپشن بھی ہے میرے پاس اگر تم قبول کرنا چاہو۔'' فوراً سے پیش تر اس نے اپنے فیصلے میں ترمیم کی تھی۔ وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔
''یہ دیکھو......! یہ بے ہوشی کی دوا ہے' میں سوچ رہا تھا کہ ضرور میری وجہ سے شجاع نے تمہیں ٹارچر کیا ہوگا تو یہ دوا اسی وقت خرید لی تھی میں نے' شام کو دو گی تو صبح ہی اُٹھے گا' تب تک تم اس کی ہر قیمتی چیز' چیک بک جو بھی ہاتھ لگتا ہے ہتھیا لینا' یقیناً گارڈ تمہیں روکنے کی جرأت نہیں کرے گا' پھر اس کے بعد اگر اس ایس پی کو پتا بھی چل جاتا ہے تو کوئی پریشانی کی بات نہیں' زیادہ سے زیادہ وہ تمہیں طلاق ہی دے گا' دے دے۔ اِدھر وہ فارغ کرے گا اور اُدھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا' یہاں سے کہیں دور۔ جہاں کوئی ہمیں پریشان کرنے والا نہ ہو' ٹھیک ہے نا!''
بڑی مہارت سے جال پھینکتے ہوئے وہ اپنے پہلے سے پلان کیے منصوبے پر عمل کر رہا تھا۔ امامہ

بے بسی سے اسے دیکھتی آخری بازی کے طور پر یہ فعل سرانجام دینے کے لیے بھی تیار ہوگئی تھی، جس کے لیے اس کا دل اسے کسی طور پر اجازت نہیں دے رہا تھا۔

❊❊❊

سنسان سڑک پر ارسلان حیدر اسے تنہا چھوڑ کر گاڑی میں واپس جا بیٹھا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس کی محبت اس کے مفاد اور شرائط سے مشروط تھی۔

وہ اس کے معیار اور مفاد پر پوری اُترنے کے لیے ہلکان ہوتی جارہی تھی مگر وہ شخص تھا کہ اب بھی اس سے خوش نہیں تھا۔ خطرناک موسم کے تیور بدلے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ بادلوں نے بھی اپنے انمول موتی گرانے شروع کر دیئے تھے۔

اس کے شکستہ قدموں کی رفتار میں تیزی آئی تھی، جب کہ دل بے تکان دھڑک رہا تھا۔ جو راستہ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ اپنے لیے بند کر آئی تھی اب اسی راستے پر واپس پلٹنا کیسی ناقابلِ تصور شرمندگی کا باعث تھا۔ کیسے سامنا کر سکتی تھی وہ شجاع حسن کا، جسے بڑے کروفر سے ٹھکرا کر آئی تھی اور اب پلٹ کر واپس جانے کے بعد بھلا کیا حیثیت رہ جانی تھی اس کی، سوچیں تھیں کہ اسے الجھاتی جارہی تھیں۔

تیز قدموں کو گھسیٹتی وہ گھر کے سامنے پہنچی تو شرمندگی سے مرجانے کا مقام تھا۔ شجاع جو بے قراری سے سگریٹ نوشی کرتے ہوئے ٹیرس پر ٹہل رہا تھا، اسے سر جھکائے گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر بے ساختہ پُرسکون ہوگیا۔ آپ ہی آپ یہ لفظ اس کے ہونٹوں پر اُمڈ آئے تھے۔

ہجر کی رات آنکھوں میں گزاروں گا تو رو دوں گا
خیالوں میں تیری زلفیں سنواروں گا تو رو دوں گا
یونہی سنسان راتوں میں، پریشانی کے عالم میں
گلی میں آکے جب تجھ کو پکاروں گا تو رو دوں گا
تیری تصویر آنکھوں کو جھپکنے ہی نہیں دیتی
میں جب دیوار سے اس کو اُتاروں گا تو رو دوں گا
اگر میں زندگی بھی ہار دوں تو مسکراؤں گا
مگر اے دوست! جب تجھ کو میں ہاروں گا رو دوں گا

امامہ کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ سر جھکائے چلتی سیدھی گڑیا کے کمرے میں آئی۔ کپڑے بارش میں بھیگنے کی وجہ سے خراب ہوگئے تھے، اس نے دروازہ لاک کیا اور بیگ سے کپڑے نکال کر تبدیل کر لیے۔

بھیگے کپڑے اٹھا کر ابھی وہ پھیلانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ دروازہ ہلکی سی دستک سے بج اُٹھا۔ یک لخت اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ تاہم وہ کپڑے وہیں صوفے پر پھینک کر دروازے کی سمت چلی آئی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے چٹخنی گرا کر جونہی اس نے دروازہ کھولا، شجاع حسن کو مقابل پا کر بے ساختہ سر جھکا گئی۔ تاہم اس نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، آہستگی سے اسے سامنے سے ہٹا کر وہ اندر آیا اور بیڈ پر گہری نیند میں سوئی اپنی بیٹی کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اُٹھالیا۔

امامہ اسے روکنا چاہتی تھی مگر وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے واپس پلٹ گیا، نہ کوئی

استفسار' نہ سرزنش' اس شخص کی خاموشی بھی کیسی جان لیوا تھی۔

وہ کچھ دیر دروازے میں کھڑی رہی' پھر گہری سانس بھرتے ہوئے واپس پلٹ آئی۔ اس رات وہ ایک پل کے لیے بھی سکون کی نیند نہیں سو سکی تھی۔ صبح ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا جب شجاع پھر اس کے کمرے میں آیا تھا' وہ جو بازو پر سر رکھ کر کروٹ کے بل لیٹی تھی' اسے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھی۔

''گڑیا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' تمہیں بلا رہی ہے۔''

اس کی سرخ آنکھیں بھی رتجگے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ وہ سرعت سے اُٹھی اور جوتا پہنے بغیر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں گڑیا بیڈ پر بیٹھی' ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی' اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ لپک کر اسے اپنے سینے سے لگایا تھا۔

''گڑیا......! میری جان...... کیا ہوا؟''

بچی اس کی پناہ میں آتے ہی اور بلک بلک کر رونے لگی' وہ شاید خواب میں ڈر گئی تھی' اسی لیے اسے دبوچے بس مما' مما کی گردان کرتی رہی اور وہ اس کا چہرہ' اس کے ہاتھ بے تحاشا چومتی رہی۔

شجاع آ کر خاموشی سے دوسری سائیڈ پر ٹک گیا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ گڑیا کے سر میں چلتا' پیار سے اس کے بال سہلاتا' تحفظ کا احساس دلاتا رہا۔ امامہ شرمندہ سی بیٹھی رہی۔

''میرا خیال ہے یہ کسی بھیانک خواب سے ڈر گئی ہے۔'' تھوڑی دیر بعد اسے شجاع کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے کوئی رائے نہیں دی' گڑیا اس کے سینے سے لگی دونوں ہاتھوں میں' شجاع کا بازو تھام کر سہمی سہمی سی روتی رہی۔

❊❊❊

مجھے محسوس ہوتا ہے
جہاں میں آنکھ جھپکوں گی
وہیں پہ حادثہ ہوگا

ٹرین چلنے لگی تھی! جمال صاحب انوشہ کے سر پر ہاتھ رکھے اسے پلیٹ فارم سے اُٹھا لائے۔ بہت ممکن تھا کہ جن لوگوں کے ہاتھ اس کا بچہ لگا تھا وہ اس پر قبضہ جمانے کے لیے' فساد کھڑا کرنے لگ جاتے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر صدف بیگم کی رحلت پر نزہت بیگم نے اس کا بچہ نہ دیکھا ہوتا تو آج شاید وہ اسے یوں فوری نہ پہچان پاتی اور وہ اپنے بچے کے کتنے قریب سے ہو کر گزر جاتی۔

ٹرین کی وِسل کے ساتھ اس نے اپنے بچے کو بانہوں میں بھرا تھا اور شکستہ وجود کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی' پلیٹ فارم پر موجود لوگوں کا رش اب چھٹنے لگا تھا۔

وہ دوبارہ ٹرین میں چڑھ آئی۔ بچہ اب خاموش ہو چکا تھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکتا اپنے خالقِ حقیقی کا شکر ادا کر رہا تھا کہ جس کے کرم سے وہ اپنے بچے تک پہنچ پائی تھی' وگرنہ دنیا کے اس سمندر میں سارے رشتے گنوانے کے بعد بھلا اسے اپنا بیٹا پانے کی امید ہی کہاں رہی تھی۔ حالات نے جیسے اسے اپنی ٹھوکر پر رکھ رکھا تھا' اس کے بعد تو وہ کوئی اختیار بھی استعمال کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی۔ زاور اور صدف بیگم کی رحلت کے بعد یوں بھی اس کا دماغ پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔ وہ قدم قدم پر تھکنے اور ہانپنے لگی تھی۔

ٹرین سے باہر بھاگتے مناظر کے ساتھ' سرد ہوا کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے بچے کو اچھی طرح آغوش میں چھپا کر اپنا دوپٹا اس پر پھیلا دیا۔ نزہت بیگم اب جاگ رہی تھیں' وہ سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا کر سکون سے پلکیں موند گئی۔

رات بھر کے سفر کے بعد گاڑی اگلے اسٹیشن پر رکی تو وہ جھٹکے سے بیدار ہو گئی۔ منزل آ گئی تھی۔ مگر وہ ابھی تک لاعلم تھی کہ اسے کہاں جانا ہے۔

جمال صاحب ٹیکسی رکوا چکے تھے' وہ نزہت بیگم کے ساتھ اپنے بچے کو اُٹھائے خاموشی سے ٹیکسی میں آ بیٹھی' تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ٹیکسی ایک پوش علاقے میں داخل ہوئی تھی۔ تبھی جمال صاحب نے اسے بتایا۔

''کچھ عرصہ پہلے زاور نے یہاں ایک گھر خریدا تھا تمہارے لیے مگر وہ اسے تعمیر نہ کر سکا۔ انگلینڈ میں سیٹل ہونے کی وجہ سے اس نے یہاں اپنی ساری پراپرٹی فروخت کر دی تھی۔ اسی لیے اس گھر کی تعمیر بھی رک گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ تمہیں بھی وہیں سیٹ کروا دے' اس سلسلے میں کئی بار اس کی تمہارے شوہر سے بات بھی ہو چکی تھی مگر...... قدرت نے اسے اتنا وقت ہی نہیں دیا' وہ بدنصیب تو چند ماہ بعد دنیا میں آنے والے اپنے بچے کی خوشی بھی نہ دیکھ سکا' بہر حال یہاں تمہارے نام پر جو گھر ہے وہ زاور نے یہاں اپنے ایک دوست کے سپرد کر دیا تھا' اسی نے سنا ہے تعمیر مکمل کروائی ہے اس گھر کی۔ ابھی ہم وہیں چل رہے ہیں' زاور کا جو بزنس انگلینڈ میں ہے اس کی دیکھ بھال بھی وہی کر رہا ہے' سال میں دو چار بار چکر لگا لیتا ہے پاکستان کا' بہت اچھا لڑکا ہے۔'' جمال صاحب بتا رہے تھے' اس کی آنکھیں یک لخت آنسوؤں سے بھر آئیں۔

اسی پل ٹیکسی ایک جھٹکے کے ساتھ جس شان دار گھر کے سامنے رُکی تھی۔ وہ واقعی اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا۔ گیٹ پر گارڈ موجود تھا' جمال صاحب اپنا تعارف کروا کر نزہت بیگم اور انوشہ کو ساتھ لیے اندر چلے آئے۔

''اب تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتی ہو بیٹی! کبھی مت سمجھنا کہ تمہارا دنیا میں کوئی نہیں رہا' وہ اوپر سات آسمانوں پر بیٹھا رب ہے ناں' اپنے ہر بندے پر نظر رکھتا ہے' کس کی آنکھ میں آنسو ہیں' کس کے لبوں پر مسکراہٹ ہے' سب پتا ہوتا ہے اسے' وہ اپنے بندے کو آزماتا ہے۔ مگر اس پر ظلم نہیں کرتا۔'' انوشہ کے سر پر ہاتھ رکھے وہ اسے سمجھا رہے تھے۔ وہ سر جھکائے آنسو ضبط کرتی رہی۔

اس کا بیٹا وہاں آ کر بہت خوش تھا۔ وہ دلچسپی سے اسے دیکھتی دیر تک نزہت بیگم سے باتیں کرتی رہی۔ جمال صاحب کے بقول وہاں روزانہ صفائی والی آتی تھی مگر پھر بھی گھر کو توجہ کی ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک چیز کو بغور دیکھتی' خامیاں نوٹ کرتی رہی' رات میں تھکن سے بے حال کب اس کی آنکھ لگ گئی' اسے پتا ہی نہ چلا۔

اگلے روز صبح وہ جلدی بیدار ہو گئی تھی۔ ایک مدت کے بعد ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے اس نے فجر کی نماز ادا کی تو رگ و پے میں عجیب سا سکون اُتر آیا۔ اس لمحے اس کا دل شدت سے قرآن پاک کی تلاوت کو چاہا تھا مگر ابھی وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کون سی چیز کہاں [illegible] گی؟ وہ تن کمرے لاک بھی تھے۔ لہٰذا نماز کے بعد وہ دیر تک تسبیح کرتی رہی' پھر کچھ سوچ کر ناشتے کی تیاری کے لیے کچن کی

طرف چلی آئی۔ جہاں بند ڈبوں میں ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز موجود تھی۔

گیس آن کر کے اس نے چائے کا پانی رکھا تھا' جب نزہت بیگم بھی بیدار ہو گئیں' اس کا مُنا جمال صاحب کے پاس سو رہا تھا۔ نزہت بیگم، انوشہ کے پاس چلی آئیں' تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ اپنے اصل مقصد کی طرف آ گئیں۔

''مجھے تم سے کچھ بات کرنی تھی انوشہ!'' بڑے محتاط انداز میں انہوں نے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ آٹا گوندھتی رک گئی۔

''جی کہیے!''

''دیکھو غصہ مت ہونا' میں جس جگہ پر ہوں اگر تم اس جگہ پر ہوتیں تو میری پریشانی بہتر سمجھ سکتی تھیں۔ خدا گواہ ہے میں نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ تم اور زاور میرے بچے نہیں ہو' یا یہ کہ تم نے میرے بطن سے نہیں' صدف کے بطن سے جنم لیا ہے' میں وہاں انگلینڈ میں تھی تب بھی دل یہیں تمہارے پاس پڑا رہتا تھا۔ اب تو خیر بات ہی اور ہے۔'' وہ تمہید باندھ رہی تھیں' انوشہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

''تم جس اذیت اور کرب سے گزر کر آئی ہو اور گزر رہی ہو' مجھے اس کا اندازہ ہے' اس کے باوجود تمہارے بابا چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔''

''کیوں......؟ کیا بابا کو میں زندہ چلتی پھرتی اچھی نہیں لگتی؟'' کتنی بدتمیزی سے فوری جواب دیا تھا اس نے۔ نزہت بیگم گڑبڑا کر رہ گئیں۔

''نفرت ہے مجھے مرد ذات کے نام سے' شدید نفرت ہے مجھے شادی کے لفظ سے۔ اچھی یا بُری' جیسی زندگی بھی میرے رب نے میرے نصیب میں لکھ دی ہے مجھے قبول ہے' بنا کسی کے ساتھ' کسی کے سہارے کے' سمجھیں آپ......'' وہ اتنی تلخ ہو جائے گی انہیں اندازہ نہیں تھا۔ انوشہ اب رُخ پھیرے آٹے پر اپنا بقیہ غبار نکال رہی تھی۔

نزہت بیگم مایوس ہو کر جمال صاحب کے پاس کمرے میں چلی آئیں۔ انوشہ کا بیٹا ان کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

''نماز پڑھ لی......؟''

''ہوں...... مسجد جانے کی ہمت نہیں تھی' اس لیے گھر پر ہی ادا کر لی' انوشہ کیا کر رہی ہے؟''

''ناشتا بنا رہی ہے...... آج تو اس نے بھی نماز ادا کی ہے۔''

''ماشاءاللہ! وہ پاک پروردگار چاہے گا تو آہستہ آہستہ دل کے سارے جالے صاف ہو جائیں گے اس کے۔ میں ہر نماز میں اس کے لیے خصوصی دعا کرتا ہوں' تم بھی دعا کرنا بیگم! کل سرمد بیٹا آئے تو اسے وہ پسند آ جائے' میں اب زیادہ دن اسے بے آسرا نہیں دیکھ سکتا۔''

''میں بھی نہیں دیکھ سکتی مگر وہ بہت ضدی ہے' میرا خیال ہے اس بار اگر اس کے ساتھ زبردستی ہوئی تو وہ برداشت نہیں کرے گی۔''

''تمہاری بات ہوئی ہے اس سے؟''

''ہاں! وہ کسی طور دوبارہ شادی کے حق میں نہیں ہے۔''

''پاگل ہے وہ' تم نے سمجھایا نہیں اسے؟''

''سمجھایا تھا' مگر بچے جب بڑے ہو کر کندھوں تک آ جائیں تو پھر انہیں کچھ بھی سمجھانا بہت مشکل ہو جاتا ہے جمال! میرا نہیں خیال کہ اس بار وہ کسی بات پر سمجھوتا کرے گی۔''

''اچھا! اللہ بہتر کرے گا' تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے' ابھی وہ ذہنی طور پر ٹھیک بھی تو نہیں ہے' وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

نزہت بیگم خدشات کا شکار تھیں' جمال صاحب اپنے تیزی سے بجتے سیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔

❊❊❊

بارش خوب برس رہی تھی۔ کھلے آسمان کے نیچے وہ تن تنہا کھڑی' موسم کی ہولناکی کا نظارہ کر رہی تھی جب اچانک اس نے دیکھا کہ بادلوں کی گرج کے ساتھ آسمان پر دراڑیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں' وہ خوف کے مارے سہم کر اندر کی طرف بھاگی مگر تب تک آسمان کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر زمین پر آ پڑا۔

آسمان کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی زمین سے بادلوں تک پانی کی دیوار بن گئی اور یوں لگا جیسے دنیا پانی میں گھر کر رہ گئی ہو' ہر طرف چیخ و پکار شروع ہو گئی تھی۔ گوری نے لوگوں کے ساتھ اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا' اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ یہ پل بھر میں کیا ہو گیا تھا۔

لوگ قیامت' قیامت پکار رہے تھے اس کا دل جیسے خون میں ڈوب کر رہ گیا' بس اتنی جلدی اختتام ہو گیا تھا دنیا کا؟ اتنی سی زندگی تھی اس کی؟

وہ بھاگتی جاتی تھی اور خوف سے روتی جاتی تھی' کسی کو نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے عجیب افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم تھا' زمین اُدھڑتے ہوئے قالین کی مانند سمٹتی جا رہی تھی' نیچے گہرے کھدان اور آگ کا سمندر تھا' اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے' تبھی اسے زور کی ٹھوکر لگی اور وہ منہ کے بل گری تھی' اسی اثناء میں منظر بدلا تھا اور اس نے اپنے سامنے سفید لباس میں ملبوس ایک نورانی چہرے والے نیک بزرگ کو دیکھا تھا۔ وہ تسبیح پر کچھ پڑھ رہے تھے اور گوری مٹی سے بے حال ان کے سامنے زمین پر اوندھے منہ گری زار و قطار رو رہی تھی۔ بزرگ نے آنکھیں کھول کر ایک نظر اسے دیکھا تھا پھر بارعب آواز میں بولے تھے۔

''اب کیوں روتی ہے بچی! اب تو عمر کی نقدی ختم ہو چکی' اب اگلے سفر کا سوچ۔ یہ دنیا تو صرف بازار تھی جس میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہیں دوسرے اربوں لوگوں کے ساتھ عمر کی مخصوص نقدی دے کر بھیجا تھا کہ جا! دنیا کے بازار سے اپنی آخرت کے لیے کچھ خرید لا' کیا خریدا تُو نے؟ عمر کی ساری نقدی خرچ کر کے اپنی آخرت کے لیے کیا خریدا؟ نیکی یا بُرائی' آخرت کی فکر یا گمراہی' دین کی معلومات' سچے دین کا علم یا دنیا داری؟ جھانک اپنے گریبان میں اور دیکھ اپنی جھولی کی طرف...... صرف دنیا داری خریدی تُو نے' عمر کی ساری نقدی خرچ کر کے کمایا تو کیا کمایا؟ صرف دنیا داری؟''

بزرگ کی آواز میں جلال تھا وہ مزید بلک بلک کر رو پڑی۔

''دنیا والوں کی پروا کی تُو نے' ان کی خوشنودی کا خیال رکھا' ان کی پروا کی' اپنے ربّ کا کیوں نہیں سوچا' جس نے تجھے دنیا کے بازار میں خریداری کے لیے بھیجا تھا' اپنی آخرت کی فکر کیوں نہیں

ہوئی تجھے..... کس گمان میں اپنے اصل سے غافل رہی تُو‘ بول.....‘‘ وہ کیا بولتی‘ بولنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔

’’اب کیوں روتی ہے‘ اب تو اختیار میں کچھ بھی نہیں‘ عمر کی ساری نقدی‘ سارے ماہ و سال خرچ ہو چکے۔ بھٹک گئی تُو بھی دنیا کے اس بازار میں‘ اب کس بات کا غم؟ دنیا والوں سے امید رکھی تُو نے‘ رشتوں کی ڈوری میں الجھ کر دنیا کی طرف دیکھا‘ اپنے ربّ کی طرف کیوں نہیں دیکھا‘ جس کا در ہمیشہ کھلا رہتا ہے‘ جہاں ہمیشہ واپسی کا انتظار ہوتا ہے۔ عمر کی نقدی تک تجھے واپسی کا خیال نہیں آیا‘ اب جب اس نے ڈوری کھینچ کر واپس بلالیا تو روتی ہے‘ اپنے اعمال پر غم کرتی ہے‘ بڑی بدنصیب ہے تُو.....‘‘ بزرگ کے جلال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا‘ گوری کی آنکھ کھل گئی۔

آدھی رات کے اس پہر میں اس کا سارا وجود پسینے سے شرابور ہو چکا تھا‘ بدن پر ایک عجیب سی کپکپی طاری تھی‘ یہ کیسا خواب تھا؟ کیسی آگہی تھی؟ دنیا کے بازار..... عمر کی نقدی کی کیا کہانی تھی؟

وہ کیا نقصان تھا جس کا احساس اسے خواب میں دلایا جا رہا تھا؟ وہ کچھ دیر بستر پر بیٹھی سہمی رہی‘ پھر پانی پینے کے لیے اُٹھی تو دوبارہ نیند ہی نہ آئی‘ دن بھر کام میں مصروف رہنے کی وجہ سے کتنی تھک کر سوئی تھی مگر اس عجیب و غریب خواب نے کتنا بے چین کر دیا تھا اور یہ پہلی بار تو نہیں تھا‘ بی اماں کے گھر بھی وہ ایسے خوابوں کی زد میں رہی تھی‘ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

شہر آنے کے بعد وہ بہت بدل گئی تھی‘ خود کو مصروف رکھنے کے لیے بہت سے کام ڈھونڈ لیے تھے اس نے مگر سکون تھا کہ ابھی بھی دسترس سے دور تھا۔

فجر کی نماز میں ابھی کافی وقت تھا‘ وہ وضو کر کے جائے نماز پر آ گئی‘ مختلف سوچوں اور ذہن میں بھٹکتے ڈھیروں خیالات کے ساتھ‘ جیسے تیسے اس نے تہجد کی نماز ادا کی۔ بی اماں بارہ نفل پڑھتی تھیں اس سے صرف آٹھ ادا ہو سکے تھے‘ نماز کی ادائیگی کے بعد ہاتھ دعا میں اُٹھے تو صرف ایک ہی دعا لبوں پر آئی۔

’’اے میرے مالک! مجھے اس روندی ہوئی دنیا سے بے نیاز کر دے‘ میں ان میں سے نہیں ہوں جن کے لیے یہاں سکون ہے‘ مجھے یہ دنیا داری نہیں چاہیے میرے مالک! مجھے وہ راستہ دکھا جو خیر اور نجات کا راستہ ہے۔ میں بُرائی اور بُرائی پھیلانے والوں سے بے نیاز ہوں‘ میرے ہر دانستہ و غیر دانستہ فعل کو پاک کر دے مالک! میری زبان‘ ہاتھ اور عمل کے شر سے ہر کسی کو محفوظ رکھ (آمین)۔‘‘ شفاف موتیوں کی طرح آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے گالوں پر بکھر رہے تھے اور وہ روتی جا رہی تھی۔

❋❋❋

مجھ سے بچھڑ کے تُو بھی نہ پائے گا کبھی چین
آئیں گی یاد میری وفائیں تمام عمر
تجھ پر تھا اعتبار مگر اب نہیں رہا
اب غیر کو دکھانا ادائیں تمام عمر

ایان مل گیا تھا۔ وہ خوشی سے بے حال ہوتی اسے اپنی ماں کے پاس لے آئی۔ اسی اثناء میں اس کے سیل نے بیٹری ختم ہونے کا سگنل دیا تھا‘ اس نے تیزی سے یہ قطعہ ٹائپ کیا اور عباد کو بھیج کر

موبائل بند کر دیا۔
دل تھا کہ بھائی مل جانے کی خوشی کے باوجود جیسے غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ وہ اسپتال سے نکل آئی۔ ارادہ گھر جا کر سب کو ایان کے مل جانے کی خوش خبری سنانے کا تھا' مگر قدم تھے کہ مزید چلنے سے انکاری ہو گئے تھے' بہت مجبور ہو کر اسے رکشہ لینا پڑا تھا۔ وہ زندگی میں بہت کم روئی تھی مگر اس وقت جانے کیا ہوا تھا کہ آنسو بھل بھل بہہ رہے تھے۔
''واہ ری غربت! تجھے کسی کی خالص محبت بھی نصیب نہیں۔''
''کہاں جانا ہے بی بی؟'' رکشے والے کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی اور جانے کس بے خیالی میں اس کے لبوں سے نکلا تھا۔
''ساحلِ سمندر......''
پھٹ پھٹ کی تیز آواز کے ساتھ رکشہ چلتا رہا اور وہ خود میں کھوئی رہی' ہوش اس وقت آیا جب رکشہ ڈرائیور نے ساحل کے قریب لا اُتارا۔
''ایک سو پچیس روپے ہو گئے باجی!''
''ایک سو پچیس؟'' حقیقی معنوں میں وہ اب چونکی تھی۔
''ہاں جی' ایک سو پچیس! فارسی میں بولوں کیا؟''
دن بھر مشقت سے اُکتایا رکشہ ڈرائیور تپا تھا۔ صاعقہ اپنی بے خبری پر جی بھر کے پچھتائی' مٹھی میں پکڑے پیسوں کی گنتی کرنے لگی' کل دو سو روپے تھے' اس نے ایک سو پچیس نکال کر رکشہ والے کو تھما دیئے۔ رکشہ پھٹ پھٹ کرتا آگے بڑھ گیا جب کہ وہ ہونق سی وہیں کھڑی رہی۔
''کیوں آئی ہوں میں یہاں' بھلا میرا یہاں کیا ہے؟'' منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہ سمندر کے قریب چلی آئی۔ اسے لگا جیسے سمندر کی ہر لہر اس پر ہنس رہی ہو۔
''سوری...... میں آپ کو نہیں جانتا۔'' اُف کتنی اذیت تھی اس ایک جملے میں' کاش! وہ کسی کو بتا سکتی۔ وہ سُن سی گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر بیٹھ گئی۔
''آپ کو کیا لگا میں آپ کے منہ سے اصل حقیقت جان کر آپ سے نفرت کرنے لگوں گا؟ دو حرف بھیج کر چلا جاؤں گا' اپنے اور میرے تعلق کو اتنا سستا مت کریں صاعقہ! پلیز......'' وہ کہیں قریب ہی سے بولا تھا۔ وہ سر اٹھائے سمندر کی لہروں کو دیکھتی رہی۔
''تم باز نہیں آؤ گی ناں صاعقہ! مت چنو وہ راہیں جن پر چل کر پچھتانا پڑے' مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی ہو تم' لوئر مڈل کلاس گھرانے کی' جہاں صرف خواب دیکھے جاتے ہیں' ان کی تعبیر پانے کی ضد نہیں کی جاتی۔'' کتنی بلند بازگشت تھی سمندر کی لہروں کی' وہ اچانک پھٹ پڑی۔
''کیوں...... کیوں ضد نہیں کی جاتی۔ مڈل کلاس گھرانے کی لڑکیاں کیا انسان نہیں ہوتیں' ان کے سینے میں کیا دل کی جگہ پتھر ہوتا ہے؟ کیوں بانٹ دیا ہے محبت کو گھرانوں میں؟ کوئی اپنی رضا سے نصیب لکھوا کر لاتا ہے اپنے؟ کیوں روند دیا ہے معاشرے نے انسانوں کو اسٹیٹس میں بانٹ کر؟ مڈل کلاس گھرانے کی لڑکیاں کہاں جائیں؟ کیوں پتھر سے بنا کھلونا سمجھ لیا ہے لوگوں نے مڈل کلاس گھرانے کی لڑکیوں کو' کیوں......'' ساحل سمندر پر اس وقت زیادہ رش نہیں تھا لہٰذا کوئی اس کی طرف

متوجہ نہیں ہوا۔ سمندر کی تمسخر اڑاتی لہریں اب بھی اس پر ہنس رہی تھیں' اس نے اشتعال میں آ کر کئی پتھر اُٹھائے اور سمندر کی طرف اُچھال دیئے۔

''صرف مڈل کلاس گھرانوں کی میراث ہے یہ محبت سنا تم نے۔ اپر کلاس گھرانوں کی لڑکیاں یہ روگ نہیں پالتیں' سو حیلے ہوتے ہیں ان کے پاس خود کو مصروف رکھنے کے لیے نوکریاں' کلب' نیٹ' دوست اور نہیں تو ملک چھوڑ کر چلی جاتی ہیں وہ مگر...... مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی تو کہیں جا بھی نہیں سکتی۔ ایک ایک محبت کو سنبھال کر اثاثے کی طرح رکھتی ہے' خواب دیکھتی ہے اور ٹوٹ جانے پر خاموشی سے اپنی ذات کی کرچیاں چُن لیتی ہے' کوئی واویلا نہیں کرتی' کسی کلب' کسی انٹرنیٹ' کسی پارٹی میں سکون نہیں ڈھونڈ سکتی وہ۔ چھوٹی سی چار دیواری ہوتی ہے اور احساسات کا رستا لہو ہوتا ہے بس۔ کون قدر کرسکتا ہے مڈل کلاس لڑکی سے بڑھ کر محبت کی' بولو...... ہے کوئی جواب تمہارے پاس؟'' اس بار پھر وہ چلائی تھی' جواب میں سمندر کی لہریں خاموش ہو گئیں۔

''بہت اذیت ناک ہے یہ غریب ہونا بھی' نہ خودداری رہتی ہے نہ قدر۔ کاش! تم ادھوری تمناؤں کی اس اذیت کو سمجھ سکتیں' مگر میں یہ اذیت ساتھ لے کر نہیں چلوں گی' اس نے فریب کیا ہے تو کیا؟ مجھے اپنی قدر ہے' صاعقہ سو بار لعنت بھیجتی ہے ایسے دکھ اور ایسی محبت پر' سنا تم نے...... کبھی ٹوٹا ہوا نہیں دیکھو گی تم مجھے' کبھی نہیں......'' وہ چلا رہی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔

''مڈل کلاس گھرانے کی لڑکی ہوں' جانور تو نہیں ہوں نا' پھر کیوں کیا اس نے میرے ساتھ ایسا' آخر کیوں؟'' اذیت تھی کہ کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

''کیوں کہا اس نے کہ اسے میرے غریب ہونے سے فرق نہیں پڑتا' اسے کیا پتا کیا ہوتی ہیں مڈل کلاس گھرانے کی لڑکیاں۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں، چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے لیے ترستی' جائز باتوں پر بھی بُری طرح پٹتی...... آہ!''

سورج ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ مغموم سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

بچھڑنے کی اذیت کو
اگر تم جاننا چاہو
تو کچھ پل کو ذرا یہ سانس اپنی روک کر دیکھو
تمہیں محسوس یہ ہوگا
بچھڑنا ''موت'' جیسا ہے

❃❃❃

''کیا بات ہے عباد! پریشان دکھائی دے رہے ہو؟''

وہ دوا لینے کے بعد گاڑی میں آ کر بیٹھا تھا' جب اسے خاموش پا کر ہادیہ نے پوچھا' عباد بنا کوئی جواب دیئے خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

''بتاؤ نا! کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں یار! دوست کی وجہ سے پریشان ہوں' اس کی مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''ایک تو تم بھی ناں! چُن چُن کر دکھی دوست بنا رکھے ہیں تم نے۔'' اس بار وہ پھر خاموش رہا۔

"آپ نہیں آئیں گے۔" اس کے احکامات کے جواب میں فوری اس نے پوچھا تھا جب وہ بولا۔
"نہیں......" اور وہ مایوس ہو کر رہ گئی۔

دوپہر سے پہلے ہی فائزہ آپا اس سے ملنے چلی آئیں۔ وہی ان کا پیار' وہی شجاع کی باتیں اور وہی اسے بار بار اپنا خیال رکھنے کی ہدایت' وہ عورت مجسم پیار تھی۔ امامہ کو ان سے باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

وہ رخصت ہو گئی تھیں' قدرت اللہ صاحب بھی جاتے ہوئے اسے خوب پیار کر کے گئے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر اُن کے جانے کے بعد آزردہ سی بیٹھی رہی' پھر ارسلان کی کال آ گئی تو نئے سرے سے بے کلی کا شکار ہو کر رہ گئی۔

شجاع شام میں جلد لوٹ آیا تھا' وجہ گڑیا کی طبیعت کی خرابی تھی' وہ کھانا کھا کر آیا تھا۔ امامہ نے اسے شربت کا گلاس لا تھمایا۔

"تھک کر آئے ہیں' میرے ہاتھ کا پانی تو پی ہی سکتے ہیں آپ۔"

شجاع کے دیکھنے پر اس نے فوری وضاحت دی تھی جواب میں وہ گلاس تھام کر ایک ہی سانس میں خالی کر گیا۔

"شکریہ!"

مشروب پی کر فوراً اٹھتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا جب کہ وہ گہری سانس بھر کر باہر لان کی طرف چلی آئی جہاں اس نے ارسلان کو کال کی تھی۔

"ہیلو ارسلان! خوش ہو جاؤ' میں نے شجاع کو وہ دوا پلا دی۔"

"شاباش! کب پلائی؟" فوری کال پک کرتے ہوئے وہ بے تحاشا خوش ہوا تھا۔ جب وہ بولی۔

"ابھی دو منٹ پہلے' بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟"

"انتظار! ایس پی شجاع حسن کی موت کا انتظار۔"

"کیا مطلب؟" اس کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ دوسری طرف وہ دل کھول کر ہنسا۔

"مطلب تھوڑی ہی دیر میں اس کی زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا' کیونکہ تم نے اسے بے ہوشی کی دوا نہیں زہر پلایا ہے جان! اب دیکھنا ساری کہانی ٹھیک ہو جائے گی۔"

وہ خوش ہو رہا تھا۔ امامہ کے ہاتھ سے موبائل گر پڑا۔ یہ کیا ہو گیا تھا اس کے ہاتھوں۔ وہ اپنے سر کو تھامتی وہیں بیٹھ گئی۔

❋❋❋

کسی بھی موڑ پر' اگلے پڑاؤ پر
جدا ہی ہم کو ہونا ہے تو پھر آؤ
یہیں پر اپنے آنسوؤں کو ہم الگ کر لیں
یہ جتنے زخم ہیں دل پر' ادھر میری طرف کر دو
کہ تم اکثر یہ کہتے ہو' یہ سب میری وجہ سے ہیں
مگر ٹھہرو......

یہاں کچھ خواب بھی ہوں گے' جو ل کے ہم نے دیکھے تھے
سنہری خواب تم رکھ لو ادھورے سب مجھے دے دو
کہ میری یوں بھی عادت ہے
مجھے ٹوٹی ہوئی چیزوں سے اک بے نام الفت ہے!

شام کے پھیلتے دھندلکوں کے ساتھ' وہاں دیہاتی خواتین کے کاموں میں مزید چستی آ گئی تھی۔ شہر کو جاتی کچی سڑک کے کنارے پر بیٹھی' وہ چپ چاپ سی خود سے کچھ ہی فاصلے پر دہکتے تندور کے گرد کھڑی خواتین کو دیکھتی رہی۔ خشک اوپلوں سے تندور دہکاتی ایک دوسری سے باتوں میں مگن' وہ زندگی کو کتنے بھرپور انداز سے گزار رہی تھیں۔ انزلہ کی نگاہیں بے ساختہ اپنے ہاتھوں کی شفاف گلابی ہتھیلیوں پر ٹھہر گئیں۔

زمین کے وجدان میں کہیں وہ دن آج بھی اپنی پوری اہمیت کے ساتھ تازہ تھا کہ جس روز پہلی بار وہ سانول شاہ پر فدا ہوئی تھی۔

اوائل سردیوں کے دن تھے اور یونیورسٹی میں طلبہ کی حاضری کا زور کچھ روز کی ہڑتال کی وجہ سے قدرے ٹوٹ گیا تھا۔ وہاں یونیورسٹی میں کسی وزیر کا بگڑا ہوا سپوت کسی دوسرے شہر سے مائیگریشن کروا کر آیا تھا اور آتے ہی اس کی کچھ لوگوں سے ٹھن گئی تھی۔

اپنے باپ کے بڑے نام اور ان گنت دولت پر ملکیت نے اس کا دماغ آسمان پر پہنچا رکھا تھا' اساتذہ سے بات کرتے ہوئے بھی اس کا لہجہ خاصا گستاخانہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یونیورسٹی میں سوائے سانول شاہ کے گروپ کے دوسرا کوئی بھی اسے منہ نہیں لگاتا تھا۔ گزشتہ روز اپنی خدائی کے نشے میں چور اس نے فزکس کے پروفیسر کے گریبان کو پکڑ کر ان سے خاصی بدتمیزی کی تھی جس پر ان پروفیسر کے ہونہار طلبہ نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر ان کی اچھی خاصی ٹھکائی کر دی' بات پرنسپل کے ساتھ ساتھ ''اوپر'' پہنچی تو فوراً فزکس کے' پروفیسر کو جاب سے فارغ کرنے کے ساتھ ساتھ ان طلبہ کو بھی یونیورسٹی سے خارج کرنے کا حکم آ گیا کہ جنہوں نے عزت مآب وزیر کے سپوت پر ہاتھ اٹھانے کی سنگین غلطی کے ساتھ ساتھ کبیرہ گناہ کیا تھا۔ پرنسپل احتجاج کا حق رکھتا تھا مگر صرف اپنی سیٹ کی سلامتی کے لیے حق اور سچائی سے مکمل آگاہی کے باوجود اس نے پروفیسر کو فارغ کرنے کے ساتھ ساتھ ان تمام طلبہ کو بھی یونیورسٹی سے نکال دیا۔ جو استاد کی محبت میں ان کے وقار اور عزت کے لیے' جناب وزیر صاحب کے سپوت سے الجھے تھے۔ سزا کڑی اور ناحق تھی' یہی وجہ تھی کہ یونیورسٹی کے دیگر طلبہ نے اس ظلم پر شدید احتجاج کرتے ہوئے اسٹرائیک کر دی۔

پورے ایک ہفتے کے بعد حالات معمول پر آئے تھے۔ وہ بھی پروفیسر صاحب کی اپنے اس بگڑے ہوئے طالب علم سے معافی مانگنے پر کیونکہ وہ اپنے ساتھ ساتھ' اپنے ہونہار طلبہ کے روشن مستقبل کو داؤ پر نہیں لگا سکتے تھے۔

انزلہ تمام حالات سے باخبر نہیں تھی' پھر بھی اسے سانول شاہ پر غصہ آیا تھا جو ایک آوارہ لڑکے کا ساتھ دے رہا تھا۔ یہ بات اس کے علم میں بہت بعد میں آئی تھی کہ وزیر کا وہ رئیس بیٹا سانول کا بچپن کا گہرا دوست تھا اور صرف سانول کی وجہ سے مائیگریشن کروا کے وہاں آیا تھا۔ میران نے اسے

''اب میں ایسے موڈ کے ساتھ مارکیٹ نہیں جاؤں گی' بس گھر چلو۔'' وہ خفا ہوئی تھی' عباد نے خاموشی سے گاڑی گھر کے راستے پر ڈال دی۔

''تم بہت بُرے ہو عباد! کبھی کبھی شدید نفرت محسوس ہونے لگتی ہے مجھے تم سے۔'' اب وہ غبار نکال رہی تھی' عباد ہنوز خاموش رہا۔ وہ دل جلاتی رُخ پھیرے بیٹھی رہی۔

''جانے کیوں مجھے لگتا ہے جیسے کہیں پر کچھ غلط ہے' تم کچھ چھپا رہے ہو مجھ سے' یاد رکھنا عباد! اگر تم نے مجھ سے کچھ غلط کیا تو میں کبھی تمہیں معاف نہیں کروں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ جیسے بہت پریشان تھا۔

ہادیہ شدید غم و غصے کا شکار ہوئی' گاڑی رُکنے پر ایک جھٹکے سے نکل گئی۔

وہ گاڑی لاک کر رہا تھا جب اسے صاعقہ کا میسج موصول ہوا۔ دل کو کھینچ لینے والا قطعہ تھا۔ اس نے فوراً کال بیک کی مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ گاڑی کے بونٹ پر زوردار مکا رسید کیا۔

''کیوں کیا میں نے اس کے ساتھ ایسا؟ کیوں اتنا کمزور پڑ گیا میں' کیوں؟'' اپنے عمل اپنی حرکت پر اب اسے پچھتاوا ہو رہا تھا' مگر......

''مجھے معاف کر دو' میں بہت شرمندہ ہوں۔''

اگلے ہی پل وہ بڑبڑایا تھا مگر یہ پچھتاوا فی الحال اس کی بے چینی کو کم کرنے میں کسی طور معاون ثابت نہ ہو سکا۔

اسے خبر ہی نہیں تھی کہ آنے والے دن اسے مزید کیا کیا دکھانے والے ہیں۔

❁❁❁

''سانول! تُو یہاں۔''

''ہاں آپا! حویلی چھوڑ آیا ہوں میں۔''

''ہائے او ربا! مگر کیوں......؟''

''بس' غلامی نہیں کر سکتا میں کسی کی۔'' وہ شکستہ دکھائی دے رہا تھا۔

آپا جو سانول کی پھوپھو تھیں اور خاندان میں برابر کا رشتہ نہ ملنے کے جرم کی پاداش میں کنواری ہی بڑھاپے کی دہلیز پر آ بیٹھی تھیں' آزردہ ہو گئیں۔

''بہت خراب ہے تُو سانول! بچپن سے جانتی ہوں تجھے' میری ہی گود میں پل کر جوان ہوا ہے' کیسے نہیں جانوں گی پھر' مگر دیکھ سانول! زندگی کے ہر معاملے میں اکڑ نہیں چلتی۔''

''خدارا پھوپو! مجھے کچھ بھی سمجھانے کی کوشش مت کرنا' آپ جانتی ہو ناں میں مکھی بیٹھے آٹے کی روٹی نہیں کھاتا' وہ تو پھر لڑکی ہے' جو دو روز گھر سے باہر گزار کر برآمد ہوئی ہے' نہیں چاہیے ایسی دلہن کی منگ اور اس کے ساتھ زمین جائیداد۔ میرا پہلے ہی دل نہیں تھا اُدھر' بھائی کو بول میرا حصہ لکھ دے دے۔'' کچھ بھی سننے پر آمادہ نہیں تھا وہ' پھپھو رنجیدہ سی سر جھکا گئیں۔

''اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا سانول! جو زیادہ اکڑ کر چلتا ہے وہ جب ٹوٹتا ہے ناں تو ٹوٹنے کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی اس سے۔ خدا کا واسطہ ہے تجھے' زندگی کے ساتھ سمجھوتا کرنا سیکھ لے' ورنہ

بہت پچھتائے گا۔"

"کہاناں پھوپو! کوئی نصیحت نہیں' اپنا حصہ تو میں لے کر ہی رہوں گا' چاہے کچھ ہو جائے۔" وہ اشتعال کا شکار ہو رہا تھا۔ پھوپو بے بسی سے اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

اسی شام انہوں نے حویلی جا کر بہزاد کے بڑے بھائی سے بات کی تھی اور انہیں ہر ممکن طور سے سمجھانے کی کوشش کی مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا تھا۔ دونوں بھائی اپنی اپنی ضد پر اُڑے تھے' نتیجتاً سانول شاہ نے حتمی قدم اٹھا لیا۔

دوست تو گاؤں میں بھی کم نہیں تھے اس کے' پھر بھی شہر سے کئی غنڈے بلوائے تھے اس نے' تاہم اس کے اس اقدام کی خبر اس کے بھائی کو ہو گئی تھی اور اس نے بھی طیش میں آ کر تیاری مکمل کر لی۔

آپا کی نہ پہلے کوئی اہمیت تھی نہ اس وقت ہی وہ کچھ کر سکیں۔ وہ چوہدری خاندان جس نے صرف بے بس نادار لوگوں پر ظلم کرنا سیکھا تھا اب اسی کا تماشہ لگا تھا اور گاؤں کے بے بس نادار لوگ تماشائی تھے۔

دونوں طرف برابر کی جنگ تھی کہ اچانک منظر بدل گیا۔

سانول شاہ کے بھائی کے پسٹل سے نکلنے والی دو گولیاں جو سانول کے وجود میں اُتری تھیں' ساری کہانی کا پانسہ پلٹ گئی تھیں۔ دونوں طرف طاقت کا تصادم تھا اور اس تصادم میں ہار سانول شاہ کا مقدر بن گئی تھی۔

❁❁❁

"اب گڑیا کی طبیعت کیسی ہے؟"

رات بھر جاگ کر اپنی بیٹی کے سرہانے بیٹھے رہنے کے بعد وہ صبح تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر گیا تھا' جب امامہ نے اس سے پوچھا۔ وہ رات دیر تک گڑیا کے پاس بیٹھ کر اسے مختلف کہانیاں سناتی رہی تھی۔ کل فجر سے لے کر پورا دن اور پوری رات' گڑیا نے اسے اپنے ساتھ ہی مصروف رکھا تھا۔ اس اثناء میں کئی بار ارسلان کا فون آیا تھا اور اس نے اسے شجاع کو وہ دوا دینے پر مجبور کیا تھا' جو اس نے خود امامہ کو دی تھی۔

جانے کیا بات تھی کہ کل سے اب تک وہ اسے ٹال رہی تھی' شاید گڑیا کی طبیعت کی وجہ سے مگر اب جب کہ وہ خفا ہونے لگا تھا تو اس نے ہمت باندھ لی۔

قدرت اللہ صاحب ابھی کمرے سے نہیں نکلے تھے' اس نے شجاع کو کچن میں ہی روک لیا۔

"پہلے سے بہتر ہے۔"

بنا اس کی طرف دیکھے وہ جواب دے کر کچن سے نکلنے لگا تھا' جب اس نے پھر پکار لیا۔

"سنیں! میں ناشتہ تیار کر رہی ہوں پلیز آج کر کے جائیے گا۔"

"کوئی ضرورت نہیں' اس گھر میں ہر کام کے لیے ملازم موجود ہیں' آپ کو کسی بھی زحمت کی کوئی ضرورت نہیں مس امامہ! ہاں ابا جی چیک اپ کے لیے آپا کے ساتھ ہی بیرون ملک جا رہے ہیں' ہفتہ دو ہفتہ کے لیے ان کا سامان پیک کر دیجیے گا۔ دوپہر میں گاڑی آئے گی انہیں لینے۔"

بدتمیزی کی ہے' ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ زبردستی اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر نجانے کہاں لے گیا ہے۔''

زوبی کی اطلاع پر اس کے چہرے کا رنگ ایک پل میں تبدیل ہوا تھا۔ فوراً سے پیشتر اس نے ہاتھ میں پکڑے سیل سے کوئی نمبر پریس کیا تھا مگر دوسری طرف سے اس کی کال ریسیو نہیں کی گئی۔ وہ اس کا اپ سیٹ ہونا صرف دیکھ نہیں سکتی تھی' محسوس بھی کر سکتی تھی۔ کئی بار کال ٹرائی کرنے کے بعد اس نے زوبی سے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے' آپ میرے ساتھ آئیں۔ میں جانتا ہوں وہ کہاں گیا ہوگا۔''

زوبی اس وقت روڈ پر تنہا نہ ہوتی تو کبھی اس کے ساتھ نہ جاتی۔ مگر اس وقت مجبوری تھی' سانول کے دماغ میں اس وقت جیسے جھکڑ چل رہے تھے۔ بائیک اب بھی اس کا دوست چلا رہا تھا۔ مگر ہدایت وہ دے رہا تھا۔ زوبی کا دل مارے خوف اور خدشات کے جیسے سکڑتا جا رہا تھا۔ وہ اعتبار کر کے اس کے ساتھ بیٹھ تو گئی تھی مگر اب پچھتا رہی تھی۔ اندر کہیں یہ وہم بھی سر اٹھا رہا تھا کہ شاید وہ حمزہ کیانی کے ساتھ مل کر اس سے اور انزلہ سے کوئی گیم کر رہا ہو۔ سو طرح کے خدشات تھے جو دل کو لاحق تھے۔

تقریباً پندرہ منٹ کی رائیڈ کے بعد اس نے حمزہ کیانی کی گاڑی کو سڑک پر ہی جا لیا تھا۔ انزلہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی اور گاڑی میں جیسے جنگ کا سماں تھا۔ سانول کو دیکھنے کے بعد حمزہ نے گاڑی روکی تھی۔ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوری انزلہ نیچے اُتر آئی۔ جب کہ حمزہ کو سانول نے گریبان سے پکڑ کر باہر نکالا تھا۔

وہ جو بچپن کے گہرے دوست تھے۔ اس وقت جانی دشمنوں کی طرح ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے' حمزہ کیانی نے اس کے اٹھتے ہاتھ کو روکنے اور اسے کچھ بتانے کی کوشش کی تھی مگر سانول نے اسے کچھ بھی بولنے کا موقع نہیں دیا تھا' اس وقت اس کے سر پر جیسے خون سوار تھا۔ بہت مشکل سے تیسرے دوست کی مداخلت کے باعث حمزہ کیانی کی جان سانول شاہ کے ہاتھوں سے بچی تھی اور یہی وہ وقت تھا جب انزلہ نے جانا تھا کہ وہ اس کے لیے کیا تھی؟

حمزہ کیانی کے بھاگنے کے بعد اس نے اپنی حالت کی پروا کیے بغیر' ان دونوں کے لیے ٹیکسی رکوائی تھی اور خود کرایہ ادا کر کے انہیں پوری ذمہ داری کے ساتھ گھر روانہ کیا تھا۔ انزلہ اس رات بہت دیر تک جاگتی رہی تھی' زوبی کی معرفت جو کچھ بھی اس کے علم میں آیا تھا۔ وہ ساری رات اسے بے چین رکھنے کے لیے کافی تھا۔ اگلے روز ابھی وہ بستر میں تھی کہ زوبی اسے لینے کے لیے آ گئی۔

''چلو انزلہ...... سانول کا پتا کر کے آتے ہیں' کل سے وہ اور اس کا دوست اسپتال میں ہیں۔''

''کیوں......؟'' وہ پریشان ہوئی۔

''یار گہری چوٹ لگی ہے اسے سر اور بازو پر۔''

وہ متفکر تھی' انزلہ کچھ سوچتے ہوئے اپنی نانو کو بتا کر زوبی کے ساتھ اسپتال چلی آئی۔ جہاں پرائیوٹ کمرے میں بیڈ پر بیٹھا سانول شاہ اپنے دوست سے گپ شپ لگا رہا تھا' انزلہ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں جیسے چمک اٹھی تھیں۔

''السلام علیکم!'' سانول کی نگاہوں نے انزلہ کو کنفیوز کیا تھا جس پر وہ چپکے سے مسکرا دیا۔

''وعلیکم السلام' آپ یہاں؟'' خوش ہونے کے ساتھ ساتھ وہ حیران بھی ہوا تھا۔ تبھی زوبی

بول اٹھی۔

"جی...... وہ اصل میں یونیورسٹی میں آپ کے دوستوں سے آپ کی طبیعت اور حالت کا پتا چلا تو انزلہ یہاں آنے سے خود کو روک نہ سکی' اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"ٹھیک ہوں الحمدللہ! کیا انزلہ یونیورسٹی گئی تھی؟"

"نہیں! میں گئی تھی۔ یہ تو کل سے دعاؤں پر لگی ہے۔" زوبی مسکرائی تھی۔ وہ سانول کی نگاہیں خود پر جمی دیکھ کر اسے گھور کر رہ گئی۔

"شکریہ......!" اب وہ مسکرایا تھا انزلہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکی۔

"نہیں شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا ہے کہ آپ نے کل میرے لیے وہ سب کچھ کیا جو شاید آپ کو نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"کیا نہیں کرنا چاہیے تھا؟" فوراً سنجیدہ ہوا۔

"وہی اپنے عزیز دوست سے جھگڑا' مارپیٹ...... آپ تو جانتے ہی ہیں وہ کس باپ کا بیٹا ہے۔"

"ہاہ...... اتنی سی بات پر اتنی پریشان ہیں آپ؟"

انزلہ اس بار کوئی جواب نہ دے سکی۔

"آپ فکر نہ کریں' مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا وہ' کیونکہ وہ مجھے اچھی طرح سے جانتا ہے کہ میں کس باپ کا بیٹا ہوں اور یہ بھی کہ اس کے باپ کو منسٹر بنانے میں کس کا ہاتھ ہے۔"

"پھر بھی وہ یونیورسٹی میں......"

"یونیورسٹی کا تو منہ بھی نہیں دیکھنے دوں گا میں اسے اور جہاں تک آپ کی عزت ہے تو میں ضمانت دیتا ہوں انزلہ' وہ دوبارہ کبھی اپنے ہونٹوں پر آپ کا نام بھی نہیں لا سکے گا' نہ میں اسے لانے دوں گا۔"

کتنی مضبوطی تھی اس کے لہجے میں' انزلہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ سخت جان اور بہادر تھا۔ اس کی خواہش کے عین مطابق' تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو زوبی نے آہستہ سے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"کہا تھا ناں اتار دے نظر اپنے شہزادے کی' مگر تم نے میری ایک نہیں سنی اب دیکھ لو نتیجہ۔" اس کی سرگوشی سانول کی سماعتوں تک تو نہیں پہنچ سکی تھی البتہ اس کا دوست جو اُن کے پیچھے ہی کھڑا تھا' اس نے سن لی تھی۔ تبھی وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"میرا یار تو ہر نظر میں جچتا ہے' یہ کب تک نظر اتارتی رہیں گی؟"

"اُف! میری یہ زبان بھی ناں' کبھی چپ نہیں رہ سکتی۔" دوسرے ہی پل انزلہ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے اس نے اپنی زبان دانتوں تلے دبائی تھی۔ جواب میں سانول اٹھ کر ان کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"میں آج ڈسچارج ہو جاؤں گا یہاں سے' آیئے آپ کو چھوڑ آؤں۔"

"نہیں شکریہ' ہم چلے جائیں گے' آپ آرام کریں۔"

سرعت سے کہہ کر وہ فوراً وہاں سے نکل آئی تھیں۔ سانول دروازے کی دہلیز پر کھڑا کو، یہ ا،

سانول اور اس کے دوستوں سے محتاط رہنے کی تنبیہہ کی تھی کیونکہ وہ اساتذہ کا چہیتا اور سانول گروپ کا سب سے بڑا مخالف تھا۔

انزلہ کو اس روز کچھ ضروری نوٹس تیار کرنے تھے۔ میران اس روز یونیورسٹی نہیں آیا تھا اگر اسے لائبریری سے چند اہم کتابیں درکار نہ ہوتیں تو شاید وہ بھی نہ آتی' زوبی بھی اس کی دھمکیوں پر صرف اس کے ساتھ کے لیے زبردستی آئی تھی۔

موسم بے حد حسین تھا۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگتی تو کبھی ہلکی سی دھوپ نکل آتی' وہ لائبریری میں گھسی تو پھر وقت ختم ہونے پر ہی باہر نکلی۔

اپنے کام میں محویت کی وجہ سے اسے وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوسکا تھا۔ وہ اپنے نوٹس سمیٹتی' لان کی طرف چلی آئی جہاں زوبی اس کا انتظار کررہی تھی۔

''صد شکر کہ تمہارا چلہ ختم ہوگیا۔ کچھ اپنے قیس کی خبر بھی ہے کہ نہیں؟''

ان کا ارادہ موسم کے حُسن کی وجہ سے پیدل مارچ کا تھا' لہٰذا وہ اس کے قدموں سے قدم ملا کر چلتی ہوئی بولی تو انزلہ کے قدم رک گئے۔

''کون قیس؟''

''وہی...... جس کی آنکھیں خراب ہیں اور جسے پوری یونیورسٹی میں تم جیسی اسٹوپڈ لڑکی کے سوا دوسری کوئی نظر ہی نہیں آتی۔''

''او...... سانول شاہ؟'' وہ مبہم سا مسکرائی تھی جس پر زوبی چڑ گئی۔

''جی ہاں' اس کے سوا دورِ حاضر کا قیس اور ہو بھی کون سکتا ہے۔''

''کیا ہوا اسے؟''

''بخار اور قے ہورہی ہے پھر بھی یونیورسٹی آیا ہے۔''

''تو......؟''

''تو یہ کہ سب دوست چھیڑ رہے ہیں اسے' ویسے بدمعاش بنتا ہے مگر تیرا ذکر آتے ہی لبوں کی مسکراہٹ ماند نہیں پڑتی جناب کی۔''

''اچھا...... تمہارا بڑا دھیان لگتا ہے ایسی باتوں میں۔''

''ساری یونیورسٹی کا لگتا ہے۔'' وہ مسکرائی۔

انزلہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ابھی وہ لوگ یونیورسٹی روڈ کراس کرکے دوسری طرف تک آئی تھیں کہ سانول شاہ کا دوست اور وزیر صاحب کا بگڑا ہوا سپوت حمزہ کیانی' اپنی چمچماتی گاڑی کے ساتھ ان کے راستے میں آ گیا۔

''آؤ انزلہ...... میں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔''

وہ اس کی جرأت پر ٹھٹکی تھی۔ تبھی ناگواری سے بولی۔

''جی نہیں...... میں چلی جاؤں گی...... شکریہ۔''

''کم آن یار' ہم یونیورسٹی فیلو ہیں' ویسے بھی میران صاحب تو یونیورسٹی آئے نہیں تو میں چھوڑ دیتا ہوں۔''

''کیوں......؟ خدمت خلق کی کوئی تنظیم جوائن کرلی ہے آپ نے یا آج سے یونیورسٹی کی ڈرائیوری شروع کردی ہے؟''

اس پر غصے کا کوئی اثر نہ ہوتا دیکھ کر وہ مزید تپی تھی مگر مخالف بھی اپنے نام کا ایک ہی ڈھیٹ تھا' تبھی مسکراتے ہوئے بولا۔

''آپ کہیں گی تو کوئی بھی تنظیم شروع کرلوں گا' مگر ڈرائیوری تو صرف ایک آپ کی کرسکتا ہوں' بس۔''

''میں ڈرائیوروں کو جوتے مارتی ہوں' کبھی کبھی' کھالیں گے؟''

''بالکل......'' اسے زچ کرنے کی وہ قسم کھائے بیٹھا تھا۔ زوبی نے بات بڑھتے دیکھ کر انزلہ کا بازو کھینچ لیا۔

''تمہیں اس شخص کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے انزلہ' چلو۔'' زوبی کے کہنے پر اسے تاؤ آیا تھا' تبھی گاڑی عین ان دونوں کے قدموں کے قریب روک دی۔

''جب کہہ دیا کہ آج تم میرے ساتھ جاؤ گی تو بس بات ختم ہوگئی۔'' وہ گھمنڈی اور ضدی تھا۔ انزلہ کا خون کھول کر رہ گیا تھا۔

''تمہارے ساتھ جاتی ہے میری جوتی...... انزلہ شاہ نام ہے میرا' معمولی لڑکی سمجھنے کی بھول مت کرنا اور نہ ہی اس گمان میں رہنا کہ اپنے منسٹر باپ کی منسٹری پر جو چاہو کرسکتے ہو۔ میں جوتے کی نوک پر رکھتی ہوں' تمہیں بھی اور تمہارے باپ کی منسٹری کو بھی' سمجھے تم۔'' وہ اس سے الجھنا نہیں چاہتی تھی مگر اس شخص کی باتوں نے اسے مجبور کردیا تھا۔ زوبی کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

''چلو دیکھ لیتے ہیں کون کس کو جوتے کی نوک پر رکھتا ہے۔'' رعونت سے کہتے ہی وہ گاڑی سے نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے انزلہ کا بازو تھام لیا۔ زوبی نے اس غنڈہ گردی پر اسے فائل دے ماری تھی' جواب میں وہ اسے پرے دھکیلتے ہوئے' انزلہ کے تمام تر احتجاج کے باوجود اسے اپنی گاڑی میں دھکیل گیا۔ اردگرد سے گزرتے بے حس لوگوں نے یہ تماشا بڑی دلچسپی سے دیکھا تھا۔

گاڑی آگے بڑھ گئی تھی اور چیختی' روتی زوبی رانا بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

سانول اپنے دوست کے ساتھ بائیک پر پیچھے بیٹھا' کسی سے سیل فون پر باتوں میں مصروف ہا اردگرد دھیان دیئے وہاں سے گزرا تھا۔ زوبی کی نظر اس پر پڑی تو اس نے بنا کسی کی پروا کیے پوری قوت سے اسے آواز دے ڈالی۔

وہ چونکا تھا اور سیل فون کان سے لگائے لگائے ہی اس نے گردن ذرا سی ترچھی کرکے ایک نظر زوبی رانا پر ڈالی تھی' جو رو رہی تھی۔ تب فوراً سے پیشتر کال ڈراپ کرکے اس نے اپنے دوست سے بائیک رکوائی اور زوبی اس اثناء میں لپک کر اس کے پاس چلی آئی۔

''سانول بھائی...... وہ آپ کا بگڑا ہوا آوارہ دوست ہے نا حمزہ کیانی......'' ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں کے ساتھ وہ بس اتنا ہی بول پائی تھی۔ سانول حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''سب ٹھیک ہے ناں مس زوبی؟''

''نہیں...... کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے' وہ آپ کا دوست اسٹوپڈ حمزہ کیانی' اس نے انزلہ سے

تھی، وہ جانتی تھی کہ تھوڑی دیر بعد کیا ہونے والا ہے اور شاید اسی خدشے نے اس کا سارا خون نچوڑ لیا تھا، اپنی موت اسے آنکھوں کے سامنے رقص کرتی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے باوجود کتنی عجیب بات تھی کہ نہ وہ گھر سے فرار ہوئی تھی، نہ اس نے ارسلان حیدر سے ہی دوبارہ کوئی رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

اپنا سیل بھی اس نے کرچی کرچی کر ڈالا تھا۔ اس بار اس نے اپنے فرار کی ساری راہیں خود مسدود کر ڈالی تھیں۔ جو جرم اس کے ہاتھوں سرزد ہوا تھا، اس جرم کی سزا تو بھگتنا ہی تھی۔ وہ ایمان دار لڑکی تھی۔ نفرت اور محبت دونوں میں یکساں ایمان دار لڑکی۔ لہٰذا اپنی خطاء کی سزا بھگتے بغیر وہاں سے فرار ہونا اس جیسی ایمان دار لڑکی کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔

❁❁❁

اس کی جدائی کھا گئی مجھے گھن کی طرح
ہم سخت جان پہلے تو یوں کھوکھلے نہ تھے
جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے بجا نہ تھا
اتنے بُرے بھی کب تھے اگر ہم بھلے نہ تھے

پچھلے تین روز سے وہ تیز بخار میں مبتلا تھی۔ دن میں قرار رہا تھا نہ ہی راتوں کی پُرسکون نیند اپنی رہی تھی۔

صرف ایک شخص...... ایک انجان شخص کے ہاتھوں ٹوٹے مان نے کتنا شکستہ کر دیا تھا اسے، اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ شخص اس کے سامنے ہوتا اور وہ پے در پے تھپڑوں سے اس بے ایمان فریبی شخص کا چہرہ سرخ کر ڈالتی۔

گھر بھر میں ایان کے واپس مل جانے کی خوشی رقصاں تھی، زندگی سے ہارے ہوئے ان غریب مجبور چہروں پر، امید کی ایک نئی کرن نے اپنا عکس ڈالا تھا۔ سمعان، صائمہ، چھوٹے دونوں بھائی اور اس کی ماں، جیسے سب ہی سنبھل گئے تھے۔

بس نہیں سنبھل رہا تھا تو صرف ایک اس کا دل......

اپنی توہین، اپنی بے عزتی، ہر پل بے چین کیے رکھتی تھی اسے۔ اس روز رات میں وہ سونے کے لیے لیٹی تو صائمہ نے اس سے پوچھ لیا۔

''کیا بات ہے صاعقہ! دو تین دن سے نوٹ کر رہی ہوں۔ کوئی مسئلہ ہے تیرے ساتھ، ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں جاتی اور دفتر سے بھی چھٹی کر رہی ہے۔'' وہ پہلو کے بل تکیے پر گال رکھے لیٹی تھی۔ صاعقہ نے بے زاری سے پلکیں موند لیں۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے میرے ساتھ۔''

''ہاں، جھوٹ میں بھلا تیرا ثانی کوئی ہو سکتا ہے، سب سمجھتی ہوں میں، ضرور اندر کہیں چوٹ لگی ہے۔''

بڑی ملانی تھی وہ، ہر بار اس کا قیاس درست ہوتا تھا، صاعقہ جھٹکے سے بستر پر اٹھ بیٹھی۔

''ہاں لگی ہے چوٹ......پھر......؟ ہے کوئی علاج تیرے پاس میرے غم میری اذیت کا' بول۔''
''ناراض کیوں ہوتی ہے؟'' اسے خفا دیکھ کر وہ بھی اٹھ بیٹھی تھی۔
''میں نے تو سمجھایا تھا تجھے مگر تُو میری بات سمجھ نہیں سکی اور یہ تیرا قصور نہیں ہے صاعقہ! اس رستے پر چلنے والے سارے مسافر ایسے ہی سر پھرے ہوتے ہیں' انہیں سمجھاؤ یا صحیح راستے کا پتا بتاؤ تو اپنے رہنما کا گریبان پکڑنے کو ہی آتے ہیں مگر میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا' صدیوں کا نچوڑ' سالوں کا تجربہ ہے۔ یہ جو مرد ہوتا ہے نا' یہ ہمیشہ عورت کے تکیے کے نیچے چھپا سانپ ثابت ہوا ہے اس کے لیے۔ عورت چاہے تو ساری زندگی اپنی دانش مندی' سمجھداری سے اس کے ساتھ گزارہ کر لی رہے' نہیں تو ذرا سی بھول' ذرا سی غفلت کا فائدہ اٹھا کر یہ کسی بھی موقع پر عورت کو کاٹنے سے باز نہیں آتا۔ سالوں کی وفاداری' قربانیاں' خون پلانا کچھ بھی تو معنی نہیں رکھتا اس سانپ کے لیے۔ کاٹنا اس کی فطرت ہے اور فطرت کبھی بدلتی نہیں' اسی لیے کہا تھا راہِ راست پر چل' گمراہی کے راستے کا انتخاب مت کر' وگرنہ پچھتائے گی' کہا تھا ناں؟'' وہ مڈل کلاس گھرانے کی عام سی لڑکی' کتنی گہری باتیں کر رہی تھی۔ صاعقہ کا سر جھک گیا۔
''صحیح کہتی ہو صائمہ......مگر اس رستے کے مسافر صرف سر پھرے ہی نہیں ہوتے' بڑے ڈھیٹ اور عاقبت نااندیش بھی ہوتے ہیں' ٹوٹ ٹوٹ کر جب تک بس نہ ہو جائے خود کو آزمانے سے باز نہیں آتے۔ میں ٹوٹی ضرور ہوں مگر ہاری نہیں ہوں۔ وہ شخص اگر یہ سمجھتا ہے کہ اس نے مجھے برباد کیا ہے تو یہ اس کی بھول ہے' اس نے صرف میری سادگی سے فائدہ اٹھا کر مجھے بے وقوف بنایا ہے اور میں اس کی یہ خطاء کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' ہاتھ کی پشت سے گالوں پر پھسلتے آنسو رگڑتے ہوئے وہ کہہ رہی تھی۔ صائمہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکان بکھر گئی۔
''پاگل ہے تُو اور کچھ نہیں...... بھلا تجھ جیسی معمولی لوئر مڈل کلاس لڑکی کے معاف نہ کرنے سے اسے کیا فرق پڑتا ہے اسٹوپڈ' دولت جن کی جیب میں ہو ان کے لیے جذبے ویسے بھی مٹی کے ڈھیر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا یار کہ لڑکی وہ چاند نہیں ہونی چاہیے جسے کوئی بھی نظر اٹھائے اور دیکھ لے' بلکہ عورت وہ آفتاب ہو کہ کوئی اگر سر اٹھا کر دیکھنا بھی چاہے تو اسے نہ دیکھ سکے۔ بہت اہمیت ہوتی ہے زندگی میں کردار اور ایمان کی حفاظت کی......تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات؟''
''ہوں......''
''شاباش! چلو اب سو جاؤ' ایان بھائی واپس آ گئے ہیں ناں' ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا اب۔ اللہ نے چاہا تو ہمارے حالات بھی......'' صائمہ کے لہجے میں حوصلہ اور امید تھی۔
صاعقہ نے سر دوبارہ تکیے پر رکھ دیا۔ پلکیں موندتے ہی پھر عباد کا چہرہ اس کے تصور میں آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے الفاظ۔
''سوری! میں آپ کو نہیں جانتا۔''
بھلا دنیا میں اس سے زیادہ تکلیف دہ الفاظ کوئی اور ہو سکتے تھے؟

❁❁❁

ے آخر تک انہیں دیکھتا رہا' آنے والے دنوں میں واقعی نہ کسی نے حمزہ کیانی کو دوبارہ یونیورسٹی میں دیکھا۔ نہ اس واقعے سے متعلق کسی کے لبوں سے کوئی تذکرہ سنا۔

میران کو اس نے مختصراً یہ بات بتائی تھی مگر وہ پھر بھی سانول شاہ سے اس کی دوستی کا قائل نہیں تھا اور یہ بات انزلہ کو اچھی نہیں لگی تھی۔

اسے سانول اچھا لگتا تھا' وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتی تھی' یہی وجہ تھی کہ اکثر میران کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر وہ اس سے بات کر لیتی تھی۔ ان دنوں سانول شاہ میں بہت واضح تبدیلی آئی تھی' وہ سب سے کٹنے لگا تھا۔ صرف انزلہ کی راہ دیکھتا' وہ یونیورسٹی کی ہر لڑکی سے دامن بچاتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے تمام دوست احباب اور کلاس فیلوز نے اس کا نام ''قیس'' ہی مشہور کر دیا۔

کتنے خوب صورت دن تھے وہ......؟

اپنے شفاف ہاتھوں کی گلابی ہتھیلیوں پر نگاہ جمائے وہ جیسے انہی دنوں کو دیکھ رہی تھی۔

ہم چھین لیں گے تم سے یہ شانِ بے نیازی
تم مانگتے پھرو گے ہم سے غرور اپنا

زیر لب یہی شعر دہراتے ہوئے اس نے جیسے اپنے عزم کو مزید پختہ کیا تھا۔

❁❁❁

ہم ہی ناداں تھے' کیا اس پہ بھروسہ ہم نے
ہم ہی پاگل تھے کہ لوگوں کی نہ مانی' لوگو
ہم تو اس کے لیے گھر بار بھی تج بیٹھے تھے
اس ستمگر نے مگر قدر نہ جانی' لوگو

سُن ہوتے اعصاب کے ساتھ وہ لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ دل جیسے سینے میں دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔ وہ بُری تھی' مجبور اور منافق تھی۔ مگر اتنی ظالم نہیں تھی کہ اپنے ہاتھوں اپنی غرض اور مفاد کے لیے کسی کی جان لے لیتی اور جان بھی اس شخص کی جو اس کا ''محسن'' تھا۔

اسے لگا جیسے وہ کھل کر سانس بھی نہیں لے سکے گی' پہلی بار اس کے دل میں شجاع کے لیے فکر نے سر اٹھایا تھا۔

شجاع باہر کھانا کھا کر آیا تھا' کمرے میں جاتے ہی ابھی وہ بیڈ پر بیٹھا تھا کہ اس کا سر زور سے چکرانا شروع ہو گیا۔ فوراً سے پیشتر اس نے ڈاکٹر موسیٰ کو فون کر کے گھر بلوایا تھا مگر تب تک اس کا گلا بھی جکڑنا شروع ہو گیا تھا یوں جیسے کوئی پوری قوت سے اس کا گلا گھونٹ رہا ہو' وہ امامہ کو آواز دے کر بلانا چاہتا تھا مگر اس کی صدا حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

شدید گھبراہٹ کے عالم میں سست پڑتے وجود کے ساتھ اس نے واش روم کا رخ کیا تھا' جہاں اسے خوب منہ بھر کے قے آئی تھی۔ وہ ابھی واش روم میں تھا کہ ڈاکٹر موسیٰ اور ڈاکٹر عاطف دونوں اکٹھے چلے آئے۔ شجاع واش روم سے نکلا اچھا خاصا نڈھال ہو چکا تھا۔

''شجی......کیا تم ٹھیک ہو؟'' دونوں اسے دیکھ کر اس کی طرف لپکے تھے۔
اگلے پندرہ منٹ میں ڈاکٹر موسیٰ نے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا اور پھر قدرے تشویش کے ساتھ ڈاکٹر عاطف کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں کچھ ڈسکس کرتے رہے۔ وہ دونوں واپس پلٹے تو پریشان تھے۔
''تم ابھی تھوڑی دیر پہلے کہیں گئے تھے کیا؟'' ڈاکٹر موسیٰ نے سوال کیا تھا۔ شجاع نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''ہوں......ایک ضروری کام سے گیا تھا' وہیں سے کھانا کھا کر ابھی گھر لوٹا ہوں۔''
''اس کا مطلب ہے اس کھانے میں ہی گڑبڑ تھی۔''
''میں سمجھا نہیں؟'' وہ تکلیف میں مبتلا ہونے کے باوجود حیران ہوا تھا۔ جب ڈاکٹر عاطف بولے۔
''تمہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے زہر دیا گیا تھا شجاع' خدا کا معجزہ سمجھو یا کچھ اور کہ معدہ بھرا ہونے کی وجہ سے زہر قے کی صورت باہر نکل گیا' ورنہ اب تک صورتِ حال جانے کیا ہوتی' یہ میرا تجربہ ہے۔ اصل حقائق میڈیکل رپورٹ کے بعد ہی سامنے آسکیں گے' فی الحال فوری اسپتال چلو' ابھی تم مکمل طور پر خطرے سے باہر نہیں ہو۔'' ڈاکٹر عاطف کے الفاظ اس کے لیے کسی شاک سے کم نہیں تھے۔
''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''
''ڈاکٹر عاطف صحیح کہہ رہے ہیں شجی! کسی نے تمہیں جان سے مارنے کی کوشش کی ہے۔'' ڈاکٹر موسیٰ اس کے بچپن کے دوستوں میں سے تھے' تبھی اس کی حیرانی پر وضاحت دیتے ہوئے بولے تو شجاع کو چکر آگیا' یہ کیسے ممکن تھا؟
''اب اٹھ جاؤ جلدی سے' تاخیر تمہارے لیے اچھی نہیں ہے۔''
اس کی چپ پر وہ پھر بولے تو شجاع اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر ہال میں امامہ صوفے پر بیٹھی رو رہی تھی۔ شجاع نے ایک نظر اسے دیکھا تو چونک گیا' بھلا وہ کیوں رو رہی تھی؟ کیا وہ ڈاکٹر موسیٰ اور ڈاکٹر عاطف کی باتیں سُن چکی تھی؟ پہلی بار بڑا افسر ہوتے ہوئے بھی وہ شدید الجھن کا شکار ہوا تھا۔
اسپتال میں تین چار گھنٹے جیسے اس نے گزارے وہی جانتا تھا۔ فوری طور پر اس کا معدہ واش کیا گیا تھا۔ جس کے بعد رپورٹ تیار کی جانی تھی' میڈیکل رپورٹ آنے تک ڈاکٹر موسیٰ اور ڈاکٹر عاطف دونوں اس سے رابطے میں رہے تھے۔
وہ ضروری ٹریٹمنٹ کے بعد گھر چلا آیا تھا کہ اسپتال میں اس کے لیے سکون نہیں تھا' وہاں سے آ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ نیند ٹوٹ کر آرہی تھی لہٰذا اس نے خود کو نیند کے سپرد کر دیا۔ امامہ کو اس نے دوبارہ نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی اسے اپنی بیٹی کی طبیعت کے بارے میں مزید کوئی اطلاع مل سکی تھی۔ شام میں مغرب سے پہلے ڈاکٹر موسیٰ رپورٹ کے ساتھ اس کے گھر پر چلے آئے تھے۔ امامہ انہیں ڈرائنگ روم تک چھوڑ کر شجاع کے کمرے میں چلی آئی جو اس وقت تکیہ بانہوں میں چھپائے گہری نیند سو رہا تھا۔
دل کی جو حالت تھی' وہ اس کی سمجھ سے باہر تھی' روح پر جیسے ایک عجیب سے خوف کی چادر تن گئی

کر کے اچھال دیا۔
"مجھے اب یہاں سے کہیں نہیں جانا شجاع حسن! چاہے تم اپنے ہاتھوں سے مار ہی کیوں نہ ڈالو۔" شجاع کے بند کمرے کو دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑائی تھی اور پھر وہیں صوفے سے ٹیک لگا کر پلکیں موند گئی۔

❀❀❀

چارپائی سے پاؤں نیچے لٹکائے وہ ملول بیٹھی تھی جب آمنہ کڑھی کا پیالہ لیے چلی آئی۔
"آہ...... آہ...... آج تو آتے ہی شہزادی کے درشن ہو گئے' ورنہ میں تو سمجھ بیٹھی تھی کہ ضرور مر ور گئی ہو گی اور گھر والوں نے اس خوف سے کہ کہیں محلے والوں کا صدمے سے ہارٹ فیل نہ ہو جائے تیرے مرنے کی خبر نشر نہیں کی' کیسی ہو؟"
"ٹھیک ٹھاک...... مجھے کیا ہونا ہے؟"
"ہاں...... تجھے کیا ہو سکتا ہے؟ تُو دوسروں کی سٹی گم کر دیتی ہے' خیر یہ بتا موبائل کیوں آف ہے تیرا؟"
"چارج نہیں ہے۔"
"تو چارج کر لے یار' مانا کہ ہمارا ملک بدترین لوڈشیڈنگ کی لپیٹ میں ہے مگر اتنی سی بجلی تو لیب ہو ہی جاتی ہے کہ موبائل چارج کیا جا سکے۔" بنا اس کے حال پر غور کیے وہ اپنے پٹاخے چھوڑ رہی تھی۔ صاعقہ نے اکتاہٹ سے اسے دیکھا۔
"تم کہاں گئی ہوئی تھیں اتنے دنوں سے؟"
"شکر...... تجھے پوچھنے کا خیال تو آیا ہے' شادی پر گئی تھی پھوپی کے گھر۔ واپس آئی تو چھوٹی بہن نے بتایا کہ تمہارے گھر بڑا ہینڈسم سا لڑکا آیا ہے۔ پہلے میں نے سوچا ضرور وہی ہو گا تیرا ایکس وائی زیڈ! لیکن جب اس نے بتایا کہ تم اس ہینڈسم سے لڑکے کو بھائی کہتی ہو تو بس...... مجھ سے رہا نہیں گیا' تم تو جانتی ہی ہو میری اماں! میری شادی کی وجہ سے کتنی پریشان رہتی ہیں تو میں نے سوچا کہ چلو تھوڑا فلمی ہیروئنوں کی طرح میں بھی دعا سلام کر آؤں۔ کیا پتا تیرے بھائی کا دل ول آ جائے مجھ پر۔" وہ حسب عادت شروع ہو چکی تھی۔ صاعقہ نے زور کا دھموکا اس کے شانے پر رسید کر دیا۔
"خبردار جو میرے بھائی پر نیت لگائی تُو نے تو؟"
"کیوں...... تیرا بھائی آسمان سے اُترا ہے؟ ویسے بھی میرے جیسی بھابی کہاں ملے گی تجھے۔" اردگرد کا لحاظ کیے بغیر وہ بول رہی تھی۔ تبھی ایان نے کھنکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔
"صاعقہ! میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ اماں کا خیال رکھنا۔" مختصراً کہہ کر وہ باہر نکل گیا تھا۔ آمنہ نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔
"ہائے...... یہ پاکستانی لڑکے...... صاعقہ جلدی سے پانی پلا' نہیں تو میں لگی ہوں بے ہوش ہونے۔"
"ہو جا شاباش...... میں بتاتی ہوں اندر جا کر سمعان بھائی کو۔"
"عقل کر لڑکی...... مذاق کر رہی تھی میں' کبھی سمجھ بھی جایا کر۔" سمعان کے ذکر پر وہ فوراً سنبھلی

تھی۔ جواب میں صاعقہ مسکرا دی۔

''شکر جو تیرے بے سُرے چہرے پر بھی مسکراہٹ دیکھنے کو ملی' اب بتا کیا بات ہے؟ گھر میں تو سب ٹھیک ہے نا؟ کھویا ہوا بھائی بھی مل گیا' پھر بھی یہ اداسی' اوپر سے جاب پر بھی نہیں جا رہی' پتا ہے قاسمی صاحب نے کل کتنی باتیں سنائی تھیں۔''

''کیوں؟''

''بغیر بتائے چھٹی کرو گی تو باتیں تو سنائیں گے نا وہ؟' آخر مالک جو ہوئے' خیر بتا ناں کیا ہوا ہے؟'' وہ اس کی جان بخشی کے موڈ میں نہیں تھی۔ صاعقہ نے سر جھکا کر سارا ماجرا کہہ سنایا۔

''دفع دور...... اتنی سی بات کی اتنی ٹینشن لے رکھی ہے تُو نے۔ پاگل نہ ہو تو۔ مجھے تو وہ شکل سے ہی لوفر لگ رہا تھا۔'' بیان بدلنے میں تو وہ سیاستدانوں کی بھی استاد تھی۔ صاعقہ اس کے انداز پر مسکرا دی۔

''لوفر لگ رہا تھا تو بتایا کیوں نہیں؟''

''لو...... مجھے کیا پتا تھا کہانی اتنی آگے بڑھ گئی ہے' خیر سیانوں کا قول ہے اپنے سے اوپر کبھی نہ دیکھو...... ہم جیسے ہیں' ویسا ہی کوئی مل جائے بس سادا سا' غریب سا' مگر بے حد چاہنے والا' دس بارہ بچوں کا ہونے والا ابا!'' آخری جملہ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا' صاعقہ نے ایک مرتبہ پھر اس کے شانے پر دھموکا رسید کر دیا۔

''تیرے دس بارہ ہی ہوں گے بے فکر رہ۔'' وہ پھر ہنسی تھی اور پیالہ وہیں چھوڑ کر اندر سمعان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ صاعقہ گہری سانس بھر کر موبائل چارج کرنے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔

❋❋❋

انوشہ کچن میں مصروف تھی اور اس کا بیٹا باہر لان میں کھیل رہا تھا۔ جب کوئی سفری بیگ کندھے پر لٹکائے ہشاش بشاش سا گھر کے اندر چلا آیا۔ لان میں بچے کو کھیلتا دیکھ کر وہ اسی کی طرف بڑھ گیا۔

''ہیلو چاند۔''

اپنے کھیل میں مشغول چاند نے فوراً سر گھما کر اسے دیکھا تھا۔

''پاپا؟'' اس نے جیسے قیاس لگایا۔ نووارد اپنی جگہ پر ٹھٹک گیا۔

''کیا یہ بچہ اپنے باپ کی پہچان سے تاحال محروم تھا؟''

''آپ میرے پاپا ہو نا!'' شاہ زر کے بعد اب وہ ایک اور چہرے میں اپنی تکمیل ڈھونڈ رہا تھا۔ سرمد نے کچھ سوچتے ہوئے اپنے مضبوط بازو پھیلا دیے۔ بچہ ایک لمحے میں اس کے سینے سے آ لگا۔

''نہیں' لیکن آپ کے پاپا کا دوست ہوں۔''

''تو پاپا کیوں نہیں آئے آپ کے ساتھ؟'' بہ مشکل تین سال کا وہ بچہ کتنے مشکل سوال کر رہا تھا۔ وہ سر کھجا کر رہ گیا۔

انہیں کام تھا بیٹے لیکن وہ جلدی آئیں گے۔''

''کب آئیں گے۔ جب میں بڑا ہو جاؤں گا تب؟''

شجاع حسن گہری نیند میں مدہوش بیڈ پر آڑھا ترچھا لیٹا تھا' جب وہ کپکپاتے وجود کے ساتھ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ حلق میں جیسے کوئی بھاری گولا پھنس گیا تھا۔ وہ اسے آواز دے کر جگانا چاہتی تھی مگر حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

بہت دیر کشمکش کے بعد' بڑی ہمت کر کے اس نے اس کا بازو جھنجوڑا تھا اور جواب میں شجاع نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ امامہ کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تیر رہے تھے۔

"شجاع...... وہ...... وہ آپ کے دوست ڈاکٹر......" بمشکل تھوک نگل کر وہ اتنا ہی بول پائی تھی۔ جب وہ گہری نگاہوں سے اسے دیکھتا' تکیہ ایک طرف پھینک کر بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پولیس والا ہونے کی وجہ سے وہ بے چین تھا کہ آخر اسے مارنے کی کوشش کس نے کی ہوگی؟ جب کہ وہ کھانا بھی اپنے عزیز دوست کے گھر سے کھا کر آیا تھا۔

اچھی طرح فریش ہونے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں آیا تو امامہ ملازم کے ہاتھوں کافی اور دیگر لوازمات ڈرائنگ روم میں بھجوا چکی تھی۔ ڈاکٹر موسیٰ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ شجاع سے مصافحے کے بعد اس کا حال احوال دریافت کرتے وہ اسے بتا رہے تھے۔

"میرا خدشہ بالکل صحیح ثابت ہوا شجی! یہ دیکھو رپورٹ۔ اس کے مطابق تمہیں کسی مشروب میں پوائزن ملا کر پلایا گیا تھا اور اس کا اثر اتنا شدید تھا کہ اگر سخت جان اور بھرے پیٹ سے نہ ہوتے تو آدھ گھنٹے کے اندر اندر تمہاری موت واقع ہو سکتی تھی۔ خدا کا معجزہ ہی سمجھو کہ اس نے تمہیں بچا لیا اور قے کی صورت زہر باہر نکل گیا ورنہ......" وہ جانے کیا کیا بتا رہے تھے مگر شجاع کا دماغ تو لفظ "مشروب" پر ہی بھک سے اڑ گیا تھا۔ فوراً سے پیشتر ایک منظر تصور میں جھلملایا تھا۔

"تھک کر آئے ہیں' میرے ہاتھ کا پانی تو پی ہی سکتے ہیں آپ۔"

ڈاکٹر موسیٰ نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا جو ضبط سے سرخ پڑ گیا تھا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ اسے اپنا خیال رکھنے اور مزید احتیاط کرنے کی ہدایت کرتے وہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔ تب وہ لاؤنج میں آیا تھا۔ امامہ سامنے ہی صوفے پر مغموم بیٹھی تھی۔ وہ اس کے قریب چلا آیا۔ سرخ چہرہ' سرخ آنکھیں...... وہ سہم کر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی تبھی وہ چبا چبا کر بولا تھا۔

"کیوں...... کیوں مارنا چاہتی تھیں تم مجھے' کیوں؟"

اس کے مضبوط فولادی ہاتھوں کی انگلیاں اس کے گداز بازوؤں میں گڑ گئی تھیں۔ پیار و محبت سے گندھا وہ شخص اس لمحے قہر بنا اس کے مقابل کھڑا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح روتی اس کے گلے لگ گئی۔

"مجھے معاف کر دیں پلیز...... میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی۔"

"جسٹ شٹ اپ!" چنگھاڑ کر اسے خود سے الگ کرتے ہوئے اس نے خاصا جان دار تھپڑ رسید کیا تھا۔

"نفرت ہے مجھے دھوکہ باز لوگوں سے' کہا تھا ناں میں نے پھر بھی...... پھر بھی تم نے فریب کیا' کیوں؟" اب وہ اسے جھنجوڑ رہا تھا۔

"کیا بُرا کیا میں نے تمہارے ساتھ' جس کا یہ صلہ دیا' بولو...... ایک آیا تھیں تم' بے گھر بے

آسرا...... میں نے اپنا نام دیا' اپنی عزت بنایا' اندھا اعتبار کیا تم پر' ہر سہولت' ہر خوشی دی پھر بھی...... پھر بھی میری موت چاہی تم نے...... کیوں؟ کیا یہی وہ مقصد تھا جسے لے کر تم اس گھر میں آئی تھیں' بولو......؟'' وہ جنونی ہو رہا تھا۔ امامہ بے دم سی اس کے قدموں میں گر پڑی۔

''مجھے معاف کر دیں شجاع! خدا شاہد ہے میں نے آپ کو مارنا نہیں چاہا تھا۔''

''اچھا...... تو پھر وہ ''آب حیات'' کس مقصد کے لیے پلایا تھا' زندگی دان کرنے کے لیے؟'' اسے بازوؤں سے پکڑ کر اس نے پھر مقابل کھڑا کر لیا تھا' امامہ جیسے بے جان سی ہو گئی۔

''نہیں...... وہ...... وہ صرف آپ کو بے ہوش کرنے کے لیے تھا تا کہ...... تا کہ میں یہاں سے سب کچھ چرا کر لے جاسکوں۔'' روتے ہوئے اعتراف کرتی وہ اسے سخت حیران کر گئی تھی۔

''کیا......؟''

''ہاں شجاع! خدا کے واسطے میرا یقین کیجیے' میں اس بار جھوٹ نہیں بول رہی۔'' بڑی مشکل سے وہ خود کو سچ بولنے پر آمادہ کر پائی تھی۔

''مم...... میرا ایک کزن ہے۔ جس سے میں بہت محبت کرتی ہوں' اس نے مجھ سے کہا کہ اگر میں آپ کے گھر سے کافی سارا مال و متاع لے کر آؤں تو وہ مجھے قبول کر لے گا' اسی نے مجھے وہ دوا دی تھی' یہ کہہ کر کہ یہ بے ہوشی کی دوا ہے اور اس سے میرے کام میں آسانی رہے گی۔'' نظریں جھکائے ٹھہر ٹھہر کر بولتی' وہ اس کے اندر کتنے شگاف ڈال گئی تھی' اسے خبر ہی نہ ہو سکی۔ شجاع خاموشی سے اٹھا تھا اور بیڈ روم سے اپنی چیک بک اٹھا کر لے آیا' فوراً سے پیش تر اس نے ایک سادہ چیک پر اپنے دستخط کر کے امامہ کی طرف بڑھا دیا۔

''میرے گھر میں رشتوں سے بڑھ کر کچھ بھی ایسا قیمتی نہیں ہے مس امامہ! جو آپ چرا کر لے جاسکیں' اس لیے یہ کیں بلینک چیک اور جتنی چاہیں رقم بھر کر اپنے اس کزن کے حوالے کر دیجیے' فی الحال میں اتنا ہی کر سکتا ہوں آپ کے لیے۔'' اسے بنا کوئی سزا دیئے' اس کی امنگوں کے عین مطابق وہ اسے رہائی کا پروانہ دے رہا تھا۔ امامہ کی آنکھیں حیرانی سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''آپ چاہیں تو طلاق بھی ابھی دے سکتا ہوں کہ دل سے اُتری اور نظر سے گری چیزوں کو میں اپنے پاس نہیں رکھتا۔ اب جہاں جانا ہے آپ کو جایئے' میں زندگی میں دوبارہ کبھی آپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔'' وہ پل میں اجنبی ہوا تھا اور اِدھر پل میں امامہ کو لگا جیسے اس کی شخصیت کا تابوت ایک لمحے میں کرچی کرچی ہو گیا ہو۔ وہ سر اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ صحیح کہا تھا کہنے والوں نے کہ جو مسافر جان بوجھ کر بھٹکا دینے والے راستوں کا انتخاب کرتے ہیں ان کا سفر ہی کبھی ختم ہوتا ہے نہ انہیں منزل ملتی ہے۔

کتنے موقع دیئے تھے قدرت نے اسے سنبھلنے کے مگر یہ ذلت و رسوائی تو جیسے اس کی قسمت میں لکھ دی گئی تھی۔ کچھ عاقبت نااندیش لوگوں کو اپنے حصے کی ٹھوکر کھا کر ہی سمجھ آتی ہے۔ شجاع اپنا حکم سنا کر وہاں سے جا چکا تھا۔ جب کہ وہ آنسوؤں سے بھری نگاہوں کے ساتھ' اس کے دان کیے ہوئے اس خالی چیک کو دیکھتی رہی تھی۔ جو اسے اس کی خواہشوں کے عین مطابق زندگی عطا کر سکتا تھا۔ مگر کتنا عجیب ہوا تھا کہ اس نے کچھ دیر ڈبڈبائی نگاہوں سے وہ چیک دیکھنے کے بعد اسے پرزے پرزے

''ہاں۔'' بعض اوقات بچوں کو مطمئن کرنا بھی کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ انوشہ چہرے سے پسینہ پونچھتی کچن سے باہر نکلی تو اپنے بیٹے کو ایک اجنبی شخص کی بانہوں میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''السّلام علیکم! مجھے سرمد کہتے ہیں۔ یقیناً جمال انکل نے میرے بارے میں بتایا ہوگا آپ کو۔''

''جی...... وعلیکم السّلام آیئے۔''

''سوری میں بہت لیٹ ہوگیا۔ اصل میں وہاں انگلینڈ میں زاور کا جو اکاؤنٹ تھا وہ اس کی اچانک ڈیتھ کے باعث سیل ہوگیا۔ دو ماہ انہی معاملات کو سلجھانے میں نکل گئے۔'' وہ اپنے دیر سے آنے کی وجہ بیان کر رہا تھا۔

انوشہ سر ہلا کر رہ گئی۔

''بابا اکثر ذکر کرتے ہیں آپ کا۔ دو ماہ پہلے جب ہم یہاں شفٹ ہوئے تو ان کے لبوں پر بس آپ کا ہی نام تھا۔ زاور کا دوست ہونے کی حیثیت سے بہت پیار کرتے ہیں وہ آپ سے۔''

''یہ تو ذرہ نوازی ہے ان کی' آپ انوشہ ہی ہیں نا۔''

چاند کو ساتھ لیے وہ صوفے میں دھنس چکا تھا۔ انوشہ نے پھر سر ہلانے سے کام لیا۔

''جی۔''

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ اصل میں زاور اور شافیہ بہت ذکر کرتے تھے آپ کا۔ میرا تو جگری یار تھا وہ۔ جن دنوں ان کے ساتھ حادثہ پیش آیا۔ میں اسپتال میں تھا۔ بہت بعد میں گھر والوں نے بتایا مجھے۔ آپ یہاں خوش ہیں نا؟''

''جی کہہ سکتے ہیں۔''

''آپ کا بیٹا بہت پیارا ہے انوشہ! بہت میٹھی باتیں کرتا ہے۔ بابا جب فون پر بتاتے تھے تو مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور کانوں سے سن کر یقین آ گیا ہے۔'' وہ فرینڈلی طبیعت کا مالک خوش شکل نوجوان تھا۔

انوشہ نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''بابا اور آنٹی دکھائی نہیں دے رہے۔ کہیں گئے ہیں کیا؟''

''نہیں' بابا مسجد گئے ہیں اور خالہ اندر دوا کھا کر لیٹی ہیں۔ آپ انتظار کریں۔ میں بلا کر لاتی ہوں انہیں۔''

سرعت سے کہتی وہ فوراً وہاں سے کھسکی تھی۔ سرمد دوبارہ چاند سے باتوں میں لگ گیا۔

جمال صاحب اور نزہت بیگم دونوں ہی سرمد کے آنے پر بہت خوش تھے۔ وہ پورے دو ماہ کی تاخیر سے آیا تھا اور آتے ہی گھر کے فرد کی طرح گھل مل گیا تھا۔ خصوصاً انوشہ کے بیٹے کے ساتھ اس کی بہت دوستی ہوگئی تھی۔

ابتداء میں انوشہ اسے نظر انداز کیے رہی۔ مگر وہ اتنی اچھی عادتوں اور طبیعت کا مالک تھا کہ وہ زیادہ دن اس سے بے رخی نہ برت سکی۔ اس روز رات خوب چاندنی تھی۔ انوشہ چاند کو سلا کر لان میں چلی آئی۔ اسے ابھی بھی تنہائی اچھی لگتی تھی۔

رات کی خاموشی' پُر اسرار ہوا اور خوشبو لٹاتے پودوں کا سُرور وہ کچھ گھنٹوں کے لیے جیسے اپنا ہر

دلہ بھول جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایزی چیئر پر بیٹھی' پلکیں موندے گلاب اور موتیا کی خوشبو اپنے اندر اتار رہی تھی۔ جب سرمد اسے ڈھونڈتا وہاں چلا آیا۔

''انوشہ۔'' بہت دھیمے لہجے میں اس نے پکارا تھا مگر انوشہ نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

''آپ یہاں؟'' وہ سنبھل کر بیٹھی تھی۔

''ہاں' چاند اور آنٹی سو رہے ہیں' بابا مطالعے میں مشغول ہیں۔ انہیں ڈسٹرب کرنا اچھا نہیں لگا تو آپ کو ڈھونڈتا یہاں چلا آیا۔ آپ نے مائنڈ تو نہیں کیا؟''

''نہیں۔'' وہ محض یہی کہہ سکتی تھی۔ وہ اس کے قریب دھری کرسی پر ٹک گیا۔

''مجھے بابا نے آپ کی لائف کے بارے میں مختصراً بتایا تھا۔ بہت افسوس ہوا۔ اصل میں یہ جو زندگی ہے نا انوشہ بڑا عجیب کھیل ہے اور اس کھیل میں ہارتے ہمیشہ وہی لوگ ہیں جو اسے سمجھ لیتے ہیں۔ دیکھا جائے تو میری کہانی بھی آپ سے مختلف نہیں ہے۔ بڑے دکھوں اور آزمائشوں کا سامنا کیا ہے میں نے' مگر کبھی ٹوٹا نہیں۔ نتیجتاً آج میں ایک کامیاب انسان ہوں۔ آپ کو ایک پتے کی بات بتاؤں۔''

وہ بولنے کا شوقین تھا۔

''جی۔''

''آپ شاید میری بات سے اتفاق نہ کریں' مگر یہ حقیقت ہے آنسوؤں کے خزانے سے بھری آنکھوں والے زندگی کے اس کھیل کے بڑے کھلاڑی ہوتے ہیں۔ یہ جو دکھ اور افسردگی ہے ناں یہ ہر کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ احساس اور جذبات مختلف روپ میں' مختلف دلوں میں گھر کرتے ہیں۔ یہاں ہمارا یہ المیہ ہے کہ ہمیں صرف ہنستے مسکراتے لوگ ہی اچھے لگتے ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ لوگ زیادہ انمول ہوتے ہیں جنہیں حساسیت اور اداسی اپنی گرفت میں جکڑے رکھتی ہے۔ ایسے لوگ زندگی کے ہر رنگ کی پہچان رکھتے ہیں۔ ہزاروں کے ہجوم میں واہ' واہ وصول کرتے جب پلٹ کر گھر کی تنہائیوں میں آتے ہیں تو......!''

اس کا لہجہ اچانک بھرّا آیا تھا۔ انوشہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''تو......؟''

''تو......تو ان کے اندر کی اداسی اور اکیلا پن انہیں چھید ڈالتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں فین ہیں میرے' مگر پھر بھی لگتا ہے جیسے بھری دنیا میں' میں بالکل اکیلا ہوں۔ اپنی تمام خوبیوں اور ناموں کے ساتھ۔''

چہرے کا رخ پھیر کر اس نے انوشہ رحمٰن سے اپنے آنسو چھپائے تھے۔ جب اس نے پوچھا۔

''کس فیلڈ سے وابستہ ہیں آپ؟''

''سنگر ہوں۔ وہاں انگلینڈ میں شوقیہ کئی پروگرام کیے ہیں میں نے' نیٹ کے ذریعے بھی سیکڑوں فین بنائے ہیں پھر بھی' پھر بھی ایک اچھے مخلص ساتھی کی کمی' بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ایک دوست ایک ہم راز جس سے آپ بلا جھجک اپنا ہر دکھ' ہر سکھ شیئر کر سکیں۔ جس کے ہونے سے آپ کو اپنے اکیلے پن کا احساس نہ رہے۔ آپ ہر کسی کے پیچھے نہ بھاگیں۔ جو آپ کا ہو صرف آپ کا۔''

اس کا لہجہ عجب تشنگی لیے ہوئے تھا۔ انوشہ اسے سمجھ نہ سکی۔
''انگلینڈ جیسے ملک میں رہ کر کوئی تنہا کیسے رہ سکتا ہے؟''
اس کے سوال پر مقابل بیٹھا وہ شخص دھیمے سے مسکرایا تھا۔
''تنہائی کا تعلق آپ کے اندر سے ہوتا ہے انوشہ! ملکوں سے نہیں۔''
''پھر...... شادی کیوں نہیں کی ابھی تک؟''
''کمپرومائز نہیں کر سکا۔ جو اچھی لگی وہ ملی نہیں اور جو ملیں وہ دل کو لگی نہیں۔''
''مطلب؟''
''مطلب......! مطلب میں بہت عجیب سا شخص ہوں۔ میں ہی کیا ہر وہ شخص جس کے اندر کوئی آرٹسٹ ہے وہ شاید عجیب ہی ہوتا ہے۔ اس کی سوچ' اس کی خواہشات' اس کے خواب۔ بہت مشکل ہوتا ہے ہم جیسے لوگوں کو سمجھنا اور ان کے ساتھ نباہ کرنا۔''
''جو اچھی لگی وہ کیوں نہیں ملی؟''
انوشہ کو اب اس سے گفتگو کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔
سرمد نے اس کے سوال پر گہری سانس فضا کے سپرد کی پھر بولا۔
''وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے' میری چاہت' میری دیوانگی سے باخبر ہونے کے باوجود اس نے کسی اور سے شادی رچالی۔ مگر کتنی عجیب بات ہے ناں انوشہ! کہ وہ پھر بھی خوش نہیں ہے' کسی اور کے دکھ میں بے حال وہ اب بھی میرا دل جلاتی ہے۔ کیا کروں میں۔ کچھ سمجھ نہیں آتی کہ آخر یہ محبت کس بلا کا نام ہے' عجیب مصیبت ہے یار۔ کہیں کا نہیں چھوڑتی یہ بندے کو' نہ جینے دیتی ہے نہ مرنے دیتی ہے۔''
''کیا نام ہے اس کا؟''
''آپ کیا کریں گی نام جان کر؟''
''کچھ نہیں' یونہی پوچھ رہی ہوں۔ آپ نہ بتانا چاہیں تو کوئی مسئلہ نہیں۔''
''ایسی کوئی بات نہیں' یقیناً آپ تو جانتی ہوں گی اسے' بہت قریبی رشتہ ہے اس کا آپ سے۔''
''اچھا' پھر تو ضرور بتایئے۔''
وہ حیران ہوئی تھی سرمد خان مسکرا دیا۔
''یونیورسٹی فیلو ہے میری' بریرہ رحمٰن نام ہے اس کا۔''
''کیا؟'' اسے واقعی دھچکا لگا تھا۔ اس بار سرمد اسے دیکھ کر رہ گیا۔
''ہاں' وہی اسٹوپڈ ہے' بہت اچھی ہے دل کی' یونیورسٹی میں بہت دوستی رہی ہے ہماری۔ مگر قدرت نے اس کی آنکھوں اور دل میں میرے لیے محبت کا رنگ نہیں ڈالا۔ میں اسے خوب صورت نہیں لگتا۔ وہ مجھے اچھا دوست مانتی ہے مگر......!''
جملہ ادھورہ چھوڑ کر وہ مسکرایا تھا اور اس مسکراہٹ میں جو اذیت چھپی تھی۔ وہ انوشہ رحمٰن کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہ سکی تھی۔
''آپ مزید کتنی دیر یہاں بیٹھیں گی؟''

''بس' اٹھ ہی رہی تھی کیوں؟''

''کافی پینے کو دل چاہ رہا تھا۔ بابا کے بقول آپ بہت اچھی کافی بناتی ہیں۔''

وہ پھر مسکرا رہا تھا۔ انوشہ کا دل چاہا وہ اسے مسکرانے سے منع کر دے۔ کتنی اذیت' کتنی تلخی اس کی مسکراہٹ میں۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

''ٹھیک ہے۔ چلیں۔''

فوراً سے پیشتر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سرمد بھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ زندگی۔ بھرپور وہ خوب صورت شخص اندر سے اتنا خالی ہے۔

❋❋❋

''انزلہ باجی۔''

شہر جانے والی کچی سڑک سے اٹھ کر وہ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا پائی تھی کہ چھنو کی مانوس آ نے اس کے قدم وہیں روک لیے۔ اُڑی رنگت اور پھولی سانسوں کے ساتھ وہ بہت دنوں کے ا اس کے سامنے آئی تھی۔ انزلہ حیران حیران سی اسے دیکھے گئی۔

''کیا بات ہے چھنو' تو ٹھیک تو ہے؟''

''غضب ہو گیا ہے انزلہ باجی! گاؤں میں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''مطلب؟'' اس نے بھنوئیں اچکائی تھیں۔ جب وہ بولی۔

''چھوٹے چوہدری کو گولیاں لگی ہیں جی' خود اس کے بڑے بھائی نے ماری ہیں۔ وہ وہا حویلی کے قریب پڑا تڑپ رہا ہے' مگر کوئی بھی بڑے چوہدری کے ڈر سے اس کے قریب نہیں رہا۔ فیقے اور اس کے ساتھیوں کو بھی گولیاں لگی ہیں۔ آپ کچھ کریں انزلہ باجی' نئیں تو سب کچھ ہو جائے گا۔''

خبر کیا تھی کوئی بم تھا جو انزلہ کو اپنے قریب پھٹتا محسوس ہوا تھا۔

بے ساختہ اس کے کانوں میں اپنے ہی لہجے کی بازگشت گونج اٹھی۔

''تمہاری موت انزلہ شاہ کے ہاتھوں لکھی جا چکی ہے۔ سانول شاہ' یاد رکھنا۔''

اور اب...... اب جب کہ یہ کہانی ختم ہو رہی تھی تو اس کے اندر بے چینی پھیل گئی تھی۔

جسم جیسے بے جان ہو گیا تھا۔

یہ کیسا المیہ تھا زندگی کا کہ جس شخص کی غلط حرکتوں نے اسے اس سے نفرت کرنے پر مجبور کر تھا اب اس سے دائمی جدائی کے تصور کے ساتھ ہی جیسے اس کی ساری برائیاں بھی پس پشت چلی تھیں۔ یاد رہا تھا تو محض اتنا کہ وہ اس کی ''چاہت'' تھا۔

جانے کیسے فون کر کے اس نے فوراً سے پیشتر بہزاد کو گاڑی کے ساتھ بلوایا تھا اور پھر بنا جان کی پروا کیے وہ ملکوں کی حویلی پہنچی تھی۔ جہاں قدرے فاصلے پر ڈیرے کے ایک طرف وہ زمی پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

انزلہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ بھاگ کر اس تک پہنچتے ہوئے اس نے اپنے حوا

ہوئے محسوس کیے تھے۔ زندگی کے اجالوں کو الوداع کہتے اس شخص سے نفرت کا گلیشئر تیزی سے پگھل رہا تھا۔ وہ اس کا سر اپنی گود میں رکھتے ہوئے رو پڑی۔

"قیس......"

ایک مدت کے بعد اس نے اسے اس نام سے پکارا تھا جو اس کی پہچان بن چکا تھا۔ جواب میں سانول شاہ نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کے لب اس سے کچھ کہنے کی تمنا میں محض پھڑ پھڑا کر رہ گئے تھے۔

"کہا تھا ناں میں نے۔ مت خدا بن کر چلو زمین پر' کہا تھا نا' خدائی کا دعویٰ کرنے والے' مٹی تلے جب اس زبردست پکڑ والے کی گرفت میں آتے ہیں تو توبہ کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ میں نے کہا تھا نا سانول شاہ مگر تم نے میری کوئی بات نہیں سنی۔" وہ اب بلند آواز سے رو رہی تھی۔ اسی اثناء میں بہزاد جیپ لے کر آ گیا۔

"سب ٹھیک تو ہے نا ازلہ؟"

جیپ سے اترتے ہی اس نے پوچھا تھا۔ جواب میں اس نے سانول کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"نہیں بہزاد...... کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے' پلیز' پلیز جلدی کرو۔ ہمیں جلد از جلد سانول کو اسپتال لے جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے' آپ پریشان نہ ہوں۔ گولیاں پیٹ میں لگی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو اسے کچھ نہیں ہوگا۔"

ازلہ کی جذباتیت و ہمدردی پر از حد حیران' اس نے آگے بڑھ کر سانول شاہ کو اٹھایا اور جیپ کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ ازلہ بنا دادی کو بتائے بہزاد کے ساتھ ہی جیپ میں بیٹھ گئی۔ اسے چھنو کی صدا اب بھی اپنے قریب سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

"پتا ہے ازلہ باجی! بڑے چوہدری نے سانول شاہ کو گولیاں ماری ہیں۔"

"نہیں۔"

"آپ کو کیسے پتا ہو گا جی! چھوٹے چوہدری بھلا کسی کی سمجھ میں آنے والی چیز تھوڑی ہیں۔ اب تک تو میں انہیں منہ بھر بھر گالیاں اور بددعائیں دیتی رہی تھی مگر' مجھے تو کل ہی فیقے نے بتایا تھا کہ چھوٹے چوہدری نے میران شاہ کی پھانسی ختم کروا کر اسے پورے تحفظ کے ساتھ کہیں بھگا دیا تھا۔ اس پر بڑے چوہدری کی اس سے جنگ ہوئی تھی اور تو اور......! اس نے اپنی بچپن کی منگ بھی ٹھکرا دی۔ سب کہتے ہیں جی وہ صرف آپ کا نام لیتا ہے......!"

چھنو اور بھی جانے اسے کیا کیا بتا رہی تھی مگر اس کا دل تو رک گیا تھا۔

جو پھانس دل میں چبھی تھی' جو نفرت کی اصل وجہ تھی' وہی ختم ہو گئی تھی تو اب کیا جواز باقی رہ گیا تھا اس شخص سے بے تحاشا نفرت و عداوت کا۔ جب کہ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے باپ کا قاتل بڑا چوہدری ہے اور اب اسی بڑے چوہدری نے اس شخص کے وجود میں بھی گولیاں اتار دی تھیں۔ جو باپ کے بعد اسے بے حد محبوب تھا۔

❁❁❁

"یہ سرمد خان کون ہے؟"

وہ اوپر ٹیرس پر کھڑا نیچے سڑک کے مناظر دیکھ رہا تھا۔ جب عباد کی کال آ گئی اور ابتدائی دعا سلام کے بعد جو پہلا سوال اس نے کیا وہ یہی تھا۔

"کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس یونہی' تمہارے آفس سے پتا چلا کہ کسی سرمد خان کے ساتھ مل کر بزنس کو شیئر کر رہے ہو؟"

"ہاں یار۔"

"کیوں؟"

"بس' اب تنہا کچھ بھی سنبھالا نہیں جاتا' وہ زاور کا پارٹنر تھا۔ اس کے انتقال کے بعد بھی ایمانداری سے اس نے وہاں انگلینڈ میں زاور کا کام سنبھالا۔ اسی لیے میں نے اسے یہاں بلوایا۔ کل میٹنگ رکھی ہے اس سے تم بھی آ جانا۔"

"میں نہیں آ سکوں گا۔ تمہیں پتا تو ہے گھر میں کتنی مصروفیت رہی ہیں۔ ہانیہ کی شادی کے بعد اماں کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی ہے' پھر دل کا موسم بھی بہت عجیب ہو رہا ہے یار! کسی چیز میں بھی سکون نہیں رہا۔"

"کیوں' کیا ہوا؟"

"کیا ہونا تھا یار! وہی محبت کی کارستانیاں اور ہجر کی آگ۔"

"میں سمجھا نہیں' تمہارا راوی تو چین ہی چین لکھ رہا تھا پھر......؟"

"پھر اب نہیں لکھ رہا۔ ایک ہفتے سے نہ اس کی شکل دیکھی ہے نہ آواز سنی ہے۔" از حد افسردہ لہجے میں کہتا وہ شاہ زر کو اچھا خاصا حیران کر گیا تھا۔

"کیا مطلب...... منگنی شدہ ہو کر بھی تو ابھی وہیں اٹکا ہوا ہے؟"

"ہاں...... تو...... تُو بھی تو شادی شدہ ہے۔ پھر بھی محترمہ آنسہ انوشہ رحمٰن میں جان اٹکی رہتی ہے تمہاری۔"

وہ بلا کا ذہین اور حاضر دماغ تھا۔ شاہ زر کے لبوں پر چپ لگ گئی۔

"ایک سوال پوچھوں شاہ؟" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد عباد کی آواز آئی تھی۔ وہ چپ رہا۔

"لگ گئی ہے نا دل پر؟" اس کی چپ پر وہ ہنسا تھا مگر بہت پھیکی سی ہنسی تھی اس کی۔ اس بار شاہ زر نے چپ توڑ دی۔

"پوچھو۔"

"یہ محبت کیا بلا ہے کیا تجھے اس کی سمجھ آتی ہے؟"

"نہیں۔" شاہ زر کی "نہیں" میں بہت تھکن تھی۔

"مجھے بھی سمجھ نہیں آتی شاہ! پتا نہیں کیا مصیبت ہے' جتنا نظر چراتا ہوں' اتنا ہی بے بسی محسوس ہوتی ہے' کیا کروں؟"

"کسی ایک کنارے پر لگ جاؤ' محبت میں شرک نہیں چلتا۔"

"کیسا شرک؟"

''یہی کہ ایک وقت میں ایک ہی مقام کئی لوگوں کو دینا۔''

''یہ تو تم بھی کر رہے ہو۔''

''نہیں' میں نہیں کر رہا۔ زندگی اگر میرے سامنے انوشہ اور بریرہ دونوں کی چوائس رکھے تو میں لمحے سے پیشتر انوشہ کو چنوں گا۔ ہاں اگر اس کے بغیر بریرہ ملتی ہے تو پھر وہی سب کچھ ہے۔''

''اور اگر وہ دونوں ایک ہی شخص کی اولاد نہ ہوتیں تو؟''

''تو میں انوشہ اور بریرہ دونوں کو ساتھ رکھتا۔ ایک پل کے لیے بھی خود سے دور نہ کرتا۔''

''ٹھیک ہے' چلو فرض کرتے ہیں کہ انوشہ تمہیں مل جاتی ہے۔ تو کیا تم بریرہ کو چھوڑ دو گے؟''

''شاید میرے لیے یہ مشکل ہو' مگر یہ طے ہے کہ اگر بریرہ کسی اور کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔ تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔''

بہت مشکل سوال کا جواب بہت سوچ کر دیا تھا اس نے تبھی اس نے پھر پوچھا۔

''اور انوشہ' اگر وہ کسی اور کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے تو......؟''

اس بار اسے پھر چپ لگ گئی تھی۔ کئی لمحوں کے بعد وہ بولا تھا۔

''بہت مشکل ہے میرے لیے اس کے بغیر خوش رہنا' بہت نقصان کیا ہے میں نے اس لڑکی کا عباد۔ بہت قرض ہیں میری ذات پر اس کے وہ میرے بغیر خوش رہ سکتی ہے۔ مگر میں اسے اب مزید کسی اور کے ساتھ شاید کبھی برداشت نہ کر سکوں۔''

''تم پاگل ہو شاہ زر اور کچھ نہیں۔''

''محبت میراث ہی پاگلوں کی ہے میری جان! بھلا ہوش مندوں نے بھی کبھی اپنا کچھ گنوایا ہے۔ اس راہ میں تو جو بھی لٹا ہے سب دیوانوں کا ہی لٹا ہے۔ شعر نہیں سنا تم نے کہ......

ایک ہمیں آوارہ کہنا' کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

''واہ......اب تو شعر و شاعری بھی شروع کر دی کیا بات ہے۔ اچھا منّے کا کچھ پتا چلا......؟''

''نہیں یار یہ پولیس والے بھی کبھی کسی کے ہوئے ہیں۔ بجائے فائدے کے مجھے تو ان سے نقصان ہی نظر آتا ہے۔ کب کہاں کس موقع پر ''وردی'' چڑھ جائے۔ کچھ پتا نہیں چلتا۔''

''چل چھوڑ یار' پہلے کیا کم مسائل ہیں کہ اب ان ''قانون دان'' کے مسئلے کو بھی سر پر سوار کر لیں۔ میں آ رہا ہوں ایک دو روز میں تیرے پاس' اپنا خیال رکھنا۔''

''ٹھیک ہے خدا حافظ۔''

عباد سے بات کرنے کے بعد اس کے اندر کا ''حبس'' قدرے کم ہو گیا تھا۔ بے شک نفسا نفسی کے دور میں ایسا سچا' مخلص دوست خدا کی طرف سے اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

❀❀❀

چاند کب سے آئس کریم کھانے کی فرمائش کر رہا تھا۔

انوشہ اس کے زکام کی وجہ سے اسے مسلسل ٹال رہی تھی۔ تبھی وہ سرمد کی گود میں چڑھ آیا جو

جمال صاحب کے ساتھ، بزنس امور پر ڈسکس کر رہا تھا۔

"انکل، مجھے آئس کریم کھانی ہے۔"

"چلو بھئی، نئی فرمائش پوری کرو۔" جمال صاحب مسکرائے تھے۔

سرمد نے چاند کے ہاتھ چوم لیے۔

"کتنی ساری کھانی ہے۔"

"ڈھیر ساری۔"

"مگر ڈھیر ساری آئس کریم کے پیسے تو آپ کے پاپا نے نہیں دیے مجھے۔"

"تو آپ میری ان سے بات کروا دیں نا۔ میں ان سے کہوں گا وہ آپ کو ڈھیر سارے پیسے بھجوا دیں گے۔"

چاند کی بات پر انوشہ کا خون جلا تھا جب کہ سرمد ہنس دیا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے، پھر میں گاڑی نکالتا ہوں آپ مما سے بولو وہ ہمارے ساتھ آئیں۔"

سرمد کے کہتے ہی وہ اس کی گود سے اتر کر انوشہ کے سر ہو گیا تھا۔

"مما چلیں انکل کے ساتھ آئس کریم کھانے۔"

"تم ہی جاؤ نوید سے کہیں کہ میں نہیں جا رہی کہیں۔"

وہ برہم ہوئی تھی۔ تبھی سرمد نے ٹوک دیا۔

"بری بات انوشہ! بچوں کے ساتھ ایسا رویہ نہیں رکھتے۔ یہ عمر بہت حساس ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی بات کو اندر بٹھاتے ہیں بچے۔ خیر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوں۔ نہیں تو میں کہیں نہیں جا رہا۔"

"اچھی بات ہے۔ میرا موڈ نہیں ہے کہیں جانے کا۔"

"موڈ بننے میں دیر نہیں لگتی۔ اب اٹھ جائیں نہیں تو میں نے اور چاند نے کھینچ کر اٹھا لینا ہے۔"

وہ چاند کا ہاتھ پکڑ کر واقعی اس کے قریب چلا آیا تھا۔

انوشہ سٹپٹا کر اسے دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"دنیا میں سو ضدی مرے ہوں گے جب آپ کا نزول ہوا ہو گا۔"

کلس کر اس نے کہا تھا۔ سرمد دل کھول کر ہنس پڑا۔

"چلیے بابا......! آپ اور آنٹی بھی چلیں۔ کیا یاد کریں گے اس عمر میں آئس کریم کو۔"

چاند کو بانہوں میں اٹھا کر وہ جمال صاحب کے قریب آیا تھا۔ جب وہ بول اٹھے۔

"نہیں بیٹا تم لوگ جاؤ۔ میں تو ابھی عصر کی نماز کے لیے جا رہا ہوں اور تمہاری آنٹی دوا لے کر لیٹی ہیں۔ انہیں آرام کرنے دو۔"

"واہ اس عمر میں بھی بیوی کے آرام کی کتنی پروا ہے آپ کو، بھئی شوہر ہو تو آپ جیسا۔" وہ پھر ہنسا تھا۔ جمال صاحب شرمندہ سے ہو گئے۔

انوشہ گاڑی میں آ کر بیٹھی تو سرمد نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس سے پوچھ لیا۔

"آپ مائنڈ نہ کریں۔ تو ایک بات پوچھوں انوشہ؟"

"میں مائنڈ نہیں کیا کرتی، آپ پوچھیں کیا پوچھنا ہے۔"

وہ چونکی تھی مگر اس نے سر گھما کر سرمد کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"اچھی بات ہے۔"

سرمد نے ایک نظر اسے دیکھا تھا اور پھر نگاہ سامنے روڈ پر جما دی۔

"کیا چاند عبدالصمد کی اولاد نہیں ہے؟"

"چٹاخ۔" انوشہ کو لگا اس نے سوال نہیں طمانچہ رسید کیا ہے اس کے منہ پر۔

کیا عجیب ستم ظریفی تھی کہ وہ اس "کالک" سے باہر نکل ہی نہیں پا رہی تھی۔ ہر جگہ اس کی مثال منہ کھولے اس کے سامنے کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بوجھل اعصاب کے ساتھ خاموشی سے دیکھتی رہی۔

"ایم سوری اگر آپ نے مائنڈ کیا تو۔"

وہ اب اسے دیکھ رہا تھا۔ انوشہ نے سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا دیا۔

"اٹس او کے۔" وہ بہت آزردہ ہوگئی تھی۔ سرمد کو اپنے سوال پر پچھتاوا ہونے لگا۔

تقریباً پچیس منٹ گاڑی میں خاموشی چھائی رہی تھی۔ جب گاڑی ایک جھٹکے سے ایک ریستوران کے سامنے رک گئی۔ سرمد نے گاڑی سے نکل کر پہلے چاند کو اٹھایا پھر انوشہ کی سائیڈ پر آگیا۔ مگر وہ اس سے قبل ہی گاڑی سے نکل آئی تھی۔

"موسم کتنا اچھا ہو رہا ہے نا انوشہ!"

شاید وہ اس کا موڈ بحال کرنے کو پوچھ رہا تھا۔

انوشہ نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چلیں پھر اسی خوشی میں آپ کو شاندار سا ایڈوانس ڈنر کرواتا ہوں' کیا یاد کریں گی آپ کہ کس دل اجنبی سے واسطہ پڑا تھا آپ کا۔"

براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ مسکرایا تھا۔

انوشہ بے ساختہ نظریں چرا گئی۔

عین اسی لمحے وہاں کسی اور گاڑی کے ٹائر چرچرائے تھے اور گاڑی میں بیٹھے شاہ زر آفندی کی نگاہیں انوشہ اور اپنے بیٹے کو ایک اجنبی شخص کے ساتھ اکٹھے دیکھ کر حیرانی سے کھلی رہ گئی تھیں۔

تو کیا واقعی اس کے امتحان کا وقت شروع ہو گیا تھا؟

❁❁❁

اس روز پورے دو ماہ کے بعد وہ جاب پر واپس آئی تھی اور یہ دو ماہ عباد نے کیسے گزارے تھے بس اس کا دل جانتا تھا۔

صاعقہ جانتی تھی کہ وہ بھی عباد انڈسٹری میں ہی کام کرتا ہے۔ اسی لیے اس نے بیماری کا بہانہ بنا کر دو ماہ کی درخواست بھیج دی تھی۔ عباد اس سے پہلے کبھی باقاعدگی سے آفس نہیں آتا تھا۔ زیادہ تر بیرملکی ٹورز پر ہی رہتا تھا مگر اب پچھلے دو ماہ سے وہ پوری پابندی سے آفس آرہا تھا۔ اسی امید پر کہ شاید وہ اسے مل جائے۔

کئی بار وہ اس کی گلی میں بھی گیا تھا مگر، ہر بار وہ دروازہ اسے بند ہی ملا۔

اس روز اسے کہیں جانا تھا۔ وہ صرف چند لمحوں کے لیے آفس کا چکر لگانے آیا تھا۔ جب اس کی نظر اپنے کیبن کی طرف جاتی صاعقہ پر پڑی تھی۔ صرف دو ماہ میں وہ لڑکی کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی، اس کا دل اس کے پہلو میں دھڑکا تھا اور بہت زور سے دھڑکا تھا۔

عین اسی لمحے اسے شاہ زر کی بات یاد آئی تھی۔

''کسی ایک کنارے پر لگ جاؤ عباد، محبت میں شرک نہیں چلتا۔''

''ہاں اسی لیے تو خدا بھی شرک کرنے والوں کو معاف نہیں کرتا۔ تم نے صحیح کہا تھا شاہ زر، محبت تو حید، وحدانیت کا نام ہے شرک کرنے والے ہمیشہ بھٹک جاتے ہیں۔''

وہیں کھڑے کھڑے اس نے سوچا تھا اور سیدھا اپنے روم میں چلا آیا تھا۔ وہاں ضروری کام نپٹانے کے بعد اس کے قدم صاعقہ کے کیبن کی طرف اٹھ گئے۔

❁❁❁

شجر پہ جو کوئی جال ہوگا
تو پنچھیوں کا زوال ہوگا
ستارا مٹی میں گم ہوا تو
تمہیں بھی اس کا ملال ہوگا
وفا کی مٹی کو چھو کے دیکھو
ہمارے جیسا ہی حال ہوگا
جواب تم سے جو گم ہوا ہے
کوئی تو ایسا سوال ہوگا
جو بیچ رستے میں ٹوٹ جائے
وہ ربط کیسے بحال ہوگا؟
بتول دل جو لہو لہو ہو
تو رنگ آنکھوں کا لال ہوگا!

''اللہ ہدایت کیسے دیتا ہے؟''

حسب معمول وہ سونے جاگنے کی کیفیت میں مبتلا تھی اور وہی جلالی بزرگ پھر اس کے سامنے تھے۔ جب اس نے خوف زدہ ہو کر ان سے پوچھا تھا۔

جواب میں بزرگ کی موندی ہوئی آنکھیں کھل گئیں۔ ان آنکھوں کی سرخی اور جلال نے کھا کا دل سہا دیا تھا۔

''بہت مہربان ہے وہ اپنی مخلوق پر، اپنے محبوب کی محبوب امت پر، گناہ سے لتھڑے یہ لوگ دنیا کی مستی میں گم ہیں۔ جن کے لیے آخرت ایک قصے کہانی کے سوا اور کچھ نہیں یہ لوگ ہدایت کے حق دار نہیں ہیں بیٹی کہ ان کے ظاہر و باطن میں تضاد ہے۔ یہ نماز میں اللہ رب العزت کی پاک ذات کے سامنے سر جھکاتے ہیں مگر ان کے دل...... ان کے دماغ، ان میں دنیا ہی چل رہی ہوتی ہے

بکری کے مردہ بچے سے زیادہ حقیر دنیا' یہ عمر کی نقدی خرچ ہونے تک ہوش میں نہیں آئیں گے۔ دنیا ان کے لیے نشہ ہے اور یہ اس نشے میں مدہوش ہیں۔ انہی لوگوں کے لیے شیطان مردود نے بڑے کروفر کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ سے کہا تھا کہ وہ قبر تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ ان لوگوں کے لیے دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے مگر...... اللہ کی مخلوق میں اس کے وہ بندے جو اس کی رضا اور خوشنودی کے لیے اللہ کے ناپسندیدہ تمام کاموں سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں خواہ وہ ان کے کتنے ہی محبوب ہوں تو یہ ہدایت اور بڑا انعام ہے بیٹی۔ یہ دنیا کی زندگی تو گہری نیند کا نام ہے۔ اس نیند سے آنکھ نزع کی آخری ہچکی کے ساتھ ہی کھلے گی مگر افسوس' تب تک عمر کی ساری نقدی خرچ ہو چکی ہوگی۔''

''کیسی عمر کی نقدی بابا؟ کیسا دنیا کا بازار؟''

وہ پریشان تھی۔ بابا کے ہاتھ میں موجود تسبیح کے گرتے دانے رک گئے۔

''عمر کی نقدی کا نہیں پتا تجھے......؟ یہ مہلت کا نام ہے بیٹی' دس سال' بیس سال' پچاس سال وہ اپنے جس بندے کو جتنی چاہتا ہے عمر کی نقدی دے کر بھیجتا ہے کہ جا تجھے دنیا کے بازار میں جینے کے لیے اتنی مہلت اتنے ماہ وسال دیے۔ اس مقرر کی ہوئی مہلت میں اپنے لیے جو کما سکتا ہے کما' چاہے تو نیکی اور اچھے اعمال کی گٹھڑی تیار کر' جو تیرے اخروی سفر میں تیرے کام آئے۔ وہ وقت کہ جب جنم دینے والی ماں بھی بچے کی نہیں ہوگی۔ نفسا نفسی کے اس وقت میں صرف اپنے اعمال کام آئیں گے۔ نہیں تو برائی کے شیطانی ٹھیلوں کی طرف چلا جا اور آخرت میں اپنی ذلت کے لیے اپنے اعمال نامے میں گناہوں کا بوجھ اکٹھا کرتا جا۔ پھر جیسے ہی سانسوں کی مہلت ختم ہوگی۔ حساب شروع ہو جائے گا۔ امتحان کا وقت گزر جائے تو پھر نتیجہ ہی تیار کیا جاتا ہے بیٹی! یہی عمر کی نقدی اور دنیا کے بازار کی کہانی ہے۔''

''مگر...... میں تو اس راہ کی بھٹکی ہوئی راہی نہیں ہوں بابا' میں تو بے زار ہوں اس روندی ہوئی دنیا سے......!''

وہ روئی تو بزرگ کے لبوں پر تمسخر اڑاتی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''کیسی بے زاری ہے یہ جس میں دنیا کی چاہ ختم نہیں ہوئی' کیا کیا تُو نے اپنے اصل کے لیے؟''

کتنا مشکل سوال تھا اور کیسی تلخی تھی۔

وہ پسینے میں شرابور سر جھکا گئی۔

خوابوں کا یہ سلسلہ لامتناہی ہوتا جا رہا تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تو دل پوری شدت سے دھڑک رہا تھا۔ شب آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔ وہ بستر پر اٹھ بیٹھی۔

خواب کا ایک ایک منظر ذہن میں تازہ تھا۔ آپ ہی آپ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''کیا کروں میں؟ یہ خواب...... یہ آگہی...... آخر کیا مقصد ہے ان کا؟ میرا ربّ مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے؟''

وہ الجھ رہی تھی اور اس الجھن کا سرا سوائے قرآن پاک اور نماز کے اور کسی سے نہیں مل سکتا تھا۔

✲✲✲

پچھلے دو ماہ میں وہ بہت زیادہ سنجیدہ اور مصروف ہو کر رہ گیا تھا۔

گھر میں ہادیہ کے ساتھ ساتھ باقی لوگوں نے بھی یہ بات محسوس کی تھی مگر اس سے استفسار کسی نے نہیں کیا۔ ہادیہ اس روز نہیں آئی تھی اور عباد کو فوری اسلام آباد جانا تھا مگر صاعقہ کو دیکھنے کے بعد جیسے اس کے سارے کام ملتوی ہو گئے تھے۔ وہ تیز قدموں سے چلتا اس کے کیبن میں آیا تھا۔ جہاں وہ سر جھکائے بیٹھی۔ اپنے کام میں مصروف تھی۔

''صاعقہ!''

مانوس پکار پر اس نے فوراً سر اٹھایا تھا اور پھر جیسے سر جھکانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ دل اتنی شدت سے دھڑکا تھا کہ وہ خود اپنی بے اختیاری پر گھبرا اٹھی۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ میرے ساتھ چلو پلیز۔''

دو قدم مزید آگے بڑھاتے ہوئے وہ اس کے سر پر آ کھڑا ہوا تھا۔

صاعقہ کا چہرہ ضبط سے سرخ ہو گیا۔

''سوری...... میں آپ کو نہیں جانتی۔''

''صاعقہ پلیز...... ایک بار میری سن لو پھر جو بھی فیصلہ کرو گی مجھے قبول ہو گا۔''

''مجھے کوئی فیصلہ نہیں کرنا' نہ میرا آپ سے کوئی واسطہ ہے سمجھے آپ۔''

''صرف ایک بار...... پلیز......!''

اسے اردگرد کا کوئی لحاظ نہیں تھا۔ صاعقہ اس کی ہٹ دھرمی پر تپ اٹھی۔

''میں اس وقت کام میں مصروف ہوں مسٹر زین اور میرے ایم ڈی اس وقت مجھے کہیں جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔''

''بھاڑ میں گیا کام' میں ایم ڈی سے بات کر لیتا ہوں۔ تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چل رہی ہو بس۔''

''خدمت کریں مسٹر زین میں......!''

''تم بھی نہ کیا کرو ضد' چلو جلدی کام سمیٹو شاباش' میں ابھی آتا ہوں۔''

اپنی مخصوص ہٹ دھرمی سے کہتا وہ ایم ڈی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ صاعقہ اس کی ضد اور دل ہی دل میں تلملاتی آفس میں تماشا نہ بننے کے لیے مجبوراً آفس سے نکل آئی۔ عباد اس کے پیچھے ہی نکلا تھا۔

دل میں اس کی طبیعت صاف کرنے کا ارادہ کرتی۔ خاموشی سے اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

✲✲✲

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ ساحل سمندر کے قریب رکی تھی۔

موسم بے حد سہانا تھا تبھی اس نے ساحل کا رخ کیا تھا۔ وگرنہ وہ اسے کسی پارک یا ریستوران میں ہی لاتا۔ پورے راستے صاعقہ گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے اپنا غصہ ضبط کرتی رہی تھی۔

وہ گاڑی سے باہر نکلا تو صاعقہ اس سے پہلے ہی گاڑی سے نکل آئی۔ خوب صورت گندمی چہرے پر غصے کی شدت کے باعث جیسے دھوپ چمک رہی تھی۔ وہ ترچھی نظر سے اسے دیکھتا۔ قدرے نادم سا قریب آ کھڑا ہوا۔

''ایم سوری صاعقہ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔''

''کیوں......؟''

وہ بڑی سلگتی نگاہوں سے سامنے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔

عباد کو لگا جیسے شاید اس کے الفاظ اندر ہی کہیں دم توڑ گئے ہوں۔ بہت مشکل سے وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''اس روز میرے باس کی بیٹی میرے ساتھ تھی۔ اسی لیے میں نے آپ کو پہچاننے سے انکار کیا مگر خدا گواہ ہے صاعقہ! میں پچھلے دو ماہ میں ایک پل بھی سکون سے نہیں رہ سکا۔ بار بار میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا' مگر نہ فون پر آپ سے رابطہ ہو رہا تھا نہ آپ آفس آ رہی تھیں۔ یہ بہت غلط ہے صاعقہ! کم از کم آپ کو مجھ سے وضاحت ضرور مانگنی چاہیے تھی۔''

اس کا لہجہ دھیما تھا اور صاعقہ کا دل چاہا وہ اس کا چہرہ تھپڑوں سے سرخ کر دے۔

''ہو گیا آپ کا لیکچر مکمل؟''

اس کی طرف دیکھے بغیر وہ مکمل اجنبی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ تڑپ اٹھا۔

''صاعقہ پلیز......!''

''مر گئی صاعقہ اور مار دیا اسے آپ پر اعتبار نے' آپ نے کیا سمجھا مسٹر زین میں غریب ہوں تو میری کوئی عزت نہیں؟ آپ امیر ہیں تو جب جو چاہے سلوک کر سکتے ہیں؟ نہیں' میں نے آپ کو پسند کیا تھا۔ اپنا آپ فروخت نہیں کیا۔ یہ ساری دنیا بھی اگر میری غربت کی وجہ سے مجھے دھتکار دے تب بھی میرے لیے میری ذات کی بہت اہمیت ہے کیونکہ میں خود کو دنیا کی نظر سے نہیں دیکھتی۔ میرا ہونا میرے لیے اہم ہے۔ خواہ دنیا کو میرے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق پڑے یا نہ پڑے۔''

وہ کھل کر دل کا غبار نکال رہی تھی۔

عباد دانستہ خاموش رہا کہ اس وقت خاموشی میں ہی عافیت تھی۔ اب بھی اگر وہ دل کا غبار نہ نکالتی تو شاید ان دونوں کے درمیان قائم فاصلے کبھی کم نہ ہوتے۔

''آپ نے کیا سمجھا......آپ مجھے کسی سستے سے کھلونے کی مانند دھتکار دیں گے تو میں ٹوٹ کر بکھر جاؤں گی۔ روتی پھروں گی آپ کے ہجر میں یا آپ کے پاؤں پکڑ کر آپ سے محبت کی بھیک مانگوں گی؟ بھیک میں نہیں ملتی محبت اور نہ ہی بدلے ہوئے محبوب کا دل پاؤں پکڑنے سے موم ہوتا ہے۔ آج تک رُوئے زمین پر کوئی ایسی دوا بھی ایجاد نہیں ہوئی جو محبت کے زخموں کا تریاق بن سکے۔ بدلے ہوئے لہجوں کا کوئی حل نکال سکے۔ آپ نے اچھا کیا کہ مجھے میری اوقات یاد دلا دی۔ وگرنہ کاغذ کی محبت کے کاغذی دلاسوں پر جیتی ابھی آگے چل کر جانے کتنی تکلیف اٹھانی پڑتی مجھے' آخر جو جتنی اونچائی پر جائے گا اسے منہ کے بل گرنے پر اتنی ہی چوٹ اور زخموں کا عذاب سہنا پڑے گا۔''

''صاعقہ......!''

''اور ہاں' ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا مسٹر زین' یہ جو ہم جیسے کم حیثیت' فقیر لوگ ہوتے ہیں ناں' بڑے ایماندار ہوتے ہیں یہ جذبوں میں' ہر چیز خالص ہوتی ہے ہمارے پاس چاہے وہ آنسو ہوں' احساسات ہوں یا جذبات۔ قدرت نے ہم جیسے کنگلوں کو ایک چیز بڑی فراوانی سے ودیعت کی ہوئی ہے اور وہ ہے ''محبت'' بہر حال صاعقہ احمد آپ کے غم میں ٹوٹ کر بکھرنے والوں میں سے نہیں ہے۔''

بنا اس کی صدا کو خاطر میں لائے وہ سمندر کی پرسکون موجوں پر سلگتی نگاہیں جمائے اپنی کہہ رہی تھی۔ یوں جیسے ان خاموش' پرسکون موجوں کو جتا رہی ہو کہ دیکھو اس روز تم مجھ پر میری بے بسی' میرے دکھ' میرے اکیلے پن پر ہنس رہی تھیں۔ آج میں نے اپنے محبوب کو پرایا کر دیا اور تم خاموش ہو دیکھا تم نے...... میں نے کہا تھا ناں۔ تم کبھی صاعقہ کو ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے نہیں دیکھو گی۔

''بس......! یا ابھی کچھ اور بھی کہنا ہے؟''

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد بالآخر عباد نے لبوں کو جنبش دی تھی۔

صاعقہ نے اس کا سوال سنا ان سنا کر دیا۔

غصے اور جذبات کی شدت سے جہاں اس کی ٹانگیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے وہیں آنکھیں آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ عباد کو اس لمحے اس سادہ سی لڑکی پر بے حد ترس اور پیار آیا۔

اس کے مقابل آ کر براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔ پھر انتہائی اپنائیت اور نرمی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

''میری آنکھوں میں دیکھو صاعقہ! تمہیں خبر ہو جائے گی کہ تم ٹوٹنے سے بچ نہیں سکی ہو۔ اپنا چہرہ دیکھو فقط دو ماہ میں کتنا کملا گیا ہے۔ اپنی یہ خوب صورت آنکھیں دیکھو۔ کیسے پرانے مزاروں کے دیپ کی مانند بجھ کر رہ گئی ہیں ایک نظر ذرا اپنے سراپا پر دوڑاؤ' وہ پہلے سی جاذبیت اور دل کشی کہیں کھو گئی ہے کیوں......؟''

اس کا ہاتھ صاعقہ کے گال پر ٹکا تھا اور وہ اتنے دن سے ضبط کا پہاڑ بنی ہوئی تھی۔ ایک دم سے جیسے سارا گلیشیئر پگھل گیا۔ ایک بار جو آنسو ٹوٹ کر گالوں پر پھیلے تو پھر قطار ہی لگ گئی عباد نے پہلی بار اتنے قریب سے کسی لڑکی کو یوں روتے ہوئے دیکھا تھا تبھی اس کا دل جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔

صرف ایک لمحے میں اس پر آشکارہ ہوا تھا کہ وہ صاعقہ احمد کے بغیر کچھ بھی نہیں' صاعقہ اب اپنا ضبط کھو بیٹھی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بری طرح رو رہی تھی۔

''تم بہت برے ہو زین! دنیا میں تم سے زیادہ اسٹوپڈ دوسرا کوئی نہیں۔''

''سیم ٹو یو' میرا بھی یہی خیال ہے تمہارے بارے میں' چاہوں تو ابھی تم سے زیادہ آنسو بہا سکتا ہوں مگر وہ ایک شعر ہے ناں!

ہم نے ہنس ہنس کے بھرم اہلِ وفا کا رکھا
ہم بھی رو دیتے اگر عشق میں جھوٹے ہوتے

اس کے کہنے پر صاعقہ نے اپنا سر اوپر اٹھایا تھا۔

"میں نہ جھوٹی ہوں نہ چال باز۔"

"میں نے کب کہا کہ تم جھوٹی ہو' میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ تم بہت اسٹوپڈ ہو' کوئی ذرا سی بات پر ناراض ہوتا ہے۔"

"ذرا سی بات...... تمہارے لیے وہ ذرا سی بات تھی؟"

ازحد دکھ کے ساتھ اس نے پوچھا تو عباد نے نگاہیں چرالیں۔

"کہا ناں صاعقہ اس وقت مجبور تھا۔ قسم سے وہ لڑکی اگر تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیتی تو بات کا بنا لیتی۔ جانے باس کو کیا کیا کہتی جا کر...... اور پھر بس اس ذرا سی بات پر میری نوکری' یہ شاہانہ باٹھ۔ یہ سب ختم اور میں آ جاتا سڑک پر۔ ذرا سوچو' اگر ایسا ہو جاتا تو ہم اپنے آنے والے ں کو کیا منہ دکھاتے۔"

سنجیدگی سے بات کرتے کرتے وہ اچانک فنی ہوا تھا۔

صاعقہ جو بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی ایک دم سے سرخ پڑ گئی۔

"دیکھو اس وقت کتنا خوب صورت رنگ ٹھہرا ہے تمہارے چہرے پر۔ اسی لیے کہتا ہوں یار' امتحان لیا کرو میرا اور اپنا۔ جس اذیت میں یہ دو ماہ میں نے گزارے ہیں صرف میرا خدا اور یہ ل جانتا ہے۔ تم تو فیصلہ کر کے سکون سے گھر میں بیٹھ گئی تھیں۔ میں بے چارا قیس ہر کام چھوڑ کر صبح شام تک صرف اس امید پر کہ شاید تمہاری کوئی ایک جھلک کہیں دکھائی دے جائے تمہاری گلی کے ڑ پر پاگلوں کی طرح کھڑا رہتا تھا۔ دو ایک بار تو لوگ مشکوک بھی ہونے لگے تھے۔ تبھی دل پر پتھر ھ کر یہ سلسلہ ترک کیا۔"

اس کی آنکھوں میں محبت کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔

صاعقہ مسرور سی رخ پھیرے کھڑی مسکرا اٹھی۔

"ادھر دیکھو صاعقہ' کتنے لڑکے لڑکیاں آزادانہ گھوم رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنی اپنی محبت کا ین دلا رہے ہیں۔ گھر والوں کے اعتبار کا خون کر کے جھوٹ کا سہارا لے کر صرف یہیں نہیں ہوٹلوں' ارکوں کی زینت بنے ہوئے ہیں اور شاید روز بنتے ہیں۔ مگر یہ پیار نہیں ہے یہ صرف ضرورت ہے۔ ان کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے۔ یہاں ساحل سمندر پر آنے والا ہر لڑکا زین نہیں ہے۔ نہ ہر لڑکی صاعقہ احمد ہے۔ جس کا اندر اجلے دودھ کی مانند شفاف ہے۔ اس لیے ہمیشہ یقین رکھنا' تمہاری غربت یا حیثیت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے اگر اہم ہے تو صرف تمہاری ذات' ہارے اندر کا اجلا پن' تمہاری پاکیزگی، تمہاری حیا اور یہ وہ چیز ہے جو ہر لڑکی کے پاس نہیں ہوتی۔ یور' یہ خزانہ' یہ دولت۔ کسی بھی لڑکی کو سب کچھ عطا کر سکتا ہے صاعقہ! مجھ سے خاکسار کی تو اوقات کیا ہے۔"

اس کی زبان سے نکلے ان لفظوں نے پل میں معتبر کر دیا تھا اسے۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھتی مسکرا ی۔

"چلو اب اس صلح کی خوشی میں اچھا سا لنچ کرتے ہیں۔"

"نہیں بہت دیر ہو جائے گی۔ ایم ڈی صاحب ناراض ہو جائیں گے۔"

''ہونے دو ناراض میں خود بات کرلوں گا ان سے۔تم چلو۔''
وہ کہاں اس کی سننے والا تھا۔
صاعقہ محض منمنا کر رہ گئی۔
واپسی کا یہ سفر کتنا دل کش اور سہانا تھا۔ وہ بے مقصد ہی ڈرائیو کرتے عباد کو نک سک سے تیار اس شاندار لباس میں، بار بار نظر بچا کر چوری چوری دیکھتی رہی۔ کہنے والوں نے کتنا صحیح کہا ہے کہ عشق و محبت کے روگی کا علاج سوائے اس کے محبوب کے اور کسی کے پاس نہیں۔

❊❊❊

''ہادیہ لنچ کے لیے چلنا ہے کہ نہیں؟''
سجی سنوری ہانیہ نے کوئی تیسری مرتبہ اسے آواز دی تھی جب وہ کنگن پہنتے ہوئے کمرے سے نکلی اور سرعت سے سیڑھیاں کراس کرنے لگی۔
''میں تو تیار ہی ہوں بس آپ کے بھائی صاحب کا انتظار ہو رہا ہے۔ وہ اسٹوپڈ فون ہی ریسیو نہیں کر رہا۔''
''مصروف ہوں گے۔ ویسے بھی ہو سکتا ہے وہ اسلام آباد کے لیے نکل گئے ہوں۔ آج اسلام آباد جانا تھا انہیں۔''
''لیکن اس نے لنچ پر آنے کا وعدہ کیا تھا۔''
''تو کیا ہوا یار! مصروف بھی تو ہو سکتے ہیں۔ اب جلدی چلو' تمہارے بھائی اس سے زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔''
وہ عجلت میں تھی۔ ہادیہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر عباد کا نمبر پریس کر گئی مگر دوسری طرف پھر اس کا سیل کوئی رسپانس نہیں دے رہا تھا۔ وہ کوفت زدہ سی ہانیہ کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔
لنچ کا جو پروگرام ہانیہ کی شادی کے بعد اس نے صرف عباد کے لیے بنایا تھا۔ ایک دم سے بے مزہ ہو کر رہ گیا تھا۔

❊❊❊

محبت عام اک سانحہ تھا!
ہمارے ساتھ پیش آنے سے پہلے وہ اور گڑیا گہری نیند سو رہے تھے۔ جب امامہ سست روی سے چلتی اپنے بیڈروم میں چلی آئی۔
پرسوں شجاع کی نفرت اور بے تحاشا غصے کے بعد وہ سر جھکائے مغموم بیٹھی تھی۔ جب ریاض بابا (چوکیدار) نے اس کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے اسے تسلی دی تھی اور اسی گھر میں بنے اپنے کوارٹر کے دروازے اس پر کھول دیے تھے۔ شجاع سے ان کا واسطہ بہت پرانا تھا۔ وہ اس کی ضد اور غصے سے بخوبی واقف تھے۔ وہ ایک بار جو فیصلہ کر لیتا تھا پھر اس کو پتھر کی لکیر بنا دیتا۔
وہ جانتے تھے کہ شام میں گھر واپس لوٹنے کے بعد اگر امامہ اسے دوبارہ نظر آئی تو وہ کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ خاندانی ملازم ہونے کی حیثیت سے وہ شجاع کی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز

آگاہ تھے۔ لہٰذا امامہ کو سمجھا بجھا کر وہ اپنی طرف لے آئے تھے۔ جہاں ان کے ساتھ ان کی بیمار امی ہوی رہتی تھیں۔

شجاع نے گھر واپسی کے بعد امامہ کو موجود نہ پا کر گہرا سانس بھرا تھا۔ رات میں وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹا تو نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑی اور اپنی شادی کی تصویر پر جا ٹھہری۔ دل میں ایک لمحے کے لیے ہلچل سی مچی تھی اور اس نے شکوہ کناں نگاہوں سے تصویر کو دیکھتے ہوئے ٹیبل پر واپس رکھ دیا۔

گڑیا اس سے امامہ کے بارے میں سوال پر سوال کر رہی تھی۔ وہ بہ مشکل اسے بہلاتا۔ اس کے بالوں میں ہاتھ چلاتے ہوئے اسے سلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سوگئی تو وہ اٹھ کر ٹیرس پر چلا آیا۔

رات خوب چاندنی تھی مگر اس چاندنی میں ایک عجیب سا حزن بکھرا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایسے بے زار ہو کر واپس پلٹا اور کمرے میں آ کر نیند کی گولی ہتھیلی پر رکھی۔ گلاس پانی سے بھرا اور گولی نگل کر بازو آنکھوں پر دھرتے ہوئے لیٹ گیا۔

امامہ جس وقت وہاں آئی وہ گہری نیند میں مدہوش سو رہا تھا۔ بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ کوارٹر سے نکلی تھی اور بنا کسی کو بتائے وہاں پہنچی تھی۔ جہازی سائز بیڈ کے دائیں طرف گڑیا سوئی تھی وہ اسی طرف چلی آئی۔ اس کا ننھا سا ہاتھ پہلو میں گرا تھا۔ وہ جب یہاں آئی تھی تو یہ گڑیا بہت چھوٹی تھی۔ شاید اسی لیے اسے جان کا عذاب لگتی تھی۔ مگر اب جب کہ اس کا دل بدل گیا تھا تو یہ بازی پلٹ گئی تھی۔

ہائے افسوس......

وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک کر بچی پر جھک گئی۔ چھ سال کی عیشاء میں اس وقت اسے اپنا آپ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے جھک کر بے ساختہ اپنے ہونٹ اس کی سرد پیشانی پر رکھ دیے۔ وہ کمبل کے بغیر لیٹی تھی اس نے کمبل کھول کر اچھی طرح اس پر پھیلا دیا۔ پھر وہ گھوم کر بیڈ کی بائیں سائیڈ پر آئی اور شجاع کے پاؤں کے قریب بیٹھ کر اس نے اپنے ہاتھ اس کے پاؤں پر دھر دیے۔ ٹپ ٹپ آنسوؤں کا سلسلہ تا حال جاری تھا۔ اس کے دل میں جانے کیا آئی کہ جھک کر اپنے لب اس کے پاؤں پر رکھ دیے۔ عین اسی لمحے شجاع کی آنکھ کھلی تھی۔

اپنے پیروں پر جھکی اس روتی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ کیا معاملہ ہے مگر اگلے ہی لمحے جب سمجھ میں آیا تو اس نے تیزی سے اپنے پاؤں کھینچ لیے پھر فوراً اٹھتے ہوئے اسے بازو سے تھاما اور بیڈروم سے باہر لے آیا۔

”کیا کر رہی ہو تم اس وقت یہاں؟ میں نے کہا تھا ناں دوبارہ کبھی شکل مت دکھانا۔“

اس کا بازو جھنجوڑتے ہوئے وہ غرایا تھا۔

امامہ بے بسی سے رو پڑی۔

”میں گڑیا کے بغیر نہیں رہ سکتی شجاع! خدا کا واسطہ ہے آپ کو، مجھے اس معصوم بچی سے دور مت کریں۔“

”جسٹ شٹ اپ۔ تم جیسی بے ایمان‘ بے ضمیر‘ دھوکے باز لڑکی کو بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں میں۔ تم جانتی ہو کہ میری بیٹی میں میری جان ہے اور اس بار تم اسی کو مہرہ بنا کر فائدہ اٹھانا چاہتی ہو‘ مگر

میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ سمجھی تم۔"
وہ اپنا اعتبار کھو چکی تھی۔
شجاع بنا اس کے آنسوؤں کی پروا کیے کمرے میں گیا اور قمیص پہن کر پھر لاؤنج میں چلا آیا۔
"چلو۔"
اگلے ہی پل وہ پھر اسے بازو سے تھامے اپنے ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔
وہ ہکا بکا رہ گئی۔
"کہاں لے جا رہے ہیں آپ مجھے؟"
"گاڑی میں بیٹھو پھر بتاتا ہوں۔"
کتنی سختی تھی اس چہرے پر اور اس لہجے میں۔ اس نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑانا چاہا مگر گرفت بے حد سخت تھی۔ وہ آنسو پیتی بے بس سی ساتھ گھسٹتی رہی۔
گیٹ پر موجود گارڈ ابھی بھی الرٹ تھا۔ شجاع کے اشارے پر اس نے فوراً سے پیشتر گیٹ کھول دیا۔ گاڑی گیٹ سے نکلی تو اس نے پوچھا۔
"اپنے کزن کا ایڈریس بتاؤ چھوڑ کر آ رہا ہوں اس کے پاس۔"
"کوئی ضرورت نہیں ہے گاڑی روکیں۔ پپ...... پلیز۔"
"ایڈریس بتاؤ امامہ! نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"
اس بار وہ دہاڑا تھا۔
امامہ سمجھ گئی کہ چوکیدار بابا نے کیوں فی الوقت اسے اس کے سامنے آنے سے منع کیا تھا۔ وقت اس کے غصے سے ڈرتے ہوئے اس نے ارسلان کا ایڈریس ٹھہر ٹھہر کر اسے بتا دیا۔ اگلے پندرہ منٹ میں گاڑی اس گھر کے باہر کھڑی تھی۔ جہاں ارسلان ٹھہرا ہوا تھا۔
"جاؤ اور اب کبھی پلٹ کر پیچھے نہ دیکھنا۔"
اس کی سائیڈ کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے نیا حکم سنایا تھا۔
امامہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔
"شجاع میں......!"
"گاڑی سے نکلو امامہ حسن! اس سے پہلے کہ میرا دماغ گھوم جائے۔"
درشتگی سے کہتے ہوئے اس نے زبردستی اسے کھینچ کر گاڑی سے نیچے اتار لیا تھا۔
"اب جاؤ......!"
امامہ نے سر اٹھا کر دیکھا وہاں معافی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔
اس نے اپنی محبت کو پانا چاہا تھا۔ شجاع حسن سے چھٹکارے کی خواہش بھی کی تھی اور دل کی گہرائیوں سے دعا بھی مانگی تھی مگر اس وقت اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس دعا کی مقبولیت کیسی اذیت سے دوچار کر دے گی اسے۔ محبت کے یوں حصول کا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ آنسوؤں بھری آنکھوں کے ساتھ آخری بار سر اٹھا کر اس نے شجاع حسن کو دیکھا تھا مگر وہ رخ پھیرے تھا۔ وہ شدید مایوس ہو کر آگے بڑھ آئی۔

اس کے اٹھتے قدموں کے ساتھ ہی وہ گاڑی میں بیٹھا تھا اور جس وقت امامہ نے اس گھر کے بند دروازے پر دستک دی اور جواب میں وہ دروازہ کھلا۔ وہ اطمینان سے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے زن سے وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

گو دل اس وقت سخت اضطراب کا شکار تھا مگر...... اتنا سکون پا گئی تھی۔

اندر کے مرد کو جیسے قرار آ گیا تھا۔

وہ نہیں جان پایا تھا کہ اس رات اس نے اپنی زندگی کی کتنی بڑی سنگین غلطی کی تھی۔

❋❋❋

دھول اڑاتی نگاہوں سے وہ گاڑی میں بیٹھا انوشہ اور اپنے بیٹے کو اس اجنبی مرد کے ساتھ ریستوران کے اندر جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔

عجیب ستم ظریفی تھی کہ اس نے انگلینڈ میں کبھی سرمد کو روبرو نہیں دیکھا تھا۔ ان دونوں کے درمیان ہمیشہ فون پر بات ہوتی رہی تھی۔ تبھی وہ اس کی شناخت میں ناکام رہا تھا۔

انوشہ اپنے لیے اتنی جلدی کوئی فیصلہ کر سکتی ہے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اسے خبر نہ ہوئی کہ وہ کتنی دیر وہاں گاڑی میں بیٹھا رہا تھا۔ وہ لوگ ڈنر سے فارغ ہو کر باہر نکل آئے تھے تب بھی وہ وہیں موجود تھا۔

واپسی کے سفر میں اس نے اپنی گاڑی ان لوگوں کی گاڑی کے پیچھے ڈال دی تھی۔ ایک طویل مسافت کے بعد جس عمارت کے سامنے رکی تھی' وہ عمارت شاہ زر کے لیے ہرگز غیر شناسا نہیں تھی۔ زاور کے ساتھ وہ اکثر وہاں آتا رہا تھا بلکہ اسی کے مشورے اور رہنمائی کے بعد زاور وہ پلاٹ خرید کر وہاں عمارت کھڑی کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔

انوشہ اور سرمد کے گھر میں داخل ہونے کے بعد وہ پلٹا اور اس بار جیسے ہاتھوں میں اسٹیرنگ وہیل تھامنے کی ہمت ہی نہیں رہی تھی۔ جانے کس عالم میں ڈرائیو کے بعد وہ ہوٹل واپس پہنچا تھا۔

ایک لمحے کے لیے دل چاہا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر واپس بھاگ جائے مگر' پھر سر جھٹک دیا۔ جب وہ قسمت میں ہی نہیں تھی تو بھلا خود کو تھکانے سے کیا حاصل تھا؟ انوشہ کو ''چاند'' کیسے اور کہاں ملا یہ ایک اور الجھا دینے والا سوال تھا۔

کل سرمد کے ساتھ اس کی میٹنگ تھی۔

حاشر نفیس صاحب کے گھر منعقد ایک چھوٹی سی پارٹی میں اسے سرمد کے ساتھ اور بھی کئی لوگوں سے ملنا تھا۔ انوشہ اپنی دانست میں اس سے چھپ کر دور چلی گئی تھی' مگر اس نے پھر سے اس کا سراغ ڈھونڈ لیا تھا۔

اضطراب کے ساتھ ساتھ اپنے بیٹے کی سلامتی پر دل کو قدرے قرار نصیب ہوا تھا۔ چاہے وہ دنیا کی نظر میں اس کا بیٹا نہیں تھا۔ صرف اور صرف انوشہ کے ماتھے کا کلنک تھا اک گناہ تھا۔ مگر شاہ زر کو اس ننھے سے وجود میں اپنی جان دوڑتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ اس کے لیے امید کی ایک کرن تھا۔

ناجائز تعلق سے جائز جنم لینے والا وہ ننھا فرشتہ اس کی ہر چیز کا مالک تھا۔

سوچ کا محور انوشہ اور چاند سے ہو کر بریرہ کی طرف رخ موڑ گیا تھا۔ اسے انگلینڈ گئے کئی ہفتے

ہو گئے تھے مگر وہ ابھی تک اس کے حق میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ اس نے بریرہ کی دل آزاری نہیں کی ورگرنہ انوشہ کے یوں فیصلہ کر لینے کے بعد کیا باقی رہ جاتا اس کے پاس۔

رات انہی سوچوں کی نذر ہو گئی تھی۔ صبح دیر تک پڑا سوتا رہا۔ ظہر کی نماز کے بعد کہیں آنکھ کھلی تو فریش ہو کر نیچے چلا آیا۔ اگلے دو گھنٹے یونہی سستی میں گزر گئے جب اس کے سیل پر سرمد کی کال آ گئی۔

''ہیلو!''

''السلام علیکم جناب! کہاں ہیں آپ؟''

''بس نکل ہی رہا تھا یار! تم پہنچ گئے کہ نہیں؟''

''کب سے پہنچا ہوا ہوں یار! اب تو سب تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں بس ابھی آیا۔''

جلد سے جلد اس نے بات سمیٹی تھی کہ طبیعت ابھی بھی بے حد بوجھل تھی۔

اگلے پچیس منٹ کے بعد وہ حاشر صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں واقعی رنگ و نور کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ وہ سب سے ہاتھ ملاتا اچانک سرمد کو دیکھ کر رک گیا۔

''رک کیوں گئے یار! میں سرمد ہوں' سرمد خان کیا نہیں پہچانا؟''

وہ شاید اسے پہلے دیکھ چکا تھا۔ شاید کہیں تصویروں میں مگر شاہ زر اسے دیکھ کر ضرور ٹھٹک گیا تھا۔ یہی تو وہ شخص تھا جسے اس نے انوشہ کا ممکنہ شوہر تسلیم کر لیا تھا۔

''نائیس ٹو میٹ یو' کیسے ہیں آپ؟''

سرمد نے خود ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ نادم سا سر جھٹک کر اس کا ہاتھ دبا گیا۔

''شکریہ! مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی' آپ کیسے ہیں؟''

''فٹ فاٹ' بہت خواہش تھی آپ سے ملنے کی چلو تمنا تو پوری ہوئی۔''

وہ مسکرا رہا تھا۔ شاہ زر نگاہ چرا گیا۔

تھوڑی دیر سب سے گپ شپ کے بعد وہ دونوں الگ کونے میں آ بیٹھے تھے۔

''اور سنائیے شاہ زر! کیا ہو رہا ہے آج کل۔ زاور اکثر ذکر کرتا تھا آپ کا۔ بلکہ شافیہ کے پاس تو سوائے آپ کی باتوں اور یادوں کے اور کچھ تھا ہی نہیں۔ اسی کے پاس کئی تصویروں میں آپ کو دیکھا تھا میں نے۔''

''ہوں' مجھ سے بھی اکثر آپ کا ذکر کیا کرتے تھے دونوں۔ سوئے اتفاق کہ کبھی روبرو ملاقات نہیں ہو سکی بہر حال شادی کی بہت بہت مبارک ہو۔''

صرف اپنے دل کی تسلی کے لیے اس نے وہ جملہ کہا تھا جواب میں سرمد ہنس پڑا۔

''کس کی شادی میرے بھائی اور کب ہوئی یہ شادی؟''

''آپ کی اور کس کی کل انوشہ کے ساتھ ریستوران میں دیکھا تھا آپ کو۔''

''او ہاں ضرور دیکھا ہوگا۔ مگر وہ میری وائف نہیں ہیں۔''

ہنستے ہوئے اس نے کہا تھا۔ شاہ زر کو لگا اس کے پورے وجود میں سکون کی لہر سرایت کر گئی ہو۔

''اوسوری اور سنائیں۔''

''نہیں سوری کی کوئی بات نہیں' انوشہ جیسی صبر وتحمل والی لڑکیاں قسمت والوں کو ملتی ہیں۔ بہر حال بریرہ کیسی ہے؟''

''فائن' آج کل تو انگلینڈ گئی ہوئی ہے۔''

''اچھا کیا انگلینڈ واپس چلی گئی ہیں؟''

''ہاں کچھ ہفتے پہلے ہی گئی ہیں۔''

''اور آپ؟ میرا مطلب ہے آپ نہیں گئے؟''

''نہیں میرا یہاں رہنا زیادہ ضروری ہے۔''

وہ ضرورت سے زیادہ اداس اور سنجیدہ تھا۔ سرمد نے بزنس کو چھیڑ لیا۔ وہ ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ اچانک شاہ زر کی نظر اپنے بیٹے پر جا پڑی۔ وہ وہاں موجود تھا اور رو رہا تھا۔ تب سرمد خان سے ایکسکیوز کر کے فوراً بچے کی طرف لپکا تھا۔

''چاند۔''

مانوس صدا پر چاند نے بھی سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور پھر جیسے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی اک جھلکی۔ شاہ زر نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں اٹھالیا اور باہر لان میں لے آیا۔

''کیوں رو رہے ہو میری جان؟''

''مجھے پاپا یاد آ رہے ہیں۔''

اس کے بے تحاشا پیار پر بچے نے فوری رونے کی وجہ بیان کی تھی۔

''مما کہتی ہیں میرے پاپا بہت دور رہتے ہیں۔ جب میں بڑا ہو جاؤں گا تب وہ آئیں گے۔ مگر مجھے پاپا کی ضرورت ہے مجھے ڈھیر سارے غبارے چاہئیں۔''

وہ ہنوز رو رہا تھا۔ شاہ زر کو لگا جیسے کسی نے اس کا دل جکڑ لیا ہو۔

''آؤ میں غبارے لے کر دیتا ہوں آپ کو۔''

''نہیں' مجھے اپنے پاپا کے پاس جانا ہے بس۔''

بچہ اس کی بانہوں میں مچلا تھا۔ شاہ زر اس کے آنسوؤں سے ہار گیا۔

''ٹھیک ہے تو چلو میں آپ کے پاپا سے ملواتا ہوں۔''

اسے اٹھا کر کچھ ہی قدموں کے فاصلے پر رکھی کرسی پر بٹھاتے ہوئے وہ خود پنجوں کے بل اس کے سامنے گھاس پر بیٹھ گیا۔ پھر جیب سے والٹ میں رکھا اپنا آئی ڈی کارڈ نکالا اور اسے چاند کے سامنے کر دیا۔

''مل لو اپنے پاپا سے یہی تمہارے پاپا ہیں۔''

بچے نے اشتیاق سے کارڈ تھام کر کچھ دیر بغور اسے دیکھا پھر بول اٹھا۔

''یہ تو آپ کی تصویر ہے۔''

''یہ آپ کے پاپا کی تصویر ہے چاند کیا آپ کی مما نے نہیں بتایا آپ کو۔''

''نہیں۔ آپ ہی میرے پاپا ہو ناں؟''

"ہاں میری جان! میں ہی آپ کا پاپا ہوں۔"

اسے بانہوں میں سموتے ہوئے اس نے اعتراف کیا تو بچے کو لگا جیسے اس نے ایک دنیا فتح کر لی ہو۔

"چلو اب بتاؤ آپ کہاں کھو گئے تھے اور مما کو کہاں سے ملے؟"

دوسرے ہی لمحے وہ اسے خود سے الگ کیے اس کے ننھے منے ہاتھ تھامے پوچھ رہا تھا۔ بچے نے سر جھکا کر جیسے سب یاد کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے بھوک لگی تھی پاپا' وہ لوگ کہتے ہم تمہیں ٹافیاں دیں گے اس لیے میں وہاں چلا گیا۔"

"کہاں چلے گئے اور کون تھے وہ؟"

"پتا نہیں' مجھے وہاں روڈ پر ملے تھے' یہ بڑی سی گاڑی تھی ان کے پاس۔ جب میں ان کے ساتھ گیا وہ بچوں کو بہت مار رہے تھے۔ میں نے کہا میں نے مما کے پاس جانا ہے تو انہوں نے مجھے بھی مارا۔"

بچے کے ذہن میں جو جو محفوظ تھا وہ بیان کر رہا تھا۔ تین سال کی غیر شعوری عمر میں اس کا ذہن اور ذہانت کمال کی تھی۔ لہجہ اتنا صاف اور رواں تھا کہ کوئی مان ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ تین سال کا ہے۔

"پھر انہوں نے آپ کو چھوڑا کیسے؟"

"چھوڑا نہیں پاپا' انہوں نے مجھے ندیم کے ساتھ بھیج دیا تھا کہ جاؤ باہر سے کھانا مانگ کر لاؤ۔ میں روز اس کے ساتھ کھانا مانگ کر لاتا تھا۔"

کروڑ پتی شخص کا وہ بیٹا کیسے کیسے دل خراش انکشافات کر رہا تھا۔

شاہ زر نے کٹتے دل کے ساتھ اس کے ہاتھ چوم لیے۔

"پھر مما کو کیسے ملے آپ؟"

"مما نے مجھے پکارا تھا۔ ادھر پلیٹ فارم پر' وہاں گاڑی جاتی ہے ناں اِدھر، پھر مما مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ پھر سرمد انکل آ گئے۔ انہوں نے کہا آپ کے پاپا جلد آئیں گے۔ آپ کہاں تھے پاپا؟ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ آپ ہی میرے پاپا ہیں۔"

شاہ زر کی ٹائی کو چھیڑتے ہوئے وہ حساب لے رہا تھا۔ تبھی انوشہ پریشان سی اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں چلی آئی۔

"مما......مما دیکھیں میرے پاپا مل گئے ہیں۔"

شاہ زر کی اس کی جانب پشت تھی مگر بچے کی نظر اس پر پڑ گئی تھی۔ تبھی وہ خوشی سے چلایا تھا وہ اپنی جگہ ٹھٹک گئی۔ کیونکہ شاہ زر اب رخ پھیرے اسے دیکھ رہا تھا۔

"چلو اب بھاگ جاؤ مما کے پاس' میں کل شام میں آپ کو لینے آؤں گا۔ پھر ڈھیر سارے غبارے خریدیں گے ٹھیک ہے؟"

اس سے پہلے کہ وہ بچے کے سامنے اس کا بھرم توڑتی۔ وہ جلدی جلدی اٹھا اور پھر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کی سائیڈ سے گزر کر اندر ہال کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں پارٹی اپنے عروج پر تھی۔

❋❋❋

اس کی زوردار دستک کے جواب میں دروازہ کھلا تھا مگر دروازہ کھولنے والا ارسلان حیدر نہیں تھا۔

"جی فرمایئے۔" وہ جو کوئی بھی تھا نشے میں دھت تھا۔

امامہ نے پلٹ کر ایک نظر پیچھے ڈالی۔ شجاع حسن گاڑی ریورس کر رہا تھا۔

"جی......وہ......وہ مجھے ارسلان سے ملنا تھا۔ مم...... میں اس کی کزن ہوں۔"

اس کے تعارف پر نشے میں دھت لڑکے نے بہت گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا تھا اور عین اسی پل شجاع کی گاڑی وہاں سے گئی تھی۔ پیچھے اب کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک انجانے سے خوف کا شکار ہو کر دائرہ مزید پھیلانے لگی۔

"ٹھیک ہے......آیئے۔"

نشے سے بند ہوتی آنکھیں بہ مشکل کھولے وہ امامہ کے لیے گیٹ سے ہٹ گیا تھا۔ امامہ کا دل نہ جانے کیوں اس لمحے بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اندر جانا نہیں چاہتی تھی۔ خود ارسلان نے بھی اسے وہاں آنے سے منع کیا تھا مگر آدھی رات کے اس پہر وہاں اندر جانے کے سوا اب اس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

ڈرتے جھجکتے ایک بڑے سے ہال سے ہوتی ہوئی نیم تاریکی والے کمرے میں آ رکی تھی اور اس اچانک جس منظر پر اس کی نظر پڑی۔ اسے دیکھ کر بے ساختہ اس کی چیخ نکل گئی۔ تبھی کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ دھرا تھا۔

"یہ کون ہے بھئی' آدھی رات کو اتنی حسین بلا کہاں سے ٹپک پڑی۔"

کمرے میں موجود دوسرے مرد نے قدرے حیران اور بدمزہ ہو کر پوچھا تھا۔ جب کہ وہاں موجود لڑکی سنبھل گئی تھی۔ اسے اندر لانے والا لڑکا اب دانت نکوستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ارسلان حیدر کی کزن ہے اس سے ملنے آئی ہے۔"

"ہاہاہا چلو یہ تو بڑا اچھا قرض ادا ہو گیا اور بڑی جلدی لے کر چلو پھر بیڈروم میں اس سے نمٹ کے آتا ہوں۔"

سامنے موجود ادھیڑ عمر کا وہ شخص خباثت کی اعلیٰ مثال لگ رہا تھا۔

امامہ دوبارہ نظر اٹھا کر اس وجود کو دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی تاہم اس نے خود کو چھڑانے کی بھرپور کوشش ضرور کی تھی۔

ارسلان ایسے گھٹیا اور غلیظ دوستوں کے ساتھ رہتا ہو گا یہ سوچ کر ہی اس کا دل پھٹ رہا تھا۔

لڑکا اب ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھے ایک اور ہاتھ سے اسے کھینچتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے جا رہا تھا۔

"ادھر مر بھاگ گیا ہے وہ یہاں سے تیرا کچھ لگتا۔ سالا لڑکیوں کا نشئی ہے۔ جہاں اچھا مال ملا اس کی رال ٹپک گئی اس کی۔ تین سال پہلے بھی اس ایس پی کے دوست کی بہن کو اس نے موت کے گھاٹ اتارا' بے عزتی بھی اسی نے کیا اور پھنس گئے ہم مفت میں۔ اب بھی لڑکی کو پٹایا ہم نے اور لے کر بھاگ گیا وہ خبیث۔ مگر کوئی بات نہیں۔ اس سے اچھی مل گئی ہے ہمیں۔"

دھڑ......دھڑ......دھڑ کتنے آسمان تھے جو اس ایک لمحے میں اس کے سر پر آ گرے تھے۔ وہ ہکا

ہکا سی اس نشے میں دھت لڑکے کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ صرف ایک لمحے میں وہ آسمان سے زمین پر گر کر کرچی کرچی ہو گئی تھی۔

کس کے پیچھے بھاگ رہی تھی وہ ایک زانی، لٹیرے اور دھوکے باز کے پیچھے؟

وہ شخص کیا تھا اور اب تک اسے کیا سمجھتی رہی تھی؟

کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی اس شخص کے لیے جو اس سے مخلص بھی نہیں تھا۔ اس کا دل چاہا وہ روئے چیخ چیخ کر روئے، یوں کہ زمین بھی اس کے دکھ اس کے نقصان پر لرز اٹھے مگر...... کیا رہ گیا تھا ارسلان حیدر نے اس کے پاس؟ کچھ بھی تو نہیں۔

وہ پلٹی تھی اور سن اعصاب کے ساتھ خطرہ بھانپتے ہوئے اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر نشے میں پاگل اس گدھ نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔

❋❋❋

اپنا بھی درد مجھ کو میرے راز دار دے
کچھ اپنی زندگی پر مجھے اختیار دے
ایسا نہ ہو کہ کل تو میرا ساتھ چھوڑ دے
جتنا نبھا سکیں مجھے اتنا ہی پیار دے

"قسم سے تم بہت ضدی ہو زین! ہمیشہ اپنی منواتے ہو۔ کبھی میری بھی مان لیا کرو۔"

عباد کے فیورٹ ریسٹوران میں اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے صاعقہ نے گلہ کیا تھا۔ جب وہ مسکرا کر بولا۔

"ابھی...... میری مان لو شادی کے بعد صرف تمہاری مانوں گا۔"

بہت بے ساختگی میں روانی سے اس نے کہا تھا۔ صاعقہ ٹھٹک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"مجھ سے شادی کرو گی ناں صاعقہ؟"

آسمان زمین پر جھک کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

صاعقہ کے اندر کی دنیا پھر سے ہلچل کا شکار ہو گئی۔

"پتا نہیں، ابھی شادی کے لیے کچھ سوچا نہیں ہے میں نے۔"

"تو سوچ لو ناں یار! سوچنے میں ٹائم ہی کتنا لگتا ہے؟"

"اچھا سوچ لوں گی، تم تو ٹک کر اپنی سیٹ پر بیٹھو۔"

وہ اس کی جانب جھکا ہوا تھا تبھی اس نے پیچھے دھکیلا تو وہ ہنس پڑا۔

"کر لو نخرے میں امیر ہو گیا ناں تو پچاس پچاس لڑکیاں آگے پیچھے پھریں گی میرے تب تمہیں پتا لگے گا میری اہمیت کا۔"

"ہونہہ...... وہ دن آنے سے پہلے ہی میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گی۔"

"کیوں......؟"

"بتایا تو تھا اپنی حیثیت سے اوپر کے لوگوں سے تعلق رکھنا مجھے بالکل بھی پسند نہیں کلاس

اس ریلیشن میں بندہ نا چاہتے ہوئے بھی دوسرے سے مرعوب رہتا ہے۔ کھل کر کچھ بھی شیئر نہیں کر سکتا۔"

"اس کا مطلب اگر میں امیر ہو گیا تو تم مجھے چھوڑنے میں ایک پل لگاؤ گی۔"

"نہیں مگر ہو بھی سکتا ہے' کیونکہ دولت ایسی چیز ہے جو سب سے پہلے آپ کے اندر سے انسانیت ختم کرتی ہے اور میں...... میں انسانیت کو بہت اہمیت دیتی ہوں زین!"

وہ ازحد سنجیدہ ہو چکی تھی۔

عباد کے دل میں اس کا مقام مزید بڑھ گیا۔

"ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں صاعقہ۔"

وہ بہت دنوں تک اس سے اپنا اصل چھپا کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ تبھی راہ ہموار کر رہا تھا۔ جواباً صاعقہ کی نظر اپنے ہاتھوں پر ٹک گئی۔

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔ یہ دولت میں صبح و شام کھیلنے والے لوگ انسان کو انسان نہیں رہنے دیتے۔ بہت بدلی ہوئی خاص نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ اپنے سے نیچے لوگوں کو۔"

"تم اتنی حساس کیوں ہو صاعقہ؟"

اس کی اداسی پر وہ بے چین ہوا تھا۔ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

"غربت بہت کچھ سمجھا دیتی ہے زین!"

"اچھا چھوڑو فلسفے کو یہ بریانی چکھو کیسی ہے؟"

ماحول کی کثافت کو دور کرنے کے لیے اس نے فوراً موضوع بدلا تھا۔ صاعقہ بھوک نہ ہونے کے باوجود صرف اس کی خوشی کے لیے چاول پلیٹ میں ڈالنے لگی۔ عین اسی لمحے ہانیہ اس کے شوہر اور ہادیہ وہاں داخل ہوئی تھی۔ ہانیہ اپنے شوہر کے ساتھ باتوں میں مشغول تھی مگر ہادیہ کی نظر اس پر پڑی تھی۔

سوٹڈ بوٹڈ حلیے میں عباد کو ایک عام سی لڑکی کے ساتھ لنچ کرتے دیکھ کر وہ حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ وہ تو اسلام آباد جانے والا تھا مگر اس وقت کتنے اطمینان سے وہاں بیٹھا ہوٹلنگ کر رہا تھا۔ مارے غصے کے اس کا دماغ سنسنا اٹھا۔

"السلام علیکم!" اگلے ہی پل وہ اس کے سر پر کھڑی تھی۔

عباد غیر متوقع طور پر اسے وہاں دیکھ کر' کھانے سے ہاتھ روکتے ہوئے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"وعلیکم السلام! تم یہاں کیسے؟"

جلدی سے اپنی سیٹ سے کھڑے ہو کر اس نے ہادیہ سے پوچھا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی وہ صاعقہ سے ایکسکیوز کر کے اسے زبردستی سائیڈ پر لے آیا۔ اگلے پندرہ منٹ کے بعد وہ اپنی ٹیبل پر دوبارہ آیا تو صاعقہ کے اندر کی دنیا جل کر خاکستر ہو چکی تھی۔

"کون تھی یہ لڑکی!"

خود کو دیے حق کے تحت اس نے پوچھا تھا۔ عباد سے وضاحت مشکل ہو گئی۔

"وہی باس کی بیٹی تھی یار!"

''تو اس سے میرے سامنے بھی بات ہو سکتی تھی۔ سائیڈ پر لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''تم جیلس ہو رہی ہو؟''

بات کو ٹالتے ہوئے وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔ جب وہ ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی۔

''مجھے کیا ضرورت ہے جیلس ہونے کی' تمہاری اپنی زندگی ہے جو چاہو کرو۔''

''ٹھیک ہے پھر میں جا رہا ہوں اسے پرپوز کرنے۔''

وہ مسکرایا تھا۔ صاعقہ اسے گھور کر رہ گئی۔

''پکے بے ایمان ہو تم' قسم سے۔''

''چلو جیسا بھی ہوں اب تو تمہارا ہی ہوں۔''

وہ مسکرا رہا تھا۔

صاعقہ نے بے ساختہ نظر اس کے چہرے سے ہٹالی کہ مبادا اسے اس کی نظر ہی نہ لگ جائے۔

جس وقت وہ صاعقہ کے ساتھ ریستوران سے نکل رہا تھا ہادیہ کی گہری نگاہیں دور تک اس کے تعاقب میں اٹھی تھیں۔ اس نے ہانیہ کو اس کی وہاں موجودگی کا نہیں بتایا تھا' مگر عباد کے بدلے ہوئے رویے کی وجہ کسی حد تک ضرور اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

اگلے روز آفس میں عباد کی پیشی ہو گئی تھی۔

❁❁❁

سانول شاہ کا فوری آپریشن ہوا تھا اور اب ڈاکٹرز کی کئی گھنٹوں کی محنت و تگ و دو کے بعد اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ تاہم وہ ابھی ہوش میں نہیں آیا تھا۔ بہزاد نے اس کے کمرے میں شفٹ ہونے کے بعد زبردستی انزلہ کو گاؤں واپس بھیج دیا تھا۔

وہ رات میں خاصی تاخیر سے گھر واپس آئی تو دادی ماں اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ اس کی دستک کے جواب میں دروازہ کھول کر وہ ناراضگی کے اظہار کے طور پر کمرے میں چلی آئیں۔ انزلہ بھی ان کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

''میں نے تیرا سامان تیار کر دیا ہے انزلہ' صبح کے نکلتے سورج کے ساتھ شہر واپس چلی جانا۔ میں اب مزید تجھے اپنے پاس نہیں رکھ سکتی۔''

پیٹھ موڑے اپنے بستر کی شکنیں درست کرتے ہوئے دادی ماں نے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ وہ وہیں دہلیز پر رک گئی۔

''کیوں؟''

''مجھ سے نہ پوچھ اس کیوں کا جواب' اپنے آپ سے پوچھ۔''

وہ اپنا غصہ دبائے ہوئے تھیں۔ انزلہ تھکن سے چور اپنے بستر پر آ بیٹھی۔ صحیح تو کہہ رہی تھیں وہ۔ اسے اپنے آپ سے جواب لینا چاہیے تھا مگر اس کے پاس بھلا کسی بھی بات' کسی بھی سوال کا جواب رہا ہی کہاں تھا۔

اعصاب اس وقت اتنے بوجھل تھے کہ وہ چاہ کر بھی دادی ماں سے کوئی بحث نہ کر سکی اور چپ

بستر پر ڈھے گئی۔
سانول شاہ کا چہرہ' اس کا زخمی وجود تصور سے نکل ہی نہیں رہا تھا۔
ساری رات کروٹوں اور آنسوؤں کی نذر ہو گئی تھی۔
صبح ذرا سی دیر کے لیے آنکھ لگی تھی۔ پھر فوراً ہی کھل گئی۔ سانول کے ہوش میں آ جانے کا خیال قرار کر گیا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر غسل خانے کی طرف بڑھی تو دادی صحن میں چار پائی پر بیٹھی چڑیوں کو رات کی بچی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈال رہی تھیں۔ اس نے فریش ہونے کے بعد وضو کیا اور سکون سے نمازِ فجر ادا کر کے دادی ماں کے قریب چلی آئی۔
''آپ مجھ سے خفا ہیں دادی اماں......؟''
''میرا کیا حق ہے تم سے خفا ہونے کا......؟''
''کیوں حق نہیں ہے' آپ ہی کے تو سارے حقوق ہیں مجھ پر۔''
''ہاں زبان سے کہنے میں کیا جاتا ہے۔''
''دل سے کہہ رہی ہوں دادی اماں! جو چاہیں قسم لے لیں۔ مگر اب میں خود بھی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتی۔ آپ بھی شہر چلیں ناں میرے ساتھ۔''
بازی الٹ ہو گئی تھی۔ وہ اسے پریشان کر کے بندے کی پتر بنانا چاہتی تھیں۔ الٹا اس نے اپنا ارادہ ظاہر کر کے انہیں پریشان کر دیا تھا۔
''تم ہی جاؤ بی بی! میں اپنے شوہر اور بیٹے کی ڈھیریاں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔''
''ہاں' ان ڈھیریوں میں اب کیا رکھا ہے دادی اماں کچھ بھی تو نہیں۔''
''دماغ چل گیا ہے تیرا۔ خوب سمجھتی ہوں میں۔ باپ کے قاتلوں سے ہمدردیاں سوجھ رہی ہیں۔''
''غلط اطلاع دی ہے کسی نے آپ کو۔ اپنے بابا کے قاتل کو مر کر بھی معاف نہیں کر سکتی میں۔ ہاں ان کے دشمن کو صرف اللہ ربّ العزت کی رضا کے لیے راہِ راست پر لانے کا ارادہ ضرور کیا ہے میں نے۔ آپ چاہیں تو بہزاد سے پوچھ سکتی ہیں۔''
اسے وضاحت سے چڑ تھی۔ پھر بھی وہ وضاحتیں دے رہی تھی۔ دادی ماں کا غصہ بالآخر اس کی شادی کے لیے رضامندی پر ختم ہوا تھا۔ وہ اپنی ذات کے تمام حقوق انہیں دے کر ان کی رضا کے بعد اس شام شہر کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ جہاں سانول بارہ گھنٹے گزر جانے کے باوجود تا حال ہوش میں نہیں آیا تھا۔

❋❋❋

آنکھوں سے خواب دل سے تمنا تمام شد
تم کیا گئے کہ شوق نظارہ تمام شد
کل تیرے تشنگاں سے عجب معجزہ ہوا
دریا پہ ہونٹ رکھے تو دریا تمام شد

دنیا تو ایک برف کی سل کے سوا نہ تھی
پہنچی ذرا جو آنچ تو دنیا تمام شد
شہر دل تباہ میں پہنچوں تو کچھ کھلے
کیا بچ گیا ہے راکھ میں اور کیا تمام شد
اک یادِ یار ہی تو پس انداز ہے محسن
ورنہ وہ عشق کار تو کب کا تمام شد

تقریب سے وہ سیدھا ''یزدانی پیلس'' چلا آیا تھا کہ یہ قریب پڑتا تھا۔

وہ اندر آیا تو گوری جائے نماز پر بیٹھی' ہاتھ دعا میں اٹھائے رو رہی تھی۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ یہ کون ہے؟ مالکن وہ ہو نہیں سکتی تھی اور نوکرانی وہ لگ نہیں رہی تھی۔

دعا میں ہاتھ اٹھائے زار و قطار روتے ہوئے اس کے ذہن میں بزرگ کی باتیں گونج رہی تھیں جو آج صبح ہی وہ اس کے خواب میں کہہ رہے تھے۔

''یہ دنیا...... یہ محض گزرگاہ ہے۔ ایسی گزرگاہ جہاں سے ہو کر تمہیں اپنی اصل منزل تک جانا ہے اور وہ منزل جنت ہو گی یا جہنم' یہ فیصلہ اللہ ربّ العزت کی ذات پاک' تمہارے اعمال سامنے رکھ کرے گی۔ یاد رکھنا بیٹی گمراہی ہر قدم پر انسان کے ساتھ چلتی ہے۔ یہ دنیا کا عشق' ہمیشہ بدنظری سے ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بری صحبت' بری بات سننے اور پڑھنے سے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسا راستا اختیار کرو گی۔ ویسی مراد پاؤ گی۔ قرآن پڑھو گی تو دل میں اللہ ربّ العزت کی پاک ذات کا عشق پیدا ہو گا۔ احادیث سنو گی تو اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کرنے لگو گی۔ لیکن کسی غیر محرم سے بلا ضرورت بات کرو گی تو اندرونی جذبات ابھریں گے اور دل میں دنیا داری کا عشق پنجے گاڑ کر بیٹھ جائے گا۔ تباہی و بربادی کا یہ ''بیج'' بڑھتے بڑھتے تناور درخت بن جائے گا اور آخر کار تمہاری ہستی کو ہلا کر رکھ دے گا۔ یہ چند روزہ فانی دنیا تمہارا امتحان ہے بیٹی' وہ عورت مت بن جسے شر اور فتنہ کہا جائے۔ رحمت بن' اپنی زبان' نفس اور خیالات کو قابو میں رکھ۔ مت دیکھ کہ دنیا کیا سمجھتی ہے؟ یہ دیکھ کہ تیرے ربّ کے ہاں تیرا کیا مقام ہے۔ وہ کیا سمجھتا ہے۔ یہ زبان کی نرمی اور لچک کسی کو تیری طرف راغب نہ کر لے۔ گمراہ نہ کر لے یاد رکھ وہ عورت جو اپنی زبان کی نرمی اور لچک سے کسی غیر محرم مرد کا دل لبھائے گی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ اس میں اوندھے منہ لٹکائی جائے گی۔''

یہ کیسی آگاہی تھی کیسی تنبیہ تھی کہ وہ بے چین ہو کر رہ گئی تھی۔

کیسا کرم تھا یہ اس پر اللہ ربّ العزت کی پاک ذات کا کہ اسے ان باتوں سے آگہی نصیب ہو رہی تھی۔ جن سے لاعلمی کے سبب جانے کتنے ایمان والوں کو آخرت میں رسوائی کا سامنا کرنا تھا اور وہ اسی پر رو رہی تھی جب شاہ زر نے قریب آ کر ہلکا سا گلا صاف کیا۔

''السّلام علیکم!''

وہ چونکی اور آنسوؤں کے موتی پل بھر کو پلکوں پر ٹھہرے تھے۔ پلٹ کر نظر شاہ زر کے اجنبی چہرے پر پڑی تو مزید حیرانی ہوئی۔ عباء پہنے اس نے سر بھی اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔

''وعلیکم السّلام! فرمایئے۔''

''مجھے شاہ زر کہتے ہیں لیکن معاف کیجیے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''میرا نام گوری ہے۔ بریرہ جی نے یہاں پناہ دی تھی۔ آپ ان کے شوہر ہیں ناں؟''

''ہاں' مگر اس نے مجھے یہاں آپ کی موجودگی کا نہیں بتایا تھا۔ خیر کیسے جانتی ہیں آپ انہیں۔''

وہ اب صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

گوری جائے نماز پر ہی بیٹھی رہی۔

''میں انہیں نہیں جانتی مگر ان کے بھائی زاور حسن صاحب ادھر ہمارے گاؤں کے قریب زخمی ہو گئے تھے تو میرے بھائی انہیں اٹھا کر گھر لائے تھے۔ کچھ روز وہ ادھر ہمارے مہمان رہے تھے۔ اب ان کے زخم بھر گئے تو وہاں سے چلے آئے۔ مگر آتے ہوئے انہوں نے میرے بھائی سے کہا تھا کہ انہیں جب بھی کسی مدد کی ضرورت پڑے وہ شہر چلے آئیں پھر بھائی کا قتل ہو گیا اور میری پھوپھی وفات پا گئیں۔ تو میرا شوہر مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کی بھی موت ہو گئی تو میں یہاں چلی آئی کیونکہ بھری دنیا میں اب میرا کوئی بھی رشتہ سلامت نہیں رہا۔''

''اوہ' ویری سیڈ۔ یہاں کا ایڈریس کیسے ملا؟''

''وہ......جی...... کارڈ تھا میرے پاس' زاور صاحب آتے ہوئے اپنا کارڈ دے کر آئے تھے۔ اس کی مدد سے میں یہاں تک پہنچ گئی۔''

گفتگو کے دوران اس نے ایک بار بھی نظریں اٹھا کر سامنے نہیں دیکھا تھا۔

شاہ زر کو چہرے کی معصومیت اور لہجے کی سادگی بے حد اچھی لگی۔

''یہاں' خالی گھر میں رہتے ہوئے کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟''

''ہوتی ہے جی' کام والی تو صفائی کر کے صبح صبح ہی چلی جاتی ہے۔ اکثر دو دو دن آتی ہی نہیں' پیچھے چوکیدار اور باورچی دونوں مرد ہوتے ہیں۔ میں سارا دن کمرا بند کر کے اندر بیٹھی رہتی ہوں۔ صرف صبح کے وقت جب کام والی آتی ہے تب ہی باہر نکلتی ہوں۔''

''اوہ' اس طرح تو آپ خاصی مشکل کا شکار ہوتی ہوں گی۔ اگر آپ کو برا نہ لگے اور ذہن مانے تو آپ میرے ساتھ' میرے گھر چل سکتی ہیں۔ وہاں آپ کو کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔''

اس نے شاہ زر کو تصویروں میں دیکھا تھا اور وہ اسے بہت اچھا لگا۔ مگر اس وقت اس کا لہجہ صورت سے بھی زیادہ اچھا تھا۔ گوری کی آنکھیں یک لخت ادریس کی یاد میں بھیگ گئیں۔ جانے آج کل موقع بے موقع وہ اسے اتنا یاد کیوں آتا تھا۔

''کیا ہوا' اگر آپ نہیں جانا چاہتیں تو کوئی بات نہیں' میں تو صرف آپ کی مشکل کی وجہ سے کہہ رہا تھا۔''

وہ پریشان ہوا تھا۔ گوری نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔

''ایسی بات نہیں ہے شاہ زر بھائی۔ بس جانے کیوں آپ کو دیکھ کر مجھے میرا بھائی یاد آ گیا۔''

''اگر میں کہوں کہ میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا ہے تو......!''

اس بار گوری نے سر اٹھایا۔

''میری بھی ایک ہی بہن تھی' دنیا میں ''شافیہ آفندی'' جان دیتا تھا اس پر اور وہ مر کر سچ مچ میری

جان ہی لے گئی۔ آپ کے چہرے پر پہلی نظر میں ہی مجھے اس کا چہرہ اس کی شباہت نظر آئی تھی۔"
وہ وضاحت دے رہا تھا۔ گوری کے آنسو تھم گئے۔
"بریرہ کو کال ملاتا ہوں۔ اس سے بات کر کے تسلی کر لیں۔ پھر چلیں گے میں تو صرف دیکھ بھال کے لیے آیا تھا یہاں آپ کا سبب اللہ رب العزت کی طرف سے بن گیا۔"
بریرہ کو کال ملاتے ہوئے وہ اسے بتا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آن لائن تھی۔
"السلام علیکم! کیسی ہو؟"
"وعلیکم السلام! تم سناؤ۔"
"میں تو ٹھیک ہوں' یزدانی پیلس آیا تھا دیکھ بھال کے لیے یہاں گوری سے ملاقات ہوگئی۔ مجھے تو بالکل شافیہ کا گمان ہوا۔ یہ یہاں محفوظ نہیں ہے بریرہ۔"
"ہوں' میں سمجھتی ہوں' مگر وہ خود چل کر میرے پاس آئی تھی اسے سر چھپانے کے ٹھکانے کی تلاش تھی اسی لیے میں نے وہاں ٹھہرالیا۔ اب انگلینڈ تو ساتھ لے کر نہیں آ سکتی تھی۔"
"وہ تو ٹھیک ہے مگر اب میں اسے "شاہ پیلس" لے جا رہا ہوں۔ وہاں اور بھی خواتین ہیں جو کام کے لیے آتی ہیں۔ اسے وہاں بہتر محسوس ہوگا۔"
"ٹھیک ہے جیسا تم مناسب سمجھو۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔"
وہ ایسی ہی تھی بے ضرر سی' شاہ زر نے تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد گوری کی بریرہ سے بات کروا کر کال ڈراپ کر دی۔
"شاہ پیلس" میں آنے کے بعد گوری کو یک گونہ قرار نصیب ہوا تھا کہ شاہ زر صبح کا نکلا رات گئے ہی گھر واپس لوٹتا تھا اور آتے ہی تھوڑا سا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں گھس جاتا' صبح کام والی آتی تھی اور پھر تمام گھر کے کام نمٹا کر شام ڈھلے ہی گھر واپس جاتی تھی۔ ایسے میں وہ بالکل آزاد ہوتی کہ جہاں دل چاہا وہاں بیٹھی۔ شاہ زر واقعی اس کے لیے سگے بھائیوں کی طرح ثابت ہوا تھا۔
خوابوں کا سلسلہ یہاں آ کر بھی ویسے ہی جاری تھا۔ تبھی اس روز ناشتے کے وقت اس نے پہلی بار شاہ زر کو خود سے مخاطب کرنے کی ہمت کی تھی۔
"شاہ بھائی' آپ سے ایک فرمائش کروں تو پوری کریں گے۔"
وہ چونکا تھا اور پھر اس کا جھکا سر دیکھ کر مسکرایا تھا۔
"ہوں' سو فرمائشیں بھی کرو تو پوری کروں گا۔"
اس کی حوصلہ افزائی پر کچھ لمحے سوچنے کے بعد وہ بولی تھی۔
"وہ' مجھے ایک اکیڈمی بنانی ہے۔ چھوٹے بچوں کے لیے جہاں میں انہیں قرآن کی تفسیر اور ترجمہ پڑھا سکوں۔ انہیں زندگی کے حقیقی معنی بتا سکوں۔ انہیں بتا سکوں شاہ بھائی کہ قرآن کیا ہے اور ہماری زندگیوں میں یہ کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا ایک ایک حرف کتنی گہرائی لیے ہوئے ہے۔ غیر مسلم اس کی تعلیمات سے فائدہ اٹھا کر کہاں سے کہاں پہنچ گئے اور جس محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب امت کے لیے اللہ رب العزت نے اسے نازل کیا وہ اسی قرآن سے دوری کے سبب کیسی کیسی تباہ کن مصیبتوں اور پستیوں میں جا گری۔"

''بہت اچھا ارادہ ہے مگر شاید آپ کے علم میں نہ ہو میری پیاری بہن کہ ہمارے اس ماڈرن معاشرے کے ماڈرن لوگ۔ اپنے بچوں کی دینی تعلیم صرف قرآن پاک ایک مرتبہ پڑھا کر مکمل سمجھتے ہیں پھر چاہے وہ بچہ ساری عمر اس قرآن کو ہاتھ لگائے نہ لگائے کوئی فکر نہیں' یہاں ایسے گھرانے بھی ہیں گوری' جن میں بچے اگر کسی وجہ سے مذہب میں دل چسپی لینے لگیں تو مائیں پریشان ہو جاتی ہیں۔ انہیں بے ہنگم پارٹیز' گیٹ ٹو گیدر رنگ' بے حیا تعلقات' انٹرنیٹ کی تباہی و بربادی کی طرف لانے کے لیے ہزار جتن کرتی ہیں۔ قرآن کی تفسیر اور تعلیمات سے زیادہ انگریزی زبان اور لٹریچر میں اپنے بچوں کو دھکیل کر بے حد خوشی و اطمینان محسوس کرتی ہیں۔ یہ معاشرہ ایسے ہی لوگوں اور ماؤں سے بھرا ہے گوری۔ یہاں آپ کی کون سنے گا۔ نقار خانے میں طوطی کی ویسے بھی کوئی نہیں سنتا۔ یہاں لوگوں کو تفریح کے لیے رومانوی باتیں اور ماحول مطلوب ہے اللہ رسول کی باتوں کے لیے شاید ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے کیونکہ ہدایت بھی اس کی نصیب ہوتی ہے جس کے دل میں ذرا سی گنجائش ذرا سی نمی ہو' گونگے' بہرے' اندھے لوگوں کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔''

وہ ماڈرن شہری تھا مگر اس کی باتیں ''اندر'' کی باتیں تھیں۔ گوری کو بے حد دکھ ہوا۔

''یہ ہماری بدنصیبی ہے شاہ بھائی' مگر میں پھر بھی اکیڈمی بنانا چاہتی ہوں۔ کیونکہ جس اللہ نے یہ خیال میرے دل میں ڈالا ہے یقیناً وہی میری مدد بھی فرمائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ خیال کبھی میرے دل میں نہ ڈالتا۔''

''ٹھیک ہے' میں آج ہی بات کرتا ہوں' اس سلسلے میں کسی سے تم فکر نہ کرو۔''

''جزاک اللہ بھائی! یقیناً اللہ آپ کو اس کا بہتر اجر دینے والا ہے۔''

وہ دعا دے کر پلٹ گئی تھی۔ شاہ زر گم صم سا کتنی ہی دیر وہیں بیٹھا رہا۔ کیا وہ ''بہتر اجر'' کے قابل تھا؟

❋❋❋

رات بھر کی سخت بے سکونی کے بعد صبح جب وہ بستر سے نکلا تو طبیعت بے حد بوجھل تھی۔

رات اس نے جو امامہ کے ساتھ کیا تھا۔ اب اس پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ مگر...... وہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے والوں میں سے نہیں تھا اور جو پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھتے اکثر وہی منہ کے بل گرتے ہیں۔ گڑیا ابھی سو رہی تھی۔ وہ فریش ہو کر تیار ہونے کے بعد بنا ناشتہ کیے باورچی کو گڑیا کا خیال رکھنے کی ہدایت کرتا آفس چلا آیا۔

اپنے شاندار' ڈیکوریٹڈ کمرے میں سیٹ سنبھالنے کے بعد' ٹی وی آن کرتے ہوئے ابھی وہ فون کا ریسیور ہی اٹھا رہا تھا کہ اچانک نشر ہونے والی خبر نے اسے ٹھٹکا دیا۔

''وقار کالونی کے علاقے' وقاص ٹاؤن میں گزشتہ شب ایک نوجوان لڑکی کو انتہائی بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پولیس کے مطابق اس علاقے میں تین انتہائی مطلوب مجرم مقیم تھے۔ تاحال لڑکی کی شناخت نہیں ہو سکی ہے۔ تاہم ملزمان کا کہنا ہے کہ وہ لڑکی پناہ کی تلاش میں خود وہاں چل کر آئی تھی۔''

خبر کے ساتھ اسکرین پر ملزمان کے چہرے اور کپڑے میں لپٹی لڑکی کی مسخ شدہ تصویر بھی دکھائی

جا رہی تھی۔ شجاع حسن کا وجود جیسے لمحے میں سرد پڑ گیا تھا۔ کل رات وقاص ٹاؤن کے علاقے میں ہی تو امامہ کو چھوڑ کر آیا تھا اور جو گھر اسکرین پر دکھایا جا رہا تھا یہ وہی تو تھا جس کے دروازے پر اس نے دستک دی تھی۔

❀❀❀

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں' ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم' اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم
اے درد بتا کچھ تُو ہی بتا' اب تک یہ معما حل نہ ہوا
ہم میں ہے دل بے تاب نہاں' یا آپ دل بے تاب ہیں ہم
میں حیرت و حسرت کا مارا' خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ' کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم
لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پر پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہلِ زمانہ قدر کرو نایاب نہ ہوں کم یاب ہیں ہم

اس کا سیل کب سے بج رہا تھا۔

نگاہیں ٹی وی اسکرین سے ہٹا کر اس نے موبائل فون کی اسکرین پر ڈالی تھیں۔ دوسری طرف فائزہ آپا کا نمبر تھا۔ وہ بے خیالی میں کال ریسیو کر گیا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام کیسے ہو' کہاں ہو؟'' دوسری طرف وہ بے حد مسرور تھیں۔ وہ الجھ کر رہ گیا۔

''ابھی آفس پہنچا ہوں آپا! خیریت......!'' کیسے ہو۔ کا جواب دینا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''ہاں خیریت ہی ہے۔ وہ اصل میں ابا جی کو امامہ کی یاد ستا رہی تھی۔ یہاں بلوانا چاہتے ہیں اسے اپنے پاس تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں نا۔'' وہ شاید اسے تنگ کر رہی تھیں مگر شجاع ایک لفظ کہنے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔

''ویسے وہ ہے کہاں؟ سیل نمبر بھی آف مل رہا ہے اور گھر پر بھی نہیں ہے؟''

''پتا نہیں آپا۔ جب میں گھر سے نکلا تھا تو وہ کمرے میں ہی تھی۔''

''چلو ٹھیک ہے میں کچھ دیر بعد پھر ٹرائی کروں گی۔''

''نہیں' میں شام میں خود آپ کی بات کرادوں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

''چلو جیسے تمہاری مرضی۔ ابا جی تو ابھی دوا لے کر سو رہے ہیں۔ اٹھیں گے تو پھر امامہ اور گڑیا کا پوچھیں گے۔''

''میں بات کروادوں گا آپا! ابھی آفس میں مصروف ہوں۔ بات نہیں کر سکوں گا۔''

''ٹھیک ہے اپنا خیال رکھنا۔''

''خدا حافظ۔''

وہ اس وقت کسی سے بھی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ تبھی جلدی سے لائن ڈراپ کر دی۔ عین اسی لمحے ٹیلی فون کی بیل بجی تھی اور اپنے گھر کا نمبر دیکھ کر اسے نا چاہتے ہوئے بھی کال

نکل پڑی تھی۔

''ہیلو۔''

''السلام علیکم سر! وہ چھوٹی بی بی ناشتے کے لیے بہت تنگ کر رہی ہیں۔ بار بار بیگم صاحبہ کو پکارتے ہوئے رو رہی ہیں۔''

ریسیور کان سے لگاتے ہی ایک اور اذیت نے اس کا منہ چڑایا تھا۔ شجاع نے اس بار بنا کچھ کہے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا تھا۔ دماغ کی نسیں اس لمحے جیسے پھٹنے کو تیار تھیں۔ ریسیور پٹختے ہی اس نے ٹی وی آف کر کے متعلقہ علاقے کے ایس پی کو فون کیا تھا اور وہاں ڈیوٹی پر موجود ڈی ایس پی اور ایس ایچ او کو فوری اپنے حضور طلب کیا تھا۔

اگلے پینتالیس منٹ میں دونوں اس کے آفس میں موجود تھے۔

''جی سر خیریت۔''

ڈی ایس پی نے لب کھولنے کی ہمت کی تھی جب کہ ایس ایچ او مؤدب کھڑا رہا تھا۔

''بیٹھیے۔ مجھے کل رات وقاص ٹاؤن میں ہوئے سانحے کی رپورٹ چاہیے۔''

اس کے چہرے پر چٹانوں سی سختی تھی۔ ڈی ایس پی اور ایس ایچ او دونوں مقابل بیٹھ گئے۔ پھر ای ایس پی کی ہدایت پر ایس ایچ او نے اسے بریف کیا تھا۔

''رپورٹ تیار ہے سر! وہاں پچھلے تقریباً تین چار ہفتوں سے کرائے پر کچھ لڑکے رہ رہے تھے۔ ایک دو مقدمات میں نامزد بھی ہیں وہ۔ یہ کل آدھی رات کے بعد کا واقعہ ہے سر! دو لڑکے اور دو لڑکیاں اس وقت وہاں موجود تھیں۔ ایک کا قتل ہو گیا ہے دوسری موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ گئی۔ لڑکے دونوں گرفتار ہیں۔''

''کیا نام ہے مرنے والی لڑکی کا۔''

''امامہ...... امامہ حسن یہی نام بتا رہے تھے وہ لڑکے۔''

ایس ایچ او کے لبوں سے نکلنے والے وہ الفاظ کیا تھے کوئی بم تھا جو شجاع حسن کو اپنے اردگرد پھٹتا محسوس ہوا تھا۔

بھلا یہ کیسے ممکن تھا امامہ حسن یوں اچانک کیسے مر سکتی تھی؟

وہ تو اپنے محبوب کے پاس گئی تھی۔ اس شخص کے پاس کہ جسے پانے کے لیے اس نے اس کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ پھر اسی شخص کے ہاتھوں وہ کیسے مر سکتی تھی؟

''نہیں امامہ حسن! دس از ناٹ فیئر۔''

ہلکے سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سرخ گوشے نم ہوئے تھے۔

''سر آپ ٹھیک ہیں؟''

مقابل بیٹھے ڈی ایس پی اور ایس ایچ او دونوں حیران ہوئے تھے۔ شجاع نے خفیف سا سر جھکا کر دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے اپنی آنکھوں کے گوشوں کو دبایا تھا۔

''جی ہاں' قتل کیسے ہوا ہے لڑکی کا؟''

یہ سوال پوچھتے ہوئے وہ جس اذیت سے گزرا تھا محض اس کا دل جانتا تھا۔

ایس ایچ او اب اسے بتا رہا تھا۔
''اس کے چہرے اور جسم پر تیزاب پھینکا گیا ہے سر! تاہم اس کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی ہے۔ آپ چاہیں تو لاش کا معائنہ کر سکتے ہیں۔ پوسٹ مارٹم کے بعد اس کی لاش سرد خانے میں رکھوا دی گئی ہے۔''
''ٹھیک ہے۔''
ڈوبتے دل کے ساتھ اس لمحے اس نے ڈی ایس پی اور ایس ایچ او کو فارغ کر دیا تھا۔ امامہ حسن کے بارے میں اسے ایسی تفتیش سے واسطہ پڑے گا' اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس لمحے بے ساختہ اسے اپنے الفاظ یاد آئے تھے۔
''اب جاؤ اور زندگی میں دوبارہ کبھی مجھے اپنی شکل مت دکھانا۔''
کبھی کبھی غصے اور جذبات میں انسان کیا سے کیا کہہ جاتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ اس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات درج ہوتی ہے۔ کوئی اس لمحے شجاع حسن سے پوچھتا کہ اس کا دل کس اذیت میں گرفتار تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ خود کو شوٹ کر ڈالتا یا امامہ حسن کی جان لینے والے ان عادی مجرم لڑکوں کا مار مار کر بھرکس نکال دیتا۔ کیسا امتحان تھا یہ زندگی کا کہ جس میں اسے کسی کا ساتھ راس ہی نہیں آ رہا تھا۔
اگلے پورے پینتیس منٹ اس نے کمرا لاک کر کے خود اپنا ضبط آزمانے کی نذر کیے تھے۔ تنہائی میں کسی حد تک دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد' اس نے فائزہ آپا کے سیل نمبر پر مسیج چھوڑا تھا۔
''امامہ حسن اب اس دنیا میں نہیں رہی آپا۔ کل رات ایک ایکسیڈنٹ میں اس کی موت ہو گئی ہے۔''
وہ جانتا تھا اس کا مسیج وصول ہونے کے بعد سمندر کے اس پار بھی قیامت آئے گی۔ مگر اب اس کے سوا وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے شام میں بابا سے امامہ کی بات کروانے کا وعدہ کیا تھا مگر......!'' وہ شام اب کبھی نہیں آنی تھی۔
مسیج بھیج کر سیل پاور آف کرتے ہوئے وہ اپنی سیٹ سے اٹھا تھا اور اگلے ہی پل کمرے سے باہر نکل آیا۔ ڈرائیور چاق و چوبند اسے کمرے سے باہر دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔
''اسپتال......!''
مختصر کہہ کر اس نے خود کو جیسے بہ مشکل جیپ کی فرنٹ سیٹ پر دھکیلا تھا۔ اگلے کچھ لمحوں میں گاڑی اس کے مطلوبہ راستے پر فراٹے بھر رہی تھی۔

❄❄❄

بریرہ رحمٰن کی انگلینڈ روانگی کا سن کر سرمد خان سے زیادہ دن پاکستان میں نہیں رکا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہ زر سے ملاقات کے بعد تیسرے روز ہی وہ خود بھی انگلینڈ میں تھا۔
شام اس وقت تیزی سے گہری ہو رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر بریرہ رحمٰن پر پڑی تھی۔ اس کی طرح وہ بھی شاید سکون ڈھونڈنے وہاں نائٹ کلب میں آئی تھی۔ وہ خود کو اس کی جانب بڑھنے سے

ل سکا۔

"بریرہ!"

ساری دنیا سے بے نیاز' جام پر جام چڑھاتی وہ خود کو تباہ کر رہی تھی۔ جب سرمد کی پکار پر چونک کر اٹھاتے ہوئے اس نے بڑا سا گھونٹ بھرا اور گلاس سامنے دھری ٹیبل پر پٹخ دیا۔

"تم......؟"

"ہاں' اچھا نہیں لگا مجھے یہاں دیکھ کر؟"

"ہاں۔" وہ نشے میں تھی۔ سرمد آہ بھر کر رہ گیا۔

"مجھے بھی تم ایسی جگہوں پر اچھی نہیں لگتیں مگر تمہارے معاملے میں میں بہت بے بس ہوں اا۔"

"تو......؟"

"تمہیں ترس کیوں نہیں آتا مجھ پر؟"

اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے وہ جیسے ٹوٹا تھا۔

بریرہ رحمٰن نے نیا پیگ بنانے کے لیے گلاس تھاما ہی تھا کہ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

"بس کرو' خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔"

"جسٹ شٹ اپ! مجھے مت روکو۔"

جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالتے ہوئے وہ غرائی تھی۔

سرمد خان اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"سب کچھ پا کر بھی ایسی تشنگی بریرہ......! مجھے تو کچھ نہیں ملا' دل بھی خالی ہے اور ہاتھ بھی' پھر بھی میں تلخ نہیں ہوا۔ کیا میں انسان نہیں ہوں؟"

"مجھے نہیں پتا۔ بس اس وقت مجھے میرے حال پر چھوڑ دو پلیز۔"

"نہیں چھوڑ سکتا میں تمہیں تمہارے حال پر اور یہ تم بہت اچھی طرح سے جانتی ہو۔" وہ بھی ضد میں آیا تھا بریرہ سر جھکائے خود پر ضبط کرتی رہی۔

"تمہارے دل میں میرے لیے محبت نہیں ہے۔ ٹھیک ہے' مگر جس کے لیے ہے پلیز اس کے ساتھ خوش رہو' میں تمہیں اداس نہیں دیکھ سکتا۔"

ٹیبل پر رکھے اس کے دونوں ہاتھ تھامے وہ بہت بے بسی سے اعتراف کر رہا تھا۔ بریرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میری مدد کرو گے؟"

کچھ لمحوں کے بعد وہ بولی تو اس کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

"ہوں' یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔"

وہ مسلسل اسے نگاہوں کے حصار میں رکھے ہوئے تھا۔

بریرہ رحمٰن نے اس بار آنسو پونچھ لیے۔

"کیا تم انوشہ رحمٰن سے شادی کر سکتے ہو سرمد!"

اس قطعی غیر متوقع سوال اور فرمائش پر وہ سٹپٹا کر رہ گیا۔

''انوشہ رحمٰن ایک بہترین لڑکی ہے بریرہ! اور اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی کی ہم سفر کے لیے اس کا انتخاب بہترین ہے مگر سرمد خان کا جو دل ہے اس پر بریرہ رحمٰن کے قدموں کے نشان ہیں اس کی چاہ' دل کے صحرا کو بگولے کی صورت گھیرے ہوئے ہے۔ میں اس کی یاد سے منکر نہیں ہو سکتا۔''

وہ دل اور زبان کا صاف شخص تھا۔ بریرہ نے عجیب بے بسی کے ساتھ اس کی طرف نگاہ کی۔

''محبت صرف پانے کا نام تو نہیں ہے سرمد!''

''میں نے کب پانے کا سوال کیا ہے؟ میں تو ہمیشہ تمہاری رضا میں راضی رہا ہوں۔ اچھا جو بھی تم نے کہا۔ چاہا میں نے کبھی اختلاف نہیں کیا۔ اب کم از کم مجھ سے میری خودداری تو مت چھینو بریرہ!''

''تمہیں صرف اپنی خوشی سے مطلب ہے۔ میرا غم' میری خوشی تمہارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے نا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں شاہ سے پیار کرتی ہوں۔ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔''

وہ رو پڑی تھی اس وقت اس کے حواس اس کا ساتھ بھی نہیں دے رہے تھے۔ سرمد بنا اس کے آنسوؤں سے متاثر ہوئے فوری اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو گھر چلتے ہیں۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''نہیں مجھے شاہ زر کو پانا ہے۔ وہ میرا ہے صرف میرا۔''

''باہر بارش شروع ہو گئی ہے بریرہ! چلو۔''

اس بار قدرے سختی سے کام لیتے ہوئے اس نے بریرہ کو زبردستی کھڑا کیا تھا۔ وہ اسی کے سہارے کلب سے نکل کر باہر گاڑی تک آئی تھی۔ اگلے چالیس منٹ کی ڈرائیونگ میں وہ سیٹ پر سر گرائے سوتی رہی تھی۔ گاڑی اس کے گھر کے باہر پارک کرنے کے بعد اس نے اسی حالت میں اسے گاڑی سے باہر نکالا تھا اور سہارا دے کر اس کے کمرے تک لایا۔

سائلہ بیگم بیٹی کے انتظار میں جاگ ضرور رہی تھیں۔ مگر اس کے ہر معاملے میں بے بس دکھائی دیتی تھیں۔ وہ انہیں سرسری سا سلام کر کے وہاں سے چلا آیا۔

سامنے ایک بار پھر' شفاف روڈ تھا اور لاتعداد ہلکان کرنے والی سوچیں......!

''کیا تم انوشہ رحمٰن سے شادی کر سکتے ہو سرمد!''

بریرہ کا نشے میں غرق بھاری لہجہ اور یہ سوال اسے پوری رات بے چین رکھنے کو کافی تھا۔ بارش ہو رہی تھی مگر اسے اپنا تن من جلتا سلگتا محسوس ہو رہا تھا۔

''کیا تھا بریرہ رحمٰن! اگر تم میری زندگی میں نہ آتیں۔ کیا تھا اگر میرے دل میں میری نظر میں تمہاری بہن کے لیے بھی تھوڑی سی محبت بے دار ہو جاتی؟''

کرب سے لب کچلتے ہوئے وہ جیسے اس کے تصور سے گلہ کر رہا تھا۔

❋❋❋

غم زندگی نے لا کر، ہمیں اس جگہ پر مارا
جہاں اس طرف کنارا، نہ ہی اس طرف کنارا
یہاں کس کو اتنی فرصت کہ ہمارا حال پوچھے
یہ مزاج ہے سبھی کا نہیں ذکر ہے تمہارا
یہ عجیب سا جہاں ہے یہاں سب ڈسے ہوئے ہیں
کوئی دشمنی کا مارا کوئی دوستی کا مارا
کئی کام رہ گئے ہیں تیرے عشق کی وجہ سے
تیرے ساتھ بھی خسارا تیرے بعد بھی خسارا
تیرے ساتھ بیتے لمحے، میری زندگی کا حاصل
تیرے بعد پھر کسی کو نہیں پیار سے پکارا

اگلے روز آفس میں عباد کی پیشی ہوگئی تھی۔ کیونکہ اس کی غیر موجودگی میں یاور صاحب آفس آئے تھے اور انہیں بزنس سے متعلق بہت سے معاملات میں عباد کی پچھلے کچھ دنوں کی کارکردگی پر قطعی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ جلتی پر تیل کا کام ہادیہ کی شکایت نے کیا تھا۔ جو اس کی ہیلپر کی حیثیت اس کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ کل ریستوران میں عباد کو ایک قطعی اجنبی لڑکی کے ساتھ دیکھ کر جتنی والی تھی اس کا دل ہی جانتا تھا۔

وہ شخص جو اس کی اولین پسند تھا جس کا نام اس کے نام کے ساتھ منسوب تھا۔ وہ اسے کسی صورت شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ خواہ معاملہ محض دوستی یا دل لگی کا ہی کیوں نہ ہوتا۔ پھر آج کل پچھلے دو ماہ جو رویہ وہ اس کے ساتھ رکھ رہا تھا اس نے اسے ایک انجانے سے خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔

عباد کا چھن جانا اس کے لیے موت کے مترادف تھا۔ کم از کم اس کے معاملے میں وہ بہت حساس ہوتی تھی۔

عباد، یاور صاحب کے آفس میں داخل ہوا تو وہ صوفے پر ان کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام! تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا میں۔“

سگار سلگاتے ہوئے انہوں نے سرسری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

عباد ایک نظر ہادیہ پر ڈالتے ہوئے قدرے ٹھٹک گیا۔

”خیریت!“

”ہوں، خیریت ہی ہے، تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو شیئر کر لو۔ سنا ہے بزنس کو آج کل تمہاری مکمل توجہ نصیب نہیں ہو رہی ہے۔“

اب وہ باقاعدہ اسے گھور رہے تھے۔ عباد نظر چرا گیا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے پاپا۔“

”جسٹ شٹ اپ۔ جھوٹ سے سخت نفرت ہے مجھے، ایسی کوئی بات نہیں ہے تو مسٹر ہمدانی کے ساتھ اسلام آباد والی میٹنگ کیوں کینسل کی تم نے۔ جانتے تھے نا یہ میٹنگ ہماری کمپنی کے لیے کتنی

اہم تھی کتنا بڑا کانٹریکٹ ملنے والا تھا اس کمپنی سے ہمیں۔" وہ برہم ہوئے تھے۔
عباد سر جھکا گیا۔
"سوری پاپا! دراصل اس وقت میں ایک ضروری کام میں پھنس گیا تھا۔"
"ضروری کام' کیسا ضروری کام؟ باپ سے جھوٹ بولتے ہو' خوب اچھی طرح جانتا ہوں میں تمہارے ضروری کاموں کو۔ دو دو ٹکے کی لڑکیوں کے پیچھے سرعام تماشا لگائے پھرتے ہو تم اپنا۔"
وہ اس وقت کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔
عباد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
"وہ دو ٹکے کی لڑکی نہیں ہے۔"
"بکواس بند کرو۔ شرم نہیں آتی باپ کے سامنے اپنی نالائقیوں کا اعتراف کرتے ہوئے؟ یاد رکھو برخوردار! بزنس کے تمام امور تمہارے ہاتھ میں دینے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تم اپنی لاپروائیوں سے اسے دیوالیہ کردو سمجھے!" وہ سخت غصے کا شکار تھے۔ عباد ہادیہ کو خفگی سے گھورتا فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"ایک بات اور کان کھول کر سن لو تمہاری شادی وہیں ہوگی جہاں میں چاہوں گا۔ یہ یاد رکھنا۔ اب جا سکتے ہو تم۔"
اچھی طرح اس کی طبیعت صاف کرنے کے بعد انہوں نے رخ پھیر لیا تھا۔
عباد سامنے پڑی ٹیبل کو ٹھوکر مارتا ان کے شاندار آفس سے باہر نکل آیا۔ ہادیہ کی طرف سے اس کا دل بے حد برا ہوا تھا۔ اسی وقت بنا کسی تیاری کے وہ اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔
جس وقت اس کی گاڑی شاہ زر کے گیٹ کے سامنے رکی وہ ٹیرس کی ریلنگ سے ٹیک لگائے جانے کن خیالوں میں کھویا دکھائی دے رہا تھا۔
عباد کو گاڑی سے نکلتے دیکھ کر وہ بے اختیار چونکا تھا۔ جب کہ عباد نے وہیں کھڑے ہو کر گاڑی کو لاک کرتے ہوئے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔ اگلے ہی پل وہ تیزی سے سیڑھیاں عبور کرتا گھر سے باہر تھا۔ عباد سے گلے ملتے وقت اس نے اسے بہت زور سے بھینچا تھا۔
"بڑی لمبی عمر ہے تیری' ابھی میں تجھے ہی یاد کر رہا تھا اور تُو شیطان کی طرح حاضر بھی ہو گیا۔"
"بس دیکھ لو سیانے ایسے ہی نہیں کہتے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔"
جواباً اس نے بھی جوش دکھایا تھا۔ شاہ زر چلا اٹھا۔
"کیا کر رہے ہو؟ ہڈی پسلی ایک کرنی ہے کیا؟"
"نہیں تجھے دکھا رہا ہوں کہ میرے بازوؤں میں آج بھی تجھ سے زیادہ طاقت ہے۔"
"یہ تو ہے' چل اوپر ٹیرس پر چلتے ہیں۔"
"نہیں یار! آج کوئی ٹیرس' کوئی ہال' کوئی ڈرائنگ روم نہیں۔ بس آج یہیں بیٹھتے ہیں باہر سیڑھیوں پر۔"
"دماغ ٹھیک ہے تیرا لوگ موالی سمجھیں گے۔"
"سو وہاٹ! سمجھتے رہیں جو سمجھتے ہیں مجھے کوئی پروا نہیں چل بیٹھ!"

زبردستی شاہ زر کا ہاتھ کھینچ کر وہ گھر سے باہر کی سیڑھیوں پر ٹک گیا تھا۔

''کبھی کبھی دولت کی اس مشینی' مصنوعی دنیا سے نکلنے کو دل چاہتا ہے شاہ! دم گھٹتا ہے میرا اس سوسائٹی میں۔ شدت سے دل چاہتا ہے کہ میں بھی زندگی کی تلخیوں کو بہت قریب سے محسوس کروں۔ گھر کے کچے آنگن میں اپنے گھر کے تمام افرد کے ساتھ چار پائی سے چار پائی لگا کر سوؤں تا کہ اگر رات میں کسی وجہ سے میری آنکھ کھلے مجھے کوئی مسئلہ ہو تو میری ماں' میرا باپ میرے ساتھ اٹھے۔ میری ذرا سی کھانسی پر ان کی نیند ٹوٹ جائے۔ یوں تنہا قبر کی مانند بند کمرے میں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہ مروں۔ میرے اپنے میری اذیت' میری تکلیف سے بے خبر نہ رہیں۔ میں سچ میں اکتا گیا ہوں شاہ! اس لگی بندھی زندگی سے۔ جہاں صرف دو سے چار اور چار سے آٹھ کرنے کی فکر زندگی کو گھیرے ہوئے ہے۔ میں اس فکر کو اعصاب سے اتار پھینکنا چاہتا ہوں۔''

وہ دل برداشتہ دکھائی دے رہا تھا۔ شاہ زر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا لیا۔

''عبادتم ٹھیک ہو نا؟''

''پتا نہیں یار بس آج چل کہیں کسی سستے سے ہوٹل میں جا کر کھانا کھائیں۔ بنا گاڑی کے پیدل چلتے ہوئے بارش میں بھیگیں اور جب بیمار پڑ جائیں تو کسی معمولی فیس والے ڈاکٹر کے پاس جا کر اپنی باری کے انتظار میں گھنٹوں خوار ہونے کے بعد دوا لے کر آئیں پلیز۔''

''عبادتم!''

''چل نا شاہ! آج زندگی کو اس کے حقیقی رنگوں میں دیکھ کر آتے ہیں۔ جیسے وہ فرحت عباس شاہ کہتے ہیں۔

آ کسی روز کسی دکھ پہ اکٹھے روئیں
جس طرح مرگِ جواں پر کہیں دیہاتوں میں
بوڑھیاں روتے ہوئے بَین کیا کرتی ہیں
جس طرح ایک سیاہ پوش پرندے کے کہیں گرنے سے
ڈار کے ڈار زمینوں پر اتر آتے ہیں
چیختے' شور مچاتے ہوئے' کرلاتے ہوئے
اپنے محروم رویوں کی الم ناکی پر
اپنی تنہائی کے ویرانوں میں چھپ کر رونا
اجنبیت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں کہیں
شہر سے دور' سیاہ غاروں میں چھپ کر رونا
اک نئے دکھ میں اضافے کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنی ہی ذات کے جنگل میں الجھ کر رونا
اپنے گمراہ مقاصد سے وفا ٹھیک نہیں
ہم پرندے ہیں نا مقتول ہوائیں پھر بھی
آ کسی روز کسی دکھ پر اکٹھے روئیں

ٹوٹے ہوئے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولتا وہ اس کی جان پر بنا گیا تھا۔

''عباد تو کچھ بتائے گا کہ لگاؤں ایک......؟''

''کیا بتاؤں؟''

''سب کچھ' کیوں اتنا اداس ہو رہا ہے۔ کیوں بنا بتائے یوں اچانک گاڑی پر آیا ہے؟''

''بس دل چاہ رہا تھا گھر سے فرار کو تیری طرف دوڑ لگا دی تجھے اچھا نہیں لگا؟''

''ایسی بات نہیں ہے' خیر! وہاں سب ٹھیک تو ہے نا؟''

ہلکی ہلکی بارش میں بھیگتے دونوں موسم سے قطعی بے نیاز دکھائی دے رہے تھے۔

''ہاں' الحمدللہ بس یہ میرا دل کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔''

اس کا سیل بج رہا تھا۔

ہادیہ کی مسلسل کالز اور ایس ایم ایس آ رہے تھے مگر اس نے بنا کوئی رسپانس دیے سیل آف کر دیا۔

''کیوں کیا ہوا ہے اب دل کو؟''

''راہِ راست پر آ گیا ہے یار! تُو نے کہا تھا نا محبت شرک سے پاک ہے اور محبت کے اصل مفہوم کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جن کی طلب اور محبت میں وحدانیت ہوتی ہے۔ یہ محبت چاہے خدا سے ہو یا اس کے بندوں سے، درمیان میں کوئی تیسرا نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اس کی سمجھ آ گئی ہے شاہ! میں نے جان لیا ہے میں صاعقہ احمد کو کھو کر ہادیہ کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا ہوں' مگر کبھی مطمئن نہیں رہ سکتا۔ جب کہ صاعقہ کے ساتھ اس کی محبت پا کر میں صرف ایک ہادیہ تو کیا' ہزاروں ایسی ہادیہ کو ٹھکرا سکتا ہوں۔ میں نہیں جانتا میں یہ سب کیوں کر رہا ہوں۔ شاید یہ میرے لیے اتنا آسان نہ ہو' مگر میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں صاعقہ احمد کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

اپنی بے کلی کی اصل وجہ اس نے بیان کر دی تھی۔

شاہ زر ایک نظر اوپر برستے آسمان کو دیکھتا اداسی سے مسکرا دیا۔

''چلو خدا کا شکر ہے کہ محبت کی یہ کشتی کسی کنارے تو لگی۔ مجھے اپنی تو کوئی سمجھ ہی نہیں آ رہی عباد! میں بھی انوشہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسے پھر سے گنوا دینے کا تصور نہیں کر سکتا مگر مجھے لگتا ہے جیسے اس کے اور میرے درمیان ایک سمندر حائل ہے اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں اس سمندر کو عبور کر سکوں۔ میں انوشہ کی خود ساختہ نفرت سہہ سکتا ہوں مگر بریرہ کو اپنی وجہ سے مزید کوئی دکھ نہیں دے سکتا۔'' اس کے لہجے میں تھکن تھی۔

اس بار عباد کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''بہت سیدھی سادی زندگی کو ہم نے خود بہت الجھا لیا ہے شاہ! ساری عمر ان جھمیلوں میں بسر نہیں ہو سکتی۔ تمہیں کوئی نا کوئی فیصلہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ ایک ہی شخص کی دو بیٹیوں میں سے ایک کو اس کے تمام تر آنسوؤں اور دکھوں کے ساتھ چھوڑنا پڑے گا مجھے بتاؤ کسے چھوڑنے کا حوصلہ کرو گے۔''

''میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے عباد!''

''مشکل خود بنا رکھی ہے تم نے۔ آج سب کچھ کلیئر ہو جانے دو مکمل ایمان داری سے اپنے اندر

کر دیکھو۔ وہاں طاقِ دل پر کس کے نام کا دیا جل رہا ہے کس کی طلب دل کی سلطنت پر سر پٹخ ا ہے۔"

"پتا نہیں۔ چلو بارش کو انجوائے کرتے ہیں۔"

"نہیں شاہ زر! بہت ہو گیا فرار، اب اور نہیں آج یہ کشتی بھی کسی ایک ساحل کے کنارے لگ کر ی پلیز بتاؤ۔ تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں نہیں جانتا یار! بس مجھے اتنا پتا ہے میں اپنے بیٹے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"چلو ٹھیک ہے بیٹا تمہیں عدالت سے مل جائے گا۔ پھر جلد سے جلد یہاں سے سب کچھ سمیٹ لینڈ چلنے کی تیاری کرو۔ بریرہ بھابی کے پاس۔"

"نہیں یار! میں انوشہ کو مزید کوئی دکھ دے سکتا ہوں نا اسے بے یار و مددگار تنہا چھوڑ سکتا ہوں۔ کے بعد وہ اب میری ذمہ داری ہے۔"

"تو ٹھیک ہے نا اس سے میں شادی کر لیتا ہوں۔ اپنی ذمہ داری بنا لیتا ہوں اسے، تم جب چاہو ے پاس آ کر اس سے مل لیا کرنا۔"

وہ اسے بخشنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

شاہ زر نے اس بار مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے اس کے شانے پر زور کا مکا رسید کر دیا۔

"بارش تیز ہو رہی ہے اپنا نہیں تو میرا ہی خیال کر لو، بیمار پڑ جاؤں گا میں۔"

"کوئی پروا نہیں آج یہاں سے تم میری طرح کوئی فیصلہ کر کے اٹھو گے۔ یہ یاد رکھو۔"

"کیا مصیبت ہے تھوڑا وقت تو دو۔"

"تین سال بہت ہوتے ہیں اسٹوپڈ! اب تمہاری مزید آوارگی برداشت نہیں ہوتی مجھ سے۔ بھی وقت لے کر سوچتے رہے تو کبھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکو گے بس فیصلہ وہی ہوتا ہے جو ایک لمحے ہو۔"

"اٹس او کے۔ میں بری کو چھوڑ دوں گا مگر ابھی نہیں۔"

"گڈ۔" اس کے اٹھ کھڑے ہونے پر وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

شاہ زر کے چہرے پر اب سنجیدگی تھی۔

"کاش وہ میری کزن اور بچپن کی دوست نہ ہوتی۔ کاش میرا اس سے نکاح نہ ہوا ہوتا عباد! کاش ماما نہ مرتیں، کاش...... کاش میں نے اسے ہمیشہ کے لیے ماں بننے کے حق سے محروم نہ کیا ہوتا۔"

"یہ سب نہ ہوتا تو کیا تم اسے آسانی سے چھوڑ سکتے تھے۔"

"ہاں۔" رخ پھیرنے اعتراف کرنے میں اس نے ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ عباد گہری سانس بھر ہ گیا۔

تُو نے دامن میں سمیٹے ہیں زمانے کتنے
اے محبت تجھے انسان سا فانی کم ہے

"بس اب خوش ہونا۔"

اس کے شعر پر نثار ہونے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔ عباد رخ پھیر گیا۔

"تو بریرہ بھابی سے تمہیں صرف ہمدردی ہے کیونکہ تم نے ان کا نقصان کیا ہے۔ اس لیے انہیں چھوڑتے ہوئے تمہیں دکھ ہو رہا ہے؟ ہے نا۔"

"پتا نہیں یار وہ بہت اچھی ہے۔ بہترین دوست ہے۔ شادی سے پہلے ہمارا کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ انوشہ رحمٰن کے زندگی میں آنے سے پہلے میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس سے شادی کے بعد کبھی اس سے علیحدگی کا یوں سوچ بھی سکوں گا مگر میں خود بھی نہیں جانتا کہ زندگی نے میرے ساتھ اتنا بھیانک مذاق کیوں کیا ہے؟ ایک لڑکی جس نے میرے لیے اپنا سب کچھ گنوا دیا میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ پا رہا ہوں۔ حالانکہ میں نے بہت کوشش کی ہے خوش رہنے اور خود کو سمجھانے کی۔ بریرہ رحمٰن کے نقصانات کا ازالہ کرنے کی مگر میں خوش نہیں رہ پا رہا۔ میں نا اپنے ساتھ انصاف کر رہا ہوں نا اس کے ساتھ۔ پھر کیا فائدہ ایسی زندگی کا عباد! جس میں، میں اسے کوئی خوشی ہی نہ دے سکوں۔ جب کہ دوسری طرف وہ لڑکی جسے میرے تصور سے بھی نفرت ہے میں اسے نظر انداز نہیں کر پا رہا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے عباد! جب اس لڑکی کے بطن سے جنم لینے والے بچے کو میں نے باپ کے لیے ترستے دیکھا تو میرے اندر سے کیسی ہوک اٹھی۔ کیا قصور ہے اس معصوم بچے کا کہ اسے دنیا کی ٹھوکریں ملیں، گم نامی کی شرم ناک زندگی ملے؟ میں بیتے لمحات کو واپس لانے پر قادر نہیں ہوں۔ مگر بگڑے حالات کو درست تو کر سکتا ہوں نا اور یہ فیصلہ مجھ سے کسی نے نہیں کروایا عباد! بس اس ننھے سے معصوم بچے نے کروایا ہے جو میرا کل ہے۔"

وہ شکستہ دکھائی دے رہا تھا۔

عباد نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر دھر دیا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم انوشہ رحمٰن کے ساتھ ایک خوش گوار زندگی بسر کر و گے؟"

"پتا نہیں سچ پوچھو تو مجھے اب اپنی زندگی کی پروا بھی نہیں ہے۔ وہ رشتے جو میری زندگی کا سرمایہ تھے۔ چھن گئے عباد! منوں مٹی اوڑھ کر سو گئے زمین میں' اب کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کیسے رہتا ہوں۔ کون میری خوشیوں کے نظارے دیکھنے والا ہے۔ کون دعا کرنے والا ہے میری مسکراہٹوں کے لیے۔ یہاں اب کسی کو میرے آنسوؤں سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے میرے یار! شب کی تنہائیوں میں چھپ کر روؤں یا دن کے اجالوں میں' کوئی فرق نہیں پڑتا یہاں کسی کو۔"

"کیا مجھے بھی نہیں۔"

اس کے دل برداشتہ ہونے پر وہ بھی دکھی ہوا تھا۔ تبھی شاہ زر نے اسے مسکرا کر دیکھنے کے بعد سینے سے لگا لیا۔

"تو تو میری جان ہے عباد! میرا سایہ ہے۔ بھلا تجھے کیوں فرق نہیں پڑے گا؟"

"ہوں یہ ہوئی نا بات۔ چل اب بارش انجوائے کریں۔"

"چلو۔" اپنی ہر الجھن عباد سے شیئر کرنے کے بعد وہ واقعی ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

اگلے تین روز ان دونوں نے اپنی خواہشات کے مطابق اکٹھے ہی بسر کیے تھے۔ تین روز کے بعد عباد کراچی چلا آیا جب کہ شاہ زر نے انگلینڈ کے لیے سیٹ بک کروالی۔ اس نے پہلی بار بریرہ کو اپنی آمد سے متعلق باخبر نہیں کیا تھا۔ وہ گھر سے باہر تھی جب وہ برستی بارش میں اس کے گھر تک

لگیا تھا۔
ساحل اور اشان سائلہ بیگم کو چھوڑ کر پیرس سیٹل ہو گئے تھے۔ لہٰذا بریرہ کے ساتھ وہ آج کل اکیلی تنہائیوں کے عذاب اٹھا رہی تھیں۔ شاہ زر کو اچانک وہاں دیکھ کر انہیں بے تحاشا خوشی ہوئی تھی۔
وہ دیر تک ہال میں آتش دان کے پاس بیٹھا ان سے جانے کیا کیا باتیں کرتا رہا تھا۔ بریرہ کی گھر واپسی بہت لیٹ ہوئی تھی مگر وہ پھر بھی تھکن کے باوجود اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔
بریرہ کو گمان نہیں تھا کہ وہ گھر واپسی پر یوں اچانک اسے اپنے سامنے بیٹھا دیکھے گی۔
وہ تھکن سے چُور گھر واپس لوٹی تھی مگر پھر بھی شاہ زر کو مقابل دیکھ کر وہ ساری تھکن بھول گئی تھی۔
''شاہ......! تم......تم یہاں......او میرے خدا! اتنا بڑا سرپرائز؟''
پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھتی وہ خوشی سے جھوم اٹھی تھی تبھی وہ مسکرا دیا۔
''کیوں' کیا بنا اطلاع کے میں یہاں نہیں آسکتا۔''
''کیوں نہیں آسکتے جب چاہو آسکتے ہو' مگر مجھے یقین نہیں آرہا کاش مجھے پتا ہوتا کہ تم آؤ گے تو میں کہیں نہ جاتی۔''
''اٹس او کے یار! واپس تو آگئی ہو نا بس کافی ہے۔''
سائلہ بیگم اٹھ گئی تھیں کہ داماد کے سامنے شرمندہ ہونے کا حوصلہ ان میں نہیں تھا۔ بریرہ ان کے اٹھنے کے بعد شاہ زر کو اپنے کمرے میں لے آئی۔
''مجھے یقین تھا شاہ! تم آؤ گے اور ضرور آؤ گے۔ تمہیں لوٹ کر آنا ہی تھا کیونکہ جو پیار تمہیں بریرہ رحمٰن دے سکتی ہے وہ دنیا کی کوئی اور لڑکی کبھی نہیں دے سکتی۔ اللہ ربّ العزت کی اس اتنی بڑی کائنات میں' صرف تم میرے لیے بنے ہو شاہ! صرف تم۔ یہ دیکھو میں نے دو ہفتے پہلے تمہارے لیے کتنی پیاری جیکٹ خریدی ہے۔ ایک دم شہزادے لگو گے پہن کر اور یہ...... گھڑی دیکھو' صرف اور صرف تمہارے لیے ایک ماہ پہلے خریدی تھی۔ پہلے سوچا تمہیں پارسل کر دوں مگر پھر خیال آیا کہ نہیں جب تم یہاں آؤ گے تو تمہیں اپنے ہاتھوں سے دوں گی اچھی ہے نا۔''
''ہاں۔''
''تھینکس تم بیٹھو یہاں میں بس ابھی آئی۔''
وہ خوشی سے بے حال تھی۔
شاہ زر کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔
اگلے پچیس منٹ میں وہ دوبارہ اس کے مقابل آئی تو وہ ٹھٹک گیا۔ بلیک شیفون کی ساڑھی میں لائٹ میک اپ اور لائٹ سی جیولری کے ساتھ' وہ بے حد دیدہ زیب دکھائی دے رہی تھی۔ چوڑیوں سے بھری کلائیاں اور ترشے ہوئے سلکی بالوں میں گندھی ہلکی سی چٹیا اسے ایک انوکھا سا روپ دے رہی تھی۔
وہ کیا کرنے جا رہی تھی؟
''دیکھو' تمہیں عورت اسی روپ میں اچھی لگتی ہے نا شاہ! میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں آئندہ اس طرح ہی رہوں گی خوش۔''

اس کے دونوں ہاتھ تھامے وہ قربان ہو جانے کو تیار تھی۔
شاہ زر نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں کی گرفت سے چھڑا لیے۔
"تمہیں پتا ہے بریرہ! میں یہاں کیوں آیا ہوں"
بہت دیر بعد کمرے میں اس کی آواز گونجی تھی۔ وہ حیران سی اسے دیکھتی رہ گئی۔
"کیوں آئے ہو؟"
اس کی آواز جیسے کسی کنوئیں سے آئی تھی۔ وہ بے ساختہ رخ پھیر گیا۔
"تمہیں طلاق دینے۔"
بہت آسانی سے کہہ دیا تھا اس نے مگر بریرہ رحمٰن کو لگا اس کی ہستی کی دیوار ہی ہل گئی ہو۔
"وہاٹ' کیا کہا تم نے ایک بار پھر سے کہو۔"
وہ جانتا تھا اسے شاک لگے گا مگر پھر بھی دل مضبوط کرتے ہوئے اس نے کہہ دیا تھا۔
"بار بار نہیں کہہ سکتا۔"
"تم مذاق کر رہے ہو نا شاہ!"
"کاش میں اس پوزیشن میں ہوتا بریرہ! میرے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ مگر اتنے دن مسلسل سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں بری کہ ہمارے لیے یہی بہتر ہے میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکتا۔ تم چاہتی ہو کہ میں صرف تمہارا ہو کر رہوں مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ میں چاہتے ہوئے بھی انوشہ رحمٰن کو اپنی زندگی سے بے دخل نہیں کر سکتا' تم اچھی لڑکی ہو بریرہ! دنیا کی سب سے بہترین لڑکی......!"
"چٹاخ۔"
اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا بریرہ کے جاندار طمانچے نے اسے خاموش کر دیا۔
"جسٹ شٹ اپ شاہ زر آفندی...... جسٹ شٹ اپ۔"
پل میں لہو رنگ آنکھوں کے ساتھ وہ غضب ناک ہوئی تھی۔
"دنیا کی بہترین لڑکی ہوتی تو تم مجھے یوں دو کوڑی کا کرتے؟ کسی اور کو مجھ پر ترجیح دیتے؟ نہیں بریرہ رحمٰن درخت سے گرے زرد پتے سے بھی ہلکی ہے۔ کیچڑ ہے کیچڑ تبھی تم اپنا دامن بچا لینا چاہتے ہو۔ کیا رہنے دیا ہے تم نے دنیا کی اس اچھی لڑکی کے پاس۔ کچھ بھی تو نہیں؟"
بولتے بولتے اچانک اس کا لہجہ بھر آیا تھا۔
"کیا مانگا تھا میں نے تم سے ہیرے جواہرات' تاج محل' ڈالر؟ بتاؤ کیا مانگا تھا میں نے کچھ بھی تو نہیں۔ مانگا تو صرف تمہیں مانگا' تمہاری چاہ مانگی۔ کتنی بڑی کائنات ہے میرے رب کی۔ سیکڑوں' ہزاروں' کروڑوں مردوں سے بھری ہوئی۔ ایک سے بڑھ کر ایک بہترین مرد انوشہ رحمٰن جسے چاہے پا سکتی ہے جس کے ساتھ چاہے رہ سکتی ہے مگر بریرہ رحمٰن کو ان سیکڑوں' کروڑوں ہزاروں مردوں میں صرف ایک شاہ زر چاہیے صرف شاہ زر۔"
پلکوں سے ٹوٹ کر آنسو اس کے گالوں پر پھسل آئے تھے۔ شاہ زر نے لب بھینچ لیے۔
"تم انوشہ رحمٰن کو اپنی زندگی سے بے دخل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تم اس پر مرتے ہو۔ مگر بریرہ رحمٰن

کی تمہاری زندگی میں کوئی وقعت نہیں ہے۔ اس لیے اسے اپنی زندگی سے بے دخل کرنا تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں؟ ہے نا؟"

وہ زخمی ہو رہی تھی۔

شاہ زر نے چپ چاپ رخ پھیر لیا۔

"تم بھی اس ظالم خود غرض دنیا کے عام سے مرد نکلے شاہ زر' دھوکے باز' مطلبی' ہوس پرست۔ صحیح کہتے ہیں کہنے والے تم مرد اعتبار اور وفا کے قابل نہیں ہو۔ صرف نفرت کے قابل ہو تم، صرف نفرت کے۔ ہر گام' ہر منزل پر صرف اپنے مفاد کو دیکھتے ہو دوسرا کوئی جان سے چلا جائے تمہیں پروا نہیں۔"

وہ ٹوٹی تھی اور ٹوٹ کر بکھرنے والی ہر چیز شور مچاتی ہے لہٰذا وہ بھی چلا رہی تھی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ ابھی اسی لمحے۔ میں زندگی میں دوبارہ کبھی تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔"

شاہ زر کے بازو کو گرفت میں لے کر اسے کمرے سے باہر دھکیلتے ہوئے وہ پاگل ہی تو ہو گئی تھی۔ سائلہ بیگم شور سن کر وہاں آئی تھیں مگر روتی اور چلاتی ہوئی بریرہ رحمٰن نے انہیں کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں دیا۔

شاہ زر نے احتجاج نہیں کیا۔ برستی بارش میں بریرہ رحمٰن کے ہاتھوں وہ سڑک پر آیا تھا۔ مگر پھر بھی اسے اس کے دکھ پر تکلیف ہو رہی تھی۔

وہ کب اسے یوں توڑنا چاہتا تھا؟

بریرہ رحمٰن نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکالنے کے بعد وہیں دہلیز پر بیٹھ کر بلند آواز میں رونا شروع کر دیا تھا۔

سائلہ بیگم کو لگا جیسے ان کا دل پھٹ جائے گا۔

"بُری کیا ہوا میری جان! کیا کہا ہے شاہ زر نے تجھ سے؟"

لپک کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگایا تھا۔ جواباً وہ مزید بلک بلک کر رو پڑی۔

"کہا جاتا ہے مما! بیٹی ماں کا نصیب چراتی ہے۔ میرے نصیب پر بھی آپ کے نصیب کا سایہ پڑ گیا۔ آپ نے صدف رحمٰن سے سید کمال کو چھینا تھا۔ اس کی بیٹی نے مجھ سے میرے شاہ زر کو چھین لیا مما۔ حساب برابر کر دیا اس نے۔"

وہ زندگی میں کبھی یوں بلک بلک کر نہیں روئی تھی۔

سائلہ بیگم کا وجود جیسے ساکت ہو گیا۔ وقت نے کیسا جما کر طمانچہ لگایا تھا ان کے چہرے پر۔ تیس سال پہلے کسی عورت کا بسا بسایا گھر اجاڑ کر اس کے شوہر کو اپنی جاگیر بناتے ہوئے انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی اس عمل کا ردعمل بھی ہو گا۔

❁❁❁

وہ گہری نیند میں سو رہا تھا جب سیل فون کی مسلسل بجتی ٹون۔

"چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں۔"

(جو اس نے صرف صاعقہ کے نمبر پر سیٹ کر رکھی تھی) نے اس کی نیند کا گلا گھونٹ دیا۔ کراچی واپسی کے بعد گھر آ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں قید ہو گیا تھا۔ تھکن اس قدر تھی کہ کچھ کھائے پیئے بغیر ہی بیڈ پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ ابھی آنکھ کھلی تھی اور اسکرین پر صاعقہ احمد کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ اس نے غنودگی کے باوجود فوراً سے پیشتر کال پک کر لی کہ صاعقہ احمد کی ناراضگی اسے کسی طور گوارا نہیں تھی۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! تم بند کرو' میں ابھی کال کرتا ہوں تمہیں۔''

عادت کے عین مطابق اس نے اس کی کال کاٹ کر فوری اس کا نمبر پریس کر دیا تھا۔ دوسری طرف صاعقہ نے تیسری بیل پر کال ریسیو کر لی۔

''اب بولو' خیریت؟''

''ہوں' کیا میں خیریت کے علاوہ تمہیں کال نہیں کر سکتی؟''

''کیوں نہیں کر سکتی' آدھی رات کو بھی کرو تو پہلی بیل پر اٹھاؤں گا۔''

''بس رہنے دو تین دن سے خبر نہیں لی کہ زندہ ہوں یا مر گئی ہوں۔ بڑے آئے آدھی رات کو پہلی بیل پر کال اٹھانے والے۔'' وہ اس کی خفگی بھرے انداز پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے' عزیز از جان آنسہ! میں نے پچھلے تین روز میں سیکڑوں ایس ایم ایس کیے ہیں تم نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ میں چونکہ یہاں نہیں تھا۔ شاہ زر کے ساتھ تھا۔ اس لیے کال نہیں کر سکا۔ خیر کیسی ہو؟''

''ٹھیک ہوں تم کہاں ہو؟''

''ابھی تو گھر پر ہوں۔ تھوڑی دیر میں دوست کی طرف جاؤں گا کیوں خیریت۔''

''ہاں' وہ اصل میں آج میں آفس نہیں گئی کل رات یہاں ہمارے علاقے میں بہت دیر تک طوفانی بارش ہوئی ہے۔ تو جو بڑا کمرا تھا اس کی چھت گر گئی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم اس وقت چھوٹے کمرے میں چائے پی رہے تھے۔ سامان البتہ سارا برباد ہو گیا ہے۔ اوپر سے سارا گھر تالاب کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ ایان بھائی شہر میں نہیں ہیں اور سمعان بھائی کا تم جانتے ہو معذور ہیں۔ زیادہ کام نہیں کر سکتے' چھوٹے دونوں بہت چھوٹے ہیں۔ ایسے میں آپا اور میں کیا کر سکتے ہیں؟ اگر تم فری ہو تو پلیز آ جاؤ زین! میرے ساتھ مل کر جو تھوڑا بہت سامان جو بچ رہا ہے وہ باہر نکلوا دو۔''

کیسی عجیب درخواست و فرمائش تھی اس کی۔ ایک لمحے کے لیے وہ سوچ میں پڑ گیا پھر فوراً فیصلہ کرتے ہوئے بولا۔

''او کے' میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔ تم فضول میں کسی بھی چیز کو مت چھیڑنا سمجھیں۔''

''جی! سمجھ گئی۔''

وہ اس کا مان تھا۔ سکھ اور دکھ کے ہر موسم کا ساتھی تھا پھر کیسے نثار نہ ہوتی وہ اس پر۔

عباد نے کال ڈراپ کرنے کے بعد کراچی میں ہی مقیم اپنے ایک دوست کا نمبر ملایا اور اسے فوری ایک گھر ہائیر کرنے کی ہدایت کرنے کے بعد ان تنگ و تاریک بوسیدہ گلیوں کی طرف چلا آیا کہ جہاں رہنے والی ایک لڑکی اسے زندگی سے پیاری تھی۔

❁❁❁

بریرہ رحمٰن کو علیحدہ راستوں کا ''مژدہ'' سنانے کے بعد شاہ زر آفندی ایک رات کے لیے بھی وہاں نہیں رکا تھا۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ منہ پر بریرہ رحمٰن کو جدائی کا فیصلہ سناتا۔ لہٰذا اسی رات پاکستان واپسی کے بعد اس نے پہلے سے تیار شدہ طلاق کے پیپرز سائن کرنے کے بعد اگلے دن انہیں بریرہ رحمٰن کو روانہ کر دیا تھا۔

یہ عمل کٹھن تھا۔ جسم سے لہو نچوڑ لینے والا تھا مگر......!

آج نہیں تو کل یہ قدم تو اسے اٹھانا ہی تھا۔ مسلسل ذہنی تھکاوٹ اور اذیت کے سمندر میں ڈولتی اپنی ذات کی کشتی کو کسی ایک کنارے تو لگانا ہی تھا۔

بریرہ رحمٰن سے اپنے راستے جدا کرنے کے بعد پورے تین دن وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ تین روز کے بعد بالآخر گوری کے اصرار و مداخلت پر اسے کمرا چھوڑ کر باہر نکلنا پڑا تھا۔ گھر کے ملازمین کی زبانی گوری اس کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جان گئی تھی۔ اب بھی اسی نے ...ل ہونے کے بعد زبردستی اسے کھانا کھلا کر جمال صاحب اور نزہت بیگم کے پاس بھیجا تھا کہ وہ ان کے سامنے انوشہ کے لیے اپنا پرپوزل پیش کر سکے۔ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا مگر صرف اس کی ضد اور اپنے بیٹے کو ایک نظر دیکھ لینے کی خواہش اسے پھر سے انوشہ رحمٰن کے گھر کی دہلیز پر لے آئی تھی۔

❁❁❁

''قیس......!'' پچھلے ایک گھنٹے سے کسی بت کی طرح ساکت وہ اس کے بیڈ کی سائیڈ پر بیٹھی اسے گہری نیند میں مدہوش دیکھے جا رہی تھی۔ اب جو سانول کی پلکوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی تو وہ اسے پکارے بغیر نہ رہ سکی۔ سانول شاہ نے اس کی پکار پر فوراً پلکیں کھولی تھیں۔

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہیں ہوش آ گیا۔ کوئی اتنی گہری نیند بھی سوتا ہے قیس!'' اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ حیران ہی تو رہ گیا۔

''تم' یہاں......؟''

''ہاں مجبور تھی گاؤں میں کسی کی ہمت ہی نہیں تھی تڑپتے ہوئے سانول شاہ کو بڑے چوہدری کی حویلی کے پچھواڑے سے اٹھا لانے کی۔ اسی لیے مجھے تم پر یہ احسان کرنا پڑا ورنہ تم تو جانتے ہو' مجھے تم سے کتنی نفرت ہے۔''

سانول اس بار خاموش رہا تھا۔ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پھر سے پلکیں موند لیں۔

''کیا شکریہ ادا نہیں کرو گے میرا؟''

''نہیں۔''

''یہی امید تھی تم سے تم بھی سوچتے ہو گے میں نے تمہاری مدد کیوں کی جب کہ میں تو تم سے نفرت کرتی ہوں ہے نا۔''

سانول پھر خاموش رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

''تمہاری موت میرے ہاتھوں لکھی ہے مائی ڈیئر قیس! پھر کسی اور کی گولی سے کیسے مرنے دے

سکتی ہوں میں تمہیں؟"

"ٹھیک ہے اب جاؤ یہاں سے۔نہیں تو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔"

اس کی خفگی پر وہ ہنسی تھی۔

"پہلے خود سے اٹھ کر بیٹھ تو جاؤ' پھر مجھے بھی اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دینا۔"

وہ جانتا تھا کہ وہ اسے تنگ کر رہی ہے تبھی آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹا رہا۔

"دیکھ لیا نا قیس! جتنا بھی اکڑ کر چل لو خدا کی زمین پر اس خدا کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ سیکڑوں مربع پر پھیلی زمین یہ بینکوں میں رکھے دولت کے انبار' آگے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلتے لوگ کیا یہ خدا کی گرفت سے بچا سکتے ہیں؟ نہیں یہ سب تو دھوکا ہے قیس! جس میں ہم انسانوں نے اپنے آپ کو ڈال رکھا ہے۔ پلیز نکل آؤ اس دھوکے سے کچھ نہیں رکھا اس خدائی میں پلیز......!"

"تم چپ کرو گی انزلہ! یا میں یہاں سے اٹھ کر چلا جاؤں؟"

غلط وقت پر اس کی مداخلت نے اسے برہم کر دیا تھا۔

انزلہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"یہ میری ضد ہے ڈیئر قیس! کہ تمہیں بندے کا پتر بنا کر ہی دم لوں گی۔"

"خوش فہمی ہے تمہاری۔"

"نہیں اپنے ربّ پر یقین ہے۔ خیر ایک خوش خبری سن لو۔ میں گاؤں سے جا رہی ہوں ہمیشہ کے لیے۔"

جانے کیوں وہ اس کی تکلیف سے بے خبر ہو گئی تھی تبھی مسلسل بول رہی تھی۔ سانول شاہ نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اسی پل نرس کمرے میں داخل ہوئی تو وہ خاموش ہو گئی۔

"اب کیسی طبیعت ہے مسٹر شاہ! خاصا میجر آپریشن تھا آپ کا۔ جانے کس کی دعائیں کام آ گئیں آپ کے۔"

اسے چیک کرتے ہوئے وہ بتا رہی تھی۔ وہ اب بھی خاموش رہا۔

"لگتا ہے پھر سے غنودگی طاری ہو رہی ہے ان پر' شاید رات تک صحیح ہوش میں آ جائیں۔" نرس نے اسے بتایا تھا۔ وہ خاموشی سے سر ہلا کر رہ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں بہزاد وہاں چلا آیا تھا۔

"آپ ابھی تک یہیں ہیں مس انزلہ! گھر نہیں گئیں۔"

"نہیں ابھی گھر سے ہی آئی ہوں۔ پہلے سے بہتر طبیعت ہے ان کی۔"

"اچھی بات ہے میرا خیال ہے آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اب یہاں سے چلنا چاہیے آپ کو۔"

"ہاں نگران کے پاس کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت پڑ گئی تو؟"

"تو وہ ان کا مسئلہ ہے آپ کا نہیں۔ مت بھولیں کہ آپ ایک پرائی لڑکی ہیں۔ ویسے بھی دادا ماں ادھر ہماری حویلی میں ہیں۔ بابا کہہ رہے تھے کہ میں آپ کو ساتھ لے آؤں۔"

"خیریت......؟"

بہزاد کی اطلاع پر وہ چونکی تھی۔ جب وہ رخ پھیر کر سانول شاہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔
"جی ہاں' خیریت ہی ہے۔ میں ایک دو ضروری کام نمٹا کر آتا ہوں۔ آپ چلنے کی تیاری کیجیے۔"
اس کا لہجہ غیر معمولی سنجیدہ تھا۔ وہ خاموشی سے سر ہلا کر رہ گئی۔
تھوڑی دیر میں سانول کی بڑی پھوپو وہاں آ گئیں تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے اس حال میں یوں تنہا چھوڑ کر جانے کو قطعی دل نہیں مان رہا تھا۔ اگلے تیس منٹ میں بہزاد کے ہمراہ اس کی گاڑی گاؤں مراد شاہ کا سفر طے کرتے ہوئے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں حویلی میں اماں اس کی تقدیر کا کیا فیصلہ کیے بیٹھی ہیں۔

✻✻✻

ہادیہ کے پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہٰذا وہ کچھ دنوں کے لیے اپنی بیگم کے ہمراہ پاکستان چلے آئے تھے۔ جس پر ہادیہ کے ساتھ ساتھ یاور صاحب بھی بے حد خوش تھے۔ عباد البتہ ان کی آمد سے بے خبر تھا کیونکہ وہ کراچی میں نہیں تھا۔ شاہ زر کے پاس اسلام آباد چلا گیا تھا۔ واپسی پر بھی اس کی گھر کے کسی فرد سے کوئی بات نہیں ہو سکی تھی۔
وہ گھر سے نکلا تھا اور اسی روز شام میں یاور صاحب اپنی بیگم کے ساتھ باقر صاحب کی طرف آئے تھے تا کہ ان کی مزاج پرسی کر سکیں۔ مدت کے بعد محفل جمی تھی۔ دونوں بھائی یوں فرصت سے اکٹھے بیٹھے تھے باتوں باتوں میں مسز باقر نے ہادیہ کی شادی کا موضوع چھیڑ دیا تو باقر صاحب کہہ اٹھے۔
"یاور بھائی! میں ہادیہ کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ اکلوتی بیٹی ہے اور زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ خدارا غلط مت سمجھیے گا مگر میں اب جلد از جلد اپنی بیٹی کے فرض سے سبک دوش ہونا چاہتا ہوں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟"
"مجھے کیا کہنا ہے یار! میں تو خود شام سے پہلے اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے جانے کے لیے تیار ہوں۔ بس تیری طرف سے ہی سستی ہو رہی تھی۔ بول کب آؤں بیٹے کی بارات لے کر؟"
"جب آپ کا جی چاہے۔" وہ خوش ہو گئے تھے۔
"تو پھر ٹھیک ہے اس مہینے کی بائیس تاریخ کو بارات تیرے گھر کی دہلیز پر ہوگی، خوش؟" بنا ماں اور بیٹے سے بات کیے انہوں نے پروگرام طے کر دیا تھا۔
مسز یاور کوئی اعتراض نہ ہونے کے باوجود اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گئی تھیں۔ جب کہ ہادیہ کا اندرونی خوشی سے دمک رہا تھا۔
مسز باقر فوراً اٹھ کر مٹھائی لے آئی تھیں۔
"کاش ہانیہ اور عباد بھی اس وقت یہاں ہوتے تو مزا آ جاتا۔"
سب کا منہ میٹھا کرواتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ جب باقر صاحب بولے۔
"ہاں' بلکہ میرا خیال تھا کہ آپ کو عباد بیٹے سے پوچھ کر ہی یہ بات طے کرنی چاہیے تھی۔"
"ارے چھوڑو عباد کو' میرا بیٹا ہے وہ' میں باپ ہوں اس کا وہ میرا باپ نہیں ہے جو برسوں سے

طے بات کو فائنل کرتے ہوئے اس کی رضا پوچھوں بس تم اپنی تیاری مکمل رکھو۔ ان شاء اللہ میری طرف سے تاخیر نہیں ہوگی۔"

وہ خوش تھے۔ بے پناہ مسرور تھے۔ مسز یاور انہیں پر سوچ نگاہوں سے دیکھتی آئندہ آنے والے دنوں کی خوشیوں کی دعا کرتی رہیں۔

❁❁❁

سرد رویہ، الجھا لہجہ
کھوئی آنکھیں، ٹھنڈے ہاتھ
بے رنگ چہرہ، بد اخلاق
دیکھو تم بن کون ہوں میں؟

اپنے آفس سے اسپتال تک جیسے وہ پہنچا تھا اس کا دل ہی جانتا تھا۔ یہ کیسے آنسو تھے جو بہہ نکلنا رہے تھے۔ ڈائریکٹ دل پر گرتے ہوئے اس کا سینہ فگار کر رہے تھے۔ یہ کیسی اذیت تھی جو اندر ہی اندر اسے مسمار کر رہی تھی۔ فقط چند گھنٹوں میں اتنی ٹوٹ پھوٹ ہوگئی تھی کہ اس کے لیے ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھانا محال ہو رہا تھا۔

بھلا وہ کیوں جا رہا تھا اسپتال؟

کیا امامہ حسن کی بے جان لاش، اس کا عبرت انگیز انجام دیکھنے؟

کیا اس میں اتنی ہمت بچ رہی تھی کہ وہ اس کا عبرت انگیز انجام دیکھ سکتا۔ اس کا سامنا کر سکتا۔ نہیں......! تو پھر وہ کیوں جا رہا تھا۔ جب کہ اسے مارنے والے بھی اس کے نام کی تصدیق کر چکے تھے۔

اس نے سوچ لیا تھا۔ اسپتال سے جانے کے بعد وہ پہلی فرصت میں بنا جسمانی ریمانڈ کے بھی ان لڑکوں کو چھوڑے گا نہیں۔ خواہ اس کی ملازمت ہی خطرے میں کیوں نا پڑ جائے۔

قتل ہونے والی لڑکی کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد سرد خانے میں رکھ دی گئی تھی۔

لڑکی کا چہرہ اور پورا جسم تیزاب کے باعث یوں مسخ ہو چکا تھا کہ اس کی پہچان ممکن ہی نہیں رہی تھی۔

وہ ضبط کا پہاڑ بنا خاموشی سے لاش کا جائزہ لیتا رہا۔ بے شک شناخت مشکل تھی مگر......! وہ جسم "اس کی" امامہ حسن کا نہیں تھا۔ امامہ اتنی صحت مند نہیں تھی۔ بے تحاشا تشدد کے سبب یہ ممکن تھا کہ اس کا جسم پھول گیا ہو مگر، اس کے اندر دل کی جگہ کوئی چیز دھڑک دھڑک کر اسے یہ یقین دلا رہی تھی کہ وہ اس کی امامہ حسن نہیں تھی تو پھر اس کی امامہ حسن کہاں تھی؟

❁❁❁

ہوائیں دل دکھائیں گی
سنو پاگل!
کھڑے رہنے سے کیا حاصل؟
ہوا تو بس یہی ہوگا

ہوائیں دل دکھائیں گی
نگاہیں بھیگ جائیں گی
چلو' اندر چلے آؤ!
سنا ہے جو بھی مرضی سے چلا جائے
کبھی واپس نہیں آتا۔

''اور وہ لوگ جو ایمان لائے ان کے دل اللہ کی یاد سے چین پاتے ہیں۔ بے شک اللہ کی یاد ہی سے دلوں کا چین ہے۔''

قرآن پاک کھلا ہوا اس کے سامنے رکھا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی ٹوٹ ٹوٹ کر اس مقدس کتاب کے پاک اوراق پر گر رہے تھے۔ سورہ الرعد کی بظاہر کتنی چھوٹی سی آیت تھی مگر بہت گہرا مفہوم سمیٹے ہوئے تھی اپنے اندر......!

وہ مفہوم کیا تھا؟

دلوں کے چین کی کہانی کیا تھی؟

اللہ رب العزت کی پاک ذات نے اس بظاہر چھوٹی سی آیت میں علم و حکمت کے کتنے خزانے پوشیدہ رکھے تھے؟ زندگی سے ہارے ہوئے وہ مایوس لوگ' جنہیں اعلیٰ ڈگری ہولڈرز ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا۔ جن کے دل بہترین' ماہرین ڈاکٹرز کے علم میں لاعلاج ہو چکے تھے۔ یہ آیت ان ''ناکارہ دلوں'' کی شفا تھی۔ دوا تھی۔ بہت گہرے راز تھے اس آیت کے اندر۔ سمندر کی تہوں سے بھی زیادہ گہرے راز۔ جنہیں سمجھنے کے لیے بہت سمجھ کی ضرورت تھی۔

ایک ایک حرف' ایک ایک لفظ حکمت سے بھرا ہوا تھا اور وہ رو رہی تھی۔

اپنی لاعلمی و غفلت پر اپنی نادانی پر......!

اس کے نزدیک وہ کتاب صرف احترام سے بہت اونچی جگہ رکھ کر سجا دینے کے لیے تھی۔ یا پھر کبھی بے سکونی و بے قراری اور فرصت کے لمحات میں زور زور سے ہل کر وہ الفاظ دہرا لینے کے لیے۔ وہ کبھی سمجھ ہی نہ سکی کہ اس کتاب کا حق کیا ہے؟ ایسی کیا بات ہے اس کتاب میں' جو اللہ رب العزت نے اس پاک کتاب کو قیامت تک کے انسانوں کے لیے مکمل قرار دے دیا۔ زندگی میں واقعی کچھ باتوں کی سمجھ بہت دیر سے آتی ہے۔ پہلے پارے سے تیرھویں پارے تک کے سفر میں جیسے اس کی شخصیت ہی بدل گئی تھی۔ کیسے کیسے حالات و واقعات سے آگاہی ہو رہی تھی۔ کیا کیا آشکار نہیں ہوا تھا اس پر۔

اب کوئی اسے دیکھتا تو شاید پہچان ہی نہ پاتا کہ وہ گاؤں کی وہ گوری ہے جو لڑائی جھگڑے میں مردوں کو بھی مات دیتی تھی۔ جسے محض تن کر چلنا آتا تھا۔ جو اپنی شادی سے لے کر بھائی کی موت تک زندگی سے بے زار' حالات سے نالاں' خدا سے شکوے کرتی پھرتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت جو آنسو تھے وہ ان گزرے دنوں کی کوتاہیوں کے آنسو تھے جو کنکر بن کر اس وقت آنکھوں میں چبھ رہے تھے۔ وہ رو رہی تھی اور اس کا دل جیسے پہلو میں کٹتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اے میرے مالک! میرے معبود حقیقی! اے واحدہ' لاشریک! میری کیا اوقات جو تیری شان

رحیمی و کریمی سے کوئی شکوہ کروں۔ میں تو تیرے ٹکڑوں پر پلنے والی بھکارن ہوں۔ تو عطا کرے تو تیرا شکر ادا کروں گی اور محروم کر دے تو صبر کروں گی۔ مجھے میری کم فہمی و غفلت کے لیے معاف کر دے مالک! شیطان مردود سے بچا کر اپنی پناہ کے حصار میں لے لے۔"

اور اس دعا کے ساتھ سکون کی لہر جیسے اس کے رگ و پے میں اترتی جا رہی تھی۔

❁❁❁

شجاع اسپتال سے سیدھا گھر چلا آیا تھا۔ اس کی بیٹی تھی کہ امامہ کے لیے روتی روتی سو گئی تھی۔ جب کہ دماغ کی شریانیں جیسے پھٹنے کو تیار ہو رہی تھیں۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ کچھ کھا کر سو رہتا۔ اسے لگا وہ زندگی میں کبھی کسی عورت کی وفا نہیں پا سکے گا۔

اس رات ایک مرتبہ پھر امامہ کے لیے سوچتے ہوئے اور سلگتے ہوئے اس نے بہت زیادہ سگریٹ پی تھی۔ اس کا موبائل تاحال آف تھا۔ چوکیدار کو بھی اس نے سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ کوئی بھی ملنے کے لیے آئے' اسے مطلع نہ کیا جائے۔ دل اس وقت جیسے ساری دنیا سے کٹ جانے کی خواہش کر رہا تھا۔

"وہ کہاں کس حال میں ہو گی؟" یہ سوال اس کے اندر آتش فشاں بنا ہوا تھا۔

ایک کے بعد ایک سگریٹ ختم ہو رہی تھی اور اسی کے ساتھ سلگتے آنسوؤں کا لاوا تھا جو گالوں پر بہہ نکلا تھا۔

"کاش میں تمہیں تمہاری بے وفائی کی سزا دے سکتا امامہ حسن! کاش......!" اس کے نکاح کے روز والی تصویر کو ہاتھوں میں لیے اس نے حسرت سے سوچا تھا اور وہاں تقدیر ایک نئی کہانی رقم کرنے جا رہی تھی۔

❁❁❁

"شکریہ ارسلان! اس وقت اگر تم موقع پر نہ آتے تو جانے میرا کیا حال ہوتا۔" سڑک کنارے سنگی بنچ پر نڈھال بیٹھی وہ کہہ رہی تھی اور ارسلان کے لبوں پر یوں چپ کا قفل لگا تھا جیسے وہ کچھ بھی بولا تو اس کی ذات چیخ جائے گی۔

کچھ لمحے یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے تھے۔ جب وہ بولا۔

"مجھے خبر نہیں تھی کہ تم وہاں ہو یا ہو سکتی ہو' مجھے تم سے ایسی حماقت کی توقع بھی نہیں تھی۔ میں تو محض اپنا سامان لینے آیا تھا وہاں۔ ان لوگوں سے میرا جھگڑا چل رہا تھا۔ ایک لڑکی کی وجہ سے' اسی لیے میں مزید وہاں ان لوگوں کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا مگر' سامنے جو منظر میں نے دیکھا اس نے میرا خون کھولا دیا۔ کاش وہ دونوں کتے مر جاتے میرے ہاتھوں۔" وہ ابھی بھی کھول رہا تھا۔

امامہ حسن نے اس کی دی ہوئی شال ٹھیک کر کے کندھوں کے گرد لپیٹ لی۔

"وہ کہتے ہیں تو تم کیا ہو ارسلان۔ جو کام وہ کرتے ہیں وہی تم بھی کرتے ہو' تم نے مجھ سے کہا کہ تم بے قصور ہو' تم پر وہ کیس جھوٹا بنا تھا۔ مگر حقیقت میں تم بے قصور نہیں تھے۔ تم پر بنا وہ کیس جھوٹا نہیں تھا۔ بس تم مجھے فریب دیتے رہے۔ میری محبت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر حماقتیں کرواتے رہے مجھ سے۔"

"جانے دو' اب ان باتوں کا فائدہ نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ تم اب کیا چاہتی ہو' میرے ساتھ چلو گی یا اس ایس پی کے گھر چھوڑ آؤں تمہیں؟" وہ مضطرب تھا اس لیے اس کی بات کاٹتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

امامہ حسن کی آنکھیں پھر سے جلنے لگیں۔

"اس شخص کے گھر میں اب میرے لیے کوئی جگہ نہیں رہی ہے ارسلان! گر گئی ہوں میں اس کی نظروں سے تم پلیز کسی دارالامان میں پہنچا دو مجھے۔"

"خاموش ہو جاؤ" اس بار وہ دہاڑا اور اگلے کچھ ہی لمحوں میں وہ اس کے لیے ٹیکسی روک رہا تھا۔ امامہ نے اس کے بعد پھر لب نہیں کھولے۔

"فی الحال ہم میری ایک دوست کے گھر جا رہے ہیں۔ جہاں میرا قیام ہے۔ میں اس سے کہوں گا تم باہر سے پاکستان دیکھنے آئی ہو۔ تم بھی یہی کہنا اوکے۔" وہ اسے ہدایت کر رہا تھا۔ امامہ چپ چاپ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

"ایک بات پوچھوں ارسلان؟" کچھ لمحوں کی مسافت کے بعد اس نے لب کھولے۔

"ہوں۔"

"تم ضرورت کے لیے کب تک محبت کرتے رہو گے۔"

"میں ابھی تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں امامہ! لہٰذا چپ رہو پلیز۔" وہ اضطراب کا شکار تھا اور امامہ وجہ جانتی تھی تبھی اس کے جواب پر رخ کھڑکی کی طرف موڑ کر بیٹھ گئی۔ سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکاتے ہی کچھ مناظر پھر ذہن کی اسکرین پر روشن ہوئے تھے اور وہ جیسے کانپ کر رہ گئی تھی۔

"کیا ہوتا اس وقت اگر اس کا رب اس پر کرم نہ کرتا......؟ اور وہ وقت جب اس کے حوصلے جواب دے گئے تھے۔ اس وقت ارسلان حیدر کو رحمت بنا کر اس "قتل گاہ" کی طرف نہ بھیجتا؟" قریب تھا کہ آنکھیں پھر چھلک پڑتیں۔ اس نے جلدی سے پلکیں موند لیں۔

"میں تمہیں معاف نہیں کروں گی شجاع حسن! اپنی زندگی کے اس حادثے کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

❁❁❁

اس نے ڈور بیل پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر جیسے اٹھانا بھول گیا۔

انوشہ گھر پر نہیں تھی' جمال صاحب کو بستر سے نکل کر دروازے تک آنے میں کئی منٹ لگ گئے۔

"السلام علیکم انکل!"

"وعلیکم السلام تو یہ تم ہو؟ میں سمجھا کوئی شرارتی بچہ یونہی تنگ کر رہا ہو گا۔ آؤ اندر آ جاؤ" دروازہ کھول کر شاہ زر پر نگاہ ڈالتے ہی وہ ایک لمحے کے لیے پریشان ہو گئے تھے۔ شاید بریرہ کے ہاتھوں اسی شاہ زر کے لیے انوشہ کو پہنچنے والی تکلیف وہ ابھی تک فراموش نہیں کر پائے تھے۔ شاہ زر نادم سا ان کے خلوص پر اندر بڑھ آیا۔

نزہت بیگم لاؤنج میں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ شاہ زر پر نگاہ پڑتے ہی ان کے چہرے کا رنگ

بھی بدلا تھا۔شاید انہیں یہ گمان نہیں تھا کہ وہ ان کی تلاش میں یہاں بھی پہنچ جائے گا۔

''السلام علیکم آنٹی۔'' وہ جھکا تھا۔نزہت بیگم نے پریشان نگاہوں سے جمال صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔

''وعلیکم السلام کیسے ہو بیٹا!''

''الحمدللہ! ٹھیک ہوں' آپ کیسی ہیں۔مجھے بتایا بھی نہیں اور شہر چھوڑ دیا؟'' ان کے پاس بیٹھتے ہی اس نے گلہ کیا۔جواب میں وہ بے بس سی۔نظروں کا رخ پھیر گئیں۔

''بس مجبوری بن گئی تھی بیٹے!''

''میں شرمندہ ہوں آنٹی! میں نہیں جانتا کہ اس روز بریرہ نے انوشہ سے کیا کہا' مگر اس روز جو بھی ہوا ہوگا' مجھے اس کی بہت اذیت ہے۔آپ نہیں جان سکتیں میں اس روز کے بعد کتنا اپ سیٹ رہا ہوں بہر حال میں نے بری کو چھوڑ دیا ہے۔'' بہت بڑی بات کو اس نے بہت روانی سے کہہ دیا تھا۔نزہت بیگم ہکا بکا سی اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو۔''

''سچ کہہ رہا ہوں آنٹی! ہمارا اب ایک ساتھ چلنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔''

''مگر کیوں؟ بریرہ اچھی لڑکی ہے۔اگر انوشہ کی وجہ سے کوئی مسئلہ ہو بھی گیا ہے تو اسے درگزر کردو کیونکہ انوشہ کی شادی ہو رہی ہے۔'' ایک پہاڑ اس نے گرایا تھا اور دوسرا نزہت بیگم نے گرا دیا۔وہ چکرا ہی تو گیا تھا۔

''انوشہ کی شادی؟''

''ہاں انوشہ کی شادی! زاور کا بہت اچھا دوست ہے سرمد۔انگلینڈ میں رہتا ہے۔ابھی تک شادی نہیں کی اس نے' انوشہ کے بیٹے سے بھی بہت پیار کرتا ہے۔اسی کے ساتھ ہو رہی ہے۔''

''مگر......!''

''مگر کیا......! ساری عمر گھر بٹھا کر تو نہیں رکھ سکتے اسے!''

اس بار نزہت بیگم کے لہجے میں لچک نہیں تھی۔شاہ زر کو لگا اس کا دل رک جائے گا۔

''کیا انوشہ اس شادی سے خوش ہے؟''

''نہیں۔مگر جلد ہی ہو جائے گی زندگی بھر حالات سے سمجھوتا ہی تو کیا ہے اس نے' اب بھی کر لے گی۔''

وہاں اس کے مزید رکنے کا جیسے کوئی جواز نہیں رہا تھا۔مگر پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری۔

''آنٹی! میں انوشہ کے لیے اپنا پرپوزل پیش کرنے آیا تھا۔''

''جانتی ہوں مگر یہ ممکن نہیں۔''

''کیوں ممکن نہیں ہے؟ میں اس کے لیے بریرہ رحمٰن کو طلاق دے چکا ہوں۔''

''بہت غلط کیا تم نے اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے تمہیں ہم سے بات کرنی چاہیے تھی۔''

''بات ہی تو کرنے آیا ہوں آنٹی! اور غلط بھی کچھ نہیں ہوا۔میرے اور انوشہ کے بیچ اب تک جو ہوتا رہا ہے' وہ غلط تھا آنٹی! اسی غلطی کو صحیح کرنے کی کوشش میں یہاں تک آیا ہوں میں۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ آیئے میرے ساتھ سب بتاتا ہوں۔سوری انکل! میں یہ بات آپ کے سامنے نہیں کر سکتا۔''

اس نے آر یا پار کرنے کی ٹھان لی تھی۔ جمال صاحب اور نزہت بیگم دونوں اس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

اگلے دومنٹ کے بعد وہ علیحدہ کمرے میں نزہت بیگم کو بتارہا تھا۔

''انوشہ کی بربادی کا ذمہ دار میں ہوں آنٹی! اس کے ساتھ جو بھی ہوا وہ میں نے کیا۔ میں نے عین نکاح کے وقت شافیہ کی بے وقوفی کا سبب زاور کو سمجھا اسی لیے انتقام کی آگ میں انوشہ کا وجود جلا دیا۔ میں بہت شرمندہ ہوں آنٹی! ایک پل کا سکون میسر نہیں ہے مجھے وہ بچہ جو میرا خون ہے۔ میں اسے مزید محرومیوں کا شکار نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لیے ساری کشتیاں جلا کر یہاں آپ کی دہلیز پر چلا آیا ہوں۔ خدا کا واسطہ ہے آنٹی! مجھے معاف کردیں اور میری خوشیاں پانے میں میرا ساتھ دیں پلیز!'' شاہ زر کا حال اس وقت کسی سوالی سے مختلف نہیں تھا۔

نزہت بیگم پتھرائی ہوئی بے یقین آنکھوں سے اسے دیکھے گئیں۔

''بہت طمانچے کھالیے ہیں میں نے حالات کے اب مزید کچھ مت کہیے گا آنٹی پلیز! وہ لڑکی صرف میرے لیے بنی ہے۔اسے صرف میں خوش رکھ سکتا ہوں اور کوئی نہیں۔'' وہ سوال کررہا تھا اور نزہت بیگم کے دماغ میں اس کی صرف ایک ہی بات گونج رہی تھی۔

''انوشہ کی بربادی کا ذمہ دار میں ہوں آنٹی۔''

اس بات کے بعد اب کچھ بھی کہنے کی گنجائش رہی ہی کہاں تھی۔ اب جو بھی کرنا تھا بہت سمجھداری سے کرنا تھا انہیں۔

❀❀❀

صاعقہ چارپائی پر بیٹھی تھی۔تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔

''لگتا ہے آگیا تیرا ہیرو۔'' آمنہ نے دستک سنتے ہی سرگوشی کی۔اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔صائمہ اندر کمرے میں پانی نکال رہی تھی۔اس نے دھڑکتے دل سے دروازہ کھول دیا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! آؤ۔'' کتنا خوب صورت لگ رہا تھا وہ اس وقت۔اس کے لیے نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھنا دشوار ہوگیا۔

''سوری! مجھے تھوڑی دیر ہوگئی۔ وہ اصل میں باس نے ایک ضروری کام سے بھیج دیا تھا۔ میں نے ابھی ایک دوست سے بات کرکے گھر کا انتظام کرلیا ہے۔تمہیں جو ضروری سامان لینا ہے وہ لے لو شام تک یہ گھر خالی کردیں گے ہم۔''

''لیکن زین! تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت......''

''چپ! دادی اماں نہ بنی رہا کرو ہر وقت میری۔''

اس کے ہونٹوں پر شہادت کی انگلی رکھ کر کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا تو پاس کھڑی آمنہ نے صاعقہ کو مسکرا کر دیکھا۔ انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنا دیا۔ اگلے ہی پل عباد شرٹ کے بازو فولڈ کیے کمرے سے سامان نکال رہا تھا۔ سمعان کو بخار تھا لہٰذا آمنہ رشک بھری نگاہوں سے صاعقہ کو دیکھتی دوسرے کمرے میں سمعان کے پاس چلی آئی۔

"کون آیا ہے؟" اسے پاتے ہی سمعان نے آنکھوں سے بازو ہٹایا تھا۔ وہ چارپائی کے کنارے پر ٹک گئی۔

"صاعقہ کے آفس سے کوئی صاحب آئے ہیں۔ مدد کے لیے شام تک کہتے ہیں۔ [illegible] ہو جائے گی۔"

"ایان کا پتا چلا کہاں گیا ہے؟"

"نہیں شاید صاعقہ کو پتا ہو' تمہارا بخار کیسا ہے اب؟"

"پتا نہیں تم جاؤ اب اپنے گھر۔ سارا دن اِدھر ہی نہ گھسی رہا کرو۔"

"کیوں نہ رہوں' تمہیں کیا تکلیف ہے میرے گھسے رہنے سے۔"

"مجھے کوئی تکلیف نہیں' تمہارے سسرال والوں کو ہو سکتی ہے۔"

"بھاڑ میں گئے ایسے سسرال والے' میرا سسرال یہی ہے بس!"

"پاگل پن کا مظاہرہ مت کرو' کچھ نہیں دے سکتا میں تمہیں۔"

"مجھے تم سے کچھ چاہیے بھی نہیں' سوائے نام کے سمجھے تم!"

سمعان جانتا تھا وہ اس سے بھی جیت نہیں سکے گا۔ تبھی خاموش ہو گیا۔

"اور ویسے بھی میں اپنی ماں کو منا کر ہی تم سے شادی کروں گی۔ بے فکر رہو تم!" جل کر کہتی وہ اٹھ کر اس کے کمرے کا سامان سمیٹنے لگی۔ سمعان پھر سے آنکھوں پر بازو رکھ کر اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں لگ گیا اور دوسرے کمرے میں صائمہ، عباد کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

"اب تو پریشان نہیں ہونا؟" سارا سامان نکال کر قدرے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ وہ صاعقہ سے پوچھ رہا تھا۔ جواب میں اس نے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

"چلو شکر ہے میں چاہتا تو یہ کام کسی سے پیسے دے کر بھی کروا سکتا تھا۔ مگر مجھے اچھا نہیں لگا۔ [illegible] کہو نا صاعقہ! تو میں ساری دنیا چھوڑ کر آ جاؤں تو صرف ایک لمحے میں' میں ساری دنیا ترک کر کے تمہارا ہاتھ تھام سکتا ہوں۔ بہت بہادر بنا دیا ہے تمہاری محبت نے مجھے سچ میں۔"

"بہت شکریہ!"

"اپنے پاس رکھو اپنا شکریہ اور چلو ایک کپ چائے بناؤ۔ تب تک میں ذرا آنٹی کے پاس بیٹھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے مگر...... وہ چائے کا سامان تو پانی کی نذر ہو گیا۔" کتنی شرمندگی تھی اس وقت اس کے لہجے میں عباد مسکرایا۔

"کوئی بات نہیں سادہ پانی تو پلا سکتی ہو نا پھر آنٹی سے مل کر مارکیٹ چلتے ہیں۔ جو چیز چاہیے ہو لے لینا۔"

"ٹھیک ہے۔" بنا سر اٹھائے وہ زیرِ بار ہوئی تھی۔ عباد ہلکی سی ایک چپت اس کے سر پر لگاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ تبھی صائمہ اس کے پاس آئی تھی۔

"بہت اچھا لڑکا ہے صاعقہ! اگر یہ تمہاری پسند ہے تو یقیناً لاجواب ہے۔"

کتنی اچھی لگی تھی اس وقت اسے صائمہ کے منہ سے عباد کی تعریف یوں جیسے وہ بہت معتبر ہوگئی ہو۔ صائمہ اب چارپائی پر بیٹھی پاؤں کے انگوٹھے سے گیلی زمین کھرچ رہی تھی۔ وہ کچھ لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی' پھر اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے نیچے زمین پر بیٹھ گئی۔

"کیا تم خدا کی رحمت سے مایوس ہونے کا سوچ سکتی ہو صائمہ!"

"نہیں۔"

"تو پلیز ہمت رکھو نا اداس مت ہو' اللہ بہتر کرے گا۔ کہیں نہ کہیں کوئی تو ہوگا نا! جس کے ہاتھوں کی لکیروں میں تمہارا نام ہوگا۔"

"پتا نہیں یار!"

"میرا ایمان ہے' ضرور ہوگا۔ اب جو تھوڑی بہت چیزیں رہ گئی ہیں۔ وہ سمیٹ لو۔ میں زین کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں لے آؤں۔ ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے لے آؤ۔ ایان کب تک آئے گا؟"

"پکا نہیں پتا۔ مگر امکان ہے آج ہی آجائیں گے۔ میں پانی دے آؤں زین کو۔" اچانک یاد آنے پر وہ اٹھی مگر تب تک عباد اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

"بہت بے وقوف لڑکی ہو تم' پانی تک نہیں پلا سکتیں۔"

"سوری۔"

"چھوڑو سوری ووری کو۔ مارکیٹ چلنا ہے کہ نہیں؟"

"بس چل رہی ہوں چادر لے آؤں۔" جلدی سے کہہ کر وہ اندر کمرے میں گئی اور اگلے کچھ ہی منٹوں میں اس کے ساتھ باہر آگئی۔

"دوست کی گاڑی مانگ کر لایا تھا۔ بے چارہ انتظار کر رہا ہوگا۔" صاعقہ کے بیٹھنے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے کہا تو وہ پریشان ہوگئی۔

"کیا ضرورت تھی گاڑی مانگ کر لانے کی......؟ ہم رکشہ یا ٹیکسی سے بھی تو جا سکتے تھے۔"

"مجھے رکشہ یا ٹیکسی کی عادت نہیں ہے۔ ویسے بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' دوست جان دیتے ہیں مجھ پر تم آنٹی کا سناؤ ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"ابھی تو سب ٹھیک ہے۔ وہ جو کینسر کا کہا تھا ڈاکٹر عارف نے وہ سب غلط نکلا۔ الحمدللہ امی کی رپورٹس بالکل ٹھیک ہیں۔ بس گھریلو حالات اور مسائل کی وجہ سے پریشان ہوتی ہیں۔ تو مسئلہ بن جاتا ہے۔"

"چلو شکر ہے خدا کا۔ میں نے منیجر صاحب سے بات کی تھی تمہارے لیے بہت خوش ہیں وہ تمہارے کام سے' اللہ نے چاہا تو اگلے ماہ سے ڈبل تنخواہ ہوگی تمہاری۔"

"کیا......! تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے۔"

ایک پل میں گلاب کی طرح کھل اُٹھی تھی وہ۔ عباد دیکھتا رہ گیا۔

''سرپرائز بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے عزیز از جان! اور ابھی میں مما سے ہماری شادی کے لیے بھی بات کرنے والا ہوں۔''

آج کا دن خوشیوں بھرا تھا۔ اس کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔

''تم بہت اچھے ہو زین! کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں تمہیں سمجھ ہی نہیں سکی۔ تم آسمان ہو اور میں زمین' پھر بھی تمہارا مجھ سے اتنا پیار! سمجھ میں نہیں آتا کن الفاظ میں تعریف کروں تمہاری۔''

''جن الفاظ میں بھی کرو گی' مجھے تو اچھا لگے گا۔'' وہ مسکرایا تو صاعقہ اسے دیکھتی مسکرا کر نگاہ پھیر گئی۔

''کون کہتا ہے زین کہ محبت کا وجود ختم ہو گیا ہے۔ کون کہتا ہے موجودہ وقت کی لڑکیوں کی قسمت میں وفا نہیں رہی۔ دیکھو میرے ہاتھوں میں خوشیوں اور راحت کے کتنے پھول ہیں۔ دیکھو میں کتنی سرخرو ہوں ایک انسان کی محبت میں......! اب مجھے اپنے رب سے اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔''

''شکریہ! اللہ نے چاہا تو بہت جلد تمہارے ہر خواب کی تعبیر دوں گا تمہیں اور اس کے ساتھ ایک بہت خوب صورت سرپرائز بھی۔'' مہارت سے ڈرائیو کرتے اس کے ہاتھوں میں مضبوطی تھی۔

صاعقہ کا دل چاہا وہ ہواؤں میں اڑنے لگے۔ اس روز اس نے عباد کے ساتھ بہت سا وقت بتایا تھا۔ شاپنگ کے ساتھ ساتھ عباد نے اسے رات کا کھانا بھی کھلایا تھا۔ وہ شام اس کی زندگی کی ایک حسین شام تھی۔

عباد گھر آیا تو آسیہ بیگم اس کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔

''مما! آپ ابھی تک سوئی نہیں......؟''

''نہیں! جوان اولاد رات دیر تک گھر سے باہر رہے تو ماؤں کو نیند اور قرار ذرا کم ہی آتا ہے۔''

وہ غیر معمولی سنجیدہ تھیں۔ عباد قدرے پریشان ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''پریشان لگ رہی ہیں۔ سب ٹھیک تو ہے نا!''

''پتا نہیں! لیکن تمہاری وجہ سے میں حقیقت میں بہت پریشان ہوں۔ تمہارے پاپا نے تمہاری شادی طے کر دی ہے اور تم ہو کہ آزاد بیل کی طرح مست بے پروائی کا مظاہرہ کر رہے ہو' کیا چاہتے ہو تم آخر......؟''

''میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتا مما! ہادیہ میری پسند نہیں ہے۔''

''بکواس بند کرو' تم شاید بھول گئے ہو تمہاری مرضی پر ہی ہادیہ سے تمہاری نسبت طے ہوئی تھی۔''

''ہوئی ہو گی مگر اب وہ میری پسند نہیں ہے۔''

''یہ کیا بکواس ہے عباد! تم رشتوں کو مذاق سمجھتے ہو؟''

وہ غصے سے دہاڑی تھیں۔ جواب میں عباد نے محبت سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''آئی ایم سوری مما! میں واقعی بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔ میرا مقصد کسی بھی طرح سے آپ کو اذیت پہنچانا نہیں' مگر آپ میری ماں ہیں اور میں جو بات آپ سے شیئر کر سکتا ہوں اور کسی سے نہیں کر سکتا۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں ہادیہ کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا۔''

”تو یہ بات اپنے پاپا کو بتاؤ مجھے نہیں۔ میرا کوئی اختیار نہیں ہے‘ نہ تم پر نہ ان پر۔“

”اوکے‘ کہہ دوں گا۔“

”بہت بدتمیز ہو گئے ہو تم۔ کون ہے وہ لڑکی جس نے اتنی خود سری سکھادی ہے تمہیں؟“ اچانک لا بھڑکی تھیں۔ عباد نے اس بار گہری سانس بھر کر سر صوفے کی پشت گاہ سے ٹکا دیا۔

”میں کسی کی باتوں میں آنے والا نہیں ہوں مما! اور یہ بات آپ بہت اچھے طریقے سے جانتی ہیں۔“

”پھر اس شادی سے انکار کی وجہ؟“ اس بار آواز اس کے پیچھے سے آئی تھی۔ عباد نے چونک کر گردن موڑی اور صوفے کی پشت پر یاور صاحب کو کھڑے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”السلام علیکم پاپا!“

”وعلیکم السلام برخوردار! کچھ پوچھا ہے میں نے آپ سے؟“ ان کے تیور کڑے تھے۔ عباد کو لگا اگر اس وقت وہ کمزور پڑ گیا تو پھر کبھی ان سے اپنی بات نہیں منوا سکے گا۔ تبھی اس نے لب کچلتے ہوئے رخ پھیرا تھا۔

”میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں پاپا! اور اسے پرپوز بھی کر چکا ہوں۔“

”ہمیں مطلع کیے بغیر۔ کسی بھی اہمیت کے قابل نہیں سمجھا تم نے ہمیں؟“

”ایسی بات نہیں ہے پاپا! میں نے صرف پرپوز کیا ہے نکاح نہیں کیا۔“

”تو وہ بھی کر لو۔ ہم سمجھ لیں گے ہمارا کوئی بیٹا تھا ہی نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسی آپ کی خوشی‘ میں کل ہی یہاں سے شفٹ ہو جاؤں گا۔“

وہ انہی کا بیٹا تھا اور بے حد ضدی‘ یاور صاحب کے ساتھ آسیہ بیگم بھی اس کا منہ دیکھتی رہ گئی تھیں۔ مگر وہ وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔

”سن لیا آپ نے......؟ وہ گھر چھوڑنے کو تیار ہے۔“

”ہوں‘ مگر میں بھی اس کا باپ ہوں۔ اتنی آسانی سے اسے اپنی من مرضی نہیں کرنے دوں گا۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے یاور! اولاد قد میں برابر آ جائے تو ان کے ساتھ زبردستی نہیں چلتی۔“

”جانتا ہوں مگر تم فکر مت کرو۔ ان شاء اللہ وہی ہوگا جو ہم چاہیں گے۔“ ان کے ذہن میں کچھ تھا۔ آسیہ بیگم ان کے ارادے سے بے خبر‘ ساری رات بے چینی سے کروٹ بدلتی رہیں۔ اگلے روز عباد ابھی بے دار نہیں ہوا تھا کہ وہ یاور صاحب کی ہدایت پر اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

عباد کی آنکھ اپنے بالوں میں ان کی نرم انگلیوں کے لمس سے کھلی تھی۔ وہ رو رہی تھیں۔

”مما! آپ یہاں......؟“ فوراً سے پیشتر وہ اٹھ بیٹھا جواب میں آسیہ بیگم نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

”ہاں دیکھنے آئی تھی کہ جس بیٹے کو میں نے اتنی دکھ سے جنم دیا راتوں میں جس کے لیے جاگی‘ وہ آج خود مختار ہو کر کسی ایک لڑکی کے لیے اسی ماں کو چھوڑنے کا فیصلہ کر کے کیسے سکون کی نیند سوتا ہے۔“

”او نو مما! کسی لڑکی کے لیے آپ کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ مگر...... پاپا جو چاہتے ہیں وہ کرنا بھی میرے لیے آسان نہیں ہے۔“

"ٹھیک ہے' تمہارے پاپا کچھ بھی کہتے رہیں مگر میرے لیے میرے چاند کی خوشیوں سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔ جو تم چاہو گے وہی ہوگا۔ بس ابھی خاموش رہو۔ بلکہ مکمل طور سے خود کو کام میں گم کر کے ثابت کر دو کہ تم کسی سے کم نہیں ہو' اگر وہ تمہیں عاق کریں گے تو نقصان اٹھائیں گے۔ کل سڈنی جانا ہے انہیں' ایک ماہ کے ٹور پر میں چاہتی ہوں اس بار ان کی جگہ اس ٹور پر تم جاؤ۔ جب واپس آؤ تو اتنے کامیاب ہو کہ وہ خوش ہو کر ہماری ہر ایک بات تسلیم کرنے کو تیار ہو جائیں۔" عباد کے مضبوط گرم ہاتھوں کو اپنے نرم ہاتھوں میں دباتے ہوئے وہ اس کا ذہن بنا رہی تھیں۔ مما کے ان کے چہرے پر ممتا کے رنگ دیکھتے ہوئے کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک مما! اگر آپ میرے ساتھ ہیں تو جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی ہوگا۔"

"شاباش میری جان! چلو اب جلدی سے اٹھ کر شاور لو اور ناشتا کرو' تب تک میں تمہارے پاپا سے بات کرتی ہوں۔" اس کے اقرار پر بے پناہ خوش ہوتے ہوئے انہوں نے اس کی پیشانی چوم کر جواب میں وہ کمبل ہٹاتے ہوئے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آسیہ بیگم کی محبت اور رضامندی نے اس کے اندر جیسے نئی روح پھونک دی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ فوری صاعقہ کو فون کر کے یہ خوش خبری سنائے پھر خوب صورت سرپرائز کا سوچ کر اس کام کو بھی اپنی واپسی پر اٹھاتے ہوئے اس نے صبح بخیر کہنے کے ساتھ اسے اپنی سڈنی روانگی کی اطلاع دی اور مسرور سا واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

❋❋❋

انزلہ کے قدم جونہی حویلی کے وسیع صحن میں پڑے بہزاد کی ماں اور بابا دونوں کے چہرے پر مسرت دوڑ گئی۔ دادی ماں کا چہرہ البتہ ابھی بھی سنجیدہ تھا۔ وہ حیران سی آگے بڑھ آئیں۔

"آ گئی میری دھی! بڑے مبارک قدم ہیں اس کے......!"

بابا کے لہجے میں اس کے لیے صرف محبت ہی نہیں' توصیف اور ستائش بھی تھی اور یہ توصیف و ستائش کیوں تھی' اس وقت وہ نہیں جان پائی تھی۔

"السلام علیکم! سب ٹھیک تو ہے نا!" قدرے حیران' سب سے پیار لیتی وہ دادی ماں کے پاس میں ٹک گئی تھی۔ بہزاد الٹے پیروں ڈیرے کی طرف بڑھ گیا۔ دادی اب احسن کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔

"ہاں' اللہ کے فضل سے سب ٹھیک ہے بس آج سے تو اس حویلی کی امانت ہوگئی ہے۔ کل فون آیا تھا بہزاد بیٹے کی طرف اسی نے اجازت دی ہے۔"

"کیسی اجازت! اور مما کا بہزاد سے کیا تعلق ہے؟" وہ ساکت ہی تو رہ گئی تھی تاہم اس سے پہلے کہ دادی ماں اسے جواب دیتیں بابا بول اٹھے۔

"تعلق کیسے نہیں ہوگا بیٹے! بتایا تو تھا آپ کے بابا کا بہت گہرا تعلق تھا اس حویلی سے اور آپ تو کھیلا ہی کنیز کی گود میں ہے' جب آپ پیدا ہوئی تھیں تو تبھی میں نے بہزاد کے لیے آپ کو مانگ لیا تھا۔"

"مگر ماما نے مجھ سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔" اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

ے کی رنگت بھی بدل گئی تھی۔ تبھی دادی ماں نے سختی سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

"ہر بات وقت سے پہلے تیرے علم میں لانا ضروری نہیں۔"

"مگر یہاں میری زندگی کی بات ہو رہی ہے دادی ماں!"

"تو کوئی سولی تو نہیں چڑھا رہا ہے تجھے۔ رشتہ ہی پکا کر رہے ہیں پھر اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت ہے؟"

بڑی ماں اور بابا کے سامنے یہ عزت افزائی اسے غرق کر رہی تھی۔ وہ روہانسی سی اٹھ کر حویلی کے کشادہ صحن سے نکل آئی۔ باہر ڈیرے کی طرف بہزاد اپنی گن صاف کر رہا تھا۔ وہ اس کی طرف آئی۔

"بہزاد! یہ سب کیا ہے۔ آپ نے مجھ سے کہا تھا میں اسے اپنی محبت سے انسان بنالوں' ساری برائیاں سارے غلط کام چھڑا دوں اور اب جب کہ وہ ہوش میں بھی نہیں آیا ہے۔ آپ چاہ رہے ہیں میں پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دوں۔ بھٹکنے دوں اسے گمراہی میں تنہا۔"

"ہاں۔"

ٹھہرے جامد لہجے میں اس کی "ہاں" نے پل میں برف کر دیا تھا اسے وہ ہکا بکا سی اس کا منہ تکتی رہ گئی۔

"مگر کیوں؟"

"کیونکہ تم نے ساری دنیا کی بھلائی کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ نہ ہی وہ شخص تمہاری کوششوں سے سدھرنے والا ہے۔"

"مگر پھر بھی میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی فی الحال اسے سہارے کی ضرورت ہے۔"

"تو ہو' اس شخص کے لیے تمہاری اس درجہ ہمدردی میری سمجھ سے باہر ہے انزلہ شاہ!" وہ برہم ہوا تھا۔ انزلہ کو لگا اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔

"سوری بہزاد علی مراد! میں اپنی زندگی کے ذاتی معاملات میں کسی کی بھی پابند نہیں ہوں۔ جیسے پھول بو پر کوئی پہرا نہیں' جھرنوں پر کوئی بندش نہیں' ایسے ہی انزلہ شاہ بھی آزاد ہے۔ وہ شخص اس وقت ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزر رہا ہے اور یہی وہ وقت ہے جب مجھے اس کی مدد کرنی ہے۔ اسے حیوان سے انسان بنانا ہے۔ تم اس کے لیے چاہو تو سمجھوتا کر لو۔ چاہو تو مجھ سے دستبردار ہو جاؤ۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔" اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ پلٹ آئی تھی اور بہزاد علی مراد کی پُرسوچ نگاہیں دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

❋❋❋

دونوں بازو سر کے نیچے ٹکائے بستر پر چت لیٹا وہ جانے کس سوچ کے حصار میں تھا کہ انزلہ شاہ کی کمرے میں آمد نے اسے چونکا دیا۔ خیالوں کا تسلسل ٹوٹا تھا اور اب وہ صرف اسے دیکھ رہا تھا۔

"السلام علیکم!" اداس چہرے پر بہت نرم مسکراہٹ سجا کر اس نے کہا تھا مگر سانول نے جواب نہیں دیا۔ وہ شاید اس سے بہت خفا تھا۔

"تو اب تم سلام کا جواب بھی نہیں دو گے؟ ٹھیک ہے مت دو مگر میں تو پھر بھی یہاں آؤں گی

اور بار بار آؤں گی۔'' وہ مسکرا کر کہتی پاس چلی آئی تھی۔ سانول نے اس بار اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔

''آتی رہنا' میں آج ڈسچارج ہو رہا ہوں یہاں سے۔''

''پاگل ہوئے ہو؟ اتنا بڑا آپریشن ہوا ہے' ابھی ٹھیک نہیں ہوئے اور تم......!''

''ہاں میں ڈسچارج ہو رہا ہوں۔ زخموں کی پروانہ میں نے پہلے کبھی کی تھی نہ اب کروں گا۔ تم رکھو اپنی ہمدردیاں اپنے پاس سنبھال کر۔''

''صرف ہمدردیاں سانول......؟'' کس قدر دکھ سے اس نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ نظریں چرا گیا۔

''پچھلے چند روز سے گاؤں میں بہت سکون ہو گیا ہے۔ لوگوں نے پھر سے اپنے بچوں کو اسکول بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ اب وہ جھولیاں اٹھا اٹھا کر تمہاری موت کے لیے دعا نہیں کرتے۔ کیونکہ انہیں یقین ہے اس بار تم زندہ گاؤں واپس نہیں آؤ گے۔ ہاں' تمہارے مرحوم ڈرائیور کی بیوی اور بیٹیاں ضرور دن رات تمہاری عبرت ناک موت کی دعائیں مانگتی ہیں اور وہ ڈرائیور کا بیٹا اس کی رگوں میں تا حال انتقام کا خون جوش مار رہا ہے۔ سنا ہے راتوں کو نیند نہیں آتی اسے۔ کچھ کھاتا پیتا بھی نہیں ہے۔ اصل میں کسی طاقت ور امیر کے ہاتھوں جب کسی بے کس غریب پر ظلم ڈھایا جاتا ہے تو یہی کیفیت ہوتی ہے سانول! بہت اذیت میں گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے وہ بے کس غریب۔ دنیا کی عدالتوں میں انصاف نہیں ملتا اسے مگر......!''

''تم اپنی بکواس بند کرو گی یا میں کمرے سے باہر نکالوں تمہیں؟'' اس کی توقع کے عین مطابق وہ بھڑکا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

''اب گھاؤ کیسے ہیں تمہارے؟'' اگلے ہی پل اس نے موضوع بدل دیا تھا۔ سانول نے خاموشی سے پلکیں موند لیں۔

''چھوڑوں گا نہیں میں اپنے بڑے بھائی کو' جتنے گھاؤ اس نے میرے وجود پر لگائے ہیں ایک ایک کا حساب لوں گا۔''

''ضرور لینا' دولت اور اقتدار کی سب سے بڑی پہچان ہی یہی ہے کہ خون کے رشتے کو بے حس کر کے بے جان چیزوں کی اوقات بڑھا دیتی ہے اور کتنے مزے کی بات ہے قیس کہ یہ بے جان چیزیں مدتوں یونہی پڑی رہتی ہیں مگر رشتے نہیں رہتے۔''

''خدا کا واسطہ ہے انزلہ شاہ! تم جاؤ یہاں سے۔'' ایک بار پھر وہ بے زار ہوا تو انزلہ خاموشی سے اٹھ کر اس کی دوائیاں چیک کرنے لگی۔ کل بہزاد علی مراد کی حویلی میں جو فیصلہ اس کی تقدیر کا ہوا وہ اس پر بہت دل برداشتہ تھی۔ جانے کیوں کل سے پھر میران شاہ بہت یاد آ رہا تھا اسے جانے وہ کہاں چلا گیا تھا۔ زوبی کے بعد ایک وہی تو تھا جو اسے اندر سے جانتا اور سمجھتا تھا۔

دوائیاں چیک کرنے کے بعد وہ پلٹی تو سانول کو پلکیں موندے بے خبر سوتے پایا۔ نجانے وہ جاگ رہا تھا یا نہیں۔ وہ بنا اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے قریب آ بیٹھی۔

موٹی موٹی بند غلافی آنکھیں۔ مغرور تنی ہوئی تیکھی ناک' کشادہ پیشانی پر بکھرے سیاہ

ل مضبوط چوڑے کندھے‘ بھاری مونچھوں تلے دبے گداز ہونٹ‘ وہ واقعی اس قابل تھا کہ اسے نظر
ر کر دیکھنے کے بعد سراہا جاتا۔ جانے وہ کیوں بھٹک کر رہ گیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم بھی اس کے اندر سے
وایتی جاگیردار کی سوچ تبدیل نہیں کر سکی تھی۔ اس لمحے جانے کیا سوچتے ہوئے اس نے شہادت کی
ل سے اس کی پیشانی‘ پھر ناک‘ پھر ہونٹوں کو چھوا تھا۔

”تم برے ہو سانول شاہ! قابل نفرت ہو لوگوں کے لیے پھر بھی انزلہ شاہ تم سے پیار کرتی
ہے۔“ اس کا لہجہ سرگوشی سے بلند نہیں تھا مگر پھر بھی سانول شاہ نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

”انزلہ شاہ سے کہو‘ مت پیار کرے مجھ سے۔ میں اس کی محبت کے قابل نہیں ہوں۔ بہت برا
انسان ہوں میں۔“

”اسے برے نہیں لگتے وہ تمہیں اپنانا چاہتی ہے قیس!“

”اس کا قیس نہیں رہا اب۔“

”اچھا! تو پھر بچپن کی منگ سے تعلق کیوں توڑا؟ اپنے بھائی کی بات مان کر شادی کیوں نہیں
کر لی؟“

”وہ لڑکی میرے قابل نہیں تھی۔“

”ایسا کب تک چلے گا قیس! کیا تم ساری زندگی خود سے یونہی لڑتے رہو گے؟“

”پتا نہیں‘ مگر یہ طے ہے انزلہ کہ اب کسی خوب صورت خوش گوار زندگی پر میرا کوئی حق نہیں رہا
ہے۔ بابا کے بعد خدائی کا جو نشہ میں نے چکھا ہے وہ اب سکون سے جینے بھی نہیں دے گا۔ میں جانتا
ہوں ایک روز میں انہی پر پیچ راستوں پر بھٹکتے بھٹکتے کسی بدنام دہشت گردوں کی طرح موت کی بے
رحم بانہوں میں چلا جاؤں گا۔ مگر مجھے اب اس کا افسوس نہیں ہے انزلہ! کیونکہ میں جانتا ہوں میں دنیا
کے لیے جتنا بھی قابلِ نفرت سہی مگر اب بھی کوئی ہے‘ جو میرے مرنے کے بعد......!“

اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتا انزلہ شاہ نے سرعت سے ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

”جب تک انزلہ شاہ کے جسم سے روح کا تعلق برقرار ہے قیس! تب تک تمہیں کچھ نہیں
ہو سکتا۔“ ایک دم سے بہت حساس‘ بہت جذباتی ہو گئی تھی۔ سانول شاہ اسے دیکھتا رہ گیا۔

”تمہیں خدائی کرنے میں مزا آتا ہے‘ تم کرو خدائی‘ مگر خدا کا واسطہ ہے سانول! مجھے میرا قیس
واپس کرو۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ہوں خوش نہیں رہ سکتی۔“ وہ رو رہی تھی۔ سانول کا دل
جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

”میں جانتی ہوں قیس! تم بہت اچھے ہو۔ یقیناً تم نے بھی زندگی میں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔
میرا یقین کرو میرا دل تمہارے ہر نقصان پر تازہ زخم کی مانند رس رہا ہے۔ مگر میں تمہیں مزید ان
راہوں کی گود میں سانس لیتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ خوب صورت دن جو ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔
بہت انمول تھے۔ میں انہیں دنوں میں واپس جانا چاہتی ہوں قیس! تمہارے ساتھ ایک خوش گوار
زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ میری تقدیر ہمارے درمیان صدیوں کے فاصلے حائل
کر دے۔ میں تمہیں پا لینا چاہتی ہوں۔ تمہیں یہ احساس دلانے کے لیے ایک عاجز انسان بن کر جینے
میں بھی زندگی بہت خوب صورت ہے۔ میں ساری کشتیاں جلا کر آ سکتی ہوں سانول! پلیز میرے

ہو جاؤ۔" وہ مضبوط سوشل گرل تھی مگر اس لمحے محبت کے احساس میں بکھر رہی تھی۔ سانول نے بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے سرد ہاتھوں کی گرفت سے نکال لیا تھا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے انزلہ! پلیز اس وقت تم جاؤ یہاں سے۔" اس کا کوئی لفظ اس وقت اس پتھر دل انسان پر اثر نہیں کر رہا تھا۔ وہ مایوس سی اٹھ آئی۔

سانول نے اس کے کمرے سے باہر نکلنے پر بے ساختہ گہری سانس بھری تھی۔

کچھ مرحلے وفا کے جفا کے سپرد ہیں
وہ دیپ کیا جلیں جو ہوا کے سپرد ہیں
اس نے بھی اپنی ضد نہیں چھوڑی کسی طرح
ہم کیا کریں ہم اپنی انا کے سپرد ہیں

❋❋❋

دن خاصا ڈھل چکا تھا۔

دور نیلے آسمان پر اڑتے پرندے اب جیسے تھک ہار کر اپنے ٹھکانوں کو واپس پلٹ رہے تھے۔ فضا میں حبس قدرے بڑھ گیا تھا۔ اونچے اونچے درختوں کے سرسبز پتے ساکت تھے۔ دور افق کے اس پار غروب ہوتا سورج' اب اپنی نارنجی کرنیں تیزی کے ساتھ سمیٹ رہا تھا۔ قریب ہی کچے گھروں کے کھلے احاطے میں خواتین اپنے گھریلو فرائض سرانجام دیتی دکھائی دے رہی تھیں۔

گھر سے اسکول جاتے ہوئے انزلہ شاہ نے عجیب تھکی تھکی سی نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہاں بہت دور تک مٹی سے اٹے کچے راستے پر کسی سانول شاہ کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ گاؤں کے لوگ مسرور تھے' مگر اس کا دل جیسے سنسان ہو کر رہ گیا تھا۔ آج کتنے دن ہو گئے تھے اس کی صورت دیکھے۔ اب تو بہزاد علی مراد بھی ملک سے باہر تھا۔ دادی ماں کے رویے میں تھوڑی بہت لچک آئی تھی مگر اب وہ زیادہ خود ہی ان سے بات نہیں کرتی تھی۔

دل جیسے بجھ کر رہ گیا تھا۔

تھکے تھکے سے قدم اٹھاتی وہ قبرستان کے قریب سے گزر رہی تھی جب اچانک ٹھٹک کر رک گئی۔ وہاں قبرستان سے کچھ ہی فاصلے پر درختوں کے جھنڈ کے قریب سانول شاہ کا ڈیرہ تھا اور وہیں درختوں کے جھنڈ کے قریب سے قدرے فاصلے پر وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

وہ سرعت سے اس کی طرف لپکی۔

"قیس!"

اس کی پکار پر سانول شاہ نے بھی آنکھیں کھولنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی تھی۔ ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ ساری دنیا سے بے نیاز وہ کتنا دل کے قریب لگ رہا تھا۔ گو ابھی اس کے زخم پوری طرح سے مندمل نہیں ہوئے تھے مگر پھر بھی وہ گاؤں چلا آیا تھا۔ انزلہ دھڑکتے دل کے ساتھ وہیں اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟"

"ٹھیک ہوں' تم آئیں نہیں دوبارہ۔"

"کوئی فائدہ ہی نہیں تھا آنے کا۔ بلکہ اب تو تمہیں بہت خوش ہو جانا چاہیے ڈیئر کہ میں یہاں سے جارہی ہوں شاید ہمیشہ کے لیے۔"

"کہاں جارہی ہو؟"

"مما کے پاس۔"

"کیوں؟"

"تمہارے "کیوں" کا جواب نہیں ہے میرے پاس، مگر میری تقدیر کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے سانول! شاید جو بھی ہوا اچھا ہی ہوا۔ میں اب بھی تم سے یہ نہیں کہوں گی کہ تم یہ غنڈہ گردی چھوڑ دو۔ کیونکہ میں جانتی ہوں، تمہیں اپنی خوشی، اپنی آن و شان آج بھی ہر شے سے زیادہ پیاری ہے۔ میں کیا اور میری بے لوث محبت کیا۔" بہت دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ تبھی وہ بولا۔

"کیوں جارہی ہو؟"

"شادی طے ہوگئی ہے میری بہزاد علی مراد سے اور اب اسے میرا تم سے میل جول رکھنا گوارا نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو میں خود بھی اب کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی تم سے نفرت کا، نہ محبت کا۔ تمہارا جو دل چاہے وہ کرنا، کوئی منع نہیں کرے گا تمہیں نہیں پوچھوں گی اب کہ تم نے میران شاہ کے ساتھ کیا کیا؟ ادریس شاہ کی بہن گوری کا کیا بنا، وہ کہاں گئی؟ کچھ نہیں پوچھوں گی اب میرا تم سے جو تعلق تھا وہ ایک سہانے خواب کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا اور تمہاری مجھ سے جو نام نہاد محبت تھی وہ ایک بکواس کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔"

"بس! آگے ایک لفظ بھی مت بولنا انزی! میں اپنی محبت کے معاملے میں تمہارا کوئی بہتان برداشت نہیں کروں گا۔" شدتِ ضبط سے اس وقت اس کی آنکھیں خوب سرخ ہو رہی تھیں۔ مگر وہ بالکل سپاٹ چہرہ لیے اس کے مقابل بیٹھی ان آنکھوں میں دیکھتی رہی جہاں اس وقت ایک طوفان مچل رہا تھا۔

"سچ کڑوا ہوتا ہے سانول شاہ! اور تمہاری محبت کا سچ یہی ہے کہ وہ محض ایک بکواس کے سوا اور کچھ نہیں تھی۔"

"چٹاخ۔"

بہت دنوں کے بعد اس نے انزلہ شاہ کی کسی بات پر ضبط کھویا تھا۔ مگر وہ تھپڑ کی شدت سے سرخ گال کے ساتھ بھی مسکرا رہی تھی۔

"تھینکس۔" ڈبڈبائی آنکھوں میں تشکر کا احساس لیے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت آہستگی سے اس نے کہا تھا۔ جواب میں سانول شاہ نے از حد اضطراب کے عالم میں رخ پھیر لیا۔

"میں زندگی میں سب کچھ کھو چکا ہوں انزلہ! سب کچھ گنوا دیا ہے میں نے، سب کچھ۔ مگر تمہیں کھو کر جینے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔ اپنی فضول ضد چھوڑ دو۔ یہاں چھپکلی کی طرح سہم کر دیوار سے لگ جانے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ بس جس کے پاس طاقت ہے وہی سر اٹھا کر زندہ رہ سکتا ہے۔"

''ہمیں ایسی زندگی نہیں چاہیے سانول! ہمیں لوگوں پر اپنی دہشت' اپنی دھاک بٹھا کر جینا۔ یہاں جس کو دیکھو وہی طاقت کے نشے میں چُور مست ہاتھی کی طرح جھوم رہا ہے۔ اپنے کمتر کو دبا کر سکون محسوس کرتا ہے۔ خدا کی زمین پر خدائی کا دعویٰ کرتا ہے۔ ہنستی مسکراتی زندگیوں کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہاں بہت سے دیہات ایسے ہیں سانول جہاں کوئی نہ کوئی چوہدری' کسی نہ کسی میران شاہ پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔ جہاں تعلیم منہ چھپائے رو رہی ہے۔ زہریلی رسمیں فرد واحد کو انسانیت کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر رہی ہیں۔ جہاں زندگی تھک رہی ہے سانول! مگر آج تک کوئی کسی ڈرائیور کا بیٹا' بندوق اٹھا کر ان برائیوں کو جڑ سے ختم نہیں کر سکا ہے۔ کسی وزیر مشیر کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ محض چند گھڑیوں کے لیے ہی سہی۔ کبھی ان دیہاتوں میں آ کر یہاں فراوانی پاتی حیوانیت کا نظارہ کر سکے جہالت کی بھینٹ چڑھتی زندگیوں کے اوراق پلٹ سکے۔ درد سے بھرے دلوں کا حال سن سکے۔ رنج و کرب سے برستی بے بس آنکھوں کے انمول موتیوں کو چن سکے۔ ہم سب مر گئے ہیں قیس! نفسانفسی اور بے حسی کے زہر نے ہم سب کو پتھر کا بنا دیا ہے۔ اب ہم پر اچھے برے موسم اثر انداز نہیں ہوتے۔ کسی کی سسکیاں، کسی کی بد دعائیں ہمارے ذہن کو نہیں جھنجھوڑتیں۔ ہم سب بھنبھوڑ' بھنبھوڑ کر اپنے ہی مسلم بھائیوں کا گوشت کھا رہے ہیں۔ اسی لیے تو اللہ ربّ العزت نے بھی ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ قدم قدم پر ٹوٹتی آفتیں ہمارا نصیب بن کر رہ گئی ہیں۔ جب مر جانا ہی مقدر ٹھہرا تو پھر کیوں نا سرخرو ہو کر مریں۔ کیوں نا اپنے معبودِ حقیقی کے سامنے سرشار ہو کر مریں کہ جس نے ہم سب پر اپنا خاص کرم فرماتے ہوئے ہمیں اپنے محبوب نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب امت میں پیدا فرمایا۔ سانول کیوں نا ہم وہ راستے ہی بند کر دیں جو ہمارے اس معاشرے میں جانے کتنے ہی بے بس نوجوانوں کو غلط منزل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ جب مر جانا ہی ٹھہرا تو کیوں نا اس زندگی کو کسی کی بھلائی کے لیے وقف کر دیں؟'' خوب صورت سیاہ آنکھوں میں اک جوت جگائے وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ جواب میں سانول نے گہری سانس بھرتے ہوئے رخ پھیر لیا۔

''کیا کرنا چاہتی ہو تم؟''

''کچھ نہیں! بس جہالت کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔ بھٹکے ذہنوں کو راہِ راست پر لانا چاہتی ہوں' گمراہ لوگوں کی درست رہنمائی کرنا چاہتی ہوں۔''

''نہیں کر سکو گی تم چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکو گی انزلہ شاہ! کیونکہ جب بھی تم اپنے ان احساسات کو ذہن کے طاقچے سے نکال کر عمل کی دہلیز تک لاؤ گی تمہیں مار دیا جائے گا۔ تمہارے اپنے اس وطن میں تمہارے اپنے لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔ کسی سڑک پر چلتے ہوئے، کسی ان دیکھی گاڑی کے نیچے آ کر کچلی جاؤ گی۔ کسی انجانی سمت سے آتی ہوئی گولی سینے پر کھا کر مر جاؤ گی۔ کسی طاقت کے بم کے پھٹنے سے تمہاری موت ہو جائے گی۔ یہاں کوئی تمہیں سچ کی راہ پر چلنے نہیں دے گا۔ حکمرانی کے نشے میں چُور یہ لوگ تم سے تمہاری زندگی کو چھین لیں گے۔ انزلہ! مار ڈالیں گے تمہیں۔''

یونیورسٹی کے بعد وہ پہلی بار اسے یوں جذباتی دیکھ رہی تھی۔ تبھی لبوں پر مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے بولی۔

”جب مرجانا ہی مقدر ٹھہرا تو کیوں نا سچائی کی راہ گزر پر چلتے ہوئے موت سے ہاتھ ملائیں لیں! بددعائیں لے کر کیوں مریں۔ حبس زدہ فضا میں مزید اندھیرے کیوں بکھیریں؟ ہماری زندگی میں کچھ تو ایسا ہو کہ ہم دنیا سے سرخرو ہو کر جاسکیں۔“

اس وقت انزلہ شاہ کے لہجے میں جو مضبوطی اور آنکھوں میں جو پیاس تھی اس نے سانول شاہ کی ذات پر چڑھے بے حسی اور کٹھور پن کے خول کو توڑ دیا تھا۔ وہ ٹوٹنا نہیں چاہتا تھا مگر انزلہ شاہ نے بالآخر اسے ریزہ ریزہ کر کے توڑ ڈالا تھا۔ تیز سیلاب کی مانند اس کی محبت کے بہاؤ نے اس مضبوط درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ وہ اس کی آنکھ میں مچلتے جدائی کے خوف سے لڑھکتے آنسوؤں سے ہار گیا تھا۔

کوئی زنجیر ہو چاہت کی' چاندی کی' روایت کی
محبت توڑ سکتی ہے
یہ ایسی ڈھال ہے جس پر
زمانے کی کسی تلوار کا سکہ نہیں چلتا
اگر چشم تماشا میں ذرا سی بھی ملاوٹ ہو
یہ آئینہ نہیں رہتا
یہ ایسی آگ ہے جس میں
بدن شعلوں میں جلتے ہیں تو روحیں مسکراتی ہیں
یہ وہ سیلاب ہے جس کو
دلوں کی بستیاں آواز دے کے خود بلاتی ہیں
یہ جب چاہے کسی بھی خواب کو تعبیر مل جائے
دعا جو بے ٹھکانا ہو' اسے تاثیر مل جائے
کسی رستے میں' رستہ پوچھتی تقدیر مل جائے
محبت روک سکتی ہے' سمے کے تیز دھارے کو
کسی جلتے شرارے کو' فنا کے استعارے کو
محبت روک سکتی ہے' کسی گرتے ستارے کو
یہ چکنا چور آئینے کی کرچیں جوڑ سکتی ہے
جدھر چاہے' محبت یہ باگیں موڑ سکتی ہے
کوئی زنجیر ہو اس کو محبت توڑ سکتی ہے

”تو تم نے قسم کھالی ہے کہ تم مجھے میری مرضی کے مطابق جینے نہیں دو گی؟ ہے نا!“ اگلے ہی پل انزلہ کا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا وہ مسکرادی۔

”ہاں! تمہیں شاید یاد نہیں ہے یونیورسٹی پریڈ میں تم نے خود کو میرے سپرد کر دیا تھا۔ تو پھر میری مرضی۔ جس رستے پر بھی چلاؤں۔“

”چلو ٹھیک ہے مگر مجھے میری ڈگر سے ہٹانے کے بعد اگر ساتھ چھوڑا تو معاف نہیں کروں گا

انزلہ!"

"نہیں چھوڑوں گی بس تم میرا ساتھ دینا۔ ہر منزل' ہر گام پر پلیز قیس!"

"ٹھیک ہے۔"

نئے سفر کے لیے نئے عہد ہو رہے تھے اور ادھر تقدیر ان کی بے خبری پر مسکرا رہی تھی۔

❃❃❃

نئے گھر میں شفٹ ہونے کے بعد وہ بہت خوش تھی۔

عباد جیسے شاندار' مخلص شخص کا ساتھ کسی جنت سے کم نہیں تھا اس کے لیے۔ اوپر سے اس کی نوازشیں اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ ہواؤں میں اڑنے لگے۔ گھر میں سب اس کی قسمت پر رشک کرتے نہ تھکتے تھے۔ صائمہ اور آمنہ کی نگاہوں میں الگ ستائش ہوتی تھی۔ اس ایک شخص نے جیسے بہت معتبر کر دیا تھا اسے۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ اب کبھی اس سے بدگمان نہیں ہوگی۔ کبھی شک نہیں کرے گی اس کی محبت پر' ہمیشہ اس کے چرنوں کی داسی بن کر اسے محبت اور راحت دیتی رہے گی۔

عباد کو سڈنی گئے دو ہفتے ہو گئے تھے اور ان دو ہفتوں میں وہ پل پل اس سے رابطے میں رہا تھا۔ دو ہفتوں کے بعد اچانک اس کی طرف سے خاموشی چھا گئی تھی اور اسی خاموشی نے اسے پریشان کیا تھا۔ ایک دن' دو دن' تین دن' صبر کی انتہا ہو گئی تھی۔

اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ بدگمان نہیں ہوگی مگر وہ بدگمان ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ شک نہیں کرے گی مگر وہ شک کر رہی تھی۔ غیر ملک میں' کسی بھی حسینہ کے حسن کا جادو چل سکتا تھا اس پر اور یہ خیال اس کے بدن سے لہو نچوڑنے کو کافی تھا۔ دل کے اندر اس کے خیریت بخیر نہ ہونے کا خدشہ بھی سر اٹھا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز وہ "عباد انڈسٹری" کے مین آفس میں آئی تھی۔ آمنہ اس کے ہمراہ تھی۔

اسی کے ساتھ لنچ بریک سے قبل جب استقبالیہ پر اس نے "زین" کا نام لیا تو وہاں موجود لڑکی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"سوری! یہاں اتفاق سے زین نام کے کوئی صاحب کام نہیں کرتے۔ منیجر صاحب کا نام سعد صدیقی ہے وہ ابھی آئے نہیں ہیں۔ آپ پلیز انتظار گاہ میں چاہیں تو بیٹھ کر انتظار کر سکتی ہیں۔"

ریسپشنسٹ کے الفاظ نے اس کے دل کو جیسے دھچکا لگایا تھا۔ وہ ہکا بکا سی اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

"مگر اس نے تو یہی کہا تھا کہ وہ......!"

"کس نے کہا تھا؟"

ریسپشنسٹ اب اس کی بوکھلاہٹ کو شک کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ روہانسی سی آمنہ کی طرف منہ پھیر گئی۔

"کسی نے نہیں ہم منیجر صاحب کا انتظار کرتی ہیں۔"

بالآخر آمنہ نے لب کھولے تھے۔ صاعقہ آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ جیسے سرد پڑتی جا رہی تھی۔ اگلے پون گھنٹے کے کوفت آمیز انتظار کے بعد انہیں کمپنی منیجر کے آنے کی اطلاع ملی تھی اور عباد

نے یہی بتایا تھا کہ وہ کمپنی منیجر کا اسسٹنٹ ہے۔ یقیناً اسی سے اس کے حال احوال کی خبر مل سکتی تھی۔ اسے اب خود پر اور اپنی بے پروائیوں پر غصہ آ رہا تھا کہ ایک ہی کمپنی میں کام کرتے ہوئے وہ اس کے مقام سے کیوں لاتعلق رہی۔

جانے وہ واقعی وہاں کام کرتا بھی تھا یا نہیں۔ ایک کے بعد ایک خدشہ سر اٹھا رہا تھا اور اس کا دل دھڑک دھڑک کر صرف یہی صدا بلند کر رہا تھا۔

''نہیں وہ ایسا نہیں ہے' مجھے اپنے ربّ پر اور اپنے پیار کی سچائی پر پورا یقین ہے۔ وہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ مجھ سے جھوٹ بولے۔ یقیناً وہ کسی مشکل میں ہوگا۔ یقیناً ریسپشنسٹ کو کچھ بھول رہا ہے۔''

اگلے مزید بیس منٹ کے بعد وہ منیجر کے آفس میں بیٹھی تھی۔

''جی بی بی فرمایئے!''

عام سی شکل وصورت کا حامل ادھیڑ عمر منیجر خاصا خشک بندہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کرتی۔ بہت مشکل سے بول پائی تھی۔

''وہ...... سر وہ مجھے زین یاور صاحب سے ملنا تھا۔ وہ اسی کمپنی میں آپ کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ آج کل سڈنی میں ہیں شاید!''

''آج کل سڈنی میں ہیں تو یہاں کس طرح مل سکتے ہیں آپ کو؟ ویسے بھی میرے کسی اسسٹنٹ کا نام زین نہیں' ضرور آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔''

منیجر کا لہجہ اخلاق سے مبرا تھا۔ عین اسی پل کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور ہادیہ کی سینڈل کی آواز اس کی سماعتوں میں اتری تھی۔

''سعد صاحب! یہ چند فائلز ہیں آج فائنل کرنی ہیں۔ انکل کہہ رہے ہیں۔ آپ ایک نظر انہیں دیکھ لیں تو آج بھجوا دیتے ہیں۔'' منیجر اس کی آمد پر فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔ تبھی صاعقہ نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ تنگ ٹراؤزر پر انتہائی شارٹ قمیص اور گلے میں لٹکتا دوپٹا اس کے ماڈرن ہونے کے ساتھ اس کی حیثیت و مقام بھی عیاں کر رہا تھا۔ تاہم وہ اسے فوری پہچان گئی تھی۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے عباد نے اپنے باس کی بیٹی کہہ کر متعارف کروایا تھا۔ دوسری طرف وہ لڑکی بھی اسے پہچان گئی تھی تبھی اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک گئی۔

''تم...... یہاں......؟''

کیا نہیں تھا ان دو لفظوں میں؟ اسے لگا وہ بھرے بازار میں ننگے سر ہو گئی ہو۔

''انہیں میرے کمرے میں بھیجیں سعد صاحب! بہت اہم مہمان ہیں یہ ہماری۔'' استہزائیہ نگاہوں سے عجیب سی جلن چھلکاتی وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے بولی اور اگلے ہی پل منیجر کے کمرے سے باہر نکل گئی۔

صاعقہ کو لگا جیسے آج کا دن طلوع ہی اسے ذلیل کرنے کے لیے ہوا ہے۔ وہ اب وہاں آنے پر پچھتا رہی تھی۔ جانے ابھی آگے اور کون سی سچائی اس کا منہ چڑانے کو تیار بیٹھی تھی۔

منیجر نے اسے ہادیہ کے کمرے میں بھجوا دیا اور وہ جیسے ان دونوں کی منتظر ہی تھی۔

عباد یاور کی بہت خوب صورت سی' فریش تصویر اس کی ٹیبل پر سیٹ تھی۔ صاعقہ وہ تصویر وہاں دیکھ کر مزید الجھ گئی۔ عین اسی پل یاور حیات صاحب وہاں کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

''انکل! یہ کچھ گیسٹ آئے ہیں آپ کے عباد صاحب سے ملنے۔'' بنا انہیں بیٹھنے کی آفر کیے اس نے کھڑے کھڑے گولا داغ دیا تھا۔

یاور صاحب اس کی اطلاع پر چونکے تھے۔

''کون ہے یہ......؟''

''وہی' آپ کے عباد کی اسپیشل فرینڈ جسے اس روز ریستوران میں دیکھا تھا میں نے اور شاید وہی لڑکی جس کی وجہ سے آج کل وہ بزنس سے بے پروا ہو رہا ہے۔''

کتنا عجیب اور الجھا ہوا تعارف تھا اس کا۔ صاعقہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ آخر وہ اسے عباد نام کے شخص سے کیوں منسوب کر رہی ہے۔ آمنہ الگ پریشان اور حیران ہو رہی تھی۔

یاور صاحب اب خاصی تنقیدی نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔

''بیٹھو!'' حکم یوں تھا جیسے وہ ان کی زرخرید غلام ہو۔

وہ دونوں ازحد کنفیوز سی بیٹھ گئی تھیں۔ جواب میں وہ بھی ان کے مقابل ٹک گئے۔

''شکل سے تو دونوں شریف گھرانے کی لگتی ہو پھر ہوٹلوں میں پرائے لڑکوں کے ساتھ ماں باپ کی عزت اچھالتے ہوئے شرم نہیں آتی؟''

اگلے ہی پل سگار جلاتے ہوئے انہوں نے جیسے اسے زندہ درگور کیا تھا۔ وہ رو پڑی۔

''معاف کیجیے گا سر! آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم ویسی لڑکیاں نہیں ہیں جیسی آپ سمجھ رہے ہیں۔'' یہاں بھی آمنہ نے شدید برہم ہو کر لب کھولے تھے۔

صاعقہ کا دماغ تو جیسے کام ہی نہیں کر رہا تھا۔

''عباد کو کیسے جانتی ہو تم؟'' اگلے ہی پل وہ پھر اس کی روح کو رگید رہے تھے۔ اس بار صاعقہ نے سر اٹھایا تھا۔

''کون عباد......؟''

''اللہ رے معصومیت! عباد ان کا بیٹا' اس کمپنی کا مالک۔ وہی شخص جس کے ساتھ اس روز تم وہاں ریستوران میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔'' اس کے حیرانی سے پوچھنے پر ہادیہ نے آگ برساتے لہجے میں جواب دیا۔ صاعقہ کو لگا جیسے وہ کسی پہاڑ کے نیچے آ گئی ہو۔

''وہ عباد نہیں تھا۔ زین تھا' زین اس کمپنی کا ایک معمولی سا ورکر۔''

''جسٹ شٹ اپ زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ عباد تھا۔ میرا منگیتر۔'' حلق کے بل چلاتے ہوئے اس کا بس نہ چلتا تھا کہ صاعقہ کا چہرہ نوچ لیتی۔ یاور صاحب کے ماتھے کے بلوں میں بھی اضافہ ہوا تھا۔

''میں جھوٹ نہیں بول رہی اس نے اپنا نام زین ہی بتایا تھا۔''

''جھوٹ بولا تھا اس نے تم جیسی لڑکیوں کی کمی نہیں ہوتی امیرزادوں کو۔ کان کھول کر سن لو لڑکی! عباد کی بات ہادیہ بیٹی سے طے ہے اور شادی بھی عنقریب اسی کے ساتھ ہوگی۔ تم اپنا وقت

کی اور برباد کرو۔ پہلے ہی تمہاری وجہ سے بہت نقصان کر دیا اس نے کمپنی کا۔ سمجھیں تم......!" اس کے لبوں سے نکلنے والا ہر لفظ کسی نشتر سے کم نہیں تھا اس کے لیے۔ کوئی عرش سے فرش پر آتا ہے، یہ اس لمحے صاعقہ احمد سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ چلا چلا کر اپنی ملال دے۔ روئے اور اپنے ساتھ ہوئے فریب کا گلہ کرے مگر اب اس کا فائدہ ہی کیا تھا۔

اس کے اور یاور حیات صاحب کے درمیان محض ایک ٹیبل نہیں دولت اور حیثیت کی بلند فصیل تھی۔ جس کے اوپر سے جھانک کر انہیں دیکھنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ کیونکہ عباد یاور کے جھوٹ اور فریب نے بہت پستہ قد کر دیا تھا اسے۔

آمنہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کروا دیا۔ اتنی تذلیل اس جیسی لڑکی کے لیے کافی تھی۔

اس وقت وہاں اس کے محض خواب نہیں ٹوٹے تھے۔ بلکہ وہ خود بھی ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔

جسم میں اتنی سی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ خود سے اٹھ کر کھڑی ہی ہو جاتی۔ لبوں پر چپ کا قفل لگائے خود سے کھڑے ہونے کی کوشش میں وہ لڑکھڑا کر رہ گئی تھی۔

اس روز اگر آمنہ عباس اس کے ساتھ نہ ہوتی تو شاید وہ صحیح سلامت گھر نہ پہنچ پاتی۔

❁❁❁

آؤ اداس راتوں میں
دل کی بستی میں آ کے دیکھو
ہر ایک رستہ، ہر اک دریچہ
تمہاری چاہت کا منتظر ہے
فلک سے تکتا ہے چاند تم کو
ستارے تم کو بلا رہے ہیں
مجھے گماں ہے تمہارے دل میں
گئے دنوں کے ملال ہیں کچھ
نئی رُتوں کے سوال ہیں کچھ
نئے سفر کے خیال ہیں کچھ
اگر یہ سچ ہے تو میری مانو
پرانے رستوں پہ لوٹ آؤ
پرانی بستی میں کوئی اب تک
تمہاری آمد کا منتظر ہے

"انوشہ......!"

گھر واپسی کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی جب نزہت بیگم کی پکار نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ چاند کو گود سے اتارنے کے بعد وہ ان کی طرف پلٹی تھی۔

"جی۔"

''کہاں تھیں صبح سے۔'' بہت چونکا دینے والا سوال اور لہجہ تھا ان کا۔ وہ جی بھر کے آزردہ ہوئی۔

''ملازمت کی تلاش میں گئی تھی۔''

''کیوں۔ ایسی کیا مشکل آن پڑی تم پر جو چند ہزار کی نوکری کے لیے سڑکوں پر دھکے کھا رہی ہو؟''

''آپ کو نہیں پتا۔ کیا مشکل پڑی ہے مجھ پر۔'' اس کی آنکھوں کے کٹورے پل میں آنسوؤں سے لبریز ہوئے تو نزہت بیگم نے رخ پھیر لیا۔

''ایسی کوئی انہونی نہیں ہوئی تمہارے ساتھ کہ زندگی کا سوگ ہی کم نہ ہو۔ بہر حال میں نے تمہاری بات طے کر دی ہے۔ اسی جمعہ کو نکاح اور رخصتی ہے تمہاری۔ جو تھوڑی بہت تیاری کرنی ہے کرلو۔'' جس طرح موت کی سزا سناتے ہوئے کسی جج کے لہجے میں بے رحمی در آتی ہے بالکل ویسا ہی لہجہ نزہت بیگم کا بھی تھا۔ انوشہ پھٹی پھٹی آنکھوں میں بے یقینی کے ساتھ انہیں دیکھتی رہ گئی تھی۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی زندگی کی کوئی انہونی ہونی تھی۔

یہ کیسا داغ لگا تھا زندگی کے دامن پر جس کا رنگ پھیکا ہی نہیں پڑ رہا تھا۔

اس کی آنکھو سے آنسو کا ایک قطرہ ٹوٹ کر زمین پر گرا تھا۔

''میں یہ شادی نہیں کروں گی۔''

''بس بہت میں' میں کر لی تم نے اور بہت برداشت سے کام لے لیا ہم نے۔ اب اور نہیں۔ جب میری عمر میں آؤ گی تو پتا چلے گا تمہیں کہ یہ اذیت کیا ہوتی ہے۔ جوان بیٹی کی ناکام ازدواجی زندگی کا دکھ رات کی پرسکون نیند حرام کر دیتا ہے ماں باپ پر تمہیں دس بیس سال کی زندگی کا اعتبار ہوگا انوشہ! مجھے ایک پل کی زندگی کا بھروسا نہیں ہے۔ تمہارے بابا کی صحت بھی گرتی جا رہی ہے۔ میں مرنے کے بعد صدف کی روح سے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔ تو نے جہاں اتنی قربانیاں دی ہیں وہاں ایک قربانی اور سہی۔'' کیا نہیں تھا نزہت بیگم کے لہجے میں۔ بے رحمی' اکتاہٹ' حق' ہمدردی' تفکرات' عاجزی۔

انوشہ کو لگا اس کی سانس جیسے سینے میں پھنس کر رہ گئی ہو۔ جانے زندگی کو ابھی اس سے اور کتنے امتحان مطلوب تھے۔ اس رات کا ایک ایک پل آنکھوں میں بسر کیا تھا اس نے۔ شدید ٹھنڈ کے باوجود ساری رات کمرے کی کھڑکی کھلی رہی تھی۔ چاند نزہت بیگم کے پاس تھا لہٰذا رات پھر بنا کمبل کا سہارا لیے وہ کمرے میں صوفے سے ٹیک لگائے قالین پر بیٹھی رہی تھی۔ اس کی دانست میں وہ سرمد خان سے منسوب کی جا رہی تھی۔ مگر پھر بھی ایک عجیب سی بے چینی تھی کہ کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ نزہت بیگم اور جمال صاحب اس کے نکاح کے فوری بعد انگلینڈ واپس جانے کا پروگرام طے کیے بیٹھے تھے۔ تاکہ وہاں زاہد کے گھر اور آفس کی خود بہتر دیکھ بھال کر سکیں اور یہ انوشہ کے لیے قدرے اطمینان کی بات تھی کیونکہ سرمد سے نکاح کے بعد اس کا اپنا فیصلہ بھی ہمیشہ کے لیے وہ ملک چھوڑ دینے کا تھا۔ جس کی فضاؤں میں اس کے لیے سوائے درد کی آمیزش کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

❋❋❋

''الم' اہلِ روم مغلوب ہوں گے نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد جلد

غالب ہوجائیں گے چند ہی سال میں پہلے بھی اور پیچھے بھی خدا ہی کا حکم ہے اور اس روز مومن خوش ہوجائیں گے۔ اور وہ جسے چاہتا ہے مدد دیتا ہے اور وہ غالب و مہربان ہے۔ یہ خدا کا وعدہ ہے اور خدا اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے یہ تو دنیا کی ظاہری زندگی ہی کو جانتے ہیں اور آخرت کی طرف سے غافل ہیں تو کیا انہوں نے اپنے دل میں غور نہیں کیا کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان کو اپنی حکمت سے ایک وقت مقرر تک کے لیے پیدا کیا ہے اور بہت سے لوگ اپنے پروردگار سے ملنے کے قائل نہیں تو کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر نہیں کی؟ سیر کرتے تو دیکھ لیتے کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے ان کا انجام کیسا ہوا؟ وہ ان سے زور اور قوت میں کہیں زیادہ تھے اور انہوں نے زمین کو جوتا اور اس کو ان سے زیادہ آباد کیا تھا جو انھوں نے کیا اور ان کے پاس ان کے پیغمبر نشانیاں لے کر آتے رہے تو خدا ایسا نہ تھا جو ان پر ظلم کرتا' بلکہ وہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔ پھر جن لوگوں نے برائی کی ان کا انجام بھی برا ہوا کہ یہ خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے اور ان کی ہنسی اڑاتے تھے۔"

پارہ نمبر 21 کی سورہ الروم کا ترجمہ پڑھتے ہوئے اس کا دل جیسے کٹ رہا تھا۔ کیسی کیسی قوموں کے عروج اور زوال کی داستان اور حالات نہیں تھے اس مقدس کتاب میں۔ خدائے بزرگ و برتر نے کیسے کیسے صاف کھول کھول کر اپنے بندوں کو غلط اور صحیح سے باخبر نہیں کیا تھا۔ کیسی کیسی خوب صورت مثالیں پیش نہیں کی تھیں انہیں سمجھانے کے لیے۔ پھر بھی جہالت کا اندھیرا تھا کہ چھٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ غفلت اور گمراہی کا پردہ تھا کہ چاک ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ کیوں......؟ اگر خدا چاہتا تو اپنا ذکر نہ کر کے سونے والے مٹی کے پتلوں کی آنکھوں سے شب کی پرسکون نیند چھین لیتا۔ پھر چاہے کوئی گولیاں پھانکتا یا رات بھر کروٹیں بدلتا۔ وہ میٹھی نیند کی نعمت عطا نہ کرتا کوئی تھا جو اس پاک و بے نیاز ذات کو اس کے اس ارادے سے باز رکھ سکتا؟ نہیں......! پھر بھی اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کیوں؟ کیونکہ رحم اور کرم اس کی صفات ہیں۔ کائنات میں کوئی اس سے بڑھ کر معاف کرنے والا' درگزر کرنے والا نہیں اپنے بندوں کی خطائیں دیکھ کر بھی وہ اپنی عطائیں کم نہیں کرتا۔ ایسے پیارے مہربان رب کی نافرمانی اس کے احکام کی خلاف ورزی خود انسان کے اپنے ہی حق میں خسارہ ہے اور یہی بات وہ اس سورہ میں اپنے بندوں کو سمجھا رہا تھا۔ کیا تھے یہ سرکش غفلت میں پڑے ہوئے لوگ خاک کے ذرے کے برابر بھی تو نہیں۔ اپنی حیثیت' اپنی دولت' اپنے منصب پر گھمنڈ کر کے اکڑ کر چلنے والے ان لوگوں سے کہیں افضل' طاقتور' مٹی ہو گئے تھے۔ تو پھر یہ لوگ کس دھوکے میں جی رہے تھے؟

شاہد حسین! جس نے کبھی اسے کوئی خوشی نہیں دی ہمیشہ حقیر اور پاؤں کی جوتی ہی سمجھا' مگر خود اس کا اپنا انجام کیا ہوا۔ حقیقی مالک کے احکام و فرمان سے غفلت برت کر بدبودار مٹی سے بنے اپنے باس کی فرمانبرداری میں جان قربان کرتے ہوئے اسے توبہ کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ ملتا بھی کیوں۔ وہ محض نافرمان ہی نہیں مشرک بھی تھا۔ اس نے بدبودار مٹی سے بنے انسان کی تابعداری میں اپنی آخرت داؤ پر لگا دی تھی۔ کتنے مواقع دیے اس کے حقیقی مالک نے اسے توبہ کے' مگر وہ ظلم اور سرکشی میں مست اپنی طاقت پر مغرور کبھی سنبھلا ہی نہیں' آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ یوں کہ بہرہ' اندھا' گونگا ہو گیا۔ جان کنی کے عالم میں عینی شاہدین کے مطابق اس نے بار بار کلمہ پڑھنے کی کوشش

کی تھی مگر وقت آخر میں اس کی زبان سے ادا ہی نہیں ہو پایا۔
عشق مجازی ہو یا حقیقی' اس میں شرک کی کوئی معافی نہیں' محبت کا پہلا اصول ہی وحدانیت ہے۔ مگر یہ کوڈ بہت کم لوگ سمجھ پاتے ہیں۔ شاہد حسین بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ اسی لیے تو دونوں جہان کی سرخروئی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔
آج کتنے دنوں کے بعد اسے شاہد حسین یاد آیا تھا اور شاہد حسین کے ساتھ کتنی اور بہت سی یادیں جڑی تھیں۔ گاؤں شاہ والا کی ہر گلی' ہر کوچے' ہر گھر کی یاد۔ کتنے دنوں سے شاہ زر نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ جب بھی وہ گھر آتا وہ سو رہی ہوتی یا تلاوت قرآن پاک میں مشغول ہوتی۔ جواباً وہ اسے ڈسٹرب کیے بغیر ملازمہ سے ہی اس کا حال احوال دریافت کر کے کمرے سے باہر چلا جاتا۔ گوری کی خواہش و فرمائش پر اس نے اس کے لیے ایک ایسی اکیڈمی کا انتظام کر دیا تھا جہاں وہ مسلمان بچوں کو قرآن پاک کی تفسیر کا علم دے سکتی۔ وہ دولت بانٹ سکتی کہ جس کا نعم البدل کوئی نہیں تھا اور آج اسی اکیڈمی میں اس کا پہلا دن تھا اور وہ خوشی سے بے حال تھی۔ فی الحال وہاں چند بچے ہی آ سکے تھے وہ بھی شاہ زر کی وساطت سے کہ موجودہ وقت کی اپر کلاس سوچ کی حامل ماؤں اور گھرانوں کے لیے قرآن پاک کی تفسیر سے کہیں زیادہ۔ انگلش لٹریچر اور انگلش سکھنے سکھانے والی اکیڈمیوں میں زیادہ دلچسپی تھی۔ انہیں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ان کی اولاد اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد ان کی میت پر دعائے جنازہ پڑھ سکے گی کہ نہیں۔ ان کے مرنے کے بعد ان کی روح کے ایصالِ ثواب کے لیے کوئی پارہ' کوئی تسبیح پڑھ کر بخشے گی کہ نہیں۔ شاید انہیں اس میٹھے پھل کی ضرورت تھی بھی نہیں۔ ضرورت تھی تو فنا ہو جانے والی دنیا میں جھوٹی واہ واہ اور عزت و توقیر کی۔ تبھی خونِ جگر سے سینچ کر پروان چڑھنے والی اولاد کو وہ کڑوے پھل کے درخت بنا رہی تھیں۔ جیسی آمدنی تھی ویسا ہی خون زندگی بن کر ان کے بچوں کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ اپنے اصل سے قطعی بے نیاز' مالک حقیقی کے ہر فرمان کو نظر انداز کیے اپنے طور سے انہوں نے خود کو جہنم میں اوندھا لیٹنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔
گوری اب بچوں سے ان کا تعارف لے رہی تھی۔ کومل پھولوں جیسے وہ ننھے فرشتے' اعلیٰ گھرانوں کے چشم و چراغ ہی تھے۔ ان میں سے ایک کا نام معاذ تھا۔ ایک صالح تھا۔ ایک کا نام جواد تھا۔ ایک ریان اور ایک فہد سب کے مزاج اور اطوار مختلف تھے۔ معاذ کم گو شرمیلا بچہ تھا تو صالح ذرا سہما' جواد ایک نمبر کا ہوشیار اور شرارتی تھا۔ جب کہ ریان بے حد فرمانبردار محبت کرنے والا بچہ تھا۔ فہد کو البتہ وہ سمجھ نہیں پائی تھی وہ بروکن فیملی سے تھا اور بہت کم جواب دے رہا تھا اس کی کسی بات کا' گوری اسے نظر انداز نہیں کر پائی تھی۔ معصوم ذہنوں کو حقیقی آگاہی دینے کے لیے اس نے سب سے پہلے ایک چھوٹے سے واقعے کا سہارا لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ انسانی ذہن بھی کسی کاشت ہونے والی زمین کی طرح ہوتا ہے۔ اگر ہم کسی زمین کو ہموار اور گداز کیے بغیر اس میں اعلیٰ سے اعلیٰ بیج بھی بو دیں تو بہترین فصل حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اللہ ربّ العزت کی حقیقی محبت سے دور اس کے گمراہ بندوں کو بھی ایک دم کسی کوشش کے تحت راہِ راست پر نہیں لایا جا سکتا۔ بہترین نتائج حاصل کرنے کے لیے اللہ ربّ العزت کے کرم خاص کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن کی زمین کی ہمواریت

بھی ضروری ہے۔

صاف ستھرے کشادہ کمرے میں قالین پر بچوں کے ساتھ بیٹھی وہ اب ان سے پوچھ رہی تھی۔

"معاذ کیا آپ نے قرآن پاک پڑھا ہے؟"

"جی ٹیچر۔"

"اور باقی لوگوں نے؟" اب اس نے سب کی طرف دیکھا تھا۔ سب نے ایک ساتھ کورس میں جواب دیا تھا۔

"ہم نے بھی پڑھا ہے ٹیچر!"

"لیکن میں نے ابھی پورا نہیں پڑھا۔" ریان نے فوراً منہ بسورا تو وہ مسکرا دی۔

"کیوں' آپ نے پورا کیوں نہیں پڑھا ابھی تک۔"

"وہ حافظ صاحب نے مجھے تھپڑ مارا تھا تو مما نے ان کی بے عزتی کر کے انہیں نکال دیا۔ پیسے بھی نہیں دیے ان کو۔"

"صرف ایک تھپڑ کی وجہ سے۔"

"جی ٹیچر۔" بچہ نادم تھا۔ گوری کا دل دکھ سے بھر گیا۔ "ٹیچر میری مس نے بھی کلاس میں میری انسلٹ کی تھی۔ میرے پاپا نے ان پر کیس بنوا دیا۔ مس دوبارہ اسکول نہیں آئیں۔" ریان کی بات پر معاذ کو بھی اپنا قصہ یاد آ گیا تھا۔ وہ دکھ سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ بے ساختہ اس لمحے اسے استاد کی عزت وحرمت پر حضرت علیؓ کے اقوال یاد آئے مگر وہ اپنے درس کے پہلے ہی دن بچوں کو ان کے گمراہ والدین سے متنفر کرنا نہیں چاہتی تھی' تبھی نظر انداز کر گئی۔

"ایک کہانی سنو گے بچو!"

"جی ٹیچر!"

"ایک بزرگ تھے بہت نیک' بہت اللہ والے اپنی جوانی میں ہی انہوں نے دنیا ترک کر کے ایک اونچے پہاڑ پر بسیرا کر لیا۔ وہاں وہ سارا دن اللہ کی عبادت کرتے۔ جوانی سے بڑھاپا آ گیا۔ مگر ان کا معمول نہیں بدلا۔ ایک دن شیطان نے ان کے دل میں یہ خیال ڈالا کہ انہوں نے ساری زندگی اللہ کی عبادت کی ہے لہٰذا وہ ضرور جنت میں جائیں گے۔ جب ان کے دل میں یہ خیال آیا تو اللہ نے اپنے اس نیک بندے سے پوچھا۔

"اے میرے بندے! تو نے ساری زندگی میری عبادت کی۔ مجھے یاد کیا تاکہ تو آخرت میں اللہ کو پا سکے۔ میں تجھے اپنے عذابوں سے محفوظ رکھوں یہ سب تو تُو نے اپنے لیے کیا میرے لیے کیا کیا؟"

بزرگ اللہ رب العزت کی طرف سے اس سوال پر لاجواب ہو گئے۔ واقعی جو عبادت انہوں نے کی تھی وہ تو صرف اپنے لیے کی تھی۔ تاکہ انہیں اللہ رب العزت کی محبت حاصل ہو جائے اور وہ جنت میں جائیں اس میں اللہ کے لیے تو کچھ بھی نہیں تھا۔"

بچے انہماک سے اس کی بات سن رہے تھے۔ جب وہ سانس لینے کو رکی اور پھر بولی۔

"جب اللہ نے بزرگ سے پوچھا کہ تُو نے میرے لیے کیا کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئے اور سوچ

سوچ کر خوب نادم ہوئے کہ انہوں نے ساری زندگی اللہ کے لیے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ تب انہوں نے اللہ سے پوچھا۔ اے میرے پاک پروردگار میں نے جو کیا تجھے پانے کے لیے کیا تیری رضا اور خوشنودی کے لیے کیا۔ مجھے بتا میں اور کیا کروں کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ تب اللہ ربّ العزت نے فرمایا میری رضا کے لیے میرے بندوں کے پاس جا اور ان کے کام سنوار انہیں راضی کر جنت تو میں تجھے اپنے رحم و کرم سے بھی عطا کر دوں گا۔ دیکھا... ! یہ محبت کا حقیقی رنگ ہے۔ اس کائنات میں اللہ ربّ العزت کی اپنے بندوں سے محبت کے سوا اور کوئی چیز خالص نہیں۔''

''ٹیچر میں اللہ سے محبت کروں گا اور اس کی رضا کے لیے حافظ صاحب سے بھی معافی مانگ لوں گا۔'' ریان پر اس کے لیکچر کا اثر ہوا تھا۔ وہ اطمینان سے مسکرا دی۔

''شاباش! خوب جان لو ریان! ہر وہ کام جو ہمارے لیے خواہ کتنا ہی ناپسندیدہ یا مشکل ہو اگر ہم اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں تو وہ پاک و بے نیاز اسی کام میں ہماری بہتری اور بھلائی رکھ کر اسے ہمارے لیے مبارک کر دیتا ہے۔''

''ٹیچر، پھر ہم نماز نہ پڑھیں۔'' اب کے جواد نے سوال اٹھایا۔

''کیوں؟'' وہ قدرے حیران ہوئی تو وہ بولا۔

''آپ نے خود ہی تو بتایا ہے اللہ اگر چاہے تو اپنے بندے کو اپنی رحمت سے جنت عطا کر سکتا ہے۔''

''بے شک، مگر اس کی رحمت کا حق دار ہونے کے لیے اس کا فرمانبردار بندہ ہونا بھی تو ضروری ہے۔ بھلا جس سے محبت کی جاتی ہے کیا اس سے قریب ہونے کو دل نہیں چاہتا۔ اس کی ہر بات ماننے کو دل نہیں چاہتا۔''

''چاہتا ہے ٹیچر! میں پاپا سے بہت پیار کرتا ہوں۔ اس لیے ان کی ہر بات مانتا ہوں۔''

''اور میں اپنے چاچو سے وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں ٹیچر! کیا آپ میرے چاچو کو بھی ایسی پیاری پیاری کہانیاں سنا سکتی ہیں۔ وہ نماز نہیں پڑھتے۔'' ریان کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی تھی۔ گوری اس کی معصومیت پر مسکرا دی۔

''نہیں، مگر جو بات آپ یہاں سے سیکھیں وہ خود اپنے چاچو کو بھی بتا دیا کریں۔ ٹھیک ہے۔''

''جی ٹیچر! ریان نے فرمانبرداری دکھائی تھی اس نے اس کے گال کا بوسہ لیا۔ اکیڈمی سے گھر آئی تو شاہ زر اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ وہ اسکارف مزید ٹھیک کرتی اسی کی جانب بڑھ گئی۔

''السلام علیکم شاہ بھائی! کیسے ہیں آپ؟''

''وعلیکم السلام، میں تو ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ کہاں رہتی ہو آج کل۔ حال چال پوچھنے سے بھی گئیں۔''

''بس اپنے ربّ کو راضی کرنے میں لگی ہوئی ہوں بھائی! آپ سنائیں کچھ بات بنی۔''

''ہوں، آج آفس میں جمال انکل کا فون آیا تھا۔ اسی جمعہ کو نکاح کا پروگرام فائنل ہے۔''

''کیا انوشہ مان گئی۔''

''پتا نہیں، بہرحال میری بہن ہونے کے ناتے اب جو کرنا ہے تم ہی نے کرنا ہے۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں بھائی! اللہ رب العزت نے چاہا تو سب بہتر ہوگا۔''
''اللہ تمہاری زبان اور قدم مبارک کرے۔ اب آرام کروں گا۔ بہت تھکن ہو رہی ہے۔''
''جی بہتر!''

شاہ زر کے اٹھنے پر وہ بھی مودب سی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جمعہ کب آ گیا پتا ہی نہیں چلا۔ پھر شاہ زر کے ساتھ اس نے انوشہ کے لیے بہت سی قیمتی چیزیں خریدی تھیں۔ انوشہ کو گمان بھی نہیں تھا کہ وہ کس کی زندگی کا حصہ بننے جا رہی ہے۔ نا اس نے نزہت بیگم سے پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ مسلسل کمرا نشینی نے اسے اس سوچ و خیال کی طرف آنے ہی نہیں دیا تھا۔ یہ پہاڑ تو عین نکاح کے وقت گرا تھا۔ جب وہ مہمانوں کے بیچ گھر کر بیٹھی تھی اور مولوی صاحب اس سے سائن لے رہے تھے۔ تو انہوں نے پوچھا۔

''شاہ زر ولد آزر آفندی بحق مہر پانچ لاکھ سکہ رائج الوقت آپ سے نکاح کے خواہاں ہیں کیا آپ کو قبول ہے؟''

ہلکے پھلکے میک اپ سے جگمگاتا چہرہ جیسے کسی طوفان کی زد میں آیا تھا۔ اس نے تڑپ کر نزہت بیگم کی طرف دیکھنا چاہا مگر وہ وہاں نہیں تھیں۔ یہ کیسی سزا تھی۔ کیا امتحان تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ایک لمحے میں سارے جسم پر جیسے بے حسی کی چادر تن گئی تھی۔ مکمل بے بسی کے عالم میں کوئی راہ فرار نہ پاتے ہوئے اس نے یوں اثبات میں گردن ہلائی تھی جیسے میدان جنگ میں ہاری ہوئی فوج کا کوئی زخمی سپاہی اپنے ہتھیار پھینک کر خود کو دشمن کے حوالے کرتا ہے۔ نکاح نامے پر سائن گھسیٹتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کی کپکپاہٹ واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اسے زندگی کی اسٹیج پر اپنا کردار بار بار مر کر زندہ ہونے والا لگ رہا تھا اور نکاح کا مرحلہ مکمل ہوتے ہی ہر طرف مبارک سلامت کا شور اٹھ گیا تھا۔ ایک محض اس کے زندہ جلنے کے عمل نے اور کتنے بہت سے لوگوں کو مسرور کر دیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر جلتی کڑھتی اپنے آنسو پیتی رہی۔ گوری نے اس تقریب میں بھرپور طریقے سے شرکت کی تھی۔ سادہ لباس میں مکمل اسکارف کے ساتھ وہ انوشہ کے پاس ہی بیٹھی رہی تھی۔ صبح صادق میں ابھی کچھ ہی دیر تھی۔ جب وہ لوگ انوشہ کو لے کر واپس ''شاہ پیلس'' پہنچے تھے۔ چاند پوری تقریب کے دوران ایک پل کے لیے بھی شاہ زر کی گود سے نیچے نہیں اترا تھا۔ شاہ زر سے زیادہ وہ خوش اور مسرور تھا۔

اگلا پورا دن انوشہ کمرے میں بند رہی تھی۔ جب کہ وہ دوستوں کو اور آفس کے ورکرز کو دعوت کھلانے میں۔ ولیمہ کا پروگرام ابھی لیٹ تھا۔ رات گئے تھکن سے چور وہ گھر واپس لوٹا تو چاند گوری کی آغوش میں سو چکا تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اپنے بیڈ روم کی طرف چلا آیا مگر اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے چند گھنٹے پہلے شاندار سجے ہوئے کمرے کا ابتر حال دیکھا۔ مزید ستم کہ یہ حال کرنے والی خود بھی وہاں نہیں تھی۔ اوپر فرسٹ فلور کا کمرا لاکڈ تھا اور وہ اسی میں تھی۔ شاہ زر زیر لب مسکراتا، گہری سانس بھرتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گیا کہ شدید تھکن کے باوجود اپنے ربّ کے قرض کی ادائیگی اس پر فرض تھی۔

❋❋❋

ہم نے سوچ رکھا ہے
چاہے دل کی ہر خواہش
زندگی کی آنکھوں سے
اشک بن کے بہہ جائے
چاہے اب مکینوں پر
گھر کی ساری دیواریں، چھت سمیت گر جائیں
اور بے مقدر ہم اس بدن کے ملبے میں
خود ہی کیوں نہ دب جائیں
تم سے کچھ نہیں کہنا
کیسی نیند تھی اپنی، کیسے خواب تھے اپنے
اور اب ان خوابوں پر
نیند والی آنکھوں پر، نرم خو گلابوں پر
کیوں عذاب ٹوٹے ہیں
تم سے کچھ نہیں کہنا
گھر گئے ہیں راتوں میں
بے لباس باتوں میں
اس طرح کی گھاتوں میں
کب عذاب ٹلتے ہیں
کب چراغ جلتے ہیں
اب تو ان عذابوں سے
بچ کے بھی نکلنے کا
راستہ نہیں جاناں!
جس طرح تمہیں سچ کے لازوال لمحوں سے
واسطہ نہیں جاناں!
ہم نے سوچ رکھا ہے
چاہے کچھ بھی ہو جائے
تم سے کچھ نہیں کہنا!

صاعقہ کا ہاتھ آمنہ کے ہاتھ میں تھا اور وہ سرد پڑتی جا رہی تھی۔ اسے لگا جیسے سڑک پر بھاگتی گاڑیاں اس کے وجود کو روندتی ہوئی گزر رہی ہوں۔ جیسے اس کا وجود ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا ہو۔ عجیب حال تھا کہ نہ آنکھوں سے کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ نہ کانوں سے کچھ سنائی دے رہا تھا۔ تیز آندھی چلی تھی کہ چند لمحوں میں اس کی محبت اور خوابوں کا درخت جڑ سمیت اکھڑ کر رہ گیا تھا۔

آمنہ اسے تھام کر ایک طرف لے کر بیٹھ گئی۔

''صاعقہ! تم ٹھیک ہونا!''

''ہوں۔''

''دیکھو پلیز جو بھی ہوا اسے دل پر نہیں لینا۔ ہو سکتا ہے کہیں کوئی مجبوری ہو جس کی وجہ سے اس نے......!''

''میرا ایک کام کرو گی آمنہ!'' سرد کپکپاتے ہاتھوں سے آمنہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے آمنہ کی بات کاٹی تھی۔

''ہوں بولو۔''

''میرا ریزائن دے دینا کل عباد انڈسٹری میں۔''

''مگر......!''

''کوئی اگر مگر نہیں' اپنی تنخواہ بھی نہیں لوں گی میں۔''

''صاعقہ تم۔''

''میرا سر درد سے پھٹ رہا ہے آمنہ! بہت مشکل سے سانس لے پا رہی ہوں میں۔ خدارا کوئی بحث مت کرو اس وقت۔''

''ٹھیک ہے جیسا تم کہو گی ویسا ہی ہوگا۔ مگر میں بھی یہاں کام نہیں کروں گی اب۔'' وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔ صاعقہ سن سی سر جھکائے بیٹھی رہی۔

محبت کی عمارت گر گئی ہے
کوئی ملبے پہ بیٹھا رو رہا ہے
ہَوا ساکن ہے سارا شہر ویراں
تیرے جانے کا ماتم ہو رہا ہے

❀❀❀

عباد کی پاکستان واپسی کنفرم ہو گئی تھی۔ ہادیہ مسروری یاور حیات صاحب کے آفس میں چلی آئی۔

''انکل! ہمارے لیے ایک خوش خبری ہے۔''

''اچھا وہ کیا؟''

وہ کسی فائل میں سر دیے بیٹھے تھے۔ اس کی آمد پر سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ سرشاری ان کے مقابل بیٹھ گئی۔

''وہ لڑکی تھی نا صاعقہ' آپ کے ہونہار سپوت کا دُم چھلا یہاں ہماری ہی کمپنی میں ملازم تھی۔ کل شام سے یہ علاقہ اور جاب دونوں چھوڑ گئی ہے۔''

''گڈ تمہیں یہ خبر کہاں سے ملی؟''

''آفس کا ایک رپورٹر لگا رکھا تھا اس عجوبے کے پیچھے۔ اسی نے اطلاع دی۔''

''چلو' اچھی بات ہے۔ میں تو پہلے سے جانتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اصل میں یہ مڈل کلاس

گھرانوں کی لڑکیاں بہت خود دار اور تھوڑی سی سائیکی ہوتی ہیں۔ اسی لیے انہیں ان کی اوقات میں رکھنا بہت آسان ہوتا ہے۔ بہر حال عباد آتا ہے تو شادی کی ڈیٹ پھر سے فائنل کرتے ہیں۔ اب تو خوش ہونا۔"

"جی انکل! بہت بہت خوش ہوں۔ آپ حقیقتاً بہت عظیم ہیں۔" وہ سرشار تھی بے پناہ سرشار۔

یاور حیات صاحب اسے مسرور دیکھ کر پیار سے اس کا سر سہلاتے ہوئے خود بھی مسکرا دیے۔ دولت کے اونچے ایوان میں، محبت کا پنچھی پھر پھڑ پھڑا کر اپنے پر زخمی کر بیٹھا تھا اور اس تماشے پر کسی غریب کی مفلس تقدیر پھر بین کر رہی تھی۔

❀❀❀

عباد نے کراچی ایئرپورٹ پر قدم دھرتے ہی سب سے پہلے صاعقہ کو کال کی تھی مگر اس کا نمبر ہنوز آف مل رہا تھا۔ کئی بار کوشش کے باوجود لائن نہ مل سکی تو وہ مایوس ہو گیا۔ ہادیہ گاڑی لیے اس کی منتظر تھی۔

"السّلام علیکم، کیسی ہو۔" اپنے مختصر سامان کے ساتھ اس سے روبرو ہوتے ہی اس نے اخلاقیات کا تعلق نبھایا تھا۔ جواب میں وہ چپ چاپ سی ایک نظر اس پر ڈالتی سر اثبات میں ہلا گئی۔

"کیا ہوا ناراض ہو؟"

اپنے گھر والوں کی پلاننگ سے قطعی بے خبر وہ اس کے موڈ پر الجھتے ہوئے گاڑی میں بیٹھا تھا۔ ہادیہ نے اس کے بیٹھتے ہی فوری گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"نہیں میرا تم سے اب ایسا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔" لاتعلق سے لہجے میں کہتی اسٹیئرنگ کو مضبوطی سے تھامے وہ سامنے سڑک پر دیکھ رہی تھی۔

عباد مزید الجھ کر رہ گیا۔

"کیا مطلب! کیا مجھ سے کوئی خطاء سرزد ہوئی ہے۔"

"نہیں مگر پھر بھی تم نے مجھے بہت ہرٹ کیا ہے عباد! مجھے کم از کم تم سے ایسی امید نہیں تھی۔" وہ واقعی دکھی دکھائی دے رہی تھی۔ عباد سمجھ نہ سکا کہ آخر ہوا کیا ہے۔

"میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔"

"تم سمجھ بھی نہیں سکو گے بہر حال میں آسٹریلیا واپس جا رہی ہوں۔ زندگی میں پھر کبھی پاکستان واپس نہ آنے کے لیے۔"

"کیوں ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔"

"دماغ خراب ہو گیا ہے میرا اس لیے۔ جس شخص کے خواب بچپن سے دیکھتی آئی۔ وہ شخص اب مجھ سے دستبردار ہو رہا ہے۔ اس لیے۔" اس بار اس کا لہجہ بھرایا تھا۔ عباد بے ساختہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

"اوہ، تو یہ بات ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوں ہادی! میں نے واقعی تمہیں دکھی کیا ہے اور اس کے لیے میں شاید کبھی خود کو معاف نہ کر سکوں۔ مگر یہ حقیقت ہے۔ میں اس لڑکی کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔ شاہ زر کو تو جانتی ہو تم؟ بہت عزیز دوست ہے میرا۔ اس کی بھی اپنی کزن سے کمٹ منٹ تھی

انڈرسٹینڈنگ بھی ہو گئے ایک دوسرے سے۔ مگر اچانک اسے کسی اور لڑکی سے محبت ہو گئی۔ دونوں کے بیچ کا پیار تھا سمٹ گیا۔ شاہ اس دوسری لڑکی سے شادی نہیں کر سکا مگر جس کزن سے شادی کی اسے بھی کچھ نہیں دے سکا۔ بہت نقصان کیا ہے اس نے اس لڑکی کا۔ میں تمہارا نقصان نہیں کرنا چاہتا۔ ہادی! اسے وہی کہانی اپنے اور تمہارے ساتھ نہیں دہرانا چاہتا' بہت اذیت ہوتی ہے اس کھیل میں اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔" وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ہادیہ لب بھینچے سپاٹ موڈ کے ساتھ ڈرائیو کرتی رہی۔ گھر آ کر وہ بنا اس سے مزید کچھ کہے سیدھی اپنے کمرے میں جا چھپی تھی۔ عباد کچھ دیر آسیہ بیگم کے پاس لاؤنج میں بیٹھا اپنے ٹور کی باتیں کرتا رہا۔ پھر آرام کی غرض سے اٹھ گیا۔ اگلے روز ناشتے پر اس کی مسز یاور سے بات ہوئی تھی۔ اتفاق سے اس وقت یاور صاحب اور ہادیہ ناشتے کے لیے وہاں نہیں تھے۔

"مما! آپ نے صاعقہ کے لیے پاپا سے بات کی؟"

"ہوں تمہیں کیا لگتا ہے تم وہاں دن رات ایک کر کے بنا اپنی صحت کی پروا کیے کام کر رہے تھے تو میں یہاں بے نیاز بیٹھی تھی؟ نہیں میں مسلسل تمہارے پاپا کو کنوینس کر رہی تھی اور خوش ہو جاؤ تمہاری لگن تمہاری محنت تمہارا کام دیکھتے ہوئے وہ مان بھی گئے ہیں۔" یاور صاحب کی معرفت انہیں صاعقہ کے راستے سے ہٹنے کی خبر ہو گئی تھی تبھی یوں دھڑلے سے جھوٹ بول رہی تھیں۔ تاہم عباد کھل اٹھا تھا۔

"او تھینک یوں مما! مجھے یقین تھا آپ میری مدد کریں گی۔ میں واقعی بہت خوش ہوں۔" باہیں ان کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے وہ خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ آسیہ بیگم دل ہی دل میں اس کی سادگی اور اپنی کامیاب پلاننگ پر مسکرا دیں۔ عباد اسی روز اسلام آباد فلائی کر گیا تھا کہ ابھی اس کے اور شاہ زر کی خوشیاں ادھوری تھیں۔ بہت دنوں کے بعد ان دونوں نے پھر ایک دوسرے کو بھرپور کمپنی دی تھی۔ اپنی ڈھیروں باتیں ایک دوسرے سے شیئر کی تھیں۔ شاہ زر کی ہمراہی میں بھی اس نے کئی بار صاعقہ کا نمبر ٹریس کیا تھا مگر ہر بار آف ہی ملا۔ اگلے روز کراچی واپسی پر وہ سیدھا آفس چلا آیا تھا تاکہ صاعقہ سے مل سکے مگر وہاں جس اطلاع سے اس کا واسطہ پڑا اس نے اس کے قدموں تلے سے زمین نکال دی تھی۔

"سر! صاعقہ بی بی تو ملازمت چھوڑ کر جا چکی ہیں۔"

"وہاٹ! مگر کیوں......؟"

"پتا نہیں سر! وہ اپنی تنخواہ بھی چھوڑ گئی ہیں۔"

"مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اچھا ان کے ساتھ جو بی بی تھیں' کیا وہ بھی نہیں آ رہیں؟"

"نہیں سر! ایک دو روز وہ آئی تھیں پھر وہ بھی نہیں آئیں۔ استعفیٰ مل گیا تھا ان کا۔"

"لیکن وہ ایسے کیسے کر سکتی ہے۔ ابھی تو وہ مشکل حالات کا شکار تھی۔ اتنی اچھی پے کہیں اور سے ملنے کا چانس بھی نہیں کہ یوں ملازمت ترک کر دے؟"

زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ اچھا خاصا پریشان ہو گیا تھا۔ برانچ مینیجر الگ الجھ کر رہ گیا۔ اگلے بیس منٹ میں وہ ہادیہ کے کمرے میں تھا۔

''زہے نصیب! تو آج آفس کی یاد آ گئی آپ کو۔'' وہ اسے دیکھتے ہی چہکی تھی مگر عباد نے لب بھینچ لیے۔

''مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے ہادیہ!''

''ہاں پوچھو۔''

''کیا میری غیر موجودی میں یہاں صاعقہ نام کی کوئی لڑکی آئی تھی۔''

''پتا نہیں، آئی ہوگی۔ مجھ سے تو نہیں ملی کیوں! کوئی اسپیشل لڑکی تھی کیا؟''

''ہاں۔''

''اوہ! پھر تو ملنا چاہیے تھا۔ کہیں وہ ریستوران والی لڑکی تو نہیں تھی؟'' وہ اب لطف لے رہی تھی۔ عباد بے بس سا پلٹ گیا۔

''سنو! انکل سے پوچھ لینا ہو سکتا ہے ان سے ملی ہو۔''

''جسٹ شٹ اپ۔'' بھنا کر کہتا وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ پیچھے ہادیہ کھل کر مسکرا دی۔

❋❋❋

دھول اڑاتی کچی سڑک پر بے نیازی سے چلتی وہ کوئی سودائی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کنواں جو اس نے محض ایان کو سبق سکھانے کے لیے کھودا تھا اس کنویں میں وہ خود گر پڑی تھی۔ نا صرف پورے گاؤں میں رسوائی ہوگئی تھی بلکہ سانول کو بھی کھو دیا تھا۔ اس سانول کو جو اس کا خواب اس کا غرور تھا کیا۔ رہا تھا اس کے پاس، کچھ بھی تو نہیں!

نفرتوں کے سلسلوں میں کبھی کسی نے کچھ پایا بھی نہیں۔ بس کھویا ہی کھویا ہے۔ جیسے اس نے کھو دیا تھا۔

اپنے خیالوں میں غرق، نپے تلے قدم اٹھاتی، وہ پرانے کنویں کے پاس پہنچی تھی۔ جب اچانک دھواں اڑاتی ایک ٹیکسی اس کے عین قریب آ رکی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سنبھل پاتی ٹیکسی کا اگلا دروازہ کھلا اور اگلے ہی پل ایان اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ علیزہ کی آنکھیں اسے مقابل پا کر کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

''چلو ڈیئر! حساب کتاب کا وقت شروع ہو گیا ہے۔'' لبوں کی تراش میں ہلکی سی مسکراہٹ لیے وہ بولا تھا۔ علیزہ نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا وہاں اس سڑک پر دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ادریس شاہ کی لاش اس پرانے کنویں سے برآمد ہونے کے بعد گاؤں کے لوگوں نے شام ڈھلنے کے بعد وہ راستا جیسے ترک کر دیا تھا۔ علیزہ خود آج پہلی بار حویلی سے باہر نکلی تھی۔ وہ بھی ''سائیں جی'' کے مزار پر حاضری دینے اور دیا جلانے کہ پچھلے دنوں سے حویلی کی چار دیواری میں اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔

اس وقت خود کو مشکل میں گرفتار پا کر وہ الٹے پاؤں بھاگی تھی۔ جب ایان نے لپک کر اس کا بازو دبوچا اور اگلے ہی پل گھسیٹ کر ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر دھکیل دیا۔

''بہت ہوشیاری دکھالی تم نے علیزہ بی بی! اب اور نہیں، یہ گاؤں، یہ گلی کوچے، تم نے میرے لیے

ممنوع بنا دیے تھے۔ آج سے تمہارے لیے بھی یہ شجر ممنوع ہی ہوں گے۔ رہتی زندگی تک تم دھول اُڑاتی ان کچی سڑکوں کے لیے تڑپو گی۔ مگر چاہتے ہوئے بھی کبھی دوبارہ یہاں آ نہیں پاؤ گی۔ تم نے میری ہمدردی، میری محبت کا مذاق اڑا کر مجھے رسوائی سونپی تھی۔ آج سے میں تمہیں بتاؤں گا ہمدرد اور محبت کرنے والا مرد جب بے حس ہو جاتا ہے تو وہ عورت کو کیسے رکھتا ہے۔'' اپنا دایاں ہاتھ سختی سے اس کے منہ پر جمائے چبا چبا کر کہتے ہوئے وہ اسے تنبیہ کر رہا تھا اور علیزہ کی جان جیسے اس کے جسم سے نکلتی جا رہی تھی۔

انسان کو اپنا بویا ہمیشہ کاٹنا پڑتا ہے۔ ایک مرد کی محبت میں دکھ اٹھانے کے بعد نازوں پلی اس حسین دوشیزہ نے، ہر مرد کو جیسے اپنا شکار بنا لیا تھا اور یہی سب سے بڑی حماقت تھی اس کی۔ اچھے برے ہر انسان کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا بھلا جائز بھی کہاں تھا؟ دو گھنٹے کا تیز رفتار سفر اسے صدیوں پر محیط لگا تھا۔ ٹیکسی دو، سوا دو گھنٹے کے بعد ایک پرانے کھنڈر نما مکان کے قریب رکی تھی۔ ایان نے ڈرائیور کو مطلوبہ کرایہ دے کر رخصت کیا اور مکان کے اندر لے کر آ گیا۔ علیزہ نے دیکھا کچی آبادی کا بوسیدہ اجاڑ علاقہ تھا۔ گنتی کے چند گھر وہاں آباد تھے مگر اس کے باوجود ایک عجیب سی وحشت اور سناٹا تھا جو وہاں ہر سُو پھیلا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا دل خوف سے مزید دھڑکنے لگا۔ جانے وہ اس کا کیا حشر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ابھی وہ اندر داخل ہی ہوا تھا کہ چار پانچ مزید مرد ایک ٹیکسی میں وہاں پہنچ گئے۔ علیزہ انہیں دیکھتے ہی خوف سے دہل گئی تھی۔ اپنا بھیانک انجام اسے آنکھوں کے سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ شاید تبھی اس نے روتے ہوئے ایان کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔

''مجھے معاف کر دو، خدا کا واسطہ ہے تمہیں، مجھے معاف کر دو۔ میری اتنی تذلیل مت کرو ایان! خدا نے تمہیں انتقام کا موقع دے ہی دیا ہے تو اسی پاک خدا کے واسطے میرا گلا گھونٹ کر مجھے ابدی نیند سلا دو مگر یوں میری آخرت خراب مت کرو، پلیز۔''

''ہاہاہا تم جیسی بدکردار بھٹکی ہوئی لڑکی کے منہ سے آخرت کی بات بہت عجیب لگ رہی ہے ڈیئر۔ بہر حال مستحق تو تم ایسے ہی کسی انجام کی ہو مگر تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میں نے ایک مومن عورت کے بطن سے جنم لیا ہے۔ غصے اور انتقام میں بھی میں اپنے ربّ کی قائم کردہ حدود کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اور نہ ہی میرے ان دوستوں کا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ ابھی یہ لوگ یہاں میری درخواست پر، بطور نکاح کے گواہان آئے ہیں۔ تمہیں اگر یہ نکاح منظور نہ ہوا تو آگے کیا کہوں اب رہنا تو تمہیں یہاں میرے ساتھ ہی ہے۔'' وہ اسے جتنا سیدھا سمجھتی تھی۔ وہ اتنا سیدھا نہیں تھا اور نہ ہی اس وقت وہ جو کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ محض ''بڑھکی'' تھی۔ اسے عقل سے کام لینا تھا اور عقل کا تقاضا اس وقت یہی تھا کہ وہ اس کی بات مان لے۔ آنے والے پانچ افراد میں ایک مولوی صاحب بھی تھے۔ وہ جتنی خودسر اور لاڈلی تھی۔ زندگی کے اس خوب صورت بندھن کے لیے جتنے خواب اس نے آنکھوں میں سجائے تھے وہ سب اس لمحے چکنا چور ہو گئے تھے۔ فقط چند گھڑیوں میں بہت خاموشی اور سادگی کے ساتھ وہ علیزہ ملک سے علیزہ ایان بن گئی تھی۔

کیسا عجیب مذاق تھا زندگی کا کہ نکاح کے خوب صورت بندھن میں بندھنے کے باوجود اندر کہیں کوئی امنگ نہیں جاگی تھی۔ کسی قسم کی سرشاری نے اس کے وجود میں سر نہیں اٹھایا تھا۔ شاید وہ

جانتی تھی کہ اس بندھن کی بنیاد کیا ہے اور شاید اسی لیے اس نے خود کو اس لمحے اس قیدی کی طرح محسوس کیا تھا جس کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد اسے عدالت سزائے موت سے بچا کر عمر قید کی نوید سنا دے۔

ایان اب مہمانوں کو کھانا کھلا رہا تھا اور وہ دوسرے کمرے میں سر نہوڑائے بیٹھی اپنے ہاتھوں کو آپس میں مسلتے ہوئے وہاں سے فرار کی ترکیب سوچ رہی تھی۔

❊❊❊

نشے میں دھت وہ ٹیبل پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ جب سرمد اسے ڈھونڈتا وہاں آ پہنچا۔

''بریرہ......!'' اس کی پکار میں درد تھا۔ مگر سننے والی کا ہوش قائم ہی کہاں رہا تھا۔ جو وہ اسے کوئی جواب دیتی نتیجتاً اسے جھک کر خود اسے سنبھالنا پڑا تھا۔

''منع کیا تھا نا تمہیں ست آیا کرو ان کلبوں میں کیوں اثر نہیں ہوتا تم پر۔'' شدت دکھ سے اسے جھنجوڑتے ہوئے وہ برہم ہوا تھا۔ جب بریرہ نے آنکھیں کھول دیں۔

''سونے دو نا مت ڈسٹرب کرو مجھے پلیز۔''

''سونے کی جگہ نہیں ہے یہ چلو!'' اسے بازو کا سہارا دے کر سختی سے گھسیٹتا ہوا وہ ''نائٹ کلب'' سے باہر آیا تھا۔

''کیوں ہاتھ دھو کر خود اپنے پیچھے پڑ گئی ہو بریرہ! شاہ زر کو کھو چکی ہو اب کیا عزت سے بھی ہاتھ دھو گی؟'' وہ رنجیدہ تھا مگر بریرہ جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔ سوئے اعصاب اور بوجھل پلکوں کے ساتھ وہ مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھی۔ سرمد نے گاڑی کے قریب پہنچ کر اسے فرنٹ سیٹ پر دھکیل دیا۔

''تمہیں پتا ہے اس نے شادی کر لی ہے۔ انوشہ رحمٰن سے......؟''

پلکیں موندے سر سیٹ کی پشت سے ٹکائے وہ مدہوشی میں بڑبڑا رہی تھی۔ سرمد نے ایک نظر اسے دیکھا اور دروازہ بند کر دیا۔ جب وہ گھوم کر اپنی سیٹ پر آیا تو اس کی بند پلکوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''وہ میرا دوست تھا صرف میرا' اس نے کہا میں دنیا کی سب سے بہترین لڑکی ہوں۔ پھر بھی' پھر بھی اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ دنیا کی سب سے بہترین لڑکی کو۔ کوئی محبت میں ایسا کرتا ہے؟ کوئی سب سے بہترین لڑکی کو یوں اس طرح سے چھوڑتا ہے؟ وہ بھی انوشہ رحمٰن جیسی لڑکی کے لیے۔'' وہ بری طرح ٹوٹی تھی اور سرمد اس کا درد سمجھ سکتا تھا تبھی مسکرایا۔

''جو چھوڑ دیتے ہیں وہ محبت نہیں کرتے بری!''

''تو کیا کرتے ہیں؟'' اس کی پلکیں ہنوز بند تھیں۔ سرمد نے گاڑی اسٹارٹ کر لی۔

''خون کرتے ہیں دلوں کا، حسین خوابوں کا۔''

''کیوں؟''

''پتا نہیں سالوں صدیوں سے کسی کو اس ''کیوں'' کا جواب نہیں ملا ہے۔ اگر مل جاتا تو شاید یہ سلسلہ بھی رک جاتا۔''

''ہم کہاں جارہے ہیں؟''

''گھر......!''

''نہیں، مجھے گھر نہیں جانا وہ گھر نہیں زندان ہے میرے لیے۔ میرا دم گھٹتا ہے وہاں۔''

''تو ٹھیک ہے میرے ساتھ میرے گھر چلو، میں آنٹی کو فون پر مطلع کروں گا کہ تم میرے ساتھ ہو۔'' اس نے آفر کی تھی۔ بریرہ اس بار خاموش رہی اس کے اندر جیسے الاؤ دہک رہا تھا۔ ''آج موسم میں بہت خنکی ہے اور تم نے کوئی شال کوئی اوورکوٹ نہیں لیا۔''

''تمہیں خنکی محسوس ہو رہی ہو گی۔ مجھے تو لگتا ہے میں دوزخ میں جل رہی ہوں۔ یہ سزا بہت بھاری ہے سرمد! میں نہیں سہہ پا رہی اسے۔ میری آنکھیں جل جل کر راکھ ہو گئی ہیں۔ سانس ہے کہ کھینچ کر لینے سے بھی نہیں آتی۔''

''تھوڑی سی بہادری سے کام لو اور خود کو سنبھالو گی تو اس کیفیت سے نکل آؤ گی۔''

''نہیں میں نا اسے بھلا سکتی ہوں نا خود کو سنبھال سکتی ہوں۔''

''ایسے تو جینا بہت مشکل ہو جائے گا بری!''

''ہو گیا ہے اب اور کیا ہو گا۔''

''تمہیں اچھا لگتا ہے اپنے غم کو اشتہار بنا کر گلے میں لٹکانا۔''

''نہیں! مگر اس غم نے مجھے اشتہار بنا ڈالا ہے۔''

''تو نکل آؤ ناں اس عذاب سے میں وعدہ کرتا ہوں بری! تمہیں کبھی ٹوٹ کر بکھرنے نہیں دوں گا۔''

''یہ وعدہ تو اس نے بھی کیا تھا مگر کیا ہوا؟ تم مردوں کو بھلا اپنے وعدے یاد ہی کہاں رہتے ہیں۔'' اس کا یقین ٹوٹ کر چکنا چُور ہو چکا تھا اور اب چکنا چُور ہوئے اس یقین کو دوبارہ بحال ہونے میں کچھ وقت تو لگنا ہی تھا۔ سرمد نے سست روی سے چلتی گاڑی اپنے گھر کے پورچ میں روک دی۔

''چلو......!'' اپنی سیٹ چھوڑ کر وہ پچھلی سائیڈ پر جھکا تھا۔ بریرہ مدہوش سی گاڑی سے نکل آئی۔

''میں اس سے انتقام لینا چاہتی ہوں سرمد! اسے اس کی بے وفائی کی سزا دینا چاہتی ہوں۔ جیسے اس نے مجھے تماشا بنایا ہے، میں بھی اسے تماشا بنانا چاہتی ہوں۔ وہ بھی رات کو نرم بستر پر سوئے تو اسے کانٹے چبھیں وہ بھی میری طرح بے بس ہو کر خود سے فرار کے لیے کلبوں کی خاک چھانتا پھرے، اسے بھی سکون کی دولت نصیب نہ ہو سرمد! ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر محبت مانگے مگر اسے اس لڑکی کی محبت نہ ملے۔'' لڑکھڑاتے قدموں سے چلتی ہوئی وہ کہہ رہی تھی۔ سرمد ضبط سے سنتا رہا۔

''بس! میں یہیں رکوں گی۔ یہاں اس پول کے پاس۔ دیکھو اس کے شفاف پانی میں میرا چہرہ کتنا بھیانک دکھائی دے رہا ہے۔ دیکھو سرمد! وہ چاند ہنس رہا ہے مجھ پر۔ مجھے اپنی اوقات دیکھنے دو۔''

بچوں کی طرح مچل کر وہ سوئمنگ پول کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ سرمد خود کو عجیب بے بس سا محسوس کرتا خود بھی وہیں ٹک گیا۔ اس نے صبح سے اب تک کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ نہ ہی کل رات سے وہ سو سکا تھا۔ اس وقت اس کا وجود تھکن سے چور ہو رہا تھا مگر یہ بریرہ رحمٰن کے لیے اس کی محبت تھی کہ وہ اب بھی اس کے ساتھ شدید ٹھنڈ میں جاگ رہا تھا۔

''پتا نہیں وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا۔ شاید اس لڑکی کو اپنی محبت کا یقین دلا رہا ہو۔ شاید اسے بھی کہہ رہا ہو کہ وہ دنیا کی سب سے بہترین لڑکی ہے' ہے نا۔'' اپنے حال میں مست وہ قیاس لگا رہی تھی۔ سرمد کے لب خاموش رہے۔

''جب جب وہ اس کے پاس جائے گا تو کیا اسے میری یاد نہیں آئے گی۔ جب' جب وہ اس سے بات کرے گا۔ تو کیا میرا تصور اسے بے کل نہیں کرے گا؟ مم...... میں اس کی بیوی تھی سرمد...... مم...... میں نے اس کے لیے ماں بننے کا اعزاز بھی گنوا دیا۔ ہری بھری شاخ سے اجاڑ درخت ہوگئی میں' پھر بھی...... پھر بھی اس نے مجھے طلاق دے دی۔ کیوں؟ میں نے کچھ مانگا تھا اس سے؟ کچھ بھی تو نہیں مانگا' میں تو اس کے حکم پر چپ چاپ یہاں چلی آئی تھی۔ اس امید پر کہ وہ کبھی تو پلٹ کر میری طرف آئے گا مگر' وہ میری طرف نہیں آیا۔''

نیند اور نشے سے خمار آلود نگاہیں آنسو بہاتی ہوئی کیسے اس کا درد اجاگر کر رہی تھیں۔ سرمد بغور دیکھ رہا تھا۔ شاید تبھی بے کل ہو کر اس نے اپنا رخ اس کی طرف پھیرا تھا۔

''ان دردناک تصورات سے نکل آؤ بری! خدا کا واسطہ ہے تمہیں...... مت یوں بے مول لٹاؤ یہ موتی جو مجھے جان سے بھی پیارے ہیں۔'' اس کی انگلیوں کی پوریں بریرہ کے آنسو سمیٹ رہی تھیں جواب میں وہ نڈھال سی سمٹ کر اپنا سر اس کے زانوں پر رکھ گئی۔

''تمہیں برا نہ لگے تو آج کی رات میں یہیں سو جاؤں سرمد!'' اس وقت وہ پچیس سالہ دوشیزہ نہیں کوئی پانچ سالہ معصوم سی بچی لگ رہی تھی۔ شاید تبھی اس کا سر اثبات میں ہل گیا تھا اور بریرہ اجازت ملتے ہی فوراً اس کے دائیں زانو پر سر ٹکا کر پلکیں موند گئی۔

ہوا بن کر بکھرنے سے اسے کیا فرق پڑتا ہے؟
میرے جینے سے مرنے سے اسے کیا فرق پڑتا ہے؟
اسے تو اپنی خوشیوں سے ذرا فرصت نہیں ملتی
میرے غم کے ابھرنے سے اسے کیا فرق پڑتا ہے؟
میں کہ اس شخص کی یادوں میں رو کر ختم ہو جاؤں
میرے اس طرح کرنے سے اسے کیا فرق پڑتا ہے؟

سرگوشیانہ انداز میں دل کی تمام تر شدتوں کے ساتھ وہ بول رہی تھی۔ سرمد دھیرے دھیرے اس کی ریشمی زلفوں میں انگلیاں چلاتا گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

''میں تمہیں اس شخص کے غم میں فنا ہونے نہیں دوں گا بری! بہت جلد تم بھی ہنسو گی۔ ہر دکھ کا کانٹا اپنے دل سے نکال کر زندگی کی بہاروں کا لطف اٹھاؤ گی۔ تمہارا ہر آنسو میں اپنی پلکوں سے چنوں گا۔ تمہارا ہر دکھ میں اپنے سینے میں چھپاؤں گا۔ یہ وعدہ ہے میرا تم سے اور خود اپنے آپ سے بھی کہ میں بہت جلد تمہارے دل میں اپنا مقام بنالوں گا۔ تم گردن جھکا کر دیکھو گی تو صرف سرمد نظر آئے گا۔ شاہ زر کا نام و نشان بھی نہیں ہوگا کہیں۔'' اس کا لہجہ بھی سرگوشی سے بلند نہیں تھا مگر سننے والی کو نیند آ گئی تھی۔

''ایک نامحرم مسیحا کی پناہ میں درد سے بے حال وہ زخمی چڑیا اب سکون کی نیند سو رہی تھی اور اس

تھکن سے چور میٹھی نیند کا خواہاں تھا۔ اپنی انمول محبت کو قیمتی متاع کی طرح آغوش میں سنبھالنے پوری رات کسی پتلے کی طرح بے حس وحرکت تالاب کے کنارے بیٹھا رہا تھا کہ کہیں اس کی ہلکی سی جنبش سے اس کی محبت کی آنکھ نہ کھل جائے۔ تھکن' بھوک اور ٹھنڈ' بریرہ رحمٰن کے سکون اور نیند کے بدلے میں ہلکی پڑ گئی تھی۔ وقت بے شک بہت آگے نکل آیا تھا مگر انگلینڈ جیسے بے باک ملک کی سرد فضاؤں میں اس رات پول کے کنارے بیٹھا' ساری رات آنکھوں میں کاٹتا وہ شخص موجودہ وقت کا سرمد خان سہی مگر گزرے ہوئے وقت کا ''مہینوال'' ثابت ہوا تھا۔

کچے گھڑے پر تیر کر چناب کی تندخو موجوں سے کھیلنے والی سوہنی کی طرح اگر اس کی بریرہ اس سے اس کی زندگی کی فرمائش کرتی تو اس وقت وہ یہ بھی کر گزرتا کہ بریرہ رحمٰن کے لیے اس کی محبت ایسی ہی گہری تھی۔

❋❋❋

پوری رات عذاب کے عالم میں بسر کرنے کے بعد صبح جب وہ بیدار ہوا تو آنکھیں خوب سرخ ہو رہی تھیں۔ فجر سے کچھ پہلے آنکھ لگی تھی اور اب صبح کے نو بج رہے تھے۔ گڑیا کو شدید بخار تھا مگر وہ اسے سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ پچھلے چند ماہ سے وہ مکمل طور پر امامہ کی ذمہ داری بن گئی تھی۔ بہت چالاکی سے اس نے اسے اور اس کی بیٹی کو اپنا عادی بنا لیا تھا اور اب وہ اس کے بغیر جی نہیں پا رہا تھا۔ اس کا سیل اب بھی آف تھا مگر گھر کے نمبر پر مسلسل بیل ہو رہی تھی۔ وہ جانتا تھا لائن کے دوسری طرف فائزہ آپا ہوں گی اور وہ اس سے اس کے ایس ایم ایس کی وضاحت مانگیں گی مگر وہ اس وقت انہیں کوئی بھی وضاحت دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ تبھی سختی سے ملازمین کو بھی فون اٹھانے سے منع کر دیا تھا۔ ایک ہفتہ اسی عذاب کی نذر ہو گیا تھا جب اس روز اچانک ثانیہ (سابقہ بیوی) کی کال آ گئی۔ وہ ٹینس نہ ہوتا تو شاید کبھی اس اجنبی نمبر کو ریسیو نہ کرتا۔

''ہیلو شجی!'' اور یہیں پر وہ ٹھٹکا تھا۔ شجی کہنے والی ثانیہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

''ہوں بولو۔'' بہت تاخیر کے بعد اس نے جواب دیا تھا جب وہ بولی۔

''کیسے ہو' سنا ہے ترقی ہو گئی ہے؟''

''ہوں۔'' کیسے ہو کو پھر نظر انداز کر دیا تھا اس نے۔

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں شجی! بہت کمی محسوس ہو رہی ہے تمہاری۔''

''ٹھیک ہے آفس آ جانا۔''

''کیوں..... گھر پر ملنے سے ڈر لگتا ہے؟ خیر لگنا بھی چاہیے۔ سنا ہے بہت خوب صورت لڑکی سے شادی کر لی ہے تم نے۔'' وہ اسے تنگ کر رہی تھی شجاع نے اکتا کر کال ڈراپ کر دی۔ تبھی ڈاکٹر عاطف بنا' اطلاع دیے چلے آئے تھے۔

''شجی تم ٹھیک تو ہو؟'' قدرے متفکر سے وہ سیدھے اس کے بیڈ روم میں گھس آئے تھے۔ شجاع بے بس سا انہیں دیکھتا اثبات میں سر ہلا گیا۔

''بہت ٹینس لگ رہے ہو' کال بھی ریسیو نہیں کر رہے' میرے پاس فائزہ آپا کی کال آئی تھی۔ بہت بری طرح رو رہی تھیں۔ بتا رہی تھیں کہ بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسپتال میں ایڈمٹ

ہیں۔ سب ٹھیک تو ہے نا!"

"پتا نہیں یار! کہیں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں کرتا ہوں ابھی آپا سے بات' بلکہ میرا خیال ہے کل تک یا شام کی فلائٹ سے آپا کے پاس ہی چلا جاتا ہوں۔"

"ہوں یہی بہتر ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت تمہارا وہاں ہونا ضروری ہے۔ یہاں تو ویسے بھی محفوظ نہیں ہو تم۔" وہ امامہ والے واقعے سے قطعی بے خبر تھے۔ شجاع نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

ڈاکٹر عاطف کے جانے کے بعد اس نے اپنی غفلت پر افسوس کرتے ہوئے فوری فائزہ آپا کو کال ملائی تھی۔ جواباً وہ رو پڑیں۔

"کیا ہوا ہے امامہ کے ساتھ شجی! تم نے اکیلے باہر نکلنے کیوں دیا اسے؟"

"بابا کیسے ہیں آپا!"

"زندگی اور موت کے درمیان جھول رہے ہیں۔ امامہ والی خبر سن لی تھی انہوں نے۔ اسی سے ہارٹ اٹیک ہو گیا۔"

"میں آ رہا ہوں آپ کے پاس فوری۔"

"پاگل ہوئے ہو؟ وہاں امامہ کی تدفین۔"

"چھوڑ دیجیے امامہ کے ذکر کو آپا پلیز۔ کچھ نہیں ہوا ہے اسے۔ بس کہیں کھو گئی ہے۔ میں آ رہا ہوں۔ آپ کے پاس۔ بات مکمل کرتے ہی اس نے کال ختم کی تھی۔ ایک شاک پہلے دیا تھا اس نے اور ایک اب دے دیا تھا۔ فائزہ آپا ہکا بکا سی رہ گئیں۔ اگلے روز کے ڈوبتے سورج سے قبل وہ ان کے پاس پہنچ گیا تھا مگر اگلے روز کا ڈوبتا سورج اپنے ساتھ قدرت اللہ صاحب کی زندگی بھی لے گیا تھا۔ شجاع نے جس وقت ان کے کمرے میں قدم رکھا تھا اسی لمحے انہوں نے ہمیشہ کے لیے پلکیں موندی تھیں۔ شجاع حسن کی زندگی کا ایک اور بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ فائزہ آپا بلک بلک کر رو رہی تھیں مگر وہ خاموش تھا یوں جیسے طوفان آنے سے پہلے سمندر خاموش ہو جاتے ہیں۔ گڑیا کو فائزہ آپا کی بیٹی نے سنبھالا ہوا تھا۔

پندرہ بیس روز اسی غم اور نقصان کے حصار میں گزر گئے تھے۔ شجاع حسن کا پاکستان واپس آنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا مگر واپس تو آنا ہی تھا۔ تاہم واپسی سے قبل اس نے امامہ حسن کی ساری کہانی فائزہ آپا کو سنا دی تھی۔ جسے سن کر وہ اس پر خاصی برہم ہوئی تھیں۔

"مجھے تم سے ایسی جہالت کی امید نہیں تھی شجی! وہ جیسی بھی تھی تمہاری عزت تھی۔ اس سے جو حماقت بھی سرزد ہوئی مگر سزا بہت بڑی دی تم نے۔ کوئی اپنی عزت کو یوں اوباش لوگوں کے سپرد کر کے آتا ہے وہ بھی آدھی رات کو؟ اور وہ بھی ایک پڑھا لکھا' ذہن وفطین' سمجھدار ڈی آئی جی۔"

"مجھے اوباش لوگوں کا اندازہ نہیں تھا آپا! ویسے بھی عورت کے معاملے میں ہمیشہ مرد کی عقل جواب دے جاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے ایک پل کو مان لیتی ہوں کہ تمہاری عقل جواب دے گئی تھی مگر کوئی اپنی بیوی کو اس کے نامحرم کزن کے سپرد بھی کر کے آتا ہے کوئی۔ کیا سوچ کر اسے سونپنے گئے تھے تم کہ بڑی بہادری کا کارنامہ سرانجام دے رہے ہو۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ کیا ہوا ہوگا اس کے ساتھ۔ جانے کہاں گئی

ہوگی وہ۔ اتنی پیاری گڑیا سی لڑکی' جانے زندہ بھی ہوگی کہ نہیں۔'' آپا کے آنسو تھے کہ خشک ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

وہ بے کل سا ان کے قریب سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں آپا! خدا کا واسطہ ہے آپ مزید پریشان مت کریں۔ گڑیا کو آپ کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔ خیال رکھیے گا اس کا ایک ماہ بعد دوبارہ چکر لگاؤں گا تو واپس لے جاؤں گا۔''

اس کی فلائٹ کا وقت ہو رہا تھا۔ لہٰذا بیگ سنبھال کر وہ جانے کو تیار ہو گیا۔ گڑیا اس وقت سو رہی تھی۔ جاگ رہی ہوتی تو اسے کبھی تنہا واپس نہ آنے دیتیں۔ فائزہ آپا نے رخصتی کے وقت اسے خوب پیار کیا تھا۔ ساتھ ہی اپنا خیال رکھنے کی ہدایت بھی کی۔ رات دو بجے پاکستان اپنے گھر واپس پہنچا تھا۔ جناب قدرت اللہ صاحب کی تدفین وہیں ہو گئی تھی کہ فائزہ آپا کا مستقل ٹھکانا وہیں تھا۔

گھر واپسی کے بعد جونہی اس نے ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھا۔ ٹھٹک کر رک گیا۔ ثانیہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بڑے استحقاق کے ساتھ صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ ضبط کی ہزار کوشش کے باوجود اسے دیکھ کر تڑپ اٹھا۔

''تم......؟''

''اوہ! آ گئے تم؟ کتنے دنوں سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میری بیٹی کہاں ہے؟''

''تمہاری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ سنا تم نے؟ اب چلی جاؤ یہاں سے۔ میں تمہاری شکل دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔''

''جانتی ہوں' مگر میں تم سے بہت شرمندہ ہوں شجی! میرا خدا جانتا ہے میں اپنے فیصلے پر بہت پشیمان ہوں' کوئی رات ایسی نہیں ہے جب رو کر نہ سوؤں۔''

''مگر مجھے تمہارے ہنسنے رونے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ دوبارہ اس گھر میں قدم رکھنے کا سوچنا بھی مت۔''

''ٹھیک ہے نہیں سوچوں گی مگر کبھی کبھی تو مل ہی سکتے ہیں ہم۔''

''کیوں اب کیا رہ گیا ہے ملنے کو؟''

وہ تلخ ہوا تھا ثانیہ کا سر جھک گیا۔

''کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے شجاع!''

''نہیں!''

''ٹھیک ہے مت کرو معاف مگر میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

اسے بیٹی کی پروا اب بھی نہیں تھی۔ شجاع اسے نظر انداز کرتا اپنے بیڈروم میں چلا آیا۔

''دوسری بیوی کہاں ہے تمہاری۔ دکھائی نہیں دے رہی۔ گڑیا کا بھی نہیں بتایا تم نے؟'' وہ بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔ شجاع نے بیگ سائیڈ پر رکھ کر خود کو بیڈ پر گرا لیا۔

''وہ دونوں ملک سے باہر ہیں' فائزہ آپا کے پاس۔ اب جاؤ۔''

''جا رہی ہوں۔ مگر کل پھر آؤں گی۔ میری زندگی میں اب حقیقتاً تمہارے سوا کوئی نہیں ہے

شجاع!"

"جسٹ شٹ اپ ثانی! اب چلی جاؤ یہاں سے!"

اس عورت کے لیے کبھی وہ جان دیتا تھا مگر اب وہی عورت خود چل کر اس کے پاس آ گئی تھی ا
بھی وہ اسے دھتکار رہا تھا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ ثانیہ اس کے لہجے پر مسکرائی تھی۔

"اس وقت گرج کر کسے دکھا رہے ہو تم؟ ملازم تو سب جا چکے لاؤ میں سر دبا دوں تمہارا۔ ہا
نہ سہی دوست ہی سہی۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے' خیر میں ایک کام سے آئی تھی تمہارے پاس۔"

"جانتا ہوں میں۔ کام سے ہی آ سکتی ہو تم۔ بولو کیا چاہتی ہو اب؟"

"کچھ خاص نہیں معمولی سی سفارش چاہیے تمہاری۔ اصل میں' میں نے ایک چھوٹا سا کلب ا
کیا ہے یونہی موج مستی کے لیے۔ کئی معزز خواتین کی رکنیت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ بچے بچیاں
آ جاتے ہیں یونہی خود کو فریش کرنے۔ تو میں چاہ رہی تھی کبھی کبھی کوئی خاص فنکشن ہو تو ذرا سا
پلانے کا بندوبست بھی ہو جائے۔ مگر اس کی اجازت نہیں مل رہی۔ اگر تم ذرا سی سفارش کر دو تو
کام بن سکتا ہے۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے میں یہ کام کروں گا۔"

"نہیں' میں جانتی ہوں تم نہیں کرو گے مگر' میں نے سوچا تم سے گزارش کروں تو شاید تم مان جاؤ۔"

"سوری میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ نا آج نا کبھی۔"

"مگر میں بہت امید لے کر آئی ہوں شجاع! تم تو جانتے ہو آج کل نوجوان نسل۔"

"بھاڑ میں گئی نوجوان نسل اور بھاڑ میں گئیں ان کے ساتھ تم۔ کان کھول کر سن لو ثانیہ بیگم! ا
تمہیں اپنی زندگی' اپنے دل' اپنے گھر سے بے دخل کر چکا ہوں۔ لہٰذا میرا اب تم سے کوئی واسطہ نا
ہے۔ اگر میں خواتین کے معاملے میں نرم خو ہوں تو اسے میری کمزوری مت سمجھو' کبھی سب کچھ تم
میرے لیے مگر اب...... کچھ بھی نہیں ہو۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔ اب جاؤ یہاں سے میرا سر پہلے
سفر کی تھکان اور درد سے پھٹ رہا ہے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اس وقت یہاں سے چلی
ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تمہارا اس گھر سے کیا تعلق رہا ہے۔" وہ غصے سے بھپر رہا تھا۔ ثانیہ ایک
اس کے سرخ چہرے پر ڈالتی سر جھکا گئی۔

جانے سے قبل اس نے اپنا کارڈ' سوفے پر رکھا تھا اور پھر بنا ایک لفظ بھی کہے کمرے
نکل گئی۔

❊❊❊

ہر وعدۂ وفا کو بھلانے کا شکریہ
دیوانہ کر کے آنکھ چرانے کا شکریہ
ہم جانتے تھے آپ کے قابل نہیں ہیں ہم
کچھ روز دل کی آس بڑھانے کا شکریہ

تعبیر جن کی دیکھ کر آنکھیں ہیں زخم زخم
اتنے حسین خواب دکھانے کا شکریہ
جن خوش گمانیوں پر تھے آنسو تھمے ہوئے
ان خوش گمانیوں پر ہنسانے کا شکریہ
مانا اسی سلوک کے قابل تھے ہم صنم
ہر فاصلہ مٹا کے بڑھانے کا شکریہ

گوری اس وقت گھر پر نہیں تھی۔ شاہ زر کو ایک ضروری میٹنگ میں پہنچنا تھا مگر اتفاق سے اس وقت اس کا کوئی بھی سوٹ پریس نہیں تھا تبھی مجبوراً اسے کچن میں چاند کے لیے دودھ بوائل کرتی انوشہ کو مخاطب کرنا پڑا۔

''انوش!'' وہ اس کی پکار پر نہیں اس انوکھے طرزِ مخاطب پر چونکی تھی۔ شاہ زر کپڑے اٹھائے عین اس کی پشت پر آ کھڑا ہوا۔ ''اگر ذرا سا وقت نکال کر احسان کر سکو تو پلیز میرا سوٹ پریس کر دو' بہت ضروری میٹنگ میں شرکت کرنی ہے۔''

''بلقیس (نوکرانی) سے کہہ دیں' کر دے گی۔''

''بلقیس بیوی نہیں ہے' تم پریس کرو پلیز!'' اسے بے مقصد ضد ہوئی تھی' وہ تپ اٹھی۔

''بلقیس بیوی نہیں ہے تو میں بھی نوکرانی نہیں ہوں سمجھے آپ!''

''نوکرانی سمجھ کر تو نہیں کہہ رہا تم سے...... بیوی سمجھ کر کہہ رہا ہوں' قسم سے۔'' ایک لمحے میں اس کے لہجے کا انداز اور آنکھوں کا رنگ بدلا تھا۔ وہ سٹپٹا گئی۔

''سوری! میں فارغ نہیں ہوں۔''

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں' محض پانچ منٹ نکال لو گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ انوشہ کے دونوں کندھوں پر دھر دیئے تھے۔ انوشہ کو لگا جیسے وہ آگ کی لپیٹ میں آ گئی ہو۔

''اپنے ہاتھ پیچھے ہٹاؤ شاہ زر آفندی! میں آپ کی ایسی گستاخی قطعی برداشت نہیں کروں گی۔''

''گستاخی کی کیا بات ہے اس میں؟ اب تو قانوناً اور اسلامی نکتہ نظر سے شرعی بیوی ہو میری' کوئی دیوی تو نہیں ہو جو چھونے سے بے حرمتی ہو جائے گی۔'' وہ شرارت پر آمادہ تھا۔ انوشہ کا بی پی شوٹ کر گیا۔

''تم جیسا بے غیرت' بے ضمیر' اور گھٹیا انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔''

''آگے بھی نہیں دیکھو گی ان شاء اللہ! چلو یہ سوٹ پریس کرو شاباش!'' پل میں غصے ہوئے بغیر اس کا موڈ بدلا تھا۔

وہ اس کی ہٹ دھرمی پر مجبوراً سوٹ تھامتی پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے گئی تھی۔ شاہ زر نے اس کے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر بُریرہ کا نمبر ٹرائی کیا مگر اس کا نمبر ہنوز آف مل رہا تھا وہ اداس اداس سا اپنے بیڈ روم میں چلا آیا جہاں چاند کمبل میں چھپا بے خبری کی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ وہ کہنیوں کے بل بیڈ کے کنارے پر ٹکتے ہوئے اس کے چہرے پر جھک گیا۔ زندگی ایک دم سے کتنی خوب صورت

اور مکمل ہوگئی تھی' چاند اس کے بے تحاشا پیار پر کسمسا کر بیدار ہوا تھا۔

''پاپا! سونے دیں نا!''

''صبح ہوگئی ہے پاپا کی جان! اب اٹھ جاؤ۔''

''میں نے نہیں اٹھنا' آپ بھی سو جاؤ نا!''

''ہاہاہاہ میں بھی سو گیا نا تو آپ کی مما نے طوفان اٹھا دینا ہے۔''

''کیوں......! مما ہر وقت ناراض کیوں رہتی ہیں آپ سے؟'' مکمل بیدار ہو کر وہ اب شاہ زر کے گلے میں بانہیں ڈالے پوچھ رہا تھا۔ وہ لاجواب سا ہوگیا۔

''پتا نہیں یار! آپ کی مما کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہے۔ کسنا پڑے گا کسی دن......!'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے اسے کمبل سے نکال کر بانہوں میں اٹھا لیا تھا۔ چاند اب اس کی بات پر کل کل ہنس رہا تھا۔ انوشہ نے اس کا سوٹ پریس کر دیا تھا مگر اس کے لیے ناشتا نہیں بنایا تھا۔ وہ ہرٹ تو ہوا مگر اس پر ظاہر نہیں کیا۔

''شکریہ! اس احسانِ عظیم کے لیے۔'' چاند کو گود سے اتار کر اس کے ہاتھ سے سوٹ لیتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے کہا اور سوٹ لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ آفس کے لیے دیر ہو رہی تھی لہٰذا اس روز بنا ناشتا کیے ہی وہ چاند کو پیار کر کے آفس کے لیے نکل آیا تھا۔ تاہم آنے سے پہلے اس نے ملازم کو بیڈ روم کے علاوہ باقی تمام کمرے لاک کرنے کا حکم دے دیا تھا۔

رات میں وہ خاصی تاخیر سے گھر واپس لوٹا تو وہ لاؤنج میں بیٹھی شاید اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ شاہ زر جانتا تھا کہ وہ اس کا انتظار کر رہی ہوگی تبھی زیرِ لب مسکراتا بنا اس پر نگاہ ڈالے سیدھا اپنے بیڈ روم کی طرف چلا آیا۔ انوشہ جس کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں اس کی اس درجہ چالاکی پر تپ کر رہ گئی۔ اگلے دس منٹ تک وہ اس کے لاؤنج میں آنے کا انتظار کرتی رہی پھر مجبوراً خود ہی اٹھ کر اس کے اور اپنے مشترکہ بیڈ روم میں چلی آئی۔ شاہ زر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اب چاند کے برابر میں لیٹا اسے پیار کر رہا تھا۔

''آپ نے گھر کے تمام کمرے کیوں لاک کروائے ہیں' چوری یا ڈاکے کا خوف تھا آپ کو' میری بے ضرر ذات سے؟'' کچھ تو نیند اور کچھ غصے کی شدت نے اس کی آنکھوں میں خوب سرخی بھر دی تھی۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا چرا سکتی ہو تم شاہ زر آفندی کے گھر سے......؟'' بھرپور نگاہیں اس کے چہرے پر جمائے وہ اٹھ کر پاس آیا تھا۔ انوشہ نے خفگی سے رخ پھیر لیا۔

''میرے لیے اس گھر میں کوئی بھی چیز اتنی نایاب نہیں ہے کہ جسے میں چرانے کی خواہش کروں۔''

''تو پھر سمجھ جاؤ نا کہ میں نے تمام کمرے کیوں لاک کروائے ہیں۔'' اس نے ہاتھ بڑھایا تھا مگر وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

''سمجھ گئی ہوں مگر آپ اچھی طرح سے سمجھ لیں مجھے آپ کا ساتھ' آپ کی رفاقت کسی طور قبول نہیں' میری مجبوری یا بے بسی سمجھ لیں کہ میں یہاں آپ کے ساتھ رہ رہی ہوں ایک چھت کے نیچے

ورنہ جس طرح سے یہاں میرا دم گھٹتا ہے میں ایک پل بھی نہ رکوں۔"
"اٹس او کے بار بار جتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" لب بھینچتے ہوئے وہ برہم ہوا تھا۔ انوشہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا۔
"آپ اپنی فضول حرکتوں سے بار بار مجبور کرتے ہیں کہ آپ کو سب جتایا جائے۔"
"کیا مفاد ہے میرا اس میں بتاؤ...... ؟ جان دینے والی لڑکی کو چھوڑ کر تمہیں اپنایا اپنا نام دیا کیوں؟ میرا کوئی مفاد تھا اس میں...... ؟ نہیں...... یہ سب میں نے تمہارے لیے کیا کیونکہ میں جانتا ہوں جو خطا مجھ سے سرزد ہوئی اس خطا کی پاداش میں تم کسی بھی بہترین سے بہترین انسان کی ہم سفر بن جاؤ گی مگر کبھی خوش نہیں رہ پاؤ گی۔ یہ معاشرہ اس معاشرے کے لوگ کبھی جینے نہیں دیں گے تمہیں اور وہ بچہ جس نے ابھی ٹھیک سے ہوش بھی نہیں سنبھالا ہے اسے کوئی مکمل آسودگی اور زندگی نہیں دے سکے گا۔ اسی لیے بُریرہ کو طلاق دی میں نے کہ یہاں صرف ایک نہیں دو زندگیوں کا سوال تھا۔ تم ساری عمر بھی چلا چلا کر لوگوں کو اپنی پارسائی کا یقین دلاتی رہو پھر بھی سب کو مطمئن نہیں کر سکو گی مگر اب...... کسی کی مجال نہیں کہ کوئی تمہاری ذات پر انگلی اٹھا سکے جو زخم تمہاری ذات پر تمہاری روح پر میرے ہاتھوں لگا اس پر مرہم بھی مجھے ہی رکھنا تھا اور یہی میں نے کیا ہے۔ اب اسے میری شرافت کہو یا محبت کہ میں تمہاری کسی فضول حرکت کا بُرا نہیں مناتا ورنہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو عبدالصمد کی طرح تمہیں تمہاری اوقات چند لمحوں میں اچھی طرح بتا کر رکھ دیتا۔" لفظوں کے دانت نہیں ہوتے مگر پھر بھی یہ کاٹ لیتے ہیں اور جب یہ کاٹ لیتے ہیں تو ان سے لگنے والے زخم زندگی بھر نہیں بھرتے۔ انوشہ رحمٰن کی روح پر بھی کچھ ایسے ہی زخموں کے آبلے پڑے تھے۔ شاہ زر آفندی کے لبوں سے نکلنے والے زہریلے لفظوں کی کاٹ سے اس کی آنکھیں بھر آنے کو بے تاب ہوئی تھیں مگر اس نے کمال ضبط سے اپنے آنسو روک لیے۔ وہ کم از کم اس شخص کے سامنے کبھی کمزور پڑنا نہیں چاہتی تھی جو دنیا میں اس کا سب سے بڑا دشمن تھا۔
"بہت شکریہ میرے بارے میں اتنا سوچنے اور میرا اتنا خیال رکھنے کے لیے واقعی بہت عظیم انسان ہیں آپ۔ اتنے عظیم کہ مجھ جیسی دو ٹکے کی رسوا لڑکی آپ کے ساتھ رہنے کے قابل ہی نہیں مجھے آپ کے احسانوں کا پورا احساس ہے مگر معذرت میں پھر بھی آپ کے ساتھ ایک کمرے میں نہیں رہ سکتی۔"
"کیوں...... ڈرتی ہو تسخیر ہونے سے؟" ایک اور چوٹ...... وہ بلبلا کر رہ گئی۔
"نہیں...... ! سوائے اللہ رب العزت کی پاک ذات کے میں کسی چیز سے نہیں ڈرتی اور رہا تسخیر ہونے کا سوال تو آپ کی خوش گمانیوں کا بھرم قائم رہے اسی میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔"
اس بار ضرب شاہ زر کے دل پر پڑی تھی اور وہ سرتا پیر سلگ کر رہ گیا تھا۔
"اگر ایسی بات ہے تو پھر آج کی رات تم یہیں اسی کمرے میں بسر کرو گی۔"
"ہرگز نہیں! مر کر بھی آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتی میں۔"
"اتنی آگے کی سوچنے کی ضرورت نہیں ہے ابھی فی الحال تم اپنے پورے ہوش و حواس میں زندہ سلامت وہ سب کرو گی جو میں کہوں گا۔" وہ ضد میں آیا تھا اور اسی ضد میں اس نے انوشہ کے منہ پر

ہاتھ جما کر اسے بیڈ پر دھکیل دیا تھا۔ ''بہت گھمنڈ اور خوش فہمی ہے تمہیں اپنی بہادری پر' آج دیکھ لینا میری طاقت کے سامنے تمہاری اس فضول اکڑ کی کیا اوقات ہے۔'' چاند کے اٹھ جانے کے خدشے سے وہ دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ انوشہ کو لگا وہ کسی معصوم چڑیا کی طرح ظالم صیاد کے شکنجے میں پھنس گئی ہو۔ اپنی رہائی کے لیے اس نے ہر حربہ آزمالیا تھا مگر صیاد کی مضبوط گرفت کے سامنے اس کی ہر کوشش بے کار گئی۔ تبھی آخری حربے کے طور پر وہ رو پڑی تھی اور شاہ زر جو آج اسے کسی طور بخشنے کے موڈ میں نہیں تھا اس کے رونے پر کمزور پڑ گیا۔

''اب کیوں رو رہی ہو' وہ سارا طنطنہ' وہ اکڑ کہاں گئی؟''

''تم مرجاؤ شاہ زر! خدا کرے تمہیں کل کا سورج دیکھنا بھی نصیب نہ ہو۔'' رونے کے بعد وہ بد دعاؤں پر اتر آئی تھی۔

شاہ زر زیر لب مسکراتا اسے اپنی فولادی گرفت سے آزاد کر گیا۔

''یہ جو زبان ہوتی ہے نا عورت کی' یہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ عورت اگر اس چھوٹی سی چیز کو قابو میں رکھ لے تو ساری دنیا پر حکومت کر سکتی ہے۔'' وہ طنز کرنے سے باز رہنے والا نہیں تھا۔ انوشہ زارو قطار روتی رہی۔ ''اب چپ کر جاؤ خدا کا واسطہ ہے تمہیں' چاند اٹھ گیا تو دوبارہ نہ سوئے گا نہ سونے دے گا' ویسے بھی میں نے تمہارا کوئی نقصان نہیں کیا۔''

''بکواس بند کرو۔'' بھنا کر کہتی وہ اس پر دھاڑی تھی اور پھر بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''یہ لو چابیاں...... اور جہاں دل چاہتا ہے جا کر سو جاؤ۔ رات میں ڈرو گی تا کسی دن تو میں نہیں آتا مدد کے لیے۔'' اب وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔ انوشہ بنا اس پر نگاہ کیے تیزی سے کمرا چھوڑ گئی۔

''پاگل......!'' اس کے جانے کے بعد سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے اس نے کہا اور پھر سوئے ہوئے چاند کو ایک ہاتھ سے اٹھا کر اپنے بازو پر سلاتے ہوئے خود بھی وہیں لیٹ کر سکون سے پلکیں موند گیا۔

فجر سے کچھ پہلے یونہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ پیاس کا احساس نہیں تھا مگر ایک عجیب سی بے چینی ضرور دل و دماغ کو حصار میں لیے ہوئے تھی۔ کئی بار کروٹ بدلنے کے بعد بالآخر وہ بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کمرے میں ہیٹر آن ہونے کی وجہ سے ٹھنڈک کا احساس زیادہ نہیں تھا۔ لہٰذا ایک نظر سکون سے سوئے چاند پر ڈالتے ہوئے وہ کمرے سے نکل آیا۔ انوشہ لاؤنج میں صوفے پر سو رہی تھی اور سردی سے بچنے کے لیے اس کے پاس سوائے اپنی گرم شال کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ سست روی سے چلتا اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

کیسی کڑی سزا کے سپرد کر رکھا تھا اس لڑکی کی فضول نفرت اور انا نے اس کو' اس وقت سردی کی شدت سے اس کا وجود کانپ رہا تھا اور ہونٹ جیسے نیلے پڑ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا اگر اس نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو ضرور وہ جاگ جائے گی اور پھر وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لیے کچھ نہ کر سکے گا تبھی کچھ سوچتے ہوئے وہ واپس اپنے بیڈ روم میں گیا اور اپنا گرم آرام دہ کمبل لا کر اس پر ڈال دیا۔ جانے کیوں اس لمحے اس کا شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ وہ صوفے سے نیچے ڈھلکتے اس کے ریشمی بالوں کو سمیٹ کر اس کے شانوں پر ٹکا دے' مگر محض اس کی آنکھ کھل جانے کے ڈر سے

اپنے اندر ہی دبا گیا۔
انوشہ کی صبح آنکھ کھلی تو خود کو آرام دہ نرم کمبل میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ رات وہ خاصی اشتعال رو کر سوئی تھی۔ سردی سے اس کا پورا جسم سُن ہو رہا تھا۔ اوپر سے نیند تھی کہ مہربان ہونے کا نام لے رہی تھی مگر...... پھر جانے کب اس کے ربّ کو اس پر رحم آ گیا تھا اور وہ سوگئی تھی' سونے تک کے پاس سوائے گرم شال کے اور کچھ بھی نہیں تھا تو پھر یہ کمبل......!
خاصا الجھا دینے والا معاملہ تھا مگر وہ جان گئی تھی کہ یہ مہربانی کس نے کی ہوگی۔
تو کیا اس کی طرح وہ بھی جاگتا رہا تھا۔
کیا اس پر بھی نیند کی دیوی مہربان نہیں ہوئی تھی؟
نا چاہتے ہوئے بھی وہ سوچتی' صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
''مجھے یہاں نہیں رہنا' کسی صورت بھی نہیں۔''
اگلے ہی پل غصے سے سوچتے ہوئے وہ گویا فیصلہ کر رہی تھی۔

❊❊❊

پیار دے پرم نئی رہ گئے اج کل یاراں وچ
کئی واری میں خبر پڑھی اخباراں وچ
شکلوں سوہنے' اندروں نیتاں بُریاں نیں
منہ تے ہاسے' بغلاں دے وچ چھریاں نیں
مار کے سُٹ گئے یار نوں یار بازاراں وچ
کئی واری میں خبر پڑھی اخباراں وچ

میلے پُرشکن لباس میں سڑک کے بائیں جانب فٹ پاتھ پر بیٹھی وہ چہرے پر آیا پسینہ صاف رہی تھی' جب ترنگ میں یہ اشعار گنگناتے ہوئے واصف کی نگاہ اس پر پڑی۔
''مصحف...... وہ دیکھ' میرال......!'' اور اس کی اطلاع پر وہ جو بے نیازی سے ڈرائیو کر رہا تھا دم گاڑی کو بریک لگا گیا۔
''میرال......اور یہاں......؟''
''یار! مجھے تو وہی لگ رہی ہے۔'' کبھی نہ سنجیدہ ہونے والا واصف اس لمحے سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ مصحف کے ہاتھوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ واضح جھلکنے لگی تھی۔
''وہ میرال نہیں ہے مگر میرال کی فوٹو کاپی ضرور ہے۔''
''میرا خیال ہے ہمیں ایک بار اسے قریب سے جا کر دیکھنا چاہیے۔''
''نہیں......وہ بُرا منا سکتی ہے۔''
''جانے دے یار! تو نکل باہر......شاباش!'' گاڑی میں اب بھی وہی بول گونج رہے تھے۔
''کئی واری میں خبر پڑھی اخباراں وچ''
فٹ پاتھ زیادہ دور نہیں تھا اور اس وقت ہلکی ہلکی چبھتی ہوئی دھوپ میں خود اپنے حال سے بے کسی کے انتظار میں بیٹھی' صاعقہ احمد کو وہ بول بخوبی سنائی دے رہے تھے۔ درد بھری آواز میں

گانے والے نے کمال کیا تھا' اسے لگا وہ اشعار جیسے اسی کے لیے تخلیق ہوئے اور گنگنائے گئے ہیں' آنکھوں کے گوشوں میں صرف چند لمحوں کے اندر خاصا پانی بھر آیا تھا جسے اس نے ہاتھ کی پشت سے صاف کرلیا۔

''یہ تو رو رہی ہے یار!''

''ہوں..... مگر پھر بھی میں اس سے بات ضرور کروں گا۔'' واصف اپنے ارادے میں پختہ دکھائی دے رہا تھا۔ مصحف نے کندھے اُچکا دیئے۔

''ایکسکیوز می!''

صاعقہ اس پکار پر متوجہ ہونا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی اس نے سر اٹھا کر ان دونوں پر نگاہ ڈالی تھی۔

''جی......!''

''اگر آپ بُرا نہ مانیں تو کیا ہم آپ کا نام جان سکتے ہیں؟''

''نہیں!''

''او کے......! کیا آپ کسی میرال کو جانتی ہیں؟''

''نہیں.....'' اس کا چہرہ سپاٹ اور لہجہ برفیلا تھا۔ مصحف بے ساختہ رخ پھیر گیا۔

''دیکھیے...... میرا نام واصف ہے اور یہ مصحف ہے میرا دوست۔ اس شہر میں ہمارے نام اور مقام سے شاید کوئی بھی ناواقف نہ ہو' آپ اچھی لڑکی ہیں اور مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے' کیا آپ ہم پر بھروسا کرتے ہوئے کسی اچھی جگہ بیٹھ کر ہماری بات سن سکتی ہیں؟''

''نہیں......!''

اس کا انداز نہیں بدلا تھا۔ اسی لمحے آمنہ وہاں چلی آئی۔

''صاعقہ یار! یہاں بھی بات بننا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں یہ احمقانہ خیال اب اپنے دماغ سے نکال ہی دینا چاہیے۔'' بنا مصحف اور واصف پر توجہ دیئے وہ خاصی مایوسی سے اسے بتا رہی تھی۔ صاعقہ کا چہرہ لمحے میں تاریک پڑ گیا۔

''ٹھیک ہے' چلو! مگر میں ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' وہ کھڑی ہوئی تھی جب واصف نے دوبارہ مخاطب کرلیا۔

''ایکسکیوز می! اگر آپ بُرا نہ مانیں تو ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔''

''کیا مدد کر سکتے ہیں آپ ہماری؟'' اس بار وہ سلگی تھی جب کہ آمنہ حیرانی سے ان دونوں کو جانچ رہی تھی۔

''آپ کو کیا مدد چاہیے؟'' وہ بھی سنجیدہ تھا۔ صاعقہ نے کچھ سوچتے ہوئے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔

''مجھے ٹیلی ویژن میں کام کرنا ہے' ڈھیر سارا روپیہ کمانا ہے۔ بتایئے دلا سکتے ہیں مجھے کام.....؟''

''ہاں......! ٹیلی ویژن میں کیا' آپ چاہیں تو فلم میں بھی کام کر سکتی ہیں۔'' اس بار حیران ہونے کی باری آمنہ اور صاعقہ کی تھی۔

''میرا خیال ہے ہمیں ان کی بات سننی چاہیے۔'' صاعقہ نے فوری فیصلہ کرلیا تھا۔ آمنہ اس کا

دیکھتی رہ گئی۔
"پاگل ہو گئی ہو کیا تم نہیں جانتیں آج کل کراچی میں کیسے حالات چل رہے ہیں؟ مجھے تو شکل سے ہی دونوں خطرناک دکھائی دے رہے ہیں۔" اس کے کان میں منہ گھساتے ہوئے اس نے اسے روکنا چاہا تھا جب واصف بول اٹھا۔
"آپ اللہ کو حاضر ناظر جان کر ہم پر مکمل بھروسا کر سکتی ہیں سسٹر!"
"تو ٹھیک ہے آپ اپنا سیل نمبر دے دیجیے ہم گھر جا کر خود آپ سے فون پر بات کر لیں گے۔"
"ٹھیک ہے یہ لیجیے وزیٹنگ کارڈ' میں آپ کی کال کا انتظار کروں گا۔" واصف نے مایوس نظر آتے ہوئے والٹ سے اپنا کارڈ نکالنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی تھی۔ صاعقہ اس کا کارڈ تھام کر اس پر سرسری نگاہ ڈالتی' آمنہ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔
"تمہیں کیا لگتا ہے' کیا یہ کال کرے گی؟"
"ہاں' ضرورت سب کچھ کروا دیتی ہے۔" وہ پُر امید تھا۔ مصحف شانے جھٹک کر گاڑی کی طرف چلا آیا۔

❁❁❁

"کیا تم اس لڑکے کو کال کرو گی؟" گھر آ کر آمنہ نے چادر اتارتے ہی اس سے پوچھا تھا۔ جواب میں وہ چار پائی پر آڑی ترچھی لیٹ گئی۔
ہوں' ضرور کروں گی۔ جانے کیوں مجھے لگتا ہے جیسے میرا خدا میری غیبی امداد کرنا چاہ رہا ہے۔"
"لیکن مجھے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا' میرا خیال ہے ہم پھر سے کوئی جاب ڈھونڈتے ہیں۔"
"ہر گز نہیں...... دس بارہ ہزار کی جاب بھی اب میری زندگی کا مقصد نہیں ہے' مجھے ہزاروں لاکھوں روپیہ چاہیے آمنہ! بینک بیلنس گاڑی سب کچھ چاہیے۔"
"مگر کیوں......؟ جب تمہیں اس شخص کے سنگ چلنا ہی نہیں' اسے پانا ہی نہیں تو پھر اس کے لیے یوں خود کو برباد کرنے کا کیا مقصد۔"
"تمہیں نہیں بتا سکتی' جو آگ میرے اندر سلگ رہی ہے اس کی اذیت کو تم جان بھی نہیں سکتیں' میں چاہے مر جاؤں مگر صرف ایک بار اسے دکھانا ضرور چاہوں گی کہ عورت اگر کسی چیز کو زندگی کا مقصد بنا لے تو پھر اسے حاصل کر کے رہتی ہے' صرف محبت ایک ایسی چیز ہے آمنہ جو ہرا دیتی ہے عورت کو ورنہ دنیا کی کون سی چیز ہے جو عورت پانا چاہے اور پا نہ سکے۔"
"ہو سکتا ہے وہ مجبور ہو' تمہیں سب کچھ سچ بتانا چاہتا ہو مگر......"
"پلیز اسٹاپ اٹ آمنہ...... کوئی ذکر نہیں ہوگا ہمارے بیچ اس شخص کا' شدید نفرت کرتی ہوں میں اس شخص کے تصور سے بھی۔"
"اِٹس او کے' میں ٹھنڈا لاتی ہوں۔ پھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"
"نہیں اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں گھر جاؤں گی اب' صبح میرے ساتھ پھر مزید خواری کے لیے تیار رہنا۔"
"مگر......!"

''تو اگر مگر مائی ڈیئر! بس چلوں گی اب!'' وہ آج کل بہت تلخ اور ضدی ہو گئی تھی۔ آمنہ کا دل دکھ سے بھر گیا۔

''کاش! تمہارا منہ ہوتا اے محبت اور میں وہ نوچ سکتی۔''

بیرونی دروازے کی دہلیز پار کرتی صاعقہ احمد کی چال کی شکست دیکھتے ہوئے بے ساختہ وہ بڑبڑائی تھی اور پھر دروازہ بند کر کے وہیں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔

صاعقہ رکشہ لے کر گھر پہنچی تو شام خاصی ڈھل چکی تھی۔

''کہاں تھیں تم! مالک مکان تین چکر کاٹ گیا ہے گھر کے...... کہہ رہا تھا شام تک کرایہ نہ دیا تو سامان نکال کر باہر پھینک دے گا' سمعان کو بخار تھا پھر بھی دیہاڑی کے لیے چلا گیا ہے' چھوٹے دونوں بھی کام کے لیے گئے ہیں' ابھی تک واپس نہیں لوٹے۔''

''ایان بھائی کا پتا نہیں چلا؟''

''کہاں سے چلنا ہے خبر تک تو ہونے نہیں دی تُو نے ان کی' اتنا نہیں ہو سکا کہ ایک دو دن کا صبر ہی کر لیتیں۔ اچھا بھلا گھر مل گیا تھا آرام دہ' پتا نہیں اچانک کیا سمائی دماغ میں جو کھینچ کر یہاں لے آئیں۔'' صائمہ بناء اس کے حال پر غور کیے غصہ نکال رہی تھی۔ وہ بے حس سی کچن میں چلی آئی۔

''اپنی مرضی سے تعلق بناتی ہو اور پھر بنا کسی سے مشورہ کیے اپنی مرضی سے ختم بھی کر دیتی ہو' پتا نہیں کیا چاہتی ہو تم ذرا گھر والوں کی خوشیوں کا خیال نہیں ہے تمہیں۔'' وہ بڑبڑاتی اس کے پیچھے ہی کچن میں چلی آئی تھی۔

صاعقہ کا دماغ گھوم گیا۔

''میں نے گھر والوں کی خوشیوں کا ٹھیکا نہیں لیا ہوا...... سمجھیں تم! نہ ہی کسی کی خیرات پر جیتی ہوں میں۔''

''تم پاگل ہو گئی ہو صاعقہ! اور کچھ نہیں ہے۔''

''کاش ہو جاتی پاگل!'' اس سے پہلے کہ آنکھیں بھر آتیں' زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ چولہے کے سامنے بیٹھ گئی۔

''اماں کو کچھ بنا کر دیا ہے کہ نہیں......؟''

''کہاں سے بنا کر دوں؟ جو راشن تم لائی تھیں کب کا ختم ہو چکا' اب پانی ہی ابال کر دے سکتی ہوں۔''

''دودھ بھی نہیں ہے؟''

''نہیں!''

''ٹھیک ہے میں کرتی ہوں کچھ بلکہ پہلے مالک مکان کے پاس جاتی ہوں' سنا ہے بڑا دل پھینک آدمی ہے اس عمر میں بھی۔''

''ہاں! مگر تم کیوں جاؤ گی اس کے پاس؟''

''اپنے گھر والوں کی راحت کے لیے......''

''کیا مطلب......؟''

''مجھ جیسی لڑکیوں سے ان کے کسی بھی عمل کا مطلب نہیں پوچھا کرتے صائمہ!''

''کیا مطلب ''مجھ جیسی'' ......؟''

''پتا نہیں...... یہ دنیا اس دنیا کے لوگ' بہت تکلیف دہ رائے اور لفظ استعمال کرتے ہیں ''مجھ ...ی' حالات اور تقدیر کی ستائی ہوئی باغی لڑکیوں کے لیے' کوئی آوارہ کہتا ہے تو کوئی بدکردار' کسی کے ...س اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ ''مجھ جیسی'' لڑکیوں کے پیچھے ان کی مجبوریوں کے احوال بھی جان لے۔''

''تمہیں کیا ہوگیا ہے صاعقہ! تم ایسی تو نہیں تھیں۔''

''پتا نہیں کیا ہوگیا ہے مجھے' میں آتی ہوں ابھی۔''

بے سدھ سی' دھیمے لہجے میں کہتی وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ صائمہ پریشان سی اس ...ی عزت اور سلامتی کی دعا کرتی جانے کیا کیا پڑھ کر اس پر پھونکتی رہی۔ مغرب کے قریب کہیں وہ ...اپس آئی تو اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کی کچھ اشیاء کے شاپرز تھے۔

''کیوں گئی تھیں تم مالک مکان کے پاس...... سمعان کئی بار تمہارا پوچھ چکا ہے۔''

''بتا کر تو گئی تھی تمہیں کہ کیوں جا رہی ہوں۔ وہ دل پھینک بڈھا ہے اور میں اسے بے وقوف ...انے گئی تھی تا کہ میری غیر موجودگی میں وہ دوبارہ تم لوگوں کو پریشان نہ کرے۔''

''یہ ٹھیک نہیں ہے صاعقہ! کسی کو پتا چل گیا تو بہت غلط باتیں پھیلیں گی۔''

''پہلے کیا ٹھیک ہے ہماری زندگی میں؟ ویسے بھی جس کے پاس پیسہ نہیں ہوتا لوگ ان کی ...یہاں بھی خامیوں میں شمار کرتے ہیں۔ کیسی محبت' کیسی انسانیت' سب بکواس ہے صائمہ! کسی ...ریب کو کوئی حق نہیں کہ وہ عزت دار کہلائے' یہاں عزت کے لائق صرف وہی لوگ ہیں کہ جن کی ...یب نوٹوں سے بھری ہوتی ہے۔ وہ نوٹ خواہ کسی غریب کا خون نچوڑ کر حاصل کیے گئے ہوں یا اپنا ...میر بیچ کر...... اب شرافت اور محبت کا اچار نہیں ڈالتا کوئی......''

''مگر......!''

''اگر مگر کی بحث میں پڑنا چھوڑ دو صائمہ! ہماری سزا ہے یہ کہ لوگ ہماری تضحیک کریں اور جو ...اہیں الزام لگائیں۔ میں نے کان لپیٹ لیے ہیں تم بھی لپیٹ لو۔'' وہ ازحد سنجیدہ اور آزردہ تھی' ...صائمہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

❋❋❋

''عباد......!'' اپنا والٹ اٹھا کر وہ ابھی کمرے سے نکلنے کا قصد کر رہا تھا کہ آسیہ بیگم نے اسے ...ارلیا۔

''جی مما......!''

''کہاں جا رہے ہو؟ مجھے بات کرنی تھی تم سے۔''

''ابھی تو ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں' آپ بتائیے کیا بات ہے......؟''

''تمہارے کام کی بات ہے' اصل میں تمہارے پاپا اس لڑکی کے گھر والوں سے ملنا چاہتے

ہیں۔'' وہ خوب ہوشیاری سے پتے پھینک رہی تھیں۔ عباد کے اندر پھر بے چینی پھیل گئی۔

''ٹھیک ہے مما! ایک دو روز میں ملواتا ہوں ان سے۔'' وہ پریشان بھی تھا اور مصروف بھی۔

آسیہ بیگم اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

''ٹھیک ہے' میں کہہ دوں گی ان سے۔''

''شکریہ!'' سرعت سے کہہ کر وہ کمرے سے نکل آیا تھا۔

اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں وہ صاعقہ کے علاقے میں تھا...... وہ گھر لاک ملا تھا جو سڈنی جانے سے قبل اس نے خود اسے کرایہ پر لے کر دیا تھا۔

وحشت سی وحشت تھی!

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ وہ لڑکی جو اس کے لیے خوش بُو کے احساس کی مانند تھی' اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ دل کی بے چینی حد سے سوا تھی' کئی بار آمنہ سے رابطے کی کوشش کی مگر وہ گھر پر ہی نہ ملی۔ اس کا دل چاہا وہ سڑک پر بیٹھ کر روئے یا گاڑی کسی درخت میں دے مارے۔ اگر اسے خبر ہوتی کہ اس کا ٹور اس سے اس لڑکی کی محبت چھین لے گا تو وہ کبھی سڈنی نہ جاتا۔ مسلسل ایک ہفتہ اس نے صاعقہ کی تلاش جاری رکھی تھی مگر بدلے میں سوائے مایوسی کے اور کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ آسیہ بیگم اس کی حالت نوٹ کر رہی تھیں' پچھلے ایک ہفتے سے وہ بے حال تھا' کھانے پینے سے بے پروائی کے ساتھ ساتھ وہ خود اپنی ذات سے بے پروائی بھی برت رہا تھا۔ رات بھر اس کے کمرے کی لائٹ جلتی رہتی تھی۔ اس روز ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اوپر اس کے کمرے میں چلی آئی تھیں۔

''عباد!'' وہ تکیہ بانہوں میں دبائے گہری نیند سو رہا تھا۔ کمرے کا حال بھی اس کی طرح ابتر تھا۔ کہیں کوئی چیز ٹھکانے پر پڑی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سرخ و سفید چہرہ کملا کر رہ گیا تھا' آنکھوں کے نیچے حلقے الگ پڑ گئے تھے۔ انہیں لگا جیسے کسی نے ان کا دل مٹھی میں لے لیا ہو۔ ''عباد!'' بہت پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے پھر اسے پکارا تھا۔ جواب میں عباد نے ہلکا سا کسمسا کر آنکھیں کھول دیں' اس کا جسم آگ کی مانند دہک رہا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں' کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی؟'' ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ عباد نے اپنا سر چپکے سے ان کی گود میں رکھ دیا۔

''مما......! مجھ سے وہ لڑکی کھو گئی ہے۔'' کہنے کے ساتھ ہی وہ بلک بلک کر رو پڑا تھا بالکل کسی ننھے سے معصوم بچے کی طرح۔ آسیہ بیگم کو لگا ان کا دل رک جائے گا۔

''اتنا پیار کرتے ہو اس سے تو کہاں گئی؟''

''پتا نہیں مما! لیکن کہیں کچھ بہت غلط ہوا ہے' وہ ایسی نہیں ہے کہ یوں راستہ بدل کر کہیں جا سکے۔''

''اتنا یقین ہے اس پر؟''

''اس پر نہیں مما اپنی محبت پر یقین ہے۔''

''اچھا سنبھالو خود کو...... تمہارے پاپا دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے۔'' نظریں چراتے ہوئے انہوں نے اس کے بال سہلائے تھے۔

''ہادیہ اچھی لڑکی ہے خاندان سے ہے پھر بہت پیار بھی کرتی ہے تم سے...... میری مانو تو اس کے لیے ہامی بھرلو' خوش رہو گے۔''

''نہیں......! وہ نہیں تو کوئی نہیں مما!''

''ایسا کیا ہے اس میں؟ تمہیں پتا ہے یہ مڈل کلاس گھرانے کی لڑکیاں بہت چالاک ہوتی ہیں' پیسوں کے لیے امیر لڑکوں کو پھانستی ہیں اور جب کنگال کر دیتی ہیں تو خالی برتن کی طرح پھینک کر چلی جاتی ہیں' تمہیں اس کے لیے اتنا جوگ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''وہ ایسی نہیں ہے مما! مجھے نہیں پتا مڈل کلاس گھرانوں کی لڑکیاں کیا ہوتی ہیں کیا نہیں' میں جاننا بھی نہیں چاہتا مگر میں اس کو جانتا ہوں۔ وہ ایسی نہیں ہے' اسے نہیں پتا میں کون ہوں' کیا ہوں' میری کیا حیثیت' کیا مقام ہے وہ تو بس پیار کرنا جانتی ہے' زندگی کی آزمائشوں اور ذمہ داریوں میں پھنسی وہ صرف مجھے دل سے پیار کرتی ہے' میری ذات کی قدر کرتی ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے' مل جائے گی کہیں نہ کہیں' ابھی اٹھو اور تھوڑا سا کچھ کھالو' پھر میں ڈاکٹر صاحب کو بلوا لیتی ہوں' چیک اپ کرلیں گے۔''

''نہیں! اس کی ضرورت نہیں ہے' میں ٹھیک ہوں' آفس جا رہا ہوں تھوڑی دیر میں۔''

''پاگل ہوئے ہو؟ اتنا بخار ہے اور کہتے ہو ٹھیک ہوں' ہرگز نہیں اور آفس کا تو نام بھی نہیں لینا۔''

''نہیں مما! مجھے آفس جانا ہے' کیا پتا وہ آجائے۔''

''تم پاگل ہوگئے ہو عباد! اور کوئی بات نہیں ہے۔''

''محبت پاگل ہی تو کر دیتی ہے مما!'' زخمی سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلا کر کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ آسیہ بیگم بے بس سی اسے دیکھتی رہ گئیں۔

❁❁❁

''صاعقہ! تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔''

''خوش خبری......! اور میرے لیے...... ہاہ! مذاق تو نہ اڑاؤ یار!''

''سچ کہہ رہی ہوں پاگل لڑکی! وہ پرسوں ہم جن ڈائریکٹر صاحب سے ملنے گئے تھے نا! انہوں نے کال بیک کی تھی کہہ رہے تھے کہ آکر مل لیں' کوئی نئی سیریل ڈائریکٹ کر رہے ہیں آج کل۔''

''سچ......!''

''اور نہیں تو کیا!''

''پھر تو واقعی اچھی خبر ہے چلو چلیں۔''

''چلتے ہیں' بس یہ ذرا سے کپڑے دھو کر پھیلا دوں۔''

''کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں...... سمجھیں!'' آمنہ کی والدہ کی کڑک دار آواز پر وہ دونوں چونکی تھیں۔

''جب دیکھو یہ لڑکی کہیں نہ کہیں آوارگی پر تیار رہتی ہے اور تم اتنی بے شرم ہو کہ ماں سے اجازت لینا بھی گوارا نہیں کرتیں' تمہارے باپ کو تمہارے کرتوتوں کا پتا چل گیا تو تمہارے ساتھ

میری چٹیا بھی پکڑ کر گھر سے باہر کر دیں گے۔''

''اماں!''

''چلاؤ مت...... اس کی ماں اس کی کمائی کھاتی ہوگی اسی لیے روک ٹوک نہیں کرتی ایسا کوئی لالچ نہیں ہے۔ آئی سمجھ! بہت دن برداشت کر لی تیری خودسری' اب دیکھتی ہو ہماری عزت کا جنازہ نکالتی پھرتی ہو تم۔'' وہ اپنی جگہ ایک فیصد بھی غلط نہیں تھیں مگر صاعقہ کو کسی نے زہر میں بجھا خنجر اس کے سینے میں پیوست کر دیا ہو۔ دکھ کی شدت سے گنگ وہ انہیں رہ گئی تھی۔

''صاعقہ! پلیز تم اماں کی بات کا بُرا مت ماننا' انہیں عادت ہے وقت بے وقت فضول بو لنے

''بکواس بند کرو اور جا کر ہانڈی چڑھاؤ' بڑی آئی تمیز دار ہمدرد بی بی!'' اس کی معذرت پھر ڈپٹتے ہوئے بولی تھیں۔ صاعقہ کو لگا وہ اگر ایک منٹ بھی وہاں رکی رہی تو رو پڑے گی۔

''میں چلتی ہوں آمنہ! تم اپنا خیال رکھنا۔''

''صاعقہ!'' وہ تڑپ کر اسے روکنا چاہتی تھی مگر صاعقہ اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے سرعت سے پلٹ کر اس کے گھر کی دہلیز پار کر گئی۔

''جب دیکھو یہ لڑکی کہیں نہ کہیں آوارگی پر تیار رہتی ہے اور تم اتنی بے شرم ہو کہ ماں سے اجازت لینا بھی گوارا نہیں کرتیں' تمہارے باپ کو تمہارے ان کرتوتوں کا پتا چل گیا تو تمہارے ساتھ میری چٹیا پکڑ کر مجھے بھی گھر سے باہر نکال دیں گے۔''

آمنہ کی ماں کی زہریلی آواز نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ وہ کھینچ کر سانس لیتی' آنسو دھند میں چلتی رہی۔

''اس کی ماں اس کی کمائی کھاتی ہوگی اسی لیے روک ٹوک نہیں کرتی' مگر مجھے ایسا کوئی لالچ نہیں ہے' سمجھیں!''

کتنے نوکیلے تھے یہ لفظ..... کانٹوں اور پتھروں سے بھی زیادہ مگر وہ ضبط کیے چلتی رہی۔ راستہ طے کرنے کے بعد اچانک اس کے پاؤں میں شدید تکلیف کا احساس ہوا رک کر دیکھا پاؤں لہولہان ہو رہا تھا۔ جانے کب کہاں کانچ کا ٹکڑا پاؤں میں پیوست ہو کر اسے زخمی کر گیا تھا نے رک کر پاؤں کو پکڑا اور زور سے کھینچ کر خون سے سُرخ ہوا کانچ کا ٹکڑا باہر نکال لیا۔

اگلے تیس منٹ کے بعد وہ مطلوبہ ڈائریکٹر کے سامنے تھی۔

''تو آپ ہیں صاعقہ!''

''جی......!''

''شوبز میں کیوں آنا چاہتی ہیں؟''

''اور لوگ کیوں آتے ہیں۔''

''مختلف مقاصد ہوتے ہیں ان کے' کوئی شہرت کے لیے تو کوئی دولت کے لیے' البتہ کچھ آپ بھلانے اور خود کو بہلانے کے لیے بھی آ جاتے ہیں اس طرف......!''

''میں بھی خود کو بھلا دینا چاہتی ہوں' ڈھیر سارا پیسہ کمانا چاہتی ہوں۔''

کو بھلانا آسان نہیں ہوتا مس صاعقہ!"
تی ہوں اسی لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔"
جانتے ہوئے بھی کہ لوگ اس فیلڈ کو اچھا نہیں سمجھتے۔"
وں!"
ڈ......!" وہ مسکرائے تھے پھر اچانک نگاہ اس کے پاؤں پر پڑی تو چونک اٹھے۔
ے...... یہ آپ کے پاؤں اتنے زخمی کیوں ہیں؟"
کی نشان دہی پر صاعقہ نے ذرا سا سر جھکا کر اپنے زخمی پاؤں پر نگاہ کی تھی پھر گہری سانس
وئے بولی۔
یہ محبت کے زخم ہیں آصف صاحب! جو بھی اس نگر کو گیا اسے واپسی کی راہ میں یہ زخم سمیٹنا ہی
ں۔"
اوہ! میرا خیال ہے آپ کو ایک چانس ضرور ملنا چاہیے۔ ٹھیک ہے آپ کل اسی ٹائم مل لیجیے گا
......!"
شکریہ......!" بنا سامنے چائے کے کپ کو ہاتھ لگائے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

❀❀❀

"جلدی تیار ہو جاؤ یار! آج کے فنکشن میں ٹائم پر پہنچنا بہت ضروری ہے۔"
"کیوں؟" وہ جو بیڈ پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی ارسلان کی آمد پر جیسے خواب سے جاگ اٹھی۔
"کیوں سے کیا مطلب...... کل بتایا تو تھا بہت بڑا فنکشن ہے۔ بڑے بڑے نامور لوگ شرکت
ں گے، اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی تم پسند آ گئیں تو سمجھو بات بن گئی تمہاری۔" وہ ترنگ میں
بیڈ کے کونے میں ٹک گیا تھا۔
امامہ کے لبوں پر زخمی سی مسکان بکھر گئی۔
"اس کا مطلب ہے تم "چارا" تیار کرنے آئے ہو تا کہ بھینس کو کھلا کر اس سے دودھ حاصل
کو۔"
"بکواس نہ کرو یار! جینے کے لیے سو حیلے کرنے ہی پڑتے ہیں۔ اس وقت ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں
یوں دوستوں کے گھر کب تک رکھوں گا میں تمہیں، نہ تو شادی کر سکتا ہوں نہ ہی تنہا چھوڑ کر کہیں
سکتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے، تم چلو میں تیار ہو کر آتی ہوں۔" عادت کے برخلاف اس نے بہت جلدی بات
لی تھی۔ ارسلان خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔
اگلے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ دونوں نائٹ کلب میں تھے۔
"یہ امامہ ہیں میری کزن! انگلینڈ سے آئی ہیں۔" ہزار بار کا بولا ہوا جھوٹ وہ ایک مرتبہ پھر
ل رہا تھا۔ اس بار مقابل کوئی ماڈل تھا۔
"نائس ٹو میٹ یو...... میرا نام فہد ہے، دیکھا ہو گا ٹی وی پر آپ نے۔" مسکرا کر اپنا تعارف

کرواتے ہوئے اس نے مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا تھا۔ جواب میں امامہ نے ذرا سی جھجک کے بعد اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"سوری......! میں ٹی وی نہیں دیکھتی' بہر حال آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

"شکریہ! ویسے میرا خیال ہے آپ کو ماڈلنگ کی طرف آنا چاہیے۔"

"کیوں......؟"

"کیوں کیا......! آپ خوب صورت ہیں' ذہین ہیں' پھر اس فیلڈ میں بہت پیسہ ہے۔"

"مگر مجھے انفارمیشن نہیں ہے' کوئی ہیلپ بھی نہیں۔"

"ہیلپ کو چھوڑیں آپ...... آپ جیسے خوب صورت لوگوں کو ہیلپ کی ضرورت نہیں ہوتی' بس ہامی بھریں اور آفر کی جھولی میں۔" ارسلان قریبی میز پر بیٹھا سب سن رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا امامہ مسکرا دی۔

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے آفرز آپ کے ہاتھ میں ہوں۔"

"بس یہی سمجھ لیں کہ ہاتھ میں ہے' میرے ساتھ ہی کچھ ایڈ کر لیجیے گا۔"

"یہ تو بہت امیزنگ ہے' میں ضرور کرنا چاہوں گی۔"

"شکریہ! بات ماننے کے لیے...... چلیں کہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" وہ جانتی تھی کہ اب اسے کیسی باتیں کرنی ہیں' تبھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ارسلان نے بے ساختہ گہری سانس بھر کر سر کرسی کی پشت سے ٹکایا تھا۔

آنے والے دنوں میں فہد کی مدد سے امامہ نے بہت کامیابیاں سمیٹیں۔ شروع کے دو تین ایڈ میں بھرپور پذیرائی کے بعد جیسے اس پر آفرز کی بوچھاڑ ہو گئی تھی۔ اب فہد کو اس سے تعلق رکھنے پر رشک آ رہا تھا۔ فہد کے بعد جہاں زیب نامی ماڈل کے ساتھ اس کی دوستی ہو گئی تھی اور جہاں زیب اسے ماڈلنگ سے فلم کی طرف لایا تھا۔ ایک کے بعد ایک کامیابی اس کے قدم چوم رہی تھی۔ ارسلان کو اسی کی مدد سے کام مل گیا تھا۔ دونوں مل کر مصروف ہو گئے تھے۔ دن بھر خود کو "دنیاداری" اور "رنگ و نور" کے نشے میں مصروف رکھنے کے بعد رات کو جب وہ بستر پر لیٹتی' تو شجاع اور گڑیا کے ساتھ ساتھ قدرت اللہ صاحب بھی شدت سے یاد آتے اور آنکھ سے ان کی یاد شفاف موتیوں کی صورت گالوں پر بکھر آتی۔

"جانے گڑیا کس حال میں ہوگی' اسے یاد بھی کرتی ہوگی کہ نہیں......" یہی سوال اسے بے کل کیے رکھتا۔ اس روز کسی نئے پروجیکٹ کے سلسلے میں اسے ایک تقریب اٹینڈ کرنی تھی۔ جہاں زیب نے اسے اس تقریب کے لیے اپنے پیسوں سے شاپنگ کروائی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کی خوب صورت ساڑھی میں ملبوس وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ جہاں زیب اسے اپنے حوالے سے مختلف لوگوں سے ملوا رہا تھا۔ جانِ محفل بنی وہ ہر کسی سے داد و تحسین سمیٹ رہی تھی۔ کھانے کے بعد جہاں زیب اور وہ ایک میز کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے جب جہاں زیب نے چپکے سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"مومی! آگے کی زندگی کے لیے کیا سوچا ہے تم نے......؟"

''کیا سوچنا ہے؟''

''میں شادی کی بات کر رہا ہوں۔''

اس کا ہاتھ ایک انداز سے اپنے لبوں سے لگاتے ہوئے اس نے کہا تھا اور امامہ کے مسکراتے لب فوراً سمٹ گئے۔ دایاں ہاتھ اٹھا کر جہاں زیب کے ہاتھوں سے اپنا بایاں ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس نے ذرا سی نگاہ پھیری تھی اور پھر جیسے وہیں پتھر کی ہو گئی۔

شجاع حسن مکمل یونیفارم میں ملبوس قہر برساتی نگاہوں سے اسی کی طرف دیکھتا اسے شاکڈ کر گیا تھا۔

❋❋❋

ابھی ٹھہرو ابھی کچھ دن لگیں گے
وصل کو خواہش بنانے میں
تمہیں اپنا سمجھنے کے لیے دل کو منانے میں
وفا کیا ہے' تقاضائے محبت کی حدیں کیا ہیں؟
حدوں کی سرحدیں کیا ہیں؟
پھر ان کے پار جانے کا سبب کیا ہے؟
دھیان و بے دھیانی میں
تمہاری بھٹکتی باتوں کی ندیا کی روانی میں
کہانی ہی کہانی میں
ابھی ٹھہرو' ابھی کچھ دن لگیں گے
رشتہ بے نام کو' ہم نام کرنے میں
کہانی کو کسی آغاز سے انجام کرنے میں
کہیں اظہار کرنے میں' کہیں اقرار کرنے میں
ابھی ٹھہرو' ابھی کچھ دن لگیں گے

نگاہیں ٹیلی ویژن اسکرین پر جمائے وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا جب انوشہ آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں چلی آئی۔

''السلام وعلیکم!''

وہ بے ساختہ چونکا تھا۔

''وعلیکم السلام' خدا کا شکر ہے کہ شکل نظر آئی۔ کہاں تھیں دن بھر؟''

انٹرویو دینے گئی تھی جاب کے لیے اور میرا انتخاب بھی ہو چکا۔''

''اچھا......انٹرویو دیتے ہی انتخاب ہو گیا؟''

''جی ہاں......'' اس کی مبہم مسکراہٹ پر وہ تپ گئی تھی۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم جاب کیوں کرنا چاہتی ہو؟''

اگلے ہی پل وہ سنجیدہ ہوا تھا۔ انوشہ نے رخ پھیر لیا۔

''ہاں...... جو تعلق آپ نے زور زبردستی اور دھوکے سے میرے ساتھ باندھا ہے۔ میرے لیے اس تعلق کی کوئی اہمیت نہیں' میں اب بھی نفرت کرتی ہوں تم سے' میرے لیے اب بھی تمہارا ایک روپیہ اپنی ذات پر خرچ کرنا حرام ہے۔ تم جانو یا نہ جانو مگر میں نے اب تک تمہارے گھر میں سوائے پانی کے اور کوئی چیز اپنے حلق سے نہیں اتاری' تم سمجھتے ہو تم نے اس سنسان جزیرے کو فتح کر کے بڑا کام کیا' مگر میں آخری سانس تک خود پر تمہارا حق تسلیم نہیں کروں گی۔''

ایک سناٹا تھا جو ان الفاظ پر شاہ زر کے اندر تک اتر گیا تھا۔ وہ سپاٹ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ نفرت اور ضد کی اگر کوئی حد تھی تو انوشہ رحمٰن پر وہ حد ختم تھی۔

''ٹھیک ہے اور کچھ......؟''

گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے اس لڑکی کی نفرت سے شکست تسلیم کی تھی۔

''اور کچھ نہیں' میں ایک ہی کمرے میں آپ کے ساتھ نہیں رہ سکتی' اس لیے میں نے اوپر کا ایک کمرہ اپنے لیے سیٹ کر لیا ہے۔''

''تم'' اور ''آپ'' کے درمیان پھنسی وہ نظریں جھکائے مزید مطالبات پیش کر رہی تھی۔

شاہ زر نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔

''ٹھیک ہے' بات اگر رشتے کی بے وقعتی اور حساب کتاب تک آ ہی پہنچی ہے تو پھر اس معاملے کو اچھی طرح سے حل کرتے ہیں...... ہوں......''

اب وہ گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''تمہارے لیے میری ہر چیز حرام ہے تو پھر میرے لیے تمہاری خدمتیں حلال کیسے ہو سکتی ہیں؟ مانا کہ اس گھر میں ہر کام کے لیے ملازمین موجود ہیں مگر پھر بھی تم میرے بیٹے کو سنبھالتی ہو' اس کا خیال رکھتی ہو' تمہارے اس کام کا بھی معاوضہ ہونا چاہیے۔''

''ہرگز نہیں...... آپ بھول رہے ہیں کہ آپ کے بیٹے سے میرا بھی کوئی تعلق ہے' جائز ماں ہوں' میں اس کی' اور آج تک کسی ماں نے اپنے بچے کی پرورش کے پیسے نہیں لیے' ہاں البتہ آپ کے پیسے بنتے ہیں میری طرف' اس گھر میں رہنے کے پیسے' اور وہ میں ضرور دوں گی۔''

اس لڑکی کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔

شاہ زر لب بھینچ کر اپنے اندر اٹھے غصے کے طوفان کو ضبط کر گیا۔

''اس سے پہلے کہ میرے لبوں سے کچھ غیر مناسب الفاظ نکلیں' یہاں سے چلی جاؤ انوشہ پلیز......'' وہ اس لڑکی سے کبھی جیت نہیں سکتا تھا۔ انوشہ بنا اس کے چہرے پر نگاہ کیے خاموشی سے کمرا چھوڑ گئی۔

❋❋❋

شدید سردی میں بنا کمبل کے ٹی وی کے سامنے بیٹھا وہ انگلش موویز سے دل بہلا رہا تھا جب ریان زور سے اس کے کمرے کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر چلا آیا۔

''چاچو' مما بلا رہی ہیں۔''

''مما سے کہو چاچو فری نہیں ہے۔''

بنا نگاہ اسکرین سے ہٹائے اس نے پٹ سے جواب دے دیا۔
''کیا کر رہے ہیں؟''
''مووی دیکھ رہا ہوں۔''
''چاچو...... ٹیچر کہہ رہی تھیں مووی دیکھنے سے گناہ ہوتا ہے۔ اللہ میاں بہت مارتا ہے۔''
''اچھا...... کس چیز سے مارتا ہے اللہ؟''
وہ مسکرایا تھا۔ ریان چپ ہو گیا۔
''پتا نہیں' یہ تو ٹیچر نے نہیں بتایا۔''
''تو پوچھنا ناں یار ٹیچر سے اور اب جاؤ اپنا ہوم ورک کرو شاباش۔''
ٹیلی ویژن اسکرین پر جو سین تھا' وہ ریان کے دیکھنے لائق نہیں تھا تبھی اس نے اسے کمرے سے بھگا دیا۔ عین اسی لمحے اس کے سیل پر باقر کی کال آئی تھی۔
''کہاں ہو شہزادے' کال کیوں ریسیو نہیں کر رہے تھے؟''
''سائیلنٹ پر تھا یار' کہو کیا بات ہے؟''
''میں آ رہا ہوں تیری طرف' آج رات بہت غضب کا پروگرام سیٹ کیا ہے ہم نے۔''
''اچھا...... کچھ اسپیشل ہے کیا؟''
''ہاں بہت اسپیشل ہے۔''
''چلو ٹھیک ہے آ جاؤ' میں گھر پر ہی ہوں۔''
سرعت سے کہہ کر اس نے کال ڈراپ کر دی تھی اور اب اسے باقر کی آمد کے ساتھ رات کے ڈھل جانے کا بھی انتظار تھا۔
''کیا پروگرام ہے؟''
اگلے تیس منٹ میں باقر اس کے پاس تھا۔
''بتایا تو ہے بہت اسپیشل پروگرام ہے۔ شام میں آصف کی طرف چلیں گے۔ اس کے گھر والے کراچی گئے ہیں آج' تنہا ہو گا گھر پر' وہاں مووی وغیرہ دیکھیں گے پھر ہوٹلنگ وغیرہ کر کے کچھ پینے پلانے کا پروگرام ہو گا اور اس کے بعد اسپیشل پروگرام......''
ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگاتے ہوئے اس نے بتایا تھا۔
''عدی نے برا سا منہ بنا کر رخ پھیر لیا۔
''چلو......'' میں سمجھا پتا نہیں کیا اسپیشل پروگرام ہو گا' یہ تو روز کا کھیل ہے۔''
''یار اس بار لڑکی بہت غضب کی ہے اور زیادہ پروفیشنل بھی نہیں۔''
مووی دیکھنے کی بجائے یار کلب چلیں گے اور کچھ ہلا گلا کریں گے۔''
''ٹھیک ہے...... جیسی تیری خوشی۔''
وہ سارے دوستوں کا لاڈلا تھا۔ اس لیے ہر بار اسی کی خواہش کا احترام کیا جاتا تھا۔
''اب انکل کی طبیعت کیسی ہے؟''
اگلے ہی پل چلغوزے چھیلتے ہوئے باقر نے اس سے پوچھا تو عدی نے ٹی وی آف کر دیا۔

''پہلے سے بہتر ہیں۔''

''اور وہ ان کی ول کا کیا بنا' تجھے کچھ دیں گے کہ نہیں؟''

''مجھے کچھ نہیں چاہیے ان سے' نہ دیں کچھ......''

''مگر یار یہ تیرا حق ہے' تو اپنا حق چھوڑ دے گا۔''

''ڈیم اٹ یار' چل مارکیٹ چلتے ہیں' کچھ چیزیں خریدنی ہیں اپنی گرل فرینڈ کے لیے۔'' وہ بیزاری سے بولا تو باقر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

❋❋❋

طلال ہمدانی کا شمار ارب پتی رئیسوں میں ہوتا تھا۔ اپنی جوانی آرمی میں بھرپور عیش و ع کے ساتھ بسر کرنے کے بعد ریٹائر ہو کر انہوں نے اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا تھا۔ جس می کے دو بڑے بیٹوں عفان اور منان نے ان کی بھرپور مدد کی۔

عدنان کا نمبر چوتھا تھا۔ اس کی پیدائش پر طلال صاحب اپنی محبوب بیگم کو کھو بیٹھے تھے۔ لہٰذ گرہ سی پڑ گئی تھی دل میں' اس کے لیے اور اس گرہ نے ان دونوں باپ بیٹوں کو کبھی ایک دوسر قریب ہونے ہی نہیں دیا۔ عدنان سے بڑا اشان تھا اور وہ تعلیم کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔ اور منان دونوں شادی شدہ تھے اور ایک ہی گھر میں اکٹھے رہ رہے تھے۔ دونوں کی بیگمات سگی تھیں لہٰذا امن وسکون تھا گھر میں' ریان عفان ہمدانی کا بیٹا تھا اور عدنان سے بے حد کلوز تھا۔ کے گھر ابھی اولاد نہیں ہوئی تھی لہٰذا گھر بھر کی محبتوں کا واحد وارث وہی تھا۔

عفان شاہ زر کا دوست تھا اور اسی کے کہنے پر اسکول کے بعد اس نے ریان کو گوری کی اُ میں اسلامی تعلیمات کے لیے بھیجنا شروع کیا تھا۔

ماں کے وجود سے محرومی اور باپ کے سرد رویے نے عدنان کو خودسر اور عیاش بنا دیا تھا' ہر وہ کام کر کے دل کو تسکین حاصل ہوتی تھی جو اس کے گھر والوں' خصوصاً باپ کو ناگوار گزرتا' اے کرنے کے باوجود اسے جاب یا بزنس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اخلاق سوز فلمیں دیکھنا' شراب پینا اور غلط کاریوں کو اپنا محبوب مشغلہ اپنانے میں اس کے بگ ہوئے آوارہ دوستوں نے اس کی پوری پوری مدد کی تھی۔ وہ بلا کا ضدی اور موڈی تھا۔ گھر بھ اسے ریان کے سوا کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا تاہم اسے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔

کئی بار اس پر کیس بنے تھے۔ کئی بار وہ روڈ ایکسیڈنٹ کی نذر ہوا تھا مگر ہر حادثے کے بع کی ذات پر چڑھی بے حسی کی چادر مزید موٹی ہوتی جاتی تھی۔

اس رات بھرپور عیاشی کے بعد وہ گھر واپس لوٹا تو نشے سے اس کا انگ انگ چور تھا۔

اپنے کمرے میں آنے کے بعد اس کا شدت سے دل چاہا کہ کاش کوئی نرم آغوش ہو جو اس وجود کو قیمتی متاع کی طرح سمیٹ کر میٹھی نیند سلا دے' مگر وہاں اس سرد کمرے میں سوائے بے چیزوں کی سجاوٹ کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ بددل سا جوتے اتارے بغیر بیڈ پر گر پڑا۔ جسم ہلکا ہلکا گرم ہو رہا تھا۔ اگلے روز کہیں شا

لی تھی اور آنکھ کھلتے ہی پہلا احساس "درد" کا ہوا تھا۔ یوں لگا جیسے سارا وجود درد کے شکنجے
ہو' تیز بخار کی حدت نے ایک ایک عضو جیسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی
کے باوجود جسم کو حرکت نہ دے سکا۔
یں جیسے کانٹے اگ آئے تھے اور آنکھیں یوں جل رہی تھیں گویا انگارے ہوں۔ یہ سب
ے بے پروائی اور ضرورت سے زیادہ عیاشی کے سبب ہوا تھا۔ مگر اسے احساس نہیں تھا نہ ہی
ی فرد نے اس کے کمرے میں جھانکنے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ تیز بخار کے حصار میں
کے ساتھ بے سدھ سادہ یونہی پڑا رہا تھا جب اچانک اسے اپنی پیشانی پر نرم ہاتھوں کی
گرماہٹ کا احساس ہوا' خمار سے بوجھل نگاہوں کو بمشکل کھول کر دیکھا تو ریان اس کے
کے قریب بیٹھا اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اس کا سر دبا رہا تھا۔
کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔
چو...... میں نے کہا تھا ناں مووی نہ دیکھیں اللہ مارتا ہے۔"
وم سامنے بنا کر وہ اسے یاد کروا رہا تھا' عدی نے ذرا سا مسکرا کر اس کے دونوں ہاتھ تھام

یک ہے اور کس کس بات پر اللہ مارتا ہے؟"
ٹیچر کہہ رہی تھیں جب ہم سے کسی کو تکلیف پہنچتی ہے تو اللہ ناراض ہو جاتا ہے' کیونکہ اللہ
ں سے بہت پیار کرتا ہے۔"
ور اللہ خوش کیسے ہوتا ہے؟"
یہ تو ٹیچر کو پتا ہے' کل پوچھوں گا ان سے' میری ٹیچر بہت اچھی ہیں۔"
چاچو سے بھی زیادہ اچھی؟"
اوں...... اچھی تو بہت ہیں مگر چاچو سے زیادہ نہیں۔"
سکرایا تو عدی نے ہاتھ بڑھا کر اسے خود سے لپٹا لیا۔
چاچو...... میری ٹیچر بہت اچھی کہانیاں سناتی ہیں' قرآن پاک میں اللہ نے ہماری بہتری اور
کے لیے جو باتیں کی ہیں وہ سب بتاتی ہیں ہمیں اور ساری دعائیں بھی یاد کرواتی ہیں۔"
اور کیا کیا کرتی ہے آپ کی ٹیچر؟"
بچوں سے پیار کرتی ہیں' نماز پڑھنا سکھاتی ہیں' آپ ٹیچر سے نماز پڑھنا سیکھو گے؟"
نہیں یار! میری پٹائی کریں گی وہ۔"
نہیں چاچو! میری ٹیچر پٹائی نہیں کرتیں' بہت پیار سے پڑھاتی ہیں۔"
چلو پھر ٹھیک ہے' تب تو سیکھنا ہی پڑے گا۔"
ریان کے بالوں میں پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اسے بہلایا تھا تبھی اس کی دوست
ہلکے سے دروازہ ناک کرتے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔
"ہائے عدی' کیسے ہو؟ باقر سے پتہ لگا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔"
"ہاں یار! کل رات بس خیال نہیں کیا تو بخار ہو گیا۔ تم سناؤ کیسی ہو' کہاں ہوتی ہو آج کل؟"

''میں نے کہاں ہونا ہے' تمہیں تو پتا ہے کسی مسئلے میں پھنس گئی تھی۔ اوپر سے اس اسٹوپڈ انسان نے مووی بنا کر نیٹ پر پھیلادی۔ پاپا اور مما نے تو قطع تعلق کرلیا' آج کل دانی کے ساتھ رہ رہی ہوں اب اس کی بھی نت نئی فرمائشیں شروع ہوگئی ہیں۔''

''ہوں...... یہ تو ہے' آگ گھی کے پاس رہے تو اس کا جے رہنا ناممکن ہے۔ اب یہ سارے حالات تو فیس کرنا ہی پڑیں گے کیونکہ واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''ایک راستہ ہے...... اگر تم مجھ سے شادی کرلو تو' میں ہر برائی چھوڑ سکتی ہوں۔''

زاویہ نے کہا تھا اور وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا تھا۔

''سوری یار! میں ابھی شادی کی پوزیشن میں نہیں ہوں' تم دانی سے کہو وہ کرلے گا۔''

''تم سے پہلے اسے ہی کہا تھا' شادی کے لیے' ایکسکیوز کرلیا ہے اس نے' مگر دوست کی حیثیت سے تعلق بنانا چاہتا ہے۔''

''پھر کیا کرنا ہے؟''

''کیا کرسکتی ہوں' چڑیا کے گھونسلے سے گرے بچے کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ نہ ہی درخت سے گرے پتوں کو کوئی اٹھا کر جھولی میں بھرتا ہے۔ یہاں گرنے والی ہر شے کے مقدر میں روندے جانا لکھ دیا گیا ہے عدی! سو میں بھی آج کل ہر ایک کے پاؤں تلے آرہی ہوں۔''

''جسٹ شٹ اپ یار! اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی تم نے کوئی انوکھا غلط کام نہیں کیا' آج کل سبھی یہی کررہے ہیں پیار میں' پھر ان کی شادیاں بھی ہوجاتی ہیں اور ہنسی خوشی زندگی بھی گزار لیتے ہیں' تمہیں بھی کوئی نہ کوئی اچھا لڑکا مل ہی جائے گا۔''

''خود فریبی ہے یہ اور کچھ نہیں' بہرحال کرنی تو بھگتنا ہی پڑتی ہے' جس طرح کسی پھل کا اگر چھلکا اتار کر اسے فروخت کیا جائے تو اسے کوئی نہیں خریدتا بالکل اسی طرح چادر اتری عورت بھی مکروہ ہوجاتی ہے۔ یہ پردہ ہی ہے عدی جو ہزار آزمائشوں اور مصیبتوں سے بچاتا ہے' ہم نفس کی آگ میں بھسم ہوکر جب اس پردے کی حرمت کا سودا کرلیتے ہیں تو پھر دربدر' ٹھوکریں کھانا ہی مقدر بن جاتی ہیں۔''

''او ہیلو! زیادہ مذہبی اور فلسفی ہونے کی ضرورت نہیں ہے' زندگی تھرل کا نام ہے' موج مستی' انجوائے منٹ کا نام ہے' اسے موج مستی میں گزارو' بس۔''

''نہیں عدی! بڑی گمراہی ہے یہ' بڑا ظلم ہے یہ اپنی ذات پر' جس چیز کی کوئی گارنٹی نہیں اس پر بھروسہ کرکے خود کو تباہ کرنا کہاں کی دانش مندی ہے؟''

''میرا خیال ہے اب تم مار کھاؤ گی مجھ سے' کہیں ریان کی ٹیچر سے مل کر تو نہیں آرہیں۔''

''نہیں......'' وہ اداسی سے مسکرائی تھی۔

عدنان نے کمبل پرے پھینک دیا۔

''تم بیٹھو میں ابھی فریش ہوکر آتا ہوں' پھر آؤٹنگ کے لیے چلتے ہیں۔''

خراب طبیعت کی پروا کیے بنا وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ زاویہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

ریان نے دیکھا اس کے بازو اور پیٹ عریاں تھے۔ اس وقت جو جین اس نے پہن رکھی تھی

کے خوب صورت جسم کو مزید عیاں کر رہی تھی بے ساختہ اس کے تصور میں اپنی ٹیچر کا سراپا آ گیا۔ صورت عبایا میں سر پر اسکارف لپیٹے وہ اتنی پرنور دکھائی دیتی تھی کہ ریان زیادہ دیر اس کی ںوں میں دیکھ ہی نہ پاتا مگر سامنے بیٹھی یہ عورت اس کی مما کی کاپی ہی لگ رہی تھی' وہ بجھا بجھا کھڑا ہوا۔

''اگر میں مما سے کہوں کہ وہ ٹیچر جیسے کپڑے پہنیں تو کیا مما مان جائیں گی؟ اگر چاچو اس آنٹی وہ کپڑے پہننے کے لیے کہیں تو کیا یہ مان جائیں گی.....'

انہی سوالوں میں الجھا وہ عدنان کے کمرے سے نکل گیا تھا۔

اگلے روز اکیڈمی میں وہ گوری کو یہ بات بتا رہا تھا۔

''ٹیچر میری مما اور چاچو کی دوست آپ کے جیسے کپڑے کیوں نہیں پہنتیں؟''

گوری اس کے سوال پر مبہم سا مسکرائی تھی۔

''اس سوال کا جواب بہت گمبھیر ہے ریان! آپ نہیں سمجھو گے۔ خدا کی اس کائنات میں روئے من پر اس شخص سے زیادہ بدنصیب اور قابل ترس شخص اور کوئی نہیں' جسے وہ پاک ذات ہدایت ہب نہ کرے' قرآن پاک کی سورہ الروم پارہ نمبر۲۱ آیات نمبر ۲۸ اور ۲۹ میں اللہ رب العزت فرمان ہے۔

''اللہ غالب حکمت والا ہے اور وہ تمہارے لیے تمہارے ہی مال کی ایک مثال بیان فرماتا ہے' ملا انسانوں میں جن غلاموں کے تم مالک ہو' وہ اس مال میں جو ہم نے تم کو عطا کیا ہے' تمہارے ریک نہیں؟ کیا تم اس میں ان کو اپنے برابر سمجھتے ہو؟ اور کیا تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جیسے ہاں سے ڈرتے ہو؟ اور ہم اسی طرح عقل والوں کے لیے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں گر جو ظالم ہیں بے سمجھے اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں تو جس کو خدا گمراہ کرے اسے کون ہدایت ے سکتا ہے؟ اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔''

آیت کا ترجمہ سناتے ہوئے اس کی آنکھیں ہلکی سی نم ہو گئی تھیں۔

''اللہ مہلت دیتا ہے' اختیار بھی دیتا ہے' مگر انسان جب سرکشی اور جہالت میں حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر وہ اپنی گرفت میں جکڑ لیتا ہے۔ اپنی پکڑ میں لے لیتا ہے اور خدا کی پکڑ بہت سخت ہوتی ہے ریان! بہت پچھتاتا ہے انسان پھر اپنی کوتاہیوں پر' بالکل ویسے ہی جیسے آخرت میں اس پاک ذات کے منکر' کافر اپنے ہاتھ کاٹیں گے دانتوں سے اور اپنی گمراہی پر واویلا کریں گے مگر ان کو معافی نہیں ملے گی۔ مہلت پوری ہو جائے تو سزا اور جزا کا عمل شروع ہو جاتا ہے' اور اگر بداعمالی کی سزا نہ ملے تو نیک اور بد میں اللہ کے فرمانبردار اور نافرمان بندوں میں کوئی فرق ہی نہ رہے۔''

''تو کیا میرے چاچو اور مما کو بھی سزا ملے گی؟''

''اللہ رحم کرنے والا ہے' جسے چاہے بخشنے والا ہے' آپ اللہ سے ان کی ہدایت کے لیے دعا کیا کریں۔''

''کیا دعا کرنے سے ہدایت مل جاتی ہے ٹیچر؟''

بہت معصوم سا سوال تھا مگر گوری کے لبوں پر چپ لگ گئی۔

''ہاں بھی اور نہیں بھی...... انسانی ہستی کی بنیاد ہی جس مرکز پر ہو وہ حاصل ہونا آسان نہیں ہے ریان! ہدایت وہ واحد چیز ہے جو کبھی دل کی گہرائیوں سے گڑگڑا کر مانگے بنا نہیں ملتی' اللہ سب کچھ بن مانگے عطا کرتا ہے مگر ہدایت بن مانگے نہیں دیتا۔''

''آپ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں ٹیچر' آپ بہت اچھی ہیں۔''

ریان اس کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا وہ نرمی سے مسکرا دی۔

''جو اللہ سے پیار کرتے ہیں اللہ ان کے لیے اپنی ساری مخلوق کے دلوں میں عزت اور محبت ڈال دیتا ہے اور جو اللہ سے دور ہوتے ہیں' دنیا کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں مگر انہیں سکون نہیں ملتا' آپ نے دیکھا ہوگا ریان! بڑے بڑے فنکار' گلوکار' خوب صورت سے خوب صورت چہرے' جتنی بھی شہرت اور نام کما لیں' دنیا والوں کے دلوں میں بس جائیں' مگر پوسٹرز اور تصویروں کی صورت پاؤں' سڑکوں اور گندے نالوں میں رلتے پھرتے ہیں' مگر کبھی وہ عورت یا مرد جس کے دل میں اللہ کی محبت اور خوف ہوگا اس کی صورت کسی کیمرے کی آنکھ میں نہیں آئے گی' نہ ہی اس کی بے حرمتی ہوگی۔''

بہت اچھی مثال پیش کی تھی اس نے مگر ریان کی سمجھ میں نہیں آئی۔

وہ گھر آیا تو عدنان لان میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ وہ اسی کی سمت بڑھ آیا۔

''السلام علیکم چاچو!''

''وعلیکم السلام...... آ گیا میرا لوبٹ؟''

''جی...... اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

''فٹ فاٹ...... تم سناؤ' آج کیا سکھایا آپ کی ٹیچر نے؟''

''بہت کچھ...... ٹیچر کہتی ہیں اللہ مہلت اور اختیار دیتا ہے مگر انسان جب سرکشی اور جہالت میں حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر وہ اپنی گرفت میں جکڑ لیتا ہے۔ اپنی پکڑ میں لے لیتا ہے اور اللہ کی پکڑ بہت سخت ہوتی ہے۔''

''اسٹاپ اٹ یار! ابھی آپ کی عمر نہیں ہے ان باتوں کو ذہن پر سوار کرنے کی۔ میں کرتا ہوں بھابی سے بات' وقت سے پہلے پاگل کر دیں گے یہ لوگ تمہیں۔''

سخت برہم ہو کر بڑبڑاتے ہوئے وہ اٹھا اور دندناتا ہوا ریان کی مما کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ ابھی تک نائیٹی میں ملبوس تھیں۔

''بھابی آپ لوگ ریان کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؟ کون سی اکیڈمی میں بھیجنا شروع کیا ہے اسے؟ بچے کی شخصیت مسخ ہو رہی ہے' نہ کارٹون دیکھتا ہے' نہ ہلا گلا کرتا ہے' لے کر آخرت کے عذاب کی باتیں کرتا رہتا ہے آج کل۔''

''اپنے بھائی سے پوچھنا یہ سوال' جن پر مولوی بننے کا بھوت سوار ہوا ہے آج کل۔ میری تو بڑی جھڑپ ہوئی ہے ان سے' میں کیا کروں۔''

''بھائی ہر وقت گھر پر نہیں ہوتے' آپ کل سے ریان کو اکیڈمی نہیں بھیجیں گی۔''

''اپنا حشر نہیں کروانا میں نے' بہت سختی سے تاکید کی ہے انہوں نے۔''

''تو ٹھیک ہے' پھر اس محترمہ ٹیچر صاحبہ کے دماغ کی برین واشنگ کرنی پڑے گی مجھے۔''

سرخ چہرے کے ساتھ لب کاٹتے ہوئے اس نے گویا اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اگلے روز وہ خود ریان کو اکیڈمی لے کر آیا' گوری اندر کلاس میں تھی' اسے آفس میں ٹھہرالیا گیا۔

''میم......آپ سے کوئی عدنان صاحب ملنے آئے ہیں۔''

وہ قرآن پاک کے مطالعے میں مشغول تھی جب آفس بوائے نے آکر پیغام دیا' وہ چونک اٹھی۔

''کتنی بار کہا ہے مجھے میم نہیں آپی یا باجی کہا کرو' اور آفس میں کیا نصیر صاحب نہیں بیٹھے؟''

''بیٹھے ہیں جی' پر وہ صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے' انہیں مہمان خانے میں بٹھائیں' میں آتی ہوں۔''

شرمندہ سے آفس بوائے کو پراعتماد لہجے میں کہتی وہ پھر سے قرآن پاک کے مطالعے میں مشغول ہوگئی۔

'تقریباً تیس منٹ کے بعد وہ مہمان خانے میں داخل ہوئی تو عدنان کے ضبط کی انتہا ہو چکی تھی۔

''السّلام علیکم!''

سرسری سی اک نگاہ اس کے رف سراپا پر ڈالتے ہوئے اس نے نرمی سے سلام کیا تھا مگر عدنان نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔

''بیٹھیے' مجھے اپنے بھتیجے کے سلسلے میں کچھ بات کرنی ہے آپ سے۔''

''جی فرمائیے۔'' بلا کی پراعتمادی کے ساتھ وہ قدرے فاصلے پر بیٹھ گئی تھی۔

''فرمانا کچھ نہیں' صرف انفارم کرنا ہے۔ آپ قرآن کی آڑ لے کر ننھے منے بچوں کو فضول میں ذہنی مریض بنا رہی ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کا اصل کیا ہے اور میں جاننا بھی نہیں چاہتا' مگر میں آپ کو بتا دوں' آپ برائے مہربانی ریان کو ہراساں مت کریں' ورنہ میں برداشت نہیں کروں گا۔''

''اچھی بات ہے' کوئی آپ کے بچے کو ٹارچر یا ہراساں کرے تو آپ کو برداشت کرنا بھی نہیں چاہیے مگر یہاں اس اکیڈمی میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں صرف قرآن پاک کی تعلیم دی جاتی ہے اور بس۔''

''قرآن پاک کی تعلیم میں معصوم بچوں کو عذابوں کے احوال سنا سنا کر کون سا علم بانٹ رہی ہیں آپ؟''

''وہی جو آپ کو نہیں ملا۔''

''جسٹ شٹ اپ! خوب اچھی طرح جانتا ہوں میں آپ جیسی لڑکیوں کی حقیقت۔ یہ عبایا اور اسکارف میں خود کو لپیٹ کر زیادہ پارسا ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہت اوپر کی حدوں تک جاتے دیکھا ہے میں نے' ایسی اللہ اللہ کرنے والی نیک پروین بیبیوں کو۔ لہٰذا مجھ پر اپنا علم اور عقل مت جھاڑو' سمجھیں آپ؟''

وہ صرف عیاش نہیں' خودسر بھی تھا' گوری کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''میرا خیال ہے آپ ضرورت سے زیادہ بکواس کر چکے ہیں' اب جائیے یہاں سے۔''

''جانے کے لیے ہی آیا ہوں' دوبارہ شکایت نہ ہو۔''

وہ کھڑا ہوا تھا' گوری نے اس کی تنبیہہ پر سر جھٹک دیا۔
''اپنے بھتیجے کو بھی ساتھ لے جایئے' تاکہ دوبارہ یہاں آنے کی زحمت گوارہ نہ کرنی پڑے۔''
پل میں فیصلہ سنا دیا تھا اس نے' عدنان بنا توجہ کیے سرخ چہرے کے ساتھ وہاں سے نکل آیا۔

❋❋❋

دھوپ کے دشت میں شیشے کی ردائیں دی ہیں
زندگی تونے ہمیں کیسی سزائیں دی ہیں
اک دعاگو نے رفاقت کی تسلی دے کر
عمر بھر ہجر میں جلنے کی دعائیں دی ہیں

ٹیلی ویژن اسٹوڈیو میں اس کا وہ چوتھا چکر تھا۔ کل مالک مکان نے اس سے اپنا مطالبہ پورا نہ ہونے پر گھر کا سامان نکال کر باہر پھینک دیا تھا۔ ایان کا کوئی پتہ نہیں تھا اور سمعان اپنی معذوری کے ساتھ فوری طور پر پانچ ہزار روپے حاصل کرنے میں قطعی ناکام رہا تھا۔ سردی اتنی تھی کہ ہڈیوں میں گھستی تھی۔

رات بھر جاگ کر گلی میں بسر کرنے کے بعد صبح ناشتے کے نام پر بنا کچھ کھائے پیے وہ پھر اسٹوڈیو چلی آئی تھی۔ آج ڈائریکٹر کو شاید اس پر ترس آ گیا تھا تبھی پون گھنٹہ انتظار کے بعد بلا کر انہوں نے اسے اپنے آفس میں بلالیا۔

''جی مس صاعقہ تو آپ پیسے کے لیے شوبز جوائن کرنا چاہتی ہیں۔''

''جی۔''

''کہیں کوئی جاب وغیرہ کرتی ہیں کہ نہیں؟''

''جی نہیں اب نہیں کرتی۔''

''گھر میں کون کون ہیں؟''

''سبھی ہیں بیمار ماں' معذور بھائی اور عمر کی سیڑھیاں تیزی سے پھلانگتی لاچار بہن۔''

''ہوں۔'' مقابل بیٹھے اس گدھ کے چہرے پر اچانک مسکراہٹ آئی تھی۔

''غربت بھی بڑی ظالم چیز ہے۔ خیر کام مل جائے گا آپ کو' مگر پہلے آپ کو میرے ساتھ ایک کپ چائے پینا پڑے گی' وہ بھی میرے گھر پر۔''

''آپ کے گھر پر کیوں؟'' خوش ہوتے ہوتے وہ اچانک ٹھٹکی تھی۔ جواب میں ڈائریکٹر واصف نے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں گھر پر بہت سکون محسوس کرتا ہوں۔ آج کل تو بیگم صاحبہ بھی میکے گئی ہوئی ہیں' بہت تنہائی محسوس ہوتی ہے' قسم سے۔''

آنکھوں کا رنگ بدلتا وہ شخص کسی طور ''ڈاکٹر عارف'' سے الگ نہیں تھا۔

صاعقہ نے بدک کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''نہیں...... میں آپ کے گھر نہیں جا سکتی۔''

''گھر نہیں جاسکتی تو میرے Play میں کیسے آسکتی ہو' بولو۔''
وہ ان چند ایمان فروش لوگوں میں سے تھا جو خفیہ طور پر دوسروں کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ صاعقہ نے آنسو بھری نگاہوں کے ساتھ سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر آہستہ سے کرسی کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
''میں مڈل کلاس گھرانے کی بھوک سے تنگ آئی لڑکی سہی' مگر عزت کا سودا کبھی نہیں کروں گی۔'' شکست کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں غصہ بھی تھا۔ ڈائریکٹر ہنس دیا۔
سامنے دور تک شفاف سڑک بچھی تھی۔ وہ آزردہ سی سر اٹھا کر دیکھتی رو پڑی۔
''کاش تم کبھی میرے مقابل آؤ عباد یاور اور میں اپنے جاندار تھپڑوں سے تمہارا چہرہ سرخ کرسکوں۔'' کٹتے دل سے مجبور بہت آہستہ سے اس نے سرگوشی کی تھی۔ تبھی کسی نے اسے پکار لیا۔
''ایکسکیوز می۔''

❋❋❋

''عباد......''
موسم بے حد خراب تھا' باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ اسٹاف کے تمام لوگ آفس سے نکل چکے تھے مگر وہ بنا بخار کی پروا کیے نگاہ کمپیوٹر اسکرین پر جمائے کسی گہری سوچ میں گم سب سے کٹ کر بیٹھا تھا جب ہادیہ نے سرسری سا اس کے کمرے میں جھانکتے ہوئے اسے پکار لیا۔
عباد نے چند ساعت کے لیے نگاہیں کمپیوٹر اسکرین سے ہٹائیں مگر پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔
''تم یہاں بیٹھے ہو اور میں کب سے تمہارے سیل پر ٹرائی کر رہی ہوں۔ باہر موسم دیکھو کتنا خراب ہے' کیا گھر نہیں جانا؟''
''نہیں......ابھی نہیں۔''
''کیوں......؟ آنٹی کی تین کالز آچکی ہیں۔ بہت پریشان ہیں تمہارے لیے۔''
''انہیں کہہ دو میں ٹھیک ہوں' اور تم جاؤ پلیز۔''
''تمہیں تنہا چھوڑ کر چلی جاؤں' ہرگز نہیں۔''
''ہادیہ پلیز......''
''کیا پلیز......ضروری نہیں کہ ہر بات تمہاری مانی جائے' تمہیں اب مجھ میں دلچسپی نہیں نہ سہی' تمہیں مجھ سے شادی نہیں کرنی' نہ کرو۔ مگر تم میرے دوست ہو عابی' فرسٹ کزن ہو میرے۔ میں تمہیں اس وقت یوں تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتی سوری۔''
وہ اس کی اندرونی کیفیت سے بے خبر نہیں تھی۔ عباد نے کرب سے پلکیں موند لیں۔
''بہت بڑا گیم کھیلا ہے تم لوگوں نے میرے ساتھ ہادیہ! بہت بڑا گیم۔''
''کیا مطلب؟'' وہ بڑبڑایا تو ہادیہ چونک اٹھی۔
''تم جانتی ہو' بہت اچھی طرح سے جانتی ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ایک منصوبے کے تحت آسٹریلیا بھیج کر میری عدم موجودگی میں' پھر دولت کی چھری سے محبت کی گردن کو ذبح کیا ہے تم لوگوں

نے۔ مگر یاد رکھنا' میں اسے کبھی کھونے نہیں دوں گا' ڈھونڈ کر رہوں گا اسے۔ چاہے وہ سمندر پار ہی کیوں نہ چلی جائے۔''

اس کی آنکھوں میں ہلکی نمی کے ساتھ سرخی بھی تھی۔

ہادیہ کا دل عجیب سے خوف میں دھڑک اٹھا۔

''تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ مجھے یا انکل آنٹی کو کوئی ضرورت نہیں تمہیں کسی سے دور کرنے کی۔''

''ضرورت نہیں تکلیف تھی' تبھی یہ سب پلان کیا تم لوگوں نے' آفس مینجر سب بتا چکا ہے مجھے وہ یہاں آئی تھی' تم سے ملی تھی مگر تم نے مجھ سے جھوٹ بولا' کتنی اذیت کی بات ہے کہ مما نے بھی اس کھیل میں تمہارا ساتھ دیا۔''

پلٹ کر اٹھتے ہوئے وہ دہاڑا تو ہادیہ نے رخ پھیر لیا۔

''کھیل کیسا...... ہاں میں نے جھوٹ بولا تم سے' کیونکہ میں تمہیں اذیت میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔'' دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے ایک پل میں اس نے کہانی بنائی۔

عباد نے تنفر سے سر جھٹک دیا۔

''میں جانتی ہوں تم یقین نہیں کرو گے' مجھے اس سے فرق بھی نہیں پڑتا' مگر میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا' جس سے تم دونوں کے بیچ کوئی دوری آتی۔ ہاں وہ ہرٹ ہوئی' کیونکہ تم نے اس سے اپنی اصلیت چھپائی تھی' کسی زین کو ڈھونڈتی ہوئی آئی تھی وہ یہاں مگر جب اسے پتا چلا کہ تم زین نہیں عباد ہو' میرے فیانسی' تو وہ جی بھر کر شرمندہ ہوئی' معافی مانگ رہی تھی مجھ سے۔ میں نے کہا' اس سے کہ تم صرف اس سے پیار کرتے ہو' مگر اس نے تھوک دیا تم پر' یہ کہہ کر کہ اسے ایک جھوٹے دولت مند ہمسفر کی کوئی ضرورت نہیں' اگر نہیں یقین آتا تو پوچھ لو مینجر سے' انکل بھی یہیں تھے' مگر آنکھ بھر کر نہیں دیکھا اس نے انہیں اور چلی گئی۔''

اس بار ہادیہ کی بات میں وزن تھا۔ وہ اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

''محبت میں ہمیشہ پر یقین رہنا اچھی بات ہے' مگر بہتر ہوتا ہے اگر اس کی بنیاد بھی سچ پر رکھی جائے۔'' کبھی کبھی سچ کتنا نوکیلا لگتا ہے' عباد کو لگا جو آئینہ اس وقت ہادیہ اسے دکھا رہی تھی اس میں اس کا چہرہ بے حد بھیانک ہو گیا ہو۔

وہ پلٹا تھا اور پھر بنا ایک لفظ کہے آفس سے نکل گیا۔

باہر اب بھی تیز بارش ہو رہی تھی۔ مگر اسے پروا نہیں تھی' اندر لگی آگ پر جتنے بھی سرد قطرے گرتے کم تھے۔

❊❊❊

''عدنان......''

وہ ابھی ابھی باہر سے آیا تھا اور اب تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اپنے کمرے میں جا رہا تھا جب عفان نے اسے زوردار آواز دے کر پکارا۔ وہ وہیں کھڑا گھوم کر ان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''جی۔''

''یہاں آؤ' مجھے کچھ بات کرنی ہے تم سے۔''

ٹی وی دیکھتے ہوئے ان کا لہجہ خاصا خشک تھا۔ وہ لب کچلتا سیڑھیاں اتر آیا۔

''جی فرمائیے۔''

''ریان کی اکیڈمی گئے تھے تم؟'' اس کے بیٹھتے ہی تفتیش شروع کی تھی۔

''جی۔''

''کس لیے؟''

''کوئی خاص مقصد نہیں تھا' بس یونہی دماغ ٹھیک کرنے گیا تھا اس کی استانی کا۔''

''جسٹ شٹ اپ...... ہوتے کون ہو تم میرے بیٹے کی ٹیچر کا دماغ ٹھیک کرنے والے۔ اس کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کرنے والے؟''

اچانک دہاڑ کر انہوں نے اسے اس کی اوقات یاد دلائی تھی۔ عدنان اندر سے کٹنے کے باوجود خاموش نہ رہ سکا۔

''آپ کا بیٹا میرا بھی کچھ لگتا ہے جناب عفان آفندی صاحب!''

''بکواس بند کرو اپنی' وہ میرا بیٹا ہے اور اس کی بھلائی برائی کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ہے۔ تم جو حال اپنائے ہوئے ہو' اسی پر رہو' میرے بیٹے کی زندگی میں دخل اندازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے؟''

اس کی بدتمیزی کی خبر یقیناً ان تک پہنچ چکی تھی۔ تبھی اتنا سخت لہجہ اختیار کیا تھا انہوں نے' وہ ضبط سے لب کچلتا اٹھ کھڑا ہوا۔

''ٹھیک ہے' اوقات یاد دلانے کا شکریہ۔''

باپ کے ساتھ ساتھ بھائیوں سے بھی اس کی نہیں بنتی تھی مگر اس وقت جانے کیوں ہتک کا احساس بہت زیادہ ہوا تھا۔ اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد رات بھر اس نے شراب پی تھی' رہ رہ کر گوری کا سراپا اس کے تصور میں آ رہا تھا اور رگوں میں ابلتا خون ایک اسی تصور کے ساتھ اسے جنونی کر رہا تھا۔ ہر دومنٹ کے بعد کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر پٹختے ہوئے وہ اسے غلیظ گالیوں سے نواز رہا تھا۔

''چھوڑوں گا نہیں میں تمہیں' تمہاری اوقات یاد دلا کر رہوں گا' دیکھ لینا۔''

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوری صبح ہو جائے' رات ساری یونہی اذیت کی نذر ہو گئی تھی۔ صبح کے قریب کہیں آنکھ لگی تو پھر دوپہر دو بجے ہی جاگا۔ بیدار ہو کر بھی پہلا خیال اسی کا آیا تھا' تبھی ایزی ہو کر اپنا سیل آف کرتے ہوئے وہ دوبارہ ریان کی اکیڈمی چلا آیا۔

''گوری آپا کوئی عدنان صاحب ملنے آئے ہیں آپ سے۔''

ریان آج نہیں آیا تھا مگر عدنان چلا آیا تھا' وہ ابھی ''سویٹ لیکچر'' کی تیاری کر رہی تھی۔ ملازم کی ہدایت پر اثبات میں سر ہلاتی' اگلے پندرہ منٹ میں مہمان خانے کی طرف چلی آئی۔

''السلام علیکم۔''

حسب عادت کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سلام کیا تھا۔ عدنان پینٹ کی پاکٹس میں ہاتھ گھساتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں اس وقت بہت سرخ ہو رہی تھیں۔

''حیرانی ہو رہی ہے ناں اس وقت مجھے یہاں دیکھ کر کہ اتنی بے عزتی کے بعد پھر چلا آیا۔ ناں؟'' گوری کو پہلی بار اس سے ڈر لگا تھا مگر اس نے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''جی نہیں یہ اسلامی درس گاہ ہے۔ یہاں کوئی بھی ہدایت پانے کے لیے آ سکتا ہے۔''

''اچھا..... دکان لگا کر بیٹھی ہو کیا ہدایت کی؟''

جل کر کہتا وہ اس کے قریب آیا تھا۔ وہ خاموش رہی۔

''جاننا چاہو گی میں اس وقت یہاں کیوں آیا ہوں؟''

بنا گوری کے چہرے کے تاثرات کی پروا کیے وہ بولا تھا۔ گوری چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

''قیمت بتاؤ اپنی' ایک رات کی کیا لو گی؟''

جملہ کیا تھا' کوئی سنسناتا ہوا تیر تھا جو اس کے سینے میں پیوست ہوا تھا۔ سرخ چہرے کے ساتھ حد ضبط کا مظاہرہ کرتی وہ اس پر ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے رہ گئی تھی۔

اگر پہلے والی گوری ہوتی تو ضرور پوچھتی۔ ''اپنے گھر کا ریٹ بتاؤ' تمہاری بہن کتنے پیسے لیتی ہے؟'' مگر وہ اب پہلے والی گوری نہیں رہی تھی' تبھی انتہائی غصے کے باوجود مسکرا کر بولی۔

''میری قیمت کا جان کر کیا کریں گے' میں نے تو اپنا ذہن و دل اپنے رب کی راہ میں رکھ دیا۔ آپ اپنی خواہشات کے لیے کسی اپنے جیسی لڑکی کو تلاش کیجیے۔''

''بکواس سننے کے لیے نہیں آیا میں' قسم کھائی ہے میں نے تمہیں تمہاری اوقات یاد دلانے کی۔ اگر میں نے اپنی قسم پوری نہ کی تو اپنے باپ کا نہیں۔''

وہ ضد اور غصے کی بھینٹ چڑھا تھا' گوری کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

''ایسی قسمیں نہیں کھانی چاہئیں جن کا پورا ہونا ممکن نہ ہو۔ بہر حال اب جا سکتے ہیں یہاں سے' مجھے کلاس لینی ہے' ہاں اتنا جان لیجیے' دنیا میں ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی۔''

''ہر چیز نہ ہو مگر تم بکو گی اور یہ میری ضد ہے۔''

انتہائی حد تنفر سے انگلی اٹھا کر کہتا' اگلے ہی پل وہ وہاں سے نکل آیا تھا۔ گوری گم صم سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

❋❋❋

کھڑکی کھلی تھی اور ٹھنڈی ہوا کے شدید جھونکے اس کے بالوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ شجاع کے ساتھ ہونے والے غیر اتفاقی ٹکراؤ نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا۔ تب ہی ارسلان ہلکے سے دروازہ ناک کرتے ہوئے کمرے میں چلا آیا۔

''جلدی تیار ہو جاؤ یار' آج کے فنکشن میں ٹائم پر پہنچنا بہت ضروری ہے۔''

''کیوں.....؟'' وہ جو بیڈ پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی ارسلان کی آمد پر جیسے خواب سے جاگ اٹھی۔

''کیوں سے کیا مطلب..... کل بتایا تو تھا بہت بڑا فنکشن ہے' بڑے بڑے نامور لوگ شرکت کریں گے۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو بھی تم پسند آ گئیں تو سمجھو بات بن گئی ہماری۔'' ترنگ میں کہتا وہ بیڈ کے کونے میں ٹک گیا تھا۔

امامہ کے لبوں پر زخمی سی مسکان بکھر گئی۔

''اس کا مطلب ہے تم ''چارا'' تیار کرنے آئے ہوتا کہ کسی بھینس کو کھلا کر اس سے دودھ حاصل کر سکو۔''

''بکواس نہ کرو یار! جینے کے لیے سو حیلے کرنے ہی پڑتے ہیں' اس وقت ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں ہے' یوں دوستوں کے گھر کب تک رکھتا پھروں گا؟ میں تم سے نہ شادی کر سکتا ہوں نہ تنہا چھوڑ کر کہیں جا سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے' تم چلو میں تیار ہو کر آتی ہوں۔'' عادت کے برخلاف اس نے بہت جلدی بات مان لی تھی۔ ارسلان خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

اگلے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ دونوں نائٹ کلب میں تھے۔

❀❀❀

''پتا ہے انزلہ...... کل میں نے ایک بہت خوب صورت خواب دیکھا۔''

صاف ستھرے حلیے میں تروتازہ چہرے کے ساتھ' گاؤں شاہ والا کو کراس کر کے گزرتی نہر کے کنارے بیٹھا وہ انزلہ کو بتا رہا تھا۔ جو انہماک سے اسے دیکھتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

''اچھا...... کیسا خواب؟''

''بہت انوکھا سا تھا' تم ہوتی ہو' میں ہوتا ہوں' ہمارا چھوٹا سا خوب صورت گھر ہوتا ہے اور اس گھر میں ہمارے چھوٹے چھوٹے دو بچے ہوتے ہیں' جن کے لیے تم صبح کا ناشتہ تیار کر رہی ہوتی ہو' میں صحن میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہوتا ہوں اور آپا ہمارے بچوں کو ارد گرد بٹھا کر انہیں بڑی اچھی باتیں بتا رہی ہوتی ہیں۔ میں اخبار کی اوٹ سے چوری چوری تمہیں کام کرتے ہوئے دیکھتا ہوں جب تم' اچانک کچن سے نکل کر میرے پاس آتی ہو اور دہاڑ کر کہتی ہو۔

''تم یہاں مزے سے بیٹھے اخبار چاٹ رہے ہو اور میں وہاں کچن میں کھڑی کب سے چینی کے لیے خوار ہو رہی ہوں۔ بچوں نے اسکول جانا ہے ناشتہ کب تیار کروں گی؟ ہائے...... قسمت خراب تھی میری جو تم جیسے شوہر سے پالا پڑ گیا۔''

وہ اپنا خواب سنا رہا تھا اور انزلہ اس کے چہرے کے انداز دیکھتے ہوئے ہنس رہی تھی جب اچانک وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''ایسے مت ہنسا کرو انزلہ! کہیں میری نظر ہی نہ لگ جائے تمہیں' ویسے کبھی کبھی مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''اچھا...... ڈر اور تمہیں' بہت مضحکہ خیز لفظ ہیں یہ۔''

''کہہ سکتی ہو۔ اصل میں یہ جو محبت ہوتی ہے ناں' بہت قیمتی متاع کی مانند ہوتی ہے' اس اثاثے کو کھونے کا ڈر' بہت بزدل بنا دیتا ہے انسان کو۔ اسی لیے تو اس راہ پر آنے سے ڈرتا تھا میں۔''

''اچھا جی...... کس بات کا ڈر پڑ گیا ہے اب؟''

''تمہیں کھو دینے کا ڈر انزی! اپنی سفاک تقدیر کی بے وفائی کا ڈر' اپنے خوب صورت خواب اچانک ٹوٹ جانے کا ڈر۔''

''تم پاگل ہو قیس اور کچھ نہیں۔''

بے ساختہ نظریں چراتے ہوئے وہ بڑبڑائی تھی' جب سانول نے اس کا آنچل اپنی گرفت میں لے لیا۔

''مجھ سے وعدہ کرو انزی! مجھ سے کبھی بے وفائی نہیں کرو گی' چاہے کچھ ہو جائے تم میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑو گی۔ میں وہ سب کروں گا جو تم کہو گی مگر بدلے میں آخری سانس تک تم میرا ساتھ نبھاؤ گی' مجھ سے وعدہ کرو۔''

کسی ننھے سے بچے کی مانند ہراساں وہ اس سے عہد لے رہا تھا۔

انزلہ نے ذرا سا رخ پھیر کر نہر کے گدلے پانی پر نگاہ ڈالی پھر سانول کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جیسے سب کچھ بھول گئی۔

''میں وعدہ کرتی ہوں قیس! زندگی کی آخری سانس تک تمہارا ساتھ نبھاؤں گی' چاہے کچھ ہو جائے۔''

''تھینکس جانم!'' وہ مسرور ہوا تھا۔

''اب چلو...... دیکھو سورج ڈوب رہا ہے' تم نے وعدہ کیا تھا تم اپنے ڈرائیور کی بے جا موت کا ازالہ کرو گے' اور اس کے گھر والوں سے معافی مانگو گے۔''

''ہوں' عہد پورا بھی کیا ہے' وہ لوگ مجھے معاف نہیں کر رہے مگر پھر بھی میں نے وہ سب چیزیں جو میری دسترس میں تھیں ان کے نام کر دی ہیں۔''

''سچ......؟'' انزلہ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا۔ جب وہ مسکرا کر اثبات میں سر ہلا گیا۔

''ہوں' تمہاری قسم۔ اپنے بھائی پر کیس بھی نہیں کر رہا' سب عیش و عشرت بھی ترک کر دی۔ کل سے نماز بھی پڑھ رہا ہوں اور اب گاؤں کی بھلائی کے سب کاموں میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ تم دیکھنا انزلہ' اس گاؤں کے لوگوں کے دلوں میں میرے لیے جو نفرت ہے میں اسے محبت میں بدل دوں گا۔''

''ان شاء اللہ...... تم نہیں جانتے قیس میں کتنی خوش ہوں۔''

''جانتا ہوں' بس تم یہ جان لو کہ تمہاری یہ خوشی ہی اب میری زندگی ہے۔''

''ہوں...... میں نے کہا تھا ناں میرا قیس بہت اچھا ہے۔''

انزلہ کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اس پر نثار ہو جائے۔ سانول آخری کنکر نہر کے گدلے پانی کی نذر کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ بہزاد علی مراد ملک سے باہر تھا۔ اسے انزلہ کی ماں کنیز نے اپنے پاس بلایا تھا۔ اور انزلہ اس کی غیر موجودگی کے اس وقت کو جی بھر کر انجوائے کرنا چاہتی تھی۔

''چلو...... تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں۔''

''جی نہیں مجھے گاؤں کے راستے ازبر ہو چکے ہیں۔'' اسے جلانے کو کہتی وہ ابھی چند قدم ہی اٹھا پائی تھی کہ اچانک کراہ کر رک گئی۔

''اف...... ایک تو تمہیں اس گاؤں کے خار راس نہیں ہیں۔ میرا بس چلے تو ان سب کانٹوں کو جمع کر کے آگ لگوا دوں جو میری شہزادی کے پاؤں میں چبھ کر اسے تکلیف دیتے ہیں۔'' پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے انزلہ کا پاؤں اٹھایا اور پھر آہستہ سے کانٹا نکال کر پھینکتے

ے مسکرادیا۔

❀❀❀

''بی بی جی..... آپ کو شاہ زر صاحب بلا رہے ہیں۔''
اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی وہ مکمل انہماک سے ''شہاب نامہ'' کا مطالعہ کر رہی تھی جب ملازمہ
ستہ سے اس کے کمرے کا دروازہ ناک کرتے ہوئے اندر چلی آئی۔
گوری نے فوری سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔
''ٹھیک ہے' آتی ہوں۔''
تھوڑی دیر بعد وہ لاؤنج میں شاہ زر کے مقابل بیٹھی تھی۔
''آپ نے بلایا بھائی' خیریت؟''
شاہ زر، نیوز دیکھ رہا تھا۔ اور چاند اس کی گود میں بیٹھا چاکلیٹ کھا رہا تھا۔
''ہوں۔ سارا دن کمرے میں بند رہتی ہو' شادی کے بعد تو اپنی بہن کی شکل دیکھنے سے بھی گیا۔''
''کیا بات ہے' بھابی سے بنتی نہیں کیا؟''
فوراً ٹی وی آف کرتے ہوئے وہ گوری کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ جواباً وہ مسکرادی۔
''ایسی بات نہیں ہے بھائی! انوشہ بھابی تو بہت اچھی ہیں۔''
''بس ایک میں ہی برا ہوں باقی سب اچھے ہیں۔''
سرد آہ بھر کر اس نے جونہی کہا گوری کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔
''لگتا ہے بھابی سے تازہ تازہ جھگڑا ہوا ہے۔''
''میرا دماغ خراب ہے جو اس سے جھگڑوں گا۔ تم سناؤ اکیڈمی کیسی چل رہی ہے اور وہ عدی
نے دوبارہ پریشان تو نہیں کیا؟''
''اکیڈمی تو بہت اچھی چل رہی ہے بھائی مگر وہ لڑکا پتا نہیں کیوں ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گیا ہے' آج
آیا تھا پریشان کرنے۔''
''اچھا..... کیا کہہ رہا تھا؟''
''یونہی فضول بولتا ہے' پتا نہیں اس لڑکے کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟''
''سائیکی کیس ہے گوری' محبتوں سے محرومی اور احساسِ کمتری کے احساس نے اسے ایسا
ودسر بنا دیا ہے۔ ایسے لوگوں کا علاج سوائے محبت کے اور کچھ نہیں۔''
''میں سمجھی نہیں۔''
''ابھی سمجھ بھی نہیں سکو گی' بہر حال' آئندہ زندگی کے لیے کیا سوچا ہے تم نے؟''
''کچھ بھی نہیں' جو میرے رب کو منظور ہوا بس وہی۔''
''چلو ٹھیک ہے' اب کھانے کو کچھ ملے گا کہ نہیں؟''
''بھابی نہیں آئیں ابھی تک؟''
''نہیں..... نئی نئی جاب ہے ناں' ابھی وقت لگے گا خمار اترنے میں۔''
''بری بات بھائی! ایسا نہیں سوچتے' اب وہ اتنی بھی بری نہیں ہیں' باہر موسم خراب ہے آپ کو

ان کا پتا کرنا چاہیے تھا۔"
"کیسے کروں؟ محترمہ ایک گھنٹہ قبل آفس سے نکل چکی ہیں اور سیل مسلسل آف جا رہا ہے۔"
"پھر تو پکی بات ہے کہ وہ مشکل میں ہوں گی' مگر آپ ہیں کہ مزے سے گھر میں بیٹھے ہیں۔"
"تو کیا کروں' اتنی تیز بارش اور سرد ہوا میں اسے انوشہ' انوشہ کی صدائیں دیتا سڑکوں پر نکل جاؤں؟"
"بالکل...... وہ روز ایک ہی راستے سے آفس آتی جاتی ہیں' اور کچھ نہیں تو اسی راستے کو دیکھ آیئے۔" گوری کے پاس مفت مشورے کی کمی نہیں تھی۔
شاہ زر مسکرا دیا۔
"یار تم بہن میری ہو مگر سائیڈ ہمیشہ اس کی لیتی ہو۔"
"سمجھا کریں' عورتیں اتحاد کریں گی تو معاشرے میں تبدیلی آئے گی۔"
"فار گاڈ سیک گوری! اب کون سی تبدیلی آنا باقی رہ گئی ہے؟"
"بتاؤں گی' ابھی اٹھیے آپ' اور بھابی کو لے کر آیئے' پلیز تب تک میں کھانا لگواتی ہوں۔"
کہنے کے ساتھ ہی اس نے شاہ زر کے بازو سے شرٹ کھینچ کر اسے اٹھا دیا۔
باہر بارش اب بھی زوروں پر تھی۔
وہ گاڑی لے کر سردی کی پروا کیے بغیر نکل گیا۔ تیز بارش کی وجہ سے سڑکوں پر لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ تیز ڈرائیونگ میں بھی مشکل پیش آ رہی تھی۔ تیزی سے چلتے وائپر کے اس پار اس کی نظریں صرف انوشہ کو ڈھونڈ رہی تھیں جو بالآخر اسے نظر آ گئی تھی۔ مکمل طور پر بھیگے ہوئے کپڑوں میں ملبوس سردی سے کپکپاتے ہوئے وہ دور ایک شیڈ کے نیچے کھڑی جانے کون کون سی قرآنی آیات کا ورد کر رہی تھی۔
شاہ زر نے گاڑی اس کے قریب لے جا کر آہستہ سے روک دی۔
"آجاؤ۔" بائیں ہاتھ سے اس نے دروازہ بھی پش کر دیا تھا۔
انوشہ ایک نظر اپنے کپڑوں سے ٹپکتے پانی پر ڈالتی دل ہی دل میں اللہ رب العزت کا شکر ادا کرنے کے بعد جلدی سے گاڑی میں آ بیٹھی۔
"موبائل کہاں ہے تمہارا؟"
"گھر رہ گیا تھا آج۔ رات چارج نہیں کیا تھا۔"
"تو آفس سے فون نہیں کر سکتی تھیں کہ جلدی نہیں نکل سکو گی' میں تمہارا ملازم نہیں ہوں جو اتنے خراب موسم میں پاگلوں کی طرح سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا تمہیں ڈھونڈتا پھروں۔"
دہاڑ کر کہتے ہوئے اس نے غصہ دکھایا تھا۔
انوشہ ایک نظر اسے دیکھتی' سیٹ سے اٹھنے ہی لگی تھی کہ اس نے بایاں ہاتھ اس کے ہاتھ پر جما دیا۔
"بیٹھی رہو' چپ چاپ' زیادہ ہیروئن بننے کی ضرورت نہیں ہے۔"
کہنے کے ساتھ ہی اس نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔ انوشہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکالتی رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔

❁❁❁

''ایکسکیوز می!''

اجنبی صدا پر صاعقہ نے ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا' واصف علی ہمدانی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

وہ بیزاری سی رخ پھیر گئی مگر تب تک وہ قریب آ چکا تھا۔

''میں نے آپ کو اپنا سیل نمبر اور کارڈ دیا تھا مگر آپ نے رابطہ نہیں کیا' کیوں؟''

''میری مرضی' میں آپ سے رابطے کی پابند نہیں ہوں۔''

''ٹھیک ہے' مگر کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ شوبز میں کیوں آنا چاہتی ہیں؟''

''ہوں پیسے کے لیے۔''

''مگر پیسہ صرف غلط راستے پر چل کر ہی تو نہیں کمایا جا سکتا اور بھی کئی طریقے ہیں۔''

''مجھے اور کوئی طریقہ دکھائی نہیں دے رہا ہے اس وقت۔''

''دے جائے گا دکھائی' آپ مجھے بتایئے کتنے پیسے چاہئیں آپ کو؟''

''کتنے پیسے دے سکتے ہیں آپ؟''

''جتنی آپ ڈیمانڈ کریں۔''

''میری ڈیمانڈ پر مت جائیں عورت پیسوں کے معاملے میں ویسے بھی بہت کریزی ہوتی ہے۔''

''آپ کہہ سکتی ہیں' میں ایسا نہیں سمجھتا۔''

''حیرت ہے۔ شاید دنیا کا پہلا امیر آدمی ہے جس کی عورت کے بارے میں اتنی مثبت سوچ ہے۔''

''فضول کی بحث ہے یہ' آپ بتایئے پلیز آپ کو کتنے پیسے چاہئیں؟''

وہ سنجیدہ تھا' صاعقہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''پانچ لاکھ......''

''ٹھیک ہے مل جائیں گے اور کچھ۔''

اس بار حیران ہونے کی باری صاعقہ کی تھی۔

''اور کچھ نہیں مگر اتنے پیسے آپ کیوں دیں گے مجھے؟''

''پیسے کام کے عوض ہی ملتے ہیں مس۔''

''کیسا کام؟''

''کوئی غیر قانونی خطرے والا کام نہیں ہے۔''

''تو پھر...... کیا کرنا ہو گا مجھے؟''

''محبت۔''

''کیا......؟'' واصف علی ہمدانی نے جتنے آرام سے کہا تھا وہ اتنی ہی زور سے اچھل پڑی تھی۔

''جی ہاں...... اتنے پیسوں کے عوض آپ کو محبت کرنی ہو گی' اذلان حیدر سے محبت۔''

''کون اذلان حیدر؟''

''زندگی سے روٹھا ہوا ایک خوب صورت کردار۔''

''مگر میں محبت نہیں کر سکتی۔''

نگاہ پھیر کر کہتے ہوئے وہ جیسے گہرے کرب کا شکار ہوئی تھی۔

واصف علی ہمدانی سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

''حقیقت میں مت کیجیے گا' فرضی تو ہو سکتی ہے ناں۔''

''نہیں محبت کبھی فرضی نہیں ہوتی' آپ چاہتے ہیں میں کسی کو محبت کے نام پر دھوکہ دوں' اس جذبے کے نام پر جو اس کائنات کی بقاء کی بنیاد ہے' راز ہے۔''

''ہاں' کیونکہ میں اس سے پیار کرتا ہوں' بے حد بے تحاشا۔''

''غلط...... بے تحاشا پیار کرنے والے دھوکہ نہیں دیتے۔''

''پلیز مس! بحث میں وقت ضائع کرنے کا فائدہ نہیں ہے۔''

''آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟''

''بتادوں گا' فی الحال آپ بتائیے کریں گی میرا کام کہ نہیں۔''

''میں سوچ کر بتا سکوں گی۔''

''ٹھیک ہے' میرا کارڈ آپ کے پاس ہے' میں شدت سے آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔'' پینٹ کی پاکٹس میں ہاتھ گھسائے اس نے گہری نگاہوں سے صاعقہ کو دیکھتے ہوئے کہا اور پھر پلٹ گیا' صاعقہ عجیب سی کشمکش کا شکار وہیں کھڑی دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

❄❄❄

دیر تک بارش میں بھیگنے کے باعث انوشہ تیز بخار اور زکام کی زد میں آ گئی تھی۔

گوری ایک ہفتے کے لیے جماعت کے ساتھ شہر سے باہر گئی تھی۔ لہٰذا وہ کسی کو اپنی خرابی طبیعت کا بتا بھی نہیں سکی۔ شاہ زر خود بھی فلو کی زد میں تھا۔ سرخ ناک کے ساتھ' آفس کے لیے بمشکل تیار ہوئے' وہ ڈائننگ ٹیبل پر صرف چائے پینے آیا تھا جب چاند نے پیچھے سے آ کر اس کی گردن میں اپنے بازو حمائل کر دیے۔

''گڈ مارننگ پاپا۔''

''گڈ مارننگ نہیں پاپا کی جان' پہلے السلام علیکم اور پھر صبح بخیر۔''

''سوری پھوپو نے بتایا تھا' یاد ہی نہیں رہا۔''

مسکرا کر نادم سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے شاہ زر کا گال چوم لیا تھا۔ جواب میں اس نے اسے اٹھا کر گود میں بٹھالیا۔

''مما نے ناشتہ کر لیا؟''

''نہیں پاپا...... مما تو ابھی سو رہی ہیں۔''

''کیوں...... وہ تو جلدی اٹھ جاتی ہیں۔''

''پتا نہیں' رات میری آنکھ کھلی تو مما جاگ رہی تھیں۔''

چاند کی اطلاع پر قدرے متفکر ہو کر اس نے ملازمہ کو آواز دی تھی۔

''جی صاحب۔''

کچن میں کام کرتی ملازمہ دوپٹے سے گیلے ہاتھ خشک کرتی اس کی پکار پر فوراً حاضر ہوئی تھی۔

''بیگم صاحبہ آج بیدار نہیں ہوئی ہیں' جا کر دیکھو طبیعت ٹھیک ہے ان کی۔''

''جی اچھا۔''

اس کی ہدایت پر ملازمہ اوپر انوشہ کے کمرے میں گئی تھی۔ اگلے چند منٹ کے بعد وہ شاہ زر کو بتا رہی تھی۔

''صاحب جی! بیگم صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' شاید بخار ہے انہیں' بڑی مشکل سے بول رہی تھیں۔''

''اوہ میرے خیال سے' کل بارش میں بھیگنے کی وجہ سے بخار ہو گیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔'' متفکر لہجے میں کہتا وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اوپر انوشہ اپنے کمرے میں کمبل میں دبکی شدید بخار میں کانپ رہی تھی۔

''انوشہ!'' اس کے قریب پہنچتے ہی اس نے اپنائیت سے اسے پکارا تھا۔ انوشہ نے ذرا سی دیر کو آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر پلکیں موند لیں۔ شاہ زر نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی پر رکھا پھر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

''اتنی طبیعت خراب تھی' بتا تو دیتیں۔ میں ڈاکٹر کو کال کرتا ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے' میں ٹھیک ہوں۔''

''مجھے تو ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ ویسے بھی شوہر کی حیثیت سے اپنا فرض تو ادا کرنا ہی ہے مجھے۔ تم بھلے بھول جاؤ اپنے فرائض' میں نہیں بھول سکتا۔''

''مت بھولو' مگر مجھے تمہاری ہمدردی' تمہارے فرائض' تمہاری نوازشوں کی ضرورت نہیں ہے' سمجھے تم۔''

''بس کرو۔ بہت ہو گیا یہ نفرت اور بے حسی کا کھیل۔ میں یوں اپنی آنکھوں کے سامنے اس طرح سے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تمہیں۔''

''اچھا......؟ میری تکلیف تمہیں تکلیف دے رہی ہے؟''

''ہاں۔''

''ہونہہ' اللہ نے چاہا تو اب تم اسی تکلیف میں رہو گے' ہمیشہ۔''

ازحد تنفر سے کہتے ہوئے اس نے اپنے اوپر سے کمبل اتار کر پرے پھینکا تھا۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے انوشہ! خدا کا واسطہ ہے تمہیں' اب بس کرو' ختم کر دو یہ نفرت کی کہانی' بہت ہو گئی' پلیز۔''

''کبھی نہیں' زندگی کی آخری سانس تک' میری تم سے نفرت کبھی محبت میں نہیں بدل سکتی۔ کہیں لکھ کر محفوظ کرنا ہے تو کر لو شاہ زر آفندی' میں نفرت کرتی ہوں تم سے' انتہا کی حد تک' میرا بس چلے تو تمہاری زندگی کو عذاب بنا کر رکھ دوں۔ بہت نقصان کیے ہیں تم نے میرے' بہت سے لوگوں کی نظروں سے گرایا ہے مجھے۔ بہت رشتے چھینے ہیں تم نے میرے۔ کس کس کو بھولوں' کس کس کو معاف کروں؟ نہیں کر سکتی میں تمہیں معاف' کبھی نہیں۔'' شعلوں جیسے پرتپش لہجے میں پھنکار کر کہتی وہ دوسری سائیڈ سے بستر سے نکل گئی۔

"تم خدا نہیں ہو کہ ہمیشہ وہی کرو جو چاہو' تم زبردستی مجھے پامال کرسکتے ہو' اپنی زندگی میں شامل کرسکتے ہو' مگر میرے اندر کی نفرت ختم نہیں کرسکتے' میرا دل نہیں جیت سکتے۔"

"جیتوں گا' اگر تم ضدی ہو تو میری رگوں میں بھی بہت ضدی خون ہے۔ یاد رکھنا' تم محبت کرو گی مجھ سے' خود کہو گی کہ تم میرے بغیر نہیں رہ سکتیں' یاد رکھنا۔"

"میری زندگی میں وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔"

"آئے گا' تمہاری زندگی میں ہی آئے گا اور بہت جلد آئے گا۔ دیکھ لینا۔"

کہنے کے ساتھ ہی اس نے انوشہ کا بازو پکڑا اور زبردستی کھینچتے ہوئے اسے نیچے لے آیا۔

"اگر تم چاہتی ہو کہ میں زبردستی تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر نہ جاؤں تو آرام سے یہاں بیٹھو اور ڈاکٹر کا انتظار کرو۔" لاؤنج میں اسے صوفے پر دھکیلتے ہوئے اس نے برہمی سے کہا اور باہر نکل گیا' اگلے بیس منٹ میں وہ ڈاکٹر کے ساتھ وہاں آیا تو انوشہ غائب تھی۔

"بیگم صاحبہ کہاں ہیں......؟"

صفائی کرتی ملازمہ سے قدرے ڈپٹ کر اس نے پوچھا تھا۔

"جی...... وہ تو ابھی آفس کے لیے نکلی ہیں' میں نے روکنے کی کوشش بھی کی مگر انہوں نے ڈانٹ دیا۔"

اطلاع کیا تھی جیسے نمک تھا جو شاہ زر کے زخموں پر کسی نے چھڑک دیا تھا۔ غم و غصے سے اس نے لب بھینچ لیے۔ وہ لڑکی اسے اذیت دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ شدید خرابی طبیعت کے باوجود آفس جا کر بہت تکلیف پہنچائی تھی اس نے اسے۔ وہ ڈاکٹر سے ایکسکیوز کرتا تمام دن آفس میں بیٹھا کڑھتا رہا۔

شام تک انوشہ کی طبیعت مزید بگڑ چکی تھی۔ چکراتے سر کے ساتھ وہ آفس سے نکلی تو ایک قدم اٹھانا بھی محال لگ رہا تھا۔ بنا شاہ زر کے متعلق کچھ بھی سوچے' وہ ٹیکسی کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہی تھی جب کسی نے اسے پکار لیا۔

"انوشہ......"

مانوس صدا پر فوراً سے پیشتر پلٹ کر اس نے دیکھا تھا اور پھر جیسے حیران رہ گئی تھی۔

❋❋❋

رات کے شہر میں' کھیل ہی کھیل میں
کھو گئے ہم کہیں' وقت کی لہر میں
آگ ایسی لگی' خواب تک جل گئے
نیند کے قہر میں' رات کے شہر میں
اک مسافر لٹا' روشنی کھو گئی
راستہ گم ہوا' ایک کھڑکی کھلی
کوئی در وا ہوا......

ڑ کر جسم کو کوئی سایہ گیا
ٹ کر شاخ سے ایک پتا گرا
ے صدا نہر میں، رات کے شہر میں
ر سیٹی بجی کالے انجن کے سنگ، ریل گاڑی چلی
ب آنسو گرا' آخری پہر میں
ت کے شہر میں
رواز ے پر دستک کی صدا ابھری تھی۔ آمنہ کپڑے سمیٹتی بیرونی دروازے کی طرف چلی آئی۔
کون؟''
'ایان' صاعقہ کا بھائی۔''
'ایان بھائی۔'' اسے جیسے باہر سے اس جواب کی امید نہیں تھی۔ تبھی قدرے حیران ہوتے
اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔
''السلام علیکم! ایان بھائی آپ۔''
''جی وہ گھر لاکڈ تھا سوچا آپ سے پوچھ لوں یہ لوگ کہاں گئے ہیں؟''
''پتا نہیں ایان بھائی! صاعقہ نے یہ گھر تبدیل کیا تھا پھر کسی وجہ سے وہاں سے بھی شفٹ کر
کافی مشکلات کا شکار ہیں آپ کے گھر والے۔ میں نے ایک دو بار صاعقہ کے ساتھ جانے کی
ں کی مگر وہ لے کر ہی نہیں گئی۔ اس کے لیے تو میں خود بھی بہت پریشان ہوں۔''
''کیوں؟ وہ ملنے تو آتی ہوگی آپ سے۔''
''نہیں' دو چار ہفتوں سے نہیں آ رہی' ناراض ہے مجھ سے۔''
''میرے خدا، تو اب میں کہاں ڈھونڈوں انہیں؟ پہلے ہی بہت مشکل سے ملے تھے یہ لوگ۔''
''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ آپ کو یوں بتائے بغیر انہیں گھر چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔''
''شوق سے نہیں گیا تھا' مجبوری میں گیا تھا تاکہ ان کے لیے کچھ کر سکوں۔''
''پھر کیا کیا ہے آپ نے ان کے لیے۔''
''معذرت، ابھی یوں گلی میں کھڑے کھڑے نہیں بتا سکتا۔ بہر حال اب چلتا ہوں۔ یہ میرا
ل نمبر ہے جیسے ہی صاعقہ آپ کو ملے یہ نمبر اور یہ کچھ پیسے اسے دے دیجیے گا۔ میں پھر آؤں گا۔''
ت سے پیسوں کا ایک لفافہ اور ایک چھوٹی سی چٹ جس پر اس کا موبائل نمبر لکھا تھا اسے پکڑا کر وہ
ٹ گیا تھا۔ آمنہ اسے صدا دے کر روکتی رہ گئی۔ اماں اس وقت گھر پر نہیں تھی وگرنہ وہ اسے اندر ضرور
تی۔ دروازہ بند کر کے وہ پلٹی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس تنگ بوسیدہ گلی کے کئی ادھ کھلے کواڑ بھی
ہوئے تھے۔ اگلی صبح تک اس محلے میں ایک نئی کہانی جنم لے چکی تھی۔
آمنہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی اور اس کے کردار کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی گئیں۔ چور نگاہ
کھنے والی اس محلے کی ایمان فروش کچھ خواتین نے ایان سے پندرہ منٹ دروازے پر ملاقات اور اس
ے چٹ و لفافہ تھامنے کو اپنی مرضی کے معنی پہنا کر اسے رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ
پنی صفائی میں قسمیں کھاتی رہ گئی مگر......! چھوٹی چھوٹی تنگ گلیوں کے اس بوسیدہ محلے میں بسنے

والے لوگوں کے ذہن بھی اتنے ہی تنگ تھے۔ اگلے چند روز میں اس کی منگنی کا سامان بھی واپس آ گیا تھا۔ صف ماتم بچھے اس چھوٹے سے گھر میں پہلی بار اسے اس کی ماں نے خوب مارا تھا اور یہ مار بھی ایسے جرم کے لیے تھی جو اس سے سرزد ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ تو صرف سمعان کو پسند کرنے کی سزاوار تھی۔ اس کے برے حالات پر اس کے گھر والوں کے لیے اپنے دل میں ہمدردی رکھتی تھی۔ تیسری کوئی بات تو تھی ہی نہیں درمیان میں مگر...... پھر بھی اس کا کردار داؤ پر لگ گیا تھا۔ رائی سے پہاڑ اور پہاڑ بھی ایسا بلند کہ وہ اس کے نیچے دب کر سانس لینے سے بھی معذور رہی۔ اپنے ہی گھر میں کسی گناہ کے وہ جیسے اچھوت بن کر رہ گئی تھی۔ نہ کوئی اس کی طرف دیکھتا تھا نہ بات کرتا تھا۔ وہ کھاتی نہ کھاتی کوئی پروا نہیں تھی کسی کو۔ اسے بدن پر لگے زخموں کا کوئی ملال نہیں تھا تکلیف تھی تو صرف اپنے رشتوں کی بے اعتباری کی۔ کتنا گرا دیا تھا ان لوگوں نے اسے یوں کہ وہ زندہ جاوید ہنستی کھلکھلاتی لڑکی سے چپ کا مجسمہ بن کر رہ گئی تھی۔ ماؤں کی نیندیں تو شاید بیٹیوں کے جنم لیتے ہی اڑ جاتی ہیں۔ وہ بیٹی تو پھر جوان بھی تھی رسوا بھی اور منگنی ٹوٹی ہوئی بھی۔ اس کی ماں کی نیند اڑنا لازمی بات تھی۔ بہت دنوں کی کوششوں کے بعد بالآخر ایک جاننے والی کے توسط سے اس کے لیے ایک پہلے سے شادی شدہ ادھیڑ عمر شخص کا رشتہ آ گیا تھا۔ جو بچوں کی خاطر دوسری شادی کرنا چاہ رہا تھا۔

محلے میں بیٹی کے ہاتھوں ہوئی رسوائی کا داغ دھونے کے لیے آمنہ کی ماں نے یہ رشتہ منظور کر لیا تھا۔ سادگی سے ساری تیاری ہوئی اور اسی روز وہ بابل کی دہلیز سے رخصت بھی ہو گئی مگر یہ رخصتی ایسی ہی تھی جیسے کسی گھر سے جنازہ نکلتا ہے۔

سمعان کو کسی دوست کی معرفت اس شادی کی خبر ملی تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو جیسے وہ ساکت ہی رہ گیا۔ یقین ہی نہ آیا تھا کہ ہر مشکل میں ساتھ نبھانے کا دعویٰ کرنے والی وہ لڑکی یوں بنا بتائے کسی اور کے سنگ چپ چاپ رخصت ہو کر بھی جا سکتی ہے۔ سڑک کے کنارے لگے بجلی کے پول تلے کھڑا وہ کتنی ہی دیر اپنی کٹی ہوئی ٹانگ اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو دیکھتا رہا تھا۔ آنکھیں بھر آنے کو بے تاب تھیں۔ سارا شہر دوڑتی بھاگتی گاڑیوں میں سوار جیسے زندگی کی دوڑ میں ایک دوسرے سے مقابلے پر تلا ہوا تھا۔ مگر ایک اس کا دل تھا کہ وہاں جیسے دور دور تک سناٹا بکھر گیا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہاں اس کے دکھ پر رونے کی فرصت کسی کے پاس نہیں تھی۔ اس روز اس نے اپنا پہلا گراف بیچا تھا۔ شب کی تاریکی میں شکستہ دل سے اگلے دو روز کے بعد گھر واپس پلٹتے ہوئے وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کا خاصا سامان لایا تھا۔ ہلکے سانولے چہرے پر پھیلی پیلاہٹ ماں کے پیر دباتی صاعقہ نے خصوصی نوٹ کی تھی۔ مگر وہ جان ہی نہیں سکی کہ جس درد نے اس کا دل اجاڑ ڈالا تھا آج اسی درد کی گرفت میں اس کے سادہ دل بھائی کا دل بھی مسمار ہو چکا ہے۔

زندگی جب امتحان لینے پر آتی ہے تو سارے مشکل سوال ایک ساتھ تقدیر کے بنے میں لپیٹ کر آپ کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ اس رات سمعان کے ساتھ ساتھ صائمہ اور صاعقہ بھی صبح تک جاگتی رہی تھیں۔ صاعقہ کے ذہن میں رہ رہ کر واصف علی ہمدانی کا خیال آ رہا تھا۔ اگر وہ اس کی آفر قبول کر لیتی تو اس کے گھر والے ایک بہترین زندگی گزار سکتے تھے مگر یہ آفر کسی کو دھوکا دینے کی تھی۔ محبت کے نام پر بے وقوف بنانے کی اور اس کے نزدیک دنیا کا سب سے بدترین شخص وہی تھا جو کسی

خلوص دل کو محبت کے نام پر فریب دیتا ہوا اپنے گھر والوں کے لیے ہی سہی، مگر وہ کسی کو وہی تکلیف کیسے پہنچا سکتی تھی جو خود اس کے دل نے بہت پاش پاش ہو کر مشکل سے جھیلی تھی۔

زندگی میں بہت کچھ بکھر کر رہ گیا تھا بالکل اس کے گھر کے سامان کی طرح!

سوچیں، دل، خیالات، خواب......! کس کس کا واویلا کرتی وہ...... کس کس کو روتی؟ اس رات گلی میں بکھرے سامان اور اپنے خوابوں میں کوئی فرق محسوس نہ کرتے ہوئے بہت مجبور ہو کر اس نے خود غرض بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

❁❁❁

سرد رویہ، الجھا لہجہ
کھوئی آنکھیں، ٹھنڈے ہاتھ
بے رنگ چہرہ، بد اخلاق
دیکھو تم بن کون ہوں میں؟

اگلے روز بہت سوچ و بچار کے بعد وہ واصف علی ہمدانی کے آفس چلی آئی تھی۔ وہ میٹنگ کے لیے نکل چکا تھا ورنہ اس کی آمد کی اطلاع پا کر شاید ساری مصروفیات ہی ملتوی کر دیتا۔ صاعقہ کی مجبوری نے اسے وہاں اڑھائی گھنٹے انتظار کروایا تھا۔ واصف میٹنگ کے بعد گھر جا رہا تھا جب اس کی سیکریٹری نے اسے صاعقہ کا پیغام دیا جواباً وہ گھر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے فوراً آفس چلا آیا۔

صاعقہ خاصی شکستہ سی اس کے کمرے میں آئی تھی۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔" بہت معذرت محترمہ کہ آپ کو میرا انتظار کرنا پڑا۔ اگر آپ یہاں آنے سے پہلے مجھے مطلع کر دیتیں تو میں ہرگز کہیں نہ جاتا۔" وہ خوش بھی تھا مطمئن بھی صاعقہ حیرانی سے اسے دیکھے گئی۔

"کیا لیں گی آپ کافی یا کولڈ ڈرنک۔"

"کچھ نہیں بس آپ کا تھوڑا سا ٹائم مل جائے یہی بہت ہے۔"

"شرمندہ کرنے والی باتیں نہ کریں محترمہ! میں کافی منگواتا ہوں۔" سیٹ سنبھالتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھایا تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکا گئی۔ کافی آرڈر کرنے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"جی اب بتایئے کیسی ہیں آپ۔"

"ٹھیک ہوں۔"

"پھر کیا فیصلہ کیا آپ نے۔"

"وہی جو آپ کی خواہش تھی۔"

"گڈ! میں واقعی بہت خوش ہوں۔ یہ تصویر دیکھیے آپ کیسی ہے؟" مسرور ہوتے ہوئے اس نے میز کی دراز سے ایک تصویر نکال کر صاعقہ کے سامنے رکھ دی تھی۔ صاعقہ کی نظریں جونہی اس پر پڑیں وہ حیران رہ گئی۔

"ارے یہ تو میری تصویر ہے۔"

”جی نہیں' یہ میرال ہے میرال حسن۔“

”مگر اتنی مشابہت۔“

”جی' کبھی کبھی ہو جاتا ہے ایسا۔ بہت سے چہروں کو جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے جیسے ہم نے پہلے بھی انہیں کہیں دیکھا ہے۔ آپ کو پہلی بار دیکھ کر مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا۔ بہر حال آپ غور سے دیکھیں گی تو کچھ فرق بھی واضح ہو جائیں گے میرال کے بال آپ کے بالوں سے میل نہیں کھاتے۔ جسامت میں بھی وہ آپ سے ذرا سی صحت مند ہے۔ آپ کے اور اس کے رنگ میں بھی واضح فرق ہے۔ وہ ہمیشہ شارٹ شرٹ اور جینز یا اسکرٹ پہنتی تھی مگر آپ مکمل مشرقی ملبوس میں رہتی ہیں۔ ہاں ایک چیز آپ دونوں میں مشترک ہے۔“

”کیا؟“

”آواز“ جانے وہ اسے کیا بتانے جا رہا تھا۔ صاعقہ توجہ سے اسے دیکھتی رہی۔

”اب کہاں ہے وہ۔“

”یہ تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ مگر غالب امکان یہی ہے کہ وہ مر چکی ہے۔“

”کیا مطلب۔“ اسے جیسے دھچکا لگا تھا۔

”دو سال پہلے اپنے یونیورسٹی فیلوز کے ساتھ ٹرپ پر گئی تھی وہ۔ راستے میں اس کی گاڑی پھسل گئی اور اب تک نہ اس کا کچھ پتا چلا نہ گاڑی کا۔“

”مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ دوستوں کے ساتھ گئی تھی تو۔“

”جی وہ دوستوں کے ساتھ گئی تھی مگر اپنی گاڑی میں اسے ڈرائیونگ کا جنون تھا۔ ہر وقت کہیں نہ کہیں جانے کو بے قرار رہتی تھی۔ اس وقت بھی سب کے منع کرنے کے باوجود وہ اپنی فرینڈز کے ساتھ' یونیورسٹی کی گاڑی میں بیٹھنے کے بجائے اپنی گاڑی پر نکلی تھی جس یونیورسٹی میں وہ پڑھ رہی تھی۔ حسن انکل اس کے پرنسپل تھے۔ ابھی پچھلے سال ریٹائر ہوئے ہیں۔“

”پھر کیسے پتا چلا اس کا؟“

”پتا کہاں چلا اس ٹرپ میں، میں اور مصحف بھی تھے۔ میں چاچو کا بیٹا ہوں اس کا اور مصحف پھوپو کا۔ ہم لوگ صبح تک مری پہنچ گئے تھے سنو فال دیکھنے مگر وہ دن چڑھے تک نہیں پہنچی تھی۔“

”پھر کسی سے پتا تو کیا ہوگا آپ نے؟“

”آپ کو کیا لگتا ہے نہیں کیا ہوگا؟ اکلوتی بیٹی تھی وہ حسن انکل کی۔ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے انکل اور آنٹی اسے۔ پچھلے دو سالوں سے کوئی ادارہ کوئی جگہ' کوئی شہر نہیں چھوڑا انہوں نے جہاں اسے نہ تلاشا ہو' مگر وہ نہیں ملی۔“ واصف علی ہمدانی کے لہجے میں افسردگی تھی۔

صاعقہ کا سر جھک گیا۔

”آنٹی تو اب کسی کو پہچانتی بھی نہیں ہیں' ہر آہٹ پر پاگلوں کی طرح بستر سے اٹھ کر گیٹ کی طرف بھاگتی ہیں۔ مگر میں آپ سے ان کی بات نہیں کروں گا۔“ بہت سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس نے سگریٹ جلا لیا تھا۔ صاعقہ نے بے ساختہ سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”پھر؟“

"یہ تصویر دیکھیں، یہ اذلان حیدر ہے۔ میرا جگری یار۔" ایک بہت ہینڈسم لڑکے کی تصویر میز پر
لے سامنے رکھتے ہوئے وہ اسے بتا رہا تھا۔
"اربوں کی جائیداد کا تنہا وارث ہے۔ یہ آفس جہاں ہم بیٹھے ہیں۔ اسی کا ہے، میرال کے
والوں میں انکل آنٹی کے بعد اس کا نام آتا ہے۔ جب تک میرال تھی دیوانوں کی طرح اسے
تھا مگر اب وہ نہیں ہے تو اس کے ذکر سے بھی نفرت کرتا ہے۔"
"کیوں، ویسے کیوں تو مجھے پوچھنا ہی نہیں چاہیے۔ یہ تو مرد کی فطرت کا حصہ ہے جیسے پانی
نشیب کی طرف بہتا ہے ایسے مرد بھی ہمیشہ اچھائی سے برائی کی طرف جاتا ہے۔ کوئی زندہ رہے
جائے کوئی فرق نہیں پڑتا اسے۔"
"ممکن ہے آپ درست کہہ رہی ہوں مگر میرا یار ایسا نہیں ہے۔"
کافی آ گئی تھی، واصف نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ملازم کے جانے کے بعد صاعقہ کو کپ
اتے ہوئے وہ بولا۔
"جس روز ہمارا ٹرپ گیا تھا اس روز اذلان اور میرال کے بیچ بہت شدید جنگ ہوئی تھی۔ میں
ہیں جانتا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرال کی موت اور اذلان کی اس سے اچانک نفرت میں کہیں
نہ کہیں اس جھگڑے کا تعلق نکلتا ہے۔ وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں ہے کہ میرال مر گئی ہے۔"
"پھر اب آپ کیا چاہتے ہیں۔"
"اذلان کی زندگی۔"
"کیا۔"
"ہاں بہت تیزی سے ختم کر رہا ہے وہ خود کو۔ یہ بات صرف میں جانتا ہوں اور کوئی نہیں جانتا۔"
"سوری میں سمجھی نہیں۔"
"میں ابھی آپ کو سمجھا بھی نہیں سکتا۔ مگر آپ کو اسے زندگی کی طرف واپس لانا ہے۔ اس کی وہ
تمام الجھنیں سمیٹنی ہیں جو اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔"
"مگر یہ کیسے ممکن ہوگا؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اس سے میرال کر ملوں؟"
"نہیں، وہ اتنا پاگل نہیں ہے کہ آپ میں اور میرال میں فرق کو محسوس نہ کر سکے مگر آپ کو دیکھنے
کے بعد وہ پتھر پگھل ضرور سکتا ہے۔ اس بات کا یقین ہے مجھے۔"
"کیا میرال اس سے محبت کرتی تھی۔"
"پتا نہیں بہت گھنی لڑکی تھی وہ۔ اس کی نہ خوشی کا پتا چلتا تھا نہ غم کا۔ اپنی کوئی بھی بات سوائے
انکل آنٹی کے اور کسی سے شیئر نہیں کرتی تھی۔ اذلان حیدر سے بھی نہیں، مگر پھر بھی وہ اسے چاہتا تھا۔
بے حد! بے تحاشا! اسی کی ضد پر دونوں کی منگنی ہوئی تھی۔ مگر اب اس کی یہ بے تحاشا نفرت میری سمجھ
سے باہر ہے۔"
"تو آپ اس الجھی ہوئی کہانی کا سرا ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔"
"ہاں۔"
"تو ٹھیک ہے میں ان سے ملوں گی مگر بدلے میں مجھے ایک بہت اچھا سا گھر چاہیے جہاں میں

اپنی فیملی کے ساتھ رہ سکوں۔"

"ٹھیک ہے کل پرسوں تک انتظام ہو جائے گا۔"

"کل پرسوں تک نہیں واصف صاحب! آج ہی۔"

"ٹھیک ہے آج ہی انتظام کروا دیتا ہوں' کب شفٹ ہونا ہے۔"

"آج رات یا کل صبح۔"

"او کے' جتنے پیسے چاہیے ہوں وہ بھی بتا دیجیے گا۔ میں حساب کتاب اور سودے بازی کے معاملے میں بے ایمان آدمی نہیں ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ اللہ نے چاہا تو آپ مجھے بھی ایمان دار ہی پائیں گے۔"

"گڈ!" وہ کافی ختم کر چکا تھا مگر صاعقہ نے ایک گھونٹ بھی نہیں بھرا تھا۔

"اب چلتی ہوں میں کل دوبارہ آؤں گی۔"

"مگر آپ نے کافی تو پی ہی نہیں' آپ بیٹھیں پلیز! میں دوسرا کپ منگواتا ہوں۔"

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کافی ذرا کم ہی پیتی ہوں۔ کل سہی۔" شائستگی سے معذرت کرتے ہوئے وہ اس کے آفس سے نکل آئی تھی۔ راستے میں اسے لگا جیسے عباد اس پر ہنس رہا ہو۔

"تو اب تم بھی کسی کو محبت کے نام پر دھوکا دینے جا رہی ہو؟ ہاہاہا کیا فرق رہا مجھ میں اور تم میں صاعقہ! مجھ سے نفرت کرتی ہو تو خود سے بھی کرو۔"

"جسٹ شٹ اپ! تمہارے فریب نے مجھ سے زندہ دلی کو چھینا ہے۔ میرا فریب کسی کی جان نہیں لے گا۔ سمجھے تم!" اپنے دھیان میں بولتے ہوئے وہ چلائی تھی۔ جواب میں آس پاس سے گزرتے لوگوں نے رک کر خاصی حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

"لگتا ہے پاگل ہے دیکھنے سے پتا ہی نہیں چلتا۔" قریب سے گزرتے ہوئے کسی نے رائے دی تھی۔ اس کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر آئیں۔

"ظاہری دیکھنے سے بھلا پتا لگتا ہی کہاں ہے کہ کون کیسا ہے۔ کاش انسان کا باطن اس کے چہرے پر لکھا ہوتا تو کبھی کوئی دھوکا نہ کھاتا' نہ یوں پاگل کہلاتا۔"

زخمی سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے وہ بڑبڑائی تھی۔

وہ ہم سفر تھا مگر اس سے ہم نوائی نہ تھی
کہ دھوپ چھاؤں کا عالم رہا جدائی نہ تھی
عداوتیں تھیں' تغافل تھا' رنجشیں تھیں مگر
بچھڑنے والے میں سب کچھ تھا بے وفائی نہ تھی

❋❋❋

ایان احمد نے علیزہ ملک سے نکاح کیا تھا مگر اسے اب اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اسے توڑنے اور ذلیل و رسوا کرنے کے لیے وہ اس سے سڑکوں پر بھیک منگوانا چاہتا تھا مگر پھر اچانک اس

ارادہ بدل گیا۔ وہ اس وقت بدتر حالات کا شکار تھا اور ایسے حالات میں علیزہ ملک جیسی سونے کی مرغی اس کے بہت کام آسکتی تھی۔ اس کا ایک دوست حال ہی میں کویت سیٹل ہوا تھا اور اب اس کا ارادہ بھی کویت جانے کا تھا۔ اسی مقصد کے لیے اس نے علیزہ ملک کے گھر والوں سے تاوان کا مطالبہ کیا تھا۔ حویلی میں بڑے ملک کی طبیعت' علیزہ کی دوبارہ گمشدگی کی وجہ سے بہت خراب ہوگئی تھی۔ ایسے حالات میں' چھوٹے ملک کو بنا کوئی ہوشیاری دکھائے' اپنی عزت ساکھ اور باپ کی زندگی بچانے کے لیے ایان کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا تھا۔

پانچ لاکھ کی خطیر رقم کے تاوان کے بعد علیزہ حویلی آ گئی تھی مگر بے حد ٹوٹی بکھری ہوئی۔ کیا رہ گیا تھا۔ اس کے پاس' کچھ بھی تو نہیں۔

ایان کڑی جدوجہد اور کوشش کے بعد' کویت چلا گیا' جانے سے قبل اس نے آمنہ سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ علیزہ جس وقت اس کے گھر سے رخصت ہو رہی تھی اس نے کہا تھا۔

''جاؤ' آزاد کر رہا ہوں تمہیں مگر یاد رکھنا میری ضد اب بھی وہی ہے۔ گاؤں سید والا کی گلیوں اور چوراہوں کو تمہارے لیے شجر ممنوعہ بنا کر رہوں گا۔ یہ رہائی عارضی ہے۔ واپس آ کر سارے حساب کتاب برابر کروں گا تم سے۔''

وہ واپس آ گئی تھی مگر سر تا پیر بدل کر۔ صاحبہ اسے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔ ایک منٹ سکون سے نہ بیٹھنے والی لڑکی کے لبوں پر عجیب سی چپ لگ گئی تھی۔

''علیزہ! تو ٹھیک تو ہے نا۔'' حویلی کے کشادہ صحن میں دھوپ ڈھلنے لگی تھی۔ وہ مضمحل سی اٹھ کر اندر کمرے میں آئی تو صاحبہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کر اندر چلی آئی۔ علیزہ نے ایک نظر سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر نگاہ پھیر لی۔

''ہاں' ٹھیک ہی ہوں' مجھے کیا ہونا ہے؟''

''مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی' کیا سانول شاہ کی وجہ سے دکھی ہو۔''

''نہیں۔''

''پھر کیا بات ہے' کیا چاچا کی طبیعت کی وجہ سے پریشان ہو۔''

''ہوں' شاید یہی وجہ ہو۔'' بنا اس کی طرف دیکھے اس نے تسلیم کیا تھا۔ پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے صاحبہ کو ساری بات بتا دی کہ اس سے کچھ بھی چھپانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

''یا اللہ! یہ سب کیسے اور کب ہوا۔ کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا اس نے تجھے۔''

''نہیں' میری طرف تو دیکھتا بھی نہیں وہ۔ پھر بھی' پھر بھی میں اس سے نفرت نہیں کر پا رہی۔ صاحبہ! کاش میں اس سے نفرت کر سکتی۔'' بہت بے بسی سے وہ کہہ رہی تھی۔ صاحبہ پریشان سی اسے دیکھے گئی۔

''اب کیا ہوگا علیزہ! چاچا تو تیری فوری شادی کی تیاری کر رہے ہیں۔''

''جانتی ہوں' میرے پاس ایان کے گھر والوں کا پتا ہے' میں وہاں جا سکتی ہوں۔ مگر اس سے پہلے میں بابا سے بات کروں گی۔ بہت پیار کرتے ہیں وہ مجھ سے' میرے ساتھ زیادتی نہیں ہونے

دیں گے۔" اسے اپنے باپ پر مان تھا تبھی پر یقین لہجے میں کہہ رہی تھی۔ صاحبہ سرد آہ بھرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ میں چلتی ہوں اب رات سے بھوری (گائے) کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سوچ رہی ہوں آج بابا کے ہاتھ شہر بھجوا دوں۔ تو پریشان نہ ہو' رب سوہنے نے چاہا تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ اس کی عزیز دوست ہی نہیں مخلص غمگسار بھی تھی۔ تبھی اسے تسلی دیتی رخصت ہو گئی۔ علیزہ بڑے ملک کے کمرے کی طرف آئی تو وہاں اس کے بھائی زور و شور سے اسی کے متعلق بحث کر رہے تھے۔

"یہ ٹھیک نہیں ہے بابا! آپ کا لاڈ پیار اپنی جگہ' مگر یہ لڑکی کئی بار ہماری عزت کا جنازہ نکال چکی ہے۔ ہم سے جو ہو سکے گا اسے دے دیں گے مگر زمین کی ایک پائی پر حق نہیں بنتا اس کا۔"

"چپ کرو میری بیٹی ہے وہ۔ تمہاری مرتی ہوئی ماں سے اسے ہمیشہ پھولوں کی طرح رکھنے کا وعدہ کیا تھا میں نے۔ مجھے پتا ہے' وہ کیسی ہے اس کا قصور نہیں ہے۔ اس لڑکے ایان احمد کا قصور ہے سارا۔ وہ گناہ گار ہوتی تو ہر بار اسے ہمارے ہاتھوں ذلیل نہ کرواتی۔ بہت یقین ہے مجھے اپنی بیٹی پر۔ جو اس کا حصہ ہے وہ اسے مل کر رہے گا۔" بیماری کے باوجود بڑے ملک کی آواز میں دبدبہ تھا۔ علیزہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ اس نے سوچ لیا تھا وہ بھائیوں سے اپنا حصہ نہیں لے گی۔ اسے زمین جائیداد سے زیادہ رشتے عزیز تھے۔ جنہیں خود سے دور کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ڈھلتے دن کے ساتھ سردی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے بستر میں دبک کر بیٹھ گئی۔

"کہیں لکھ کر رکھ لے علیزہ' شادی کروں گا تو تجھ سے۔ نہیں تو تیری حویلی کے سامنے خود کو گولی سے اڑا لوں گا۔ دیکھ لینا۔"

بے ساختہ شہزاد عباس کی یاد ہوا کے جھونکے کی طرح اس کے تصور کے پردے پر جھلملائی تھی۔ وہ پڑھا لکھا روشن خیال نوجوان تھا۔ جسے گاؤں کے قدرتی ماحول سے جنون کی حد تک پیار تھا۔ علیزہ کو اس کے بارے میں محض اتنا پتا تھا کہ وہ شہر میں یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور بے حد لائق طالب علم ہے۔ اس کا مستقبل روشن تھا۔ وہ اس کی دوست صاحبہ کا خالہ زاد تھا اور گاؤں کی فطری زندگی دیکھنے ان کے گاؤں آیا تھا۔ علیزہ شروع میں اس سے بہت خار کھاتی تھی اور اسے اپنے منگیتر سانول شاہ کی بہادری اور کارناموں کے قصے سنا سنا کر متاثر کرنے کی کوشش کرتی رہتی تھی مگر وہ کبھی کسی سے متاثر ہوتا ہی نہیں تھا۔ علیزہ کو پتا ہی نہ چلا اور وہ اس سے متاثر ہوتی گئی۔ اکثر تینوں کھیتوں کی سیر کو نکل جاتے۔ کبھی آم اور مالٹوں کے باغات میں گھس کر سارے پھلوں کا ناس کر آتے بڑے ملک تک ان کی شرارتوں کی شکایات پہنچتی رہتی تھی۔ مگر انہوں نے کبھی اسے نہیں ڈانٹا۔

شہزاد کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں مگر وہ پھر بھی جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ علیزہ کو اس نے بتایا کہ وہ حکومتی ویزے پر مزید تعلیم کے لیے ملک سے باہر جانا چاہ رہا ہے۔ وہ اس کے لیے دعا کرے۔ اور علیزہ اس کی خوشی کے لیے بنا دل میں اٹھتے خدشات کی پروا کیے ہر نماز میں اس کی کامیابی کے لیے دعا کرنے لگی تھی۔ جس روز علیزہ نے اچھے نمبروں کے ساتھ میٹرک پاس کیا' وہ بہت خوش تھا۔

شہر میں اس نے علیزہ کے لیے بہت سی شاپنگ کی تھی۔ چند روز کے بعد ہی کینیڈا کے لیے اس کا اسٹوڈنٹ ویزا لگ گیا۔ وہ اتنا خوش تھا کہ قدم زمین پر لگتے ہی نہیں تھے۔ علیزہ بھی اس کی خوشی میں خوش تھی مگر جدائی کے مرحلے پر اس کی خوشی آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ کتنے وعدے اور کتنی قسمیں تھیں جو شہزاد عباس نے اسے اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے کھائی تھیں۔ بقول اس کے وہ مر سکتا تھا مگر کسی اور لڑکی کا اس کی زندگی میں آنا ممکن نہیں تھا۔ مگر کینیڈا جانے کے بعد اسے نہ اپنا کوئی وعدہ یاد رہا نہ قسم۔ پہلے وہ پابندی سے اسے خط لکھتا تھا مہینے میں ایک آدھ بار فون پر بات بھی کر لیتا تھا۔ پھر یہ سلسلہ بھی جاتا رہا۔ وہ کسی چکور کی مانند بے قرار صرف اس کے خط کا پتا کرنے صاحبہ کے گھر کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ بہت دنوں کے بعد اسے پتا چلا کہ شہزاد کو کینیڈا میں اپنی ایک کلاس فیلو سے محبت ہو گئی ہے اور وہ اسی سے شادی کا خواہاں ہے۔

علیزہ کے دل پر اس خبر سے بجلی گر پڑی تھی۔ وہ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی کہ کوئی اپنی قسمیں بھی بھلا سکتا ہے۔ کیا کیا نہیں سوچ لیا تھا اس نے شہزاد عباس کے لیے۔ کیسے کیسے خواب وابستہ نہیں کر لیے تھے اس سے مگر سب کچھ بکھر گیا۔ بہت بڑا صدمہ تھا یہ اس کے لیے۔ اسے سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ شہزاد عباس نے کسی اور لڑکی کو اس پر فوقیت کیوں دی؟ وہ خوب صورت، پڑھی لکھی، مال دار لڑکی تھی اس کے ہاتھ میں ہر ہنر تھا۔ وہ اس سے بے حد مخلص اور وفادار تھی پھر اور کیا چاہیے تھا اسے، جس کی تلاش میں وہ اس کے خواب روند کر کسی اور لڑکی کی طرف بڑھ گیا تھا۔

بے یقینی سی بے یقینی تھی، غم و غصے نے جیسے پاگل سا کر چھوڑا تھا اسے۔ تبھی وہ بکھرتی گئی تھی۔ ایک شہزاد عباس کے ہاتھوں ملنے والی شکست کا غم بھولنے کے لیے اس نے ہر مرد کو کھلونا سمجھ لیا تھا۔ کہاں کہاں تک نہیں گئی تھی وہ اس کھیل میں۔ خود اپنی نظروں سے بھی گر گئی تھی۔ سانول شاہ کو بھی کھو دیا اس نے اور اب......! اب سامنے پھر چٹیل میدان تھا۔

جانے ابھی اور کون سے حساب کتاب تھے جو وہ قرض رکھ کر چلا گیا تھا۔

❋❋❋

''انوشہ......!'' صدا دوبارہ ابھری تھی۔ انوشہ نے اپنے چکراتے سر کو بہ مشکل تھامتے ہوئے پلٹ کر دیکھا اور پھر جیسے حیران رہ گئی۔ سر زمان اس سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑے مسکرا رہے تھے۔

''سر آپ......؟'' انہیں دیکھتے ہی اسے اپنی تکلیف بھول گئی تھی۔

''جی ہاں، کیسی ہیں آپ۔''

''میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں؟''

''آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوں۔ خود ہی دیکھ لیجیے۔'' وہ بہت خوش اور مطمئن لگ رہے تھے۔ انوشہ کی نظریں ان کے چہرے پر ٹکی رہیں۔

''پاکستان کب آئے آپ۔''

''ایک ماہ ہو گیا ہے۔ آپ اگر مصروف نہ ہوں تو کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

''جی۔'' وہ انہیں منع کرنا چاہتی تھی مگر اس سے انکار ہو ہی نہ سکا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ریستوران

میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے تھے۔

''میری شادی ہوگئی ہے انوشہ' بہت اچھی لڑکی ہے۔ سارہ نام ہے اس کا۔ پاکستان دیکھنے کی بہت شوقین تھی اسی کی ضد کی وجہ سے مجھے آنا پڑا ورنہ آپ کی شادی کے بعد حقیقت میں اس ملک سے میرا دل اچاٹ ہوگیا تھا۔ بہرحال آپ سنائیے۔ کیا مصروفیات ہیں آج کل' کبھی یاد ہی نہیں کیا آپ نے؟'' وہ شاید گلہ کررہے تھے۔ انوشہ نے نظریں جھکالیں۔

''میری بھی شادی ہوگئی سر! عبدالصمد کی وفات کے بعد شاہ زر آفندی نے مجھے اپنے نکاح میں لے لیا' اسی کے پاس رہ رہی ہوں۔ آج کل۔''

''اوہ' عبدالصمد کی وفات کب ہوئی' ویسے شاہ زر بہت اچھا لڑکا ہے۔''

''ہرگز نہیں' عبدالصمد کی موت میں بھی اس کا ہاتھ ہے۔ وہ شخص میرے نصیب کی سیاہی بن کر میری پیشانی پر درج ہو چکا ہے۔ سر! آپ نہیں جانتے میں اس سے کتنی نفرت کرتی ہوں۔''

''کسی حد تک جانتا ہوں مگر وہ واقعی اچھا لڑکا ہے انوشہ! جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ آپ کو بہت پسند کرتا ہے۔ یونیورسٹی لائف میں آپ کو اس پر ترجیح دیتا تھا تو اس کے چہرے کا رنگ دیکھنے والا ہوتا تھا۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے' جنہیں جاننا' سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ شاہ زر آفندی بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہے۔''

''آپ اس کی وکالت کیوں کررہے ہیں۔''

''وکالت نہیں کررہا انوشہ! آپ کو سچ بتا رہا ہوں۔ کچھ ایسے طالب علم ہوتے ہیں جنہیں ہم اساتذہ چاہیں بھی تو اپنی یادداشت سے نکال نہیں پاتے۔ ایک اچھی یاد' ایک فخریہ حوالہ بن کر جو ہمیشہ ہماری باتوں' ہماری یادوں میں محفوظ رہ جاتے ہیں۔ آپ اور شاہ زر بھی ایسے ہی طالب علم ہیں جنہیں میں فراموش نہیں کرسکا۔ بہت قابلیت ہے اس لڑکے میں۔ ظاہری طور پر وہ جیسا بھی ہوگا مگر میں جانتا ہوں اس کا باطن بہت پیارا ہے۔''

''میں اب چلتی ہوں سر! مجھے کہیں جانا تھا۔ آپ پلیز مجھے اپنا رابطہ نمبر دیجیے۔ جب تک آپ پاکستان میں ہیں میں آپ سے رابطے میں رہنا چاہوں گی۔'' شاہ زر کے اس سے زیادہ قصیدے سننا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ تبھی سامنے رکھی چائے کے فقط دو گھونٹ بھر کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ سر زمان اس کی اس حرکت پر مسکرائے تھے۔

''کیوں نہیں' یہ تو خوشی کی بات ہے آیئے میں ڈراپ کردوں آپ کو۔''

''نہیں' میں چلی جاؤں گی۔ یہاں پاس میں ہی گھر ہے میرا۔''

سہولت سے معذرت کرتے ہوئے وہ ان کا کارڈ لے کر وہاں سے نکل آئی تھی۔ گھر میں داخل ہوئی تو ملازمہ کے سوا اور کسی کی شکل نظر نہ آئی۔

''السلام علیکم بی بی جی! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' ملازمہ اسے دیکھتے ہی قریب آئی تھی۔

''وعلیکم السلام ٹھیک ہوں۔ چاند کہاں ہے؟''

''وہ جی شاہ صاحب کے ساتھ باہر گئے ہیں۔ صبح شاہ صاحب ڈاکٹر لے کر آئے اور آپ چلی گئیں؟ بہت غصہ ہورہے تھے صاحب۔''

''ہونے دو۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔ چاند آئے تو میرے پاس اوپر بھیج دینا۔''
''جی بیگم صاحبہ! جیسی آپ کی مرضی۔'' شاہ زر کے لیے اس کا ایسا روکھا رویہ ملازمہ کی سمجھ سے باہر تھا۔ انوشہ کو لگا جیسے شاہ زر اس کے بیٹے کو اس سے چھین کر اسے بالکل اکیلا کر دینا چاہتا ہو وہ چاند رفتہ رفتہ خود سے بہت دور ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ اگر چاند، شاہ زر کا ہو جاتا تو بھلا اس کے پاس کیا رہ جاتا۔ ہر رشتہ تو وہ کھو چکی تھی۔ اب یہ آخری ایک رشتہ رہ گیا تھا۔ جسے وہ کسی طور کھونے کے لیے تیار نہیں تھی۔ چاند کی گھر واپسی تک وہ بری طرح کڑھتی رہی تھی۔ وہ اس کے پاس کمرے میں آیا تو انوشہ نے اس سے منہ پھیر لیا۔
''مما! کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' اس کے بخار سے تمتماتے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے وہ پریشان ہوا تھا جب وہ بولی۔
''ہاں۔''
''مگر کیوں میں نے کیا کیا؟''
''کیا کیا ہے؟ میں بتاؤں یہ تمہیں کہ تم نے کیا کیا ہے۔ کان کھول کر سن لو چاند! اگر آئندہ مجھ سے پوچھے بغیر تم اپنے پاپا کے ساتھ کہیں باہر گئے یا ان کے کمرے میں گھسے تو میں تمہیں پھر سے چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ اور کبھی واپس نہیں آؤں گی۔''
''ایسا کیوں کہہ رہی ہیں مما! میں اکیلا تھا اس لیے پاپا باہر گھمانے لے گئے۔''
''کچھ بھی ہو تم دوبارہ شام کے بعد نا ان کے کمرے میں جاؤ گے نا کہیں باہر سمجھے تم۔'' وہ سخت اضطراب کا شکار تھی چاند اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔
''او کے مما! آئی پرامس میں شام میں پاپا کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اب تو آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گی نا۔''
''نہیں۔'' بنا چاند کے چہرے کی طرف دیکھے وہ مطمئن ہوئی تھی۔
اگلے روز اسے آفس سے واپسی میں دیر ہو گئی۔ چاند لان میں بیٹھا تنہا کھیل رہا تھا۔ جب شاہ زر آفس سے واپسی پر گاڑی گھر کے پورٹیکو میں کھڑی کرنے کے بعد اس کی طرف چلا آیا۔
''السلام علیکم چاند! کیا ہو رہا ہے۔''
''کچھ نہیں پاپا! پھوپو کو یاد کر رہا تھا۔ وہ کب آئیں گی۔''
''ایک دو روز میں آ جائیں گی' آپ اتنی ٹھنڈ میں یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ کمرے میں چلتے ہیں۔''
''نہیں پاپا! مما نے کہا تھا اگر میں شام کے بعد آپ کے کمرے میں گیا تو وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائیں گی۔'' چاند کے چہرے پر اداسی تھی شاہ زر ساکت رہ گیا۔
کیا وہ لڑکی اپنی نفرت میں اس حد تک بھی جا سکتی تھی؟ اسے یک لخت انوشہ حسن پر بے تحاشا غصہ آیا۔
''آپ چلو میرے ساتھ' مما ہم دونوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔'' جھک کر زبردستی چاند کو بانہوں میں بھرتے ہوئے اس نے کہا اور اپنے کمرے میں لے آیا۔
''آپ کے پاپا آپ کو آپ کی دادو' دادا اور شافی پھوپو کی تصویریں دکھائیں گے دیکھو گے؟''

''جی پاپا!'' بچہ ایک دم سے خوش ہوا تھا۔

شاہ زر اسے پیار کر کے وارڈ روب سے اپنا سوٹ نکال کر واش روم میں گھس گیا۔ پاپا... کے بعد وہ بیڈ پر چاند کے پہلو میں لیٹا اسے اپنا فیملی البم دکھا رہا تھا۔

بہت سی تصویروں میں انوشہ بھی تھی۔ چاند ایک ایک تصویر کو دیکھتے ہوئے بہت خوش ہو رہا... تبھی انوشہ گھر چلی آئی۔ تھکن سے اس کا حال برا ہو رہا تھا۔

''السّلام علیکم! بی بی جی آج اتنی دیر کر دی آپ نے؟'' ملازمہ اسے دیکھتے ہی کچن سے نکل آئی... انوشہ نے اسے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

''چاند کہاں ہے؟''

''وہ جی شاہ صاحب کے ساتھ ہے ان کے کمرے میں۔'' اطلاع کیا تھی' اس کے تھکے ہو... اعصاب کے لیے کوئی طوفان تھا۔ سیڑھیوں پر دھرے اس کے قدم واپس پلٹے تھے اور سیدھے شاہ... کے کمرے کی طرف اٹھ گئے۔ شاہ زر چاند کی کسی بات پر ہنس رہا تھا۔ اسے دروازہ دھکیل کر کم... میں داخل ہوتے دیکھا تو ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔

''کیا کر رہے ہو یہاں' منع کیا تھا نا میں نے کہ یہاں نہیں آنا۔ پھر کیوں آئے تم یہاں!'' لپک کر چاند کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اسے جھنجوڑا تھا۔

چاند اس کی آمد پر بری طرح سہم کر رہ گیا تھا۔

''سوری مما! وہ پاپا زبردستی اٹھا لائے تھے۔''

''چٹاخ۔'' اس کی پوری بات سنے بغیر اس نے اسے تھپڑ جڑ دیا تھا۔

شاہ زر اس کی اس سنگ دلی پر بھنا اٹھا۔

''اپنی حد میں رہو انوشہ رحمٰن! ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں شوٹ کر ڈالوں۔''

''خاموش! تم رہو اپنی حد میں...... اگر تم سمجھتے ہو کہ تم میرے بیٹے کو مجھ سے دور کر دو گے تو... تمہاری بہت بڑی بھول ہے۔''

''بکواس بند کرو اپنی اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

''دفع ہو جانے کے لیے ہی آئی ہوں' چلو چاند......!''

''چاند کہیں نہیں جائے گا۔ یہیں سوئے گا اسی کمرے میں میرے پاس...... تم جاؤ یہاں سے...''

''نئیں پاپا! مما ہمیں چھوڑ کر چلی جائیں گی'' چاند رو دیا۔ شاہ زر کا اشتعال قدرے کم ہو گیا...

''تم فکر مت کرو بیٹا! کہیں نہیں جا سکتی یہ کھوکھلی انا کی ماری مُردہ دل لڑکی!'' بناء اس کی حالت کی پروا کیے اس نے دل جلایا تھا۔ انوشہ بے بس سی آنسو پیتی فوراً واپس پلٹ گئی۔

کمرے میں آ کر بلک بلک کر روئی۔ کتنا ذلیل کر رہا تھا وہ شخص اسے...... کسی بھی موقع پر... اسے اس کی اوقات یاد دلانا بھولتا تھا نہ اس کے زخم ادھیڑنا......!''

اگلے روز آفس کے بعد وہ پھر اس کے کمرے میں تھی۔ چاند کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ شاہ زر نے آفس سے چھٹی کر لی۔ اس وقت بھی وہ اسی کو بہلا رہا تھا' سامنے ٹیلی ویژن اسکرین پر ٹام اینڈ جیری کے کارٹون لگے تھے' انوشہ نے ایک نظر اس پر ڈالنے کے بعد نگاہ پھیر لی۔

''خیریت!'' شاہ زر نے قدرے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''جی ہاں! خیریت ہی ہے' کچھ قرض تھا آپ کا وہی ادا کرنے آئی ہوں' یہ لیجیے!''

''کیا ہے یہ......؟'' بدواچکا کر خاصی اجنبیت سے اس نے انوشہ کی بند مٹھی کو دیکھا تھا۔

''کرایہ ہے' آپ کے اس خوب صورت محل میں رہنے کا...... مگر اب مزید میں اور میرا بیٹا یہاں ں رہیں گے۔''

''اچھا؟ ویری گڈ...... کتنا کرایہ ہے؟''

''دس ہزار!''

''بس......؟'' طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ ہنسا تھا۔ ''بہت شکریہ! مس انوشہ یہ یاد ا نے کا کہ آپ ایک کرائے دار کی حیثیت سے یہاں رہ رہی ہیں اور یہ بھی کہ آپ پر میرا کوئی رض ہے' میں تو بھول ہی چکا تھا۔ داد دینی پڑے گی آپ کی خودداری کی' بہرحال! آپ ابھی بھی ہت کچھ بھول رہی ہیں۔ چلو خیر کوئی بات نہیں' میں یاد دلاتا ہوں۔'' اس کا انداز سراسر توہین آمیز ھا۔ انوشہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ ''مجھے تو پتا ہی نہیں تھا آپ اپنی جان پر میرا کوئی احسان لے کر مرنا نہیں چاہتی ہیں' چلو آج سارے حساب بے باق کر لیتے ہیں۔'' دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر وہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوا تھا۔ ''دیکھیے مس انوشہ! آپ کے سابق شوہر مسٹر عبدالصمد صاحب نے اپنے کاروبار کی گری ہوئی ساکھ سنبھالنے کے لیے مجھ سے بیس لاکھ روپے بطور قرض لیے تھے جس کی تاحال ادائیگی نہیں ہو سکی' کچھ زیور لائے تھے وہ آپ کے میرے پاس مگر میں نے وہ نہیں لیے' صرف آپ کے لیے...... میں کیا جانتا تھا اسے؟ مگر آپ کی خوشیوں اور آسائشوں کے لیے میں نے اسے اتنی بڑی رقم بنا واپسی کی امید کے' بطور قرض دی۔ اس کے بعد چلو آپ کی بات کرتا ہوں۔ چھ ماہ ہو گئے آپ کو یہاں رہتے ہوئے' بجلی گیس کے بلوں کو چھوڑ دیتے ہیں' صرف کمرے کے کرائے کی بات کریں تو پانچ ہزار ماہانہ بنتے ہیں' اس حساب سے چھ ماہ کی ادائیگی کے تیس ہزار روپے ہونے چاہیے مگر آپ کیا دے رہی ہیں' صرف دس ہزار......؟'' ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلائے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

انوشہ دس ہزار کی رقم مٹھی میں دبائے' آنکھ میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے فوراً سر جھکا گئی۔

''اور بھی بہت قرض واجب ہیں میرے آپ پر' کبھی فرصت میں ٹائم نکال کر آئیں گی تو بتاؤں گا' فی الحال صرف یہی کہنا ہے' یہ نفرت اور انا آج تک کسی کو سرخرو نہیں کر سکی' جو انہیں اپناتا ہے' وہی ٹوٹ کر رہ جاتا ہے لہٰذا پلیز نکل آؤ اس جنگ سے اور دیکھو ہماری زندگی اس کے بغیر کتنی خوب صورت ہے۔''

''تمہارے ساتھ میری زندگی کبھی خوب صورت نہیں ہو سکتی' سنا تم نے۔'' بھیگی آنکھوں میں چھلکتی نفرت کے ساتھ وہ پھنکاری تھی۔ شاہ زر بے ساختہ مسکرا دیا۔

''پتھر دل لڑکی ہو تم' پتا نہیں کب سدھرو گی؟''

''میں یہاں تمہاری بکواس سننے نہیں آئی۔''

''اچھا! تو بتادیتیں ناں یار! میں چائے پانی کا پوچھ لیتا۔'' اس بار اسے تنگ کرتے ہوئے اس نے اس کا آنچل تھام لیا تھا۔ انوشہ بھنا کر رہ گئی۔

''اپنی حد میں رہو شاہ زر آفندی! فضول میں میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیوں؟ تم میں ایسے کون سے سرخاب کے پَر لگے ہیں۔ لگے بھی ہوتے تو خدا کی قسم ایک پل بھی جدا نہ ہوتا تم سے۔''

''شٹ اپ!''

''اوں ہوں...... اتنی بد دماغی اچھی نہیں ہوتی۔ تمہیں یاد ہے' ساحل کی شادی میں ایک بار میں نے تمہیں اپنا سر دبانے کے لیے کہا تھا مگر جواب میں اپنی چوڑیاں تڑوا کر بھی تم نے میری بات نہیں مانی تھی۔ الٹا یہ کہا تھا کہ جس دن میں تمہیں خرید لوں اسی دن آ کر رعب جماؤں اور پتا ہے میں لے جواب میں کیا کہا تھا؟'' انوشہ کا آنچل اب بھی اس کی گرفت میں تھا اور وہ اس کی چہرے کی بدلتی رنگت سے لطف لے رہا تھا۔

''مجھے نہیں پتا...... میں تم پر لعنت بھی نہیں بھیجتی۔''

''یہ تو تم نے کہا تھا یار! میں نے تو کچھ اور کہا تھا۔'' انوشہ نے اپنا آنچل اس کی گرفت سے نکال لیا۔

''بات سنو...... ایک اور قرض بھی واجب ہے میرا تم پر......'' اس کے آنچل چھڑانے پر وہ پھر سنجیدہ ہوا تھا۔ انوشہ نے سر اٹھا کر استفہامیہ نگاہیں اس پر گاڑ دیں۔

''کون سا قرض؟''

''تمہیں نہیں پتا؟ کتنے ماہ ہو گئے ہماری شادی کو...... ایک ایک دن' ایک ایک رات کا قرض واجب ہے تم پر...... کب تک یونہی اپنی نفرت کی سولی پر لٹکائے رکھو گی مجھے؟''

انوشہ کو امید نہیں تھی کہ وہ ''اس قرض'' کی بات کرے گا' تبھی ٹپٹا کر نگاہیں پھیرتے ہوئی واپس پلٹ گئی۔

''پاپا...... مما آپ سے اتنی ناراض کیوں ہیں؟'' چاند ایک بار پہلے بھی اس سے یہی سوال کر چکا تھا۔ اب پھر پوچھ رہا تھا۔ شاہ زر سر کھجا کر رہ گیا۔

''پتا نہیں یار! آپ چھوڑو مما کی ناراضگی کو...... چلو ڈاکٹر انکل کے پاس چلتے ہیں۔''

''نہیں پاپا! مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔''

''کیوں' میرے بہادر بیٹے کو کیوں ڈر لگتا ہے ڈاکٹر انکل سے؟''

''وہ...... ان کے پاس انجکشن ہوتا ہے نا اس لیے۔''

''تو کیا ہوا یار! بہادر ماں کے بہادر بیٹے ہو آپ۔ ایک انجکشن کیا بگاڑ لے گا ہمارا' رات میں طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو مسئلہ ہو جائے گا۔'' اس کا بخار چیک کرتے ہوئے وہ پریشان ہو رہا تھا۔

''نہیں پاپا! مما مجھ سے صلح کر لیں گی تو میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

''شیور؟''

''جی پاپا شیور......!''

''چلو ٹھیک ہے' پھر ہم اپنے بیٹے کو مما کے کمرے میں چھوڑ آتے ہیں' صلح بھی کروا دیں گے آپ کی' ٹھیک ہے؟'' چاند کا بوسہ لیتے ہوئے اس نے اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔ وہ خوش ہو گیا۔

''پاپا! آئی لو یو سو مچ۔'' بازو شاہ زر کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے اس نے جوابی کارروائی کی تھی۔ انوشہ اس وقت وارڈ روب کھولے کھڑی تھی جب شاہ زر ہلکے سے دروازے پر دستک دے کر اندر چلا آیا۔

''انوشہ!'' وہ از حد حیرانی کے عالم میں پلٹی تھی۔

''چاند کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' کل رات بھی ٹھیک سے نہیں سو سکا۔ اسے اپنے پاس سلا لو اور پلیز بہت خیال رکھنا اس کا...... ابھی بخار نہیں ہے۔ اگر رات میں ہو جائے تو مجھے بلا لینا' میں آ جاؤں گا ٹھیک ہے؟'' کتنی فکر مندی تھی اس کے لہجے میں...... وہ خاموش کھڑی رہی۔ شاہ زر چاند کو بیڈ پر سلانے کے بعد' اسے پیار کر کے ایک نظر خاموش کھڑی انوشہ پر ڈالتے ہوئے اس کے کمرے سے چلا گیا۔ انوشہ اس کے جانے کے بعد پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔

❁❁❁

بارش گزرتے ہر پل کے ساتھ تیز ہو رہی تھی تبھی اچانک دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ ''ہیلو! گڈ مارننگ!'' انتہائی خوش گوار موڈ کے ساتھ ہادیہ ناشتے کی ٹرے اٹھائے اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ مضطرب سا کھڑکی سے پلٹ کر بیڈ کی طرف چلا آیا۔

''گڈ مارننگ!''

''رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اتنی دیر تک تمہارے کمرے کا دروازہ بجاتی رہی مگر تم نے کوئی رسپانس شو نہیں کیا' کیا جلدی سو گئے تھے؟''

''ہاں......'' عباد کی آنکھیں خوب سرخ ہو رہی تھیں' ہادیہ اس کے صاف جھوٹ پر مسکرا دی۔

''کچھ پتا چلا تمہاری گرل فرینڈ کا؟'' کپ میں چمچ ہلاتے ہوئے اس نے پوچھا تھا' عباد نے لب بھینچ لیے۔

''صرف گرل فرینڈ نہیں ہے وہ میری...... محبت کرتا ہوں میں اس سے۔''

''وہ تو مجھ سے بھی کرتے ہو عباد! اس کا کیا؟''

''اس کی محبت تمہاری محبت سے زیادہ زور آور ہے۔''

''اب ہو گئی ہو گی۔ وگرنہ چند روز پہلے تک تو تمہارا بس نہیں چلتا تھا کہ شام سے پہلے نکاح کر کے مجھے اپنے گھر لے آؤ۔'' وہ سچ کہہ رہی تھی مگر عباد نے ناگواری سے رخ پھیر لیا۔

''میں آج تک نہیں سمجھ سکی عباد! یہ تم مرد لوگ محبت کو کیا سمجھتے ہو؟ ہر اگلے قدم پر' ہر نئے چہرے کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے تمہیں...... کتنے کچے گھروندے ہیں تمہاری محبتوں کے' بادِ مخالف بھی نہیں چلتی اور گر کر چکنا چور ہو جاتے ہیں۔''

''ہادیہ پلیز! میں اس وقت تم سے بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''بحث کون کر رہا ہے؟ تمہیں لگتا ہے تم مجھے رد کرو گے پھر بھی میں تم سے شادی کروں گی؟

زبردستی تمہاری زندگی کا حصہ بن کر تمہاری ایک نگاہ التفات کو ترسوں گی؟ نہیں عباد! ہم لڑکیوں کی محبت کچے گھروندے جیسی نہیں ہوتی' ہر اگلے قدم پر' ایک نیا چہرہ ہمیں اپنی طرف نہیں کھینچتا۔ ہم تو پاگل ہوتی ہیں' جو ایک بار نگاہ و دل کو اچھا لگ جائے بس پھر اسی کے نام کی تسبیح پھیرتی رہتی ہیں۔ اچھے سے اچھا پاکر بھی ہماری زندگی میں اس ایک شخص کی کمی ہمیشہ رہتی ہے جو پہلی بار دل و نگاہ کو اچھا لگتا ہے۔ میری زندگی میں بھی تمہاری کمی ہمیشہ رہے گی' وہ سارے خواب جو میں نے تم سے منسوب کر رکھے تھے' میری آنکھوں سے کبھی ہجرت نہیں کریں گے۔ تمہیں جو ٹھیک لگتا ہے تم کرو' مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ لیکن اپنا خیال تو رکھو عباد! ہم دوست ہیں اور ایک دوست کی حیثیت سے میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ تم دکھی رہو۔'' اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ اٹھی تھی۔ عباد ہنوز لب بھینچے بیٹھا رہا۔

''چلو چائے پیو پھر آفس کے لیے نکلتے ہیں' اوکے!''

''نہیں' میں آج آفس نہیں جاسکوں گی۔''

''ٹھیک ہے' میں چلی جاؤں گی لیکن تم ناشتا کرو پلیز!''

''میں کرلوں گا' تم جاؤ پلیز!'' اس کے لہجے میں ابھی تک بے زاری تھی۔ ہادیہ ضبط کا مظاہرہ کرتی خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ آگے آنے والے دنوں میں عباد نے کافی حد تک خود کو سنبھال لیا تھا مگر ایک چپ جو اس کے ہونٹوں پر ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئی تھی اس کا کسی طور خاتمہ ممکن نہیں ہوسکا تھا۔

❊❊❊

''بُریرہ!'' کمرے میں مکمل اندھیرا کیے وہ گھٹنوں میں سر چھپائے بیٹھی تھی جب سائلہ بیگم نے اس کے کمرے کی لائٹ جلاتے ہوئے اسے پکارا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ تبھی وہ اس کے قریب آکر بیٹھ گئی تھیں۔ ''سرمد کا فون آیا ہے۔ شام میں کہیں جانا ہے اسے۔ کہہ رہا تھا تمہیں ساتھ لے کر جائے گا۔ اٹھ جاؤ اب...... کتنے دنوں سے کچھ نہیں کھایا تم نے۔''

''تو کیا ہوا' مر تو نہیں گئی میں...... اور مجھے کہیں نہیں جانا' آپ اسے کہہ دیں یہاں نہ آئے۔''

''میں آگیا ہوں محترمہ! اور آپ چل رہی ہیں میرے ساتھ' سمجھیں۔'' بالکل اچانک دروازہ کھول کر سرمد اندر آیا تھا۔ بُریرہ نگاہ پھیر گئی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' میں نہیں جارہی کہیں۔''

''میں کچھ نہیں جانتا' تم میرے ساتھ چل رہی ہو' بس۔''

''ضد مت کرو سرمد! میرا دل نہیں چاہ رہا۔''

''سارے مسئلے ہی دل کے ہیں' علاج کرواؤ اپنے دل کا...... ویسے کتنی خودغرض لڑکی ہو تم! اس روز میں ساری رات تمہارے لیے جاگتا رہا اور تم مزے سے سوتی رہیں۔ اب میں کہہ رہا ہوں کہ تمہیں ساتھ چلنا ہے تو تم انکار کررہی ہو' یہ ٹھیک نہیں ہے بری!''

''مما! آپ سمجھائیں اسے...... فضول ضد کررہا ہے۔''

''جو کہنا ہے خود کہو' میں تمہارے کسی بھی معاملے میں بولنے کی مجاز نہیں ہوں۔'' سائلہ بیگم اس سے خفا تھیں لہٰذا اٹھ کر کمرے سے نکل گئیں۔ بُریرہ اس لمحے خود کو سرمد کے سامنے قطعی بے بس محسوس

لی۔

"تم کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو سرمد! میں کبھی بھی تم سے پیار نہیں کرسکتی۔ میرا دل شاہ زر کا مسکن رہے گا خواہ وہ اس میں آباد ہو یا نہ ہو۔"

"تو کیا ہوا؟ میں نے کب مجبور کیا تمہیں کہ تم مجھے چاہو۔ یہ میرا مسئلہ ہے کہ میں تمہیں پیار ں یا نہ کروں اور تم اس معاملے میں مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگاسکتیں' سمجھیں! کتنا استحقاق تھا اس لہجے میں...... بریرہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"تم کیوں نہیں سمجھتے سرمد! کہ میری ذات اب ایک خالی مکان سے زیادہ کچھ نہیں۔ کیا کرو اس اجڑے ہوئے خالی مکان کو حاصل کرکے......؟"

"پھر سے آباد کروں گا' اپنی چاہت اور توجہ کے پھولوں سے سجاؤں گا' سنواروں گا۔"

"نہیں...... یہ سب افسانوی باتیں ہیں' اب ایسا نہیں ہوتا۔ مجھ جیسی عورت کے لیے' تم جیسا ں دار کوئی بھی مرد ایسا نہیں کرسکتا۔ میں جانتی ہوں' مجھے اپنانے کے بعد تم بھی چار دن ہمدردی گے پھر...... گھر کے کسی کونے کھدرے میں ڈال کر بھول جاؤ گے' کسی جھوٹے برتن کی طرح۔ ارا بھی دل مجھے استعمال میں لانے کو نہیں چاہے گا' طعنے دو گے تم مجھے' میرے ماضی کی ناکامیوں ے میری بدکرداریوں کے...... سب پتا ہے مجھے' تم بھی ایسا ہی کرو گے۔" بریرہ رحمٰن کے لہجے میں رادرد تھا۔ سرمد لبوں پر پھیکی سی مسکان سجاتے ہوئے رخ پھیر گیا۔

"کاش تم میری پہلی محبت' میری پہلی خواہش نہ ہوتیں بری! پھر میں تمہیں دکھاتا' میں کتنا ھوٹا اور ذرا بے نیاز قسم کا مرد ہوں' ابھی جتنی بڑی بات تم نے کہہ دی ہے' میرا دل چاہتا ہے کہ ہارے ایک تھپڑ لگاؤں مگر لگا نہیں سکتا کیونکہ تھپڑ کھانے کے بعد اگر تم روئیں' تو مجھ سے برداشت یں ہوگا۔" اس کے لبوں پر مسکراہٹ کے باوجود آنکھوں میں درد تھا۔

بریرہ کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔

"میں نہیں جانتا بری! مرد کے لیے محبت کیا ہوتی ہے کیا نہیں۔ وہ کسی عورت کے لیے وفادار تا ہے یا نہیں۔ میں تو صرف خود کو جانتا ہوں یا پھر تمہیں...... ہوسکتا ہے میری آنکھوں میں' میرے دل میں' جو خوب صورتی تمہارے لیے ہے وہی شاہ زر کی آنکھوں اور دل میں انوشہ کے لیے ہو' یہ اختیاری فعل نہیں ہے بری! بعض اوقات انسان ایسے معاملات میں قطعی بے بس ہوجاتا ہے۔"

"مگر وہ بے بس نہیں ہے' وہ فریبی ہے' مکار ہے۔ دھوکا کیا ہے اس نے میرے ساتھ...... میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی سرمد! کبھی بھی نہیں......"

"او کے' مت کرنا مگر ابھی اٹھو' میرے دوست کی شادی کی سالگرہ ہے' ہم دونوں کو مدعو کیا ہے س نے' اگر تم نہیں جاؤ گی تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔" اب وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھا رہا تھا۔

بریرہ بے بسی سے اس کی طرف دیکھتی بالآخر اٹھ کھڑی ہوئی۔

❁❁❁

وہ نماز پڑھ کر مسجد سے نکل رہا تھا جب انزلہ سے ٹکراؤ ہوگیا۔

''السلام علیکم!'' اسے دیکھتے ہی وہ مسکرائی تھی۔ سانول جواب میں گہری سانس بھر کر رہ گیا۔
''وعلیکم السلام! تمہیں اپنے گھر میں سکون کیوں نہیں ہے؟ ہر وقت گاؤں کی گلیوں میں دندناتی پھرتی ہو۔''

''تو تمہیں کیا تکلیف ہے' میرے اپنے پاؤں ہیں' جہاں دل چاہے گا جاؤں گی۔''

''ایسی کی تیسی تمہارے دل کی...... گھر بیٹھا کرو ٹک کر۔''

''نہیں بیٹھتی کیا کرلو گے؟''

''بہت کچھ کرسکتا ہوں مگر کروں گا نہیں' کیونکہ اب میں قیس ہوگیا ہوں۔''

''شکل دیکھی ہے اپنی قیس والی' صبح فجر کی نماز کیوں نہیں پڑھی؟''

''آنکھ ہی نہیں کھلی یار! رات سینے میں بہت درد تھا' دیر سے نیند آئی تھی۔

''کیوں...... درد کیوں تھا؟ اور وہ بازو والی گولی تنگ تو نہیں کرتی نا!''

''نہیں' تنگ کرنے کا اختیار صرف انزلہ شاہ کے پاس ہے۔'' مسکرا کر سینے کے درد کو اس نے نظر انداز کردیا تھا۔ انزلہ شاہ اسے گھور کر رہ گئی۔ وہ شخص جو سارے گاؤں کے لیے دہشت اور نفرت کی علامت تھا خواتین جسے دیکھ کر راستہ بدل لیا کرتی تھیں' اسی سانول شاہ کو انزلہ شاہ کی محبت نے انسان بنادیا تھا۔

سارا گاؤں حیران تھا کہ آخر اسے ہوا کیا ہے؟ مگر وہ ہر بات سے بے نیاز اپنے حال میں مست تھا۔ دونوں آج کل گاؤں میں سالوں سے بند پڑے اسپتال کو دوبارہ فعال بنانے کے لیے کوشش کررہے تھے۔ وہاں گاؤں میں ہر سال بہت سی خواتین ڈیلیوری معاملات میں بروقت طبی سہولیات دستیاب نہ ہونے کے سبب انتہائی بے بسی کے عالم میں دم توڑ جاتی تھیں۔ ابھی چند روز قبل انزلہ نے چھنو کی دوست کو درد سے تڑپتے' گدھا گاڑی پر جان دیتے دیکھا تھا اور تب سے ہی وہ بے چین تھی۔ سانول محض اس کی خوشی کے لیے شہر میں اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے وہاں سے ڈاکٹرز کو لانے اور دیگر معاملات کو ٹھیک کروانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ لوگ ان دونوں کو حیرت سے دیکھتے اور اپنی مرضی کے تبصرے کرتے مگر انزلہ کو کسی کی پروا نہیں رہی تھی۔ فی الوقت جو اسپتال تھا وہ ''شاہ والا'' سے تیس چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا' گاؤں کی غریب مزدور خواتین' ڈیلیوری معاملات بگڑنے کی صورت میں گدھا گاڑی پر ڈال کر اسپتال پہنچائی جاتی تھیں' جس کے باعث بہت سی خواتین اسپتال پہنچنے سے قبل راستے میں ہی دم توڑ جاتی تھیں۔ وہاں ان غریب مزدور خواتین کے لیے کسی ایمرجنسی گاڑی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ بہزاد علی مراد کو ان تمام معاملات کی خبر تھی' فی الحال وہ ملک سے باہر تھا مگر انزلہ سے بے خبر نہیں تھا۔ ابھی دو روز قبل اس نے انزلہ کو فون پر کہا تھا۔

''تم میری محبت نہیں انزلہ! نہ ہی میری ضد ہو مگر پھر بھی میں تم سے شادی کروں گا کیونکہ تم میرے ماں باپ کی پسند اور ان کی خواہش ہو۔ بچپن کی منگ ہو میری...... اور ہم جاگیردار سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں مگر اپنی بچپن کی منگ کو نہیں...... خواہ اس کے دل و دماغ پر کوئی اور ہی کیوں نہ قابض ہو۔''

وہ خاموش رہی تھی کیونکہ یہ سب وہ خود بھی جانتی تھی مگر اس نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔

سانول شاہ کو محبت کے رستے پر لانے کے بعد وہ کسی صورت اسے اکیلا چھوڑنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں آج کل ایک دوسرے کا سایہ بنے ہوئے تھے۔ سانول فی الحال اپنی آپا کے ساتھ رہ رہا تھا مگر شادی کے بعد اس کا ارادہ شہر شفٹ ہو جانے کا تھا۔ اس کے ماتحت ملازم دربدر ہو گئے تھے۔ کچھ اب بھی اس کی محبت اور وفاداری کا دم بھرتے تھے جب کہ کچھ اس سے غداری کرتے ہوئے اس کے بڑے بھائی سے جا ملے تھے۔ انزلہ جانتی تھی کہ سانول کا اس گاؤں میں مزید رہنا ممکن نہیں ہے۔ قدم قدم پر اس کی مردانگی زخمی ناگ کی مانند بل کھاتی اسے اذیت سے دوچار کرتی تھی' بھولے سے بھی اس کی نگاہ حویلی جانے والے راستوں پر پڑ جاتی تو اس کی رگوں میں جوش مارتا خون پھر سے ابلنے لگتا' اس کے اندر کے ضدی اور باغی انسان کو پھر سے وحشت پر مائل کرنے لگتا تب انزلہ اسے اپنی محبت اور توجہ سے بمشکل ٹھنڈا کرتی۔ اسے بہلاتی۔

وہ اس منظر سے ہٹنا چاہتا تھا تبھی اس نے شہر شفٹ ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور انزلہ اس کے فیصلے سے خوش تھی۔ سانول کی طرح وہ بھی جینا چاہتی تھی' ہر غم و فکر سے پاک' خوب صورت خوش گوار زندگی' جس کے ہر موڑ پر اس کا محبوب اس کے ساتھ تھا۔

❁❁❁

''زمان انکل!'' وہ سونے کی کوشش کر رہے تھے جب عدنان کی پکار پر آنکھوں سے بازو ہٹاتے ہوئے فوراً اٹھ بیٹھے۔

''عدی؟ آؤ بیٹا! کیسے ہو......؟''

''میں ٹھیک ہوں' آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟''

''ارے نہیں یار' ڈسٹربنس کیسی؟ سارا نے بتایا تھا کہ تم آؤ گے' میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا' طلال کیسا ہے؟''

''ٹھیک ہے۔ سارا آنٹی کہاں ہیں؟''

''کسی فرینڈ کی طرف گئی ہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے...... تم سناؤ' پریشان کیوں ہو؟''

''کچھ خاص نہیں انکل! میں اصل میں شادی کرنا چاہ رہا ہوں۔''

''ارے واہ! یہ تو اچھی بات ہے' کون ہے وہ خوش نصیب لڑکی؟''

''گوری نام ہے اس کا' یہیں اسی شہر میں رہتی ہے' آپ کسی انوشہ رحمٰن کو جانتے ہیں؟''

''انوشہ رحمٰن...... ہاں! بہت قابل اسٹوڈنٹ رہی ہے میری...... مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''وہ...... جس لڑکی سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں' وہ انہی کی کچھ لگتی ہیں۔ میں نے پرسوں آپ کو ان خاتون کے ساتھ ریستوران میں دیکھا تھا۔''

''ہاں...... وہ تھی میرے ساتھ...... مگر تم اس کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟''

''جاننا پڑتا ہے انکل! جس چیز کو آپ حاصل کرنا چاہیں اس کے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کرنی پڑتی ہیں۔ میں یہ سب اپنے گھر والوں سے شیئر نہیں کر سکتا نا، مجھے ان سے کوئی توقع نہیں ہے مگر میں جانتا ہوں آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔'' وہ بیڈ پر ان کے قریب ہی بیٹھا تھا' مسز زمان اس

کے الفاظ پر مسکرا دیئے۔
"تم میرے دوست سے فضول میں خائف ہو عدی! اور کوئی بات نہیں۔"
"انکل پلیز! میں اس وقت یہاں آپ کے دوست کو ڈسکس کرنے نہیں آیا۔"
"ٹھیک ہے برخوردار! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے' میں انوشہ سے بات کرلوں گا۔"
"صرف بات نہیں انکل! آپ نے انہیں راضی بھی کرنا ہے' میں ذاتی طور پر خود بھی مل چکا ہوں ان سے......مگر میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔"
"ٹھیک ہے' اللہ نے چاہا تو ویسا ہی ہوگا جیسا تم چاہتے ہو' میں کل ہی انوشہ کے آفس میں ملتا ہوں ان سے......خوش!"
"بہت خوش انکل! یو آر رئیلی سو گریٹ۔" دبے دبے جوش میں ممنونیت سے ان کے ہاتھ دبانے کے بعد وہ فوری اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "اب چلتا ہوں' دوست انتظار کررہے ہوں گے' سارا آنٹی آئیں تو میرا اسلام کہیے گا۔"
"ارے...... یہ کیا بات ہوئی؟ بیٹھو ابھی تھوڑی گپ شپ کرتے ہیں۔"
"پھر سہی انکل! ابھی فوری کہیں جانا ہے' آپ آرام کیجیے پلیز!" سرعت سے ہاتھ ہلا کر وہ فوری وہاں سے نکل گیا تھا۔
اس رات اس نے پھر کمرا بند کرکے بہت ڈرنک کی تھی۔

❀❀❀

گوری ایک ہفتہ جماعت کے ساتھ شہر سے باہر رہ کر گھر واپس آ گئی تھی۔ انوشہ نے آفس ٹائمنگ کے بعد پارٹ ٹائم جاب بھی شروع کردی تھی۔ شاہ زر آفندی کے تمام قرض کی ادائیگی کی دھن نے اسے جیسے مشین بنادیا تھا۔ اس وقت بھی تھکن سے بے حال وہ بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹی تھی۔ جب گوری دو کپ چائے کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی آئی۔
"السلام علیکم بھابی! کیسی ہیں آپ؟"
"ٹھیک ہوں' تم کب آئیں؟" گوری کی صدا پر ناچار اسے اٹھنا پڑا تھا۔
"آج صبح ہی واپسی ہوئی ہے۔ بھائی بتارہے تھے آپ نے پارٹ ٹائم جاب شروع کردی ہے' کیوں؟"
"بس یونہی یار! گھر میں دل نہیں لگتا۔"
"لگ بھی کیسے سکتا ہے' بھائی سے آپ کی بنتی نہیں اور چاند کی آپ پروا نہیں کرتیں۔"
"کون کہتا ہے نہیں پروا کرتی اس کی؟ اسی کے لیے تو سب کررہی ہوں۔"
"کیا کررہی ہیں؟ اسے پیسے کی ضرورت نہیں ہے بھابی! آپ کی محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔"
"فی الحال میں اس پر بحث نہیں کرنا چاہتی گوری! پلیز!" درد سے پھٹتے سر کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے دباتے ہوئے اس نے بے زاری ظاہر کی تھی۔

گوری خاموشی سے چائے میں چمچ چلانے لگی۔
''مجھے تم سے کسی اور مسئلے پر بات کرنی تھی' کیا تم فارغ ہو ابھی؟''
''جی! عشاء کی نماز میں ابھی وقت ہے' آپ کہیئے' کیا بات کرنی ہے؟'' انوشہ کی طرح گوری کا لہجہ بھی سنجیدہ تھا' انوشہ بات شروع کرنے کے لیے لفظ ڈھونڈنے لگی۔
''ایک لڑکا ہے عدی! عدنان نام ہے اس کا' تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میرے استاد سرزمان ہیں نا' ان کے پاپا کے بہت اچھے قریبی دوستوں میں سے ہیں' وہی پرپوزل لے کر آئے تھے میرے پاس..... میں نے ابھی انہیں کوئی امید نہیں دلائی مگر بہتر ہو گا گوری اگر تم یہ پرپوزل قبول کرلو۔''
''کیوں.....؟ آپ شاید اس لڑکے کے بیک گراؤنڈ سے واقف نہیں ہیں بھابی! ورنہ شاید یہ مشورہ کبھی نہ دیتیں۔''
''میں اس کے بیک گراؤنڈ سے واقف ہوں' مجھے پتا ہے وہ کیوں شادی کرنا چاہتا ہے تم سے۔''
''آپ سب جانتی ہیں' پھر بھی.....؟''
''ہاں' پھر بھی.....'' گوری کی حیرانی پر اس نے شدت دکھائی تھی۔ وہ دکھ سے کٹ کر رہ گئی۔
''میں اچھی بیوی نہیں ہوں' نا ہی اچھی ماں اور بیٹی ثابت ہو سکی۔ شاید اچھی بہن بھی نہیں رہی ہوں' پھر بھی..... پھر بھی میں تمہاری بربادی نہیں چاہتی گوری! میں نہیں چاہتی کہ ضد اور انتظار میں ایک مرد کی انا نے جو کھیل میری زندگی کے ساتھ کھیلا' تم بھی اپنی تمام تر معصومیت اور پاکیزگی کے ساتھ کسی ایسے ہی کھیل کا حصہ بنو۔''
''آپ کم زور ہوں گی انوشہ بھابی! میں کم زور نہیں ہوں' میں نے خود کو اپنے رب کی پاک ذات کے سپرد کر رکھا ہے' بے شک وہی میری عزت اور جان کی حفاظت کرنے والا ہے۔''
''بے شک! مگر پھر بھی تم یہ شادی کرلو گوری! پلیز!'' انوشہ رحمٰن کے لہجے میں اس کی آنکھوں میں اس لمحے عجیب سا درد تھا۔ گوری حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔
''وہ شخص میرے قابل نہیں ہے بھابی! اور میں زندگی میں پھر سے کسی ناپسندیدہ شخص کے ساتھ عمر بتانے کا تلخ تجربہ نہیں کر سکتی۔''
''جانتی ہوں۔ مگر تم روشنی ہو گوری! سرتاپیر اجالا ہو۔ مجھے کامل یقین ہے کہ تم اسے بدل دو گی' اس نے آج تک کسی لڑکی کے لیے شادی کی بات نہیں کی۔ وہ چاہتا تو تمہیں بھی نقصان پہنچا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ تمہیں جائز طریقے سے حاصل کرنا چاہتا ہے' کیا پتا اسی میں تمہاری کوئی بہتری ہو' کیا خبر یہی میرے مالک کی رضا ہو' وہ تمہارے ذریعے اپنے کسی بندے کو ہدایت کی طرف لانا چاہتا ہو۔'' انوشہ رحمٰن کی بات میں اس بار وزن تھا۔ گوری خاموش رہی۔
اگلے روز سرزمان اپنی بیگم سارا کے ساتھ عدنان ہمدانی کا پرپوزل لے کر وہاں چلے آئے۔ شاہ زر گھر پر نہیں تھا' انوشہ نے گوری کی رضامندی کے بعد اپنے طور پر یہ رشتہ منظور کرلیا۔ شاہ زر اس رشتے کے حق میں نہیں تھا کہ اس سے عدنان کی سرگرمیاں پوشیدہ نہیں تھیں اور گوری کو وہ بہن کہتا ہی نہیں' دل سے مانتا بھی تھا۔ تاہم انوشہ نے اسے رضامند کرلیا یہ کہہ کر کہ اس رشتے میں گوری کی پسند شامل ہے۔

شادی کی تاریخ طے ہوگئی تھی۔ گوری نے اکیڈمی سے چند روز کی چھٹیاں لے لیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ شادی ایک بڑے چیلنج کا نام ہے مگر پھر بھی اس نے اسے تسلیم کرلیا تھا' صرف اور صرف اپنے رب کی محبت میں ایک بھٹکے ہوئے راہی کو سیدھی راہ پر لانے کے لیے جب کہ دوسری طرف اماں عبدالرحمٰن سرزمان کی نگاہوں میں سرخرو ہوگئی تھی۔

❋❋❋

''مون! تم نے جہاں زیب کو کیوں بتایا کہ تم شادی شدہ ہو؟'' تقریب سے واپسی کے بعد ارسلان اس سے الجھ رہا تھا' امامہ نے رخ پھیرلیا۔

''وہ مجھ سے شادی کا خواہش مند ہو رہا تھا اس لیے۔''

''تو کیا ہوا یار! فوری طے تو نہیں ہو رہی تھی شادی...... پتا نہیں تم کب دنیا کے ساتھ چلنا سیکھو گی؟''

''مجھے دنیا کے ساتھ نہیں چلنا ارسلان! تمہارے ساتھ چلنا ہے بس......''

''عقل سے پیدل لڑکی ہو تم اور کچھ نہیں...... بہرحال ابھی وہ ڈائریکٹر صاحب آرہے ہیں' ان کے ساتھ چلی جانا۔''

''ہرگز نہیں! مجھے اس ڈائریکٹر کے ارادے نیک نہیں لگ رہے تھے۔''

''اوہو یار! تم کوئی سیپ کا موتی نہیں ہو' چند گھنٹے گزارلو گی ان کے ساتھ تو کوئی قیامت نہیں آنے والی۔'' ارسلان حیدر کے لہجے میں برہمی تھی' امامہ شاکڈ رہ گئی۔

''یہ تم کہہ رہے ہو ارسلان! جس کے لیے میں نے اپنے شوہر سے بے وفائی کی۔''

''کوئی احسان نہیں کیا مجھ پر...... میرے ساتھ رہنا ہے تو یہ سب کرنا ہوگا۔'' رخ پھیرے بہت آسانی سے اس نے کہہ دیا تھا' امامہ کو لگا جیسے اس کی ہستی فنا ہوگئی ہو۔ لیکن قدرے بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے وہ روتی ہوئی باہر نکلی تھی۔

شام ڈھل چکی تھی اور اب رات کا اندھیرا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ارسلان بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے آیا تھا۔

''تم حماقت کر رہی ہو مون! یاد رکھنا اگر اب کسی مشکل میں گرفتار ہوئیں تو میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔'' اس شخص کے اندر سے احساس مرچکا تھا اور جس شخص کے اندر سے احساس ختم ہوجائے وہ پھر انسان نہیں رہتا۔ امامہ کے آنسوؤں میں مزید شدت آگئی۔ عین اسی لمحے ان دونوں کے قریب پولیس کی گاڑی آکر رکی تھی۔

''اوئے...... کون ہو دونوں؟ اس وقت یہاں سڑک پر کیا کر رہے ہو......؟'' خالص پیشہ ورانہ انداز میں ''تفتیش'' کرتے وہ دونوں پولیس والے گاڑی سے اتر آئے تھے۔ ارسلان نے منہ ہی منہ میں انہیں کئی گالیاں ایک ساتھ دے ڈالیں۔

''میری بیوی ہے یہ...... روٹھ کر گھر سے جا رہی تھی' منانے آیا ہوں۔''

''بلے بھئی بلے! پولیس والوں کے ساتھ ہیرا پھیری؟ ابھی پتا لگ جاتا ہے بچو! ذرا تھانے چلو۔'' ان میں سے ایک حوالدار نے ارسلان کا بازو پکڑلیا تھا تبھی امامہ چلا اٹھی۔

"چھوڑو اسے...... تم جانتے نہیں ہو میں کس کی بیوی ہوں۔"

"چپ کراوئے! زیادہ ٹر ٹر کی تو زبان نکال کر ہاتھ میں پکڑا دوں گا، سمجھی!"

نچلے عہدوں کے ان ایمان فروش پولیس والوں کو اچانک "وردی چڑھ" گئی تھی۔ امامہ نے قطعی بے بسی کے عالم میں خود کو قانون کے ان رکھوالوں کے سپرد کر دیا تھا۔

✻✻✻

ہر گھڑی درد کی شدت سے سسکتی آنکھیں
اور اوپر سے تیرے وصل کے خوابوں کے عذاب
روز آنگن میں کھڑے پیڑ سے گرتے پتے
اور سرِ شام پرندوں پہ گزرتی آفات
نبض اور دل کی بغاوت سے تڑپتی ہے حیات
اس بھرے شہر میں بڑھتا ہوا لوگوں کا قحط
روز ہوتی ہے میرے ساتھ دیواروں کی جھڑپ
روز اک سانس کو پھانسی کی سزا ملتی ہے
اب تو آ جا! اے میری جان کے پیارے دشمن
اب تو آ جا کہ تیرے ہجر کے قیدی کو یہاں
روز اس شہر میں مرنے کی دعا ملتی ہے

رات کا پچھلا پہر تھا جب تختہ ہوئی کمر کے ساتھ امامہ حسن کو بالآخر خواتین کی جیل میں بجھوا دیا گیا۔ پچھلے ساڑھے چار گھنٹوں میں وہ ارسلان کے ساتھ اے ایس آئی کے کمرے میں بیٹھی انہیں اپنی ذات کے لیے صفائی دینے کی کوشش کرتی رہی تھی مگر......

وہاں ڈیوٹی پر موجود قانون کی ذمہ دار وردی میں ملبوس وہ "انسانی گدھ" اس ہاتھ آئی چڑیا کو کسی طور رہا کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اے ایس آئی کا چند گھنٹوں کے لیے گھر جانے کا ارادہ بھی بدل گیا تھا۔ ارسلان مچل رہا تھا مگر قانون کے ان رکھوالوں کو احتجاجاً بلند ہونے والی آوازوں کو دبانے میں خاصی مہارت تھی۔

ارسلان پر کیس بن گیا تھا۔ مگر امامہ کو بنا کسی چالان کے جیل بجھوا دیا گیا۔ قانون اور اس کے قاعدے منہ لپیٹے پڑے رہے تھے۔ ساٹھ ستر خواتین پر مشتمل وہ بیرک جہاں وہ لائی گئی تھی، چوں چوں کا مربع لگ رہی تھی۔ سات سال کی بچی سے لے کر اسّی سال کی عورت تک وہاں موجود تھی۔

قدرے پریشان نگاہوں سے سب کا جائزہ لیتی وہ ایک کونے میں بیٹھ گئی۔

یکلخت کیسی مصیبت آن پڑی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اسے ارسلان حیدر سے شدید نفرت کا احساس ہوا تھا۔ وہاں بیرک میں اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایک حاملہ لڑکی بیٹھی تڑپ رہی تھی۔ اسے شاید وہاں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ بیرک میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ سگریٹ، پان، تمباکو، عطر، تیل سب کی ملی جلی خوشبو و بو نے کھل کر سانس لینا بھی محال کر دیا تھا۔ امامہ کا سر چکرانے لگا۔

''پڑھی لکھی لگتی ہے اور شاید کنواری بھی...... بے چاری!''

اس سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھی ایک بزرگ خاتون نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔ امامہ اس کے افسوس کو نہ سمجھ سکی۔

''ہوں...... پڑھی لکھی ہے تو کیا ہوا' یہاں جیل کی چار دیواری کے اندر خواتین کے ساتھ کیا ہوتا ہے ذرا پڑھے لکھوں کو بھی پتا چلے۔'' بزرگ خاتون کی ہمدردی پر ایک اور خاتون نے دل جلایا تھا۔ امامہ خوف زدہ سی بیٹھی انہیں دیکھتی رہی۔

اس رات وہاں بیرک میں اس حاملہ لڑکی کی موت ہوگئی تھی۔ جیل کی سلاخوں کے اندر جنم لینے والے بچے نے دنیا کا منہ دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ برف جیسی سفید و سرد رنگت والی حالات کی ستائی اس لڑکی نے اپنی جان دے کر اس رات اس کی عزت کو داغ دار ہونے سے بچالیا تھا۔ روح کی جسم سے پرواز کے ساتھ ہی اسے جیل سے بھی رہائی نصیب ہوگئی تھی مگر امامہ سُن ہو کر رہ گئی تھی۔ صبح ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔ جیل میں عجیب سی کھلبلی مچ گئی تھی' وہ دہشت کا شکار ہوتی سر گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گئی۔

❊❊❊

''پاپا...... مما کب آئیں گی......؟''

شجاع گڑیا کو گھر لے آیا تھا اور اس وقت اس کے بستر میں گھسا اسے کہانی سنا رہا تھا۔ جب اس نے اچانک بخار سے تمتماتے چہرے کے ساتھ اس کی گود سے سر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ شجاع اس سوال پر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ٹھٹک گیا۔ جانے کیوں وہ امامہ کو بھول ہی نہیں پا رہی تھی۔

''کیا آپ کے لیے پاپا کا پیار کافی نہیں ہے گڑیا......؟'' بہت اضطراب کے عالم میں رنجیدگی سے اس نے پوچھا تھا۔ گڑیا جواب میں پلکیں موند گئی۔

''مجھے مما بہت یاد آتی ہیں پاپا! وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں پلیز انہیں ڈھونڈ کر لے آئیں ناں!'' وہ بچی جسے شروع سے ہی ماں کی آغوش اور محبت نصیب نہیں ہوسکی تھی۔ جو چار سال کی ہونے کے باوجود نہ ہنستی تھی' نہ بولتی تھی' نہ ٹھیک سے کھاتی تھی' نہ سوتی تھی۔ اس ننھی پری کو امامہ کے پیار اور توجہ نے یکسر بدل دیا تھا۔ وہ جینے لگی تھی' ہنسنے بولنے لگی تھی مگر......

امامہ حسن سے اچانک جدائی نے اس ننھی پری کے لبوں پر قفل لگا دیئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ پھر اپنے خول میں بند ہو رہی تھی۔ ملازمین کے بقول وہ سارا دن کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ شجاع اپنے ہاتھ سے زبردستی کچھ کھلا دیتا تو کھالیتی وگرنہ بھوکی بیٹھی رہتی' اسے اپنی بچی بہت عزیز تھی مگر بہت سی باتوں پر اس کا اختیار نہیں تھا۔

پچھلے ایک ہفتے سے گڑیا کو ہلکا ہلکا بخار بھی رہنے لگا تھا۔ اس نے صرف گڑیا کے خیال کے لیے دوبارہ سے ''آیا'' رکھنے کی کوشش بھی کی مگر وہ کسی کے ساتھ ایڈجسٹ نہ ہوسکی۔ جانے امامہ نے اس بچی پر کیا جادو کر رکھا تھا۔ اس روز گڑیا کو اپنے ہاتھ سے ناشتہ کروانے کے بعد وہ خاصے اضطراب و پریشانی میں آفس آیا تھا۔ رات جانے کیوں بار بار کروٹیں بدلنے کے باوجود اسے نیند نہیں آئی تھی۔

امہ حسن اپنی تمام تر بے وفائی کے باوجود اسے یاد آتی رہی تھی۔ بھرپور تھکن سے چُور جسم کے ساتھ
اعصاب بھی کھنچ کر رہ گئے تھے۔ اُدھر قریبی علاقہ کی جیل میں پچھلی رات ایک حاملہ خاتون کی
اناک موت نے میڈیا میں ہلچل مچادی تھی۔ شجاع کو ایمرجنسی اس جیل کا دورہ کرنا پڑا تھا۔

اِدھر امامہ کی دھڑکن اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ آنے والی رات کی تاریکی میں اس کے
ساتھ کیا ہونے والا تھا وہ جان گئی تھی۔ قانون کی وردی پہن کر' فرض شناسی کا حلف اٹھانے والے
بظاہر مسلمان رکھوالے دن کا اجالا ڈھلتے ہی کیسے اس کا بدن نوچیں گے اسے وہاں جیل کی ہی ایک
خاتون نے بہت تفصیلاً بتادیا تھا۔

عزت کی جس چادر کو وہ اب تک سنبھال کر اجلا رکھے ہوئے تھی وہ چادر بس میلی ہونے ہی والی
تھی۔ رورو کر اس نے اپنا بُرا حال کرلیا تھا۔ دعائیں مانگ مانگ کر اس کے لب خشک ہوگئے تھے۔
وہ جانتی تھی کہ اس کا سامنا شجاع سے ہوگا مگر عزت کی قیمتی متاع لٹانے کے بعد بھلا اس سے ملنا کیا
معنی رکھتا تھا؟ پھر چاہے وہ اس کی عزت کے لٹیروں کا حشر بگاڑ دیتا مگر اس کی پاکیزگی کبھی واپس
آنے والی نہیں تھی۔

اس نے طے کرلیا تھا وہ رات آنے سے قبل جیسے بھی ہوسکا اپنی جان پر کھیل جائے گی مگر عزت
کا سودا نہیں ہونے دے گی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا رحمٰن اور رحیم رب اسے مشکل کی اس گھڑی میں بھی
بے یارو مددگار نہیں چھوڑے گا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ گناہ گار ہے' خطا کار ہے' مگر بدکار نہیں ہے۔ اس
نے اللہ کی قائم کردہ ''حدود'' کو پار نہیں کیا تھا لہٰذا رو رو کر اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے
ہوئے اس نے ایک بار پھر سے رب کو سچے دل سے مدد کے لیے پکارا تھا۔

شجاع جس وقت وہاں مانیٹرنگ کے لیے آیا وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی جانے کون کون سی
قرآنی آیات اور دعائیں پڑھنے میں مشغول تھی' اس کی پوچھ گچھ پر بھی اس نے گھٹنوں سے سر
اٹھانے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی۔

وہ پلٹ رہا تھا جب سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے اس نے اپنے ماتحت کھڑے ایس ایچ او
سے پوچھا تھا۔

''یہ کون ہے؟''

''نئی لڑکی ہے سر! کچھ روز پہلے ایک لڑکے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑی گئی ہے۔''

''بکواس ہے یہ......'' ایس ایچ او کے الزام پر اس نے اچانک چلاتے ہوئے سر اٹھایا تھا اور
پھر جیسے ساکت رہ گئی تھی۔ ''کوئی رنگ رلیاں نہیں منائیں میں نے کسی کے ساتھ...... یہ لوگ جھوٹ
بول رہے ہیں۔''

شجاع کی آنکھوں کے دکھ' حیرت اور نفرت نے اسے جیسے کاٹ ڈالا تھا مگر وہ پلٹ گیا۔ امامہ کو
لگا جیسے وہ مرجائے گی۔

''ڈی آئی جی صاحب! خدا کا واسطہ ہے آپ کو' میرا یقین کریں میں گناہ گار نہیں ہوں' یہ لوگ
جھوٹ بول رہے ہیں۔'' وہ تڑپ رہی تھی۔ شجاع کی آنکھوں کے سامنے اس کی چند روز پہلے کی
''عیاشی'' کا منظر گھوم گیا۔ اگلے اٹھتے قدم پر اس کی سماعتوں میں اپنی بیٹی کی صدا گونجی تھی۔

''مجھے مما بہت یاد آتی ہیں پاپا......! وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں...... پلیز انہیں ڈھونڈ کر لے آئیں ناں......''

''کیا ایف آئی آر ہے اس کے خلاف......؟'' کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پھر ایس ایچ او سے پوچھا تھا۔ جواب میں وہ گڑبڑا گیا۔

''سر! ایف آئی آر ابھی درج نہیں ہوئی ہے۔''

''کیوں؟'' اسے حیرانی ہوئی تھی مگر ایس ایچ او کے پاس فی الحال اس کی کیوں کا جواب نہیں تھا تبھی وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا تھا۔

''کس لڑکے کے ساتھ پکڑی گئی ہے یہ؟''

''آپ آئیں سر! میں ملواتا ہوں۔'' ازحد گھبرائے چہرے کے ساتھ وہ اسے وہاں سے ٹالنا چاہ رہا تھا تبھی وہ لڑکی بول اٹھی تھی۔

''ڈی آئی جی صاحب! یہ لڑکی جھوٹی نہیں ہے' خدا کا واسطہ ہے آپ کو' اسے لے جائیں یہاں سے' ورنہ یہ بھی برباد ہو جائے گی' لُٹ جائے گی۔'' کیسی کسک تھی اس سزا یافتہ قیدی خاتون کے لہجے میں۔ شجاع بے ساختہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا تھا۔ اسی روز شام میں امامہ حسن کی رہائی ہوگئی تھی۔ وہ چاہتا تو اپنی عزت پر ہاتھ ڈالنے والے سارے عملے کو معطل کر دیتا مگر ایسا تو تب ممکن ہوتا جب امامہ حسن اس کی نگاہ میں سرخرو ہوتی اور وہ اس کی نگاہ میں سرخرو تو نہیں تھی۔

❊❊❊

یاد پیا کی آئے......
بیری کوئلیا شور مچائے
مجھ برہن کو راس نہ آئے
من میں جوت جگائے...... ہائے
یاد پیا کی آئے

قدرے ریش ڈرائیونگ کے ساتھ مدھم آواز میں گاڑی میں گونجتی یہ غزل اس کے پُرتھکن اعصاب کو قرار بخش رہی تھی اور پھر شہر کے سب سے بڑے شاپنگ پلازہ کے سامنے گاڑی پارک کر کے جب وہ سیڑھیاں تیزی سے چڑھ رہا تھا تو عین اسی لمحے صاعقہ اپنا دوپٹا ٹھیک کرتی شاپنگ پلازہ سے نکلی تھی۔

ازلان جلدی میں تھا اور شاید صاعقہ بھی' یہی وجہ تھی کہ عین سیڑھیوں کے وسط میں دونوں کا زبردست ٹکراؤ ہوا تھا۔ صاعقہ اس ٹکراؤ کے لیے تیار نہیں تھی' تبھی برہم ہوئی تھی۔

''دیکھ کر نہیں چل سکتے آپ......؟'' بمشکل سنبھل کر سر اٹھاتے ہوئے اس نے جونہی ازلان کو دیکھا پھر گویا پتھر کی ہوگئی۔

''میرال......؟'' دوسری طرف سامنے موجود شخص کا وجود بھی جیسے آندھیوں کی زد میں آ گیا تھا۔

بہتے ہوئے اشکوں کی روانی میں مرے ہیں

کچھ خواب میرے عین جوانی میں مرے ہیں
قبروں میں نہیں ہم کو کتابوں میں اتارو
ہم لوگ محبت کی کہانی میں مرے ہیں

"میں...... میرال نہیں ہوں۔" دھک دھک کرتے دل کی دھڑکنوں پر بمشکل قابو پاتے ہوئے اس نے وضاحت دی تھی مگر ازلان کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اُب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔

"میرال نہیں ہو تو پھر کون ہو......؟"

"پتا نہیں...... راستہ چھوڑیں میرا۔"

ازلان حیدر سے یوں اچانک سرِ راہ ٹکراؤ اس کے پلان کا حصہ نہیں تھا تبھی وہ سرعت سے اس کی سائیڈ سے نکل آئی تھی مگر...... وہ اب بھی وہیں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے چھو کر مجھے پتھر سے پھر انسان کیا
مدتوں بعد میری آنکھ میں آنسو آئے

"ایکسکیوزمی......!" صاعقہ وہاں سے جا چکی تھی اور اب کوئی اور لڑکی اس کے مقابل کھڑی اس سے راستہ مانگ رہی تھی۔ وہ چونکا اور بجائے اندر جانے کے تیزی سے سیڑھیاں اترتا اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔ ہاتھوں کی لرزش اس کے اندر کی دنیا کے زیروبم ہونے کا واضح اشارہ دے رہی تھی' اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ اس وقت کہاں جائے؟ ذہن جیسے کام ہی نہیں کررہا تھا۔

انتہائی مصروف شاہراہ پر جتنی بے پروائی اور غیر ذمہ داری سے وہ ڈرائیو کررہا تھا اس کا زبردست حادثہ ہو جانا یقینی تھا مگر وہ بچ گیا تھا' ابھی کچھ روز قبل ہونے والے ایکسیڈنٹ کے زخم تازہ تھے۔ دوپہر کے اس وقت کوئی گرل فرینڈ' کوئی کلب' کوئی نشہ اسے پناہ نہیں دے سکتا تھا تبھی وہ گھر چلا آیا تھا۔

صبح وہ اپنا کمرا جس حال میں چھوڑ کر گیا تھا وہ اب بھی اسی حال میں ملا تھا' کسی ملازم کی جرأت نہیں تھی کہ اس کے منع کرنے کے بعد وہاں قدم رکھ لیتا۔ حال سے بے حال ہوئے کمرے میں مکمل تاریکی کرنے کے بعد اس نے وارڈروب سے سگریٹ کے پیکٹ نکالے اور بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔

کوئی حساب رہا تھا نہ کوئی حد...... ایک کے بعد دوسرا' دوسرے کے بعد تیسرا' تیسرے کے بعد چوتھا' رات ڈھل جانے تک اس کا یہی مشغلہ رہا تھا۔ کثرت سگریٹ نوشی نے نہ صرف اس کی وجاہت کو ماند کر دیا تھا بلکہ گرتی ہوئی صحت کے ساتھ اس کی زندگی بھی تیزی سے خطرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اگلے دو دن وہ بے حال پڑا رہا تھا۔ واصف علی ہمدانی نے اس دوران اس سے رابطے کی بہت کوشش کی مگر وہ بے حس بنا پڑا رہا' نہ خود کمرے سے باہر گیا' نہ کسی اور کو کمرے میں آنے دیا۔

تیسرے دن اس کا سامنا پھر صاعقہ احمد سے ہوا تھا۔ اس بار وہ اسے اپنے آفس میں ملی تھی۔ واصف علی ہمدانی نے اسے پرسنل سیکرٹری کی حیثیت سے اپائنٹ کیا تھا' ازلان شاکڈ رہ گیا۔

"یہی لڑکی ملی تھی تمہیں پرسنل سیکرٹری کی حیثیت سے اپائنٹ کرنے کے لیے؟" شاک سے نکل

کر شدید غصے میں وہ واصف کی طرف آیا تھا۔ جو فون پر کسی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔

''کیوں...... اس لڑکی کو کیا ہے؟'' فوراً سے پیشتر فون رکھتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ تھا۔ ازلان نے سامنے میز پر پڑی فائل اٹھا کر دیوار پر دے ماری۔

''یہ لڑکی میری پرسنل سیکرٹری کی حیثیت سے اس آفس میں کام نہیں کر سکتی۔''

''مگر کیوں...... صرف اس لیے کہ اس کی شکل میرال حسن سے ملتی ہے؟''

''جسٹ شٹ اپ...... اوکے۔'' وہ دہاڑا تھا۔ واصف نے لب بھینچ لیے۔

''وہ لڑکی اسی آفس میں تمہاری پرسنل سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرے گی' چاہے تم یہ گوارا کرو یا نہ کرو۔''

''تمہیں یہ حق کس نے دیا؟''

''میری سویٹ اینڈ کیوٹ آنٹی نے' جن کے تم انتہائی نافرمان بیٹے ہو۔''

''شٹ اپ......!'' وہ وحشت کا شکار ہو رہا تھا۔ واصف خاموشی سے اس کا سرخ چہرہ دیکھتا رہا۔

''پلیز کول ڈاؤن ازلان! صرف اس لیے کہ اس کی شکل کسی سے ملتی ہے ہم اس کی قابلیت اور اہلیت کو ریجیکٹ نہیں کر سکتے' وہ اچھی سمجھ دار لڑکی ہے۔ اسے صرف میں نے اپائنٹ نہیں کیا پورے پینج نے سلیکٹ کیا ہے' لہٰذا پلیز اس کے سامنے کسی قسم کی حماقت کا مظاہرہ مت کرنا۔'' اس بار نرمی سے سمجھاتے ہوئے اس نے ازلان کے کندھوں پر ہاتھ دھرے تھے' جنہیں اس نے فوراً خفگی سے جھٹک دیا۔

''اس پوری دنیا میں وہ واحد سمجھ دار' قابل لڑکی نہیں ہے۔''

''نااہل بھی تو نہیں ہے۔'' واصف کے پاس دلائل کی کمی نہیں تھی۔ وہ شدید خفگی کے موڈ میں وہاں سے اٹھ آیا۔

❋❋❋

گاڑی شجاع حسن کے گھر کے سامنے رکی تھی۔ امامہ کے آنسو تھے کہ تھمنے کو نہیں آ رہے تھے۔ وہ شجاع حسن سے خائف تھی۔ اسے زندگی میں کبھی معاف نہ کرنے کا عزم رکھتی تھی مگر وہ ایک رات! اس نے کل بے قصور ہوتے ہوئے جیل کی چار دیواری کے اندر بنا کسی جرم کے کاٹی تھی اس ایک رات نے شجاع حسن کے خلاف نفرت اور غصے کے ہر طوفان کو بہا دیا تھا' اس وقت وہ اس کا مجرم نہیں محسن نظر آ رہا تھا۔

جیل سے شجاع حسن کے گھر تک' تمام راستے وہ روتی رہی تھی۔

ڈرائیور اسے بحفاظت شجاع حسن کے گھر تک پہنچا کر جا چکا تھا اور وہ خوب صورت لان عبور کر کے گھر کے اندر داخل ہوئی تو ایک گمبھیر خاموشی نے اس کا استقبال کیا۔ خوب صورت در و دیوار یوں چپ کی بکل مارے ہوئے تھے جیسے صدیوں سے وہاں زندگی کی آواز نہ گونجی ہو۔

سست قدموں سے اشکبار آنکھوں کے ساتھ چلتی وہ گڑیا کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس سے پہلے جناب قدرت اللہ صاحب کا کمرا اسے لاک ملا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ وہاں نہیں تھے۔ گڑیا البتہ اپنے بستر پر میٹھی نیند سو رہی تھی اسے شاید سرِ شام ہی سلا دیا گیا تھا یا پھر اس کی طبیعت ٹھیک

ہیں تھی۔

امامہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھی تھی اور گڑیا کے سرہانے بیٹھ کر اسے دیوانوں کی طرح چومنا شروع کر دیا تھا۔ بچی کی آنکھ اس کی محبت کی شدت پر ہی کھلی تھی۔

''مما! آپ آ گئیں......؟'' ٹکر ٹکر کئی پل امامہ کو دیکھنے کے بعد وہ اس سے لپٹ گئی تھی۔ امامہ نے اسے قیمتی متاع کی طرح اپنی بانہوں میں سمولیا۔

''ہاں میری جان! آپ کی گناہ گار مما آ گئی۔''

''میں نے صبح پاپا کو بولا تھا میری مما جہاں بھی ہیں انہیں ڈھونڈ کر لائیں۔''

''ہاں! آپ کے لیے آپ کے پاپا کو اللہ میاں نے میرے پاس بھیج دیا۔'' اس کے آنسو بچی کے بالوں پر گر رہے تھے۔ تبھی اس نے پھر پوچھا۔

''مما! آپ گڑیا کو چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں؟'' اور یہ وہ سوال تھا جس کا جواب وہ اسے کبھی نہیں دے سکتی تھی تبھی اس کا منہ چومتے ہوئے بولی تھی۔

''کہیں نہیں گئی تھی بیٹے! بس مما کھو گئی تھی۔''

''مما اتنی بڑی ہو کر بھی کھو جاتی ہے؟'' منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ ننھی پری مسکرائی تھی۔ امامہ نے اسے بانہوں میں بھینچ لیا۔

''ہاں بیٹے! عقل اور عمر کی کوئی شرط نہیں۔ جسے کھو جانا ہو وہ چاہے بڑھاپے کو پہنچ جائے کھو کر رہتا ہے۔'' اس کی بات گڑیا کے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی مگر پھر بھی وہ خوش تھی۔

''اب تو آپ گڑیا کو چھوڑ کر نہیں جائیں گی مما......؟''

''نہیں......!'' بھل بھل بہتے آنسوؤں پر ضبط کرتے ہوئے اس نے وعدہ کیا تھا۔

شجاع اس رات بہت لیٹ گھر واپس آیا تھا۔ شاید اسے اطمینان تھا کہ امامہ گڑیا کے پاس ہے۔ امامہ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی تبھی وہ گڑیا کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔ شجاع یونیفارم تبدیل کرنے کے بعد اپنی بیٹی کے کمرے میں آیا تو وہ امامہ سے لپٹ کر میٹھی نیند سو رہی تھی۔ وہ اسے ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا مگر امامہ کے وجود کو برداشت کرنا بھی بہت مشکل تھا۔ تبھی وہ فوراً واپس پلٹ گیا تھا۔

اگلے روز شام میں جب وہ گڑیا کو گھمانے پھرانے کے بعد اس کی پسند کی ڈھیر ساری شاپنگ کے ساتھ گھر واپس آیا تو امامہ سے اس کا سامنا ہوا تھا۔ وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی اور اب دعا میں ہاتھ اٹھائے زار و قطار رو رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی شجاع کے اندر نفرت کی ایک تیز لہر اٹھی تھی۔ اگلے ہی پل وہ اسے نظر انداز کرتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

❁❁❁

سگریٹ کے گہرے کش لیتا' درد سے پھٹتے سر کے ساتھ' آفس میں بیٹھا وہ گھر جانے کے لیے سوچ رہا تھا جب ایس پی حزام نے سلیوٹ کے ساتھ اس کے کمرے میں قدم رکھا۔

''السلام علیکم سر!''

''وعلیکم السلام! کیسے ہو حزام؟''

''فائن سر! آپ کی دعائیں ہیں۔''

''کیا بنا امامہ حسن کے کیس کا؟''

''پوری فائل تیار ہے سر! یہ لیجیے...... جو لڑکے گرفتار ہیں انہیں سزا بھی ہوگئی ہے۔''

''کچھ پتا چلا انہوں نے قتل ہونے والی لڑکی کے بارے میں جھوٹ کیوں بولا؟''

''جی سر! ان لڑکوں کے بقول انہوں نے امامہ حسن کو ہی قتل کیا تھا' دوسری لڑکی جو اس وقت وہاں موجود تھی وہ ان کی دوست تھی مگر امامہ حسن کی بجائے اس کا قتل کیسے ہوگیا' وہ خود بھی نہیں جانتے۔''

''جھوٹ ہے یہ!''

''نہیں سر! میرے تجربے کے مطابق وہ جھوٹ نہیں بول رہے' یقیناً اندر کہانی کچھ اور ہے۔ بہر حال میں نے امامہ حسن کی پوری ہسٹری اکٹھی کی ہے' اس فائل میں سب حالات درج ہیں۔''

''گڈ...... مجھے یقین تھا یہ کام آپ سے بہتر کوئی انجام نہیں دے سکتا۔''

''تھینک یو سر......!'' ایس پی حزام خوش ہو کر رخصت ہوگیا تھا۔ شجاع فائل اٹھا کر آفس سے اٹھ گیا۔

❀❀❀

''تمہیں پتا ہے جیل میں کیا ہوتا ہے؟''

آنکھوں پر بازو رکھے وہ سو رہی تھی جب اچانک اس کے ذہن میں جیل کی چار دیواری کے اندر مقید اس چوبیس پچیس سالہ لڑکی کی آواز گونجی تھی جو اس کے ساتھ بیرک میں بند تھی۔ امامہ نے قدرے ہراساں ہو کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''کیا ہوتا ہے؟'' اس کے جوابی سوال پر ایک زخمی سی مسکراہٹ اس لڑکی کے لبوں پر بکھری تھی۔

''کیا نہیں ہوتا؟ برہنہ انسانیت چیختی ہے' بلبلاتی ہے' بین کرتی ہے' اشرف المخلوقات کہلانے والے انسانوں کی بربریت پر' وحشت پر مگر...... اس کے بین رات کی دبیز تاریکی میں گھٹ کر' دب کر رہ جاتے ہیں۔ ایک ہی خدا، ایک ہی رسول اور ایک ہی کتاب کے ماننے والے جب ''اختیار'' کی وردی پہن کر سامنے آتے ہیں ناں تو شیطان بھی ان کی شیطانی پر توبہ کر لیتا ہے۔ یہاں آنے والے سب قاتل نہیں ہوتے نہ ہی سب مہر لگے چور' ڈاکو' لٹیرے ہوتے ہیں پھر بھی یہ درندے' یہ وحشی جانور' بھنبھوڑ ڈالتے ہیں انہیں۔'' اس لڑکی کا اندر زخمی تھا۔ امامہ ان سمجھی نگاہوں کے ساتھ اسے دیکھے گئی۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو' میں سمجھ نہیں پا رہی......''

''جانتی ہوں تم سمجھ بھی نہیں سکتیں۔ مخمل کے کمبل لپیٹ کر' شان دار گھروں میں سو جانے والوں کے لیے بس رات آتی ہے اور گزر جاتی ہے مگر یہاں...... وحشت اور بربریت کی اس چار دیواری میں رات گزرنے کے لیے نہیں آتی' چیخنے کے لیے آتی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں تم خود دیکھو گی کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔ یہ فرضی اور افسانوی باتیں نہیں ہیں' رِستے ہوئے ناسور ہیں۔ کاش...... کاش! کسی این جی او' کسی فلاحی ادارے کی آنکھیں کھلیں' انہیں گھروں کے اندر عورتوں پر ہونے والے مظالم پر آواز اٹھانے اور ناجائز پیدا ہونے والے بچوں کی حق تلفی پر رونے' کڑھنے سے فرصت ملے اور وہ یہاں سسکتی ہوئی انسانیت کا نظارہ کریں' ان کے لیے آواز اٹھائیں' کاش...... کوئی تو آئے اور

دیکھے......" زخمی لہجے والی اس لڑکی کی آنکھیں اچانک بھر آئی تھیں۔ امامہ کا خوف بڑھ گیا۔

"کیا تم مجھے بتاؤ گی کہ یہاں کیا ہوتا ہے؟"

"بتادوں گی تو کیا ہوگا...... کیا کرو گی تم......؟"

"مجھے نہیں پتا مگر شاید میں کچھ کرسکوں' میرے شوہر ڈی آئی جی ہیں۔" پہلی بار شجاع کا حوالہ اس کے لیے بہت فخر کا باعث بنا تھا۔ تاہم اس کے برابر بیٹھی اس لڑکی کی آنکھیں تحیر سے پھیل گئی تھیں۔

"ڈی آئی جی کی بیوی ہو کر تم یہاں ہو؟"

"ہاں! کچھ ایسے حالات ہو گئے تھے کہ میں ان کے ساتھ نہیں رہ سکی۔"

"تو کیا اسی نے تمہیں کسی جھوٹے کیس میں پھنسا کر یہاں بھجوا دیا؟"

"نہیں! اسے تو شاید خبر بھی نہیں کہ میں یہاں ہوں۔"

"اگر خبر نہیں ہے تو خبر کرو' نہیں تو یہ لوگ زندہ رہنے لائق نہیں چھوڑیں گے تمہیں۔"

"مگر کیوں! میں نے کیا کیا ہے؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے یہاں آنے والے سب مجرم ہوتے ہیں؟ نہیں! یہاں سیکڑوں پھانسی کے تختے پر جھول جاتے ہیں مگر آخری سانس تک انہیں اپنے جرم کا پتا نہیں چلتا۔ اندھا ہوتا ہے قانون...... اندھا!" لڑکی جذباتی ہوئی تھی۔ امامہ نے سر گھٹنوں سے اٹھالیا۔

"کیا تم بھی یونہی آئی ہو یہاں......؟"

"نہیں! قتل کیا ہے میں نے اپنے شوہر کا' کیونکہ وہ بدکار تھا۔ نکاح کر کے فروخت کرنا چاہتا تھا مجھے' میری غیرت نے گوارہ نہیں کیا یہ۔ اسی لیے قصہ تمام کر دیا اس کا مگر یہی کام اگر وہ سر انجام دیتا تو یہ اندھا قانون اسے تحفظ دے کر باعزت بری کر دیتا۔ غیرت کے نام پر قتل...... ہا...... ہا...... ہا......"

"سزا ہوئی ہے تمہیں؟"

"نہیں! کیس چل رہا ہے ابھی۔"

"وکیل کیا کہتا ہے؟"

"کیا کہنا ہے اس نے' وہ تو دولت کے پانی کی مچھلی ہے۔ نوٹ دکھاتے رہو اور دن بڑھاتے رہو۔"

"کون کون ہیں گھر میں؟"

"چار بہنیں ہیں اور ایک بوڑھا معذور باپ! آتا ہے کبھی کبھی ملاقات پر...... دھکے کھا کر چلا جاتا ہے۔"

"اور بہنیں......؟"

"انہیں منع کر رکھا ہے میں نے' تم نہیں جانتیں ان ایمان والوں کی بھوک کو۔ قانون کی آڑ میں یہ لوگ بے بس انسانیت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اپنے اصول اور اپنے مفاد ہوتے ہیں ان کے' انہیں فرق نہیں پڑتا' چاہے کوئی جیل کی سلاخوں سے سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائے یا انصاف کے کٹہروں کے چکر لگا لگا کر۔ بہت بھیانک حقیقتیں منہ چھپائے پڑی ہیں یہاں۔ اتنی بھیانک کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے۔"

''تو تم کسی بڑے افسر سے بات کیوں نہیں کرتیں؟''

''کیا ہوگا بات کرنے سے؟ کیا جیلوں کے اندر کی کہانیاں بدل جائیں گی؟ کیا میرے بعد کسی اور کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ کیا سمجھتی ہو تم' ان بڑے افسروں کو کچھ نہیں پتا؟ کیا انصاف کی کرسی پر بیٹھے جج بے خبر ہیں؟ نہیں! سب آشنا ہیں۔ جیل کی چار دیواری ہو یا کسی وکیل کا چیمبر...... ہر جگہ ایک ہی کہانی چلتی ہے بے بسی اور اختیار کی کہانی...... شاید اس بدنام جگہ کی چار دیواری کے اندر آنے والے ہر بدنصیب انسان کو یہ لوگ گناہ گار تسلیم کر کے' ہر قسم کی رعایت' ہمدردی' توجہ اور انسانیت سے خارج قرار دے دیتے ہیں' جب چاہا برہنہ کر کے تشدد کر لیا اور جب چاہا عزت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔''

''کیا جیل میں قیدی شور نہیں مچاتے؟'' اس کا دل بیٹھ رہا تھا۔ برابر بیٹھی لڑکی کے لبوں پر زہریلی مسکان بکھر گئی۔

''کس کو سنائیں شور مچا کر؟ جو شور مچاتا ہے پھر اس کی چیخیں پوری بیرک سنتی ہے' اُدھر گھڑیال رات کے بارہ بجاتا ہے اور ادھر تشدد کی کہانیاں شروع ہو جاتی ہیں' کوئی ماں نہیں ہوتی وہاں دیکھنے والی۔ اگر ہو تو شاید لمحے سے قبل مر جائے۔'' صرف ایک لمحے کے لیے وہ سانس لینے کو رکی پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ ''قیدیوں میں بھی بہت بڑے بڑے مگر مچھ ہوتے ہیں جن کی ساری عمر جیل کی سلاخوں کی نذر ہو جاتی ہے' سر کے بال منڈوا کر جو بھی نیا لڑکا یا بوڑھا جیل میں داخل ہوتا ہے وہ پہلے ان مگرمچھوں کی خوراک بنتا ہے پھر پولیس والے ادھیڑ ڈالتے ہیں اسے...... زخموں سے چُور' ٹوٹی ہڈیوں کے وجود کے ساتھ' ٹھنڈی زمین پر رات کو لیٹنے کے لیے بھی جگہ نصیب نہیں ہوتی اسے۔''

عین اسی لمحے حاملہ لڑکی کی موت ہوئی تھی۔ امامہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

اس کی سانس بہت تیز چل رہی تھی اور جسم پسینے میں شرابور تھا۔ کتنی بھیانک تھی وہ دنیا جہاں سے شجاع اسے نکال لایا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس کی دعائیں مستجاب ہو گئی تھیں۔ کیسے شکر ادا کرتی وہ اپنے ربّ کی مہربانی اور کرم نوازی کا' کیسے اس شخص کا شکریہ ادا کرتی جو شاید اس کی شکل دیکھنے کا روادار بھی نہیں تھا۔

❊❊❊

''عباد...... یہ ازلان حیدر کون ہے؟''

خالی دل و دماغ کے ساتھ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا' وہ جانے کون سے مسئلے سلجھا رہا تھا' جب ہادیہ ایک فائل ہاتھ میں لیے اس کے کمرے میں چلی آئی۔ عباد نے فی الفور توجہ کمپیوٹر سے ہٹائی تھی۔

''شاہ زر کے دوست کا دوست ہے' میٹنگ ہے اس کے ساتھ' کیوں؟''

''کچھ نہیں' ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔ میں نے دیکھا ہے اس لڑکے کو اکثر...... گہرا سمندر سا' یوں لگتا ہے جیسے کوئی صدیوں سے بند شان دار عمارت ہو' خیر چھوڑو اسے' تم بتاؤ آنٹی کو تنگ کیوں کر رہے ہو' کھانا کیوں نہیں کھاتے؟''

''میں بچہ نہیں ہوں ہادی! اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں تم کہہ دو انہیں مجھے فورس نہ کیا کریں۔''

''عباد! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کوئی آج کے فاسٹ دور میں کسی معمولی سی لڑکی کے لیے اپنے فیملی

ر ان کے ساتھ ایسا کرتا ہے جیسا تم کررہے ہو؟''
''کیا...... کیا ہے میں نے؟ ہاں...... کیا کیا ہے؟ وہ لوگ زبردستی مجھے شادی کے بندھن میں ﺮﻫﻨﺎ چاہتے ہیں مگر میں ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے اور ہاں میں نے ﻠﮯ بھی تمہیں وارن کیا تھا' میرے سامنے اس لڑکی کے لیے معمولی کا لفظ استعمال مت کیا کرو' کیونکہ رے دل اور میری زندگی میں جو مقام اسے حاصل ہے تم اس مقام تک کبھی نہیں پہنچ سکتیں۔'' اٹھ کر ﮕﺮ سے کہتے ہوئے اس نے جن نگاہوں سے ہادیہ کو دیکھا تھا' وہ سُن رہ گئی تھی۔
کیا کوئی اتنا بھی بدل سکتا ہے؟ کیا لوئر کلاس گھرانے کی کوئی معمولی سی لڑکی' عباد جیسے شان دار د کو اتنا بے بس اور خود سر بھی بنا سکتی ہے؟ یہ کیسا مذاق' کیسی کہانی تھی زندگی کی جس پر یقین کرنے کا ں کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔
یہ کیسا دریا تھا عشق کا جو چڑھ کر اتر ہی نہیں رہا تھا۔ عباد کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ اسی کی سیٹ بیٹھ گئی۔ کیا تھی صاعقہ احمد! اور کیسی محبت تھی جو اس نے عباد سے کی تھی۔ اس کا دل چاہا کاش! کہیں ے وہ لڑکی اس کے سامنے آئے اور وہ اس کا گلا دبا کر اسے مار ڈالے۔ عباد کی زندگی سے یہ کانٹا النے کے لیے اب اسے کچھ اور کرنے کی ضرورت تھی۔

❁❁❁

سگریٹ کا ایک پیکٹ خالی ہوگیا تھا اور اب وہ دوسرا اٹھا رہا تھا جب امامہ سر جھکائے وہاں ل آئی۔
''شجاع!'' وہ چونکا تھا اور پھر نگاہ اس پر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں نفرت اتر آئی۔
''شجاع ایم سوری میں......''
''جسٹ شٹ اپ اور نکل جاؤ یہاں سے......'' امامہ کی بات کاٹتے اس کے لہجے میں چنگھاڑ ﻟﯿﮟ غراہٹ تھی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
''صرف ایک بار میری بات سن لیں پلیز......!''
''تمہیں سنائی نہیں دیا میں نے کیا کہا ہے؟'' دوبارہ اسی لہجے میں کہتے ہوئے وہ اس کے مقابل کھڑا ہوا تھا۔
''نفرت کرتا ہوں میں تم سے۔ اپنی بیٹی کا خیال نہ ہوتا تو زندگی بھر تمہارا یہ مکروہ چہرہ کبھی نہ یکھتا۔ تم مرگئی ہو امامہ حسن...... اس گھر کے لیے' اس گھر کے رہنے والوں کے لیے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اپنی اوقات میں رہو' اس وقت تک جب تک میں اپنی بیٹی کو بورڈنگ نہیں بھجوا دیتا۔'' کھا جانے والی ﮔﺎﮨﻮں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے رخ پھیرا تھا۔ وہ جیسے کٹ کر رہ گئی۔
''اور اس کے بعد......؟''
''اس کے بعد تم آزاد ہوگی...... جہاں دل کرے منہ اٹھا کر چلی جانا۔''
کتنی اجنبیت' کس قدر حقارت سے کہہ رہا تھا وہ۔ امامہ کے آنسو ٹوٹ کر گالوں پر لڑھک آئے۔
''میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اس دنیا میں جہاں میں منہ اٹھا کر چلی جاؤں۔''

"یہ میرا دردِ سر نہیں ہے‘ تم جیسی بدکردار‘ ضمیر فروش لڑکیوں کا کوئی ایک ٹھکانہ ہو بھی نہیں سکا
اب اس نے رخ پھیرا تھا امامہ کا چہرہ غصے اور دکھ کی شدت سے سرخ پڑ گیا۔

"میں بدکردار نہیں ہوں...... سمجھے آپ......" کردار پر لگی یہ چوٹ اس کی برداشت میں تھی نہیں۔ "آپ کیا سمجھتے ہیں کیا مجھے آپ سے نفرت نہیں؟......اس رات جب آپ میری عزت محافظ ہوتے ہوئے مجھے زبردستی ایک نامحرم کے سپرد کر آئے تھے۔ اس رات آپ بھی مر گئے میرے لیے۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا میں زندگی میں دوبارہ کبھی آپ کا چہرہ نہیں دیکھوں گی‘ ج وہاں اس رات میں نے دیکھا‘ اس کے بعد آپ کے نام سے منسوب رہنے کا تصور بھی مٹ گ میرے ذہن سے۔ مگر میرے ربّ نے میری عزت اور جان کی حفاظت کی۔ بے شک اس سے کر انسان کا کوئی محافظ نہیں۔ میں آپ کے لیے بدکردار سہی مگر میرے ربّ نے قدم قدم پر عزت کی حفاظت کی ہے‘ میں اس کی نگاہ میں بدکردار نہیں ہوں۔ اسی لیے اس نے پھر مجھے آزمائشوں سے نکال کر آپ کے گھر میں پہنچا دیا۔ جو مدد آپ نے میری کی اس کے بعد میں بھو کہ مجھے آپ سے نفرت کرنی تھی۔ زندگی بھر آپ کا چہرہ نہیں دیکھنا تھا‘ مجھے یاد رہا تو صرف ا آپ میرے محسن ہیں‘ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ میں آپ کو اپنی مصیبتوں کی کہانیاں نہیں سنا گی شجاع! نہ آپ کے بیڈ پر آنے کی خواہش ہے مجھے‘ بس مجھے اپنی بیٹی کے قریب رہنے دیں‘ خد قسم! میں اسے کوئی تکلیف پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" گرتے آنسوؤں کے ساتھ اس نے د سارا غبار نکالا تھا۔ شجاع ٹراؤزر کی پاکٹس میں ہاتھ گھسائے‘ رخ پھیرے کھڑا اسنی ان سنی کر گیا۔

"آج ملازمہ کی زبانی مجھے اباجی کی رحلت کا جان کر بہت دکھ ہوا ہے‘ سارا دن میں ان کر کے روتی رہی مگر میرے آنسو انہیں واپس نہیں لاسکتے پھر بھی اپنی زندگی کے اس موڑ پر میں ا بہت یاد کر رہی ہوں۔"

"بکواس کر رہی ہو تم اور کچھ نہیں......" اچانک وہ پھٹ پڑا تھا۔ "ایک نمبر کی چالاک‘ ڈرامہ لڑکی ہو تم۔ اپنے عاشق کو بچانے کے لیے تم نے اس گھر میں پلاننگ کے تحت قدم رکھا‘ بار بار می بیٹی کو جان سے مارنے کی کوشش کی۔ مجھے زہر دیا‘ شادی کے باوجود اپنی عیاری اور مکاری سے تم مجھے خود سے دور رکھا۔ کس کے لیے صرف اپنے عاشق کے لیے‘ تم محفلوں کی زینت ہو کوئی بھی گرا شخص تمہیں چھو کر شادی کی آفر کرسکتا ہے۔ اب بھی صرف اپنے عاشق کو بچانے کے لیے تم ہمدردی کا ڈرامہ کر رہی ہو مگر اچھی طرح سے جان لو امامہ حسن! میں اب تمہاری کسی چال میں آ والا نہیں۔ اگر چاہوں تو ابھی تین حرف سنا کر اپنی زندگی سے بے دخل کرسکتا ہوں تمہیں مگر صر تھوڑے دنوں کے لیے بھی میں ایک نامحرم لڑکی کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہنا گوارہ نہیں کرسکتا ا لیے جب تک یہاں ہو کوشش کرنا میرے سامنے نہ آؤ ورنہ مجھے خود پر کنٹرول رکھنا بہت مش ہو جائے گا۔" انتہائی کرخت لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ کمرے سے نکل گیا تھا‘ پیچھے ا حسن‘ اپنے آنسو ضبط کرتی دیر تلک اسی کے بارے میں سوچتی رہی۔

❁❁❁

...ب کے قدرتی تازہ پھولوں سے سجے کمرے میں سر بہ... نیمی وہ عدنان ہمدانی کا انتظار ...ی جو اسے حاصل کرنے کے بعد فتح کے نشے میں سرشار اپنے دوستوں کے ساتھ ''موج ...ں مصروف تھا۔ شاہ زر اور انوشہ نے اس شادی میں بالکل سگے بھائی بھابی جیسا کردار ادا کیا ...ر جانے کیوں اسے ''ادریس شاہ'' بہت یاد آیا تھا بے شک وہ ایک مثالی بھائی تھا۔

...پنے خیالوں میں ڈوبی وہ ماضی کے ایک ایک لمحے کی یاد کو آنسوؤں میں پرو رہی تھی جب ...ے پر مدہم سی دستک کے بعد طلال ہمدانی صاحب کمرے میں چلے آئے۔

گوری کا دل اس لمحے بے ساختہ تیزی سے دھڑک اٹھا تھا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! جیتی رہو۔''

اس کے گھبرائے گھبرائے سے سلام کا جواب نہایت شفقت سے دیتے ہوئے وہ قریبی صوفے ... گئے تھے۔

''گوری بیٹے! میں بہت خوش ہوں آپ جیسی نیک سمجھ دار بچی، بہو بن کر میرے گھر میں آئی ... بے شک یہ سب عدی کی ضد اور پسند سے ہوا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اللہ ربّ العزت نے ...ت میں آپ کو اس گھر کی بہتری اور بھلائی کے لیے وسیلہ بنا کر بھیجا ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ کو ...ی کے بارے میں تھوڑی سی معلومات دے دوں۔'' کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے بولنا ...ع کیا تھا۔ گوری سر جھکائے سنتی رہی۔ ''وہ دل کا بُرا نہیں ہے مگر ماں کے وجود سے محرومی اور ...ے دوستوں کی کمپنی نے اسے بہت بگاڑ دیا ہے۔ اصل میں اس کی پیدائش پر ہی اس کی ماں انتقال ...ئی تھی۔ اسی لیے اسے وہ پیار اور توجہ نہیں مل سکی جو اسے درکار تھی۔ میں بھی اپنے کاروبار میں الجھا ... شاید اس کی غلط حرکتوں اور بدتمیزیوں کی وجہ سے ہی گھر میں کوئی بھی اسے پسند نہیں کرتا۔ بہت ...گے نکل گیا ہے وہ اپنی خودسری میں مگر...... مجھے یقین ہے آپ جیسی پیاری اور سمجھ دار لڑکی ضرور اپنی ...ت اور صبر سے اسے بدل کر رکھ دے گی، ہے ناں......؟'' وہ اس سے وہی امید باندھ رہے تھے جو ...شہ نے باندھی تھی۔ گوری کا سر آپ ہی آپ اثبات میں ہل گیا۔

''شاباش! اللہ آپ کو بہت خوش رکھے بیٹے! میں دیکھتا ہوں اسے۔'' اس کی یقین دہانی پر ...رے مطمئن و مسرور ہوتے ہوئے وہ اس کا سر پیار سے تھپتھپاتے کمرے سے نکل گئے تھے۔ گوری ...گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

رات کے تین بج رہے تھے۔ شدید مصروفیات کے باوجود اس نے آج کی بھی کوئی نماز قضاء ...ہیں کی تھی۔ اس کی روزمرہ روٹین میں صبح فجر کی نماز کے لیے بیدار ہونا اور پھر رات عشاء کی نماز ...ڑھ کر دیر تک قرآن پاک کا مطالعہ وظائف اور تسبیحات وغیرہ کرنا مشکل تھا۔

اس وقت اس کی آنکھیں نیند کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ تبھی وہ کمرے میں داخل ہوا ...تھا۔ عجیب سی سرشاری کے نشے میں چور آنکھیں جیسے گہرا سمندر بنی ہوئی تھیں۔ وہ دوبارہ سنبھل کر ...بیٹھ گئی۔

''کیوں...... خرید لیا ناں میں نے تمہیں؟'' بنا کسی سلام دعا کے کمرا لاک کرتے ہی وہ بیڈ پر

آ کر تر چھا لیٹ گیا تھا۔ گوری گھبرا کر مزید سمٹ گئی۔

"یہ اوقات ہے تم لڑکیوں کی' کوئی بھی مرد جب چاہے چٹکیوں میں مسل کر پھینک سکتا ہے تمہیں۔" حقارت سے کہتے ہوئے اس نے گوری کی کلائی تھامی تھی اور ایک ہی پل میں آدھ درجن چوڑیوں کو توڑ کر بیڈ پر بکھیر ڈالا تھا' گوری اس وحشت پر سسک کر رہ گئی تھی۔

"یہ انجام ہوگا تمہارا یاد رکھنا۔"

"کوئی پروا نہیں...... اسلام میں بیوی پر شوہر کے بہت سے حقوق فرض ہیں' اگر وہ ان کا خیال نہ رکھے تو گناہ گار ٹھہرا دی جاتی۔ ہے آپ بھی میرے شوہر ہیں۔ ایسے شوہر جنہیں میں نے صرف اپنے ربّ کی رضا کے لیے اپنایا ہے۔ میں اب بھی بکی نہیں ہوں' منسوب ہوئی ہوں آپ کے نام سے۔ وہ بھی پوری عزت اور وقار کے ساتھ۔ اب ایک رات تو کیا ساری راتیں ہی آپ کی امانت ہیں' وہ بھی کسی قیمت اور معاوضے کے بغیر۔"

"بہت بولنا آتا ہے تمہیں مگر جلد بھول جاؤ گی۔ کیونکہ مجھے چڑ چڑ زبان چلاتی لڑکیاں بالکل پسند نہیں ہیں اور ہاں اپنے ربّ کی رضا اور خوشنودی کے لیے جو رشتہ تم نے مجھ سے بنایا ہے وہ رشتہ بہت مہنگا پڑنے والا ہے تمہیں۔"

"جانتی ہوں' مگر آپ نہیں جانتے جو کچھ اب تک میں نے برداشت کیا ہے' اس کے بعد اب کوئی بھی طوفان آئے مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

"اچھا' چلو پھر تم بھی کیا یاد کرو گی کہ کس کے نصیب میں لکھی گئی تھیں۔" ذرا سا مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے گوری کی گردن میں پڑا نیکلس کھینچ لیا تھا۔ "بہت تشنگی ہے میرے اندر' بہت سے طوفان ہیں' کیا کیا برداشت کرو گی؟ کس کس خلا کو حوصلے اور صبر سے فِل کرو گی؟ جو آگ میرے اندر دہک رہی ہے اس آگ میں جل کر راکھ نہ ہو جاؤ تو کہنا۔" وہ نشے میں تھا' گوری کا وجود جیسے سُن ہو گیا۔

"آپ کی یہ نفرت اور وحشت میرے ارادوں کو کمزور نہیں کر سکتی۔"

"اچھا...... چلو کرو برداشت پھر یہ نفرت اور وحشت۔" سرد لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اٹھا کر بیڈ سے نیچے پھینکی تھیں۔ اگلی صبح وہ بیدار ہوا تو بہت فریش تھا مگر گوری کے لبوں کو چپ لگ گئی تھی۔ اسے لگا وہ واقعی اس طوفان کا سامنا زیادہ دن نہیں کر سکے گی۔ انسانیت کے دائرے سے نکلا وہ شخص واقعی نفرت کے قابل تھا مگر نفرت اس مسئلے کا حل نہیں تھی۔

اسے ضبط کرنا تھا۔ اپنے صبر اور ہمت کو آزمانا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اس کی فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی تبھی قدرے شکستگی سے بستر چھوڑتے ہوئے وہ نیا لباس اٹھا کر واش روم میں گھس گئی۔

❀❀❀

سفر آسان لگتا تھا
دل برباد تجھ کو یہ سفر آسان لگتا تھا
اِدھر تو سوچتا تھا اور اُدھر
آنکھوں سے کوئی خواب چہرہ آن لگتا تھا

مگر خوابوں میں رہنا
خواب جیسی بے حقیقت
خوشبوئے صحرا میں رہنا ہے
کناروں سے جو ہو محروم
اس دریا میں رہنا ہے
دل برباد ہم نے تو کہا تھا
یہ سفر آسان لگتا ہے مگر
آئینہ سے بدن سے چھین لیتا ہے

''گڈ مارننگ مائی ڈیئر وائف!'' نمازِ فجر کی قضا پڑھنے کے بعد وہ آج ولیمے کی تقریب کے لیے سوٹ کا انتخاب کر رہی تھی، جب وہ کمبل پرے ہٹاتے ہوئے بستر سے نکل آیا۔

''السلام علیکم..... صبح بخیر!'' اس کے حصار باندھنے پر بہت نرمی سے اس نے جواب دیا تھا، جواباً وہ چڑ گیا۔

''آج ولیمے کی تقریب ہے اور آج کی تقریب کے لیے تم میری پسند کا سوٹ پہنو گی، سمجھیں.....؟'' بنا اس کے سلام کا جواب دیئے اس نے وارڈ روب کا پٹ کھولا تھا۔ وہ خاموش رہی۔

''یہ ساڑھی ہے آج کے لیے تم یہی پہنو گی۔''

سیلولیس، بلاؤز اور گہرے گلے کے ساتھ وہ ساڑھی جسم کو ڈھانپنے کے لیے نہیں، مزید نمایاں کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ وہ ایک نظر ساڑھی پر ڈالتی عدنان کو دیکھنے لگی۔

''میں آپ کی عزت ہوں، آپ کے نام سے منسوب ہوں۔ لباس پہننے کے بعد اگر وہاں تقریب میں سیکڑوں لوگ میرے وجود کی نمائش سے لطف اٹھائیں گے تو یہ آپ کے لیے ذلت کا باعث ہوگا' میرے لیے نہیں۔''

''جسٹ شٹ اپ! ہر وقت وعظ سنانے کے موڈ میں نہ رہا کرو۔ یہ میرا گھر ہے اور یہاں تم وہی کرو گی جو میں چاہوں گا' سمجھی تم.....'' عقل و دانش و ہدایت سے دور وہ شخص ابھی اس کی بات سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ گوری جان گئی کہ اس وقت اس سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں' لہٰذا خاموشی سے ساڑھی اس کے ہاتھ سے تھام لی۔

ولیمے کی تقریب میں اس کا حُسن دیکھنے لائق تھا۔

شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں تقریب ارینج کی گئی تھی۔ شام میں جس وقت تیار ہو کر وہ کمرے سے نکل رہا تھا' گوری نے جانے کیا سوچ کر اپنی آنکھوں سے کاجل نکالا اور عدنان کے کان کے پیچھے نظر کا ٹیکہ لگا دیا۔

اس کی اس حرکت پر وہ سُن رہ گیا تھا۔

اس وقت بھی دوستوں کے سنگ وہ خاصا الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ انوشہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی پھر بھی وہ گوری کے ساتھ بیٹھی جانے اسے کیا کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چاند اماں دونوں بے حد مسرور تھے۔

شاہ زر' سرزمان اور ان کی وائف سارا کے ساتھ بیٹھا باتوں میں مصروف تھا۔ جب کہ طلال ہمدانی اپنے دوستوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ عفان اور ان کی مسز کے بھی اپنے ہی مہمان تھے۔ عدنان نے دیکھا گوری نے ساڑھی کا پلو' سر اور سینے پر یوں سیٹ کر رکھا تھا کہ ان کی زینت چھپ گئی تھی۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ زاویہ چپکے سے آ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''تم نے تو کہا تھا کہ تم شادی کی پوزیشن میں نہیں ہو۔''

''ہوں......شادی کب کی ہے ایویں ضد پوری کی ہے۔''

''بکواس! صاف کہو کہ اس لڑکی کے پردے پر مر مٹے ہو۔ لاکھ ماڈرن بنو مگر حقیقت میں تم بھی ایک روایتی مرد ہو۔ جسے لبادے میں لپٹی عورت اچھی لگتی ہے' خواہ اندر سے وہ جتنی بھی داغ دار ہو۔''

''جسٹ شٹ اپ زاویہ! کسی کے باپ کا خریدا ہوا غلام نہیں ہوں میں کہ وہ جو چاہے باتیں سنا کر چلتا پھرے۔ میری اپنی زندگی ہے اور میں وہی کرتا ہوں جو مجھے اچھا لگتا ہے بس۔'' ایک پل میں تپ کر کہتا وہ اٹھ گیا۔ زاویہ ضبط سے لب کاٹتی بیٹھی رہ گئی۔

رات اڑھائی بجے کے قریب' تقریب کا اختتام ہوا تھا۔ گوری نے گھر پہنچتے ہی وضو کیا اور جائے نماز پر کھڑی ہو گئی۔ اپنے حقیقی مالک کے حضور سر بہ سجود ہونے کے بعد وہ ہمیشہ بہت سکون محسوس کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ دعا میں ہاتھ اٹھائے رو رہی تھی جب وہ کمرے میں چلا آیا۔

''بڑی ڈھیٹ ہو تم! اتنی تھکن اور مصروفیت کے باوجود یہ کام نہیں بھولیں۔'' بیڈ پر گرتے ہی اس نے استہزائیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ گوری نے جائے نماز سمیٹ دی۔

''یہ کام نہیں ہے' ایک مسلمان کا فرض ہے۔ اللہ رب العزت کی ہزار ہا نعمتوں کے جواب میں اس کی واحدنیت کو تسلیم کرنے کا فرض۔''

''اچھا......! تم کیا سمجھتی ہو' وہ جو سارے جہان کا مالک ہے' اسے اپنا آپ تسلیم کروانے کے لیے تم جیسی بناوٹی لڑکیوں کے ان سجدوں کی ضرورت ہے؟''

''نہیں! وہ اپنی رحمتوں اور قدرتوں کے ساتھ ابد سے ہے اور ازل تک رہے گا۔ کوئی اس کے وجود کو تسلیم کرے یا نہ کرے اسے فرق نہیں پڑتا مگر جس انسان کو اس نے اشرف المخلوقات بنا کر دنیا میں بھیجا ہے' اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے رب العزت کی اطاعت کرے' اس کے حکم پر سر جھکاتے ہوئے اس کا فرماں بردار رہے۔''

''بس......آج کے لیے اتنا لیکچر کافی ہے۔'' وہ کہتے ہوئے اس کا بازو پکڑ کر بیڈ پر گرا لیا تھا۔

''ساڑھی کیوں اتاری؟'' اب وہ تفتیش پر اتر آیا تھا۔ گوری نے رخ پھیر لیا۔

''نماز پڑھنی تھی مجھے اور وہ لباس نماز کے لیے مناسب نہیں تھا۔''

''نماز......نماز......نماز......تنگ آ گیا ہوں میں تمہاری اس فضول اداکاری سے۔ تم کیا سمجھتی ہو یوں مومنہ بننے کا دکھاوا کر کے تم میری نظروں میں اپنا مقام بنا لو گی۔ مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دو گی کہ تم اچھی لڑکی ہو۔''

''نہیں!'' وہ جتنا ڈسٹرب ہوا تھا گوری کے لہجے میں اتنا ہی ٹھہراؤ تھا۔ ''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا اس بات سے کہ آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں مگر مجھے اس بات سے بہت فرق پڑتا ہے کہ اپنے مالک کی نظر

میں' میں کیا ہوں۔"

"چپ کرو! چلو مووی دکھاتا ہوں تمہیں ایک لڑکی کی' کیا یاد کرو گی تم بھی کہ کس ماڈ شوہر سے واسطہ پڑا ہے۔" اسے ایک بازو میں دبوچے دوسرے ہاتھ سے اس نے لیپ ٹاپ آن کیا تھا۔

"دیکھو ذرا! کیا کمال کی لڑکی ہے۔ پورے پندرہ دن اپنے گھر والوں کو ڈاج دے کر یہ میرے ساتھ ہوٹل میں رہی تھی۔ یہ مووی بھی اس کی رضا سے بنائی تھی میں نے۔ یہ ہوتی ہے زندگی' زندگی کا اصل مزہ انجوائے' تھرل......"

"کب تک......؟" صرف ایک نظر اسکرین پر ڈالنے کے بعد اس نے نگاہ پھیر لی تھی۔ عدنان اب مووی انجوائے کرنے لگا۔

"جب تک زندگی ہے۔ سانس چلتی ہے تب تک......"

"اور اس کے بعد؟"

"بعد کی بعد میں سوچیں گے۔"

"یہی تو گمراہی ہے۔"

"چپ! اب اگر تم نے کوئی فضول لیکچر شروع کیا تو قسم سے مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔" وہ راہِ حق کا مسافر تھا۔ ابھی اسے ہدایت کی دولت ودیعت نہیں ہوئی تھی تبھی بنا سوچے سمجھے کچھ بھی بول رہا تھا۔ گوری نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

اس کی زبان پر استغفار کا ورد جاری تھا۔ عدنان نے مووی کی آواز کا والیم مزید بڑھا دیا۔ وہ ضدی' خود پسند اور عیاش شخص تھا۔ اس نے آہستہ سے پلکیں موند لیں۔

"یہ مشاغل ہیں میرے' ایسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ تم بھی ان جیسی بنو گی' دیکھ لینا...... کہتے ہیں ناں جو شخص جیسا ہوا سے ویسا ہی ہم سفر ملتا ہے اگر میں عیاش ہوں تو تم پارسا کیسے ہو سکتی ہو؟" اپنی دھن میں بولتے ہوئے اس نے جونہی نگاہ پھیری' گوری کی بند پلکوں سے ٹوٹتے آنسوؤں کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ایک منٹ' دو منٹ' تین منٹ۔ وہ لڑکی اپنے ربّ کی محبت اور فرماں برداری میں کتنی ثابت قدم تھی۔ اسے لگا جیسے مووی میں ایک دم سے اس کی دلچسپی ختم ہو گئی ہو۔ اگلے ہی پل قدرے بدمزہ ہو کر اس نے لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کر دیا تھا۔

❀❀❀

واصف علی ہمدانی نے صاعقہ کی فرمائش پر اسے خوب صورت گھر مہیا کر دیا تھا۔

صائمہ بہت خوش تھی مگر سمعان کے لبوں پر لگا قفل یہاں آ کر بھی نہیں ٹوٹا تھا۔ ایان کی لاتعلقی اور آمنہ کی غیر متوقع بے وفائی نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ تاہم اس کی ماں کی صحت سنبھل گئی تھی۔ چھوٹے دونوں بھائیوں کی تعلیم کا ٹوٹا ہوا سلسلہ بھی دوبارہ بحال ہو گیا تھا۔ صرف ایک دل کی اداسی پر ان سب اپنوں کی خوشی بھاری پڑ رہی تھی۔

واصف علی ہمدانی نے اسے مایوس نہیں کیا تھا اور اب وہ بھی اسے مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

واصف کے ساتھ چند روز پیش تر ایک ریسٹورنٹ میں اس نے عباد کو دیکھا تھا۔ اپنی منگیتر ہادیہ کے ساتھ۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھا وہ شخص اسے صدیوں کے فاصلے پر بیٹھا محسوس ہوا تھا۔

کتنی خوش تھی وہ لڑکی اس کی ہمراہی میں جو اس کے نام سے منسوب تھی مگر کتنی اکیلی ہو کر رہ گئی تھی......

کاش محبت دولت کے عوض ملتی تو وہ لاکھوں کروڑوں لٹا کر اس شخص کو خرید لیتی جو اس کے لیے کُل کائنات تھا۔ جسے کھونے کے بعد وہ بالکل اجڑ کر رہ گئی تھی مگر وہاں محبت دولت کے عوض نہیں تھی۔

اس نے واصف پر اپنا درد ظاہر کیے بنا وہاں سے فوری فرار چاہا تھا مگر ایک اور رات کو اس شخص کی یادوں کے عذاب لائے، خود پر مسلط ہونے سے نہیں روک سکی تھی۔

❁❁❁

دردرویہ' الجھا لہجہ
کھوئی آنکھیں' ٹھنڈے ہاتھ
بے رنگ چہرہ' بداخلاق
دیکھو تم بن کون ہوں ''میں''

''بُریرہ!'' تیز بارش میں سڑک کے کنارے، سنگی بنچ پر بیٹھی بارش کی سرد بوندوں کو ہتھیلی پر جمع کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب شاہ زر نے اسے پکارا' وہ آج صبح ہی ارجنٹ کام کے سلسلے میں انگلینڈ آیا تھا۔ بُریرہ مانوس پکار پر چونکی اور پھر جیسے ساکت رہ گئی تھی۔

کس دیدہ دلیری سے اس کی محبت کا مجرم' خود چل کر کٹہرے میں آ گیا تھا۔ اٹھ کر کھڑی ہونے کی کوشش میں وہ لڑکھڑا کر رہ گئی تھی۔

''اتنی تیز بارش میں بنا چھاتے کے بیٹھی ہو' مرنے کا ارادہ ہے؟'' کس درجہ اپنائیت سے اس نے سوال کیا تھا۔ بُریرہ کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ یوں ٹپکا جیسے صدیوں سے خشک ہوئی جھیل میں بارش کا کوئی قطرہ گرا ہو۔ سامنے کھڑے اس شخص کے فراق میں وہ کیا سے کیا ہو کر رہ گئی تھی مگر وہ شخص ذرا نہیں بدلا تھا۔ بُریرہ کے اندر کوئی سسک اٹھا۔ اس سے بڑھ کر بھلا محبت کی توہین اور کیا ہو سکتی تھی؟

''جن کے اندر دوزخ دہک رہے ہوں انہیں تیز بارش کی سرد بوندیں کچھ نہیں کہتیں۔'' ڈبڈبائی آنکھوں سے بمشکل اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا' جواباً وہ قریب آ گیا۔

''کیا تم ابھی تک اسی دکھ کے حصار میں ہو بری! خدا کا واسطہ ہے تمہیں اس دکھ سے نکل آؤ' مجھے لگتا ہے انوشہ رحمٰن کے بعد میں تمہاری بددعاؤں کی زد میں آ کر بے سکون ہو گیا ہوں پلیز مجھے معاف کر دو بری پلیز!'' اس شخص کو اب بھی اس کے درد کا احساس نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے سکون کے لیے آیا تھا۔ وہ رو پڑی۔

''ہرگز نہیں! تم منافق ہو شاہ زر آفندی! محبت کا جھانسہ دے کر میرے دل کی نگری برباد کی ہے تم نے' میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی' کبھی نہیں......''

کیا تھا وہ شخص ساری عمر اس کے سامنے نہ آتا' وہ پھر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے سے بچ جاتی۔

''میں جانتی ہوں' تم نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی' تم مردوں کے لیے محبت یوں بھی دردِ سر نہیں ہے۔ جہاں جس موڑ پر جو اچھا لگا اپنا لیا' جو دل سے اتر گیا اسے پھینک دیا۔ چلتی گاڑی کی طرح ہر اسٹیشن پر' نئے مسافروں کی ضرورت ہوتی ہے تمہیں۔ مگر ہم لڑکیاں پھر بھی تم جیسے مردوں کی کھوکھلی

محبتیں قیمتی اثاثوں کی طرح سنبھال کر ساری عمر سینے میں چھپائے پھرتی ہیں۔ تم معافی تو کیا میری نفرت کے قابل بھی نہیں ہو۔" چلا کر کہتے ہوئے وہ پھر سے بنچ پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا سیل پرس میں پڑا تھا جانے اتنی تیز بارش میں وہ کام بھی کرتا ہے کہ نہیں۔ اس کے باوجود بُری طرح روتے ہوئے اس نے سیل نکالا اور سرمد کا نمبر پریس کر ڈالا۔

وہ ضروری میٹنگ کے لیے نکل رہا تھا' جب سیل پر بُریرہ کا نمبر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ ایک لمحے سے قبل اس نے اس کی کال پک کی تھی۔

"بری! کیا تم ٹھیک ہو؟"

"نہیں! میں ٹھیک نہیں ہوں، تم جہاں بھی ہو جلدی آ جاؤ پلیز......"

"اوکے! میں آ رہا ہوں' تم کہاں ہو؟"

"گھر کے پاس' روڈ پر......!"

"ٹھیک میں آ رہا ہوں۔" وہ رو رہی تھی۔ سرمد کی جان پر بن گئی تھی۔

کال ڈراپ ہوتے ہی وہ تیزی سے اٹھا تھا۔ قریب کھڑی سیکریٹری خاموش نہ رہ سکی۔

"سر! ابھی آپ میٹنگ کے لیے نکل رہے تھے' یہ میٹنگ ہماری کمپنی کو کروڑوں کا......"

"میں جانتا ہوں مس ندا! مگر ابھی جس شخص کو میری ضرورت ہے وہ کروڑوں نہیں اربوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے میرے لیے' اوکے۔" اپنے اسٹاف کے ساتھ ہمیشہ خوش باش رہنے والے اس شخص کا لہجہ اس لمحے کتنا سرد تھا۔ سیکریٹری دوبارہ کچھ کہنے کی جسارت نہ کرسکی۔ اگلے پندرہ منٹ میں وہ متعلقہ روڈ پر تھا۔

"میں تم سے نفرت نہیں کرتی شاہ زر آفندی! بلکہ مجھے کراہیت آتی ہے تم سے۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں' اب زندگی میں کبھی میرے سامنے مت آنا ورنہ یا تم اس دنیا میں نہیں رہو گے یا میں۔" سیل بیگ میں رکھتے ہوئے وہ پھر کھڑی ہوئی تھی' عین اسی لمحے سرمد وہاں پہنچا تھا۔ جونہی اس نے گاڑی سے قدم باہر رکھا' بُریرہ سرعت سے اس کی طرف لپکی اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رو پڑی۔

"بری! کیا ہوا ہے؟" حیران و پریشان سا ایک نظر خاموش کھڑے شاہ زر پر ڈالتا' وہ اس کے لیے متفکر ہوا تھا۔ وہ روتی رہی۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں سرمد! بے حد' بے تحاشا' مجھے لے چلو یہاں سے پلیز۔" کتنی جذباتی ہو رہی تھی وہ اس لمحے۔ سرمد شاکڈ رہ گیا۔ جب کہ شاہ زر کے لبوں پر پھیکی سی مسکان بکھر گئی۔ اپنے درد کا بھرم رکھنے کا یہ بھی ایک اچھا انداز تھا۔

سرمد بنا اس پر دوسری نگاہ ڈالے قیمتی متاع کی مانند بُریرہ کو سنبھال کر گاڑی میں بٹھاتا ہوا وہاں سے چلا گیا مگر وہ دیر تک وہیں کھڑا رہا۔

کیسی عجیب کہانی تھی زندگی کی کہ اس نے جن دو لڑکیوں کو اپنی زندگی میں چاہا تھا' ان میں سے ایک کو بھی خوش نہیں رکھ سکا تھا۔

بارش مزید تیز ہو گئی تھی مگر اب وہاں سنگی بنچ پر بُریرہ رحمٰن نہیں' شاہ زر آفندی بیٹھا تھا۔

❁❁❁

انوشہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور چاند اس سے نوڈلز کے لیے ضد کر رہا تھا۔
وہ کافی دیر سے ٹالتی رہی پھر اس کے رونے پر بالآخر اٹھ کھڑی ہوئی کہ وہ اسی کے ہاتھ کے نوڈلز کی ضد کر رہا تھا۔
شاہ زر گھر پر نہیں تھا ورنہ اسے آؤٹنگ کے لیے باہر لے جاتا۔
اس وقت وہ کچن میں چاند کو نوڈلز بنا کر دینے کے بعد اپنے لیے چائے بنا رہی تھی جب وہ شدید تھکن کا شکار' سفری بیگ کندھے پر ڈالے گھر میں داخل ہوا تھا۔ لاؤنج چونکہ کچن کے سامنے ہی تھا لہٰذا بیگ وہاں رکھنے کے بعد وہ سیدھا کچن میں چلا آیا تھا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام پاپا! مما نے میرے لیے نوڈلز بنائے ہیں' آپ کھائیں گے؟'' چاند اسے دیکھ کر ہی خوش ہوا تھا۔ شاہ زر نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے ڈھیر سارا پیار کر ڈالا۔

''نہیں پاپا کی جان! آپ کھاؤ۔ مما، پاپا کے لیے کچھ اور بنا دیں گی۔'' اس کی تسلی پر وہ نوڈلز کا باؤل اٹھا کر لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے چلا آیا تھا۔

''کیا کر رہی ہو انوش!'' تھکے تھکے اداس لہجے میں وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ انوشہ نے لب بھینچ لیے۔

''کچھ نہیں!''

''کچھ تو کر رہی ہو' میں سمجھتا تھا تم مجھ سے نفرت کرتی ہو مگر میں غلط سمجھتا تھا۔ حقیقت میں تم مجھ سے نفرت نہیں محبت کرتی ہو۔ تبھی تو زبردستی میری بہن کو بھی اس گھر سے نکال باہر کیا تاکہ میری توجہ صرف اور صرف تم پر مرکوز رہے' ہے ناں؟'' صرف اسے تنگ کرنے کے لیے اس نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ دھرے تھے۔ جواب میں وہ تپ اٹھی۔

''میں نے جو کیا گوری کی بہتری اور بھلائی کے لیے کیا' سمجھے آپ۔''

''نہیں! میری بہتری اور بھلائی کے لیے کچھ کرو گی تو سمجھوں گا۔'' وہ اداس تھا مگر اس کے لہجے میں شرارت تھی' انوشہ نے رخ پھیر لیا۔

''آپ سفر سے آئے ہیں آرام کیجیے' میں اس وقت آپ کے منہ لگنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔''

''میں تو ہوں۔'' بنا اس کی تُرشی کو کوئی اہمیت دیئے اس نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ انوشہ کو لگا وہ آگ کی لپیٹ میں آ گئی ہو۔

''تم حد سے بڑھ رہے ہو شاہ زر آفندی!''

''کون سی حد؟ تمہیں بخار ہے پھر بھی کام کر رہی ہو' میرا انتظار کر لیتیں' میں بنا دیتا چاند کو نوڈلز۔''

''کیوں؟ وہ میرا بیٹا ہے مجھے اس کے کام کرتے ہوئے تکلیف نہیں ہوتی۔''

''صرف تمہارا بیٹا ہے؟''

انوشہ اس کا حصار توڑنا چاہ رہی تھی اور وہ اسے جیسے خود میں سمونا چاہ رہا تھا۔ گرم سانسوں کی

تپش سے انوشہ کے رخسار دہک اٹھے تھے۔

''اگر وہ صرف تمہارا بیٹا ہے تو پھر مجھ غریب سے اس درجہ نفرت کی وجہ۔'' وہ سرگوشی کر رہا تھا۔ انوشہ کو لگا جیسے وہ اپنے حواس میں نہ ہو۔ آج سے پہلے اس نے یہ انداز کبھی نہیں اپنایا تھا۔ وہ خود کو چھڑانے کے لیے جدوجہد کر رہی تھی جب اس نے اسے کندھوں سے پکڑتے ہوئے اپنے مقابل کر لیا۔

''انوش! تم مجھ سے نفرت کرتی ہو ناں' بالکل ٹھیک کرتی ہو۔ میں وہ شخص ہوں جو کسی کی نفرت کے قابل بھی نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ بھی تمہارے ساتھ کیا اس کے بعد اگر مجھ میں ذرا سی بھی غیرت ہوتی تو جا کر کہیں خودکشی کر لیتا مگر زندگی بھر تمہارے سامنے کبھی نہ آتا۔ مگر غیرت ہی تو نہیں ہے مجھ میں' کھیل سمجھتا ہوں محبت کو۔ زندگی مٹی کے گھروندے کی طرح ہے میرے لیے۔ جب جیسے چاہا بنالیا جب جیسے چاہا مٹالیا۔'' اداس آنکھوں میں جنون ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ سُن سی اسے دیکھے گئی۔

''بکواس کی تھی میں نے تم سے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یوں کرتے ہیں محبت کرنے والے؟ نہیں کرتا میں تم سے محبت' کوئی محبت نہیں کرتا میں تم سے۔ مگر اس کے باوجود تم دھڑکن بن کر میرے سینے میں دھڑکتی ہو۔ تمہاری آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں تو میرا جگر کٹتا ہے۔ تم نفرت سے منہ پھیرتی ہو تو میرے سینے میں سانس الجھنے لگتی ہے۔ میں تم سے محبت نہیں کرتا انوشہ! پھر بھی تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو میں تڑپ اٹھتا ہوں' پاگل کر دیا ہے تم نے مجھے' میں تمہیں دیکھنا نہیں چاہتا تھا' سوچنا نہیں چاہتا تھا پھر بھی تم ایک پل کے لیے نگاہ سے اوجھل ہوتی ہو تو میں مرنے لگتا ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں تم پتھر ہو مر جاؤں گا تم سے سر ٹکراتے ٹکراتے مگر پھر بھی میں باز نہیں آ رہا ہوں' کتنی سنگ دل ہو تم......''

وہ شخص واقعی اپنے حواس میں نہیں تھا۔ انوشہ کا وجود جیسے برف ہو گیا۔ ''تم مجھ سے نفرت میں حق بجانب ہو انوش! مگر میں تھک گیا ہوں' سہارے ڈھونڈتا ہوں خود کو مضبوط کرنے کے مگر تم تک پہنچتے ہی تھک کر گر جاتا ہوں' ہار جاتا ہوں۔'' جانے وہ شخص کہاں سے ہو کر آیا تھا۔ برف ہوئے وجود کے ساتھ انوشہ نے اس کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹائے تھے جب شاہ زر نے اس کی کلائی تھام لی۔

''آئی لو یو انوشہ! آئی لو یو سو مچ۔'' بھرپور شدت کے ساتھ کہتے ہوئے اس نے انوشہ کی کلائی پر دباؤ بڑھایا تھا جواب میں کرچ کرچ کی آواز کے ساتھ کئی چوڑیاں ٹوٹ کر زمین پر بکھر گئیں۔ وہ شخص واقعی پاگل ہو چکا تھا۔

''سوری......'' انوشہ کی کلائی پر خون دیکھ کر وہ شرمندہ ہوا تھا پھر اگلے ہی پل پلٹ کر کچن سے نکل گیا۔ تاہم انوشہ بنا درد کا احساس کیے پتھر بنی وہیں کھڑی رہی تھی۔

❋❋❋

سانول شاہ کی کوششوں سے حکومت نے گاؤں شاہ والا میں موجود اسپتال کی تعمیر نو کی منظوری دے دی تھی۔ سانول خود اپنی نگرانی میں یہ کام کروا رہا تھا' گاہے بگاہے اس کے شہر کے چکر بھی لگتے رہتے تھے۔ انزلہ کے لیے وہ شہر میں بہت خوب صورت گھر تعمیر کروا رہا تھا جس کی نگرانی اس کے ایک

دوست کے سپرد تھی۔ بہت دنوں پہلے اس نے انزلہ کو میران شاہ کے بارے میں تفصیلاً بتادیا تھا۔
اس وقت شاہ والا میں تیز بارش ہورہی تھی اور وہ جو مزدوروں کو ہدایات دے رہا تھا ایک نظر آسمان کو دیکھتا اپنے ڈیرے کی طرف چلا آیا جو اس کے بڑے بھائی کی گاؤں سے اچانک ہجرت کے بعد اس کے قبضے میں آ گیا تھا۔
پچھلے دنوں اس کے بڑے بھائی پر فالج کا اٹیک ہوا تھا جس کے بعد اس نے گاؤں سے ہجرت کر لی تھی۔ وقتِ رخصت وہ اس سے ملنا چاہتا تھا مگر سانول نے اس سے ملنا گوارہ نہیں کیا' صرف انزلہ کی وجہ سے اس نے اسے زندہ چھوڑ دیا تھا ورنہ اب تک گاؤں شاہ والا میں ایک قبر ضرور بنتی' اس کے بڑے بھائی کی یا پھر خود اس کی......
موسم کی مناسبت سے انزلہ نے اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے پکوڑے بنائے تھے' آس پاس کے گھروں سے سوجی کے حلوے کی سوندھی سی خوشبو الگ دل للچارہی تھی مگر اتنا وقت نہیں تھا۔ کل رات کنیز بیگم نے اس سے بات کی تھی' وہ ٹھیک نہیں تھیں اس لیے اسے اپنے پاس بلا رہی تھیں۔ انزلہ خود بھی ان سے ملنا چاہ رہی تھی تا کہ بہزاد علی مراد کی بجائے انہیں سانول شاہ کے لیے رضامند کرے اسی لیے اس نے دادی ماں کے ساتھ انگلینڈ آنے کی ہامی بھر لی تھی اور اب یہی بات اسے سانول سے شیئر کرنی تھی۔
دادی ماں کے پاس کچھ خواتین بیٹھی تھیں لہٰذا موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ پکوڑوں کی پلیٹ کے ساتھ گھر سے نکل آئی۔ وہ جانتی تھی سانول اس وقت اپنے ڈیرے پر ہی ہوگا تبھی کچے راستوں کے کیچڑ سے بچتی وہ اسی راہ پر گامزن ہوگئی تھی۔
کچے راستوں پر بارش کا پانی کھڑے ہوجانے کے باعث اسے چلنے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی' پاؤں میں سادا چپل تھی پھر بھی کئی جگہوں پر وہ پھسلتے پھسلتے بچی تھی۔ سانول بڑی دور سے اسے آتے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ڈیرے کے قریب پہنچ کر اس نے اچانک سر اٹھا کر سانول کو دیکھا اور اگلے ہی قدم پر پھسل کر پکوڑوں کی پلیٹ سمیت دھڑام سے زمین پر آ گری۔
سانول جو اس کی حالت سے لطف اٹھا رہا تھا اسے یوں عین نگاہوں کے سامنے زمین بوس ہوتے دیکھ کر کھلکھلائے بغیر نہ رہ سکا۔
''شرم کرو کچھ' بجائے اس کے کہ آگے بڑھ کر تم مجھے سہارا دیتے۔ میرے گرنے پر کھڑے ہنس رہے ہو؟'' اس کے کپڑے تو خراب ہوئے ہی چہرے پر بھی کیچڑ لگ گیا۔ سانول کا ہنس ہنس کر برا حال ہوگیا۔
''اُف! پہلی بار کسی بندریا کو یوں زمین چاٹتے دیکھا ہے۔''
''کیا! میں بندریا ہوں...... میں بندریا ہوں تو تم خود کیا ہو' بندر کہیں کے۔'' خود ہی ہمت کرتے ہوئے وہ کہنی کی مدد سے زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''چلو تم بندریا! میں بندر' پورا جنگل بنائیں گے یہاں۔''
''بنانے کی کیا ضرورت ہے پہلے ہی کسی جنگلی سے کم نہیں ہو اور مجھے پورا یقین ہے' تمہارے بچے بھی ایک نمبر کے جنگلی ہی ہوں گے۔''

''اوہیلو! مجھے جو کہنا ہے کہو مگر میرے مستقبل میں آنے والے معصوم بچوں کی شان میں کوئی گستاخی کی تو معاف نہیں کروں گا۔''

''مت کرنا' میں معافی مانگ بھی نہیں رہی۔'' دوپٹے سے منہ صاف کرتے ہوئے اس نے بے نیازی جتائی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔

''تمہاری تو اس موسم میں جان جاتی ہے پھر اب کیسے نکل پڑیں گھر سے؟''

''بس دماغ خراب ہوگیا تھا' سوچا تم جیسے اسٹوپڈ شخص کے لیے اتنے اچھے موسم میں اپنے ہاتھ سے پکوڑے بناؤں اور پھر کھلا کر آؤں' یہی ہمدردی الٹی پڑ گئی۔''

''کاش! ہمدردی کی جگہ تم محبت کا لفظ استعمال کرلیتیں۔'' ایک نظر کیچڑ کی نذر ہوئے پکوڑوں پر ڈالتے ہوئے اس نے مصنوعی تاسف سے کہا تو انزلہ نے زور کا مکا اس کے شانے پر رسید کیا۔

''انگلینڈ جارہی ہوں میں' تمہاری جان چھوڑ کر۔''

''شکر! تمہیں خیال تو آیا۔''

''میں مذاق نہیں کررہی قیس! میں واقعی کچھ روز کے لیے انگلینڈ جارہی ہوں۔'' اس کے سنجیدگی سے کہنے پر وہ جو مسکرا رہا تھا فوراً سنجیدہ ہوگیا۔

''کیوں......؟''

''مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' بلا رہی ہیں مجھے۔ میں خود بھی جانا چاہ رہی ہوں تاکہ مما کی رائے تمہارے لیے ہموار کرسکوں۔'' اس کی وضاحت پر وہ پلٹ گیا تھا' تبھی انزلہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تمہیں میرا یقین ہے ناں قیس! تمہیں پتا ہے ناں تم میرے لیے کیا ہو؟''

''ہاں! مگر زندگی کا بھروسا نہیں۔''

''اُف! میں ہمیشہ کے لیے تو نہیں جارہی' صرف چند دنوں کی بات ہے' پھر یہی ہم ہوں گے اور یہی ہمارے گاؤں کے مسائل۔''

''تمہیں یقین ہے تم واپس آؤ گی؟''

''ہاں!''

''مجھے یقین نہیں ہے۔''

''کیوں! تمہیں کیا لگتا ہے' کیا میں وہاں جا کر بدل جاؤں گی' بھول جاؤں گی تمہیں؟''

''ہاں!''

''نہیں قیس! انزلہ شاہ مرسکتی ہے مگر اپنے عہد سے پھر نہیں سکتی۔''

''پھر بھی میں چاہتا ہوں تم نہ جاؤ' پتا نہیں کیا چیز ہے جو مجھے اندر سے کاٹ رہی ہے' پریشان کررہی ہے۔''

''تم پاگل ہو اور کچھ نہیں......'' سانول شاہ کے بالوں کو شرارت سے بکھیرتے ہوئے وہ ہنسی تھی۔

''ابھی تو میں نے تمہیں بہت تنگ کرنا ہے۔ تمہیں پتا ہے جب ہماری شادی ہوجائے گی تو میں روایتی بیوی بن کر خوب جھگڑے کیا کروں گی تم سے۔ تم لیٹ گھر آؤ گے تو جھگڑا...... کسی سے

پھڈا کرو گے تو جھگڑا...... بچوں کو ڈانٹو گے تو جھگڑا...... عاجز آ جاؤ گے تم مجھ سے اور کہو گے الل
کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے تم جیسی اسٹوپڈ لڑکی سے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔"

"تم واپس آؤ گی ناں انزلہ......؟" ہنستے ہوئے اپنی دھن میں وہ جانے کیا کیا بول رہی تھی جب سانول نے اسے کندھوں سے تھامتے ہوئے اپنے مقابل کرلیا۔ اس کی آنکھوں سے اس لمحے جیسے خون ٹپک رہا تھا۔ وہ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا ہے قیس! تم ٹھیک تو ہوناں......؟"

"مجھے چھوڑو...... میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو؟"

"ہاں! میں واپس آؤں گی تمہارے لیے' اپنے قیس کے لیے۔ یہ درخت یہ پتے' یہ مٹی یہ س گواہ ہیں قیس! وہ دیکھو وہ نہر کا بہتا شفاف پانی' وہ گواہ ہے۔ انزلہ واپس آئے گی' پھر کبھی کہیں نہ جانے کے لیے......" اس کی روشن' ذہانت سے چمکتی آنکھوں میں گہرا یقین تھا' محبت تھی' تڑپ تھی۔ ا رخ پھیر گیا۔

"اپنا عہد یاد رکھنا انزلہ! مت بھولنا کہ میں نے صرف تمہارے لیے اپنے اندر کے جانور کو مار اپنے اندر ہی سلا لیا ہے۔ مت بھولنا کہ تم میرے لیے زندہ رہنے کا واحد مقصد نہیں' واحد وجہ ہو۔"

"نہیں بھولوں گی' بس تم میرا انتظار کرنا۔" سانول کا ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے اپنا سر اس کے مضبوط کندھے پر ٹکا دیا تھا۔ وہ مضطرب سا کھڑا لب دباتے ہوئے' افق کے اس پار غروب ہوتا سورج کو دیکھتا رہا۔

❋❋❋

اب بھی شاعر رہوں' کس کی خاطر رہوں......
کون ہے جو میرے لفظ و معنی کی آنکھوں سے بہتے......
آنسوؤں میں چھپے درد چنتا پھرے......
خواب بنتا پھرے......
کون آنکھیں میری دیکھ کر یہ کہے
کیا ہوا جانِ جاں' کب سے سوئے نہیں
اس سے پہلے تو تم اتنا روئے نہیں
اب بھلا کس لیے......؟
خوب صورت سی آنکھیں پریشان ہیں
اپنی حالت پہ خود اتنی حیران ہیں
کون بے چین ہو' کون بے تاب ہو
موسم ہجر کی شام تنہائی میں' آبلہ پائی میں
کون ہو ہمسفر' گرد سے راہ گزر
کوئی رستہ نہیں' کوئی راہی نہیں
در پہ دستک کی کوئی گواہی نہیں

دل کے ویران و برباد صفحات پر
جس قدر لفظ لکھے تھے بیکار ہیں
ایک لمبی جدائی کے آثار ہیں
سوچتا ہوں کہ اب ان خیالوں سے خوابوں سے باہر رہوں
کیوں میں شاعر رہوں' کس کی خاطر رہوں

نفرت ہو یا شہرت...... دونوں ہی کی زیادتی انسان کو تھکا دیتی ہے۔ وہ بھی تھکنے لگا تھا۔ مسلسل دعائیں رد ہونے لگیں تو انسان خدائے پاک و برتر کی ذات سے مایوس ہونے لگتا ہے' تو ایک لڑکی تھی' انسان تھی۔

وہ ہارنے لگا تھا۔ انوشہ رحمٰن کی بے جا نفرت سے تھکنے لگا تھا۔

وہ محسوس نہیں کرنا چاہتی تھی مگر نا چاہتے ہوئے بھی اسے شاہ زر کا بدلنا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بہت ہو کر رہ گیا تھا۔ ہر وقت کام' کام اور بس کام...... انوشہ رحمٰن کو تنگ کرنا تو دور اس نے ضرورت لیے بھی اسے دیکھنا' اس سے بات کرنا چھوڑ دیا تھا۔

اب اکثر وہ رات کو دیر سے گھر واپس آتا اور صبح بنا ناشتہ کیے آفس کے لیے نکل جاتا۔ چاند روز کا انتظار کرتا سو جاتا تھا مگر وہ روز صبح ناشتے سے پہلے اسے پیار کر کے منا لیتا۔ رات میں آفس واپسی کے بعد بھی وہ اسے انوشہ کے پہلو سے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے جاتا اور پھر صبح وہ اسی ساتھ بیدار ہوتا۔

مگر...... یہ روٹین بھی زیادہ دن برقرار نہیں رہی تھی۔

نظر کے سامنے ایک ہی گھر' ایک ہی چھت تلے رہ کر اس لڑکی سے بے نیاز رہنا' بہت تکلیف تھا۔ تبھی وہ پیرس چلا آیا تھا۔ اس شہر کی خوب صورتی اور اداسی ہمیشہ اسے اپنے حصار میں جکڑ لیتی تھی۔

اکثر یہاں آ کر وہ اپنے سارے غم بھول جایا کرتا تھا۔

اب بھی وہ پچھلے تین ہفتوں سے یہاں تھا اور یہ تین ہفتے بے تحاشا مصروفیت کے ساتھ' گھر بھی پر اس نے ساری ساری رات سگریٹ کے ساتھ اپنا دل جلا کر بسر کیے تھے۔ چاند روزانہ اس سے فون پر بات کرتا تھا اور اسے واپس آنے کی تاکید کرتا تھا' مگر...... وہ روز اس سے وعدہ کر کے اپنے وعدے سے پھر جاتا۔

پچھلے تین ہفتوں میں اس نے بھول کر بھی انوشہ کی آواز نہیں سنی تھی۔

اس روز چاند اس سے انوشہ کی شکایت کر رہا تھا کہ وہ اسے گھمانے پھرانے کے لیے باہر لے کر نہیں جاتی' اس کے ساتھ گھر میں بھی نہیں کھیلتی' اسے دوستوں کے گھر جانے بھی نہیں دیتی۔ شاہ زر اس کی شکایتوں اور معصومانہ انداز پر مسکرا رہا تھا۔ ابھی شاید اسے اور بھی شکایات شاہ زر تک پہنچانی تھیں کہ اچانک لائن ڈس کنکٹ ہو گئی۔ شاہ زر جانتا تھا کہ انوشہ نے چاند سے فون چھین کر لائن کاٹ دی ہے تبھی اس نے کال بیک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر چاند اب مچل رہا تھا' اسے اپنے قامت کے جیسی سائیکل چاہیے تھی اور انوشہ اس کی فرمائش پر کان نہیں دھر رہی تھی۔ اسی لیے وہ اپنے

باپ سے فرمائش کرنا چاہ رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ فوراً سے پیشتر اس کی فرمائش پوری کردے گا مگر......

یہاں بھی انوشہ نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔

وہ اب رو رہا تھا اور انوشہ پریشان نگاہوں سے قطعی بے بسی کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ جس سائیکل کے لیے وہ ضد کررہا تھا وہ ستائیس ہزار کی تھی اور انوشہ کے پاس اس وقت صرف پچیس ہزار روپے تھے۔ بیس ہزار روپے ابھی کل ہی اس نے کمیٹی کی نذر کیے تھے۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ چاند شاہ زر سے فرمائش کرے' اسے کچھ بتائے......اس کی غیر موجودگی میں چاند کی تمام تر ضروریات پوری کرنا وہ خود پر فرض سمجھتی تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے' وہ دیارِ غیر میں' اپنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے باپ سے فرمائش کرتا' اسے گوارہ ہی نہیں تھا مگر مسئلہ پیسوں کا تھا' صرف دو ہزار کے لیے وہ شاہ زر کے سامنے چھوٹی پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ تبھی اس نے چاند سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ اسے سائیکل خرید کردے گی مگر اس شرط پر کہ وہ اپنے پاپا سے فرمائش نہیں کرے گا۔ چاند نے فوراً سے پیشتر وعدہ کرلیا تھا۔

اگلے دو تین روز وہ سکون سے اسے ٹالتی رہی تھی۔ مہینے کا اختتام تھا اور اگلے ایک دو روز میں اسے تنخواہ مل جاتی تو وہ چاند کی فرمائش پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دو اپنی ضروریات کی اشیاء بھی خرید لیتی' مگر چاند میں اتنا صبر نہیں تھا' اس روز اس نے اسکول سے چھٹی کی تھی۔ انوشہ آفس گئی ہوئی تھی پیچھے سے شاہ زر کی کال آگئی' فون چاند نے ہی اٹھایا۔

''پاپا......کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں......؟''

شاہ زر کو ملازم سے بات کرنی تھی' وہ ائرپورٹ پر تھا' اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ چاند فون اٹھائے گا اور یہ بات کہے گا۔ تبھی حیرانی سے بولا تھا۔

''کیوں پاپا کی جان کیا ہوا......کیا مما نے کچھ کہا ہے؟''

''نہیں......مگر مما مجھے سائیکل لے کر نہیں دے رہیں۔''

''کون سی سائیکل......؟''

''وہ جو میرے دوست علی کے پاس ہے' اس کے پاپا نے اسے فوراً لے دی تھی۔''

''او......تو یہ بات ہے' ٹھیک ہے' پاپا ابھی پاکستان آرہے ہیں' کل میرے چاند کے پاس بھی وہی سائیکل ہوگی جو علی کے پاس ہے۔''

''پرامس......؟''

''پکا پرامس۔'' بڑی مشکل سے وہ چاند کو یقین دلانے میں کامیاب ہوا تھا۔

پیرس روانگی سے قبل اس نے ایک بلینک چیک سائن کرکے انوشہ کے تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا تاکہ اس کی غیر موجودگی میں وہ اپنی اور چاند کی ضروریات پوری کرسکے' مگر......اس خودسرانا کی ماری لڑکی نے شاید وہ چیک کیش کرانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔

سارے رستے وہ افسردہ رہا تھا۔

رات بارہ بجے کے قریب وہ گھر پہنچا تو انوشہ جاگ رہی تھی۔

"السلام علیکم......!"

وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ اچانک سامنے آئی تھی اور ٹھٹک گئی تھی۔

"وعلیکم السلام!"

"چاند سو گیا......؟"

"جی ہاں...... ابھی تھوڑی دیر قبل سلایا ہے اسے۔"

"ٹھیک ہے۔"

نظر اٹھا کر بنا اس کی طرف دیکھے' وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ انوشہ دیر تک وہیں کھڑی رہی۔ اگلی صبح سنڈے کے باعث وہ قدرے تاخیر سے بیدار ہوئی تھی۔

فریش ہو کر' ناشتہ تیار کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف آئی تو شاہ زر اس کے بستر میں لیٹا چاند کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

"پاپا...... علی کی بہن ہے ناں حمنہ' وہ اسے بہت پیار کرتا ہے' کل اس نے حمنہ کو اپنی سائیکل پر بٹھا کر سیر بھی کرائی تھی۔ میری بہن کیوں نہیں ہے......؟" کتنی حسرت سے وہ پوچھ رہا تھا۔ انوشہ وہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی تھی۔ خود شاہ زر بھی لاجواب ہو گیا تھا۔ تبھی وہ آگے بڑھی تھی۔

"چاند...... آپ کا ناشتہ تیار ہو گیا ہے چلو ناشتہ کرو۔"

"نہیں...... مجھے ناشتہ نہیں کرنا' مجھے پاپا کے ساتھ جا کر علی جیسی سائیکل لانی ہے۔"

"پاپا خالی پیٹ لے کر نہیں جائیں گے اور میں نے کہا تھا ناں آپ سے' میں آپ کو سائیکل لادوں گی۔" شاہ زر کے سامنے اسے علی پر غصہ آیا تھا مگر وہ بدک گیا۔

"نہیں' آپ نے جھوٹا پرامس کیا تھا' آپ بالکل بھی اچھی مما نہیں ہیں۔"

"چاند......" اسے جیسے دھچکا سا لگا تھا۔

اس کا بیٹا جس کے لیے وہ ساری صعوبتیں چپ چاپ جھیل رہی تھی' وہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ اچھی ماں نہیں ہے۔ شاہ زر کے سامنے یہ "شکست" کتنی تکلیف دہ تھی۔ اس کی آنکھیں یکلخت نم ہو گئیں۔

"چاند...... سوری بولو مما کو...... مما کے لیے ایسے نہیں کہتے۔"

شاہ زر کو اس کی تکلیف کا احساس ہوا تھا۔ تبھی اس نے فوراً بیٹے کو ڈانٹا تھا۔ وہ رخ پھیر گئی۔

"مگر پاپا...... مما اپنا کوئی پرامس بھی پورا نہیں کرتیں۔ علی کی مما اس کے لیے ہوسپٹل سے حمنہ کو لائی تھیں' مما میرے لیے ہوسپٹل سے گڑیا کیوں نہیں لاتیں......؟" اس کے اپنے گلے' اپنی شکایتیں تھیں' انوشہ ایک نظر اس پر ڈالتی کمرے سے نکل گئی تھی۔

وہ اس شخص کا بیٹا تھا' اسے ساری زندگی اسی کا رہنا تھا' وہ اپنی پوری زندگی بھی اس پر لٹا دیتی' تب بھی اسے شاہ زر آفندی کا بیٹا ہی رہنا تھا۔ وہ کبھی معتبر نہیں ہو سکتی تھی اور یہی سوچ اسے رلا رہی تھی۔

باہر موسم بے حد سرد تھا' مگر وہ پروا کیے بغیر لان میں آ بیٹھی۔

کیا ملا تھا اسے زندگی سے......؟ اتنے سالوں میں کیا پایا تھا اس نے سوائے دکھوں کے؟ کچھ

بھی تو نہیں......دل تھا کہ کٹ کر آنسوؤں کی صورت بہہ جانے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی مگر......اس کے دل پر بہت گہرائی سے لگی تھی۔

''انوش......چاند کی باتوں کو دل پر مت لینا پلیز' وہ بچہ ہے تم سمجھ سکتی ہو۔''

شاہ زر اس کے پیچھے کب وہاں چلا آیا تھا اسے خبر نہیں ہو سکی تھی' تاہم اس کے پاس آ کر بیٹھنے پر وہ خاموشی سے کھڑی ہوئی تھی اور اگلے ہی پل تیز تیز چلتی اپنے کمرے میں چلی آئی کہ اس وقت وہ خود اپنے آپ سے بھی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

❋❋❋

سانحہ ایسا بھی گزرا ہے میرے ہونٹوں پر
مجھ سے مانگی ہی نہیں جاتی دعا تیرے بعد
ہر نیا دن نئے صدمے کی خبر لاتا ہے
مجھ سے ناراض سا رہتا ہے خدا تیرے بعد

''عباد......'' وہ ابھی تھکا ہوا آفس سے آیا تھا اور اب اپنے کمرے میں جا رہا تھا جب مسز یاور نے اسے پکار لیا۔

''جی......''

''تمہارے پاپا بلا رہے ہیں۔''

''فریش ہو کر آتا ہوں مما......'' کتنا ٹوٹا ہوا شکستہ لہجہ تھا اس کا' مسز یاور دیکھتی رہ گئیں۔ فقط چند ہی روز میں وہ کتنا بدل کر رہ گیا تھا۔ یہ کیسی جنگ' کیسا کھیل تھا' جس کی بھینٹ' انہوں نے اپنے بیٹے کو چڑھا دیا تھا۔ محض اپنے کھوکھلے اسٹیٹس' جھوٹی شان کی خاطر......؟

وہ جانتی تھیں ان کا بیٹا عام لڑکوں جیسا نہیں ہے وہ بہت حساس ہے' بچپن سے ہی اس کی عادات دوسرے بچوں سے بہت مختلف تھیں۔ مسز یاور کو گھر میں پرندے رکھنے کا شوق تھا' وہ پرندے منگواتی تھیں اور عباد چپکے سے انہیں آزاد کر دیتا' اکثر اس کے دوست کسی چڑیا' کبوتر کو زخمی کر دیتے تو وہ اسے اٹھا کر گھر لے آتا' اس کی مرہم پٹی کرتا اور جب تک وہ اڑنے کے قابل نہ ہو جاتا اس کی جان پر بنی رہتی۔ اکثر وہ اپنے لیے گلاس میں ڈالا دودھ اپنی پالتو بلی کو پلا دیتا' گھر کے ملازمین کے بچوں کے ساتھ وہ یوں گھل مل جاتا گویا وہ اس کے اپنے بہن بھائی ہوں' اپنے قیمتی سے قیمتی کھلونے اٹھا کر انہیں دے دیتا تھا جس پر اکثر اسے مسز یاور سے ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔

وہ بہت حساس اور سمجھدار تھا' اس نے کبھی اپنے حسب نسب پر گھمنڈ نہیں کیا تھا' گو وہ سوٹڈ بوٹڈ رہتا تھا مگر......بہت قیمتی لباس' بہت قیمتی چیزیں کبھی بھی اس کا اولین انتخاب نہیں رہی تھیں۔ مسز یاور جانتی تھیں کہ وہ انسانوں کی برابری کا قائل ایک ہمدرد انسان ہے' اس نے کبھی اپنے کسی قول و فعل سے اپنے کسی رشتے کو تکلیف نہیں پہنچائی تھی' تو پھر وہ......اس کی ماں ہو کر اسے تکلیف کیوں دے رہی تھیں......؟

زندگی میں ہمیشہ ویسا نہیں ہوتا جیسا آپ چاہتے ہیں' مگر......یہ بات بہت کم لوگوں کی سمجھ میں

اتی ہے۔

عباد فریش ہونے کے بعد یاور سعید صاحب کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ ہادیہ بھی وہیں موجود تھی اا سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتا' سامنے دھرے سوفے پر ٹک گیا۔

''آپ نے بلایا پاپا......؟''

''ہاں' کتنے دنوں سے شکل نہیں دیکھی تمہاری' کہاں رہتے ہو آج کل......؟''

وہ اس کے مقابل سوفے پر ہادیہ کے ساتھ بیٹھے تھے...... عباد نے سر جھکا لیا۔

''کہاں ہو سکتا ہوں پاپا' گھر اور دفتر کے علاوہ......؟''

''پتا نہیں! گھر پر ہوتے ہو تب بھی دکھائی نہیں دیتے اور آفس میں ہوتے ہو تب بھی۔''

''مصروف ہوتا ہوں پاپا! کچھ نئے پروجیکٹس پر کام کر رہا ہوں' آپ کو کیا بات کرنی تھی؟'' وہ تھکا ہوا تھا' اور اس وقت سوائے پرسکون نیند لینے کے اسے اور کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ یاور سعید صاحب نے ہادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بات شروع کی تھی۔

''بہت ضروری بات کرنی ہے تم سے...... تمہیں یاد ہوگا سڈنی جانے سے قبل تم کسی لڑکی میں انٹرسٹڈ تھے' اور اس سے شادی بھی کرنا چاہتے تھے۔ باوجود اس کے کہ بچپن سے ہی تمہاری نسبت ہادیہ بیٹی کے ساتھ طے ہے اور اس رشتے کے لیے تمہیں کبھی بھی کوئی اعتراض نہیں رہا' مگر...... صرف تمہاری خواہش اور ضد کے لیے' تمہاری مما اور میں نے اپنی زبان بھلا کر اس لڑکی کے لیے اپنی رضامندی دے دی۔ اب اس بات کو بھی تقریباً کئی ہفتے ہو گئے ہیں' مگر تم نے مجھے اس لڑکی سے نہیں ملوایا۔ تمہارے جتنے بھی دوست ہیں سب شادی شدہ ہیں' اپنے گھروں میں آباد ہیں' اور تم جو ہمارے اکلوتے بیٹے ہو' ابھی تک ہمیں اس خوشی سے محروم رکھے ہوئے ہو' مجھے بتاؤ عباد' آخر تمہارا کیا ارادہ ہے' کیا چاہتے ہو تم......؟''

سوال مشکل تھا مگر...... عباد کو جواب دینا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ سوال ہوگا اور شاید اسی لیے اس نے خود کو اس سوال کا جواب دینے کے لیے پہلے سے تیار کر لیا تھا۔

مسز یاور چائے کے ساتھ ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ عباد نے سر اٹھا کر انہیں نہیں دیکھا۔ بہت دھیمے لہجے میں وہ کہہ رہا تھا۔

''میں آپ کا نافرمان بیٹا نہیں ہوں پاپا! نہ ہی مجھے اس بات کی حقیقت سے کوئی انکار ہے کہ ہادیہ بہت اچھی لڑکی اور میری بہت اچھی دوست ہے۔ اگر صاعقہ احمد میری زندگی میں نہ ہوتی تو یقیناً ہادیہ کو اپنی وائف کی حیثیت سے دیکھنا میری اولین ترجیح ہوتی۔ مگر میں منافق نہیں ہوں پاپا' میں جانتا ہوں کہ پہلے کی طرح ہادیہ کو خوش رکھنا اور ایک بیوی کی حیثیت سے اپنی زندگی میں مقام دینا' اب میرے لیے بہت مشکل ہے۔ اسی لیے میں اس شادی سے بھاگ رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ جس لڑکی کو میں نے ہمیشہ محبتوں اور خوشیوں کے خواب دکھائے ہیں' وہ اب میرے ہاتھوں میرے ساتھ رہ کر کوئی دکھ اٹھائے' ایک ہی بار مرنے اور پل پل مرنے میں بہت فرق ہوتا ہے پاپا۔ میں اس لڑکی کو پل پل مرتے نہیں دیکھ سکتا' اسی لیے میں چاہتا ہوں آپ اس کی شادی کسی بہت اچھے سے لڑکے سے کر دیں' جو اس کی صحیح معنوں میں قدر کر سکے۔ جہاں تک آپ کی خوشیوں کا سوال ہے تو میرا وعدہ

ہے بہت جلد میں شادی کرلوں گا کسی بھی لڑکی سے چاہے وہ مجھے ناپسند ہی کیوں نہ ہو مگر...... ہادیہ کبھی نہیں ہو سکتی۔'' دوٹوک لہجے میں اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا۔

پیچھے ہادیہ برف جیسی ہوگئی تھی۔

یہ کیا کہہ گیا تھا وہ......؟

یاور صاحب اب اپنی مسز سے کہہ رہے تھے۔

''یہ لڑکا دن بہ دن میری سمجھ سے باہر ہوتا جارہا ہے۔ میں اپنے بھائی کے سامنے شرمندہ نہیں ہوسکتا' آسیہ اسے سمجھا دو اس کی شادی ہوگی تو ہادیہ بیٹی سے ورنہ کسی سے نہیں۔''

''تو وہ کب چاہتا ہے کسی سے شادی کرنا...... پچھلے ایک ماہ سے بہت بدل کر رہ گیا ہے میرا بیٹا' زبان رشتوں سے زیادہ اہم نہیں ہوتی یاور اور وہ بندھن' جو زندگی بھر کا بندھن ہے' دو دلوں کے ملاپ اور خوشیوں کا بندھن ہے۔ وہ کبھی زور زبردستی سے پائیدار نہیں ہوسکتا' آج ہم اگر زبردستی عباد کو منا کر ہادیہ سے اس کی شادی کروا بھی دیتے ہیں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ شادی کے بعد دونوں میں کوئی کلیش نہیں ہوگا۔ خدانہ کرے زبردستی سے بنے اس تعلق کے بعد دونوں میں علیحدگی ہو جاتی ہے تو کیا تب' آپ اپنے بھائی سے نظر ملا سکیں گے؟ نہیں...... ہمارا ایک ہی بیٹا ہے یاور...... میں نہیں چاہتی کہ وہ ہمارے کسی غلط فیصلے یا ضد کی بھینٹ چڑھے' اس لیے میں اب اسے کسی غلط بات پر مجبور نہیں کروں گی۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم......؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا......؟ ہادیہ عباد کو پسند کرتی ہے۔''

''مگر عباد اب ہادیہ کو پسند نہیں کرتا اور یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے کہ جسے انا کا مسئلہ بنالیا جائے' وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی پسند ناپسند بدلتی رہتی ہے' ہادیہ اچھی لڑکی ہے میں کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ یہ اس شخص کی زندگی کا حصہ بنے جو اسے پسند ہی نہ کرتا ہو۔''

مسز یاور کے الفاظ کسی برچھی کی طرح ہادیہ کے دل پر لگے تھے۔ تبھی شدید ہرٹ ہو کر وہ اٹھی تھی اور ایک منٹ سے پہلے کمرے سے نکل گئی۔

''this is too much aasia ذرا سوچو اگر ہادیہ کی جگہ تمہاری اپنی بیٹی ہوتی' جس کی نسبت سالوں کسی شخص کے ساتھ طے رہنے کے بعد یوں ڈسٹرب ہو جاتی تو کیا تب بھی تم یہی کہتیں......؟''

''ہاں...... کیونکہ میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں جو اولاد کی دشمن ہوتی ہیں۔ جھوٹی انا' جھوٹے حسب نسب کی خاطر اپنے جگر کے ٹکڑوں کو سولی چڑھا دیتی ہیں۔ میں اپنے بیٹے کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں' اگر اس نے ہادیہ سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو وہ کبھی بھی اس تعلق کو خوش اسلوبی سے نبھا نہیں سکے گا' جبکہ ہادیہ زیادہ دن یہ برداشت نہیں کر سکے گی اور بالآخر اس شادی کا اختتام طلاق پر ہوگا' میں یہ نہیں چاہتی یاور...... میری جگہ کوئی بھی ماں' اپنی بیٹی کے لیے ایسا نہیں چاہے گی۔'' مسز یاور کے مضبوط لہجے میں لچک ناپید تھی' یاور سعید صاحب پریشان ہو کر رہ گئے۔

''میرا بیٹا بہت پریشان ہے یاور! جو ظلم ہم اس کے ساتھ کر چکے ہیں' اب اس کے بعد مجھ میں مزید کسی اور فریب کی ہمت نہیں ہے' اس کی آنکھوں کی ویرانی اور لبوں کی چپ' مجھے اندر سے کاٹ

رہی ہے۔ کوئی گلہ نہیں کیا میرے بیٹے نے مجھ سے' کوئی لعنت ملامت نہیں کی' مگر...... پھر بھی وہ سامنے آتا ہے تو میں اس سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہتی۔" وہ پشیمان تھیں' یاور صاحب ازحد پریشانی کا شکار...... سگار جلا کر' اسٹڈی میں چلے گئے۔

❁❁❁

حویلی میں بڑے ملک کی طبیعت پچھلے روز سے زیادہ خراب ہو گئی تھی' لہٰذا اس روز اپنے بھائیوں کی غیر موجودگی میں اس نے اپنی بڑی بھالی کے سامنے' انہیں ایان احمد سے اپنے نکاح کی بابت سب سچ بتا دیا تھا' بڑے ملک کے لیے یہ بات کسی شاک سے کم نہیں تھی' مگر...... جس حالت اور کیفیت میں وہ گرفتار تھے اس میں ایان جیسے "چھوٹے کمی کمین" کو اتنی بڑی جسارت کی سزا دینا ان کے اختیار میں نہیں رہا تھا' لہٰذا مجبوراً انہیں یہ بات اپنے بیٹوں کے سامنے رکھنی پڑی تھی۔

بقول ان کے' ان کی زندگی کا چراغ کسی بھی لمحے گل ہو سکتا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی موت کے بعد علیزہ کسی مشکل کا سامنا کرے مگر...... ان کی خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔

اس شاک کے اگلے دو روز بعد ان کی رحلت ہو گئی تھی اور ان کی رحلت کے بعد حویلی میں سب سے پہلے جس مسئلے نے سر اٹھایا تھا' وہ علیزہ کی طلاق کا تھا' مگر علیزہ کسی طور طلاق کے حق میں نہیں تھی' باپ کی وصیت کے مطابق' زمین جائیداد کا جو حصہ اسے ملنے والا تھا' اس کے بھائی کسی طور وہ حصہ کسی کو دینے کے لیے تیار نہیں تھے' ان کی خواہش تھی کہ علیزہ ایان احمد سے طلاق کے بعد حویلی میں رہ کر' تمام معاملات اور امور سنبھالے' مگر وہ جانتی تھی کہ یہ معاملات اور امور سنبھالنا' حقیقت میں کس اذیت کا نام ہوگا' تبھی اس نے اپنے بھائیوں کی خواہش پر سر جھکانے سے انحراف کیا تھا' جس کی پاداش میں اسے اپنے بھائیوں کی سخت وحشت اور تاؤ کا سامنا کرنا پڑا۔

باپ کے ہوتے ہوئے وہ بھائی جو اس کے لیے جان دیتے تھے اب وہی اس کی جان لینے کے درپے ہو گئے تھے۔

لہٰذا بہت سوچ بچار کے بعد...... اسے اپنا حصہ اپنے بھائیوں پر قربان کر کے' چپ چاپ کراچی آنا پڑا تھا۔ آمنہ کی شادی ہو چکی تھی مگر...... اس کی ماں اب بے سکون ہو گئی تھی' بیٹی کے چہرے پر چھائی زردی اور دن بدن ہڈیوں میں ڈھلتے وجود نے ایک عجیب سے احساس پشیمانی میں مبتلا کر دیا تھا انہیں۔ علیزہ کے پاس انہی کے گھر کا ایڈریس تھا' کویت روانگی سے قبل اسے رہا کرتے ہوئے ایان نے اسے کراچی میں انہی کے گھر کا ایڈریس دیا تھا' تبھی سخت خواری کے بعد وہ سیدھی وہیں چلی آئی تھی۔

دروازہ آمنہ کی ماں نے کھولا تھا۔

"السلام علیکم......"

"وعلیکم السلام۔ کون......؟"

"جی...... میرا نام علیزہ ہے' میرے شوہر ایان احمد نے کچھ روز قبل بیرون ملک جاتے ہوئے مجھے یہاں کا پتا دیا تھا' تاکہ میں ضرورت پڑنے پر اس کے گھر والوں سے رابطہ کر لوں۔"

"اچھا...... آؤ...... اندر آؤ......" کچھ پل سوچ و بچار کے بعد انہوں نے دروازہ وا کر دیا تھا۔

"کہاں سے آئی ہو......؟"

''جی......گاؤں سے......''

''ہوں......ایان دو ماہ قبل یہاں آیا تھا' اپنے گھر والوں کے لیے کچھ پیسے اور اپنا رابطہ نمبر دے کر گیا تھا' مگر...... مجھے اور میری بیٹی کو اس کے گھر والوں کا کچھ نہیں پتا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ اصل میں ان کی جو لڑکی ہے صاعقہ اس سے میری بیٹی کی دوستی تھی' میں کبھی نہیں گئی ان کے گھر...... کافی دنوں سے سوچ رہی تھی وہ پیسے ان تک کیسے پہنچاؤں' اب تم آ گئی ہو تو وہ امانت میں تمہارے سپرد کر دیتی ہوں' دل پر بوجھ محسوس ہوتا ہے۔''

علیزہ کو صحن میں چارپائی پر بٹھانے کے بعد' بولتے ہوئے وہ اندر کمرے میں چلی گئی تھیں' تقریباً پانچ منٹ کے بعد دوبارہ آئیں تو ان کے ہاتھ میں سفید لفافہ تھا۔

''یہ لو تمہاری امانت......میری بیٹی کی شادی ہوگئی ہے' اس کا اب صاعقہ اور اس کے گھر والوں سے کوئی واسطہ نہیں' تم بیٹھو میں شربت لاتی ہوں تمہارے لیے۔''

علیزہ پریشان سی لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی' جب وہ شربت کا گلاس لیے دوبارہ چلی آئیں۔

''ہم غریب ضرور ہیں بیٹی مگر بے ایمان نہیں ہیں' گن لو پورے پچیس ہزار ہیں۔''

''جی شکریہ......مگر...... مجھے ان لوگوں سے ملنا تھا۔''

''بھئی اب اس کے لیے تو میں کچھ نہیں کر سکتی...... یہ کوشش تو تمہیں خود ہی کرنی پڑے گی۔''

بالکل صاف جواب دے دیا تھا انہوں نے......علیزہ ازحد پریشانی میں شربت کا گلاس خالی کر کے انہیں تھماتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بہت شکریہ......خدا حافظ۔''

اتنے بڑے شہر میں' جہاں کوئی اس کا آشنا بھی نہیں تھا' کسی کو ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہی تھا اس کے لیے' جبکہ وہ اپنے پیچھے تمام کشتیاں بھی جلا آئی تھی۔

آمنہ کے گھر سے نکلنے کے بعد پریشانی ہی پریشانی تھی۔

کراچی جیسے غیر محفوظ شہر میں' پچیس ہزار کی خطیر رقم کے ساتھ وہ تنہا کسی بھی مصیبت کی بھینٹ چڑھ سکتی تھی' مگر...... سامنے نہ کوئی راستہ تھا نہ منزل...... وہ گاؤں سے اپنی سسرال کی تلاش میں روانہ ہوئی تھی مگر وقت نے اس کی پیشانی پر دربدری تحریر کر دیا تھا۔

ایان احمد نے اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کے بعد چیلنج کیا تھا کہ وہ گاؤں سعید والا کی گلیاں اور چوراہے اس کے لیے شجر ممنوع بنا کر رہے گا اور اس کا چیلنج پورا ہو گیا تھا' گاؤں واپسی کی راہ بھول کر وہ ایک کے بعد ایک مصیبت کی بھینٹ چڑھتی گئی تھی۔

❊❊❊

''یہ حسن پیلس ہے...... کچھ عرصے پہلے تک یہاں زندگی اپنی پوری خوب صورتی کے ساتھ رقص کیا کرتی تھی مگر اب ...... یہاں وحشت ہی وحشت...... ویرانی ہی ویرانی ہے۔ میرال حسن کی غیر متوقع موت کے بعد میں نے یہ جانا ہے صاعقہ کہ اس دنیا میں زندگی سے بڑھ کر خوب صورت اور

موت سے بڑھ کر تکلیف دہ کوئی اور چیز نہیں۔'' گاڑی حسن پیلس کے سامنے روکتے ہوئے' واصف علی ہمدانی اسے بتا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے گاڑی سے نکل آئی۔

''کتنا سبزہ ہے یہاں...... بہت خوب صورت' بالکل کسی خوابوں کے محل جیسا گھر ہے یہ......''

مرزدہ سی وہ حسن پیلس کے گرد بکھرے سبزے کو دیکھ رہی تھی' تبھی واصف بھی گاڑی سے نکل آیا۔

''ہاں...... اصل میں یہ بھی انکل اور میرال کی مشترکہ محنت کا نتیجہ ہے۔ دیوانی تھی وہ پھولوں کی' پرندوں کی' کتابوں کی' تتلیوں کی' خوشبوؤں کی' بارشوں کی' بہت جنون تھا اسے قدرت کو قریب سے دیکھنے کا۔''

''ازلان حیدر آتا ہے یہاں......؟''

''نہیں...... میرال حسن کی رحلت کے بعد اس نے کبھی بھولے سے بھی یہاں قدم نہیں رکھا۔''

''آپ کو کیا لگتا ہے' کیا واقعی وہ میرال حسن سے محبت کرتا تھا۔''

''ہاں...... میرال حسن کے لیے اس کی نفرت کی شدت سے ہی اس کی محبت کا پتا چلتا ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

''بہت آسان مطلب ہے۔''

صاعقہ کے استفسار پر پینٹ کی پاکٹس میں ہاتھ گھساتے ہوئے وہ دو قدم آگے آیا تھا۔

''کسی بھی انسان کی زندگی میں صرف دو جذبے بہت طاقت ور ہوتے ہیں' ایک محبت کا جذبہ اور دوسرا نفرت کا...... محبت...... کسی بھی انسان سے ہوسکتی ہے مگر...... نفرت ہر انسان سے نہیں ہوتی' یہ صرف اسی سے ہوتی ہے جس سے آپ کا تعلق بہت گہرا ہو۔'' کتنی گہری باتیں کرنا جانتا تھا واصف علی ہمدانی' وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

''انکل آنٹی کے پاس کون ہوتا ہے اب......؟''

''مصحف ہوتا ہے' اصل میں بیوہ ہونے کے بعد پھوپو یہیں آ گئی تھیں' حسن پیلس میں۔ میرال اور مصحف دونوں چھوٹے تھے' مصحف کے یہاں آنے کے بعد دونوں نے ایک ساتھ تعلیمی مدارج طے کیے۔ آنٹی کے بقول میرال' مصحف کی بہت اچھی دوست تھی۔ اسپیشلی پھوپو کی رحلت کے بعد وہ بہت سوفٹ ہوگئی تھی مصحف کے لیے' زیادہ سے زیادہ کمپنی دینے لگی تھی اسے...... اور شاید یہی بات ازلان کو گوارہ نہیں تھی' بہرحال میرال کے بعد مصحف ہی انکل آنٹی کو سنبھال رہا ہے۔ آج کل تو ملک سے باہر گیا ہوا ہے' انکل نے یونیورسٹی چھوڑ دی ہے' آفس بھی نہیں جاتے' اسی لیے میں چاہتا تھا کہ آپ یہاں آئیں' شاید آپ کو دیکھنے کے بعد' یہاں اس گھر کے سناٹوں میں کچھ کمی آ جائے۔''

اسے بریفنگ دیتے ہوئے واصف کا لہجہ اداس تھا' صاعقہ کچھ سوچتے ہوئے گھر کے اندر چلی آئی۔

❀❀❀

بریرہ کی طبیعت خراب تھی۔

پچھلے ایک ماہ سے وہ تیز بخار کی زد میں تھی اور یہ بخار تھا کہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ مسلسل بارش کے سرد قطروں کو جذب کرتا وجود اب آگ اگل رہا تھا' اور وہ مکمل بے نیازی سے اس

آگ میں سرمد خان کو جلا رہی تھی۔

وہ جو بزنس ٹائیکون تھا' ساری دنیا ترک کیے اس کے بستر سے لگا بیٹھا رہتا تھا' بریرہ نے ا
بارا سے اس دیوانگی سے منع کیا تھا جواب میں اس نے کہا تھا۔

''میری دنیا تم ہو بریرہ...... اگر تم اس دنیا میں نہیں ہو تو میرے لیے اس کائنات کی ہر شے ب
ہے' کیسا بزنس' کیسی دولت...... کیسا مقام و مرتبہ۔'' اور وہ اس جواب پر بالکل خاموش رہ گئی تھی۔

شاہ زر کو دوبارہ دیکھنے اور ملنے کے بعد وہ مزید جینا نہیں چاہتی تھی۔ اسے دنیا ہی نہیں' ا
ذات سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔ مگر سرمد خان تھا کہ زبردستی اسے جینے پر مجبور کر رہا تھا' سائلہ بیگم
سمجھانے اور منت کرنے پر اس نے مجبوراً سرمد خان سے نکاح کرلیا تھا مگر وہ خوش نہیں تھی' اور شاید
خوش رہ ہی نہیں سکتی تھی کہ اس نے خوش رہنا کب کا ترک کردیا تھا۔

سرمد خان البتہ خوش تھا' کسی کانچ کی گڑیا کی طرح اس کا خیال رکھتا۔ وہ قدم قدم پر اسے شرم
کر رہا تھا۔ اس روز وہ گھر آیا تو اس کے ساتھ ایک بہت پیارا چھوٹا سا بچہ بھی تھا' بریرہ بے ساختہ ب
سے اٹھ بیٹھی۔

''یہ کون ہے سرمد......؟''

''انسانی بچہ ہے...... غربت کے ہاتھوں تنگ اس کی ماں' اسے باسکٹ میں ڈال کر فرار ہوگئی۔

''او میرے خدا...... یہ کیسے ممکن ہے' کوئی ماں اتنے پیارے بچے کو کیسے چھوڑ کر جاسکتی ہے؟''

''جاسکتی ہے بری...... بہت انوکھے رنگ ہیں اس کائنات کے' تم اپنے غم سے نکلو تو دیکھ
یہاں جینے کے لیے کیسے کیسے قرض ادا کرنے پڑتے ہیں...... آج سے یہ بچہ میرا اور تمہارا بچہ ہے'
اسے محرومیوں سے بچائیں گے بری...... ایک کامیاب انسان بنا کر' دنیا سے متعارف کروائیں گے

''ان شاء اللہ۔'' بھرائی آنکھوں سے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اسے بازوؤں
بھرلیا تھا۔

''میں اس کا نام بلند بخت رکھوں گی۔ اچھا نام ہے ناں......؟''

''ہاں...... تم جو سوچو' جو چاہو' جو کرو سب اچھا ہے بری!''

شادی کے دو ماہ گزر جانے کے باوجود اس شخص کی آنکھوں میں بریرہ رحمٰن کے لیے موجود مح
کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ روز بنا ناشتہ کیے خود تیار ہو کر آفس جاتا تھا' دوپہر میں دل چاہتا تو کچھ کھا
گر نہ بھوکا رہتا۔ رات میں آفس سے واپسی کے بعد اکثر بریرہ اسے سوئی ہوئی ملتی۔ تب تھکن
چور ہونے کے باوجود وہ زبردستی اسے خود کھانا تیار کر کے ڈنر کرواتا اور دوا دیتا' پچھلے دو ماہ سے
روٹین چلی آرہی تھی' تبھی بریرہ کی نظر جھک گئی تھی۔

غم اشتہار بنا کر گلے میں لٹکانے کے لیے نہیں' دل میں دفن کرنے کے لیے ہوتے ہیں' مگر
تھی کہ کسی صورت اپنے مردہ خوابوں کو دفن کرنے پر تیار ہی نہیں تھی۔

بچہ بریرہ کے حوالے کرنے کے بعد وہ باہر لاؤنج میں آبیٹھا تھا' تبھی آدھ گھنٹے بعد وہ بھی ا
کے ساتھ صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔

''سرمد...... آج میں بہت خوش ہوں' آپ نے جو گفٹ مجھے دیا ہے لگتا ہے شاید اس کے۔

پ کے احسانوں کا قرض ادا نہیں کر سکوں گی۔"
یں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بری! بس ایک ادنیٰ سی کوشش کی ہے' تمہیں زندگی کی طرف
نے کی......"
پھر کیا خیال ہے' ڈنر کرنے چلیں۔" بہت طویل عرصے کے بعد اس نے یوں موڈ میں آ کر
ائش کی تھی' سرمد کا دل دھڑک اٹھا۔
یہ تم کہہ رہی ہو بری.......؟"
نہیں......میری روح کہہ رہی ہے۔" منہ بنا کر جس انداز میں اس نے کہا تھا' وہ اسے دیکھتا
۔ جبکہ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی' موسم بدل رہا تھا' قطرہ قطرہ بارش کے بعد محبت کی اس سوکھی کھیتی
بس ہونے ہی والا تھا۔

❁❁❁

میرال......" جیسے ہی اس نے قدم گیٹ عبور کر کے خوب صورت لان میں رکھے' وہاں بیٹھی
یت نفیس خاتون بے یقینی سی اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
صاعقہ نے گھبرا کر پیچھے دیکھا' واصف علی ہمدانی' اس سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی کھڑا
تنے میں وہ خاتون اس کے بالکل قریب چلی آئی تھیں۔
میرا نام صاعقہ ہے......اتفاق سے میری شکل آپ کی میرال سے بہت ملتی ہے۔" خاتون
یب آنے پر فوراً اس نے وضاحت دی تھی۔
جواب میں طاہرہ بیگم کی آنکھوں کے دیپ ایک دم سے بجھ گئے۔ بتول بانو بھی اس وقت وہیں
یں' واصف آگے بڑھ آیا۔
"یہ ہماری فیکٹری میں جاب کرتی ہیں آنٹی......میں نے میرال کا بتایا تو آپ سے ملنے چلی
ں اب کیسی طبیعت ہے آپ کی......"
"ٹھیک ہوں......آؤ بیٹی......چائے پی لو......ہم ابھی پی ہی رہے تھے۔" وہ جتنی نفیس تھیں
ں بااخلاق بھی۔ بتول بانو البتہ بہت خاموش سی تھیں' صاعقہ ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے لگی۔
علی ہمدانی بھی برابر میں ہی براجمان ہو گیا۔
"آنٹی......اگر آپ محسوس نہ کریں تو کیا میں میرال کا کمرہ دیکھ سکتی ہوں۔" عرصے کے بعد
نے میرال کے کمرے کی بات کی تھی۔
طاہرہ بیگم کی آنکھیں فوراً نم ہو گئیں۔
"ہاں......کیوں نہیں......مدت گزر گئی اس کمرے کو غیر آباد ہوئے مگر اب بھی وہ مجھے وہیں
ں ہوتی ہے۔ کبھی روٹھ کر بیڈ پر بیٹھی ہوئی' کبھی آئینے کے سامنے کھڑی مسکراتی ہوئی' خدا کی
تھی' اس نے لے لی......مگر......صبر نہیں آتا بیٹی......انسان اس قابل ہی کہاں ہے کہ اسے امانتاً
چیز دی جائے اور وہ اس کے لیے بے ایمان نہ ہو۔" بھیگی ہوئی آنکھوں سے درد ٹپک رہا تھا۔
صاعقہ انہیں تسلی دیتی رہی۔

چند لمحات کے بعد وہ میرال حسن کے کمرے میں تھی' ایک نہایت نفیس اور خوبصورت کمرے میں...... جہاں پڑی ہر چیز اپنی قدر و قیمت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ وہ ایک ایک چیز کو چھو کر دیکھتی رہی۔ طاہرہ بیگم اسے کمرے میں چھوڑ کر باہر چلی آئی تھیں' جبکہ واصف لاؤنج میں بیٹھا' بتول بیگم کے ساتھ گپیں لگا رہا تھا۔ موضوع گفتگو یقیناً ازلان کی ذات تھی' وہ بے نیازی میرال کے کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔

اسٹڈی ٹیبل پر پڑی ہوئی کتابیں' میرال کے باذوق ہونے کا اعلان کر رہی تھیں۔ دیگر چیزوں کی طرح کتابوں کے انتخاب میں بھی اس کی پسند لاجواب تھی' اشفاق احمد کی ''زاویہ'' شہاب کی ''شہاب نامہ'' تارڑ کی ''پیار کا پہلا شہر'' قربت مرگ میں محبت'' عبداللہ حسین کی ''اداس نسلیں'' ایک سے بڑھ کر ایک کتاب اس کے مطالعے کی میز پر موجود تھی' کتابوں سے ذرا پرے ایک بہت ہی خوب صورت چھوٹا سا قرآن پاک بھی رکھا ہوا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ قرآن پاک کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے کرتی تھی۔

ایک ایک کتاب اور چیز کو توصیفی نگاہوں سے دیکھتی وہ ابھی اسٹڈی ٹیبل سے اٹھنے ہی لگی تھی کہ اچانک میرال کی ڈائری پر اس کی نگاہ پڑ گئی' جو کتابوں کے بیچ میں دبی ہوئی تھی' صاعقہ اخلاقیات کی دیوار پھلانگنا نہیں چاہتی تھی مگر جانے کیوں اس کا وجدان اسے وہ ڈائری اٹھانے پر مجبور کر رہا تھا۔

عجیب کشمکش کے بعد بالآخر اس نے وہ ڈائری کتابوں کے درمیان سے نکال کر اپنے پرس میں رکھ لی تھی۔ ایک الجھی ہوئی دل چسپ کہانی کا کوئی سرا...... تلاش کرنے کی خواہش میں اس نے فی الحال اخلاقیات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

شام میں مغرب سے پہلے اس کی ''حسن پیلس'' سے واپسی ہوئی تھی۔ تاہم طاہرہ بیگم نے اسے روز وہاں آنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔

❋❋❋

ہادیہ نے سڈنی واپس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عباد کو پتا چلا تو آفس سے واپسی کے بعد وہ سیدھا اس کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ اپنی پیکنگ کر رہی تھی۔

''آسٹریلیا واپس جا رہی ہو ہادی۔''

''ہاں......'' چونک کر پلٹتے ہوئے اس نے عباد کو دیکھا تھا۔

''ناراض ہو کر جا رہی ہو مجھ سے......؟''

''نہیں......'' اس کی پلکیں بھیگی ہوئی تھیں مگر وہ ضبط سے کام لے رہی تھی۔ عباد آگے بڑھا اور اس نے ہادیہ کا ہاتھ تھام لیا۔

''تم میری سب سے اچھی دوست ہو ہادی' آئی سویئر......''

''ہوں...... میں جانتی ہوں اور میں یہ بھی جانتی ہوں عباد کہ کسی بھی انسان کی زندگی میں محبت کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اسی لیے میں چپ چاپ تمہاری زندگی سے نکل رہی ہوں' ویسے بھی دل سے تو تم نے مجھے نکال ہی دیا ہے تو پھر زندگی میں رہنا کیا معنی رکھتا ہے۔''

عباد اس بار خاموش رہا تھا۔
"تمہیں پتا ہے عابی..... اس دنیا کا سب سے بڑا دکھ کیا ہے.....؟" اچانک بھیگی پلکیں اٹھا کر اس نے عباد کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ نفی میں سر ہلا گیا۔
ہادیہ اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر گلاس ونڈو کے قریب جا کھڑی ہوئی۔
"اس دنیا کا سب سے بڑا دکھ "کھو دینا ہے۔" انسان چاہے محبت کو کھوئے' یا پھر زندگی کو' اپنے رب کی قربت کو کھوئے یا پھر جان سے پیارے رشتوں کو..... کچھ بھی "کھو دینے" سے بڑھ کر اذیت ناک یہاں کچھ نہیں ہے۔"
"ایم سوری ہادی..... ایم رئیلی ویری سوری۔"
"نہیں..... پلیز سوری مت کہو..... یہ سب تو تقدیر کے کھیل ہیں عابی! وہ جسے چاہے نواز دے' جس سے چاہے چھین لے..... انسان تو کھلونا ہے تقدیر کے ہاتھوں میں..... تمہیں پتا ہے چند روز پہلے تک مجھے لگتا تھا اگر تم مجھے نہیں ملے تو میں مر جاؤں گی مگر..... اب مجھے لگتا ہے اگر میں نے تمہیں پالینے کے بعد کھو دیا تو میں زندہ نہیں رہوں گی۔ تم مجھے اچھے لفظوں میں یاد رکھو عابی! میرے لیے یہی بہت ہے۔" کتنی جلدی شکست تسلیم کر لی تھی' اس لڑکی نے جو جانے ابھی کتنی زندگیوں کو الٹنے پلٹنے کا ارادہ رکھتی تھی' عباد ایک بار پھر جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا تھا۔
ہادیہ نے اس بار مسکرا کر اسے دیکھا اور پھر فوراً اپنے آنسو چھپاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

❊❊❊

رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی جب اس کی گھر واپسی ہوئی تھی۔
گرج چمک کے ساتھ تیز بارش نے سڑکوں پر خاصا پانی جمع کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ نشے میں دھت خود ڈرائیو کر کے گھر پہنچا تھا۔ گوری ابھی تہجد کی نماز سے فارغ ہو کر اس کی سلامتی اور ہدایت کی دعا مانگتی اس کا انتظار کر رہی تھی۔
گیٹ کے اس پار جیسے ہی ہارن بجا' وہ بیڈ سے اٹھ کر تیزی سے ٹیرس کی طرف لپکی' چوکیدار گیٹ کھول رہا تھا۔ وہ ایک نظر عدنان کی گاڑی پر ڈالتی واپس پلٹ آئی۔
آج زاویہ کی سالگرہ تھی اور اس کے تمام دوستوں نے اسے خوب موج مستی کے ساتھ سیلیبریٹ کیا تھا۔ عدنان گاڑی پارک کرنے کے بعد کمرے میں آیا تو اس کا سر نشے کی شدت سے گھوم رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت اسے زور کی ٹھوکر لگی تھی' اگر گوری فوراً آگے بڑھ کر اسے تھام نہ لیتی تو یقیناً وہ گر جاتا۔ اپنی کمزور بانہوں کا سہارا دے کر وہ اسے دہلیز سے بیڈ تک لائی تھی۔
"آپ ٹھیک ہیں ناں عدی.....؟"
"ہوں....." پلکیں موندے وہ فوراً بیڈ پر ڈھے گیا تھا۔ گوری نے اس کی شرٹ کے بٹن کھول دیے۔
آرام دہ تکیے پر اس کا سر رکھنے کے بعد وہ اس کے پاؤں کی طرف بڑھی تھی اور پھر اس کے دونوں پاؤں اٹھا کر اپنی گود میں رکھتے ہوئے اس نے انہیں جوتوں کی قید سے آزاد کر دیا۔

''اتنے خراب موسم میں اتنی دیر تک گھر سے باہر رہنا مناسب نہیں ہوتا۔''

''میں ایسا ہی ہوں' میرے لیے کچھ بھی مناسب غیر مناسب نہیں ہے۔''

''تو غلط بات ہے ناں! کتنے خراب حالات ہیں آج کل' معمولی سے پیسوں' معمولی سے موبائل اور گاڑی کے لیے لوگ پل میں کسی کی بھی جان لے لیتے ہیں۔''

''لے لیں جان...... مجھے پروا نہیں ہے۔'' بیزاری سے کہتے ہوئے اس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا۔ گوری نرمی سے اس کے موزے اتارنے کے بعد نرم ہاتھوں سے اس کے گورے پاؤں سہلانے لگی۔

''مگر مجھے بہت پروا ہے' زبردستی کا ہی سہی مگر اب اسی تعلق سے میری حیات ہے۔''

''اچھا؟'' آنکھوں سے بازو ہٹا کر اسے دیکھتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے قریب کھینچ لیا تھا۔ گوری نے بے ساختہ اس کے منہ پر فوری ہاتھ رکھ دیا کہ اس وقت اس کے منہ سے آتی شراب کی بو نے اسے ابکائی پر مجبور کر دیا تھا۔

''کبھی بتایا نہیں تم نے کہ اتنا اہم ہو گیا ہوں میں تمہارے لیے۔'' وہ اپنے منہ سے اس کا ہاتھ ہٹا رہا تھا۔ گوری مچل کر رہ گئی۔

''میں اس تعلق کی بات کر رہی ہوں جو میرے اور آپ کے درمیان ہے۔''

''مطلب...... تمہیں بھی میری پروا نہیں ہے؟''

پل میں اس کی آنکھوں کا رنگ بدلا تھا۔ گوری نے بمشکل خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور واش روم کی طرف لپک گئی۔ عدنان نشے کی شدت سے بند ہوتی آنکھوں کے باوجود بیڈ سے اٹھ کر اس کے پیچھے آیا تھا۔

''بتاؤ...... تمہیں میری پروا ہے کہ نہیں......؟''

''نہیں۔'' منہ اچھی طرح صاف کرنے کے بعد وہ پلٹی تھی۔ عدنان کے اندر جیسے پھر سے توڑ پھوڑ ہونے لگی۔

''میں راتوں کو باہر رہوں' پرائی لڑکیوں کے ساتھ عیاشی کروں' نشے میں خود کو تباہ کروں' تمہیں بھی کوئی پروا نہیں ہے ناں......؟''

جانے وہ اس سے کیا اگلوانا چاہ رہا تھا۔ گوری کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''بکواس کرتی ہو تم کہ تمہیں میری پروا ہے' تم بھی خود غرض ہو۔ تمہیں بھی صرف یہی فکر ہے کہ میں کہیں کسی گاڑی کے تلے آ کر کتے کی طرح کچلا نہ جاؤں' کیونکہ میرے بعد یہاں اس گھر میں' دولت جائیداد میں' تمہارا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ تمہیں صرف میری زندگی اور موت کی پروا ہے' مگر...... جو میں کر رہا ہوں وہ موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔'' اس کا منہ دبوچے وہ اب اپنے اندر کا زہر باہر نکال رہا تھا۔ گوری کا وجود کانپنے لگا۔ وہ شخص نشے میں ہمیشہ اس کے لیے مصیبت ثابت ہوتا تھا۔ اس وقت بھی بڑی مشکل سے وہ اسے پرے دھکیل کر کمرے سے نکلی تھی۔

طلال صاحب تہجد کی نماز کے لیے بیدار ہو چکے تھے۔ گوری نے ان کے لیے جائے نماز بچھائی تو وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے۔

"عدی آ گیا گھر......؟"

"جی پاپا۔"

"ابھی آیا ہے؟"

"جی......"

"اس کا مطلب ہے اس شادی اور تم جیسی پیاری بچی کی محبت نے بھی اس پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا۔" وہ پریشان تھے۔ گوری کا سر جھک گیا۔

"میں شرمندہ ہوں پاپا۔ مگر میرا خیال ہے جب تک وہ اس گھر میں پوری عیاشی کے ساتھ رہیں گے' شاید کبھی بھی نہ سدھر سکیں۔ آپ انہیں ان کی ذمہ داری کا احساس دلائیں' انہیں کچھ دنوں کے لیے اس عیش و عشرت کی زندگی سے محروم کر دیں' شاید وقت کی ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ سدھر جائیں۔"

اس کا مشورہ معقول تھا۔ طلال صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ وہ جتنا عیاش تھا اتنا ہی حساس اور ذمہ دار بھی تھا' یقیناً بے آسرا ہونے کے بعد اسے کچھ نہ کچھ سبق حاصل کرنا ہی تھا۔

❁❁❁

"عدی......" دن بارہ بجے کے بعد بیدار ہو کر بنا ناشتہ کیے' سج دھج کر وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا جب طلال صاحب نے اسے پکار لیا۔ گوری کچن میں تھی۔ وہ خاصا بدمزہ ہو کر ان کی طرف چلا آیا۔

"جی۔"

"بیٹھو' کچھ بات کرنی ہے تم سے۔"

"سوری۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ کہیے کیا کہنا ہے؟" وہی اس کا گستاخانہ انداز۔ گوری اس کی بدتمیزی پر حد درجہ شرمندہ ہوتی' کچن میں ہی کھڑی رہی۔ طلال صاحب نے بھی بے ساختہ اپنا چشمہ ٹھیک کیا تھا۔

"رات کتنے بجے گھر واپس آئے تھے آپ......؟" قطعی سرد لہجے میں انہوں نے پوچھا تھا۔

عدنان کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"جتنے بجے روز آتا ہوں۔ تین ساڑھے تین بجے' کیوں؟"

"مجھ سے پوچھ رہے ہو کیوں......؟ تمہیں نہیں پتا کہ اب تم شادی شدہ ہو' ایک عدد بیوی ہے تمہاری۔"

"تو کیا کروں' بیوی کو ساتھ لے کر گھوما کروں؟"

"شٹ اپ...... اس گھر میں رہنا ہے تو اپنے طور طریقے بدلو نہیں تو سامان اٹھاؤ اپنا اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" طلال صاحب کو غصہ بہت کم آتا تھا مگر جب آتا تو پھر کوئی حد نہیں رہتی تھی۔

عدنان سب کے سامنے اس عزت افزائی پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے' میں خود بھی آپ کے اس محل میں رہنے کا خواہشمند نہیں ہوں۔" اندر سے کرچی کرچی ہونے کے باوجود مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف واپس پلٹ گیا تھا۔ گوری نے کچن سے نکل کر ایک نظر طلال صاحب کی طرف دیکھا پھر ان کی

آنکھوں کا اشارہ پا کر عدنان کے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔

''عدی یہ ٹھیک نہیں ہے' آپ کو پاپا کے سامنے ایسے لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''اپنی اوقات میں رہو' سمجھی۔''

وارڈروب کھولے وہ غرایا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''باندھو اپنا سامان اور چلو یہاں سے۔''

''مگر......''

''تمہیں سنائی نہیں دیا میں نے کیا کہا ہے؟''

اس کے اگر مگر پر حلق کے بل وہ چلایا تھا۔ گوری چپ چاپ اپنا سامان پیک کرنے لگی۔ وہ واقعی جتنا عیاش تھا اتنا ہی حساس اور خوددار بھی تھا۔ اگلے پندرہ منٹ میں مختصر سے سامان کے ساتھ وہ اس محل سے نکل آیا۔ طلال ہمدانی صاحب دیر تک ان دونوں کو رخصت ہوتے دیکھتے رہے تھے۔

❁❁❁

شجاع کے سامنے اسٹڈی ٹیبل پر امامہ حسن کی زندگی سے متعلق فائل کھلی پڑی تھی اور وہ سگریٹ کے گہرے کش لیتا' بنا دروازہ لاک کیے اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جو ڈی ایس پی حزام نے بڑی محنت سے مکمل کی تھی۔

رپورٹ کے مطابق بیس سال قبل سید حسن رضا صاحب کے گھر دو جڑواں بچیوں نے جنم لیا تھا۔ جن کے نام امامہ حسن اور میرال حسن رکھے گئے۔ امامہ بڑی تھی اور میرال چھوٹی...... حسن صاحب ان دنوں اسکول ماسٹر تھے۔ نئی نئی جاب تھی اور نئی نئی شادی...... دو ننھی بچیوں اور ایک عدد بیوی کے ساتھ نئے علاقے میں پوسٹنگ نے انہیں خاصا پریشان کر دیا تھا۔ تاہم نئے علاقے میں جو گھر انہیں ملا' اسی گلی میں حیدر عباس صاحب کا گھر بھی تھا' جن کی گتے کی فیکٹری تھی۔ ان کی بیوی کو اللہ نے شادی کے دس سال بعد دو جڑواں بیٹوں ارسلان حیدر اور اذلان حیدر سے نوازا تھا۔ تبھی ان کے مزاج میں بے حد سادگی اور عاجزی تھی۔

امامہ کی ماں طاہرہ بیگم کے اس محلے میں آنے کے بعد' حیدر عباس صاحب کی بیگم بتول بانو نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک برتا تھا جس کے باعث بہت جلد اس محلے میں ان کا دل لگ گیا۔ بتول بانو کے گھر حفصہ نامی ایک خاتون جھاڑو برتن کے لیے آتی تھیں۔ وہ بیوہ تھیں اور بے اولاد بھی...... اکثر طاہرہ بیگم نے انہیں اپنے مرحوم شوہر کی برائیاں کرتے سنا تھا' بقول ان کے انہوں نے زندگی بھر شوہر کے عتاب اور ظلم برداشت کیے ہیں۔ اسی لیے طاہرہ اور بتول دونوں خواتین کو ان کے ساتھ خاصی ہمدردی ہوگئی تھی۔ حفصہ بیگم کی ایک بہن زینب بی تھیں۔ جن کے میاں کلرک تھے اور بڑی مشکل سے معمولی سی تنخواہ میں کھینچ تان کر ان دونوں میاں بیوی کا گزارا ہوتا تھا۔

اپنی بہن کی طرح وہ بھی اولاد کی نعمت سے محروم تھیں۔

ارسلان اور اذلان اسکول جانے لگے تھے۔ تبھی حسن صاحب نے امامہ اور میرال کو بھی اسی اسکول میں ایڈمیشن دلوا دیا۔ صبح اسکول جاتے ہوئے وہ چاروں بچوں کو اپنے ساتھ گھر سے اسکول کے لیے لے جاتے اور دوپہر میں واپسی پر ساتھ لے آتے' اگر انہیں کبھی کوئی ضروری کام پڑ جاتا تو

حیدر صاحب کسی ملازم کے ہاتھ بچوں کو اسکول سے گھر چھڑا دیتے۔

ان دنوں حسن صاحب کی طبیعت بہت ناساز رہنے لگی تھی۔ گردے کے درد نے انہیں جیسے بستر سے لگا دیا تھا۔ طاہرہ بیگم سارے دن ان کی تیمارداری میں لگی رہتیں' بچے مکمل طور پر ملازم کے سپرد کر دیئے گئے تھے۔ وہی انہیں اسکول لے کر جاتا اور اسکول سے واپس لاتا۔ اس روز میرال نے اسکول کی چھٹی کی تھی کیونکہ اذلان کے پیٹ میں درد تھا اور وہ اسکول نہیں جا رہا تھا۔ امامہ، ارسلان کے سیکشن میں تھی لہٰذا ملازم ان دونوں کو لے کر چلا گیا مگر اسکول سے واپسی کے وقت وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ راستے میں گاڑی خراب ہوگئی تھی اس لیے اسے بچوں کے اسکول پہنچنے میں تھوڑی سی تاخیر ہوگئی' مگر بچوں نے اس کا ویٹ نہیں کیا اور تنہا ہی اسکول سے نکل گئے۔ وہ بہت دیر تک شہر کی مختلف شاہراہوں پر انہیں تلاش کرتا رہا ہے مگر وہ دونوں ہی اسے نہیں ملے۔

کہانی کیا تھی ایک طوفان تھا جو حیدر عباس اور حسن رضا صاحب کی زندگیوں کو ہلا کر رکھ گیا تھا۔

اپنے اپنے طور پر دونوں نے بچوں کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی' پولیس اسٹیشن میں رپورٹ لکھوائی' اخبارات میں اشتہارات دیئے' ملازم پر کیس بھی کروایا مگر بچوں کو نہیں ملنا تھا وہ نہیں ملے۔ چند ہی روز میں حفصہ بیگم اور ان کی بہن وہ علاقہ چھوڑ کر چلی گئیں۔ تاہم طاہرہ بیگم اور بتول بانو کے دلوں پر کبھی مندمل نہ ہونے والے زخم لگ کر رہ گے تھے۔ ایک عجیب سی چپ نے دونوں کو اپنے حصار میں لے لیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس سانحے کی اذیت کم ہوتی گئی تھی' حسن رضا صاحب اسکول ماسٹر سے ترقی کر کے کالج میں پروفیسر لگ گئے جبکہ حیدر عباس صاحب کا کاروبار انٹرنیشنل سطح پر پھیل گیا' اذلان اور میرال دونوں کالج لائف میں آ گئے تھے۔ تبھی حیدر صاحب کی فیکٹری کے اس ملازم نے ان پر کئی سال پہلے کا وہ راز افشا کیا تھا جس سے وہ اب تک بے خبر تھے۔

فیکٹری سے دربدری کے بعد جیل سے رہا ہو کر اس ملازم نے چند دن مزدوری کی پھر اسی کالج میں چپڑاسی لگ گیا جس میں میرال اور اذلان زیر تعلیم تھے۔ اس کے اپنے تین بچے تھے دو بیٹے اور ایک بیٹی' تاہم اس واقعے کے کچھ ہی عرصے بعد اچانک اس کا بڑا بیٹا اور پھر بیٹی معمولی بیمار رہ کر مر گئے۔ قدرت کی طرف سے کسی ماں کی آنکھ سے بہنے والے آنسوؤں کا انصاف ہو گیا تھا مگر یہ سبق اتنا بڑا تھا کہ اس کی بیوی یہ صدمہ زیادہ دن نہیں سہار سکی اور خود بھی چل بسی' تب سے اب تک اس نے تنہا اپنے زندہ رہ جانے والے بیٹے کو پالا تھا۔

ابھی پچھلے دنوں اس نے اس کی شادی کی تھی اور شادی کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ مل کر وہی بیٹا جو سلوک اس کے ساتھ کر رہا تھا اس سلوک نے اسے اپنے گناہ کا اعتراف کرنے پر مجبور کیا تھا۔

حیدر عباس اور حسن رضا صاحب اس وقت اپنے گھر کے لان میں اکٹھے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جب وہ ہاتھ باندھے انتہائی قابل رحم حلیے میں وہاں آیا تھا۔ صد شکر کہ اس وقت طاہرہ یا بتول میں سے کوئی خاتون وہاں موجود نہیں تھی۔ ملازم کے بقول تیرہ سال پہلے جو گناہ اس سے سرزد ہوا تھا' وہ گناہ اس نے حفصہ بیگم کے کہنے پر کیا تھا۔ ان دنوں حفصہ بیگم اس پر بہت مہربان تھیں اور بس انہی

کی محبت میں' اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ حیدر صاحب اور حسن صاحب دونوں ہی مدت کے بعد اپنے بچوں کے زندہ سلامت ہونے کی خبر پا کر بہت خوش ہوئے تھے تاہم دونوں نے ہی فی الحال اپنی بیگمات کو اس سے بے خبر رکھا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے جس زخم پر تیرہ سال کا مرہم لگا ہے وہ اگر پھر سے تازہ ہو گیا تو بہت نقصان ہو جائے گا۔

اپنے اپنے طور پر دونوں نے حفصہ بیگم اور ان کی بہن کو بہت تلاشا مگر دونوں کا سراغ ہی نہ مل سکا۔ بہت کوشش کے بعد صرف اتنا پتا چلا کہ زینب بی اور ان کے شوہر وفات پا چکے ہیں تاہم مرنے سے پہلے زینب بی نے امامہ حسن کو حفصہ بیگم کے سپرد کر دیا تھا جو ارسلان حیدر کی ماں کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہ رہی تھیں۔

کاغذات کا اینڈ ہو چکا تھا۔ شجاع فائل بند کر کے' کرسی کی پشت سے سر ٹکا کے پلکیں موند گیا۔

تو یہ کہانی تھی امامہ حسن کی......!

اس کے ذہن میں اس وقت جیسے جھکڑ سے چل رہے تھے' وہ اسٹڈی روم میں داخل ہوئی تھی۔

''شجاع......گڑیا آپ کے بغیر کھانا نہیں کھا رہی ہے پلیز آ کر اسے کھانا کھلا دیں۔'' وہ چونکا تھا اور پھر فوراً کرسی سے اٹھا۔

''ٹھیک ہے' میں آتا ہوں۔''

خلاف توقع اس بار اس نے اسے ڈانٹا نہیں تھا' وہ مسرور ہوتی واپس پلٹ گئی' اگلے ہی روز وہ پروفیسر حسن صاحب سے جا ملا تھا۔

''السلام علیکم سر...... مجھے شجاع حسن کہتے ہیں۔'' حسن صاحب اپنی سٹڈی میں تھے۔ وہ اطلاع کرنے کے بعد سیدھا وہیں چلا آیا تھا۔

''وعلیکم السلام......بیٹھو۔'' کتنے کمزور ہو گئے تھے وہ' شجاع عقیدت سے انہیں دیکھتا قریبی صوفے پر ٹک گیا۔

''میری خوش بختی ہے سر کہ میں نے کالج لائف میں آپ سے تعلیم حاصل کی ہے' آپ میرے استاد محترم ہیں' اور یہ بھی میری خوش بختی ہے کہ آپ کی ایک بہت قیمتی امانت میرے پاس ہے۔''

''قیمتی امانت......؟'' آنکھوں سے چشمہ اتارتے ہوئے حسن صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔ تب وہ بولا۔

''جی......قیمتی امانت...... پندرہ سال پہلے کھو جانے والی آپ کی بیٹی امامہ حسن......''

''کیا......؟'' اس کے الفاظ پر حسن صاحب کو لگا جیسے ان کا دل رک گیا ہو۔

''جی ہاں......آپ کی بیٹی امامہ حسن میری وائف ہیں اور میری کسٹڈی میں ہیں۔'' وہ بتا رہا تھا اور حسن صاحب کی آنکھیں بھر آئی تھیں' ان کا جسم ہلکے ہلکے کپکپا رہا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹا! بھلا مجھ جیسے گنہگار پر وہ پاک و بے نیاز اتنا مہربان کیسے ہو سکتا ہے۔'' انہیں جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ شجاع اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب چلا آیا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں سر...... اللہ نے چاہا تو کل ہی وہ آپ کے پاس ہوں گی۔ آپ خود ان سے مل سکیں گے انہیں دیکھ سکیں گے۔'' وہ انہیں یقین دلا رہا تھا جواب میں حسن صاحب اس کے

ٹھوں پر سر ٹکا کر کتنے ہی لمحوں تک بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے رہے تھے۔

❁❁❁

آفس ٹائم ختم ہو گیا تھا مگر وہ ابھی تک اپنی سیٹ پر بیٹھی کام کر رہی تھی۔
کل ازلان نے اسے ذرا سا لیٹ ہو جانے پر بہت ذلیل کیا تھا اور وہ روئی تھی۔ پچھلے ایک ماہ سے وہ اسے ڈس ہرٹ کر رہا تھا۔ بات بات پر کمرے میں بلا کر ذلیل کر دیتا' معمولی سی غلطی پر سب کے سامنے جھاڑ پلا کر رکھ دیتا مگر عجیب ضدی اور ڈھیٹ لڑکی تھی کہ اس پر جیسے کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔
کل آفس آتے ہوئے دونوں ایک ہی لفٹ میں پھنس گئے تھے۔ ازلان جتنا اس سے بھاگتا تھا وہ اتنی ہی جان کو آ رہی تھی۔ لفٹ اسٹارٹ ہونے کے بعد کوفت کے عالم میں وہ اپنے روم میں آیا تھا اور دن بھر اس کا موڈ سخت آف رہا تھا۔
اس وقت بھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ سر جیسے پھٹ رہا تھا درد سے...... تبھی اپنے روم سے نکل کر اس کی سیٹ کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ برہم ہوا تھا۔
''آفس ٹائم ختم ہو چکا ہے محترمہ! سب لوگ جا چکے ہیں' آپ بھی تشریف لے جایئے اب۔''
''آپ چلے جائیں سر...... میرا کام ابھی رہتا ہے مکمل کر لوں پھر چلی جاؤں گی۔'' وہ آج بہت اداس دکھائی دے رہی تھی۔ اسے اور غصہ آ گیا۔
''کیسے چلی جائیں گی باہر موسم کے تیور دیکھے ہیں آپ نے...... اور وہ چوکیدار...... اس کے ایمان کی گارنٹی ہے آپ کو......؟''
''نہیں...... مگر آپ میری اتنی فکر کیوں کر رہے ہیں......؟''
''بھاڑ میں جاؤ تم...... آئی ڈونٹ کیئر۔''
ایکدم سے مشتعل ہو کر کہتا اگلے ہی پل وہ آفس سے نکل گیا تھا مگر چاہتے ہوئے بھی گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ نہ کر سکا۔ صاعقہ پندرہ منٹ کے بعد آفس سے نکلی تو وہ گاڑی میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔
''اسٹوپڈ۔'' اس کی مسکراہٹ نے ازلان کا دل جلایا تھا۔ تاہم ابھی وہ گاڑی اسٹارٹ کر ہی رہا تھا کہ وہ بڑے اطمینان سے فرنٹ ڈور کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔
''لوگ اتنے برے بھی نہیں ہیں جتنے دکھائی دیتے ہیں۔''
''شٹ اپ...... میں نے جسٹ اپنا فرض نبھایا ہے۔ میرے آفس کی کسی لڑکی کی عزت پر اس کی اپنی حماقت سے ہی سہی' حرف آئے' میں برداشت نہیں کر سکتا۔''
''اچھا...... اور کیا کیا برداشت نہیں کر سکتے آپ......؟''
وہ اس کے غصے سے لطف اٹھا رہی تھی۔ ازلان نے چپ چاپ گاڑی اسٹارٹ کر دی۔
''آپ کو ایک مشورہ دوں اگر مانیں تو......؟''
کچھ لمحوں کے بعد' کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ پھر بولی تھی۔ ازلان خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

''ایسا کھیل کبھی نہیں کھیلنا چاہیے جو صرف آپ کو جلا کر بھسم کر دے۔'' اس کے الفاظ پر ایک دم گاڑی کو بریک لگی تھی۔

''میں اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔''

''جانتی ہوں...... مگر آپ نہیں جانتے ازلان صاحب کہ کمرے میں اگر بہت دھواں بھر جائے تو اسے کسی نہ کسی دروازے' روشندان یا سوراخ سے باہر نکالنا ضروری ہو جاتا ہے' نہیں تو دم گھٹنے سے موت واقع ہو سکتی ہے۔''

''یہ میرا مسئلہ ہے' آپ کا نہیں۔''

''اوقات یاد دلانے کا شکریہ' اب چلیں۔''

فوراً سے پیشتر وہ سنجیدہ ہوئی تھی۔ ازلان نے سر جھٹک کر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر انجن جواب دے گیا۔ بار بار کوشش کے باوجود وہ گاڑی اسٹارٹ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

''گاڑی کا انجن خراب ہو گیا ہے' دوسری گاڑی منگواتا ہوں۔''

بارش مزید تیز ہو گئی تھی۔ صاعقہ نے اپنا سیل نکال لیا تھا تاکہ گھر اطلاع دے سکے کہ وہ لیٹ ہو جائے گی مگر...... خراب موسم کے باعث اس کے سیل کے سگنل نہیں آ رہے تھے۔ ادھر ازلان بار بار اپنے دوست کو کال کر رہا تھا مگر ایک دو بیل کے بعد ہی کال ڈس کنکٹ ہو جاتی' دوسری طرف سے بھی کوئی رسپانس نہیں مل رہا تھا' اس کی پریشانی بڑھ گئی۔

''سیل کی چارجنگ ختم ہو گئی ہے' نہ آپ دیر کرتیں نہ یہ سب ہوتا۔''

''آپ کہنا چاہ رہے ہیں کہ موسم میری وجہ سے خراب ہوا ہے یا گاڑی میں نے خراب کی ہے؟''

''کچھ نہیں کہنا چاہ رہا میں......''

اس کی حیرانی پر بیزاری سے کہتا ہوا وہ گاڑی سے نکل گیا تھا۔ صاعقہ دیکھتی رہ گئی۔ بارش کی تیزی میں قدرے کمی آ رہی تھی' ازلان کچھ فاصلے پر ایک شیڈ کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ بے ساختہ میرال کی یاد اس کے دل میں کسی برچھی کی طرح پیوست ہو کر رہ گئی تھی۔ تبھی صاعقہ گاڑی سے نکل کر اس کے پہلو میں جا کھڑی ہوئی۔

''سنا ہے میرال کو بھی بارش بہت پسند تھی۔ کاش آپ اس سے بے وفائی نہ کرتے تو وہ یوں ہرگز نہ مرتی۔''

''میری وجہ سے نہیں مری وہ اور بے وفائی بھی اس نے کی تھی میں نے نہیں۔'' زخمی سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے وہ پھنکارا تھا۔ صاعقہ مسکرا دی۔

''یہ بارش بھی ناں...... بھولنے نہیں دیتی کچھ بھی......''

''آپ تھوڑی دیر کے لیے خاموش نہیں رہ سکتیں۔'' اس کی مسکراہٹ پر وہ جلا جبکہ صاعقہ نے دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔

''بارش کی بنیاد میں جانے کس کے اتنے آنسو ہیں
صدیوں پہلے شاید کوئی' صدیوں بیٹھ کے رویا ہے''

دھیمے لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے اسے بھی بہت کچھ یاد آیا تھا۔ ازلان کی آنکھیں بھر آئیں۔

''ہوائیں دل دکھائیں گی
سنو پاگل......!
کھڑے رہنے سے کیا حاصل
ہوا تو بس یہی ہوگا
ہوائیں دل دکھائیں گی
نگاہیں بھیگ جائیں گی
چلو اندر چلے آؤ
سنا ہے جو بھی مرضی سے چلا جائے
کبھی واپس نہیں آتا......''

برسوں پہلے میراں حسن نے یہ نظم اس کی ڈائری میں' خود اپنے ہاتھوں سے تحریر کی تھی اور اب اسی نظم کا ایک ایک لفظ اس کی زندگی کا روگ بن گیا تھا۔

''آپ کو پتا ہے اذلان صاحب! جو لوگ اپنی ذات کے برزخ میں جلتے ہیں' ان کے تن پر بارش کے یہ سرد قطرے بھی کوئی اثر نہیں کرتے۔'' عادت سے مجبور ہاتھ پھیلا کر بارش کے سرد قطروں کو اپنی ہتھیلی پر گراتے ہوئے وہ پھر بولی تھی۔ اذلان نے شیڈ کے پلر سے ٹیک لگالی۔

''نہیں......''

کتنا ٹھہراؤ تھا اس کے لہجے میں...... صاعقہ سرد آہ بھر کر رہ گئی۔ عین اسی لمحے ایک گاڑی ان کے قریب سے گزری تھی' اور پھر رک گئی۔ اگلے ہی پل عباد یاور اس گاڑی سے نکلا تھا۔ صاعقہ کی نگاہ جیسے ہی اس پر پڑی' وہ جیسے پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہوگئی' جبکہ دوسری طرف عباد کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔

❁❁❁

رات بھر کی سخت بے سکونی کے بعد صبح جو فیصلہ اس نے کیا وہ ''شاہ پیلس'' سے چپ چاپ چلے جانے کا تھا۔ اب تک وہ صرف اپنے بیٹے کے لیے یہاں رہ رہی تھی مگر اب شاید اس کے بیٹے کو بھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اچھی ماں بھی ثابت نہیں ہوسکی تھی' تبھی رات بھر سوچنے کے بعد اس نے شاہ زر اور چاند کی زندگی سے نکل جانے کا فیصلہ کرلیا تھا تاکہ وہ دونوں اپنی زندگی اپنے طور سے بہتر انداز میں بسر کرسکیں۔ شاہ زر نے آفس کے لیے نکلتے وقت خصوصی اس کا چہرہ پڑھا تھا اور وہ اسے بہت بے چین محسوس ہوئی تھی۔ وہ ٹھہرا تھا' کچھ کہنے کے لیے لب بھی وا کیے مگر...... پھر فوراً ہی ہونٹوں کو ایک دوسرے میں پیوست کرتے ہوئے وہ تیزی سے نکلتا چلا گیا تھا۔ چاند بھی تیار ہوچکا تھا' بیگ پہنے' ٹفن باکس اٹھائے اس نے جھک کر انوشہ کے گالوں پر بوسہ لیا اور پھر خدا حافظ کہہ کر شاہ زر کے پیچھے ہی بھاگ گیا' انوشہ کی آنکھوں سے دو آنسو بڑی خاموشی سے بہے تھے۔

تھکے تھکے سے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں آکر اس نے شاہ زر کے نام ایک خط لکھا اور پھر اپنے پاس جمع شدہ تمام رقم وہیں کاغذ کے ٹکڑے کے ساتھ' بیڈ پر رکھ کر' اپنا پرس اٹھاتی ہوئی وہ اپنے کمرے سے نکل آئی تھی' کمرا لاک کرنے کے بعد سیڑھیاں کراس کرتے ہوئے وہ نیچے ہال میں

آئی۔ ملازمہ حسب معمول کچن میں مصروف تھی وہ اسے کچھ بھی بتائے بغیر گھر سے نکل آئی۔ زندگی میں ہر مسئلے کا حل فرار نہیں ہوتا' مگر وہاں...... شاید سب کی تقدیر میں ''دربدری'' لکھ دی گئی تھی' بھری ہوئی پلکوں پر' وقت کی گرد جم جم کر انہیں اتنا بوجھل بنا رہی تھی کہ اس کہانی کے سارے کرداروں کے لیے جینا عذاب ہو گیا تھا۔

❃❃❃

ہم تو وہ لوگ ہیں جو
نہ کسی کے دست شمار میں ہیں
نہ کسی کی نگاہ کے حصار میں ہیں
یوں جیسے ہو کوئی صدیوں کا بے انت سفر
صحرا' صحرا پھرتا' کوئی خاک بسر
کیا پوچھتے ہو ہم سے کہ کون ہیں ہم
ہم تو جگنو بھی نہیں جو کسی کی آنکھ میں چمکتے
کسی کو سنوارتے
ہم تو آنسو کی طرح ہیں
آنکھ سے ٹپکے اور ڈوب گئے
محبت کی آس میں گھر سے نکلے اور بے سمت مسافت میں
دربدر پھرتے ہوئے
بے نام شام کی نذر ہوئے

''سائیڈ پر ہو کے بیٹھو بی بی' تین لوگوں کی سیٹ ہے یہ۔''

گم حواس کے ساتھ اپنے خیالوں میں ڈوبی' وہ بس کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی جب کنڈیکٹر کی کڑک دار آواز نے اسے چونکا دیا۔

مسافروں سے کھچا کھچ بھری اس بس میں ضرورت سے زیادہ لوگ ٹھونسے جا چکے تھے۔ انوشہ کی ٹانگیں ساتھ بیٹھے ایک نامحرم مرد کی ٹانگوں سے مس ہو رہی تھیں۔ ہزار سکڑنے اور سمٹنے کے باوجود وہ اپنے وجود کو ساتھ بیٹھے نامحرم مرد کے وجود سے محفوظ نہیں رکھ پا رہی تھی۔ مارے بے بسی کے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

کتنی مشکل سے کراچی جانے والی بس میں جگہ ملی تھی۔ مردوں سے کھچا کھچ بھری اس بس میں بیٹھنے کے بعد اسے اپنی حقارت کا اور بھی شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

ایک عورت کی زندگی میں عزت اور محرم مرد کی کیا اہمیت ہوتی ہے بہت اچھی طرح سے معلوم ہو رہا تھا اسے۔ وہ پھر حالات کی نذر ہونے کی خواہاں نہیں تھی مگر اس کے اندر کا جو لاوا تھا وہ اسے چین لینے نہیں دے رہا تھا۔ اس وقت وہاں گاڑی میں مردوں کی اکثریت تھی۔ جن کی بھوکی نگاہیں' دوپٹا اچھی طرح لپٹا ہونے کے باوجود اس کے وجود کو نوچ رہی تھیں۔

اس نے کبھی یوں بسوں میں طویل سفر نہیں کیا تھا مگر اب وہ خود جان بوجھ کر اس صلیب پر لٹک

گئی تھی۔ کراچی صباء احمد کی شادی ہوئی تھی۔ اسی صباء احمد کی جو یونیورسٹی میں اس کی واحد عزیز ترین دوست تھی۔ جس سے ہمیشہ اس نے اپنا ہر دکھ سکھ بلا جھجک شیئر کیا تھا۔

اس وقت بھی جب وہ خود سے بھاگ رہی تھی۔ بھری دنیا میں اسے کوئی ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا جس سے وہ دل کی بات کر سکتی۔ تب اسے صباء احمد یاد آئی تھی۔ جو اپنی شادی کے بعد بھی کبھی اس کی ذات سے یکسر غافل نہیں ہوئی تھی۔

تختہ ہوئی کمر کے ساتھ رات کے جانے کسی پہر اچانک اس کی آنکھ کھل تھی۔

اسے لگا جیسے اس کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہوں۔ کرنٹ کھا کر وہ سیدھی ہوئی تو اس نے دیکھا بس میں برابر والی سیٹ پر بیٹھا وہ ادھیڑ عمر مرد اس کے وجود کو اپنے ناپاک ہاتھوں سے جانچ رہا تھا۔ انوشہ کا دل چاہا وہ اسے زوردار تھپڑ لگا کر بس سے اتر جائے۔ مگر منزل ابھی بہت دور تھی اور رات کے اس پہر کسی اور گاڑی کا اس ویرانے میں ملنا قطعی ممکن نہیں تھا۔

زندگی میں پہلی بار کسی کی غلط حرکت پر وہ چپ رہی تھی۔

زندگی میں پہلی بار اسے یقین آیا تھا کہ مرد اپنے نفس کی بھوک کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔

پنڈی سے کراچی کا وہ سفر اس پر زندگی کی بہت سی تکلیف دہ حقیقتیں آشکار کرنے کے لیے یادگار ثابت ہوا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے قریب جب وہ کراچی بس اسٹاپ پر اتری اسے لگا اس کے اندر کی خوددار اور مضبوط عورت مر چکی ہو۔ صباء احمد اسے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیرت سے گنگ رہ گئی تھی۔ کتنے سالوں کے بعد وہ انوشہ رحمان کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا انوش...... مجھے تو سچ میں یقین نہیں آ رہا کہ میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہوں مگر بہت تھک چکی ہوں۔ کیا اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی۔"

"ارے یہ کیا بات ہوئی۔ میری عزیز از جان دوست سالوں بعد چل کر میری دہلیز تک آئی ہے اور میں اسے اندر آنے کو نہ کہوں ایسا ہو سکتا ہے کیا؟"

خوشی سے بے حال وہ اسے بازو سے تھام کر گھر کے اندر لائی تھی۔ تھوڑے سے ریسٹ کے بعد انوشہ فریش ہو کر لاؤنج میں آئی تو صباء اس کے لیے کھانا لگا چکی تھی۔

"مجھے پتا ہے تم لمبا سفر کر کے آئی ہو اس لیے بھوک لگی ہوگی۔ چلو بلا تکلف شروع ہو جاؤ۔"

چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف وہ اسے ہدایت دے رہی تھی۔ انوشہ دل نہ چاہنے کے باوجود نوالے توڑنے لگی۔ گوبھی گوشت بنا تھا اور صباء کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔

کھانا کھلانے کے بعد وہ اسے گیسٹ روم میں لے آئی تاکہ وہ آرام کر لے۔

شام میں پرسکون نیند کے بعد وہ بیدار ہوئی تو صباء اس کے پاس چلی آئی۔

"جی جناب کہیے کیسے مزاج ہیں آپ کے؟ تھکن کچھ کم ہوئی کہ نہیں؟"

"کس تھکن کی بات کر رہی ہو؟ زندگی کی تھکن یا سفر کی......؟" کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے اس نے پیچھے دھرے تکیے سے ٹیک لگالی تھی۔ صباء مسکرا دی۔

"فی الحال تو سفر کی بات کر رہی ہوں۔ ٹرین سے آئی تھیں یا جہاز سے۔"

''نہ ٹرین نہ جہاز۔ بس سے آئی تھی۔''
''کیوں شاہ زر بھائی نے اعتراض نہیں کیا؟''
''وہ اعتراض کرنے کا حق کھو چکا ہے صباء اس شخص نے مجھے اپنی زندگی سے نکال پھینکا ہے۔''
''کیا مطلب تم کہنا چاہتی ہو کہ تمہاری شاہ زر بھائی سے علیحدگی ہو چکی ہے۔''
''ہاں۔''
''مگر کیوں اور کیسے۔''
''کیا ضروری ہے کہ ہم صرف اسی موضوع پر بات کریں۔''
''ہاں کیونکہ یہ میری دوست کی زندگی کا معاملہ ہے۔''
''زندگی' زندگی' زندگی..... کون سی زندگی صباء؟ کیا وہ زندگی تھی جب ماں اور باپ دونوں کے ہوتے ہوئے میں کسی لاوارث کی طرح اپنے ننھیال کی دہلیز پر پڑی ان کی دل شکن باتیں سنتی تھی اور پل پل مجھے اپنے زندہ رہنے پر افسوس ہوتا تھا۔ کیا وہ زندگی تھی جب اپنے سگے باپ کے گھر ہوتے ہوئے میری حیثیت ایک ملازمہ سے بڑھ کر نہیں تھی۔ گھر میں جس کا جو دل چاہتا تھا میرے ساتھ سلوک کرتا تھا مگر کوئی ان سے باز پرس کرنے والا نہیں تھا۔ کیا ہوتی ہے زندگی؟ ایک ان چاہے نا پسندیدہ ترین شخص کے ساتھ اس کے احسانوں کے بوجھ تلے دب کر رہنا؟ کب تک صباء جس کہانی کا کوئی اختتام نہ ہو میں زندگی کی آخری سانس تک اس کہانی کا کردار بن کر نہیں رہنا چاہتی۔ اگر یہ زندگی ہے' اسی کو زندگی کہتے ہیں تو مجھے یہ زندگی نہیں چاہیے۔'' وہ رو پڑی تھی صباء نے لپک کر اسے گلے سے لگالیا۔

''ایسے نہیں کہتے انوشہ زندگی تو خدا کی آزمائش ہے۔ ایک امتحان ہے جو اللہ نے صرف ہمیں ہمارے اعمال جانچنے کے لیے دی ہے۔ خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔''

''میں اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں صباء! بس مجھے یوں لگتا ہے جیسے خدا مجھ سے راضی نہیں ہے۔''

''استغفار' ایسے نہیں سوچتے خدا کے بارے میں برا گمان رکھنا بھی گناہ ہے' اللہ نہ کرے کہ وہ پاک ذات کبھی خفا ہو تم سے۔ تمہیں پتا ہے وہ جن سے خفا ہوتا ہے انہیں نیست و نابود کر دیتا ہے۔ باقی رہ جانے والے لوگوں کے لیے عبرت بنا دیتا ہے۔ تم پریشان نہ ہو' میں کرتی ہوں تمہارے لیے کچھ نہ کچھ۔'' وہ اسے خود سے لگائے تسلی دے رہی تھی۔

انوشہ اپنے آنسو پیتے ہوئے اس کے گلے سے لگی رہی۔

اگلے دو روز کے بعد وہ لان میں بیٹھی تھی جب صباء نے اسے اس کی جاب کی خوشخبری سنائی۔ انوشہ نے اس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔

''تم واقعی ایک عظیم دوست ہو صباء' میں زندگی کے ہر موڑ پر تمہاری مقروض رہوں گی۔''

''بس بس زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں ہے' میں نے ناشتا بنا لیا ہے جلدی سے آجاؤ۔'' اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے اس کا گال تھپتھپا کر وہ واپس مڑ گئی تھی۔

ناشتے کے دوران انوشہ نے اس سے پوچھا تھا۔

''صباء اگر تم محسوس نہ کرو تو میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''ہوں پوچھو۔'' وہ چائے بنانے میں معروف تھی۔

انوشہ نے ہاتھ میں پکڑا کپ دوبارہ میز پر رکھ دیا۔

''تین دن ہو گئے مجھے تمہارے گھر آئے ہوئے مگر ان تین دنوں میں میں نے تمہارے شوہر کو ایک بار بھی نہیں دیکھا کیا تم اکیلی رہتی ہو یہاں؟''

''نہیں......رات آئے تھے......تم سو رہی تھیں......میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔''

''اور اب کہاں ہیں وہ کیا سو رہے ہیں؟''

''ہاں رات دیر سے سوئے تھے تو اب دیر سے ہی اٹھیں گے۔''

''ہوں، ویسے تمہارا خیال تو رکھتے ہیں ناں مطلب پیار ویار کرتے ہیں۔''

''ہوں، کرتے ہیں۔''

''بچوں، وچوں کے بارے میں کیا سوچا ہے تم لوگوں نے؟''

''فی الحال تو کچھ بھی نہیں سوچا۔ مستقبل میں شاید کچھ ہو جائے۔''

''کیا مطلب تین سال ہو گئے تمہاری شادی کو اور ابھی تک کچھ بھی نہیں سوچا۔ پاگل لڑکی ہو تم۔ تمہیں پتا ہے کسی بھی مرد کو صرف بچوں کی ڈوری سے ہی قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان بچے پل کا کام کرتے ہیں۔''

''اچھا تم ناشتا کرو، میں ذرا کچن دیکھ لوں۔''

پل میں ڈسٹرب ہوتے ہوئے وہ اپنی سیٹ سے اٹھی تھی۔ انوشہ حیرانی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

دوپہر میں جب وہ اپنے کمرے میں مقید بانو قدسیہ کی ''راجہ گدھ'' کا مطالعہ کر رہی تھی تو اچانک لاؤنج سے کسی مرد کے چنگھاڑنے کی آواز آئی تھی۔

''گھٹیا عورت کسی بات کا سلیقہ ہے تم میں کہ نہیں۔'' وہ بھاگ کر کھڑکی کے قریب آئی تھی۔ باہر لاؤنج کا منظر اسے برف کر دینے کے لیے کافی تھا۔ صباء احمد کپکپاتے وجود کے ساتھ رو رہی تھی۔ جبکہ اس کا ہم سفر سر کا تاج کہلانے والا وہ مرد ایک اور حسینہ کے کپڑوں پر گری چائے اپنے رومال سے صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس مرد نے صباء کو دھکا دے کر سائیڈ پر گرایا اور خود اس اجنبی حسینہ کا ہاتھ تھام کر لاؤنج سے نکل گیا۔ انوشہ کی آنکھیں جیسے پتھر ہو گئی تھیں۔

جانے کیوں اس لمحے اسے عبدالصمد یاد آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام بدترین دن اور راتیں بھی جو اس نے اس کی رفاقت میں بسر کی تھیں۔ مرد کا یہ روپ کتنا بھیانک اور ان مٹ تھا۔ جس وقت وہ کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئی صباء دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''صباء۔'' اس کے مقابل بیٹھ کر جونہی اس نے اس کے ہاتھ تھامے وہ جیسے ٹوٹ گئی۔

انوشہ کو لگتا تھا جیسے دنیا میں اس سے زیادہ دکھی لڑکی دوسری کوئی نہیں ہے مگر اس وقت صباء احمد کو ٹوٹ کر روتے ہوئے دیکھنے کے بعد اس نے جانا تھا کہ صباء احمد بھی بہت دکھی لڑکی ہے۔ مگر اس نے

اس طرح اپنے غموں کو اشتہار بنا کر گلے میں نہیں لٹکایا ہوا تھا۔

رات کھانے کی ٹیبل پر وہ دونوں خاموش بیٹھی تھیں۔ تبھی انوشہ نے پوچھا تھا۔

''کب سے چل رہا ہے یہ سب۔''

''پچھلے تین سال سے۔''

''کیا مطلب تم تین سال سے اس گھٹیا مرد کے ہاتھوں ذلیل ہو رہی ہو۔''

''ہاں۔''

''مگر کیوں، تم پڑھی لکھی ہو، خوب صورت ہو، اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہو پھر یہ سب کیوں؟''

''کیا فرق پڑتا ہے پڑھا لکھا خوب صورت اور امیر کبیر ہونے سے تم کیا سمجھتی ہو انوشہ! دکھ صرف انہی لڑکیوں کو ملتے ہیں جن کا کوئی نہیں ہوتا؟''

''نہیں مگر تم اپنے لیے بہتر فیصلہ کرسکتی ہو، چھوڑ سکتی ہو اس شخص کو جو تم جیسی پیاری لڑکی کے قابل نہیں ہے۔''

''سو واٹ؟ کیا ہوگا اسے چھوڑ دینے سے؟ یہی نا کہ بھائیوں کے کندھوں پر پھر سے بوجھ بن کر لدھ جاؤں گی۔ بھابیوں کی راتوں کی نیندیں میرا بوجھ پھر سے ہلکا کرنے کی فکر میں اڑ جائیں گی۔ روز وہ میرا وجود اپنے لفظوں کے نشتر سے چھلنی کریں گی اور میں روز سر جھکا کر اپنے مرنے کی دعا مانگوں گی۔ تمہیں پتا ہے انوشہ! ایک عورت کی زندگی میں اس کے اپنے گھر کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ میں پچھلے تین سالوں سے یہ عذاب سہہ رہی ہوں مگر آج تک میرے بھائیوں کو اس بات کا پتا نہیں چلا اور میری اللہ سے دعا ہے کہ میری زندگی تک انہیں کبھی پتا بھی نہ چلے، کیونکہ میں جانتی ہوں جس دن انہیں اس بات کا پتا چلا وہ بھی کچھ نہیں کرسکیں گے مگر...... میری ذات اور حقیر ہو کر رہ جائے گی۔ اب چلو میکے میں تو عزت ہے نا۔'' اپنے میکے میں ذرا سی عزت کے لیے پھول سی لڑکی کتنی اذیتیں اٹھا رہی تھی۔

انوشہ سن بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔

''کون ہے وہ لڑکی جس کے لیے وہ تمہیں ذلیل کر رہا ہے۔'' بہت دیر کے بعد اس نے پوچھا تھا۔ صباء نے جواب میں سر جھکا لیا۔

''بیوی ہے اس کی۔ یونیورسٹی میں دونوں کا افیئر چلا اور دنوں نے گھر والوں کی مرضی کے خلاف کورٹ میرج کر لی۔''

''تمہیں پتا تھا شادی سے پہلے اس بات کا۔''

''نہیں کسی کو بھی نہیں پتا تھا۔ شادی کی پہلی رات بتایا تھا ارسلان نے مجھے۔''

''اور بچے نہ ہونے کی بھی یہی وجہ ہے؟''

''ہاں اس لڑکی کو میرے بطن سے ارسلان کا بچہ گوارہ نہیں ہے۔ اسی لیے وہ نہیں چاہتے کہ میں ماں بنوں، دو بیٹیاں ہیں ویسے ان کے پاس۔''

''مگر یہ ظلم ہے وہ شخص تمہیں تمہارے بنیادی حق سے محروم نہیں رکھ سکتا۔''

''رکھ رہا ہے۔ ماں باپ کے دباؤ میں اس نے شادی کی ہے مگر خود کو میرا پابند نہیں کیا۔''

''ماں باپ کہاں ہیں اب اس کے؟''

''وفات ہو گئی ہے ان کی' دو سال پہلے باپ اور ابھی تین ماہ پہلے ماں۔ اسی لیے تو وہ اس لڑکی کو یہاں گھر لانے لگے ہیں۔ جب وہ یہاں آتی ہے تو ارسلان مجھے اس کی ملازمہ بنا دیتے ہیں۔ آج ابھی اس لڑکی کی کہنی لگنے سے چائے چھلکی' میرا پاؤں اور پیٹ جلا مگر تھپڑ بھی مجھے ہی پڑا۔ کیا شاہ زر بھی تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا تھا؟'' بات کرتے کرتے اچانک اس نے پوچھ لیا تھا۔ انوشہ گنگ رہ گئی۔ بے ساختہ اسے شاہ زر آفندی کا لہجہ اور الفاظ یاد آئے تھے۔

''بکواس کی تھی میں نے تم سے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یوں کرتے ہیں محبت کرنے والے؟ نہیں...... میں تم سے محبت نہیں کرتا مگر اس کے باوجود تم دھڑکن بن کر میرے سینے میں دھڑکتی ہو' تمہاری آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں تو میرا جگر کٹتا ہے۔ تم نفرت سے منہ پھیرتی ہو تو میرے سینے میں سانس الجھنے لگتی ہے۔ میں تم سے محبت نہیں کرتا انوشہ' پھر بھی تکلیف ہوتی ہے تو میں تڑپ اٹھتا ہوں۔ پاگل کر دیا ہے تم نے مجھے' میں تمہیں دیکھنا نہیں چاہتا سوچنا نہیں چاہتا۔ پھر بھی تم ایک پل کے لیے نگاہ سے اوجھل ہوتی ہو تو میں مرنے لگتا ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں تم پتھر ہو' مر جاؤں گا تم سے سر ٹکراتے ٹکراتے مگر پھر بھی میں باز نہیں آ رہا۔ کتنی سنگدل ہو تم۔''

''ہاں۔'' بے خیالی میں اس نے سر ہلا دیا تھا۔

''اوو یری سیڈ۔ کیا اس کی زندگی میں بھی کوئی لڑکی تھی۔''

''ہاں۔''

''پتا نہیں یہ مرد ایسے کیوں ہوتے ہیں اور پتا نہیں ہم عورتیں ایسی کیوں ہوتی ہیں؟'' قدرے شکستہ سی صباء برتن سمیٹنے لگی تھی۔ انوشہ گم سم سی بیٹھی جانے کیا کیا سوچتی رہی۔

❄❄❄

وہ ابھی تھک کر آفس سے واپس گھر آیا تھا۔ جب چاند سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اس کے قریب چلا آیا۔

''السلام علیکم پاپا۔''

''وعلیکم السلام بگ باس۔ کیسے ہو؟''

''ناٹ ہیپی پاپا۔''

شاہ زر جوتے اتار رہا تھا اس کے جواب میں ایک دم سے سیدھا ہو بیٹھا۔

''کیوں؟''

''مما' نہیں ہیں گھر پر۔''

''تو آفس گئی ہوں گی بیٹا۔ اس میں ناخوش ہونے والی کون سی بات ہے۔''

''وہ آج آفس نہیں گئیں۔ آنٹی بتا رہی تھیں ان کے آفس سے فون آیا تھا۔ وہ بھی ان کا پوچھ رہے تھے۔ مجھے لگتا ہے پاپا! مما ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ میں نے کہا تھا نا وہ ہمیں چھوڑ کر چلی جائیں گی۔''

اس بار چاند کے الفاظ پر اس کا دل دھڑکا تھا۔ واقعی وہ صبح بہت ڈسٹرب تھی۔ شاہ زر نے الجھی نظر چاند کو دیکھا پھر اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے فوراً اٹھ کر انوشہ کے کمرے کی طرف چلا آیا۔ جہاں بیڈ کے پاس پڑا کاغذ کا وہ ٹکڑا جو وہ پیسوں کے نیچے دبا کر رکھ گئی تھی جیسے شدت سے اس کا منتظر تھا کمرے کا لاک بھی شاہ زر نے ہی کھولا تھا۔

قطعی سن دماغ کے ساتھ' پیسوں کے نیچے دبا وہ کاغذ اٹھاتے ہوئے اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ لکھا تھا۔

''میں جا رہی ہوں شاہ زر' کہاں...... یہ ابھی میں خود بھی نہیں جانتی مگر میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اب واقعی آپ کے گھر میں میری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چاند آپ کا بیٹا ہے اسے قدم قدم پر آپ کے نام اور آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ میں نہ کبھی اچھی بیٹی بن سکی' نہ اچھی بہن' نہ اچھی بیوی اور نہ ہی اچھی ماں۔ اسی لیے میں نے اس گھر سے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے کیونکہ میں مزید آپ کے احسانوں کے بوجھ تلے دب کر جینا نہیں چاہتی۔ جو دن میں نے آپ کے گھر کی چھت تلے گزارے ان کا معاوضہ ساتھ رکھ کر جا رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں یہ پیسے کم ہیں مگر میرے پاس فی الحال یہی ہیں۔ میں نے اپنی جاب سے بھی ریزائن دے دیا ہے۔ ریزائن لیٹر اسی خط کے ساتھ چھوڑے جا رہی ہوں۔ کمپنی تک پہنچا دیجیے گا اور ہاں چاند کا بہت خیال رکھیے گا۔ اسے اس بری ماں کی کمی محسوس مت ہونے دیجیے گا میں آپ کے گھر سے سوائے اپنی ذات کے اور کچھ بھی لے کر نہیں جا رہی ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔''

فقط انوشہ

خط کیا تھا موت کا پیغام تھا اس کے لیے۔ شاہ زر کو لگا جیسے اس کے قدموں سے جان نکل گئی ہو۔ اگر اسے اس کے ارادوں کی ذرا سی بھی خبر ہوتی تو وہ ہرگز اسے یہ قدم نہ اٹھانے دیتا مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟

دونوں آنکھوں کے گوشے انگوٹھے سے دباتے ہوئے وہ سر جھکا کر بیڈ پر بیٹھ گیا تھا جب چاند بے قرار سا وہیں چلا آیا۔

''پاپا مما کا پتا چلا؟''

کیسی کسک و بے تابی تھی اس کے لہجے میں۔ شاہ زر نے ہاتھ بڑھا کر اسے خود سے لگا لیا۔

''نہیں مگر آپ پریشان نہ ہوں' جیسے آپ پاپا کو مل گئے تھے ویسے ہی مما بھی مل جائیں گی۔ ہم دونوں مل کر انہیں ڈھونڈ لیں گے' رائٹ۔''

''جی پاپا۔''

''گڈ چلو اب آپ کھانا کھاؤ' پھر ہوم ورک کر کے کارٹون دیکھنا میں ذرا ریسٹ کرلوں۔''

اس کے اعصاب اس وقت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے تھے۔ چاند کے کمرے سے جانے کے بعد وہ کمرا بند کر کے انوشہ کے کمرے میں ہی بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ دونوں آنکھوں پر بازو رکھ کر اس نے لائٹ بھی آف کر دی۔

کہاں جا سکتی تھی وہ اور وہ بھی خالی ہاتھ؟ شاہ زر کو اس سے قطعی اس حماقت کی توقع نہیں تھی۔

اب وہ کرتا بھی تو کیا اگر کسی سے شیئر کرتا تو یقیناً انوشہ کی رسوائی ہوتی جبکہ وہ پہلے ہی دنیا کی نظر میں معتبر نہیں تھی۔ ایک عجب دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس نے اسے کہ جہاں نہ وہ سکون سے جی سکتا تھا نہ مر سکتا تھا۔

❊❊❊

بارش خوب تیز ہو رہی تھی۔

وقفے وقفے سے بجلی کی گرج چمک نے اسے اچھا خاصا سہا دیا تھا۔ مگر شجاع ابھی تک گھر واپس نہیں آیا تھا۔ نجانے وہ کہاں تھا اتنی دیر تو اس نے کبھی نہیں کی تھی۔

امامہ گڑیا کو کھانا کھلا کر سلانے کے بعد' گلاس ونڈو میں آ کھڑی ہوئی۔ باہر روڈ کے اس پار گمبھیر اندھیرا تھا۔ بالکل ویسا ہی اندھیرا جیسا وہ اپنی زندگی میں محسوس کر رہی تھی۔ ارسلان ابھی جیل سے رہا نہیں ہوا تھا۔ مگر اسے اب جیسے اس کی پروا بھی نہیں تھی بہت توڑ چکا تھا وہ شخص اسے اور اس میں اب مزید ٹوٹنے کی ہمت نہیں تھی۔

ایک عورت کے لیے عزت اور محبت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مگر ارسلان حیدر کے دل میں اس کے لیے نہ عزت تھی نہ محبت۔ اس شخص کو جو اس سے محبت کا دعوے دار تھا اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ اوباش لوگوں کے ہاتھوں اپنی عزت گنوا بیٹھے۔ اس کے برعکس شجاع نے کبھی محبت کے بلند و بانگ دعوے نہیں کیے تھے پھر بھی اسے برا لگا تھا۔ ایک اجنبی محفل میں کسی اجنبی شخص کا اسے چھونا اور اتنا برا لگا تھا کہ پچھلے تین ہفتوں میں اس نے ضرورت کے تحت بھی اس کی طرف دیکھنا گوارہ نہیں کیا تھا۔

وہ شخص اپنی محبت اور نفرت دونوں میں بہت ایماندار تھا۔

امامہ چپ چاپ اسے سوچ گئی۔

بجلی پھر چمکی تھی اور شاید کڑک کر قریب کے کسی ایریا میں گری بھی تھی۔ امامہ دہل کر رہ گئی۔ مختلف آیات کا ورد کرتے ہوئے وہ شدت سے شجاع کی واپسی کی منتظر تھی۔ جب وہ دعا کی قبولیت کی صورت تھکا تھکا سا گھر واپس چلا آیا۔ امامہ نے اسے دیکھا اور سکون و اطمینان کی ایک لہر اس کے اندر تک سرایت کر گئی۔

آج دوپہر میں اس کی فائزہ آپا سے بات ہوئی تھی اور انہی سے اسے بہت سی وہ باتیں پتا چلی تھیں جو اس کے علم میں نہیں تھیں۔ وہ ابھی سونے کے لیے بیڈ پر آئی تھی کہ وہ اس کے کمرے میں چلا آیا۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے' اسٹڈی میں آؤ۔"

ٹراؤزر کی پاکٹس میں ہاتھ گھسائے سرد مہری سے کہہ کر وہ واپس پلٹ گیا تھا۔ امامہ حیران و پریشان سی ہزار خدشوں کے ساتھ اس کے پیچھے اسٹڈی میں چلی آئی۔

"جی کہیے۔"

"صبح اپنا سامان پیک کر لینا اب مزید تم اس گھر میں نہیں رہو گی۔"

بنا اس کی طرف دیکھے اس نے فوراً سے پیشتر اپنا مدعا بیان کر دیا تھا امامہ سن رہ گئی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ' کیا گڑیا کے اسکول کا بندوبست ہوگیا ہے؟''
''نہیں۔''
''پھر' پھر کیوں دیس نکالا دے رہے ہیں آپ مجھے؟ میں نے مانا کہ میں خطا کار ہوں گنہگار ہوں اپنے رب کی' مگر...... میں نے معافی بھی تو مانگی ہے آپ سے' آپ نے کہا تھا میں آپ کے سامنے نہ آؤں' میں نہیں آئی۔ ایک حرف شکایت تک زبان پر نہیں لائی میں پھر بھی' پھر بھی آپ چاہتے ہیں میں یہاں سے چلی جاؤں۔''
''ہاں۔''
''مگر کیوں؟'' وہ دکھ سے چلا اٹھی تھی جب وہ رخ پھیرتے ہوئے بولا۔
''اس لیے کیونکہ تم کسی کی زندگی کا اثاثہ ہو۔''
''نہیں ہوں میں کسی کی زندگی کا اثاثہ' وہ سب جھوٹ تھا۔ فریب تھا میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں شجاع! میں گڑیا کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔''
''پاگل پن کی باتیں مت کرو تم جانتی ہو میں تمہیں کن سے ملوانا چاہتا ہوں۔'' اس بار وہ برہم ہوا تھا۔ امامہ گم صم سی اسے دیکھے گئی۔
''نہیں' کن سے ملوانا چاہتے ہیں۔''
''تمہارے ماں باپ سے ان ماں باپ سے جنہوں نے پانچ سال کی عمر میں تمہیں کھو دیا تھا۔ وہ زینب بی اور اس کا شوہر تمہارے ماں باپ نہیں تھے۔ تمہارے ماں باپ حسن انکل اور طاہرہ آنٹی ہیں۔ جن سے تمہیں چھین لیا گیا تھا۔ پڑھو یہ سارے حقائق اور جان لو کہ تمہاری زندگی کی کہانی کیا ہے۔''
قطعی درشتگی سے کہتے ہوئے اس نے ڈی ایس پی حزام کی تیار کردہ فائل اور چند فوٹو' اسٹڈی ٹیبل پر پٹخ دیے تھے۔ امامہ جیسے برف ہوگئی۔
''تم چاہو گی تو میں تمہیں ڈائیورس دے دوں گا۔ مگر یہ طے ہے امامہ حسن کہ ہمارے راستے اب کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔''
قطعی سنگدلی سے اپنا فیصلہ سنانے کے بعد وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا مگر امامہ ضرور بھونچکا رہ گئی تھی۔ کیا وہ شخص اپنی نفرت میں اس حد تک بھی جا سکتا تھا؟

❋❋❋

اس نے وہ رپورٹ پڑھ لی تھی اور اب پچھلے چالیس منٹ سے خوب رونے کے بعد وہ شجاع حسن کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس شخص نے اس پر ایک اور احسان کیا تھا کہ اسے اس کی پہچان لوٹا دی تھی۔ وہ جو بھری دنیا میں خود کو بے آسرا سمجھ رہی تھی یہ حقیقت جاننے کے بعد کہ وہ ایک رئیس آدمی کی چہیتی اولاد ہے کتنی پرسکون ہوگئی تھی۔
اسے یاد آرہا تھا حفصہ بیگم جب بھی زینب بی سے ملتی تھیں ان کی باتوں میں کبھی حسن رضا اور حیدر عباس کا ذکر ہوتا تھا۔ امامہ نے کئی بار زینب بی سے ان دونوں ناموں کے بارے میں پوچھا تھا

جواب میں ہمیشہ انہوں نے اسے فرضی کہانی سنا کر ٹال دیا تھا۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ جب زینب بی کی وفات ہوئی تھی تو وہ بہت بے چین تھیں۔ بار بار اسے کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر زبان بندی کی وجہ سے محض ہکلا کر رہ جاتیں۔ ارسلان حیدر کے بقول حفصہ بیگم نے بھی مرنے سے پہلے اسے اپنے پاس بلانا چاہا تھا بہت ممکن تھا کہ شاید انہوں نے ارسلان حیدر کو یہی سچائی بھی بتادی ہو۔

وہ سوچتی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔

شجاع نیند میں تھا جب اسے اپنے پیروں پر کسی کے نرم ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا' ادھ کھلی آنکھوں سے اس نے سر اٹھا کر امامہ حسن کو دیکھا اور پھر فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تم یہاں؟''

مگر امامہ نے اس کا سوال نہیں سنا' وہ آگے بڑھ کر شجاع کے گلے لگ کر زاروقطار رو پڑی تھی۔

شجاع اس قطعی غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے لگا جیسے اس کا وجود طوفانوں کی زد میں آ گیا ہو' خوش گوار زندگی کی طرح گلے لگے وہ لڑکی اس وقت اس کے لیے کسی کڑے امتحان سے کم نہیں تھی۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ جذباتی لمحوں کی گرفت میں آتا۔ امامہ نے اپنا سر اس کے کندھے سے ہٹا لیا۔

''بہت شکریہ شجاع' ایک اور احسان کے لیے۔''

''اٹس او کے اب جاؤ۔''

فوراً سے پیشتر خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے رخ پھیرا تھا اور پھر امامہ کے بیڈ سے اٹھتے ہی کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ اس کی دھڑکنیں ابھی تک معمول پر نہیں آئی تھیں۔ دل الگ بغاوت کے لیے آمادہ ہو رہا تھا تبھی اسے اپنے بازو پر امامہ کا ہاتھ پھسلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ جیسے ساکت رہ گیا۔

''آپ چاہتے ہیں نا میں ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلی جاؤں۔ آپ زندگی میں دوبارہ کبھی میری شکل نہ دیکھیں۔ ہے نا؟ میں چلی جاؤں گی آپ زندگی میں دوبارہ کبھی میری شکل نہیں دیکھیں گے۔ مگر پلیز شجاع مجھے ڈائیورس مت دیجیے گا۔ میں آپ کے نام آپ کے حوالے کی پہچان کے ساتھ جینا چاہتی ہوں۔ میرا یقین کیجیے۔ میں خطاکار ہوں مگر بدکار نہیں ہوں۔''

بھیگے لہجے میں کہتی ہوئی وہ اس کے پہلو میں ٹکی تھی اور اس کا ہاتھ اب شجاع کے بازو سے ہوتا ہوا سینے پر آ رکا تھا۔ شجاع کو لگا جیسے اس سرد نازک ہاتھ میں پوشیدہ حدت سے اس کی سانس جل جائے گی۔ یقیناً آج وہ اسے بخشنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''مجھے اپنی دہلیز سے خالی ہاتھ مت کریں شجاع' کوئی تعلق کوئی زنجیر تو ہونی چاہیے ہمارے درمیان تاکہ زندگی کا سفر اگر اکیلے بھی کاٹنا پڑے تو دشوار نہ لگے۔''

دھیمے لہجے میں بھی وہ اسے مسمار کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔ وہ جیسے ڈھ گیا۔

پلٹ کر ایک نظر امامہ حسن کو دیکھنے کے بعد اس نے اپنے لب اس کی سرد پیشانی پر دھر دیے تھے۔ وہ لڑکی اس کی دہلیز سے خالی ہاتھ جانے کی خواہاں نہیں تھی اور ادھر اس کا اپنا دل تھا کہ نواز نے

کو مچل رہا تھا۔ ساری بدگمانیاں' ساری انا اس لمحے جیسے منہ لپیٹ کر سو گئی تھی۔ اسے یاد رہا تو محض اتنا کہ امامہ حسن اس کے نام سے منسوب ہے۔ اور ایک ایسی سرزمین کی مانند ہے جو اس کی دسترس میں ہوتے ہوئے بھی سیراب ہونے سے محروم رہی ہو۔

ٹپکا ٹپکا اوس کی صورت موتی برساتی رات ایسے بیت گئی تھی جیسے کوئی حسین خواب ہو۔ صبح دن کا اجالا پھیلنے کے بعد شجاع کی آنکھ پہلے کھلی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ رات کیا ہوا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے جب اسے اپنے سینے پر بے خبر سوئی امامہ حسن کے وجود کا احساس ہوا تو رات کے تمام پرکیف لمحات کسی فلم کے یادگار سین کی مانند اس کے ذہن کی اسکرین پر ایک کے بعد دیگرے چھاتے چلے گئے۔

امامہ حسن نے خود کو پارسا ثابت کر دیا تھا۔ بے شک اس نے اس کی امانت میں خیانت نہیں کی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اسے اپنے دل میں کوئی مقام دیتا۔ ایس ایچ او کے ذہن میں گونجنے والے الفاظ نے اسے جیسے منجمد کر دیا۔

''جناب کل رات یہ لڑکی کسی لڑکے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑی گئی ہے۔''

اور لڑکا کون تھا ارسلان حیدر۔

وہ ارسلان حیدر جس کے لیے اس نے اسے زہر دیا تھا۔ وہ ارسلان حیدر جس کے لیے وہ اس کے گھر میں بچی کی آیا بن کر گھسی تھی۔ بچپن سے جوانی تک جس کے نام اس نے اپنا ہر لمحہ کیا تھا شجاع کے ذہن میں وہ سارے ایڈ' سارے کمرشل گھومنے لگے تھے۔ جن میں اس نے ارسلان کے لیے کام کیا تھا۔ کس کس نے نہیں دیکھا ہو گا اس کمرشلز میں اسے۔ کوئی جگہ ایسی تھی ہی نہیں جہاں اس نے اس کی عزت نہ اچھالی ہو۔

کیا اب وہ محفلوں میں' یار دوستوں کے سامنے اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے متعارف کر سکتا تھا؟

صرف ایک محبت کے الاؤ میں اس لڑکی نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

شجاع کو لگا جیسے امامہ حسن کی جگہ اس کے سینے سے آگ لپٹی ہو۔ تبھی قطعی درشتگی سے اس نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے پرے دھکیل دیا تھا۔ امامہ اس اچانک بھونچال پر ہڑبڑا کر بیدار ہوئی تھی۔

''صبح ہو گئی ہے اب جاؤ اپنے کمرے میں۔''

رات خوش بو اور موتی لٹانے والے لب' اب ایک دم سے دن کے اجالے میں آگ برسانے لگے تھے۔

وہ شاکڈ ہی تو رہ گئی۔

''رات جو کچھ میں نے تمہیں دان کیا' اسے اس گھر میں اپنی خدمتوں کا معاوضہ سمجھ لینا۔ اب جاؤ'' کتنی حقارت تھی اس شخص کے لہجے میں۔ ایک لمحے میں وہ عرش سے فرش پر لے آیا تھا۔ امامہ کا دماغ جیسے ماؤف ہو گیا تھا۔

پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے کتنی ہی دیر اسے دیکھنے کے بعد وہ روتی ہوئی اس کے کمرے سے

...کیسی بدنصیبی تھی کہ اپنا آپ اس کے قدموں میں بچھا کر بھی اپنی پاکیزگی ثابت کر کے بھی وہ شخص کی نفرت کے گراف سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔

گڑیا اٹھ چکی تھی اور اب اسے ڈھونڈ رہی تھی مگر وہ کمرا بند کر کے روتی رہی۔

دوپہر میں فریش ہو کر وہ کمرے سے باہر نکلی تو اس کا چہرہ خوب سرخ ہو رہا تھا۔ شجاع نے اپنی ...کو اب تک اس کی ناسازی طبع کا بتا کر بہلایا ہوا تھا۔ مگر اب امامہ کو دیکھتے ہی وہ اس کی طرف ...آئی تھی۔

''مما آپ کہاں تھیں۔ میں نے اتنا مس کیا آپ کو۔''

امامہ نے جھک کر اسے پیار کیا پھر بنا اس کے سوال کا کوئی جواب دیے وہ اس کا ہاتھ تھام کر ...اع کی طرف چلی آئی۔

''آپ مصروف نہ ہوں تو چلیں؟'' سپاٹ لہجے میں عجیب سا درد تھا۔ وہ نظریں چرا گیا۔

''ہاں تم اپنا سامان لے آؤ میں گاڑی نکلواتا ہوں۔''

''مما آپ کہاں جا رہی ہیں۔''

شجاع کے وہاں سے اٹھتے ہی گڑیا نے مچل کر اس سے پوچھا تھا جواب میں اس کی آنکھیں بھر ...ئیں۔

''اسپتال۔'' مرے مرے سے لہجے میں اس نے جواب دیا تھا۔

''میرے لیے بھیا لینے۔''

''ہاں۔'' جانے کیوں وہ اس بچی کو تکلیف پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔ گڑیا بے طرح خوش ہو گئی۔

شام کے دھندلکے ہلکے ہلکے گہرے ہو رہے تھے۔ جب وہ ''حسن پیلس'' پہنچی تھی۔ گھر سے ...ب تک شجاع حسن نے اس سے کوئی بھی بات نہیں کی تھی۔

حسن رضا صاحب کو شدت سے اس کی آمد کا انتظار تھا۔ حیدر عباس صاحب اور ان کی بیگم بھی ...ں موجود تھیں مگر ان دونوں کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ کون آ رہا ہے۔ گیٹ کے اس پار جس وقت ...اع کی گاڑی رکی۔ حسن صاحب فوراً اٹھ کر گیٹ کی طرف لپکے تھے۔ امامہ گاڑی سے نکلنے کے بعد ...ٹ کے قریب آئی تو چوکیدار نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میرال بی بی آپ......؟''

جواب میں امامہ نے حیران ہو کر سوالیہ نگاہوں سے شجاع کی طرف دیکھا تھا جو اسے ہی دیکھ ...تھا۔

''نیا ملازم ہے ابھی اسے میرال اور امامہ کی کہانی کا علم نہیں ہے' چلو۔'' اس کی وضاحت پر وہ ...موشی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

جس وقت وہ گیٹ کے قریب پہنچی' عین اسی لمحے حسن رضا صاحب گیٹ سے باہر آئے تھے۔ ...مہ پر نگاہ پڑتے ہی ان کے ضبط کا پارہ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔ وہ بالکل میرال حسن کا عکس تھی۔ حسن رضا ...احب کو لگا وہ گر پڑیں گے۔ جسم کا بوجھ سہارنا اس لمحے سے پہلے کبھی انہیں اتنا مشکل نہیں لگا تھا۔

امامہ کے قدم بھی انہیں دیکھ کر ذرا سا لڑکھڑائے تھے۔ شجاع اس کے پیچھے ہی آ رہا تھا۔ اس نے

بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے تحفظ اور تسلی دی تھی۔ طاہرہ بیگم کو صورت حال کا علم نہیں تھا وہ گھبرا کر آئیں تو حسن صاحب امامہ کو گلے سے لگائے زار و قطار رو رہے تھے۔ وہ شاکڈ رہ گئیں۔

''مم...... میراں...... !''

''نہیں طاہرہ یہ امامہ ہے ہماری گمشدہ بچی۔''

''کیا؟'' طاہرہ بیگم کی بصارتیں جیسے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ حسن صاحب اب امامہ کو چوم رہے تھے۔

''ہاں طاہرہ! یہ امامہ ہے۔ پندرہ سال پہلے اسے حفصہ اور اس کی بہن نے اسکول سے اغوا کروا لیا تھا۔ مجھے اس ڈرائیور نے چند روز پہلے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ قدرت کے کھیل ہیں طاہرہ! جب وہ انسان سے کچھ لیتا ہے تو بہت کچھ نواز بھی دیتا ہے۔''

طاہرہ بیگم کا جسم کانپ رہا تھا۔ امامہ کو بے یقینی سے دیکھتے ہوئے وہ اس کی طرف لپکی تھیں اور پھر اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے بری طرح رو پڑی تھیں۔

امامہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ ایک عرصے کے بعد ''حسن پیلس'' کے مکینوں کے بے حس جسموں میں زندگی کا احساس جاگا تھا۔ شجاع خاموشی سے سب دیکھتا رہا۔

امامہ کے گلے لگ کر روتے ہوئے طاہرہ بیگم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ملازمین میں ہلچل مچ گئی میراں کی غیر متوقع موت کے بعد وہاں حسن پیلس میں روز اک نئی کہانی جنم لے رہی تھی۔ شجاع طاہرہ بیگم کو اپنے مضبوط بازوؤں کا سہارا دیتے ہوئے ان کے کمرے میں لے آیا تھا۔ حسن پیلس میں اس رات اس کی بہت خاطر مدارت ہوئی تھی مگر...... وہ لوٹ آیا تھا۔

اسی ہفتے گڑیا کو بورڈنگ بھجوانے کے بعد وہ خود اپنی فیلڈ کی طرف سے وزٹ پر ملائیشیا چلا گیا تاہم جانے سے قبل اس نے ارسلان حیدر کو جیل کی سلاخوں سے نکال کر حیدر عباس صاحب اور ان کی بیوی کے سپرد کر دیا تھا۔

❊❊❊

تجھ کو نہیں احساس کہ اے دل تیری خاطر
اک شخص بڑے کام کا بیکار ہوا ہے

صاعقہ احمد سے ٹکراؤ کے بعد وہ جیسے پھر سے اپنا چین و قرار کھو بیٹھا تھا۔ صاعقہ اس کی طرف دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی مگر...... وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔ صرف ایک بار اس سے اس کی بے وفائی کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

ارسلان حیدر کے ساتھ بھری برسات میں اس کی تنہائی نے اس کے اندر جیسے آگ لگا چھوڑی تھی۔ اس روز وہ آفس نہیں آئی تھی عباد کسی بے قرار روح کی مانند وقفے وقفے سے اس کے کیبن کا چکر لگاتا رہا۔ اگلے دو روز کے بعد وہ اسے پھر روڈ پر ملی تھی۔

عباد ضروری کام سے جا رہا تھا مگر پھر بھی اس نے گاڑی صاعقہ کے قریب جا کر روکی تھی۔

''بیٹھو۔''

فرنٹ ڈور کھول کر قطعی سپاٹ چہرے کے ساتھ اس نے جیسے حکم جاری کیا تھا۔ وہ رخ پھیر گئی۔

''میں چلی جاؤں گی۔ آپ جائیے۔''

''صاعقہ میں اس وقت تم سے بحث کے موڈ میں نہیں ہوں پلیز بیٹھ جاؤ۔'' بمشکل وہ خود پر ضبط رکھے ہوئے تھا۔ صاعقہ اس کے سرخ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے لب بھینچتی چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اگلے تیں منٹ کے بعد وہ شہر کے سب سے مہنگے ریستوران میں عباد یاور کے مقابل بیٹھی تھی۔

''تو یہ وجہ تھی میری زندگی سے تمہارے یوں چپ چاپ چلے آنے کی۔'' بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ ہاف فولڈ کہنیاں ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے اسے دیکھ پایا تھا۔ صاعقہ کی آنکھوں میں تیزی سے آنسو جمع ہونے لگے۔

''ہاں۔''

کیوں؟ محض اس لیے کہ اس کے پاس مجھ سے زیادہ دولت ہے۔''

''ہاں۔'' وہ دبے دبے لہجے میں چلا رہا تھا اور وہ رخ پھیرے رو رہی تھی۔

''نہیں' نہیں صاعقہ احمد' میری محبت اتنی سستی نہیں ہوسکتی۔ لوگ کہتے ہیں مڈل کلاس لڑکیوں کو دولت کی بھوک ہوتی ہے۔ وہ امیر کبیر لڑکوں کے دل کو نہیں جیب کو دیکھتی ہیں۔ کہہ دو کہ لوگ غلط کہتے ہیں پلیز۔''

بے خودی میں بکھرتے ہوئے اس نے صاعقہ احمد کے سرد ہاتھ تھام لیے تھے۔ تبھی شاید وہ ہوش میں آئی تھی۔ آنکھ سے انگارا بن کر ٹوٹنے والے آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ عباد کی گرفت سے نکالا تھا۔

''نہیں' لوگ جو کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ محبت مڈل کلاس لڑکیوں کا درد سر نہیں ہے۔ نہیں جانتیں مڈل کلاس لڑکیاں محبت کی سچائی کو۔ میں نے بھی تم سے تمہاری دولت کے لیے تعلق رکھا تھا لیکن جب مجھے پتا چلا کہ تم سڈنی چلے گئے اور یہ کہ تمہاری شادی تمہاری کزن سے طے ہے تو مجھے لگا میں زیادہ عرصہ تک تمہیں بے وقوف نہیں بنا سکتی۔ اسی لیے میں تمہاری زندگی سے نکل آئی۔ تم میری منزل نہیں تھے۔ عباد یاور' مگر اذلان حیدر میری منزل ہے' کیونکہ میں اب اس سے پیار کرتی ہوں۔ بے حد پیار میرے اور اس کے بیچ آنے کی کوشش مت کرو ورنہ......!'' اس کے لہجے میں سرد مہری تھی عباد یاور کو لگا وہ ملبے تلے دب گیا ہو۔

''ورنہ......؟''

''ورنہ جو لڑکی تمہیں بے وقوف بنا کر چھوڑ سکتی ہے وہ تمہاری جان بھی لے سکتی ہے۔''

عباد یاور کے پتھر ہوئے وجود کو اس نے ایک لمحے میں جیسے پاش پاش کر دیا تھا۔ ریستوران کے باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی مگر عباد کے لیے اندر باہر چاروں طرف ان دیکھی سی آگ جل رہی تھی جس میں دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دل سمیت سارا وجود مسمار ہو گیا تھا۔

❀❀❀

اس نے سونا بنا کے مٹی سے
مجھ کو مٹی کے بھاؤ بیچ دیا

ہمدانی پیلس سے دربدری کے بعد وہ اسے اپنے ایک دوست کے فلیٹ پر لے آیا تھا۔ اس کی

طرح اس کا دوست بھی ایک امیر کبیر باپ کا بگڑا ہوا سپوت تھا۔ آج کل زاویہ اس سے کنارہ کش ہو کر اسی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس روز زاویہ نے نائٹ کلب میں پارٹی رکھی تھی۔ وہ اسی پارٹی میں شرکت کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ جب وہ چپ چاپ سی اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔

''عدی۔ میں یہاں اس فلیٹ میں خود کو محفوظ محسوس نہیں کر رہی۔ کیا ہم کہیں اور نہیں رہ سکتے۔''

وہ پلٹا تھا اور پھر ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے ہنس پڑا تھا۔

''کیوں یہاں کیا ہے؟ تم تو بڑی بہادر بنتی تھیں۔ اب کیا ہوا؟ کیا اب اپنے خدا پر بھروسا نہیں رہا تمہیں۔''

ہنس کر استہزائیہ لہجے میں کہتے ہوئے وہ پرفیوم کا اسپرے کرنے لگا تھا۔ وہ سر جھکا گئی۔

''صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہیں محلوں میں رہنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ محبت اور فرمانبرداری کی مالا گلے میں لٹکا کر کسی فلیٹ میں نہیں رہ سکتیں تم۔''

وہ شخص چوٹ پہنچانے اور دل جلانے میں ماہر تھا۔ گوری ایک نظر اس کے شاندار سراپا پر ڈالتی واپس پلٹ گئی۔

شام کے دھندلکے گہرے ہونے لگے تھے۔ باہر تیز بارش کے ساتھ آندھی طوفان نے گوری کو سہما دیا تھا۔ وہ شدت دل سے عدنان کی گھر واپسی کی دعا کر رہی تھی۔ تبھی دروازہ بجا تھا۔ وہ دوپٹا اچھی طرح اپنے گرد لپیٹنے کے بعد بارش میں بھیگتی دروازے تک آئی تھی۔

''کون؟''

''عاطف۔''

اس کے سوال کے جواب میں عدنان کے اسی دوست کی آواز آئی تھی جو اس فلیٹ کا مالک تھا۔

گوری کا ہاتھ دروازے کی کنڈی تک جاتے جاتے رک گیا۔

''بھائی! عدی ابھی گھر پر نہیں ہیں۔''

''مجھے پتا ہے' بھابی! عدی میرے ساتھ ہی ہے' ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اس کا بری طرح زخمی اور بے ہوش ہے۔''

عاطف کی آواز میں اسے کرب محسوس ہوا تھا۔ تبھی جیسے اس کا دل ڈوب گیا۔ وہ اس شخص سے متعلق ایسے ہی خدشات کا شکار تو رہتی تھی۔ اس کے اندر کی کوئی چیز اسے دروازے کی چٹخنی گرانے سے روک رہی تھی مگر باہر اپنے شوہر کے زخمی اور بے ہوش ہونے کی اطلاع پا کر وہ دماغ کے بجائے دل کو برتری دے گئی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے جیسے ہی اس نے چٹخنی گرائی عاطف دروازے کو اندر کی طرف دھکیلتا گھر کے اندر گھس آیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی فوراً اس نے چٹخنی لگائی تھی۔

گوری اس اچانک افتاد پر جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی۔

''کیا بھابی! اتنی دیر سے بارش میں کھڑا بھیگ رہا ہوں مگر آپ کو کوئی احساس ہی نہیں۔ شوہر کا دوست نہ سہی اس گھر کا مالک سمجھ کر ہی دروازہ کھول دیتیں۔''

اپنے فریب پر کمینگی سے مسکراتے ہوئے وہ گوری کے بھیگے سراپا کو خوب توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

وہ اچانک حواس میں واپس پلٹتے ہوئے اندر کمرے کی طرف بھاگی' بے جان وجود میں صرف کے ہزاروں کی رفتار میں دھڑکنے کا احساس ہو رہا تھا۔ تاہم مکاری اور عیاشی میں ماہر عاطف رواری نے اس کی یہ کوشش فوراً اس پر جھپٹتے ہوئے ناکام بنا دی۔

''ارے کہاں بھاگ رہی ہیں۔ مہمان ہوں آپ کا کوئی خاطر تواضع نہیں کریں گے؟'' اس کے منہ سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ گوری کی روح بلبلا اٹھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں نہیں تھا کہ شوہر کو ہدایت کے رستے پر لانے کی کوشش میں وہ اپنی عزت کی اجلی چادر کو ایک عیاش کے ہاتھ میں دے بیٹھے گی۔

''چھوڑو مجھے۔''

''چھوڑ کے ہی جاؤں گے۔ میں نے کوئی اچار تھوڑی ڈالنا ہے آپ کا۔''

اس کے خوب صورت وجود کو اپنے حصار میں کستے ہوئے اس نے پھر کمینگی دکھائی تھی۔ گوری کی روح بلبلا اٹھی۔

''نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے' خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔ میرے ساتھ ایسا مت کرو' تمہاری بہنوں بھی ہوں میں۔''

''میری کوئی بہن نہیں ہے۔ ہوتی بھی تو اتنی خوب صورت نہیں ہو سکتی تھی۔ کیوں بندھی ہوئی ہو ری سے۔ وہ بے وقوف شخص کیا دے سکتا ہے تمہیں میری طرف دیکھو۔ دنیا کی ہر خوشی تمہارے قدموں میں ڈھیر کر سکتا ہوں میں۔''

گرجتے بادلوں اور کڑکتی بجلی کی پروا کیے بغیر وہ شیطان اپنی پلاننگ پر عمل کر رہا تھا۔ زاویہ نے ں سے عدنان ہمدانی کی بربادی مانگی تھی اور وہ اس سے کیے عہد کے مطابق اس کی عزت کو نیلام کرنے چلا آ رہا تھا۔

گوری اب چلا رہی تھی۔

''چھوڑو مجھے نہیں تو خدا کا قہر نازل ہوگا۔''

''ہاہاہا بچہ سمجھ کر ڈرا رہی ہیں مجھے۔ سوری میں ڈرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ویسے بھی ں ملک میں سوائے خدا کا قہر نازل ہونے کے اور کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ دیکھیے نا' کتنا اچھا ڈریس پہنا ا ہے آپ نے۔''

وہ اپنی حدود کراس کر رہا تھا۔ گوری نے خود کو اس عیاش شخص کے فولادی پنجے میں قطعی بے بس سوس کرتے ہوئے ایک نظر اوپر برستے آسمان کی طرف دیکھا اور بلک کر رو پڑی۔

''نہیں اب اور ذلت و رسوائی نہیں میرے مالک! مجھے اس آزمائش میں مت ڈال' جو میری دنیا آخرت تباہ کر کے رکھ دے۔ میری عزت کی چادر تیرے ہاتھ ہے مالک اسے داغ دار ہونے سے بالے۔''

اپنے بچاؤ کی ہر کوشش کرتی وہ دل ہی دل میں سسک پڑی تھی۔ جب عاطف کے سیل زاویہ کی کال آ گئی۔ اس نے سیل پاکٹ سے نکال کر چیک کیے بغیر گوری کو گھسیٹ کر برآمدے کے ستون سے باندھا اور پھر اطمینان سے سیل نکال کر وہاں زاویہ کی کئی مس کالز دیکھ کر اسے کال

بیک کر دی۔

''اسنوپڈ کال کیوں نہیں اٹھا رہے تھے؟''

پہلی بیل پر ہی کال پک کرتے وہ بھنائی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

''مصروف تھا بھابی جی کے ساتھ اس لیے۔ تمہیں کیا مصیبت پڑ گئی؟''

''مصیبت کے بچے' وہ گھر کے لیے نکل پڑا ہے۔ اب تک تو پہنچ بھی گیا ہوگا' اگر اس نے تمہیں وہاں دیکھ لیا تو تمہاری خیر نہیں۔''

''میری خیر کی فکر چھوڑ دو تم۔ عاطف نام ہے میرا' کچے کھیل نہیں کھیلتا میں کل تک تمہیں مطلوبہ نتائج نہ ملیں تو نام بدل دینا میرا۔'' لب دبا کر مسکراتے ہوئے وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ زاویہ لائن ڈراپ کر گئی۔

اگلے پانچ منٹ میں وہ باہر مرکزی دروازہ ان لاک کرنے کے بعد گوری کو ستون سے کھینچ کر بیڈ روم میں لے آیا۔

''لیجیے بھابی جی آ گئے آپ کے شوہر نامدار۔ کتنی پاک باز ہیں آپ...... وہ کیا کہتے ہیں اللہ اللہ کرنے والی۔ مگر...... ہوگا کیا...... آپ کا عقل کا اندھا شوہر آپ کے اس حسین اور خوب صورت وجود کو میری بانہوں میں دیکھ کر غصے سے پاگل ہو جائے گا۔ آپ رو رو کر اپنی پارسائی ثابت کرنے کی کوشش کریں گی۔ مگر وہ یقین نہیں کرے گا۔ وہ اسی پر یقین کرے گا جو اسے میں بتاؤں گا۔''

وہ صدمے سے گنگ تھی اور وہ شخص اسے مزید مسمار کر رہا تھا۔ عدنان جس وقت دروازہ کھلا پا کر قدرے غصے میں بیڈ روم کی طرف آیا۔ عاطف گوری پر جھکا ہوا تھا اور وہ جیسے بے جان ہو گئی تھی۔

وہی گوری جس کی دہاڑ پر گاؤں کے مرد بھی دہل جایا کرتے تھے۔ کتنی آسانی سے ایک شیطان شخص کی مکروہ پلاننگ میں مسمار ہو گئی تھی۔ عدنان کو یقین ہی نہ آیا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا چھا گیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ گوری غلط کردار کی لڑکی نہیں ہے۔ مگر بند گھر میں اس کا دوست اندر کیسے آیا۔ یہ سوال طوفان بن کر خون کی صورت اس کی شریانوں سے ٹکرا رہا تھا۔

عاطف نے عدنان کو دیکھ کر گوری کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ عصمت پر آنچ آئے بغیر بھی اسے لگ رہا تھا۔ اس نے جیسے سب کچھ کھو دیا ہو۔ مگر عدنان بے حس و حرکت نہیں رہ سکا تھا۔ گوری کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے وہ عاطف پر پل پڑا تھا۔ عاطف جانتا تھا کہ وہ جذباتی ہوگا مگر اتنا بھاری پڑے گا۔ یہ اس کے علم میں نہیں تھا۔

اس روز عاطف سبزواری کو مار مار کر بے ہوش کرنے کے بعد اس نے اتنی شراب پی تھی کہ خود اس کی اپنی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔

❁❁❁

دیکھ دسمبر اب مت آنا
میرے اندر کتنے صحرا پھیل چکے ہیں
تنہائی کی ریت نے میرے

سارے دریا پاٹ لیے ہیں
اب میں ہوں اور میرے بنجر پن کی بوجھل تہہ ہے
دیکھ دسمبر تیری ان برفاب شبوں میں
تیری ان بے خواب شبوں میں
خواب سویٹر کون بنے گا؟
روح کے اندر گرتی برفیں
کون چنے گا؟
دیکھ دسمبر اب مت آنا

''مما، ہم پاکستان کب چلیں گے۔''

شدید سرد موسم میں بیڈ پر بیٹھی وہ مستنصر حسین تارڑ کی 'قربت مرگ میں محبت' کا مطالعہ کر رہی تھی جب اس کی چار سالہ بیٹی نے اس کا دھیان بٹاتے ہوئے پوچھا۔ انزلہ شاہ کے اندر جیسے سناٹا پھیل گیا۔

از حد حیرانی کے ساتھ اس نے چونک کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا تھا۔

''پاکستان...... کبھی نہیں۔''

''مگر کیوں میری فرینڈ اپنی مما کے ساتھ پاکستان گئی تھی۔ وہ بہت تعریفیں کرتی ہے پاکستان کی۔ سارے دن اسکول میں پاکستان کی باتیں سناتی ہے۔ مما مجھے پاکستان دیکھنا ہے پلیز۔''

اس کی بیٹی امل اب بیڈ پر چڑھ آئی تھی۔ وہ ضد کر رہی تھی۔

انزلہ کے اندر پھر سے طوفان اٹھنے لگے۔

''نہیں، کبھی نہیں۔ دوبارہ پاکستان کا نام لیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھی تم؟'' سرخ چہرے کے ساتھ اس کا تنفس بھی تیز ہو گیا تھا۔ چھوٹی سی بچی سہم کر رہ گئی۔ یک لخت جیسے سب کچھ بدل گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھر سے جلنے لگیں۔ ٹوٹ کر رونے کی خواہش میں اعصاب چٹخنے لگے تھے۔ بچی روتے ہوئے کمرا چھوڑ گئی تھی مگر وہ اب بھی رو رہی تھی گھٹنوں کے گرد دونوں بازو لپیٹے زار و قطار رو رہی تھی۔

چار سال قبل جب وہ پاکستان سے انگلینڈ آئی تھی تو بہت پر جوش تھی۔ سانول شاہ اسے گاؤں سے شہر چھوڑنے آیا تھا۔ بہت سے عہد تھے جو اس نے ایئر پورٹ پر سانول شاہ سے کیے تھے۔ وہ خاموش تھا اس کے چہرے پر آنے والے وقت کی جدائی کے خدشات صاف رقم تھے۔ از حد سنجیدہ چہرے پر سرخ ڈوروں والی آنکھوں کا کرب۔ پہلی بار انزلہ شاہ پر سانول کی شدید محبت کا راز کھل گیا تھا۔ دادی ماں اس کے ساتھ آئی تھیں اور بہزاد علی مراد پہلے سے یہیں تھا۔ وہ انگلینڈ آنے کے بعد دو تین ہفتوں تک سخت بے قرار تھی مگر پھر جیسے ہی پاکستان سے سانول شاہ کے خطوط کے آنے کا سلسلہ شروع ہوا وہ بہل گئی۔

اپنے ہر خط میں سانول اسے گاؤں کے حالات اور اپنے دل کی بے قراری کے قصے لکھ کر بھجواتا تھا۔ صرف انزلہ کی محبت میں اس نے گاؤں کی سڑکیں پکی کروائی تھیں۔ کنویں کے علاوہ وہاں بیٹھے

پانی کا انتظام بھی ہو گیا تھا۔ گاؤں کی غریب خواتین کے لیے زیر تعمیر اسپتال میں لیڈی ڈاکٹر اور دیگر عملے کا انتظام بھی کروالیا تھا۔ ہر نئے خط میں' ہر نئی کامیابی کی خبر وہ اسے بہت خوشی کے ساتھ لکھ کر بھجواتا تھا چھنو کے بیٹی ہوئی تھی اور وہ اسے بہت یاد کر رہی تھی۔

سانول کے ڈرائیور کی فیملی وہ گاؤں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میران شاہ کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ ہر روز وہ اسے اپنے ڈیرے کے قریب پیپل کی چھاؤں کے تلے بیٹھ کر خط لکھتا تھا اور یاد کرتا تھا۔ پچھلے تین ہفتوں سے اس نے شیو نہیں کی تھی جس پر اس کی پھوپو نے جنہیں وہ آپا کہتا تھا اسے موالی کہنا شروع کر دیا تھا۔

اکثر خطوط میں وہ اسے اپنے خواب لکھ کر بھیجتا تھا۔ بے حد خوب صورت اور روشن خواب جس میں وہ دونوں ہوتے تھے اور ان کے بچے۔

انزلہ اس کے خط پڑھ کر دیر تک ہنستی اور فریش رہتی۔ ان دنوں کنیز بیگم، دادی ماں اور بہزاد کے ساتھ خفیہ میٹنگز کرتی دکھائی دیتی تھی۔ مگر انزلہ سانول کو خط لکھنے اور سوچنے میں اتنی مگن ہوتی کہ اسے ان کی میٹنگز کا احساس ہی نہ ہوتا۔

اس روز وہ بہت خوش تھی۔ سانول نے شہر میں اپنا گھر خرید لیا تھا۔ کنیز بیگم کا موڈ بھی اچھا تھا۔ لٰہذا دادی ماں کی موجودگی میں ہی اس نے بات چھیڑ دی تھی۔

''مما مجھے آپ سے کچھ شیئر کرنا تھا۔''

کنیز بیگم کے لب اس کی بات پر سمٹے تھے۔ جبکہ دادی ماں نے رخ پھیر لیا تھا۔ جیسے وہ جانتی ہوں کہ وہ کیا شیئر کرنے جا رہی ہے۔

''ہوں' کہو۔''

''مما ایک لڑکا ہے سانول۔'' نظریں جھکا کر قدرے جھجکتے ہوئے اس نے بتایا تھا۔

''یونیورسٹی پریڈ میں میرا کلاس فیلو تھا بہت اچھا ہے۔ بہت محبت کرتا ہے مجھ سے' شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ اس سے مل لیں۔ وہ اگلے ہفتے یہاں انگلینڈ آ رہا ہے۔''

''اچھا مگر تمہاری شادی تو طے ہو چکی ہے۔'' بہت ٹھہرے ہوئے سرد لہجے میں کنیز بیگم کی یہ اطلاع اسے شاکڈ کر گئی تھی۔

''وہاٹ...... مجھ سے پوچھے بغیر، رائے لیے بغیر؟''

''ہوں کیونکہ تم ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئیں کہ اپنے فیصلے خود کر سکو۔''

''مگر یہ میری زندگی ہے مما...... مجھے کس کے ساتھ چلنا ہے۔ کس کے ساتھ جینا ہے۔ یہ سوچنے کا حق آپ مجھ سے کیسے چھین سکتی ہیں۔''

وہ صدمے سے گنگ ہو گئی تھی مگر کنیز بیگم نے اس کے حال کی پروا نہیں کی۔

''کچھ نہیں چھینا جا رہا تم سے۔ بہزاد اچھا لڑکا ہے۔ بچپن کی منگ ہو تم اس کی۔ چار دن کسی کے ساتھ گھوم پھر لینے کا مطلب یہ نہیں کہ تمہاری اس کے ساتھ شادی ہو جائے۔''

''مگر میں اس کے بغیر نہیں جی سکتی مما! میں نے وعدہ کیا ہے اس سے' ہمیشہ ساتھ نبھانے کا' ہر سکھ' ہر دکھ میں قدم سے قدم ملا کر چلنے کا۔ وہ مر جائے گا مما میں نے وعدہ وفا نہ کیا تو وہ پاگل ہو جائے گا۔

بھٹک جائے گا پھر سے۔'' تڑپ کر کہتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔ تبھی دادی ماں نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

''چپ کرو لڑکی! مت بھولو کہ تم نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا۔ وہ غنڈہ موالی تمہارے قابل نہیں ہے۔ برائی جس کی گھٹی میں پڑی ہو وہ لاکھ اچھائی کا ڈھونگ کرلے' انسان نہیں بن سکتا۔ اپنی ماں کی بات مان اور بھول جا اسے۔''

''تمہاری دادی ٹھیک کہہ رہی ہیں انزلہ! تم جانتی ہو تمہارے بابا کے بعد میں نے کبھی تمہیں ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ تم نے جو چاہا میں نے وہی کیا۔ اب تمہاری باری ہے۔ اگر تم اپنی ماں کو کھو کر اس لڑکے کو اپنانا چاہتی ہو تو جاؤ میں تمہیں نہیں روکوں گی مگر یاد رکھنا اگر تم نے میرا مان توڑا تو میں نہ کبھی تمہاری شکل دیکھوں گی، نہ تمہیں اپنا دودھ معاف کروں گی۔''

ساری عمر انگلینڈ جیسے ایڈوانس ملک میں گزارنے کے باوجود کنیز بیگم کے اندر کی عورت اپنی روایت سے باہر نہیں نکل سکی تھی۔ انزلہ گم صم سی انہیں دیکھے گئی۔

اسی ہفتے ان لوگوں نے وہ گھر تبدیل کرلیا تھا۔ انزلہ لاکھ نا چاہنے کے باوجود' پتھر کی مورت بنی' بہزاد علی مراد کے نام سے منسوب ہوگئی تھی۔ کنیز بیگم اور دادی ماں نے اپنی ضد پوری کرلی تھی مگر اس ضد نے ایک ہنستی مسکراتی' زندہ دل لڑکی کے لبوں پر مستقل چپ کا قفل لگا دیا تھا۔

بہزاد علی مراد بہت اچھا شوہر اور بہت اچھا باپ ثابت ہوا تھا۔ کنیز بیگم اسے داماد کے روپ میں دیکھ کر بہت خوش تھیں مگر اس کی زندگی زیادہ دیر تک وفا نہیں کرسکی تھی۔ اس کی بیٹی تین سال کی تھی جب پاکستان میں ہی وہ ایک حادثے کی نذر ہوگیا تھا۔ اس کی وفات کے تین ماہ بعد ہی دادی ماں بھی ملک عدم سدھار گئیں۔ ایک کے بعد ایک زخم انزلہ کی برہنہ روح پر لگتا چلا گیا تھا مگر وہ بے حس ہوچکی تھی۔

کنیز بیگم اب اسے دیکھتی تھیں تو چھپ چھپ کر روتی تھیں مگر...... اس نے مدت ہوئی رونا چھوڑ دیا تھا۔

اس کی بیٹی اب چار سال کی تھی۔ وہ بالکل انزلہ کی کاپی تھی۔ اسی کی طرح اپنی سرزمین' اپنی مٹی' اپنے آباؤ اجداد سے محبت کرنے والی اپنے دادی دادا' چاچو کی باتوں پر نثار ہونے والی۔ اپنے بابا کی طرح ضدی اور خودسر......!

پچھلے چار پانچ سالوں میں اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

سانول شاہ کا کیا ہوا۔ اس کی غیر متوقع بے وفائی کے بعد اس نے کیا کیا وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔

مگر اب اپنی بیٹی کے منہ سے پاکستان کا نام سن کر وہ پھر لہولہان ہوگئی تھی۔

❄❄❄

رات مہمان ہوا اداسی دل میں کوئی
بعد مدت اسے دیکھا ہم نے
وہ جو آنکھوں میں رہا کرتا تھا
وہ جو خوابوں میں بسا کرتا تھا
رات اس شہر کی دہلیز پر آیا تو جھجکتا ہوا محسوس ہوا

اس طرح بھی تو ہوا کرتا ہے
بستیاں چھوڑ کے جانے والے
لوٹ کے آئیں تو رستے سے ڈرا کرتے ہیں
حادثے درد کی بنیاد ہوا کرتے ہیں
ہم نے دیکھا کہ وہ اس شہر کی نکڑ پر کھڑا سوچتا ہے
کیا خبر کوئی شناسا بھی ملے یا نہ ملے
کیا خبر......
اجنبی بن کے ملیں سارے پرانے ساتھی
اور نئے لوگ تو نئے لوگ ہوا کرتے ہیں
وہ متذبذب سا آگے بڑھا وادی میں اور پھر
چونک اٹھا
اس نے دیکھا کہ نہ پہلی سی وہ رونق ہے نہ حالت کوئی
جیسے کرتا ہی نہ ہو اس کی کفالت کوئی
رات پھیلی ہوئی ہر سمت دعائیں خاموش
عہد بکھرے ہوئے ہر سمت وفائیں خاموش
گویا اک حادثہ عہدِ وفاداری میں ہوا
شہر کا شہر ہی ویران ہوا ہو جیسے
اور ''وہ''......
جو میری آنکھوں میں ہر لحظہ رہا کرتا تھا
حیران و پریشان ہوا شہر کی ویرانی پر
ہم بہت کھل کے ہنسے اس کی پریشانی پر

''جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ بی بی! ایان صاحب اور ان کے بچے بس پہنچنے ہی والے ہیں' ہاتھوں میں دم نہیں ہے کیا؟''

بخار سے بے حال میلے کپڑوں میں ملبوس' چکراتے سر کے ساتھ وہ بنگلے کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی جب انیسہ بیگم جو بنگلے کی کیئر ٹیکر اور اس کی جان کی دشمن تھی کی چنگھاڑ پر اس کے ہاتھ مزید تیزی سے حرکت کرنے لگے تھے۔

پچھلے پانچ سالوں سے وہ اسی بنگلے میں کام کر رہی تھی۔ جہاں اسے تین وقت کی روٹی کے ساتھ' سر چھپانے کے لیے چھت کا آسرا بھی میسر تھا۔ کتنا بدل دیا تھا گزرے پانچ سالوں نے اسے..... ریشم سی ملائم انگلیاں' کھردرے ہاتھوں کا حصہ بن گئی تھیں۔ گداز بدن' حالات کی تند آندھیوں کا زور برداشت کرتا' ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ خوب صورت آنکھیں جو اٹھتی تھیں تو مقابل کا ایمان لوٹ لیا کرتی تھیں' کسی شکستہ قلعے کی مانند' اندر کو دھنس کر رہ گئی تھیں' مسلسل بیماری نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

وہ جان گئی تھی کہ اسے اب زندگی اسی حال میں بسر کرنی ہے۔ تبھی اس نے صبر کرلیا تھا اور جو صبر کرلیتا ہے اس کے لیے مٹی بن جانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ کیا کیا نہیں سہا تھا اس نے پچھلے پانچ سالوں میں، کوئی اذیت ایسی تھی ہی نہیں جس سے اس کا سامنا نہ ہوا ہو۔

پانچ سال ہونے کو آئے تھے اسے سید اولا کی شاہراہوں اور گلی کوچوں کی شکل دیکھے، جانے پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ ان پانچ سالوں میں کیا ہوا تھا اسے کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ خبر ہوتی بھی کیسے، پانچ سال پہلے آمنہ کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ پے در پے بدترین حالات کی بھینٹ چڑھتی گئی تھی۔ گزرے پانچ سالوں میں سوائے عزت کے وہ اور کچھ بھی بچا کر نہ رکھ سکی تھی۔ تیس ہزار کی وہ رقم جو آمنہ کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ فقط دو ہی ماہ میں خرچ ہوگئی، دو ماہ اسی بنگلے کے ''مالی بابا'' کے گھر غربت کے بدترین روپ دیکھنے کے بعد اس نے اس بنگلے میں ملازمت کا فیصلہ کیا تھا۔

حال ہی میں تعمیر ہونے والے اس بنگلے کی ملکیت ایک بوڑھی خاتون اور اس کے بوڑھے شوہر کے نام تھی۔ دونوں عجیب سے کٹھور اور بے حس تھے، مالی بابا کی سفارش پر اسے اس بنگلے میں کام ملا تھا۔ تاہم بوڑھی خاتون اور اس کی چاپلوس ملازمہ نے اس بنگلے میں اس کا جینا محال کر دیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر اسے بہت بڑی بڑی روح چیر دینے والی باتیں سننا پڑتی تھیں۔ علیزہ مالی بابا پر اضافی بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی، اسی لیے سب برداشت کر رہی تھی۔ اس بنگلے کے سوا کوئی اور ٹھکانا بھی تو نہیں تھا۔

گزرے پانچ سال میں ہر طرح کی زیادتی برداشت کرکے بھی اس نے کبھی شور نہیں مچایا تھا۔ پچھلے پانچ سالوں میں کسی نے اسے ضرورت سے زیادہ بولتے، ہنستے یا مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ صبح سویرے آتی تھی اور پھر بنا ناشتہ کیے اپنا کام مکمل کر کے چلی جاتی تھی۔ دو سال قبل اسے علیحدہ کوارٹر مل گیا تھا کیونکہ مالی بابا کی رحلت ہوگئی تھی۔

آج تک کسی کو پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کیا چاہتی ہے؟ اس کی خاموش طبع کے باعث نہ کوئی اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا تھا نا اس کے حالات جاننے کی۔

ابھی دو ماہ قبل وہ بنگلہ کسی اور نے خرید لیا تھا۔ وہ بد دماغ بوڑھی عورت اور اس کا شوہر ملک سے باہر چلے گئے تھے تاہم ملازمین کی چھٹی نہیں کی گئی تھی، دو ماہ میں۔ سارے بنگلے کی ایک ایک چیز کو تبدیل کیا جا رہا تھا اور اِدھر علیزہ کا بخار تھا کہ جان چھوڑنے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ اسے اتنی سی رعایت بھی نصیب نہیں ہوئی تھی کہ وہ ہفتہ دو ہفتہ گھر بیٹھ کر آرام ہی کر لیتی۔

اس روز بھی صبح سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ مسلسل بخار کے سبب جسم میں ہل کر پانی پینے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ مگر انیسہ بیگم کے ہاتھوں ہونے والی بے عزتی سے بچنے کے لیے وہ صبح صبح ہی کام پر آ گئی تھی۔

شدید تھکن اور بیماری سے بے پروائی کے باعث رات بھر میں بخار کی شدت مزید بڑھ گئی تھی۔ اگلے روز بنگلے کے مکین آ گئے تھے مگر اس سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ حلق سوکھ کر کانٹا بنا ہوا تھا اور جسم تھا کہ تپتے، سلگتے انگارے سے کیا کم ہوگا۔

کئی بار اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش میں وہ ہانپ کر رہ گئی تھی۔ ادھر انیسہ بیگم کو اسے بنگلے میں لانے کی

ملازمت سے بے دخل کرنے کا موقع مل گیا۔ تین دن بعد وہ جیسے کام پر آئی تھی' اس کا دل ہی جانتا تھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے وقت اس کے منہ پر زور سے فٹ بال آ کر لگا تھا۔ علیزہ تڑپ کر رہ گئی۔ لان میں انیسہ بیگم' چوکیدار کو کچھ ہدایت دے رہی تھی' ان کے قریب ہی ایک چھوٹا سا بچہ ٹی شرٹ میں ملبوس کھڑا ہنس رہا تھا۔

وہ آنسو ضبط کرتی جونہی انیسہ بیگم کے قریب آئی وہ بول اٹھیں۔

''اب کیا آئی ہو یہاں لینے' جاؤ بی بی! اب یہاں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ صاحب نے کہہ دیا ہے تمہارا حساب کر دوں۔''

''مگر......''

''کیا مگر...... ہاں...... بہت دن برداشت کر لیا میں نے تمہیں یہاں۔ اب مزید اپنی شکل دکھانا مجھے' مفت ماری حرام خور۔''

وہ جس ڈر سے خوف زدہ تھی' وہ ڈر پورا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں یک لخت آنسوؤں سے بھر آئیں۔

''ایسا مت کہیں انیسہ آپا! آپ جانتی ہیں میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔''

''تو میں کیا کروں؟ میں نے لنگر خانہ کھول رکھا ہے یہاں؟ تین دن ہو گئے تجھے بے شرموں کی طرح گھر پڑے ہوئے' ذرا سوچا تو نے کہ کون صفائی کرے گا تیری جگہ یہاں آ کر...... نئے مالک کیا سوچیں گے' بول......؟''

وہاں اس کے حال کی پروا کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ بے بسی سے روتی ابھی انیسہ آپا کے قدموں میں بیٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اس کی نظر کچھ ہی فاصلے پر سامنے کھڑے اس پتھر ہوئے شخص پر جا پڑی جو شاکڈ سا یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔

علیزہ ملک کے آنسو اس کی پلکوں پر ہی اٹک گئے۔

''ایان......''

پپڑی زدہ ہونٹوں نے ہلکی سی جنبش کی اور پھر جیسے اس پر سب روشن ہو گیا۔

❀❀❀

ہادیہ کی بات طے ہو گئی تھی۔

پاکستان سے آسٹریلیا واپسی کے بعد عباد یاور کے دکھ کو بھلانے کے لیے اس نے اپنی دوست کے بھائی فہیم رضا کا ہاتھ تھاما تھا اور اب گزرتے وقت کے ساتھ دونوں میں اچھی خاصی ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ رشتے کی خواہش کا اظہار بھی فہیم کی طرف سے ہوا تھا۔

عباد میں آسٹریلیا آنے کی ہمت نہیں تھی۔ اسپیشلی صاعقہ احمد کے خیالات جاننے کے بعد وہ اس سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا اس نے۔ مڈل کلاس لڑکیاں' امیر کبیر لڑکوں سے نہیں ان کی دولت سے محبت کرتی ہیں۔ اسے شرم آ رہی تھی ہادیہ کا سامنا کرتے ہوئے مگر پھر بھی وہ اس کے اصرار پر آسٹریلیا چلا آیا تھا۔

منگنی کی سادہ سی تقریب میں سفید سوٹ پہنے بنا کسی میک اپ کے' وہ کتنی اداس لگ رہی تھی

عباد شرمندہ شرمندہ سا اس کے قریب جا بیٹھا۔

''کیسی ہو ہادی؟''

''تمہیں کیسی لگ رہی ہوں؟'' وہ مسکرائی تھی مگر اس مسکراہٹ میں بھی درد تھا۔ وہ نظریں چُرا گیا۔

''بہت خوب صورت' بے حد پُر وقار!''

''شکریہ...... اب تم بھی شادی کرلو جلدی سے پلیز۔''

''کرلوں گا' ابھی کون سا بوڑھا ہو رہا ہوں۔''

''ہو جاؤ گے جلدی' اگر یونہی اذیت کے حصار میں رہے تو تمہیں پتا ہے ناں یہ ٹینشن اور اذیت انسان کو وقت سے پہلے بہت بوڑھا کر دیتی ہیں۔''

''ہوں پتا ہے' تم خوش ہو ناں؟'' عباد کے بات بدلنے پر ہادیہ نے فوراً رخ پھیرا تھا۔

''پتا نہیں' لیکن فہیم اچھا لڑکا ہے' وہ جلد مجھے خوش رہنا سکھا دے گا۔''

''میں اس کا مشکور رہوں گا مگر پھر بھی پلیز مجھے معاف کر دینا ہادی! کہتے ہیں محبت اپنا دل دکھانے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ مجھے لگتا ہے شاید تمہیں کھونے کے بعد میں پُرسکون نہیں رہوں گا۔ شاید میں فہیم سے جیلسی بھی فیل کروں' ہوتا ہے ناں ایسا جو چیز آپ کے نام سے منسوب رہی ہو' اسے خواہ آپ خود چھوڑ بھی دیں پھر بھی وہ کسی دوسرے کے پاس برداشت نہیں ہوتی بہرحال میرے لیے دعا کرنا' میں بہت بے سکون ہو گیا ہوں ہادی!''

''مجھے معاف کردو عباد! اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ لڑکی تمہاری زندگی میں اس حد تک اہمیت رکھتی ہے تو اس روز جب وہ تمہاری تلاش میں آفس آئی تھی' میں اسے وہیں روک لیتی اور کبھی کہیں نہ جانے دیتی۔''

''اٹس اوکے' میں چلتا ہوں اب۔ پلیز انکل آنٹی کو مت بتانا اور ہاں یہ میں تمہارے لیے گفٹ لایا تھا لو سنبھالو اسے۔''

چھوٹے سے نفیس کیس میں ڈائمنڈ کے ساتھ گولڈ کی وہ بہت نفیس چین تھی۔ ہادیہ کی آنکھیں اچانک چھلک اٹھیں۔

''کاش میں تم سے کہہ سکتی عباد کہ میں تم سے بے تحاشا محبت کرتی ہوں۔''

وہ کہنا چاہتی تھی مگر اس نے یہ نہیں کہا تھا' اس وقت سب کچھ کہنے کے لیے آنسو ہی کافی تھے جنہیں عباد نے فوراً اپنے رومال میں جذب کر کے جیب میں رکھ لیا تھا۔

''تم دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ہو ہادیہ! قسم سے......''

''ہوں' مگر تم دنیا کے سب سے بُرے لڑکے ہو کیونکہ تم نے زندگی کے طویل سفر کے لیے دنیا کی سب سے اچھی لڑکی کو کھو دیا ہے۔ پتا نہیں یہ کیسی کہانی' کیسا المیہ ہے؟ یہاں دنیا میں سب سے اچھا ہونے کے باوجود محبت نہیں ملتی عباد! یہ جزیرہ کوئی اور ہی فتح کر لیتا ہے۔''

اس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے' عباد نے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''اسٹوپڈ روتا نہیں' خوش رہنا ہے' سمجھی......!''

وہ اپنی اداسی کا بھرم رکھ رہا تھا' ہادیہ بھی روتے میں مسکرا دی۔

''رنگ پہناؤ' پھر خوش رہوں گی۔''

''او کے......!'' اداسی سے مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے اس کی انگلی میں پڑی رِنگ اتار کر پھر سے خود پہنا دی' پھر لاکٹ سیٹ کھولتے ہوئے وہ بھی اپنائیت سے اس کے گلے میں ڈال دیا۔

''لو پہنا دیا' اب ہمیشہ اسے اپنے دل کے قریب رکھنا' ٹھیک ہے۔''

''ہوں......!'' سر جھکا کر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ عباد کچھ دیر مزید اس کے قریب بیٹھنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ آسٹریلیا سے واپسی کے بعد وہ سیدھا پنڈی آیا' شاہ زر کے پاس۔ دونوں ایک ہی بیڈ پر نیم دراز دیر تک اپنا اپنا احوال ایک دوسرے سے شیئر کرتے رہے تھے۔

شاہ زر نے عباد کو انوشہ کے بارے میں بتا دیا تھا اور اب وہ اس کے لیے خاصا فکر مند تھا۔ تاہم اس نے شاہ زر سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے طور پر انوشہ کو تلاش کرنے میں اس کی پوری پوری مدد کرے گا۔

❁❁❁

انوشہ کو جاب مل گئی تھی۔

صبا کے شوہر ارسلان کا رویہ اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ اچھا تھا۔ اسی لیے اس نے پہلی فرصت میں اپنا ٹھکانہ تبدیل کیا تھا۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ حالات میں بھی بہتری آئی تھی۔ ارسلان کی دوسری بیوی مزید بچے کے حق میں نہیں تھی اسی لیے وہ صبا کی طرف پلٹا تھا اور پھر صبا کے بطن سے بیٹے کی پیدائش کے بعد اس کے رویے میں مکمل تبدیلی آ گئی تھی۔

انوشہ خوش تھی بالآخر صبا کو اس کا حق مل گیا تھا۔ تاہم وہ گزرتے ہر دن کے ساتھ جیسے بجھتی جا رہی تھی۔ تنہا درخت ہو' چاند ہو یا انسان' قابل ترس ہی ہوتا ہے' اسے بھی اب خود پر ترس آنے لگا تھا۔ بہت کٹھن تھا تنہا رہنے کا یہ فیصلہ' کوئی رات ایسی نہیں تھی جب وہ رو کر نہ سوتی ہو مگر......

اب رونے کا حاصل کیا تھا' اپنے پیچھے تمام کشتیاں وہ خود جلا کر آئی تھی۔ اس روز صبح سے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ صبا کا شاہ زر سے رابطہ ہو گیا تھا مگر اس نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ انوشہ اس کے پاس ہے کیونکہ انوشہ کا اعتبار توڑنا اسے کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ تاہم اس روز شاہ زر کی کال آئی تو اس نے بتایا کہ اس کے بیٹے کا زبردست ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے' وہ اسپتال میں ہے۔ اس نے صبا سے دعا کی درخواست کی تھی اور صبا دعا کرنے کے ساتھ ساتھ فوراً انوشہ کے پاس چلی آئی تھی۔

انوشہ ابھی نیند کی گولی لے کر سونا ہی چاہتی تھی کہ صبا نے اسے شاہ زر کے فون کا بتا دیا۔

وہ مضبوط اعصاب کی خوددار لڑکی تھی مگر اس وقت صبا کے منہ سے اپنے بیٹے کے ایکسیڈنٹ کا سن کر اسے لگا جیسے وہ مٹی سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو۔ اس کی ساری انا ساری خودداری سارا ضبط جیسے دَھرا کا دَھرا رہ گیا تھا۔

کپکپاتے وجود کے ساتھ اس لمحے اس نے فوراً ''شاہ پیلس'' واپسی کا فیصلہ کیا تھا۔ صبا کا شوہر شہر میں نہیں تھا تاہم اس نے ڈرائیور سے اس کے لیے جہاز کا ٹکٹ اور سیٹ کنفرم کروا دی تھی۔ اگلے روز کی ڈھلتی شام کے ساتھ وہ پنڈی واپس پہنچ گئی تھی۔ صباء نے اسے مطلوبہ اسپتال کا بتا دیا تھا' دیوانوں کی طرح اپنے حال سے بے خبر' بنا تھکن کی پروا کیے' وہ اپنے گھر جانے کی بجائے سیدھی

اسپتال چلی آئی تھی جہاں آئی سی یو میں پڑے اس کے نو سالہ بیٹے کے لبوں پر بار بار اسی کا نام آ کر اٹ رہا تھا۔

ائر پورٹ سے اسپتال اور اسپتال سے آئی سی یو کے اس کمرے تک پہنچنے میں وہ جیسے ہلکان ہو گئی تھی' پچھلے پانچ سال کا ضبط کسی گلیشیر کی مانند پگھل چکا تھا۔ شاہ زر وہاں نہیں تھا۔ وہ بچے کے لیے خون کی مزید بوتلوں کا انتظام کرنے گیا تھا تاہم وہ وہیں کھڑی' بچوں کی طرح بلک بلک کر رو پڑی تھی۔

ایک مدت کے بعد اس کا دل اپنے ربّ سے کچھ مانگتے ہوئے جیسے پھٹ رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے سے دور رہ سکتی تھی مگر اسے ہمیشہ کے لیے کھونے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔

جانے یہ ایک ماں کے سسکتے ہوئے دل سے نکلی دعاؤں کا ثمر تھا یا ایک باپ کی سر توڑ کوششوں اور صدقوں کا کہ ان کا بیٹا اگلے چوبیس گھنٹوں میں ہوش میں آ گیا تھا۔ آئی سی یو کے باہر بلکتی ہوئی انوشہ رحمٰن کو دیکھ کر شاہ زر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں تاہم اس نے اسے مخاطب کرنا گوارا نہیں کیا تھا۔

چاند کے روم میں شفٹ ہونے کے بعد جب انوشہ لپک کر اس کے قریب جانے لگی اس نے انتہائی غصے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''وہ میرا بیٹا ہے انوشہ رحمٰن! بہتر ہوگا اگر آپ اسے میرا بیٹا ہی رہنے دیں۔''

''نہیں...... وہ میرا بیٹا ہے' مجھے اس کی صورت دیکھنے دو پلیز......'' وہ رو پڑی تھی' شاہ زر کو مزید غصہ آ گیا۔

''تمہارا بیٹا ہوتا تو پانچ سال پہلے یوں لاوارثوں کی طرح اسے چھوڑ کر نہ جاتیں' بہت دکھ سہے ہیں میرے بیٹے نے' بہت مشکل سے اس نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ اس کی ماں مر چکی ہے' پلیز اسے دوبارہ ڈسٹرب مت کرو۔''

''نہیں' مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے' پلیز مجھے معاف کر دو...... پلیز......''

پچھلے پانچ سالوں نے اگر اسے کسی پل سکون لینے نہیں دیا تھا تو سکون انوشہ رحمٰن کے چہرے پر بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بھی ہجر کی کڑی دھوپ میں جلی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی پرانے خستہ کھنڈروں سی ویرانی صاف جھلکتی دکھائی دے رہی تھی۔ جانے کیا سوچ کر شاہ زر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

کمان سے نکلتے تیر کی مانند لپک کر وہ اپنے بیٹے کے پاس گئی اور اسے بے تحاشا چومنے لگی تھی۔ شاہ زر عجیب سے احساسات میں گھرا' ایک سائیڈ پر کھڑا اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

❀❀❀

وہ کچن میں تھی اور سرمد ابھی آفس سے گھر واپس آیا تھا۔

''السّلام علیکم!''

اپنا بیگ اور کوٹ لاؤنج میں صوفے پر پھینکنے کے بعد وہ کچن میں ہی چلا آیا تھا۔ جواب میں ماہ رو نے مسکرا کر خاصے تمتماتے چہرے کے ساتھ اسے دیکھا۔

''وعلیکم السّلام اور شام بخیر......!''

"کیا ہو رہا ہے؟" اسے آٹا گوندھتی دیکھنے کے باوجود قریب آتے ہوئے وہ پوچھ بیٹھا تھا
جواب میں بُریرہ نے واپس پلٹتے ہوئے آٹے میں لتھڑے ہاتھ بڑے آرام سے اس کے دونوں
گالوں پر پھیر دیے۔

"کچھ نہیں' آج اپنے بیٹے کی فرمائش پر اسے خالص پاکستانی کھانا بنا کر دے رہی ہوں۔"

"اچھا! کبھی شوہر کی فرمائش کو تو اتنی اہمیت نہیں دی۔" بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کرتے
ہوئے اس نے شکایت کی تو وہ مسکرا دی۔

"میرا شوہر بڑا معصوم قسم کا فرماں بردار بندہ ہے' بالکل میرے پاپا کی طبیعت والا' اس نے کبھی
زور دے کر یوں اپنی فرمائش منوائی ہی نہیں۔"

"اوہ.....تو یہ بات ہے' مطلب اب جناب کے ساتھ روایتی پاکستانی شوہروں جیسا سلوک کرنا
پڑے گا۔"

بُریرہ کی ناک پر چٹکی لیتے ہوئے اس نے چھیڑا' جواب میں اس نے اس کے کندھے پر ہلکا
مکا رسید کیا۔

"کر کے تو دیکھنا' جان لے لوں گی تمہاری۔"

"لے لینا کوئی پروا نہیں۔" اب وہ اسے خود میں سمو رہا تھا۔ بُریرہ کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

"سرمد! آپ کو بخار ہے؟"

"نہیں تو۔"

"نہیں کے بچے' سارا جسم آگ کی مانند تپ رہا ہے' اور بھیگو بارش میں۔" وہ اپنے معمول کے
موڈ میں آ گئی تھی' وہ مسکرا دیا۔

"تمہارے عشق کا بخار ہے بُریرہ! اتنی جلدی نہیں اترنے والا۔"

"عشق کرنے کے سوا کبھی کچھ اور بھی کر لیا کرو۔"

"مثلاً.....تم حکم کرو' کیا کرنا ہے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔"

"پاگل.....!" اس کی شرارت پر ڈپٹ کر کہتے ہوئے اس نے خود کو اس کی گرفت سے نکالا پھر
آٹا گوندھ کر سائیڈ پر رکھتے ہوئے وہ اسے بیڈ روم میں لے آئی۔

"لیٹو یہاں پر' وہ بھی بالکل خاموشی سے' آئی سمجھ۔"

سرمد خان پر اس کا اچھا خاصا رعب چلتا تھا اور اسے اس کا یہی انداز پسند تھا' تبھی مسکراتے
ہوئے چپ چاپ بیڈ پر لیٹ گیا۔

"تم بھی ساتھ لیٹو۔"

"چپ.....!" ڈپٹ کر ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے وہ اس کا بخار چیک کرنے لگی۔

"دیکھو ذرا' ایک سو تین بخار ہے اور جناب کو پروا ہی نہیں۔" اب اسے غصہ آ رہا تھا' سرمد چپ
چاپ اسے دیکھے گیا۔ بخار چیک کرنے کے بعد اس نے اس کے پاؤں جوتوں کی قید سے آزاد کیے
پھر اس کے پاؤں تلے سے کمبل نکال کر اس کے اوپر پھیلا دیا۔

"میں ڈاکٹر کو کال کرتی ہوں تب تک خاموشی سے لیٹے رہیں۔"

''کوئی نہیں تم پاس بیٹھو گی تو لیٹوں گا۔نہیں تو میں بھی آ رہا ہوں کچن میں۔''

''سرمد! میں نے بیچ میں اب ایک لگا دینی ہے۔''

''دو لگا دو' مگر میرے پاس بیٹھو۔'' بچے کی طرح ضد کرتے ہوئے اس نے اس کا آنچل تھام لیا تھا۔بُریرہ اس کی ضد سے ہار مانتے ہوئے وہیں بیڈ پر بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھنے کے بعد اسے دبانے لگی۔

''کبھی کبھی بالکل چھوٹے سے بچے بن جاتے ہو آپ۔''

''تو کیوں عادتیں خراب کی ہیں میری؟''

''میں نے کوئی نہیں کی' آپ شروع سے خراب ہو۔''

''اچھا اب تو جیسا بھی ہوں برداشت کرو۔'' اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا مگر پھر بھی وہ خود کو ہشاش بشاش ظاہر کر رہا تھا۔بُریرہ کی گود میں تھوڑی دیر بعد اسے نیند آ گئی تھی۔تبھی وہ اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔بلند بخت اسلامک سینٹر سے گھر واپس آ گیا تھا اور اب اسے بھوک ستا رہی تھی۔بُریرہ نے اسے کھانا کھلا کر تھوڑی دیر پڑھانے کے بعد اس کے کمرے میں بھیج دیا اس تنبیہہ کے ساتھ کہ سرمد کی طبیعت ٹھیک نہیں وہ اسے ڈسٹرب نہ کرے۔بلند بخت اس کی تنبیہہ پر سوئے ہوئے سرمد کو پیار کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی تھی۔سرمد کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' وہ کراہ رہا تھا شاید بخار اس کے دماغ کو چڑھ گیا تھا۔بُریرہ گھبرا اٹھی۔

''سرمد......!'' اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے اس نے اسے پکارا تھا مگر سرمد نے آنکھیں نہیں کھولیں۔رات پچھلے پہر میں داخل ہو رہی تھی بُریرہ کی جان پر بن گئی۔روتے ہوئے اس نے اسے جھنجوڑا تھا پھر بیڈ سے اتر کر بھاگتے ہوئے پچھلے روڈ پر ڈاکٹر ڈی این کے گھر کے سامنے کھڑی ہو کر ان کے گھر کا دروازہ پیٹنے لگی۔پہلی بار اسے اپنی زندگی میں سرمد خان کی زندگی کی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔جسم سے جان کیسے نکلتی ہے؟ پانچ سال کے بعد وہ دوبارہ محسوس کر رہی تھی۔پچھلے پانچ سال میں سرمد خان نے اسے اتنی محبت دی تھی کہ اب اس کے بغیر ایک پل بھی جینے کا تصور اسے پاگل کر رہا تھا۔پچھلے پہر کا سفر سست روی سے مکمل کرتی اس سرد رات میں کتنی ہی دیر وہ ڈاکٹر ڈی این کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتی رہی تھی مگر ڈاکٹر ڈی این نے اس کے لیے اپنے گھر کا دروازہ نہیں کھولا تھا۔تبھی وہ اس دروازے کی طرف آئی جس کی طرف آنے والا کوئی سائل کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹا تھا۔

سائلہ بیگم انگلینڈ میں نہیں تھیں۔وہ ساحل کے پاس نیویارک گئی ہوئی تھیں۔مشکل اور مصیبت کی اس گھڑی میں سوائے اللہ ربّ العزت کی پاک ذات کے اور کوئی نہیں تھا جو اس وقت اس کا درد سمجھتا۔اس نے اب تک سرمد خان پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ اس کی زندگی میں کیا مقام رکھتا ہے مگر اب اسی کے لیے رو رو کر وضو کرتے ہوئے' وہ پچھلے پانچ سال سے ٹوٹا ہوا ایک اور پیارا سا تعلق بحال کر رہی تھی۔

شاہ زر کے لیے مانگی اپنی تمام دعائیں رد ہونے کے بعد پانچ سال ہوئے اس نے اللہ سے کچھ مانگنا ہی چھوڑ دیا تھا مگر اب وہ پھر مانگ رہی تھی۔زار و قطار روتے ہوئے وہ اپنے اللہ سے سرمد

خان کی صحت اور سلامتی مانگ رہی تھی اور اس کے اللہ نے رات کے اس پہر میں اپنا در کھٹکھٹانے پر اسے خالی ہاتھ واپس نہیں لوٹایا تھا۔

سرمد خان کی آنکھ جس وقت کھلی وہ دوپٹا نماز کے لیے اچھی طرح لپیٹے بار بار اس کا ہاتھ چومتے ہوئے رو رہی تھی۔ رات میں شاید اس نے اس کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھی رکھی تھیں۔ وہ شاکڈ ہی تو رہ گیا تھا۔

''بری......!''

''بری نہیں سرمد بُری کہو' بے حد بُری ہم سفر ہوں میں تمہاری۔ کیا نہیں کیا تم نے میری اداس زندگی میں خوشیوں کے پھول کھلانے کے لیے مگر میں نے کیا کیا؟ پرانے زخموں سے کھرنڈ اتار اتار کر خود کو لہولہان کرتی رہی' تمہاری قدر ہی نہیں کی۔ مجھے معاف کر دو سرمد' پلیز......!'' جذبات میں بکھرتے ہوئے وہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ سرمد حیران ہی تو رہ گیا تھا' فقط ایک ہی رات میں اسے کیا ہو گیا تھا؟

''بری......میری جان! میں ٹھیک ہوں۔''

وہ تڑپ اٹھا تھا۔ اس کے آنسوؤں پر' مگر بُریرہ نے اس کے سینے سے سر نہیں اٹھایا۔

''آپ کو ٹھیک رہنا ہے ہمیشہ۔ کیونکہ آپ میں میری جان ہے سرمد! مجھے لگتا تھا میرے رب نے مجھ سے شاہ زر آفندی کو چھین کر بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر' پانچ سال اسی گمان میں بیت گئے' نہیں سمجھ سکی میں اس کی حکمت۔ میں نہیں سمجھ سکی سرمد کہ جب وہ آپ سے کچھ لیتا ہے تو صرف اسی لیے کہ اس کے پاس آپ کے لیے اس سے بہتر کچھ موجود ہوتا ہے' میں نہیں سمجھ سکی۔''

سرمد خان کے سینے پر سر پٹختے ہوئے وہ اپنی نادانی کا ماتم کر رہی تھی جواب میں سرمد نے اپنے بازو اس کے گرد پھیلا دیئے۔

''بری پاگل ہوئی ہو' پلیز چپ کر جاؤ نہیں تو میرا دل رک جائے گا۔''

وہ ایک محبت کرنے والا انسان تھا۔ الجھی ہوئی کہانی کے الجھے ہوئے کرداروں میں ایک بے حد گداز دل رکھنے والا۔ ایسا انوکھا کردار' جس کے حصول کے لیے لوئر' مڈل' اپر' ہر کلاس' ہر طبقے کی لڑکی خواہش کرتی ہے۔ اس کی محبت سمندر کی طرح لامحدود تھی مگر اس محبت کو اس نے مختلف چہروں اور دلوں میں تقسیم نہیں کیا تھا بلکہ صرف ایک ہی چہرے اور ذات کو مرکز بنا کر اپنی الفت کی سلطنت کے سارے خزانے اسی ایک خوش نصیب لڑکی پر کھول دیئے تھے۔

بریرہ اب اس کی پیشانی چوم رہی تھی۔

''میں محبت کا سمندر ہوں سرمد! اور مجھے یہ اعتراف کر لینے دیں کہ اس سمندر کی ہر موج اب زندگی بھر صرف آپ کے پاؤں چھو کر واپس پلٹے گی۔''

''بری! میں بے ہوش ہو جاؤں گا قسم سے۔'' سرمد خان کا دل بخار سے نڈھال ہونے کے باوجود خوشی سے پھٹ رہا تھا۔ مگر بریرہ نے اپنی محبت میں کمی نہیں کی۔

''میری زندگی کی کتاب میں آپ ایک خوب صورت کردار ہیں سرمد! ایسا کردار جس کے حصول کی خواہش کے لیے جانے میرے جیسی کتنی محبت میں اندھی لڑکیاں نقلی چہروں سے دھوکا کھا جا

ہیں۔ پل دو پل کا سہارا بننے والے' خوش نما' مگر خود غرض چہروں پر لٹا دیتی ہیں اپنا آپ' لیکن انہیں سوائے فریب کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ محبت کا سمندر لٹا کر بھی ساری عمر پیاس سمیٹتی رہتی ہیں۔ انہیں سرمد خان نہیں ملتا' ہر لڑکی کو سرمد خان نہیں ملتا......"

اس پر جھکی وہ کس حسرت سے کہہ رہی تھی۔ سرمد خان کو لگا وہ جیسے سانس بھی نہیں لے پائے گا۔ باہر کھڑکی کے اس پار سورج طلوع ہو رہا تھا اور اندر اس کمرے میں ایک نئی زندگی بیدار ہو رہی تھی' ایک بے حد خوب صورت اور روشن زندگی......

❁❁❁

"ایک لڑکی تھی میرال حسن......!"

ازلان کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا کچھ ضروری کام نمٹا رہا تھا' جب صاعقہ نے اچانک اس کی سیٹ کی بیک پر آتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ازلان کے کی بورڈ پر تیزی سے چلتے ہاتھ فوری رک گئے۔

"بے حد پیاری تھی' بالکل کسی کانچ کی گڑیا جیسی...... مگر اس کا جو دل تھا ناں وہ اس سے بھی زیادہ پیارا تھا اور پتا ہے ازلان...... اس دل میں کیا تھا؟"

بہت سنجیدہ لہجے میں بہت سکون کے ساتھ کہتی وہ اسے بے کل کر گئی تھی۔ گزرے پانچ سالوں میں دونوں ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست بن گئے تھے مگر پچھلے پانچ سالوں میں دونوں کے بیچ کبھی میرال حسن کے ذکر پر کوئی بحث نہیں ہوئی تھی۔

اس عرصہ میں صاعقہ کی پوزیشن بہت مضبوط ہو گئی تھی' اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر اس نے وہ سب حاصل کر لیا تھا' جس کے کبھی وہ صرف خواب دیکھا کرتی تھی۔ ایان سے اس کا رابطہ بھی ہو گیا تھا تاہم گزرے ہوئے ان پانچ سالوں میں سمعان نہیں رہا تھا۔ آمنہ کی غیر متوقع بے وفائی کے بعد وہ چاہنے کے باوجود بھی جی نہیں سکا تھا۔

اندر ہی اندر لگے روگ نے اسے نگل لیا تھا۔ اس کی رحلت کے بعد ہی ازلان صاعقہ کے زیادہ قریب آیا تھا۔ کسی کے علم میں نہیں تھا مگر چپ چاپ زندگی کی بے حسی سے ہار مان لینے والے اس شخص نے اپنا آپ، اپنے ہر رشتے پر قربان کر دیا تھا۔ اس کی ٹانگ گوری کے لیے کٹی تھی اس نے اپنا گردہ گھر والوں کے لیے بیچا تھا اور مرنے سے چند لمحے پیش تر اس نے اپنی آنکھیں آمنہ کو دان کر دی تھیں جو ایک حادثے میں بینائی کھو بیٹھی تھی۔

بہت مشکل سے سنبھالا تھا صاعقہ نے اس کے بعد خود کو' بالکل ویسے ہی جیسے ازلان نے میرال کے بعد خود کو بہت مشکل سے سنبھالا تھا۔ ارسلان حیدر کے واپس لوٹ آنے کے بعد' بزنس کا بوجھ اس کے کندھوں سے ہٹ گیا تھا۔ گھر میں بھی اب ہر وقت اسی کے ناز اٹھائے جاتے تھے۔ وہ اس کی کاپی تھا مگر ازلان نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس سے جیلسی محسوس نہیں کی تھی۔ تاہم وہ مزید خود میں سمٹ ضرور گیا تھا۔ صاعقہ کے ساتھ ساتھ امامہ سے بھی اس کی فرینڈ شپ قائم ہو گئی تھی۔

اب وہ اکثر اپنی باتیں صاعقہ سے بلا جھجک شیئر کر لیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس سے بزنس کا کوئی پوائنٹ ڈسکس کر رہا تھا' جب اس نے اچانک بات بدل دی۔ ازلان سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھے گیا۔

''کیا تھا......''

''آپ کا پیار...... بے حد' بے تحاشا۔'' بہت خوشی کے ساتھ وہ اسے بتا رہی تھی' وہ چڑ گیا۔

''بکواس ہے یہ اور کچھ بھی نہیں۔''

''بکواس نہیں یہ حقیقت ہے۔ آپ پوری کہانی سنیں گے تو خود بخود سب جان جائیں گے۔'' جانے وہ آج اس پر کیا آشکارا کرنے جا رہی تھی۔ ازلان خاموش ہو گیا۔

''اس کا ایک دوست تھا مصحف' پھوپو زاد کزن بھی تھا۔ میرال کو اس سے ہمدردی تھی' صرف اور صرف ہمدردی مگر اس شخص کو میرال حسن سے ہمدردی نہیں تھی کیونکہ میرال حسن رضا صاحب کی بیٹی' جن کی دولت و جائیداد پر وہ اپنا حق سمجھ رہا تھا۔ اس شخص نے یہ دولت ہتھیانے کے لیے میرال جیسی کانچ کی گڑیا سے شادی کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔'' جیسے جیسے وہ بولتی جا رہی تھی ازلان کا جسم آگ بن رہا تھا۔

''وہ شخص جانتا تھا کہ میرال صرف ازلان سے پیار کرتی ہے مگر اس پیار کا اس نے کبھی اظہار نہیں کیا' بہت عجیب لڑکی تھی وہ۔ تاہم مصحف کو یہ گوارا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ازلان میرال کا ہمسفر بن گیا تو اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا۔ اسی گندی سوچ اور لالچ نے اسے میرال کو ازلان حیدر کے خلاف بہکانے پر مجبور کر دیا۔ بظاہر ہمدرد بن کر وہ اسے ازلان حیدر سے متعلق ایسی ایسی اخلاق سوز کہانیاں سناتا کہ وہ بکھر کر رہ جاتی مگر اس پاگل نے یہ بھی صرف اپنی ڈائری کے بے جان اوراق سے شیئر کیا' کبھی ازلان حیدر کو نہیں بتایا کہ اس کے اندر کون سی جنگ چھڑی ہے اور مصحف علی نے اسی کا فائدہ اٹھایا۔ ازلان حیدر کو میرال حسن سے دور کرنے کے لیے اس نے زیادہ سے زیادہ میرال حسن کو کمپنی دینا شروع کر دی۔ ہر وقت وہ اسے اپنے ساتھ مصروف رکھتا۔ پھر ایک روز میرال حسن نے اسے بتا دیا کہ وہ ازلان حیدر کی بے وفائی کے باوجود اس کے بُرے کردار اور بے ایمانی کے باوجود اس کے بغیر نہیں رہ سکتی اور یہیں پر اس نے فیصلہ کیا کہ میرال حسن کو اب مزید زندہ نہیں رہنا چاہیے۔'' جونہی وہ خاموش ہوئی ازلان اسپرنگ کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو تم؟'' اس کا اندر ڈوبنے لگا تھا۔ صاعقہ کے لبوں پر دھیمی سی مسکان بکھر گئی۔

''بکواس نہیں یہ حقیقت ہے آپ پوری کہانی سن لیں پھر میں آپ کو ثبوت بھی فراہم کر دوں گی۔''

ازلان کو لگا جیسے اس کے وجود کے پرخچے اڑ جائیں گے' یہ کیسی حقیقت تھی جس سے وہ اتنے سال بے خبر رہا تھا اور صاعقہ اگر یہ سب جانتی تھی تو اس نے پہلے کیوں یہ سب اس سے شیئر نہیں کیا' ایک لمحے میں اس کا دماغ جیسے پھٹنے لگا تھا' صاعقہ پھر بولنا شروع ہو گئی۔

''میرال حسن کا یونیورسٹی گروپ ٹرپ پر مری اور شمالی علاقہ جات کی سیر کو جا رہا تھا۔ اس نے مصحف کو یہ بتا دیا۔ مصحف نے اس سے وعدہ کیا کہ ٹرپ سے واپسی کے بعد اس کی طرف سے وہ خود تم سے یعنی ازلان حیدر سے بات کرے گا۔ میرال بہت خوش تھی' وہ اس کی بہت ممنون تھی' مگر ازلان حیدر کو اس کا مصحف کے قریب رہنا گوارہ نہیں تھا۔ اس نے صاف لفظوں میں اسے وارن کیا کہ مصحف ٹرپ میں اس کے ساتھ نہیں جائے گا مگر میرال نے اس کی بات نہیں مانی۔ مصحف تو اس کے

لیے اس کا محسن تھا پھر وہ کیسے ازلان کی بات مان لیتی جب کہ اس کے ذہن میں بھی یہی تھا کہ ازلان' مصحف سے صرف اس لیے خار کھاتا ہے کیونکہ وہ اسے اس کی ہر رپورٹ دیتا ہے' دونوں کے درمیان بات کلیئر نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمیوں کے پہاڑ بلند ہوتے چلے گئے تھے۔'' ایک لمحے کے لیے وہ سانس لینے کو رکی تھی۔ ازلان دم سادھے بیٹھا رہا۔'' وہ ٹرپ پر چلی گئی مگر مری پہنچنے سے قبل ہی مصحف کے دوستوں نے اسے راستے سے کڈنیپ کرلیا' اگلے دو روز کے بعد مصحف کو یہ خوش خبری سننے کو مل گئی کہ میرال حسن مرگئی ہے۔ اس کے گھر میں بھی سب کو پتا چل گیا تھا' وہ خوش تھا بے حد خوش...... مگر میرال حسن کے گھر والوں کے سامنے اسے رونے سسکنے کا ڈراما بار بار کرنا پڑا۔ اس نے میرال کے حادثے کے بعد ازلان حیدر کو بھی یہی بتایا کہ میرال اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے کلوز تھی اور اس سے اس کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ میرال حسن کے ذکر سے بھی متنفر ہوجائے' اس کا اس کے گھر والوں سے بھی کوئی رابطہ نہ رہے اور ایسا ہی ہوا۔ ازلان حیدر، میرال حسن کی موت کی خبر پر یقین نہ کرنے کے باوجود بکھرتا چلا گیا تھا۔ اس صدمے کو سہارنے کے لیے اس نے سگریٹ اور جانے کیسی کیسی بلائیں اپنے گلے میں ڈال لی تھیں۔ وہ تیزی سے زندگی سے دور جارہا تھا' جو مصحف کی ایک اور کامیابی تھی۔ اسی دوران اس کے دوست واصف کو ایک لڑکی مل گئی' صاعقہ احمد...... قسمت' محبت اور حالات کی ستائی لڑکی وہ اسے دور سے میرال حسن لگی تھی۔ اس روز مصحف بھی اس کے ساتھ تھا' اس لڑکی کو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔ اس نے واصف کو اس لڑکی سے بے نیازی برتنے کی ہدایت بھی کی مگر واصف نے اس کی بات کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے ابروڑ جانے کے بعد وہ حالات اور قسمت کی ستائی اس لڑکی کو ایک ڈیل کے تحت صرف اس لیے ازلان حیدر کی زندگی میں لے آیا کہ شاید وہ لڑکی جو دیکھنے میں میرال حسن جیسی دکھتی تھی' اس کے دوست کو زندگی کی طرف لے آئے۔ اس نے اس لڑکی سے محبت کا ڈراما کرنے کے لیے بھی کہا اور اسے ازلان کے آفس میں سیٹ بھی کردیا۔ ازلان اس لڑکی سے خار کھاتا تھا مگر وہ لڑکی ڈھیٹ ہوگئی تھی' بار بار بے عزتی کے باوجود اس کے سامنے آجاتی' وہ سگریٹ پیتا تو اس سے سگریٹ چھین لیتی اور اسے باتوں میں لگا کر ساحل سمندر پر لے جاتی۔ زیادہ سے زیادہ الٹی سیدھی حرکتیں کرکے اسے ہنسانے اور خود میں مگن کرنے کی کوشش کرتی۔ اڑھائی سال بعد اس کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں جس روز اس نے اپنا بھائی کھویا اس روز ازلان حیدر نے اسے تسلی اور اپنائیت دی۔ رفتہ رفتہ دونوں کے درمیان عناد کی دیوار گرتی چلی گئی تھی مگر صاعقہ احمد نے اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ ''حسن پیلس'' جاتی ہے اور یہ بھی کہ اس کے ہاتھ میرال حسن کی ڈائری لگی ہے۔ ڈائری پڑھنے کے بعد اسے مصحف پر شک ہوا تھا مگر صرف اپنے شک کی بناء پر وہ کسی شخص کو بے نقاب نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے اس صورت حال میں واصف سے مدد لی اور میرال کی ڈائری اس کے حوالے کردی۔ واصف نے بنا بات اوپن کیے اپنے ایک ایس پی دوست سے سارا کیس ڈسکس کیا اور اس کیس کی انوسٹی گیشن کے دوران ایک افسر کو شک ہوا کہ میرال حسن مری نہیں ہے' اس نے ایسی لڑکی اپنے کسی رشتہ دار کے گھر کام کرتے دیکھی ہے۔ مگر کہاں یہ اسے یاد نہیں آرہا تھا' پانچ سال کیسے گزرے ایک لمبی کہانی ہے مگر یہ بات خوش آئند تھی کہ شاید میرال حسن زندہ ہو۔' ابھی مصحف کو شک نہیں ہوا تھا کہ اندر ہی اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے اسی لیے

جب دو ماہ قبل میں نے اسے "حسن پیلس" میں میرال حسن کی جڑواں بہن امامہ حسن کو دوبارہ مل جانے کا بتایا تو اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔ اپنی پلاننگ کے تحت ہم نے اسے پاکستان بلایا اور یہ تلقین کی کہ وہ کسی کو بھی اپنی پاکستان آمد سے باخبر نہ کرے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور تبھی ائرپورٹ سے واصف کے دوست نے اسے گرفتار کرلیا' مگر سب کی طرح وہ بھی یہی جانتا تھا کہ میرال مرچکی ہے۔ اس لیے اسے گرفتار کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اِدھر آپ زندگی کی طرف واپس پلٹے اور اُدھر کل میرال حسن کا سراغ مل گیا' اس میرال حسن کا جسے مصحف کے دوستوں نے اپنی طرف سے جلدی میں مار کر پھینک دیا تھا اور اس کی گاڑی بھی وہی ہضم کرگئے تھے مگر جسے اللہ زندہ رکھنا چاہے اسے کوئی موت نہیں دے سکتا۔ اذلان! بے شک کائنات میں اس سے بڑا پلانر اور کوئی نہیں۔" ایک مرتبہ پھر وہ سانس لینے کے لیے رکی تھی' اذلان کا حال ایسا تھا گویا وہ پتھر ہوچکا ہو۔

"میرال زندہ ہے اذلان! مگر ظالموں نے جو اس کے ساتھ کیا' جس بے دردی سے اس کا گلا گھونٹ کر اسے مارنے کی کوشش کی اس کے بعد وہ اب کچھ کھا نہیں سکتی' صاف بولتی بھی نہیں ہے۔ بس دارالامان کے کسی کونے میں منہ چھپائے روتی رہتی ہے۔"

"کہاں ہے وہ......؟" بہت دیر کے بعد آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے بھاری لہجے میں اس نے پوچھا تھا۔ تبھی صاعقہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ابھی وہیں ہے دارالامان میں۔ واصف گئے ہیں اسے لینے' آج آجائے گی۔ اصل میں جن لوگوں کے گھر وہ کام کررہی تھی وہ ملک سے باہر چلے گئے۔ جو نئے لوگ آئے ان کی طرف سے میرال کو اپنی عزت کا خدشہ تھا۔ اپنے ساتھ ہوئے حادثے کے بعد شاید وہ اپنا ذہنی توازن بھی ٹھیک سے برقرار نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسی لیے دارالامان پہنچ گئی' بہر حال میں بہت خوش ہوں' بے حد......"

وہ واقعی خوش تھی' اذلان کچھ دیر آنکھوں میں نمی لیے اسے دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگاتے ہوئے رو پڑا۔

"تھینکس صاعقہ...... تھینک یو سوچ......"

"بس رہنے دیں' اب اٹھیں اور ذرا آئینے کے سامنے جاکر خود کو میرال حسن سے سامنے کے لیے تیار کیجیے۔"

شرمندہ ہوکر اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکالنے کے بعد وہ مسکرائی تھی۔ اذلان دیر تک خود کو نارمل نہ کرسکا تھا۔ پانچ سال تک اس کے دل نے میرال کی موت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس کے دل کی یہ گواہی کتنی سچی تھی۔

❁❁❁

"امامہ......" وہ پودوں کو پانی دے رہی تھی جب اپنے پیچھے ارسلان حیدر کی پکار سن کر اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر میں ملبوس وہ شخص بہت اداس لگ رہا تھا۔

"کیسی ہو......؟"

"تمہیں کیسی لگ رہی ہوں۔"

اس کے قریب آکر کھڑے ہونے پر اس نے بے نیازی دکھائی تو جواب میں اس نے پانی کا

پائپ امامہ کے ہاتھ سے چھین لیا۔
''بہت پیاری۔ امامہ پلیز' میرے حال پر رحم کرلو۔ میں ریئلی نہیں جی سکتا تمہارے بغیر' قسم سے امامہ! مجھے اپنی ہر خطا کا احساس ہوگیا ہے' تم جیسے کھوگی میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں' مگر پلیز...... مجھے معاف کردو' اس شجاع حسن سے طلاق لے کر مجھے اپنالو پلیز......''
وہی اس کی روز کی تکرار...... امامہ کا پارا ہائی ہوگیا۔
''تم کیسے شخص ہو ارسلان حیدر! صرف اپنے مفادات کے لیے تم نے مجھے ایک انجان شخص کے گھر اکیلے بھیجا' میری محبت کا امتحان لیا اور میں نے...... پوری ایمان داری کے ساتھ یہ امتحان دیا وہ سب کچھ کیا جو تم چاہتے اور کہتے گئے کیونکہ میں تم سے مخلص تھی مگر تم...... تم مجھ سے مخلص نہیں تھے۔ کیا کیا نہیں کیا تم نے میرے ساتھ...... میرے ہاتھوں میرے ہی شوہر کو زہر تک دلوا دیا تم نے۔ مگر پھر بھی میں تمہاری محبت کا دم بھرتی رہی۔ اپنے شوہر کی عزت' مان' محبت کو' جوتے کی نوک پر رکھ کر' تمہارے ہر گناہ میں تمہارا ساتھ دیتی رہی۔ کیا ملا ہے مجھے' یہی کہ میرے شوہر نے مجھے اپنی نگاہوں سے گرا کر اپنی زندگی سے بے دخل کردیا۔ اس روز جب وہ شدید بدگمان ہوکر مجھے تمہارے ٹھکانے پر چھوڑ کر گئے اور وہاں تمہارے دوستوں نے تمہاری دشمنی میں جس طرح سے میری عزت کے ساتھ کھیلنا اور مجھے جان سے مارنا چاہا' کیا اس کے لیے میں کبھی تمہیں معاف کرسکتی تھی' نہیں...... یہ تو اتفاق ہوا کہ غلط فہمی میں انہی کے ہاتھوں میری جگہ ان لوگوں نے اس دوسری لڑکی کو تیزاب سے جلا دیا ورنہ اس سانحے کے بعد کیا میری روح تمہیں کبھی معاف کرسکتی تھی نہیں...... بہت ذلیل کیا تم نے مجھے ارسلان حیدر! ایک محبت کا لالچ دے کر' بہت کچھ چھینا ہے مجھ سے' اب میں تمہاری رفاقت پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔ کیونکہ اب میرے دل و دماغ پر وہی شخص قابض ہے جو میرے بچوں کا باپ ہے' جس نے مجھے ہمیشہ عزت دی ہے' جو اپنی نفرت اور محبت دونوں میں ایمان دار ہے۔''
امامہ پلیز! میں مرجاؤں گا۔''
''تو مرجاؤ! تم جیسے منافق' مطلب پرست شخص کو ویسے بھی زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ مجھے اب تمہاری زندگی اور موت سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہاں اس شخص کا ایک اور احسان ہے مجھ پر کہ اس نے صرف میرے لیے' تمہارے سارے گناہ معاف کرکے تمہیں رہا کردیا۔ اب اگر تم میں ذرا سی بھی شرم باقی ہے تو میری زندگی سے دور چلے جاؤ' پلیز......'' انتہائی کرخت لہجے میں کہتے ہوئے وہ بنا اس کی صورت دیکھے لان سے چلی آئی تھی' پیچھے ارسلان حیدر کے چہرے پر ایسی زردی کھنڈی تھی گویا سب کچھ پا کر اس نے اپنا سب سے قیمتی اثاثہ کھو دیا ہے۔
اسی رات کی فلائٹ سے وہ حیدر عباس صاحب کو بتا کر شاید ہمیشہ کے لیے پاکستان سے باہر چلا گیا۔ امامہ حسن نے وہ ساری رات جاگ کر بیتائی تھی۔
پانچ سال ہوگئے تھے شجاع حسن نے اس سے بات نہیں کی تھی۔ ابتداء میں ملازم گڑیا کو اس سے ملوانے لاتا رہا تھا پھر وہ بھی اپنی پھوپو کے پاس ملک سے باہر چلی گئی۔ حسن صاحب نے اس معاملے میں شجاع سے بات کرنی چاہی تھی مگر اس نے سختی سے منع کردیا۔ شجاع حسن کے گھر سے رخصتی کے فقط تین ہفتوں کے بعد اسے ماں بننے کی خوش خبری مل گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ خبر سب

سے پہلے وہ شجاع سے شیئر کرے مگر اس نے اپنی خواہش کو دبا لیا تھا' حسن صاحب اور طاہرہ بیگم اس کے ناز اٹھاتے نہیں تھکتے تھے۔ حاملہ ہونے کے ساتویں ماہ اس کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ مسلسل ٹینشن اور خود سے بے پروائی نے اسے خطرناک صورت حال سے دوچار کر دیا تھا۔ شجاع کو جیسے ہی خبر ملی وہ بھاگا آیا مگر امامہ نے اس سے بات نہیں کی۔ اسپتال میں جب ڈاکٹر اس کی حالت کے پیش نظر اسے لیبر روم میں لے جا رہے تھے' تب بھی آپریشن کے لیے پیپرز پر سائن کرتے ہوئے اس کا حال دیکھنے والا تھا۔ بے تحاشا خوشی اور بے تحاشا پریشانی نے اس کا حال عجیب سا بنا دیا تھا۔ اس نے امامہ سے بات کرنے اور اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی تاہم وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

طاہرہ بیگم، امامہ کے ساتھ ساتھ تھیں اور وہ انہی کا ہاتھ پکڑ کر مسلسل روئے جا رہی تھیں۔ فائزہ آپا کو شجاع نے ایمرجنسی میں بلوا لیا تھا۔ وہ جس وقت پاکستان پہنچیں' امامہ نے ایک خوب صورت' صحت مند بچے کو جنم دیا تھا' خود اس کی اپنی حالت بھی خطرے سے باہر آ گئی تھی۔ شجاع کو اس روز سے پہلے فائزہ آپا نے کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ بار بار وہ اپنے بیٹے کو دیکھتا تھا اور چومنے کی خواہش کرتا تھا مگر بچہ ابھی اسپتال کی نگہداشت میں تھا۔ وقت سے پہلے پیدائش کے باعث اسے فوری طور پر ضروری ٹریٹمنٹ بھی دی گئی تھی۔ امامہ کی مسلسل ٹینشن کے باعث وہ کالے یرقان کا شکار ہو گیا تھا اور اب ڈاکٹر اس ننھے سے وجود کو بچانے کے لیے خون کا انتظام کر رہے تھے۔ شجاع کا خون بچے سے میچ کر رہا تھا' اس نے اپنے بیٹے کو دو بوتلیں خود دیں۔

امامہ کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ پورا ایک ہفتہ زندگی اور موت کے درمیان لٹکے رہنے کے بعد اس کے بیٹے کو خدا نے زندگی نصیب کی تھی' وہ اپنے رحیم اور رحمٰن ربّ کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔

انتہائی ذمہ دار پوسٹ پر ہونے کے باوجود شجاع کا بیشتر وقت اب اسپتال کی نذر ہو رہا تھا۔ صدقات کا کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ فائزہ آپا خود ایک پل کے لیے اس کے پاس سے نہیں ہٹتی تھیں۔ گڑیا کو پتا چلا تو وہ سمندر پار بیٹھی بھائی کو دیکھنے کے لیے مچل اٹھی۔

پیار ہی پیار اور محبتیں ہی محبتیں تھیں مگر اس کے باوجود شجاع اور امامہ کے درمیان حائل فاصلے کم نہیں ہوئے تھے۔ وہ اب بھی روز شام میں آتا تھا اور اپنے بیٹے و دیگر گھر والوں سے مل کر چلا جاتا تھا' امامہ کو لگتا تھا جیسے وہ اپنا دل پتھر کر چکا ہو' پچھلے پانچ سالوں میں اس نے ایک بار بھی اسے گھر چلنے کے لیے نہیں کہا تھا۔

اپنے بیٹے کا نام اس نے اپنے پاپا کی پسند پر عمیر رکھا تھا اور اب وہ ون کلاس میں پڑھ رہا تھا' شکل و صورت میں وہ مکمل شجاع پر گیا تھا۔ تاہم حساسیت اور محبت اس نے امامہ سے چرائی تھی' بلا کا ذہین اور شرارتی تھا۔ شجاع اس روز اسے خود اسکول سے پک کر کے اپنے گھر لے گیا تھا۔ امامہ ابھی سو کر اٹھی تھی تبھی اسکول کال آ گئی۔ عموماً عمیر اس کے ساتھ گھومنے پھرنے چلا جاتا تو وہ اسے کال کر کے انفارم کر دیتا تھا تاکہ وہ پریشان نہ ہو' اس وقت بھی اس نے نیند کے خمار میں کال پک کی تھی۔

''السّلام علیکم!''

''وعلیکم السّلام! عمیر میرے پاس ہے پریشان مت ہونا۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اپنے سلام کے جواب میں وہی روٹین کی بات سن کر اس نے سرد آہ بھری تھی تبھی وہ بولا تھا۔

''اگر تم مصروف نہیں ہو تو مجھے تم سے کچھ شیئر کرنا تھا۔''

''جی......!'' ایک دم سے اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا تھا۔

''وہ ایک لڑکی ہے سعدیہ! میرے ماتحت ایس پی کی بہن ہے۔ بہت خوب صورت' حساس سی لڑکی ہے۔ اکثر ملتی رہتی ہے۔ گھر بھی دو چار بار ملنے آئی ہے' بقول اس کے اسے مجھ سے محبت ہوگئی ہے اور یہ بھی چاہتی ہے کہ میں اس سے شادی کرلوں' میں نے ہامی بھر لی ہے۔ آج شام بات طے ہو رہی ہے اگر تم آنا چاہو تو آ سکتی ہو۔'' جانے وہ اسے اطلاع دے رہا تھا کہ اس کی سانس کھینچ رہا تھا۔ امامہ کو لگا جیسے وہ گونگی بہری' اندھی ہوگئی ہو۔ اسے کال کٹ کرنے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔

پانچ سال کے بعد بالآخر وہ لمحہ آ گیا تھا' جب اسے ریزہ ریزہ ہونا تھا۔ اس پرفیکٹ اور ایمان دار شخص نے بالآخر اپنے لیے ایک پرفیکٹ اور ایمان دار لڑکی ڈھونڈ لی تھی۔ امامہ حسن کی کہیں جگہ نہیں رہی تھی۔ اس کے گھر کے ساتھ ساتھ وہ اس کی زندگی سے بھی بے دخل ہو رہی تھی۔ آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر بہتے چلے گئے تھے اور وہ خاموشی سے جیسے خود کو مسمار ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔

❁❁❁

گوری نے اسلامک اکیڈمی دوبارہ جوائن کرلی تھی۔ وہ مزید اپنے بچوں کو بھوکا مرتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

گزرے پانچ سالوں میں لوگوں نے اسے ایک بے جان مجسمے سے زیادہ نہیں دیکھا تھا۔ ضرورت کے تحت کی جانے والی بات کا جواب بھی وہ بہت مختصر دیتی تھی۔ کتنا بدل دیا تھا ان گزرے پانچ سالوں نے اسے۔

عدنان کے اب بھی وہی معاملات تھے۔ گوری کی نگاہ اب جب بھی اس کی طرف اٹھتی تھی' اسے خود پر ہنسی آتی تھی۔ کیا کیا نہیں سوچ کر آئی تھی وہ اس کی زندگی میں...... مگر...... کیا سے کیا نہیں ہو کر رہ گیا تھا وہ۔ شراب اس کی ہڈیوں میں جیسے رچ گئی تھی' بے حیائی اور فحاشی کی محفلوں میں اس کی شرکت اتنی ہی لازم ہوگئی تھی جتنی کسی بیمار کے لیے دوا......

گزرے پچھلے پانچ سالوں میں کوئی اذیت ایسی نہیں تھی جو اس نے عدنان ہمدانی کے ہاتھوں نہ اٹھائی ہو۔ جس کے ساتھ ساتھ روح پر بھی بے شمار گھاؤ تھے جو ہر رات اسے تڑپائے رکھتے۔ وہ شخص نہ اس کی شکل دیکھنے کا روادار تھا نہ اس کے بچوں کی' مگر پھر بھی وہ اس سے نفرت نہیں کر پائی تھی۔ اب بھی ہر دعا میں اس کے ہاتھ اس کی سلامتی کے لیے اس کی ہدایت کے لیے اٹھتے تھے مگر اس شخص کو اب اس کے کسی بھی عمل سے کوئی دل چسپی نہیں رہی تھی۔ اس وقت اسٹڈی ٹیبل پر سر ٹکائے بیٹھی وہ گزرے پانچ سالوں کو سوچتی رہی اور روتی رہی۔

عمر عذابِ تشنگی سے ڈر گئی ہے
کہانی میں محبت مرگئی ہے

❁❁❁

میرال حسن' صاعقہ اور واصف علی ہمدانی کی مخلصانہ کوششوں سے بالآخر "حسن پیلس" واپس پہنچ گئی تھی مگر وقت نے اسے بہت بدل دیا تھا۔ گلاب کے تازہ پھول کی مانند مہکنے والی لڑکی کسی یادگار قلعے کی مانند ڈھے کر رہ گئی تھی۔

ازلان اسے دیکھنے کے بعد کتنی ہی دیر روتا رہا تھا جب کہ طاہرہ بیگم اور حسن صاحب کا حال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ امامہ کے اپنے دکھ تھے مگر اکلوتی بہن کے ملن نے اس کا حال بھی عجیب کر دیا تھا۔ کبھی ہنستی تھی اور کبھی میرال کو گلے لگا کر روتی تھی۔ اس کا بیٹا عجیب حیرت میں مبتلا ٹکر ٹکر کبھی ماں کو دیکھتا تو کبھی خالہ کو۔ شجاع ملک سے باہر تھا اس لیے اس خوشی میں وہ شریک نہیں ہو سکا تھا۔ رفتہ رفتہ میرال کی حالت میں بہتری آئی تو اس نے سب کو بتایا کہ وہ کیسے اپنے ہی گھر کے فرد' اپنی پھوپو کے بیٹے مصحف کی سازش کا شکار ہو کر ایک کے بعد ایک مشکل کی بھینٹ چڑھتی گئی تھی۔

مصحف کو اس کے کیے کی سزا مل گئی تھی مگر پھر بھی ازلان کے اندر اک آگ جل رہی تھی جس میں وہ اس شخص کو جلا کر بھسم کر دینا چاہتا تھا۔ میرال اب زندگی کی طرف واپس آ رہی تھی' اسی لیے حسن صاحب اور حیدر عباس صاحب نے باہمی مشاورت سے اس کی اور ازلان کی شادی طے کر دی۔

صاعقہ نے دیکھا وہ ازلان جسے سب خبطی اور بدماغ کہتے تھے' غصہ جس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اب اسی ازلان کے لبوں سے مسکراہٹ جدا ہی نہ ہوتی تھی۔ "حسن پیلس" کی رونقیں پھر سے بحال ہو گئی تھیں۔ صبر کرنے والے اداس اور غمگین دلوں نے اجر پا لیا تھا مگر...... اسے قرار نہیں تھا۔

کہیں نا کہیں' کسی نہ کسی روز عباد یاور سے ٹکراؤ اسے نئے سرے سے ادھیڑ کر رکھ دیتا تھا۔ وہ چیز جو ان دونوں کے درمیان فاصلوں کا باعث بنی تھی۔ اس نے حاصل کر لی تھی مگر پھر بھی محبت کی تتلی ہاتھ نہیں آ سکی تھی۔ ہزاروں لاکھوں روپے حاصل کر کے بھی وہ گزرا ہوا خوب صورت وقت نہیں خرید سکتی تھی اور یہ بے بسی کتنی عجیب بے بسی تھی۔

"حسن پیلس" میں ازلان اور میرال کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں مگر اس کے دل کا سناٹا تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

اس روز امامہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ازلان کو شاپنگ کے لیے جانا تھا وہ صاعقہ کو امامہ کی جگہ ضد کر کے زبردستی آفس سے اٹھا لایا۔ صاعقہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں ایک مرتبہ پھر اس کا ٹکراؤ عباد یاور سے ہو جائے گا۔ اس وقت وہ دونوں شہر کی سب سے مہنگی بوتیک میں کھڑے ایک دوسرے کی پسند پر بحث کر رہے تھے جب وہ بے نیازی سے بوتیک کا آوٹ ڈور پش کرتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

"صاعقہ! میں کہہ رہا ہوں کہ تم بلیک ڈریس نہیں پہنو گی تو نہیں پہنو گی بس۔" ازلان حیدر' صاعقہ احمد سے کہہ رہا تھا اور اس کے لہجے میں کتنا استحقاق تھا' وہ گم صم سا وہیں کھڑا رہ گیا۔

صاعقہ اب ازلان سے کہہ رہی تھی۔

"میں نے بلیک کلر پہننا ہے اور ضرور پہننا ہے' اگر تم نہیں خریدو گے تو میں خود خرید لوں گی۔"

کوئی دکھ' کسک' کوئی پچھتاوا نہیں تھا اس لڑکی کے لہجے میں' عباد کا دل کٹ سا گیا۔

کس کے لیے برباد کررہا تھا وہ خود کو؟ اس لڑکی کے لیے جس نے کبھی دل سے اسے چاہا ہی نہیں تھا۔

زندگی کے خوب صورت اور قیمتی پل کس کے روگ میں ضائع کررہا تھا۔ وہ اس لڑکی کے روگ میں، جس کے لیے اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی؟

اگر اس کے دل میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی تو پھر وہ کیوں نہیں بھلا پارہا تھا اسے؟ ایک اس کے سوا، اس کے لیے ساری دنیا کیوں بے کار ہوگئی تھی؟

اذلان حیدر کی نظر اچانک اس پر پڑی تھی اور وہ فوراً اس کی طرف لپک آیا تھا۔

''ارے عباد صاحب آپ یہاں......؟''

''ہوں...... کچھ شاپنگ کرنی تھی تو۔'' اچٹتی سی نظر صاعقہ پر ڈالتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اذلان اب اسے بتا رہا تھا۔

''میں بھی شاپنگ کے لیے ہی آیا تھا، وہ اصل میں اگلے ہفتے شادی ہے تو......''

اس کی طرح اذلان نے بھی بات ادھوری چھوڑ دی تھی مگر اس ادھوری بات نے عباد یاور کو شاکڈ کردیا تھا۔ کس قدر دکھ اور بے یقینی سے اس نے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی صاعقہ احمد کو دیکھا تھا۔ جو سر جھکائے کھڑی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ گر جائے گا۔ محبت جینا سکھا کر دامن چھڑالے تو انسان گر ہی جاتا ہے۔ صاعقہ احمد اب اذلان حیدر سے کہہ رہی تھی۔

''اب چلیں، مجھے بھوک لگی ہے۔''

''ہوں چلو......او کے عباد صاحب! کل آفس میں آپ سے ملاقات ہوگی۔''

وہ شخص خوش تھا، بے پناہ خوش......

اسے خوش ہی ہونا تھا، محبت چیز ہی ایسی ہے جس کا دامن پکڑ لے اسے دنیا اور آخرت دونوں بھول جاتی ہے مگر یہی محبت جن سے روٹھ جاتی ہے انہیں ٹھیک سے سانس لینا بھی دشوار ہوجاتا ہے، عباد یاور کے ساتھ بھی یہی ہورہا تھا۔

اذلان حیدر اور صاعقہ احمد، ایک ساتھ چلتے ہوئے بوتیک سے نکل گئے تھے، وہ گم صم سا خالی خالی سے اعصاب کے ساتھ، کتنی ہی دیر وہیں کھڑا رہا، پھر بنا کچھ دیکھے اور خریدے خود بھی باہر نکل آیا۔

❁❁❁

خواب پوش آنکھوں میں
آنسوؤں کا بھر جانا
حسرتوں کے ساحل پر
تتلیوں کا مر جانا
حبس کی ہواؤں میں
خوش بوؤں کا ڈر جانا
دل کے گرم صحرا میں، حشر ہی بپا ہونا
درد لا دوا ہونا

کیا بہت ضروری ہے
'اب تیرا جدا ہونا'
''بابا سانول......!''
وجد کے عالم میں ٹنڈ منڈ درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا وہ شخص فقط کچھ ہی سالوں میں ''سَنی دادا'' سے ''بابا سانول'' ہوگیا تھا۔ اس کے دل پر ڈاکا ڈالنے والی بھی محبت تھی۔

اس وقت گاؤں شاہ والا کی کسی عورت کی پکار پر بہ مشکل اس نے پلکیں وا کی تھیں۔

''ہوں۔''

''بابا یہ میرا بچہ ہے کل شام سے روئے جا رہا ہے۔ ابا جی کہتے ہیں اسے سایہ ہوگیا ہے۔ آپ دم کر دیں گے تو ٹھیک ہو جائے گا۔''

عورت کی درخواست پر اس کا دل چاہا وہ خوب ہنسے بھلا جس کی دعاؤں میں قبولیت نہیں رہی تھی اس کے دم میں اثر کہاں ہونا تھا؟ اس گاؤں کے سادہ لوح لوگ شاید کبھی بدلنے والے نہیں تھے۔ وہ اسے اللہ والا سمجھ رہے تھے جبکہ وہ...... وہ تو ایک عورت کا روگی تھا۔ ایک عورت کو مجسم پانے کے لیے اللہ کے قریب ہوا تھا۔

انزلہ شاہ کے اس گاؤں سے جانے کے بعد اس نے وہ سارے کام کیے تھے جس سے وہ خوش ہوتی مگر زندگی کے پینتیس سالوں میں ایک بار بھی اس نے اللہ کی خوشنودی کا نہیں سوچا تھا۔ ایک عورت کی محبت میں اس نے برائی چھوڑ دی تھی۔ مگر اللہ ربّ العزت جو ساری کائنات کا ربّ ہے اس پاک ذات کی محبت میں اس نے دنیا ترک نہیں کی تھی۔

یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ گاؤں آ گیا اور یہاں کی بے بس مخلوق پر اپنے باپ اور بھائیوں کی خدائی دیکھی تو اسے اچھا نہیں لگا مگر باپ کی رحلت کے بعد جب اسے طاقت کا ہتھیار ملا تو اسے بھی خدائی کرنے میں مزا آنے لگا اور پھر جیسے یہ مزا، یہ نشہ اس کی ہڈیوں میں اُترتا چلا گیا تھا۔

کتنے سورج ابھرتے اور غروب ہوتے دیکھے تھے اس نے اس گاؤں میں۔ جب وہ دہشت کی علامت تھا تب بھی لوگ اس کا احترام کرتے تھے اور اب جبکہ وہ اللہ کا عاجز بندہ ہوگیا تھا لوگ اب بھی اس کا احترام کرتے تھے۔ اس کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ کو بھی اس کے مقابل کھڑی اس سادہ لوح عورت نے مقدس جانا تھا۔ وہ یوں مؤدب کھڑی تھی گویا ہلی بھی تو اس کی شان میں گستاخی ہو جائے گی۔ سانول نے سر دوبارہ درخت کے تنے سے ٹکا دیا۔

''میں اللہ کا نیک بندہ نہیں ہوں بی بی! نہ کوئی عامل ہوں پھر میرے دم سے کیا ہوگا؟''

''ایسا نہ کہیں بابا تین سال ہو گئے آپ کو دنیا ترک کیے۔ شدید آندھی طوفان میں بھی یہیں اس درخت کے نیچے چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں۔ مسجد کے سوا گاؤں کے کسی آدمی نے آپ کو کہیں اور نہیں دیکھا آپ کی برکت سے ہی اس گاؤں کے کتنے مسئلے حل ہو گئے ہیں۔ وہ حشمت تھا نا اس کی بیٹی کا بیاہ بھی ہو گیا آپ کی دعا سے۔'' لہجے میں بھرپور عقیدت سموئے وہ عورت اسے بتا رہی تھی۔

سانول کے اندر بے چینی پھیل گئی۔

"یہ سب اللہ کا کرم، اس کی رحمت ہے۔ مجھے گناہ گار مت کرو بی بی! میں اس قابل نہیں ہوں۔" مگر عورت اس کے صاف جواب پر بھی وہاں سے ہلی نہیں تھی۔ وہ چڑ کر وہاں سے اٹھ گیا۔ اپنے پیچھے اس نے اس عورت کو دوسری عورت سے کہتے سنا تھا۔

"بڑے جلالی ہیں یہی تو پہچان ہے اللہ والوں کی کہ وہ اپنی عظمت کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے۔ ہائے اس طرف تو کوئی دن کو بھی نہ آئے اور یہ رات رات بھر بیٹھے رہتے ہیں پھر بھی کہتے ہیں اللہ والے نہیں ہیں۔"

وہ چلتا گیا اس کا دل چاہا وہ اس گاؤں سے کہیں دور چلا جائے گا مگر پھر انزلہ شاہ کی واپسی کی امید اس کا راستہ روک لیتی۔ اس نے ہوا' پانی' درخت ہر چیز کو گواہ بنا کر واپسی کا وعدہ کیا تھا اور وہ زندگی کی آخری سانس تک اس کے وعدے پر اعتبار کر کے اس کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔

❀❀❀

"علیزہ ملک' تم یہاں؟" پتھر ہوئے شخص کے لبوں نے بھی ہلکی سی جنبش کی تھی۔ علیزہ سانس تک نہ لے سکی۔ تبھی انیسہ آپا پھر بولی تھی۔

"آہو جی' یہی علیزہ ہے ایک نمبر کی ہڈحرام اور کاہل لڑکی ہے جی! میں نے کل حساب کر دیا ہے اس کا۔"

"شٹ اپ۔" اس کے تبصرے پر ایان نے دہاڑ کر اسے چپ کروایا تھا۔ جبکہ علیزہ ہوش کی دنیا میں واپس آتے ہوئے فوراً پیچھے بھاگی تھی۔

"علیزہ' علیزہ پلیز میری بات سنو۔"

بے خود سا وہ اس کے پیچھے لپکا تھا مگر وہ نہیں رکی اپنے کوارٹر میں داخل ہونے کے بعد اس نے سرعت سے کنڈی لگائی تھی۔ ایان ملازمین کے بیچ تماشہ نہ بننے کے خیال سے کچھ دیر اس کے بند کواڑوں پر دستک دیتا رہا پھر پلٹ آیا۔

اس کا دل اس لمحے بہت شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کہاں کہاں نہیں تلاشا تھا اس نے اس لڑکی کو' مگر اتنے سالوں کے بعد وہ ملی بھی تو کس حیثیت میں۔ اس کا دل چاہا وہ زور سے دیوار میں سر دے مارے۔ انیسہ آپا کی حیرت اپنی جگہ برقرار تھی۔ اسے دال میں کچھ کالا ہونے کا احساس چونکا رہا تھا۔

عصر کے قریب علیزہ نے اپنا سارا سامان پیک کر لیا تھا۔ وہ دوبارہ اس بنگلے میں قدم رکھنے کی خواہاں نہیں تھی مگر جیسے ہی اس نے کوارٹر سے قدم باہر نکالا بے قراری سے ٹیرس پر ٹہلتے ایان احمد کی نگاہ اس پر جا پڑی اور وہ فوراً پلٹ کر سرعت سے سیڑھیاں کراس کرتا نیچے چلا آیا۔۔۔

علیزہ بیرونی دروازے کو لاک کر رہی تھی جب وہ اس کے سر پر جا پہنچا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

علیزہ کو گمان نہیں تھا کہ وہ اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہوگا تبھی وہ جہاں کی تہاں رہ گئی تھی۔ اس نے پیچھے پلٹ کر اسے دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

"اگر تم یہاں سے فرار کی کوشش کر رہی ہو تو اس خوش فہمی کو دماغ سے نکال دو کہ میں تمہیں ایسا

کرنے دوں گا۔ چلو اندر مجھے بات کرنی ہے تم سے۔''

آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھولتے ہوئے اسے گھر کے اندر لے آیا۔ علیزہ یوں اس کے ساتھ کھنچتی آئی تھی گویا اس کے وجود میں جان ہی نہ ہو۔

صرف ایک کمرے پر مشتمل اس بوسیدہ سے کوارٹر میں اس کا چند لمحوں کے لیے بھی کھڑا ہونا محال ہو رہا تھا۔ علیزہ کی طبیعت کے پیش نظر' شاید کچھ روز سے یہاں صفائی ستھرائی کا کام بھی نہیں ہوا تھا۔ شدید گرمی میں وہاں کسی پنکھے' کسی سائے کی کوئی چیز نہیں تھی۔ جانے وہ وہاں کیسے رہتی تھی۔

''کہاں چلی گئی تھیں تم؟ تمہیں پتا ہے میں نے کہاں کہاں تمہیں نہیں تلاشا۔''

علیزہ کا بازو تھامتے ہوئے وہ بہت دکھ سے کہہ رہا تھا مگر وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

''علیزہ۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے اس کا بازو جھنجوڑتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

''میں علیزہ نہیں ہوں۔''

آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بہ مشکل وہ کہہ پائی تھی۔ ایان کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''ایسا مت کہو علیزہ! بہت تلاشا ہے میں نے تمہیں۔ سید والا' آمنہ کے گھر' کراچی کے ایک ایک روڈ ایک ایک گلی میں مگر تم نہیں ملیں۔ کوئی ایسے بھی کرتا ہے۔ علیزہ ہاں میں مانتا ہوں، میں تمہارا گنہگار ہوں۔ اپنے نکاح میں لا کر بھی میں نے تمہارے وجود کو تسلیم نہیں کیا مگر میں کبھی بھی تمہیں بھول نہیں پایا علیزہ۔ کسی اور کی رفاقت میں ضرورتاً زندگی گزارتے ہوئے تم ہر پل میرے ساتھ رہیں۔ ہر پل تمہارا احساس مجھے تڑپاتا رہا۔ ہر بار پاکستان واپسی پر تمہاری تلاش میرا حاصل رہی۔ یقین نہیں آ رہا نا؟'' اب اس شخص کے لہجے میں نمی تھی۔

علیزہ ملک کے آنسو تواتر سے گرنے لگے۔

''بہت شرمندہ ہوں۔ میں تم سے علیزہ! پلیز مجھے معاف کر دو پلیز۔''

''کس بات کی معافی؟ ایک لڑکی نے آپ کے جذبات کے ساتھ کھیل کھیلا۔ آپ نے اس بات کی سزا دے دی۔ حساب برابر ہوا پھر معافی کس بات کی؟'' تواتر سے گرتے آنسوؤں کے ساتھ اس نے بات مکمل کی تھی۔ ایان تڑپ کر رہ گیا۔

''نہیں تمہیں سزا نہیں دی تھی۔ خود اپنے حصے میں تڑپ لکھ لی تھی۔ مجھے معافی کا صرف ایک موقع دے دو علیزہ' میں وعدہ کرتا ہوں اپنی ہر خطا کی تلافی کر دوں گا۔''

''نہیں۔''

''تو ٹھیک ہے آج کے بعد میں بھی تمہارے ساتھ اس کوارٹر میں زندگی گزاروں گا۔''

''یہ کوارٹر آپ کے رہنے لائق نہیں ہے۔''

''میرے رہنے لائق نہیں ہے تو تم نے پانچ سال کیسے گزار لیے یہاں؟ تم بھی تو ملکوں کی بیٹی تھیں۔ یہ گھر...... جس میں تم پچھلے پانچ سال سے ملازمہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہو۔ تم اس گھر کی مالکن ہو علیزہ' میرے پاس موجود ایک ایک پیسے پر تمہارا حق ہے۔ کیونکہ یہ ساری دولت تمہارے

توسط سے ملنے والی رقم سے ہی کمائی گئی ہے۔ میں نوکر تھا تمہارا تم میری ملازمہ نہیں تھیں۔"

"وہ ماضی تھا میرا' ایک مدت ہوئی اب میں نے ماضی میں جینا چھوڑ دیا ہے۔"

"مگر میں اب بھی ماضی میں جیتا ہوں علیزہ میرا دل اور گھر دونوں خالی ہیں۔ میں نے تمہیں دکھ دیے۔ میں کم ظرف تھا۔ تم نے پانچ سال میری عزت کی مخالفت کی۔ میرے ہجر کو اپنی جان کا روگ بنالیا۔ یہ تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے۔ ایک بار پھر احسان کردو جاناں' پلیز [illegible]"

ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے اب وہ دوسرے ہاتھ [illegible] اس [illegible] ہاتھا علیزہ ضبط کرتے ہوئے اس کے گلے لگ کر زار وقطار رو پڑی۔ ایان احمد کو لگا [illegible] ایک [illegible] بعد اسے راحت نصیب ہوئی ہو۔

اس کی شرٹ علیزہ کے آنسوؤں سے پوری طرح بھیگ چکی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے اسے خود سے الگ نہیں کیا تھا۔ بیس پچیس منٹ اچھی طرح رو کر دل کا غبار نکالنے کے بعد وہ خود ہی اس سے الگ ہوئی تھی۔

"تھینکس اب بتاؤ اسی کوارٹر میں رکھوگی مجھے یا پھر اپنے محل میں؟" دایاں ہاتھ علیزہ ملک کے گال پر رکھتے ہوئے اب وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔ علیزہ نے رخ پھیرلیا۔

"میرے پاس کوئی محل نہیں ہے۔"

"مگر میرے پاس ہے ایک اسٹوپڈ سی شرارتی لڑکی کی امانت۔"

"مگر......!"

"اب کوئی اگر مگر نہیں' چلو۔" گزرے پانچ سالوں نے اسے بہت خود اعتماد اور خوب صورت بنا دیا تھا۔ علیزہ نا چاہنے کے باوجود اس کے ساتھ کھنچتی گئی۔

"ایان صاحب...... یہ...... آپ کے ساتھ......؟"

انیسہ آپا کو اسے ایان کے ساتھ دیکھ کر سب سے پہلا جھٹکا لگا تھا۔ وہ ایان کی چوڑی پشت کے پیچھے چھپ گئی۔

"یہ...... کیا؟ علیزہ بی بی کہو۔ یہ گھر جہاں آپ ملازمت کر رہی ہیں انہی کا ہے۔ یہ مالکن ہیں اس گھر کی۔ میری پہلی بیوی اور آخری محبت تھی۔ میرا نہیں خیال کہ آج کے بعد اس گھر کو آپ کی مزید ضرورت پیش آئے۔ لہٰذا سامان باندھیں اپنا اور حساب کتاب کرکے رخصتی پکڑیں۔"

لہجے میں بھرپور تلخی سموئے اس نے انیسہ آپا کو ان کی اوقات یاد دلا دی تھی۔ جواب میں وہ ہکا بکا سی کھڑی اس کا منہ دیکھتی رہیں۔ یوں جیسے قدرت کے اس کرشمے پر یقین ہی نہ آرہا ہو۔ تبھی ملازم ایان کے بیٹے کو گود میں اٹھائے وہاں چلا آیا۔

"ایان صاحب یہ چھوٹے صاحب آپ کے لیے رورہے ہیں۔"

وہی بچہ جس نے علیزہ کے منہ پر فٹبال مارا تھا۔ اب ایان کے لیے رو رو کر بے حال ہو رہا تھا۔

ایان نے ہاتھ بڑھا کر ملازم سے بچے کو لے لیا۔

"یہ میرا بیٹا ہے علیزہ' بہت ضدی اور بدتمیز ہے۔"

انیسہ آپا کے بعد ملازم کی آنکھوں میں بھی حیرانی تھی۔ وہ علیزہ کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے

اسے اندر لے آیا۔ وہ گھر جہاں پچھلے پانچ سال سے اس کی تحقیر ہو رہی تھی۔ اب اسی گھر میں سب اس سے نظریں چراتے ہوئے اس کے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ انیسہ آپا کی الگ جان پر بنی تھی۔ صبح سے شام تک کئی بار وہ علیزہ کے پاس آئیں مگر معافی مانگنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ صبح علیزہ نے اس سے کہا تھا کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے اور اب وہ ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے اس سے کہنا چاہتی تھیں کہ ان کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

فقط ایک ہی دن میں کائنات کے رب نے بازی پلٹ دی تھی گدا کو بادشاہ اور بادشاہ کو گدا کر دیا تھا۔ علیزہ اپنے مہربان رب کی قدرت اور انصاف پر قربان ہوتی۔ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اسی روز رات میں ایان اسے اپنے پہلو میں اپنے بازو پر لٹائے بتا رہا تھا۔

''میں واقعی تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ علیزہ' کویت جانے کے بعد یوں کام میں مصروف ہوا کہ کسی کا ہوش ہی نہیں رہا۔ پھر بھی رات میں سونے کے لیے لیٹتا تو اکثر تمہاری یاد بے قرار کر کے رکھ دیتی۔ مگر مجھے کچھ کرنا تھا علیزہ۔ اپنے گھر والوں کے لیے بہت کچھ کرنا تھا۔ اڑھائی سال لگ گئے مجھے وہاں سیٹل ہونے میں۔ تب میری بہن صاعقہ کا مجھ سے رابطہ ہوا اور اس نے بتایا کہ سمعان نہیں رہا۔ یہ بھی کہ وہ جاب کر رہی ہے اور اب گھر کے حالات بہت بہتر ہیں۔ اس طرف سے سکون ہوا تو پھر تمہاری یاد آئی کہ جانے تم کیسی ہو گی؟ مجھے یاد بھی کرتی ہو گی کہ نہیں مگر میں مطمئن تھا کہ تم اپنے گھر میں اپنے گھر والوں کے ساتھ ہو مجھے کیا پتا تھا کہ جس لڑکی کے پیسوں سے میں اپنے سونے کے محل کی بنیاد رکھ رہا ہوں۔ وہ میری تلاش میں اسی شہر کے گلی کوچوں میں دھکے کھا رہی ہے۔''

جھک کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے وہ جیسے بے اختیار ہوا تھا۔ علیزہ اس کے بے خبر سوئے ہوئے بیٹے پر ہاتھ رکھے اپنی دھڑکنوں کا شور سنتی رہی۔

اب وہ کہہ رہا تھا۔

''مجھے تم پر غصہ تھا علیزہ! تم سے نفرت نہیں تھی پر دیس میں اپنے قدم جمانے کے لیے میں نے ایک امیر کبیر لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا مگر' وہ زیادہ دن تک میرا ساتھ نہیں نبھا سکی اور ایک روز مجھے بیٹے کا تحفہ تھما کر چپ چاپ چلی گئی۔ جہاں سے آج تک کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔ میں ایک مرتبہ پھر تنہا رہ گیا۔ مگر اس بار میری تنہائی میں میرا بیٹا میرے ساتھ تھا۔ گھر والے پاکستان واپسی کی ضد کر رہے تھے۔ ان کے اصرار پر تین سال کے بعد اپنے بیٹے کے ساتھ میں پاکستان واپس لوٹ آیا۔ پاکستان واپسی کے بعد میں تمہیں لینے سیدو لا گیا تو پتا چلا کہ تم وہاں نہیں ہو اور یہ بھی کہ تمہارے ابا جی نہیں رہے میں بہت پریشان اور دل برداشتہ ہو کر وہاں سے واپس آیا تھا پھر اس کے بعد جتنے دن پاکستان میں رہا تمہیں تلاش کرتا رہا۔ آمنہ کے گھر بھی گیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ تم وہاں آئی تھیں مگر چلی گئیں۔ مت پوچھو کہ اس وقت دل کا کیا حال تھا۔ بھوکا پیاسا' سارا سارا دن سڑکوں پر مارا مارا ہر شبے والی جگہ پر تمہیں تلاش کرتا کہ شاید تم کہیں کسی موڑ پر دکھائی دے جاؤ مگر نہیں میری قسمت میں ابھی تمہارا وصال نہیں لکھا تھا۔ صائمہ کی شادی کے بعد میں نے چھوٹے دونوں بھائیوں کو اپنے پاس کویت بلا لیا اور ایک مرتبہ پھر انسان سے مشین بن گیا مگر' پچھلے چند سالوں میں جتنا پیسہ بھی میں نے کمایا اس ایک ایک پیسے پر تمہارا حق ہے۔'' علیزہ کی طرف کروٹ بدلے وہ اس کے بال سہلا رہا

تھا۔ وہ اب بھی خاموش رہی۔

''مجھے احساس ہے علیزہ! مجھ جیسے بدبخت انسان نے تمہاری زندگی کے بہت سے خوب صورت دن ضائع کر دیے ہو سکے تو میری اس خطا کو معاف کر دو پلیز۔''

''نہیں میرے ساتھ جو بھی ہوا وہ میری تقدیر کا لکھا تھا ایان! شاید مکافات عمل اسی کو کہتے ہیں۔ میں لوگوں کی زندگی کو کھلونا سمجھ کر کھیلتی تھی تقدیر نے مجھے کھلونا بنا کر وقت کے سپرد کر دیا یہاں اچھے برے ہر عمل کا قرض تو چکانا ہی پڑتا ہے۔''

''نہیں علیزہ ایسا مت کہو خدا گواہ ہے میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ تم سے نکاح کے بعد میں نے تمہاری ہر خطا کو دل سے معاف کر دیا تھا۔ میرے نزدیک تم صرف احمق تھیں اور کچھ بھی نہیں۔''

علیزہ ملک کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ اسے یقین دلا رہا تھا۔

''اپنے گھر والوں سے نہیں ملے آپ۔''

''نہیں' آج نکلنا تھا یہ تو پتا ہی نہیں تھا کہ خدا یوں معجزانہ طور پر تم سے ملا دے گا اور ہم اکٹھے وہاں جائیں گے۔ صاعقہ کو بہت شوق ہے تم سے ملنے کا۔''

''مجھے بھی۔''

''اچھا جی۔'' وہ مسکرایا تھا پھر اگلے ہی پل علیزہ کا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولا۔

''تم میرے بیٹے کو ایک ماں کی حیثیت سے قبول کر لو گی نا علیزہ۔ اس نے اب تک ماں کی صورت نہیں دیکھی ہے اسی لیے بدتمیز اور غصیلا ہے۔''

صبح کا بھولا وہ مسافر شام کو گھر واپسی پر اس سے ایک اور امتحان میں سرخرو ہونے کی امید رکھ رہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

''کیوں نہیں' جو لڑکی اتنے سال تک آپ کے ہجر اور انتقام میں آپ کی وجہ سے ملنے والے ہر دکھ اور مصیبت کو اپنے نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر سکتی ہے وہ کیا آپ کے بیٹے کو قبول نہیں کرے گی؟''

''تھینکس علیزہ' مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔''

علیزہ کے الفاظ نے اسے روح کی گہرائی تک پرسکون کر دیا تھا۔ تبھی اس پر جھک کر اس نے اپنا ہاتھ نائٹ بلب کے سوئچ پر رکھ دیا۔

''آئی تھنک اتنے سالوں کی مسافت نے تمہیں بہت تھکا دیا ہے' ہے نا؟'' علیزہ کے کھردرے ہاتھوں کو بہت ملائمت سے سہلاتے ہوئے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔

''نہیں۔''

''ایویں نہیں''

اس کی شرارت کو سمجھ کر مسکراتے ہوئے اس نے نائٹ بلب آن کر دیا تھا۔ وہ تشنہ لب لڑکی جس کے بہت سے قرض وہ اپنی روح پر محسوس کر رہا تھا اب اسے اس تشنہ لبی کی پچھلے پانچ سالوں کی تھکن

اتارنی تھی۔

❋❋❋

''عدی......!''

وہ تیزی سے ہوٹل کی سیڑھیاں کراس کر رہا تھا جب زاویہ کی پکار نے اس کے تیزی سے اٹھتے قدم روک دیے جب تک وہ پیچھے پلٹ کر دیکھتا وہ اس کے برابر آ گئی۔

''گھر جا رہے ہو؟''

''نہیں ابھی ایک دوست کے پاس جاؤں گا' کیوں؟''

''مجھے کچھ شیئر کرنا تھا تم سے۔ بہت دن ہوئے روز سوچتی ہوں آج کہوں گی کل کہوں گی مگر جیسے ہی تم سامنے آتے ہو میری ہمت جواب دے جاتی ہے' کیا ابھی ہم اکٹھے کہیں بیٹھ سکتے ہیں؟'' نظریں جھکائے وہ کچھ الجھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

''خیریت پچھلے چار گھنٹوں سے ہم اکٹھے ہی تو تھے۔''

''اکٹھے تھے مگر تنہا نہیں۔''

''ٹھیک ہے چلو۔''

وہ شاید جلدی میں تھا۔ زاویہ اس کے ساتھ ہی ہوٹل سے نکل آئی۔ جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ دونوں اپنے دوستوں کے ساتھ موج مستی میں مصروف تھے۔ اگلے تیس منٹ کے بعد دونوں قریبی ریستوران میں ایک دوسرے کے مقابل خاموش بیٹھے تھے۔

''اب کہو' کیا کہنا چاہتی ہو؟'' چند لمحوں کے بعد بالآخر عدنان نے اس خاموشی کا گلا گھونٹا۔ زاویہ نگاہیں پھیر گئی۔ اگلے ہی پل وہ اپنے بیگ سے کچھ نکال رہی تھی۔

''تم میرے بہت اچھے دوست ہو عدی' پچھلے پانچ سالوں میں جو عزت اور قیمتی وقت تم نے مجھے دیا' اسی نے مجھے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا میں تم سے سب کچھ شیئر کر لوں' وہ بات بھی جس کو جاننے کے بعد تم میری شکل پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرو گے۔''

''کیا بکواس ہے یہ؟'' وہ برہم ہوا تھا۔ زاویہ نے جواب میں عدنان کے سامنے میز پر کچھ کاغذات رکھ دیے۔

''یہ میری رپورٹس ہیں ڈاکٹرز کے مطابق میرے دونوں گردے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ کوئی علاج' کوئی تجویز اب زندگی کے دن نہیں بڑھا سکتی۔ کسی بھی دن کسی بھی لمحے موت آ سکتی ہے۔ بہت اذیت سہی میں نے عدی اور شاید بہت سی اذیت ابھی سہنی ہے۔ میں نے یہ بات ابھی کسی سے بھی شیئر نہیں کی اپنے ماں باپ سے بھی نہیں۔'' بہت سنجیدہ لہجے میں قدرے سنجیدگی کے ساتھ وہ کہہ رہی تھی۔

عدنان جہاں کا تہاں بیٹھا رہ گیا۔ زاویہ اب اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام رہی تھی۔

''یہ بیماری نہیں ہے عدی' میری سزا ہے اللہ نے بیماری کی صورت جتا دیا ہے کہ وہ ہے' سنتا' جاگتا' دیکھتا' ہر پل' ہر لمحہ حاضر' مگر انسان نہیں سمجھتا عدی! اسے لگتا ہے جیسے چند روز کی زندگی میں وہ جو بھی کرے گا۔ اسے کبھی پرسش نہیں ہوگی۔ جانتے ہو میرا گناہ کیا ہے۔''

کیسا کرب تھا اس لمحے اس کی آنکھوں میں وہ خاموشی سے دیکھے گیا۔

''تم کیسے جانو گے تمہیں تو بس یہی پتا ہے کہ میں بدکار ہوں۔ اپنی ضرورت کے لیے لوگوں کی ہوس اور بھوک کا نشانہ بنتی ہوں۔ تمہیں میرے اس گناہ کا تو پتا ہی نہیں۔ جس نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔''

''کیسا گناہ؟'' اس کی بھیگی پلکوں کو دیکھتے ہوئے وہ اجنبیت سے بولا تھا۔ جب زاویہ نے سر جھکالیا۔

''بہت بڑا گناہ' اللہ کے ایک بہت نیک' بہت قریبی بندے پر جھوٹے بہتان کا گناہ۔''

''کیا مطلب؟'' وہ الجھا تھا۔ زاویہ کی زبان جیسے اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس کی آنکھیں ایک لخت آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ عدنان کا ہاتھ تھام کر روتے ہوئے وہ جیسے بے اختیار ہوگئی۔

''تم مجھے معاف کردو گے نا عدی۔''

''کیا بکواس ہے زاویہ' صاف صاف بتاؤ کیا کیا ہے تم نے۔''

''بہت برا' بہت برا کیا ہے میں نے۔'' زیرلب بڑبڑاتے ہوئے وہ اسے مزید تپا گئی تھی۔ تبھی وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

''سوری میرے پاس اس وقت تمہاری پہلیاں بوجھنے کا ٹائم نہیں ہے۔''

''میری بات سنو عدی' پلیز۔'' سرعت سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ جیسے تڑپی تھی۔

''میں جانتی ہوں آج کے بعد تم کبھی میری شکل نہیں دیکھو گے۔ میرا نام لیتے ہوئے مجھے اپنے تصور میں لاتے ہوئے زمین پر تھوکو گے مگر پھر بھی میں اب مزید اس بوجھ کے ساتھ نہیں چل سکتی عدی! میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ عاطف کا مرڈر ہوگیا ہے۔ تین ماہ قبل اسے اس کی محبوبہ کے ایک اور عاشق نے زندگی سے محروم کردیا اور جانتے ہو اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ کیونکہ اس نے میرے بہکاوے میں آکر تمہاری پاک دامن بیوی کو رسوا کیا تھا۔ وہ لڑکی جو حیا اور پاکیزگی کا سمبل ہے اسے تمہاری زندگی سے بے دخل کر کے تمہیں بے سکون کرنے کے لیے میں نے اور عاطف نے ایک کھیل کھیلا تھا۔ شیطانی کھیل۔'' بائیں ہاتھ سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے وہ یہ کیسا انکشاف کر رہی تھی۔

عدنان کو لگا جیسے اس پر ساتوں آسمان ایک ساتھ آگرے ہوں۔

''تم نے مجھے ٹھکرا کر اس سے شادی کی تھی اور مجھے یہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے عاطف سے کہا اگر وہ میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے تو پہلے اسے میری شکست کا بدلا لینا ہوگا۔ اس نے ہامی بھرلی اور اس روز' جب تم میرے پاس تھے خراب موسم نے ہم دونوں کو تمہاری زندگی میں آگ لگانے کا موقع فراہم کردیا۔ وہ تمہارے لیے پریشان تھی عاطف نے اس سے کہا تھا تمہارا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور یہ بھی کہ تم اس کے ساتھ ہو مگر بے ہوش ہو اسی لیے بہت سوچ کر اس نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ تم سے پیار کرتی تھی عدی اسی کا فائدہ اٹھا کر ہم نے اسے بلیک میل کیا۔ مگر داغدار نہیں کیا۔ کر ہی نہیں سکے کیونکہ وہ تو اپنے ربّ کی پناہ میں تھی اور اس کے اسی ربّ نے مجھے اور عاطف کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ اپنے منصوبے میں کامیاب ہونے کے باوجود نہ وہ سکون میں تھا نہ میں۔ ہر روز ہم دونوں کو عجیب عجیب سے خواب پریشان کرتے جنہیں وہ مجھ سے شیئر کرتا اور میں اس سے اور اب اس کی عبرت ناک موت کے بعد میں بہت ڈرگئی ہوں کئی بار وہ میرے خواب میں آکر مجھے بتا چکا ہے کہ وہ

بہت تکلیف میں ہے۔ میں نے جان لیا ہے عدی! کہ وہ ذات جو اپنی صفات میں رحمان اور رحیم ہے وہی جب اپنے نافرمان بندوں کو سزا دینے پر آتا ہے تو ایسی سزا دیتا ہے کہ عبرت بنا دیتا ہے۔ کوئی رعایت کوئی معافی کسی چھوٹ کی گنجائش نہیں دیتا۔"

وہ پھر رونے لگی تھی۔ عدنان بے حس و حرکت پتھر بنا وہیں کھڑا رہا۔ زاویہ اب اس سے معافی مانگ رہی تھی مگر اسے کچھ سنائی ہی کہاں دے رہا تھا۔ اگلے دس منٹ میں وہ روتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ مگر وہ اب بھی وہیں بیٹھا تھا نظر کے سامنے اس وقت جو سین تھا۔ اس میں شدید بارش ہو رہی تھی اور وہ بے دردی کے ساتھ اس بے جان ہوئی' بے بس لڑکی کو پیٹ رہا تھا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا کہ اس کے ہاتھ سے لگنے والے زخم اس نازک بدن پر کہاں کہاں ثبت ہو رہے ہیں۔

اگلے روز وہ شدید بخار میں پھنک رہی تھی۔ اس میں اتنی سی سکت بھی نہیں تھی کہ وہ ہل کر پانی کا ایک گلاس ہی پی لیتی۔ عدنان اس وقت شدید طیش کے عالم میں گھر سے نکل گیا تھا اور پھر تین روز کے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔ گوری اسی حالت میں کمرے میں بے ہوش پڑی تھی۔ وہ شدید نفرت کے باوجود جانے کیا سوچ کر اسے اسپتال لے آیا اور وہیں اسے پتا چلا تھا کہ وہ پریگنٹ ہے۔ اس وقت وہ اسے طلاق دے کر دوبارہ اس کے بھائی کے گھر بٹھانے کا سوچ رہا تھا۔ مگر پھر اسے سبق سکھانے کے لیے پل پل کی اذیت دینے کا سوچ کر رک گیا۔ اس واقعے کے بعد کیا کیا نہیں کیا تھا اس نے اس کے ساتھ اس وقت وہ سب کچھ سوچتے ہوئے بھی اسے وحشت ہو رہی تھی۔

پچھلے پانچ سالوں میں اس لڑکی نے کبھی اپنی ضرورت کے لیے اس کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ وہ روز رات گئے گھر واپس لوٹتا اور وہ اجنبی شہر میں اپنی تنہائی سے نبرد آزما ہوتی اس کے لیے پوری پوری رات جاگتی رہتی کیونکہ اس کی واپسی پر اگر وہ دروازہ کھولنے میں پانچ منٹ کی تاخیر بھی کر دیتی تو وہ اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ کھانا پینا تو اس نے چھوڑ ہی دیا تھا اس کے ہاتھ سے۔ ہر لمحہ وہ اسے یہ محسوس کرواتا تھا جیسے وہ کوئی اچھوت ہے۔ وہ کھانا کھاتی ہے نہیں کھاتی اسے خبر تھی نہ پروا۔ اپنی گرل فرینڈز کو آئے روز وہ گھر لے آتا تھا اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے من چاہی عیاشی کر کے اسے اذیت دیتا۔ وہ سارا سارا دن سلائی مشین پر جھکی اپنی آنکھیں پھوڑتی رہتی اور وہ یہ تک نہ پوچھتا کہ یہ مشین آئی کہاں سے ہے۔ اس کے مشاغل اس کی مصروفیات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ چھ ماہ کے بعد جس وقت اس کی ڈلیوری کا وقت آیا وہ گھر پر نہیں تھا۔ گوری کو دروازے پر آنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ اسی لیے وہ درد سے تڑپتی تنہا گھر میں اپنے رب کو پکارتی رہی۔ رات گئے معمول کے مطابق جب وہ گھر واپس آیا تو وہ کہیں نہیں تھی۔ اس کا دماغ پھر سنسنا اٹھا۔ صبح ساتھ والی ہمسائی نے اسے آکر بتایا تھا۔

"بھائی آپ کی بیوی اسپتال میں داخل ہے رات ان کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔ ہم ان کی چیخوں پر گھبرا کر آئے تھے اللہ نے بڑا کرم کیا ہے ان پر دو جڑواں بچے ہوئے ہیں آپ کے ایک بیٹا ایک بیٹی۔"

مگر اسے خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی شریانیں غصے کی زیادتی سے پھٹ رہی تھیں۔ اس نے کیوں نہیں بتایا تھا اسے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لے کر محلے میں تماشا بنا دیا تھا۔ دل میں پڑی

رنجش صرف اس سے نفرت کا احساس ہی دلاتی تھی۔ گوری کی گھر واپسی کے بعد اس نے ایک نظر بھی نہ بچوں کو دیکھا نہ اس کا حال دریافت کیا۔ زچگی کے دوران بھی وہ پوری تندہی سے اس کے تمام کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیتی رہی تھی۔ عدنان نے سگریٹ اور شراب کا استعمال بڑھا دیا تھا اور مقصد صرف اسے تکلیف پہنچانا تھا۔ بچے بڑے ہو رہے تھے مگر وہ بے نیاز تھا۔ اس کے پاس انھیں دینے کے لیے ایک پیار بھری نظر بھی نہیں تھی۔ گھر کے تینوں نفوس اس کی آمد پر سہم کر رہ جایا کرتے تھے۔ وہ تنہا اپنے بچوں کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ ناقص خوراک، بات بات پر تشدد اور دن رات محنت نے بہت تیزی سے اس کی صحت پر اثر ڈالا تھا۔

پنڈی سے جہلم آنے کے بعد اس نے اپنا موبائل نمبر بھی تبدیل کر لیا تھا۔ جس سے ہمدانی پیلس اور شاہ زر دونوں کا رابطہ ہی اس سے کٹ گیا۔ بوسیدہ سے گھر کا کرایہ بھی زیادہ تر گوری ہی ادا کرتی تھی۔ مگر پھر بھی اس کے لبوں پر کوئی گلہ نہیں تھا۔ عدنان کی خدمت اور فرمانبرداری میں ایک دن کے لیے بھی کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

وہ اب بھی اس کا ہر کام شوق اور محبت سے کرتی تھی۔ گزرے پانچ سالوں میں اس نے کبھی عدنان کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ اسے یاد کرنے سے بھی اس کی کوئی خطا کوئی شکایت کوئی بدتمیزی یاد نہیں آئی تھی۔ قطرہ قطرہ دل سے بدگمانی اور نفرت کی برف پگھلتی رہی اور وہ بے آواز روتا وہیں بیٹھا رہا۔

صبح چار بجے کے قریب اس کی گھر واپس ہوئی تو گوری اپنے بستر پر اپنی بیٹی کو گود میں لیے رو رہی تھی۔ گرم چادر میں لپٹا اس کا پرنور چہرہ آنسوؤں سے بری طرح بھیگ چکا تھا۔ وہ سست روی سے قدم اٹھاتا اس کے قریب چلا آیا۔

''کیا ہوا کیوں رو رہی ہو؟''

بھاری بوجھل لہجے میں ایک مدت کے بعد اس نے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ حیران ہی تو رہ گئی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ تم سے پوچھ رہا ہوں کیا ہوا ہے؟'' اس کے ٹکر ٹکر دیکھنے پر جھک کر اس نے اپنی بیٹی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا پھر پریشان ہو اٹھا۔

''اسے تو بہت تیز بخار ہے۔ تمہیں بتانا تو چاہیے مجھے۔'' گوری کو لگا جیسے وہ نشے میں ہے۔ مگر نشے میں بھی مدت ہوئی اس شخص نے اسے مخاطب کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے آنسوؤں میں مزید روانی آ گئی۔ جبکہ وہ اب اپنی بیٹی کو اس کی گود سے اٹھا رہا تھا۔

''میں ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا ہوں اسے تم پریشان نہ ہو۔''

اسے پریشان نہ ہونے کی تلقین کر کے وہ خود پریشان ہو گیا تھا۔ بچی کے چیک اپ کے بعد جب وہ واپس آیا گوری جائے نماز پر بیٹھی دعا میں ہاتھ اٹھائے رو رہی تھی۔ وہ بچی کو بیڈ پر لٹانے کے بعد اس کے برابر میں ہی نیم دراز ہو گیا۔

''حمنہ اب ٹھیک ہے گوری! تھوڑی دیر میں بخار اتر جائے گا۔''

''یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

اس کی تسلی کے جواب میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے ربّ کا شکر ادا کیا تھا۔ اسی صبح اس نے عدنان کو اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کھیلتے اور انھیں پیار کرتے دیکھا۔ وہ حیران ہی تو رہ گئی۔ اس

سے زیادہ حیرانی اس وقت ہوئی جب اس نے خود اسے ناشتا بنانے کے لیے کہا۔ گوری کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ہنسے یا روئے۔ اس کے ہاتھوں میں واضح لرزش تھی۔ آٹا ختم ہوئے تیسرا دن تھا۔ اس نے بچوں کے لیے سنبھال کر رکھا بن چائے کے ساتھ پیش کر دیا۔ وہ چونکا تھا اور پھر گوری کے سپاٹ چہرے پر نگاہ ڈالنے کے بعد اس کا دل چاہا وہ کہیں ڈوب کر مر جائے۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ لڑکی جو زندگی کے سفر میں اس کی ہم سفر بنے گی۔ وہ اسے اتنی بدحال زندگی دے گا۔ مارے شرمندگی کے وہ اس کے سامنے سر بھی نہیں اٹھا سکا۔

ساری رات کے رت جگے کے بعد اگلی صبح بنا روز کی طرح لمبی تان کر سوئے وہ جاب کی تلاش میں نکل گیا تھا۔ آفس سے اپنے ضروری ڈاکمنٹس اٹھانے کے بعد اپنے ایک دوست کی کمپنی میں ہی اس کی جاب کا بندوبست ہو گیا۔ اپنے آفس سے ڈاکومنٹس فوری پہنچانے کی ڈیوٹی اس نے پنڈی میں مقیم اپنے ایک دوست کے سپرد کر دی تھی۔

اگلے روز اسے ایک ماہ کی پیشگی تنخواہ بھی مل گئی۔ جس سے گھر واپسی پر وہ روزمرہ استعمال کی ڈھیروں چیزیں اٹھا لایا۔ گوری دروازہ کھولتے ہی حیران و پریشان رہ گئی تھی۔ صرف ایک رات میں کیا سے کیا ہو کر رہ گیا تھا۔ کتنا بدل گیا تھا وہ شخص۔ اس کے سہمے سہمے بچے اب اپنے باپ کا پیار پا کر کھل کر ہنسنے بولنے لگے تھے۔ کیسا معجزہ کر دیا تھا اس کے پاک ربّ نے۔ وہ اپنے ایک ایک آنسو میں اس کا شکر ادا کرتی نہ تھکتی تھی۔ کتنا پیارا اور بھرپور منظر تھا۔ جس میں وہ اپنے بچوں کو چیزیں نکال نکال کر تھما رہا تھا اور وہ خوش ہو رہے تھے۔ وہ دور کھڑی دیکھتی رہی۔ رات کا کھانا عدنان باہر سے لے آیا تھا اور اس رات سب نے مل کر کھانا کھایا تھا۔

گوری کھانے کے بعد کام کاج سے فارغ ہو کر آئی تو اس کے دونوں بچے عدنان کے پہلو میں اس کے بازوؤں پر سو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔ سرد ہاتھ دوپٹے کے پلو سے خشک کرتے ہوئے اس نے زمین پر بیٹھ کر عدنان کے دونوں پاؤں پکڑ لیے۔ اس کی ابھی ابھی آنکھ لگی تھی۔ گوری کے پاؤں پکڑنے پر فوراً اس کی آنکھ کھلی اور وہ جیسے کرنٹ کھا کر اٹھ بیٹھا۔

''یہ کیا کر رہی ہو۔'' فوراً سے پیشتر اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔ گوری نے سر جھکا لیا اس کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

''آپ کا بہت شکریہ عدنان! آپ نے بچوں کو ان کا باپ لوٹا دیا۔''

ایک اور شرمندگی۔ رخ پھیر کر اس نے ایک نظر بچوں پر ڈالی پھر آہستہ سے چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ گوری کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اسے لے کر باہر برآمدے میں آ بیٹھا۔

''کس مٹی کی بنی ہو تم؟ وہ شخص جس نے ہمیشہ تمہاری تذلیل کی، تمہیں دکھ دیے، غلط سمجھا، تم اسی کے پیر چھو رہی ہو۔ تمہیں نفرت نہیں ہوئی اس شخص سے۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''پتا نہیں۔'' ٹوٹتے آنسوؤں کے موتیوں کے ساتھ اس نے رخ پھیرا تھا۔ عدنان کا دل کٹ کر رہ گیا۔ دائیں ہاتھ سے اس نے گوری کا سر پکڑتے ہوئے اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

''میں اتنی اچھی ہم سفر کے قابل نہیں تھا بالکل بھی نہیں۔'' اس کے لہجے میں بھی نمی تھی۔ گوری کو لگا
ں کی ساری دعائیں مستجاب ہو گئی تھیں۔ اس کا گھر مکمل ہو گیا تھا۔ وہ عدنان کے ہاتھ تھامے بیٹھی
رتی رہی۔

آنے والے دنوں میں عدنان نے اس کے لیے خود کو سر تا پیر بدل لیا تھا۔ نہ کوئی معافی تلافی کا
سلسلہ ہوا تھا نہ قول و قرار کا۔ بس خاموشی سے گوری کی طرح اس نے بھی قربانیاں دینی شروع کر دی
تھیں۔ وہ ڈبل شفٹ میں کام کر رہا تھا۔ امیر کبیر باپ کا بیٹا ہونے کے باوجود عام ورکرز کی طرح
دن رات زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کے لیے خود کو خوار کر رہا تھا۔

شراب اور شباب اس کی ہڈیوں میں رچ بس گئے تھے۔ بہت مشکل تھا ان دونوں چیزوں سے
چھٹکارا مگر پھر بھی اس نے یہ دونوں چیزیں خود پر حرام کر لی تھیں۔ صرف گوری کے لیے اس نے خود کو
اذیت کی سولی پر چڑھا دیا تھا۔

جونہی وہ آفس سے تھک کر گھر واپس آتا، گوری سب کام چھوڑ کر اس کے آگے پیچھے ہو جاتی۔
وہ جو ماں کی وفات کے بعد محبتوں کو ترس گیا تھا۔ اکیلے پن اور اپنوں کی بے حسی نے جسے بد سے بدتر
بنا دیا تھا۔ اسی بدتر انسان کو وہ اپنی قربانیوں اور محبتوں سے صحیح معنوں میں انسان بنانے میں کامیاب
ہو گئی تھی۔ بھلے وہ دنیا میں کسی کے لیے بھی اہم نہیں تھی۔ مگر وہ لڑکی جس نے بد سے بدتر حالات میں
بھی اس سے کنارہ کشی نہیں کی تھی۔ وہ اس کے لیے اہم تھا۔ اگر اس کے سر میں معمولی سا درد ہوتا تو
وہ اس کے لیے ساری ساری رات بیٹھی رہتی تھی۔ اس کی نفرت کے باوجود وہ اس کا سر دبانا اس کا
خیال رکھنا نہیں بھولتی تھی۔

اب جیسے جیسے اسے یاد آتا تھا اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ خود کو ختم کر لے۔ وہ لڑکی اپنی وفاؤں
کے ساتھ سرخرو رہی تھی۔ مگر وہ اپنی تمام تر نفرتوں کے ساتھ ہار گیا تھا۔ ہار بھی ایسی کہ نظریں ملا کر
معافی مانگنے کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی۔

اس روز وہ ابھی آفس سے گھر واپس آیا ہی تھا کہ سامنے طلال ہمدانی صاحب کو بیٹھے دیکھ کر
حیران رہ گیا۔ ان کے ساتھ ریان اور اس کی بھابی بھی تھیں۔ صد شکر کہ گوری کا حلیہ قابل قبول تھا
وگرنہ وہ ان کے سامنے آنے کے قابل نہ رہتا۔ اس کے دونوں بچے اس کی آمد کی خبر پاتے ہی اس
کے قریب لپک آئے تھے۔ وہ شرمندہ شرمندہ سا دونوں کو بازوؤں میں اٹھا کر آگے بڑھ آیا۔

''السّلام علیکم!''

''وعلیکم السّلام، کیسے ہو؟'' طلال صاحب اسے گلے لگانے کے لیے اٹھے تھے۔ اس نے بچوں
کو نیچے اتار دیا۔

''ٹھیک ہوں پاپا آپ کیسے ہیں۔''

''کیسا ہو سکتا ہوں جس شخص کے بڑھاپے میں اس کا جوان بیٹا نافرمان ہو کر اس کے گھر سے
نکل آئے وہ کیسا ہو سکتا ہے؟''

''سوری پاپا۔'' سر جھکا کر اس شخص نے سوری کی تھی۔ جسے سر جھکانا آتا ہی نہیں تھا۔ طلال
صاحب کا دل خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ آگے بڑھ کر انہوں نے اسے بانہوں میں بھر لیا تھا۔

''اب تو معاف کردو بیٹا! ایک عمر ہوگئی مخالف رستوں پر چلتے چلتے۔ میں بوڑھا ہوں ہار مان لیتا ہوں۔ مجھے معاف کردو ان سب غلطیوں کے لیے جو دانستہ یا نادانستہ مجھ سے سرزد ہوئی ہیں۔''

''نہیں پاپا ایسے مت کہیے میں نے بھی بہت تنگ کیا ہے آپ کو۔''

''اولاد تنگ کرتی ہے مگر ماں باپ کبھی سزا نہیں دیتے انہیں۔ نہ کنارہ کشی کرتے ہیں۔ تم نے کیا سمجھا تھا یوں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو کر تم ہماری زندگیوں سے نکل جاؤ گے اور یوں چھپ کر دوستوں سے ڈاکومنٹس منگواتے ہوئے کیا ہم تمہارا سراغ نہیں لگا پائیں گے۔ بولو......؟''

''میں شرمندہ ہوں پاپا۔''

''شرمندہ کے! بچے اب گھر چلو۔ میں نے اپنے سارے بچوں میں اپنی جائیداد تقسیم کر دی ہے۔ تمہارے لیے بھی بہت پیارا گھر بنوایا ہے۔ اپنے گھر میں تو چلو گے نا؟'' وہ اس کی ضد اور غصے سے اچھی طرح واقف تھے تبھی حل نکال کر آئے تھے۔ وہ مزید شرمندہ ہوگیا۔ واپسی کے سفر میں ریان گوری کے ساتھ لگا اسے بتا رہا تھا کہ وہ اس کے لیے بہت اداس تھا۔

رات تک وہ گھر پہنچ گئے تھے۔ دیدہ زیب پتھر سے تعمیر کیا گیا گھر واقعی اپنی خوب صورتی میں بے مثال تھا۔ زندگی میں پہلی بار عدنان اپنے گھر والوں کی محبت دیکھ رہا تھا۔ اس کے بھائی اس کے بچوں سے پیار کر رہے تھے۔ باپ اور بھابیاں گوری کے صدقے واری جا رہی تھیں۔ وہ خوش تھا بے پناہ خوش۔

اسی کے اصرار پر گوری نے اپنی پرانی اکیڈمی دوبارہ جوائن کر لی تھی۔ عدنان نے بھی بھائیوں کے ساتھ ہی آفس جانا شروع کر دیا تھا۔ شاہ زر کے دو تین چکر بھی لگ گئے تھے۔ وہ اس کے لیے بہت فکر مند رہا تھا۔ گزرے دنوں میں روح اور جسم پر جتنے زخم لگے تھے جیسے سب مٹ گئے تھے۔

اس روز اسے شاہ زر کے گھر سے واپسی پر خاصی تاخیر ہوگئی تھی۔ عدنان آفس سے واپس آچکا تھا۔ اس کے دونوں بچے اس کا انتظار کرتے کرتے سو گئے تھے۔ وہ پریشان اور شرمندہ سی سیدھی اپنے بچوں کے پاس آئی تھی مگر ملازمہ کے بقول انہیں عدنان نے کھانا کھلا کر سلا دیا تھا۔ تبھی وہ چادر اور جوتے اتارتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔

عدنان آفس سے واپسی کے بعد ٹی وی دیکھتے ہوئے سو چکا تھا۔ اس نے اب تک نہ لباس تبدیل کرنے کی زحمت گوارا کی تھی نہ جوتے اتارنے کی۔ شاید کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو کوستی' بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ عدنان کے پیروں سے اس کے جوتے اور موزے الگ کرنے کے بعد اب وہ اس پر جھکی اس کی شرٹ کے بٹن کھول رہی تھی۔ تبھی عدنان نے سرعت سے بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کرتے ہوئے اسے خود پر گرا لیا۔

''اتنی دیر کر دی واپسی میں۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں انتظار کر رہا ہوں گا۔'' گوری اس کی اس حرکت کے لیے تیار نہیں تھی تبھی گھبرا گئی۔

''سوری' بھائی کھانے پر اصرار کر رہے تھے۔ پھر نماز کا ٹائم ہوگیا۔ میرا خیال تھا آپ آفس سے واپسی پر لینے آجائیں گے مگر آپ نہیں آئے۔''

''اچھا تم نے ویٹ کیا تھا میرا۔'' گوری کی بے ترتیب دھڑکنیں اس کے اندر طوفان بپا کر رہی

تھی۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھ بھی نہ سکی۔

''جی کیا تھا۔ مگر پھر خود ہی آ گئی کیونکہ میں جانتی ہوں آپ کے پاس میرے لیے وقت نہیں ہے۔''

''اچھا اور کیا کیا جانتی ہو تم۔''

''بہت کچھ۔'' اس سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا مگر عدنان نے گرفت ڈھیلی نہیں کی۔

''مثلاً۔''

''مثلاً میں آپ کی نظر میں نیک لڑکی نہیں ہوں۔ با کردار بھی نہیں ہوں۔ اللہ ربّ العزت کے کرم سے مجھ پر اور میرے بچوں پر ترس کھا کر میرا ہر قصور معاف کر دیا مگر میں جانتی ہوں آپ کے دل میں میری عزت نہیں ہے۔''

''اور؟'' وہ اس کے کندھے پر سر جھکائے شکایت کر رہی تھی۔

''اور کچھ نہیں۔'' اب شاید وہ رونے لگی تھی۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

''جب میری تم سے شادی ہوئی تم جانتی تھیں میں بد کردار ہوں تم نے مجھے قبول کیا۔ کیوں؟ پچھلے پانچ سالوں میں تمہاری نظروں کے سامنے میں نے ہر طرح کی عیاشی کی پھر بھی تم نے مجھے نہیں چھوڑا' کیوں؟ کیا میں سمجھ لوں کہ تم بھی مجھ پر ترس کھا رہی ہو۔ تم پاک دامن ہو گوری۔ پچھلے سالوں میں یہ بات اپنے عمل سے ثابت کی ہے تم نے۔ میں کیا ہوں ایک بد کردار' عیاش شخص کیا تمہاری پاکیزگی میرے بہتان سے متاثر ہو سکتی ہے؟ نہیں۔ سونے کو لاکھ پیتل کہتے اور سمجھتے رہو اس کی ہیئت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تم سے کہا تھا اگر میں گناہ گار ہوں تو تم نیک کیسے ہو سکتی ہو۔ مگر میرے ربّ نے مجھے دکھا دیا ہے۔ تم نیک ہو تو اس نے تمہاری پارسائی مجھ پر ثابت کر کے مجھے بھی برائی سے بے زار کر دیا۔ یہی کرشمے ہیں اس کے مگر کیا میں اس قابل ہوں گوری کہ میں تم سے اپنی ہر غلط حرکت کی معافی مانگوں اور تم مجھے معاف کر دو۔ نہیں میں اس قابل نہیں ہوں۔ اسی لیے میں نے تم سے معافی نہیں مانگی مگر اس کے باوجود کیا تمہارے دل میں میری عزت نہیں ہے۔''

کتنی وضاحت کے ساتھ اس نے اسے معتبر کیا تھا۔ وہ اور شدت سے رو پڑی۔

''تم میری جان ہو گوری اور جان جسم کے لیے لازم ہوتی ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی بدصورت اور کٹی پھٹی کیوں نہ ہو۔''

گوری کے بال سہلاتے ہوئے وہ اسے خود میں جذب کر رہا تھا۔ گوری کو لگا ایک عمر تپتے سورج کے تلے جلتے رہنے کے بعد اسے گھنی ٹھنڈی چھاؤں نصیب ہو گئی ہو۔

''رو لو آج جتنا رونا ہے کیونکہ آج کے بعد کبھی ان آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں کروں گا۔ جو وقت گزر گیا میں اسے واپس نہیں لا سکتا مگر جو وقت دسترس میں ہے اسے خوب صورت ضرور بنا سکتا ہوں۔ بس تم مجھے معاف کر دینا گوری پلیز۔'' طلال صاحب نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ محبتوں کا ترسا ہوا ایک حساس شخص تھا۔ جس کی تلخیوں اور محرومیوں کو گوری کی محبت اور توجہ نے مٹا دیا تھا۔ اب اسے کوئی احساس محرومی نہیں تھا۔ شاید تبھی وہ شراب اور شباب کی محفلوں کی راہ بھول گیا تھا۔

گوری نے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے سینے کے سر اٹھایا۔ پھر انتہائی محبت سے اپنے لب اس کی آنکھوں پر رکھ دیے۔

''آپ میرا ایمان ہو عدی اور اللہ رہتی سانسوں تک میرے ایمان کو سلامت رکھے' آمین ''
''ثم آمین۔''

اس کی محبت کے اظہار نے اسے مزید بے تاب کر دیا تھا۔ خوش بو بکھیرتی رات کے ان لمحوں نے الجھی ہوئی کہانی کے دو اور خوب صورت کرداروں کو نئی زندگی بخش دی تھی۔

❋❋❋

ازلان اور میرال حسن کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو گئی تھی۔

اس روز مہندی کی رسم تھی اور حسن پیلس کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ صاعقہ اور امامہ دونوں کام میں پیش پیش تھیں۔ مگر دونوں کے دل ہی بجھے ہوئے تھے۔ شجاع کے بقول وہ اپنی دوسری شادی کی تیاری کر رہا تھا۔ جبکہ دوسری طرف عباد کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ اس نے دانستہ بھی صاعقہ سے سامنا ہونے کی کوشش ناکام بنا دی تھی۔

ایک عجیب سی چپ اور بیگانگی کا تاثر ملتا تھا اس کے چہرے پر۔ کتنے دن ہوئے اس نے اس کا ذکر بھی نہیں سنا تھا۔ اسے یقین تھا وہ اس تقریب میں بھی نہیں آئے گا۔ مگر وہ آ گیا تھا۔ ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو اور گرے کرتا شلوار میں ازلان کے ساتھ کھڑا وہ شخص یقیناً عباد یاور ہی تھا۔

صاعقہ کا دل اسے دیکھ کر بہت زور سے دھڑکا تھا۔ وہ آنے والے مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھی مگر عباد کو دیکھنے کے بعد ایک عجیب سی کپکپاہٹ اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اس وقت بھی وہ کسی خاتون سے علیک سلیک کے بعد اسٹیج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب کسی نے اس کی کلائی تھام لی۔ صاعقہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

''بات سنو میری۔''

عباد یاور اس کے پہلو میں کھڑا چہرے پر عجیب سی سنجیدگی طاری کیے اس سے کہہ رہا تھا۔ صاعقہ سے نظر اٹھا کر اسے دیکھنا محال ہو گیا۔

''ہاتھ چھوڑو میرا۔''

''چھوڑ دوں گا مگر اپنے سوال کا جواب لے کر۔''

''میرے پاس آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں۔''

''تمہارے پاس ہی میرے ہر سوال کا جواب ہے۔''

عجیب ضدی سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ اسے سائیڈ پر لے آیا تھا۔ صاعقہ نے دیکھا اس کی آنکھوں کے گوشوں میں ہلکی سی نمی تھی۔

''تم نے دولت کے لیے مجھے چھوڑا تھا نا مجھے بتاؤ ازلان حیدر کو کس کے لیے چھوڑا ہے۔ اس کی شادی کسی اور لڑکی سے کیوں ہو رہی ہے؟ کیا اس سے بھی امیر مل گیا ہے کوئی؟''

''ہاں۔''

وہ جتنا جذباتی ہو رہا تھا صاعقہ کے لہجے میں اتنا ہی ٹھہراؤ تھا۔ تبھی وہ سلگ اٹھا۔

''بکواس کرتی ہو تم۔ میں جان گیا ہوں ازلان حیدر سے تمہارا کوئی افیئر نہیں تھا۔ تم کس سے بھاگ رہی ہو صاعقہ اور کیوں؟''

''میرا بازو چھوڑیں پلیز۔''
''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔''
''میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔''
''تو ٹھیک ہے میرے سوال کا جواب نہیں دے سکتیں مگر مجھے مرتے ہوئے تو دیکھ سکتی ہو نا۔'' نم آنکھوں کے گوشوں میں ہلکی سی سرخی جھلکی تھی۔ وہ دہل کر رہ گئی۔
''نہیں۔''
''یہ بھی نہیں، وہ بھی نہیں۔ یہ سب کیا ہے صاعقہ؟ خدا کا واسطہ ہے تمہیں ترس کھاؤ مجھ پر۔ کتنے سال ہو گئے مجھے اذیت کی سولی پر لٹکے ہوئے اور کتنی سزا دو گی مجھے میری چاہت کی؟'' وہ شخص بھی روہانسا ہو رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، یاور سعید صاحب اچانک وہاں آ کھڑے ہوئے۔ صاعقہ انہیں مقابل پا کر حیران رہ گئی تھی۔
''کیسی ہو بیٹا؟''
''ٹھیک ہوں۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا جواب دے۔ عباد رخ پھیر گیا تھا۔
یاور سعید صاحب اب اس سے کہہ رہے تھے۔
''میں جانتا ہوں بیٹے! آپ بہت خود دار لڑکی ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرا بیٹا میرے کیے کی سزا بھگت رہا ہے۔ مگر میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔ چاہوں تو اب بھی زبردستی اس کے سر پر سہرا سجا سکتا ہوں۔ کسی بھی امیر سے امیر تر لڑکی کو بہو بنا کر اپنے گھر لا سکتا ہوں۔ مگر اس سے کیا ہو گا۔ میرے اکلوتے فرمانبردار بیٹے کا دل، اس کی زندگی اجڑ کر رہ جائے گی۔ یہ رشتا تو بھائے گا مگر یوں جیسے کوئی گلے میں پھندا پڑا ڈھول زبردستی بجاتا ہے۔ میرا بیٹا بہت اچھا ہے بیٹے! اسے اس کے گھمنڈی باپ کی خطا کی سزا مت دو، میں آپ سے معافی مانگتا ہوں میرے بیٹے کو اپنا لو پلیز۔'' وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ امیر کبیر شخص یوں کبھی اس کے سامنے ہاتھ بھی جوڑ سکتا ہے۔ تبھی سن رہ گئی تھی۔ عباد اب تڑپ کر اپنے باپ کے بندھے ہوئے ہاتھ چوم رہا تھا۔
''نہیں پاپا، پلیز ایسا مت کریں۔''
''میں نے اس بچی کے ساتھ جو کیا ہے عباد! یہ اس کے جواب میں کچھ بھی نہیں ہے۔ بہت ذلیل کیا تھا میں نے اسے۔ مگر اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ یہ بچی میرے بیٹے کی زندگی میں اتنی خاص ہے۔''
ان کے انکشاف پر عباد جہاں حیران ہوا تھا، وہیں صاعقہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یاور سعید صاحب اب اس کے گھر والوں سے مل رہے تھے جبکہ وہ عباد کے پہلو میں کھڑی رو رہی تھی۔
''کوئی یوں بھی کرتا ہے صاعقہ! پچھلے پانچ سالوں میں ایک بار بھی تمہیں مجھ پر اور خود پر ترس نہیں آیا۔ مجھ سے شیئر تو کرتیں۔ میں معافی مانگ لیتا تم سے۔ چھوڑ دیتا سب کچھ تمہارے لیے۔ مگر اتنی اذیت تو نہ سہنی پڑتی۔''
وہ بے حد دل برداشتہ تھا۔ وہ سر جھکائے کسی مجرم کی طرح کھڑی رہی۔ سامنے اسٹیج پر اب رسم حنا ہو رہی تھی عباد نے چپکے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میری مماتم سے ملنے کے لیے بہت بے تاب ہیں۔ بتول آنٹی کی طرح انہیں بھی اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے اوراس کے بچوں کو گود میں کھلانے کا بڑا شوق ہے ملوگی مما سے؟''

''جی نہیں۔''

''ایویں نہیں۔ جان لے لوں گا تمہاری۔'' وہ اب اذیت کے حصار سے نکل رہا تھا۔ صاعقہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکان بکھر گئی۔

''کل میں غریب تھی تو آپ کے والدین نے مجھے حقیر جان کر ٹھکرا دیا۔ یوں جیسے میرے سینے میں دل ہی نہ ہو۔ آج میرے پاس بھی دولت ہے۔ کوئی بھی امیر سے امیر' خوب صورت شخص میرا ہمسفر بن سکتا ہے۔ اسی لیے آپ کی بدگمانیاں بھی ڈھل گئیں اور آپ کے پاپا کو بھی اپنے غلط سلوک کا احساس ہوگیا واہ۔''

اس کا لہجہ طنز سے خالی نہیں تھا۔ عباد کو لگا جیسے کسی نے اس کا دل چیر کر رکھ دیا ہو۔ فوراً سے پیشتر اس نے صاعقہ کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

''ہوں بالکل صحیح جج کیا ہے تم نے مجھے۔ پانچ سال تک تمہارے امیر ہونے کا انتظار ہی تو کر رہا تھا میں۔ مگر تم نے صحیح کہا۔ اب تو کوئی بھی امیر کبیر خوب صورت شخص تمہارا ہاتھ تھام سکتا ہے۔ اب مجھے تمہاری طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔'' ٹوٹے بکھرے لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے ہی وہ آگے بڑھا تھا جب صاعقہ نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں نے اتنا کچھ سہا تم صرف ایک طنز نہیں سہہ سکے۔''

''یہ طنز نہیں میری خودداری پر چوٹ ہے۔''

''چوٹ تو میری خودداری پر بھی بار بار لگی ہے۔ پھر بھی میں تمہیں چاہنے سے باز نہیں رہ سکی۔ جب بھی تمہیں بھلانے کا سوچا دل کٹ کر رہ گیا۔ مجھے بتاؤ عباد! جس کے پاس دولت نہ ہو کیا وہ کسی سے محبت نہیں کرسکتا کسی کو پا نہیں سکتا۔ لوگ محبت کو دولت کے ترازو میں کیوں تولتے ہیں۔''

اس کے بھیگے لہجے پر وہ پلٹا تھا۔

''مجھے لوگوں کا نہیں پتا صاعقہ! میں تم سے صرف اپنی اور تمہاری بات کروں گا۔ وہ لڑکی جو بچپن سے میرے نام سے منسوب تھی میں نے اسے چھوڑ دیا۔ صرف اس لڑکی کے لیے جو دولت مند نہیں تھی مگر میرے دل کی خوشی تھی۔ اب بھی میرا دل صرف اسی لڑکی کی رفاقت کا طلب گار ہے۔ جو اپنی خودی پر حرف نہیں آنے دیتی۔ دولت بہت ہے میرے پاس۔ خدا کے واسطے اپنے اور میرے درمیان اس چیز کو مت لاؤ۔'' صاعقہ جانتی تھی وہ جو کہہ رہا ہے بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے تبھی بھیگی پلکوں کے ساتھ وہ مسکرائی تھی۔

''ایک شرط پر نہیں لاؤں گی۔''

''کیا؟'' وہ چونکا تھا۔ صاعقہ نے اس کا ہاتھ دوبارہ تھام لیا۔

''اس شرط پر کہ تمہاری زندگی میں کبھی صاعقہ احمد کی جگہ کوئی اور لڑکی نہیں آئے گی۔ نمبر دو تم شادی کے بعد میری ہر بات مانو گے۔ گھر کے سارے کاموں میں برابر کی مدد کراؤ گے۔'' اقرار کے انوکھے انداز پر وہ مسکرایا تھا۔

''ٹھیک ہے نمبر دو والا پوائنٹ منظور ہے مگر نمبر ایک والا......!'' کان کھجا کر جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے وہ مسکرایا تھا تبھی صاعقہ نے اس کے شانے پر زور سے مکا رسید کر دیا۔

''جان لے لوں گی تمہاری اب ایسا سوچا بھی تو۔''

''کیوں تم نے جو پانچ سال ترسایا ہے اس کا حساب نہیں لینا۔''

''نہیں۔''

''ایویں نہیں۔'' اب اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ صاعقہ مسکرا دی۔ اگلے پل وہ اس کا ہاتھ تھامے اسے اپنی ماں سے ملوا رہا تھا۔

''مما' یہ صاعقہ ہے وہی سنگدل لڑکی جس نے پانچ سال سے آپ کے بیٹے کو سولی پر لٹکا رکھا ہے۔ کیا خیال ہے ساس بن کر اگلے پچھلے سارے حساب کلیئر نہ کر لیں۔''

''نہیں' کیونکہ یہ واقعی بہت پیاری بچی ہے۔ اگر اس کے لیے تم نے پانچ سال انتظار کیا ہے تو بالکل ٹھیک کیا ہے۔'' وہ کب سے ان دونوں کو کونے میں کھڑا دیکھ رہی تھیں۔ تبھی بے حد مسرور انداز میں صاعقہ کا گال تھپتھپاتے ہوئے خوش ہوئی تھیں۔ عباد ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔

''یہ چیٹنگ ہے مما! ابھی بہو بھی نہیں بنی اور بیٹے سے زیادہ پیاری ہو گئی۔''

''تم دونوں ہی بہت پیارے ہو مجھے۔''

''اوں ہوں' پھر ٹھیک ہے۔'' وہ خوش تھا بے پناہ خوش۔ سامنے اسٹیج پر امامہ، میرال اور ازلان کے ساتھ کسی بحث میں مصروف تھی۔ جبکہ ازلان، عباد کی طرف دیکھ کر بائیں آنکھ شرارت سے دباتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ عباد نے جواب میں اسے سیلوٹ پیش کر دیا۔

''چلو۔'' اگلے ہی پل وہ پھر صاعقہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہہ رہا تھا وہ حیران رہ گئی۔

''کہاں۔''

''جہاں میرا دل چاہے لے کر جاؤں تم پوچھنے والی کون ہوتی ہو ہاں۔'' پیار سے چٹکی میں اس کی ناک دباتے ہوئے اس نے اس کے بال بکھیرے تھے۔

''ویسے ابھی ہم مارکیٹ چل رہے ہیں۔ انگیجمنٹ رنگ لینے اور تھوڑی سی تمہاری شاپنگ کرنے۔''

''مگر۔''

''کوئی اگر مگر نہیں۔''

مسز یاور کو بتا کر اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے وہ اسے باہر لے آیا تھا۔ جہاں سیکڑوں روشن ستاروں کے جھرمٹ میں جگمگاتا چاند اپنے اکیلے پن کو یکسر نظر انداز کیے ان دونوں کے ملن پر مسرور ہو رہا تھا۔ صاعقہ، عباد یاور کے ساتھ اس کی شاندار گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مسکرا دی۔ بے شک اس کے رب نے عباد یاور جیسے خوب صورت اور پر خلوص ہم سفر کی صورت اس کی زندگی کے تمام دکھوں اور محرومیوں کا ازالہ کر دیا تھا۔

❀❀❀

''شاہ......مم......میرے بیٹے کو ہوش تو آ جائے گا نا۔''

چاند کا آپریشن کامیاب ہوگیا تھا مگر وہ ابھی ہوش میں نہیں آیا تھا۔ تبھی وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے شاہ زر کے قریب آئی تھی۔ شاہ زر نے پلٹ کر ایک نظر اس کے آنسوؤں سے تر چہرے پر ڈالی پھر خفگی سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔

''پتا نہیں۔''

''ک...... کیوں...... آپ ڈاکٹر سے پتا کریں نا وہ کیا کہتے ہیں۔''

''مجھے نہیں پتا وہ کیا کہتے ہیں اور پلیز تم یہ پریشان ہونے کا ڈراما بند کر کے جاؤ جہاں سے آئی ہو۔ میں نہیں چاہتا میرے بیٹے کی وجہ سے تمہاری انا یا خودداری پر کوئی حرف آئے۔''

''کیسی انا کیسی خودداری پچھلے پانچ سال سے پل پل مجھے یہ محسوس ہوتا رہا ہے جیسے میرے اندر کچھ جل رہا ہے۔ پلیز شاہ زر مجھے معاف......!''

''جسٹ شٹ اپ۔'' اس کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ دہاڑ کر اسے چپ کراتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ انوشہ کو لگا جیسے اس کے وجود پر منوں بوجھ آ پڑا ہو۔

رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی مگر وہ سوئی نہیں تھی۔

زیرلب مختلف قرآنی آیات کا ورد کرتی وہ چاند کے پہلو میں بیٹھی اس پر بار بار پھونک رہی تھی۔ شاہ زر خود بھی جاگ رہا تھا کبھی ڈرپ چیک کرتے ہوئے کبھی دوائیوں کو ترتیب دیتے ہوئے گاہے بگاہے اس کی نظر انوشہ رحمان پر پڑتی اور پلٹ آتی۔ واقعی پچھلے پانچ سالوں نے ان دونوں کو بہت تھکا دیا تھا۔ چاند کی ڈرپ اتر جانے کے بعد وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ جب انوشہ آنسوؤں سے تر چہرہ رگڑے ہوئے اس کے قریب نیچے زمین پر بیٹھ گئی۔ اگلے ہی پل شاہ زر کے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں میں تھے۔

''شاہ زر پلیز' مجھے معاف کر دو پلیز۔'' آنسوؤں سے اس کا لہجہ بھاری ہو رہا تھا۔ شاہ زر نے فوری ہاتھ اس کی گرفت سے نکال لیے۔

''تمہیں معاف کرنا اتنا آسان نہیں ہے انوشہ رحمان! بہت اذیت دی ہے تم نے مجھے۔ ایک طرح سے کچھ نہیں رہنے دیا تم نے میرے پاس۔ اب معافی نہیں۔''

''پلیز......!'' رو کر عاجزی سے کہتے ہوئے اس نے اپنا سر شاہ زر کی گود میں رکھ دیا تھا مگر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ انوشہ کی کب آنکھ لگ گئی اسے پتا ہی نہیں چلا۔ صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ یونہی اس کی گود میں سر رکھے سو رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کب سویا تھا۔

چاند کو ہوش آ گیا تھا اور اب پھر سے اسے پکار رہا تھا۔ انوشہ آنکھ کھلتے ہی اس کی طرف لپکی تھی۔

''چاند' میری جان! مما آپ کے پاس ہیں دیکھو۔''

''مما۔'' دوسری طرف چاند کو جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ شاہ زر کی آنکھ بھی کھل چکی تھی۔ وہ دوسری سائیڈ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی طرح چاند بھی انوشہ سے خفا تھا مگر اس نے اسے منالیا تھا۔

کچھ رشتوں کی اہمیت واضح ہونے کے لیے وقت شرط ہوتا۔ بے انوشہ کے لیے شاہ زر اور چاند کا رشتہ بھی ایسا ہی تھا۔ گزرے پانچ سالوں میں ایک بہترین استاد کی طرح زندگی نے اسے وہ سبق یاد کروائے تھے کہ وہ آخری سانس تک بھولنے کی حماقت نہیں کر سکتی تھی۔

اس روز چاند کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ پانچ سال کے بعد شاہ زر نے اسے بے حد خوش اور مطمئن دیکھا تھا۔ شاید وہ سونے کا نوالہ کھلا کر بھی اس کی زندگی میں ماں کی کمی کو پورا نہیں کرسکا تھا۔ کمرے سے گاڑی تک وہ چاند کو اپنی بانہوں میں اٹھا کر لایا تھا۔ پھر سہولت سے پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ اس کی ٹانگ کا زخم ابھی ہرا تھا۔ انوشہ دل گرفتہ سی اس کی چیزیں سمیٹتی پیچھے ہی چلی آئی۔ تھوڑی دیر بعد دواؤں کے زیر اثر چاند کی آنکھ لگ گئی تھی۔ شاہ زر ہنوز چہرے پر سنجیدگی طاری کیے ڈرائیو کرتا رہا۔

کل رات صبا کی کال آئی تھی اور اس نے انوشہ کے اس کے پاس گزرے پانچ سال کا سارا احوال اسے کہہ سنایا تھا مگر وہ پھر بھی خاموش تھا اور یہی خاموشی انوشہ کے اضطراب کو بڑھا رہی تھی۔

”میرے بیٹے نے مجھے معاف کر دیا ہے آپ نہیں کریں گے؟“

”نہیں۔“ سپاٹ چہرے کے ساتھ کہتے ہوئے اس نے گیئر بدلا تھا۔ تبھی انوشہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ شاہ زر جیسے فریز ہو کر رہ گیا تھا۔ مردے کی طرح اکڑی رہنے والی وہ لڑکی بھلا یوں منانا کب سیکھ گئی۔ وہ ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ انوشہ نے اس کے کندھے سے ٹیک لگاتے ہوئے دوسرا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔

”کب تک معاف نہیں کریں گے؟“ وہ خاموش رہا تھا۔

”آئی پرامس میں آپ کے سارے قرض اتار دوں گی۔ پچھلے پانچ سالوں میں بہت پیسے جمع کیے ہیں میں نے۔“ صرف اسے چڑانے کے لیے بولنے پر مجبور کرنے کی خاطر اس نے کہا تھا۔ جواب میں وہ اسے گھور کر رہ گیا۔

”گھر چل رہے ہیں نا‘ سارے حساب ہی بے باک کروں گا بے فکر رہو۔“

وہ مسکرائی تھی اور شاہ زر نے ایک مدت کے بعد اس لڑکی کے لبوں پر پھول بکھرے دیکھ کر بے حد اطمینان محسوس کیا تھا۔ جو سبق وہ اسے نہیں سکھا سکا تھا وقت نے سکھا دیا تھا۔

وہ اس کے ہاتھ پر دھرا اپنا ہاتھ اٹھا رہی تھی جب شاہ زر نے فوری اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے لیا۔

”بڑے قرض واجب ہیں تم پر آج لگ جائے گا پتا۔“ پل میں موڈ بدلتے ہوئے اس نے جھک کر انوشہ کا سرد ہاتھ چوما تھا۔ عین اسی لمحے سائیڈ سے موٹر سائیکل سوار نکلا اور گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ انوشہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

”اف ڈرائیو تو دھیان سے کریں کیا ہو گیا ہے؟“

”آپ کا خمار ہو گیا ہے اور کچھ نہیں۔“ وہ اب سامنے دیکھ رہا تھا۔

”گھر پہنچ جائیں بخیر و عافیت اتارتی ہوں سارا خمار۔“ اس نے دھمکی لگائی تھی۔

”پکی بات ہے اتارو گی، نا۔“ اس کے الفاظ کو انجوائے کرتے ہوئے وہ اب شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

انوشہ نے جواب میں نظریں چراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہلکا سا مکا رسید کر دیا۔ ایک مدت کے بعد زندگی سے اس کی صلح ہوئی تھی۔ وہ زندگی کہ جس کے سارے کردار پتھر تھے۔ مگر اب وہ

پتھر نہیں رہی تھی۔ ثابت قدم چاہنے والے ہم سفر نے بالآخر اس پتھر کو پگھلا دیا تھا۔ اب تک ہوئے تمام نقصان کو فراموش کرتے ہوئے اس نے پھر سے شاہ زر کے کندھے پر سر رکھا اور سکون سے پلکیں موند لیں کہ اب محبت کے اس راوی نے چین ہی چین لکھنا تھا۔

❁❁❁

میرال کی مہندی کی تقریب جاری تھی۔

امامہ تھوڑی دیر ہنسی مذاق کے بعد اسٹیج سے اتر آئی۔ اس کا سر درد کی شدت سے پھٹ رہا تھا۔ پچھلے کئی روز سے اسے ہلکا ہلکا بخار اور کھانسی بھی رہنے لگی تھی۔ شاید تب سے ہی جب سے شجاع نے اسے کسی دوسری لڑکی میں اپنی دلچسپی کا بتایا تھا۔ اس تقریب کے لیے بھی وہ نہیں آیا تھا۔ ہزار سوچیں تھیں جو اس کا دل کاٹ رہی تھیں۔ وہ کیا کر رہا ہوگا؟ اس کی کیا مصروفیات ہوں گی۔ کیسے کیسے اژدھے ذہن و دل کو ڈس رہے تھے۔ جانے دل بے ایمان کو ایک دم سے کیا ہو گیا تھا۔

درد سے پھٹتے سر کو سکون دینے کے لیے وہ چائے بنانے کچن میں آئی تھی جب اچانک اس کے سیل پر فائزہ آپا کی کال آ گئی۔

"السلام علیکم آپا! کیسی ہیں؟"

"وعلیکم السلام تم کہاں ہو؟"

"خیریت۔"

"خیریت ہی کا تو پتا کرنا تھا۔ شجاع پر حملہ ہو گیا ہے۔ وہ اسپتال میں بری طرح زخمی ہے۔"

"وہاٹ؟" امامہ کو لگا جیسے اچانک زمین اس کے پاؤں تلے سے سرک گئی ہو۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپا؟"

"مجھے اطلاع ملی ہے امامہ! میری شجاع سے بات نہیں ہوئی پلیز تم پتا کرو وہ کیسا ہے۔"

"ج...... جی میں پتا کرتی ہوں۔"

اس کے حواس پل میں ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ گھر میں سب خوشیاں منا رہے تھے ایک مدت کے بعد حسن پیلس کے مکینوں کو خوشی نصیب ہوئی تھی مگر اس کی قسمت کی نحوست نے پھر اسے عجیب امتحان میں ڈال دیا تھا۔ کچھ پل کشمکش کے بعد وہ بنا کسی کو کچھ بتائے وہیں کچن میں کھڑی ملازمہ کو ضروری کام کا بتا کر ڈرائیور کے ساتھ شاہ پیلس آ گئی تھی کہ یہیں سے شجاع کے بارے میں کچھ خبر مل سکتی تھی۔

"السلام علیکم بی بی جی۔"

سالوں بعد گیٹ پر کھڑے چوکیدار کی آنکھیں امامہ کو دیکھ کر چمکی تھیں۔

"وعلیکم السلام بابا! شجاع صاحب کدھر ہیں؟"

"وہ تو جی اسپتال میں ہیں کل کسی نے ان کو جان سے مارنے کی کوشش کی تھی۔"

"او! تو کون سے اسپتال میں ہیں؟"

"یہ تو مجھے نئیں پتا جی اپنا برکت جا رہا ہے جی اسپتال ان سے پوچھ لیں۔"

چوکیدار بابا کا پورا جواب سنے بغیر وہ بھاگ کر اندر آئی تھی۔ کتنے سال ہوئے تھے اس نے ان در و دیوار کو خود پر حرام کر لیا تھا۔ اس وقت بھی افراتفری میں وہ اپنے ملازم کے ساتھ متعلقہ اسپتال

آئی تھی۔ جہاں پرائیویٹ کمرے میں واقعی شجاع حسن سر اور سینے پر پٹیوں میں جکڑا پولیس کے کچھ افسران سے باتیں کر رہا تھا۔ نظر جیسے ہی بے تابی سے دروازہ کھول کر اندر آتی امامہ پر پڑی وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا۔ اس کے افسران نے بھی شاید امامہ کو دیکھ لیا تھا تبھی جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ٹھیک ہے شجاع کل ملتے ہیں پھر' اللہ نگہبان۔''

''شکریہ سر!'' اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ امامہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ افسران کے کمرے سے نکلتے ہی وہ شجاع کا ہاتھ تھام کر رو پڑی تھی۔

''اب کیسے ہیں آپ؟''

''تمہیں کیسا لگ رہا ہوں۔'' زرد چہرے کے باوجود وہ مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ امامہ نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

''آپ کو میری نظر لگ گئی ہے۔ صحیح کیا آپ نے مجھے میری نحوست سمیت اپنے گھر سے نکال دیا۔ اگر ساتھ رہتے تو پتا نہیں اب تک کیا ہو چکا ہوتا۔ آپ کے ساتھ مجھ جیسی منحوس لڑکی سوٹ ہی نہیں کرتی۔''

''پھر کیسی لڑکی سوٹ کرتی ہے؟''

''بہت اچھی بہت پرخلوص مکمل ایمان دار لڑکی۔''

''یہاں مکمل ایمان دار کون ہے امامہ؟'' بہت دنوں کے بعد وہ اسے فرصت سے دیکھ رہا تھا۔ امامہ نے آنسو پونچھتے ہوئے سر جھکا لیا۔

''پتا نہیں...... آپ پر حملہ کیوں ہوا؟''

''پولیس والا ہوں۔ پولیس والوں کے ساتھ ایسے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے جان بوجھ کے اطلاع نہیں کی تمہیں۔ سوچا شادی والا گھر ہے۔ رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے۔''

''جانتی ہوں انسان مشکل میں صرف اسے ہی یاد کرتا ہے جو دل کے قریب ہو اور میں آپ کے دل کے قریب نہیں ہوں۔''

''اچھا پھر کون ہے میرے دل کے قریب؟''

''وہی لڑکی جسے اپنی زندگی میں شامل کر رہے ہیں آپ۔'' وہ رنجیدہ تھی۔ شجاع مسکرا دیا۔

''اگر تم خوش نہیں ہو تو نہیں کروں گا۔''

اس کے جواب پر فوراً نظریں اٹھائی تھیں۔ کیا نہیں تھا ان آنکھوں میں۔ شجاع نے ہاتھ بڑھا کر اسے خود سے لگا لیا۔

''بڑی بدگمان لڑکی ہو مگر میں پھر بھی تم سے شرمندہ ہوں امامہ! تم نہیں جانتی ان گزرے چند سالوں میں کیا ہوا ہے۔ تمہارے حسن پیلس سے جاتے کے کچھ روز بعد مجھے تمہاری طرف سے طلاق کے لیے عدالتی آرڈر مل گئے تھے۔ بہت شاکڈ ہوا تھا میں' سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایسا کوئی قدم اٹھاؤ گی پھر تمہاری طرف سے ارسلان کی کالز نے جینا حرام کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ تم اب میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں۔ بلکہ اس کی زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہو۔ مجھے بہت غصہ آتا تھا۔ امامہ

تمہارے بغیر جینے کا تصور ہی محال تھا میرے لیے۔ ایک بار سوچا بھیج دوں طلاق مگر پھر حوصلہ نہیں ہوا تو ایبروڈ چلا گیا۔ وہاں جا کر بھی چین نہیں آیا۔ یہی خوف دامن گیر رہا کہ حسن انکل یا تم خود اچانک سامنے آ کر طلاق کا مطالبہ نہ کر دو مگر پھر منے کی پیدائش پر میں خود کو نہیں روک سکا۔ میں نہیں جانتا حسن انکل کس کے پابند تھے۔ تمہاری قسم کے یا پھر ارسلان کی سازش کے مگران کی خاموشی اور تمہاری بے نیازی دونوں مجھے اندر سے کاٹتی رہیں۔ ارسلان دھمکیاں دیتا رہا اور میں صرف تمہارے لیے برداشت کرتا رہا اور کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ کیا کروں؟ کل میرال سے تفصیلی بات ہوئی۔ اس نے اسپیشلی اپنی شادی میں شرکت کے لیے کال کی تھی مگر جب تمہارا ذکر ہوا تو اصل حقیقت کا پتا چلا۔ مت پوچھو امامہ! کیا حال تھا میرا۔ کتنا کچھ شیئر کرنا تھا تم سے مگر اس سے پہلے کہ کوئی سرپرائز دیتا یہ ٹینشن ہو گئی۔"

گہری سانس لیے وہ سب واضح کر رہا تھا۔ امامہ کا دل چاہا ارسلان حیدر کا منہ نوچ لے۔

"اللہ گواہ ہے شجاع مجھے کسی بات کا علم نہیں۔"

"جانتا ہوں تبھی تو معافی مانگ رہا ہوں۔"

"مگر میں نے معاف نہیں کرنا۔"

"کیوں جی؟"

"بس میری مرضی۔"

"ٹھیک ہے معاف نہ کرو مگر پیار تو کرو پلیز۔"

"جی نہیں...... پیار بھی اسی سے کرائیں جس سے شادی رچا رہے تھے۔" اس بار شجاع کھل کا ہنسا تھا۔

"ابھی تک اس بات کو دل سے لگائے بیٹھی ہو۔ پاگل مذاق کیا تھا تمہاری قسم' صرف دیکھنا چاہ رہا تھا تم کیا ری ایکٹ کرتی ہو مگر تمہاری خاموشی نے پھر دل جلا دیا۔"

"جھوٹ......!" نروٹھے انداز میں کہتے ہوئے وہ جھکی اور پھر آہستہ سے اپنے لب شجاع کے زخمی سینے پر رکھ دیے۔

"تھینکس اب کسی مرہم کی ضرورت نہیں۔" وہ بے پناہ خوش دکھائی دے رہا تھا۔

امامہ نے خود کو ہلکی پھلکی محسوس کرتے ہوئے جھک کر اس کے کندھے پر سر ٹکا دیا۔ اس شخص کی رفاقت کے لیے اس کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔ اسے لگا جیسے وہ کسی خواب کے حصار میں ہو۔ اگر یہ خواب بھی تھا تو وہ اس خواب کے حصار سے کبھی باہر نہیں آنا چاہتی تھی کہ اب یہ خواب ہی اس کی زندگی کا حاصل تھا۔

❋❋❋

گاؤں مراد شاہ کی حویلی میں اس وقت عجیب سی ہلچل مچی تھی اور اس ہلچل کا سبب مراد علی شاہ کا نکاح تھا۔ جس میں شرکت کے لیے ایک مدت کے بعد حویلی کے بڑے بیٹے بہزاد علی شاہ کی بیوہ [illegible] شاہ اپنی اکلوتی بیٹی کے ساتھ ایبروڈ سے آئی تھی۔

ایک مدت ہوئی حویلی میں سناٹوں کا بسیرا تھا۔

اداس پرندے صبح رزق کی تلاش میں حویلی کے اونچے ستونوں اور منڈیروں پر بیٹھ کر کچھ پل چہچہاتے اور پھر اڑ جاتے۔ اماں جی سارے ان اشاروں کو سمجھتی تھیں [illegible] چھینکتی رہتیں۔ ابا جی دل کے مریض ہو گئے تھے مراد علی شاہ [illegible] دوسرا دورہ پڑا تھا اور تبھی وہ پاکستان آنے پر مجبور ہوئی تھی

کتنے سال ہوئے تھے اسے حویلی والوں کو [illegible] کر سکی تھی۔ اس کی بیٹی بہت خوش تھی۔ [illegible] سناٹا تھا کہ کسی طور ختم ہونے میں نہیں آتا تھا [illegible] شاہ کا حال نہیں پوچھا تھا۔

اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ کبھی آ کر اس کا سامنا کرتی۔ [illegible] بھی گزرے ہوئے کل کی یاد کا کوئی بھولا بھٹکا بادل اس کے تصور کے پردے پر چھاتا وہ نئے سرے سے ادھڑنے لگتی۔ پچھلے چند سالوں میں اس نے زندگی کو کسی زہر کی مانند گھونٹ گھونٹ پیا تھا۔ نہ کبھی خود خوش رہ سکی تھی نہ ہی اس سے وابستہ افراد کو کبھی اس کے وجود سے کوئی راحت نصیب ہوئی تھی۔ عجیب پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی وہ۔ مراد علی شاہ کا گھر آباد ہو گیا تھا۔ ابا جی اور اماں جی عمرے کے لیے چلے گئے۔ انزلہ سارے دن سودائیوں کی طرح حویلی میں چکراتی پھرتی۔ زندگی کو اب جیسے اس کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ اس کی بیٹی کو انگلینڈ واپس جانا تھا اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا تھا۔ کنیز بیگم بار بار فون کرتیں مگر انزلہ بات نہیں کر رہی تھی۔

تمہیں معلوم ہے ہم نے کسی کے ہجر میں
یہ زندگی کیسے گزاری ہے
ہر اک خوش بو کی آہٹ پر
گماں اس کا گزرتا تھا
ہر اک ساعت پر دل آنکھوں میں آ کے بیٹھ جاتا تھا
کئی پہلو بدلتی خواہشیں ہاتھوں کو پھیلائے
دعائیں مانگتی اور ہانپتی دل سے گزرتی تھیں
مگر جو ہجر لاحق ہے
یہ جسم و جاں کی دیواریں گراتا ہے
امید و بیم کی آنکھوں سے بینائی کے سارے منظروں کو
خاک کرتا اور مٹاتا ہے
سو ہم بھی خاک ہیں اور خاک کی تقدیر میں لکھا گیا ہے
”بے اماں رہنا“

اپنی بیٹی کی ضد پر اس روز بہت دنوں کے بعد اپنے گاؤں شاہ والا آئی تھی۔ لہولہان دل ایک ایک سانس کو بوجھل بنا رہا تھا۔ پچھلے چند سالوں میں واقعی کسی نے اس کے عہد کی پاسداری میں گاؤں کا نقشہ بدل کر رکھ دیا تھا مگر وہ اپنا عہد نہیں نبھا سکی تھی۔ ہوا' پانی' درختوں کو گواہ بنا کر بھی اس نے بد

عہدی کی تھی۔ تبھی ہر چیز اسے خود پر ہنستی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

اس کی بیٹی یہاں آ کر بہت خوش تھی مگر وہ بیمار پڑ گئی تھی۔ مسلسل بخار کے ساتھ عجیب سی بے سکونی اور اضطراب نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کی آمد پر بہت خوش تھے۔ اسپیشلی چھنو، مگر اس کے لیے اب خوشی کا جیسے کوئی معنی ہی نہیں رہا تھا۔ سید والا سے مراد علی شاہ کی بیوی آئی تھی۔ انزلہ کا حال دیکھ کر اس نے بہت نیک نیتی کے ساتھ اسے بتایا تھا۔

''انزلہ باجی میرا خیال ہے آپ پر سایہ ہو گیا ہے میری بات مانیں تو سنی بابا کے پاس چلی چلیں بڑی شہرت سنی ہے جی ان کی۔ ساری ساری رات قبرستان کے قریب درخت کے نیچے بیٹھ کر جانے کیا پڑھتے رہتے ہیں۔ مجھے تو بہت عقیدت ہے جی ان سے۔''

''سنی بابا۔'' نوکیلے خنجر کی مانند کوئی چیز جیسے اس کے اندر تک سرایت کر گئی تھی۔

''ہاں جی، آپ تو جانتی ہونگی آپ کا تو علاقہ ہے یہ، پہلے اس گاؤں کے چوہدری تو تھے وہ۔''

ایک مدت کے بعد اس شخص کے بارے میں خبر ملی بھی تو کیا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل ڈالا اگلے دن کے ڈھلتے سورج کے ساتھ اپنی بیٹی کی انگلی تھامے وہ جیسے بہت اذیت میں اس کے ڈیرے کی طرف آئی تھی۔ ٹنڈ منڈ درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا سانول شاہ پلکیں موندے زیر لب جانے کیا پڑھ رہا تھا۔

انزلہ خاموشی سے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''قیس۔'' ایک مدت کے بعد کسی نے اسے اس نام سے پکارا تھا۔ سانول کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ فوراً سے پیشتر اس نے آنکھیں وا کی تھیں اور پھر جیسے کچھ دیکھنے قابل نہیں رہا تھا۔

''بہت شہرت سنی ہے آپ کی، یہ میری بیٹی ہے۔ چند سال قبل اس کے بابا بہزاد علی شاہ کی وفات ہو گئی تھی، میں ان کی بیوہ ہوں۔ اس کے باوجود مجھ پر سایہ ہو گیا ہے۔ محبت کا سایہ اس شخص کی محبت کا سایہ جسے میں چاہتے ہوئے بھی کبھی ایک پل کے لیے بھی نہیں بھلا سکی۔''

وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ سانول کو لگا جیسے اس کا دل دھڑکنا بھول جائے گا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھی نم ہو گئے تھے۔ وہ اس لڑکی کی مجبوریوں اور حوادث کے بارے میں سب جانتا تھا۔ تبھی ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کی بیٹی کو اپنی گود میں لے لیا۔

''مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ تم کس کی بیوہ ہو مگر میری زندگی آج بھی تمہارے بغیر ادھوری ہے انزلہ۔'' اس کا لہجہ بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔ انزلا ٹپ ٹپ بہتے آنسوؤں کے ساتھ مسکرا دی۔

''میں نے رشتوں اور مجبوریوں کی ساری زنجیریں توڑ دی ہیں قیس! دیکھو وقت اب بھی ہماری مٹھی میں انمول موتی کی طرح دمک رہا ہے۔''

اس کی ہتھیلی سانول شاہ کے سامنے پھیلی تھی۔ سانول شاہ نے وہ ہاتھ قیمتی متاع کی مانند تھام لیا۔ زندگی کے صحرا میں ایک عمر کی آبلہ پائی کے بعد محبت کے دو اور مسافروں کو وصال کی ٹھنڈی چھاؤں نصیب ہو گئی تھی۔

(تمت بالخیر)

Pakistanipoint Waqar Azeem